خصوصی اشاعت بیادِ مرشد الامت

حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

ماہنامہ

پیامِ عرفات

رائے بریلی

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي
دار عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی
دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)
www.abulhasanalinadwi.org

خصوصی اشاعت بیادِ مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

شمارہ: ۶-۸ جلد: ۱۵

قائدینِ ملت کی ذمہ داری

”آج مسلمانوں نے اپنی غیر ذمہ دارانہ اور بے مقصد زندگی، ثقافتی اور فکری کم مائیگی کے باعث اپنے مستقبل کی گاڑی کو ایسے بھیانک ڈگر پر ڈال دیا ہے جو کسی وقت بھی ہلاکت کی گہری کھائی میں گر سکتی ہے، لہٰذا رہنمایان ملت اور رہبران قوم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ خودغرضی اور موقع پرستی کی پستیوں سے بلند ہوکر اس امت کو ہلاکت کی کھائیوں میں گرنے سے بچائیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اپنے دشمنوں کے دام فریب میں آکر ہمیشہ ہمیش کے لیے اپنی انفرادیت کھو بیٹھیں۔“

(مسلم سماج - ذمہ داریاں اور تقاضے: ۹۵-۹۶)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی
مفتی راشد حسین ندوی
عبدالسبحان ناخداندوی
محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی
محمد ارمغان بدایونی ندوی

جون - اگست ۲۰۲۳ء مطابق شوال المکرّم - ذی الحجہ ۱۴۴۴ھ

اس شمارہ کی قیمت -/Rs.200

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ”پیام عرفات“ مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔
www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.10 E-Mail: markazulimam@gmail.com سالانہ زرتعاون: -/Rs.100

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

آئینۂ مضامین

مضمون	مضمون نگار	صفحہ
اداریہ	بلال عبدالحی حسنی ندوی	۹
مرشدالامت- ماہ وسال کے آئینہ میں	محمد نجم الدین ندوی	۱۰
شان خط	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ	۲۱
آخری خطاب	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ	۲۲
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے	حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ	۲۶
ایں خانہ ہمہ آفتاب است	حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب الہ آبادی مدظلہ	۳۰
تعزیتی مکتوب	حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مدظلہ	۳۲
فرشتہ صفت انسان	حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ	۳۵
ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا	حضرت مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی مدظلہ	۳۷
بقیۃ السلف کی رحلت	حضرت مولانا عبدالحمید اسماعیل زھی مدظلہ	۳۹
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا	حضرت مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری مدظلہ	۴۱
برکۃ العصر کی رحلت	مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی	۴۲
عم محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ	مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی	۴۷
الوداع امت کے مرشد الوداع	مولانا عزیز الحسن صدیقی	۵۲
تاریخ ندوہ کی تاریخ ساز شخصیت	پروفیسر سید احتشام احمد ندوی	۵۴
تعزیتی پیغام	مولانا محمد سعد صاحب کاندھلوی	۵۵
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا	مولانا مفتی محمد قاسم قاسمی	۵۷
کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گذر گئے	مولانا عبدالعلیم فاروقی	۶۲
آبروئے بزم	مولانا احمد لاٹ ندوی	۶۳
غضب تو یہ ہے کہ اب آفتاب ٹوٹا ہے	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۶۵
تمہاری خوبیاں زندہ تمہاری نیکیاں باقی	پروفیسر اختر الواسع	۷۳
گلشن ندوہ کا گل سرسبد	مولانا محمد الیاس گھمن	۷۴
وہ رشک صد بہار گلستاں چلا گیا	انجینئر سید سعادت اللہ حسینی	۷۷

دنیائے علم وادب اور اسلامی قیادت کا ایک بڑا سانحہ	مولانا سلطان ذوق ندوی	۷۸
غموں کی دھوپ اداسی کی آندھیاں توبہ	پروفیسر مسعود الحسن عثمانی	۷۹
وہ آبروئے ندوہ شبلی وسلیماں	پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن	۸۲
ملال یہ ہے کہ دہلیز عاشقاں بھی گئی	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۸۶
''رہبر کامل''-خصوصیات اور کچھ بنیادی نکات	پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی	۸۸
قیادت کی صف اول کا ایک بڑا خلا	مولانا عبدالستار صاحب مفتاحی	۹۲
علم وادب کا مہر تاباں	مولانا محمد آیت اللہ قادری	۹۳
حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ: نقوش وتاثرات	ڈاکٹر علی احمد ندوی	۹۴
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے	مولانا عبدالقادر عارفی	۹۶
پیکر علم وادب	استاد شیخ شمس الدین درمش	۱۰۳
عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں	قاری سید حبیب احمد باندوی	۱۰۴
خانوادۂ حسنی کے بدرِ منیر	مفتی عبیداللہ اسعدی	۱۰۷
کاروان انسانیت کا حدی خواں	مفتی محمد سلمان منصور پوری	۱۰۹
فقید المثال معلم وقائد	پروفیسر قاضی عبدالماجد ندوی	۱۱۰
خاطرات شیریں	مولانا محمد شریف صاحب بارہ بنکوی	۱۱۳
مرشد الامت کی وفات-ایک مثالی عہد کا خاتمہ	ڈاکٹر سلیم الرحمٰن خاں ندوی	۱۱۵
جامع حسنات شخصیت	مولانا عمیر الصدیق ندوی	۱۱۷
عرفان حق کا پیکر جمیل	جناب عین الحید رعلوی	۱۲۹
حضرت مولاناؒ-قومی ومسلکی یکجہتی کی علامت	ڈاکٹر عبدالمجید پاریکھ	۱۲۴
میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا	مولانا علاء الدین ندوی	۱۲۵
ایک عظیم جغرافیہ داں	مولانا ابوسحبان روح القدس ندوی	۱۲۶
وہ آسماں تھا مگر سر جھکا کے رہتا تھا	مولانا ضیاء عبداللہ ندوی	۱۲۸
ایک معتدل مزاج اور جامع شخصیت	ڈاکٹر محمد اکرم ندوی	۱۳۰
لا مجھ کو دکھا ان کی طرح کوئی اگر ہے	ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی	۱۳۲
مرشد الامت-اکیسویں صدی کی عبقری شخصیت	مولانا اسماعیل بھولا ندوی	۱۳۴
بہاریں تم سے تھیں	الحاج سید ناطق حسن قادری	۱۳۷

حضرت مرشدالامت کی یاد میں	ڈاکٹر تابش مہدی	۱۳۸
سرمایہ ملت کا نگہباں	مولانا ڈاکٹر ابورضا ندوی	۱۴۳
ایک مثالی معلم کی وفات-ایک عہد کا خاتمہ	پروفیسر سرور عالم ندوی	۱۴۴
ایک گوہر نایاب	مولانا وسیم صدیقی ندوی	۱۴۶
ایک پیکر یقیں اور پیکر استغنا کی رحلت	مولانا وزیر احمد اعظمی ندوی	۱۴۷
.....لیکن تو چیزے دیگری	مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی	۱۴۹
ایک مثالی شخصیت	ڈاکٹر محمد انس ندوی	۱۵۶
ریاست ٹونک اور حضرت مرشدالامت	مولانا محمد عامر خان ندوی	۱۶۰
ایک عبقری ومثالی استاد	ڈاکٹر سید راشد نسیم ندوی	۱۶۲
اب یاد نہ آؤں رہنے دو	مولانا ممشاد علی قاسمی	۱۶۴
کہکشان فکر ونظر کے بدر منیر	ڈاکٹر انور حفیظ ندوی	۱۶۹
سرمایہ ملت کا پاسباں	مفتی راشد حسین ندوی	۱۷۱
برکۃ العصر وریحانۃ الہند	مولانا عبدالسبحان ناخدامدنی ندوی	۱۷۳
مقبول بارگاہِ انام	مولانا مفتی محمد ذاکر نعمانی	۱۸۱
رفتید ولے نہ از دل ما	مولانا محمود الرحمٰن فاروقی ندوی	۱۸۳
ماموں جی	ڈاکٹر حسن رشید	۱۸۶
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا	مولانا یاسین کاکوسی گجرات	۱۸۹
کچھ پھول یادوں کے چمن سے	مولانا سیف الدین اسلام پوری	۱۹۴
میر کارواں- چند مشاہدات وتاثرات	مولانا خالد رشید فرنگی محلی	۱۹۷
مولانا سید محمد رابع علیہ الرحمہ کے غیر ملکی سفرنامے	ڈاکٹر جمشید احمد ندوی	۱۹۹
ایک پرانا چراغ نہ رہا	مولانا ناصر سعید اکرمی ندوی	۲۱۱
وہ کوہ کن کی بات.....	ڈاکٹر مظفر حسین ندوی	۲۱۷
یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے	مولانا اشہد جمال ندوی	۲۲۱
میر کارواں کی رحلت	مولانا جمال احمد ندوی	۲۲۳
ملت اسلامیہ ہند کا ایک درخشاں ستارہ	مولانا مطیع الرحمٰن عوف ندوی	۲۲۵
ملت کا بے لوث قائد اور پیکر اخلاص وعمل	مولانا مفتی محمد شمشاد ندوی	۲۲۷
خوشبو ان کی یادوں کی	ڈاکٹر عبدالقادر چوغلے	۲۳۱
پاکیزہ زندگی- پاکیزہ موت	مولانا ڈاکٹر ہارون رشید ندوی	۲۳۳
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے	حافظ سید محمود اشرف اشرفی	۲۳۵

حسن اخلاق کا حسین پیکر	مولانا شیخ ابرار احمد ندوی	۲۳۶
بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی	مولانا وثیق احمد ندوی	۲۳۸
نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں	مولانا رزین اشرف ندوی	۲۴۳
اوراق زندگی - ایک مطالعہ	مولانا ضیاء الحق خیرآبادی	۲۴۵
ادب اسلامی کے قافلہ سالار	مولانا ڈاکٹر شاکر فروخ ندوی	۲۴۹
عظیم المرتبت استاد کی رحلت	مولانا خورشید انور ندوی	۲۵۴
رابع لا خامس لہ	مولانا توقیر عبدالفتاح ندوی	۲۵۹
ملت اسلامیہ کی محترم شخصیت	مولانا محمد اسعد قاسمی	۲۶۱
وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے	مولانا ظہیر انوار قاسمی	۲۶۲
ہم آپ کے فراق سے محزون ہیں اے مرشد امت!	ڈاکٹر صباح اسماعیل ندوی	۲۶۵
دعوت وفکر کا سورج غروب ہوا	مولانا منہاج الدین قریشی ندوی	۲۶۷
ایک عہد آفریں شخصیت	پروفیسر مجیب الرحمٰن ندوی	۲۶۹
نقوش وتاثرات	مولانا محمد ارشد اعظمی	۲۷۲
آئینہ ذات وصفات	پروفیسر فہیم اختر ندوی	۲۷۴
حضرت مولانا - بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ	مولانا ڈاکٹر وقار الدین لطیفی ندوی	۲۷۶
میراثِ علم وآگہی	پروفیسر مسعود عالم فلاحی	۲۸۰
سالار کاروانِ ملت - چند یادیں چند باتیں	مولانا سعود الحسن ندوی	۲۸۱
نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ	مولانا مسعود حسن حسنی ندوی	۲۸۳
زینت دشت ودمن رونق پروانہ گیا	مولانا سید ہاشم نظام ندوی	۲۸۷
مرشد الامت - علم وفکر کے آئینہ میں	مولانا محمد شعیب ندوی	۲۹۱
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا	ڈاکٹر محمد نصر اللہ ندوی	۲۹۳
ایک دور اندیش، بلند اخلاق اور اعلیٰ ظرف شخصیت	مفتی رحمت اللہ ندوی	۲۹۵
ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم	ڈاکٹر مہدی حسن خاں ندوی	۲۹۸
متاعِ دین ودانش	مولانا محمد نفیس خان ندوی	۳۰۱
جامع اور متوازن شخصیت	مولانا سلمان نسیم ندوی	۳۰۷
ہم سفر اب مرے پہلو میں مرا دل نہ رہا	پروفیسر قمر شعبان ندوی	۳۱۰
زیبِ لوح وقلم	ڈاکٹر عبید الرحمٰن ندوی	۳۱۲
بات میں سادہ وآزاد، معانی میں دقیق	مولانا ڈاکٹر محمد اعظم ندوی	۳۱۶
۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء کو ہم نے کیا کھویا؟	مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی	۳۲۴

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را	مولانا عبید اللہ شمیم قاسمی	۳۳۲
چلتا نہیں ہے زور کسوں کا قضا کے ہاتھ	مولانا جمیل اختر جلیلی ندوی	۳۳۵
ایسا ملا ہے دردِ دل جس کی کوئی دوا نہیں	حافظ مصباح الدین	۳۳۸
چچا میاں کی دل آویز شخصیت	محمد مکی حسنی ندوی	۳۴۳
قصہ دو عظیم اور مثالی بھائیوں کا ایک عینی شاہد کی نظر سے	مولانا زاہد حسین ندوی جمشید پوری	۳۴۵
محبوب ترین شخصیت	مولانا منصور حسن حسنی ندوی	۳۴۹
ابا اپنی انفرادی خصوصیات کے آئینے میں	خلیل احمد حسنی ندوی	۳۵۱
اچھے ابّاؒ کی شخصیت-ذاتی تاثرات	محمد امین حسنی ندوی	۳۶۰
رندوں کو تسلی تھی کہ میخانہ میں تم ہو	مولانا سعد چشتی ندوی	۳۶۳
ایک عہد کا خاتمہ	جناب عبد الماجد نظامی	۳۶۶
مجمع الکمالات	مولانا محمد عاصم ندوی	۳۶۸
آتی ہی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو	مفتی محمد جابر بن عمر پالن پوری	۳۷۰
ایک یادگار ملاقات	مولانا محمد صادق مظاہری	۳۷۶
علم وفن کی آبرو	پروفیسر قطب الدین ندوی	۳۷۹
مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں	پروفیسر محفوظ الرحمٰن ندوی	۳۸۰
آنسو بہا رہی ہے فضا تیری موت پر	مولانا عین الحسن ندوی	۳۸۲
زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی	مولانا طلحہ نعمت ندوی	۳۸۶
پیکر زہد وعمل	جناب نوید حسن	۳۸۸
فکر وعمل کے چند گوشے	ڈاکٹر غیاث الاسلام صدیقی ندوی	۳۹۰
میرے پیارے ابا یادوں کے آئینہ میں	مولانا رشید احمد حسنی ندوی	۴۰۲
ایک عہد ساز شخصیت	مولانا مفتی سید محمد ریاض کھجناوری ندوی	۴۱۰
ایک شجر سایہ دار تھا، نہ رہا	مولانا فرید حبیب ندوی	۴۱۳
حضرت الاستاذ کا تصنیفی وتدریسی ذوق	مولانا خالد ضیا صدیقی ندوی	۴۱۵
دین حق کے ترجمان-ملتِ بیضا کے امین	مولانا محمد سلمان ندوی بجنوری	۴۲۱
عالم اسلام کی ایک عبقری شخصیت	مفتی آصف باقر ندوی	۴۲۶
وہ فیضان حق کا نمونہ تھے	مولانا محمد بن یوسف ندوی	۴۲۸
پیکر علم وحکم	مولانا شاہ ارشد علی ندوی	۴۴۲
میر کارواں کا سفر آخرت	مولانا محمد توحید خان ندوی	۴۴۴
نبوت کے یہ وارث ہیں یہی ہیں ظل رحمانی	مفتی صابر حسین ندوی	۴۵۲

آبروئے باغِ ہند	مولانا فتح محمد ندوی	۴۵۸
مرشد الامت مجلسی افادات کے آئینہ میں	مولانا زین العابدین ہاشمی ندوی	۴۶۲
یاد آتی ہیں تری باتیں ترے جانے کے بعد	مولانا محمد سعد خان ندوی کانپوری	۴۶۵
ایک تاریخ ساز شخصیت	شاہ عمران حسن	۴۶۸
چھپ گئے وہ ساز ہستی چھیڑ کر	مولانا زاہد عباسی ندوی	۴۷۱
تاج دارِ علم وحکمت	محمد نجم الدین ندوی	۴۷۲
جانشین مفکر اسلام ''کاروان زندگی'' کے آئینہ میں	محمد ارمغان بدایونی ندوی	۴۸۰
ابا حضرت ہم سے رخصت ہو گئے	مولانا سعید حسنی ندوی	۴۸۶
ایک باکردار مثالی استاذ	مولانا محمد ارشد ندوی	۴۹۱
ستودہ صفات شخصیت	عبد العلی حسنی ندوی	۴۹۴
ہمارے ابا	عبد الحی حسنی ندوی	۴۹۶
ملے خاک میں اہل شاں کیسے کیسے	مولوی محمود ضیاء خیر آبادی	۴۹۸
اچھے ابا کی چند خصوصیات	سید محمد میاں حسنی	۵۰۱
وہ جو رخصت ہو گئے ویران ہے اب یہ چمن	سید ابو الحسن علی حسنی	۵۰۴
آہ مرشد الامت	محمد معاذ بن حافظ مصباح الدین	۵۰۵
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے	سید علی زین العابدین اشرف	۵۰۷
حیات مستعار کے چند گوشے	محمد حنظلہ کمال	۵۰۹
اچھے ابا- کچھ یادیں	سیدہ امامہ حسنی	۵۱۱
میرے اچھے ابا	سید عادل حسنی	۵۱۲

گلہائے عقیدت

جتنا بھی فخر تم کو محسوس ہو وہ کم ہے	حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ	۵۱۳
ہیں شریعت اور طریقت کے چمکتے ماہتاب	الحاج انیس احمد انیس پرخاصویؒ	۵۱۴
بشارت گوش کن رابع کہ تو محبوبِ آقائی	مولانا فیض الرحمٰن صاحب	۵۱۵
قطعہ تاریخ ارتحال مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ	ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی	۵۱۶
آہ حضرت مولانا رابع حسنی ندویؒ	ڈاکٹر ماجد دیوبندی	۵۱۷
اک پاسبان ملتِ بیضا چلا گیا	مولانا محمد مرتضیٰ سلفی راغب	۵۱۸
رحلت حضرتِ رابع کا ہے ہر دل کو ملال	مولانا نعمان اکرمی ندوی	۵۱۹
منبع صدق وصفا حضرتِ رابع ندوی	مولانا سید ہاشم نظام ندوی	۵۲۰
حضرت رابع تھے جو ملت کے نگہبان	مولانا عمران فراہی ندوی ازہری	۵۲۱

تھے نازش قرطاس وقلم حضرتِ رابع	مولانا سمعان خلیفہ ندوی بھٹکلی	۵۲۲
علم وعمل کی شمع، ہدایت کا اک چراغ	مولانا زاہد حسین ندوی جمشید پوری	۵۲۳
امت کے پاس بان دلارے چلے گئے	مولانا پرویز ندوی	۵۲۳
رابع الحسنی کے جیسا کوئی دوجا اب کہاں	مولانا تسنیم عابد ندوی	۵۲۴
بوالحسن کے خانوادے کی شمع اک بجھ گئی	مولانا پرویز حاصل ندوی	۵۲۵
شان ندوہ جان ندوہ جانشین بوالحسن	سید ابوالحسن علی حسنی	۵۲۶
کتنی ہی نسلوں کے معمار تھے رابع حسنی	شفقت علی کاوش شوکتی	۵۲۷

تعزیت نامے

علماء ودانشورانِ بیرونِ ہند	۵۲۸
علماء ودانشورانِ ہند	۵۳۲
اہل سیاست	۵۳۹

افادات مرشد الامتؒ

عقیدۂ توحید	۵۴۰
نماز	۵۴۰
زکوٰۃ	۵۴۰
روزہ	۵۴۱
حج	۵۴۱
محبت رسول ﷺ	۵۴۲
علم	۵۴۲
بیعت	۵۴۲
نیک صحبت	۵۴۳
دعوت دین	۵۴۳
طریقہ دعوت	۵۴۴
خودرائی	۵۴۴
نیت	۵۴۴
دعا	۵۴۴

مدیر کے قلم سے

مدتوں رویا کریں گے.....

بلال عبدالحی حسنی ندوی

دنیا میں ہزاروں لاکھوں لوگ آتے اور جاتے ہیں لیکن بعض ایسے بھی آتے ہیں جو انمٹ نقوش چھوڑ جاتے ہیں، جن کی زندگی ایسی روشنی بن جاتی ہے جس سے دلوں اور دماغوں کو روشنی ملتی ہے، جس کی مثالی زندگی سے زندگیوں کو جلا ملتی ہے، جن کے اخلاق ومحبت سے آوارہ دلوں کو منزل مقصود ہاتھ آتی ہے، بے چین لوگ جن کی آغوش میں آکر سکون پاتے ہیں، ایسے لوگوں کی جدائی دنیا کے لیے سوہان روح ثابت ہوتی ہے، ان کے جانے سے ایسا خلا پیدا ہوجاتا ہے کہ وہ مدتوں نہیں بھرتا۔

جان کرمن جملہ خاصان میخانہ مجھے　　مدتوں رویا کریں گے جام وپیمانہ مجھے

اور جب ساقی ہی نہ رہے تو کیا جام اور کیا پیمانہ اور کیسا میخانہ؟! مرشد امت جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی ذات اس دور میں ایسی تھی کہ ان کے وجود سے ڈھارس ملتی تھی، دلوں کو تسکین کا سامان ملتا تھا، وہ دنیا کے لیے باعث برکت تھے، ملت اسلامیہ کے لیے ان کی حیثیت "واسطة العقد" کی تھی، مختلف جماعتیں اور مختلف ادارے ان پر ایک ہوجاتے تھے، ملت کے شیرازے کو جس طرح ان کی ذات نے ایک کردیا تھا، یہ ان کی بڑی صفت تھی۔

ان کا فیض عام تھا، اس میں خاص وعام کی کوئی قید نہ تھی، کوئی بڑا ہو یا چھوٹا' کسی ادارہ کا سربراہ ہو یا ایک عام مسلمان، ان کا در سب کے لیے یکساں کھلا تھا، ایک معمولی بے ہنگم نوجوان ہو، کوئی معمولی طالب علم ہو، ہر ایک کو اس در سے سودا ملتا تھا اور سب اپنی تشنگی وہاں آکر دور کرتے تھے، سب کو اپنے درد کا درماں حاصل ہوتا تھا۔

حضرت نے بھرپور زندگی گذاری، زندگی کے آخری لمحات تک وہ دین وملت کے لیے وقف رہے، زہد وقناعت' صبر واستقامت' تواضع وفنائیت اور اخلاص واخلاق کا ایسا خوبصورت پیکر نگاہوں نے کم دیکھا ہوگا، امت کا درد ان کو وراثت میں ملا تھا، دعا ان کی اصل غذا تھی، خود مجسم دعا تھے اور اہل تعلق کو دعا کی تلقین فرماتے تھے، دعا میں عجیب کیفیت ہوتی، خلوتوں میں جو بھی مناجات کا عالم ہوتا ہو، راتوں میں بے چینی کا حال کوئی کیا بیان کرے، کبھی لیٹتے' کبھی اٹھ جاتے اور سر تکیہ پر رکھ کر روتے رہتے، کبھی ہچکیاں بندھ جاتیں، محسوس ہوجاتا کہ کوئی آگیا ہے تو فوراً اپنے آپ کو سنبھال لیتے۔

حضرت والا کو اللہ تعالیٰ نے بڑی انتظامی صلاحیت بھی عطا فرمائی تھی، فرماتے تھے کہ امت کو انتشار سے بچانے کے لیے میں کبھی کچھ تنازل اختیار کرلیتا ہوں، حضرت مفکر اسلام کے بعد انہوں نے ندوۃ العلماء کی آبیاری کی اور اس کو اس کے اصولوں پر قائم رکھا، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے ادارہ کو جس میں مختلف الخیال جماعتوں اور افراد کو جمع کیا گیا ہے' بحیثیت صدر مولانا نے سب کو سنبھالا اور بورڈ مستحکم رہا۔

دارعرفات آج سے نصف صدی قبل حضرت نے قائم کیا تھا، اس کے لیے وہ فکرمند رہتے تھے، یہ ذمہ داری تھی اس کے ذمہ داروں کی کہ وہ اپنے بانی اور سرپرست کو خراج تحسین پیش کریں اور سب سے بڑھ کر خراج تحسین یہ تھا کہ ان کے افکار وآثار کو عام کیا جائے، ان سے استفادہ کی شکلیں پیدا کی جائیں، وہ صفات جو عنقا ہوتی جارہی ہیں، لوگوں کے سامنے لائی جائیں، شاید کہ اندھیروں میں یہ قندیل رہبانی ثابت ہو۔

یہ راقم دعا گو ہے اور شکر گذار ہے اپنے ان عزیزوں کا جنہوں نے رات دن ایک کرکے یہ ارمغان تیار کیا، اس میں دعوت وفکر بھی ہے اور گہرائی وگیرائی بھی، سیرت وکردار بھی ہے اور علم وعمل کے جواہر پارے بھی، کام کرنے والوں کے لیے اس میں بہت کچھ سامان ہے آگے بڑھنے کا اور کوئی عالم ہو یا طالب علم ہو، مصنف ہو یا داعی ہو، منتظم ہو یا رہبر ہو، ہر ایک کے لیے اس میں غذا ہے، تقویت قلب کا سامان ہے اور ایسی چشم کشا حقیقتیں ہیں کہ اگر ان کو سامنے رکھا جائے تو شاید راستے کھلتے چلے جائیں۔

اکتوبر ۱۹۲۹ء

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

ماہ و سال کے آئینے میں

اپریل ۲۰۲۳ء

محمد نجم الدین ندوی

۱۹۲۹ء

☆ ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۹ء- مطابق ۲۵/جمادی الثانی ۱۳۴۸ھ کو تکیہ کلاں رائے بریلی میں پیدائش۔

۱۹۳۲ء

☆ دادا سید خلیل الدین حسنی کا انتقال۔

۳۶-۱۹۳۷ء

☆ مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی کی زیر نگرانی تکیہ کلاں (رائے بریلی) میں ابتدائی تعلیم۔

۳۷-۱۹۳۸ء

☆ مولوی سلیم امام و مؤذن مرکز والی مسجد کی زیر نگرانی مکتبی تعلیم۔

۳۹-۱۹۴۰ء

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مکتب میں داخلہ۔

۱۹۴۱ء

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے درجہ عربی اول میں داخلہ۔

☆ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی لکھنؤ آمد اور ان کی مجالس میں حاضری۔

۱۹۴۲ء

☆ ۲۱/سال کی عمر میں بڑے بھائی مولوی سید محمود حسنؒ کی وفات۔

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے درجہ عربی دوم میں داخلہ۔

۱۹۴۳ء

☆ دارالعلوم کے نظام سے علیحدہ مولانا سید حمید الدینؒ و مولانا سید نور الحسن سے استفادہ۔

☆ داعی کبیر حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کی لکھنؤ آمد اور ان کی خدمت کی سعادت۔

☆ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ کی صحبت میں ایک ہفتہ نظام الدین مرکز دلی میں قیام۔

۱۹۴۶ء

☆ ایک ماہ مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں قیام اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے خصوصی استفادہ۔

۱۹۴۷ء

☆ دار العلوم دیوبند میں ایک سال کا قیام اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے استفادہ۔

☆ قیام دارالعلوم میں مولانا اعزاز علی امروہی کی خصوصی توجہات اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی مجالس علمیہ سے خصوصی استفادہ۔

☆ سال کے اختتام پر لکھنؤ واپسی۔

☆ دارالعلوم دیوبند سے واپسی پر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں سال آخر (عالمیت) میں داخلہ۔

۱۹۴۸ء

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے تکمیل (فضیلت) سے فراغت اور آپ کے نامور اساتذۂ کرام:-

مولانا شاہ حلیم عطا محدثؒ، مولانا سعید احمد اعظمیؒ، مولانا محمد اسحاق سندیلویؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا محمد ناظم ندویؒ، مولانا سید حمید الدینؒ، مولانا مفتی محمد سعید ندویؒ، مولانا محمد

اسباط لکھنویؒ۔ قرأت وتجوید کے استاد قاری سید ودوالحی لکھنویؒ اور عربی زبان وادب میں اپنے ماموں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے خصوصی استفادہ۔

☆ شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کی صدرات میں لکھنؤ کے اندر جمعیۃ علماءِ ہند کا آل انڈیا اجلاس اور اپنے رفقاء کے ساتھ اجلاس کی کامیابی کے لیے جدوجہد۔

۱۹۴۹ء

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شعبۂ ادب عربی میں بحیثیت معاون مدرس کے تقرر۔

☆ قطب الوقت حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت وارادت۔

۱۹۵۰ء

☆ شیخ ومرشد حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ وخال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی رفاقت میں سفر حجاز اور پہلی بار حج وعمرہ اور مقامات مقدسہ کی زیارت کی سعادت۔

☆ دعوتی وتبلیغی مشن کی خاطر حجاز مقدس میں ایک سال کا قیام۔

☆ خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ساتھ کعبۃ اللہ میں پہلی بار حاضری کی سعادت۔

۱۹۵۱ء

☆ یک سالہ قیام حجاز کے بعد ہندوستان واپسی۔

☆ حافظ قرآن شفیق پھوپھی کا حادثہ وفات۔

۱۹۵۲ء

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شعبہ عربی ادب میں بحیثیت ادیب دوم کے تقرر۔

۱۹۵۳ء

☆ بڑے ماموں ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کی دختر محترمہ سیدہ رقیہ حسنی سے نکاح اور خطبہ نکاح شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھوانے کی سعادت۔

۱۹۵۴ء

☆ مشہور شامی عالم وقاضی شیخ علی طنطاوی اور عراقی عالم شیخ امجد زھادی کی لکھنؤ آمد اور ان سے پہلی بار ملاقات۔

۱۹۵۵ء

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے شعبہ عربی ادب میں بحیثیت ادیبِ اول (صدر شعبہ عربی) تقرر۔

☆ دسمبر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی دعوت پر امیر مساعد بن عبدالرحمٰن آل سعود کی ندوۃ العلماء لکھنؤ آمد اور ان کی زیارت وملاقات۔

☆ جامعہ عباسیہ بھاول پور پاکستان کے شیخ الجامعہ کی مدرسی کے لیے دعوت، مگر جواباً معذرت اور قیام دارالعلوم کو ترجیح۔

☆ مولانا عبداللہ عباس ندویؒ ومولانا معین اللہ ندویؒ کی معیت میں ندوہ کے کام سے بحرین اور عراق کا سفر۔ وہاں کی بڑی شخصیات مثلاً: علامہ بہجہ بیطار اور شیخ علی طنطاوی سے ملاقات۔

۱۹۵۷ء

☆ خاندانی مرشد اور عظیم مجاہد آزادی شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات۔

☆ نامی پریس لکھنؤ سے پہلی بار "منثورات من أدب العرب" کی اشاعت اور دارالعلوم کے نصاب میں شمولیت۔

۱۹۵۹ء

☆ پندرہ روزہ عربی صحیفہ "الرائد" کا اجراء۔

☆ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کا قیام اور حضرت مولانا علی میاںؒ کی وفات تک سکریٹری کے عہدہ کی تفویض۔

۱۹۶۱ء

☆ بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کی وفات۔

۱۹۶۲ء

☆ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کی معیت میں کویت کا تین ہفتے کا دعوتی وفکری سفر اور چند اہم امور پر مشتمل امیر کویت شیخ عبداللہ سالم صباح کے نام آپ کا خط۔

☆ شیخ ومرشد قطب الارشاد حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کا لاہور میں انتقال۔

☆ جغرافیہ کے موضوع پر آپ کی شاہ کار تصنیف ”جزیرۃ العرب“ کی پہلی بار اشاعت۔

۱۹۶۳ء

☆ جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ کی دعوت پر محاضرات کے لیے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی رفاقت میں سفر اور حضرت مولاناؒ کے اصرار پر ایک محاضرہ پیش کرنے کا شرف۔

☆ حج بیت اللہ کی سعادت۔

☆ رابطہ عالم اسلامی کا قیام اور حضرت مولاناؒ کی معیت میں آپ کی شرکت۔

☆ ملک فیصل بن عبدالعزیز آل سعود سے ملاقات کے وقت حضرت مولاناؒ کی رفاقت کا شرف۔

☆ متعدد اہم علماء ومقتدر اصحاب سے ملاقات مثلاً: شیخ ابن باز، شیخ عبدالمحسن عباد، شیخ امین شنقیطی، شیخ ناصرالدین البانی، شیخ صالح حصین، شیخ محمد مجذوب اور استاذ محمد اطہار شامی۔

۱۹۶۴ء

☆ لندن کا پہلا سفر اور متعدد دینی ودعوتی کاموں کا قریب سے مشاہدہ وجائزہ۔

۱۹۶۵ء

☆ مشہور تصنیف ”الأدب العربي بين عرض ونقد“ کی پہلی بار طباعت اور کتاب کی نصاب میں شمولیت۔

۱۹۶۷ء

☆ دارالعلوم کے سابق شیخ الحدیث اور آپ کے استاد مولانا سید حمید الدین صاحبؒ کا انتقال۔

۱۹۶۸ء

☆ ۳۰/اگست کو نانی صاحبہ بزرگ وبابرکت ہستی مخدومہ خیر النساء بہترؔ کی رحلت۔

۱۹۶۹ء

☆ والد ماجد کے سفر حج وزیارت میں رفاقت کی سعادت۔

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں طلبہ کی اسٹرائک اور حالات کو نارمل کرنے میں آپ کا کلیدی کردار۔

۱۹۷۰ء

☆ ”كلية اللغة العربية وآدابها“ میں بحیثیت عمید کے تقرر۔

۱۹۷۱-۷۰ء

☆ دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی کا قیام اور عہدۂ صدارت کا قرعہ فال آپ کے نام۔

۱۹۷۳ء

☆ دریائے کابل سے دریائے یرموک تک کے بعض اسفار میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی رفاقت۔

☆ مشہور کتاب ”الأدب العربي وصلته بالحياة“ کی ”الندوة العالمية للأدب الإسلامي“ سے پہلی بار اشاعت۔

☆ ”مختار الشعر العربی“ (حصہ اول) کی کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا (ندوۃ العلماء لکھنؤ) سے پہلی بار اشاعت اور ندوہ کے نصاب میں شمولیت۔

۱۹۷۵ء

☆ پچاسی سالہ جشن تعلیمی ندوۃ العلماء کا انعقاد اور اس میں ذمہ دارانہ شرکت۔

☆ والد ماجد جناب سید رشید احمد حسنیؒ کا ۸۳/سال کی عمر میں انتقال۔

۱۹۷۶ء

☆ خالہ جان مخدومہ حضرت سیدہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ (مؤلفہ زادِ سفر) کا ۷۶ رسال کی عمر انتقال۔

☆ ملک میں ایمرجنسی کا نفاذ اور اس کے بعد حضرت مولانا علی میاںؒ کی رفاقت میں وزیر اعظم اندرا گاندھی سے ملاقات۔

☆ راشٹریہ بھون دہلی میں موریٹانیا کے صدر مختار دل دادا صاحب سے حضرت مولاناؒ کی معیت میں ملاقات۔

۱۹۷۷ء

☆ حضرت مولاناؒ کی رفاقت میں مغرب اقصیٰ (مراکش) کا دو ہفتے کا تاریخی سفر اور ملک شاہ حسن بن سلطان محمد الخامس سے شاہی محل میں ملاقات اور ظہرانہ میں شرکت۔

☆ "رابطة الجامعات الإسلامية رباط" (مراکش) میں شرکت اور نامور مراکشی عالم شیخ محمد الفاسی، استاذ ابوبکر القادری اور دیگر اہم شخصیات سے ملاقات۔

☆ شاہ خالد بن عبدالعزیز آل سعود کی سرپرستی وہدایت پر آل ورلڈ اسلامک ایجوکیشن کانفرنس مکہ مکرمہ میں شرکت۔

☆ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی رفاقت ومعیت میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ وکناڈا کا تاریخی دورہ اور ''دو مہینے امریکہ میں'' کتاب کی تصنیف۔

☆ وزیر اعظم اندرا گاندھی کی تکیہ کلاں آمد اور حضرت مولاناؒ کی معیت میں ان سے ملاقات۔

۱۹۷۸ء

☆ خطیب عرفات وامام حرم مکی شیخ عبدالعزیز بن عبد اللہ بن حسن آل الشیخ کی پہلی بار ندوہ آمد، نمازِ جمعہ کی امامت اور "حفلة التكريم" کا انعقاد۔

۱۹۷۹ء

☆ ماموں زاد بھائی ادیب ومفکر مولانا سید محمد الحسنی بانی ایڈیٹر البعث الاسلامی کا انتقال۔

☆ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی رفاقت میں متحدہ عرب امارات کا سفر اور ابوظہبی کی بڑی شخصیت قاضی القضاۃ احمد عبدالعزیز آل مبارک ودیگر سے ملاقات۔

☆ شارجہ کا سفر، وہاں کے بڑے عالم دین شیخ عبداللہ علی محمود کی میزبانی میں قیام اور اہم شخصیات سے ملاقات۔

☆ ریاض، مدینہ منورہ، جدہ اور مکہ مکرمہ کا سفر اور ڈاکٹر احمد محمد علی کی دعوت واصرار پر "البنك الإسلامي للتنمية" جدہ کی کانفرنس میں شرکت نیز ملک وبیرون ملک کی اہم شخصیات سے تبادلہ خیال میں شرکت۔

۱۹۸۰ء

☆ صد سالہ اجلاس دار العلوم دیوبند میں شرکت۔

۱۹۸۱ء

☆ بین الاقوامی مذکرات ادب اسلامی کا ندوۃ العلماء لکھنؤ میں انعقاد اور ذمہ دارانہ شرکت۔

☆ مذاکرہ ادب اسلامی کی روداد کی تصنیف اور اس کی اشاعت بنام: ''دین وادب''

۱۹۸۲ء

☆ عربی ادب کی نمایاں خدمات کے اعتراف میں انڈین کونسل اتر پردیش کی طرف سے ایوارڈ۔

☆ عربی زبان وادب کی اہم خدمات کے اعتراف واظہار قدر میں صدر جمہوریہ ایورڈ کا اعزاز۔

☆ بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنی بانی وایڈیٹر ماہنامہ رضوان لکھنؤ کی وفات۔

☆ دار المصنفین اعظم گڑھ میں ''اسلام اور مستشرقین'' کے موضوع پر منعقد بین الاقوامی سیمینار میں شرکت نیز ہندو پاک اور ممتاز عرب علماء سے ملاقات۔

☆ الجزائر کا سفر اور عالمی کانفرنس تلمسان میں شرکت، اہل تعلق اور سرکردہ شخصیات سے ملاقات۔

☆ آل انڈیا عربک سیمینار منعقدہ سینٹرل انسٹی ٹیوٹ فار انگلش اینڈ فارن لنگویجز حیدرآباد میں شرکت۔

۱۹۸۳ء

☆ حضرت مولاناؒ کی رفاقت میں لندن کا سفر اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامک سینٹر کے افتتاحی پروگرام میں شرکت

☆ حضرت مولاناؒ کی معیت میں امارات، سعودی عرب اور کویت کا دورہ۔

☆ "مختار الشعر العربي" (حصہ دوم) کی شعبہ عربی ادب سے اشاعت اور نصاب میں شمولیت۔

۱۹۸۴ء

☆ مدارس اسلامیہ کے نصاب ونظام پر ندوۃ العلماء لکھنؤ میں نصاب تعلیم کانفرنس میں ذمہ دارانہ شرکت۔

☆ مکہ مکرمہ میں ادب اسلامی کی اشاعت وفروغ کے لیے بین الاقوامی تنظیم رابطہ ادب اسلامی کی تشکیل اور اس کے سکریٹری جنرل مقرر۔

☆ مولانا محمد ثانی حسنی میموریل سوسائٹی کی تاسیس اور بحیثیت سرپرست آپ کا انتخاب۔

۱۹۸۵ء

☆ امام حرم مکی شیخ عبدالرحمٰن بن عبدالعزیز سدیس کی ندوۃ العلماء میں آمد اور ان سے ملاقات۔

☆ ندوۃ العلماء میں ادبِ اسلامی کے موضوع پر دو روزہ مجلس مذاکرۂ علمیہ میں ایک مفصل رپورٹ کی ترتیب اور ذمہ دارانہ شرکت۔

☆ دارالعلوم تاج المساجد بھوپال میں منعقد علامہ سید سلیمان ندوی بین الاقوامی سیمینار میں شرکت اور سید صاحب کی ادبی خصوصیات پر ایک جامع مقالہ۔

☆ حضرت مولاناؒ کی رفاقت میں دیار یورپ کا چند روزہ سفر۔

☆ حاکم شارقہ امیر شیخ سلطان بن محمد القاسمی اور دیگر اہم شخصیات سے ملاقات۔

☆ عالمی انجمن برائے تحقیقات اسلامی (اسلامک ریسرچ ورلڈ کونسل) لکسمبرگ کے جلسہ میں شرکت۔

☆ ڈاکٹر اسماعیل راجی فاروقی اور ڈاکٹر حسن ترابی اور ڈاکٹر جمال الدین عطیہ ودیگر اہل علم ودانش سے ملاقات۔

☆ ماہر قانون وعظیم خطیب وداعی مشہور اخوانی لیڈر ڈاکٹر سعید رمضان سے ملاقات۔

۱۹۸۶ء

☆ ندوۃ العلماء میں رابطہ ادب اسلامی کا بین الاقوامی اجلاس اور بحیثیت سکریٹری مرکزی دفتر رپورٹ کی ترتیب وتدوین۔

☆ ترکی میں رابطہ ادب اسلامی کی ایک اہم کانفرنس اور شعبۂ برصغیر ومما لک شرقیہ کی رپورٹ کے ساتھ ذمہ دارانہ شرکت۔

☆ ترکی میں رابطہ ادب اسلامی کانفرس کی روداد کی تصنیف بعنوان: "ترکی میں ایک ہفتہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ہمراہ"

☆ ندوۃ العلماء میں امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیل اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کی قیادت میں ایک وفد کی آمد، "حفلة التكريم" کا انعقاد اور اس میں نظامت کی ذمہ داری۔

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھی کی تشریف آوری، دس پندرہ روز کا قیام اور ان کی مجالس علم وعرفان میں آپ کی حاضری۔

۱۹۸۷ء

☆ جے پور میں رابطہ ادب اسلامی کا اجلاس اور اس میں بحیثیت سیکریٹری جنرل کے شرکت۔

☆ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی معیت میں ملیشیا کا ایک ہفتہ کا تاریخی ودعوتی سفر۔

☆ حضرت مولانا کی رفاقت میں انگلستان کا سفر۔

☆ رابطہ عالم اسلامی کی سلور جوبلی میں شرکت۔

۱۹۸۸ء

☆ حضرت مولاناؒ کی معیت میں حجاز مقدس کا سفر اور رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت۔

☆ رابطہ ادب اسلامی کے متعدد جلسوں میں بحیثیت سکریٹری شرکت۔

☆ حضرت مولاناؒ کی معیت ورفاقت میں شیخ احمد خلیفہ سویدی کی دعوت واصرار پر ابوظہبی کا سفر اور جلسوں میں شرکت۔

☆ اسی سفر میں دبئ اور شارجہ کے اہم پروگراموں میں شرکت اور ہندوستان واپسی کے موقع پر ایرپورٹ تک بطور اعزاز واکرام حاکم شارقہ شیخ سلطان بن محمد قاسمی کی ہمراہی۔

۱۹۸۹ء

☆ ترکی میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کے اجلاس میں شرکت اور ایک ہفتہ کا قیام۔

☆ آکسفورڈ لندن کے سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز کی میٹنگ میں شرکت۔

☆ ممانی صاحبہ سیدہ طیب النساء (طیبہ بی) اہلیہ محترمہ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا انتقال۔

۱۹۹۰ء

☆ ۲۷؍جنوری کو رابطہ عالم اسلامی کے ایک اجلاس میں حضرت مولانا کے ساتھ شرکت۔

☆ مولانا ابوالکلام آزاد صد سالہ جشن میں شرکت۔

☆ دینی تعلیمی کونسل کی مجلس عاملہ واراکین عمومی کی میٹنگ میں شرکت۔

☆ "تاريخ الأدب العربي (العصر الإسلامي)" کی پہلی بار كلية اللغة العربية وآدابها (ندوۃ العلماء) سے اشاعت۔

☆ حجاز مقدس کا سفر اور عمرہ کی ادائیگی۔

☆ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے ساتھ رابطہ عالم اسلامی کی کانفرنس میں شرکت اور اہم لوگوں سے ملاقات مثلاً: ڈاکٹر معروف دوالیبی سابق وزیر اعظم شام، مسٹر نجم الدین اربکان ترکی، استاد عبدرب الرسول وزیر اعظم افغانستان۔

☆ رائے بریلی میں "حمد ومناجات" کے موضوع پر بین الاقوامی مذاکرۂ علمیہ کا انعقاد اور اس میں ذمہ دارانہ شرکت۔

☆ علمائے ترکستان کی ندوۃ العلماء آمد اور حضرت مولانا ودیگر ذمہ داروں سے ملاقات، عباسیہ ہال میں وفد کی تکریم میں ایک جلسہ۔

۱۹۹۱ء

☆ آل انڈیا مسلم انٹلکچول فورم لکھنؤ کے ایک عظیم الشان تاریخی اجلاس میں اپنے جامع مقالہ کے ساتھ شرکت۔

☆ بھوپال سیمینار میں ذمہ دارانہ شرکت اور نظامت، دارالتصنیف والترجمہ بھوپال کے افتتاحی جلسہ میں بھی شرکت۔

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں امام مسجد اقصیٰ شیخ محمد محمود الصیام کی آمد اور استقبالیہ کی ذمہ داری۔

۱۹۹۲ء

☆ عالمی رابطہ ادب اسلامی سیمینار کا ندوۃ العلماء میں انعقاد، عرب علماء کی آمد اور آپ کی ذمہ دارانہ شرکت۔

☆ مولانا محمد ثانی حسنی سوسائٹی کے زیر اہتمام عالمی دعوت وفکر اسلامی کانفرنس کا انعقاد اور آپ کی ذمہ دارانہ شرکت۔

☆ رابطہ ادب اسلامی کی تعارفی مہم کا آغاز اور لکھنؤ سے متصل مختلف اضلاع کا دورہ اور خطابات۔

☆ آکسفورڈ اسلامک سینٹر کے جلسہ میں شرکت کے لیے انگلستان کا سفر۔

۱۹۹۳ء

☆ بابری مسجد اور مہاراشٹر وگجرات فسادات کے مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے حضرت مولانا کی رفاقت میں وزیر اعظم ہندوی پی نرسمہاراؤ سے ملاقات۔

☆ بخاریٰ وسمرقند کا تاریخی سفر اور وہاں کے اجلاس میں ایک نشست کی صدارت۔

☆ رودادِ سفر کی تصنیف بعنوان ''سمرقند وبخاریٰ اور اس کی بازیافت'' اوراس کی اشاعت۔

☆ انسٹی ٹیوٹ آف انٹی گرل ٹیکنالوجی لکھنؤ کی تقریب سنگ بنیاد میں شرکت۔

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے عہدۂ اہتمام کی تفویض۔

☆ ندوۃ العلماء میں ایک عظیم الشان اصلاح معاشرہ کانفرنس کا انعقاد اور بحیثیت داعی مہتمم دارالعلوم کے ذمہ دارانہ شرکت۔

☆ رابطہ ادب اسلامی کے سہ سالہ اجلاس میں حضرت مولانا کے ساتھ ترکی کا سفر۔

☆ جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ میں دوروزہ اجتماع اور حضرت مولانا کی رفاقت میں آپ کی شرکت۔

☆ دارالعلوم الاسلامیہ بستی اور دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے پروگرام میں شرکت۔

۱۹۹۴ء

☆ بنگلہ دیش کا سفر اور رابطہ ادب اسلامی کے سیمینار میں شرکت۔

☆ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی معیت میں اسلامک سینٹر آکسفورڈ کے سالانہ جلسہ انتظامی میں شرکت۔

☆ بروکس یونیورسٹی آکسفورڈ کے ہال میں منعقد رابطہ ادب اسلامی کے ایک جلسہ میں شرکت۔

☆ وجدہ (مراکش) میں قیام اور رابطہ ادب اسلامی کے وجدہ یونیورسٹی میں منعقد جلسہ میں حضرت مولانا کی رفاقت میں شرکت۔

☆ چند ایام مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں قیام، عمرہ کی ادائیگی اور متعدد اہم جلسوں میں شرکت۔

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں سی بی آئی کا چھاپہ اور اس پر شدید ردعمل کا اظہار وضروری کارروائی۔

۱۹۹۵ء

☆ کل ہند تحفظ مدارس کانفرنس کا دار العلوم ندوۃ العلماء میں انعقاد۔

☆ اصلاح معاشرہ کانفرنس بستی کا انعقاد اور اصلاح معاشرہ کمیٹی کے کنوینر کی حیثیت سے شرکت اور خطاب۔

☆ ۸؍نومبر کو تحفظ مدارس کانفرنس غازی پور میں شرکت

☆ دارالمصنفین اعظم گڑھ میں منعقد رابطہ ادب اسلامی کے سیمینار میں ذمہ دارانہ شرکت۔

۱۹۹۶ء

☆ رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت، مدینہ منورہ میں قیام اور شرفِ زیارت وسلام۔ نیز شیخ حسن بن یعقوب کتبی حسنی سے مدینہ منورہ کے زمانہ قیام میں ایک خوشگوار ملاقات۔

☆ اہلیہ محترمہ (سیدہ رقیہ حسنی رحمہا اللہ) کا انتقال۔

☆ والدہ محترمہ سیدہ امۃ العزیز رحمہا اللہ کی وفات۔

☆ وزیر اعظم مسٹر دیو گوڑا کی ندوہ آمد اور حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی معیت میں آپ کی ملاقات۔

☆ ترکی میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی شخصیت اور دینی وعلمی خدمات کے موضوع پر منعقد رابطہ ادب اسلامی کے اجلاس میں شرکت۔

☆ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شخصیت وخدمات کے موضوع پر ایک عظیم الشان سیمینار میں شرکت اور خطاب۔

☆ حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی معیت میں سفر حجاز اور کعبہ مشرفہ کے اندر داخل ہونے کا عظیم شرف واعزاز۔

۱۹۹۷ء

☆ آپ کے دورِ اہتمام میں خطیب وامام حرم مکی شیخ محمد بن عبداللہ السبیل کی دارالعلوم ندوۃ العلماء میں آمد اور عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنس برائے امور دعوت وفکر اسلامی منعقدہ بتاریخ

۱۲-۱۳رنومبر میں شرکت۔

☆ رابطہ ادب اسلامی لاہور (پاکستان) میں بین الاقوامی تاریخی سیمینار اور اس میں بحیثیت ذمہ دار شرکت نیز صدر پاکستان سردار فاروق احمد خاں لغاری سے ملاقات۔

۱۹۹۸ء

☆ نائب ناظم ندوۃ العلماء کے منصب کی تفویض۔

☆ حضرت مولانا کی معیت میں علی گڑھ کا ایک سفر اور دینی تعلیمی کانفرنس میں شرکت۔

☆ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی معیت میں منگلور اور بھٹکل کا ایک خوش گوار و مفید سفر۔

☆ رابطہ ادب اسلامی کے اجلاس منعقدہ حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونہ میں بحیثیت سکریٹری وذمہ دار شرکت۔

☆ عمان (مملکت اردنیہ ہاشمیہ) میں منعقد رابطہ ادب اسلامی کی مجلس عاملہ کے جلسہ میں شرکت اور ولی عہد سلطنت امیر حسن بن طلال بن عبداللہ حسنی اردنی سے ملاقات نیز شاہی محل میں امیر حسن کی طرف سے شاندار دعوت۔

☆ مکہ مکرمہ ومدینہ منورہ کی حاضری اور عمرہ کی ادائیگی۔

۱۹۹۹ء

☆ ادب اسلامی کے مذاکرۂ علمیہ منعقدہ بنگلور میں شرکت اور خطاب۔

☆ حضرت مولانا علی میاں کی عیادت کے لیے وزیر اعظم ہند مسٹر اٹل بہاری واجپائی کی اپنے رفقاء کے ہمراہ ندوہ میں حاضری، اس موقع پر آپ کی میزبانی اور حضرت مولانا کی ترجمانی۔

☆ بیعت وارشاد میں حضرت مولاناؒ کے خلیفہ ومجاز۔

☆ ایک اہم کتاب ''امت مسلمہ-رہبر اور مثالی امت'' کی مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے اشاعت۔

☆ حضرت مولاناؒ کا دبئی کا سفر، "جائزة دبئی الدولية" کا اعزاز اور اس یادگار سفر میں حضرت مولانا کے ساتھ آپ کی رفاقت۔

☆ حضرت مولاناؒ کے اعزاز میں سلطان حسن بلقیہ کے نام سے برونائی حکومت کا ایوارڈ اور آپ کو بطور ترجمان لینے کا شرف۔

☆ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات، نماز جنازہ میں لاکھوں فرزندان اسلام کی شرکت اور آپ کی امامت۔

۲۰۰۰ء

☆ ندوۃ العلماء کی نظامت کے عہدۂ جلیلہ ومنصب عالی کی تفویض۔

☆ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ میں بحیثیت رکن انتخاب۔

☆ عالمی رابطہ اب اسلامی کے شعبۂ برصغیر ومما لک شرقیہ کے لیے بحیثیت صدر انتخاب۔

☆ دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش (لکھنؤ) کے عہدۂ صدارت کی تفویض۔

☆ جاپان کا ایک یادگار تاریخی ودعوتی سفر۔

☆ مدرسہ قاسم العلوم ہریانہ میں علماء وطلباء اور غیر مسلموں سے ایک اہم خطاب اور ''افضل انسان'' کے عنوان سے کتابی شکل میں اس خطاب کی اشاعت۔

☆ ساؤتھ افریقہ کا دعوتی سفر اور وہاں کی مختلف عصری دانش گاہوں میں متعدد خطابات۔

☆ حجاز مقدس کا دعوتی سفر ہوا اور عمرہ کی ادائیگی۔

☆ دینی تعلیمی کونسل کانفرنس میں شرکت کے لیے علی گڑھ کا سفر اور صدارتی خطاب۔

☆ کل ہند تحریک پیام انسانیت فورم کے لیے بحیثیت سرپرست انتخاب۔

☆ ''شاہ ولی اللہ ایوارڈ'' بنام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی وصول یابی کا شرف۔

☆ بھٹکل کا سفر اور ''مولانا علی میاں اور بچوں کا ادب'' کے عنوان سے منعقد جلسہ کی صدارت۔

۲۰۰۲ء

☆ قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر عالی مرتبت کے لیے آپ کا انتخاب۔

☆ آپ کی کتاب "أضواء على الأدب العربي" کی رابطہ ادب اسلامی کے شعبہ برصغیر و ممالک شرقیہ کے دفتر سے اشاعت۔

۲۰۰۳ء

☆ سیرت کے موضوع پر اہم ایک کتاب "نقوس سیرت" کی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی میموریل سینٹر حیدرآباد سے اشاعت۔

۲۰۰۴ء

☆ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ بین الاقوامی سیمینار منعقدہ جامعہ اسلامیہ اعظم گڑھ میں شرکت، صدارت اور خطاب۔

۲۰۰۵ء

☆ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اٹھارہویں اجلاس میں تفہیم شریعت کمیٹی کے قیام کا فیصلہ۔

☆ آپ کی تصنیف "مولانا ابوالحسن علی ندوی عہد ساز شخصیت" کی مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے اشاعت۔

☆ ندوۃ العلماء کے کیمپس میں دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے پچاس سال مکمل ہونے پر خصوصی اجلاس کی صدارت اور خطاب۔

۲۰۰۷ء

☆ دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن کی حیثیت سے انتخاب۔

☆ "تیرہویں اور چودہویں صدی ہجری میں ہندوستان میں علم حدیث" کے عنوان پر اعظم گڑھ میں منعقد بین الاقوامی سیمینار میں شرکت، صدارت اور علم حدیث اور ہندوستان کے موضوع پر ایک پرمغز خطاب۔

۲۰۰۸ء

☆ آپ کی شہرہ آفاق تصنیف رہبر انسانیت ﷺ کی دارالرشید لکھنؤ سے اشاعت۔

☆ مرکز الامام ابی الحسن الندوی تکیہ کلاں رائے بریلی کا قیام اور دوروزہ سیمینار کی افتتاحی نشست کی صدارت وخطاب۔

۲۰۰۹ء

☆ جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں شرکت اور صدارتی خطاب۔

☆ بھٹکل میں "تحفظ شریعت واصلاح معاشرہ" کے زیر عنوان تاریخی جلسہ عام میں ہزاروں فرزندانِ توحید سے ایمان افروز خطابِ عام۔

۲۰۱۰ء

☆ دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور کے جشن زریں میں شرکت اور خطابِ عام۔

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا اکیسواں اجلاس اور عیدگاہ عیش باغ لکھنؤ کے اجلاس عام میں صدارت۔

☆ اِرا میڈیکل کالج اینڈ ہاسپٹل لکھنؤ میں منعقد جلسہ میں شرکت وخطاب اور آپ کی خدمت میں میڈیکل کو سپاس نامہ کی پیشکش کا شرف۔

☆ مرادآباد کے لاج پت نگر رام لیلا گراؤنڈ میں پیام انسانیت کے عظیم الشان جلسہ کی صدارت، "انسانیت اور اس کے لیے ہماری ذاتی ذمہ داریاں" عنوان سے خطابِ عام۔

۲۰۱۱ء

☆ بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار میں شرکت کے لیے حیدرآباد کا سفر اور صدارتی خطاب۔

☆ ملک گیر آئینی حقوق بچاؤ تحریک کی کامیابی میں مکمل رہنمائی۔

۲۰۱۲ء

☆ آپ کی دعوت پر امام حرم مکی شیخ خالد بن علی غامدی کی ندوۃ العلماء لکھنؤ آمد اور متعدد جلسوں میں بحیثیت صدر آپ کی شرکت

☆ قرآنیات پر آپ کی اہم ترین تصنیف ''قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل'' کی پہلی بار دار الرشید لکھنؤ سے اشاعت۔

☆ حجاز مقدس کا سفر، عمرہ کی ادائیگی اور مدینہ منورہ حاضری۔ رابطہ عالم اسلامی کے اجلاس میں شرکت، رابطہ کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر عبداللہ عبدمحسن ترکی اور امام حرم مکی شیخ عبدالرحمٰن سدیس سے ایک یادگار ملاقات۔

☆ جدہ میں شیخ عبداللہ علی بصفر یمنی مقیم جدہ سے ملاقات نیز بعض اہم شامی علماء (مثلاً: شیخ سلمان ابوغدہ، شیخ عبد الرحمٰن حلبی، شیخ خالد حکمی اور شیخ احمد باشمیل) سے ملاقات اور ان کی خواہش وطلب پر سند حدیث کی اجازت۔

۲۰۱۳ء

☆ عزیز داماد اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے عظیم استاد داعی اسلام مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ کی وفات۔

☆ تنظیم ابنائے ندوہ کی طرف سے طویل تدریسی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ۔

۲۰۱۴ء

☆ جامعہ علوم القرآن جمبوسر کے سولہویں سالانہ اجلاس میں شرکت اور کلیدی خطاب۔

☆ رہبر انسانیت کے عربی ایڈیشن "سراجاً منیراً" کی مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے اشاعت۔

☆ دار المصنفین اعظم گڑھ میں شبلی صدی تقریبات میں شرکت اور اعزازی تمغہ کا حصول۔

☆ ''قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل'' کتاب کا عربی ترجمہ "الهداية القرآنية سفينة نجاة للإنسانية" کی اشاعت۔

۲۰۱۵ء

☆ ملکی سطح پر دستور بچاؤ تحریک کی کامیابی میں مکمل رہنمائی۔

☆ جنوبی ہند کے متعدد مقامات (بھٹکل، بنگلور، میسور) کا دعوتی واصلاحی سفر۔

☆ آمبور اور میل وشارم (تمل ناڈو) کا سفر، ٹی عبد الواحد اسلامک ریسرچ فاؤنڈیشن آمبور میں خطاب۔

☆ رابطہ ادب اسلامی کے اجلاس میں شرکت اور صدارتی خطاب۔

☆ مجلس تحفظ ختم نبوت حیدرآباد کے جلسہ میں شرکت اور صدارتی خطاب۔

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی کے اجلاس کیرالہ میں شرکت اور افتتاحی نشست کی صدارت نیز اختتامی نشست میں ملک کے طول وعرض سے آنے والے اہل علم وفقہ سے ایک پر مغز خطاب۔

☆ ''شاہ ولی اللہ ایوارڈ'' کے لیے آپ کے نام کا قرعہ فال۔

☆ آل انڈیا پیام انسانیت فورم کا دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں سالانہ کل ہند اجلاس اور صدارتی خطاب۔

۲۱۰۶ء

☆ شیخ صالح آل طالب امام حرم مکی کی آمد اور ان سے ملاقات اور شیخ کا غایت تاثر کا اظہار۔

۲۰۱۷ء

☆ نومبر میں آل انڈیا پیام انسانیت فورم کا سالانہ کل ہند اجلاس منعقدہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں صدارتی خطاب نیز صدارتی خطاب کی ''دعوت وتبلیغ کے رہنما اصول'' کے نام سے ایک رسالہ کی شکل میں اشاعت۔

۲۰۱۹ء

☆ برادر عزیز اور ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم مولانا سید واضح رشید حسنی ندویؒ کا انتقال۔

۲۰۲۱ء

☆ مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کا احیاء اور ارکان کا انتخاب۔

☆ برادر زادہ وعزیز داماد اور ندوۃ العلماء کے ناظر عام ونائب ناظم مولانا محمد حمزہ حسنی ندویؒ کی وفات۔

☆ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے گیارہویں اجلاس عام میں شرکت کے لیے کانپور کا سفر اور زندگی کے آخری اجلاس عام کی صدارت۔

۲۰۲۲ء

☆ ندوۃ العلماء کے مولانا حیدر حسن خان ہال میں ''یک روزہ مشاورتی اجلاس مدارس ملحقہ'' میں صدارتی خطاب۔

☆ مجلس تحقیقات شرعیہ لکھنؤ کے تحت فقہی سیمینار کی صدارت اور صدارتی خطاب۔

۲۰۲۳ء

☆ ''مجموعہ قوانین اسلامی'' کے جدید ایڈیشن کی ترتیب وتدوین میں آپ کی رہنمائی اور ترتیب جدید کے بعد اشاعت۔

☆ فلسطینی وفد کی آپ سے ملاقات کے لیے تکیہ کلاں آمد اور مسئلہ فلسطین پر اظہار خیال۔

☆ بروز جمعرات ۱۳/اپریل مطابق ۲۱/رمضان المبارک کو مہمان خانہ دارالعلوم میں سانحہ ارتحال۔

☆ آبائی وطن تکیہ کلاں رائے بریلی میں روضۂ سید ہدیٰ میں تدفین۔

يا نفس أجملي جزعاً

فإن ما تحذرين قد وقعا

(اے نفس! شورشِ غم پر قابو رکھ، جس بات کا تجھے ڈر تھا وہ بات پیش آچکی)

حضرت مرشد الامت مفکر اسلام کی نظر میں

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

''عزیز موصوف (مولانا سید محمد رابع حسنیؒ) کامیاب استاذ عربی زبان کے ایک ممتاز ادیب باحث ونقاد صاحب قلم اور مصنف ہیں، جن کی کئی تصنیف شدہ کتابیں دارالعلوم کے نصاب میں داخل ہیں، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نائب صدر اور عجمی ممالک کے لیے ذمہ دار اور سکریٹری (ناظم) اور اس کے اہم وفعال رکن اور مشیر ومعتمد ہیں، اس کے ساتھ وہ اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی کی عاملہ کے ممتاز رکن بھی ہیں، جو ہر سال اس کے سالانہ انتظامی جلسہ میں راقم کی رفاقت میں شرکت کے لیے انگلستان جاتے ہیں۔ چاٹگام، استنبول اور سعودی عرب کے ادب اسلامی کے جلسوں میں انہوں نے ذمہ دارانہ اور منتظمانہ کردار ادا کیا ہے، رابطہ کے ہندوستان میں ترجمان، سہ ماہی رسالہ ''کاروان ادب'' کے وہی مدیر مسئول اور روح رواں ہیں، ندوۃ العلماء کے عربی رسالہ ''الرائد'' اور ماہانہ مؤقر رسالہ ''البعث الاسلامی'' کے بھی اہم مضمون نگاروں میں ہیں، ندوۃ العلماء کی فکر خصوصیات وامتیازات اور اس کے علمی ذہنی اور دینی مزاج کے نہ صرف حامل بلکہ اس کے داعی ترجمان اور عملی پیکر بھی ہیں۔'' (کاروان زندگی: ۶/۱۲-۱۳)

شان خط

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محمد الرابع الحسنی الندوی

ندوۃ العلماء - لکھنؤ - الھند

سبحانہ

مکرم و محترم جناب ڈاکٹر عثمانی صاحب زید مجدکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا
کل شام کو آپ عالماً تذکرہ آئے تھے لیکن مجھ سے ملاقات نہیں ہو سکی
یہ بتانا تھا کہ پرسوں الحمد حسن صاحب آئے تھے، انہوں نے کہا کہ آپ حضرات
کے جو مطالبات ہیں وہ جو قابل عمل ہیں وہ ہو جائیں گے، مناسب یہ ہے
کہ وہ مطالبات پہلے دیدیں ان کی تکمیل کر دی جائے گی پھر آپ حضرات
ملاقات کریں وہ ملاقات بہتر ہوگی، نیز اس بات کی تاکید کی
جو کام انجام دیدیا جائے گا ~~اس کو~~ پریس میں اس کا چرچا نہ ہونا چاہئے
اس سے خلوت کو رسوائی پیش آتی ہے۔ اصل ضرورت کام کی
انجام دہی ہے وہ عملی بات ہے صرف اسی حد تک بات رہنا چاہئے
ایسی باتیں پریس میں آنے پر مسائل کھڑے ہونے کی کچی طور پر
ہی رضا چاہئے
لہٰذا آپ بوڑھے میمورنڈم تیار کر کے مولانا سعید الرحمن صاحب کے پاس
بھیج دیں وہ بھجوا دیں گے۔ مجھ کو کل سفر کرنا ہے اور آج رات ہر ہل
جا رہا ہوں اس لئے مولانا سعید صاحب کو دیدیں وہ پوری بات سے
واقف ہیں

والسلام مخلص

[illegible]

۱۳/۸/۲۰۰۶ء

آخری خطاب

بتاریخ: ۸/ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ-۳۱/ مارچ ۲۰۲۳ء (بمقام: مسجد دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں-رائے بریلی)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

الحمد للّٰہ نحمده ونستعينه ونستغفره ونؤمن به ونتوكل عليه ونعوذ باللّٰه من شرور أنفسنا ومن سيئات أعمالنا من يهده اللّٰه فلا مضل له ومن يضلله فلا هادي له، ونشهد أن لا إله الا اللّٰه وحده لا شريك له ونشهد أن سيدنا ونبينا محمدا عبده ورسوله، أما بعد!

حضرات!

ہر وہ کام جو اللہ کے لحاظ سے کیا جائے نیک کام ہے اور وہیں سے وہ کام دین بن جاتا ہے، عربی زبان میں ''دین'' طریقہ عمل کو کہتے ہیں کہ کس طرح آدمی عمل کرتا ہے اور زندگی گذارتا ہے، ہم لوگ بھی عام بول چال میں دین اسی کو کہتے ہیں اللہ کو ایک ماننا، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننا اور اس کے جو احکام ہیں یا جو اللہ تعالیٰ کی باتیں ہیں ان کو اختیار کرنا، اگر کوئی شخص ایسا کرتا ہے تو اسلامی نقطہ نظر سے وہ دیندار ہے ورنہ ہم اسے دیندار نہیں مانتے۔

بعض مرتبہ ہم لوگوں کو بڑی غلط فہمی ہو جاتی ہے، بہت سے اعمال کو ہم دین سمجھتے ہیں حالانکہ وہ دین نہیں ہوتے اور ان پر کسی دوسری چیز کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ اس کو آپ یوں سمجھئے کہ آپ کو کہیں کسی کارخانہ میں ملازمت مل جائے اور کام یہ بتایا جائے کہ تمہیں اس کی نگرانی کرنا ہے، پھر اس پر کارخانہ کے مالک سے معاہدہ بھی ہو جائے، تو اب اگر ہم اب ہم ٹھیک سے کام کریں گے اور بیٹھ کر نگرانی کرتے رہیں گے، تب تو گویا ہم مالک کے حکم کے مطابق کام کر رہے ہیں، ورنہ مالک ہم کو تنخواہ نہیں دے گا اور یہ کہے گا کہ تم نے تو ٹھیک سے کام ہی نہیں، تم تو وہاں بیٹھ کر چائے پیتے رہے، تفریح کرتے رہے اور مزے لیتے رہے، تم نے کام تو نہیں کیا، اس لیے تمہیں تنخواہ بھی نہیں ملے گی۔ ٹھیک اسی طرح ہمیں بھی یہ دیکھنا ہے کہ اللہ کے حکم اور اس کی مرضی کے مطابق ہم نے کیا کیا کام کیے ہیں، ہم کیا کر سکتے ہیں اور ہمیں کیا کرنا چاہیے، ان سب باتوں کا ہم خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔

اس وقت دنیا پر جو چیز غالب اور چھائی ہوئی ہے، وہ صرف اس بات کی فکر ہے کہ ہمیں کیا کھانا ہے اور اپنے بچوں کو کیا کھلانا ہے؟ اسی فکر کے نتیجہ میں ہم یہ سوچتے ہیں کہ ہمیں دنیا میں رہ کر کچھ نہ کچھ کام تو کرنا ہی ہے، اگر آپ غور کریں تو آج ہماری ساری مشغولیتیں اپنی ذات کے فائدہ کے لیے ہیں، یا اپنی اولاد کے فائدہ کے لیے ہیں، آج ہم یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم یہ کام نہیں کریں گے تو ہمیں تنخواہ نہیں ملے گی اور پھر ہم کیسے زندگی گذاریں گے۔ بے شک اس کی فکر کرنا ٹھیک ہے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی اس سلسلہ میں ہماری بڑی رعایت کی ہے، اتنی بڑی رعایت کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بہت سی چیزیں صاف الفاظ میں کہہ دی ہیں کہ ایسا کرو اور ایسا نہ کرو، اللہ نے جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا ہے کہ ایسا کرو وہ فرائض ہیں اور ان کا ترک کرنا گناہ عظیم ہے، لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اگر فرض چھوڑ دیں گے تو اس کا کچھ وبال نہیں ہوگا، یاد رکھو اللہ نے جو باتیں بتائی ہیں ان میں فرائض بھی ہیں، واجبات بھی ہیں اور سنتیں بھی ہیں، فرض کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ اس اللہ کا حکم ہے جو ہمارا آقا و مالک ہے، اگر اس نے کسی چیز کا حکم دیا ہے کہ یہ کام تمہیں کرنا ہے اور یہ کرنا تمہارے لیے ضروری ہے، تو اس کو چھوڑنے پر ہمیں سزا

ہوجائے گی، اس کے بعد واجبات کا درجہ ہے، جن کے ترک پر انسان فرائض کے ترک کرنے کے مقابلہ میں کم درجہ کا گنہگار ہوگا، پھر سنتوں کا درجہ ہے کہ حضور ﷺ نے جس طرح عمل کیا ہے، ہمیں ویسا عمل کرنا ہے، دراصل ہمارا دین جو ہم کو بتایا گیا ہے، وہ یہی ہے کہ حضور ﷺ نے جیسا عمل کیا ہے ویسا عمل ہم خالص اللہ کے لیے کر کے دکھائیں۔ اس کے علاوہ ہمیں کسی اور کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر ہم کسی کو دکھانے کی نیت سے کریں گے تو وہ ہماری ذاتی عمل ہوگا، لہٰذا ہمارا ہر عمل ایسا ہونا چاہیے جس سے اللہ راضی ہو، یہ سب سے ضروری بات ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ ہم نے اپنے وجود کو پوری طرح سمجھا ہی نہیں ہے، ہمارا وجود ایسا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں سب سے بہتر مخلوق بنایا، ساری مخلوقات انسانوں کے بعد ہیں، یہاں تک کہ جنات بھی انسانوں کے بعد ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو دوسری مخلوقات پر فوقیت دی ہے اور ہم کو بڑی مخلوق بنایا ہے، لہٰذا ہمیں بھی اپنے آپ کو بڑے طریقہ ہی سے دکھانا چاہیے، سوچنے کی بات ہے کہ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں بڑی مخلوق بنایا ہے تو ہم چھوٹی مخلوق کی حیثیت سے زندگی کیوں گذار رہے ہیں؟ ہم صرف کھانے پینے ہی کی فکر میں رہیں یا تفریح کی فکر میں رہیں، ظاہر ہے یہ باتیں بڑی مخلوق ہونے کا ثبوت نہیں ہیں، اللہ نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا اور ان سب کو حکم دیا کہ آدم کے سامنے جھک جاؤ، چنانچہ وہ سب جھک گئے، مگر شیطان نے کہا کہ ہم تو انہی کی طرح ایک مخلوق ہیں تو ہم کیوں جھکیں، ہم تو خود ان سے بڑے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم میری جنت سے نکل جاؤ، اسی بنیاد پر شیطان کو حضرت آدم سے بغض پیدا ہوگیا اور اسے خیال ہوا کہ ان ہی کی وجہ سے اس کی رسوائی ہوئی ہے، تو اس نے سازش شروع کی اور یہ صلاحیت بھی اسے اللہ تعالیٰ ہی نے دی ہے، گرچہ اسے ہر چیز کی صلاحیت نہیں دی، جیسا کہ انسان کو بھی بہت سی صلاحیتیں دینے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کی صلاحیت نہیں دی ہے۔ بہرحال شیطان نے اپنی سازش کی صلاحیت کا استعمال کرتے ہوئے حضرت آدم کو رسوا کرنے کی ٹھان لی اور کچھ دن بعد انہیں اس درخت کو استعمال کرنے پر بہکایا جو ان کے لیے ممنوع تھا، شیطان نے یہ پٹی پڑھائی کہ اس کی ممانعت کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے، آپ اسے استعمال کر سکتے ہیں، چنانچہ انہوں نے اس درخت سے کھالیا، اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ہم نے تم کو منع کیا تھا، مگر تم نے ہمارے حکم کا خیال نہیں رکھا، تو اب تم بھی اس جنت سے چلے جاؤ اور عمل کر کے دکھاؤ، تاکہ اس جنت کے دوبارہ مستحق بن سکو، اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام نے توبہ کر لی اور اللہ نے معاف فرمادیا، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ اب تمہاری اولاد کو دیکھا جائے گا کہ وہ ہمارے حکم پر چلتی ہے یا شیطان کے پھندے میں پھنستی ہے، گویا ابن آدم کے امتحان کا یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

ابن آدم کے امتحان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی ایک عمر متعین کر دی ہے، اس لیے کہ سارے انسانوں کا امتحان ایک وقت میں نہیں ہوسکتا تھا، لہٰذا ہر ایک کے لیے ایک عمر مقرر کر دی تاکہ وہ دیکھ سکے کہ بندہ اپنی زندگی میں کیا عمل کرتا ہے، اب جس بندہ کا جتنے دنوں میں جائزہ مکمل ہوجائے اس کی اتنی ہی عمر رکھ دی، کسی کی اکیس سال تو کسی کی چالیس سال، ہمیں جو عمر ملی ہے وہ اسی جانچ کے لیے ملی ہے، تاکہ پتہ چل سکے کہ اس جانچ میں ہم سچے ثابت ہوسکتے ہیں یا جھوٹے، اب اللہ کے تمام احکام اور اس کی کتاب ہمارے سامنے محفوظ وموجود ہے، اللہ نے جو چیزیں ضروری قرار دی ہیں اور جو سنتیں بتائی ہیں ان کو کبھی نہیں بدلا جاسکتا، ہمارا یہ دین آخری دین ہے اور ہمیں یہ بتادیا گیا ہے کہ یہ چیزیں تمہارے لیے مناسب ہیں اور یہ چیزیں نامناسب ہیں۔ اس کے بعد ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اسی طرح کرتے ہیں، اسی طرح سمجھتے ہیں اور اسی طرح مانتے ہیں یا نہیں جیسا اللہ تعالیٰ چاہتا ہے۔ لیکن ہمیں دھیان رہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور اس سے کسی چیز کو چھپایا نہیں جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کو ایسا بنایا کہ اس کے اندر ہر چیز کی

چھاپ آجاتی ہے، جیسے تصویر کے اندر ہر چیز آجاتی ہے، ایسے ہی انسان کے اندر اچھی اور بری بات کی چھاپ آجاتی ہے، یہاں تک کہ دیواروں میں بھی ان اچھی اور بری باتوں کی چھاپ آجاتی ہے، لیکن ہمیں وہ نظر نہیں آتی، وہ نظر کب آئے گی؟ تب نظر آئے گی جب اس دنیا میں ہماری آنکھ بند ہوگی اور ادھر والی یعنی دوسری دنیا کی آنکھ کھل جائے گی، تب ہر شخص دیکھ لے گا اور اسے معلوم ہوجائے گا کہ اس نے دنیا میں کیا عمل کیا ہے اور اس کو جو عمر ملی تھی اس کے اندر اس نے کیا کیا ہے، پھر اللہ تعالیٰ کہے گا کہ یہی تمہاری چھاپ ہے، اب بولو تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ قرآن مجید میں یہ سب باتیں بہت تفصیل سے بیان ہوئی ہیں، بتایا گیا ہے کہ اس وقت انسان سوائے رونے اور افسوس کرنے کے کچھ نہیں کرسکے گا، کیونکہ ہم وہاں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے کہ ہم نے دنیا کے اندر یہ برا کام کیا تھا اور یہ اچھا کام کیا تھا، اس لیے وہاں ہم کوئی جواب نہ دے سکیں گے، وہاں ارشاد ہوگا کہ اسی دن کے لیے ہم نے تمہیں دنیا کے اندر سمجھایا تھا تاکہ تم سنبھل جاؤ اور ہوشیار ہوجاؤ۔

آخرت میں پہنچنے کے بعد اللہ کی طرف سے رعایت کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی، لیکن اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ساتھ بڑی رعایت کا معاملہ رکھا ہے، جس کی سب سے بڑی مثال ''توبہ'' ہے، توبہ واقعی عجیب وغریب چیز ہے، بعض لوگ اس کو بیعت کی شکل میں اختیار کرتے ہیں اور بعض لوگ خود قرآن مجید کے مطالعہ کی روشنی میں اختیار کرتے ہیں، سب کے مختلف طریقے ہیں۔ دنیا میں برے کام کرنے کے نتیجہ میں ہمارے اندر جو بری چھاپ پیدا ہوتی ہے، اس کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ گنجائش رکھی ہے کہ توبہ کے ذریعہ معافی ہوسکتی ہے، جس طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کو قبول کرلیا اور انہیں معاف کردیا، پھر اس کے بعد ان کی نسل کا جائزہ لینے کے لیے ایک نظام بنادیا اور بتادیا کہ جو بھی معافی مانگے گا، ہم اس کو معاف کردیں گے، واقعی اللہ نے ہمارے لیے یہ بڑی نعمت کی بات رکھی ہے، سوچنے کی بات ہے کہ اللہ نے ہمارے لیے کتنی بڑی نعمت رکھی ہے، ورنہ بعض وقت آدمی کا گناہ ایسا ہوتا ہے، جس کی دنیا کے اندر معافی کی گنجائش نہیں ہوتی مگر اللہ اسے بھی معاف کردیتا ہے، اس کی بے شمار نظیریں ہمارے سامنے موجود ہیں، ایک شخص کے متعلق آتا ہے جنہوں نے دوران جنگ معلوم کیا کہ اگر ہم جہاد میں شریک ہوجائیں تو کیا ہم کو جنت مل جائے گی؟ ارشاد ہوا کہ ہاں! اگر تم جہاد میں ایمان کے ساتھ شریک ہوجاؤ تو یقیناً جنت ملے گی، اس وقت وہ کھجور کھا رہا تھا، اس نے وہ کھجور پھینک دی اور ایمان کی حالت میں میدان جنگ کے اندر کود پڑا، پھر وہ راہ خدا میں شہید ہوگیا اور جنت کا مستحق قرار پایا، حالانکہ اس نے اپنی ساری زندگی جاہلیت میں گذاری۔

ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اللہ نے ہم کو جو عمر دی ہے، اس کو ہم نے صحیح صرف کیا یا نہیں، عمر کا صحیح صرف کرنا یہ ہے کہ جو احکام ہم کو دیے گئے ہیں، ان کو ہم نے پورا کیا یا نہیں؟ ان کی ادائیگی میں ہم سے جو کوتاہی ہوئی، اس کے لیے ہم نے اللہ سے معافی مانگی اور توبہ کی کہ نہیں، اسی کے ساتھ یہ امید بھی رکھی کہ نہیں کہ اللہ ہمیں معاف کردے گا۔

ہمارے بعض اعمال ایسے ہوتے ہیں جو دیکھنے میں بڑے اچھے معلوم ہوتے ہیں، لیکن اندر سے خراب ہوتے ہیں، اندر سے ان کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ ان کے ذریعہ اپنی داد یا اپنا کوئی فائدہ مقصود ہوتا ہے، لیکن یہ اس شکل میں ہوتا ہے کہ آدمی سمجھتا ہے ہم نے دوسرے کے ساتھ ہمدردی کردی، ہم نے دوسرے کو فائدہ پہنچادیا اور فلاں اچھا کام کردیا، ظاہر ہے دیکھنے میں وہ کام اچھے ہیں، لیکن بعض مرتبہ اندر سے انا کی بات پیدا ہوجاتی ہے، یہ انا واقعی بڑی تباہ کن چیز ہے، اگر آپ دیکھیں تو ہمارے ہر کام میں کسی نہ کسی شکل میں ''ہم'' ملے گا، ہمیں اسی ''ہم'' پر کنٹرول کرنا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانوں پر رحم کے عجیب وغریب دروازے کھولے ہیں، اس نے دیکھا کہ یہ انسان سچے وعدے تو کرے گا، مگر خلاف ورزی بھی کرجائے گا، شیطان جو اس کے پیچھے لگا ہوا ہے وہ اس کو بہکائے گا اور مختلف ترکیبیں کرے گا، اسی لیے اللہ

نے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا، چونکہ شیطان کا اثر آدمی کی سوچ پر پڑتا ہے، اس لیے ہمیں اپنی سوچ صحیح رکھنی چاہیے اس کا بڑا فائدہ ہوتا ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے زندگی گذارنے کے لیے ہمیں جو احکام دیے ہیں وہ بہت آسان ہیں، حدیث میں آتا ہے کہ جب حضور ﷺ معراج میں گئے، تو وہاں چوبیس گھنٹہ کے اندر پچاس وقت کی نمازیں اللہ کی طرف سے مقرر ہوئیں، پھر آپ ﷺ کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس سے گذر ہوا، تو انہوں نے کہا کہ ہم اپنی امت کو دیکھ چکے ہیں، ہمیں تجربہ ہے کہ آپ کی امت کے لوگ اس سلسلہ میں کوتاہی کریں گے اور اتنا نہیں کرسکیں گے، لہٰذا اللہ سے اس میں رعایت کی درخواست کرلیجیے، چنانچہ آپ ﷺ واپس تشریف لے گئے تو اللہ نے نمازوں میں رعایت فرمادی اور پچاس نمازوں کو پانچ کردیا اور کہا کہ ان پانچ نمازوں کا ثواب پچاس والا ہی ملے گا، بظاہر تم پانچ نمازیں پڑھو گے لیکن حقیقت میں وہ پچاس شمار ہوں گی۔

ہمیں سب سے پہلے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم معلوم کریں کہ اللہ نے کیا چیز ضروری قرار دی ہے اور دینی لحاظ سے کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے، ہم کو یہ بھی معلوم کرنا چاہیے کہ اللہ نے ہم کو کن باتوں سے منع کیا ہے اور کن باتوں کی اجازت دی ہے، اللہ نے ہم کو ساری اچھی چیزوں کی اجازت دی ہے، بشرطیکہ ان میں ملاوٹ نہ ہو۔

دوسری بات یہ کہ یہ دین بہت آسان ہے، چوبیس گھنٹہ میں صرف پانچ وقت کی نمازیں ہیں، اس میں کتنا وقت ہی لگتا ہے اور کون سی دشواری ہوتی ہے، ظاہر ہے نہ کوئی وقت لگتا ہے اور نہ کوئی دشواری ہوتی ہے، اسی طرح اللہ نے ایک نماز کا ثواب دس کے برابر رکھا ہے، اس پر بھی مزید یہ اللہ کا رحم وکرم یہ ہے کہ انسان سے جو کوتاہیاں ہوجاتی ہیں ان کی تلافی کے لیے توبہ رکھی ہے، اگر توبہ نہ ہوتی تو آدمی کے گناہ مٹنا ممکن نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں پر خاص رحم کا معاملہ یہ بھی فرمایا کہ ان کی کوتاہیاں دور کرنے اور ان کی غلطیوں کو معاف کرنے کے لیے کچھ مخصوص مواقع بھی رکھے، جس میں رمضان المبارک کا مہینہ بہت اہم موقع ہے، رمضان کے ذریعہ سے آدمی کی نیکیاں بہت بڑھ جاتی ہیں، نیکیاں کمانے کا اور اپنے گناہوں سے معافی کا اس سے اچھا کوئی موقع نہیں، بارہ مہینوں میں یہ مہینہ بھرپور ہمیں معافی کے مواقع دیتا ہے، بشرطیکہ ہم وہ مواقع حاصل کرنے کی فکر کریں، اس لیے عرض یہ کرنا ہے کہ ہمیں اس مہینہ کی قدر کرنا چاہیے، اس سے جو فائدہ اٹھاسکتے ہوں وہ اٹھانا چاہیے، اس میں ایک رات تو ایسی بتائی گئی ہے جو ایک ہزار مہینہ کی راتوں سے زیادہ افضل ہے، یعنی جو ثواب ایک ہزار راتوں میں مل پائے گا، وہ اس ایک رات میں مل جائے گا، لہٰذا ہم اپنی طاقت کے مطابق عمل کریں، اللہ ہمیں کسی چیز پر زبردستی مجبور نہیں کرتا، ہمارے لیے سب آسان ہے اور جو آسان کام ہیں اللہ نے ہمیں وہی بتائے ہیں، ابھی زندگی باقی ہے، اللہ نے ہم کو موقع دیا ہے اور ہم کو بے شمار دنوں کی عبادت کا ثواب تنہا ایک رات اور ایک مہینہ میں حاصل ہورہا ہے، اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

صلى الله تعالىٰ على نبينا وحبيبنا ومولانا محمد وبارك وسلم كثيرا كثيرا كثيرا، كفى بك وليا وكفى بك نصيرا يا أكرم الأكرمين ويا أرحم الراحمين، رب اغفر وارحم، اللهم إنك تعلم ما لا نعلم، إنك أنت الأعز الأكرم وأنت العلي الأعظم!

متکلم اسلامؒ کے حقیقی جانشین

اللہ رب العزت نے مخدوم ومکرم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے ذریعہ ندوۃ العلماء کو حضرت مولانا علی میاں ندوی قدس اللہ سرہ کے خطوط پر پورے اعتدال، ہر طرح کی میانہ روی اور حکمت وفقاہت کے ساتھ جاری رکھا، بلاشبہ یہ پوری امت کے لیے باعث مسرت ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ
(مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

حشر تک اب زباں نہ کھولیں گے
تم پکاروگے ہم نہ بولیں گے

یہ خبر گویا ایک بجلی بن کر گری جس نے قلب وذہن کو بری طرح متاثر اور جسم کو نڈھال کر دیا کہ استاذ محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ۱۲/ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳/ اپریل ۲۰۲۳ء بروز جمعرات بعد نماز ظہر اس جہانِ فانی سے دارِ بقاء کو کوچ کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

حضرت مولاناؒ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں تقریباً ایک ہفتہ سے علاج ومعالجہ کی غرض سے تکیہ رائے بریلی سے آکر مقیم ہوگئے تھے، حضرت کو نزلہ زکام اور بخار کی شکایت تھی جو عام طور سے عمر کے آخری مرحلہ میں لاحق ہو ہی جاتی ہے، لیکن یہ اندازہ نہیں تھا کہ حضرت مولانا اتنی جلدی ہم لوگوں کو داغ مفارقت دے جائیں گے، حادثہ والے دن ظہر کے بعد راقم الحروف حضرت ہی کے پاس تھا، حضرت اپنے بستر پر خاموش لیٹے ہوئے تھے، گویا آپ پر غشی طاری ہو، جیسے ہی میں حضرت کی قیام گاہ سے نکل کر گھر پہنچا تو یہ اندوہناک خبر موصول ہوئی، سن کر جگر پارہ پارہ ہوگیا۔لیکن ہونی کو کون ٹال سکتا ہے؟! بقول ایک عربی شاعر:

یا نفس أجملی جزعاً
فإنك ما تحذرین قد وقعا
موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ہمارے شیخ مفکر اسلام حضرت علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ کے سچے جانشین اور خلیفہ تھے، حضرت مفکر اسلام رحمہ اللہ کے رحلت فرما جانے کے بعد حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی کو ندوۃ العلماء کے تمام انتظامی امور اور تعلیمی سرگرمیوں کی ذمہ داری سپرد کر دی گئی، جس کو انہوں نے بڑی خوش اسلوبی، تن دہی اور کامیابی سے انجام دیا، یہ اس لیے ممکن ہوا کیونکہ مولانا رابع صاحب ہمارے حضرت مفکر اسلام ہی کے تربیت یافتہ اور فیض یافتہ تھے، حضرت ہی کے سامنے مولانا نے اپنا علمی سفر طے کیا تھا، مولانا بچپن سے لے کر حضرت مفکر اسلام کی وفات تک ان ہی کے دامن سے وابستہ رہے، مولانا کو حضرت مفکر اسلام کی تمام تر توجہ اور شفقت حاصل رہی، جس نے ان کو اس قابل بنا دیا کہ تمام علمی ودینی کاموں کو سرانجام دے سکیں اور حضرت مفکر اسلام کی نیابت کا حق ادا کر سکیں۔

حضرت مولانا رابع حسنی قدس سرہ کی شخصیت ایک ہمہ جہت اور ہشت پہل شخصیت تھی، حضرت مولانا جہاں ایک جانب عالم ربانی، دینی رہنما، بہترین اور مشفق استاذ، واعظ ومبلغ، پختہ صاحبِ قلم اور ایک تجربہ کار منتظم تھے، تو دوسری جانب پاکیزہ اور عمدہ اخلاق وکردار کے مالک تھے، حضرت مولانا تقریباً ۲۳/سال تک ندوۃ العلماء کے نظامت کے عہدہ پر فائز رہے، اسی طرح مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت بھی آپ ہی کے کاندھوں پر تھی اور بالاتفاق ۲۰/ سال کے طویل عرصہ تک مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب ہوتے رہے، علاوہ ازیں دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کی صدارت، عالمی رابطہ ادب اسلامی کی صدارت اور اس کی تمام تر سرگرمیاں آپ ہی

کی زیرنگرانی انجام پارہی تھیں، آپ کے اندر سمندر کا سا سکوت، زمین کی سی تواضع اور پہاڑ جیسی قوت واستقامت اور آسمان کی طرح بلند ہمتی تھی، یہ خصوصیات آپ کو اپنے ہم عصروں سے ممتاز کرتی تھیں اور آپ کے دور میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جس میں یہ صفات وامتیازات موجود ہوں۔

حضرت مولانا کی زندگی کا مشن دعوت واصلاح، تعمیر انسانیت اور اس کی فلاح و بہبود تھا، آپ اس پیغام کو عام کرنے اور اس مشن کی کامیابی کے لیے مختلف طریقے اختیار کرتے، جن میں تصنیف وتالیف، وعظ ونصیحت، درس وتدریس اور صحافت قابل ذکر ہیں، آپ کی بہت سی خصوصیات میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ آپ ماہر نفسیات تھے، سامع اور مخاطب کی نفسیات سے واقف ہوتے، پھر اس کے مطابق ان سے گفتگو فرماتے، قوم وملت اور امت مسلمہ کے احوال سے باخبر رہتے، آپ نے بہت سے ملکوں کا سفر کیا، بہت سے علاقوں کی خاک چھانی، وہاں کے حالات سے واقف ہوئے اور ان کا گہرائی سے مطالعہ کیا، آپ کے خطبات اپنے موضوع پر آپ کے وسیع تجربات کی عکاسی کرتے تھے، لہٰذا جو کوئی بھی آپ سے ملاقات کرتا یا آپ کے کلام اور خطاب کو سنتا تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔

ندوۃ العلماء میں قیام کے دوران مہمان خانہ میں حضرت کی علمی و اصلاحی مجلسیں منعقد ہوتیں، جن میں دارالعلوم کے اساتذہ وطلباء شرکت کرتے، میں بھی ان مجالس کے سننے والوں اور استفادہ کرنے والوں میں ہوتا، یہ مجالس کا سلسلہ کوئی نیا نہیں تھا، اس سے قبل حضرت مفکر اسلام علیہ الرحمہ اساتذہ، طلبہ اور عوام الناس کے افادہ کے لیے اس طرح کی مجالس کا انعقاد کرتے، ان علمی و دینی مجالس میں شہر لکھنؤ کے علماء ودانشوران علمی وروحانی استفادہ کی غرض سے حاضر ہوتے، حضرت مفکر اسلام کے بعد جب حضرت مولانا محمد رابع حسنی صاحب ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہوئے تو آپ نے بھی اس سلسلہ کو باقی رکھا، بسا اوقات حضرت مولانا کی ان مجالس میں دینی، علمی، اصلاحی یا حدیث شریف کی کوئی کتاب پڑھی جاتی، جس کی آپ تشریح فرماتے اور زیادہ تر حضرت مولانا حاضرین مجلس کے سامنے دینی واصلاحی گفتگو فرماتے، جس میں بڑی تاثیر ہوتی۔

راقم الحروف پر اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل رہا کہ میرا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک طالب علم کی حیثیت سے ۱۹۵۱ء میں داخلہ ہوا، پہلے ہی دن سے میرا استاد محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے تعارف اور تعلق قائم ہوگیا، الحمد للہ پھر یہ تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا اور حضرت مولانا کی زندگی کے آخری سانس تک تقریباً ۷۵/ سال کی طویل مدت تک یہ تعلق باقی رہا، اس طویل مدت کے درمیان راقم استاد محترم کی خدمت میں ایک محبّ، مسترشد اور طالب علم کی حیثیت سے حاضر ہوتا رہا اور ان کے علمی اور انتظامی کاموں میں تعاون کرتا رہا، میں نے حضرۃ الاستاذ سے تخصص فی الادب کے پہلے سال میں ابوالفرج اصفہانی کی کتاب "رنات المثالث والمثانی" (یہ اغانی کی تلخیص ہے) پڑھی، استاد محترم کے پڑھانے کا انداز اور اسلوب بڑا ہی دلکش اور خوبصورت ہوتا، درس کے دوران جب حضرت مولانا کلمات اور مفردات کی تشریح کرتے، تو ان کلمات کی فقہ اور اس کی گہرائی میں چلے جاتے۔

ایک مرتبہ درس میں "حِین" کا لفظ آیا، وقت کے معنی میں، اس کلمہ کے ضمن میں حضرت نے فرمایا: "حَان - یَحِین - حِیناً" (مصدر 'ح' کے کسرہ کے ساتھ) کے معنی قریب ہونے کے ہیں، مثلاً: حانت الصلوۃُ، یعنی نماز کا وقت قریب ہوا اور "حِین" کی جمع ہے "أحیان" عربی شاعر نے کہا ہے:

و أحیاناً علی بکر أخینا
إذا ما لم نجد إلا أخانا

اور "حَان - یحِین - حَیناً" ('ح' کے فتح کے ساتھ) اس کے معنی ہلاک ہونے کے ہیں، (الحین بفتح الحاء الهلاك والدمار) عربوں کا قول ہے:

"نحن فی ید الحَین بین البحرین."

(ہم سمندر کے درمیان موت کے منھ میں ہیں)

اوراسی طرح عرب استعمال کرتے ہیں:

"حیّنه اللّٰهُ تعالیٰ."

جس وقت حضرۃ الاستاذ نے منثورات کی تالیف کا کام شروع کیا تو انہوں نے راقم الحروف پر یہ ذمہ داری ڈالی کہ میں کتاب میں آنے والے مشکل الفاظ کی لغوی تشریح کروں، لہٰذا راقم نے الحمدللہ اس ذمہ داری کو استادمحترم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے مکمل کیا، یہ کام اب تک کتاب کے حاشیہ میں موجود ہے، راقم الحروف مجلّہ ''البعث الاسلامی'' (۱۹۵۵ء) کے ندوۃ العلماء سے نکلنے کے وقت حضرۃ الاستاذ کی حوصلہ افزائی اور تعاون کو کبھی نہیں بھلاسکتا، حضرت مولانا میری اور میرے رفیق محترم مولانا سید محمد الحسنیؒ کی مکمل رہنمائی فرماتے، اسی تعلق اور محبت وشفقت کی بنا پر ''البعث الاسلامی'' کو پہلے ہی دن سے حضرۃ الاستاذ کا مکمل تعاون وتائید حاصل رہی، اس مجلّہ میں حضرۃ الاستاذ کے بہت سے علمی وادبی مقالات نشر ہوئے ہیں، اگران کو کتابی شکل دی جائے تو ایک قیمتی اور ضخیم کتاب منظرعام پر آجائے، آخری چند سالوں میں قارئین کی پسند اور ان کے نفع کی خاطر حضرت کے مختلف موضوعات پر مقالات شائع ہوتے رہے، ان میں بعض ترجمے اور بعض اصل عربی ہی میں ہوتے۔

حضرۃ الاستاذ کی تجویز پر ۱۹۵۹ء میں صحیفہ ''الرائد'' کا اجراء عمل میں آیا، وہی اس کے مؤسس اور سب سے پہلے ایڈیٹر تھے، لہٰذا حضرت نے راقم کو اس کے مساعدین اور مشورہ کمیٹی میں رکھا اور اس بات کا مکلّف بنایا کہ راقم ''الرائد'' کے لیے کوئی تحریر یا طلبہ کے کالم "صفحة الشباب" میں کوئی قصہ نقل کردے اور جس وقت حضرت مولانا صحیفہ الرائد کے ایڈیٹر ہوئے تو راقم الحروف کو حضرت نے نائب ایڈیٹر بنایا، یہ حضرت کی انتہائی شفقت اور محبت کی بات تھی، اس پر میں اللہ تعالیٰ کا شکرگزار ہوں، راقم مسلسل اس صحیفہ کے نکلنے کے پہلے ہی دن سے اس میں لکھتا آیا ہے اور حضرت نے راقم کے لیے "کلمة الرائد" کے نام سے ایک خاص کالم مقرر کردیا تھا، یہ ''الرائد'' میں ایک مشہور کالم ہے، جو بھی الرائد کا مطالعہ کرتا ہے وہ اس کالم سے بخوبی واقف ہے۔

حضرۃ الاستاذ کی پوری زندگی قوم وملت اور امت مسلمہ کی فکر وتڑپ میں گزری۔ حضرت کے کارہائے نمایاں کی ایک لمبی فہرست ہے، کس کس کا تذکرہ کیا جائے، حضرت کی تو پوری زندگی ہی علمی وعملی سرگرمیوں اور عظیم کارناموں سے بھری پڑی ہے، راقم الحروف کی خوش قسمتی ہے کہ حضرت نے راقم کی بہت سی تصنیفات پر اپنا قیمتی مقدمہ تحریر فرمایا، خصوصاً راقم کی کتاب "شعراء الرسول فی ضوء الواقع و القریض" جس کو راقم نے ڈاکٹریٹ کے مقالہ کے طور پر لکھا تھا اور جس کے حضرت مشرف بھی تھے، حضرت نے راقم الحروف کو یہ شرف بخشا کہ راقم حضرت کی بعض کتابوں پر بطور مقدمہ کچھ تحریر کرے، لہٰذا تعمیل حکم میں راقم نے حضرت کی بعض قیمتی کتابوں پر بطور تعارف کے بعض کلمات لکھے، یہ تمام کتابیں طبع ہوکر منظرعام پر آچکی ہیں، راقم الحروف نے حضرت کی ایک مشہور ومعروف کتاب -جس کی اہل علم کے یہاں بڑی پذیرائی ہوئی- پر بھی ایک تحریر قلمبند کی تھی، وہ کتاب ''قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل'' کے نام سے ہے اور کئی زبانوں میں اس کے ترجمے اور کئی کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں، اس کا ایک اقتباس راقم یہاں قارئین کے سامنے پیش کرتا ہے:

''ہر زمانہ میں ایسے علماء وفضلاء کا ظہور ہوتا رہا ہے جو عربی زبان کے ماہر اور قرآن پاک کے معانی ومطالب سے گہری واقفیت رکھتے تھے، لوگ ان کو عزت واحترام کے ساتھ ہاتھوں ہاتھ لیتے اور ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور ان کی بیان کردہ تشریحات' اشارات اور معانی ومطالب سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں، سورتوں اور آیات کے شان نزول سے واقف ہوتے اور ان مفاہیم ومطالب کی عملی تطبیق سے واقف ہوتے، جس پر ان کا کلام مشتمل ہوتا، اس آخری

دور میں بھی قرآن پاک کی فضیلت، عظمت و بلندی اور تفسیر و شروحات پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں، جن میں حضرۃ الاستاذ کی یہ قیمتی کتاب بھی ہے، جو قرآن پاک سے متعلق ہے، جس کو حضرت نے مفسرین کی آراء اور اقوال کی روشنی میں اور دعوتی نقطہ نظر سے تحریر فرمایا ہے، اسی طرح ایمان و اسلام کا صحیح مفہوم ایسے علمی افکار و اقوال کی روشنی میں پیش کیا ہے جس سے دین کو سمجھنا بہت آسان ہو جاتا ہے، جس کو پڑھنے کے بعد دلوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری اور قرآن پاک سے تعلق و محبت اور احکام الٰہی پر عمل کرنے کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔''

(مقدمہ کتاب ص:۱۳-۲۳، مطبع دار القلم)

ندوۃ العلماء نے حضرۃ الاستاذ کی زندگی میں نمایاں شہرت حاصل کی، ندوہ کا پیغام اور اس کی آواز تمام براعظموں میں پہنچی اور اس کا دائرہ عمل وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، یہاں تک کہ آپ کے دور نظامت میں دار العلوم ندوۃ العلماء سے فارغ ہونے والوں کی تعداد میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا، حضرت مولانا ہمیشہ طلبہ کی دینی تربیت اور اسلامی ثقافت سے آراستہ ہونے پر اپنی پوری توجہ مرکوز کرتے، وقتاً فوقتاً ہمارے حضرت دار العلوم کے طلبہ کو بحیثیت مہتمم راقم کے مشورہ سے ندوۃ العلماء کی جامع مسجد میں جمع فرماتے اور طلبہ کے سامنے بڑی فکر مندی اور دل سوزی کے ساتھ قیمتی خطاب کرتے، جس میں بڑی تاثیر ہوتی، بات سادہ ہوتی، لیکن دلوں میں اترتی چلی جاتی۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

کبھی کبھی حضرت مولانا دار العلوم کے اساتذہ کو جمع کر کے ان سے گفتگو فرماتے اور طلبہ کی تعلیم و تربیت اور نگہداشت سے متعلق ذمہ داریاں سپرد کرتے، فرماتے کہ

''اساتذہ اپنی ذمہ داری سے غفلت نہ برتیں، ان طلبہ کو ان کے والدین نے ہمارے بھروسے یہاں بھیجا ہے، ہم ہی ان کے استاد ہیں اور ہم ہی ان کے والدین بھی ہیں، والدین کی جو ذمہ داری ہوتی ہے، اس سے کہیں زیادہ ہماری ذمہ داری بنتی ہے۔''

آپ کا دور نظامت بلاشبہ اپنے عہد کا ایک زریں باب ہے، حضرت مفکر اسلام مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کے رحلت فرما جانے کے بعد حضرۃ الاستاذ کی نظامت کا دور شروع ہوا، آپ نے حضرت مفکر اسلام ہی کے نقش قدم پر چل کر دکھایا، آپ نے اپنے دور نظامت میں کبھی ایک نیا پیسہ بطور تنخواہ نہیں لیا، آپ نے پوری زندگی ندوۃ العلماء اور اس کی ترقی کے لیے وقف کر دی، آپ کو دنیا کی آرائش و زیبائش کبھی اپنی طرف مائل نہ کر سکی، آپ دنیا کے مال و متاع سے بیزار رہنے والے تھے، آپ ایک مثالی نمونہ اور بقیۃ السلف تھے، آپ نے پوری زندگی بڑی سادگی کے ساتھ گزار دی، یہاں تک کہ وقت موعود آ پہنچا اور آپ اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

جیسے ہی حضرت کی وفات کی خبر پھیلنا شروع ہوئی، لوگوں کا ہجوم ندوۃ العلماء کی جانب تیزی سے بڑھنا شروع ہو گیا، دیکھتے ہی دیکھتے احاطہ دار العلوم میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی، نماز جنازہ کا وقت تراویح کی نماز کے بعد کا طے ہوا، حضرت کے محبین، متوسلین، شاگرد اور عوام الناس ہزاروں کی تعداد میں نماز جنازہ میں شرکت کے لیے حاضر ہو گئے، تقریباً شب کے ساڑھے دس بجے راقم الحروف کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی گئی، اس کے بعد جنازہ دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ رائے بریلی لے جایا گیا، جہاں صبح آٹھ بجے آپ کی دوسری نماز جنازہ پڑھی گئی، پھر خاندانی بزرگوں کے پہلو میں آپ کی تدفین عمل میں آئی۔

هيهات لا يأتي الزمان بمثله
إن الزمان بمثله لبخيل

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ترجمانی: محمد سلمان بجنوری ندوی

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

حضرت مولانا قمر الزماں صاحب الہ آبادی مدظلہ
(دار المعارف الاسلامیہ-الہ آباد)

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ہندوستان کی وہ مایہ ناز شخصیت تھی جن کی بزرگی، اخلاص وللّٰہیت، نام ونمود سے دوری اور دین وملت کی بے لوث خدمات کا اعتراف سب نے کیا ہے۔

ماشاء اللہ مولانا محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اس دور قحط الرجال میں شفقت ومحبت، عاجزی وانکساری، اتحاد واتفاق، بردباری وتحمل کا عملی نمونہ اور سلف صالحین کی ایک یادگار تصویر تھی۔

اپنی خوش نصیبی ہے کہ آپ سے اور آپ کے برادر عزیز حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ ہی سے ربط وتعلق رہا، جب حضرت مولانا علی میاں قدس سرہ کے یہاں جانا ہوتا تو یہ دونوں بھائی خاص خیال رکھتے تھے اور بعد میں یہ تعلقات اور زیادہ بڑھ گئے، بے انتہا لطف وکرم کا معاملہ فرماتے تھے۔

الحمد للہ اس حقیر کی کتابوں کو بے حد پسند فرماتے تھے اور تقریظات وتاثرات بھی ارقام فرماتے رہتے تھے، ایک مرتبہ فرمانے لگے: ”مولانا آپ کی کتابیں تو مراجع میں سے ہوجائیں گی۔“

دار العلوم ندوۃ العلماء کی مجلس شوریٰ میں مولانا محمد رابع صاحب ہی نے اس حقیر کو شریک کیا اور مجلس شوریٰ میں ہمیشہ اپنے پاس بٹھاتے تھے اور اس حقیر ہی سے مجلس شوریٰ میں بیان کی فرمائش کرتے تھے۔ فللّٰہ الحمد والمنة!

آپ ضلع رائے بریلی تکیہ کلاں کے ایک مشہور دینی، علمی اور روحانی خانوادہ میں ۲۵/جمادی الثانیہ ۱۳۴۸ھ مطابق ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے۔ آپ حضرت مولانا سید عبد الحی حسنیؒ کے نواسے اور مولانا سید خلیل الدین حسنیؒ کے پوتے ہیں، آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی سید رشید احمد حسنی اور والدہ کا نام سیدہ امۃ العزیز ہے، جو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی بڑی ہمشیرہ ہیں۔

ماشاء اللہ آپ کا پورا خاندان متدین، متواضع، خوش اخلاق، اتحاد واتفاق اور الفت ومحبت میں ”رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ“ کا حقیقی مصداق ہے۔

آپ کی تعلیم وتربیت میں آپ کے دونوں ماموں ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ اور حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کا خاص تعاون رہا تھا، خاص طور سے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی نگاہِ شفقت ومحبت آپ کی صلاحیتوں کو نکھارنے اور آپ کی شخصیت کو سنوارنے میں معین رہی۔

حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ان پر بہت اعتماد وبھروسہ تھا، ہر اعتبار سے اپنے کاموں اور مشوروں میں ان کو شریک رکھتے تھے۔ فللّٰہ الحمد والمنة!

خود مولانا محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں کہ ”مجھ کو اپنے ماموں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی اور سرپرستی کا زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہوا اور ان کے کاموں میں شریک رہنے سے ان کے اطمینان اور رضا مندی کی سعادت حاصل ہوئی۔“

ملکی وبیرونی اسفار میں بطور رفیق وخادم ساتھ رہتے تھے، یکم مئی ۱۹۹۹ء کو ان کی طرف سے اجازت وخلافت حاصل ہوئی، ان کی وفات کے بعد مختلف ملکی اداروں کی سربراہی اور غیر ملکی اداروں کی

رکنیت میں ان کی جگہ حاصل ہوئی اور سبھی حلقوں نے ان کو بالاتفاق جانشین تسلیم کیا، ۲۰۰۰ء سے ندوۃ العلماء لکھنؤ کی نظامت اور ۲۰۰۲ء سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے عہدہ پر تادم حیات فائز رہے، حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد مولانا سید بلال حسنی ندوی دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظم اور مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی ناظر عام کے عہدہ پر فائز ہوئے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان عزیزوں کو خدمات دینیہ وعلمیہ کو بحسن وخوبی انجام دینے کی توفیق مرحمت فرمائے اور صدیق مکرم حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء کو صحت وعافیت عطا فرمائے۔ آمین!

مولانا کی جدائی سے یہ حقیر مع غلام زادے (مولوی سعید احمد قاسمی ندوی، ومولوی عزیز احمد قاسمی، ومولوی محبوب احمد ندوی، ومولوی عبداللہ قاسمی، ومولوی عبید اللہ ندوی) حزین وغم گین ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مولانا کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، درجات عالیہ سے نوازے اور جملہ اعزہ واقارب اور متعلقین ومنتسبین کو صبر وسکون کی نعمت سے نوازے۔

آمین یارب العالمین!

نیک صحبت کی ضرورت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

’’اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جہاں عقل کی دولت عطا کی ہے کہ وہ اپنی ذات اور اپنے ماحول کے معاملات اور حالات کو ان کی مختلف نوعیّتوں کے لحاظ سے سمجھ سکیں اور ضرورتوں کے مطابق تدابیر طے کر سکیں، وہاں ان کو یہ مزاج بھی دیا ہے کہ وہ اپنے مشاہدات اور معلومات سے اثر لیں، کسی کو اچھا کرتے دیکھیں تو اپنے دلوں میں اس کی اچھائی کے اختیار کرنے کی خواہش محسوس کریں اور کسی کو برا کام کرتے دیکھیں تو اس کی برائی سے اپنی طبیعت میں بیزاری محسوس کریں۔

انسانوں کی یہی صفت ہے جو انسانوں کو بہت سی برائیوں سے روکتی اور بچاتی ہے، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آج تک انسان اس بات پر عامل ہے کہ اپنے جسم کے بعض خاص حصوں کو ضرور چھپائے، ان کے نہ چھپانے کو وہ برا سمجھتا ہے، خواہ وہ مذہب کو مانتا ہو نہ مانتا ہو، یہ کیوں ہے؟ یہ درحقیقت بچپنے ہی سے یہ محسوس کرنے سے ہے کہ لوگ اس کو برا سمجھتے ہیں اور یہ کہ کوئی شخص ایسا نہیں کرتا۔ اسی طرح جھوٹ بولنا‘ چوری کرنا اور اسی طرح کی دوسری باتیں ہیں جن کو معاشرہ میں سب ہی برا سمجھتے ہیں اور گریز کرتے ہیں، جھوٹ بولنے والا بھی اپنے دل میں محسوس یہی کرتا ہے کہ اس نے برا کام کیا، لیکن سوسائٹی میں جب کوئی گناہ یا بدمعاشی کا کام عام طریقہ سے کیا جانے لگتا ہے اور کوئی اس کو برا نہیں سمجھتا، تو اس کی برائی سوسائٹی کے افراد کے دلوں سے نکل جاتی ہے اور کا کرنے والا دل میں بھی اس کی برائی محسوس نہیں کرتا۔ لہٰذا یہ بہت ضروری ہے کہ اچھا ماحول بنایا جائے، جس میں ہر ایک کو اچھائی کی اچھائی اور برائی کی برائی صاف نظر آئے، تاکہ برائی سے گریز کرنے اور اپنے کو اس سے دور رکھنے کا خیال ہر شخص کے دل میں آئے اور اپنے اس مزاج کی وجہ سے جو اس میں فطری طور پر پایا جاتا ہے اس سے بچ سکے۔ اس کے لیے اصل بات تو یہ ہے کہ ایسا ماحول بنایا جائے اور یہ نہ ہو رہا ہو تو صالح انسانوں کی طرف سے کی جانے والی مجالس سے یہ حاصل کیا جائے۔ نیکی اور اچھے کردار کی طرف متوجہ کرنے والی مجالس سے غیر معمولی فائدہ حاصل ہوتا ہے اور زندگیاں سدھر جاتی اور بن جاتی ہیں۔ لیکن ان مجالس سے فائدہ ان میں آکر شریک رہنے اور وقت گذارنے سے ہوتا ہے اور یہ بات ہر ایک کو میسر نہیں ہو سکتی، فاصلے بھی مانع ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں اس کا بدل یہ ہے کہ اچھے ماحول کے حالات کو سنا جائے اور کتابوں میں ان کے مندرجات کا مطالعہ کیا جائے، اس سے بھی ایک گونہ وہی فائدہ ہوتا ہے جو نیک لوگوں کی مجالس میں شرکت سے ہوتا ہے۔‘‘ (ماخوذ از مقدمہ اقوال سلف: ۶/۲۱-۲۲)

تعزیتی مکتوب

حضرت مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی مدظلہ
(معتمد تعلیم ندوۃ العلماء-لکھنؤ)

برادر عزیز محترم مولانا سید بلال حسنی ندوی (ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء-لکھنؤ)

وعزیزی محترم مولانا سید جعفر مسعود حسنی ندوی (ناظر عام دار العلوم ندوۃ العلماء-لکھنؤ) حفظکم اللہ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اچانک ۲۱ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ کو مرشد امت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ ناظم ندوۃ العلماء کے حادثہ کی خبر نے دل ودماغ میں ایسی کیفیت پیدا کردی ہے، جس سے ان کے تعلق کا اندازہ ہورہا ہے، شاید ہی کوئی لمحہ بیداری کا ایسا گذر رہا ہے جس میں ان کا خیال نہ ہو، اس حادثہ فاجعہ سے آپ دونوں حضرات اور پورے خاندان' دار العلوم ندوۃ العلماء و متعلقین اور پوری ملت اسلامیہ کو جو صدمہ پہنچا ہے وہ نا قابل بیان ہے، گرچہ حضرت مولانا نور اللہ مرقدہ کو اللہ تعالیٰ نے طویل عمر عطا فرمائی۔

حضرت مولاناؒ کو حضرت مولانا علی میاں ندوی نور اللہ مرقدہ کے بعد ندوۃ العلماء کی نظامت اور اس کشتی کی بادبانی کے لیے ۲۳ر سال کا عرصہ دیا گیا، دار العلوم ندوۃ العلماء کی ترقی کا آغاز حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ سے شروع ہوا، مجھے وہ وقت یاد ہے جب دونوں بورڈنگ کے طلبہ کی تعداد ۷۰-۷۵ر تھی، یہ میری طالب علمی اور ابتدائی مدرسی کا زمانہ ہے، لیکن حضرت مولانا علی میاں صاحب نور اللہ مرقدہ کی مساعی اور برکتوں سے اور ان کے رفقاء وتلامذہ جو اس میر کارواں کے ساتھ وابستہ تھے، دار العلوم ندوۃ العلماء نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے عالم عربی اسلامی کی عظیم الشان درس گاہ بن گیا اور حضرت والا کے اس دنیا سے رخصت ہونے کے بعد جو خلا پیدا ہوا وہ ان کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب نور اللہ مرقدہ سے پر ہوا اور ان کے برادر عزیز مولانا محمد واضح حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساتھیوں کے تعاون سے دار العلوم ترقی کے منازل طے کرتا ہوا بہت آگے نکل گیا، جس کا شاید ابتدا میں کسی کو تصور بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

حضرت اقدس مولانا علی میاں رحمہ اللہ کی دعاؤں ودل سوزی اور ان کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع صاحبؒ کی آہ سحر گاہی اور حکمت اور فہم وفراست، تواضع وانکساری اور صفات نبوی جس کے وہ حامل تھے' ندوۃ العلماء ترقی کرتا چلا جارہا تھا، مختلف حالات پیش آئے، مگر ہر حالت میں ان کی دعا وآہ سحر گاہی اور حکمت اور ان کی نسبت حسنی نے ان سب مراحل کو پار کرلیا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب کی وفات کا سنگین حادثہ اچانک پیش آیا، ابھی حضرت مولانا سے یہ ناچیز ایک ماہ پہلے ملاقات کرکے ابوظبی واپس آیا تھا، الحمد للہ طبیعت بہت ہشاش بشاش تھی اور اس علالت کے دوران بھی حضرت والا سے فون پر برابر رابطہ قائم رہا، لیکن قضا وقدر کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں، موت وحیات کے لیے وقت مقرر ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا غیبی نظام ہے کہ کسی حادثہ کے پیش آنے سے پہلے ان کے اعزہ واقارب کے لیے صبر وتحمل کا مادہ عطا فرمادیتے ہیں، ورنہ انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ برداشت کرسکے، یہ بھی حقیقت ہے ؎

دیتے ہیں ظرف بادہ قدح خوار دیکھ کر

اس موقع پر مجھے اس بدوی کا شعر یاد آرہا ہے، جو حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کی ان کے والد حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی وفات پر تعزیت پیش کرتے ہوئے کہا تھا:

اصبر نكن بك صابرين فانما
صبر الرعية بعد صبر الرأس
خير من العباس صبرك بعده
والله خير منك للعباس

(صبر سے کام لیجیے، آپ کے صبر ہی سے ہمیں صبر آئے گا، اس لیے کہ رعایا کو صبر اپنے سردار ہی سے ملتا ہے، حضرت عباسؓ کے بعد آپ کے لیے صبر بہتر ہے اور اللہ کی ذات آپ کے لیے عباسؓ سے کہیں زیادہ بہتر ہے)

بے شک یہ حادثہ حسنی خاندان اور دار العلوم ندوۃ العلماء اور پوری ندوی جماعت، ہندوستان کے مدارس اور عالم عربی میں فکر اسلامی کے حاملین کے لیے غیر معمولی ہے، اس وقت کچھ لکھنے کے لیے قلم میں طاقت نہیں، دماغ میں قوت نہیں، خاص طور پر یہ تصور کر کے کہ حضرت نور اللہ مرقدہ ہم سے اچانک رخصت ہو گئے۔

اس ناچیز کا حضرت سے تقریباً ۷۰ رسال کا تعلق رہا ہے، سنہ ۱۹۵۳ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ کے بعد حضرت مولانا نے خارج میں حماسہ پڑھائی تھی، ویسے آپ حضرات کو معلوم ہے کہ حضرت نے جو تحریر اس ناچیز کو دی وہ میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہے، حضرت مولاناؒ کا اکابر حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوری، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور ہمارے استاذ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی نور اللہ مراقدہم سے جو تعلق رہا ہے وہ آنکھوں دیکھا حال ہے ؎

شنیدہ کے بود مانند دیدہ

حضرت مولاناؒ تواضع وخاکساری، استغناء، زہد، توکل، حلم، بردباری جو صفات حسنی خاندان کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی ہیں، وہ ان سب کے حامل تھے، بالکل اس شعر کے مصداق تھے ؎

رہیں دنیا میں اور دنیا سے بے تعلق ہوں
پھریں دریا میں اور ہرگز نہ کپڑوں میں لگے پانی
خدا یاد آئے جن کو دیکھ کر وہ نور کے پتلے
نبوت کے یہ وارث ہیں یہی ہیں ظل رحمانی
یہی ہیں جن کے سونے کو فضیلت ہے عبادت پر
انہی کے اتقاء پر ناز کرتی ہے مسلمانی

اس وقت آپ دونوں حضرات پر خصوصیت سے جو ذمہ داری آن پڑی ہے، امید ہے کہ آپ صبر وتحمل سے کام لیں گے اور اپنی خاندانی نسبت وروایات کو انشاء اللہ اسی طرح برقرار رکھیں گے ؎

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق
ہر ہو سنا کے نداند جام سنداں باختن

کا نمونہ دنیا کو دکھادیں گے، اللہ تعالیٰ کی نصرت وحفاظت آپ کے ساتھ ہے۔

حضرت مولاناؒ کی ذات گرامی اپنے ماموں حضرت مولانا علی میاںؒ کی نسبت کو جذب کیے ہوئے تھی، ان کی پوری زندگی حضور ﷺ کی ذات گرامی سے عشق اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت، اولیاء اللہ اور صلحائے امت سے گہری محبت وعقیدت میں گذری، جو اس خاندان کا شعار رہا ہے اور حضرت مولانا محمد رابع صاحبؒ پر اکابر کی نظر رہی ہے اور ان کی توجہات ودعاؤں اور شفقت سے وہ پوری طرح فیض یاب ہوئے تھے، ان کی تربیت اور صحبت جو اللہ کے فضل سے آپ دونوں کو حاصل ہے، اس سے امید ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء اور اس کا مشن اسی طریقہ سے قائم ودائم رہے گا، اللہ تعالیٰ کی خصوصی نصرت ومدد ہم رکاب رہے۔

ہمارے استاذ حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہ بار بار اعلان فرماتے تھے کہ بھائی! میری زندگی کا تو آخر ہے، جو لوگ باقی ہیں ان سے رجوع کرو، آئندہ انشاء اللہ انہی سے کام ہوگا، یہ

عالم کا نظام ہے۔

اس وقت اس سے زیادہ کچھ لکھنے کی ہمت نہیں، اللہ تعالیٰ کے غیبی نظام کے تحت حضرت والا نے آپ دونوں کو تیار کر رکھا تھا، اس لیے دار العلوم ندوۃ العلماء کا مشن انشاء اللہ پوری طاقت کے ساتھ جاری وساری رہے گا، ہم سب آپ کے ساتھ ہیں، یہ آپ لوگوں کی سعادتمندی ہے حضرت مولاناؒ نے آپ لوگوں کو اپنے روحانی مزاج میں رنگ دیا ہے، انہوں جو کچھ خاندانی میراث پائی تھی، جس کے وہ حامل تھے، وہ اپنا کام پورا کر کے چلے گئے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ لوگوں کو صحت وعافیت عطا فرمائے، پوری ہمت وتوکل علی اللہ کے ساتھ اپنا کام جاری وساری رکھیں، اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت آپ کے ساتھ ہے، انشاء اللہ زندگی رہی تو عنقریب حاضر خدمت ہوں گا۔

سب حضرات کی خدمت میں سلام مسنون کے بعد تعزیت پیش کرتا ہوں۔

فقط والسلام

شریک غم

اُرد. تقی الدین ندوی

معتمد تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء

۲۷/رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ

۱۸/اپریل ۲۰۲۳ء

امت مسلمہ کی عظیم شخصیات

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''اس امت کی تاریخ کا مطالعہ کرنے سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ اس امت میں مسلسل اور اس کے مختلف علاقوں میں ایسی ایسی عظیم شخصیتیں پیدا ہوئی ہیں جو ایمان وعزیمت کے معیاری کردار کی حامل رہی ہیں اور جب جب انسانی زندگی میں دینی واخلاقی بگاڑ پھیلا ہے، اس امت میں سے کوئی شخصیت قدرآور بن کر سامنے آگئی اور ایمان وعزیمت کی خصوصیت کے ساتھ انسانوں کی اخلاقی ومذہبی بلکہ انسانی وفکری رہنمائی واصلاح کا ایسا زبردست کام انجام دیا ہے، جس کی مثال صرف نبیوں کے یہاں ملتی ہے، وہ نبی تو نہ تھے کیونکہ نبوت آخری نبی محمد ﷺ پر ختم ہوچکی ہے، لیکن انہوں نے اپنے کردار اور سیرت سے نبیوں کا نمونہ پیش کیا، ان کو خدا کی طرف سے اس کا حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے لیے نبیوں کے طریقہ کی توفیق کی دعا کریں اور یہ دعا ان کو سورۂ فاتحہ میں پڑھنا بتایا گیا ہے، جو نمازوں کی ہر رکعت میں پڑھی جاتی ہے اور ایک جگہ یہ دعا بتائی گئی ہے کہ "وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَاماً" (ہم کو پرہیزگاروں کا امام ومقتدیٰ بنا۔)

چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پھر ان کے بعد متعدد تابعین، پھر تبع تابعین، جن میں نمایاں طور پر حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ، عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ، پھر بعد کے لوگوں میں ائمہ حدیث وائمہ فقہ، ائمہ تزکیہ وتصوف، عظیم غازی ومجاہد، جنہوں نے اسلام کے صحیح اصول اور مسلک کے مطابق جہاد کی مثالیں قائم کیں، خدمت علم کے میدان کے عظیم شہ سوار اور اس طرح کی دوسری عظیم تاریخی شخصیتیں گذشتہ تاریخ اسلام میں پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔''

(حالات حاضرہ اور مسلمان: ۹۰-۹۱)

فرشتہ صفت انسان

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ
(شیخ الحدیث دارالعلوم۔کراچی)

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی قدس اللہ تعالیٰ سرہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا اپنی حیثیت سے بلند تصور کرتا ہوں اور اپنے آپ کو اس کے لیے نااہل پاتا ہوں۔ اگرچہ مجھے حضرت مولانا قدس اللہ تعالیٰ سرہ سے نیاز حاصل کرنے کا موقع کم ملا ہے اور میں بہت قریب سے ان سے استفادہ نہیں کرسکا، لیکن ان کی خدمات، ان کی شخصیت کی عظمت اور ان کا فیض میرے لیے ایسی چیز ہے جس کے بارے میں کوئی ادنیٰ شک نہیں ہوسکتا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی قدس اللہ تعالیٰ سرہ اس دور میں امت مسلمہ کی رہنمائی کے لیے ایک روشن مینار کا کردار ادا کر رہے تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو بہت سی عظیم خصوصیات سے نوازا تھا۔ وہ ندوۃ العلماء کے علاوہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور سے بھی فیض یاب ہوئے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں یہ شرف عطا فرمایا کہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ساتھ سفر وحضر میں ان کی صحبت اٹھانے کا انہیں موقع ملا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو جو علم اور امت کی فکر عطا فرمائی تھی، اسی کے ساتھ ان اولیائے کرام سے اکتساب فیض کا موقع عطا فرمایا تھا جن سے درحقیقت ایک عالم دین اور ہر مسلمان کی شخصیت کی تعمیر ہوتی ہے، اس کا نتیجہ تھا کہ اللہ نے ان کو علم وعمل کا ایسا پیکر بنایا تھا کہ وہ صرف الفاظ ونقوش کے علم کے حامل نہ تھے، بلکہ اس علم پر عمل کرنے کے جتنے مظاہر ہوتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہ سارے مظاہر ان میں جمع فرمادیے تھے۔

اس ناکارہ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مولانا علی میاںؒ کی زیارت اور ان سے براہ راست استفادہ کی توفیق بخشی اور خط وکتابت کے ذریعہ بھی الحمدللہ میں ان سے ہدایات لیتا رہا۔

ان کی شخصیت میں علم وعمل کی جو جامعیت تھی اور اسی کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں امت کی فکر اور جو سوز دروں عطا فرمایا تھا، وہ اس دور میں خال خال ہی لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، اسی بنا پر حضرت مولاناؒ نے غیر معمولی خدمات انجام دیں اور صرف ہند وپاک ہی میں نہیں بلکہ پورے عالم اسلام اور عرب دنیا کے اندر اٹھنے والے فتنوں کا مقابلہ کیا اور اس کی خاطر انہوں نے انتہائی درد مندی ودل سوزی اور اخلاص کے ساتھ ایسے پیغامات دیے جنہوں نے بہت سی زندگیوں کو بدل دیا۔ اگر ایک لفظ میں ان کی شخصیت کو یہ کہا جائے کہ وہ ''سوز مجسم'' تھے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو ان سے جو تعلق قائم ہوا اور جس طرح انہوں نے ان کی صحبت اٹھائی اور سفر وحضر میں ان کی رفاقت کی سعادت انہیں نصیب ہوئی، اس کے نتیجہ میں وہ ''حضرت مولانا علی میاںؒ کے عکس جمیل'' بن کر اس دنیا کے سامنے پیش ہوئے اور جو مشن اور جو کام حضرت مولانا علی میاں قدس اللہ تعالیٰ سرہ انجام دے رہے تھے، اس کام کو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی قدس اللہ سرہ نے انہی کے بنائے ہوئے طریقہ کے مطابق اور انہی صفات کے ساتھ نہ صرف یہ کہ قائم رکھا بلکہ اس کو اور آگے بڑھایا اور ساری دنیا تک پیغام پہنچانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مولانا رابع حسنی قدس اللہ سرہ کو عربی ادب کا ملکہ بھی حضرت مولانا علی میاںؒ کی طرح عطا فرمایا تھا، عربی ادب سے صحیح کام لینے اور اس کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا جو سلیقہ مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کو تھا، اللہ تعالیٰ نے وہی

سلیقہ اور انداز حضرت مولانا رابع حسنی ندوی قدس اللہ سرہ کو دیا تھا، جنہوں نے اپنی ادبی خدمات کے ذریعہ یہ واضح کردیا کہ ادبِ عربی کسی ذہنی عیاشی کا نام نہیں ہے اور نہ ہی وہ اس کام کے لیے ہے کہ آدمی صرف اچھی نثر ونظم لکھے، بلکہ وہ اس لیے ہے کہ آدمی اس کے ذریعہ سے دنیا میں وہ پیغام پھیلائے اور دوسروں تک وہ آواز پہنچائے جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کے ذریعہ دنیا کو پہنچائی اور نبی ﷺ نے اس کی عملی تصویر بن کر دکھایا۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی معیت میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے مجھے کئی مرتبہ ملاقات کا موقع حاصل ہوا، اس کے علاوہ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی وفات کے بعد بھی ایک دو مرتبہ مجھے حضرت مولانا رابع صاحبؒ سے نیاز حاصل ہوئی، میں یہ سمجھتا ہوں کہ جتنی مرتبہ بھی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی قدس اللہ سرہ کی مجھے زیارت نصیب ہوئی تو ایسا لگا جیسے انسانی روپ میں ایک فرشتہ ہمارے سامنے ہے۔ اللہ نے ان کو اُن اخلاق فاضلہ اور اُن صفات عالیہ کا ایک اہم پیکر بنایا تھا جو ایک اچھے مسلمان کے لیے اور اچھے عالم وداعی کے لیے ضروری ہے۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی وفات کے بعد الحمد للہ مجھے حضرت مولانا رابع حسنی قدس اللہ سرہ سے ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعہ استفادہ کا شرف حاصل رہا، اگرچہ یہ کم ہوا لیکن میں ان کو اپنا بڑا، بزرگ اور مقتدیٰ سمجھتا ہوں اور الحمد للہ میں نے ان سے اپنے بعض اہم معاملات میں مشورے بھی لیے، بلکہ حضرت نے خود یہ کرم فرمایا کہ مختلف مواقع پر رابطہ فرما کر اپنے ہدایات اور ارشادات سے مجھے نوازا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وفات کسی ایک فرد یا کسی ایک خاندان کا صدمہ نہیں ہے، بلکہ یہ پورے عالم اسلام کا ایک بہت بڑا نقصان ہے، بلاشبہ آپؒ اس شعر کا مصداق ہیں ؎

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

واقعہ یہ ہے کہ ان حضرات کا دنیا سے جانا ہمارے لیے ایک بہت بڑا صدمہ ہے اور ساتھ ہی ایک بہت بڑے خطرہ کی نشان دہی بھی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم ان کی روایات اور طریقوں کو بھلا کر محض الفاظ ونقوش کے علم کی حد تک محدود رہ جائیں اور اپنی زندگیوں کو اس علم کے مطابق نہ ڈھالیں۔

اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ جب سورج ڈوبتا ہے تو چاند ستارے آجاتے ہیں، پھر وہ چاند ستارے ہی بعد میں جا کر سورج بن جاتے ہیں یعنی پھر دوبارہ سورج کی روشنی آجاتی ہے، لہٰذا اس قسم کے صدمات ساری دنیا میں پیش آئے ہیں اور اہل علم کی برادری میں خاص طور پر بہت پیش آئے ہیں، لیکن یہ اللہ کا انمٹ قانون ہے کہ

﴿فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ (الأعراف: ٣٤) (بس جب ان کا وہ وقت آپہنچتا ہے تو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی نہ آگے ہوسکتے ہیں اور نہ پیچھے)

معلوم ہوا اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس اٹل قانون میں کسی کو دخل نہیں، اگر کسی کی قربانی کسی کی وفات کو مؤخر کرسکتی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی کریم ﷺ کی ایک ایک سانس کے بدلہ اپنی ہزاروں جانیں قربان کردیتے لیکن جو اللہ کا فیصلہ تھا اس کے آگے سب نے سر جھکایا اور صدمہ کے باوجود سب نے آپ ﷺ کے مشن کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اس لیے اس حادثہ کے موقع پر بھی میں یہی توقع رکھتا ہوں کہ حضرت مولانا رابع حسنی ندویؒ کی تعلیم وتربیت سے انشاء اللہ ایسے افراد ضرور تیار ہوئے ہوں گے جو آئندہ ان کے مشن اور ان کے فیض کو نہ صرف جاری رکھیں بلکہ اس کو مزید ترقیات دیں، جس طرح انہوں نے اپنے شیخ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے فیض کو جاری رکھا۔ اللہ اپنے فضل وکرم سے اس امید کو پورا فرمائے اور مجھے اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ یہ فیض جاری رہے گا۔

میں دل سے دعا گو ہوں کہ اللہ اپنے فضل وکرم سے ان کے درجات میں پیہم ترقی عطا فرمائے اور مقاماتِ قرب میں ان کو خصوصی جگہ دے، ان کی خدمات کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول بخشے اور ان کے فیوض سے ہمیں استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور جو حضرات ان کے بعد آئے ہیں اللہ ان پر ان کے فیوض جاری رکھے۔ آمین!

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا

حضرت مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی مدظلہ
(ڈربن یونیورسٹی-افریقہ)

برادر مکرم مولانا رابع حسنیؒ کا حادثہ انتقال ایسا اچانک پیش آیا جس نے قلب ودماغ کی دنیا کو منتشر کر دیا۔اس حادثہ کے لیے قلب و دماغ تیار نہ تھا۔ یہی صورت حال مولانا واضح صاحب مرحوم کے ساتھ بھی پیش آئی۔حضرت مولانا علی میاںؒ کی وفات کے بعد یہ حادثہ ایسا ہے جس نے نہ صرف ان کے خاندان کے افراد کو اپنی شفقتوں سے محروم کر دیا بلکہ کتنے ہی ادارے ان کے صائب مشوروں اور صحیح قیادت سے محروم ہو گئے، خصوصاً آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ان کی قیادت سے محروم ہو گیا۔

مولانا رابع حسنی ندویؒ نے اپنی عمر کا بڑا حصہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ساتھ گزارا اور ان کی تربیت نے مولانا رابع صاحبؒ کو جوانی ہی میں علمی پختگی سے ہم کنار کر دیا تھا۔عجیب بات یہ بھی ہے جو میں نے محسوس کی کہ ان کی تقریر کا انداز اور آواز اور طرز بیان بھی اکثر حضرت مولانا علی میاںؒ کی آواز کے مشابہ ہو جاتا تھا۔

ندوۃ العلماء میں میرا داخلہ درجہ اول میں ۱۹۴۱ء میں ہوا تھا۔ اس کے ایک دو سال بعد غالباً ۱۹۴۳ء میں میری مولانا رابع صاحبؒ سے ملاقات ہوئی، وہ مجھ سے کلاس میں تین سال آگے تھے، میں ابھی طفل مکتب ہی تھا، لیکن وہ مجھے حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ معتمد تعلیم ندوۃ العلماء کی نسبت اور ان کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے پہچاننے لگے تھے، پھر مزید شناسائی کے مواقع بھی ملے۔

دوسری بات جس کے سبب مجھے ان سے مزید قربت ہوئی وہ یہ کہ بعد میں مولانا واضح رشید صاحبؒ ندوہ میں داخل ہوئے اور واضح صاحبؒ مجھ سے کلاس میں تین سال پیچھے تھے۔ان دونوں سے اکثر ملاقات حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلیؒ کے گھر پر کبھی کبھی ہو جاتی تھی اور مولانا رابعؒ وواضحؒ صاحبان کے والد تو ڈاکٹر صاحب کے مطب ہی میں کام کرتے تھے۔ یہ دونوں حضرات شہر میں اپنے گھر خاتون منزل میں رہتے تھے اور روزانہ ندوہ آتے تھے اور تعلیم کے بعد گھر چلے جاتے تھے۔اس طرح شناسائی میں اضافہ ہوتا رہا، مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں درجہ چہارم میں پہنچا تو ایک مرتبہ مولانا واضح صاحب مرحوم مجھے سے کہنے لگے کہ مولانا رابع صاحب مجھ سے تین سال آگے تھے اور وہ خود مجھ سے تین سال پیچھے تھے۔تو میں نے کہا کہ میں اتصال بین الاخوین کا ذریعہ ہوں۔ میری پیدائش ۱۹۳۲ء کی ہے اور مولانا رابع صاحبؒ کی ۱۹۲۹ء کی تھی۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے مولانا رابع صاحبؒ کو اپنے ساتھ سفر وحضر دونوں ہی میں بہت قریب رکھا اور ان کی خوب تربیت کی، حتی کہ ان کی شخصیت نکھر کر ایک ہیرے کی طرح ہوگئی، جس کا اعتراف حضرت مولانا علی میاںؒ کی حیات ہی میں ہونے لگا تھا، اسی لیے مولانا رابع حسنی ندویؒ کی انتظامی وعلمی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے حضرت مولاناؒ ہی کی حیات میں انہیں ندوہ نائب ناظم مقرر کیا گیا، جس وقت ان کو نائب ناظم بنایا گیا اس وقت ندوہ کو ان کی ضرورت تھی، کیونکہ حضرت مولانا علی میاںؒ اکثر سفر پر رہتے تھے، اس لیے ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ان ہی کے مزاج کے مطابق ندوۃ العلماء کے تمام ذمہ دارانہ امور کو آسانی سے حل کر سکے۔

لیکن اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد اچانک حضرت مولانا علی میاںؒ کا انتقال ہوگیا اور پھر مولانا رابع حسنی ندویؒ ۲۰۰۰ء میں بالاتفاق ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ منتخب ہوگئے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب مولانا رابع صاحبؒ کے انتقال کے بعد ان ہی کے خاندان کے ایک روشن چراغ مولانا بلال حسنی جو مولانا رابع صاحب کے زیر تربیت رہے تھے، ناظم ندوہ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوگیا ہے اور یہ عمل یقیناً حق بہ حق دار رسید کا مصداق ہے۔

یادش بخیر! ہمارے زمانہ میں ندوۃ العلماء میں ہر سال قدیم اور جدید طلبہ کے مابین ہاکی یا فٹ بال کے کھیل کا مقابلہ ہوتا تھا، مولانا رابع صاحب تو بڑے درجہ میں تھے اور سنجیدہ رہتے تھے لیکن مولانا واضح صاحب کھیل کے موقع پر زور وشور سے حصہ لیتے تھے، اس موقع پر یہ بات بھی قارئین کے لیے بڑی دلچسپ اور تعجب خیز ہوگی کہ ہاکی کے کھیل سے حضرت مولانا علی میاںؒ اور مفتی سعید صاحبؒ کو بھی مناسبت تھی، کھیل کے دوران یہ حضرات طلبہ کو خوب تھکا دیتے تھے، مگر طلبہ اپنی جوانی کا فائدہ اٹھا کر کھیل جیت جاتے تھے۔

میں جب بھی ندوۃ العلماء آتا تھا تو مولانا رابع صاحب اور مولانا واضح صاحب سے خوب مجلس رہتی تھی اور ندوہ کے زمانہ قیام کے پرانے واقعات کا دیر تک تذکرہ رہتا تھا۔

مولانا رابع صاحبؒ کے اخیر زمانہ نظامت میں ندوہ کے اندر چند بہت ہی تکلیف دہ حالات بھی پیش آئے، اتفاق سے میں اس زمانہ میں ندوہ ہی میں مہمان خانہ میں مقیم تھا۔ میں نے ان کی پریشانی دیکھی اور ان کو کوئی حتمی فیصلہ لینے میں ان کی پریشانی کا کسی قدر مجھے احساس بھی ہوا، تو میں نے ان کو ایک مشورہ دیا جو انہوں نے قبول کیا اور بالآخر چند ماہ بعد انہوں نے بہت غور وخوض کے بعد اپنا فیصلہ صادر کیا اور اس طرح الحمدللہ ندوہ ہر شر سے محفوظ رہا۔

پھر ایک سخت موقع وہ بھی آیا جب ان کے ہر دل عزیز بھائی مولانا واضح صاحبؒ کا انتقال ہوگیا جو ندوہ کے معتمد تعلیم تھے۔ ان کی وفات کے بعد مولانا رابع صاحبؒ نے اس منصب کے لیے مجلس نظامت کو میرا نام تجویز کیا، لیکن یہ خبر میری اطلاع کے بغیر ہی نہ جانے کس طرح سوشل میڈیا اور اخبارات میں نشر ہوگئی، مگر اس تجویز کا منظور ہونا اس لیے مشکل ہوگیا کہ میری مستقل جائے سکونت جنوبی افریقہ کی ہے، جس کے سبب ندوہ میں قیام ممکن نہ تھا، جب کہ اس اہم اور حساس منصب کے لیے مستقل وقت کی ضرورت ہے، اسی لیے میں نے معذرت کردی۔ حسن اتفاقیہ تھا کہ میں اسی زمانہ میں ہندوستان گیا ہوا تھا اور علی گڑھ میں موجود تھا، چنانچہ میں ایک دو دن بعد ندوہ حاضر ہوا اور میں نے وہاں پہنچ کر مولانا رابع صاحب کو اپنے آپ سے بہتر ایک نام مولانا ڈاکٹر تقی الدین ندوی صاحب کا تجویز کیا، جو اس کے لیے ہر لحاظ سے موزوں تھے، مولانا رابع صاحب نے بھی اس نام پر میری رائے سے مکمل اتفاق کیا، پھر یہ بھی حسن اتفاق ہوا کہ انہی دنوں مولانا تقی الدین صاحب بھی لکھنؤ آئے ہوئے تھے، چنانچہ ان کو اسی وقت ایک طویل نشست میں اس منصب کے لیے راضی کر لیا گیا اور انہوں نے یہ ذمہ داری قبول کرلی۔ ظاہر ہے اس منصب کے لیے وہ ہر صورت میں مجھ سے بہتر تھے اور یہ تو اللہ کا کرم تھا اس نے صحیح فیصلہ کرا دیا۔ الحمدللہ مولانا تقی الدین صاحب کے تقرر نے مولانا رابع صاحبؒ کا بوجھ کسی قدر ہلکا کر دیا تھا۔

مولانا رابع صاحبؒ کے لیے اپنے عزیز بھائی کی جدائی کا زخم ایسا تھا جو ان کے لیے ہر آن ہرا رہا، کیونکہ وہ ان کے بھائی ہی نہ تھے بلکہ ان کے دست و بازو تھے۔ بالآخر چند سال کے فرق سے مولانا رابع صاحب بھی اس دنیا سے رحلت فرما گئے، جن کی وفات میرے لیے ذاتی طور پر بہت سخت حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، امید ہے کہ اب وہ اپنے ماموں کے پاس خوش ہوں گے اور ضرور دل ہی دل میں جنت میں کہہ رہے ہوں گے۔

یاد آئیں گی وفائیں تم کو میری دیکھنا
قدر ہوگی تم کو میری مرجانے کے بعد

بقیۃ السلف کی رحلت

حضرت مولانا عبدالحمید اسماعیل زھی مدظلہٗ
(مدیر و شیخ دارالعلوم زاہدن-ایران)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پورے عالم اسلام کے لیے ایک بہت ہی عظیم سانحہ اور بڑا نقصان ہے۔انا للہ وانا الیہ راجعون!

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ ایک جامع علمی شخصیت اور انتہائی عظیم انسان تھے۔آپ اپنی تصانیف' درس و تدریس' دعوت وارشاد' نظم ونسق اور قائدانہ صلاحیت کے حوالے سے اور علمی وفکری اعتبار سے ایک بااثر شخصیت تھے اور روحانیت اور تصوف وللّٰہیت میں آپ کا مقام اونچا تھا۔

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ ہمارے دور کے اکابر بالخصوص امام سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے تربیت یافتہ تھے اور ہمارے زمانے میں ''بقیۃ السلف'' اور اکابر علماء کی یادگار تھے۔ان کی تصانیف خاص کر فکر اسلامی اور عربی ادب کے موضوع پر لکھی گئی تحریروں سے واضح ہے کہ حضرت مولاناؒ اس میدان میں اپنے مرشد ومربی حضرت علامہ ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے نقش قدم پر گامزن تھے اور آپؒ سے اللہ تعالیٰ نے بڑا کام لیا۔

آپؒ نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کے بعد پوری قابلیت کے ساتھ دارالعلوم ندوۃ العلماء کا انتظام وانصرام سنبھال لیا، جس کا شمار عصر حاضر کے سب سے بڑے اسلامی تعلیمی مراکز میں ہوتا ہے۔اس کے علاوہ آپؒ نے ہندوستان میں ہزاروں علماء اور مسلمانوں کی رہنمائی کی اور مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے اہم اداروں کی صدارت فرمائی، یقیناً آپ کی یہ سب خدمات عالم اسلام کے لیے انتہائی قابل قدر ہیں۔

آج سے کئی سال پہلے (۲۰۰۸ء میں) ہم نے حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کی دعوت پر رائے بریلی میں علامہ سید ابوالحسن ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور افکار پر منعقد ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی تھی۔اس موقع پر ہم نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بھی چند راتیں گزاریں اور اس عظیم تعلیمی مرکز کے مہمان رہے۔ یہ سفر ہمارے لیے ایک یادگار سفر تھا۔اسی سفر کے دوران پہلی بار حضرت مولانا سید محمد رابع ندویؒ سے ملاقات ہوئی۔ ہم کچھ دن ان کی خدمت میں رہے تو آپ کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آئے۔

مولاناؒ نے اپنے اسلاف گرامی کی طرح سادہ زندگی گزاری، انہیں دیکھ کر کسی کو یہ اندازہ نہ ہوتا کہ اس سادہ اور بے تکلف لباس میں کتنا عظیم کردار اور علم وفکر کی حامل شخصیت موجود ہے۔

بندہ نے حضرت علامہ ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ سے پہلی بار مسجد نبوی میں ملاقات کی، البتہ آپؒ کی گرانقدر تصانیف اور علم وفکر سے ہمیشہ مستفید ہوتے رہے، لیکن ہمارے شیخ ومرشد حضرت مولانا عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ (بانی دارالعلوم زاہدان) آپ کی کئی بار زیارت کر چکے تھے اور ہمیشہ آپ کا تذکرہ فرماتے تھے۔مولانا عبدالعزیزؒ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت' خدمات اور افکار' فصاحت وبلاغت اور آپ کے علم وتقویٰ سے بہت ہی متاثر تھے اور اپنی مجالس میں مولاناؒ کا تذکرہ فرماتے تھے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ علامہ مولانا عبدالعزیز رحمہ اللہ نے علامہ سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت بھی کی تھی۔اس بیعت کی روئیداد کچھ یوں ہے کہ مولاناؒ مکہ مکرمہ میں حضرت مولانا

عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں بیعت کرنے کی نیت سے حاضر ہوئے، مولانا رائے پوریؒ نے فرمایا کہ ہمارا یہاں قیام ختم ہوگیا ہے اور اب ہم ہندوستان جانے والے ہیں۔ آپ مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے پاس جاکران سے بیعت کرلیں۔ مولانا عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے اس نصیحت پر عمل فرمایا اور آپؒ نے مسجد الحرام میں علامہ ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی اور وہیں ان سے بیعت کی۔ مولانا عبدالعزیزؒ کی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے بہت سی یادیں وابستہ تھیں۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال سے ہم بہت متاثر ہوئے اور اس پر ہم ہندوستان کے تمام علمائے کرام بالخصوص لکھنؤ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ اور حضرت مولانا کی اولادٗ عزیزوں اور رشتہ داروں اور آپ کے شاگردوں اور عقیدت مندوں سے تعزیت کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے درجات بلند فرمائے اور اپنے فضل وکرم سے ان کے انتقال کے بعد پیدا ہونے والی خلا کو پر فرمائے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں اس خصوصی نمبر کی اشاعت انتہائی قابل قدر اور قابل تعریف اقدام ہے۔ ہمیں اپنے ماضی کو نہیں بھولنا چاہیے۔ ہماری آنے والی نسلوں کو ان اکابر کے افکار اور علم سے محروم نہیں رہنا چاہیے۔ اس طرح کی کوششیں ہونی چاہئیں تاکہ ان اکابر کا طریقہ جاری رہے۔

ہم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے جانشین مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی کو بھی مبارک باد پیش کرتے ہیں جنہوں نے حال ہی میں یہ ذمہ داری سنبھالی ہے۔ ان کا انتخاب اس ملک کے عوام اور علمائے کرام کے اعتماد کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے انہیں توفیق اور کامیابی سے نوازیں گے اور آپ انشاءاللہ پوری قوت اور توانائی کے ساتھ ان بزرگوں کی خدمات کو جاری رکھیں گے۔

وصلّی اللّٰہ تعالی علیٰ خیر خلقه محمد وآله وصحبه أجمعین!

ملکِ ایران اور شیعوں کے متعلق چند حقائق

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

’’اسلامی ممالک میں چند ممالک کثیر آبادی والے ہیں جن میں سرفہرست ایران ہے۔

ایران کا پشتینی مذہب شیعہ نہیں ہے، یہ ایک عرصہ کے بعد ہوا، اصل بات یہ ہے کہ ایرانیوں کی ترکوں سے برابر جنگ ہوتی رہتی تھی جس میں ایرانیوں کو شکست ہوتی، اس لیے ایرانیوں نے سوچا کہ مذہب کا سہارا جب تک نہ لیا جائے گا اس وقت تک جوش پیدا نہیں ہوگا، اس لیے مصلحتاً وضرورتاً شیعہ مذہب کو اختیار کیا۔

حضرت عمرؓ کے عہد حکومت میں ایران فتح ہوا، یہی وہ بنیادی سبب ہے جس کی وجہ سے شیعہ ان سے جلتے ہیں اور انہیں گالیاں دیتے ہیں، کیونکہ وہ عربوں سے اپنے آپ کو نسب میں برتر سمجھتے ہیں، سوائے حضرت حسنؓ اور حضرت حسینؓ کے۔

شیعہ صرف اس لیے اتحاد چاہتے ہیں کہ وہ اقلیت میں ہیں اور اقلیت میں رہ کر وہ کچھ نہیں کرسکتے۔‘‘

(مستفاد از: افادات علم وحکمت: ۹۲-۹۹)

اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

مولانا مفتی احمد صاحب خانپوری
(سرپرست جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین- ڈابھیل)

حضرت اقدس مولانا محمد رابع صاحب ندوی نور اللہ مرقدہ کی شخصیت اس دور قحط الرجال میں سلف صالحین کی سچی یادگار اور اکابرین امت کی حسین تصویر تھی، آپ کی ذات گرامی سے عرب وعجم، امریکہ ویورپ، چین وجاپان غرض سبھی مستفید ہوئے، خصوصاً عالم عربی میں مفکر اسلام حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد آپ ہی ان کے نمائندے ونائب تصور کیے گئے اور آپ نے بھی حضرت کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ''عرب قومیت'' کے بت کو پاش پاش کرنے کی مقدور بھر سعی کی۔

دوسری طرف ملک کے ناگفتہ بہ حالات میں بدلتے منظر نامے کے پیش نظر مسلمانوں کی متحدہ جماعت ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کی جس صبر وضبط، تحمل واستقامت اور حکمت وہمت کے ساتھ آپ نے قیادت وسیادت فرمائی ہے، اس کا اندازہ آپ کے عقیدت مندوں اور خوشہ چینوں کو تو تھا ہی، مگر آپ کے وصال کے بعد معاندوں اور نکتہ چینوں کو بھی بہ خوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ''بورڈ'' کی صدارت کا راستہ پھولوں کی سیج نہیں' کانٹوں کا دشت بے کنار تھا، ان کے صبر وضبط اور خموشی نے بیسیوں فتنوں کو روک دیا تھا۔

''دار العلوم ندوۃ العلماء-لکھنؤ'' کی بیس سے زائد سالوں تک نظامت کرنا ہے، ایسے ماحول میں جب ملک میں ملی ادارے اور تحریکیں آئے دن ٹوٹ پھوٹ اور باہمی خلفشار کی شکار ہوتی جارہی ہیں، حضرت مولانا کا دو دہائی سے زائد عرصہ تک ''ندوہ'' کی حفاظت میں جگر خون کرنا وہ عظیم قربانی ہے جو مدتوں یاد کی جائے گی۔

ایک ندوہ ہی کی کیا بات ہے، دسیوں ادارے اور بیسیوں مجلّے حضرت مولاناؒ کی رحلت سے یتیم ہوگئے ہیں، پوری ملت ہندیہ تاریخ کے اس نازک موڑ پر اپنے آپ کو لاوارث محسوس کررہی ہے:

جب سے اس نے شہر کو چھوڑا، ہر رستہ سنسان ہوا
اپنا کیا ہے، سارے شہر کا اک جیسا نقصان ہوا

محسن نقوی

اللہ تعالیٰ حضرت مولاناؒ کی مغفرت فرمائے، حسنات قبول فرمائے، درجات بلند فرمائے، ان کی خدمات جلیلہ کو شرف قبولیت بخش کر ان کے حق میں صدقہ جاریہ وذخیرۂ آخرت بنائے، پس ماندگان کو صبر جمیل واجر جزیل سے نوازے، ملت کو بہ عافیت ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

آپ کی خدمات جلیلہ کا ایک روشن پہلو اکابر ندوہ کی امانت

جامع ومتوازن شخصیت

''حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب مدظلہ' حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ساتھ طویل عرصہ تک رفاقت وصحبت کی وجہ سے امت مسلمہ کے مسائل اور عالمی حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور اعتدال پسندی وسلامتی فکر تو مولانا مدظلہ کو ورثہ میں ملی ہے۔ آپ جہاں کہیں تشریف لے جاتے ہیں، وہاں پوری دردمندی کے ساتھ اخلاص نیت' دینی مدارس کی اہمیت اور اکابر امت کی قربانیوں کا ذکر فرماتے ہیں، نیز اسلامی تاریخ سے سبق آموز واقعات بیان فرما کر مستشرقین اور دیگر اعداء اسلام کی دسیسہ کاریوں پر سے پردہ اٹھاتے ہیں۔'' (تحفہ گجرات: ۷)

جناب مولانا عبداللہ کاپودرویؒ

برکۃ العصر کی رحلت

مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی
(ناظم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات کا اثر سب کے دلوں پر بڑا گہرا ہے اور یہ ایک طبعی بات ہے، اس لیے کہ اب تک ہمارے سروں پر جو ایک سایہ تھا وہ نہیں رہا، واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ان کی حیثیت ''برکۃ الدنیا'' اور ''برکۃ العصر'' کی تھی اور وہ پوری دنیا کے لیے باعث خیر وبرکت تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو اخلاق کی وہ بلندی عطا فرمائی تھی جس کا اعتراف سب کو ہے اور انہیں ایسا دل دیا تھا، جس نے کبھی بھی کسی کا برا نہیں سوچا، ان کی ذات سے کسی کو تکلیف پہنچنا تو بہت دور کی بات ہے، ہم نے ان کی بیماری کے بالکل آخری ایام میں بھی یہی دیکھا کہ وہ ہر ایک کے ساتھ غیر معمولی اخلاق برتتے تھے اور شدید ضعف کے باوجود وہ جس طرح ہر آنے والے سے اپنائیت کے ساتھ بات کرتے تھے، اس کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

سچی بات یہ ہے کہ حضرت مولاناؒ نے مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ کی جانشینی کا حق ادا کردیا۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو ''مجمع الکمالات'' لکھا تھا، جن کی وفات کے بعد ہمارے حضرت مولاناؒ ان کے جانشین ہوئے اور انہوں نے ان کی پوری صفات اپنے اندر جذب کرلیں، جس کے نتیجہ میں آپ کی شخصیت بھی ''مجمع الکمالات'' ہوگئی تھی، یہاں تک کہ آپ حضرت مولاناؒ کے بالکل مثنی بن گئے تھے اور بعض مرتبہ لوگوں کو دیکھ کر دھوکہ ہوتا تھا کہ یہ تو حضرت مولانا علی میاںؒ ہی معلوم ہوتے ہیں۔

حضرت مولاناؒ نے جب آپ کو حضرت رائیوریؒ سے بیعت کرایا، تو حضرت رائے پوریؒ نے بیعت کرنے کے بعد فرمایا:

''علی میاں! بیعت تو میں نے کرلیا لیکن یہ آپ کے ہیں اور ان کی تربیت آپ ہی کے ذمہ ہے۔''

اس کا نتیجہ تھا کہ وہ وہ پہلے دن سے لے کر اخیر تک اس طرح حضرت مولاناؒ کے ساتھ رہے جو ایک مثال ہے، انہوں نے اپنے آپ کو مٹا دیا، کسی کے بس میں ایسا نہیں تھا کہ وہ خود کو اس طرح فنا کر دے جیسے مولاناؒ نے خود کو حضرت مولاناؒ کے لیے کیا تھا اور اسی فنائیت کا نتیجہ تھا کہ حضرت مولانا کے دل میں ان کے لیے جو محبت تھی وہ کسی کے لیے نہیں تھی۔ آخری درجہ کی بات یہ ہے کہ بعض مرتبہ استنجا لگا ہوتا اور حضرت مولاناؒ فرمادیتے کہ رابع گاڑی میں بیٹھو تو آپ بیٹھ جاتے اور ایک مرتبہ بھی عذر نہ فرماتے، اس لیے کہ ان کی لغت میں حضرت مولاناؒ کے لیے ''نہیں'' تھا ہی نہیں، بعض مرتبہ شدید تکلیف ہوتی تھی، لیکن کبھی حضرت مولاناؒ سے یہ نہیں فرمایا کہ ہم ساتھ میں نہیں جاسکتے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے سامنے حضرت مولانا رابع صاحبؒ نے خود کو فنا کردیا تھا اور ایسا مٹا دیا تھا جو آسان کام نہیں ہے، ایسا لگتا تھا کہ ان کے اندر کا نفس غائب ہوگیا ہے، اس میں شبہ نہیں کہ مولانا عالم دین تھے، بڑے ادیب تھے، مفکر اور صاحب بصیرت انسان تھے، لیکن سفروں کے اندر ہمیشہ حضرت مولاناؒ کے ساتھ ایک خادم کی حیثیت سے رہتے تھے، یہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بھی حضرت مولاناؒ کے ساتھ تقریر کریں اور ان کا بھی اشتہارات میں نام چھپے، حالانکہ آدمی کے اندر بڑائی کا احساس ایسی چیز ہے جو بہت بعد میں ختم ہوتی ہے، لیکن حضرت مولانا رابع صاحب کا معاملہ ہی عجیب

تھا، انہیں دیکھ کر لگتا تھا کہ ان کے اندر بڑائی کا احساس ہی نہیں ہے، وہ حضرت مولاناؒ کے ساتھ ہر جگہ شریک رہے، مگر ایسے تمام مواقع سے انہوں نے خود کو پیچھے رکھا جہاں نام ونمود کا شبہ بھی ہوتا ہو، ایک مرتبہ جب حضرت مولاناؒ مدینہ منورہ تشریف لے گئے اور وہاں "النبوۃ والأنبیاء" کے عنوان سے محاضرات ہوئے، جس کا اردو ترجمہ ''منصب نبوت اور اس کے عالی مقام حاملین'' کے نام سے شائع ہوا ہے، تو اس موقع پر بھی حضرت مولانا رابع صاحبؒ ساتھ میں موجود تھے، اس وقت حضرت مولانا علی میاںؒ نے باصرار ان کو بھی ایک محاضرہ تیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ تمہیں ایک محاضرہ دینا ہے، شاید اس طرح کے ایک ہی دو موقع ہوں گے، ورنہ ہمیشہ ان چیزوں سے دور رہنے کی کوشش کی۔ لیکن جب حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد اللہ تعالیٰ نے انہیں جانشین بنایا اور تمام لوگوں کے قلوب ان پر مجتمع ہوئے تو ہم نے خود حضرت کو دیکھا لگتا تھا کہ ان پر عجیب کیفیت ہے، وہ بار بار فرماتے تھے کہ میں خود کو اس لائق نہیں سمجھتا۔ لیکن ملت اسلامیہ ہندیہ کی قیادت کے لیے آپ کا جو انتخاب ہوا، تو سب نے دیکھا کہ آپ نے اس کا حق ادا کر دیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو غیر معمولی بصیرت عطا فرمائی تھی، ان کی رائے میں بڑا اعتدال اور توازن ہوتا تھا، وہ وقت کی نزاکت کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے، ہمارے والد صاحب حضرت مولاناؒ کے متعلق فرماتے تھے کہ اگر کسی کو مشورہ کرنا ہو تو چھوٹے بھیا سے کرے، کیونکہ ان سے زیادہ صائب الرائے کوئی نظر نہیں آتا اور یہ واقعہ ہے کہ مولانا میں دور اندیشی بہت تھی، وہ بہت دور تک سوچتے تھے، جہاں جلدی سے کسی کی نگاہ نہ پہنچ سکے حضرت مولاناؒ کی نگاہ وہاں تک پہنچ جاتی تھی اور وہ پہلے ہی سے اس کا سد باب کر دیتے تھے جس کی وجہ سے بہت سے خطرات ٹل جاتے تھے اور الحمد للہ معاملات حل ہو جاتے تھے، ظاہر ہے اب ایسے لوگ خال خال ہوتے ہیں۔

ہمارے حضرت مولاناؒ اسوۂ رسول ﷺ کا ایک نمونہ تھے، ظاہر ہے جانے والا تو چلا گیا، لیکن اب ہمیں آپ کی ان صفات سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے جن سے انہوں نے ملت کو فائدہ پہنچایا، حضرت مولاناؒ اکثر ایک بات کہتے تھے کہ بعض مرتبہ ہم کوئی کام کرتے ہیں اور ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ اس کام کے لیے اس سے بھی بہتر شکل ممکن ہے، لیکن کبھی کبھی ہم لوگوں کو جوڑنے کے لیے تنازل گوارا کر لیتے ہیں، واقعی یہ بہت بڑی چیز ہے، اجتماعیت ایسی چیز ہے جس سے کاموں میں قوت آتی ہے اور کام جاری رہتے ہیں۔ حضرت مولاناؒ کے اندر کی سب کو جوڑ کر چلنے کی بڑی اہم صفت تھی، وہ سب کو ہمیشہ محبت کے ساتھ لے کر چلے اور ان کی دور اندیشی سے ہمیشہ ملت کو فائدہ پہنچا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اللہ کے ایک نیک اور ولی بندہ تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں ایمان کی گہرائی عطا فرمائی، اخلاق کی بلندی اور امت کا درد عطا فرمایا، یہ وہ صفات ہیں جو بندوں کو ممتاز کرتی ہیں، پھر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کو ایسی عمر عطا فرمائی جو ایمان اور عمل صالح سے بھرپور تھی، حدیث شریف میں ایسے حضرات کے متعلق گواہی ہے کہ

"خَيْرُ النَّاسِ مَنْ طَالَ عُمُرُهُ وَحَسُنَ عَمَلُهُ"

(تم میں سب سے بہتر وہ ہیں جن کی عمر زیادہ ہو اور ان کے اعمال بھی اچھے ہوں) (ترمذی: ۲۵۰۰)

اعمال اچھے ہونے کی مختلف شکلیں ہیں، جن میں ایک شکل یہ بھی ہے کہ آدمی کی زندگی نمونہ کی ہو اور اسوۂ رسول ﷺ کی مکمل نقل ہو، اس زندگی کے ساتھ جس کی عمر طویل ہو وہ اپنے وقت کا امام اور برگزیدہ بندہ ہوتا ہے اور دنیا اس سے فائدہ اٹھاتی ہے، ہمارے حضرت مولاناؒ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایسا ہی مقام عطا فرمایا تھا، ان کے دل میں امت کا ایک درد تھا اور اس کا عالم یہ تھا کہ انہیں راتوں کو نیند نہیں آتی تھی، وہ راتوں کو اٹھ جاتے تھے اور روتے رہتے تھے، میں نے انہیں خود دیکھا کہ وہ راتوں کو بہت بے چین ہوتے تھے اور فرماتے تھے کہ اس وقت امت کے اندر دو ایسے امراض ہیں جن کی وجہ سے یہ امت زوال کا شکار ہو رہی ہے، پہلا مرض یہ ہے کہ یہ

امت بے دین ہے اور دوسرا مرض یہ ہے کہ یہ امت بے بس ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو غیر معمولی ذہانت اور امت کو جوڑنے کا مزاج دیا تھا، ایک طویل عرصہ تک انہوں نے ملت اسلامیہ ہندیہ کی قیادت فرمائی اور بعض عالمی اداروں کی بھی رہبری کی، سب جگہ حضرت مولاناؒ نے سب کو ساتھ لے کر نباہ کرتے ہوئے اس طرح اپنا سفر جاری رکھا کہ الحمد للہ کہیں کوئی بڑی دشواری پیش نہیں آئی اور اگر کبھی کوئی بات ہوئی تو اپنی بصیرت سے اس کو بہتر سے بہتر طریقہ پر حل فرمایا، بعض مرتبہ ایسے مواقع بھی آئے کہ لگ رہا تھا کشتی ڈانواڈول ہے، مگر وہ آپ کی فراست ایمانی سے پار لگ گئی، حضرت مولاناؒ کی انہی صفات سے امت کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔ بلاشبہ ایسی جامع الکمالات شخصیات کم ہی ہوتی ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو بے شمار اکابر امت کی صحبتوں سے فائدہ اٹھانے اور ان کے قریب رہنے کا موقع عطا فرمایا تھا، سب سے پہلے انہوں نے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو دیکھا، حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کے ساتھ سفر کیا اور بالخصوص حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوریؒ کے ساتھ انہوں نے ایک طویل سفر کیا، اس سفر میں ایک دلچسپ واقعہ بھی پیش آیا جو حضرت اکثر سنایا کرتے تھے، یہ سفر حجاز کا تھا اور پانی کے جہاز سے ہوا تھا، سفر کے لیے حضرت مولاناؒ جوتا خرید کر لے گئے تھے، دوران سفر حضرت رائے پوریؒ کی مجلس ہو رہی تھی اور مولانا کے جوتے باہر رکھے تھے جو کسی صاحب کو شاید پسند آگئے اور وہ پہن کر چلے گئے، جب وہ واپس آئے تو حضرت مولانا نے اپنے جوتے دیکھ کر اٹھا لیے، پھر جب مجلس ختم ہوئی تو ان صاحب نے ہنگامہ شروع کر دیا کہ میرے جوتے چوری ہو گئے، حضرت نے کہا: شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، وہ جوتے تو میرے ہیں، لیکن وہ صاحب نہیں مانے اور ان کی آواز تیز ہو گئی، یہاں تک کہ بات حضرت رائے پوریؒ تک پہنچ گئی، تو حضرت رائے پوریؒ نے حضرت مولانا رابع صاحبؒ سے فرمایا: ارے چھوڑیئے، اتنا کہنا تھا کہ حضرت نے فوراً اپنا جوتا انہیں دے دیا۔ حضرت فرماتے تھے کہ عجیب بات ہے حضرت رائے پوریؒ کو میری یہ بات اتنی پسند آئی کہ پورے سفر وہ یہی تذکرہ کرتے رہے کہ مولوی رابع صاحب نے میری بات مان لی، ظاہر ہے اہل اللہ کے یہاں بات ماننے کی بڑی قیمت ہے، حضرت مولاناؒ فرماتے تھے کہ حضرت رائے پوری یہی چیز دیکھتے تھے کہ آدمی بات کتنی مانتا ہے، وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ تسبیحات اور نمازیں کتنی پڑھتا ہے۔ یقیناً یہ بھی بنیادی بات ہے، لیکن اس سے کم درجہ کی بات یہ بھی نہیں کہ آدمی اپنے بڑوں کو بڑا سمجھے اور ان کی بات مانے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو حسن خاتمہ عطا فرمایا، وفات والے دن تقریباً سوا بارہ بجے ہی فرمایا کہ مجھے ظہر کی نماز پڑھاؤ، اس وقت زیادہ لوگ موجود نہیں تھے، لیکن پھر بھی نماز کے لیے آپ کا اصرار رہا اور آپ نے زیادہ دیر کسی کا انتظار نہیں کیا، بلکہ جلد از جلد نماز ادا کرانے کے لیے کہا، ظہر کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کرنے کے بعد ان کے اوپر بے ہوشی کی کیفیت طاری ہوئی اور اسی کے اندر حرکت قلب اس حال میں بند ہوئی کہ آپ کی سانسوں سے اللہ اللہ کی آوازیں آرہی تھیں اور آپ اللہ اللہ کرتے ہوئے اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے۔

حضرت مولانا ضلع رائے بریلی کے ایک چھوٹے سے گاؤں تکیہ کلاں میں پیدا ہوئے، اپنے بھائیوں میں ان کی حیثیت "واسطة العقد" کی تھی، والد ماجد سنتے بولتے نہیں تھے، لیکن بڑے فہیم اور دیندار انسان تھے، پڑھنا لکھنا بھی سیکھا تھا، اگر کوئی بات نہ سمجھتا تو لکھ کر بتاتے تھے، حضرت نے اپنی جوانی میں والد صاحب کو حج کرایا، وہاں وہ بیمار ہوئے، لیکن حضرت نے ایسی خدمت کی کہ محسوس نہیں ہونے دیا اور الحمد للہ صحت ہوئی اور حج مکمل ہوا۔

والدہ صاحبہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی بڑی ہمشیرہ تھیں، صاحب دل خاتون تھیں، انہوں نے اپنی اولاد کی تربیت کی اور تینوں صاحب زادے آفتاب وماہتاب بن کر روشنی بکھیرتے رہے، حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی ان میں سب سے

بڑے تھے، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کے خلیفہ، انتہائی نرم دل اور جامع الکمالات شخصیت کے حامل تھے، سب سے چھوٹے مولانا واضح رشید صاحب مفکر وادیب، صاحب تصانیف، صاحب بصیرت عالم تھے، عالم اسلام سے ان جیسا واقف طبقہ علماء میں شاید ہی کوئی ہو، دل بڑا شفاف تھا، دونوں بھائیوں کا انتقال حضرت مولانا کے سامنے ہوا، مولانا ثانی صاحب تو ساٹھ کی دہائی تک بھی نہیں پہنچ سکے، لیکن اہم اور ضخیم تصنیفات یادگار چھوڑیں، مولانا محمد حمزہ حسنی صاحب ان کے تنہا فرزند تھے اور ایک صاحبزادی جو عزیز القدر مولوی محمود مرحوم کی والدہ تھیں، مولانا واضح صاحب نے طبعی عمر پائی، حضرت کی وفات سے چار سال پہلے وہ دنیا سے رخصت ہوئے، مولانا جعفر صاحب ان کے تنہا فرزند ہیں جو اپنے والد کی فکری وعلمی وراثت کے امین ہیں۔

حضرت مولانا کی ابتدائی تعلیم رائے بریلی میں ہوئی پھر تقریباً دس سال کی عمر میں والدہ صاحبہ نے ماموؤں کے پاس لکھنؤ بھیج دیا، بڑے ماموں مولانا حکیم ڈاکٹر سید عبدالعلی صاحب کا گھر وہیں تھا، وہی سب کا مستقر تھا، حضرت مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی لیکن مولانا کے اصل استاد ومربی حضرت مولاناؒ تھے۔

حضرت مولاناؒ کا اسلوبِ تعلیم اور اندازِ تربیت بڑا حکیمانہ تھا، تعلیم میں حضرت کے یہاں بڑی سختی تھی، حضرت مولانا رابع حسنی صاحبؒ فرماتے تھے کہ سبق پوری طرح تیار کر کے لانا ہوتا تھا، ایک غلطی بھی ماموں جی کو برداشت نہیں تھی، غلطی پر سخت سرزنش فرماتے، یہ تعلیم سفر وحضر میں جاری رہی، حدیث کی تکمیل حضرت شاہ حلیم عطاؒ کے یہاں ہوئی، تقریباً ایک ماہ مظاہر علوم میں بھی قیام رہا اور حضرت شیخ سے استفادہ کا موقع ملا، پھر بقیہ سال کا حصہ دیوبند میں گذرا، حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے خاندان کا بڑا گہرا تعلق تھا، حضرت جب دیوبند پڑھنے کے لیے گئے تو ایک درجہ میں جہاں قیام بھی تھا نکل کر سامنے کھڑے ہوئے تھے کہ اچانک حضرت مدنی تشریف لے آئے، دیکھ کر بولے: آپ یہاں کیسے؟ مولانا نے فرمایا کہ پڑھنے کے لیے حاضر ہوا ہوں، فرمایا: نہیں! یہاں کیسے؟ آپ کو ہمارے گھر آنا چاہیے۔ مولانا نے فرمایا کہ حاضر ہوجاؤں گا، پھر کئی روز حضرت کے یہاں قیام رہا پھر اجازت لے کر دارالاقامہ میں منتقل ہوگئے۔

اسی زمانہ کا واقعہ ہے کہ دارالعلوم میں شوریٰ کا جلسہ تھا، حضرت رائے پوری تشریف لائے اور حضرت مدنی کے یہاں قیام ہوا، مولانا فرماتے ہیں کہ حضرت مدنی گھر میں تھے اور ہم حضرت رائے پوری کی خدمت میں حاضر تھے، کچھ روز پہلے حضرت رائے پوری تکیہ رائے بریلی تشریف لائے تھے، اسی کا تذکرہ فرمانے لگے کہ حضرت مدنی تشریف لے آئے، حضرت رائے پوری ان کی طرف متوجہ ہوگئے اور فرمایا کہ حضرت! ہم تکیہ گئے تھے، حضرت مدنی نے فرمایا کہ دو جگہ رات گذارنے کو جی چاہتا ہے، ایک تکیہ کی مسجد میں اور دوسرے میاں نور محمد جھنجانوی کے حجرہ میں۔

یہ قصہ ۱۹۴۷ء کے شروع کا ہے، مولانا نے وہاں ہدایہ جلالین وغیرہ پڑھیں، ارادہ اگلے سال دورہ کا بھی تھا، مگر ۱۹۴۷ء کے فسادات کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوسکا اور حضرت مولانا نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہی تکمیل کی۔

اس زمانہ میں نہ مدارس عام تھے اور نہ ملازمت کے مواقع تھے، فراغت کے بعد ایک سال کا عرصہ یوں ہی گذر گیا، سال کے اخیر میں دارالعلوم کے مہتمم مولانا عمران خاں صاحب نے ازخود فرمایا کہ میں چاہتا ہوں کہ تمہیں تدریس میں لے لوں، اس کے بعد ہی انتظامیہ کا جلسہ تھا جس میں یہ تجویز منظور ہوئی اور ۱۹۴۹ء میں حضرت نے ندوہ میں بحیثیت مدرس قدم رکھا، تدریس کے وہ چند سال ایسے گذرے کہ حضرت نے تعلیم کے لیے رات دن ایک کردیے، اتنی محنت کی کہ صحت متاثر ہوگئی اور خاندان کے بزرگوں کو کہنا پڑا، حضرت فرماتے تھے کہ وہ محنت پھر ساری زندگی کام آئی، وہ دن اور حضرت کی وفات کا دن، حضرت نے اپنے آپ کو ندوہ کے لیے تج دیا، تدریس کے دوسرے ہی سال حجاز مقدس کا سفر ہوا اور ایک سال وہاں بھی قیام رہا، تبلیغی کوششوں کا سلسلہ بھی جاری رہا اور وہاں علماء

سے استفادہ کا بھی خوب موقع ملا، ایک سال بعد واپس ہوئے تو دار العلوم میں ادیب دوم کی حیثیت سے تقرر ہوا، پھر مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کے جانے کے بعد ادیب اول اور "کلية اللغة العربية" کے قیام کے بعد "عميد كلية اللغة" منتخب ہوئے۔

حضرت مولانا کی دور رَسی اور معاملہ فہمی کی وجہ سے ذمہ داران ندوۃ العلماء کو ان پر بھرپور اعتماد تھا، ندوۃ العلماء اور ان کی شخصیت لازم وملزوم ہوگئے تھے، ان کی پوری زندگی ندوہ کے لیے وقف تھی، شاید ہی کوئی دوسری شخصیت ایسی ہو جس نے اتنی طویل مدت کسی ادارہ کی بھرپور خدمت کی ہو، جو موقع اللہ نے حضرت کو دیا، انہوں نے ہر طرح کی اونچ نیچ کو سمجھا، اس پچہتر سالہ مدت میں بڑے نشیب وفراز آئے، دو ایک اسٹرائکیں بھی ہوئیں لیکن حضرت اس کے لیے سینہ سپر رہے۔

طلبہ سے مولانا کا شروع سے بڑا تعلق رہتا تھا، وہ ان کی ایک ایک چیز کی فکر کرتے، ان کی تربیت فرماتے، ان کی ضروریات پر بھی نگاہ رکھتے اور ان کی ترقی کے لیے راستے تلاش کرتے، یہی وجہ ہے کہ حضرت کے شاگردوں کا ہمیشہ ان سے انتہائی تعلق رہا۔ حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ اور حضرت مولانا تقی الدین ندوی مدظلہ جو حضرت کے بالکل ابتدائی دور کے شاگرد ہیں، اخیر تک وہ حضرت کی محبت میں سرشار رہے اور خدمت میں حاضری سعادت جانتے رہے۔

حضرت کا اصل ذوق تدریس کا تھا، اس میں تقریباً حضرت کے پچہتر سال گذرے، شاید ہی کسی کو یہ شرف اتنی طویل مدت تک حاصل رہا ہو، عجیب بات ہے کہ حضرت کا موضوع ادب وتاریخ رہا، لیکن اخیر دور میں کئی سال حضرت نے بخاری شریف پڑھائی اور یہ مبارک سلسلہ وفات سے دو تین مہینہ پہلے تک جاری رہا۔

سلوک وتربیت میں بھی حضرت مفکر اسلام کی جانشینی کا حق حضرت نے ادا کردیا، ہزاروں بندگان خدا نے حضرت سے اس باب میں فائدہ اٹھایا اور مقصود کو پہنچے، اس وقت پچاس سے زائد وہ حضرات ہیں جو اس باب میں بھی حضرت کے لیے صدقہ جاریہ ہیں اور شاگردوں کی تعداد کا تو اندازہ لگانا مشکل ہے، ساری دنیا میں اس وقت حضرت کا فیض جاری ہے۔

حضرت کو سفروں سے بہت کم مناسبت رہی، حضرت مفکر اسلام کی وفات کے بعد انہوں نے ضروری بیرونی اسفار کیے، مصر، لندن، جاپان، ساؤتھ افریقہ کے علاوہ متعدد سفر حجاز مقدس کے ہوئے، رابطہ عالم اسلامی کے جلسوں میں بھی شرکت ہوئی، وہاں کے اصحاب علم وادب کو ہم نے خود دیکھا کہ وہ اگر حضرت سے ملتے تو اکثر زبانوں پر یہی ہوتا "كأنه الشيخ أبى الحسن" یہ تو بالکل شیخ ابوالحسن معلوم ہوتے ہیں، اخیر دور میں حضرت نے اپنی معذوریوں اور کمزوریوں کی بنا پر سفر ترک فرمادیا، لیکن حرمین شریفین کی حاضری کا بار بار ذکر فرماتے اور جانے کی خواہش ظاہر فرماتے۔

جب تک برادر خورد حضرت مولانا واضح رشید صاحبؒ حیات رہے، وہ ہمت دلاتے رہے اور ان کی وجہ سے حضرت ہندوستان کے سفر کرلیتے تھے، لیکن ان کی وفات کے بعد پھر کوئی باقاعدہ سفر نہ ہوسکا، ان دونوں بھائیوں کی محبت بھی مثالی تھی، ایک دوسرے کے بغیر شاید ایک دن گذارنا بھی مشکل تھا، لیکن یہ حضرت کی قوتِ ایمانی تھی کہ انہوں نے اپنے چھوٹے محبوب بھائی کی جدائی کا غم برداشت کیا۔

اخیر میں حضرت کو اپنی معذوری اور کمزوری کا خیال تھا اور بار بار فرماتے کہ ہم کچھ نہیں کر پاتے، جب کہ وہ ضروری پروگراموں میں شرکت فرماتے، کام کرنے والوں کی رہنمائی کرتے اور ضروری مشورے دیتے، ان کی معذوری اور کمزوری کبھی ایسی نہیں ہوئی کہ اس نے ان کو معطل کیا ہو، بھرپور زندگی گذاری، کام کرتے کرتے ملت کا درد اپنے سینہ میں لیے ہوئے اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہوگئے، وہ ہاتھ جو ملت کی سرخ روئی کے لیے ہمیشہ اٹھتے رہتے تھے اور وہ زبان جو ساری انسانیت کی فلاح کے لیے دعا گو رہتی تھی، وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی، یقیناً یہ پوری ملت کے لیے بڑا خسارہ ہے، اللہ تعالیٰ غیب سے ملت کی حفاظت کا سامان فرمائے اور حضرت والا کو ان کی خدمات جلیلہ کا بہتر سے بہتر صلہ عطا فرمائے۔ آمین!

عم محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی
(ناظر عام ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

عم محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی زندگی ایک کھلی کتاب تھی، کھلی بھی تھی اور آسان بھی، ہر شخص اس کو پڑھ سکتا تھا، ہر شخص اس کو سمجھ سکتا تھا، نہ اس میں کوئی ابہام تھا اور نہ اس میں کوئی الجھاؤ، عوام نے بھی اس کو پڑھا، خواص نے بھی اس کو سمجھا، دونوں پر اس کا اثر پڑا، عوام ان کے اخلاق، ان کی محبت، ان کی شفقت، ان کی سادگی، ان کی تواضع، ان کی بے نفسی، ان کی ہمدردی، ان کی نرم دلی اور ان کے جذبہ خیر خواہی سے متاثر ہوئے اور خواص ان کے علم وفضل اور ان کی فہم وفراست، ذکاوت وذہانت، تصنیف وتالیف، تحریر وتقریر، دور اندیشی ودانش مندی، انتظامی صلاحیت، صحیح موقف اور صحیح فیصلے، حکیمانہ قیادت، تحمل وبردبادی اور مختلف المزاج بلکہ متضاد طبائع رکھنے والے افراد کو یکجا کر لینے کی صلاحیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

وہ صاحب ایمان اور صاحب عمل تھے، اس کا ثبوت ان کے جنازہ نے دیا، اس محبوبیت اور مقبولیت نے دیا جس کا مشاہدہ ان کی تدفین کے موقع پر ہوا: ﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمَنُ وُدًّا﴾

ان کی زندگی تقویٰ سے عبارت تھی اور صبر تو گویا ان کی بنیادی صفت تھی اور اس کی گواہی اپنوں نے بھی دی اور غیروں نے بھی، جن جن حالات سے اللہ تعالیٰ نے انہیں گزارا، نہ تقویٰ کا دامن ہاتھ سے چھوٹا اور نہ صبر کی اس بلندی سے وہ ذرا نیچے اترے، تبھی تو وہ مقام ملا جس پر دنیا آج رشک کرتی ہے، بغیر طلب اور بغیر کوشش کے حتی کہ بغیر خواہش اور بغیر چاہت کے۔

وہ صاحب ولایت تھے، صاحب استقامت تھے، صاحب عزیمت تھے، صاحب فراست تھے، صاحب بصیرت تھے، زہد، ورع، استغنی، احتیاط، حلم، قناعت، تقشّف، تواضع انکساری، بردباری، نرمی، فکرمندی، دردمندی اور سوز دروں میں اپنی مثال آپ تھے، بقول مولانا مفتی محمد تقی عثمانی وہ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا عکس جمیل تھے، ایک کو دیکھ لیجیے دوسرے کو سمجھ لیجیے، شکل وصورت میں ایسی شباہت کہ حضرت مولانا علی میاںؒ کی جگہ حضرت مولانا رابع حسنیؒ کی تصویر لگ جاتی اور لوگ سمجھ نہ پاتے۔ بولنے اور لکھنے میں احتیاط کا یہ عالم تھا کہ زبان سے کبھی کوئی لفظ ایسا نہ نکلتا جس پر گرفت ہو سکے، تحریر میں کوئی ایسا لفظ نہ آتا جس پر انگلی اٹھ سکے، عاجزی وفروتنی کا یہ عالم کہ اس کا تصور بھی محال ہے۔

ایک طالب علم پیر دبانے بیٹھ گیا، آپ نے منع کیا وہ نہ جانے کیا سمجھا اٹھ کر چلا گیا، آپ کو احساس ہوا کہ شاید یہ بات اس کو ناگوار گذری اور یہ احساس اتنا بڑھا کہ مولوی عین الحسن ندوی کو بھیجا کہ اس طالب علم کو ڈھونڈ کر لائیں، جب وہ طالب علم آیا تو مولانا نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ شاید آپ کو میری بات ناگوار گذری، معاف کیجیے گا، میں نے تو آپ سے بیٹھنے کے لیے کہا تھا، جانے کے لیے نہیں۔

آپ کی طبیعت ناساز تھی، سخت کمزوری اور نقاہت تھی، سینہ میں تکلیف تھی، ایک صاحب آئے، سلام کیا، کچھ دیر کھڑے رہے اور پھر چلے گئے، کمزوری اور تکلیف کا یہ عالم تھا کہ آپ ان سے کچھ نہ کہہ سکے، کچھ دن بعد وہ صاحب جب پھر آئے تو مولانا نے ان سے کہا کہ معاف کیجیے گا، اس دن آپ آئے تھے، میں آپ سے بیٹھنے کے لیے نہ کہہ سکا، نقاہت کا یہ عالم تھا کہ بولنا بھی مشکل تھا۔

خدا کی ناراضگی اور پکڑ کا ڈر اتنا ان پر غالب رہتا تھا کہ کسی بھی لمحہ یہ خیال ان کے دل سے نہیں نکلتا تھا اور یہی وہ خیال تھا جو ہمیشہ ان کی زبان کی حفاظت کرتا تھا اور ان کے اخلاق کی بھی۔

ایک مرتبہ میں نے ان سے جا کر کہا، فلاں صاحب سے آپ اس طرح ملتے ہیں اور اتنا ان کا خیال رکھتے ہیں اور وہ اس اس طرح آپ کے بارے میں باتیں کر رہے تھے اور یہ کہتے کہتے میرے منھ سے کچھ سخت باتیں ان کے لیے نکل گئیں، مولانا ایک دم سے سنجیدہ ہو گئے اور سختی کے ساتھ بولے کہ تم زیادہ تیز بول رہے ہو، تمہیں اپنی زبان کا حساب دینا ہے، ان کو اپنی زبان کا، تم اپنی زبان کو قابو میں رکھو، یہ سننا تھا کہ جیسے میرے بریک لگ گیا اور آج بھی ان کا یہ جملہ، یہ تنبیہ سامنے آ کر کھڑی ہو جاتی ہے، جب بھی زبان تیز چلنے لگتی ہے تو زبان کو خود بخود لگام لگ جاتی ہے۔

یہ ان کی نرمی اور مروت کی ہی کی بات تھی، ہم جیسے چھوٹے بھی ان کے سامنے کھل کر اپنا موقف یا اپنی رائے رکھ دیا کرتے تھے اور وہ پوری توجہ کے ساتھ اس کو سنتے تھے، اس کے اچھے پہلو کو سراہتے اور اگر اس میں خرابی یا نقصان کا اندیشہ ہوتا تو بڑی نرمی سے سمجھا دیتے۔

میرے مزاج میں تھوڑی حدت ہے اور شاید یہ میری بہت بڑی کمزوری ہے، دوران گفتگو اکثر لہجہ تیز ہو جاتا ہے اور بات کچھ اس انداز کی ہو جاتی ہے کہ گویا میری ہی بات صحیح ہے، ایک مرتبہ خود میرے والد صاحب نے مجھ سے کہا کہ تم بہت رف لہجہ میں بات کرتے ہو، یہ غیر مہذب طریقہ ہے، عم محترم مولانا رابع حسنی ندویؒ نے ایک بار یہ کہتے ہوئے تنبیہ کی کہ یہ بات تم نرمی سے بھی کہہ سکتے تھے، کتنا خوبصورت انداز تھا یہ سمجھانے کا، دل میں اتر جانے والا۔

وہ کبھی اس طرح نہیں ٹوکتے تھے کہ کسی کو برا لگے یا توہین کا احساس ہو، یا دل میں کوئی گرہ پڑے یا اسے یہ لگے کہ ٹوکنے والا اپنے کو برتر سمجھ رہا ہے اور اس کو اپنے سے کمتر، کیوں کہ ایسے میں نصیحت کا الٹا اثر پڑتا ہے، خود انہوں نے اپنی کم عمری کا ایک واقعہ اپنے خادم بھائی عین الحسن ندوی کو سمجھاتے ہوئے سنایا کہ ایک مرتبہ ان کے ایک ساتھی ایسے وقت نماز پڑھ رہے تھے جو نماز کا وقت نہیں تھا، انہوں نے ٹوکتے ہوئے کہا کہ تم اس وقت نماز پڑھ رہے ہو یہ تو منافقوں کی نماز کا وقت ہے، جواب میں انہوں نے کہا کہ آپ کو آپ کا ایمان مبارک ہو میں منافق ہی سہی۔

میرے والد محترم کے انتقال کے بعد ان کی ایک بڑی خصوصیت انہوں نے یہ بتائی کہ وہ اختلاف کرتے تھے مخالفت نہیں کرتے تھے اور اختلاف اور مخالفت میں بڑا فرق ہے، اختلاف سے بات بنتی ہے، سنورتی ہے اور خامیاں اور کمیاں دور ہوتی ہیں اور مخالفت سے بات بگڑتی ہے اور دوری بڑھتی ہے اور ضد اور ہٹ دھرمی پیدا ہوتی ہے جو بسا اوقات دشمنی تک پہنچ جاتی ہے۔

مولانا کا مزاج یہ تھا کہ اگر کوئی شخص ان سے کسی کے بارے میں کوئی ایسی بات کہتا جس سے اس کی غلط تصویر بنتی ہو، تو مولانا اس کا اچھا پہلو ضرور بیان کر کے اس کی تصویر بہتر کرنے کی کوشش کرتے یا پھر اس موضوع کو بدل دیتے، کبھی ان کی زبان سے کسی کے بارے میں کوئی ایسا لفظ نہیں نکلا کہ اگر اس کو نقل کر دیا جائے تو انہیں شرمندگی ہو یا جس کے بارے میں بولا گیا ہے اس کو برا لگے۔

وہ نہایت ذہین تھے اور انتہائی سمجھدار، ایک ایک چیز کو سمجھتے تھے، ایک ایک آدمی کو پہچانتے تھے، جب ان کے سامنے مسائل لائے جاتے، دشواریوں کا تذکرہ ہوتا، حالات کے سلسلہ میں تشویش کا اظہار کیا جاتا اور حل لوگوں کی سمجھ میں نہ آ رہا ہوتا تو وہ اپنی دو منٹ کی گفتگو سے ان سیاہ بادلوں کو چھانٹ دیا کرتے تھے۔ ان کے اندر بے پناہ مروت تھی، لیکن دین کے معاملہ میں، عقیدہ کے معاملہ میں، شریعت کے معاملہ میں وہ ایک چٹان سے بھی زیادہ سخت ہو جاتے تھے اور ان کی اس مضبوطی سے دوسروں کو طاقت ملتی تھی۔

ان کی بے نفسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا انتقال ہوا تو مولانا سید عبداللہ حسنیؒ نے جو مولانا رابع حسنی ندویؒ کے بھتیجے بھی تھے اور داماد بھی، ان سے عرض کیا کہ نماز جنازہ آپ پڑھائیں، حضرت

مولانا اس پر تیار نہیں ہوئے اور ان سے کہا: ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ماموں جی کی نماز جنازہ پڑھا سکیں، یہ حق تمہارا ہے، لیکن مولانا عبد اللہ حسنی ندوی کے اصرار پر مجبوراً آپ تیار ہوئے اور نماز پڑھائی، اسی طرح مولانا عبد اللہ حسنی ندویؒ نے آپ سے عرض کیا کہ اب آپ تکیہ رائے بریلی میں اس کمرہ میں قیام کریں جس میں حضرت مولانا علی میاں کا قیام رہا کرتا تھا، کیوں کہ اب آپ ان کی جگہ ہیں اور ان کے جانشین ہیں، لیکن مولانا اس پر بھی راضی نہ ہوئے اور وہ یہی کہتے رہے کہ نہیں، ان کے جانشین تم ہو، یہ تمہارا حق ہے، اسی طرح جب بھی کوئی ان سے بیعت وارادت کا تعلق قائم کرنے کے لیے آتا تو وہ مولانا عبد اللہ حسنی کا نام بتاتے اور ان سے تعلق قائم کرنے کو کہتے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب (جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) نے اپنی ایک تقریر میں حضرت مولانا رابع حسنی ندوی کی تواضع اور بے نفسی کا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ انتقال سے قبل میں حضرت سے ملاقات کی غرض سے لکھنؤ آیا، ایک دو دن قیام رہا، واپسی کے دن میں حضرت سے ملاقات کے لیے مہمان خانہ گیا، مگر حضرت محو استراحت تھے، وقت کم تھا، میں نے خادم سے کہا کہ حضرت سے سلام عرض کر دینا اور وقت کی تنگی کا عذر بتا دینا، یہ کہہ کر میں ایر پورٹ کے لیے نکل گیا، ایر پورٹ پہنچا ہی تھا کہ حضرت کے خادم کا فون آیا، انہوں نے کہا: حضرت بات کرنا چاہتے ہیں، شاید خادم بتانا بھول گئے تھے، حضرت وہیل چیر سے میرے کمرہ تشریف لائے تھے، حضرت نے فون پر معذرت کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ مہمان خانہ آئے، آپ کو زحمت ہوئی مجھے جگا دیتے، میں شرمندہ ہوں، مجھے پہلے سے آپ کا شیڈول معلوم کرنا چاہیے تھا اور مجھے خود آپ کے کمرہ آنا چاہیے تھا۔

ایک دوسرا واقعہ حضرت کی بے نفسی کا انہوں نے بتایا کہ مولانا پاریکھ صاحب کا درس قرآن ختم ہو رہا تھا، اس کے لیے انہوں نے تقریب رکھی تھی اور مفکر اسلام کو بلایا تھا، رفیق کے طور پر حضرت مولانا رابع حسنی ندوی تشریف لائے تھے، تعلق کی بنا پر انہوں نے مجھے بھی دعوت دی تھی، میں بھی حاضر ہوا تھا اور اسٹیج پر موجود تھا، اچانک میری نگاہ حضرت مولانا رابع صاحب پر پڑی جو عوام کے درمیان اس طرح تشریف فرما تھے کہ خاص اور عام کا فرق مٹ گیا تھا، میں نے منتظمین میں سے ایک سے کہا: وہ صاحب جو عوام کے درمیان تشریف فرما ہیں ان کو اسٹیج پر لاؤ، لیکن وہ حضرت کے مقام ومرتبہ کو سمجھ نہ سکا یا دیگر مصروفیات نے اس کے ذہن سے یہ بات نکال دی، پھر میں نے دوسرے صاحب سے کہا کہ فلاں صاحب اسٹیج کے نیچے تشریف فرما ہیں، ان کو باصرار اسٹیج پر لائیے، یہ ان کی تواضع اور فنائیت ہے، ورنہ وہ بہت بزرگ اور صاحب علم وفضل ہیں۔

تواضع اور بے نفسی اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ لوگ جب آپ سے اصلاح کے لیے کہتے تو آپ فرماتے اصلاح کے محتاج تو ہم خود ہیں، لوگ جب توجہ ڈالنے کے لیے کہتے تو آپ فرماتے کہ مجھے توجہ ڈالنا ہی نہیں آتا۔

مولانا کا تعلق زمین دار گھرانے سے تھا، زمین دار گھرانے سے تعلق ہو، کھیت بھی ہوں اور باغات بھی اور زمین سے دلچسپی نہ ہو، زمین کا تذکرہ نہ ہو، یہ بات ناقابل یقین ہے، لیکن مولانا کا معاملہ کچھ ایسا ہی تھا، نہ کھیت کا تذکرہ نہ باغ کا حتی کہ گھر میں بھی کوئی بات ایسی نہیں کرتے تھے، وہ بات صرف دین کی کرتے تھے، اصلاح وتربیت کی کرتے تھے، دعوت وتبلیغ کی کرتے تھے، یا پھر حالات پر فکرمندی کا اظہار یا پھر بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلہ میں ہدایات۔

دل آزاری سے آپ کوسوں دور تھے، ہدایا بھی اس لیے قبول کرتے تھے کہ انکار کی صورت میں دل آزاری ہوگی، لیکن ہدیہ دینے والے کو کچھ نہ کچھ ہدیہ دینے کا ضرور اہتمام کرتے تھے، فرماتے تھے نصیحت اس طرح کرو کہ ذرا بھی اپنی بڑائی کا احساس نہ ہو، اس سے اس شخص کو شرمندگی کا احساس ہوگا۔

ان کی زندگی کے بڑے کاموں میں ایک بڑا کام اپنے والد کو حج کرانا تھا، والد ضعیف بھی تھے اور سماعت وگویائی سے محروم بھی اور سفر پانی کے جہاز کا اور پھر راستہ میں بیمار ہونا اور بیماری کا یہ سلسلہ حج

کے ایام تک جاری رہنا، کتنی دشواریاں پیش آئیں ہوں گی، کیسے کیسے حالات کا سامنا کیا ہوگا، لیکن انتہائی خندہ پیشانی کے ساتھ، انتہائی تابعداری اور خوش دلی کے ساتھ، اس سفر میں والد صاحب کی راحت کی خاطر انہوں نے اپنے کو بالکل مٹادیا، مکہ مکرمہ میں قیام حضرت مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ کے مکان پر تھا، انہوں نے جب مولانا رابع صاحب کو اپنے والد کی اس طرح خدمت کرتے ہوئے دیکھا تو انہوں نے کہا: ''رابع میاں نے اپنی جنت ابھی سے بنالی۔''

والدہ سے محبت، والدہ کی خدمت اور والدہ کی تابعداری میں بھی وہ اپنی مثال آپ تھے، والدہ ہی کی خوشی میں ان کی خوشی اور والدہ ہی کی راحت ہی میں ان کی راحت تھی، وہ ان کی خوشی کی خاطر ہر طرح کی تکلیف اٹھا سکتے تھے اور ہر طرح کی قربانی دے سکتے تھے۔

ہر ہفتہ انہی کی خوشی کے لیے لکھنؤ سے رائے بریلی آتے، جبکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ سفر نہایت دشوار تھا، رائے بریلی کے لیے صرف ایک ہی دو ٹرینیں تھیں اور وقت سے بے وقت ہونا ان کا معمول تھا، آدھا آدھا دن رائے بریلی پہنچنے میں لگ جاتا تھا، بسوں کا کوئی نام ونشان نہ تھا، اسٹیشن سے تکیہ پیدل آنا اور تکیہ سے اسٹیشن پیدل جانا، ۴-۵/ میل کا یہ فاصلہ ہمیشہ پیدل ہی طے ہوتا تھا، سفر کی یہ سہولتیں تو بہت بعد میں حاصل ہوئیں، سخت گرمی میں جب وہ پیدل گھر پہنچتے تھے تو شیروانی ان کے پسینہ میں تر ہوتی تھی اور اس زمانہ میں تکیہ میں نہ بجلی تھی نہ پنکھا، جس طرح دن گزرتا تھا اور جس طرح رات بیتتی تھی وہ وہی جان سکتا ہے جس نے وہ دن گزارا اور رات بتائی، لیکن والدہ کی خوشی ان کی ہر تکلیف میں راحت کا سامان پیدا کردیا کرتی تھی۔

بھائیوں کے ساتھ ان کا معاملہ خواہ وہ بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ ہوں یا چھوٹے بھائی مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ جس نے یہ محبت نہیں دیکھی وہ شاید یہ محبت سمجھ بھی نہ پائے، ذرا سوچئے چند گھنٹوں کے بعد سفر ہے، ساری تیاری مکمل ہے، تقریباً پانچ افراد پر مشتمل پورا ایک قافلہ ہے، عین وقت پر چھوٹے بھائی پر جن کو سفر سے ذرا بھی مناسبت نہ تھی، سفر کا اثر پڑنے لگتا ہے اور وہ سفر کے لیے اپنے کو تیار نہیں کر پاتے ہیں، سفر کینسل کردیا جاتا ہے، چہرہ پر کوئی شکن نہیں، ماتھے پر کوئی بل نہیں، زبان سے ناگواری کا کوئی اظہار نہیں، ایک لفظ منہ سے یہ نہیں نکلتا کہ واضح دیکھو تمہاری وجہ سے یہ سفر نہیں ہو پایا۔

ہر موقع پر اور خاص طور پر کہیں آنے جانے میں اس کا پورا خیال کہ واضح کو یہ احساس نہ ہو کہ ہمیں اہمیت زیادہ دی جارہی ہے اور ان کو کم، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو مقام دیا تھا اور جو مقبولیت اور محبوبیت عطا فرمائی تھی، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ لوگ دونوں کے درمیان فرق کریں، لانے میں لے جانے میں، بٹھانے میں، ٹھہرانے میں، لیکن مولانا رابع حسنیؒ کا یہ کمال تھا کہ وہ ان کو اس طرح اپنے ساتھ رکھتے تھے کہ یہ فرق کسی موقع پر بھی ظاہر نہیں ہو پاتا تھا، کہیں پر بھی وہ ان کو اپنے سے الگ نہیں ہونے دیتے تھے، نہ ٹرین میں، نہ قیام گاہ میں، نہ جلسہ گاہ میں اور نہ کہیں آنے جانے میں، دو بھائیوں کے درمیان یہ وہ محبت تھی جس کی لوگ مثال دیتے تھے اور دیتے رہیں گے۔

وہ خاندان کے بڑے تھے، بڑوں ہی کی طرح رہے، سب کی فکر، سب کا خیال، رشتوں کا پورا پاس ولحاظ، کہیں جاتے اگر وہاں رشتہ دار ہوتے تو ملنے جاتے، رشتہ دار ملنے آتے تو ان کو پورا وقت دیتے، کوئی بیمار ہوتا تو اس کی عیادت کے لیے جاتے، کئی موقوں پر تو یہ دیکھا کہ کسی کا آپریشن ہے اور اس کو مولانا کی موجودگی سے اطمینان ہورہا ہے تو مولانا اس وقت تک ہسپتال میں بیٹھے رہے جب تک کہ آپریشن ہوتا رہا، جب آپریشن ہوگیا تو گھر یا ندوہ گئے، یہ مروت، یہ لحاظ، یہ خیال کہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔

ان کی خدمت میں رہنے والے اس بات کی گواہی دیں گے کہ کبھی بھی انہوں نے ان میں سے کسی سے یہ نہیں کہا کہ تم نے یہ کام کیوں کیا، یا یہ کہ یہ کام کیوں نہیں کیا؟ بلکہ ان کی خدمت کرنے والے ان سے کہہ دیا کرتے تھے کہ آپ نے یہ کیوں کیا؟ ایک واقعہ ان کی خدمت میں پیش پیش رہنے والے بھائی مصباح الدین نے یہ بیان کیا کہ ایک صاحب بڑی عمدہ کھجور لائے اور وہ کھجور مولانا نے کسی کو ہدیہ کر دی، بھائی مصباح الدین کو جب یہ پتہ چلا تو انہوں نے مولانا سے کہا

کہ فلاں صاحب آپ کے لیے کھجور لائے تھے اور آپ نے وہ کسی کو دے دی، مولانا اس پر یہ کہہ سکتے تھے کہ تم سے کیا مطلب، چیز میری تھی جس کو چاہوں دوں، لیکن مولانا نے اس کے جواب میں بڑی نرمی سے کہا کہ چھوڑو اب تو دے دی۔

کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے کھانے کے سلسلہ میں گھر ہی میں سہی کوئی فرمائش کی ہو یا اپنی پسند کی چیز پکانے کو کہا ہو، ان سے پوچھا بھی جاتا اور پوچھنے والا کوئی غیر نہیں ان کی بیٹیاں ہوتیں تب بھی اپنی پسند کا کوئی اظہار نہیں، بس یہی کہتے کہ جو پکتا ہے وہی ٹھیک ہے اور جو سب کو پسند ہو۔ نمک کم ہوا تو کچھ نہیں، مرچ زیادہ ہوگئی تب بھی کچھ نہیں، کھانے میں دیر لگتی تب بھی کوئی مسئلہ نہیں، کھانا ان کا گھر سے ندوہ جاتا تھا، کبھی پکنے میں دیر لگی، کبھی لے جانے والے نے تاخیر کی، مہمان خانہ میں سب بیٹھے ہیں، انتظار ہو رہا ہے، پوچھا جا رہا ہے کہ دسترخوان کیوں نہیں لگ رہا ہے؟ جواب دیا جا رہا ہے کہ کھانا لانے والا ابھی آیا نہیں، ایک لفظ شکوہ کا نہیں، نہ لانے والے کے لیے نہ گھر والوں کے لیے، ایسا لگتا تھا کہ گویا کچھ ہیں ہی نہیں۔

چندہ کی رقم کے سلسلہ میں اتنے محتاط تھے کہ ادھر کسی نے رقم دی ادھر مولوی برکت کو بلا کر ان کے حوالہ کی یا پھر کسی کے ذریعہ ان تک بھجوا دی، گھر میں رقم رہے یا ان کے بیگ میں، اس کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔

جلسوں میں اجتماعی دعا کرانے میں شاید ہی کسی نے ان کو روتے ہوئے دیکھا ہو، لیکن رات کے اندھیرے میں لوگوں کی نظروں سے دور گوشہ تنہائی میں تہجد کے موقع پر دعا کے لیے اٹھے ان کے ہاتھوں کی وہ کپکپاہٹ، ان کے جسم پر طاری وہ لرزہ اور درد میں ڈوبی ان کی وہ فریاد دوسروں کو رلا دیا کرتی تھی، کئی بار ایسا دیکھا اور یہ وقت عام طور پر ان کے آرام کا ہوتا تھا، وہ کمرہ میں تنہا ہوتے تھے اور لوگ سمجھ رہے ہوتے تھے وہ آرام کر رہے ہیں، لائٹ بند ہو چکی تھی، اچانک کمرہ میں جانا ہوا تو دیکھا وہ کچھ کہہ رہے ہیں اور رو رہے ہیں، بالکل ایسا لگتا تھا کہ کوئی ان کے سامنے ہے جس سے وہ رو رو کر باتیں کر رہے ہیں اور اپنا حال دل کہہ رہے ہیں، لیکن وہ فریاد ہوتی تھی جو اپنے خدا سے کر رہے ہوتے تھے، لیکن آہٹ پا کر وہ ایسے ہو جاتے تھے جیسے کہ سو رہے ہوں۔

سیرت پاک پر کتابیں بہتوں نے لکھیں لیکن ایسے سیرت نگار کم ہوں گے جن کی زندگی میں سیرت پاک کا اتنا اثر نظر آتا ہو اور شاید یہ عمل ہی کی برکت ہے کہ ان کی تحریر کردہ ''رہبر انسانیت'' کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی مقبولیت عطا فرمائی۔

مسلم قائدین سے خطاب

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

''ضرورت ہے کہ مسلمان قائدین ملت کے افراد میں ان کی کوتاہیوں کا شعور پیدا کریں اور حالات کی درستگی کے لیے مؤثر تدابیر اختیار کریں، اس سلسلہ میں مسلمانوں کی اپنی سابقہ تاریخ کی کئی مثالوں سے صحیح رہنمائی حاصل ہوتی ہے، ان مثالوں سے واقفیت پیدا کر کے مناسب تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہے، اس سلسلہ میں ان کو اپنے اردگرد کی طاقتوں کو بھی دیکھنا ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور مسلمان ان کے دباؤ سے کس طرح باہر آسکتے ہیں اور اپنی شخصی زندگی میں بھی یہ دیکھنا ہے کہ اس کو کیسے صحیح اسلامی تعلیمات کے مطابق درست کر سکتے ہیں؟! اس کام کو فکر و توجہ سے کرنے کی ضرورت ہے۔''

(ماخوذ از ابتدائیہ؛ دعوتِ فکر و نظر: ۱۰-۱۱)

الوداع امت کے مرشد الوداع

مولانا عزیز الحسن صدیقی
(مہتمم مدرسہ دینیہ - غازی پور)

آپ کی رحلت سے ملت اسلامیہ شدید روحانی صدمے سے دوچار ہے۔ بے شک آپ ایک عرصے سے صاحب فراش تھے لیکن آپ کے چاہنے والوں کو اطمینان تھا کہ آپ کی قیادت وسیادت کے سایہ تلے زندگی گزار رہے ہیں۔ انھیں یقین تھا کہ موجودہ پرآشوب وپرخطر دور میں آپ کی نپی تلی رائے اور بیش قیمت مشورے ملت کو درپیش مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے میں ممد ومعاون ثابت ہوں گے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جب بھی کوئی پیچیدہ مسئلہ اور کٹھن گھڑی سامنے آئی تو آپ کے ایک فقرے نے ساری گرہوں کو کھول دیا اور راہ کی دشواریوں کو دور کر دیا۔ ایک دو دن کی بات نہیں گزشتہ چوتھائی صدی کی تاریخ ہماری نگاہ کے سامنے ہے۔

آپ کے بیش قیمت مشورے اور مبنی برحق وصواب فیصلے ملت کے حق میں اکسیر ثابت ہوتے رہے ہیں، آپ نے جس حکمت ودانائی کے ساتھ سفینہ ملت کی ناخدائی اور راہ نمائی کی، وہ یقیناً آپ ہی کا حصہ تھا۔ آپ نے ندوۃ العلماء، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، دینی تعلیمی کونسل، پیام انسانیت فورم اور رابطہ ادب اسلامی جیسے اداروں اور تنظیموں کی نظامت وصدارت کے عظیم مناصب کی ذمہ داریوں کو جس حسن وخوبی کے ساتھ نبھایا وہ آپ کا ہی حصہ تھا۔

آپ کے بارے میں کچھ لوگ کم فہمی کی بنا پر کہہ دیا کرتے تھے کہ آپ بہت کم بولتے ہیں لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ آپ خاموشی کے ساتھ ملت مظلوم کی خیر خواہی وغمگساری کی فکر کرتے اور راہیں تلاش کیا کرتے تھے۔ آپ کی خاموشی پر ہزار تکلم قربان اور آپ کے تکلم پر سو جان سے نثار ہونے کو جی چاہتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

''ہر رہرو کو دو مسلکوں میں سے ایک مسلک ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے، یا قمری وبلبل کی شورش یا شمع کی خاموشی وسوزش اور تجربہ کاران طریق جانتے ہیں کہ دوسری راہ پہلی سے کہیں زیادہ نازک اور کٹھن ہے۔ اس میں بے قیدی وبے وضعی کی آزادی ہے، اس میں ضبط احتیاط کی پابندی اور معلوم ہے کہ شعلوں کی طرح بھڑکنا آسان ہے، مگر تنور کی طرح اندر اندر ہی سلگنا اور حفظ وضبط کے سارے آداب شرائط سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے۔'' (تذکرہ ص ۳۰۰)

ہم پورے وثوق اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ کہنا چاہتے ہیں کہ مرشدالامت حضرت العلام مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ جن کی یاد میں یہ چند سطریں قلم بند کی جارہی ہیں، نے کبھی کوئی بھڑکاؤ بیان نہیں دیا۔ اپنی باتیں پوری قوت کے ساتھ کہیں لیکن قوم کے جذبات کا کبھی استحصال نہیں کیا اور آپ کو اپنی کہی ہوئی بات کو کبھی واپس نہیں لینا پڑا۔ کلیم عاجز نے کتنی اچھی بات کہی ہے:

بات چاہے بے سلیقہ ہو کلیم
بات کہنے کا سلیقہ چاہیے

مولاناؒ اپنے قول وعمل کے جو نمونے چھوڑ گئے ہیں ہم اگر ان کا اتباع کرتے رہے تو ان شاء اللہ ہمارے بہت سے حقیقی اور مفروضہ مسائل ومعاملات کی گتھیاں آپ سے آپ سلجھتی چلی جائیں گی اور ہمیں نقصانات سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا۔ عجلت پسندی اور ہتھیلی پر سرسوں جمانے اور مخلصین وصادقین کے فرمودات کو خاطر میں نہ لانے کے سبب ہم بہت نقصان اٹھا چکے ہیں۔

بابری مسجد کی بازیابی اور تحفظ کے سلسلے میں حضرت مولانا علی میاںؒ کی کوششوں کو جو کامیابی کی منزل تک پہنچ رہی تھیں ہماری جذباتیت اور قیادت کی خامیوں نے ہی سبوتاژ (Sabotage) کیا تھا۔

ہمارے اتاؤلے پن کی ایک مثال اور لے لیجیے، جن دنوں بابری مسجد کا قضیہ بڑے زور شور سے اٹھا ہوا تھا، ایک مہاتما جی نے صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا رابع حسنی کو بند لفافے

میں اپنی ایک تحریر بھیجی تھی جس کو مولانا نے اسی طرح اٹھا کر رکھ دیا اور فرمایا تھا کہ بورڈ کی اگلی میٹنگ میں اسے پیش کیا جائے گا۔

ندوۃ العلماء کا تحفظ:

گزشتہ دنوں ندوۃ العلماء کو سخت حالات سے گزرنا پڑا لیکن حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے بہ حیثیت ناظم ندوۃ العلماء ایسا تاریخی کارنامہ انجام دیا جس کو ''کامیاب آپریشن'' سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ دنیا نے دیکھا کہ آپ نے نہایت صبر وتحمل سے کام لیا اور ندوہ کو ہرزد سے بچانے کی کامیاب کوشش کی۔ اللہ کا خاص کرم ہوا۔ ان شاء اللہ ندوہ کی تاریخ میں آپ کی اس خدمت کو جلی عنوانات کے ساتھ یاد کیا جائے گا اور خراج تحسین پیش کیا جائے گا۔ الحمد للہ آپ کی مساعی جمیلہ کے نتیجے میں ندوہ اپنے اصول ومقاصد پر قائم رہتے ہوئے بدستور اور بہ احسن وجوہ خدمات انجام دے رہا ہے۔

ہمارے صحافیوں اور مدیران اخبارات و جرائد نے اتنی سی بات کو افسانہ کر دیا اور اس بات پر اصرار شروع کر دیا کہ مولانا مہاتما جی کی تحریر کو عام کیوں نہیں کرتے؟ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ مہاتما ایک ایسے معاملے میں ملوث ہوئے کہ قید خانے کی راہ لینی پڑی۔

مولانا کی بصیرت:

۱۹۷۴ء میں جب کوٹھاری ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ شائع ہوئی تو اہل مدارس پر سراسیمگی طاری ہوئی لیکن پورے ملک میں سناٹا چھایا رہا۔ ایسے مایوس کن حالات میں مدرسہ دینیہ غازی پور کے خدام نے قدم آگے بڑھایا اور ۲۴؍مارچ ۱۹۷۴ء کو ذمہ داران مدارس اور اساتذہ کا ایک مشاورتی اجتماع طلب کیا۔ الحمد للہ مشرقی اتر پردیش کے بیشتر مدارس کے نمائندے شریک ہوئے۔ ہماری درخواست پر مورخ اسلام مولانا قاضی اطہر مبارک پوری بھی شریک ہوئے۔ آپ ہی نے اس جلسے کی صدارت فرمائی۔ صورت حال کا مقابلہ کرنے کی تدابیر سوچی گئیں نیز صدر محترم کی تجویز پر ''وفاق مدارس عربیہ'' کے نام سے ایک تنظیم قائم ہوئی۔ ابتدا میں یہ تنظیم صرف بنارس کمشنری تک محدود رہی بعد میں اس کو مشرقی اتر پردیش تک پھیلا دیا گیا۔ اس کے زیر انتظام مدارس کے سالانہ امتحانات ہونے لگے لیکن نصاب تعلیم میں یکسانیت نہ ہونے کی وجہ سے دقتیں پیش آئیں تاہم تنظیم قائم رہی اور اس کا دائرہ کار وسیع ہوتا گیا لیکن مدارس کے روایتی نفاق نے ''وفاق'' کو نگل لیا۔ ذمہ داران مدرسہ دینیہ غازی پور کو اس مفید تنظیم کے ختم ہونے کا افسوس ضرور تھا لیکن انھوں نے ضلع غازی پور کی سطح پر اس کو باقی رکھا اور جب بھی مدارس کے سامنے چیلنجز آئے، اس نے حالات کا مقابلہ کیا اور آزاد دینی مدارس کے کاز کی حمایت کی۔

حضرت مرشد الامت جب غازی پور تشریف لائے تو آپ کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا گیا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ ''مدارس کا ڈھیلا ڈھالا وفاق زیادہ مفید اور کارگر ہوسکتا ہے، ضرورت ہے کہ ہر ضلع میں اسی طرح کا وفاق قائم کیا جائے۔'' چند ماہ قبل مدارس کے سروے کا شاخانہ کھڑا ہو چکا ہے، اس کو اہل مدارس نے خطرہ کا الارم نہ سمجھا تو مستقبل میں صورت حال بھیانک روپ اختیار کرسکتی ہے۔

اگر مدارس اسلامیہ دین کے قلعے ہیں تو ان کی حفاظت قلعہ میں رہنے والوں کو ہی کرنی ہوگی۔

آخری ملاقات:

راقم اپنی مسلسل علالت اور ضعف کی وجہ سے کئی برسوں سے ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے جلسوں میں شرکت نہیں کر سکا تھا لیکن امسال جب مجلس میں شرکت کا دعوت نامہ موصول ہوا تو میں سفر کے لیے آمادہ ہوگیا۔ ۱۱؍مارچ کی شام میں ندوہ کے احاطے میں داخل ہوا تو مغرب کی نماز کا وقت قریب تھا۔ میں جلدی جلدی تیار ہو کر مہمان خانے کی طرف چل دیا، حضرت بھی اپنے کمرے سے نکل کر ہال میں داخل ہوئے اور اہلاً وسہلاً مرحبا مرحبا کہتے ہوئے خادم کو گلے لگایا پھر جماعت سے نماز ادا کی اور نماز سے فراغت کے بعد تخت پر ہماری طرف رخ کر کے بیٹھ گئے اور نہایت بشاشت کے ساتھ گفتگو فرماتے رہے۔ کاش یہ مسرت بخش لمحات اور طویل ہوتے لیکن حضرت کی تکلیف اور تعب کا خیال کر کے ہم جلد ہی اٹھ کر چلے آئے۔ اس کے ایک ماہ بعد حضرت والا کی دائمی مفارقت کی خبر سن کر دل دھک سے ہو کر رہ گیا، چاروں طرف تاریکی پھیل گئی اور زبان انا للہ وانا الیہ راجعون کا ورد کرنے لگی۔

حیف در چشم زدن صحبت مرشد آخر شد

اللہ تعالیٰ حضرت والا کے درجات بلند سے بلند تر کرے اور ملت مرحوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے نیز ان کے فیوض و برکات سے ہمیں تادیر متمتع فرماتا رہے۔ آمین!

تاریخ ندوہ کی تاریخ ساز شخصیت

پروفیسر سید احتشام احمد ندوی
(سابق صدر شعبہ عربی کالی کٹ یونیورسٹی- کیرالا)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے سگے بھانجے اور ان کے حقیقی جانشین تھے، حضرت مولانا رابع صاحبؒ نے مفکر اسلام مولانا علی میاں ندویؒ کی نیک صحبت کو لازم پکڑا اور ان کی ہر ہر ادا کو اپنی زندگی میں نقل کرنے کی کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ رب العزت نے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی وفات کے بعد انہیں ان کا حقیقی جانشین بنادیا اور تمام لوگوں نے بالاتفاق ان کی شخصیت کو تسلیم کیا۔

میرے نزدیک حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ اور ان کی شخصیت کو عظمت کی بلندی عطا کرنے والا سب سے اہم وصف یہی ہے کہ انہوں نے مولانا علی میاں ندویؒ کی جانشینی کا حق ادا کردیا، دراصل حضرت مولانا علی میاںؒ کی شخصیت ایسی عظیم اور با اثر تھی کہ ان کی وفات کے بعد ان کے چھوڑے ہوئے کاموں اور عہدوں ومناصب کو سنبھالنا اور ہر ایک کو ساتھ میں لے کر چلنا یقیناً آسان کام نہیں تھا، لیکن سلام ہے حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی ذہانت وذکاوت اور مومنانہ فراست کو، جو اپنے ماموں حضرت مولانا علی میاںؒ کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے اور بالخصوص انہوں نے تحریک ندوۃ العلماء کو وہی وقار بخشا جس مقام پر حضرت مولانا علی میاںؒ نے ندوہ کو چھوڑا تھا۔

لاریب کہ یہ مولانا رابع صاحبؒ ہی کا کارنامہ تھا جنہوں نے حضرت مولانا علی میاں جیسی عظیم شخصیت کے بعد نہ صرف یہ کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کو سنبھالا، بلکہ اپنی مبارک کوششوں سے اس کو ہمہ جہت ترقی بھی دی جس کے نتیجہ میں حضرت مولانا علی میاںؒ کی وفات کے بعد واقع ہونے والے خلا کو لوگوں نے کم محسوس کیا۔

قسام ازل نے حضرت مولانا رابع صاحب ندویؒ کو حلم وتدبر جیسی نعمت عطا کی تھی، ان کے پورے عہد نظامت میں ندوہ جہد مسلسل کے ساتھ ترقی کی راہ پر گامزن رہا، نہ کوئی شور ہوا نہ ہنگامہ اور نہ ہی کسی طرح کی ایسی بڑی مخالفت ہوئی جس سے ندوہ کی عظمت کو نقصان پہنچے اور لوگوں کو حضرت مولانا علی میاںؒ کے بعد ایک خلا کا احساس ہو، البتہ اس سے انکار نہیں کہ بعض مواقع پر ایسا بھی محسوس ہوا کہ شاید اب یہ عظیم درس گاہ کسی حاسد کے حسد کا شکار ہوجائے، لیکن ایسے تمام مواقع پر حضرت مولانا رابع صاحبؒ نے اپنی حکمت عملی، دور اندیشی اور مومنانہ بصیرت کے ساتھ ندوہ کو ایسے تمام آزمائشی مرحلہ سے نجات عطا فرمادی۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی وفات کے بعد بعض لوگوں کو یہ تشویش ہوئی تھی کہ اب ندوہ کے انتظام وانصرام کو سنبھالنے والی اس قد کی کوئی شخصیت شاید مستقبل قریب میں نہ ملے، یہ باتیں میرے کانوں تک بھی پہنچی، تو میں نے اسی وقت برملا یہ کہا تھا کہ ایسا ہرگز نہیں ہے، اللہ تعالیٰ نے مولانا علی میاںؒ کی وفات سے پہلے ہی ان کا مثنیٰ مولانا رابع حسنی ندویؒ کو بنادیا ہے اور زمانہ دیکھے گا کہ وہ یقیناً ان کے حقیقی جانشین ثابت ہوں گے، اللہ کا فضل ہے کہ زمانہ نے دیکھا۔

مولانا رابع صاحب کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ انہوں نے کبھی بھی کوئی کارنامہ اپنی ذات کی جانب منسوب نہیں کیا، اگر کبھی کسی نے کوئی تعریفی جملہ کہہ دیا تو فوراً تردید کرتے ہوئے فرمادیا کہ یہ سب تو ماموں جان کی برکت اور ان کی دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کی شخصیت تاریخ ندوہ کی تاریخ ساز شخصیت ہے، جنہوں نے ندوہ کی عظمت کو اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ تادم آخر باقی رکھا۔

تعزیتی پیغام

مولانا محمد سعد صاحب کاندھلوی
(مرکز تبلیغ نظام الدین- دہلی)

سلالۃ النبوۃ العظمیٰ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الحسنی الندوی رحمہ اللہ کے علم واحسان کے انتہائی عظیم حامل، بقیۃ السلف شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب وغیرھم رحمہم اللہ تعالیٰ کی فکر اور روحانی میراث کے امین: حضرت مولانا سید محمد رابع الحسنی الندوی رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ اس دار فانی سے رحلت فرما کر حق تعالیٰ شانہ کے جوار رحمت میں منتقل ہوگئے۔إنا للّٰه وإنا إليه راجعون، إن القلب يحزن والعين تدمع ولا نقول إلا بما يرضى به ربنا جل وعلا، وإنا بفراقك لمحزونون، أعظم اللّٰه لنا ولكم الأجر وألهمنا وإياكم السلوان والصبر، متعنا اللّٰه به إلى أجل معدود وقبضه لوقت معلوم بأجر عظيم إن شاء اللّٰه تعالىٰ.

حضرت مولانا مرحوم کی وفات حسرت آیات کے باعث قلب وجگر پر جو درد وغم کا اثر ہے، وہ ناقابل بیان ہے، گذشتہ دو دہائیوں سے اندرون وبیرون ملک کیسے کیسے اکابر واعاظم، مراکز علم ودعوت سے اٹھائے گئے، کتنی محفلیں ویران ہوئیں، کتنے اساطین علم وفضل اس فانی دنیا سے منھ موڑ کر راہی آخرت ہوئے، جن کی وجہ سے دنیا میں علوم نبوت کے مینارے قائم تھے، جن کی جہود مبارکہ سے علم، دعوت اور تزکیہ کے چمن لہلہا رہے تھے، جو اپنے علم ومعرفت میں اسلاف کی حقیقی یادگار تھے، جنہوں نے ان مقدس ہستیوں کی صحبت اٹھائی اور نفوس قدسیہ کے چشمہائے فیوض سے استفاضہ کیا تھا، جنہوں نے اپنے کردار عمل سے خیر القرون کی یاد تازہ کردی تھی، لیکن چند سالوں سے یہ بساط اتنی تیزی سے سمٹ رہی ہے کہ ہر سمت خاموشی پاؤں پسارے نظر آتی ہے، اللہ رب العزت امت مسلمہ پر رحم فرمائے اور رجال کار کے ذریعہ امت کی دست گیری فرمائے۔آمین!

حضرت مولانا مرحوم کی حیات امت مسلمہ کے لیے عظیم سرمایہ اور بہت بڑی نعمت تھی، قحط الرجال کے اس دور میں ایسی مقتدر، ہمہ جہت اور نابغہ روزگار شخصیات کا اٹھ جانا کسی ادارے یا ملک کا ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کا عظیم خسارہ ہے، کیوں کہ انسانوں پر شدید حال کائنات کے نقشوں کا نقصان یا فقدان نہیں ہے، بلکہ شدید حال علماء ربانیین کا اس فانی دنیا سے رحلت فرما جانا ہے، جس کو حدیث پاک میں "ثلمة لا تسد" فرمایا گیا ہے۔

حضرت مولانا مرحوم کی ستر، اسّی سالوں ـــــ تقریباً ایک صدی ـــــ پر محیط دینی خدمات کے طفیل جو سرمایہ علم وعمل امت مسلمہ کو ملا، جس میں متعدد تحریکات کی قیادت، تصانیف ـــــ جن میں سے بعض بڑی یونیورسٹیوں اور جامعات میں داخل نصاب ہیں ـــــ، مواعظ وخطبات، معاہد ومکاتب کا قیام اور عالم اسلام کے افق پر چمکنے والے آپ کے تلامذہ، نیز ملی قیادتوں اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی سرپرستی کے نتیجہ میں وجود میں آنے والی بے شمار ترقیات ومحاسن، ایں ہمہ، امت کے لیے بڑی روحانی میراث اور امت پر بہت بڑا احسان ہے اور اللہ رب العزت کا دستور ہے کہ وہ مخلصین کو ایسا عملہ عطا فرماتا ہے جو ان کے بعد تمام ذمہ داریوں کا بوجھ ایسے کاندھوں پر اٹھاتے ہیں جس کے باعث ان کا کارواں اپنی منزل کی جانب پیہم گامزن رہتا ہے۔

مولانا مرحوم کا دعوت وتبلیغ کی خدمات کے سلسلہ میں جو کردار وعمل ہے، وہ نہایت طویل بھی ہے اور نا قابل فراموش بھی، تاہم مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے زمانہ سے ہی آپ کا جو تعلق مرکز نظام الدین اور خانوادۂ الیاسی سے رہا وہ بھی آپ کی حیات کا وقیع باب ہے، گویا حضرت الاستاذ سیدی مولانا ابوالحسن علی رحمہ اللہ کا حضرت مولانا الیاس صاحب اور حضرت مولانا یوسف صاحب رحمہما اللہ سے جو تعلق تھا وہ مولانا مرحوم کو دیگر تمام ظاہری وباطنی علوم ومعارف کی طرح میراث میں ملا تھا، چنانچہ ۱۹۴۴ھ میں مولانا مرحوم نے حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کی صحبت میں بنگلہ والی مسجد میں ایک ہفتہ قیام بھی فرمایا، مولانا مرحوم کی وفات یوں تو پورے عالم اسلام اور تمام احباب دعوت کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے، لیکن احقر کے لیے بالخصوص ایک ایسا ذاتی نقصان ہے، جیسے مولانا کے قریبی اعزہ کے لیے، سیدی حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی رحلت کے بعد مولانا نے اپنی شفقتوں اور محبتوں کے باعث گویا مولانا کی رحلت کا درد محسوس نہ ہونے دیا، لیکن شفقتوں اور محبتوں کا یہ خزینہ اور علم وفضل، جہد وعمل میں اسلاف رحمہم اللہ کی یہ نشانی ہم سے چھن گئی اور ہم ایک اور شجر سایہ دار سے محروم ہوگئے۔ أللهم أكرم نزله ووسع مدخله وبرد مضجعه وأدخله دارا خيرا من داره وأهلا خيرا من أهله ونقه من الخطايا كما ينقى الثوب الأبيض من الدنس وباعد بينه وبين خطاياه كما باعدت بين المشرق والمغرب، أللهم لا تحرمنا أجره ولا تفتنا بعده. آمین!

بندہ اور تمام احباب بنگلہ والی مسجد اس الم ناک حادثہ پر مستحق تعزیت ہیں، نیز تمام دینی تحریکات، مدارس، مکاتب اور معاہد جن کی حضرت سرپرستی فرماتے تھے اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے تمام کارکنان، اساتذۂ کرام، تلامذہ، متعلقین، متوسلین اور جملہ پسماندگان کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتے ہیں اور اللہ رب العزت سے دعا گو ہیں کہ اللہ رب العزت مولانا مرحوم کو اپنی رحمتوں میں ڈھانپ کر ابدی راحتیں نصیب فرمائے، اعلیٰ علیین میں پیہم ترقی درجات سے نوازے، پس ماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے اور آپ کے لگائے ہوئے اشجارہ مثمرہ کی تا قیام قیامت آبیاری کرے۔ آمین!

حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ اور ان کی دینی دعوت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

’’مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے مسلمانوں کی دینی حالت کی کمزوری کا احساس کر کے تن من دھن سے اس دینی گراوٹ کو دور کرنے کے کام میں اپنے کو کھپا دیا اور دینی دعوت کے کام کو خاص طریقہ واسلوب سے ایک تحریک بنا دیا جو کہ کتاب وسنت کی تعلیمات کے دائرہ میں رہتے ہوئے حالات اور انسانی مزاج کی رعایت کی حامل ہونے کے ساتھ بڑی اثر انگیز بن گئی اور یہ کام ہریانہ کے علاقہ میوات سے شروع کیا، جہاں کے مسلمان دین سے اتنے دور ہو گئے تھے کہ وہ اپنے کو مسلمان تو سمجھتے تھے لیکن اپنے علاقہ کے غیر مسلموں کی عادتوں کے سلسلہ میں خلط ملط ہو گئے تھے۔ مولانا کو اپنی کوشش میں کامیابی کا جو فائدہ حاصل ہوا، اس کو انہوں نے سامنے رکھتے ہوئے کام کو اور پھیلایا اور پورے ہندوستان میں تبلیغی ودینی دعوت، دینی اصلاح کا ایک بڑا کارگر ذریعہ بن گئی۔ مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے نظام الدین دہلی میں بنگلہ والی مسجد سے تعلق ہونے کی بنا پر وہاں مدرسہ قائم کیا اور اسی مسجد کے ذریعہ سے اپنا دعوتی کام پھیلایا، اس طریقہ سے یہ مرکز دینی تعلیم کا بھی مرکز بنا، اس سے زیادہ دعوت وتبلیغ کی کوششوں کا بھی زبردست مرکز بنا۔‘‘

(ماخوذ از مقدمہ؛ تذکرہ حضرت مولانا محمد زبیر الحسن کاندھلویؒ: ۱۳)

گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

مولانا مفتی محمد قاسم قاسمی
(استاد حدیث ومفتی دارالعلوم زاہدان-ایران)

۱۹۸۰ء سے پہلے کی بات ہے جس زمانے میں؛ میں دارالعلوم کراچی میں زیر تعلیم تھا، اسی زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ہمارے دل میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی محبت ڈال دی اور ان کی کتابوں سے اوران کی تحریروں سے ایک خاص شغف نصیب فرمایا۔اس زمانے میں حضرتؒ کی جو کتاب ملتی تھی ہم اسے فوراً خرید کر پڑھتے تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر بڑا احسان تھا، اس زمانے میں مختلف تنظیمیں اور تحریکیں چل رہی تھی، اگر اللہ کی دست گیری نہ ہوتی اور ہم حضرتؒ کی تصنیفات کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو معلوم نہیں ہم کس وادی میں بھٹک جاتے۔

اس زمانے میں ندوہ سے مختلف رسالے جیسے: ''الرائد'' ''تعمیر حیات'' اور ''البعث الاسلامی''، دارالعلوم کراچی میں حضرت مولانا محمد تقی عثمانی صاحب کے لیے آتے تھے، ان رسائل میں مولانا محمد الحسنی، مولانا سید محمد رابع، مولانا محمد واضح رحمہم اللہ اور ڈاکٹر سعید الاعظمی کے مضامین کو بہت ذوق شوق سے پڑھتا تھا۔ انہی رسائل کے ذریعہ اس خاندان مکرم کی مذکورہ شخصیات سے تعارف ہوا اور اسی زمانے سے حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی محبت کے ساتھ ان تمام حضرات کی محبت بھی دل میں بس گئی۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ سے پہلی ملاقات طالب علمی کے زمانہ میں نصیب ہوئی، جب میں درجہ خامسہ میں دارالعلوم کراچی میں زیر تعلیم تھا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے لکھنؤ کے سفر اور ان حضرات کی زیارت کی توفیق بخشی، جس کی داستان طویل اور شوق ومحبت کی داستان ہے۔

لکھنؤ کا پہلا سفر:

سنہ ۱۴۰۷ھ میں ہمارا لکھنؤ کا پہلا سفر ہوا۔اس سفر میں میرے دو دوست؛ حاجی محمد بخش اور حاجی عبداللہ بھی ساتھ تھے۔ ہم سب بڑے ذوق وشوق سے تہران سے ممبئ اور ممبئ سے دہلی (مرکز نظام الدین) اور وہاں سے لکھنؤ پہنچے۔ دل میں ایک ناقابل وصف شوق اور خوشی کی لہریں دوڑ رہی تھیں۔ جب ہم وہاں پہنچے تو حضرتؒ وہاں تشریف نہیں رکھتے تھے، کسی عربی ملک غالباً مصر کے سفر میں تشریف لے گئے تھے۔ ہم ندوۃ العلماء میں رہے۔ حضرت مولانا معین اللہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ہم پر بہت ہی کرم فرمایا، ہمارا استقبال فرمایا اور حضرتؒ کے سفر پر ہونے کی اطلاع دی۔ ہم انتظار میں رہے اور منٹیں گنتے رہے کہ حضرت کب تشریف لائیں گے۔ حضرتؒ جب تشریف لائے تو بہت ہی کرم کا معاملہ فرمایا اور محبت اور شفقت سے نوازا۔ ہمارا حال پوچھا اور سفر کا مقصد پوچھا۔ ہمارے ملک کے حالات کچھ مختصر دریافت فرمائے۔

اس زمانے میں میری توجہ پوری طرح حضرت مولانا سید ابوالحسن علیؒ کی طرف مرکوز تھی اور زیادہ تر انہی کی خدمت میں رہتا تھا، جتنے دن وہاں رہے ہم حضرتؒ کے دسترخوان میں ان کے ساتھ رہتے تھے اور مادی غذا کے ساتھ معنوی غذا سے بھی مستفید ہوتے رہتے تھے۔

چونکہ حضرت مولانا سید محمد رابع رحمہ اللہ کو پہلے سے ان کی تحریروں کے ذریعہ پہچانتا تھا تو انہی دنوں میں؛ میں نے آپ سے الگ وقت لیا۔ مولاناؒ نے بہت شفقت کا معاملہ فرمایا۔ میں نے عربی

زبان کے سلسلے میں آپ سے رہنمائی چاہی کہ عربی زبان کی تدریس کیسی ہو اور کس طرح عربی زبان کو پھیلایا جائے؟ حضرتؒ نے اپنے تجربے اور طریقے بتائے اور اسے مثالوں کے ذریعہ سمجھایا۔ میں ان کی محبت اور شفقت، کریمانہ اخلاق اور ایک گم نام اور دور افتادہ طالب علم کو اتنا وقت دینے سے بہت متاثر ہوا۔ اسی وقت سے حضرتؒ کی محبت اور عظمت دل میں بیٹھ گئی۔

اسی سفر میں رائے بریلی اور ندوۃ العلماء میں ایک ہفتہ کے قریب لگ گیا اور پھر واپسی ہوگئی۔ واپسی کے بعد بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ سے خط و کتابت جاری رہی اور آپ جواب عنایت فرماتے اور رہنمائی فرماتے۔

لکھنؤ کا دوسرا سفر:

دوسرا سفر ہمارا ۱۴۱۳ھ میں ہوا۔ اس وقت حضرتؒ قید حیات میں تھے اور مولانا سید محمد رابعؒ بھی حضرتؒ کے ساتھ رہتے ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا اور حضرات کی ذرہ نوازیاں اور کرم فرمائیاں ہمارے شامل حال رہیں اور گفتگو اور تبادلہ خیال کے مواقع مل گئے، اپنے استعداد کے مطابق ان حضراتؒ سے فیض یاب ہوئے۔

اس سفر میں ہم نے ایک خاص بات محسوس کی اور وہ یہ کہ جب دسترخوان بچھتا تھا تو حضرتؒ پوچھتے تھے: ”رابع کہاں ہے؟“ محسوس ہوا کہ خاص اہتمام فرمارہے ہیں۔ جب کہ دارالعلوم کے دوسرے اساتذہ حضرات موجود ہوتے، لیکن حضرت رحمۃ اللہ علیہ مولانا محمد رابعؒ کا بہت ہی خیال فرماتے تھے، اس سے اندازہ ہوا کہ حضرتؒ کے ہاں مولانا سید محمد رابعؒ کی الگ شان ہے۔

حضرت مولانا سید ابو الحسن کا سانحۂ ارتحال:

حضرت مولانا سید ابوالحسنؒ کے انتقال سے پہلے میں لکھنؤ کے سفر کی تیاری کرنے لگا اور ویزے کے لیے درخواست دی مگر سفارت کے ذمہ داروں نے کچھ تعصب کا رویہ اختیار کیا، معاملہ کو ٹالتے رہے اور ہمیں بہت انتظار میں رکھا۔ میں نے سفر کے لیے ساز و سامان تیار کیا تھا اور پورا ایک مہینہ انتظار میں گذارا۔

غالباً تئیس کی رات تھی اور ہم کسی دوست کے ساتھ ختم قرآن کے سلسلے میں کہیں جارہے تھے۔ ہمارے ساتھی نے کہا کہ ایک غم واندوہ کی خبر آئی ہے، میں سناؤں یا نہیں؟ وہ چونکہ حضرتؒ سے میری عقیدت اور تعلق سے واقف تھے اور سفر کے لیے تیاری کا بھی انہیں علم تھا، تو انہوں نے ایسی تمہید کے ساتھ بات کی پھر انہوں نے اطلاع کی کہ BBC اخبار کے ذریعہ معلوم ہوا ہے کہ حضرت کا انتقال ہوا ہے۔ یہ خبر ہم پر بجلی کی طرح گری۔ ہم خاموش رہے اور ”انا للہ“ پڑھتے رہے۔ ایک تو حضرت کے ارتحال کی حسرت تھی اور ایک دوسرا یہ کہ باوجود کوشش کے آخری دنوں میں حاضری سے ناکام رہا تھا۔

میں نے یہ مضمون پڑھا بھی تھا کہ کسی بزرگ کے آخری ایام حیات یہ بہت فیض کے ہوتے ہیں۔ بہرحال یہ حسرت تو رہی۔ ہم اسی رات گئے اور ختم قرآن کا اہتمام کیا اور دعائیں کیں، پھر میں نے غالباً اسی رات یا دوسری رات میں دارالعلوم کراچی میں حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کو فون کیا، حضرت نے مجھے فوراً بتایا کہ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ہوا ہے، میں نے کہا: جی! میں نے اسی لیے آپ کو فون کیا ہے کہ آپ مجھے کچھ تسلی دیں گے، حضرت نے تسلی دی اور دعائیں کیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، جانشینوں کو عافیت سے رکھے اور ان کی جگہ پر فرمائے۔

حضرتؒ کے انتقال کے بعد پہلا سفر:

حضرتؒ کے انتقال کے بعد ہمارا دل مرجھا گیا اور سوچنے لگے کہ اب ہم جائیں یا نہ جائیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہاں حضرت مولانا سید محمد رابع ہوں گے اور آپ متفقہ طور پر حضرتؒ کے جانشین بن گئے ہیں، مگر خیال آتا تھا کہ ہر بزرگ کا اپنا ایک مزاج ہوتا ہے تو کیا اب بھی ہمیں وہی محبت اور شفقتیں ملیں گی اور وہی ماحول ملے گا؟!

پھر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ایک بات یاد آگئی، جو حضرتؒ نے پہلے ہی سفر میں ہم سے فرمایا تھا کہ

”آپ ہمارے ہاں اگر ہر سال نہ آسکیں تو ہر دو سال آیا کریں“

ہم نے عرض کیا کہ

’’حضرت! اللہ تعالیٰ آپ کی زندگی میں برکتیں دیں اور آپ کو حیات طویلہ عطا فرمائے، ہم ضرور یہاں آیا کریں گے۔‘‘

حضرت نے فرمایا:

’’ہم رہیں یا نہ رہیں، آپ یہاں آیا کریں۔‘‘

تو اس بات کے یاد آجانے سے ہم نے لکھنؤ کا سفر اور حضرت مولانا سید محمد رابعؒ سے ملاقات کا فیصلہ کیا۔ میرے ساتھ ہمارے ساتھی مولانا عبدالحلیم قاضی صاحب (استاذ وعضو دارالافتاء دارالعلوم زاہدان) تھے، ہم یہاں سے دہلی چلے گئے، وہاں سے ریل کے ذریعہ ہمارا لکھنؤ کا سفر ہوا اور صبح کے وقت لکھنؤ پہنچ گئے۔

حضرت مولاناؒ سے اسی وقت ملاقات ہوئی، پھر ناشتہ میں حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرتؒ نے حال پوچھا اور بہت ہی شفقت اور مہربانی فرمائی، ہم ان کو دیکھتے رہے اور گذشتہ زمانے کو سوچتے رہے، ہم نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا تذکرہ کیا اور اپنی بھی کارگذاری سنائی۔

ہم نے حضرت کی خدمت میں یہ بات بھی عرض کی کہ

’’حضرت! ہم پریشان تھے کہ معلوم نہیں ہم اس مرتبہ لکھنؤ میں آکر کیا دیکھیں گے؟! بڑے حضرت کے بعد کیا ہوگا؟! مگر ہماری خوشی کی انتہا نہیں رہی کہ ہمیں وہی شفقتیں ملیں، وہی قدیم دستور العمل باقی ہے، وہی محبت کی فضا ہے، وہی اساتذہ کا حضرت مولاناؒ کی خدمت میں جمع ہونے کا معمول جاری ہے۔‘‘

حضرت مولانا سید محمد رابع کے سایہ مبارک میں وہی ماحول اور وہی سماں تھا، آپ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی جھلک نظر آتی تھی، شکل وصورت بھی وہی تھی اور سیرت بھی وہی۔ ہم بہت خوش ہوئے اور بہت شکر گذار ہوئے، پھر حضرتؒ کے ساتھ گاڑی میں رائے بریلی بھی گئے، پھر حضرت سے اجازتِ حدیث کی بھی درخواست کی، حضرت نے اپنی سند عطا فرمائی اور محبتوں شفقتوں سے نوازا، دعاؤں سے نوازا اور ہدایا سے بھی نوازا۔

اس زمانے میں حضرت مولانا عبداللہ حسنیؒ بھی قید حیات تھے، ہم ان سے بہت مانوس ہوئے اور ان کے ذریعہ خاندان کے بارے میں بہت معلومات حاصل ہوئیں۔

اس سفر میں اگر چہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے فقدان کی حسرت محسوس رہی تھی، مگر تسلی ہوئی کہ الحمدللہ جگہ پُر ہے اور محبت کا ایک سماں ہے اور وہی سرگرمیاں جاری ہیں۔ ہم بہت خوش ہوئے اور ہم نے اپنے ساتھیوں سے اس کا تذکرہ بھی کیا۔

عطائے نعمت:

اس سفر کے بعد خط وکتابت کا سلسلہ جو پہلے حضرت مولانا سید ابوالحسن صاحبؒ سے تھا، اب مولانا سید محمد رابع صاحبؒ سے جاری رکھا، کبھی براہ راست فون پر بات کرنے اور کبھی دوست احباب کے ذریعہ سلام پہنچانے اور دعائیں لینے کی توفیق ہوتی تھی۔ اسی دوران ہمارے دارالعلوم نوبندیان کے ایک استاذ مولانا محمد یعقوب صاحب کے ذریعہ حضرتؒ کا ایک اجازت نامہ بھی موصول ہوا۔ اس میں حضرتؒ نے فرمایا تھا:

’’آپ سب حضرات سے جو فکری وذہنی ہم آہنگی ہے، اس سے خوشی ہوتی ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی تصنیفات سے اور ان کے فکری مضامین سے آپ حضرات کی طرف سے جو قدردانی سامنے آتی ہے، اس سے اس تعلق کا پتہ چلتا ہے جو آپ حضرات کا ان سے رہا ہے اور جو جاری ہے، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا ایک پہلو ارشاد و بیعت کا بھی تھا، میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہوتے تو آپ کو اجازت دیتے، مجھ کو ان کی طرف سے جو حق حاصل ہے اس کی بنا پر میں ان کی طرف اس کا مستحق سمجھتا ہوں، آپ اس حق کو استعمال کر سکتے ہیں۔‘‘

اس خط میں حضرتؒ نے جن کلمات کے ساتھ ہمت افزائی فرمائی تھی، ہم ان کے اہل نہیں تھے، مگر ہمارے لیے ایک سعادت تھی کہ بزرگوں کا حسن ظن اور دعائیں نصیب ہوئیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابعؒ کی آخری زیارت:

فروری سنہ ۲۰۱۶ء میں ”مجمع الفقه الإسلامي“ کے ایک

اجلاس کے سلسلے میں ہندوستان کا سفر ہوا، یہ اجلاس ریاست آسام میں منعقد ہونے والا تھا اور اس کے لیے حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا تھا۔ ہم پہلے اس اجلاس میں شریک ہوئے۔ جلسے کے اختتام پر ہم لکھنؤ کے ارادہ سے پہلے کلکتہ آئے اور یہاں سے ہوائی جہاز کے ذریعہ لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم نے وہاں جانے اطلاع کی تھی۔

ایئرپورٹ پر دیگر حضرات سمیت مولانا سید محمود حسن حسنی صاحبؒ موجود تھے، جنہوں نے ہماری قدر و قیمت سے بڑھ کر کرم کا معاملہ فرمایا اور ان کے احسانات اور محبتیں کبھی نہیں بھولی جائیں گی۔

وہاں سے ہم حضرت مولانا سید محمد رابعؒ کی خدمت میں پہنچ گئے، ہمارے دوست مولانا مفتی عبدالقادر صاحب بھی ساتھ تھے جن کا حضرت سے قدیم تعلق ہے اور حضرت کے مجازین میں شامل ہیں، کھانے کے بعد حضرتؒ نے حکم فرمایا کہ کچھ عرض کردوں، کچھ طلبہ آئے تھے، غالباً اونچے درجات یا تخصص کے طلبہ تھے، ہم نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے اپنا تعلق اور اس کی وجوہات کا تذکرہ کیا۔

اس کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابعؒ نے بھی کچھ باتیں ارشاد فرمائیں اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خصوصیات بتائیں کہ حضرتؒ پورے عالم کو سامنے رکھ کر بات فرماتے، حضرت میں ایک تڑپ تھی، ایک اخلاص تھا، ایک عالمیت تھی۔ اسی طرح حضرتؒ کے دعوتی مزاج و مذاق اور دعوتی کاموں میں آپ کو جو پیش نظر رہتا تھا اس کا تذکرہ فرمایا۔ اس مجلس سے ہم خوب محظوظ ہوئے۔

دو تین دن جو ہم وہاں رہے تو حضرت مولانا محمد رابعؒ کے دسترخوان پر حاضری ہوتی تھی، حضرت کی صحت کمزور تھی، مگر پوری طرح شفقت فرماتے رہے۔

ایک دن ہم رائے بریلی گئے، یہ جمعہ کا دن تھا، مولانا سید بلال صاحب نے پیغام پہنچایا کہ حضرت مولاناؒ نے بات کرنے اور نماز پڑھانے کا حکم فرمایا ہے، ہم نے معذرت کرنے کی کوشش کی، مگر بالآخر تعمیل حکم کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا، اس لیے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شخصیت کے "عوامل التکوین" (تشکیلی عناصر) پر کچھ باتیں عرض کیں۔

یہ ہمارا آخری سفر تھا جس میں ہم نے حضرت مولانا سید محمد رابع رحمہ اللہ کی زیارت کی اور ان کے فیوض اور کرم نوازی سے سرفراز اور محظوظ ہوئے، مگر کیا خبر تھی کہ یہ ہمارا آخری دیدار ہوگا۔

اس سفر کے بعد بھی تعلق اور خط و کتابت حضرتؒ سے جاری رہی، خیال رہتا تھا کہ حضرت کو تکلیف نہ دیں، پھر بھی جب ہم خط لکھتے تو حضرتؒ کی طرف سے شفقتوں کی بارشیں ہوتی اور بہت ہی عنایات فرماتے تھے، جب بھی رہنمائی کی ضرورت ہوتی تو حضرت والاؒ فوراً رہنمائی فرماتے رہے، ہم حضرت کو اپنے کام اور سرگرمیوں کی اطلاع دیتے اور ان سے دعا اور رہنمائی کی درخواست کرتے، حضرت رحمہ اللہ بھی برابر شفقت فرماتے رہے۔

ایک بات جسے ہم بھول نہیں سکتے اور جو اعلیٰ اخلاق اور کرم نوازی کا مظاہرہ ہے، یہ کہ ہمارے ذاتی حادثے جو پیش آتے، خاص کر جب چند سال پہلے میرے دو فرزند اویس اور انس کا انتقال ہوا اور اس سال میری والدہ صاحبہؒ کا انتقال ہوا، تو حضرتؒ اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود تعزیت کا اہتمام فرماتے اور انتہائی موثر کلمات کے ساتھ تسلی کا پیغام ارسال فرماتے، اس چیز سے ہم بہت احسان منداور بہت محظوظ ہوئے اور تعجب ہوا کہ ایسی شخصیت جو اتنی مصروف، مفکر اسلامؒ کے جانشین اور اتنے بڑے ادارہ کے اور متعدد تنظیموں کے سرپرست تھے، اتنا اہتمام فرماتے ہیں! حضرت کی شفقت کی کوئی انتہا نہ تھی، آپ ہمارے لیے ایک سرپرست، مرشد اور رہنما اور معنوی باپ تھے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی شفقتیں اور دعائیں نصیب فرمائی۔

"آن غم تازہ شد":

اس سال یہی تمنا تھی کہ حضرتؒ کی زیارت نصیب ہوگی، مگر دونوں ملکوں کے حالات اور ویزہ کے معاملات میں سختی کی وجہ سے سفر کا بندوبست نہ ہوسکا، یہاں تک کہ رمضان کے عشرۂ اخیرہ میں

حضرت مولانا کے سانحہ ارتحال کی اچانک اطلاع آئی اور ایک دم سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی رحمہ اللہ کی جدائی کا غم تازہ ہوا اور بے ساختہ فارسی کا ایک جملہ زبان پر آیا کہ: ''آن غم تازہ شد.''

بہت ہی محرومی کا احساس ہوا اور افسوس ہوا، اس لیے کہ ہمارے لیے اور پورے عالم اسلام کے لیے آپ کی شفقتیں تھی، دعائیں تھی اور معتدلانہ، مشفقانہ، ناصحانہ رہنمائیاں تھیں، جن سے اب ہم محروم ہوگئے۔

یہ بات بھی عرض کرنا مناسب ہوگا کہ حضرت کے سانحہ ارتحال کے بعد ہمیں بھی یہ فکر لاحق ہوئی کہ حضرتؒ کے بعد کیا صورت حال ہوگی اور کون آپ کی ذمہ داریوں کو سنبھالیں گے؟ البتہ ایک طرح سے اطمینان بھی تھا کہ جس طرح حضرت مولانا سید ابوالحسن علیؒ کے بعد اللہ تعالیٰ نے مولانا محمد رابع کو یہ مقام عطا فرمایا، تو اب بھی کرم فرمائیں گے، لیکن بہر حال ایک پریشان کن خبر تھی، تو دعائیں بھی کر رہے تھے اور ندوۃ العلماء کے دیگر محبین سے بھی دعائیں کروا رہے تھے، یہاں تک کہ خبر آئی کہ مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی حفظہ اللہ، جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے تربیت یافتہ اور ان کے خادم خاص رہے تھے اور مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے اور اس خاندان کی ہر دل عزیز شخصیت ہیں، اللہ تعالیٰ نے سب اہل ندوہ کو اور اہل شوریٰ کو ان کی طرف متوجہ فرمایا ہے، اس فیصلہ سے بہت اطمینان ہوا۔ اب امید ہے کہ ان شاء اللہ وہی ماحول قائم رہے گا اور وہی امت کو شفقتیں اور خیر و برکات ملیں گی۔

ہماری دلی تمنا اور امید ہے کہ حضرت مولانا بلال حسنی حفظہ اللہ، مولانا سید جعفر مسعود صاحب، مولانا محمد امین صاحب اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دیگر ذمہ داران، حضرت مولانا محمد رابع رحمہ اللہ کے بہترین جانشین ثابت ہوں گے۔

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرتؒ کے درجات بلند فرمائے اور ہر طرح کی رحمتیں جو خاص بندگان کو عطا ہوتی ہیں، آپ کو عطا فرمائے اور آپ کو اپنے آباء و اجداد صالحین کے ساتھ ملحق فرمائے اور آپ کے جانشینوں کی رہنمائی اور مدد فرمائے اور آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللہ تعالیٰ ندوۃ العلماء کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق اور عالمی حالات کے پیش نظر اور جن اصولوں پر مدرسہ کی بنیاد رکھی گئی تھی کہ معاشرے کے تمام طبقات پر توجہ ہو اور دارالعلوم سب کے لیے رہنمائی اور خیر کا منشا ہو اور دوسرے علمائے اسلام کا اعتماد حاصل ہو، ان سب اصولوں کے مطابق کوششیں جاری رکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور عالم عربی کے ساتھ جو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے زمانے سے رہنمائی اور ارشاد کا تعلق تھا، وہ اب بھی قائم رہے، بلکہ امید ہے کہ اللہ تعالیٰ گذشتہ سے بھی بہتر طریقے سے ان ذمہ داریوں کو سرانجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللّٰهم اغفر له وارحمه وعافه واعف عنه وأكرم نزله و وسع مدخله و أبدله دارا خيرا من داره و أهلا خيرا من أهله وارزق أهله و ذويه وارزقنا جميعا الصبر والسلوان، اللّٰهم لا تحرمنا أجره و لا تفتنا بعده.

حضرت مولاناؒ کی نسبتِ اتحادی

''یہ بات بالکل صحیح ہے کہ اللہ والے سے کسی کا تعلق اس سے نسبت اتحادی پیدا کر دیتا ہے، حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے صرف اصلاح وتربیت ہی کا نہیں، خاندان کا تعلق بھی ہے، ہر آن و ہر لمحہ صحبت و معیت کا تعلق رہا ہے، قدم بہ قدم اور موقع بہ موقع رہبری و رہنمائی کا تعلق رہا ہے، باطن و ظاہر اور فکر و نظر کا تعلق رہا ہے، ان کے منظور نظر اور رفیق سفر و حضر رہے ہیں، پھر ان میں حضرت مولانا مرحوم کے علوم و معارف کیوں نہ ہوں؟ پھر وہ حضرت مولانا کی جانشینی کے مستحق کیوں کر نہ ٹھہریں؟ پھر ان میں حضرت کی جھلک کیوں نہ ہو؟'' (تحفہ گجرات:۱۹)

حضرت مولانا محمد مفتی احمد دیولوی صاحب دامت برکاتہم

کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گذر گئے

مولانا عبدالعلیم فاروقی
(مہتمم دارالمبلغین - لکھنؤ)

کیا لوگ تھے جو راہِ وفا سے گذر گئے
جی چاہتا ہے نقش قدم چومتے چلیں

انعامات حضرت حق تعالیٰ جل مجدہ کی جانب سے عطا کیے جاتے ہیں، وہ جس انعام کے لیے اپنے بندوں میں سے جس کا چاہے انتخاب کرے، نبوت، رسالت، صحابیت، ولایت، فقاہت وغیرہ جیسے دینی انعامات ہوں، یا دولت، عہدہ، منصب اور امارت وغیرہ جیسے دنیوی انعامات ہوں، سب عطائے رب سے ہی بندوں کو ملتے ہیں، اس کے بعد آتی ہے بندہ کی ذمہ داری کی بات کہ وہ اس انعام کی قدر کرتا ہے یا ناقدری؟ اپنے پروردگار کا شکر گذار ہوتا ہے یا ناشکرا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس انعام کو وہ اپنی صلاحیت وخوبی کا نتیجہ قرار دیتا ہے یا اپنے پروردگار کی عطا وبخشش؟!

ہمارے مخدوم حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کو حق تعالیٰ نے اپنے انعامات کے لیے منتخب کیا، وہ جس وقت ہماری اس دنیا سے رخصت ہوئے ہیں، اس وقت نہ صرف اپنے ملک ہندوستان بلکہ ساری دنیا کے دینی حلقوں کے لیے مرجع کی حیثیت کے حامل تھے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ندوۃ العلماء، دارالعلوم دیوبند، دینی تعلیمی کونسل، رابطہ ادب اسلامی سے لے کر رابطہ عالم اسلامی، آکسفورڈ، اسلامک سینٹر لندن اور اس جیسے دیگر ملکی وبین الاقوامی اداروں وتنظیموں سے ان کا سربراہانہ رشتہ تھا، وہ محبوب العلماء والاکابر تھے، وہ عوام کے ہر دل عزیز قائد تھے، ان سب کے باوجود وہ انتہائی متواضع، خلیق، مرتبہ شناس، نسبتوں کے قدرداں، زاہد شب بیدار اور اپنے اکابر خصوصاً اپنے مربی وشیخ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ایک ایک نقش قدم کو حرز جاں بنانے والے اور اپنے خردوں کے حوصلوں کو پرواز عطا کرنے والے، ملت اسلامیہ اور اپنے وطن عزیز کی فکر میں غلطاں وپیچاں رہنے والے ایک ایسے عظیم قائد تھے جن کی مثال ملنا آسان نہیں ہے اور یہ سب صرف اس لیے تھا کہ انہوں نے اپنے کسی کمال کو ذاتی نہیں بلکہ اپنے پروردگار کی عطا سمجھا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی ذات گرامی پوری ملت اسلامیہ اور بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کے لیے غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی، مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے آپ حقیقی بھانجے تھے، تعلیمی فراغت کے بعد آپ نے اپنی ساری زندگی انہی کے ساتھ گذاری، یہاں تک کہ آپ اپنے ماموں جان کے ہم رنگ اور ہم مزاج ہوگئے اور اخیر عمر میں بالکل ہم شکل بھی ہوگئے۔

حضرت مولاناؒ کی شخصیت کے اس پہلو کو بطور خاص سمجھنے کی ضرورت ہے کہ انہوں نے اپنے اکابر سے اسی طرح عطر کشید کیا تھا، جس طرح ان کے ماموں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے کشید کیا تھا، ان کی عادت تھی کہ وہ بزرگان دین کو تلاش کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کی باتیں سنتے تھے، ٹھیک اسی طرح حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی بھی عادت تھی کہ انہیں بزرگوں سے حقیقی عشق تھا اور ان کے متعلق بیش قیمت معلومات تھیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو ایسے وقت، ایسے دن اور ایسے مہینہ میں اپنے پاس بلایا جو انتہائی مبارک ہے، یہ بھی حسن اتفاق ہے کہ حضرت مولانا علی میاںؒ کی وفات ۲۲؍رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ کو ہوئی اور وہ جمعہ کا دن تھا، اسی طرح حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی وفات ۲۱؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ کو ہوئی اور وہ جمعرات کا دن تھا، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی نماز جنازہ شب قدر میں ہوئی اور ان کے جانشین حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی نماز جنازہ شب جمعہ میں ہوئی، ظاہر ہے ان مناسبتوں کو ہم نیک فال سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات کو بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

آبروئے بزم

مولانا احمد لاٹ صاحب ندوی
(مرکز تبلیغ - نئی دہلی)

اللہ کے رسول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"العلماء ورثة الأنبياء."(سنن أبی داؤد: ۳٦٤۳)

(علماء انبیاء کے وارثین ہیں)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ انبیاء کے حقیقی وارث تھے، اللہ رب العزت کا شکر واحسان ہے کہ اس نے حضرت مولاناؒ سے قربت کے بہترین مواقع مجھ گنہگار کو نصیب فرمائے اور مجھے ان کی صحبتیں اور شفقتیں مسلسل حاصل رہیں۔

بندہ نے آپ کی شخصیت میں اولیاء اللہ کی تمام صفات دیکھیں، لیکن یہ بڑا المیہ ہے کہ ہم ایک مردہ پرست قوم بن چکے ہیں اور حالی کی زبان میں ہندوستان کی زمین اکال الامم ہے جہاں عظیم شخصیات کو ان کی زندگی میں سمجھا نہیں جاتا اور نہ ہی ان کی قدر کی جاتی ہے، البتہ جب ان کا انتقال ہو جائے تو ان پر مرثیہ خوانی ضرور ہوتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی بزرگ شخصیت کی ہم سے وہ قدر نہ ہو سکی جس کے وہ حق دار تھے، بس رسماً آتے جاتے رہے اور دیکھتے رہے، لیکن ان سے جو چیزیں ہمیں لینے کی ضرورت تھی، ہم انہیں کما حقہ حاصل نہ کر سکے۔ اللہ تعالیٰ ہماری کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور حضرت کے درجات بلند کرے۔ آمین!

حضرت الاستاذ مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے اندر ہم نے منجملہ تمام اوصاف کے امانت داری کا وصف بہت نمایاں طور پر دیکھا، جس زمانہ میں ہم دار العلوم ندوۃ العلماء میں زیر تعلیم تھے، اس دوران ایک مرتبہ حضرت مولانا رابع صاحبؒ ہمارے درجہ میں تشریف لائے اور فرمایا کہ آج ہم تم لوگوں کو سبق نہیں پڑھا سکتے، طلبہ نے عرض کیا کہ حضرت! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے اور مزاج کیسے ہیں؟ آپ نے فرمایا: الحمد للہ ہماری طبیعت بہت اچھی ہے، لیکن بات یہ ہے کہ جس طرح ہم تم سے کہتے ہیں کہ بغیر مطالعہ کے پڑھنا ناجائز ہے، ٹھیک اسی طرح ہمارے لیے بھی بغیر مطالعہ کے کتاب پڑھانا درست نہیں ہے اور رات کچھ ایسی مصروفیات رہیں جن کے سبب ہم مطالعہ نہ کر سکے۔

حضرت مولاناؒ کی ایسی غایت درجہ احتیاط دیکھ کر آج بھی حیرانی ہوتی ہے، اگر وہ چاہتے تو اس وقت پڑھا سکتے تھے، کیونکہ جو پڑھانا تھا وہ خود انہی کی تصنیف تھی، غالباً "مختار الشعر العربی" یا "منثورات من أدب العرب" میں سے کوئی ایک کتاب تھی، مگر آپ نے اپنی تصنیف ہونے کے باوجود بھی احتیاط کے پیش نظر نہیں پڑھایا اور فرمایا:

"آج ہم نے کتاب کا مطالعہ نہیں کیا ہے، اس لیے ہم تمہیں سبق نہیں پڑھا سکتے، لیکن جب تک ہمارا گھنٹہ ہے تب تک یہ وقت تمہارا ہے، اس لیے ہم تمہارے ساتھ بیٹھا رہیں گے، اگر کچھ پوچھنا ہو تو سوال کر سکتے ہو۔"

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو جامع الکمالات والصفات ایسے ہی نہیں بنایا تھا، بلکہ اس کے پیچھے ان کے بڑوں کی دعائیں اور غیر معمولی تربیت بھی شامل تھی، جس کے نتیجہ میں ان کو یہ بلند مقام حاصل ہوا، اسی کے ساتھ ان کے اندر سعادت مندی کا جوہر بھی قابل ذکر ہے۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی وفات کے بعد ایک مرتبہ احمد آباد میں حضرت مولانا رابع صاحبؒ سے میری ملاقات ہوئی، میں نے عرض کیا: حضرت مولانا تو دنیا سے تشریف لے گئے، اب

آپ ہی ہیں جو ہماری رہبری فرمائیں گے اور ہم پر شفقت فرمائیں گے، تو اس موقع پر حضرت نے دیر تک قیمتی باتیں ارشاد فرمائیں۔

اسی مجلس میں بندہ نے بھی اپنا ایک قصہ بیان کیا کہ ایک مرتبہ ندوہ میں ہم ''النادی العربی'' کے پروگرام میں تقریر کر رہے تھے اور حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ چپکے سے ہمارے پیچھے آکر بیٹھ گئے، اس وقت ہماری تقریر کا موضوع حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے گفتگو کرنا تھا، جس میں ہم نے دوران تقریر ''قال منہ'' کہہ دیا، چنانچہ حضرت مولاناؒ نے فوراً پیچھے سے فرمایا کہ ''قال'' کا صلہ ''منہ'' نہیں ''لہ'' آتا ہے۔

میرا یہ قصہ سنتے ہی حضرت مولانا رابع صاحبؒ نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا اور فرمایا کہ ماشاء اللہ آپ خوش نصیب ہیں، آپ کو حضرت مولاناؒ کی شفقتیں حاصل رہی ہیں، آپ کی اصلاح ہوئی اور حضرت مولاناؒ نے لقمہ دیا، مگر یہی واقعہ جب ہمارے ساتھ پیش آیا تھا اور ہم نے ''لہ'' کی جگہ ''منہ'' کا صلہ استعمال کر دیا تھا تو ماموں جان نے باقاعدہ تنبیہ کے ساتھ مار بھی لگائی تھی۔

اس واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت مولانا سید محمد رابع صاحبؒ کی کیسی اعلیٰ تعلیم وتربیت ہوئی ہے۔

اللہ پاک دینی اداروں کو ان حضرات کا نعم البدل نصیب فرمائے، ادارہ کی ظاہر و باطن، اندر و باہر کے ہر شر سے پوری طرح حفاظت فرمائے۔ اللہ پاک ادارہ کو علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا رابع صاحب رحمہم اللہ جیسی عظیم شخصیات کا نعم البدل نصیب فرمائے۔ اسی کے ساتھ اپنے موجودہ اکابر بالخصوص حضرت الاستاذ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم اور دیگر اساتذہ کی قدر کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور اس دنیا سے جانے والوں کو اللہ پاک کروٹ کروٹ چین نصیب کرے اور وہاں کی بہاروں سے مالا مال فرمائے۔ آمین!

علماء کی ذمہ داری

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''تبلیغ الی الناس یہ ہے کہ لوگوں کے پاس جا کر ان کو دین کے احکام، شریعت کی باتیں، سنت کا طریقہ اور اخلاص و اخلاق کی باتیں بتائی جائیں، یہ دعوت و تبلیغ علماء کی ذمہ داری اور فریضہ ہے، علماء کا اس سے غفلت برتنا گناہ کی بات ہے، ہمارے بزرگوں کا طریقہ یہ رہا ہے کہ ایک طرف ان کے ذاتی مفادات اور تقاضے سامنے تھے، دوسری طرف دعوت و تبلیغ کا اپنا تقاضا تھا، جو امت اور انسانیت کا تقاضا تھا، تو وہ امت اور انسانیت کے تقاضے کو اپنے تقاضوں پر ترجیح دیتے تھے۔ یہ بات اللہ کو پسند ہے اور یہ اللہ کے یہاں مقبولیت کا بڑا ذریعہ بنتی ہے۔ اس لیے دین کی باتوں کو دوسروں تک پہنچانے اور آخرت کی فکر کرنے اور دوسروں کو آخرت کی فکر کی طرف متوجہ کرنے کی ذمہ داری بنتی ہے اور یہ چیز قرآن وحدیث سے معلوم ہوگی، ہمارے مدارس میں جن علوم کی تعلیم دی جاتی ہے، یہ اس وقت صحیح طور پر حاصل ہوگی جب عربی اچھی ہوگی، اسی صورت میں صحیح عالم وداعی بنایا جاسکے گا، قرآن وحدیث کی تعلیمات کے سانچہ میں اپنی زندگی اور طور وطریق کو ڈھالنا صرف عالم اور طالب علم اور مدرسہ وخانقاہ میں رہنے والوں کی ذمہ داری نہیں ہے، ہر مسلمان کو ایسا ہونا چاہیے کہ وہ اسلام کے تمام مطالبات اور تقاضوں کو سامنے رکھے اور اپنی زندگی اس کے مطابق ڈھالے، کل مسلمان اور مکمل اسلام کی بات ہے اور اسی کا مطالبہ سارے مسلمانوں سے ہے۔'' (تحفہ گجرات:۵۱)

غضب تو یہ ہے کہ اب آفتاب ٹوٹا ہے

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
(جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

راقم الحروف کو جن موضوعات پر قلم اٹھانے میں قلبی مسرت ہوتی ہے، اور الفاظ کو جذبات کی رفاقت حاصل رہتی ہے، ان میں ایک داعیان دین اور محافظین شرع متین کا ذکر خیر بھی ہے، اسی لیے اس حقیر نے بہت سے بزرگوں کے بارے میں مختلف مناسبتوں سے اپنے جذبات واحساسات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ایسے مضامین کا ایک مجموعہ ''وہ جو بیچتے تھے دوائے دل'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ اور اس موضوع کے مزید اتنے مضامین موجود ہیں جن کی کم سے کم ایک جلد ہو سکتی ہے۔

لیکن آج جب میں اپنے بزرگ، ملت اسلامیہ کی متاع بے بہا، فکر اسلامی کے ترجمان، بلند پایہ معلم، نبض شناس مصلح، داعی اور زمانہ آگاہ قائد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ پر یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو دل بہت بوجھل ہے، الفاظ کی تنگ دامانی درپیش ہے، جی چاہتا ہے کہ قلم کی روشنائی سے نہیں، بلکہ خون جگر کے قطرات سیہ سطریں لکھی جائیں، جس میں صاحب تذکرہ کیلئے نذرانہ عقیدت بھی ہو اور اَخلاف کے لیے روشنی بھی، مولانا کی وفات کے بعد کئی لوگوں نے ان کے گزرنے پر یہ شعر نقل کیا ہے:

ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں روز وشب لیکن
غضب تو یہ ہے کہ اب آفتاب ٹوٹا ہے

اگرچہ میں میں عام طور پر دوسروں کے عنوان کو اپنا عنوان بنانے سے احتیاط کرتا ہوں؛ کیوں کہ اس سے التباس پیدا ہوتا ہے؛ لیکن آج مولانا کی شخصیت پر لکھتے ہوئے مجھ کو اس سے زیادہ موزوں اور حالات کا عکاس کوئی دوسرا شعر نہیں مل سکا۔

حضرت مولانا کو دور سے تو میں نے زمانہ طالب علمی سے دیکھا ہے، میں جب دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوا تو اپنے وطن جاتے ہوئے لکھنؤ میں ٹرین کے طویل توقف سے فائدہ اٹھا کر ندوہ پہنچ گیا، موجودہ طویل اور وسیع عمارتوں کے مقابلہ اس وقت ندوہ کی چند ہی عمارتیں تھیں، مسجد بھی موجودہ مسجد کے مقابلہ کافی چھوٹی تھی، وہاں ایک شخصیت پر نظر پڑی، سفید کرتا پاجامہ، اس پر ہلکے کلر کی شیروانی اور اسی کپڑے کی ٹوپی، بہت کھلا ہوا رنگ، ڈاڑھی کا غالب حصہ سفید، پورا سراپا ایسا کہ جس کی طرف دل کو کشش ہو، طلبہ نے بتایا: یہی ہیں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، جو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے دست راست اور معتمد ترین شخصیت ہیں، اس کے بعد پھر عرصہ تک مولانا سے ملاقات کی سعادت حاصل نہیں ہوئی؛ کیونکہ اس وقت مولانا جلسوں جلوسوں سے دور رہتے تھے، عوامی تقریریں بھی نہیں کرتے تھے، اگرچہ بیرون ملک کے سفر میں حضرت مولانا علی میاںؒ ان کو اپنے ساتھ رکھتے تھے؛ لیکن اندرون ملک وہ زیادہ تر ندوہ کے کام کے لیے یکسو رہتے تھے، اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ وہ اس وقت ندوہ کا دماغ تھے۔

مولانا اپنی تواضع اور منکسر المزاجی کی وجہ سے پہچانے بھی نہیں جاتے تھے، اس سلسلے میں ایک واقعہ یاد آیا: مولانا عبدالکریم پاریکھ حضرت مولانا علی میاںؒ کے مسترشد اور مجاز تھے، اور برادران وطن میں دعوت کے کام کے سلسلہ میں ان کو حضرت کی خصوصی سرپرستی حاصل تھی، اللہ تعالیٰ نے ان کو مضامین قرآن پر بڑا عبور عطا فرمایا تھا، اپنے خطاب میں آیات قرآنی کے ٹکڑوں کو اس خوبصورتی سے نقل کرتے

تھے کہ گویا یہ آیت اسی موقع کے لیے نازل ہوئی ہے، ان کے درس قرآن کے سلسلہ کی تکمیل ہورہی تھی، اس مناسبت سے جامع مسجد مومن پورہ میں ایک خصوصی اجلاس رکھا گیا، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ نے معوذتین اور سورہ بقرہ کے پہلے رکوع کا درس دے کر تکمیل فرمائی، حضرت مولاناؒ کے ساتھ ندوہ سے مولانا پاریکھ صاحب کے متعلقین کا ایک وفد بھی آیا تھا، اورانہوں نے حیدرآباد سے مولانا محمد رضوان صاحبؒ کواوراس حقیر کوبھی مدعوکرلیا تھا، ندوہ کے وفد میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ بھی شامل تھے، جب جلسہ شروع ہوا تو ہم لوگوں کو شہ نشیں پر بٹھایا گیا؛ لیکن مولانا رابع صاحبؒ عوام کے مجمع میں دوزانو بیٹھے ہوئے تھے، میں نے دور سے مولانا کو پہچانا، اور پروگرام کے بعض منتظمین کوتوجہ دلائی کہ ان کوشہ نشیں پر بلایا جائے، لیکن بعض دفعہ سادگی اور انکساری بھی شخصیت کو پہچاننے میں رکاوٹ بن جاتی ہے؛ چنانچہ انہوں نے توجہ نہیں کی، پھر میں نے مولانا پاریکھ صاحب کے رفقاء میں سے ایک نسبتاً سمجھدار اور باخبر صاحب کو بتایا کہ آپ ان کے تواضع سے دھوکہ نہ کھایئے، اس مجمع میں جتنے علماء ہیں، وہ ان کے شاگرد ہیں یا شاگردوں کے ہم عصر ہیں اور کئی تو ان کے شاگردوں کے شاگرد ہیں، تب وہ مولانا کو اسٹیج پر بلاکر لائے، مولانا نے پہلے انکار کیا پھران کے اصرار پر آگئے، یہ مولانا سے میری دوسری ملاقات تھی، جس میں آپ سے کوئی بات چیت تو نہیں ہوئی لیکن حال کا اثر قال سے زیادہ ہوتا ہے، میں بہت متاثر ہوا کہ اتنے بڑے ادارے کے ذمہ دار، مصنف، ادیب اوران کا یہ تواضع!

انہوں نیحضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی زندگی میں کچھ اس طرح اپنے آپ کو چھوٹا بنا کر رکھا اور پچھلی صف کو اپنی جگہ بنایا کہ ندوہ آتے جاتے بھی ان کے حقیقی مقام ومرتبہ کا ادراک نہیں ہوسکا، بس اتنی بات ذہن میں رہی کہ ایک اچھے مدرس، عربی زبان کے ادیب اور بااخلاق شخص ہیں، مولانا کوقریب سے دیکھنے کا موقع اس وقت ملا جب حضرت مولانا محمد رضوان قاسمیؒ کی پہل پر دارالعلوم سبیل السلام میں رابطہ ادب اسلامی کا سمینار منعقد ہوا، حضرت مولانا علی میاںؒ اگرچہ رابطہ کے ذمہ دار اعلیٰ تھے مگر سارا انتظام وانصرام حضرت مولانا رابع صاحبؒ سے متعلق تھا، سبیل السلام میں مولانا رضوان صاحب نے اندرونی انتظام کی ذمہ داری مجھ سے متعلق کردی تھی، اہل قلم کی ایک بڑی تعداد سمینار میں شرکت کے لیے آرہی تھی۔ سمینار سے ایک دن پہلے حضرت مولانا رابع صاحبؒ اپنے رفقاء کے ساتھ تشریف لے آئے، آتے ہی چائے وغیرہ پینے کے بعد انہوں نے سمینار کے انتظامات کی تفصیل جاننی چاہی، مولانا رضوان صاحب نے مجھے مامور کیا کہ ساری تفصیلات ان کے سامنے رکھ دوں، میں نے ان کے سامنے مجلس استقبالیہ کی تشکیل، ریلوے اسٹیشن سے مہمانوں کا استقبال، سمینار ہال، مہمانوں کے لیے کمروں کی تعیین اور جن مہمانوں کو جو کمرے دیئے گئے، ان کی مصلحت وغیرہ، مہمانوں کی واپسی تک کا پورا نظام ترتیب وار رکھ دیا، مولانا بہت خوش ہوئے اور فرمانے لگے: ”آپ نے ایک ہی دفعہ میں اتنے مرتب طور پر پورے نظام کو سامنے رکھ دیا کہ ساری باتیں علم میں آگئیں، اس سے مجھے بہت اطمینان ہوا“ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس انتظام میں کئی جگہ آپ نے تبدیلیاں بھی کرائیں، ایک صاحب جو خطابت کے میدان میں بہت مقبول تھے، ان ہی کے کمرہ میں، میں نے دو اور اصحاب علم کو بھی رکھا جو علی گڑھ سے تھے، مولانا نے ان حضرات کے بارے میں فرمایا: یہ اصحاب علم اور سنجیدہ لوگ ہیں، اُن کو اِن صاحب کے ساتھ نہ رکھیے، تو اندازہ ہوا کہ وہ کس قدر دقت نظر سے مسائل کو دیکھتے تھے۔

اس سمینار میں علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خطبات پر میں نے بھی اپنا مقالہ پیش کیا، مولانا نذرالحفیظ ندوی صاحبؒ نظامت کر رہے تھے، جب میں اپنے مقالہ کی خواندگی سے فارغ ہوا تو حضرت مولانا رابع صاحبؒ اوران کے برادر خورد حضرت مولانا محمد واضح صاحبؒ دونوں نے خوب حوصلہ افزائی فرمائی اور کہا: آپ جتنے فقیہ ہیں، اتنے ہی ادیب بھی ہیں۔

اس کے بعد مدتوں حضرت مولانا سے کوئی رابطہ نہیں ہوا، جب حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی وفات ہوئی، تب مولانا سے رابطہ بڑھا اور ندوہ کی آمدورفت میں بھی اضافہ ہوا، پھر حضرت مولانا قاضی

مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات کے بعد باتفاق رائے صدر بورڈ کی حیثیت سے آپ کا انتخاب عمل میں آیا، اس وقت بعض حضرات کو اس میں تامل تھا، ان کا خیال تھا کہ مولانا مدرسہ کی دنیا کے آدمی ہیں اور خلوت نشینی کا مزاج رکھتے ہیں؛ لیکن بورڈ کے سابق جنرل سکریٹری حضرت مولانا سید نظام الدین صاحبؒ بورڈ کی صدارت کے لیے آپ کو موزوں ترین شخص سمجھتے تھے، انہوں نے کہا: میں نے بہت قریب سے مولانا رابع صاحبؒ کو دیکھا ہے اور میرا یقین ہے کہ وہ اس عہدہ کے لیے بہت مفید شخص ثابت ہوں گے اور واقعی ایسا ہی ہوا پھر جب آپ بورڈ کے صدر بنے اور بورڈ کی میٹنگوں میں آپ سے ملاقات ہوئی تو یہ قرب بہت بڑھ گیا، تقریباً ہر اجلاس کے بعد مولانا تنہائی میں میرے مشوروں کو سراہتے، افسوس کہ حضرت مولانا نظام الدین صاحبؒ پر بعض لوگوں کی طرف سے بے جا اعتراضات اٹھائے جاتے اور ان کی ہتک کرنے کی کوشش کی جاتی، میں مدلل تردید کرتا اور ٹھنڈے لب ولہجہ میں، سنجیدگی کے ساتھ، اس کی داد دیتے اور گاہے فرماتے: میری اور آپ کی رائے میں بہت ہم آہنگی ہے، میں آپ کے دور صدارت سے پہلے عام رکن تھا، آپ ہی کے عہد میں مجھے ۲۰۰۷ء کے اجلاس چنئی میں مجھے عاملہ کا رکن اور ۲۰۱۰ء کے اجلاس اورنگ آباد میں سکریٹری بنایا گیا، جو دور تک میرے گمان میں بھی نہیں تھا اور پھر جب ۳؍اپریل ۲۰۲۱ء کو حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانیؒ کی وفات ہوئی تو ایک دو دنوں کے اندر ہی آپ نے اس حقیر کو کارگزار جنرل سکریٹری مقرر کر دیا، بہر حال سکریٹری بنائے جانے سے پہلے بھی وہ بورڈ کے بہت سے مسائل میں نجی طور پر حضرت مولانا نظام صاحبؒ کے ساتھ ساتھ مجھ کو بھی شریک مشورہ رکھتے تھے۔

حضرت مولانا نظام الدین صاحبؒ کی وفات کے بعد میں کسی مناسبت سے ندوہ پہنچا، آپ مولانا واضح صاحبؒ کے ساتھ تشریف فرما تھے، بعض اور حضرات بھی تھے، مولانا نے ان کو باہر جانے کا اشارہ کیا، پھر مولانا واضح صاحبؒ نے مجھ سے استفسار کیا کہ جنرل سکریٹری کے سلسلہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟ میں نے حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی صاحبؒ کا نام لیا، انہوں نے فرمایا: بھائی صاحب کے پاس جو خطوط آرہے ہیں، ان میں زیادہ تر لوگ آپ کا نام لکھ رہے ہیں، میں نے کہا: یہ بالکل مناسب نہیں ہوگا، مولانا ولی صاحبؒ میرے بڑے ہیں، استاذ ہیں اور ان کے والد میرے بڑے محسن ہیں اور جہاں تک کام کی بات ہے تو جو کام میرے حوالہ کیا جائے گا ان شاء اللہ اس میں میری طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوگی اور سکریٹری ویسے بھی آپ نے مجھے بنا ہی دیا ہے، حضرت مولانا رابع صاحبؒ اس بات سے بہت خوش ہوئے، کہنے لگے: آپ نے میری بڑی الجھن دور کر دی پھر دیر تک دعاء دیتے رہے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے بعد آپ ندوۃ العلماء کے ناظم بنے، آپ کے ہی دور میں ندوہؒ کی مجلس شوریٰ کے لیے میرا انتخاب ہوا، ظاہر ہے کہ اس میں آپ کا اشارہ شامل تھا، پھر ندوہ کی اعلیٰ ترین انتظامی کمیٹی ''مجلس نظامت'' جو اصل میں سارے فیصلے کرتی ہے اور مجلس منتظمہ اس کی تصدیق کرتی ہے' کا مجھے رکن نامزد کیا، بورڈ کی اکثر ذیلی کمیٹیوں میں بھی آپ نے مجھے کنوینر مقرر کیا اور جب حضرت مولانا محمد برہان الدین سنبھلیؒ کی وفات کے بعد ندوہ میں مجلس تحقیقات شرعیہ کی تجدید ہوئی تو اس میں بھی مجھے رکن نامزد فرمایا، غرض کہ میرے لیے سعادت وشرف کی بات ہے کہ مجھے ہمیشہ ان کے اعتماد کی دولت حاصل رہی، وہ بورڈ کے مسائل میں بھی اور کبھی کبھی ندوہ کے تعلیمی نظام کے سلسلہ میں بھی مجھ سے مشورہ کر کے عزت افزائی فرماتے تھے، ظاہر ہے یہ ان کی بڑائی تھی۔

میری درخواست پر انہوں نے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی سرپرستی قبول فرمائی، آپ نے میری درخواست پر المعہد العالی الاسلامی کی سرپرستی بھی قبول فرمائی، وہ معہد کے کام کو بہت سراہتے تھے، میرے بعض تربیت یافتہ فضلاء کو ندوہ میں تدریس کے لیے متعین کیا اور مجھ سے فرمایا: ان کے تقرر کے محرکات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ آپ کے زیر تربیت رہ چکے ہیں، اس لیے میں نے سمجھا

کہ ان میں ضرور فکری اور فقہی اعتدال ہوگا، ایک بار مجھ سے فرمایا: جتنی جلدی تعلیمی دنیا میں معہد کو شہرت حاصل ہوئی، شاید وباید ہی ایسا ہوتا ہے۔

ندوہ کے بعض فضلاء نے حضرت سے عرض کیا: میں تخصص کے لیے معہد جانا چاہتا ہوں، تو بہت خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ ضرور جایئے، انشاء اللہ فائدہ ہوگا، ایک بار معہد کے سالانہ جلسہ میں' میں نے مدعو کیا، آپ نے دعوت قبول فرمالی؛ لیکن چونکہ عام طور پر ہوائی جہاز کا سفر نہیں کرتے تھے اور ان دنوں طبیعت بھی متاثر تھی، اس لیے ایک دو دن پہلے معذرت کردی اور فرمایا: میں اپنا تحریری پیغام بھیجتا ہوں اور اگر آپ کی رائے ہو تو ندوہ سے کسی کو نمائندہ بنا کر بھیجوں، میں نے عرض کیا: میں تو خود آپ کا نمائندہ ہوں، البتہ آپ کا پیغام آجائے تو حوصلہ افزائی کا باعث ہوگا، پیغام عام طور پر مختصر ہوتا ہے؛ لیکن آپ نے ڈھائی صفحے میں ایک تفصیلی تحریر بھیجی جس میں معہد کے کام کو بہت سراہا گیا تھا، یہ تحریر اجلاس میں پڑھ کر سنائی گئی۔

اس کے بعد جب ندوہ حاضر ہوا تو آپ نے بڑے افسوس کا اظہار کیا کہ میں اپنا وعدہ پورا نہیں کرسکا اور فرمایا: میں ضرور کسی موقع پر اس کی تلافی کروں گا، پھر جب حیدرآباد میں بورڈ کا چھبیسواں اجلاس ۹-۱۰/فروری ۲۰۱۸ء کو منعقد ہوا تو مولانا نے خود فرمایا: میں اجلاس کی اگلی صبح معہد آؤں گا، ان کا قیام عبداللہ بھائی پٹنی کے مکان پر ہوتا تھا؛ چنانچہ اگلے دن ہم لوگ آپ کو لے کر آئے، اس وقت مرکزی بلڈنگ میں دو کمروں پر مشتمل قدیم مہمان خانہ تھا، اسی میں حضرت مولانا رابع صاحبؒ اور حضرت مولانا واضح صاحبؒ کے قیام کا انتظام کیا گیا، اس وقت عمارتیں بھی کم تھیں اور کانفرنس ہال تیسری منزل پر تھا اور لفٹ بھی نہیں لگی تھی، اس لیے مولانا کی صحت کو دیکھتے ہوئے ہم لوگوں نے کانفرنس ہال کے بجائے میٹنگ ہال میں پروگرام رکھا، میز اور کرسیاں ہٹا کر طلبہ نیچے بیٹھ گئے، مولانا حالانکہ بہت تھکے ہوئے تھے، لیکن یہاں آکر بہت نشیط ہوگئے، پھر فرمایا کہ اس ادارہ سے مجھے بہت انس ہے، بہت عمدہ خطاب کیا، جس میں علوم اسلامی میں تخصص کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور فقہ اسلامی پر علاقائی احوال کا کیا اثر پڑتا رہا ہے، اس پر بڑی بصیرت مندانہ گفتگو کی، تشریف تو لائے تھے ایک دو گھنٹے کے لیے؛ لیکن پورے دن رہے اور عشاء کے قریب یہاں سے رخصت ہوئے، یہ ادارہ کے لیے بہت ہی مبارک اور اس حقیر کے لیے بڑی مسرت کا دن تھا اور یہ آپ کا حیدرآباد کا آخری سفر تھا۔

آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی سید رشید احمد حسنیؒ تھا، آپ تکیہ کلاں رائے بریلی اتر پردیش میں ۱۳۴۷ھ ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے، آپ کی والدہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی بہن تھیں، جن کا اسم گرامی امۃ العزیز تھا، آپ کی خاندانی نسبت حضرت سید احمد شہیدؒ سے ہے، اس خاندان نے اورنگ زیب عالمگیرؒ کے زمانہ سے لے کر موجودہ دور تک اسلام کی نمایاں اور امتیازی خدمات انجام دی ہیں، عقیدۂ توحید، اتباع سنت، دین حق کی ترجمانی، اسلام کی دعوت اور قول وفعل میں اعتدال اس خاندان کی مشترک خصوصیت رہی ہے، آپ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ۱۹۴۸ء میں فراغت حاصل کی، ایک سال دارالعلوم دیوبند میں بھی گزارا اور وہاں حدیث کے ساتھ فقہ کی تعلیم پر خصوصی توجہ دی، آپ نے خود اس حقیر سے دیوبند میں ہدایہ آخرین پڑھنے اور اس سے بڑا فائدہ اٹھانے کا ذکر فرمایا، نیز چند دنوں مظاہر علوم میں بھی قیام رہا اور تعلیم کے لیے حجاز مقدس بھی تشریف لے گئے۔

اپنے زمانہ کے بڑے اصحاب نسبت سے بھی استفادہ کا موقع ملا، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ اور حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی مجلسوں میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی مگر خاص طور پر آپ نے اپنے خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے تعلیم اور تزکیہ دونوں میدانوں میں استفادہ کیا اور ان کی فکر کو کچھ اس طرح اپنے اندر جذب کرلیا کہ وہ مولانا علی میاں کا عکس جمیل اور مثنیٰ بن گئے، انہوں نے حضرت مولانا علی میاں کے زیر سایہ ندوہ میں طویل

تدریسی خدمت انجام دی اوراستاذ ادب سے لے کر مہتمم اورنائب ناظم تک کی متنوع تعلیمی اورانتظامی خدمات انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ جب ۱۹۹۹ء کی آخری تاریخ میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات ہوئی تو جنوری ۲۰۰۰ء میں ندوہ کی نظامت آپ کے سپرد ہوئی۔

دوراول کے بعد ندوہ کی تعمیر وترقی کا سفر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے عہد میں شروع ہوا، جب میں ۱۹۷۶ء میں ایک زائر کی طرح ندوہ میں حاضر ہوا تھا تو درسگاہ کی بلڈنگ، سلیمانیہ اور رحمانیہ ہاسٹل اورموجودہ مسجد کے مقابلہ مختصر مسجد اورمہمان خانہ جس میں حضرت مولانا علی میاںؒ کا قیام ہوتا تھا' کے علاوہ کوئی قابل ذکر عمارت نہیں تھی اورطلبہ کی تعداد بھی غالبًا تین چارسو تھی، تعمیر حیات کے ڈیڑھ دوصفحات میں تمام طلبہ کے نتائج آجاتے تھے، جشن ۸۵ر سالہ کے بعد حضرت مولانا علی میاںؒ کی قیادت میں ندوہ نے تعلیمی شعبہ جات، اساتذہ وطلبہ کی تعداد، تعمیرات اورشاخوں کے قیام کے لحاظ سے بہت تیز رفتار ترقی کی اوران تمام ترقیات میں حضرت مولانا علی میاںؒ کے دست راست ہونے کی حیثیت سے حضرت مولانا رابع صاحبؒ کا کلیدی کردار رہا ہے، پھر جب آپ خودندوہ کے ناظم مقرر ہوئے، تب بھی یہ ترقی اسی طرح جاری رہی، بڑے پیمانے پر مسجد کی توسیع ہوئی، درسگاہ اوردارالاقامہ کی نئی عمارتیں بنیں، طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، شاخوں میں بھی اضافہ ہوا، رابطہ ادب اسلامی کا کام بھی جاری رہا، پیام انسانیت کا شعبہ بھی روبہ ترقی رہا، اس لیے حضرت مولانا رابع صاحبؒ کے عہد انتظام کو- جو حضرت مولانا علی میاںؒ کے آخرزمانہ سے لے کر خود ان کے زمانہ تک محیط ہے- ندوہ کا سنہرا دور کہا جاسکتا ہے۔

آپ کی جو چیز ہر ملنے والے کو آپ کی طرف کھینچتی تھی، وہ تھی آپ کی خوش اخلاقی اور تواضع وانکساری، آپ کی عادات پوری طرح اوصاف نبوی ﷺ کی آئینہ دار تھیں، ہرایک سے مسکرا کر ملتے، بہت نرمی اورمخاطب کے احترام کا لحاظ کرتے ہوئے گفتگو فرماتے، آنے والوں کے ساتھ اپنے دسترخوان پر بیٹھتے، دسترخوان پر بھی اپنے توشہ میں سے کچھ ان کی پلیٹ میں رکھتے تھے، جس سے ان کا اکرام مقصود ہوتا، زبان کی اس قدر حفاظت فرماتے کہ عوام تو کیا خواص بھی شاذ ونادر ہی اپنی زبان کو اس قدر محفوظ رکھ پاتے ہوں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے ماموں حضرت مولانا علی میاںؒ کی طرح محبوبیت عطا فرمائی تھی، وہ علماء، مشائخ، مختلف مکاتب فکر کے قائدین اور رہنما، جدید تعلیم یافتہ ماہرین، سیاسی قائدین اور غیر مسلم مذہبی وسیاسی رہنما سب کے درمیان عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ملک کے دور دراز علاقوں سے لوگ آکر ملاقات کرتے اور دعا کی درخواست کرتے، بیرون ملک کے اہل علم بھی عقیدت سے سرشار ہوکر حاضر خدمت ہوتے اور جو شخص آتا محبت کی حرارت اپنے ساتھ لے کر جاتا۔

یوں تو آپ کی شخصیت ایسی تھی کہ ہر شخص آپ کے بارے میں کلمہ خیر ہی کہتا تھا اور حاضرانہ وغائبانہ آپ کا ادب ملحوظ رکھتا تھا؛ لیکن اگر کسی نے آپ کے خلاف کوئی بات کہی، تب بھی آپ اپنی زبان کی پوری طرح سے حفاظت فرماتے، ایک صاحب نے جو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن بھی تھے، کچھ ایسا رویہ اختیار کیا کہ بورڈ کی مجلس عاملہ نے ان کے سلسلے میں غوروخوض کے لیے ایک کمیٹی بنادی جو چار ارکان پر مشتمل تھی، جن میں' میں بھی تھا، لوگ اس بات پر متفق تھے کہ ان کو علاحدہ کردیا جائے؛ لیکن اس کے لیے کیا تعبیر اختیار کی جائے؟ اس پر بات ہورہی تھی، مولانا نے میرے بارے میں فرمایا: یہ تحریر مرتب کردیں، میں نے کوشش کی کہ یہ تحریر زیادہ سے زیادہ مثبت رنگ میں ہو، اتفاق سے ان ہی دنوں ان صاحب کا میڈیا پر کچھ ایسا بیان آگیا تھا کہ گویا بورڈ سے اب ان کا کوئی تعلق نہیں ہے، اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اخراج کا لفظ استعمال کرنے کے بجائے میں نے لکھا: چونکہ فلاں صاحب نے خود ہی بورڈ سے بے تعلقی کا اعلان کردیا ہے، اس لیے بورڈ اس کو تسلیم کرتا ہے، اب وہ بورڈ کے رکن نہیں ہیں، مولانا میری اس تعبیر سے بہت خوش ہوئے؛

کیوں کہ اس وقت جس طرح کی تعبیرات اختیار کی جارہی تھیں، یہ ان میں سب سے ہلکی عبارت تھی، مولانا اس بات سے بہت خوش ہوئے۔ان صاحب کا رویہ اس کے بعد بھی بد سے بدتر ہوتا چلا گیا، انہوں نے ندوی فضلاء اورندوہ کے طلبہ کو انتظامیہ کے خلاف اکسانے کی بہت کوشش کی اور رشتہ کا بھی پاس ولحاظ نہیں رکھا، ندوہ میں اپنے کچھ لوگوں کو لے کر ہنگامہ کرنے کی کوشش بھی کی؛ لیکن نا کام رہے، مولانا صبر کی تصویر بنے رہے، جب ندوہ کی مجلس نظامت کی میٹنگ ہوئی توان کی حرکتوں پر سبھی حضرات ناراض تھے اور یہ ناراضگی الفاظ میں بھی ظاہر ہورہی تھی؛ لیکن مولانا کی زبان سے ان کے خلاف کوئی جملہ نہیں نکلا، حقیقت یہ ہے کہ مجھ کو بہت سی بڑی شخصیتوں کے قریب رہنے کا موقع ملا؛ لیکن قاری محمد طیب صاحب، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی- رحمہم اللہ- کو جس قدر اپنی زبان کی حفاظت کرنے والا پایا، شاید وباید ہی کسی اور کو پایا۔

مولانا کے ایک اور شاگرد جن کو اللہ نے خطابت کا بڑا جوہر عطا فرمایا ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے ان کے بعض بیانات کی وجہ سے بھی باز پرس کا فیصلہ کیا، میں چاہتا تھا کہ اس سلسلے میں زیادہ سخت رویہ نہ اختیار کیا جائے، اس لیے میں نے یہ رائے پیش کی کہ صدر محترم ان کو ایک خط لکھیں اور خط میں ان کو تنبیہ کریں، سبھی حضرات نے اس رائے سے اتفاق کیا، میں نے حضرت سے عرض کیا کہ آپ جس وقت مناسب سمجھیں کسی صاحب کو خط املا کرادیں جو اُن کو ارسال کردیا جائے، توانہوں نے فرمایا: آپ ہی یہ خط مرتب کردیں، آپ میرے مزاج کے مطابق کریں گے اور یوں ہم لوگوں کا ان سے جو خاندانی رابطہ وتعلق رہا ہے اس کا بھی پاس ولحاظ رہے۔

اس حقیر پر ذاتی طور پر بھی مولانا کی بڑی شفقتیں تھیں، میں خود ندوہ کی اور بورڈ کی میٹنگوں میں ندوہ حاضر ہوتا ہی رہتا تھا، کبھی کبھی درمیان میں مشورہ کے لیے یا صرف آپ سے ملاقات کے لیے بھی حاضر ہوتا تھا، جب بھی حاضر ہوتا بڑے تپاک اور محبت سے ملتے، اکثر کچھ تبرک بھی عنایت فرماتے جو کبھی گرم رومال کبھی شیروانی اور صدری کے کپڑے اور کبھی بسکٹ اور کھجور کی شکل میں ہوتا جو بھی نئی کتاب طبع ہوتی، وہ بھی عنایت کرتے، بعض دفعہ کسی حوصلہ افزا فقرہ اور دستخط کے ساتھ دیتے، میں از رہ احترام دور بیٹھتا تو قریب میں بیٹھنے کو فرماتے، کہتے کہ تمہارے آنے سے مجھے بہت اطمینان ہوتا ہے، بورڈ کے بارے میں بعض دفعہ مشورہ دیتے کہ فلاں کام کو اس طرح کر لینا بہتر ہوگا، تاہم یہ میری رائے ہے، فیصلہ نہیں، آپ جو بہتر سمجھیں کریں، میں عرض کرتا، حضرت! میرے لیے آپ کی رائے ہی فیصلہ ہے، حد تو یہ ہے کہ مہمان خانہ جہاں میرا قیام ہوتا، ایک دوبار وہیل چیئر کے ذریعہ وہیں تشریف لے آئے، مجھ کو بڑی شرمندگی ہوئی، میں نے عرض کیا، حضرت! مجھ کو بڑی ندامت ہوتی ہے، میں پہلے سے بہت گنہ گار ہوں، آپ میرے گناہوں میں اضافہ نہ فرمائیں، جب بھی کوئی بات ہو تو آپ خود مجھ کو بلا لیا کریں، ایک دوسفر میں میرے ساتھ عزیزی مولوی یحییٰ بن زکریا (متوطن ری یونین، فرانس) بھی تھے جو میرے داماد بھی ہیں، مولانا جب ان سے ملے تو ایک قریبی عزیز کا سا سلوک فرمایا اور بڑی شفقت کا برتاؤ کیا، وہ اپنے وطن جانے سے پہلے میرے ساتھ ملاقات کی غرض سے لکھنؤ آئے، ہم لوگ جاتے ہوئے مصافحہ کر کے رخصت ہونا چاہتے تھے، یحییٰ سلمہ کو چونکہ مستقبل قریب میں اپنے وطن واپس ہونا تھا، اس لیے وہ اس کے اور بھی زیادہ مشتاق تھے، جب ہم لوگ ندوہ سے نکلے اور حضرت کی قیام گاہ کے پاس پہنچے تو خدام نے بتایا کہ آپ آرام کررہے ہیں، میں نے خادم سے کہا: مولانا کے آرام میں خلل نہ پیدا کیا جائے، ہم لوگ ایئرپورٹ چلتے ہیں، بعد میں میرا اسلام عرض کردیجیے، جب ہم ایئرپورٹ پہنچے تو مولانا کا فون آیا، معلوم ہوا کہ وہ ہم لوگوں سے ملاقات کے لیے وہیل چیئر پر کمرہ تک پہنچ گئے تھے، خود مولانا نے فون پر معذرت فرمائی کہ مجھے افسوس ہے کہ میں دیر سے پہنچا اور آپ سے ملاقات نہ ہوسکی، ایسی تواضع، خوردنوازی اور دل داری کی بھی کوئی مثال مل سکتی ہے!

آپ کے فکری اعتدال اور ہر ملنے والے کے ساتھ شفقت ومحبت کے ساتھ برتاؤ کا اثر تھا کہ آپ اپنے زمانہ میں پوری ملت اسلامیہ ہند کے لیے نقطہ اتفاق تھے، جب بورڈ کے تیسرے صدر حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات ہوئی تو صدر کے لیے سبھوں کی زبان پر آپ کا نام تھا، انتخاب کے وقت آپ مجلس میں موجود نہیں تھے، آپ ناگپور سے حیدرآباد آتے ہوئے راستہ میں تھے، لیکن باتفاق رائے چوتھے صدر کی حیثیت سے آپ کا انتخاب عمل میں آیا، آپ ۲۰۰۳ء میں بورڈ کے صدر منتخب ہوئے اور تادم وفات ۲۰۲۳ء تک اس عہدہ پر فائز رہے، حالانکہ ہر تین سال میں صدرِ بورڈ کا نیا انتخاب ہوتا ہے؛ لیکن ہمیشہ لوگوں کی زبان پر بحیثیت صدر آپ کا ہی نام نامی رہا، آپ نے بہت نازک حالات میں اور بڑی حکمت عملی کے ساتھ صدارت کی ذمہ داری انجام دی۔

اگر مجھے حضرت کے دو بنیادی اوصاف کا ذکر کرنا ہو تو میں دو باتوں کا ذکر کروں گا، ایک: تواضع اور کسر نفسی جس کا ذکر اور پر آچکا ہے، دوسرے: استغنا اور دنیا سے بے نیازی، ان کی یہ بے نیازی کی داستان تکیہ کلاں رائے بریلی پہنچ کر زبان حال سے سنی جاسکتی ہے، بیرونی حصہ جس میں آپ کا قیام رہتا اور جس میں مہمانوں کی آمد ورفت ہوتی، سیدھا سادہ، آرام دہ فرنیچر اور تعمیری آرائش کے لوازمات سے خالی متوسط درجہ کا مکان، حد تو یہ ہے کہ واش روم میں بھی محض پلاسٹر کیا ہوا فرش ہے، اس عاجز کو چند دفعہ گھر کے اندر بھی حاضری کا موقع ملا ہے، چونکہ اس وقت اپنی صحت کی وجہ سے آپ کا چلنا پھرنا دشوار تھا، اس لیے آپ نے اندر بلا لیا اور برآمدہ جہاں خود آرام فرما رہے تھے، مجھے بھی بٹھایا، دیر تک مختلف انداز کی باتیں ہوتی رہیں، جن کا تعلق یاد ماضی سے بھی تھا اور حال وامروز سے بھی، اور امت کے لیے فکر فردا سے بھی، یہ گھر کا اندرونی برآمدہ تھا، جہاں ایک تخت پر آپ لیٹے ہوئے تھے، یہ بھی بہت سادہ عمارت ہے، اگر میں کہوں متوسط سے بھی کم درجہ کی ہے تو بے جا نہ ہوگا؛ حالانکہ آپ کو جو مقبولیت ومحبوبیت حاصل تھی اور پوری دنیا میں آپ کے نیاز مند پھیلے ہوئے تھے، ان کی طرف سے جدید ترین سہولتوں سے مزین خوبصورت مکان کی تعمیر آپ کے لیے چنداں دشوار نہیں تھی، مولانا کے بعض عزیزوں سے معلوم ہوا کہ بعض حضرات نے بڑی بڑی رقمیں پیش کیں، گاڑیاں پیش کیں، لیکن آپ نے خوبصورتی کے ساتھ اس کو قبول کرنے سے معذرت کرلی، مخلصین کے اصرار پر ان کو مشورہ دیا کہ یہ ندوہ کے حوالہ کردیا جائے۔

حب مال سے بھی بڑی بیماری حب جاہ ہے، بڑے بڑے اصحاب علم، خانقاہوں کے سجادہ نشیں، قرآن وحدیث کے اساتذہ، لوگوں کو نصیحت کرنے والے واعظین اور مقررین یہاں آکر ناکام ہو جاتے ہیں، مدرسہ میں اونچی کتابوں کے لیے لڑائی ہوتی ہے، خانقاہوں میں سجادہ نشینی کے اور مریدآباد کو وسعت دینے کے لیے جھگڑے ہوتے ہیں اور عام لوگوں کا یا جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا تو کہنا ہی کیا؟ ان کے یہاں جاہ طلبی تو کوئی برائی ہی نہیں، جن چند لوگوں کو اس سلسلے میں مستغنی اور بے نیاز دیکھا، ان میں ایک نمایاں ترین نام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا ہے اور وہ اس سلسلے میں پوری طرح اپنے خال محترم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے نقش قدم پر تھے۔

میں ۸۰ء کی دہائی سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا رکن تاسیسی ہوں اور اس وقت سے بورڈ کی نمایاں ترین شخصیات کو دیکھا ہے اور چونکہ بورڈ تمام مکاتب فکر اور اہم تنظیموں کا وفاق اور مسلمانان ہند کا سب سے مقبول اور معتبر ادارہ ہے اور ملک کی بڑی بڑی دینی جامعات اور تزکیہ واحسان کے مراکز کی نمائندگی بھی اس میں موجود ہے، میں نے بہت سے مواقع پر عہدوں کے لیے جو رسہ کشی اور ماحول سازی دیکھی ہے، وہ افسوسناک اور ناقابل بیان ہے اور میں نے ان کو اپنے سینے میں دفن رکھا ہے، یہ سوچ کر نہ ان کو زبان پر لانے کی کوشش کی اور نہ قلم پر کہ کوئی انسان خطا سے محفوظ نہیں؛ لیکن حضرت مولانا رابع

صاحبؒ کو میں نے اس باب میں غیر معمولی شان بے نیازی کا حامل پایا، یہاں تک کہ وہ بورڈ کے صدر بھی اس وقت منتخب ہوئے جب وہ اس مجلس میں موجود بھی نہیں تھے اور آپ کی صدارت کی تحریک ان لوگوں نے کی جن کا آپ کے ادارے سے براہ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق نہیں تھا اور باتفاق رائے آپ کا انتخاب عمل میں آیا۔

حضرت مولانا رابع صاحبؒ علمی اور تصنیفی اعتبار سے بھی بلند پایہ شخصیت کے مالک تھے، حضرت مولانا نے اپنی خدمت کا اصل میدان تدریس اور افرادسازی کو بنایا، ان کے دامن تربیت سے وابستہ ہوکر اساتذہ، مصنفین اور عربی زبان کے ادب شناسوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہوئی، انہوں نے تصنیف وتالیف کے میدان میں بھی نمایاں کام انجام دیا، عربی اور اردو میں پچاس سے زیادہ کتابیں آپ کے قلم سے آئی ہیں، چونکہ آپ ایک اعلیٰ درجہ کے مدرس تھے، اس لیے آپ نے اپنی تصنیفی خدمات میں نصابی کتابوں کو بڑی اہمیت دی، آپ نے نصابی نقطہ نظر سے ادب عربی کی تاریخ پر ''تاریخ الادب العربی'' لکھی، عربی تنقید نگاری پر ''الادب العربی بین عرض ونقد'' تالیف فرمائی، اسلامی ادب کے نمونوں کو ''منثورات'' کے نام سے جمع فرمایا، جو جاہلی ادب کے مقابلہ میں اسلامی ادب کی نمائندگی کرتا ہے، یہ کتاب دراصل اسلامی ادب کے نمونوں کا شاہ کار اور حضرت مولانا علی میاںؒ کی مختارات کی تمہید ہے، عربی انشا پر معروف ومقبول کتاب ''معلم الانشاء'' کی تیسری جلد مرتب فرمائی، عالم عرب کے جغرافیہ پر بہت باریک بینی سے ''جزیرۃ العرب'' تحریر فرمائی، جغرافیہ ایک خشک موضوع ہے، لیکن آپ نے اپنی تحقیق کے ذریعہ اس کو ایک دلچسپ موضوع بنادیا ہے اور اس کتاب میں ضمنی طور پر اس کی بھی پرزور وضاحت کی ہے کہ عالم عرب کی طاقت اور اس کی سربلندی اسلام سے وابستہ رہی ہے، لیکن اس کے علاوہ دیگر موضوعات پر بھی آپ نے قلم اٹھایا، سیرت کے موضوع سے آپ کو بڑی دلچسپی تھی، آپ کی مبسوط کتاب ''رہبر انسانیت'' منفرد انداز کی کتاب ہے جو ۴۶۵ر صفحات پر مشتمل ہے، اس کا اسلوب بڑا حکیمانہ ہے اور اس میں نفسیاتی پہلو کی رعایت ہے، یہ کتاب اس لائق ہے کہ مسلمانوں کے سامنے بھی پیش کی جاسکتی ہے اور غیر مسلموں کے سامنے بھی، چنانچہ مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، سیرت پر آپ کے اہم مضامین کا مجموعہ ''نقوش سیرت'' کے نام سے طبع ہوا، قرآنیات سے آپ کو خاص مناسبت تھی، اس سلسلے میں آپ کی کتاب ''قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل'' اور ''اسلامی معاشرہ سورہ حجرات کی روشنی میں'' بہت اہم کتابیں ہیں، آپ نے جتنا قریب سے سفر وحضر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کو دیکھا ہے، شاید ہی اس میں آپ کا کوئی ہمسر ہو، آپ نے اس سلسلے میں اپنی یادداشت کو ''حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، عہد ساز شخصیت، مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں'' کے نام سے مرتب کیا جو بہت اہم یادداشتوں پر مشتمل ہے، ان کے علاوہ آپ کے ادبی مضامین کا مجموعہ ''غبار کارواں'' وفیات پر مشتمل تحریریں ''یادوں کے چراغ'' اور مختلف سفرنامے بھی قابل مطالعہ ہیں، اخیر میں آپ نے اپنی آپ بیتی لکھانی شروع کی تھی جو پوری نہیں ہوسکی، لیکن اس کی ایک جلد طبع ہوئی ہے، اگر یہ مکمل ہوجاتی تو اس عہد کی مستند اور سچی تاریخ ہوتی، عالم اسلام کے احوال وافکار پر آپ کی گہری نظر تھی اور آپ اس موضوع پر لکھتے رہتے تھے، آپ کے ان مضامین کا مجموعہ عالم اسلام اور سامراجی نظام کے عنوان سے طبع ہو چکا ہے جو بڑی چشم کشا معلومات پر مشتمل ہے، آپ کا رروان ادب کے ایڈیٹر، تعمیر حیات اور مختلف رسائل کے سرپرست اور ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کی مجلس ادارت کے رکن تھے۔

آج جب کہ آپ اس دنیا سے جا چکے ہیں، ہر جگہ ایک خلا محسوس کیا جارہا ہے، جس کا پُر ہونا بظاہر دشوار ہے، دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے حسنات کو قبول فرمائے، درجات کو بلند فرمائے اور آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

تمہاری خوبیاں زندہ تمہاری نیکیاں باقی

پروفیسر اختر الواسع
(سابق صدر شعبہ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ - دہلی)

تمہیں کہتا ہے مردہ کون تم زندوں کے زندہ ہو
تمہاری خوبیاں زندہ تمہاری نیکیاں باقی

دنیا کا دستور ہے کہ لوگ پیدا ہوتے ہیں، زندہ رہتے ہیں اور مرجاتے ہیں اور کچھ دن گزرنے کے بعد انہیں سب بھول جاتے ہیں، مگر بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو صرف اپنے ہی زمانہ میں نہیں بلکہ آئندہ زمانوں پر بھی اپنے نقوش مرتسم کر جاتے ہیں، بلاشبہ انہی ممتاز لوگوں میں سے ایک مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ بھی ہیں۔ بقول شاعر۔

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مٹ جانے سے انسان نہیں مرجاتے

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کسی ایک شخص یا فرد کا نام نہیں بلکہ ایک ایسی شخصیت کا نام ہے جو ہشت پہل تھی، وہ عربی زبان وادب کے ماہر تھے، اردو زبان وادب پر انہیں ملکہ حاصل تھا، وہ ایک بہترین استاد تھے، صاحب قلم تھے اور مذہبی وادبی صحافت کے سرخیل تھے۔ اسی کے ساتھ وہ بے شمار اداروں کے سربراہ تھے، ندوۃ العلماء اور اس کے ذیلی ادارے مثلاً: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام اور تحریک پیام انسانیت کے ایک قابل فخر سربراہ تھے، جنہوں نے امت کو ایک نیا راستہ دکھایا اور ایک منزل تک پہنچایا۔ بالخصوص ندوۃ العلماء میں بحیثیت ناظم اس ادارہ کو انہوں نے جدید تعلیم کا مرکز بنانے کی کامیاب کوشش کی، ان کے زمانہ میں جس طریقہ سے کمپیوٹرائزیشن ہوا، اس سے پہلے ہمیں اس کی مثال نہیں ملتی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ملت اسلامیہ ہند کی اجتماعیت کی علامت تھے جس کا سب سے بڑا ثبوت ان کا بیس سالہ دور صدارت ہے، وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے متفقہ صدر تھے اور یہ پلیٹ فارم ملت کی اجتماعیت کا سب سے بڑا ادارہ ہے، انہوں نے بحیثیت صدر بورڈ ہندوستانی مسلمانوں کی ایک ایسے نازک دور میں سربراہی کی جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں آباد سادات کے اس خاندان کا نمایاں وصف ہی یہ ہے کہ

نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

اسی لیے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ہو یا رابطہ ادب اسلامی یا اور دیگر تحریکات وادارے، حضرت کی وفات کے بعد سبھی ان کی جیسی رہنمائی کے متلاشی رہیں گے، ایک ایسی شخصیت کے جو ان کے ہم پلہ ہو وہم مزاج ہو۔

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے میرا پہلا تعارف ان کی مشہور کتاب ''جزیرۃ العرب'' کے ذریعہ ہوا، جسے میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس کے بعد وہ مجھ پر تا دم حیات مہربان رہے اور میری طرف سے ہمیشہ فکرمند رہے، اگر کبھی میرے اوپر کوئی نازک وقت آجاتا تو ہمیشہ اپنی خصوصی توجہ فرماتے، جب لکھنؤ میں میری برین سرجری ہوئی اور میں داخل اسپتال تھا، تو کسی نے انہیں میرے متعلق اطلاع دی، جس پر انہوں نے فوراً میرے نام یہ پیغام دیا کہ وہ ''یا سلام'' کا ورد کریں اور بتایا کہ ہم بھی دعا کرتے ہیں۔

اللہ آپ کی مغفرت فرمائے' درجات بلند کرے اور امت کو آپ جیسا روشن دماغ اور عظیم الشان قائد عطا فرمائے۔ آمین!

گلشن ندوہ کا گل سرسبد

مولانا محمد الیاس گھمن
(بانی وناظم عالمی مرکز اہل سنت والجماعت-سرگودھا)

اللہ کریم نے مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو بلند مقام عطا فرمایا تھا، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد وہ اپنے علمی کمالات اور سماجی خدمات کے حوالہ سے عرب وعجم میں نمایاں پہچان رکھتے تھے۔آپ انڈیا کے صوبہ اتر پردیش کے ضلع رائے بریلی میں ایک علمی خانوادہ میں پیدا ہوئے۔ولادت یکم اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ہوئی۔

ابتدائی تعلیم رائے بریلی میں مکمل کی، اس کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں ایک سال دار العلوم دیوبند میں گذارا، جہاں انہوں نے شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ودیگر اکابر دیوبند سے تفسیر، حدیث، فقہ اور بعض فنون کی اہم کتب پڑھیں۔ ۱۹۴۸ء کو دار العلوم ندوۃ العلماء سے سند فضیلت حاصل کی۔

تدریسی وانتظامی ذمہ داریاں:

۱۹۴۹ء سے دار العلوم ندوۃ العلماء میں اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا۔

۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء کے درمیان حصول تعلیم کے لیے کچھ عرصہ کے لیے حجاز میں قیام کیا۔

۱۹۷۰ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے کلیۃ اللغہ کے ذمہ دار کے طور پر منصب سنبھالا۔

۱۹۹۳ء میں دا رالعلوم ندوۃ العلماء کے نائب مہتمم منتخب ہوئے۔

۲۰۰۰ء میں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد آپ کو دار العلوم ندوۃ العلماء کا ناظم منتخب کیا گیا۔

۲۰۰۲ء میں مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات کے بعد آپ کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا۔

علمی واخلاقی تربیت:

مولانا رابع حسنی ندویؒ نے جن اکابر سے اکتساب علم وفیض کیا، ان میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:

☆ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ
☆ شیخ العرب والعجم حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ
☆ بانی تبلیغی جماعت حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ
☆ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ
☆ حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھیؒ
☆ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق ہردوئیؒ (خلیفہ حضرت تھانوی)
☆ حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (المعروف علی میاںؒ)

آپ کی زیادہ تر علمی اور اخلاقی تربیت آپ کے ماموں مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے فرمائی، اسی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے ایک مقام پر فرماتے ہیں:

”مجھ کو اپنے چھوٹے ماموں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی نگرانی اور سرپرستی کا زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہوا، بلکہ میری تعلیم کا خاصا حصہ براہ راست ان کی استادی میں گذرا اور پھر شاید اسی مناسبت سے بعد میں مجھ کو ان کی علمی مشغولیات میں خدمت اور تعاون کی سعادت بھی زیادہ ملی اور عربی سے تعلق کے کاموں میں خدمت اور ذیلی طور پر تعاون دینے کا موقع ملا اور باہر کے سفروں میں جو زیادہ تر بلاد عربیہ میں ہوئے، اکثر ساتھ رہنے کا موقع ملا، ان

کے علمی مسودات کو صاف کرنے اور پروف دیکھنے اور طباعت واشاعت کے سلسلہ میں جو خدمت درکار تھی، اس میں بھی خاصی حد تک لگنا ہوا، اس طریقہ سے ان کے ساتھ رہنے اور ان کو مختلف موقعوں پر کام کرنے اور کسی مسئلہ میں رائے رکھنے سے واقفیت کا موقع ملا اور ان کی خدمت سے بڑی حد تک ان کے اطمینان ورضا مندی کی سعادت حاصل ہوئی، ایک طرف مجھے ان کا بھانجہ ہونے کی وجہ سے شفقت حاصل رہی، دوسری طرف شاگردی کا تعلق ہونے کی وجہ سے عقیدت حاصل ہوئی اور تیسری طرف ان کے کاموں میں خدمت کا شرف حاصل ہونے سے ذیلی مناسبت بھی حاصل ہوئی۔''

(عہد ساز شخصیت: ۱۸-۱۹)

آپ کی صلاحیتوں کو نکھارنے میں بہت بڑا کردار آپ کے بڑے ماموں ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کا بھی ہے، جب مولانا علی میاںؒ حج پر تشریف لے گئے تو اس وقت ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ نے آپ کو حصول علم وعمل کی غرض سے ایک سال کے لیے دارالعلوم دیوبند بھیجا اور اس کے تمام اخراجات خود برداشت کیے۔

خانقاہی مزاج اور بیعت وارشاد:

اللہ کریم نے جب حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے دین کا کام لینے کا ارادہ فرمایا تو آپ میں وہ خصلتیں ودیعت فرمادیں جو اس کام کے لیے ضروری تھیں اور اس کام کی ضرورت تھیں، اللہ تعالیٰ کے دین کا کام ہو اور اللہ تعالیٰ کے تعلق اور اتباع سنت کے بغیر ہو، یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اگر شکل وصورت کے اعتبار سے کبھی دین کا کام تعلق مع اللہ اور اتباع سنت کے بغیر نظر بھی آجائے تو وہ محض دینی کام کا ڈھانچہ ہوگا، جس میں روح نہیں ہوگی، دینی کام کی روح اللہ کے تعلق ہی سے حاصل ہوتی ہے۔

اسی تعلق مع اللہ اور اتباع سنت کے استحکام کے لیے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے اصلاحی تعلق قائم کیا اور کچھ عرصہ بعد ان سے بیعت بھی ہوگئے، سلوک واحسان کی منازل کو مشائخ کی ترتیب کے مطابق طے کیا تو حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے آپ کو چاروں سلاسل (سلسلہ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ) کی اجازت وخلافت عطا فرمائی۔

آپؒ نے علم ظاہر کے ساتھ علم باطن میں بھی وہ کمال حاصل کیا جو بہت کم کسی اور کے حصہ میں آتا ہے۔

عند اللہ وعند الناس مقبولیت:

یہی وجہ ہے کہ آپؒ نے عرب وعجم میں دینی خدمات کا ایسا باب رقم کیا جو بہت کم لوگوں کے حصہ میں آتا ہے، اسی تربیت کے نتیجہ میں آپ کمالات کی بلندیوں تک پہنچے اور ایک وقت آیا کہ جب آپ کی شخصیت کو تحریکی، علمی اور ادبی حلقوں میں پذیرائی ملی اور آپ عنداللہ محبوبیت اور عندالناس مقبولیت کے مقام کو حاصل کر گئے۔

تعلیمی-تحریکی اور سماجی ذمہ داریاں:

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم
☆ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر
☆ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نائب صدر
☆ دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کے صدر
☆ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کے صدر
☆ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے رکن تاسیسی
☆ دارالمصنفین اعظم گڑھ کے رکن رکین
☆ آکسفورڈ سینٹر فار اسلامی اسٹڈیز برطانیہ کے رکن رہے ہیں۔

اس کے علاوہ ان اداروں سے بھی وابستہ رہے:

☆ مولانا ابوالحسن اکیڈمی
☆ مولانا محمد ثانی میموریل سوسائٹی
☆ مولانا عبدالباری سوسائٹی
☆ مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی
☆ تحریک پیام انسانیت
☆ مجلس صحافت ونشریات
☆ دارعرفات

ان میں سے بعض کی سرپرستی اور بعض سے مکمل تعاون جاری رکھا۔

مقامی وعلاقائی ضروریات پر توجہ اور اس کے اثرات:

آپ کی یہ خوبی تھی کہ عالمی سطح پر خدمات دینیہ سرانجام دیتے ہوئے اپنے وطن کی علمی، سماجی ضروریات کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اپنے ملک اور اپنے علاقہ کی مذکورہ ضروریات کو احسن طریقہ سے پورا کرتے رہے۔آپ کی فکری ونظریاتی تربیت ہی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد اسلامی رنگ میں ڈھلی ہوئی نظر آتی ہے۔

عرب وعجم میں علمی پذیرائی:

آپ سے پھوٹنے والی علم وادب کی خوشبو ہندوستان سے اٹھ کر عرب ممالک تک اور وہاں سے دیگر ممالک تک پہنچی تو تشنگان علوم آپ کی طرف متوجہ ہوئے اور دنیا بھر سے آپ کو مدعو کیا جانے لگا چنانچہ ترکی، ازبکستان، ملیشیا، مصر، تیونس، الجزائر، امریکہ، جاپان، مراکش، جنوبی افریقہ اور برطانیہ میں آپ نے علمی محاضرات پیش کیے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داران ان علمی محاضرات کو مستقبل کتابی شکل میں شائع کردیں تو ایک علم کی پیاسی خلق خدا کی کثیر تعداد اس سے سیراب ہوسکتی ہے۔

اردو زبان پر مکمل دسترس رکھتے ہوئے آپ نے عربی میں کمال حاصل کیا۔ ۱۹۵۹ء میں آپ نے ایک عربی مجلّہ ''الرائد'' شروع کیا جو تادم تحریر جاری ہے۔عربی زبان وادب کی خدمات انجام دینے پر آپ کو ۱۹۸۲ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ہزاروں شاگرد میدان عمل میں:

آپ کی تدریسی خدمات کا سلسلہ نصف صدی سے زائد پر محیط ہے، عرب وعجم میں آپ کے بلا واسطہ اور بالواسطہ ہزاروں شاگردوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے، جو اپنے مشفق استاذ کے علم وعمل اور تربیت کی مجسم شکل اختیار کرچکا ہے اور آپ کا فیض مسلسل اپنے دائرہ کو وسعت دے رہا ہے۔

تصنیف وتالیف کا مشغلہ:

اللہ تعالیٰ نے آپ کو تدریس اور تبلیغ کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا بھی بہت عمدہ ذوق عطا فرمایا تھا، آپ نے عربی اردو میں ۳۰؍ سے زائد کتابیں تصنیف کی ہیں، جن میں بعض کتابیں اپنی اہمیت کے پیش نظر مدارس اسلامیہ اور ہندوستانی اسکولوں میں شامل نصاب ہیں۔

زندگی کے دو جانکاہ صدمات:

مولانا مرحوم کی والدہ ماجدہ صوم وصلوٰۃ کی پابند ایک بڑے علمی گھرانے کی خاتون تھیں، مولانا مرحوم میں نیک صفات اور اعلیٰ اخلاق میں ان کی والدہ کی تربیت کا بہت بڑا اور بنیادی حصہ ہے۔آپ کی اہلیہ محترمہ عفت مآب نیک خاتون تھیں، جس نے مولانا مرحوم کا ہر موڑ پر ساتھ دیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر دین کا کام کرنے والے افراد کو گھریلو اور بالخصوص والدہ اور اہلیہ کا تعاون حاصل ہو تو کام کی رفتار دگنی چوگنی ہوجاتی ہے۔۹؍فروری ۱۹۹۶ء کو آپ کی اہلیہ آخرت کو سدھار گئیں اور صرف چار دن بعد ۱۳؍فروری کو آپ کی والدہ ماجدہ راہی ملک بقا ہوگئیں۔ایک ہفتہ میں دو جانکاہ صدمات پیش آئے لیکن آپ نے اسے مشیت ایزدی سمجھ کر صبر کے ساتھ برداشت کیا اور حسب معمول اپنے دینی کاموں میں لگے رہے۔

آپ کا صدقہ جاریہ:

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تمام تعلیمی ادارے، تحریکی انجمنیں، رفاہی تنظیمیں، خاندان کے افراد، تلامذہ، متوسلین اور کتابیں جن کی نسبت آپ سے ہے وہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہیں۔رہتی دنیا تک آپ کے نامہ اعمال میں مسلسل حسنات کے اضافہ کا باعث رہیں گے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

وہ رشکِ صد بہار گلستاں چلا گیا

انجینئر سید سعادت اللہ حسینی
(امیر جماعت اسلامی ہند)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا سانحہ ارتحال ہم سب کے لیے غم ناک اور یقیناً میرے لیے از حد رنج وغم کا باعث ہے۔ وہ بے پناہ اوصاف وکمالات کے حامل، ملک وقوم کے غم خوار، عزم واستقلال کی چٹان اور عرب وعجم میں یکساں مقبولیت رکھنے والے تھے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کچھ عرصے سے علیل تھے اور ان کی علالت کی خبریں مسلسل مل رہی تھیں۔ مولانا کی صحت اور ان کے سایہ کی درازی کے لیے دعائیں بھی مسلسل ہو رہی تھیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کے فیصلوں کے آگے ہم سب بے بس ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ پوری امت کا قیمتی اثاثہ تھے۔ مولانا مرحوم حقیقت میں رونق بزم اور شمع انجمن تھے اور ملی اتحاد کا ایک مضبوط ستون تھے۔ وہ طویل عرصے سے ملک کے اہم علمی ادارے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم تھے۔ اس کے علاوہ متعدد علمی اداروں کے سربراہ اور علمی مجلسوں کے صدر نشین تھے اور مسلمانان ہند کے باوقار مشترکہ پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کی حیثیت سے اس نازک موڑ پر قیادت ورہنمائی کا فریضہ بھی انجام دے رہے تھے۔ حضرت مولاناؒ کی سربراہی میں مسلم پرسنل لاز کے تحفظ کے لیے جو کام ہو رہے تھے، وہ انتہائی اہم تھے، ملک کی موجودہ صورت حال میں مولانا کا ہم سے رخصت ہو جانا ایک عظیم خسارہ ہے۔

علم وادب، تعلیم وتعلم، رشد وہدایت، دعوت وتبلیغ اور ملی قیادت ورہبری ان سب متنوع میدانوں میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی گراں قدر خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔ اپنی پیرانہ سالی اور متعدد جسمانی عوارض کے باوجود مولانا کی دینی وملی کاموں میں سرگرمی واقعی قابل رشک تھی۔

بلاشبہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی رحلت امت مسلمہ ہند کا بہت بڑا نقصان ہے اور اس نازک موقعے پر جب کہ ملت اسلامیہ ہند چوطرفہ مسائل اور چیلنجوں کے نرغے میں گھری ہوئی ہے، یقیناً مولانا کی جدائی ایک بڑا سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل خاص سے مولانا کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

راقم الحروف کی مولانا موصوف سے متعدد دفعہ مختصر وطویل ملاقاتیں رہیں، لیکن اس وقت وہ ملاقات شدت سے یاد آرہی ہے جو چار سال پہلے جماعت اسلامی ہند کی امارت کے لیے میرے انتخاب کے فوری بعد ندوۃ العلماء میں مولانا کی رہائش گاہ پر ہوئی تھی۔ مولاناؒ نے بڑی شفقت سے مجھے اپنے قریب بٹھا کر بہت دیر تک گفتگو فرمائی تھی اور بہت سی قیمتی نصیحتوں سے نوازا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ شفقت ومحبت، عاجزی وانکساری، اتحاد واتفاق اور بردباری وتحمل کا عملی نمونہ تھے۔

میں مرحوم کے ورثا سے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں سے اور مرحوم کے تمام لواحقین سے تعزیت کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ان کی خدمات جلیلہ کو قبول فرمائے اور مرحوم کی رحلت سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اسے پر فرمائے۔ آمین!

دنیائے علم وادب اور اسلامی قیادت کا ایک بڑا سانحہ

مولانا محمد سلطان ذوق ندوی
(مہتمم دارالمعارف الاسلامیہ- بنگلہ دیش)

واقعی حضرت مولانا رابع حسنی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات دنیائے اسلام خصوصاً ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے ایک بڑا خسارہ ہے، تاریخ میں مولانا کی طرح جامع الاوصاف اور جامع کمالات شخصیت خال خال ملے گی۔

آج امت مسلمہ نے مفکر اسلام شیخ ندویؒ کے جانشین کو ہارا۔

مسلم پرسنل لا بورڈ نے ایک مبصر رہنما کو ہارا۔

اس فتنہ کے دور میں باطل کی سرکوبی اور قافلہ مجاہدین کی قیادت کرنے والے کو ہارا۔

ادب اسلامی نے زبان وادب کے شہ سوار صاحب طرز ادیب کو ہارا۔

ہزاروں مدارس اور انجمنوں نے جن کو آپ کی سرپرستی سے نازتھا، اپنے مشفق سرپرست کو ہارا۔

اتنے کمالات کے باوصف آپ خوش خو، خوش سخن، انسان نواز شخص تھے، بڑے متواضع تھے، حضرت مولانا علی میاںؒ کے بعد مدینہ منورہ میں رابطہ ادب اسلامی کی ریاست کے لیے اجتماع ہوا تھا، حضرت مولانا رابع صاحبؒ کے حق میں اکثر نے رائے دی، لیکن مولانا نے قبول نہیں کیا، جب اراکین نے اصرار کیا، فرمایا: میں استخارہ کروں گا۔ دوسرے دن جمعہ تھا، نشست میں سب کی نگاہیں آپ کی طرف تھیں، دیکھیں استخارہ کا نتیجہ کیا ہے؟ مولانا نے ایک ہی جملہ فرمایا: "لم یتغیر رأیی" ڈاکٹر عبدالقدوس ابوصالح جو نائب رئیس تھے، رئیس منتخب ہوئے، ڈاکٹر عبدالقدوس صاحب نے بڑے جذباتی انداز میں فرمایا: "إذن الشیخ محمد الرابع هو شیخ الرابطة."

اس کے بعد حضرت مولانا رابع صاحبؒ سے ارشادی کلمہ کا اقتراح کیا گیا، ایسی تقریر فرمائی کہ رابطہ کس خط پر چلے گا، جو اس کے لیے مشعل راہ ہو سکے، ڈاکٹر صاحب نے ایسا تاثر ظاہر کیا جو زرّیں حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ فرمایا:

"ما فقدنا إلا شخصية الندوي سوى ذلك كل شئ موجود فی الشیخ محمد الرابع."

حضرت مولانا رابع صاحب کے اندر شکل وصورت، نقل وحرکت اور طرز بیان میں حضرت شیخ ندویؒ سے بہت شباہت تھی، صحیح قیادت کی صلاحیت آپ کے اندر موجود تھی۔ بقول اقبال:

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

اللہ تعالیٰ کو قدرت ہے کہ حدیث "مثل أمتی کالمطر" کے مصداق ایسے تاریخ ساز انسان جب چاہے پیدا کرے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

گلستاں میں فقط اک عندلیب زار ہوتی ہے
چمن کی روح جس کی آہ سے بیدار ہوتی ہے

اللہ تعالیٰ آپ کے تمام اعمال صالحہ اور انسانی خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے اور آپ کو قدم قدم جنت عطا کرے، اپنے قرب خاص میں جگہ دے۔ آمین!

غموں کی دھوپ اداسی کی آندھیاں توبہ

پروفیسر مسعود الحسن عثمانی
(جنرل سکریٹری دینی تعلیمی کونسل-اتر پردیش)

گذشتہ چند برسوں میں مولاناؒ نے کتنے غم اٹھائے اور کیسے شدید حالات سے گذرے، اس کا اندازہ کوئی دوسرا نہیں کرسکتا، وہ جانیں اور ان کا اللہ جانے، کبھی خود ان حادثات کا ذکر نہیں کیا اور مومنانہ شان سے انہیں قبول کرتے رہے، لیکن اندر سے ٹوٹ گئے، کیسے کیسے پیاروں کو رخصت کیا اور کس طرح رخصت کیا کہ دیکھنے والوں کے کلیجے ہل گئے، لیکن حضرت مولانا رابع صاحب نے کبھی ایک جملہ بھی اپنی زبان سے غم واندوہ کا بیان نہیں کیا، بلکہ ان آنکھوں نے یہ بھی دیکھا کہ دوسروں نے بھرائی ہوئی آواز میں تعزیت کی اور رو پڑے تو مولانا انہیں تسکین دیتے تھے اور انہیں دین وایمان کی باتیں اور ایسے موقع پر اللہ کے احکام کے تقاضے سمجھاتے تھے، ایسا لگتا تھا کہ حادثہ کسی اور کے ساتھ پیش آیا ہے اور مولانا اس کی تعزیت میں کچھ فرما رہے ہیں۔ دو دو داماد رخصت ہوئے، انسانی زندگی میں یہ حادثات بڑے عظیم ہوتے ہیں، مولانا نے بھی ان کی شدت کو محسوس کیا، لیکن دل اور دماغ ہمیشہ پرسکون رہے اور زبان شکر خداوندی سے ہمیشہ تر رہی، مولانا عبداللہ صاحبؒ صرف داماد نہیں تھے بلکہ مستقبل کے لیے نور ہدایت تھے، مولانا علی میاںؒ نے مہمان خانہ میں ظہر کی نماز کے وقت انہیں بیعت کی اجازت دی تھی، ممبئی کے ڈاکٹر قمر الدین صاحب نے مولانا علی میاں کے اسی جملہ پر مولانا عبداللہ صاحب کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا، وہ روحانیت کا سرچشمہ تھے۔ عزیز ترین بڑے بھائی کے بیٹے مولانا حمزہ حسنی صاحب ہمیشہ ان کی نظر میں رہے، ان کی انتظامی صلاحیتوں کے بڑے قائل تھے، انہیں ذمہ داریاں بھی دی گئیں اور مولانا حمزہ صاحب نے انہیں خوب نبھایا بھی، اطمینان ہوگیا تھا کہ وہ خوبصورتی سے اپنے کاموں کی تکمیل کریں گے، کم سخن تھے لیکن زود فہم تھے، اللہ کا فیصلہ کچھ اور تھا اور وہ نافذ ہوا تو مولانا رابع صاحب نے شکر کی زبان اور ایک مرد مومن کی نگاہِ رمز شناس سے اسے قبول کیا، کتنے ایسے ہی دوسرے عزیز او قارب ان کے سامنے رخصت ہوئے، ان میں ایسے بھی تھے جو اپنی دینی وعلمی صلاحیتوں کی بنا پر ممتاز تھے اور مستقبل کے لیے ان سے بڑی امیدیں وابستہ تھیں اور مولانا اپنے لیے انہیں بڑی طاقت سمجھتے تھے، مولانا محمود حسن حسنیؒ کو اللہ نے بڑے جوہر عطا فرمائے تھے، شدید بیماری میں بھی وہ شکر کا مجسم نظر آتے تھے، سمجھتے تھے کہ بیماری لا علاج ہے، لیکن صبر وتحمل سے اللہ کی رضا کے آگے گردن جھکی ہوئی تھی، مولانا رابع صاحبؒ سے جب بھی ان کے سلسلہ میں دریافت کیا تو افسوس اور تقریباً ناامیدی کا اظہار فرماتے تھے، لیکن ان کی زبان سے ایک جملہ ہمیشہ سنا کہ اللہ کی مشیت بہت بڑی ہے اور کبھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بات خود مولانا محمود صاحب سے بھی فرمائی تھی، لیکن اندر سے ٹوٹے ہوئے تھے اور مولانا محمود کی آنکھوں میں آنسو تھے، عجیب منظر تھا، یہی منظر اس وقت ایک نظر دیکھا اور دوسرے کمرہ میں چلے آئے، بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے اور ندوہ واپس آگئے۔ مولانا عبداللہ صاحبؒ اور مولانا حمزہ صاحبؒ ان کے قلب ونظر تھے، دونوں کی نماز جنازہ پڑھائی اور رخصت کیا۔

ندوہ کے بعض اساتذہ ان کے سامنے رخصت ہوگئے جن سے تعلق بھی بہت تھا اور جن کا مرتبہ بھی بہت بلند تھا، مولانا برہان الدین سنبھلی صاحبؒ کا انتقال ہوا تو فرمایا کہ ان کی حیثیت ندوہ کے

لیے ایک بڑے اہم ستون کی تھی۔ بڑی تفصیلات ہیں لیکن انہیں بیان کرنے کا یارا نہیں ہے۔ مولانا واضح صاحب کا حادثہ بہت بڑا تھا، اس کی اطلاع دی گئی تو تقریباً چیخ پڑے لیکن فوراً ہی خاموش ہوگئے اور پھر خاموش ہی رہے، مولانا واضح صاحب چھوٹے بھائی تھے، لیکن تقویت کا مرکز تھے اور فکر ونظر کا بڑا اثاثہ تھے، ان کا حادثہ بظاہر ناقابل برداشت سمجھا جاتا تھا، لیکن اس کو بھی مولانا نے جس طرح قبول کیا وہ انہی کا حصہ تھا، دونوں بھائیوں میں غیر معمولی محبت تھی، ایک ساتھ اٹھنا بیٹھنا رہنا سہنا کھانا پینا اور اہم ترین معاملات ومسائل میں باہمی مشورہ، دونوں ایک دوسرے کے لیے بڑی طاقت وتوانائی، مولانا رابع صاحب انہیں واضح کہا کرتے تھے، لیکن ہمیشہ بڑا بھائی سمجھتے تھے اور مولانا واضح صاحب کو چھوٹے بھائی کی حیثیت سے بڑا ناز اور اطمینان تھا، دونوں بھائیوں کا انداز نظر اور طرز عمل اور ایک طرح سے فکری اظہار زبان خاموش سے یہی ہوتا تھا کہ ع

دل کو ڈھارس ترے وجود سے ہے

ڈھارس کا یہ ذریعہ بھی ختم ہوا تو مولانا رابع صاحبؒ بالکل تنہا ہوگئے اور اس کا احساس بھی بڑھ گیا، لیکن کبھی اس کا اظہار نہیں فرماتے تھے، مولانا علی میاں کو رخصت کیا تھا تو عمر اور صحت بہتر تھی، بڑے بھی موجود تھے، ندوہ اور ملت کا دامن بھی بھرا ہوا تھا، لیکن اس کے بعد یہ سلسلہ دراز ہوا اور ایک ایک کر کے وہ سب لوگ رخصت ہوگئے جن کی موجودگی بہت باعث تقویت تھی۔ دوسروں کے دل دہل گئے تو مولانا رابع صاحب پر جو کچھ گذری اس کو کیسے بیان کیا جاسکتا ہے؟ سمجھا بھی نہیں جاسکتا، یہ ضرور ہے کہ مولانا کو دیکھ کر ایمان تازہ ہوتا تھا، یہ بھی اندازہ ہوا کہ تنہائی کے یہ شب وروز آخرت کے تصور سے وابستہ تھے اور خود مولانا کی نظر میں اس کی بڑی قدر وقیمت تھی، وہ گفتگو بھی فرماتے تھے، ندوہ میں جلسوں میں بھی شریک ہوتے تھے، کچھ بیان بھی ہوتا تھا لیکن اندرونی طور پر وہ دنیا سے منہ موڑ چکے تھے، اس کا احساس بھی تھا کہ منزل اب زیادہ دور نہیں ہے، یہی وقت تھا جب مالک حقیقی سے ان کا قلبی رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا اور پھر ان کا پورا وجود اس کا مظہر ہوگیا لیکن کسی کو اس کا احساس نہیں ہونے دیا، اشارے ضرور نمایاں ہوئے، لیکن زبان ہمیشہ اس مسئلہ میں خاموشی بھی رہی، مولانا محمد علی جوہر نے ایک مؤمنانہ شعر کہا تھا ؎

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ساری زندگی اسی طرز ملاقات کی تمنا رہی اور جب اس کا وقت آیا تو اس کے لیے دیدۂ دل نے سب کچھ فراموش کردیا، مولانا علی میاںؒ کے ساتھ بھی یہی سب کچھ پیش آیا تھا اور بھوپال میں شاہ یعقوب صاحبؒ کے آخری ایام میں اسی کا مظاہرہ ہوا، مولانا رابع صاحبؒ بھی اسی سلسلہ میں شامل ہوگئے۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا

ادارے محروم ہوگئے، پوری ملت جیسے یتیم ہوگئی، لیکن آخرت کے اعتبار سے ان کا مقام بلند تر ہوگیا، وہ مولانا علی میاںؒ کے سایہ میں پلے بڑھے تھے، حضرت مولانا نے بہت پہلے اس کا فیصلہ کرلیا اور اسی نہج پر ان کی دینی اور علمی تربیت کی گئی اور خود مولانا رابع صاحب نے اپنے آپ کو اسی سانچہ میں ڈھال لیا اور وہ واقعۃً مولانا علی میاں کے جانشین ہوگئے، انگریزی اخبارات میں مولانا علی میاں کو ہمیشہ Soft Spoken لکھا جاتا تھا، وہی نرم گفتاری، مزاج وطبیعت کی نرمی اور مروت پورے طور پر مولانا رابع صاحب کی شخصیت میں منتقل ہوگئی تھی، مولانا نے اس کی اہمیت کو سمجھا بھی اور اس کی لاج بھی رکھی اور اس کا بھرپور مظاہرہ بھی ہوا۔ بزرگان دین وملت کی دعاؤں سے امید قوی ہے کہ روحانی اعتبار سے یہ سلسلہ قائم رہے گا اور موجودہ ذمہ داران کے لیے فضا سازگار ہوگی کہ بہرحال ان کا رشتہ بھی اسی سلسلہ سے وابستہ ہے۔

مولانا رابع صاحب کا ایک بہت اہم اور قیمتی گرامی نامہ اس وقت میرے پیش نظر ہے جو تقریباً بیس برس پہلے اور مولانا علی میاں کے سانحہ ارتحال کے چار پانچ برس بعد مجھے تحریر فرمایا تھا، وہ میرے لیے سرمایہ حیات ہے، اسی کا ایک حصہ مولانا کے پیغام کی حیثیت

رکھتا ہے، ہر دور میں ملی کاموں میں منہمک ذمہ داران کے لیے اس میں ایک سبق ہے اور طرز فکر بنانے اور سنوارنے کی دعوت بھی ہے:

''میں نے ملی کاموں کے سلسلہ میں اپنے پیش رو حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے نقش قدم کو اپنانے کی کوشش کر رکھی ہے، وہ دوستانہ انداز میں افہام وتفہیم کا سنجیدہ اور محکم طریقہ اختیار کرتے تھے اور ملت میں اپنے وقار اور اثر سے یہ فائدہ اٹھاتے تھے کہ ان کے پیچھے ملت بنے اور اس کا لحاظ رکھتے تھے کہ کسی صاحب اقتدار کے نہ دایاں بازو سمجھے جائیں اور نہ بایاں بازو، اس طرح انہوں نے مختلف بادشاہوں سے اور مختلف وزرائے اعظم سے شخصی ملاقاتیں کیں اور اپنی بات ان کے کانوں تک پورے وزن سے پہنچائی، ہندوستان کے حکمرانوں سے بھی ان کی ملاقاتیں رہیں اور جہاں مقصد میں پوری کامیابی نہ ملی، وہاں یہ ضرور ہوا کہ ان کے غلط کاموں کی شدت کو ہلکا کرنے میں وہ کامیاب ہوئے، دینی تعلیمی کونسل کے وہ صدر تھے، اس میں بھی ان کا رویہ یہی تھا، میں بھی اسی رویہ کو مناسب سمجھتا ہوں اور میرے اس خیال سے امید ہے کہ آپ کو بھی اختلاف نہ ہوگا۔''

اللہ تعالیٰ مولانا رابع صاحبؒ کے درجات بلند فرمائے، وہ تو اپنے ساتھ آخرت کے لیے بہت عظیم سرمایہ لے کر گئے ہیں، لیکن یہاں اندھیرا بہت مہیب ہے، تکیہ اور ندوہ کے در ودیوار پر افسردگی چھائی ہوئی ہے، ہر شخص مغموم ہے، ادارے فکر مند ہیں، ملت مضطرب ہے، مسائل بے شمار ہیں اور مسلمان ان کا شکار ہیں، کشتی منجدھار میں ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیت کھیون ہار ہے، اسی سے لو لگانے کی ضرورت ہے، اخلاص وللّٰہیت سے آواز بلند کرنے کی ضرورت ہے، اللہ کی رحمت کا اپنے آپ کو مستحق ثابت کرنے کی ضرورت ہے، بزرگوں کے طرز عمل پر نظر رکھنے، انہیں سمجھنے اور اختیار کرنے کی ضرورت ہے کہ یہی سب کچھ ان کی خدمت میں خراج عقیدت بھی ہے، دعائے مغفرت بھی ہے اور اپنے لیے ذریعہ نجات بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے اپنے محبوب ﷺ کی امت کو لاوارث نہیں چھوڑا ہے، دین ودنیا کی فلاح وکامرانی کے لیے ایسے ذرائع بنائے ہیں کہ ان پر عمل کر کے حالات کو سازگار بنایا جاسکتا ہے، مولانا رابع صاحبؒ کی زبان سے اکثر اسی موضوع پر جو کچھ سنا اور جس کیفیت میں انہوں نے بیان کیا، اس سے اس موضوع کی اہمیت کا احساس ہوتا تھا، اکثر اس کا بھی اندازہ ہوا کہ ملت کے مسائل میں وہ اس نکتہ کو خود بھی محسوس کرتے تھے اور ان کی خواہش ہوتی تھی کہ ملت کے افراد انفرادی اور اجتماعی طور پر اس کو سمجھیں اور اس پر عمل کریں۔

مولانا علی میاں کی فکر ونظر، غور وتدبر اور اعتدال وتوازن کا جو اثاثہ پورے طور پر مولاناؒ کے حصہ میں آیا تھا اس کو ایک امانت کے طور پر زندگی کے آخری لمحات تک نہ صرف اس کی حفاظت کا فریضہ انجام دیا، بلکہ اس کو اپنے وجود میں شامل کرلیا۔

بڑی خوش بختی یہ تھی کہ مولانا علی میاںؒ کی محبت اور شفقت مجھے جس طرح حاصل تھی، میرے محترم مولانا رابع صاحب نے بھی وہی انداز قائم رکھا، مجھے خوب یاد ہے کہ حضرت مولاناؒ کے انتقال پر تدفین کی صبح تکیہ پر جب مولانا رابع صاحبؒ کے کاندھوں پر سر رکھ کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا تو مجھے تسلی دیتے ہوئے یہی فرمایا تھا کہ آپ کے ساتھ مولانا کی محبت کا ہمیں اندازہ ہے، اس جملہ نے مجھے سنبھال لیا تھا، اب وہ بھی نہیں رہ گئے، سب کچھ چلا گیا، بس میرے آنسو ہیں، میرا اضطراب ہے، میں خود ہی اپنے آپ کو سنبھال رہا ہوں، اللہ اپنے بندوں کا نگہبان بھی ہے، شفیق ومہربان بھی ہے۔

غموں کی دھوپ اداسی کی آندھیاں توبہ
کسے سناؤں میں اپنی کہانیاں توبہ

بابری مسجد کی شہادت کے موقع پر مولاناؒ نے ایک نجی مجلس میں فرمایا تھا کہ مسلمانوں کا بھرم ٹوٹ گیا، یہ مختصر سا جملہ بڑی معنویت کا حامل تھا۔ مولانا رابع صاحبؒ اس طرح کی بلیغ باتیں اکثر فرماتے تھے۔ اب ان کا حادثہ پیش آیا ہے، تو محسوس ہوتا ہے کہ ملت کے حق میں کئی بھرم ایک ساتھ ٹوٹ گئے اور کئی جید علماء اور بزرگان دین ایک ساتھ رخصت ہوگئے اور یہاں سے وہاں تک پوری بزم خالی ہوگئی۔

یہ حالت ہوگئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے
کہ خم کے خم بھرے ہیں مے سے اور میخانہ خالی ہے

وہ آبروئے ندوہ شبلی وسلیماں

پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن
(بانی وصدر ابن سینا اکیڈمی۔علی گڑھ)

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں عصری علوم کے آغاز اور نئے نظام تعلیم کے تحت سرسید (وفات ۱۸۹۸ء) کی حیات ہی میں ان کے انتقال سے چار برس قبل مسلمانوں کے دانشور طبقہ اور صاحب نظر علماء میں یہ احساس پیدا ہو گیا تھا کہ محض رسمی دینی تعلیم، فقہ اور مسائل شریعہ پر زور دینے کے علاوہ مسلمانوں میں فکر و خیال کی وسعت، سیرت، حیات صحابہ، تاریخ اسلام، قرون اولیٰ کے مسلمانوں کے علمی وسائنسی کارناموں کے مطالعہ، عربی واردو زبان و ادب اور تصنیف وتالیف کے ذوق کے لیے ایک بڑے ادارہ کا قیام ضروری ہے۔اس کے لیے کانپور میں اس زمانہ کے مشاہیر نے بڑے پیمانہ پر ایک دارالعلوم قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور لکھنؤ میں ندوۃ العلماء کا ادارہ وجود میں آیا۔

ندوۃ العلماء کے لیے یہ امر باعث شرف وامتیاز رہا کہ اس کے قیام کی ابتدا سے اسے ایسے انصرام کار ملے، جنہوں نے اپنی صحیح اسلامی فہم، اصابت رائے اور ذوق وذہن کی بالیدگی کے ساتھ ندوہ کو جلد ہی وہ اعتبار وافتخار بخشا کہ ملک میں اسلامی علوم ومعارف کے ساتھ عصری آگاہی اس کا طرہ امتیاز بنی اور اس کے فارغین نے فقہ اور مسلکی اختلاف سے اوپر اٹھ کر قرآن وسنت، سیرت وحیات صحابہ اور عربی واردو زبان وادب کی ثروت میں تاریخ ساز کارنامے انجام دیئے۔ابتدا میں مولانا محمد علی مونگیری، نواب علی حسن خاں، منشی احتشام علی، مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا حیدر حسن خاں ٹونکی نے اپنے خون جگر سے آبیاری کی، پھر دوسری نسل میں ندوہ کے صاحب قدر فضلاء نے کمان سنبھالی۔علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا عبدالرحمٰن کاشغری ندوی، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، رئیس احمد جعفری ندوی، رشید اختر ندوی، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، مولانا ابواللیث ندوی، مولانا محمد اویس ندوی نگرامی، حکیم محمد مسیح الزماں ندوی، مولانا عبداللہ عباس ندوی، وہ ممتاز شخصیتیں ہیں، جن کے علمی، ادبی وتصنیفی کاموں نے نہ صرف ندوہ کی منشا اور اس سے وابستہ توقعات کو پورا کیا، بلکہ ملک وبیرون ملک خاص طور پر عرب ممالک میں ہندوستانی علماء کے اعتبار ووقار میں اضافہ کیا۔

مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی جن کا تعلق سادات حسنی کی ایک معزز شاخ سے تھا اور جسے شاہ علم اللہ اور سید احمد شہید نے اپنی روحانی ومجاہدانہ زندگی سے اوج کمال پر پہنچایا، اس سلسلہ زریں کی انمول کڑی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تھے۔مولانا کے فضائل وکمالات پر یہاں لکھنا مقصود نہیں ہے، انہوں نے ندوہ کی اس شاندار روایت کو جس طرح آگے بڑھایا، اس سے پوری اسلامی دنیا میں ندوہ کو عظمت ورفعت حاصل ہوئی اور ندوہ کا عالم اسلام کے اہم ترین تعلیمی اداروں میں شمار ہوا۔

مولانا علی میاں کی وفات (۲۰۰۰ء) اگرچہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے کسی سانحہ عظمیٰ سے کم نہ تھی لیکن ندوۃ العلماء کے لیے یہ ایک ایسا خسارہ تھا جس کی تلافی کی بظاہر کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ان کے بعد ندوہ کی نظامت کا سب سے بڑا مسئلہ درپیش تھا۔ اس مشکل گھڑی میں مولانا رابع حسنی کی شخصیت پر نگاہیں اٹھیں۔

انہوں نے قدرے تکلف کے بعد اس منصب عالی کو قبول کیا، پھر جلد ہی نظامت کے فرائض اس طرح ادا کیے کہ نہ صرف ندوہ بلکہ ملک اور ملک سے باہر انہیں علی میاں کے حقیقی جانشین کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا۔ ۲۰۰۲ء میں مولانا مجاہد الاسلام قاسمی کے انتقال کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کی حیثیت سے ان کا انتخاب عمل میں آیا۔ انہوں نے مسلم پرسنل لا بورڈ اور رابطہ ادب اسلامی ہند جیسے مؤقر اداروں کے فرائض صدارت اس خوش اسلوبی سے انجام دیے کہ طبقہ علماء میں انہیں خاص مرجعیت اور محبوبیت حاصل ہوئی۔ دینی حلقوں میں ان کی قیادت پر اعتماد کا اظہار کیا گیا اور جن اداروں کو ان کی سربراہی حاصل تھی وہ معتبر و مؤقر ادارے قرار پائے۔

یہ بات عام طور پر تسلیم کی گئی ہے کہ ذاتی تحصیلات سے ماوریٰ، خاندانی رشتہ و وراثت کے بطور کسی فن یا ادارہ سے تعلق نسبتاً زیادہ دلچسپی اور شغف کا باعث ہوتا ہے اور اس میں زیادہ انہماک و وابستگی کے ساتھ خیر و برکت کے زیادہ سامان ہوتے ہیں۔ مولانا رابع حسنی اپنی خاندانی روایتوں کے امین تھے۔ ندوۃ العلماء سے انہیں ذاتی و موروثی تعلق تھا۔ نانا مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی، بڑے ماموں ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی، چھوٹے ماموں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، اپنے اپنے زمانہ میں ندوۃ العلماء کے ناظم رہے تھے، دوسرے اور امتیازات کی طرح وہ نظامت ندوۃ العلماء کے سلسلہ میں اپنے ان بزرگوں کے صحیح جانشین ہوئے اور انہوں نے ندوۃ العلماء کی تعمیر و ترقی کے لیے کوئی کسر نہیں رکھی۔

وراثت میں ملے کمالات کے ساتھ ان میں عزیمت و استقامت، بے نفسی و استغنا، تحمل و بردباری، عجز و انکسار اور فقر و درویشی کی ایسی صفات موجود تھیں جو انسانیت کو مجد و شرف عطا کرتی ہیں۔ انہوں نے بڑی صاف ستھری زندگی گزاری اور دنیاوی علائق سے اپنے کو دور رکھا۔ ندوہ میں ان کے ایک قریبی عزیز کی طرف سے عوامی سطح پر بعض ایسے بیانات سامنے آئے جن سے ندوہ میں انتشار کی کیفیت پیدا ہوئی، مولانا کی ذات گرامی بھی ان کے حملوں سے محفوظ نہیں رہی، مولانا کے لیے یہ سب بے حد تکلیف دہ اور باعث رنج و ملال تھا، لیکن انہوں نے ان عزیز کے خلاف کارروائی میں اندر اور باہر سے شدید دباؤ کے باوجود کسی جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ ان کی ناشائستہ حرکتوں کے تذکرہ پر کبھی اپنی زبان سے ان کے خلاف ایک لفظ نہیں نکالا، ہمیشہ ایک المناک خاموشی چھا جاتی تھی، اعلیٰ ظرفی کا یہ مظاہرہ نفس پر بے پایاں قابو کا ایک بڑا اظہار تھا۔

ندوہ میں مولانا علی میاں کی جانشینی اور فرائض نظامت کے لیے ان کے لائق ترین بھتیجے اور ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے صاحبزادہ مولانا سید محمد حسنی پر سب کی نگاہیں تھیں۔ وہ ہر طرح اس منصب کے لائق و مستحق تھے۔ ان کی تعمیر و تربیت پر مولانا کی خاص توجہ تھی، اکثر اسفار میں ساتھ رکھتے تھے۔ عربی زبان و ادب پر انہیں وہ مہارت تھی کہ اہل زبان کی طرح لکھتے اور بولتے تھے۔ مجلّہ البعث الاسلامی جس کے وہ بانی مدیر تھے، اپنے ادبی مضامین کے باعث عالم عرب کے اہم علمی مجلّات میں شمار کیا جاتا تھا۔ ان کی جواں مرگی کے بعد مولانا علی میاں ندوی کی ساری توجہات کا مرکز مولانا سید رابع حسنی ندوی کی ذات گرامی تھی۔ انہوں نے مولانا کے دامن عطوفت میں تعلیم و تربیت حاصل کی اور سفر و حضر میں ان کے شریک رہے اور پھر اراکین مجلس انتظامیہ نے باتفاق آرا انہیں ناظم ندوۃ العلماء منتخب کیا اور انہوں نے اس منصب کو رونق بخشی۔

بڑی شخصیتوں کے تعلقات کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ لطف و مرحمت کے ان کے خاص انداز سے ہر شخص ان سے قربت محسوس کرتا ہے، مولانا سید رابع حسنی کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا۔ وہ ملک کی مقبول ترین شخصیتوں میں تھے اور بڑی تعداد میں لوگوں سے ان کا حسن تعلق قائم تھا۔ میرا ان سے رشتہ محض ذاتی نہیں تھا۔ ان کے خاندان سے تقریباً ڈیڑھ سو برس سے میرے بزرگوں کے مراسم تھے۔ مولانا حکیم سید فخر الدین خیالی، مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کے زمانہ قیام بھوپال میں خلوص و وداد باہمی کا قائم سلسلہ بحمد اللہ آج بھی برقرار ہے۔ مولانا علی میاں پر اپنے ایک مضمون (مشمولہ تذکرہ معاصر شخصیات ۲۰۲۲ء) میں اس قدیم تعلق کا میں نے قدرے تفصیل سے ذکر کیا ہے۔

ندوہ میں میری طالب علمی کے زمانہ میں ۱۹۵۲ء میں مولانا سید رابع حسنی عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے، لیکن ہمارے درجہ کے عربی ادب کے استاد مولوی عبدالماجد ندوی ہی رہے۔ ہمارے درجہ ہی کے لحاظ سے درجہ بدرجہ ان کی ترقی ہوتی رہی اور شروع سے آخر تک وہی اس درجہ کو پڑھاتے رہے۔ مولانا رابع حسنی سے ہمارے درجہ کے طلبہ کو پڑھنے کا موقع نہیں ملا۔ مولوی عبدالماجد بہار کے رہنے والے لائق اور شفیق استاد تھے۔

مولانا رابع حسنی سے ندوہ میں ان کی تشریف آوری کے بعد جو تعلق قائم ہوا، اس میں وقت کے ساتھ اضافہ ہوتا گیا۔ بہت محبت اور شفقت سے ملتے تھے۔ لکھنؤ تکمیل الطب کالج، یونانی طبی کانفرنس یا دوسرے موقعوں پر جانا ہوتا تو ان کی خدمت میں حاضری کی ضرور کوشش کرتا۔ ہر مرتبہ ندوہ میں قیام کے لیے اصرار فرماتے۔ ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کی رکنیت کے بعد اس کے سالانہ جلسوں میں شرکت اور مہمان خانہ میں قیام سے مسرور ہوتے اور دعاؤں سے نوازتے تھے۔ ہر ملاقات خوشگوار یادوں پر ختم ہوتی تھی اور دیر تک طبیعت پر اثر رہتا تھا۔ علی گڑھ میں دو مرتبہ غریب خانہ پر قدم رنجہ فرمایا۔ تیسری مرتبہ ۲۰۰۲ء میں ابن سینا اکاڈمی کے قیام (۲۰۰۰ء) کے بعد جب ان کا علی گڑھ آنا ہوا تو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ہند اسلامی وراثت کے تحفظ کے حوالہ سے دیر تک گفتگو فرماتے رہے۔

مولانا کے برادر خرد مولانا سید واضح رشید حسنی اور محمد میاں مرحوم میرے خاص احباب میں تھے۔ ندوہ کے زمانہ طالب علمی کے بعد واضح صاحب اور مولانا ابوبکر حسنی جب دہلی میں آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے، حسن اتفاق اس وقت میں بھی وہاں طبیہ کالج میں تھا۔ اکثر و بیشتر ملاقاتیں اور نشستیں رہتیں۔ پھر لکھنؤ میں ندوہ میں ان سے ملنا ہوتا تھا۔ محمد میاں مرحوم ٹھیک میری عمر کے تھے، ان سے زیادہ بے تکلف باتیں ہوتی تھیں۔ بہت کم عمری میں فوت ہوئے۔ ان کی وفات میرے لیے ایک بڑا سانحہ تھی۔ ایک قابل اطمینان بات ان کے صاحبزادہ مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی کا مولانا رابع حسنی کی جگہ ناظم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے انتخاب ہے۔ وہ ہر طرح اس کا استحقاق رکھتے ہیں۔ برسوں سے مولانا سید رابع حسنی کے زیر سرکردگی ندوہ کے معاملات سے متعلق تھے۔ مولانا خود اپنی جانشین کے طور پر انہیں دیکھتے تھے اور انتظامی و انصرامی امور میں شریک رکھتے تھے۔ ایک دو مرتبہ مجھ سے اس کا ذکر بھی ہوا تھا۔ وہ براہ راست مولانا حکیم سید عبدالحی حسنی کی یادگار علمی وراثت کے امین اور خاندان کی بہترین شریفانہ قدروں کا نمونہ ہیں۔ مولانا رابع حسنی کی وفات کے بعد جو خلا واقع ہوا ہے، ندوہ کی حد تک ان کے ذریعہ انشاء اللہ اس کی تلافی کی توقع کی جاسکتی ہے۔

مولانا رابع حسنی نے ندوۃ العلماء کی نظامت اور قومی سطح کی دوسری مصروفیات کے باوجود مطالعہ اور تصنیف و تالیف سے ہمیشہ تعلق رکھا اور زندگی بھر دین کی سربلندی کے لیے کوشاں رہے۔ ان کی دو درجن سے زیادہ چھوٹی بڑی مطبوعہ کتابیں ہیں۔ ان میں وہ رسالے بھی شامل ہیں جو ان کی دعوتی و اصلاحی تقاریر و مضامین پر مشتمل ہیں اور جنہیں یچ، یم، حسین ٹرسٹ نے مولانا علی میاں کے اسی طرح کے بعض دوسرے رسالوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔ ان میں مثلاً ''قرآن مجید عظیم نعمت، حاصل، اخلاق، ہمدردی، مدد والا تعاون، فہم قرآن و حدیث کی حامل ربانی شخصیت، راہ عمل، مولانا ابو الحسن علی ندوی کا دعوتی اور اصلاحی اسلوب، مولانا طلحہ کاندھلوی'' جیسے مفید رسالے ہیں جو ان کے تصنیفی مشغلہ پر شاہد ہیں۔ ان کی بڑی کتابوں میں ''امت مسلمہ رہبر اور مثالی امت'' (۲۰۱۱ء) ''اسلامی معاشرہ سورۂ حجرات کی روشنی میں'' (۲۰۱۶ء) ''غبار کارواں'' (۲۰۰۱ء) ہیں۔ غبار کارواں رابطہ ادب اسلامی کے اداریوں اور دیگر رشحات قلم سے متعلق ہے، اس میں ادب اسلامی کے تخیل و محرکات، اسلامی ادب اور مغربی ادبی تحریکات، ادب اسلامی کیوں، ادب اور زندگی، ادب کی طاقت، بچوں کا ادب، جیسے موضوعات شامل ہیں۔

اردو کے علاوہ عربی میں ان کی متعدد کتابوں میں رسالہ "المناسبات الإسلامية" "في ظلال السيرة" "قيمة الإمة

الإسلامية""مقالات فی الترجمة و المجتمع""فی وطن الإمام البخاري" أضواء على الأدب الإسلامی "ہیں۔

قرآن مجیداورآنحضرت کی سیرت سے انہیں خاص شغف تھا۔ ایک زمانہ میں درس قرآن کا سلسلہ بھی جاری کیا تھا۔قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل (اشاعت سوم ۲۰۰۳ء) سے ان کے تفسیری مطالعہ کی وسعت ظاہر ہوئے بغیر نہیں رہتی ہے۔سیرت پران کی دو کتابوں رہبر انسانیت اورنقوش سیرت میں سے رہبرانسانیت کا حال ہی میں انگریزی ترجمہ Prophet Mohammad The Perfect Guid for Mankind کے نام سے ڈاکٹر احسان الحق ندوی نے کیا ہے۔دار الرشید لکھنؤ سے اس کی اشاعت عمل میں آئی ہے۔چند دن قبل ۶ مئی ۲۰۲۳ء کو ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کے جلسہ میں اس کا ایک نسخہ مولانا سید بلال عبدالحی حسنی نے عطا کیا تھا۔

مولانا رابع حسنی کے سفرنامہ از بکستان کے حوالہ سے میری ان سے بہت تفصیل سے گفتگو رہی تھی،ابن سینا پر منعقدہ عالمی کانفرنسوں میں مجھے ۵ بار بخارا،سمرقند، تاشقند،ترمذ،افشنہ اور دوسرے تاریخی مقامات پر جانے کا موقع ملا ہے۔ان کا یہ سفرنامہ وہاں کے تاریخی شہروں اور وہاں کی عظیم المرتبت ہستیوں کے تعارف پر ایک قیمتی دستاویز ہے۔

کسی مختصر مضمون میں مولانا کے علمی اکتسابات اور ناظم ندوۃ العلماء کی حیثیت سے ان کی خدمات کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ان کی حیات اور کارناموں کے لیے ضخیم کتابیں درکار ہیں اور انشاءاللہ انہیں موضوع بنا کر کام کا مستقل سلسلہ جاری رہے گا۔

۲۹/اکتوبر ۱۹۲۹ء تاریخ پیدائش تھی۔۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء کو ۹۳ برس کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔

طب میں مسلمانوں کی تحقیقات وکمالات

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

''عربوں نے اپنی فکری واجتہادی قوتوں سے کام لے کر طریقہ ہائے علاج اور اعمال فن میں بے شمار تجربات واضافات کیے، چنانچہ اب وافد پہلا طبیب تھا جس نے علاج بالغذاء پر زور دیا،حکیم رضی الدین نے غذائے دوائی کو دوائے خالص کے مقابلہ میں ترجیح دی اور حکیم اوحدالزماں ابوالبرکات نے ایک خاص وبائی مرض میں قطع انامل کا علاج اختراع کیا۔ابوالمنصور صاعد بن بشر بن عبدوس نے تمام حکمائے یونان کے قدیم طریقہ علاج کے خلاف اکثر امراض باردہ مثلاً: فالج، لقوہ اور استرخاء کے لیے نظام طب عربی میں ادویہ باردہ اور منع غذا کا علاج رائج کیا، جو آگے چل کر بے حد کامیاب ثابت ہوا، یونانیوں کے یہاں حفظان صحت باقاعدہ ایک علم کی صورت میں موجود نہیں تھا،عرب اطباء نے حفظان صحت کے اصول مرتب کیے اور اسے ایک منظّم فن کی حیثیت سے رائج کیا،اسی طرح انہوں نے امراض چشم کے متعلق تحقیق کی،فن جراحت کو ترقی دی،شکر سازی کے معمل تیار کیے،شکر بنائی اور مرکب ادویہ کی تیاری میں شکر کے استعمال کو رواج دیا۔عربوں نے فن طب میں جو اضافات واختراعات کیے وہ آگے چل کر عصر حاضر کی معلومات وتحقیقات کی اساس بنے۔'' (امت مسلمہ-رہبر اور مثالی امت:۱۰۴-۱۰۵)

ملال یہ ہے کہ دہلیز عاشقاں بھی گئی

پروفیسر محسن عثمانی ندوی
(سابق پروفیسر افلو یونیورسٹی-حیدرآباد)

شعراء کو موسم بہار بہت پسند ہے، سبزہ زار پسند ہے، گلزار پسند ہے، پھولوں کا نکھار پسند ہے، وہ ہمیشہ بہار کا اور پھولوں کا تذکرہ کرتے ہیں، لیکن اس بار رمضان کی بہار آئی تو وہ گل شگفتہ گل چیں قدرت کے ہاتھوں توڑ لیا گیا جو جان بہار تھا، جس کے دم سے گلستاں کا نکھار تھا، جو مسلمانان ہند کا گل سرسبد تھا، جو مسلمانان ہند کی آبرو تھا، جس کے لیے ''ترکش مارا خدنگ آخریں'' کا عنوان زیب دیتا تھا، ۲۱ر رمضان المبارک ۱۴۴۱ھ کو ان کا انتقال ہوگیا، اس وقت ان کی عمر ۹۴ر سال تھی، وہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے چوتھے صدر تھے، قاری طیب صاحبؒ، مولانا علی میاںؒ اور قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے بعد وہ صدر ہوئے، رابع کا مطلب بھی چوتھا ہوتا ہے، ان کا انتخاب بھی اس طرح ہوا تھا کہ وہ خود برسر موقع موجود نہیں تھے، انہیں انتخاب کی خبر کی گئی اور عہدہ قبول کرنے پر اصرار کیا گیا، مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کے انتقال سے اسلامیان ہند کا چمن اجڑ گیا، لاکھوں لوگ ندوۃ العلماء کے وسیع میدان میں نماز جنازہ میں شرکت کے لیے جمع تھے، ڈالی گنج سے موتی محل کے پل تک انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر تھا، حد نظر تک سر ہی سر، لکھنؤ اور ندوہ والوں کے غم میں شریک ہونے کے لیے لوگ بمبئی سے، کشمیر سے، حیدرآباد سے، بھوپال سے بھی پہنچ گئے تھے، دہلی سے بہت سارے لوگ کار ڈرائیونگ کر کے پہنچ گئے، مرکز نظام الدین سے لوگ شریک ہوئے، مولانا صدیق صاحب باندویؒ، مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھیؒ کے خانوادے کے لوگ نماز جنازہ میں نظر آئے، حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی نے نماز جنازہ پڑھائی، جو لوگ ندوہ نہیں پہنچ سکے وہ فجر سے پہلے رائے بریلی آگئے، تاکہ یہاں نماز جنازہ میں اور تدفین میں شریک ہوں، یہاں نماز جنازہ مولانا بلال حسنی نے پڑھائی جواب ندوۃ العلماء کے ناظم ہیں، لکھنؤ میں لاکھوں کا مجمع اور یہاں بھی ہزاروں کا مجمع، مولانا محمد رابع حسنی کی شخصیت ایسی ہی تھی، اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی مقبولیت اور محبوبیت عطا فرمائی تھی، جب کسی کی مقبولیت آسمان پر لکھ دی جاتی ہے تو اہل زمین بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں:

حسن کی جنس خریدار لیے پھرتی ہے
ایک بازار کا بازار لیے پھرتی ہے

مولانا محمد رابع حسنی ندوی، مولانا ابوالحسن علی ندوی کے تربیت یافتہ انسان تھے، وہ مولانا علی میاں کے بھانجہ تھے اور سفر وحضر میں ان کے شریک تھے، وہ مولانا علی میاں کی طرح مصنف بھی تھے، مفکر بھی تھے، عربی کے انشا پرداز بھی تھے، نرم دم گفتگو گرم دم جستجو ان کی خصوصیت تھی، حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم، وہ مسلمانوں کے اتحاد کی علامت تھے، راقم سطور کے نزدیک مسلم پرسنل لا بورڈ نے بہت سے اچھے کام کیے، لیکن بہت سے فیصلے غلط بھی کیے تھے، لیکن چونکہ اجماع اور اتحاد غلط فیصلہ ہی پر ممکن تھا، اس لیے مولانا رابع صاحب نے اسے مانا اسے قبول کیا، ''متفق گردید رائے بوعلی با رائے من'' مولانا محمد رابع صاحب مسلمانان ہند کے علماء کے ذہن کو بدل نہیں سکتے تھے اور کوئی بھی بدلنے کی کوشش کرتا تو یہ اتحاد کی قیمت پر ہوتا۔

مولانا محمد رابع حسنی رابطہ ادب اسلامی کے صدر بھی تھے، یہ ایک ادبی تنظیم ہے جس کی شاخیں دنیا کے مختلف ملکوں میں پائی جاتی ہیں، مولانا ابوالحسن علی ندوی اور ان کی ہم خیال عرب ادباء نے اس

کی داغ بیل ڈالی تھی، ہندوستان میں بھی اس کے جلسے ہوتے ہیں۔

مولانا محمد رابع حسنی ندوی ایک معدن علم وروحانیت کے لولوے لالہ تھے، ان کے خاندان کی نامور شخصیت وہ ہے جسے دنیا سید احمد شہید کے نام سے جانتی ہے، مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ان کے حقیقی ماموں تھے، مولانا محمد رابع صاحب کی تربیت مولانا علی میاں نے کی تھی، وہ ان کے ساختہ پرداختہ تھے، وہی نرمی وہی لینت اور ملاطفت، دوسروں کے شیشہ دل کا خیال، وہی شیریں زبانی، خندہ پیشانی، شگفتہ روئی، وہی عبادات میں انہماک، ذکر ودعا اور تلاوت کا اہتمام اور ورع وابتہال، وہی اخلاص عمل اور خلق حسن، گفتگو میں احتیاط کہ کسی کی دل شکنی نہ ہو، غیبت سے دور اور نفور، رشتوں کا پاس ولحاظ، مسکینوں کی حاجت روائی، اسلام کی برتری کی فکر، عالم اسلام سے واقفیت، مسلمانوں کی اعانت، کثرت عبادت کی ساتھ ادائیگی حقوق، استحضار نیت، صلہ رحمی، مہمان نوازی اور علماء کی توقیر، دولت وحشمت کے معاملہ میں استغناء اور زاہدانہ کردار اور بیشمار خوبیاں جوان میں تھیں وہ مولانا علی میاں کی خصوصی تربیت کا نتیجہ تھیں۔ مولانا علی میاں عربی اور اردو دونوں زبانوں کے مصنف تھے مفکر تھے، مولانا محمد رابع حسنی ندوی بھی عربی اور اردو دونوں زبانوں کے مصنف اور مفکر تھے، وہ مولانا الیاس اور مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا حسین احمد مدنی اور شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا کی مجلسوں میں بھی بیٹھ چکے تھے اور ان شخصیتوں سے انہوں نے پورا استفادہ کیا، انہوں نے عالم عرب کے دورے کیے اور وہاں طویل عرصہ تک قیام کیا اور وہاں کی شخصیتوں سے ملاقاتیں کیں۔

مولانا علی میاں کے ساتھ انہوں نے دنیا کے ملکوں کا سفر کیا۔ دنیا کے مصنفین کی کتابوں کا مطالعہ کیا، عرب علماء کے افکار وخیالات سے واقف ہوئے، اعلیٰ تصنیفی ذوق خاندان میں موجود تھا، اس ذوق کو جلا ملی، انہوں نے مولانا عبد الباری ندوی کی کتاب ''تجدید تصوف وسلوک'' کا عربی زبان میں ترجمہ کیا، اس وقت ان کی عمر ۲۰ یا ۲۲ رسال کی تھی، اس کے بعد ان کی کتابیں لگاتار شائع ہوتی رہیں، عربی میں بھی اور اردو میں بھی۔ عربی زبان میں ان کی پندرہ کتابیں شائع ہوئیں، ان کی کتاب ''الادب العربی بین عرض ونقد'' اور ''منثورات من الادب العربی'' بہت سے مدارس اسلامیہ میں نصاب میں داخل ہے، ان کی کتاب ''جزیرۃ العرب'' کا موضوع جغرافیہ ہے، ان کی کتاب ''حج اور مقامات حج'' بھی مقبول کتاب ہے اور حج کے موضوع پر یہ واحد کتاب ہے جو جغرافیائی ذوق اور تحقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے، ان کی کتاب امریکہ کا سفرنامہ بھی بہت معلوماتی کتاب ہے، سیرت نبوی کے موضوع پر ان کی کتاب ''رہبر انسانیت'' بہت اہم کتاب ہے اور دعوتی نقطہ نظر سے لکھی گئی ہے، اردو کے علاوہ انگریزی اور ہندی میں بھی موجود ہے، ان کی کتاب ''قرآن مجید- انسانی زندگی کا رہبر کامل'' بھی بہت اہم کتاب ہے، ان کا پورا خاندان اہل علم اور اہل قلم کا خاندان ہے، ان کے بھائی محمد واضح حسنی ندوی عربی زبان کے ادیب اور مفکر تھے اور بہت سی کتابوں کے مصنف تھے، ان کے ایک اور بھائی محمد ثانی حسنی بہت اچھے شاعر، ادیب اور مصنف تھے، جنہوں نے ندوہ کا ترانہ بھی لکھا ہے، مولانا محمد الحسنی ان کے ماموں زاد بھائی نامور ادیب اور عربی کے صحافی تھے اور ان کے ماموں مولانا ابوالحسن علی ندوی کو تو دنیا جانتی ہے، پورا خاندان ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کا مصداق ہے، مولانا محمد رابع حسنی ندوی بہت آسان زبان میں لکھتے تھے، لیکن فکر کے آبدار موتی پروتے تھے، انہوں نے مسلمانوں کے مسائل پر بہت لکھا اور بہت مفکرانہ انداز میں انہوں نے رہبری کی، ان کے یہ مفکرانہ مضامین عام طور پر ''تعمیر حیات'' میں شائع ہوتے تھے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا انتقال بیک وقت علمی ادبی فکری اور روحانی قیادت کا خاتمہ ہے۔ مسلمانوں کی ظاہری اور باطنی خوبیوں کا چاند غروب ہوگیا، ایسے میں اب عید کا چاند طلوع بھی ہوا تو کیا خوشی اور کیسی فرحت ؎

وفات پا چکے سب مرشدان کوئے جنوں
ملال یہ ہے کہ دہلیز عاشقاں بھی گئی

''قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل''

خصوصیات اور کچھ بنیادی نکات

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی
(سابق چیئرمین شعبہ اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی-علی گڑھ)

بزرگ وممتاز عالم دین مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مرحوم (۲۹/اکتوبر ۱۹۲۹ء-۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء) کی وفات نہ صرف ان کے اہل خانہ اور ندوۃ العلماء بلکہ پوری ملت کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے۔ مولانا مرحوم کی شخصیت کا ایک قیمتی وسبق آموز پہلو یہ ہے کہ انہوں نے بہت مصروف زندگی گزاری۔ تدریسی مصروفیات، ندوہ اور دیگر علمی و دینی اداروں کی انتظامی ذمہ داریوں، مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت اور تحریک پیام انسانیت کی سرگرمیوں اور ملی فلاح و بہبود کے مختلف النوع کاموں کی انجام دہی کے ساتھ تصنیف وتالیف سے بھی ان کا خاص شغف رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی علمی یادگاروں میں ۲۵/سے زائد کتب اور سینکڑوں مضامین ومقالات شامل ہیں۔ ان کی دو کتابیں خصوصی اہمیت وافادیت کی حامل ہیں: قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل اور سراجاً منیراً رہبر انسانیت ﷺ۔ یہ کتابیں میرے لیے ذاتی طور پر اس وجہ سے قیمتی یادگار ہیں کہ مدرسہ دینیہ غازی پور کے زیر اہتمام ۱۷/اکتوبر ۲۰۱۵ء کو منعقدہ رابطہ ادب اسلامی (شاخ غازی پور) کے سیمینار (بعنوان ''اردو زبان وادب کے ارتقا میں مدارس اسلامیہ کا حصہ'') کے دوران میں مولانا مرحوم نے انہیں مجھے ہدیۃً عنایت کی تھیں۔ اولین کتاب کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قرآن کریم کا نہایت جامع تعارف خاص طور سے اس پہلو سے پیش کیا گیا ہے کہ عقائد، عبادات، اخلاقیات اور معاملات کے باب میں اس کی اصل حیثیت (رہبر کامل) اچھی طرح نمایاں ہوجائے۔ اسی اعتبار سے مصنف گرامی مرحوم نے اس کے مباحث مرتب کیے ہیں اور مختلف شعبہ حیات انسانی سے متعلق اس کی ہدایات آسان زبان اور سہل اسلوب میں واضح کی ہیں۔ کتاب کے تعارف میں نبی آخر الزماں ﷺ کی بعثت اور نزول قرآن کی غرض و غایت واضح کرتے ہوئے مصنف محترم تحریر فرماتے ہیں:

''قرآن مجید کو نصیحت اور موعظت کے لیے اور نبی ﷺ کو اس نصیحت وموعظت کے نمونے کے طور پر مقرر کیا گیا، اب جو بھی ان کو اپنا رہنما بنائے گا اس کو اپنے پروردگار خالق کائنات اللہ رب العالمین کے حکم اور مرضی کو بالکل صحیح طریقے سے معلوم کرنے کا موقع ملے گا اور یہ انسانی مخلوق جس کو عقل اور خواہش نفس دونوں سے فائدہ اٹھانے اور اثر لینے کی خصوصیت عطا کی گئی اور خواہش نفس کے اثر سے وہ حقائق کو سمجھنے میں بے راہ ہوسکتا ہے، اس کو صحیح راستہ پر لانے کا ذریعہ رہے گا اور من مانی زندگی گزارنے اور اللہ رب العالمین کی عطا کردہ نعمتوں سے غلط فائدہ اٹھانے سے بچانے کا ذریعہ بنے گا۔ اسی خصوصیت کی بنا پر نبی کریم ﷺ کو ہادی، مبشر، منذر، بشیر ونذیر اور سراجاً منیراً کہا گیا ہے اور قرآن مجید کو ذکریٰ للمؤمنین، ھدیً للمتقین، موعظة، شفاء، کتاب مھیمن اور ''فرقان'' کہا گیا۔''
(سید محمد رابع حسنی ندوی، قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، دار الرشید، لکھنؤ، ۲۰۱۵ء، ص ۲۱)

موجودہ دور کے حالات، انسانیت کو درپیش مسائل اور بعض حلقوں کی جانب سے قرآن کریم کی نسبت سے اٹھائے جانے والے سولات واعتراضات کے پس منظر میں اس کتابِ ہدایت کے کن مضامین کی تشریح وترجمانی خصوصی طور پر مطلوب ہے یا اس کی

ہدایات وتعلیمات کے کن پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی زیادہ ضرورت تھی اور ہے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا سید محمد واضح رشید ندویؒ زیرِ مطالعہ کتاب کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''اس وقت ضرورت اس بات کی تھی اور ہے کہ قرآن کریم میں انسانیت کی فلاح و بہبود، انفرادی اور اجتماعی زندگی کی رہنمائی کے جو اصول بیان کیے گئے ہیں، ان کو معاصر علمی انداز میں پیش کیا جائے۔ یہ قرآن کا اہم ترین موضوع ہے اور قرآن کریم نے اس کا دعویٰ بھی کیا ہے کہ یہ کتاب "ھدیً للناس" "شفاءٌ لما فی الصدور" اور "بیان للناس" ہے۔ ضرورت تھی کہ قرآن کریم کے ان موضوعات پر روشنی ڈالی جائے جو انسانی زندگی اور اخلاق سے متعلق ہیں، قرآن کریم نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جو اصول بیان کیے ہیں ان کو نمایاں کیا جائے اور شدید زیادتی اور ظلم کی حالت میں بھی صبر اور محتاط کارروائی کا جو حکم دیا ہے اور عدل وانصاف کا دامن تھامے رکھنے کی جو تلقین کی ہے اس کو واضح کیا جائے۔''

(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، محولہ بالا، ص ۴۲-۵۲)

فاضل مقدمہ نگار نے آخر میں کتاب کے مشتملات کے حوالے سے یہ تاثر ظاہر کیا ہے کہ پیشِ نظر کتاب میں واضح کردہ قرآنی ہدایات وتعلیمات ''زندگی کو فساد سے صلاح کی طرف اور قلق و بے چینی سے سکون واطمینان کی طرف منتقل ہونے میں ممد ومعاون ہوں گی۔''

(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص ۷۲)

قرآن کریم کے مقصدِ نزول، اس کے خصائص، اس کی ہدایات وتعلیمات کی جامعیت و ہمہ گیری اور ہر دور میں ان کی معنویت، انبیاء کرامؑ اور ان کی قوموں کے واقعات میں عبرت ونصیحت کی باتوں سے متعلق اس کتاب میں واضح کردہ کچھ اہم نکات یہ ہیں (درج ذیل نکات میں زیادہ تر کتاب ہی کے الفاظ نقل کیے گئے ہیں، البتہ کہیں کہیں قارئین کرام کی آسانی کی خاطر عبارت واضح کرنے کے لیے الفاظ میں کچھ تبدیلی کردی ہے یا کچھ الفاظ بڑھا دئے گئے ہیں:

☆ اللہ تعالیٰ کا یہ مقدس کلام قرآن مجید اس کی نازل کردہ کتابوں کے سلسلہ کی آخری، جامع اور ضرورت کے لحاظ سے مکمل کتاب کے طور پر اس کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر اتارا گیا اور نبی آخر الزماں کے وقت سے لے کر اس دنیا کے ختم ہونے تک آنے والی نسلوں اور قوموں کی نیک سیرت وکردار کے لیے رہنما اور نگراں بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید ہی کو انسان کے لیے سب سے بڑا رہنما اور ناصح کی صورت میں نازل فرمایا۔ یہ کتابِ ہدایت وہ نعمت ہے جس کی رہنمائی کے فیض سے انسان ہمیشہ ہمیش کی زندگی میں حقیقی کامیابی حاصل کرسکتا ہے۔

(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص ۸۲، ۸۳)

☆ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے لیے اصلاحی نظام کے طور پر اتارا اور اسے ایسا جامع بنایا کہ اس نظام میں اب کسی تبدیلی کی ضرورت باقی نہ رہے۔ اس کتابِ ہدایت کو انسانی ضرورت کے متنوع پہلوؤں میں رہنما کتاب کی حیثیت عطا کی گئی اور آنے والے ترقی یافتہ اور متنوع عہد کی ضرورت کے لحاظ سے کامل خصوصیات اور ہر عہد کے انسانوں کی ضرورت کے لحاظ سے رہنمائی کرنے والے نبی پر نازل کیا، جو انسانوں کی کامل رہنمائی کرنے والی شریعت کو لے کر تا قیامت انسانوں کیلئے مبعوث کیا گیا، اس طرح دونوں کو اپنی اپنی جگہ جامع اور تکمیلی مقام حاصل ہوا۔ قرآن مجید کو آسمانی کتابوں میں آخری اور مکمل کتاب کی حیثیت سے اور سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کو انبیاء کے سلسلہ میں تکمیلی شریعت کے ساتھ آخری نبی کا مقام دیا گیا۔

(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص ۱۱-۲۱)

☆ قرآن مجید سے پہلے بھی آسمانی کتابیں اس دنیا میں موجود تھیں، لیکن قرآن کے علاوہ کوئی بھی آسمانی کتاب اپنی اصل حقیقت پر باقی نہیں رہی، بلکہ اس کے نص اور لفظ میں تبدیلی اور تحریف کی جاچکی تھی۔ آخری کتاب الٰہی ہر طرح کے تغیر، تبدیلی اور تحریف سے پوری طرح پاک ہے۔

(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص ۴۶۱)

☆ قرآن مجید کو ایسے جامع اور متنوع و معجزانہ صورت میں عطا کیا گیا جو رب العالمین کے شایان شان ہے اور اس میں زندگی کے تمام پہلوؤں کو نہایت اعلیٰ کیفیت و معیار میں جمع کر دیا گیا۔

(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص ۳۴۱)

☆ اللہ تعالیٰ کا کلام جو انسان کے مناسب اور اچھے کردار کے لیے دستور کی حیثیت رکھتا ہے، اللہ کے نام سے اور اس کی صفتِ رحمت سے شروع ہوا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ کی ذاتِ رحمت و ربوبیت کا اظہار بھی ہوا اور انسان کو اس کی تلقین بھی ہوئی کہ وہ اپنے ہر کام کے لیے اس کے نام کا سہارا لے اور اس سے مدد مانگے اور اس کی رحمت کی امید قائم رکھے اور اس رحمت کے حصول کے لیے اس کے مقدس کلام میں بتائے ہوئے طریقوں کو اختیار کرے اور رحم چوں کہ اچھی اور اعلیٰ صفت ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ ہر ایک خود بھی اس صفت کو اختیار کرے اور دوسرے انسانوں کے ساتھ برتے بھی، اس لیے کہ ہمارے خالق و مالک اللہ رب العالمین رحمٰن رحیم نے اسی کا حکم دیا ہے۔ (قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص ۳۱)

☆ اس کائنات اور مخلوقات کے خالق و مالک کا کلام مقدس اپنے احکام اور ہدایات اور مثالوں کے ذریعہ ایک عظیم روشنی کی مانند ہے، جو انسانوں کی زندگی کی تاریکیوں میں صحیح راستہ دکھاتی ہے اور ٹھوکروں سے بچاتی ہے، یہ ٹھوکریں کسی پتھر سے لگنے والی نہیں، بلکہ انسان کی اخلاقی زندگی میں پیش آنے والی ٹھوکریں ہیں، اللہ رب العزت کے نام اور کلام کی یہ روشنی نہ ہو تو اخلاق و کردار کی ایسی تاریکی ہوگی جو زندگی کو دائمی و ابدی تباہی و بربادی سے دوچار کر دے گی، اس سے بچاؤ کے لیے کلام الٰہی ہے جو قرآن مجید کی صورت میں رب العالمین کی عطا کردہ مقدس کتابوں کے سلسلہ کی آخری اور مکمل جامع کتاب ہے اور خالق و مالک کا انسانی زندگی کی ضرورت کے لیے تفصیلی ہدایت نامہ ہے، انسان کی دنیاوی و دینی زندگی کے تمام کاموں میں رہنما ہے، انسان اس کی روشنی میں چلے تو کامیاب ہے اور اگر اس کی روشنی سے ہٹے تو ناکامیاب اور برباد ہے۔

(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص ۳۳)

☆ قرآن کریم انسان کو ایسی فکری و عملی راہ پر گامزن کرتا ہے جو ہر اعتبار سے سیدھی اور استوار ہے۔ قرآن مجید حق و باطل کے درمیان فرق کرنے والا پاکیزہ کلام ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو اپنے بندوں کے لئے نازل فرمایا، تاکہ ان کی دنیوی و اخروی سعادت کا ذریعہ بنے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں نصیحت کی ہے، انسان کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کی کامیابی کا طلب گار ہو اور اس کے لئے ربِّ کریم سے دعا کرے۔

(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص ۳۶۱-۱۸۱-۲۸۱)

☆ قرآن مجید کائنات و مخلوقات کے خالق اللہ رب العالمین کا کلام ہے، وہ ان کی صلاحیتوں کو بھی پیدا کرنے والا ہے، اس کے اس کلام میں بات سے صرف واقف کرانا نہیں، بلکہ مخاطبین کے قلب و دماغ کو ان کے وجود کے مقصد اور ان کے صلاح و فلاح کی بات سمجھانا ہے۔ مخاطبین کے قلب و دماغ کی کیفیت اسی خالقِ کائنات کی بنائی ہوئی ہے، وہی ان کی مقدارِ فہم و ادراک اور قبول کی صلاحیت کو جانتا ہے، لہٰذا قرآن مجید میں جو کلام اختیار کیا گیا وہ ان رعایتوں کے لحاظ سے جو بہتر سے بہتر صورت ہو سکتی ہے، قرآن مجید اس پر مشتمل ہے، معمولی صلاحیت کے انسان کے لیے کیا مضمون مفید ہو سکتا ہے اور ذہین و حساس انسان کے لیے کس طرح کا مضمون مناسب ہے، اسے اللہ رب العزت سے بڑھ کر کون جان سکتا ہے۔ یہ وہ خوبی ہے جس نے قرآن مجید کو معجزہ بنا دیا ہے جو انسان کے بس سے باہر ہے۔

(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص ۹۶۱-۰۷۱)

☆ قرآن مجید قیامت تک انسانوں کے لیے احکامِ الٰہی و ہدایتِ الٰہیہ کا سرچشمہ ہے، یہ آخری کتاب ہدایت انسان کے تمام پہلوؤں میں رہنمائی کے لیے اشارے و احکام رکھتی ہے اور اس میں تمام ضروری باتیں بتائی گئی ہیں اور اس سلسلہ میں جن جن باتوں

کے جاننے کی ضرورت تھی اُن سے واقف کرایا گیا ہے۔
(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص۴۴۱)

☆ قرآن مجید اپنے مشتملات میں پہلے عقائد صحیحہ کی تلقین کرتا ہے، پھر کائنات، اس کی مخلوقات کے خالق و مالک کی عبادت اور شکر گزاری کی تاکید کرتا ہے۔
(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص۵۳۲)

☆ قرآن کا سب سے اہم موضوع توحید ہے اور دوسرے موضوعات احکام و عبادات اور قصص و حکایات سب میں یہی پہلو غالب ہے کہ اسی ایک اللہ کی بات ماننی ہے اور اسی لیے نبیوں پر ایمان ہے اور ان کی باتوں پر یقین ہے کہ وہ اللہ کے حکموں کو اس کے بندوں تک پہنچاتے ہیں اور اللہ نے ان کو معجزات عطا کیے؛ تاکہ بندوں کا یقین پختہ ہو، اور نبی آخر الزماں حضور ﷺ پر اللہ تعالیٰ نے معجزہ کی صورت میں قرآن نازل فرمایا۔
(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص۱۷)

☆ قرآن مجید میں صرف عبادت ہی کی ہدایت نہیں دی گئی ہے، بلکہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں رہنمائی کی گئی ہے، حسن سیرت اور حسن اخلاق کی بھی تعلیم دی گئی ہے اور اجتماعی زندگی کے اصول و احکام بھی بیان کیے گئے ہیں۔
(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص۳۱-۵۱)

☆ قرآن میں بیان کردہ گذشتہ انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات میں بڑی عبرت و نصیحت کا سامان ہے، ان واقعات کی روشنی میں صحیح زندگی گذارنے کی تلقین کی گئی ہے اور خالق و مالک کی مخلصانہ اطاعت پر زور دیا گیا ہے۔
(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص۵۱-۶۱)

☆ قرآن پاک میں نصیحت اور موعظت کے ایسے اسلوب ملتے ہیں جو پرہیزگاروں کے دلوں کو وَا کر دیتا ہے، انھیں اعمال خیر پر ابھارتا ہے۔ قرآن حکیم اس طور پر انسان کی باطنی زندگی سنوارنا چاہتا ہے کہ ان کے اندر قول و عمل میں مطابقت، دل کی سچائی، عفت و پاکیزگی، دیانت داری، شرم و حیاء، عدل و انصاف، عہد کی پابندی، عفو و درگذر، خود داری اور عزتِ نفس جیسی خوبیاں پیدا ہو جائیں، انہی خوبیوں کی بدولت پورا معاشرہ خود بخود سدھر جاتا ہے اور انسان کی عملی قوتوں کو منظّم اور مستحکم بناتا ہے۔
(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص۳۸۱-۱۶۲)

☆ نبوت سے سرفرازی سے قبل ہی رسول اکرم ﷺ کے اعلیٰ کردار کو دیکھ کر عرب کے لوگ آپ ﷺ کو امین صادق کہنے لگے تھے۔ ''صادق'' سے مراد قول و عمل کی مطابقت اور جیسا کرنا مناسب ہے ویسا ہی کرنا، یہی صدق کے معنی ہیں۔ آپ کو صادق کہا گیا جس سے آپ ﷺ کی زندگی میں قول و فعل کی مطابقت اور عمل کا بہتر سے بہتر طریقہ پر ہونا مراد ہے اور امین سے مراد حقوق اور ذمہ داریوں کی صحیح ادائیگی ہے۔ آپ ﷺ کو سب نے امین کہا، کیوں کہ آپ ﷺ میں یہ خصوصی صفت دیکھی۔
(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل، ص۸۳۱-۹۳۱)

قرآن-رہبر کامل

''یہ کتاب (قرآن مجید) انسانی مخلوق کی صحت مندانہ زندگی کا دستور بنائی گئی ہے اور انسان کی اور انسان ہی سے ملتی جلتی دوسری مخلوق جنات کے لیے بھی اخلاقی و دینی زندگی کا دستور بنائی گئی ہے ـــــــ زندگی کا کوئی شعبہ صحت مندانہ اور شریفانہ کردار کا حامل اس کی رہنمائی سے باہر نہیں، وہ ایسا دستور حیات ہے کہ انسانی زندگی جب تک اس سے کچھ بھی جڑی رہے گی، اس پروردگار عالم کے نام کی مدد اس کو حاصل رہے گی، کیونکہ ساری کائنات اور مخلوقات کا وجود اسی کے نام کی سرپرستی سے جڑا ہوا ہے، یہ سرپرستی جس وقت بھی ٹوٹے گی تو یہ کائنات بکھر جائے گی، لہٰذا اس کائنات کی بقا کے لیے اس کے نام اور نام کی تفصیلات جن پر اس کا کلام مقدس یعنی قرآن مجید مشتمل ہے، اس کا سہارا سب کی بقا کے لیے لازمی ہے۔'' (رہبر کامل: ۲۹-۳۰)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

قیادت کی صف اول کا ایک بڑا خلا

مولانا قاری عبدالستار بوڑیوی
(مدیر مدرسہ ضیاء القرآن-بوڑیہ)

ابھی ماہ صیام ۱۴۴۴ ہجری کا آخری عشرہ شروع ہوا ہی تھا کہ مخدوم عالی قدر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین مرشد الامۃ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی وفات حسرت آیات نے دینی علمی اور ملی حلقوں کو سوگوار کر دیا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اپنے علم وفضل، اخلاق ومروت، تقویٰ وطہارت، خوف وخشیت اور رجوع الی اللہ جیسے کمالات کا ایک خوب صورت مجموعہ تھے، ان میں سمندر کی سی گہرائی اور صحرا جیسا سکون لگتا تھا، وہ اپنے شبنمی مزاج کے باوجود دین وملت کے سرمایہ پر کسی قسم کی آنچ آنے کے سخت خلاف رہتے اور پوری فکر وبصیرت کے ساتھ سرد وگرم حالات کو انگیز کرنے کی تلقین وتدبیر فرماتے۔ رب قدیر نے آپ کو صبر وتحمل فہم وفراست اور حلم وتواضع کا پیکر بنایا تھا، جس کا کسی قدر اندازہ آپ سے ملاقات اور متعدد مواقع وپلیٹ فارموں سے جاری کردہ آپ کے بیانات وفرامین سے بھی ہوتا تھا۔ وہ شور وشغب' احتجاج وحرکات اور اشتہار واعلان کے بجائے مشن کی تعمیل اور مثبت نتائج پانے پر زور دیتے تھے، ان کی سیرت وشخصیت پر اپنے خاندانی بزرگوں کے ساتھ ان اَعلام امت کا رنگ بھی چڑھا ہوا تھا جنہوں نے اپنے اپنے زمانہ میں دین وملت کی مخلصانہ قیادت ورہبری فرمائی تھی، یہی وجہ تھی کہ آپ کے دور صدارت میں جب جب مسلم پرسنل لا بورڈ یا ملت کو انتشار کی طرف دھکیلنے کی سازش یا بو محسوس ہوئی، تو حضرت مولاناؒ نے کمال خوبصورتی اور تعلق مع اللہ کے نتیجہ میں ایسے فتنوں کو ناکام بنادیا، جن سے آپ کی فراست اور مؤمنانہ شان کا ادراک ہوتا تھا، اسے حرماں نصیبی سے تعبیر کر لیجیے کہ اب ہمارے درمیان سے وہ شخصیتیں ایک ایک کر کے رخصت پذیر ہیں جن کے قلب بھی یاد الٰہی سے روشن تھے اور قالب بھی سنت نبوی سے سرشار! وہ خلوت وجلوت میں امت کے لیے تڑپتے بھی تھے اور بوقت ضرورت کفن بردوش بھی رہتے تھے، حضرت مولانا محمد رابع حسنی رحمہ اللہ اسی قافلہ کے ردیف تھے جنھوں نے خیر القرون کا جلوۂ جہاں آرا دیکھا تھا، افسوس کہ مولانا کی وفات سے قیادت کی صف اول میں بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے۔

یقیناً ایسے وقت میں جب کہ ملت اسلامیہ ہندیہ اضطراب وکشمکش کے دور سے نبرد آزما ہے اور اس کے افراد ومذہب کو ٹارگیٹ کرنے کی شرانگیز مہمات شباب پر ہیں، حضرت مولانا کا سانحہ وفات محرومیوں کا عنوان ہی کہا جائے گا، باری تعالیٰ سے دعا ہے کہ ملت اسلامیہ ہندیہ کو آپ کا بہتر بدل نصیب فرمائے۔ آمین!

میرے لیے یہ حادثہ ذاتی طور پر بھی الم ناک ہے، بایں سبب کہ خانقاہ رائے پور سے اس ناچیز کی بھی بچپن کی یادیں وابستہ ہیں، جہاں شیخ ومرشد قطب زماں مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری طاب ثراہ سے حضرت مولانا نے بھی استفادہ کیا تھا، اسی بنیاد پر حضرت مفکر اسلام مولانا علی میاں قدس سرہ اور آپ سے غائبانہ محبت دل میں بسی تھی، پھر جب آپ بوڑیہ تشریف لائے اور اس کے بعد ایک علمی کام کے ذیل میں رائے بریلی ولکھنؤ مجھے حاضری کی سعادت میسر ہوئی تو آپ نے بے پناہ شفقتوں کا معاملہ فرما کر اس قدردانی میں مزید اضافہ فرمادیا تھا۔ فرحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ!

علم وادب کا مہر تاباں

مولانا محمد آیت اللہ قادری
(خانقاہ مجیبیہ، پھلواری شریف-پٹنہ)

۲۱؍رمضان المبارک کو اس حادثہ الم ناک کی خبر موصول ہوئی کہ عالم مرتاض حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اس جہان فانی سے دارالبقا کے لیے رخصت ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

اللہ تعالیٰ ان کے مدارج بلند فرمائے۔ آمین!

حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی یہ عنداللہ مقبولیت کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک عمر طبعی عطا فرمائی، جسے انہوں نے دین وملت کی خدمت کے لیے وقف فرمایا اور دین وملت کی بیش بہا خدمتیں سرانجام دے کر رمضان المبارک کی ایک عظیم تاریخ کو وہ رب کریم سے جا ملے۔

قسمت نگر کہ کشتہ شمشیر عشق یافت
مرگے کہ زاہداں بہ دعا آرزو کنند

﴿وَالَّذِيْنَ آمَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُم بِإِيْمَانٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ﴾ (الطور: ۲۱) (اور جو لوگ ایمان لائے اور ایمان میں ان کی اولاد نے بھی ان ہی کا راستہ اختیار کیا تو ہم ان کی اولاد کو بھی ان ہی میں شامل کر دیں گے)

اس آیت کے تحت اللہ تعالیٰ آباء واجداد کرام کے ساتھ ان کا حشر فرمائے۔ آمین!

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی علیہ الرحمہ ندوۃ العلماء کی ایک قدیم یادگار تھے، جنہیں دیکھ کر سالفین صالحین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، ان کی شخصیت یقینی طور پر عصر حاضر میں بڑی مغتنم تھی، ندوۃ العلماء کی سرپرستی اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کی حیثیت سے نیز آبائی سلسلہ رشد وہدایت کے ذریعہ قوم وملت کی سربراہی ایک عرصہ دراز تک ان کے ماتحت رہی، اپنی پیرانہ سالی کے باوجود وہ اس پرآشوب دور میں بھی جس عزم وہمت اور دانائی وحکمت کے ساتھ قوم وملت کی خدمت سرانجام دے رہے تھے، وہ بلاشبہ قابل ستائش اور اصاغر کے لیے ایک نمونہ عمل ہے، درس وتدریس، علم وتحقیق کے باب میں بھی ان کی شخصیت نمایاں رہی، رسائل ندوہ کے ذریعہ ان کے مقالات علمیہ سے علمی دنیا مسلسل مستفید ہو رہی تھی، تصنیف وتالیف سے بھی حسب ضرورت طلبہ اور عوام الناس کی رہنمائی فرماتے رہے، علم وحکمت کی باتیں ان کی تحریروں اور تقریروں کی جان ہوا کرتی تھیں، متعدد خوبیاں ان کی شخصیت میں پیوستہ تھیں۔

مولانا مذکور افکار ندوہ کے ترجمان اور حضرت مولانا علی میاں ندوی علیہ الرحمہ کے بعد ان کے بہترین جانشین ثابت ہوئے، اس وقت ملک وبیرون ملک میں ان کے کثیر تلامذہ ان کی شخصیت علمیہ کے نمائندے اور ان کی خدمات علمیہ کے عینی گواہ ہیں، عالمی سطح کے اہل علم سے مولانا کے روابط تھے، ہماری خانقاہ کے بزرگوں سے بھی ان کے گہرے مراسم رہے ہیں، راقم الحروف کو بھی ان کی مخصوص شفقتیں حاصل رہی ہیں، میری خدمت سجادگی میں متعدد بار وہ خانقاہ تشریف لائے اور ملاقات کا شرف بخشا، مولانا مرحوم کا سانحہ ارتحال جہاں علم وادب کے لیے بالعموم اور اہل خاندان کے لیے بالخصوص ناقابل تلافی نقصان ہے، وہاں میرے لیے بھی ذاتی طور پر عظیم اور قلبی صدمہ ہے۔

اللہ رب العزت ان کے حسنات وخیرات میں خوب اضافہ فرما کر اپنے مقربین سالفین کے جیسا معاملہ فرمائے، ان کے وارثین ومتعلقین کو صبر جمیل واجر جزیل سے نوازے۔ آمین!

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ: نقوش وتاثرات

ڈاکٹر علی احمد ندوی
(استاذ جامعۃ الملک عبدالعزیز، جدہ)

اس کائنات میں حیات ووفات کا سلسلہ تا قیامت جاری رہے گا، یہ ایک ایسا آئین ہے کہ جس کا علم ہر دانا اور نادان کو ہے، لیکن اس ضمن میں کبھی کبھی ایسا واقعہ اور حادثہ پیش آتا ہے جو چونکا دینے والا ہوتا ہے اور لوگوں کے لیے بڑے صدمہ کا باعث ہوتا ہے اور اس کو خواص وعوام سبھی بہت محسوس کرتے ہیں، خصوصیت سے اللہ تعالیٰ کے کسی مخلص ومقبول بندہ کی رحلت کے وقت ہر طرف سے صدائے غم بلند ہوتی ہے اور اس کی آخری آرام گاہ تک مشایعت کے لیے لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اور اس کے ذکر خیر ومحاسن کا چرچا وتذکرہ ہوتا ہے، اس کی نمایاں مثال چند روز قبل ماہ مبارک کے آخری عشرہ میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا سانحہ وفات ہے، دراصل یہ محبوبیت اور مقبولیت ایمان وعمل صالح کا ثمرہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا کی سب سے بڑی خصوصیت ان کا اخلاص واخلاق ہے، ہر کام میں اخلاص خواہ وہ علمی وفکری میدان میں ہو یا اجتماعی امور سے متعلق ہو، یہ جوہر بہت نمایاں تھا، نیز مکارم اخلاق کا مظہر، ہر چھوٹے بڑے کے ساتھ آپ کا حسن سلوک وبرتاؤ تھا۔

راقم سطور پر محض یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ حضرت مولانا سے خصوصی تعلق رہا، جو کم وبیش پچاس سال کے عرصہ پر محیط ہے، ۱۹۷۰ء کے اوائل میں جب لکھنؤ کا قصد کیا اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قدم رکھا تو حضرت مولانا کا اول بار دیدار ہوا اور درجہ چہارم عربی میں داخلہ کے وقت سے آپ نے خصوصی توجہ فرمائی، پھر روز بروز آپ کی شفقت کا مشاہدہ ہوتا رہا، ایک مرتبہ علیل ہوا تو ایک ڈاکٹر صاحب کو ساتھ لے کر عیادت کی غرض سے سلیمانیہ ہاسٹل تشریف لے آئے۔

حضرت مولانا سے علمی وابستگی کا آغاز درجہ پنجم عربی سے ہوا، آپ امام نووی کی مشہور کتاب حدیث ''ریاض الصالحین'' کا درس دیتے، احادیث کا بہت آسان اور رواں ترجمہ کرتے اور ان کے معنوی پہلوؤں اور مقاصد کو واضح کرتے، اس سے قطع نظر وقتاً فوقتاً حضرت مولانا سے عربی زبان میں مختصر تحریر یا ترجمہ کر کے آپ سے اصلاح کراتا، مجھے یاد نہیں کہ غیر معمولی مصروفیت کے باوجود کبھی آپ نے معذرت کی ہو، نیز ایک مرتبہ سالانہ تعطیل کے زمانہ میں رائے بریلی جانا ہوا تو حضرت مولانا سے چند روز علامہ احمد حملاوی کی کتاب ''شذا العرف فی فن الصرف'' کا کچھ حصہ بھی پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، ندوہ کے زمانہ میں خارجی مطالعہ کے بارے میں آپ سے ہمیشہ مشورہ کرتا رہا، خاص طور پر قدیم وجدید ادب کی کتابوں سے متعلق آپ ہی کے ایماء پر امام ابن قتیبہ دینوری (م: ۲۷۶ھ) کی کتاب ''أدب الکاتب'' کا مطالعہ کیا اور اس سے بڑا ادبی ولغوی فائدہ حاصل ہوا۔

ندوہ سے درجہ ''عالمیت'' سے فراغت کے بعد حضرت مولانا کی ہدایت کے مطابق درجہ فضیلت میں زیر تدریس حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی عظیم الشان کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' کے درس میں عارضی طور پر حاضری وشرکت کا شرف حاصل ہوا، بظاہر اس سے مقصود ناچیز کو شرعی علوم کی جانب متوجہ کرنا تھا، الحمد للہ حضرت کی یہ خیر خواہی بعد کی عملی زندگی میں بہت کام آئی۔

تعلیم کے آخری مراحل تک حضرت مولانا سے تلمذ کی بنا پر ادب کا تقاضا تھا کہ بوقت ملاقات استفادہ کروں اور زیادہ بات نہ

کروں، لیکن رفتہ رفتہ یہ فاصلہ سمٹتا گیا، حضرت مولانا نے اپنے اخلاق حسنہ، عالی ظرفی اور وسعت قلبی سے روابط کو مزید مستحکم کیا، چنانچہ ناچیز کی فقہی مناسبت پر بڑی مسرت کا اظہار فرماتے، جب کبھی ملاقات ہوتی، خواہ حرمین شریفین میں ہو یا ہندوستان میں، زکاۃ اور معاشیات کے جدید مسائل پر کچھ گفتگو اور اظہار رائے کا موقع عنایت فرماتے۔

آپ کی غیر معمولی شفقت اور غایت درجہ تواضع کا ایک نمونہ یہ بھی ہے کہ آپ نے اپنے چند مضامین پر مشتمل کتاب جو عربی زبان میں "أضواء على الفقه الإسلامي ومكانة الإجتهاد منه" کے عنوان سے ہے اور یہ آپ کی فکر وفقہ کے حسن امتزاج کا مرقع ہے، اس کو شائع کرنے کا ارادہ کیا تو راقم سطور سے مقدمہ تحریر کرنے کو فرمایا، حکم کی تعمیل میں یہ خدمت انجام دی تو بذریعہ خط شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ یہ میرے استحقاق سے بڑھ کر ہے، اس طرح آپ نے ایک شاگرد کی عزت افزائی کی۔

مضمون کے اختتام پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا نے اپنا دائرہ عمل تدریس وتصنیف تک ہی محدود نہیں رکھا، بلکہ قوم وملت کی فلاح وبہبود کے لیے ہر محاذ پر سرگرم عمل رہے اور اس سلسلہ میں جدید ذرائع ابلاغ سے فائدہ اٹھانے میں کوئی گریز واحتراز نہیں کیا، واقعہ یہ ہے کہ اس قحط الرجال کے دور میں مولانا کی صفات وخصوصیات کے حامل علماء کا وجود نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کی خدمات کو قبول فرمائیں اور آپ کی فیض رسانی کو آپ کے مضامین وتصنیفات اور دیگر باقیات صالحات کے ذریعہ جاری وساری رکھیں اور آخرت میں اپنے مقرب ترین بندوں کی رفاقت سے نوازیں۔

تمدنی انقلابات اور اجتہاد کی ضرورت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ

"جب مشرق کو جدید مغربی تمدن کا سامنا ہوا اور ایسے چیلنجز پیش آئے جو ان تمدنی چیلنجز سے اہمیت میں کسی طرح کم نہیں تھے جو مسلمانوں کے جزیرۃ العرب سے نکلنے، ترقی یافتہ قوموں سے ملنے اور ان کی سادہ وبدوی زندگی سے نکل کر تمدنی اور اجتماعی زندگی کے بلا خیز سمندر میں داخل ہوتے وقت پیش آیا تھا اور جن حالات ومشکلات کا مقابلہ دین اور علم میں سند رکھنے والے ائمہ نے اپنی محنتوں سے کیا تھا، وہ ان تقاضوں کو پورا کرنے اور ان کا حل پیش کرنے میں کامیاب ہوئے، جو ان کے مصالح اور ان کی خصوصیات کے موافق تھا، اس حیثیت سے کہ وہ آسمانی اور ہمیشہ رہنے والی امت ہیں۔ امت اسلامیہ آج پھر اپنی تمدنی واجتماعی زندگی میں تقریباً انہی مشکلات اور جدید چیلنجز سے دوچار ہے، جو اس زمانہ کے چیلنجز کے مشابہ ہیں، یہ چیلنجز امت کے لائق وفائق علماء سے مخلصانہ کاوش اور دینی امانت کے ساتھ بلند علمی لیاقت کے منتظر ہیں، ان کا جواب انہی شرائط کے مطابق دیا جاسکتا ہے جن کی تفصیل اجتہاد کے عمل سے گذرنے والے فقہ اسلامی کے ائمہ نے بیان کی ہے۔

تمدنی زندگی میں ایسے مسائل پیش آچکے ہیں جن کا مسلمانوں کو بہر حال سامنا کرنا ہے اور علماء کے لیے ان کا حل تلاش کرنا ضروری ہے، مسلمان یا تو ان مسائل سے پہلو تہی اور انکار کرتے ہیں یا اس کی طرف مکمل جھک جاتے ہیں، یہ دونوں طریقے اس اسلامی دین سے میل نہیں کھاتے جو ہر زمانہ اور ہر علاقہ کا دین اور جو قیامت تک باقی رہنے والا ہے، اس لیے علماء امت پر ضروری ہے کہ ایسی راہ تلاش کریں جو ان کے اجتہاد میں معاون ہو، اجتہاد کا دروازہ اس طرح کھولیں جو شریعت اسلامی کی روح اور اس کے مزاج سے ہم آہنگ ہو، بلکہ ان مشکلات کا ایسا حل پیش کریں جس سے ثابت ہو کہ دین اسلام ہر زمانہ اور ہر علاقہ کا ساتھ دینے والا ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب اجتماعی اجتہاد کا طریقہ اختیار کیا جائے، اجتماعی اجتہاد انفرادی اجتہاد اور شخصی تحقیق سے کہیں زیادہ بہتر اور زیادہ محفوظ ہے۔" (فقہ اسلامی اور عصر جدید: ۵۶-۵۷)

دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

مولانا عبدالقادر عارفی
(نائب مفتی جامعہ دارالعلوم زاہدان-ایران)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات سے جہاں عالم اسلام بلکہ پوری انسانی برادری کو نقصان پہنچا وہاں ہم جیسے لوگوں کے لیے بھی نا قابل تلافی نقصان اور بہت بڑا خسارہ تھا، میرا تعلق حضرت مولانا سے تقریبا کوئی بائیس تئیس سال کے عرصے پر مشتمل ہے، تقریباً بائیس سال شاید اس سے پہلے پہلی دفعہ ہندوستان کا سفر کیا۔ علمائے کرام خاص طور پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بارے میں ان کی کتابوں کی وجہ سے پہلے سے تعارف تھا، یہ اس وقت کی بات ہے جب راقم دارالعلوم کراچی میں (۱۴۰۸) سے (۱۴۱۱ق) تک زیر تعلیم رہا۔ چنانچہ ان کی عربی کتابیں دیکھنے کا بہت شوق تھا اگر چہ اردو کتابیں بہت تھیں، لیکن مولانا کی عربی کتابیں بہت کم دستیاب تھیں۔ بڑی مشکل سے ان کی ایک کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' ایک نظر دیکھنے کے لیے مجھے ملی۔

اسی وقت سے دل میں سفر ہند کا شوق پیدا ہوا، لیکن کچھ دشواریوں اور قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے کئی سالوں تک یہ تمنا دل ہی میں رہی، جب حضرت سید کی وفات ہوئی اس کے بعد میرا پاس پورٹ بن گیا اور ہندوستان کا سب سے پہلا سفر پاکستان ہی کے راستے سے لاہور سے وایا روڈ ہوا۔ دیوبند جا کر وہاں شیخ الحدیث وصدر المدرسین جامعہ دارالعلوم دیوبند حضرت مولانا مفتی سعید احمد صاحب پالن پوریؒ اور دوسرے حضرات سے تعارف ہوا۔

مجھے اس سفر میں سب سے زیادہ لکھنؤ جانے کا اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے ملنے کا شوق تھا؛ ان کے نام بہت سننے میں آتا کہ حضرت مولانا کے بھانجے اور جانشین ہیں۔ میں اکیلا ہی سفر کر رہا تھا، جب لکھنؤ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء جانا ہوا، اس وقت وہاں کسی سے تعلق تھا' نہ تعارف۔

ہمارے استاد حضرت مولانا مفتی محمد قاسم قاسمی صاحب (مفتی جامعہ دارلعلوم زاہدان) کا حضرت علی میاںؒ سے گہرا تعلق تھا، انہوں نے حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب کے نام سے مجھے ایک خط دیا تھا، پہنچنے کے بعد میں نے وہ خط حضرت کی خدمت میں پیش کیا، حضرت نے بڑی خوشی کا اظہار فرمایا۔ میرا پروگرام تین دن رہنے کا اور پھر واپس آنے کا تھا۔ جب میں نے مولاناؒ سے تذکرہ کیا کہ میں تین دن رہوں گا، حضرت نے فرمایا کہ ہم شام کو غازی پور جا رہے ہیں، وہاں ایک جلسہ ہے اور تین دن کے بعد واپس آئیں گے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت میرے پاس تو تین ہی دن ہیں اور آپ حضرات جا رہے ہیں، اگر اجازت ہو میں اپنے خرچ پر ٹکٹ خرید کر آپ حضرات کے ساتھ رہوں؛ چونکہ تین دن کے بعد مجھے واپس جانا ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ ٹھیک ہے میں معلوم کرلوں گا کہ ٹرین میں سیٹ ملتی ہے یا نہیں۔ عصر کے بعد حضرت نے مجھے بلایا اور فرمایا کہ جی الحمدللہ آپ کا ٹکٹ ہو گیا ہے اور مغرب کے بعد یہاں سے نکلنا ہے۔ میں بہت خوش ہوا کہ حضرت کے ساتھ سفر میں رہنے اور استفادہ کا موقع ملے گا۔ غازی پور بھی کافی دور ہے تقریباً پوری رات سفر کر کے پھر صبح کو وہاں پہنچنا ہوگا۔ اس سفر میں حضرت مولانا کے ساتھ حضرت مولانا سید واضح رشید ندوی، حضرت مولانا محمد اسحاق حسینی ندوی برادر حضرت مولانا سید سلمان حسینی ندوی اور ایک دو بزرگ بھی ساتھ تھے۔ اس سفر میں ہم مغرب کے بعد نکلے اور ٹرین کے ذریعے سفر شروع ہوا اور تقریباً صبح کو سورج نکلنے کے بعد وہاں ایک جگہ ٹرین رکی اور کچھ حضرات استقبال کے لیے تشریف لائے

ہوئے تھے، پھر وہاں سے بذریعہ کار ہم ایک دو گھنٹے کے بعد غازی پور پہنچ گئے جہاں جلسہ ہونے والا تھا۔

اس سفر میں یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا کہ ٹرین میں حضرت مولانا نمازیں باجماعت پڑھنے کا کتنا اہتمام فرما رہے ہیں۔ ٹرین میں حضرت بہت دیر تک رات کو دعا، ذکر، تسبیحات اور نوافل میں مصروف رہتے تھے۔ پھر وہاں غازی پور پہنچنے کے بعد کچھ آرام کیا، رات کو جلسہ تھا، اس جلسے میں دیوبند سے بھی کچھ نمائندہ علماء تشریف لائے ہوئے تھے اور دیگر مدارس کے حضرات بھی موجود تھے۔ یہ کوئی سیاسی جلسہ تھا خالص علمی نہیں تھا، وہاں منتظمین کو جب معلوم ہوا کہ ایران سے بھی ایک مسافر طالب علم ساتھ ہے تو انہوں نے باقاعدہ اعلان کیا تھا کہ ہمارے پاس باہر کے مہمان بھی ہیں اور ان کا بیان بھی ہوگا، لیکن حضرت مولانا کو جب اطلاع ملی تو حضرت نے ان کو بلا کر فرمایا کہ یہ ایک سیاسی جلسہ ہے، یہ علمی جلسہ نہیں ہے، تو باہر سے جو ہمارے ساتھ مہمان آئے ہیں ان کے لیے اس میں شرکت کرنا بحیثیت خطیب مناسب نہیں ہے۔ جب جلسہ ہو رہا تھا مجھے اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ بہرحال رات کو بہت بڑا جلسہ ہوا، حضرت مولانا کا خطاب ہوا، مولانا اسحاق حسینی رحمہ اللہ کا بہت ولولہ انگیز خطاب ہوا اور جو حضرات دوسرے شہروں سے آئے ہوئے تھے ان کا بھی خطاب ہوا۔ جلسے کے بعد پھر وہیں قیام تھا اور اگلے دن صبح کو لکھنؤ کی طرف واپسی تھی۔ وہاں حضرت مولانا سے بہت سارے علماء ملاقات کے لیے تشریف لاتے تھے۔ وہاں حضرت نے فرمایا کہ ان لوگوں نے آپ کے بارے میں اعلان کیا تھا لیکن میں نے ان کو منع کیا۔ ویسے بھی یہاں ایسے جلسوں میں خطاب کرنا آپ حضرات کے لیے مناسب نہیں تھا۔ میں نے بہت شکریہ ادا کیا اور بہت خوشی کا اظہار کیا کہ سیاسی جلسوں میں شرکت کرنا اور اس میں خطاب کرنا میرے بس کی بات نہیں اور میرے لیے مناسب بھی نہیں تھا۔

پھر شام کو اسی راستے سے اور اسی طریقے سے صبح کو ہم بخیر و عافیت لکھنؤ پہنچ گئے۔ گویا تین دن کا سفر ہوا ایک رات جانے کا ایک واپسی کا اور ایک وہاں رہنے کا۔ اس سفر میں مجھے بہت فائدہ ہوا، بہت قریب سے حضرت مولانا کو دیکھنے کا موقع ملا، حضرت مولانا واضح رشیدؒ اور دوسرے حضرات سے تعارف ہوا اور مولانا کے اخلاق، محبت اور ان کے برتاؤ، ان کی خندہ پیشانی اور نرم باتوں سے میں بہت متاثر ہوا اور انہوں نے بڑی محبت فرمائی۔

واپسی کے بعد ندوہ العلماء میں ٹھہر کر ندوہ کے باقی استادوں سے ملاقات کی، خاص طور جو استاد وہاں جامعہ میں رہتے تھے ان سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد میں نے اپنا واپسی کا سفر طے کیا، وایا روڈ سفر کرنے کی وجہ سے پورا سفر تقریباً بیس دن پر محیط رہا، لیکن فائدہ اس کا یہ ہوا کہ بڑے بڑے مدارس اور علماء اور تبلیغی مرکز (نظام الدین) دہلی دیکھنے کا موقع ملا، اسلامی فقہ اکیڈمی کے آفس بھی جانے کا موقع ملا اور لکھنؤ کے بہت سے مشائخ سے ملاقاتیں بھی ہوئیں، الحمدللہ! اسی سفر میں رائے بریلی میں حضرت مولانا علی میاںؒ کے مزار پر بھی جانے کا موقع مل گیا۔

اس سفر سے واپسی کے بعد حضرت مولانا سے میں نے اپنا تعلق قائم رکھا۔ میری آرزو اور دلی خواہش پوری ہوگئی کہ کسی ایسی شخصیت سے تعارف اور تعلق ہو گیا جن کا حضرت علی میاںؒ سے تعلق ہے، خاندانی تعلق بھی ہے علمی تعلق بھی ہے شاگردی کا تعلق بھی ہے اور جانشین بھی ہے۔ پھر میں نے ہندوستان کا دوسرا سفر تقریباً ایک سال کے بعد کیا اور اس کے بعد ہندوستان کے بہت سارے اسفار ہوئے اور دشواریوں کے باوجود بھی سفر ہوتے رہے اور سب سے زیادہ جو میرا تعلق تھا وہ حضرت مولانا سید رابع حسنی ندویؒ سے تھا اور ان کے خاندان سے تعلق کی وجہ سے میں یہ سفر کرتا رہا۔

رائے بریلی میں بھی ایک مرکز جو مرکز الامام أبی الحسن الندویؒ کے نام سے کھولا گیا تھا، اس کی افتتاحی تقریب اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے افکار و نظریات پر منعقد سمینار میں شرکت کے لیے ہمیں بلایا گیا، جن میں حضرت مولانا عبدالحمید صاحب دامت برکاتہم جو ہمارے شیخ الاسلام ہیں، جامعہ دارالعلوم زاہدان کے مہتمم اور یہاں کے بہت بڑے علماء اور قائدین میں سے ہیں، ان کو بھی دعوت دی گئی تھی، کچھ اور حضرات بھی مدعو تھے، مولانا صاحب کے

ساتھ میرا لکھنؤ کا سفر طے ہوا اور رائے بریلی میں بہت بڑا جلسہ ہوا۔ اس میں حضرت مولانا عبدالحمید صاحب کا سید محمد رابع صاحب نے بہت گرم جوشی سے استقبال کیا۔ حضرت مولانا عبدالحمید صاحب دامت برکاتہم اور حضرت مولانا صاحبؒ کا خطاب ہوا، احقر کو بھی خطاب کا موقع ملا۔ بہر حال تعلقات بڑھتے رہے، محبت اور زیادہ ہوگئی اور اسفار و ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

نماز میں خشوع اور ذوق تلاوت:

آخری سالوں میں حضرت اپنی قیام گاہ (مہمان خانہ ندوہ العلماء) میں عام طور پر نمازیں ادا کرتے تھے؛ مسجد میں جانا مشکل ہوتا تھا تو میں بھی بعض اوقات ان کے ساتھ نماز پڑھتا تو حضرت کی دعا کا اور نماز پڑھنے کا انداز دیکھ کر بہت متاثر ہوتا تھا کہ کتنی تواضع سے اللہ کے سامنے کھڑے ہیں، کس انداز میں اللہ کے سامنے بیٹھے ہوئے ہیں۔ نماز پڑھنے کے وقت کرسی پر اتنی تواضع اور اتنی بے حرکتی سے تشریف فرما ہوتے کہ دیکھنے والے کبھی یہ سوچتا تھا کہ شاید مولانا کرسی پر بیٹھ کے آرام کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے بعد معلوم ہوتا کہ حضرت نماز پڑھ رہے ہیں اور تسبیحات و تلاوت میں مصروف ہیں۔ حضرت کی تلاوت کو میں نے رائے بریلی میں ایک مرتبہ سنا بھی تھا، حضرت فجر کے بعد اپنے کمرہ میں تلاوت فرماتے تھے۔ آپ بہت صاف تجوید اور روانی کے ساتھ انتہائی تواضع سے تلاوت فرماتے تھے اور ماشاء اللہ آواز بھی بہت خوبصورت تھی، ایسا لگتا تھا کہ جو تلاوت فرما رہے ہیں ان کے دل کی گہرائیوں سے الفاظ نکل رہے ہیں۔

حضرت کی بہت ساری اچھی صفات تھیں؛ نماز میں، عبادت میں، برتاؤ میں، اخلاق میں اور ان کاموں میں اللہ تعالیٰ نے ان کو اخلاق نبوی سے نوازا تھا اور یہ صفات ان کو اپنے خاندان کے لوگ خاص طور پر حضرت مولانا سید عبدالحی حسنی، ڈاکٹر عبدالعلی حسنی اور حضرت علامہ سید ابوالحسن علی ندویؒ سے وراثت میں ملی تھیں۔

ذوق مطالعہ:

جب بھی حضرت سے ملاقات ہوتی تھی اکیلے ہوتے تھے تو کوئی نا کوئی کتاب ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی، اس پیرانہ سالی میں بھی وہ بہت مطالعہ فرماتے تھے، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ حضرت کو مطالعہ سے کتنی محبت ہے اور جب بھی موقع ملتا تو حضرت کوئی کتاب ہاتھ میں لے لیتے تھے اور اس کا مطالعہ فرماتے تھے اور بڑی دقت سے مطالعہ فرماتے۔ کوئی کتاب اگر ہوتی تو حضرت اپنے پاس رکھتے تھے جو کتابیں لوگ پیش فرماتے حضرت اس کو اپنے پاس رکھتے تھے۔

مہمان نوازی:

یہ ایسی صفت ہے کہ بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کی توجہ اور مہمانوں کی طرف ان کے التفات ایک بہت بڑی سنت ہے جو ہمارے معاشرہ میں متروک ہے۔ کم لوگ اس طرف توجہ کرتے ہیں۔ مہمان کا اکرام کرنا، مہمان کے ساتھ بیٹھنا، مہمان کو بٹھانا، کھانے میں ساتھ ہونا یہ ان لوگوں کے لیے جو مصروف ہیں بڑا مشکل کام ہے۔ لیکن حضرتؒ اس کا بہت خیال فرماتے تھے؛ یہ صرف سفر کی بات نہیں بلکہ سفر اور حضر میں ہم نے دیکھا کہ حضرت مہمانوں کا بہت خیال فرماتے تھے۔

حضرت کی مجلس میں:

ان اسفار میں جب بھی حضرت سے ملاقات ہوتی تھی تو جو بات ذہن میں آجاتی اس کو حضرت سے معلوم کر لیتا۔ ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ حضرت کئی سال ہو چکے ہیں آپ حج اور عمرے کے لیے تشریف نہیں لے گئے، اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ تشریف لے جاتے تو بہت سارے احباب بھی ساتھ ہوتے۔ ان کے لیے مفید اور اچھا ہوتا۔ ہمارے حضرت رابطہ عالم اسلامی کے رکن تھے، مکہ مکرمہ سمیت دوسرے مقامات پر ان کے تعلقات تھے، ویزہ وغیرہ میں بظاہر کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ یہ سوال چند سال پہلے میں نے پوچھا جب حضرت کم سفر فرماتے تھے اور کبھی کبھی وہیل چیئر کی ضرورت پیش آتی، پیدل چلنا مشکل ہوتا۔ حضرت نے بہت سوچنے کے بعد فرمایا کہ دیکھو میرا دل تو چاہتا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ وہاں جانے میں مجھے پیدل چلنے میں تکلیف ہوتی ہے تو مجھے وہیل چیئر سے چلنا پڑتا ہے اور طواف وغیرہ اسی طریقے سے کرنا پڑے گا۔ مجھے شرم آتی ہے کہ اللہ کے گھر کے طواف میں اللہ کے گھر کے سامنے میں کسی

گاڑی میں بیٹھوں؛ انہوں نے وہیل چیئر کو گاڑی سے تعبیر کیا۔ اتنا ہی حضرت نے فرمایا اور اس بات سے میں بہت متأثر ہوا کہ ہمارے حضرات ارضِ مقدس کے ادب کا کتنا خیال فرماتے ہیں۔

ذرہ نوازی اور اپنے چھوٹوں پر شفقت کی چند مثالیں:

ایک مرتبہ حضرت سبق پڑھانے کے لیے تشریف لے گئے تھے اور بخاری کی ''کتاب الرقاق'' کا درس تھا۔ آپؒ مجھے بھی ساتھ لے گئے۔ میں وہاں کلاس میں طالب علموں کے ساتھ بیٹھ گیا اور یہ میرے لیے بہت بڑا فخر تھا کہ حضرت کی کلاس میں حضرت کے درس میں بیٹھنے کا موقع ملا لیکن عجیب بات یہ پیش آئی کہ حضرت اپنی کرسی پر تشریف فرما تھے، کسی کو اشارہ کیا کہ ایک کرسی لائی جائے، پھر حضرت نے مجھے حکم دیا کہ آپ اس پر بیٹھیں، میں نے بہت معذرت کی، اس لیے کہ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے استفادہ کے لیے گیا تھا اور یہی ساتھ جانا ہی میرے لیے فخر کا باعث تھا، لیکن حضرت نے قبول نہیں فرمایا اور مجھے حکم دیا کہ آپ ضرور کرسی پر بیٹھیں؛ مجھے بہت شرم آئی لیکن حضرت کے حکم کی تعمیل کے لیے کرسی پر بیٹھ گیا اور حضرت نے سبق پڑھایا۔ یہ ایک چھوٹی سی بات ہے لیکن کہنے کا مقصد یہ ہے کہ حضرت کی ذرہ نوازی اور ان کی توجہات ایک ادنیٰ مہمان کے ساتھ جب کہ بہت سارے لوگ موجود ہیں، خاص طور پر جو زیادہ مصروف ہیں ان کو پتہ نہیں ہوتا کہ مہمان کہاں گیا اور کہاں بیٹھ گیا، کہاں سے آ رہا ہے اور کہاں جا رہا ہے اور اسی طرح کے بہت سارے واقعات پیش آتے رہے۔

ایک مرتبہ کسی جگہ حضرت نے کچھ حاضرین کی مجلس میں جو سب اپنے ملک کے اور مقامی حضرات تھے، سب کا تعارف فرمایا کہ کس علاقہ کے ہیں اور کہاں پڑھاتے ہیں اور میرے بارے میں حضرت نے ایک ایسا جملہ فرمایا کہ ان کی اتباع سنت کے بارے میں میں بہت سوچتا رہا کہ ہمارے مشائخ سنت کی اتباع میں کس قدر کوشاں ہیں اور کوشش کرتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: یہ ایران سے ہیں لیکن ہمارے اپنے گھر کے آدمی ہیں؛ مجھے یہ جملہ سن کر شرمندگی ہوئی کہ حضرت نے اتنا بڑا اعزاز دیا اور بہت بڑی بات فرمائی، لیکن مجھے وہ حدیث یاد آ گئی کہ حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سلمان منا أهل البيت'' بالکل اسی کا ترجمہ حضرت نے فرمایا۔ حضرت سلمانؓ فارس کے تھے، عرب نہیں تھے۔ اس سے میں بہت متأثر ہوا اور ایسے واقعات اور بھی پیش آئے۔

حضرت علی میاںؒ کی پانچ کتابوں کی اہمیت اور ان کی فکر کا خلاصہ اور نچوڑ:

ایک مرتبہ میں نے عرض کیا کہ حضرت! مولانا علی میاں رحمہ اللہ کی کتابیں بہت ساری ہیں ان کیا فکار اور نظریات کو سمجھنے کے لیے کن کتابوں سے استفادہ کیا جائے اور یہ سوال ہمارے طالب علم اور دوست ہم سے پوچھتے رہتے ہیں کہ کونسی کتاب کا مطالعہ کریں؟ اس لیے کہ مطالعہ کا موقع بہت کم ملتا ہے، خاص کر اس زمانے میں لوگ بہت مختصر کتاب اور مختصر مقالہ پڑھنا چاہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: حضرت علی میاں رحمہ اللہ نے اپنے افکار کا نچوڑ اپنی کتابوں میں لکھا ہے اور اپنی باتوں میں پیش فرمائی، حضرت مولانا ابو الحسن علی ندوی کی سب کتابیں' ان کے بیانات اور خطبات سننے کے قابل اور بہت مفید ہیں۔ لیکن جب موقع نہیں ملتا' خاص طور پر علماء جن کی مصروفیات زیادہ ہیں، انہوں نے ایسے مصروف حضرات کو مشورہ دیا کہ حضرت علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی پانچ کتابیں ایسی ہیں جن کو پڑھنے سے ان کا پورا منہج اور ان کی فکر کا نچوڑ سامنے آجاتا ہے:

''السيرة النبوية على صاحبها الصلاة والسلام'' (نبی رحمت)

''الأركان الأربعة'' (**ارکان اربعہ**) ''رجال الفكر والدعوة'' (**تاریخ دعوت وعزیمت**) اور ''الصراع بين الفكرة الإسلامية والفكرة الغربية في الأقطار الإسلامية'' (**اسلامی ملکوں میں اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش**)، ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين'' (**انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر**)

یہ پانچ کتابیں حضرت کے افکار کا خلاصہ ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ اگر کسی کو ان کے پڑھنے کا بھی موقع نہیں ہے تو کم از کم ان کتابوں کا مقدمہ ہی پڑھ لے۔

سخاوت اور عالی ہمت:

حضرت کی اعلیٰ ہمت کا حال یہ تھا کہ پیرانہ سالی کے باوجود بھی مہمانوں کے ساتھ ملاقات کرتے اوران کی باتیں سن کرانہیں مشورہ دیتے تھے۔گزشتہ سال شعبان کی بات ہے کہ مجھے ایک ہفتہ وہاں رہنے کا موقع ملا۔معذوری کا یہ حال تھا کہ ان کے لیے چلنا ہی مشکل تھا،لیکن صبح آٹھ نو بجے کے بعد جب حضرت ناشتہ فرماتے، ناشتہ کے بعد مہمانوں کا آنا جانا ظہر تک لگا رہتا اور حضرت بیٹھ کر سب کی باتیں سنتے تھے، سب کا استقبال فرماتے تھے، کبھی ہم نے یہ نہیں دیکھا کہ کسی مہمان سے کہا جائے کہ ابھی آپ باہر جائیں، انتظار کر لیں، حضرت تھکے ہوئے ہیں؛ اگر کوئی کہتا بھی ہوتو اپنی طرف سے کہا ہوگا۔ حضرت ہمیشہ خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے اور سخاوت بھی اتنی تھی کہ سبحان اللہ! جو بھی آتا تو کچھ لے کے چلا جاتا۔اگر کوئی تحفہ آتا تو دوسرے کمرے میں پہنچتا اور جو آتا وہ تقسیم ہوتا۔ جو بھی مہمان آکے واپس ہو جاتا،ضرور حضرت اس کا کچھ اکرام فرماتے تھے، مہمان خانہ کے ذمہ دار مصباح بھائی ہیں، ان کو بلاتے تھے کہ مصباح بھائی مہمان جارہے ہیں تو بھائی مصباح کوئی چیز اٹھا کے ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ یہ وہی ہدایا ہیں جو حضرت کی خدمت میں لوگ لاتے، یہ لانے لے جانے کا بہت اچھا سلسلہ تھا، آخری سفر میں چودہ شعبان ۱۴۴۳ھ کو جب جانے کا ٹائم ہوا تو میں نے حضرت سے دعاؤں کی درخواست کی اور حضرت نے ہاتھ اٹھا کے بہت دیر تک دعا فرمائی اور دعائیں دیں اور سفر کے بارے میں دعا بھی کی اور بچوں کے بارے میں بھی۔ میں حضرت کی خدمت میں اکیلا تھا۔ حضرت پہلے سے ایک بہت قیمتی جوڑا جو بہت اعلیٰ معیار کا کاٹن تھا تیار کروا چکے تھے۔ آپؒ نے تکیہ کے نیچے سے وہ اٹھا کر میرے حوالہ کیا۔ یہ میرے لیے انتہائی خوشی اور مسرت کا سامان تھا۔

مہمانوں سے محبت اور ان کی تواضع:

حضرت مولانا سید محمد رابع سے میرا تعلق بڑھتا گیا اور ان کی محبتوں اور شفقتوں سے محظوظ ہوتا رہا۔ جب سفر کرتا تو مہمان خانہ میں حضرت کے کمرے میں جوان کا کمرہ تھا اس میں آنا جانا، حضرت سے ملنا، باتیں کرنا، الگ سے ملنا یا مجلس میں بیٹھنے میں کوئی پابندی نہیں تھی۔ بعض اوقات جب حضرت رائے بریلی تشریف لے جاتے تھے تو مجھے بھی ساتھ لے جاتے۔ کبھی اپنے گھر خاتون منزل تشریف لے جاتے تو ساتھ کھانے کے لیے بھی مجھے بلاتے تھے۔

اور ایک خاص بات جو حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں میں نے دیکھی یہاں پر لکھنؤ میں ان کی مہمان نوازی تھی۔ ہمارے لکھنؤ کے تعلق والے جانتے ہیں کہ حضرت مولانا کا قیام مہمان خانہ میں ہوا کرتا تھا جو ایک خاص مہمان خانہ ہے۔اس میں جو مہمان آتے تھے، خاص طور پر جو علماء آتے تھے ان کو بلاتے تھے اور ناشتہ اور دوپہر کا کھانا' شام کا کھانا ساتھ ہی ہوتا تھا۔ حضرت دسترخوان پر مہمانوں خاص کر باہر سے آنے والے مہمانوں کا بہت خیال فرماتے تھے۔ حضرت کے لیے گھر سے کھانا پک کر آتا تھا تو اس میں سے بھی حضرت کبھی مہمانوں کی تواضع فرماتے تھے، جتنی مہمان کی خدمت فرماتے اور اکرام کرتے اتنا اپنا خیال نہیں رکھتے تھے۔ جو کچھ آتا اس کی تقسیم کرتے اور سب کو کھلاتے تھے،ان کی یہ صفت ایسی نمایاں اور ظاہر تھی کہ موافقین اور مخالفین سب اس کا اعتراف کرتے ہیں۔

مولانا علی میاں سے والہانہ تعلق اور فنائیت:

حضرت مولانا' مولانا علی میاں ندویؒ کی پوری فکر پی چکے تھے جن کا حضرت علی میاں رحمہ اللہ سے تعلق رہا ہے وہ جانتے ہیں اور خاندان کے لوگ بھی کہتے ہیں کہ حضرت مولانا سید محمد رابع رحمہ اللہ کے بات کرنے، بیان کرنے، وضع قطع اور ہر برتاؤ کا انداز، یہاں تک کہ شکل وصورت کے لحاظ سے بھی حضرت علی میاں رحمۃ اللہ علیہ سے کتنی مشابہت ہے، اس کی وجہ فنائیت ہے جو حضرت مولانا رحمہ اللہ کے اندر ہر لحاظ سے موجود تھی۔

اس بات کا اندازہ اس سے لگائیں کہ دمشق میں حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "فی مسیرۃ الحیاۃ" (کاروان زندگی) تین جلدوں میں چھپ چکی تھی۔ تو انہوں نے کتاب کی جلد پر مولانا علی میاں رحمہ اللہ کی تصویر کے بجائے غلطی سے حضرت مولانا سید محمد رابع رحمۃ اللہ علیہ کی تصویر لگائی۔ اس کتاب کا میرے پاس

ایک نسخہ تھا، جب میں ہندوستان گیا تو اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ حضرت مولانا کی خدمت میں میں نے عرض کیا کہ ''فی مسیرۃ الحیاۃ'' کا یہ نسخہ آیا ہے، انہوں نے فرمایا کہ یہ نسخہ ہم نے دیکھا نہیں تو میں نے پیش کیا۔ اب اس میں لگی ہوئی تصویر کی حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ سے اتنی مشابہت تھی کہ خود حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی نے بھی فرمایا کہ بھائی یہ میری تصویر نہیں ہے؛ یہ تو حضرت ماموں کی تصویر ہے۔ پھر میں نے عرض کیا نہیں، حضرت آپ ہی کی تصویر ہے، لیکن انہوں نے نہیں مانا۔ مولانا سید واضح رشید ندوی رحمہ اللہ اس وقت حیات تھے انہوں نے بھی میری رائے کی تصدیق کی۔ دیر تک گفتگو ہوتی رہی، لیکن حضرتؒ کو تسلی نہیں ہوئی۔ اللہ کے نظام میں ایسا ہوتا رہتا ہے کہ کسی سے جب بے پناہ محبت اور اتباع اور فنائیت ہو تو اس کی تصویر میں بھی اس کا اثر آجاتا ہے، یہ محبت دونوں طرف سے تھی؛ حضرت علی میاںؒ کو حضرت مولانا سے اتنا تعلق تھا کہ میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ مولانا علی میاںؒ فرماتے ہیں کہ لوگ اپنے ساتھیوں سے، اپنے شاگردوں سے کہتے ہیں کہ میرے نقش قدم پر چلو؛ یہ رابع جو ہے یہ میرے کہنے کے بغیر میرا ایک بھی قدم نہیں چھوڑتا بلکہ جہاں میں قدم رکھتا ہوں اسی جگہ پر وہ اپنا قدم رکھتا ہے۔

ان کی تواضع کا یہ حال تھا کہ میں نے کئی بار پاؤں دبانے کی سعادت حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن آپؒ ہمیشہ منع فرماتے تھے۔

حقوق العباد میں احتیاط:

حضرت مولانا حقوق العباد کے بارے میں بہت احتیاط فرماتے تھے خاص طور پر جب کوئی کام ان سے متعلق ہوتا تو اس کے بارے میں بہت اہتمام فرماتے۔ بعض خطوط ہم ای میل کے ذریعے یا ساتھیوں کے واسطے سے بھیج دیتے، کچھ دنوں کے بعد اس کا جواب آتا۔ ہمارے خطوط ایسے تھے جنہیں جوابی خط کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر بھی حضرت جوابی خط لکھتے کہ جی ہاں آپ کا خط آیا تھا۔ پوچھنے پر بتاتے لکھنے والے کا یہ حق ہے کہ اس کا جواب دیا جائے۔

حضرت کی خدمت میں جب بھی کسی کا نام لیا جاتا کہ وہ فلاں کام کر رہے ہیں، آپ ان کی بہت تعریف کرتے، کوئی مختصر سی بات ہوتی، کوئی مختصر سا کام، کوئی چھوٹی سی خدمت اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ہوتی تو حضرت بہت تشویق اور ترغیب دیتے تھے۔ سب کی تعریف کر کے انہیں دعائیں دیتے۔ بہت اونچے الفاظ سے حوصلہ افزائی فرماتے تھے، جس سے کہنے والا بھی بہت خوش ہو جاتا تھا کہ الحمدللہ ہم بھی جس کام میں لگے ہوئے ہیں ہمارے اکابر اس کی تائید فرما رہے ہیں۔

منزل (منتخب آیات) پڑھنے کا اہتمام:

''منزل'' کے نام سے ایک مجموعہ ہے آیات کا جو حضرت مولانا زکریا کاندھلویؒ کی طرف منسوب ہے۔ اس میں منتخب آیات ہیں پڑھنے کے لیے اور بہت ساری بیماریوں کے لیے مفید ہے، اس منزل کو پڑھنا ہمارے بہت سارے اکابر کا معمول ہے۔ خاص طور پر جو حضرت مولانا زکریاؒ کے حلقے کے لوگ ہیں۔ ایک دفعہ حضرت کے سامنے منزل کی ایک کاپی دیکھنے میں آئی تو میں نے وہ اٹھا کر حضرت سے معلوم کیا کہ حضرت سنا ہے بہت سارے لوگ اس کو پڑھتے ہیں؛ حضرت نے بڑی حیرت سے سوال کیا کہ کیا تم لوگ نہیں پڑھتے ہو؟ میں نے کہا کہ میں تو نہیں پڑھتا ہوں۔ فرمایا: ہمارے خاندان میں تو اس کو بہت اہتمام سے پڑھتے ہیں پھر مجھے اجازت دے کر حکم دیا کہ ضرور پڑھیں۔ ہمارے حضرت کو اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا مقام دیا تھا۔ بہت ساری اچھی صفات کے حامل تھے۔ اللہ نے وہ مقام دیا تھا کہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے اور فنائیت ان کے اندر اتنی تھی کہ وہ کبھی کہیں بھی اظہار نہیں فرماتے تھے۔

علامہ مفتی محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کا حضرت کے بارے میں اظہارِ خیال:

میں نے کئی مرتبہ حضرت استاد محترم اور شیخ مکرم شیخ الاسلام علامہ محمد تقی عثمانی دامت برکاتہم کی خدمت میں حضرت مولانا سید محمد رابع صاحبؒ کے پیغامات اور سلام و دعائیں پہنچانے کی توفیق حاصل کی۔ استاد محترم بہت اونچے الفاظ میں ان کا ذکر فرماتے تھے

اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ بھی حضرت مولانا مفتی محمد تقی صاحب کے بارے میں فرماتے تھے کہ اللہ نے ان سے بہت کام لیا ہے، عالم اسلام کے لیے بہت غنیمت ہیں، ان کی بہت بڑی شخصیت ہیں اور مختلف الجہات شخصیت ہی، اللہ تعالیٰ ان سے کام لے رہے ہیں۔ حضرت مولانا سید رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کے سانحہ انتقال سے ذاتی طور پر جو دکھ ہوتا ہے وہ تو سب متعلقین کو ہوگا، دینی خدمات کے میدان میں بلکہ عام بشریت کی خدمت کے میدان میں بہت خلا پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے شیخ اور محبوب شخصیت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کی خالی جگہ بہترین افراد سے پر فرمائے، ان کے خاندان کے لوگوں کو اور ان کے شاگردوں کو، ان کے متوسلین اور متعلقین کو اللہ تعالیٰ ظاہری اور باطنی ترقیاں عطا فرمائے۔

طالب علم ساتھیوں سے گزارش:

مقالہ کے اختتام سے پہلے چند گزارش اپنے عزیز طالب علم ساتھیوں اور پڑھے لکھے لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہوں کہ دین کی خدمت ایک بہت بڑی سعادت ہے، علم اللہ کی طرف سے ایک نور ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے جس کا انتخاب فرماتے ہیں اسی کو عنایت فرماتے ہیں؛

﴿اللّٰهُ يَجْتَبِي إِلَيْهِ مَنْ يَشَاءُ وَيَهْدِي إِلَيْهِ مَنْ يُنِيبُ﴾

دین کے اس نور کے ساتھ اللہ تعالیٰ اگر انسان کے اندر وہ صفات پیدا فرمائے جو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارک میں تھیں اور صحابہ کی زندگی میں اور سلف صالحین کی زندگی میں تھیں تو اس سے آدمی کی اور بالخصوص علماء کی زندگی میں برکت آجاتی ہے اور برکت سے پھر ترقی ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ پھر بہت کام لیتے ہیں۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ زندگی مختصر ہوتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ بہت معیاری کام لیتے ہیں، ہمارے اسلاف میں بہت ساری ایسی شخصیات گزری ہیں جن کی عمریں مختصر تھیں، لیکن اللہ نے بہت بڑا کام لیا اور اور ان کی خدمات کا اثر ابھی تک جاری ہے۔ وہ اتنے بڑے اور اہم کام ہیں کہ شاید بڑی بڑی کمیٹیاں اور گروپس بھی ان کو انجام نہیں دے سکتے۔ اگر ہم اپنے وجود میں فنائیت، تواضع، شہرت سے دوری، منصب اور مقام سے دوری، اللہ کی مرضی پر چلنے کا ارادہ، اللہ کی رضامندی حاصل کرنے اور دین کی خدمت کا عزم پیدا کرلیں تو اللہ تعالیٰ ضرور ترقیاں عطا فرماتے ہیں، جیسا کہ ہمارے ہندو پاک کے مشائخ کو اللہ نے ترقی دی اور ان سے دین کا کام لیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ آج کل مختلف نظریات کو آسانی سے پڑھنا، میڈیا تک رسائی اور ہر قسم کے فتنوں کا سر اٹھانا ہمارے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ ایسے حالات میں ان بزرگوں کو پڑھنا از حد ضروری اور مفید ہے جنہوں نے ان افکار کو پڑھا اور سمجھا ہے اور ان کی چالوں کے بارے میں انسانیت کو آگاہ کیا ہے۔ ان میں علامہ ابوالحسن علی ندویؒ سرفہرست ہیں جنہوں نے اپنی کتب میں داخلی وخارجی فتنوں سے ہمیں آگاہ کیا ہے تو اس سلسلے میں عاجزانہ درخواست ہے کہ اس طرف توجہ دی جائے، خاص طور پر جو کتابیں میں نے حضرت مولانا سید محمد رابع رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے عرض کیا انہیں ضرور غور سے پڑھیں۔ اپنے متعلقین، پڑھے لکھے لوگوں کو خاص طور پر جو یونیورسٹیوں کے ماحول میں رہتے ہیں اور ان افکار اور نظریات سے ان کا واسطہ پڑتا ہے اور وہ مخالفین کے لقمہ تر بن جاتے ہیں، ان کے سامنے ان کتابوں کا تعارف ہو جائے اور صرف تعارف نہیں بلکہ کچھ باہمت لوگ کتابوں کی تقسیم بھی کرلیں اور اس کو اپنے لیے صدقہ جاریہ بنالیں۔

دینی مدارس میں زیر تعلیم طلباء کو مشورہ ہے کہ وہ حضرت علی میاں کی کتاب ''پاجا سراغ زندگی'' جو خطبات کا ایک مجموعہ ہے اس کو ضرور پڑھ لیں، اصحاب مدارس اس کتاب کو طلباء کی دسترس میں رکھیں یا انہیں مفت مہیا کریں۔ امید ہے ہماری کوششوں سے اللہ کسی مسلمان نوجوان کو ہدایت نصیب کرے اور مغربی افکار کے سامنے ہتھیار ڈالنے کے بجائے، وہ مقابلے کے لیے کھڑے ہو جائیں اور اللہ کے دین کو آگے بڑھائیں۔ یہ بہت بڑی سعادت ہے اور دنیا و آخرت میں ترقی کا سبب بنتا ہے۔ اللہ ہم سب کو توفیق عطا فرمائے۔

پیکرِ علم وادب

استاد شیخ شمس الدین درمش
(عالمی رابطہ ادب اسلامی-سعودی عرب)

سماحۃ الشیخ محمد رابع حسنی ندویؒ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نائب صدر تھے اور بیک وقت عربی واردو زبان کے ماہر تھے، بلاشبہ وہ ایک جید عالم دین اور معروف داعی اسلام تھے، مفکر اسلام امام ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے سانحہ ارتحال کے بعد وہ ان کے جانشین قرار پائے اور ان کی تمام ذمہ داریاں انہی کے سپرد کی گئیں، جنہیں شیخ محترم نے تادم حیات بحسن وخوبی انجام دیا۔

شیخ محترم محمد رابع حسنی ندویؒ کی عربی واردو زبان میں مختلف کتابیں ہیں جو ان کی فکر کو واضح کرتی ہیں، آپ سے میرا پہلا تعارف عالمی رابطہ ادب اسلامی کی ایک کانفرنس ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۹۹۰ء میں ہوا، پھر اس کے علاوہ بھی متعدد کانفرنسوں میں ان کے ساتھ شرکت کا موقع ملا اور خطوط کے ذریعہ بھی ان سے تبادلہ خیال ہوا، جن سے ان کی شخصیت کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا مجھے اچھا موقع حاصل ہوا۔

ادب اسلامی کے میدان میں شیخ محترم کی بڑی نمایاں خدمات رہی ہیں، جن میں بالخصوص رابطہ ادب اسلامی کے پلیٹ فارم سے ان کی لائق قدر کوششوں کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

شیخ محترم محمد رابع حسنی ندویؒ نے ادب اسلامی کے موضوع پر متعدد وقیع اور اہم کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، جو اہل علم وذوق کے لیے بہترین سوغات ہیں، آپ کی بعض اہم تصنیفات ہمارے رابطہ کے آفس میں بھی موجود ہیں مثلاً: "الأدب الإسلامي وصلته بالحياة" "أضواء على الأدب الإسلامي" "الغزل الأردي" علی الأدب الإسلامي" ہے اور دوسری "الغزل الأردي" ہے۔

شیخ محترم کی ہمہ جہت شخصیت کا زندگی کے مختلف میدانوں سے تعلق تھا، مگر ان کا ادبی ذوق ان سب پر غالب تھا، جس کی سب سے نمایاں دلیل میرے نزدیک شیخ ندویؒ کی کتاب ''رسائل الاعلام'' پر ان کے قلم سے مرقوم گراں قدر مقدمہ ہے، جس میں انہوں نے خطوط نگاری کی تاریخ پر روشنی ڈالی ہے اور اسی کے ساتھ ان کے ادبی پہلو کو بطور خاص اجاگر کیا ہے، وہ اس کے مقدمہ میں بتاتے ہیں کہ خطوط نگاری فن ادب کی ایک اہم صنف ہے، جس میں انسان مخاطب کے فہم اور اس کی سطح کا مکمل خیال رکھتا ہے اور اسی کی روشنی میں اپنی بات قلم بند کرتا ہے، انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ زیادہ مؤثر خطوط وہ ہوتے ہیں جو تکلف اور آورد سے خالی ہوں اور ان کے اندر سراسر آمد ہی آمد ہو، اس کے بعد انہوں نے خطوط نگاری کی تاریخ پر اختصار کے ساتھ عمدہ اسلوب میں روشنی ڈالی ہے، پھر یہ ذکر کیا ہے کہ پیش نظر کتاب ''رسائل الاعلام'' کی نسبت بھی ایک ایسے عالم سے ہے جو بڑے عالم اور ممتاز ادیب ہیں۔

سچی بات یہ ہے کہ مفکر اسلام امام ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی حیات وخدمات پر ہمارے یہاں سے کئی رسالے منظر عام پر آئے، جن میں لوگوں نے عمدہ سے عمدہ باتیں پیش کیں اور خوب لکھا، مگر ان کی کتاب ''رسائل الاعلام'' کا اس انداز میں تعارف کسی نے نہیں کرایا، جیسا کہ ان کے جانشین محمد رابع حسنیؒ نے پیش کیا، بلاشبہ یہ ان کے اعلیٰ ادبی ذوق کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ شیخ محترم کی مغفرت کرے اور ان کے درجات بلند کرے۔ آمین!

شیخ محترم محمد رابع حسنی ندویؒ کی عربی واردو زبان میں مختلف کتابیں ہیں جو ان کی فکر کو واضح کرتی ہیں، آپ سے میرا پہلا تعارف عالمی رابطہ ادب اسلامی کی ایک کانفرنس ۱۴۱۴ھ مطابق ۱۹۹۰ء میں ہوا، پھر اس کے علاوہ بھی متعدد کانفرنسوں میں ان کے ساتھ شرکت کا موقع ملا اور خطوط کے ذریعہ بھی ان سے تبادلہ خیال ہوا، جن سے ان کی شخصیت کو قریب سے دیکھنے اور سمجھنے کا مجھے اچھا موقع حاصل ہوا۔

ادب اسلامی کے میدان میں شیخ محترم کی بڑی نمایاں خدمات رہی ہیں، جن میں بالخصوص رابطہ ادب اسلامی کے پلیٹ فارم سے ان کی لائق قدر کوششوں کو ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

شیخ محترم محمد رابع حسنی ندویؒ نے ادب اسلامی کے موضوع پر متعدد وقیع اور اہم کتابیں بھی تصنیف کی ہیں، جو اہل علم وذوق کے لیے بہترین سوغات ہیں، آپ کی بعض اہم تصنیفات ہمارے رابطہ کے آفس میں بھی موجود ہیں مثلاً: "الأدب الإسلامي وصلته بالحياة" "أضواء على الأدب الإسلامي" "الغزل الأردي"

شیخ محترم کی دو مشہور کتابوں پر مجھے ان کی حیات ہی میں کچھ لکھنے کی سعادت حاصل ہو چکی ہے جن میں سے ایک کتاب "أضواء

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں

قاری سید حبیب احمد باندوی
(ناظم جامعہ عربیہ ہتھورا-باندہ)

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی انتہائی بلند مرتبہ انسان ہیں، اخلاق وعمل کی پاکیزگی سے آپ کی زندگی کی صبح وشام روشن ہیں، آپ جامعیت، بلندی فکر وخیال، وسعت نظر، سوز ودرد، کشش اور جاذبیت کی سچی تصویر ہیں۔

خانوادۂ تکیہ (رائے بریلی) سے ہمارے خاندان کا عقیدت ومحبت اور روحانیت وابنائیت کا تعلق ہمیشہ سے رہا ہے، حضرت مولانا کا خانوادۂ حسنی سادات کا ہے اور ہمارا تعلق حسینی سادات سے ہے جو عراق کے شہر اوسط سے ہندوستان وارد ہوا، پھر آگے کڑا مانک اور ہنسوا فتح پور میں سلسلہ مل جاتا ہے۔

روحانی وفکری تعلق وارتباط کا نقطۂ آغاز یوں ہوتا ہے جو حضرت والد صاحب کی زبانی سنا ہے، بلکہ اس پر تعامل بھی دیکھا ہے، حضرت مولانا علی میاں صاحب علیہ الرحمہ کے کئی بھانجے تھے، ان میں حضرت مولانا محمد ثانی حسنی صاحب، والد صاحب کے سہارنپور کی زمانہ طالب علمی میں درسی اور کمرہ کے ساتھی تھے، دونوں میں صلاح وتقویٰ، جہد وریاضت، علم کی دُھن، مزاج وطبیعت کی ہم آہنگی کی وجہ سے قربت اور لگاؤ تھا، حضرت مولانا علی میاں صاحب حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب علیہ الرحمہ کی خدمت میں آمد ورفت کے مواقع سے وقت نکال کر بھانجے سے ملاقات کے لیے قیام گاہ پر کبھی کبھار تشریف ارزانی فرماتے اور ان حضرات کی نیکی ومحبت کا مشاہدہ فرماتے، جس کی وجہ سے والد صاحب پر حضرت کی عنایات اور توجہ بڑھتی گئی، پھر علمی شغف ایسا کہ باوجود کمرہ میں ساتھ رہنے کے علمی انہماک کی وجہ سے کبھی کبھی ہفتوں ایک دوسرے سے غیر ضروری گفتگو کی نوبت نہیں آتی تھی، کھانا ساتھ ہوجاتا اور پھر اپنے اپنے درسی کام میں لگ جاتے اور تھک کر سوجاتے، حضرت مولانا شاہ اسعد اللہ صاحبؒ (ناظم جامعہ مظاہر علوم) کی خدمت اور صحبت میں بھی دونوں کی رفاقت رہتی۔

فراغت کے بعد والد صاحب ایک بڑے مدرسہ کی صدارت اور درس نظامی کی بڑی اور اہم کتابوں کی تدریس میں مشغول ہوگئے، پھر تقسیم ملک کے وقت چونکہ پڑھے لکھے باصلاحیت افراد پاکستان چلے گئے، ہندوستان خصوصاً باندہ جیسا پس ماندہ علاقہ اہل علم اور باکمال لوگوں سے خالی ہوگیا، جس کی وجہ سے باطل نے کمزور اور حالات کی ستم ظریفی سے سہمے ہوئے مسلمانوں پر ایسی یورش اور یلغار کی کہ ان کے قدم جادۂ حق سے ڈگمگانے لگے اور ارتداد مسلمان گھرانوں کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔

یہ جانکاہ اور دل دوز خبر حضرت والد صاحب پر بجلی بن کر گری، چنانچہ انہوں نے علی الفور تدریس چھوڑ کر علاقہ کا رخ کرلیا اور اپنے شبانہ روز لوگوں کو حظیرۂ اسلام میں واپس لانے کی محنت میں بسر کرنے لگے، اس سلسلہ کی محنت کو دوام دینے کے لیے جامعہ عربیہ ہتھورا کا قیام عمل میں لایا گیا، چونکہ یہ وقت کا اہم تقاضا تھا اور والد صاحب کی محنت اور فنائیت کو دیکھ کر اس وقت کے اکابر علماء اور مشائخ نے موقع بہ موقع ہتھورا نزول اجلال فرمایا اور والد صاحب کی حوصلہ افزائی فرمائی، مثلاً حضرت مولانا ابو الوفا صاحب شاہ جہانپوریؒ، حضرت مولانا عبد الغنی صاحبؒ، حضرت مولانا عبد الشکور صاحبؒ، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ، حضرت مفتی محمود الحسن صاحب گنگوہیؒ، آخر

الذکر کی آمد بکثرت ہوتی تھی، حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ بھی اخیر وقت میں جب کافی کام سنبھل گیا تھا تشریف لائے، حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ کی بھی متعدد مرتبہ تشریف آوری ہوئی، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے جدامجد ناگور جوایم پی میں ہے اور باندہ کا سرحدی علاقہ ہے ـــــــ میں سرکاری سروس میں تھے اور انتقال کے بعد وہیں مدفون بھی ہیں، اس لیے مولانا کا وہاں کا سفر باندہ ہوتے ہوئے ہوتا تھا، جس کی وجہ سے والد صاحب کی حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے محبتیں اور قربتیں مزید بڑھ گئیں اور مولانا کی الطاف وعنایات دو چند ہوگئیں، یوں والد صاحب کی دعوتی مساعی، کڑھن اور خلوص سے حضرت اقدس بہت متاثر تھے۔

والد صاحب نے بھی ان کو اپنا بڑا مانا اور حد درجہ ادب، عقیدت ومحبت کا معاملہ فرماتے، والد صاحب فرماتے کہ میری بہت سے علماء اور مشائخ سے ملاقاتیں رہی ہیں، لیکن جو باتیں یہاں حضرت مولانا علی میاں صاحب کی زندگی میں پائیں وہ کہیں نہیں دیکھا، خلوص واستغناء، دنیا سے بے رغبتی، زہد کا رچاؤ سب کچھ سارے اسباب دنیا کے ہوتے ہوئے بھی دنیا کو ہاتھ نہیں لگایا، گویا کہ اس شعر کے مصداق تھے ؎

بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں
دنیا میں رہتا ہوں دنیا دار نہیں ہوں

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ حضرت والد صاحب نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے مدرسہ کی کچھ مالی مشکلات کا تذکرہ کیا تو حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ سعودی کے جن شیوخ کے لیے چاہو میں خط لکھ دوں تاکہ ادارہ کی مالی مشکلات ختم ہوجائیں تو والد صاحب نے عرض کیا کہ حضرت! میرا آپ سے تعلق اللہ واسطے ہے، میں اس تعلق کو محفوظ رکھنا چاہتا ہوں، میں کسی عربی شیخ کے لیے آپ سے تحریر نہیں لکھاؤں گا، میں تو آپ کی صرف دعا لینے کے لیے حاضر ہوتا ہوں۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ بھی والد صاحب کے حق میں بڑے وقیع جملے ارشاد فرماتے کہ مثلاً جس کو ولی دیکھنا ہو وہ باندہ جاکر مولانا صدیق صاحب کو دیکھ لے، والد صاحب کے انتقال کے بعد حضرت مولانا نے جو عظیم جملے ارشاد فرمائے وہ جانبین کے بے مثال تعلق وارتباط پر شاہد عدل ہیں، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ اخیر عمر میں فرمایا کرتے تھے: میں اپنے اندر جو مناسبت مولانا صدیق صاحب کے ساتھ پاتا ہوں وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ کمیاب ہے۔

والد صاحب کو بھی حضرت مولاناؒ سے ایسی عقیدت اور تعلق تھا کہ اعتکاف سے اٹھنے کے بعد گھر جائے بغیر شب ہی کو شہر باندہ آجاتے اور صبح کو عید کی نماز پڑھا کر سیدھے تکیہ رائے بریلی کے لیے روانہ ہوتے اور حضرت مولانا علی میاں صاحب کی خدمت میں باریاب ہوتے، وہاں بھی پورا گھر منتظر ہوتا، دوپہر کو پہنچتے تو حضرت فرماتے کہ اب سویاں لاؤ، مولانا صدیق صاحب آگئے ہیں، بڑا انتظار رہتا، یہ معمول ہمیشہ والد صاحب کی حیات میں چلتا رہا، کبھی ناغہ نہیں ہوا، کبھی عید بچوں میں گھر کی نہیں کی، دونوں گھرانوں کا تعلق ایسا ہے جیسے ایک روح اور دو قالب، جس کا اثر گھرانے کے ہر فرد پر نمایاں ہے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ گوناگوں خوبیوں اور صلاحیتوں کے مالک تھے، وہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کا عکس جمیل اور صحیح معنوں میں قائم مقام تھے، جنہوں نے خوب نیابت کی اور کسی کو نے سے کمی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

مولانا رابع صاحب ۲۹؍اکتوبر ۱۹۲۹ء کو تکیہ کلاں رائے بریلی میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، پھر ندوۃ العلماء سے ۱۹۴۸ء میں سند فراغت حاصل کی، ایک سال دار العلوم دیوبند میں بھی گذارا، سہارنپور میں بھی کچھ ماہ مقیم رہے، اعلیٰ تعلیم کے لیے حجاز کا بھی سفر کیا، اپنے زمانہ کے چوٹی کے علماء اور مشائخ حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوریؒ، شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ، حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھیؒ، حضرت ہردوئیؒ وغیرہ سے کسب فیض کیا، جس سے فکر میں آفاقیت پیدا ہوئی، باقی حقیقی تعلیم وتربیت حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے زیر سایہ ہوئی۔

مولانا کی مصروف زندگی کا روشن پہلو آپ کی تصنیفی، تدریسی،

دعوتی خدمات ہیں، دار العلوم ندوۃ العلماء میں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء تک ادیب دوم یعنی اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے، اس کے بعد ادیب اول یعنی پروفیسر کی حیثیت سے مسند درس کو وقار بخشا، ۱۹۵۵ء میں صدر شعبہ عربی ادب اور ۱۹۷۰ء میں عمید کلیۃ اللغۃ مقرر کیے گئے، ۱۹۵۸ء میں پندرہ روزہ عربی جریدہ ''الرائد'' نکالا جو ہنوز جاری ہے، زبان وادب کی انہی خدمات کے نتیجہ میں ۱۹۸۱ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ سے سرفراز کیے گئے، ۱۹۹۳ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے منصب اہتمام پر فائز کیے گئے، ۲۰۰۰ء میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے سانحہ ارتحال کے بعد ناظم کے عہدہ پر سرفراز ہوئے، جس پر تا وفات باقی رہے، جس کا دورانیہ کم وبیش ۲۳ رسال ہوتا ہے، ۲۰۰۳ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے وصال کے بعد پوری ملت کی نگاہیں آپ پر آ کر ٹک گئیں اور متفقہ طور پر اس عظیم تنظیم اور سرمایہ ملت کے صدر قرار پائے، موصوف کی زیر صدارت مسلم پرسنل لا بورڈ میں آنے والے بہت سے فتنوں کا سد باب ہوا، ان کو اللہ کی طرف سے ایمان کی فراست حاصل تھی، آپ ''اتقوا فراسة المؤمن فإنه ينظر بنور الله'' کے واقعی مصداق تھے۔

حضرت مولانا رابع صاحبؒ احقر پر بہت شفقت فرماتے، اپنے بغل میں دسترخوان پر بٹھاتے اور کھانے کا اپنا تبرک عطا فرماتے اور بار بار فرماتے کہ تم تو ہمارے گھر کے ایک فرد ہو اور اس تعلق سے متعلق والد صاحب کا کوئی نہ کوئی واقعہ سناتے، جامعہ عربیہ ہتھورا باندہ کے اہم امور میں احقر نے حضرت مولانا رابع صاحب سے بارہا مشورہ کیا اور حضرت نے مناسب حال رہنمائی فرمائی جو روز روشن کی طرح کھلی حقیقت بن کر سامنے آئی۔

حضرت مولانا ملک اور بیرون ملک خدا معلوم کتنے اہم اداروں اور تنظیموں کے صدر وسرپرست نیز رکن رکین تھے، آپ کا فیض عرب وعجم ہر جگہ جاری رہا اور ہر طبقہ اور مکتب فکر کے لوگوں نے نفع اٹھایا، بلاشبہ مولانا کی زندگی قابل رشک اور ہم سب کے لیے نمونہ عمل ہے، مولانا کی بڑی خصوصیت سادگی، وسعت فکر ونظر، کشادہ قلبی، ہر فرد بشر کے لیے ہمدردی اور نبی ﷺ اور آپ کی سیرت سے جنون کی حد تک عشق ولگاؤ تھا اور چاہتے تھے کہ دنیا سیرت کے سانچے میں ڈھل کر گوہر مقصود تک رسائی حاصل کرے، مولانا کی شخصیت میں سمندر سا سکوت اور زمین سا جھکاؤ اور بچھاؤ تھا، وہ اپنی مثال آپ تھے، ۹۴ رسال تک دنیا کو اپنے اخلاق فاضلہ اور علوم ومعارف، تجربات وفراست سے فائدہ پہنچا کر اس دنیا کو رمضان المبارک کے مہینہ میں الوداع کہا اور خطہ صالحین میں محو آرام ہو گئے، بلاشبہ مولانا کی وفات قومی اور ملی ناقابل تلافی عظیم خسارہ ہے، اس پر آشوب دور میں ان کی قیادت کی شدید ضرورت تھی، لیکن احکم الحاکمین کے فیصلوں کے تہہ تک ہم خاکیوں کی رسائی کہاں ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو کروٹ کروٹ سکون نصیب فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین!

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

متاثر کن شخصیت

مولانا محمد رضوان القاسمی مرحوم

''حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کثیر المطالعہ، جہاندیدہ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے فیض یافتہ ہیں۔ اس لیے بات میں گہرائی، گیرائی، باخبری، زمانہ شناسی، پختگی، بصیرت اور للّٰہیت ہوتی ہے۔ مولانا کے ساتھ ''حسنی'' بھی ہے اور بلاشبہ ان کے اس ''حسنی خاندان'' نے نام کی مناسبت سے علم وعمل، اخلاق واخلاص اور اصابت رائے کی جو روایات قائم کی ہیں وہ قابل قدر اور لائق تحسین ہیں۔ مولانا کی طبیعت میں خاندانی انکسار اور شرافت ہے۔ حسن اخلاق متاثر کن ہے۔''

(ماخوذ از نگاہِ اولیں؛ نقوش سیرت: ۱۲)

خانوادۂ حسنی کے بدرِ منیر

مولانا مفتی عبید اللہ اسعدی
(جامعہ عربیہ ہتھورا-باندہ)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی علیہ الرحمہ میرے استاد و مربی تھے اور میرے لیے خاندانی بزرگوں میں سے تھے، حضرت کے خانوادہ سے ہمارے خاندان کا قدیم ربط و تعلق حضرت سید احمد شہید علیہ الرحمہ کے زمانہ سے رہا ہے، جس کی تجدید و تشیید ہمارے والد مولانا سید محمد مرتضٰی صاحب مظاہریؒ (ناظر کتب خانہ شبلی ندوۃ العلماء لکھنؤ) نے کی، جس کا سلسلہ مظاہر علوم کی طالب علمی اور حضرت مولانا محمد ثانی حسنی علیہ الرحمہ کی رفاقت سے شروع ہوا اور آخر دار العلوم ندوۃ العلماء کی خدمت اور لکھنؤ میں قیام کا ذریعہ بنا اور اسی محلّہ میں جس میں یہ خانوادہ کافی دنوں سے قیام پذیر تھا۔ (آمین آباد گوئن روڈ محمد علی لین نزد پکریا مسجد)

ندوہ میں والد صاحب کی ملازمت اور لکھنؤ میں قیام کی نوبت آنے پر اسی محلّہ میں مسجد مرکز تبلیغ پر وقف ایک زمین پر ایک مکان تعمیر کیا گیا، جس میں تقریباً ۱۵ر سال ہمارا قیام رہا، ہم بھائی بہنوں کی پیدائش و پرورش اسی مکان میں ہوئی، حتی کہ ۱۹۵۶ء سے ندوہ کے احاطہ میں قیام کی نوبت آئی۔

ایک محلّہ، ایک مسجد اور مکانات کے قرب نے عزیزانہ تعلق کو پختہ کیا، دونوں گھروں کی خواتین و بچے گھروں میں آتے جاتے اور ان حضرات کا گھر چونکہ کافی کشادہ تھا، تو اس میں بچوں کے کھیلنے کے لیے بڑے مواقع تھے، ان حضرات کا مکان دو منزلہ اور اس کی چھت ایک میدان سا تھا۔

حضرت مولانا محمد ثانی صاحبؒ کی وجہ سے خاص ان کے گھر سے ربط کی بات یہ تھی کہ والد صاحب تین بھائی مولانا محمد مرتضٰی، مولانا محمد عبد اللہ، مولانا محمد اجتباء، مولانا محمد ثانیؒ کے تینوں بھائیوں سے عمر کی نسبت سے ربط و تعلق رکھتے تھے، والد صاحب، مولانا ثانی صاحب، مولانا عبد اللہ صاحب، مولانا رابع صاحب، مولانا محمد اجتباء، مولانا واضح صاحب اور مولانا محمد الحسنی علیہم الرحمہ باہم خاص ربط رکھتے تھے اور یہ تعلق ایسا تھا کہ یہ حضرات ہمارے لیے ثانی چچا، رابع چچا اور واضح چچا تھے اور ہم انہی الفاظ کے عادی و مانوس تھے۔

گھر اور محلّہ میں ندوے کے مکتب سے ابتدائی تعلیم مکمل کر کے دار العلوم کا رخ کیا، مولانا خالد، مولانا حسین، مولانا حمزہ اور میں (محمد عبید اللہ) ہم سب کا داخلہ ندوہ میں ۱۹۶۰ء میں آگے پیچھے ہوا، میں نے اپنے لیے حفظ کا انتخاب کیا اور بقیہ سب عربی میں رہے۔

حفظ کی تکمیل کے بعد شعبہ عربی کے درجہ سوم میں ایک معمول اور نظام کے مطابق میرا داخلہ ہوا، سوم تا ششم کی تعلیم دار العلوم میں مکمل کی، اس عرصہ میں حضرت مولانا محمد رابع صاحب میرے خاندانی بزرگ تو تھے ہی استاد بھی تھے، مولانا سے میں نے کئی کتابیں پڑھیں، جیسے ریاض الصالحین، منشورات، جزیرۃ العرب وغیرہ۔

ششم کے بعد کا تعلیمی مرحلہ جامعہ عربیہ ہتورا باندہ اور دار العلوم دیوبند سے پورا کیا اور اس کے بعد تدریسی خدمات میں لگ گیا۔

ظاہر ہے کہ گھر لکھنؤ میں تھا تو آنا جانا اور چھٹیاں، ان سارے مواقع میں حسنی خاندان کے سب بزرگوں سے ملاقات کو اپنی سعادت سمجھتا تھا اور حضرت مولانا علی میاں صاحب علیہ الرحمہ کی رحلت کے بعد تو خصوصیت سے حضرت مولانا محمد رابع صاحب ہی مرکز عقیدت تھے، لکھنؤ میں ملاقات کے علاوہ رائے بریلی میں

حاضری دے کر ملاقات کا شرف حاصل کرنا بالخصوص ماہ مبارک میں، لکھنے کی جو توفیق رہی تو حضرت مولانا کی خدمت میں بھی پیش کرتا اور دعائیں لیتا، بعض کتابوں کے لیے حضرت مولاناؒ سے تحریر وتقریظ بھی حاصل کی، بالخصوص ''اسلام مکمل دین مستقل تہذیب'' اور ''الموجز فی اصول الفقہ''، اول الذکر کا معاملہ یہ ہے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے اجازت لے کر اس کا نام رکھا اور اشاعت کے بعد جب حضرت مولاناؒ نے وقیع تاثرات کا اظہار فرمایا تو اگلے ایڈیشن میں انہیں شامل اشاعت کیا۔

ان حضرات سے گھریلو تعلقات تھے، اس لیے بے تکلفی بھی تھی، ایک موقع پر حضرت مولانا محمد واضح صاحب نے مجھے دیکھ کر فرمایا کہ ''تم تو صناف'' ہو، چونکہ میں کچھ نہ کچھ لکھتا ہی رہتا تھا۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت مولانا رابع صاحب نے فرمایا کہ ''تم نے تو ندوہ میں پڑھا تھا، پھر فقہ کا موضوع ومیدان کیسے چن لیا؟''

لاک ڈاؤن کے زمانہ میں ایک ملاقات پر حضرت مولاناؒ نے فرمایا کہ ان دنوں میں تم نے کیا کام کیا؟ میں نے بتایا کہ ''کرونا کے مسائل'' پر ایک کتاب تیار کی ہے پھر وہ کتاب پیش خدمت بھی کی۔

حاضری کے مواقع میں محبانہ معاملات وگفتگو کا سلسلہ رہتا ہی تھا، یہ گفتگو گھریلو حالات کے علاوہ بسا اوقات فقہ اکیڈمی سے متعلق بھی ہوتی تھی، حضرت مولانا بڑی ہمت افزائی فرماتے اور اس کا اظہار کرتے کہ یہ کام اس وقت بڑی ضرورت کا ہے۔

بعض دفعہ وہ میرے سامنے مسائل کا ذکر بھی کرتے، مثلاً: کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کے متعلق اور بیٹھ کر سجدہ کرنے سے متعلق استفسار فرماتے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ خانوادہ اور بالخصوص اس کی چنیدہ شخصیات اپنے آپ میں مثالی شخصیات ہیں۔

ایں خانہ ہمہ آفتاب است

علمی ذوق، علمی اہتمام، خوش خلقی، تواضع اور سادگی وانکساری کیا چیز ان کے پاس نہیں رہی اور جو لوگ طالب بن کر آئے تو ان سے ان کو کیا چیز نہیں ملی۔ ادھر حضرت مولانا علیہ الرحمہ پر دو بڑی ذمہ داریاں تھیں ایک ندوۃ العلماء کی نظامت اور دوسری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت، دونوں ہی ذمہ داریاں اپنی جگہ اہم اور حالات کے اعتبار سے بڑی فکرمندی کی تھیں، حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے اپنے صبر وتحمل سے بعض حالات میں ندوۃ العلماء کو آزمائشوں سے نکالا اور اپنی بصیرت سے بورڈ کو بھی مضبوط رکھا۔

حضرت مولانا بار بار فرماتے کہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کوئی عام تنظیم نہیں، اس کا موضوع محدود ہے اور محدود رہنے میں ہی اس کی حفاظت ہے، اس کو پھیلانا کہ ملت کے ہر طرح کے مسائل اس میں زیر بحث لائے جائیں ہرگز مناسب نہیں۔

یہ بات اس لیے فرماتے تھے کہ آج کل کچھ لوگ ہر طرح کے مسائل کو ہر تنظیم سے جوڑنا چاہتے ہیں اور نقد وتبصرہ کرتے ہیں کہ اس میں نہیں بولتے اور اس میں نہیں بولتے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی وفات کے بعد سے چند سال قبل تک آپ اندرون ملک بہت اسفار کیے، جس کے واسطہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے حلقہ کی وسعت کے ساتھ ان حضرات کا سلسلہ ارادت بھی کافی پھیلا اور تکیہ شریفہ کی وہ رونق جو حضرت علی میاں صاحب علیہ الرحمہ کی حیات میں تھی برابر باقی رہی، پورے ماہ مبارک استفادہ وافادہ کا ایک نظام رہتا اور لوگ قریب ودور سے آکر مستفید ہوتے، جو اس ماہ مبارک تک رہا اور آئندہ بھی یہ سلسلہ رہے گا ان شاء اللہ، ادھر جب سے حضرت مولانا کی علالت کا سلسلہ شدید ہوا، مولانا بلال زید مجدہ ومدظلہ پوری توجہ سے اس کو سنبھالے رہے۔

حضرت مولانا خاندان میں اپنی قرن کی آخری کڑی تھے، جو اخیر دم تک روشنی دے کر رخصت ہوئے، خلا تو پیدا ہوتا ہے اور ہوا مگر اس خاندان کو اللہ تعالیٰ نے اتباع سنت اور رشد وہدایت کی ایک خاص شان عطا کی ہے، جس کی برکت ہے کہ یہ جگہ خالی نہیں ہوتی، بلکہ ایک صاحب سلسلہ کے دنیا سے رخصت ہوتے وقت دوسرا تیار ہو چکا ہوتا ہے اور الحمد للہ اس وقت بھی ہے۔

کاروان انسانیت کا حدی خواں

مفتی محمد سلمان منصور پوری
(استاد دارالعلوم دیوبند)

ملت اسلامیہ ہند کے بزرگ ترین رہنما، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر عالی وقار اور دسیوں تنظیموں اور اداروں کے سرپرست حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نوراللہ مرقدہ ۲۱؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ء بروز جمعرات سہ پہر ساڑھے تین بجے تقریباً ۹۴؍سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

آپ کی نماز جنازہ اسی دن بعد نماز تراویح ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اور دوسری نماز جنازہ اگلے دن صبح کو ۸؍بجے آپ کے وطن مالوف تکیہ رائے بریلی میں ادا کی گئی اور وہیں اپنے خاندان کے بلند پایہ اسلاف کے جوار میں آپ کی تدفین عمل میں آئی، دونوں جگہوں پر ہزارہا ہزار عوام وخواص کا مجمع خراج عقیدت کے لیے موجود تھا۔ رحمه الله رحمة واسعة!

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نوراللہ مرقدہ بلاشبہ بقیۃ السلف تھے، اخلاق وکردار کی بلندی، شرافت نفس، نرم روی، کم گوئی، تواضع وفروتنی، ملت کے لیے دردمندی اور بے چینی اور اصابت رائے میں آپ ممتاز مقام پر فائز تھے، انہی صفات حمیدہ کی بنا پر ملت کے ہر طبقہ میں آپ کو انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور آپ کی رائے کو انتہائی وقعت دی جاتی تھی۔

تعلیم وتعلم میں بھی آپ کا پایہ بہت بلند تھا، آپ کے شاگرد دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خصوصاً عربی ادب اور عالم عرب کے جغرافیہ پر آپ کی کتابیں مختلف جامعات کے نصاب میں شامل ہیں، سیرت طیبہ اور اسلامی تعلیمات کو عام فہم اور مستند انداز میں مرتب کرنے کا کارنامہ بھی آپ نے انجام دیا، جسے علمی حلقوں میں بڑی پذیرائی ملی۔

آپ نے ہر قسم کے تنازعات سے بچتے ہوئے یکسوئی کے ساتھ نہایت صاف وشفاف زندگی گذاری اور اخیر دم تک ملت کی مثبت رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

آپ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے سگے بھانجے تھے اور موصوف ہی کے زیر سایہ آپ نے تعلیم وتربیت کے مراحل طے کیے، کچھ مدت حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کی صحبت میں دیوبند میں رہنے کی بھی سعادت حاصل کی، جس کا آپ بڑی اہمیت سے ذکر فرمایا کرتے تھے، آپ نے حضرت مولانا علی میاں صاحب نوراللہ مرقدہ کی وفات کے بعد ان کی جانشینی کا مکمل حق ادا کیا جو انشاء اللہ تادیر یاد رکھا جائے گا، صرف ندوۃ العلماء ہی نہیں بلکہ مسلم پرسنل لا بورڈ، رابطہ ادب اسلامی، پیام انسانیت، دینی تعلیمی کونسل اور دیگر اداروں اور تحریکات میں آپ کی سیادت وقیادت ناقابل فراموش رہی۔ فالحمد کلہ للہ!

آپ سلوک ومعرفت میں بھی حضرت مولانا علی میاںؒ کے خلیفہ اور جانشین تھے، حسب دستور ہر سال رمضان المبارک میں متعلقین کے ساتھ تکیہ رائے بریلی کی مسجد میں قیام فرمایا کرتے تھے، اس سال بھی آپ رائے بریلی ہی میں تشریف فرما تھے، جہاں طبیعت کی خرابی کی بنا پر لکھنؤ لائے گئے اور ماہر اطباء کی نگرانی میں علاج کا اہتمام کیا گیا، لیکن وقت موعود آ پہنچا اور آپ ۲۱؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ کو اپنے رب کی بارگاہ میں سرخ روئی کے ساتھ حاضر ہو گئے۔

فقید المثال معلم وقائد

ڈاکٹر قاضی عبدالماجد ندوی
(صدر شعبہ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ- دہلی)

راقم کو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۵ء کے درمیان کئی چیزیں پڑھنے کا شرف حاصل ہے، میں نے ان سے شعر جاہلی (Pre-islamic poetry) اور سیرت ابن ہشام پڑھی ہے، سچی بات یہ ہے کہ جب ہمیں ان سے پڑھنے کا موقع ملا تو ایسا معلوم ہوا کہ ہمارے سامنے ایک نئی دنیا منکشف ہوگئی اور واقعی ہمیں لگا کہ علم وآگہی کا یہ ایک بالکل نیا انداز ہے جس سے ہم ابھی تک واقف ہی نہیں تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی تدریس میں بڑی گہرائی تھی، ہمارے سامنے جس انداز سے ان کے علمی لعل وگہر آتے گئے، ان میں سب سے زیادہ واضح طور پر یہ بات سامنے آئی کہ حضرت مولاناؒ کی تدریس میں تفہیم کا عنصر بہت نمایاں تھا اور آپ کا انداز تدریس ایسا تھا کہ اس میں گفتگو بڑی مربوط، معنی خیز اور مربیانہ ہوا کرتی تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا ہمیں مولانا کی ایک کلاس ختم ہونے کے بعد ان کی دوسری کلاس کا شدت سے انتظار رہتا تھا اور یہ تو کبھی ممکن ہی نہیں تھا کہ ہم ان کی کلاس میں غائب ہوجاتے یا ہمیں اکتاہٹ کا احساس ہوتا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی مربیانہ شفقتیں الحمدللہ ان کے تمام شاگردوں کو حاصل ہیں، وہ ایسی جامع صفات شخصیت تھے کہ انہوں نے اپنی نظر کرم سے کسی کو محروم نہیں کیا، جب میری ندوہ سے فراغت ہوگئی تو بعد میں جہاں کہیں بھی سیمیناروں وغیرہ میں ان سے ملاقات کا موقع ملتا تو وہ بڑی شفقت کے ساتھ میری علمی پیش رفت کے سلسلہ میں سوالات کرتے اور بڑی ہمت افزائی فرماتے، ادب اسلامی کے سیمینار میں بطور خاص ملاقات کا شرف حاصل ہوتا تھا۔

مولانا کی تدریسی خدمات کے علاوہ تصنیفی خدمات بھی ہیں، اسی طرح ادب عربی میں بھی ان کی کثیر خدمات ہیں، ظاہر ہے وہ ایک متنوع جہات شخصیت تھے، حدیث، تفسیر، ادب، تنقید، جغرافیہ اور تاریخ جیسے علوم پر ان کی زبردست نظر تھی، ان کی گفتگو سے لگتا تھا کہ وہ علم کے ناقل نہیں بلکہ ہر موضوع پر ان کی اپنی ایسی آراء ہیں جن تک رسائی بڑے غور وتدبر کے نتیجہ میں ہوتی ہے، اس لیے ان سے ملاقات کے بعد ہر شخص کو یہ لگتا تھا کہ اس نے ان سے کچھ نیا حاصل کیا ہے۔

حضرت مولانا رابع صاحبؒ پر ندوہ کے اندر میرے زمانہ طالب علمی میں بھی انتظامی ذمہ داریاں ہوا کرتی تھیں، اس زمانہ میں ندوہ کے اندر جب کبھی ان سے ملاقات کا موقع ملتا تو ان کی شفقتوں، معاملہ فہمی، باریک بینی اور ان کی ذرہ نوازی کا بخوبی پتہ چلتا تھا، ان باتوں کا ذاتی طور پر ایسا اثر پڑا کہ وہ دل پر نقش ہوگیا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو ادب عربی کی خدمات کے سلسلہ میں صدر جمہوریہ ایوارڈ اس وقت ملا جب اس اسکیم کی بالکل ابتداء تھی، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ حقیقی معنی میں ملک کے ممتاز ترین عربی کے دانشوروں میں سے ایک تھے، جن کو حکومت ہند کی جانب سے صدر جمہوریہ کا اعلیٰ ترین اعزاز دیا گیا، لیکن ان کی شخصیت سے جو شخص بھی واقف ہے وہ جانتا ہے کہ یہ سب باتیں ان کے مزاج کا حصہ نہیں تھیں کہ وہ کوئی چیز آگے بڑھ کر طلب کریں، لہٰذا یہ تو ممکن ہی نہیں کہ وہ اس اعزاز کے حصول کی خواہش بھی اپنے دل میں لائے ہوں، البتہ یہ ایک ایسی بدیہی چیز تھی جس کو ذمہ دار لوگوں نے محسوس کیا اور اس مؤقر نام کی تجویز پیش کی، ورنہ سچی بات تو یہ ہے

کہ مولاناؒ نے اس اعزاز کو قبول فرمایا، یہ ان کے لیے کوئی اعزاز کی بات نہیں تھی، بلکہ اس ایوارڈ کے لیے ایک اعزاز اور اس کی اہمیت ووقعت میں اضافہ ضرور تھا کہ حضرت مولاناؒ اس کو قبول فرمائیں۔

حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی قومی وملی خدمات کا سلسلہ تقریباً ایک صدی تک محیط ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد مولانا رابع صاحبؒ ان کے جانشین اور وارث ہوئے اور تمام ملی ذمہ داریاں آپ کے سپرد ہوگئیں، جن کو آپ نے بحسن وخوبی نبھایا اور یہ حقیقت ہے کہ آج تک میری کسی ایسے انسان سے ملاقات نہیں ہوئی جو مولانا کی خوبیوں' صلاحیتوں اور ان کی شرافت نفسی اور ان کے بلند ترین علمی واخلاقی کردار کا معترف نہ رہا ہو، واقعی یہ بڑی بات ہے کہ انہوں نے اتنی طویل زندگی پائی اور ان پر متنوع ملی ذمہ داریاں رہیں اور ان کا واسطہ اتنی بڑی دنیا سے پڑا، خواہ وہ عرب وعجم کے لوگ ہوں یا باہر کی دنیا کے لوگ ہوں، الغرض جن سے بھی ان کا واسطہ پڑا سب ان کی خوبیوں کے معترف ہوئے اور ان کو لگا کہ یہ جامع حسنات شخصیت ہے، اس شخصیت کے اندر تو وہ کردار ہے جو ہم اور آپ کتابوں میں پڑھتے ہیں، حقائق کی دنیا میں اس طرح کی متنوع جہات کی شخصیت کا ہونا واقعی حیرت کی بات ہے، جس کی اخلاقی خوبیاں اور پاکیزہ کردار اتنا بلند ہو کہ ہر شخص اس کو دیکھ کر اور اس سے معاملہ کر کے، اس کی لذت وشیرینی کو عرصہ دراز تک محسوس کرتا رہے۔

حضرت مولاناؒ کی وفات سے جہاں ایک طرف ندوہ کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے، وہیں دوسری طرف پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کا بھی بہت بڑا نقصان ہوا ہے، پچھلی دو دہائیوں سے آپ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت فرمارہے تھے اور آپ کی ذات میں ایسی خوبیاں تھیں کہ بورڈ کے اندر مختلف رجحانات' مختلف جماعتوں اور طرز فکر کے لوگ موجود تھے، مگر بورڈ کے تمام ممبران آپ کی شخصیت کے معترف تھے اور ان سب کا آپ کو مکمل اعتماد حاصل تھا، شاید یہ ان کی شخصیت کا ایک کرشمہ ہی تھا، آج کی دنیا میں بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جن پر لوگوں کو اس طرح کا اتفاق ہو جائے اور اس طرح سے ان کا اعتراف کیا جائے، واقعہ یہ ہے کہ اس حوالہ سے ان کی وفات سے ایک بڑا خلا محسوس کیا جارہا ہے اور لوگوں کے اندر اس چیز کا بہت احساس ہے، دہلی میں بڑے طبقہ کے لوگوں سے میری گفتگو ہوتی ہے اور مختلف جماعتوں ونظریات کے لوگوں سے بھی ملاقاتیں ہوتی ہیں، لیکن جب بات حضرت مولاناؒ کی آتی ہے تو ہر شخص ان کی خوبیوں ہی کا تذکرہ کرتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ ان کی جدائی پر ہر شخص کو دلی صدمہ ہے۔

حضرت مولاناؒ کی وفات جس طرح ندوہ اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے عظیم خسارہ ہے، اسی طرح ہمارے ملک عزیز کے لیے بھی بہت بڑا نقصان ہے، ایک ایسا شخص جس کے دل میں انسانیت کا اتنا درد ہو، جس کی ذات خیر وبرکت کا سبب ہو، اپنوں کے لیے بھی اور دوسروں کے لیے بھی، جس کے یہاں اپنوں اور غیروں کی کوئی تفریق بھی نہ ہو، جو بھی ان سے ملے تو لگے کہ ان کا اپنا ہے، جن کی خیر سگالی کا انداز سب سے منفرد ہو، جو سبھی کے لیے خاص ہو، واقعی ایسی عظیم شخصیت کا اس منظر نامہ سے غائب ہو جانا پورے ملک کے لیے بڑا ہی تکلیف دہ ہے، اس زمانہ میں ایک ایسا انسان جو انسانیت کا معتبر حوالہ ہو اور جس کی انسانیت کا دائرہ سب کے لیے وسیع ہو اور اس کا دامن سب کے لیے اتنا کشادہ ہو کہ وہ محسوس کرے سب اس کے اپنے ہیں، اس طرح کے لوگ اب بہت کم ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی ایک اور خاص بات جس میں وہ بہت منفرد تھے، وہ ان کی اعراض کی پالیسی تھی، اس پالیسی کا قرآن کریم میں متعدد جگہ حکم وارد ہوا ہے، بعض مرتبہ آپ کی زندگی میں ایسے مواقع بھی آئے کہ کچھ لوگوں نے آپ کی مثبت سرگرمیوں اور توانائیوں کو مختلف طریقوں سے الجھانا چاہا تاکہ وہ آپ کو مقصد سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائیں، لیکن حضرت مولاناؒ نے ایسے مواقع پر فراست ایمانی کے ساتھ اعراض کی پالیسی اپنائی اور اس طرح کی چیزوں پر کبھی کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

سچی بات یہ ہے کہ حضرت مولاناؒ کے جو بلند تعمیری مقاصد تھے، جن کے لیے ان کی زندگی وقف تھی، ان سے ہٹ کر کسی بھی لمحہ انہوں نے اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کیا اور انہیں اپنی زبان سے اپنے دفاع میں کوئی ایک لفظ نکالنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی، شاید یہی اللہ کے خاص بندوں اور اولیاء کا طریقہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے لیے کوئی کام نہیں کرتے، نہ وہ انتقام لیتے ہیں اور نہ ہی اپنی ذات کے لیے دفاع کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بلکہ ان کی خاموشی خود ہر سوال کا جواب بن جاتی ہے اور یہ جواب بڑا بلیغ ہوتا ہے، جسے اہل ہوش بڑی اچھی طرح سمجھ لیتے ہیں۔

حضرت مولاناؒ کی ذات کے سلسلہ میں یہی بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ ہم سب کے محبوب تھے، ان کی وفات کے بعد ان کی محبت سے ہمارے دل معمور ہیں، کیونکہ ہم انہیں اللہ کا ایک ولی سمجھتے ہیں، واقعی انہوں نے ولیوں والی زندگی گذاری اور نبی ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی پوری تصویر پیش کی، ان کا جانا ہم سب کے لیے بڑے صدمہ کا باعث ہے، لیکن ہم کوشش کریں گے کہ ان کی ان خوبیوں کے تذکرے کریں اور انہیں اپنے کردار کا حصہ بنائیں، اللہ تعالیٰ ہمیں ان کے بلند اخلاق وصفات اختیار کرنے میں بھی ان کی شاگردی کی توفیق دے اور وہ چیزیں ہمارے بھی کردار کا حصہ بنیں۔

اجتماعیت کی مشترکہ بنیاد

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

’’انسان کی اجتماعیت خاندانی اجزاء سے بنتی ہے اور کسی مقام پر اکٹھا بود و باش ہونے سے بھی بنتی ہے اور انسان کی اجتماعیت جس بنیاد پر ہو وہ اس کی زندگی کا بڑا خاصا ہے، اجتماعیت کے جہاں کچھ مشترک اثرات ہوتے ہیں، وہاں کچھ مشترک تقاضے بھی ہوتے ہیں۔ ایک ایسی اجتماعیت کا حق ادا کرنے کے لیے جس میں مختلف مذاہب، مختلف نسلیں اور مختلف ثقافتیں ہوں انسانیت کے عمومی تعلق کی بنیاد سب سے مؤثر بنیاد ہوتی ہے، اس میں افراد کے مفادات کو انسانی مفادات پر دیکھا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر پڑوسی پر پڑوسی کے حقوق دیکھے جاتے ہیں۔

انسانی رشتہ کی بنیاد ایسی ہے جس کا لحاظ ہمارے ملک ہندوستان جیسی ہر سوسائٹی میں کیا جاسکتا ہے، جو مذہبی اور طبقاتی لحاظ سے تنوع رکھتی ہو، اس لحاظ سے کوئی بھی انسانی معاشرہ متنوع ومختلف بنیادوں پر مشتمل اجتماعیت رکھتے ہوئے اور یکسوئی اور یکجہتی سے اور مثبت انداز میں ترقی کرسکتا ہے اور خطرات سے محفوظ رہ سکتا ہے اور اس طریقہ سے انسان کے انسان کے ساتھ دوسرے قسم کے تعلقات متاثر بھی نہیں ہوتے اور زندگی آپسی تعاون اور ایک دوسرے کا لحاظ رکھتے ہوئے چلتی ہے۔

ہندوستان میں آزادی کے بعد ضرورت تھی کہ (یہ ملک ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب کی مل جل کر کوشش سے آزاد ہوا) ہندوستان کے رہنے والوں کے تحفظ وترقی کے مسائل کو بھی یہ سب فرقے مل جل کر حل کرتے اور اجتماعی زندگی کو خوشگوار بنانے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے، ہندوستان کا دستور بھی اسی طریقہ کو واضح کرتا ہے، لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آزادی کے بعد مسائل کے حل کرنے میں خاندانی، مذہبی اور طبقاتی رشتوں کو زیادہ بنیاد بنایا جانے لگا، اس کی وجہ سے وطنی اور ملکی مفادات کو مدد ملنے میں بڑی کوتاہی ہوئی اور دیگر طبقاتی اور مذہبی ٹکراؤ اور کشمکش کے حالات پیدا ہوگئے، انسانی رشتہ کے تقاضے بھی اس میں نظر انداز ہونے لگے، اس کی وجہ سے ملک میں یکجہتی کے ساتھ ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں، یہ بڑی قابل اصلاح کمزوری اور نقص ہے، جس کی طرف توجہ اچھے اچھے اہل دانش نے بھی بہت کم کی، ہر ایک نے اپنی کسی محدود اجتماعیت کی فکر تک اپنے کو محدود رکھا۔‘‘

(ماخوذ از پیش لفظ: تحریک پیام انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو: ۳-۶)

خاطراتِ شیریں

مولانا محمد شریف صاحب بارہ بنکوی
(مرکز نظام الدین-دہلی)

مؤرخہ ۲۲؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ، ۳ بج کر ۴۵؍منٹ پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی رحلت کی خبر نے دل کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، کل تک جن کو ''مدظلہ العالی'' ''أدام اللہ فیوضکم'' کہہ کر بے حد خوشی ہوتی تھی، آج وہ ستارہ ٹوٹ گیا، دنیا جس کی روشنی سے فیض یاب ہوکر اپنی اپنی منزل پر پہنچ رہی تھی، خدا تعالیٰ امت مسلمہ کو ان کا نائب عطا فرما کر اس خلا کو پر فرمائے۔ رشد وہدایت' صلاح وفلاح کا نظام اللہ کی طرف سے قائم ہے، جب تک اللہ جس سے چاہتے ہیں لیتے رہتے ہیں، جب مدت کار پوری ہوجاتی ہے تو اس بندہ کو اللہ تعالیٰ اپنی بارگاہ میں بلا لیتے ہیں، برسہا برس کی تھکاوٹ' غم واندوہ کی کلفت کو بس یہ کہہ کر دور کردیا جاتا ہے:

﴿بِمَا غَفَرَ لِیْ رَبِّیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُکْرَمِیْنَ﴾(یس: ۲۷)

(کہ میرے رب نے میری کیا ہی بخشش فرمائی اور مجھے عزت والوں میں کیا)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے بندہ کا تعلق بہت عرصہ سے تھا، ہمیشہ دہلی مرکز نظام الدین سے آنے جانے میں حضرت کی خدمت عالیہ میں حاضری اور دعاؤں کا شرف بلکہ حال واحوال سننے سنانے کے بعد سفر شروع ہوتا، ایک مدت سے یہی معمول رہا، جس دن رمضان المبارک کے دوسرے آخری عشرہ میں شدید علالت کی خبر ملی' بندہ از خود اپنی اولادوں کے ساتھ حاضر ہوا، مولوی جعفر سلمہ کے ساتھ ڈاکٹروں کی ٹیم پورے طور سے مستعد تھی، حضرت کی راحت کے پیش نظر ملاقاتوں کا سلسلہ موقوف ہوگیا تھا، حضرت مولانا بلال صاحب سے ملاقات ہوئی، چہرہ پر نقاہت اور پشیمانی کا بڑا اثر تھا، بندہ نے مولانا کو اپنی صحت کے خیال رکھنے کے بارے میں عرض بھی کیا، مولانا کا جواب کہ ہماری ساری پریشانی وراحت انہی کے ساتھ ہے، اس وقت بہت سارے خیالات قدرت کے فیصلہ پر ایمان کے باوجود ذہن پر گردش کررہے تھے اور میں نے بالآخر اپنے بیٹوں سے کہا بھی کہ اس خاندان کے لیے رمضان کا آخری عشرہ اور جمعہ بہت اہمیت کا حامل ہے، چونکہ حضرت مولانا علی میاں نوراللہ مرقدہ سے لے کر حضرت مولانا عبداللہ حسنیؒ، حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی، مولانا محمود حسنی ندوی تک کچھ ایسا ہی سلسلہ رہا ہے۔ چنانچہ جمعرات کے دن بعد نماز ظہر بھائی علی حسن سے حضرت کا حال معلوم کیا، انہوں نے تشویش کا اظہار کیا اور ۱۵؍منٹ بعد سانحہ ارتحال کی خبر موصول ہوئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

کائنات کا نظام فنا ہی پر منحصر ہے، "کُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ" لیکن حضرت مولاناؒ کو عزم واستقلال' صبر ووفا' تواضع وانکساری' خوش خلقی وملنساری' امت کا غم' صورت وسیرت میں ممتاز' شاید میں نے کم کسی کو دیکھا اور پایا ہے۔

بہت سے ایسے مواقع آئے جن میں تند تیز ہواؤں نے ہلانے کی کوشش کی، مگر اپنے موقف پر حضرت کو ہمیشہ ثابت قدم دیکھا، اللہ تعالیٰ اپنی شایان شان بدلہ عطا فرمائے۔

بندہ اکثر ملکوں کے سفر سے واپسی کے بعد جماعتوں کے خروج کی تعداد اور علماء کرام کے پہلے اور دوسرے سال کے نکلنے کی کارگزاری سناتا تو بہت خوش ہوتے اور کہتے کہ لوگ آتے ہیں اور مایوسی کی چیزیں سناتے ہیں اور آپ امید افزا خبر سنا کر دل کو خوش

کردیتے ہیں، امت مسلمہ کے بہتر احوال سن کر، دین اور دین کی محنت کی طرف رجوع کے حالات سن کر بہت ہشاش بشاش ہوجاتے، ایک دن فرمانے لگے کہ میں ۱۰-۱۱ رسال کا تھا، مولانا الیاسؒ صاحب لکھنؤ تشریف لائے، ماموں بھانجہ والی مسجد میں نماز پڑھی، میں پیچھے بیٹھا ہوا تھا، مڑکر دیکھا، میرے بارے میں پوچھا کہ یہ کون ہے؟ ماموں جان حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ نے تعارف کرایا، میرے سر پر ہاتھ رکھا، اس کے بعد میرا ماموں کے ساتھ دہلی کا سفر ہوا اور کئی دن تک حضرت کی خدمت میں رہنے کا اور ان کی گہری فکر اور سوچ اور امت کا بے پناہ درد کا ان کے بیانوں میں از خود مشاہدہ کیا۔

ابھی کرونا کی بیماری کے موقع پر حاضری ہوئی، حضرت مولانا نے فرمایا: باطل کی بہت بڑی سازش کو اللہ نے اپنے فضل سے اور دعوت کی اس عظیم محنت کی وجہ سے اللہ نے ناکام کردیا۔

مولاناؒ نے فرمایا: حضرت مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ رب العزت نے بصیرت عطا فرمائی کہ انہوں نے اس کے بنیادی اصول بنائے:

(۱) مسجد کا قیام (۲) اپنا خرچ اپنی جیب سے (۳) خروج.

انہی اصول ثلاثہ میں اس کام کی حفاظت ہے۔

دعوت وتبلیغ سے اس خاندان کو جو تعلق روز اول سے ہے، مولانا اکثر موقعوں پر مولانا الیاس صاحبؒ کی آمد، لکھنؤ میں ان کے ساتھ محنت اور دار العلوم ندوۃ العلماء کی بلڈنگ پر چڑھ کر اس ادارہ کے لیے دعا کرنا اور اپنی والدہ محترمہ کا جس کمرہ میں حضرت کا قیام تھا اس کی کھڑکی کی طرف اشارہ کرکے کہ یہاں بیٹھ کر میری والدہ کو بیعت کیا تھا، بڑے مزے سے بیان کرتے تھے۔ بندہ نے اپنے مدرسہ میں حاضری کی درخواست کی، ختم بخاری شریف کے موقع پر مع اپنے عملے کے کئی مرتبہ تشریف لائے اور ایک مرتبہ ایک عمارت کا سنگ بنیاد تھا، تو حضرت مہتمم صاحب تشریف لائے۔

اسی عظیم سلسلہ کی برکت جاری وساری رہے، ۲۰۲۳ء کی ختم بخاری شریف کی تقریب سعید میں مولوی جعفر سلمہ اللہ تعالیٰ کی آمد نے دل کو بہت خوش کیا، اللہ تعالیٰ بڑوں کی صفات جانشینوں میں پیدا فرما کر امت مسلمہ کو مستفید فرمائے۔

مولانا مرحوم نے مولوی جعفر سلمہ سے واپسی کے بعد کارگزاری بھی لی اور اپنے تعلق کا اظہار اس طرح فرمایا کہ میں کئی مرتبہ حاضر ہوا ہوں۔ اللہ رب العزت اس سلسلہ کو جاری وساری فرمائے۔

تبلیغی جماعت کی برکات

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے امت کی وحدت کی فکر کو اپنایا تھا اور وہ اسی کی دعوت دیتے تھے اور ہم اسی دعوت کے مطابق یہ بات کہہ رہے ہیں کہ ہندوستان میں ہم امت اسلامیہ کی تھوڑی سی ذاتی توجہ سے دین کو بچا سکیں گے، اس لیے کہ ہمارے سامنے اس کا تجربہ ہے، ہم اگر دین پر قائم رہیں گے اور دین کو نسلوں تک منتقل کریں گے، تو یہ دین یہاں تابندہ وزندہ رہے گا۔

دین خالص کی دعوت اور مثبت انداز سے دین کی مبادیات؛ اخلاص، عمل، کلمہ، نماز اور حقوق کی تعلیم اور علم دین کی ترغیب کی، عقائد وفرائض اور حقوق کا صحیح علم ہوجائے اور اللہ کی یاد سے غفلت نہ رہے، اس کو جتنے اچھے طریقہ سے اور داعیانہ کردار کے ساتھ تربیت سے گذارنے کا کام تبلیغی جماعت کے ذریعہ ہوا وہ کسی اور ذریعہ سے نہیں ہوا۔ (تحفہ گجرات: ۶۴-۶۵)

مرشد الامت کی وفات-ایک مثالی عہد کا خاتمہ

ڈاکٹر سلیم الرحمٰن خان ندوی
(ٹوکیو-جاپان)

رمضان المبارک کا مہینہ تھا، اللہ تعالیٰ کی رحمتوں و برکتوں کا مہینہ تھا، صیام وقیام کا مہینہ تھا، عقیدت مندوں کا تکیہ رائے بریلی میں ہجوم تھا، مرشد الامت حضرت ناظم صاحب دامت برکاتہم کی وعظ ونصیحت سے لوگ مستفید ہورہے تھے اور اچانک خبر آئی کہ حضرت کی طبیعت ناساز ہے، جس کی وجہ سے حضرت کو تکیہ رائے بریلی سے لکھنؤ لایا گیا ہے، حضرت کو سانس لینے میں تکلیف ہے، علاج چل رہا ہے، ڈاکٹروں نے اطمینان دلایا ہے، جمعرات کے دن ۱۲/ رمضان المبارک تھا، ظہر کی نماز کا وقت ہوگیا تھا، لیکن جماعت میں دیر تھی، مرشد الامت حضرت ناظم صاحب نے ظہر کا وقت داخل ہونے کے بعد اصرار کیا کہ ظہر کی نماز ادا کی جائے، ظہر کی نماز ادا کی اور تھوڑی دیر بعد حضرت ناظم صاحب اس دنیا سے کوچ فرما کر رب العزت والجلال کے پاس تشریف لے گئے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ﴾ (البقرۃ: ۱۵۶) (ہم تو خود اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں)

فرشتے مؤمنین کا استقبال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ ؟ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ (الرعد: ۲٤) (کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو صبر کے بدلے، کیا ہی اچھا (بدلہ) ہے اس دار آخرت کا)

جنت میں مؤمنین کا استقبال ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَسِيقَ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ إِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوهَا وَفُتِحَتْ أَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ﴾ (الزمر: ۷۳) (اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے ان کے گروہ کے گروہ جنت کی طرف روانہ کیے جائیں گے، یہاں تک کہ جب اس کے پاس آجائیں گے اور دروازے کھول دیئے جائیں گے اور وہاں کے نگہبان ان سے کہیں گے تم پر سلام ہو، تم خوش حال رہو تم اس میں ہمیشہ کے لیے داخل ہوجاؤ)

خاکسار رمضان المبارک کے مہینہ میں جاپان کی ایک مسجد میں امامت کررہا تھا، مسلمانوں نے ٹیلیفون کرکے بڑے افسوس کا اظہار کیا، کچھ دوست کافی دور سے تعزیت کے لیے بھی تشریف لائے، دوسرے دن جمعہ مبارک کا دن تھا، خاکسار نے جمعہ کی نماز کا خطبہ دیا اور اسی دوران مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے لیے دعاءِ مغفرت کی۔

نفوس مطمئنہ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ☆ارْجِعِي إِلَىٰ رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً☆ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي☆وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾(الفجر: ۲۷-۳۰) (اے اطمینان والی روح! تو اپنے رب کی طرف لوٹ چل اس طرح کہ تو اس سے راضی وہ تجھ سے خوش، پس میرے خاص بندوں میں داخل ہوجا اور میری جنت میں چلی جا)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ۲۵/ جمادی الثانی ۱۳۴۸ھ مطابق ۲۹/ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو رائے بریلی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تعلیم مکمل فرمائی۔ اس کے بعد ایک سال دارالعلوم دیوبند میں گزارا۔ ۱۹۴۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ادب عربی اور دعوہ اسلامیہ کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۰ء کے اخیر سے ۱۹۵۱ء کے اخیر تک حجاز میں علماء کرام سے علمی استفادہ کیا۔ ۱۹۵۵ء میں دارالعلوم

ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ادب عربی کے شعبے کے رئیس کی حیثیت سے اور اس کے بعد ۱۹۷۰ء میں کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے عمید کے حیثیت سے، پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مدیر اور نائب ناظم کی حیثیت سے ۱۹۹۸ء تک خدمات انجام دیتے رہے۔ ۲۰۰۰ء میں مفکر اسلام علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد ناظم ندوۃ العلماء کے عہدہ پر فائز ہوکر خدمات انجام دیتے رہے۔ حضرت مولانا آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر اور عالمی رابطہ ادب اسلامی برصغیر کے صدر اور دوسرے بہت سے عہدوں پر فائز تھے۔ انہوں نے بہت سی دینی وادبی کانفرسوں میں ایشیا، یورپ، امریکہ، جاپان اور افریقہ میں شرکت فرمائی اور قیمتی مقالات سے جلسوں کو مزین فرمایا۔ ان کی بہت سی تصنیفات وتالیفات ہیں۔

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی ذات گرامی اخلاص اور للّٰہیت کی پیکر تھی، تواضع وانکساری ان کی خاص صفت تھی، شخصیت پرکشش اور منور تھی، ان کے پاس بیٹھنے میں سعادت وخوشی محسوس ہوتی تھی، ان کی مقبولیت کا اندازہ ان کی نماز جنازہ سے کیا جاسکتا ہے کہ قلیل مدت میں ندوہ میں ایک جم غفیر جمع ہوگیا تھا۔

الحمد للہ آپ کے زمانہ میں ندوہ نے ہر اعتبار سے بہت ترقی کی، تعلیم وتعلم کے اعتبار سے، طلباء کی تعداد کے اعتبار سے، عمارتوں کے اعتبار سے، شاخوں کے اعتبار سے، ایک بار حضرت ناظم صاحب سے میں نے ذکر کیا تو فرمانے لگے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم ہے۔

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ میرے استاد محترم ہیں، خاکسار کو حضرت سے عربی ادب اور جزیرۃ العرب پڑھنے کا شرف حاصل ہے، ندوہ میں جس وقت داخل ہوا تو حضرت ندوہ سائیکل سے تشریف لاتے تھے، صبح آتے ہی نائب ناظم مولانا معین اللہ صاحب ندویؒ سے ملاقات فرماتے اور آخر تک گھنٹوں پر گھنٹے طلباء کو پڑھاتے، واپسی بھی سائیکل ہی پر ہوتی۔

مفکر اسلام علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی موجودگی میں خاکسار ندوہ حاضر ہوا، مہمان خانہ کے سامنے مفکر اسلام مہمانوں کے ساتھ تشریف فرما تھے، میں نے مفکر اسلام کو جاپان تشریف لانے کی دعوت دی، فرمایا کہ رابع! (پیچھے تشریف فرما تھے) سلیم ہمیں جاپان کی دعوت دے رہے ہیں، نوٹ کرلو، طبیعت ٹھیک ہوئی تو چلیں گے، فرمایا کہ دنیا کے کئی ملکوں میں جانا ہوا لیکن ابھی تک جاپان نہیں گئے ہیں۔ مفکر اسلام علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ تو جاپان تشریف نہیں لائے، جی مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے جاپان کو اپنی نورانیت سے منور فرمایا۔

۲۰۰۰ء میں جاپان میں اسلام کی تاریخ کے سو سال پر کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں حضرت ناظم صاحب دامت برکاتہم تشریف لائے، بہت قیمتی مقالہ پیش کیا، مراکز اسلامیہ اور مساجد کے پروگرام کی دعوتوں کو شرف قبولیت بخشا اور حضرت کے وعظ ونصیحت سے جاپان کے مسلمان بھی مستفید ہوئے۔

مارچ ۲۰۲۳ء میں ندوۃ العلماء کی مجلس انتظامیہ کا اجتماع تھا، حاضری کے لیے ندوہ حاضر ہوا، ساتھ میں شیخ سعید ساتو صاحب جاپانی مسلمان جنہوں نے معانی قرآن کریم کا جاپانی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور ایک دوسرے جاپانی مسلمان یوسف تھے، حضرت ناظم صاحب دامت برکاتہم سے مہمان خانہ میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور جاپانی مہمانوں نے بہت خوشی اور سعادت محسوس کی کہ حضرت ناظم صاحب دامت برکاتہم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوگیا، خاکسار کو اور مہمانوں کو کئی بار حضرت سے ندوہ میں ملاقات کا شرف حاصل رہا اور جس وقت حضرت کی وفات کی خبر ملی تو میں نے فوراً شیخ سعید ساتو صاحب کو خبر دی، انہوں نے بڑے رنج وغم کا اظہار کیا اور دعائیہ کلمات تحریر فرمائے۔

اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، ان کی قبر کو جنت کی کیاری بنادے، ان کے تمام نیک اعمال کو قبول فرما، ان کی لغزشوں کو معاف فرما، ان کے تمام رشتہ داروں اور تعلق والوں کو صبر جمیل عطا فرما، ندوۃ العلماء کو نعم البدل عطا فرما۔ آمین!

جامع حسنات شخصیت

مولانا عمیر الصدیق ندوی
(نائب مدیر پندرہ روزہ تعمیر حیات-لکھنؤ)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی شخصیت ہشت پہل تھی، وہ ایک نہایت کامیاب معلم واستاد، مربی، مصنف، جغرافیہ داں، تذکرہ نگار، ملی مسائل پر منفرد سوچ رکھنے والے اور نہایت حکمت کے ساتھ مسائل کو حل کرنے والے دانشور شخص تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں روحانیت میں بھی بلند مقام عطا فرمایا تھا، آپ کی وفات کا غم ایسا ہے جس کو بیان کرنے کا کوئی استعارہ نہیں ہے اور ابھی بھی آپ کے لیے ''تھے'' کا لفظ استعمال کرنا محال ہے۔

مولانا کتنے اچھے مقرر اور مصنف تھے؟ ان کی تحریر میں کیا خوبی اور تاثیر تھی؟ اس کے اندر کتنی باریکیاں ہوتی تھیں؟ وہ ایک بہت بڑا سمندر ہے جس کا انشاء اللہ جائزہ لیا جائے گا، لیکن ان سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ حضرت مولانا بحیثیت ایک انسان کے آج کی دنیا کی بھیڑ میں وہ چہرہ تھے جو سب سے الگ تھے، آج ہر ایک کو اس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، سچی بات یہ ہے کہ مولانا کی شخصیت کے ہر پہلو میں سب سے نمایاں چیز جو سامنے آتی ہے وہ ان کا ایک انسان ہونا ہی ہے، ایک اچھے انسان کی جتنی بھی صفات ہوسکتی ہیں کہ اس میں محبت ہو، ایثار ہو، قربانی ہو، تحمل وبرداشت ہو، معاملہ فہمی ہو، خود کو پیچھے کر لینے کی ہمت ہو، دوسروں کو آگے بڑھانے کا حوصلہ ہو اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہر شخص کے بارے میں وہ بہتر سوچتا ہو، ہمارے حضرت مولاناؒ ان تمام اوصاف حمیدہ کی عملی تصویر تھے، انہوں نے ایک نسل کو پروان چڑھایا اور بڑے قیمتی ہیرے تراشے اور ان کی محنتوں سے غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک لوگ نکلے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ان کے جانشین اور نائب بنے، یقیناً مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی عظمت کے سامنے ان کی شخصیت میں کمی محسوس ہوتی تھی، لیکن اللہ رب العزت نے حضرت مولانا رابع صاحب نور اللہ مرقدہ کو ایک خالص وکامل انسان کے جو جوہر ودیعت کیے تھے، ان کی وجہ سے وہ پوری ملت اسلامیہ کے احساس پر چھا گئے، یہاں تک کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بھی صدر مقرر ہوئے اور لوگوں نے ان میں اور حضرت مولاناؒ میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا اور کوئی ایک طبقہ ایسا نہیں پایا گیا جو مولانا کے بارے میں ایک لفظ بھی سخت یا گراں استعمال کر سکے، بلکہ ہر آدمی ان کا معترف ومداح ہی نظر آیا اور بعض لوگ لاکھ کوششیں کرنے کے باوجود بھی ان میں کوئی کمی نہ نکال پائے، ظاہر ہے وہ حضرت مولانا علی میاںؒ کے نائب تبھی بنے جب قدرت نے ان کو وہ تمام ضروری چیزیں عطا کر دی تھیں جو نیابت کے لیے شرط ہیں۔

مولانا کی دوسری ممتاز خوبی لوگوں اور معاملات کو سمجھنا اور ہر معاملہ میں مثبت رائے اور مثبت انداز فکر کو اپنانا تھی، ایسا نہیں ہے کہ مولانا کو غصہ نہیں آتا رہا ہوگا، یا مولانا کے دل پر چوٹ نہیں لگتی ہوگی، بلکہ انہیں بھی کئی چوٹیں لگیں اور بعض مرتبہ اپنے معاصرین سے بھی چشمکوں کا سامنا کرنا پڑا، یقیناً ان کو بھی سب رپورٹیں ملتی رہی ہوں گی کہ باہر کیا کیا کہا جا رہا ہے، لیکن کمال یہ تھا کہ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے کبھی ان باتوں کا احساس ہی نہیں ہوا، دراصل مولانا کے اندر باتوں کو پی جانے کا جو ملکہ تھا وہ انتہائی اہم بات ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے لے کر آج تک اگر آپ

ملت کی تاریخ پڑھیں تو اندازہ ہوگا کہ جو کامیاب ترین اشخاص پیدا ہوئے ہیں، ان کے تمام علمی و تعلیمی پہلو ایک طرف لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی یہ رہی ہے کہ بحیثیت انسان وہ اپنے معاشرہ میں مقبول ترین ہوئے ہیں اور مقبول ترین وہی ہوتا ہے جس کو خود کو مٹانا آتا ہو، ہمارے حضرت مولاناؒ نے بھی واقعی خود کو مٹا دیا تھا۔

اللہ رب العزت نے حضرت مولاناؒ کو ملت کی خدمت کے لیے ایک لمبی عمر عطا فرمائی، لیکن اس عمر کا مولاناؒ نے جو ٹیکس ادا کیا وہ انتہائی سبق آموز ہے، حضرت مولاناؒ نے اپنی زندگی میں ایسے ایسے حادثات کا سامنا کیا جو شاید ہی کسی کی زندگی میں آئے ہوں، سگے بھائی، داماد، نواسے، بھتیجے جیسے قریب ترین رشتے جن کے بغیر زندگی جینے کا تصور بھی نہیں تھا، وہ سب ایک ایک کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے سے رخصت ہو گئے۔ اللہ اکبر!

حضرت مولاناؒ کے اندر برداشت کی جو طاقت تھی دراصل یہی طاقت انسان کو انسان بناتی ہے، لیکن یہ تبھی ہوتا ہے جب انسان بے غرض ہو جائے یا اللہ کی رضا میں خود کو فنا کر دے، اگر کسی کو فنا فی اللہ کا حقیقی مفہوم سمجھنا ہے تو چاہیے کہ وہ مولانا کی شخصیت پڑھے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا کرم ہے کہ ہمارا شمار بھی آپ کے شاگردوں اور متعلقین میں ہوتا ہے، ۱۹۷۳ء میں مجھے حضرت مولاناؒ سے باقاعدہ شاگردی کا شرف حاصل ہوا، میں نے ان سے تفسیر اور ادب وانشاء جیسے اہم موضوعات پڑھے، اس کے بعد بھی مسلسل صحبتیں حاصل رہیں، جن کے نتیجہ میں غیر شعوری طور پر ہم نے مولانا کا وہ اثر قبول کیا کہ ذرا نرم گفتار بنو، جذباتی نہ بنو اور معاملات کو سمجھنے کی کوشش کرو، واقعی یہ سب ایسی چیزیں ہیں جن کا آج فقدان ہے۔

حیرت کی بات ہے کہ حضرت مولاناؒ اپنے طلبہ کے ساتھ بھی ایسے پیش آتے تھے جیسے گویا وہ طلبہ ان کے معلم ہوں، نہایت ٹھنڈے الفاظ میں ان سے مخاطب ہوتے تھے، وہ انداز تخاطب یاد آتا ہے کہ ”مولوی! ایسا کرلو“ ”مولوی! ایسا نہ کرو،“ جب میں دارالمصنفین آنے لگا تو امین آباد گوئن روڈ والی مسجد میں انہوں نے مجھ سے چلتے وقت ایک بات فرمائی کہ دیکھو مولوی عمیر! تم دار المصنفین جا رہے ہو، تمہیں وہاں بہت کم پیسے ملیں گے، ہم چاہیں تو تمہیں کہیں بھی بھیج سکتے ہیں، لیکن خال معظم کی خواہش ہے کہ تم دارالمصنفین جاؤ، اس لیے کہ اس کی ضرورت ہے اور سن لو!

﴿مَن يَتَّقِ وَيَصْبِرْ فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ﴾ (یوسف: ۹۰) (جو بھی تقویٰ اور صبر اختیار کرتا ہے تو اللہ بہتر کام کرنے والوں کے اجر کو بیکار نہیں کرتا)

حضرت مولاناؒ نے یہ جو آیت پڑھی، یہ آج بھی میرے کانوں میں گونجتی رہتی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ان کی بھی پوری زندگی اسی تقویٰ وصبر سے عبارت تھی، ہم نے اپنے بعض پیش رو حضرات کے متعلق پڑھا ہے کہ اچھا خاصا علمی ماحول چھوڑ کر وہ صرف اس لیے چلے گئے کہ انہیں اس ماحول میں سانس لینا مشکل ہو رہا تھا اور ڈر تھا کہ کہیں گھٹ گھٹ کر مر نہ جائیں، لیکن ہمارے حضرت مولاناؒ کا صبر اور ان کی ثابت قدمی واقعی غیر معمولی تھی، وہ پوری استقامت اور لبوں کی خاموشی کے ساتھ پوری زندگی ندوہ میں لگے رہے، نہ کبھی ایک لفظ بددعا کا نکلا اور نہ کبھی ایک لفظ برائی کا، آج کے دور میں خاص طور سے پوری دنیا کو اور خاص کر ہماری ملت کو یقیناً ایسے ہی انسان کی تلاش ہے۔

مولانا کا جانا کسی فرد واحد یا تنہا ایک عالم ومصنف کا جانا نہیں ہے، بلکہ ان کی وفات سے اس انسانیت کا عظیم خسارہ ہوا ہے، جس سے انسانیت کو اعتبار ملتا ہے اور انسانیت اپنے آپ کو ملکوتی صفات کے ہم پلہ سمجھنے لگتی ہے، اللہ نے مجھے توفیق دی اور میں نے بہت سے سوانحی خاکے لکھے ہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولاناؒ کے متعلق کچھ کہنا یا لکھنا مشکل ترین کام ہے، کچھ سمجھ نہیں آتا کہ مولانا کو ہم کن الفاظ میں اور کیسے خراج عقیدت پیش کریں، اگر میں یہ کہوں کہ سب سے زیادہ وہ مجھے چاہتے تھے اور میری کامیابی سے خوش ہوتے تھے، سب سے زیادہ اچھی طرح میرے جانے پر استقبال کرتے تھے، تو مجھے واقعی یہ کہنے کا حق ہے، لیکن میرے ساتھ ان کا ہر شاگرد یہی کہنے کا حق رکھتا ہے کہ سب سے زیادہ مولانا اس کو چاہتے تھے اور سب سے زیادہ مولانا کو اس

پر اعتبار تھا، واقعی یہ خوبی ہونا کہ ہر فرد جوان سے متعلق ہو وہ یہ سمجھے کہ سب سے زیادہ ہم کو چاہتے تھے، یہ صفت میں نہیں سمجھتا کہ جلدی کسی شخصیت میں نظر آئے گی، حقیقت یہ ہے کہ بہت دنوں تک لوگ رویا کریں گے، مگر مولانا جیسا کوئی ملنے والا نہیں۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم اے ہم نفسو! وہ خواب ہیں ہم

مادیت اور خودغرضی کی اس دنیا میں جہاں صرف نام ونمود اور پیسہ ہے، حضرت مولاناؒ کی بے نیازی اور نام ونمود سے دوری بھی نمونہ کی تھی، ایک بڑے عالم نے ہمیں بتایا کہ عرب کے ایک شیخ نے نقد ایک کروڑ روپیہ حضرت مولاناؒ کی خدمت میں پیش کیا، جس پر حضرت مولاناؒ نے فرمایا: ”مجھے تو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے، اگر انہیں دینا ہی ہے تو وہ ندوہ کو دے دیں۔“

اس جملہ پر غور کریں تو کہنا بہت آسان ہے، لیکن زینت حیاۃِ دنیا سے دامن چھڑا لینا بہت مشکل ہے، آج بڑے بڑے لوگ اسی چیز کا شکار ہیں، لیکن ہمارے مولانا روشنی کا مینار تھے، آج کے دور میں ان کے ان اوصاف حمیدہ کو قلم اور میڈیا کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی ضرورت ہے، آج لوگ اپنے پروپیگنڈہ کے لیے لاکھوں کروڑوں روپئے خرچ کردیتے ہیں، لیکن ہمارے مولانا نے پوری زندگی سادگی کے ساتھ بسر کی، ندوہ کی ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رہائش رہی، مگر ان کی بااثر شخصیت کی وجہ سے وہی جگہ مرجع خلائق بن گئی۔

مولانا کی صلاحیت اور ذہانت وفطانت کے اوصاف پر کچھ کہنا یا لکھنا بھی مستقل ایک موضوع ہے کہ ان کی عربی کا کیا امتیاز تھا، بے شک عربی کے ساتھ اردو زبان میں بھی وہ خود ایک صاحب طرز واسلوب ادیب تھے، جن کے یہاں آسان زبان وبیان میں انتہائی گہری باتیں ہوتی تھیں، ندوہ کی مجلس انتظامیہ میں مولانا نے جو صدارتی خطبات پیش کیے، وہ بجائے خود تعلیم وتربیت کے موضوع پر شاہکار ہیں اور بار بار اشاعت کے لائق ہیں۔

حضرت مولاناؒ کے عہد نظامت میں ندوۃ العلماء کی جو غیر معمولی ترقی وتوسیع ہوئی وہ حیرت انگیز ہے، آج پورے ملک میں ندوہ کی سینکڑوں، ہزاروں شاخیں قائم ہوچکی ہیں، بلاشبہ ندوہ کی یہ توسیع صرف حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی برکت تھی، ان کے دور میں خاموشی کے ساتھ کام ہوتے رہے، جس کا نتیجہ ہے کہ الحمد للہ اب ہر جگہ سے ندویوں کی نئی نسل نکل رہی ہے، خدا کرے ان کی وفات کے بعد بھی ندوہ کے پیغام کی اسی طرح توسیع ہوتی رہے۔

انگریزی سامراج میں مسلمانوں کا آزمائشی مرحلہ

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

”ہندوستان میں انگریزی سامراج کے آخری ایک سو سال مسلمانوں کے لیے بڑی آزمائش اور نقصان رسانی کے گذرے، ۱۸۵۷ء کی انقلابی کوشش کی ناکامی کے بعد مسلمانوں کو خاص طور پر بڑا نقصان اٹھانا پڑا، ان کی سیاسی طاقت کو ختم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی طاقت کو بھی تباہ کرنے کی کوشش کی گئی، ایک تو تعلیمی محاذ پر ایک ایسا نظام تعلیم رائج کرکے جس کے ذریعہ مسلمانوں میں ایسے تعلیم یافتہ لوگ پیدا ہوں جو اسلامی غیرت اور اسلامی فکر وعمل سے خالی ہوں، دوسری طرف ایسے افراد کی ہمت افزائی کرکے جو مسلمانوں کو ان کے صحیح دینی عقیدہ سے ہٹا کر نئے باطل عقیدہ ومذہب میں مبتلا کردیں۔ اگر اس کے مقابلہ کے لیے اللہ تعالیٰ نے مخلص علمائے دین کو توفیق نہ دی ہوتی اور انہوں نے مغربی فکر وتہذیب کے یلغار کے لیے رکاوٹ پیدا کرنے کے اسباب نہ پیدا کیے ہوتے تو اسلام خود مسلمانوں کے ہاتھوں میں قصہ پارینہ ہوجاتا۔“

(ماخوذ از پیش لفظ: امت کی بقا اور عقیدۂ ختم نبوت: ۴)

عرفانِ حق کا پیکرِ جمیل

جناب عین الحیدر علوی
(سجادہ نشیں تکیہ شریف کاظمیہ کاکوری۔لکھنؤ)

مرشد امت حضرت مولانا محمد رابع حسنی رحمۃ اللہ علیہ اپنے خاندان کے چوتھے فرد نوید تھے، آپ کے بزرگوں نے ''محمد الرابع'' کے مبارک نام سے آپ کی تسمیہ خوانی فرمائی انگریزی، مؤرخین بھی لکھتے ہیں کہ اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ رکھنے والا نام ''محمدؐ'' ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نام نامی واسم گرامی کا ہی فیض تھا کہ تمام عمر سنت نبوی سے سرمو انحراف نہ فرمایا اور اپنی ضیا پاشیوں سے تمام عالم کو منور فرماتے رہے، جگر مرادآبادی نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

لاکھ ستارے ہر طرف ظلمت شب جہاں جہاں
ایک طلوعِ آفتاب دشت و چمن سحر سحر

حضرت مولانا محمد الرابع حسنی نوراللہ مرقدہٗ کی ذات گرامی سے نہ صرف آپ کے مسترشدین بلکہ ایک انبوہ عظیم نے فیض حاصل کیا۔ خواہ وہ علم ظاہری ہو یا علم باطن۔ اپنے دور میں آپ اپنا ثانی نہ رکھتے۔ ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر نظر ڈالئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو سید الصابرین ہیں، جن کے سر پر "ورفعنا لك ذكرك" کا تاج ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے کس کس طرح اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو آزمایا۔ عم محترم حضرت حمزہؓ کی دردناک شہادت، ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ سلام اللہ علیہا کی وفات، شفیق چچا حضرت ابوطالب کی رحلت، یکے بعد دیگرے دو صاحبزادگان کی وفات حسرت آیات! لیکن عزم وحوصلہ کا یہ کوہِ گراں جس کے لیے ارشاد ہوا: ﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ﴾ ہر حال میں راضی بہ رضائے الٰہی رہ کر اُمت مسلمہ کو یہ پیغام دے دیا گیا: "الصبر عند الصدمة الأولى"

اس حقیر نے مولانا رابع حسنی صاحب علیہ الرحمہ کو بھی راضی بہ رضائے الٰہی کا ایسا پیکر پایا جو یقیناً ﴿إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً" کا عکس جمیل تھا۔ اپنے برادر عزیز مولانا واضح رشید ندویؒ کی رحلت بعد ازاں عزیز بھتیجے خویش اور معتمد ترین انسان حضرت مولانا سید حمزہ حسنی علیہ الرحمہ کی رحلت کے جاں گداز سانحہ کو جس طرح آپ نے برداشت کیا اُس کی مثال نہیں ملتی۔ اس حقیر کو مولانا حمزہ حسنی صاحب نوراللہ مرقدہٗ سے ایک خصوص تعلق اور لگاؤ تھا، اُن کے سانحۂ ارتحال پر بری طرح رویا لیکن حضرت مرشد الامت نے اپنی آنکھوں میں تیرتے ہوئے آنسوؤں کو "كظم عن الغيظ" کی طرح پی لیا۔ یہ واقعی اہل اللہ ہی کی شاہن ہے: ﴿أُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَبِّهِ وَرَحْمَةٌ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ" کی عملی تفسیر اس عامی پر معاصی نے اُس جاں گسل موقع پر دیکھ کر اِس بات کی گواہی دی کہ خاندان رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے واقعی صبر وضبط کی وہ مثال قائم کی جسے پیش کرنے سے آج زمانہ قاصر ہے۔ مولانا حسن احمد صدیقی فاضل دیوبند کیا خوب فرماتے ہیں ؎

ترے نثار کہ گل کرکے اپنے گھر کے چراغ
حسینؑ دی ہے زمانے کو روشنی تو نے

مصلح امت ومرشد الافندۃ والعیون حضرت مولانا ابوالحسن علی الندوی علیہ الرحمہ والرضوان کی ذات گرامی پر کچھ لکھنا گویا سورج کو چراغ دکھانا ہے۔ اس حقیر کے زمانۂ طالب علمی میں حضرت والا مولانا محمد الحسنی علیہ الرحمہ اور مولانا شاہ شبیر عطا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ہم راہ تشریف لائے تھے کیوں کہ ''تذکرہ حضرت شاہ علم اللہ

رائے بریلی'' کا قلمی نسخہ کتب خانہ انوریہ کاکوری میں ہی محفوظ تھا۔ راقم اثم کو بخوبی یاد ہے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان نے اس وقت فرمایا تھا کہ ہمارا سلسلۂ طریقت اب آپ سے ہی قائم ہے (مرشدنا مولانا حضرت شاہ مصطفیٰ حیدر قلندر نور اللہ مرقدہ) (۱۹۲۳-۲۰۰۳ء) کیونکہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ سے بیعت تھے۔

حضرت شاہ ابوسعید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کا جو روحانی فیض خانقاہ کاظمیہ کاکوری سے جاری وساری تھا، وہ ''تذکرہ حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلی'' سے بخوبی عیاں ہے۔ حضرت مولانا محمد الحسنی علیہ الرحمہ تحریر فرماتے ہیں:

''کاکوری کا مشہور سلسلۂ عالیہ قادریہ قلندریہ جو اپنی وسیع المشربی اور جذب وسرمستی کے لیے مشہور ہے، اُس کے بعض نامور مشائخ کے حالات زندگی اور سوانح وواقعات میں ہمیں اُس جگہ وہ رنگ صاف نظر آتا ہے جہاں خانوادۂ علم اللّٰہی کا اُس کے ساتھ پیوند ہوا ہے اور دونوں سلسلے کسی ایک شخصیت میں جمع ہو گئے ہیں۔ گویا ایک نور مستطیل ہے کہ جدھر سے گزرتا ہے اپنی روشنی چھوڑتا جاتا ہے۔ حضرت شاہ محمد کاظم قلندرؒ (م ۱۲۲۱ھ) کو جو اس سلسلہ کے بہت عظیم المرتبت بزرگ گزرے ہیں، شاہ لعل صاحبؒ اور اُس کے بعد شاہ ابوسعید صاحب (نبیرہ سید آیت اللہ بن شاہ علم اللہؒ) سے اجازت حاصل تھی اور شاید یہی وجہ ہے کہ اپنے خاندان اور سلسلہ کے بعض مروجہ رسوم وروایات کے خلاف انہوں نے اپنے فرزند ارجمند شاہ تراب علی قلندرؒ کی تعلیم وتربیت میں اُن خلافِ شرع' خلافِ سنت اعمال کی سختی سے مخالفت کی جس کو اُس عہد میں اور خانوادوں میں معیوب وقبیح نہیں سمجھا جاتا تھا۔''

بانی خانقاہ کاظمیہ کاکوری عارف باللہ حضرت شاہ محمد کاظم قلندرؒ (۱۱۵۸ھ-۱۲۲۱ھ) اور عارف حق حضرت شاہ علم اللہ رائے بریلوی میں ایک قدرِ مشترک یہ بھی ہے کہ حضرت رائے بریلویؒ نے فوج کی ملازمت اور تزک وحشم کو لات مارتے ہوئے فقر ودرویشی اختیار فرمائی اور حضرت کاکورویؒ نے بھی فوج کی ملازمت کو خیر باد کہتے ہوئے فقر ودرویشی کا راستہ اپنایا۔ عارفِ حق حضرت شاہ علم اللہؒ کا سنِ مبارک ترسٹھ سال اور عارف باللہ حضرت شاہ کاظم قلندرؒ کی عمر مبارک بھی ترسٹھ سال (اتباع سنت نبوی کا یہی تو فیض ہے۔)

حضرت مولانا علی میاں صاحب علیہ الرحمۃ والرضوان کے نسبی اور روحانی جانشیں حضرت مولانا محمد الرابع حسنیؒ راقم آثم پر خصوصی شفقت فرماتے۔ غالباً ۱۹۹۶ء کی بات ہے جب حضرت والا اور مولانا عبداللہ عباس ندویؒ میرے بہنوئی شرف ضمیر علوی مرحوم کے ''جامعہ کلیۃ البنات'' میں تشریف لائے۔ اس حقیر سے معانقہ فرمایا تو احقر نے عرض کیا:

"حب آل محمد براء ۃ من النار"

اس حدیث کی روشنی میں آپ حضرات سے محبت تو نجاتِ اخروی کی ضامن ہے۔ مولانا نے خفیف سے تبسم کے ساتھ فرمایا:

''میرے بھائی اپنا عمل بھی تو ہو۔''

یہ سن کر اس حقیر نے جواب دیا: ''آپ کی ذات گرامی تو علم و عمل کا ایسا حسین سنگم ہے جس کے بارے میں بیدم شاہ وارثی نے بہت خوب کہا ہے ؎

ہے یہ زُہد یہی حسن عمل
کوئی سرمایہ نہیں اُن کی محبت کے سوا

قرآن مجید میں بھی اہل اللہ سے محبت کو عین ایمان قرار دیا ہے۔ مذکورہ بالا جلسہ کو حضرت مرشد الامت، مولانا عبداللہ عباس ندویؒ اور محبّ مکرم مولانا عبدالعلی فاروقی نے خطاب فرمایا اور لڑکیوں کی مذہبی تعلیم کی افادیت پر سیر حاصل گفتگو فرمائی، بعد ازاں مولانا محمد الرابع علیہ الرحمۃ کی دعائے رقت آمیز پر جلسہ کا اختتام ہوا۔

۱۹۱۶ء میں کمترین اپنے بہنوئی جناب عثمان عبدالقادر علوی (جو حضرت کے عزیز بھانجے سید ابراہیم حسنی اور سید اویس حسنی کے

بہت پرانے رفیق تھے) کے ہم راہ اپنے بھانجے نورِ چشم سفیان عثمان علوی کے ولیمہ کا دعوت نامہ لے کر گیا، ہمیشہ کی طرح بہت شفقت فرمائی اور ہم دونوں کو ایک ایک جلد ''رہبر انسانیت'' کی عطا کی جس پر تحریر فرمایا۔

ایک موقع پر ندوۃ العلماء کی حاضری کے موقع پر اِس کمترین نے عرض کیا کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے کس قدر مشابہت ہوگئی ہے، اُس کے جواب میں انتہائی انکساری سے فرمایا: ''ظاہری مشابہت کوئی معنی نہیں رکھتی'' اس حقیر نے عرض کیا باطنی معاملات میں بھی آپ حضرت کا وہ عکس جمیل ہیں جسے صرف دیکھنے والی آنکھیں ہی دیکھ سکتی ہیں۔ دل شاہ جہاں پوری کا یہ شعر میں نے سنایا۔

رنگ لایا ہے یہ ضبط اُلفت گیسوئے دوست
آخر اپنے پیرہن سے پھوٹ نکلی بوئے دوست

بھلا یہ کب ممکن تھا کہ اُس وقت عارف حق شناس حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا سنایا ہوا یہ شعر نہ یاد آتا۔

از دل بڑوں کنم غمِ دنیا و آخرت
یا خانہ جا کے رخت بود یا سرائے دوست

ایک موقع پر علماء و مشائخ کی موجودگی میں راقم احقر نے عرض کیا کہ ہمارے ہاں تمام درسی کتب کے اختتام کے بعد مثنوی مولانا رومؒ کا درس ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کے درس میں مثنوی شریف کی جو جلدیں رہیں اُس پر حضرت مولانا اشرف علی تھانوی علیہ الرحمۃ کا حاشیہ تھا جس میں ہر جگہ حاشیہ کے اختتام پر حضرت نے تحریر فرمایا ''بامراداللہ تعالیٰ'' یہ ذو معنی فقرہ اِس حقیقت کا غماز۔

چونکہ کر دی ذات مرشد را قبول
ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسول

واضح ہو کہ حکیم الامت حضرت فاضل تھانویؒ حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے بیعت تھے۔ حضرت مرشد اُمت فنا فی الشیخ، فنا فی الرسول اور فنا فی اللہ کے منازل پر عارفانہ گفتگو فرماتے رہے۔

یہی تو فنائیت تامہ کی وہ منزل ہے جہاں حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں:

"لی مع اللّٰہ وقت لا یسعنی فیہ ملك مقرب ولا نبي مرسل" نیز ارشاد ہوا۔ "أبیت عندربی یطعمنی ویسقینی"

۲۰۱۰ء کی غالباً وہ ساعت تھی جب حضرت مولانا حمزہ حسنیؒ کی دعوت پر ندوۃ العلماء کے اجلاس میں شرکت کے لیے جلسہ سے کافی قبل حضرت مرشد امت کے کمرہ میں پہنچا، وہاں بہت سے علماء تشریف فرما تھے۔ مولانا نے اِس حقیر کا تعارف کراتے ہوئے دائرہ حضرت شاہ علم اللہؒ اور خانقاہ کاظمیہ کے روحانی ربط و فیض رسانیوں کا ذکر فرمایا۔ یہ حقیر سراپا تقصیر سر ہی نہ اُٹھا سکا کیوں کہ ''پدرم سلطان بود'' کا اسلام میں کوئی تصور ہی نہیں۔ اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کے سبب اُٹھنے کا ارادہ کیا تو حضرت نے فرمایا: ''آپ میرے ساتھ چلیں گے'' مولانا نور اللہ مرقدہٗ مولانا واضح رشید ندویؒ اور یہ حقیر کار میں سوار ہوئے اور ندوۃ العلماء کے وسیع و عریض ہال میں پہنچے۔ جب مولانا نے اپنے ساتھ بیٹھنے کو فرمایا تو اس حقیر نے عرض کیا۔

بگذار کہ بندۂ کمینم
تا در صف بندگان نشینم

یہ حقیر سامعین کی صف جناب سید حسن صاحب ایڈوکیٹ (جو اس حقیر سے محبت و الفت رکھتے ہیں) کے ساتھ بیٹھا۔ جلسہ کے اختتام کے بعد حقیر کے ایک کرم فرماں مولانا نور الحسن راشد صاحب مدظلہٗ تقریر کے بعد تشریف لائے، اس ناچیز سے معانقہ فرمایا، کمترین نے مولانا کو اپنی کچھ کتابیں پیش کیں بعد ازاں واپسی ہوئی۔

متعدد بار مسلم پرسنل لا بورڈ کے جلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ راقم کافی پہلے پہنچ جاتا اور مولانا کی دل نشیں اور ایمان افروز باتوں سے لطف اندوز ہوتا۔ دائرۂ شاہ علم اللہؒ اور خانقاہ کاظمیہ کے روابط پر گفتگو فرماتے اور اس سلسلۃ الذہب کے روحانی کمالات و فیوض و برکات کا ذکر فرماتے۔

حضرت خوکاجہ باقی باللہ نقشبندی فرماتے ہیں ؎

من حاصل ایں خطاب گویم
مضمون ابو ترابؑ گویم
خاک اند جماعتے کہ مردند
ہستی بہ خدائے خود سپردند
ایں سلسلہ از طلائے ناب است
ایں خانہ تمام آفتاب است

(طویل مثنوی کے چند اشعار)

مولانا علیہ الرحمۃ بہت کم گو تھے۔ دھیمی آواز میں گفتگو فرماتے لیکن باتیں اتنی دل نشیں ہوتیں کہ براہ راست قلب پر اثر کرتیں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے قلوب کو ماسویٰ اللہ سے یکسر کردے ؎

ہر تمنا دل سے رخصت ہوگئی
اب تو آجا اب تو خلوت ہوگئی

علم وفضل زہد وتقویٰ اور عرفانِ حق کا یہ پیکر جمیل (محمد الرابع علیہ الرحمہ) رجب المرجب، شعبان المعظم اور رمضان المبارک کے مبارک ومسحور مہینوں میں خصوصی طور پر ذکر الٰہی، عبادت، معبود حقیقی اور قرب وصول حق میں مشغول رہتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مشیت کے آگے راضی بہ رضا رہنا ہی عبودیت کی اصل اور بندگی کا معراج کمال ہے۔ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں بارگاہِ رب العزت میں آپ کی حاضری، فرشتوں نے "نم کنومة العروس" کہہ کر استقبال فرمایا ہوگا ؎

دموعی هجرکم لا تحقروها
فکم بحر جمعنا من سواق

عقیدۂ توحید کی اہمیت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

''عقیدۂ توحید کی بڑی اہمیت ہے، عقیدۂ توحید کتنے لوگوں میں صحیح ہے، عقیدۂ توحید صرف زبان سے کہنے کا نام نہیں بلکہ یہ عقیدہ ہو کہ خدا ایک ہے، وہی لائق عبادت اور مالک ومختار ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے آخری رسول ہیں اور اس بات کا یقین ہو کہ سب کچھ اللہ کر رہا ہے، جو کچھ ہو رہا ہے اس کے کرنے سے ہو رہا ہے اور جو کچھ ہوگا اس کے کرنے سے ہوگا، اس کی صفات میں کوئی شریک نہیں، لہٰذا ہمیں یہ عقیدہ رکھنا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کرتا ہے، آدمی اگر چمچے سے کھانا کھائے اور یہ سمجھے کہ یہ چمچہ کھلا رہا ہے، تو یہ اس کی حماقت ہے، ہمارا عقیدہ کمزور ہوگیا ہے، آج مسلمانوں پر جو مصیبتیں آرہی ہیں وہ ایسے ہی اتفاقاً نہیں ہیں، بلکہ ہم نے سب کچھ اپنی کوششوں کو اور اپنے ذرائع اور وسائل کو سمجھ رکھا ہے، عقیدہ کی بڑی اہمیت ہے، عقیدہ تو دراصل اعمال میں داخل ہونے کا دروازہ ہے، جب عقیدہ ہی درست نہ ہو جو دروازہ ہے تو اعمال کیسے درست ہوں گے ـــــــ ہمیں اس کی اصلاح کرنی ہے، اس کی اصلاح کے لیے آسمان سے فرشتے نہیں آئیں گے، اگر اکثریت خراب ہو اور اجتماعی طور پر بگاڑ ہو تو پھر مصیبت بھی اجتماعی ہوگی اور یہ مصیبتیں ڈاکٹروں اور حکیموں سے دور نہیں ہوں گی، بلکہ ان اعمال سے دور ہوں گی جن سے اللہ پاک خوش ہوتا ہے۔''

(ملفوظات مرشد الامت: ۷۶-۷۷)

حضرت مولاناؒ-قومی و مسلکی یکجہتی کی علامت

ڈاکٹر عبدالمجید پاریکھ
(صدر خدمت خلق سوسائٹی)

ایک دینی، قومی وملی شخصیت کا وصال ہوجانا صرف مسلمانان ہند کا ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کا ایک عظیم سانحہ ہے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے بیانات' کتب اور مواعظ دینی احساس کو مسلمانوں میں بیداری رکھنے میں بے انتہا کارآمد ثابت ہوئے، ان کے دینی ومعاشرتی اصلاح کے کام سے امت فیضیاب ہوئی اور ہوتی رہے گی، عالم اسلام کی تاریخ اس عظیم الشان اور تاریخ ساز شخصیت کو فراموش نہیں کرسکے گی، انہوں نے اپنی ساری عمر ہندوستانی مسلمانوں پر اپنی علمی' دینی' اصلاحی اور فلاحی نقوش کے گہرے اثرات چھوڑے، وہی نقوش مرحوم کے لیے ذخیرۂ آخرت ثابت ہوں گے، وہ بندۂ خدا اسلام کے ذکر کو بلند کرتے کرتے اس دنیا سے رخصت ہوگیا، اللہ سے دعا ہے کہ انہیں جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔آمین!

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ایک جلیل القدر عالم دین، عظیم مصلح امت اور جلیل القدر مبلغ دین متین تھے، مولانا کے اعلیٰ اخلاق کا اعتراف ہر مکتبہ فکر میں پایا جاتا ہے اور مولانا کو جو مقام ومنزلت حاصل تھی وہ تاریخ کا ایک نایاب حصہ ہے، حضرت مولانا کی خدمات کا دائرہ صرف علمی حلقوں تک محدود نہیں تھا، بلکہ مہاراشٹرا مراٹھواڑہ علاقہ میں ان کے غیر مسلموں کے درمیان سنہ ۲۰۰۹ء میں جو پروگرام ہوئے' میں ان کا عینی شاہد ہوتے ہوئے لکھ رہا ہوں کہ ان کے پیام انسانیت پر جو بیانات ہوئے، جن کو غیر مسلموں نے بے پناہ سراہا اور ان کے بیانات نے غیر مسلموں کے دلوں پر ایسا اثر چھوڑا کہ اسلام کے تعلق سے جو غلط فہمیاں انہوں نے اپنے ذہنوں میں پال رکھی تھیں وہ ختم ہوتی چلی گئیں، حضرت مولاناؒ کی تقاریر سے مراٹھواڑہ کے سیاسی اور سماجی حلقوں میں آپ کو زبردست قدر ومنزلت حاصل ہوئی، سماجی سطح پر نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ غیر مسلموں میں بھی یکساں مقبولیت حاصل ہوئی، ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کے لیے مراٹھواڑہ کے مشہور وکیل ایڈوکیٹ مجاہد خان نے ان اجلاس کو ایک کتاب میں تصاویر اور اخباروں کے کورتج کے ساتھ شائع کیا ہے، حضرت مولانا اور اجلاس میں دیگر مقررین کی تقاریر کو اس کتاب میں قلم بند کرتے ہوئے شائع کیا گیا جو الحمدللہ بے پناہ مقبول ہوئی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے عالم اسلام میں گراں قدر خدمات انجام دیں، تقویٰ اور پرہیزگاری ان کی ذات گرامی کا نمایاں وصف تھا، بلاشبہ اس وقت ملت اسلامیہ ایک عالم دین، بزرگ، محسن وہمدرد اور قومی ومسلکی یکجہتی کی علامت سے محروم ہوگئی، مولانا کی رحلت نے ملک وبیرون ملک کے لاکھوں محبت کرنے والوں کی آنکھوں کو نمناک کردیا ہے۔

مولانا مرحوم دین وملت کے لیے اپنی مخلصانہ خدمات اور ملک میں امن ومحبت کی فضا قائم کرنے کے لیے مسلسل سعی وجدوجہد کے لیے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے، وہ نہ صرف ایک زبردست عالم دین بلکہ ایک بہتر مصلح قوم بھی تھے، زندگی بھر ملت اسلامیہ کے اتحاد واتفاق کے لیے کوشاں رہے اور ان کا نہ صرف ملک کی بہت سی دینی وملی تنظیموں سے براہ راست تعلق رہا، بلکہ بین الاقوامی تنظیموں کے بھی وہ سربراہ رہے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ہمارے درمیان سے اٹھ گئے، مگر وہ اجالوں کی میراث دے گئے، ملت جو آج ایک الجھاؤ کا شکار بنی ہوئی ہے' اسے ایسے ہی علماء سے رہنمائی مل سکتی ہے۔

میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا

مولانا علاء الدین ندوی
(استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بھانجے، ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ، مسلم پرسنل لا بورڈ کے باوقار صدر، اندرون ملک اور بیرونی ممالک کے دسیوں اداروں اور تنظیموں کے سرپرست تھے، آپ کی زندگی کے تنوعات کو مختصر کیا جائے تو تین لفظوں میں سمیٹا جاسکتا ہے، اول: معلم ومربی اور اسلامی فکر کی ترویج اور ترجمانی کا کردار، دوم: ایک پالیسی میکر اور منصوبہ ساز جہاں دیدہ انسان اور ماہر تعلیم وتربیت کا کردار اور سوم: ایک منتظم ومدبر اور دین وملت کے قائد ورہنما کا کردار۔ مولانا نے براہ راست حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے علم ومعرفت، کتابی علم اور عملی برتاؤ، دونوں بیک وقت سیکھا بھی تھا اور اپنی زندگی میں اتارا بھی تھا۔

مولانا ادب عربی کا ذوق ہی نہیں رکھتے تھے، بلکہ اپنی محنت اور اہل فن سے کسب فیض کرکے اس میں ماہرانہ نظر اور تنقیدی صلاحیت بھی پیدا کرلی تھی، دراصل مولانا نے سالہا سال تک نامور عربی شعراء کے دواوین اور احمد حسن زیات کی ''تاریخ الادب العربی'' جو ندوہ میں نصاب کا حصہ رہی ہے' پڑھاتے رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کی گہری چھاپ حضرت ممدوح کی کتاب ''الادب العربی بین عرض ونقد'' میں نظر آتی ہے، میرے اظہار کی یہ جرأت کچھ لوگوں کو چبھے گی، مگر یہ ایک فطری امر ہے، آپ جب کسی صاحب طرز ادیب کو کثرت کے ساتھ پڑھتے ہیں تو لازماً اس کا رنگ آپ پر چڑھتا ہی ہے۔

مستقبل کا مؤرخ جب کبھی ہندوستانی مسلمانوں کی ملی قیادت کا تذکرہ کرے گا، تو حضرت مولانا سید محمد رابع صاحبؒ کی ذہانت وفراست پر مبنی حکمت عملی کی ستائش کیے بغیر آگے نہیں بڑھ پائے گا، جذبات سے پرے آپ کا سوچتا ہوا مثبت دماغ، مسلمانوں کے علمی' دینی' اخلاقی اور ملک کے تئیں اپنی ذمہ داریوں سے فرار کی وجہ سے کڑھتا ہوا دل اور برقت حکمت پر مبنی راست قیادت ہی کے نتیجہ میں امت مسلمہ ہندیہ کی ہچکولے کھاتی کشتی ساحل تک جا پہنچنے میں کامیاب رہی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اپنوں اور غیروں دونوں کے لیے رحمت باد باراں تھے، ان کا اسلوب خطیبانہ اور مزاج شاعرانہ تھا اور حضرت مولانا محمد رابع ندویؒ سادہ' سہل' واضح اور صاف ستھری زبان جو سہل ممتنع سے قریب تر ہوتی لکھتے تھے، یہ مولانا رابع صاحب کا رنگ تھا اور وہ مولانا علی میاں کا انداز واسلوب تھا، دونوں یک جاں دو قالب تھے، مگر اسلوب بیان اور کام کے طور طریقوں میں نہیں، بلکہ صرف فکر ونظر اور عقیدہ وعمل میں۔

۹۴ رسالہ زندگی کے مکمل ۷۵ رسال وفات سے دو چار مہینے پہلے تک مولانا پڑھتے پڑھاتے رہے، شہ زوروں اور صاحبان زادوں اور غرباء کی اولادوں کو یکساں طور پر نکھارتے رہے، دین ودعوت، ملک وملت کی خدمت کرتے رہے، علم وادب' ثقافت اور تحریر وتقریر کے ہنر کو پروان چڑھاتے رہے، اپنے ادارہ (ندوۃ العلماء اور اس کے دارالعلوم) کے لیے زندگی بھر منصوبہ بندی کرتے رہے، مسلم پرسنل لا بورڈ کو کئی دہائیوں تک سہارا دیے رہے اور اپنے ملک اور بیرونی ممالک کے سینکڑوں اداروں کی سرپرستی فرماتے رہے، کتنی صاف ستھری اور گناہوں سے پاک صاف تھی آپ کی زندگی!

ایک عظیم جغرافیہ داں

ڈاکٹر ابوسحبان روح القدس ندوی
(استاذ حدیث وعلوم حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء-لکھنؤ)

گو حضرۃ الاستاذ مولانا محمد رابع حسنی (۱۹۲۹-۲۰۲۳ء) ایک کامیاب معلم، مخلص مربی، عربی زبان وادب کے مایۂ ناز ادیب ومؤلف، اچھے سیاست داں، قرآن کریم اور سیرت نبوی کے عالم کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں، تاہم وہ ایک عظیم جغرافیہ داں تھے، ۱۹۶۲ء میں ان کی مشہور کتاب ''جغرافیہ جزیرۃ العرب'' منظر عام پر آئی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں داخل ہوئی، ایک مدت تک مولانا موصوف اپنی یہ کتاب عالم عربی کے نقشہ کی روشنی میں خود پڑھاتے تھے اور مقامات وشہر، پہاڑ، صحراء اور وادیوں کے جائے وقوع کی نشاندہی کرتے تھے، مولانا کا یہ پیریڈ (گھنٹہ) نہایت دلچسپ اور معلومات افزا ہوتا تھا، اگرچہ مولانا کی یہ کتاب اردو میں ہے لیکن اس کے باوجود توضیح وتشریح کی ضرورت پیش آتی تھی۔

ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں ''عرب کلچر'' کے نام سے ایک Subject پڑھایا جاتا ہے، اس مضمون کے لیے یہ کتاب بہت مفید ہے۔ صحیح معنوں میں قرآن، حدیث، سیرت اور ادب عربی کے مطالعہ میں جزیرۃ العرب کے جغرافیہ کی ضرورت جابجا پیش آتی ہے، اس ضرورت کو مولانا کی کتاب ''جغرافیہ جزیرۃ العرب'' بدرجہ اتم پورا کرتی ہے۔

''دراصل بات یہ ہے کہ انسان کا قاعدہ ہے کہ وہ جس شہر اور جس گھر میں رہتا ہے اس کے حالات، ماحول، جائے وقوع، اندرونی اور بیرونی نقشہ اور ساتھ بسنے والے انسانوں کے حالات وخصوصیات سے واقف ہونا چاہتا ہے، یہ انسان کی ایک فطری اور جائز خواہش ہے اور اس کی زندگی اور زندہ دلی کا ثبوت ہمارا سکونتی اور عارضی شہر اور گھر کوئی ہو، بحیثیت مسلمان کے ہمارا وسیع شہر اور گھر اسلامی دنیا اور اس میں بھی ہمارا دینی اور روحانی مرکز اور ہمارا عقیدہ اور ہماری اسلامی تہذیب کا گہوارہ اور وطن مالوف جزیرۃ العرب ہے، ایک مسلمان کا ذہنی اور طبعی تقاضا اور دینی واسلامی فریضہ ہے کہ وہ اپنے وسیع شہر اور گھر سے واقف ہو، اس میں بسنے والے انسانوں کے عادات واطوار، طریق ماندوبود، وہاں کی قدرتی صلاحیتوں، ان ممالک کی طبعی خصوصیات سے واقف ہو۔

مسلمان کہیں بھی رہے اس کو عالم اسلام اور اسلامی اقوام کے حالات سے بے گانہ اور بے نیاز ہوکر رہنا زیب نہیں دیتا، خاص کر جزیرۃ العرب کے جغرافیائی اور طبعی حالات سے واقف ہونا یوں بھی ضروری ہے کہ اسلام کی ساری ابتدائی تاریخ اور سیرت نبوی اس سرزمین، اس کے مقامات کے جغرافیہ، قبائل کے مرکز اور مکہ معظّمہ اور مدینہ منورہ، ان کے گردوپیش کے حالات سے بالکل ناآشنا ہوکر سیرت اور تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں، ان کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ چلتے چلتے کسی اندھیری سرنگ میں آگئے، بلکہ خود حدیث شریف سے پورا استفادہ اور بعض روایات کا پورے طور پر سمجھنا، واقعات کی خاص نوعیت واہمیت کا اندازہ لگانا بھی اس کے بغیر ممکن نہیں کہ آدمی عرب کے جغرافیہ اور مقامات کے جائے وقوع، ان کے آس پاس کے تعلق کا کم سے کم کوئی اجمالی تصور رکھتا ہو، خیبر کس سمت واقع ہے؟ تبوک مدینہ کے کس سمت میں ہے؟ مدینہ میں داخل ہونے والے کا استقبال کس گیٹ سے کیا جاسکتا ہے؟ جس میں کہا گیا ہے کہ ہم پر چودھویں رات کا چاند ثنیات الوداع کی جانب سے طلوع ہوا اور کیا یہ مکہ معظّمہ کی طرف سے آنے والے کے حسب حال ہے یا تبوک کی جانب سے؟

آداب طہارت میں "لا تستقبلوا القبلة ولا تستدبروها ولكن شرّقوا أوغرّبوا" کی اہل مدینہ کو ہدایت کس بنا پر تھی؟ "مَرُّ الظَّهران" جس کا احادیث اور حج کی روایات میں بار بار ذکر آتا ہے کون سا مقام ہے اور اب اس کا کون سا نام ہے اور حنین اوطاس کا اس سے کیا تعلق ہے؟ بدر واحد میں کیا فرق ہے اور مدینہ سے ان کے فاصلے کا کیا تناسب ہے؟ یہ اور اس قسم کے بیسیوں سوالات ہیں جن کے بارے میں صحیح روشنی مقامات مقدسہ اور حجاز کے جغرافیہ کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی اور ان ضروری مقامات کے بغیر سیرت وحدیث کا طالب علم ہمیشہ ایک طرح کی تاریکی اور ذہنی الجھن میں گرفتار اور بہت سی غلط فہمیوں کا شکار رہے گا۔

کتب حدیث وسیرت میں "حیرہ" کا کثرت سے ذکر آتا ہے، حیرہ کہاں واقع ہے اور اس شہر کی کیا تاریخ رہی ہے؟ صحیح بخاری کتاب البیوع اور کتاب الحج میں سوق عکاظ، مجنہ اور ذوالمجاز کا ذکر آتا ہے، یہ بازار کس شہر میں واقع ہیں اور ان میں سوق عکاظ کی عربوں کے نزدیک کیا اہمیت ہے اور کن تاریخوں میں یہ بازار لگتے تھے؟

غزوۂ بدر کے موقع پر انصار کو جب احساس ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا روئے سخن انصار کی طرف ہے تو سعد بن معاذؓ ایک انصاری صحابی اٹھے اور پرجوش تقریر کی اور کہا کہ:

"فواللّٰه لئن سرت حتى تبلغ برك الغماد لنسيرن معك"

سیرت کے طالب علم کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ برک الغماد کہاں واقع ہے اور عربوں کے نزدیک اس کا محل استعمال کیا ہے؟

غزوۂ بنی قریظہ کے موقع پر بنی حنیفہ کے سردار ثمامہ بن اُثال نے اسلام قبول کیا، وہ جب قریش سے ملے تو انہوں نے کہا کہ ثمامہ تم بددین ہوگئے؟ تو ثمامہ نے انہیں جو جواب دیا، اس میں یہ بھی تھا کہ

"لا والله مايأتيكم من اليمامة حنطة حبة، حتى يأذن فيها رسول الله ﷺ"

یمامہ کہاں واقع ہے اور اس جگہ کی کیا خصوصیات ہیں اور ثمامہ کا قریش سے یہ کہنا کہ بخدا تمہارے پاس یمامہ کے گیہوں کا ایک دانہ بھی اس وقت تک نہ پہنچے گا، جب تک رسول اللہ ﷺ کی منظوری نہ ہوگی، کس بنیاد پر تھا؟

حدیث وسیرت اور تاریخ اسلام سے قطع نظر ادب عربی کا طالب علم بھی اپنا علمی سفر کامیابی کے ساتھ طے نہیں کرسکتا، عرب کے شعراء کی بڑی تعداد اور چوٹی کے شعراء نجد کی سرزمین سے کیوں اٹھے اور غزل گوئی کا فروغ خاص طور پر وہیں کیوں ہوا؟ اجاو سلمیٰ کہاں واقع ہیں؟ تہامہ کس کس حصہ کو کہتے ہیں؟ اور اس کی رات اپنی خنکی اور خوشگواری میں کیوں ضرب المثل ہے؟ یہ اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جن کو حماسہ اور سبع معلقہ اور جاہلی دواوین کا پڑھنے والا نہ نظر انداز کرسکتا ہے اور نہ ان تلمیحات اور اشارات کا ذوق لے سکتا ہے جو شعرائے عرب کے کلام میں بار بار آئے ہیں۔

ان سب وجوہ وحقائق کی بنا پر یہ ضروری تھا کہ پڑھے لکھے اور صاف ستھرا ذوق رکھنے والے مسلمانوں کے لیے اور عام طور پر مدارس دینیہ کے طلبہ اور فضلاء کے لیے خاص طور پر عالم اسلام اور جزیرۃ العرب کے جغرافیہ پر ایک ایسی کتاب کی ضرورت تھی جو محض خشک اور جغرافیہ کی اصطلاحی کتاب نہ ہو، بلکہ اس میں سیرت وتاریخ اور عربی ادب اور اہل عرب کے کلام کو پیش نظر رکھا جائے اور اس میں قدیم وجدید مآخذ سے اور تازہ ترین تصنیفات سے بھی استفادہ کیا جائے۔"

(جزیرۃ العرب: ۹-۱۱)

اس ضرورت کو مولانا سید محمد رابع حسنی نے پورا کیا، اس کتاب کے دو ایڈیشن نکل چکے ہیں، پہلی بار ۱۹۶۲ء میں اور دوسری بار ۱۹۸۳ء میں اہم اضافوں اور ترمیمات کے بعد، یہ کتاب دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب میں داخل ہے، متعدد اہل نظر فضلاء نے اس کو وقت کی ایک ضرورت کی تکمیل اور مدارس عربیہ کے نصاب درس میں ایک محسوس ہونے والے خلا کو پر کرنے کی کوشش قرار دیا ہے، خاص طور پر مولانا عبدالماجد دریابادیؒ نے "صدق جدید" میں اور ماہر القادری نے "فاران" میں اس کتاب کی بڑی قدر افزائی کی۔

وہ آسماں تھا مگر سر جھکا کے رہتا تھا

ڈاکٹر ضیاء عبداللہ ندوی
(ڈائریکٹر دہلی پبلک اسکول- جدہ)

لقد سكبت من دمع عيني عبرة
وحق لعيني أن تفيض من الوجد
على محمد الرابع وارث ملة
تقى لباسه العلم والزهد والمجد

رمضان کے دوسرے عشرہ میں حضرت کی علالت کی خبر ملی، عزیزی جعفر مسعود حسنی ندوی سے فون پر بات ہوئی تو پتہ چلا کہ علاج کے لیے رائے بریلی سے لکھنؤ لے جایا گیا ہے، سب کے دلوں میں بے اطمینانی اور بے چینی تھی، ہم سب حضرت کی جلد صحت یابی کی دعا کر رہے تھے، پھر افاقے کی خبر ملی تو دل کو سکون ملا، لیکن قضا وقدر کا فیصلہ کچھ اور ہی تھا۔ اچانک ۱۳ر جون کو تقریباً دوپہر دو بجے (جدہ میں) میں یہ روح فرسا خبر ملی کہ حضرت اس دنیا میں نہیں رہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

ایک لمحہ کے لیے مجھ پر سکتہ طاری ہوگیا، کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا، لیکن موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ سمجھ میں آئے یا نہ آئے تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ یوں تو یہ خبر پورے عالم اسلام اور امت اسلامیہ کے لیے بہت غم ناک تھی، لیکن میرے لیے ناقابل برداشت صدمہ تھا، میرے والد کو اس دنیا سے رخصت ہوئے تقریباً سترہ سال ہو چکے ہیں، لیکن حضرت کے سایہ شفقت نے کبھی ان کی کمی محسوس ہونے نہیں دی اور حضرت کی وفات کے بعد مجھے احساس ہوا کہ آج میں سچ مچ یتیم ہوگیا۔ فرمان رسول ﷺ "إن للّٰه ما أخذ وله ما أعطى وكل شئ وعنده بأجل مسمى فلتصبر ولتحتسب" سے ڈھارس بندھی اور حوصلہ ملا۔ اللہ حضرت کو کروٹ کروٹ چین نصیب فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

حضرتؒ سے میرا تعلق ایسے ہی تھا جیسے ایک شفیق باپ کا اپنے بیٹے سے ہوتا ہے، دراصل میرے والدین جدہ میں مقیم تھے، جب میری عمر صرف سات سال تھی، میرے والدین نے مجھے جدہ سے ہزاروں میل دور حضرت کے سایہ عاطفت میں بھیج دیا تھا، یہ وہ عمر تھی جس میں والدین کے بغیر زندگی بہت مشکل ہوتی ہے، لیکن اللہ ہمارے حضرت کو غریق رحمت کرے، انہوں نے کبھی بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں اپنے والدین سے دور ہوں، انہوں نے ہر طرح سے میرا خیال رکھا، اگر کبھی کسی طرح کی تکلیف مجھے ہوتی تو وہ بے چین ہوجاتے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار جب میں بیمار پڑا تو حضرت خود اپنی گود میں اٹھا کر مجھے قریب کے ڈاکٹر کے پاس لے گئے اور میرا علاج کرایا، حضرت کی تربیت کا انداز بہت منفرد تھا، اگر کبھی میری کسی شرارت کا ان کو علم ہوجاتا تو ایسے حلیمانہ اور حکیمانہ اسلوب، نرم لہجہ اور بے پناہ محبت وخلوص کے ساتھ مجھے سمجھاتے کہ ان کی باتیں دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی جاتیں اور ہمیشہ کے لیے نقش ہوجاتی تھیں۔

حضرت مولاناؒ کی شخصیت بے مثال تھی، ان کی وفات ملت اسلامیہ کے لیے عظیم سانحہ ہے، اہل قلم ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالیں گے۔ ان کے علم وادب، فکر ونظر، دیانت، تفقہ، تدبیر وتدبر، علمی تبحر، صبر وتحمل پر تحقیقی مضامین ومقالات لکھے جائیں گے، لیکن میں اس وقت صرف اپنے ذاتی تجربات اور مشاہدات کی بنیاد پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی زندگی ایسی تھی جس میں

نہ دنیا کی طلب تھی نہ شہرت کی چاہ، بس ہر انسان سے محبت کرنا، سب کو برابر سمجھنا اور اپنے کو بڑا نہ سمجھنا، ضرورت مندوں کی مدد کرنا، اپنے مخالفین سے بھی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آنا اور ان کی ناگوار باتوں کو مسکرا نظر انداز کر دینا، یہ ایسی باتیں ہیں جو عوام تو کیا خواص میں بھی بہت خال خال ہی ملیں گی، میں بچپن سے ہی حضرت کے سایہ شفقت میں رہا، اس لیے میں نے بارہا ان چیزوں کا مشاہدہ کیا۔

مولانا کی پوری زندگی اخلاص وللّٰہیت سے عبارت تھی، وہ قرآن کی زبان میں ایک ربانی عالم تھے: ﴿وَلَـٰكِن كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ﴾ تواضع وانکساری میں اس حدیث شریف کے مصداق تھے: "من تواضع للّٰہ رفعه اللّٰہ" یہی وجہ ہے کہ مولانا علی میاںؒ کی زندگی میں ان کی شخصیت بالکل گمنام تھی، لیکن ان کی وفات کے بعد جب وہ مولانا علی میاں ندویؒ کے جانشین بنے، تب عوام الناس کو ہمارے حضرت مولاناؒ کی گوناگوں صفات اور خصوصیات کا اندازہ ہوا۔

کوئی لگا نہ سکا اس کے قد کا اندازہ
وہ آسماں تھا مگر سر جھکا کے رہتا تھا

مولانا کی ایک بڑی خصوصیت ان کی کم گوئی تھی، مولانا جب لب کھولتے تو کسی خیر خواہ کے لیے گویا وہ اس حدیث پر عمل کرتے تھے: "من كان يؤمن باللّٰه واليوم الآخر فليقل خيرا أو ليصمت" حلم وبردباری ایسی تھی کہ بڑے بڑے نازک مسائل اور پیچیدہ حالات کو اپنے ناخن تدبیر سے حل کر لیتے تھے، وہ اس معاملہ میں اشج عبد القیس کی طرح تھے، جن کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا تھا: "إن فيك لخصلتين يحبهما اللّٰه ورسوله: الحلم والأناة" یہ وہ صفات اور خصوصیات ہیں جن کو میں نے مولانا کی زندگی میں دیکھا اور محسوس کیا۔ اللہ ان کو غریق رحمت فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ ایسی فقید المثال شخصیتیں جب دنیا سے رخصت ہوتی ہیں تو شاعر کہتا ہے ؎

ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں روز وشب لیکن
غضب تو یہ ہے کہ اب آفتاب ٹوٹا ہے

مذہب ایک عظیم طاقت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

"مذہب ایک عظیم طاقت ہے، جو ایک طرف معتقدات وخیالات کو تشکیل دینے میں بڑا حصہ لیتی ہے اور دوسری طرف جماعت اور فرد کے اندر زندگی، ہمت اور حوصلہ بھی پیدا کرتی ہے اور بعض وقت اس سے ایسے عظیم کام انجام دلوا دیتی ہے جو دوسرے طریقوں سے انجام نہیں پا سکتے۔ مذہب کی تعلیمات میں ایسے عناصر ہوتے ہیں جو انسان کی جذباتی اور معنوی طاقت کو مضبوط سہارا دیتے ہیں اور حوصلہ کو زندگی بخشتے ہیں اور بعض بعض وقت اتنی بڑی قربانیوں پر آمادہ کرتے ہیں جن کا تصور آسان نہیں ہوتا۔

انسانی تاریخ میں مذہب کی مضبوط اثر اندازی کی بے شمار مثالیں گذری ہیں، بلکہ صحیح یہ ہے کہ یورپ کے جدید ملحدانہ اور باغیانہ فلسفوں کی کامیابی سے پہلے، مذہب کے سہارے کے بغیر دنیا میں کہیں نہ سیاست کامیاب ہوتی تھی اور نہ حکومت اور نہ کوئی اجتماعی کام انجام پاتا تھا اور نہ کوئی تربیتی یا اصلاحی جدوجہد، حتی کہ حکمرانوں کو اپنے اقتدار کی بقا کے لیے مذہب کی تائید وتعاون کا سہارا لینا پڑتا تھا۔"

(سماج کی تعلیم وتربیت: ۴۰-۴۱)

ایک معتدل مزاج اور جامع شخصیت

ڈاکٹر محمد اکرم ندوی
(اسلامک سینٹر آکسفورڈ-لندن)

میرا داخلہ ندوہ میں سنہ ۱۹۷۸ء میں ہوا تھا، اس وقت بھی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا شمار چوٹی کے اساتذہ میں ہوتا تھا، اس وقت سے لے کر آج کی تاریخ تک چار دہائیوں سے زیادہ عرصہ گذر چکا ہے، اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اس طویل مدت میں آپ کی شخصیت کا کتنا ارتقا ہوا ہوگا؟! علم وفکر، تعلیم وتدریس، انتظام وانصرام اور قیادت ورہنمائی کے حوالے سے آپ نے کیا کچھ سیکھا اور سکھایا ہوگا؟! آپ ہمیشہ سے ندوہ کے انتظامی معاملات میں بھی دخیل رہے ہیں، لیکن طلبہ آپ سے درس لینے کے متمنی رہا کرتے تھے، آپ کے درس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ آپ کتاب حل کرانے کے بجائے فن کی تفہیم پر توجہ دیا کرتے تھے۔

مولانا علیہ الرحمہ کی شخصیت کا ایک اور نمایاں وصف اعتدال، توسط اور جامعیت ہے، اس سلسلہ میں مولانا ندوہ کے اعلان شدہ موقف کا ایک جیتا جاگتا نمونہ تھے، اسی وجہ سے امت کے تمام مکاتب فکر کا مولانا کی شخصیت پر اعتماد قائم رہا اور ندوۃ العلماء کے علاوہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور دیگر ملی اداروں کی قیادت وسربراہی بھی آپ کے حصہ میں آئی، ایک مرتبہ میں نے مولانا علیہ الرحمہ سے پوچھا بھی کہ ندوہ کا جو مسلک ہے وہ اعتدال، جامعیت اور توسط کا مسلک ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ اس کو ماننے اور اپنانے والے کم ہیں اور افراط وتفریط والے لوگ ہی زیادہ ہیں، مولانا نے اس کے جواب میں بہت اہم نکتہ کی طرف اشارہ کیا، فرمایا کہ

''افراط وتفریط پر مبنی موقف اپنانا آسان ہے، کیونکہ اس میں انسان کسی ایک طرف ہوجاتا ہے، جب کہ اعتدال اور توسط والے موقف پر قائم رہنا مشکل ہوجاتا ہے، اس میں ہر وقت یہ خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کسی بھی معاملہ میں نہ افراط ہو اور نہ تفریط، یہ ایک مشکل راستہ ہے، اسی لیے اسے اپنانے اور اس پر چلنے والے ہمیشہ کم ہوتے ہیں۔''

مولانا علیہ الرحمہ کا ایک اور امتیازی وصف ان کی دور اندیشی اور حکمت ہے، وہ کوئی فیصلہ کرتے وقت یا رائے دیتے وقت بہت غور وخوض اور فکر وتدبر سے کام لیتے تھے، اسی وجہ سے شاذ ونادر ہی انہیں اپنے کسی فیصلہ پر پشیمان ہونا پڑا ہوگا، بادی النظر میں یا عام لوگوں کو بسا اوقات ان کے فیصلے سمجھ میں نہیں آتے تھے، لیکن کچھ وقت گذرنے کے بعد وہی فیصلے درست ثابت ہوتے تھے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اجتماعی حقائق پر خاص زور دیتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ جس طرح ہم طبعی حقائق کو مانتے ہیں اور ان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں مثلاً: ہم اپنے گھر کے باہر جب راستہ نکالتے ہیں تو دیوار میں راستہ نہیں نکالتے، بلکہ اس کی جو جگہ ہے وہاں راستہ نکالتے ہیں، یا ہم آگ، ہوا اور پانی کی طبعی تاثیر کو قبول کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ ٹھیک اسی طرح ہمیں اجتماعی حقائق کو بھی تسلیم کرنا چاہیے اور اپنا ذہن آفاقی بنانا چاہیے، حضرت مولاناؒ کی یہی وہ فکر تھی جس کو انہوں نے تاعمر اپنے شاگردوں میں منتقل کیا اور اس موضوع پر کتابیں بھی تصنیف کیں، بالخصوص ہمارے زمانہ طالب علمی میں ان کا ایک گھنٹہ ''علم الاجتماع'' ہی سے متعلق تھا، انہوں نے ہمارے سامنے بڑے وقیع محاضرے دیے، جن کو بعد میں ''سماج کی تعلیم وتربیت'' کے عنوان سے اردو زبان میں شائع کیا گیا اور مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں نے اس کتاب کو عربی زبان میں ''التعلیم

والتربیۃ" کے نام سے ترجمہ کیا جو دارالقلم سے شائع ہوئی ہے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ جب اجتماعی حقائق کی تشریح فرماتے تھے تو ایسا لگتا تھا کہ کم از کم برصغیر ہندو پاک ابھی اس وسعت فکری سے بہت دور ہے، کیونکہ مسلمانوں کا یہ مزاج بن چکا ہے کہ ان کا ذہن مناظراتی ہے اور انہیں اپنی ہی نیکی نیکی معلوم ہوتی ہے، اپنا ہی علم علم معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ دوسروں کی نافعیت یا ان کے علم وفضل کا اعتراف ان کے لیے مشکل ہے۔ لیکن حضرت مولانا کی خوبی یہ تھی کہ وہ اجتماعی حقائق کو کھل کر قبول کرتے تھے، جس کے مظاہر میں تمام تنظیمیں، ادارے، اکیڈمیاں، مدارس اور جامعات وغیرہ ہیں، حضرت مولاناؒ کا کہنا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی جگہ پر اہمیت مسلم ہے اور ان میں سے ہر ایک کا اپنا ایک وجود ہے، جس کا ہم انکار نہیں کر سکتے مثلاً: دارالعلوم دیوبند یا مظاہر علوم سہارن پور ہے، یا تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی ہند ہے، اسی طرح دار المصنفین اعظم گڑھ یا اور بہت سے علمی، تحقیقی ودعوتی مسلمانوں کے اہم ادارے ہیں اور ان کی ایک فکر ہے اور بہت سی نمایاں خوبیاں ہیں۔ مولانا کا ماننا تھا کہ ہمیں ان کے وجود کو تسلیم کرنا چاہیے، ان کی خوبیوں کو لینا چاہیے اور اگر ان کے اندر کچھ خامیاں ہیں تو ان سے گریز کرنا چاہیے لیکن ان خامیوں کی بنیاد پر ہمارے لیے یہ مناسب نہیں کہ ہم ان کی اہمیت کو سرے سے تسلیم ہی نہ کریں اور اس کی بنیاد پر نفرت کا ماحول بنالیں۔ سچی بات یہی ہے کہ مولانا کا یہ وہ انقلابی طرز فکر تھا جس کو نہ سمجھنے سے نہ جانے کتنے فرقے وجود میں آگئے۔

یہ بہت اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی کی علامت ہے کہ حضرت مولانا رابع صاحبؒ ندوہ کے ذمہ دار تھے اور مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے بھانجے تھے، جو خود اپنی ذات میں ایک دبستان فکر تھے، لیکن اس کے باوجود جب حضرت مولانا رابع صاحبؒ ہمیں پڑھاتے تو دوران درس وہ تمام اسلامی مفکرین کا کھلے دل سے تذکرہ کرتے، ان کی خوبیوں کو بیان کرتے اور ان کی خامیوں پر نشاندہی کرتے، مگر زبان کی مکمل احتیاط اور پورے احترام کے ساتھ! کیونکہ مولانا کا ماننا تھا کہ بعض خامیوں کی بنا پر کسی کی تقلیل شان کرنا مناسب عمل نہیں ہے، اس کی وجہ سے آپسی کشمکش پیدا ہوتی ہے۔

حضرت مولاناؒ کی یہی وہ فکر تھی جس کو انہوں نے تا عمر فروغ دیا، وہ جب بھی آکسفورڈ تشریف لاتے تو اکثر یہی کہتے کہ آپ یورپ کے حقائق کا مطالعہ کیجیے، یہاں کے صالح اجتماعی حقائق سے فائدہ اٹھایئے اور ان کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش کیجیے، البتہ جو خامیاں ہیں ان سے بچیے اور ان سے دور رہنے کی کوشش کریے۔

میرے نزدیک حضرت مولانا کی یہ فکر ان کی ایک اہم علمی میراث ہے، جسے موجودہ دور میں ہم کو بہت زیادہ سمجھنے اور اس کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ مولانا کے افکار ونظریات کو عام فرمائے، ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات کو بلند کرے اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی ہمیں توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

اصول ومزاج سمجھنے کی ضرورت

"تعلیم، نظام تعلیم، نظریاتِ تعلیم کی معاشرہ کی تربیت وتشکیل میں بڑی اہمیت ہے، اس سلسلہ میں معاشرہ کے مزاج اور طبقات کے لحاظ سے تعلیم کی تفصیل کو اور اس سلسلہ میں سابق اہل علم کے تجربات وخیالات ومعلومات کو جاننے کی ضرورت ہوتی ہے، تعلیم کے سلسلہ میں ہم کو اولاً باضابطہ تعلیم یعنی مدرسہ کے کام اور مقام اور اس کے اجزائے ترکیبی یعنی طلبہ اور مواد تعلیم نیز نظریاتِ تعلیم کے جاننے کی ضرورت ہے اور معاشرہ کے سلسلہ میں یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ گھریلو زندگی کا تعلیمی کام کے سلسلہ میں کیا درجہ ومقام ہے؟ پھر مذہبی ذرائع کا تعلیمی لحاظ سے کیا اثر ہوتا اور ہوسکتا ہے؟" (سماج کی تعلیم وتربیت: ۲۶)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

لا مجھ کو دکھان کی طرح کوئی اگر ہے

ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی
(مرکز جماعت اسلامی ہند)

استاذ گرامی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی وفات کی خبر کیا ملی کہ دل کی دنیا ویران ہوگئی۔ یوں تو ان کی طبیعت کافی دنوں سے خراب تھی، اتار چڑھاؤ رہتا تھا، نقاہت برابر بڑھتی جارہی تھی، لیکن چند ایام قبل جب اپنے وطن رائے بریلی میں تھے، اچانک طبیعت زیادہ بگڑ گئی، وہاں سے لکھنؤ لائے گئے، شفایابی کی تمام انسانی تدابیر جاری تھی کہ وقتِ موعود آپہنچا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

23/نومبر 2022ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں مجلس تحقیقات شرعیہ کا سمینار تھا- اس میں مجھے بھی شرکت کا موقع ملا تھا- افتتاحی اجلاس کی صدارت مولانا کو کرنی تھی، ان کا انتظار ہوتا رہا، لیکن طبیعت کی خرابی کی وجہ سے تشریف نہ لاسکے، بالآخر مولانا بلال حسنی نے ان کا تحریر کردہ صدارتی خطبہ پڑھا، اجلاس ختم ہونے کے بعد میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، مزاج پُرسی کی اور دعائیں لیں، یہ مولانا سے میری آخری ملاقات تھی۔

مولانا رابع صاحب کی وفات ملت اسلامیہ کا بہت بڑا خسارہ ہے، ان کی شخصیت نہ صرف ہندوستان، نہ صرف عالم اسلام، بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کا مرجع تھی، تمام طبقات اور مسالک ومشارب کے مسلمان ان پر اعتماد کرتے اور انہیں اپنا رہبر ورہ نما تسلیم کرتے تھے، ندوہ میں انھوں نے طویل عرصہ تدریس کی خدمت انجام دی، پھر متعدد انتظامی مناصب بھی سنبھالے، آخر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد وہاں کے ناظم بنائے گئے، اسی طرح قاضی مجاہدالاسلام قاسمی کی وفات کے بعد مسلمانان ہند کے مؤقر ترین ادارہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت بھی انہیں تفویض کی گئی، اپنی پیرانہ سالی اور طبیعت کی ناسازی کے باوجود وہ یہ دونوں ذمہ داریاں زندگی کی آخری سانس تک بہ خوبی انجام دیتے رہے، اللہ تعالیٰ ان کی خدمات کو قبول فرمائے، ان کو اجر سے نوازے، انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

مولانا کی وفات کا غم شدید ہے، اس کا اندازہ دنیا کے کونہ کونہ سے موصول ہونے والے تعزیتی پیغامات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے، مجھے فخر ہے کہ میں بھی مولانا کے ہزاروں شاگردوں میں سے ایک ہوں اور میں نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے، اس بنا پر ان کی وفات ذاتی طور پر میرے لیے بھی بڑا صدمہ ہے، مولانا سے اپنے قریبی تعلقات کا کچھ تذکرہ کرلوں تو شاید کچھ سکون حاصل ہو۔

ندوہ میں میرا داخلہ 1975ء میں ہوا اور میں نے وہاں آٹھ برس گزارے، ابتدا میں دور سے انہیں دیکھا کرتا تھا، پھر وہ وقت بھی آیا جب کلاس میں ان سے پڑھنے کا موقع ملا، ان کے ذمہ عربی ادب کا گھنٹہ تھا اور وہ اپنی کتاب ''الادب العربی بین عرض ونقد'' کی روشنی میں درس دیا کرتے تھے، مولانا کی فنی مہارت کے ساتھ تواضع، سنجیدگی، شرافت اور طلبہ سے محبت وشفقت کا نقش اسی زمانے میں دل پر قائم ہوگیا تھا، جو ندوہ سے فراغت کے بعد اور بھی گہرا ہوتا گیا، اب یاد کیا تو دوران طالب علمی کے کچھ واقعات ذہن کے پردے پر ابھر آئے ہیں اور تقاضا کررہے ہیں کہ ان کا اظہار کروں:

میرے والد مرحوم ندوہ میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے آتے رہتے تھے اور میری تعلیمی پیش رفت کا قریب سے معاینہ کرتے تھے، انہیں دمہ کا مزمن مرض تھا، کھانسی دورہ کی شکل اختیار کرلیتی تھی، ایک مرتبہ فجر کی نماز میں شاید انہیں زیادہ کھانسی آگئی، ندوہ کے ایک جلالی

استاد نے انہیں کچھ سخت سست کہہ دیا، والد ماجد نے تو وہیں کھڑے کھڑے اپنی دیہاتی زبان میں بدلہ لے لیا لیکن مجھ سے برداشت نہ ہوا، میں نے مولانا کی خدمت میں حاضر ہوکر شکایت کی، انھوں نے میری شکایت بہت توجہ سے سنی، استاد مذکور کے نامناسب رویہ پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ اپنے والد صاحب سے کہیے: ''میں اس پر ان سے معافی مانگتا ہوں۔''

ہر برس فضیلت کے آخری سال کے طلبہ کو الوداعیہ دیا جاتا تھا، اس کا انتظام فضلیت اول کے طلبہ کرتے تھے، بھائی عبدالحی ان دنوں عربی مجلّہ ''البعث الاسلامی'' سے وابستہ تھے، اس لیے ندوہ پریس کے عملہ سے ان کے تعلقات تھے، ہم نے سوچا کہ اساتذہ کی خدمت میں دعوت نامہ چھپوا کر پیش کیا جائے، چنانچہ اچھے کاغذ پر چھپوا کر اسے تقسیم کیا گیا، تھوڑی دیر میں ہرکارہ نے آکر خبر دی کہ مولانا رابع صاحب نے بلایا ہے، ہاتھ پیر پھول گئے کہ پتہ نہیں کون سی خطا سرزد ہوگئی ہے، ڈرتے ڈرتے حاضری دی، دیکھتے ہی مولانا نے فرمایا کہ آپ لوگوں نے دعوت نامہ چھپوایا ہے- یہ فضول خرچی ہے- ندوہ پریس سے یہ مفت چھپوایا گیا ہے تو بھی غلط ہے اور اس کی اجرت ادا کی گئی ہے تو بھی غلط ہے۔ مولانا کا پڑھایا ہوا یہ سبق ذہن پر اس طرح نقش ہوا کہ آج تک رف کاغذات پر مقالات لکھنے کی عادت بنی ہوئی ہے۔

ایک برس بعد ہم فضیلت دوم میں پہنچ گئے اور ہمارے الوداعیہ کا موقع آگیا، میں نے سوچا کہ الوداعی تاثرات پیش کرنے میں کوئی جدت اختیار کرنی چاہیے، ذہن نے سُجھایا کہ عربی میں منظوم تاثرات پیش کیے جائیں، چنانچہ کچھ تک بندی کی، لیکن اطمینان نہیں ہوا، سوچا کسی استاد سے اصلاح لے لوں، آج سوچتا ہوں تو اپنی جسارت پر ہنسی آتی ہے کہ اپنا لکھا ہوا قصیدہ لے کر مولانا کے پاس پہنچ گیا، انھوں نے کمال شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی جابجا اصلاح کی، پھر تو خود اعتمادی عروج پر پہنچ گئی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی صدارت میں الوداعی پروگرام منعقد ہوا، میری زبان میں لکنت تھی، اس لیے میرا قصیدہ بھائی آفتاب عالم نے پیش کیا، اسے بہت پسند کیا گیا، مولانا علی میاں کے چہرے پر بھی بشاشت آگئی، جسے دیکھ کر میرا دل خوشی سے بلّیوں اچھلنے لگا، بعد میں ندوہ کے استاد مولانا محبوب الرحمٰن ازہریؒ نے اس قصیدہ کو مجھ سے لے کر اپنے دوست جناب ابو محفوظ کریم معصومی (کلکتہ) کے پاس بھیج دیا، جو عربی زبان کے بہت بڑے ادیب اور شاعر تھے، انھوں نے اس کی ہیئت ہی بدل دی، لیکن یہ میرے ہی نام سے ندوہ کے عربی جریدہ پندرہ روزہ ''الرائد'' میں 'ضریبة الحب' کے عنوان سے طبع ہوا۔

ندوہ سے فراغت کے بعد رابطہ ادب اسلامی کے متعدد سمیناروں میں شرکت کا موقع ملا، وہاں مولانا سے ضرور ملاقات ہوتی، میں کچھ لکھنے لگا تھا اور میری کتابیں شائع ہونے لگی تھیں، انہیں مولانا کی خدمت میں پیش کرتا تو بہت خوشی کا اظہار کرتے اور دعائیں دیتے، ایک موقع کی خوش گوار ملاقات اب تک یاد ہے، مولانا محمد تقی الدین ندوی حفظہ اللہ کے مدرسہ جامعہ اسلامیہ اعظم گڑھ میں ایک سمینار تھا، افتتاحی اجلاس کے بعد مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، استاد محترم مولانا واضح رشید ندوی بھی موجود تھے، مولانا رابع صاحب نے فرمایا: ''رضی الاسلام تو اپنے آدمی تھے۔'' مولانا واضح صاحب نے معمولی ترمیم کے ساتھ جملہ دہرایا: ''رضی الاسلام اپنے آدمی ہیں۔'' کافی عرصہ گزر جانے کے باوجود ان جملوں کی لذت اب بھی محسوس ہوتی ہے۔

ادارہ تحقیق وتصنیف اسلامی علی گڑھ سے میری وابستگی 1994 میں ہوگئی تھی، اس کا ترجمان سہ ماہی ''تحقیقات اسلامی'' مولانا کی خدمت میں بھیجا جاتا، ملاقات پر وہ اس کا تذکرہ ضرور کرتے اور اس میں شائع ہونے والے میرے مضامین کی ستائش کرتے، 2006ء میں اس کی اشاعت کو 25/ برس مکمل ہوئے تو مدیر مجلّہ اور سکریٹری ادارہ مولانا سید جلال الدین عمریؒ کے مشورے سے یہ پروگرام بنایا گیا کہ ملک و بیرون ملک کے معروف اہل علم سے مجلّہ کے بارے میں تاثرات حاصل کیے جائیں، مولانا کی خدمت میں بھی خط بھیجا گیا، انہوں نے ازراہِ نوازش اپنے قیمتی تاثرات ارسال فرمائے، جو خصوصی شمارے میں شامل کیے گئے۔

مرشد الامت — اکیسویں صدی کی عبقری شخصیت

مولانا اسماعیل بھولاندوی
(رکن مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

یہ گنہگار ایک تاجر گھرانہ سے تعلق رکھتا ہے اور اس کا خاندانی پس منظر Engineering Department سے ہے، میں خود تجارت کی دنیا میں ایک Industrialist ہوں، اس وقت دنیوی لحاظ سے جو بڑے بڑے Manufacturing plants ہیں مثلاً: (IGL) یعنی Indraprastha Gas Limited، یا Central U.P. Gas Limited، یا پھر اسی طرح Green Gas Limted اور Atomic Energy وغیرہ۔ غرض ان سبھی سے میرا تاجرانہ تعلق ہے اور میں اسی سلسلہ میں ملک در ملک (Europe، America اور Britain وغیرہ) کا مسلسل سفر بھی کرتا رہتا ہوں۔

لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہمارے خاندان میں علماء وصالحین سے ہمیشہ تعلق رہا ہے، بالخصوص میرے جد بزرگوار اور عم محترم کو اہل اللہ سے بہت تعلق تھا، اسی لیے ہمارا خاندان دار العلوم دیوبند، مظاہر علوم سہارنپور اور تبلیغی جماعت کے اہم لوگوں سے ہمیشہ قریب رہا ہے اور اس لائن سے بھی ہمارے پاس وسیع تجربات ومشاہدات موجود ہیں، لیکن میں اپنے ان تاثرات ومشاہدات کو بیان کرنے میں ہمیشہ محتاط رہتا ہوں یا خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے اپنے فضل سے مجھے مال ودولت سے خوب نوازا تھا، اسی لیے میں انتہائی آزاد خیال قسم کا آدمی تھا اور کبھی بھی جلدی کسی بزرگ یا شخصیت سے Impress نہیں ہوتا تھا۔

لیکن میری مادی زندگی میں تبدیلی کا آغاز اس وقت سے ہوا جب میں World University دار العلوم ندوۃ العلماء میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے آیا اور میں نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ملاقات کی اور ان کو قریب سے دیکھا، مگر تاجرانہ پس منظر اور طالب علمانہ عمر نے اس زمانہ میں بہت زیادہ سیکھنے کے مواقع نہ دیے، تاہم میری زندگی میں زبردست انقلاب اور Turning Point اس وقت آیا جب میں رشتہ ازدواج سے منسلک ہوگیا اور اس کے بعد مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوکر بیعت ہوا۔

میں نے دنیا بھر کی سیر وسیاحت کرنے کے بعد بیعت کے لیے جس دل آویز شخصیت کا انتخاب کیا تھا، بلاشبہ وہ میرے ہی لیے نہیں بلکہ پوری امت کے لیے ایک Role model تھی اور ان کی ذات دین ودنیا کا ایک حسین سنگم تھی۔ دراصل میں بیعت سے پہلے حضرت مرشد الامت کی مشہور کتاب ''دو مہینے امریکہ میں'' حرفاً حرفاً مطالعہ کر چکا تھا، جس کے بعد مجھے بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ وہ ہستی ہے جو دنیا سے بھی اچھی طرح باخبر ہے، یہ وہ ہیں جو دنیا کو بخوبی سمجھتے ہیں اور بہت خوش اسلوبی کے ساتھ مشورے دیتے ہیں، اسی کے ساتھ ان کا ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ لوگ دنیا اور اس کی زرق برق یا چمک دمک سے کبھی Impress نہیں ہوتے اور ان کی یہی وہ خوبی ہے جس کی بنیاد پر ہم ان سے Impress ہوتے ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا شکر ادا کیا جائے کم ہے، اس گنہگار پر خدا کا اتنا بڑا فضل رہا کہ مجھے حضرت مرشد الامت کو بے حد قریب سے دیکھنے کا موقع حاصل ہوا، ان کی بے شمار نجی مجلسوں اور اسفار میں بھی شرکت کی توفیق ملی، میں نے ان کی خلوت وجلوت کو خوب دیکھا

اورامت کے لیے ان کی تڑپ کا ہمہ وقت مشاہدہ کیا اوران کی آہ سحر گاہی، گریہ وزاری سے بھی میں بہت زیادہ متاثر ہوا، اسی لیے جب کبھی تنہائی میں مجھے ان کی یاد ستاتی ہے تو بعض مرتبہ میں بہت جذباتی ہوجاتا ہوں اوراپنے اوپر کنٹرول نہیں رکھ پاتا۔

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع ندویؒ کی ذات گرامی تمام علمائے دین اور دانشوران ملت کے لیے Role model تھی، ان کی علمی، فکری، دعوتی اور روحانی خدمات پوری ایک صدی پر محیط ہیں، انہوں نے حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی آہ وزاری کو دیکھا تھا، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی سسکیوں کو سنا تھا، حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کی تڑپ کا مشاہدہ کیا تھا اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تربیت میں وہ رہے تھے، ان تمام باتوں نے ان کی شخصیت میں ایک جاذبیت پیدا کردی تھی، یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی ظاہر وباطن میں یکساں تھی اور وہ گھر کے اندر بھی شریعت پر اسی طرح عمل پیرا تھے، جس طرح گھر کے باہر شریعت کا لحاظ کرنے والے اوراس کا پیغام دینے والے تھے، یہ بات میں ایک طالب یا مرید ہونے کی حیثیت سے ان کی خدمت میں حاضری کے بعد نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ اگر میں ان کے پاس ایک جاسوس بن کر بھی جاتا تب بھی میں پورے ایمان ویقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انہیں اتنے ہی اعلیٰ درجہ کا دین دار اور امانت دار پاتا، اللہ کے سامنے روتا ہوا پاتا اوران کی خلوت وجلوت میں یکسانیت محسوس کرتا۔ میں یہ گواہی اس لیے بھی دے سکتا ہوں کہ ایک طویل عرصہ تک مجھے ان کی صحبت کا شرف حاصل ہوا، مگر پوری مدت میں نے کبھی آپ کو اپنی زبان مبارک سے ایک حرف زائد بولتے نہیں سنا، کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے آپ کو شریعت کے ایک ایک جز پر عمل کرتے نہ دیکھا ہو اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ میں نے آپ کو حضور ﷺ کی چھوٹی چھوٹی مبارک سنتوں کا اہتمام کرتے نہ دیکھا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو حضرت مرشد الامت کی شخصیت کو پہچاننے اوران سے قریب رہنے کا موقع عنایت کیا، وہ اس بات کی گواہی دیں گے کہ ان کی ذات حقیقی معنی میں مرشد الامت تھی، ان کی مکمل عمر امت کی رہنمائی کرنے میں گذری، ان کے قلم سے متعدد علمی اور ادبی نمونے نکلے، جن کی اہمیت وافادیت کو پوری دنیا نے تسلیم کیا، لیکن ان سب کاوشوں کا مرکزی موضوع یہی تھا کہ پوری انسانیت اسلام کے پیغام سے واقف ہو اور اللہ کا کلمہ بلند ہو۔ ندوۃ العلماء، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، رابطہ ادب اسلامی، اسلامک سینٹر لندن یا اس کے علاوہ جتنے بھی وہ مؤقر platforms ہیں جن کے آپ روح رواں تھے، ان تمام کے ذریعہ آپ نے بنیادی طور پر امت کو بیدار کرنے اوراس کی صحیح رہنمائی کرنے کا فریضہ انجام دیا۔

حضرت مرشد الامت کے خطابات اوران کی مجلسیں بھی اسی بات کی گواہ ہیں کہ ان کا ہر ہر لفظ امت کی رہنمائی کے لیے ہوتا تھا، امت کی محبت اوراس کی تڑپ میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا۔ ان کی خدمت میں ہر طبقہ کے لوگ حاضر ہوتے تھے، لیکن سب کے لیے ان کا ایک ہی پیغام ہوتا تھا، وہ ہر آنے والے کو دین کی طرف توجہ دلاتے تھے۔

جن لوگوں کو ان سے خاص قربت کا شرف حاصل تھا، ان کے ساتھ مرشد الامت کی سختی بھی زیادہ تھی، وہ ان کی ہر ہر بات پر نگاہ رکھتے، چھوٹی چھوٹی باتوں کی بھی اصلاح فرماتے اور ایسی تربیت فرماتے کہ ان کے دل سے دنیا کا خیال نکل جائے، ہر طرح کا میل دھل جائے اوران کا نفس ایک دم کچل جائے۔ بعض اوقات ان کے مربیانہ ومشفقانہ انداز سے یہ بات بھی سامنے آئی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی بلند روحانی مقام اور مؤمنانہ فراست عطا فرمائی تھی، جس کے نتیجہ میں انہیں اپنے مرید کے متعلق کسی بات پر فوراً کشف ہوجاتا تھا اور پھر وہ بہت بھلے طریقہ سے تربیت کرتے تھے۔

درج ذیل سطور میں افادۂ عام کی غرض سے بعض وہ واقعات نذر قارئین ہیں جو خود مجھ ہی سے متعلق ہیں، ان سے اندازہ ہوگا کہ آپ واقعی مرشد الامت تھے اور ہر ایک پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔

ایک مرتبہ راقم الحروف ممبئی سے لکھنؤ بذریعہ ہوائی جہاز آیا اور Business Class کے ٹکٹ سے آیا، ندوہ آکر حضرت کی

خدمت اقدس میں حاضر ہوا، آپ نے چہرہ دیکھتے ہی فوراً فرمایا:

''ماشاءاللہ! آپ تو خوب سوتے ہوئے اور لیٹ کر آئے۔''

گویا اشارہ اس بات کی طرف تھا کہ کم پیسے خرچ کر کے بھی آنا ممکن تھا اور اپنی زندگی کو اتنا پر تعیش بنانا اچھی بات نہیں ہے۔

ایک مرتبہ ممبئی کے ایک بڑے عالم دین لکھنؤ آئے، جن کے متعلق میری زبان سے اپنے ایک ساتھی سے گفتگو کرتے ہوئے کوئی ایسی بات نکل گئی جو مناسب نہ تھی، پھر جب میں خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو حضرت نے فوراً تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

''قیامت کے دن ہر ایک کو اپنا اپنا حساب دینا ہے، ہمیں اپنی زبان کی حفاظت کرنا چاہیے اور کسی کے متعلق نامناسب بات کہنے میں احتیاط برتنا چاہیے۔''

آپ کے ارشاد سے میں سمجھ گیا کہ میں نے جو بات کہی تھی، حضرت کو اس کا کشف ہو چکا ہے اور یہ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

ایک مرتبہ میری طبیعت سخت علیل ہوگئی اور علاج کی تمام ممکنہ تدابیر ناکام ہوتی نظر آنے لگیں، اس وقت حضرت مرشد الامت نے مجھے ایک روحانی معالج سے رجوع کرنے کی ہدایت کی، جس پر میں نے بعد میں یہ کہا کہ دراصل مجھے کوئی بیماری ہی نہیں ہے، بلکہ میری اصل بیماری میرے حضرت کی محبت ہے جس کا میں اسیر ہوں، یہ بات آئی گئی ہوگئی، کچھ دنوں کے بعد گھر پر میرے عم محترم کی طبیعت خراب ہوئی اور اس سلسلہ میں مجھے ضرورت محسوس ہوئی کہ میں انہی روحانی معالج سے رجوع کروں جن کے متعلق حضرت نے مجھے چند روز قبل بتایا تھا، میں ان کے پاس گیا اور کام سے فارغ ہو کر خاموشی کے ساتھ ندوہ واپس آ گیا، لیکن جب ندوہ آیا تو اچانک حضرت نے فرمایا:

''آج تو آپ کی طبیعت خراب نہیں تھی، آج آپ کس سلسلہ میں وہاں تشریف لے گئے؟''

یہ جملہ حضرت کے لب مبارک سے نکلتے ہی میں سمجھ گیا کہ میری حرکت کا حضرت کو اللہ نے علم کرا دیا ہے، پھر میں نے اپنی مجبوری بیان کی تو دیر تک دعائیں دیں اور شفقتوں سے نوازا۔

حضرت مرشد الامت کی تربیت و محبت کا یہ بھی ایک نرالا انداز تھا کہ وہ اپنے خواص کی تعریف ان کے سامنے کبھی نہ کرتے اور اس سلسلہ میں بڑی احتیاط برتتے کہ کہیں ان کا نفس موٹا نہ ہو جائے اور وہ کبر و عجب کا شکار نہ ہو جائیں، مجھے متعدد بار اس کا تجربہ ہوا۔

ایک مرتبہ رات کے کسی حصہ میں آپ بیت الخلا تشریف لے گئے اور جاتے ہوئے میرے بستر پر نگاہ پڑ گئی، مجھے غیر موجود پا کر خدام سے معلوم کیا کہ کہاں ہیں؟ انہوں نے عرض کیا کہ ندوہ کے کاموں میں مصروف ہیں اور بالا خانہ میں کمپیوٹر پر کام کر رہے ہیں۔ فرمایا: اسی وقت بلا کر لائیے اور ان سے کہیے کہ وہ جو کام کر رہے ہیں اس سب کو ساتھ لے کر آئیں۔ میں گھبرا گیا اور ایسا لگا کہ آج خیریت نہیں ہے، پھر جب حاضر خدمت ہوا تو میری ایک ایک چیز کو غور سے دیکھا اور چیک کرتے گئے، مجھے حیرت ہوئی کہ اسی وقت انہوں نے بہت سی ان باریک چیزوں پر Mark کیا، جن کا مجھے یا کسی کو بھی خیال نہ ہوا تھا، پھر اس کے بعد ارشاد فرمایا:

''محنت کے ساتھ کام کرنا چاہیے، یہ چیز انسان کو ترقی دیتی ہے، جس زمانہ میں ہم یہ کام کرنے کے لائق تھے تب ہم نے بھی الحمد للہ بہت محنت کی ہے، لیکن آپ کو اس سلسلہ میں زیادہ خوش نہیں ہونا چاہیے، بے شک آپ کے کام اچھے ہیں لیکن ایسے نہیں ہیں کہ اس وقت مدارس یا جامعات میں ان کی نظیر موجود نہ ہو، اب سب جگہ لوگ update ہیں اور بہت سے مدارس بھی technology کے میدان میں اچھی کارگذاری رکھتے ہیں۔''

حضرت کی اس گفتگو کو تھوڑی دیر میں سوچتا رہا کہ اچانک اس بلیغ ارشاد میں کیا حکمت ممکن ہے؟ پھر فوراً ہی خیال آیا کہ اس وقت انہی الفاظ کی ضرورت تھی، اگر حضرت یہ کہہ کر میرے نفس کو نہ کچلتے اور دل پر آری نہ چلاتے تو یقیناً میں عجب کا شکار ہو جاتا۔

انہی سب مشاہدات و تاثرات اور تجربات کی بنا پر حضرت مرشد الامت کو میں پوری امت کے لیے ایک Role model سمجھتا ہوں۔ سچی بات یہ ہے کہ میں نے ان کے ساتھ زندگی کو بہت خوبصورت دیکھا جو میرے لیے سعادت بھی ہے اور وسیلہ نجات بھی!

بہار میں تم سے تھیں

الحاج سید ناطق حسن قادری
(سرپرست مدرسۃ الصفہ اورنگ آباد- بہار)

میرے بھائی سید طارق حسن عسکریؒ حقیقت میں میرے لیے ایک محسن شخصیت تھے، جنہوں نے بہترین نگہداشت کے ساتھ میری دینی تربیت پر بھی توجہ رکھی، میں یہ ان ہی کا احسان سمجھتا ہوں اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں بھی ہوں کہ انہی نے مجھے پہلی مرتبہ بزرگوں اور سادات کی بستی دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی سے روشناس کرایا اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے دامن ارادت سے وابستہ کیا، جن کی صحبت کیمیا اثر سے اس ناکارہ کو اپنی ذاتی زندگی میں بہت نفع حاصل ہوا۔

بھائی صاحب علیہ الرحمہ جب مجھے پہلی بار تکیہ لے کر گئے اور میں نے وہاں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی زیارت کی تو اسی وقت وہاں میں نے ان کے علاوہ چند مزید فرشتہ نما انسانوں کو بھی دیکھا، جن میں حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی، حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ اور ہمارے مخدوم ومکرم جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

پہلے دن سے میرا یہ مشاہدہ رہا کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے میری جب بھی ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں ہمیشہ ایک نرم مزاج، ملنسار، متواضع اور ہر ایک سے محبت کرنے والا پایا۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا سایہ ہمارے سروں سے اٹھ گیا اور ہمارے درمیان یتیمی کی ایک کیفیت محسوس ہونے لگی، لیکن اسی وقت اللہ تعالیٰ نے انہی کے جانشین کو ہمارے لیے ایسا روحانی سرپرست بنادیا کہ ان کا وجودِ مسعود پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کے لیے ایک نعمت ثابت ہوا۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی وفات کے بعد اس عاجز نے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ ہی کے دامن ارادت سے وابستہ ہونے کو باعث عز وشرف سمجھا اور اسی لیے حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد ان ہی کے جانشین سے تجدید بیعت کرلی۔ ظاہر ہے وہ تجدید بیعت سے قبل بھی میرا خیال رکھتے تھے اور بہت محبت فرماتے تھے، لیکن بیعت کے بعد ایسا معلوم ہوا جیسے اس تعلق میں اضافہ ہوگیا ہو۔

میرا معمول تھا کہ میں ہمیشہ رمضان المبارک کے کچھ ایام ان کی خدمت میں ضرور گذارتا اور ان کی صحبت سے فائدہ اٹھاتا، اس دوران ان کی عنایات والطاف مسلسل حاصل رہتیں اور وہ مہمانوں کی کثرت کے باوجود افطار اور کھانے وغیرہ کا خصوصی خیال فرماتے۔

میں جب آپ سے تنہائی میں ملاقات کرتا تو خاندانی تعلقات کا بڑی محبت سے ذکر فرماتے اور اپنے تعلق کا غیر معمولی اظہار کرتے، جسے سن کر طبیعت خوش ہوجاتی اور دل کرتا کہ یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ایک مرتبہ جمشید پور آئے تو میں بھی ان کی خدمت میں وہاں حاضر ہوا، اس موقع پر آپ کی طبیعت ناساز ہوگئی اور بات کرنا مشکل تھا، لیکن میں حاضر خدمت ہوا تو دیکھتے ہی نعت کے کچھ اشعار سنانے کی خواہش ظاہر کی، میں نے اپنے لیے سعادت سمجھتے ہوئے اشعار سنائے، جن کو سن کر اچانک ان کی طبیعت پہلے سے زیادہ بہتر معلوم ہونے لگی، جس کو دیکھ کر خود ان کے بھائی حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ بھی بڑے خوش ہوئے اور پھر دونوں بھائی دیر تک اس عاجز سے محو گفتگو رہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت کرے اور اپنی شان کے مطابق ان کا استقبال کرے اور امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

حضرت مرشد الامت کی یادیں

ڈاکٹر تابش مہدی
(ڈائریکٹر ادبیات عالیہ اکیڈمی-نئی دہلی)

ہمارے ممدوح و مشفق پروفیسر نثار احمد فاروقی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ ''جن شخصیتوں سے مجھے عقیدت مندانہ تعلق ہوتا ہے اور اُن سے مجھے غیر معمولی قلبی و ذہنی مناسبت ہوتی ہے، اُن پر کوئی مضمون یا مقالہ لکھنے کے لیے مجھے بہت دیر تک سوچنا پڑتا ہے۔'' یہی کیفیت اِس وقت راقم سطور کی ہے، جب وہ مرشد الامت حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ پر کچھ لکھنے کے لیے قلم اٹھائے ہوے ہے۔ سچ کہا ہے اقبال نے:

گفتار کے اُسلوب پہ قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات

رمضان المبارک ۱۴۴۴ کی اکیسویں اور ماہِ اپریل ۲۰۲۳ کی تیرہویں تاریخ کو ہم سب کے مخدوم ومحبوب، ساداتِ حسنی کے روشن وتابندہ چراغ، ملت اسلامیہ ہند کے ہر دل عزیز وغیر متنازع فکری وملّی قائد ورہ نما مرشد الامت حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی مختصر سی علالت کے بعد عمر عزیز کی چورانوے (۹۴) سیڑھیاں عبور کر کے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اِس دنیا سے ان کا اٹھ جانا رواں صدی عیسویں کی اسلامی دنیا کا ایک عظیم حادثہ ہے۔ یہ ایک ایسا حادثہ ہے، جسے کسی ایک طبقے یا مسلک و مذہب یا کسی ایک خطہ وقریہ تک محدود کر کے نہیں دیکھا جاسکتا۔ پوری اسلامی دنیا کے ہر نظریے اور مکتبِ فکر کے لوگوں نے اسے محسوس کیا اور بے انتہا حزن وتاسف کا اظہار کیا۔ غم وحزن اور احساسِ محرومی کے اظہار اور تعزیت کا سلسلہ اب بھی مختلف سطحوں پر جاری ہے۔

مرشد الامت حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے علم وفضل، نیکی وتقویٰ شایستہ مزاجی وشگفتہ طبیعت، جذبۂ ہم دردی وخیر خواہی اور بے پناہ وسعتِ نظر اور بلند خیالی کے لیے انسانوں کے ہر طبقے میں جانے اور پہچانے جاتے رہے ہیں۔ وہ ساداتِ حسنی کے اس سلسلے کی اہم اور مضبوط ترین کڑی تھے، جو کبھی دیار عرب سے دعوت وتبلیغ کا مشن لے کر اتر پردیش کے دیار مشرق کٹرا مانک پور ضلع پرتاب گڑھ میں وارد ہوا تھا۔ پھر اپنے دعوتی وتبلیغی سلسلے کو دراز کرتے ہوے جائس اور نصیر آباد کو آیاد کیا۔ اس کے بعد شہر رائے بریلی سے متصل دریاے سئی کے کنارے واقع بستی تکیہ کلاں میں آبسا۔ کم وبیش گزشتہ چھے سو برس سے یہ خانوادۂ علم ومعرفت وہیں آباد ہے اور وہیں سے پوری دنیا کو اپنے فضل وکمال اور علمی وروحانی انوار سے روشن ومنور کر رہا ہے۔ اب تو اس چھوٹے سے قریے نے ایک بڑی بستی کی شکل اختیار کر لی ہے اور اہل علم کے طبقے میں اُسے تکیہ شاہ علم اللہ یا دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی کے نام سے جانا جانے لگا ہے۔

مرشد الامت حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ۱۹۲۹ میں رائے بریلی کی روحانی بستی تکیہ شاہ علم اللہ میں پیدا ہوے۔ اور ۲۰۲۳ میں بے پناہ عزّتیں، عظمتیں، نیک نامیاں اور تقدسات دامن میں سمیٹ کر اس خرابے کو خیر باد کہہ دیا۔ اپنے خالق و مالک کے پیارے ہوگئے۔ یہ چورانوے سال کی عمر کوئی معمولی نہیں ہوتی۔ انھوں نے بھرپور زندگی بسر کی۔ لیکن ان کا ہر چاہنے والا، عقیدت منداور گرویدہ اُنھیں کچھ اور زیادہ دنوں تک یہاں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اِسے ان کی مقبولیت ومحبوبیت کی ایک روشن دلیل سمجھتا ہوں۔

حضرت مرشد الامت رحمۃ اللہ علیہ نے یوں تو اپنے عہد کے

جید علما و مشائخ سے کسبِ فیض کیا تھا۔ اُنھیں اِس بات کا بھی شرف حاصل تھا کہ انھوں نے حکیم الامت، مجدد ملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی فاروقی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی صحبت پائی تھی۔ بل کہ موجودہ عہد میں حضرت مرشد تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ وہ آخری خوش نصیب فرد تھے۔ وہ اپنی اس خوش نصیبی کا تذکرہ بڑی تفصیل سے اور نہایت اِمتنان و تشکر کے ساتھ فرمایا کرتے تھے۔ انھوں نے حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ سے بھی کسب فیض کیا تھا، ان کی ارادت سے شرف یاب ہوے تھے، محدّث کبیر علامہ حیدر حسن ٹونکی اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی بھی صحبت پائی تھی اور دنیا کے دوسرے متعدد اعاظم رجال کی بھی زیارت و ہم صحبتی انھیں حاصل رہی ہے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کے شیخ و مصلح اور استاذ و مربی مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ حضرت مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ پورے عالم اسلامی کے لیے ایک نمونہ تھے۔ یوں تو اُنھوں نے اپنی تعلیم و تربیت سے بے شمار علما، صلحا اور مشائخ تیار کیے تھے۔ سب کا تذکرہ کرنے بیٹھیں تو ایک دفتر وجود میں آجائے گا۔ لیکن انھوں نے اپنے عزیز خواہرزادے اور صالح اور مستقل مزاج شاگرد مولانا سیّد محمد رابع حسنی کو اپنی خصوصی تربیت و توجہ سے سرفراز کر کے عالم اسلام کے لیے ایک رجلِ عظیم تیار کیا تھا۔ آں محترم نے بھی ہر پہلو سے خود کو اپنے خالِ معظم اور استاذ و مربی کے لیے وقف کر دیا تھا۔ وہ درس و تدریس اور دوسری مفوضہ ذمے داریوں کی انجام دہی کے بعد انھی کے حکم اور اشارے کے منتظر رہتے تھے۔ وہ اپنے محترم ماموں اور شفیق و کریم شیخ و مربی کے ایک وفا شعار و عزیز شاگرد کی حیثیت سے ہر وقت آمادۂ خدمت رہتے تھے۔ انھوں نے پوری عمر حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی پیروی کی۔ ان کی خدمت میں لگے رہے۔ حضرت نے جہاں اور جس موقعے پر انھیں یاد کیا وہ ہمیشہ کھڑے ملے۔ سفر سے طبعی مناسبت نہ ہونے کے باوجود وہ ہند و بیرونِ ہند کے ہر سفر میں حضرت کے رفیقِ سفر رہے۔ دسمبر ۱۹۹۹ میں ان کی وفات کے بعد سے تو وہ کامل طور پر اپنے شیخ و مربی کے علمی، فکری، دعوتی اور تبلیغی مشن کو فروغ دینے میں لگ گئے تھے۔ ان کی جلائی ہوئی شمع کو روشن و تابندہ رکھنے کے لیے ہمہ تن کوشاں اور سرگرداں رہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جس کا اعتراف ہمیشہ اور ہر سطح پر ہوا ہے۔ انھوں نے ملت اسلامیہ ہند کی متحدہ تنظیم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور اسلامی دنیا کی عظیم عربی و اسلامی دانش گاہ ندوۃ العلما کے اغراض و مقاصد کے فروغ اور مختلف نازک موقعوں پر ان اداروں کے وقار اور کردار کی حفاظت کے لیے جو دانش مندانہ و حکیمانہ اقدام کیے اور ملت کے تمام مکاتب فکر کے لوگوں کا اعتماد و اعتبار حاصل کیا، اُسے تاریخ میں کبھی فراموش نہ کیا جا سکے گا۔

میں اپنی کم نصیبی کی وجہ سے اپنی اور اپنے بزرگوں کی بے پناہ خواہش کے باوجود ندوی تو نہیں ہو سکا اور حضرت مرشد الامت رحمۃ اللہ علیہ سے باضابطہ تلمذ بھی مجھے حاصل نہیں رہا۔ لیکن میرے لیے یہ کم شرف و سعادت کی بات نہیں کہ مجھے حضرتِ والا کی طویل صحبتیں حاصل رہی ہیں۔ یہ سلسلہ کم و بیش پچیس (۲۵) سال کو محیط ہے۔ میں نے خود کو ہمیشہ ایک ارادت مند اور بالواسطہ شاگرد کے طور پر دیکھا اور حسب موقع ان سے اکتساب فیض کیا ہے۔ میں نے حضرت مرشد الامتؒ سے اپنے تقریباً ربع صدی کے نیاز مندانہ قلبی مراسم اور سفر و حضر کی طویل صحبتوں اور غیر معمولی نزدیکیوں سے ہمیشہ یہی دیکھا اور محسوس کیا کہ اتباعِ سنت اور احتیاط و تقویٰ کو ان کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ وہ زندگی کے تمام معاملات و مسائل میں اسوۂ رسول کو سامنے رکھتے تھے۔ میری گناہ گار آنکھوں نے حضرت کا کبھی کوئی ایسا عمل نہیں دیکھا، جسے کتاب و سنت کے احکام سے منحرف اور احتیاط و تقویٰ سے ہٹا ہوا کہا جا سکے۔ توکل، بے لوثی اور جاہ و مال سے بے نیازی و بے رغبتی کی صفت تو ان کے خانوادے کے خردوں میں بھی بہ درجہ اتم ملتی ہے۔ میں نے بارہا اس کا مشاہدہ کیا ہے۔

مولانا سیّد محمد رابع حسنی رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے تو میرے کان عہد طفلی ہی سے آشنا ہو گئے تھے۔ کبھی حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے اور اُن کے دست راست کی حیثیت سے تو کبھی ایک اچھے اور باحکمت استاذ و مربی اور ندوے کے پابند اصول

وضوابط مگر نرم خو منتظم ومنصرم کے طور پر یا کسی دوسرے حوالے سے لیکن انھیں بالمشافہ دیکھنے اور ان سے قریب کچھ دیر بیٹھنے کا موقع ۱۹۹۶ میں میسر آیا۔ جب وہ سیّد الطائفہ حضرت علامہ سیّد سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق منعقد ہونے والے جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کے سہ روزہ علمی وتحقیقی سمی نار میں مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ہم راہ تشریف لائے ہوے تھے۔ لیکن یہ زیارت بس زیارت ہی کی حد تک رہی۔ اس بھیڑ میں اس سے زیادہ کی امید بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔

حضرتِ والا سے باقاعدہ ملنے اور کچھ استفادے کی سعادت سب سے پہلے ۱۹۹۸ میں حاصل ہوئی۔ یہ اس وقت کی بات ہے، جب میں اپنے چھوٹے بیٹے عزیزم اجمل فاروق سلمہ کے داخلے کے لیے ندوے گیا ہوا تھا۔ جب میں داخلے کی تمام کارروائیاں مکمل کر کے اپنے شفیق وکرم فرما حضرت مولانا شمس الحق ندوی کے پاس گیا تو وہ مجھے اپنے ہم راہ لیے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے خدمت میں حاضر ہوے۔ مولانا شمس الحق صاحب کی ہی وساطت سے اِس سے پہلے بھی میں کئی بار حضرت علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی پر شفقت مجلس میں باریاب ہوتا رہا ہوں۔ حضرت والا رحمۃ اللہ نے ہر بار اِس بات پر اپنی بے پناہ خوشی ومسرت کا اظہار فرمایا کہ میں مجدد ملت، مصلح وقت حضرت مولانا سیّد محمد امین نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی مرید و منتسب حضرت میاں ثابت علی ناجیہ پوری رحمۃ اللہ علیہ کا نواسہ ہوں۔ حضرت نے ہمیشہ اپنی گراں قدر دعاؤں سے نوازا۔ مجھ سے اچھی توقعات ظاہر کیں اور ہم طعامی کا بھی شرف بخشا۔

جب ہم حاضرِ مجلس ہوے تو حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دوسرے بہت سے افراد کے ساتھ حضرت مرشد الامت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف فرما تھے۔ مشفقی مولانا شمس الحق ندوی نے ان سے بھی کسی قدر میرا تعارف کرایا۔ حضرت مرشد الامت نے غیر معمولی خوشی ومسرت کا اظہار کیا اور دوپہر کے کھانے پر بھی مدعو کیا۔ اس ملاقات کے بعد حضرت مرشد الامتؒ سے کتنی ملاقاتیں رہیں، ان کی روحانی ونورانی صحبتوں سے کتنا استفادے کا موقع ملا اور کب کب ان کی کیا کیا نوازشیں اور شفقتیں مجھے حاصل رہیں، اِن کا احاطہ محال ہے۔ نہ اس وقت اس کا موقع ہے۔

۱۹۹۸ کی مذکورِ بالا ملاقات کے بعد میں مسلسل حضرت مرشد الامت کے رابطے میں رہا۔ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے ان تمام سمی ناروں اور علمی وادبی مذاکروں میں میں شریک رہا، جو ہندستان کے کسی بھی شہر ودیار میں منعقد ہوے۔ ہر اجلاس کے افتتاحی پروگرام میں حضرت کے حکم سے میں نے نعت رسول سنانے کا شرف حاصل کیا، ہر اجلاس میں اس کے مقررہ موضوع پر کوئی مقالہ پڑھا اور اس کے اختتامی سیشن کے لیے تجاویز نویسی بھی کی۔ حضرت نے ہر پروگرام کے بعد میرے مقالے اور تحریر کردہ تجاویز کی تحسین فرمائی اور اپنی قیمتی دعاؤں سے نوازا۔

۲۰۰۳ سے لاک ڈاؤن تک حضرت مرشد الامت کے حکم سے میں عالمی رابطہ ادب اسلامی کے ترجمان 'کاروان ادب' کا مستقل مرتب و مدوّن رہا ہوں۔ ہر دو یا تین ماہ کے بعد میں پابندی کے ساتھ ندوۃ العلما حاضر ہوتا رہا، رابطہ ادب اسلامی کے مختلف مذاکروں میں پیش کردہ مقالات اور مضامین کو ترتیب وتدوین کے مراحل سے گزار کر اُنھیں قابلِ اشاعت بناتا رہا ہوں۔ گویا عملی طور پر کاروانِ ادب کے ہر شمارے کا مدیر میں ہی رہا ہوں۔ اس سفر سے مجھے سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ مجھے حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی صحبتوں میں بیٹھنے اور ان کی مشفقانہ دعائیں حاصل کرنے کی سعادت مل جاتی تھی۔ حضرت تاریخِ مقررہ پر نہایت شفقت ومحبت کے ساتھ میرے منتظر رہا کرتے تھے۔ جب بھی کام پورا کر کے طے شدہ پروگرام کے تحت میں روانگی سے پہلے الوداعی مصافحے کے لیے حاضر خدمت ہوتا تھا، حضرت یہ ضرور دریافت فرماتے تھے کہ آمد و رفت کے مصارف لے لیے کہ نہیں؟ متعدد بار ایسا بھی ہوا کہ میں مہمان خانے میں اپنی نارمل حالت میں مصروفِ کار رہا، اچانک دروازے پر دستک ہوئی، جب میں نے دروازہ کھولا تو حضرت والا کھڑے ملے۔ محض یہ بتانے کے لیے کہ میرا اچانک رائے بریلی کا پروگرام بن گیا۔ مصباح آپ کا پورا خیال رکھیں گے۔ ساتھ ہی

ساتھ یہ ضرور فرماتے تھے کہ مولوی اقبال صاحب سے آمد و رفت کے مصارف ضرور لے لیجیے گا۔

حضرت مرشد الامت رحمۃ اللہ علیہ سے پچیس (۲۵) سالہ گہرے اور نیاز مندانہ رسم دراہ کے دوران میں متعدد بار بعض ایسے واقعات پیش آئے، جنھیں محض حضرت والا کے روحانی تصرف سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ سب کا تذکرہ تو مشکل ہے۔ میں صرف دو واقعات پر اکتفا کروں گا۔

یہ ۲۰۰۲ کے کسی مہینے کی بات ہے۔ میں عزیزم اجمل فاروق سلمہ سے ملنے اور ان کے تعلیمی و طعامی مصارف جمع کرنے کے لیے ندوے گیا ہوا تھا۔ وہاں سے اپنے ایک یارِ دیرینہ حافظ عبداللطیف سے ملنے کے لیے ان کے غیر معمولی اصرار اور تقاضے پر ضلع رائے بریلی کی ایک چھوٹی سی بستی تیندوا بھی جانا تھا۔ وہاں ندوۃ العلما کی مشہور شاخ مدرسہ فلاحِ دارین بھی واقع ہے۔ میرا یہ پروگرام کسی ذریعے سے حضرت مرشد الامت کے علم میں آ گیا۔ دوپہر کے کھانے پر دریافت فرمایا: آپ مدرسہ فلاحِ دارین تیندوا جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟ عرض کیا: جی۔ فرمایا: ہمیں بھی جانا ہے، ساتھ ہی چلیے گا۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ دل ہی دل میں یہ بھی سوچ رکھا تھا کہ وہاں سے حافظ عبداللطیف صاحب یا کسی اور کی معیت میں نصیر آباد بھی حاضری دوں گا۔ وہاں حضرت مولانا سیّد محمد امین نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کا دولت خانہ دیکھوں گا، اس مسجد میں کوئی نماز ادا کروں گا، جس میں حضرت سیّد نصیر آبادی پنج گانہ نمازیں ادا فرماتے تھے، تذکیر و تقریر کا بھی پروگرام ہوتا تھا اور پھر حضرت کی تربت پر حاضر ہو کر سلام و ایصالِ ثواب کا بھی شرف حاصل کروں گا۔ لیکن یہ منصوبہ بس میرے ذہن و دل میں ہی تھا۔ میں نے کسی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ بہ ہر حال ہم حضرت والا کے ہم راہ نماز عصر سے پہلے کسی وقت تیندوا کے لیے روانہ ہوے۔ حضرت والا کے برادرِ خرد اور ہم سب کے ممدوح و مخدوم حضرت مولانا سیّد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت کے مستقل رفیق سفر محترم الحاج عبدالرزاق رحمۃ اللہ علیہ اور برادر و مکرم حضرت مولانا سیّد محمود حسن حسنی ندوی رحمۃ اللہ بھی ہم راہ تھے۔ راستے بھر ایک عجیب روحانی کیفیت کا احساس رہا۔ میں حضرت کی معیت میں اپنے آپ کو غیر معمولی خوش بخت و سعادت مند محسوس کر رہا تھا۔ وقفے وقفے سے حکمت و دانش کے جواہر پارے بھی فکر و خیال کی جھولی میں آتے رہے۔ اچانک گاڑی تیندوا پہنچنے سے پہلے ایک نسواں مدرسے پر رک گئی۔ حضرت نے مجھے مخاطب کر کے فرمایا: ہم کچھ دیر یہاں بیٹھتے ہیں، آپ محمود میاں کے ساتھ حضرت مولانا سیّد محمد امین نصیر آبادیؒ کا دولت خانہ دیکھ لیجیے اور ایصالِ ثواب کے بعد جلد آجایئے۔ ہمیں تیندوا کچھ دیر رک کر رائے بریلی بھی پہنچنا ہے۔ حضرت والا کی زبان سے یہ بات سن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ایسا لگا مجھے ان مول خزانہ مل گیا۔ میری نہ جانے کتنی دیرینہ آرزو پوری ہو رہی تھی۔ فضا ابر آلود تھی۔ بل کہ رہ رہ کر ہلکی پھلکی بوندیں بھی پڑ رہی تھیں۔ میں محترم الحاج عبدالرزاق اور برادر مکرم مولانا سیّد محمود حسن حسنی رحمہما اللہ کے ہم راہ اپنے جدّ امجد کے مرشد و فکری رہ نما اور پورے دیار کے مصلح و مربی حضرت سیّد نصیر آبادی کی کچی اور غیر مزین تربت پر حاضر ہوا۔ ایصالِ ثواب کیا۔ بہت دیر تک کھڑا ان کی دینی، ملی اور اصلاحی خدمات کو تصور میں لاتا رہا اور انھی کے توسط سے اپنے جدّ محترم کو بھی یاد کیا اور ان کے لیے بھی ایصالِ ثواب کیا اور نہایت روحانی کیف و مسرت کے ساتھ متذکرہ مسجد میں بھی حاضری دی دو رکعت تحیۃ المسجد ادا کی اور وہ مکان بھی دیکھا، جس میں حضرت سیّد نصیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ رہا کرتے تھے۔

اِس موقع پر ایک نہایت مُسن و معمر بزرگ سے بھی ملاقات ہوئی، جنھوں نے بتایا کہ انھوں نے حضرت سیّد نصیر آبادی کو نہ صرف دیکھا ہے، بل کہ ان کی صحبت بھی انھیں حاصل رہی ہے۔ ان بزرگ کی باتیں تو زیادہ مرتب نہیں تھیں، لیکن ان کی باتوں پر یقین نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ بھی سمجھ میں نہیں آئی۔

یہ غالباً ۲۰۰۷ کی بات ہے۔ میں اپنے پروگرام کے مطابق تاریخ مقررہ پر ندوے حاضر ہوا۔ گرچہ اسی تاریخ کو میں فیروز پور (پنجاب) کے ایک مشاعرے میں مدعو تھا۔ لیکن چوں کہ حضرتِ والا کو میں تاریخ سے مطلع کر چکا تھا، اِس لیے میں نے مشاعرے والوں

سے معذرت چاہ لی۔ ندوہ جانا ضروری سمجھا۔ جب ڈھائی تین دن کے بعد 'کاروانِ ادب' سے متعلق تمام کاموں سے میں فارغ ہوگیا تو حضرتِ والا کی خدمت میں الوداعی مصافحے کے لیے حاضر ہوا۔ حضرت والا نے بڑے محبت وشفقت بھرے انداز میں فرمایا: آپ دلّی سے اتنی دور پابندی کے ساتھ تشریف لاتے ہیں۔ ایک بڑی ذمے داری نبھاتے ہیں۔ آپ کی کوئی خدمت نہیں ہو پاتی۔ پھر ایک لفافہ پیش کرتے ہوئے فرمایا: 'یہ بہت معمولی سا ہدیہ ہے اسے قبول فرمالیجیے۔' میری آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ میں نے کسی عذر وتامل کے بغیر اپنے لیے انعام اور سعادت مندی سمجھ کر لفافہ لے لیا۔ عرض کیا: حضرت! میں محض آپ سے محبت وتعلقِ خاطر کی وجہ سے تعمیل حکم میں حاضر ہوتا ہوں۔ اس کے علاوہ میرا کوئی مقصد ومدّعا نہیں ہوتا۔ میں تو صرفۂ آمد ورفت بھی نہیں لینا چاہتا۔ اُسے بھی محض تعمیل حکم کے طور پر لیتا ہوں۔ فرمایا: مجھے احساس ہے۔ واضح میاں بھی اسے محسوس کرتے ہیں۔ ان کے دل میں آپ کے اِس جذبے کی بڑی قدر ہے۔ یہ یوں بھی آپ کے بڑے قدرداں ہیں۔ اکثر طلبہ کو آپ سے مضمون نگاری اور زبان وبیان سے متعلق معلومات کے سلسلے میں رجوع کرنے کے لیے متوجہ کرتے رہتے ہیں۔

میں نے حضرت سے مصافحہ ومعانقہ کیا، وہیں پاس ہی مخدومی ومشفقی حضرت مولانا واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی تشریف فرما تھے، ان سے بھی مصافحے اور معانقے کا شرف حاصل کیا اور رخصت ہوکر ریلوے اسٹیشن کے لیے روانہ ہوگیا۔ بعد میں جب لفافہ کھولا تو اس میں اتنی ہی رقم ملفوف تھی، جتنی مجھے فیروز پور کے مشاعرے میں ملنی تھی۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں واقعات تو اس کے علاوہ بھی ہیں لیکن میں نے اختصار کا خیال رکھتے ہوئے بس دو پر ہی اکتفا کیا ہے۔ اِن واقعات کو حضرت والا کی قیافہ شناسی پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے اور ان کی کرامت پر بھی۔ میں بہ ہر حال انھیں اور ان کی قبیل کے دوسرے تمام واقعات کو حضرت مرشد الامتؒ کی اعلیٰ خرد نوازی بھی سمجھتا ہوں اور سامنے والے کے حالات ومعاملات سے گہری باخبری بھی۔

حضرت والا کی وفات کی سناونی ملی تو میں دلی سے باہر تھا۔ اپنی بعض مجبوریوں کی وجہ سے میں جنازے میں شریک نہیں ہوسکا۔ عزیزم اجمل فاروق سلمہ سناونی ملتے ہی رائے بریلی کے لیے روانہ ہوگئے اور جنازے اور تکفین وتدفین میں شریک رہے۔

گزشتہ ماہ کے وسط میں ندوے حاضر ہوا، رائے بریلی بھی حاضری دی۔ حضرت کے جانشیں حضرت مولانا سید بلال حسنی ندوی اور حضرت کے خویش وبرادرزادے مولانا سید جعفر مسعود ندوی اور دوسرے عزیزوں سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ کچھ عجیب کیفیت رہی۔ کسی کا یہ شعر مستقل ذہن ودماغ میں گردش کرتا رہا:

خدا جانے یہ دنیا جلوہ گاہِ ناز ہے کس کی
ہزاروں اٹھ گئے، رونق وہی باقی ہے مجلس کی

مجھے احساس محرومی اس وقت ہوا، جب میں نے پہلی بار ندوے کے مہمان خانے میں تنہا ناشتہ وطعام کیا۔ آنسو نکل آئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اِس وقت کتنی بڑی محرومی سے دوچار ہوں۔

۱۳/اپریل ۲۰۲۳ کو ہم سب کے محبوب ومخدوم، ملت اسلامیہ کے سب سے بڑے قائد ورہ نما اور ذہنی وفکری پیشوا مرشد الامت حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ عمر کی چورانوے سیڑھیاں عبور کرکے پوری ملت اسلامیہ ہند کو غم زدہ اور سوگ وار چھوڑ کر اِس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اب وہ ہم سے اتنی دور چلے گئے ہیں، جہاں تک دنیا کے کسی بھی انسان کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ جو بھی اس دنیا میں آیا ہے، اُسے ایک دن اسی طرح جانا ہے۔ اس سے کسی بھی بزرگ وولی یہاں تک کہ کسی نبی یا پیمبر کو مفر نہیں۔ لیکن حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ علم وفضل محبت وشفقت، ہم دردی وخیر خواہی، تقویٰ وطہارت، عبادت وریاضت، دوراندیشی ومعاملہ فہمی، زندہ دلی اور وسعتِ قلب ونظر کے ایسے روشن اور انمٹ نقوش چھوڑ گئے ہیں، جو شاید کبھی نہ مٹائے جاسکیں۔ انسانی برادری ان سے ہمیشہ روشنی وتاب ناکی حاصل کرتی رہے گی۔ بہ قول حضرت حافظ شیرازیؒ:

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است برجریدۂ عالم دوامِ ما

سرمایہ ملت کا نگہباں

مولانا ڈاکٹر ابو رضا ندوی
(ممبر پارلیمنٹ بنگلادیش)

۲۱ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳ اپریل ۲۰۲۳ء بروز جمعرات بعد نماز ظہر صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ وناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی ذات گرامی بلاشبہ علماء وفضلاء کے لیے مرجع کی حیثیت رکھتی تھی، سالکین معرفت ان کے اوپر ایسے ہی دیوانہ وار فدا ہوتے تھے جیسے پروانے شمع پر نثار ہوجاتے ہیں اور پیاسے کنوئیں پر ٹوٹے پڑتے ہیں، یقیناً حضرت مولاناؒ عربی کے اس محاورہ کی منھ بولتی تصویر تھے:

"من رآه بديهة هابه ومن خالطه معرفة أحبه ولم أر مثله قط" (جس نے آپ کو اچانک دیکھا وہ خوف زدہ ہوگیا اور جو آپ کی صحبت میں کچھ دیر بیٹھا وہ اسیر محبت ہوگیا، قصہ مختصر یہ کہ میں نے ان جیسا کوئی دیکھا ہی نہیں)

شمائل کے باب میں آپ ﷺ کے یہ اوصاف بیان ہوئے ہیں جو بلاشبہ آپ ﷺ کے وارثین پر بھی سو فیصد صادق آتے ہیں، حدیث میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"بعثت لأتمم مكارم الأخلاق"

(مجھے اعلیٰ اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے)

اس تناظر میں اگر ہم حضرت مولاناؒ کی شخصیت کو دیکھیں تو وہ اعلیٰ اسلامی اخلاق کا پرتو نظر آتی ہے، اعلیٰ ظرفی، بلند اخلاقی، عالی حوصلگی، نرم دلی اور احترام انسانیت حضرت مولاناؒ کی شخصیت کے امتیازی اوصاف ہیں، بالخصوص مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد جدید مسائل کی گتھیوں کو سلجھانے اور حکمت کے ساتھ انہیں حل کرنے کا اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے حضرت مولاناؒ کو جو ملکہ عطا فرمایا تھا' وہ آپ ہی کا حصہ تھا، جس کی بعد کے زمانوں میں نظیر ملنا مشکل ہے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی بے لوث خدمات کا ہر وہ شخص ممنون ہے، جو علم وفن سے تعلق رکھتا ہے، اس بندۂ عاجز پر بھی حضرت مولاناؒ کے بے شمار احسانات ہیں، جن کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا، اللہ کا فضل واحسان ہے کہ مجھے آپ سے آپ کی شہرۂ آفاق تصنیفات "جزیرۃ العرب" اور "الادب العربی بین عرض ونقد" براہ راست پڑھنے کا شرف حاصل ہے۔

اس زمانہ کی مبارک یادیں ذہن ودماغ میں برابر گردش کرتی رہتی ہیں اور آج بھی تازہ ہیں، بورڈ پر کھڑے ہوکر آپ کا جغرافیائی نقشے بنانا، فن کی تفہیم پر زور دینا، مثالوں کے ذریعہ بات کو مختلف پیرایوں میں سمجھانا اور اسی کے ساتھ طلبہ کی اخلاقی تربیت کرنا۔

مجھے بڑی ندامت ہے کہ میں اپنی شدید مصروفیات کے باعث حضرت کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا اور یہ احساس بار بار رنجیدہ کردیتا ہے، ابھی رمضان المبارک میں عید الفطر کے بعد حاضری کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک حضرت والا نے داعی اجل کو لبیک کہہ دیا اور وہ ہم سب کے درمیان سے رخصت ہوگئے، سچی بات یہ ہے کہ آپ کی وفات کا سانحہ اتنا بڑا ہے کہ اس خلا کا پر ہونا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے، یہ حادثہ کسی ایک فرد یا ادارہ یا خاندان کا نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کے لیے ایک عظیم حادثہ ہے۔

ایک مثالی معلم کی وفات — ایک عہد کا خاتمہ

ڈاکٹر سرور عالم ندوی
(صدر شعبہ عربی پٹنہ یونیورسٹی - پٹنہ)

۱۹۸۰ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء سے میری وابستگی ہوئی اور معہد کے ابتدائی درجات سے میری تعلیم کا آغاز ہوا، اس وقت کم عمری میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے نام سے آشنائی ضرور تھی، تاہم ان کے مقام ومرتبہ سے شناسائی نہ تھی، لیکن جب عالی درجات میں داخلہ ہوا تو ان کی کلاسز میں شرکت کا موقع ملا اور ان کی شخصیت سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا، حضرت مولاناؒ نے ہمیں اپنی تصنیف کردہ کتاب ''جزیرۃ العرب'' پڑھائی اور تخصص ادب عربی میں اپنی کتاب ''الادب العربی بین عرض ونقد'' پڑھائی، اس کے علاوہ سیرت ابن ہشام بھی پڑھائی، میرے ذہن کے دریچوں میں اب تک وہ یادیں محفوظ ہیں جب حضرت مولاناؒ کھڑے ہوکر بورڈ پر نقشے بناتے اور ایک ایک چیز سمجھا کر پڑھاتے تھے، انہوں نے ہمیں پوری جزیرۃ العرب اسی طریقہ پر پڑھائی، اس وقت یہ محسوس ہوا کہ ہمارے مدارس کے اساتذۂ کرام غیر معمولی صفات کے حامل ہوتے ہیں اور ان کے اندر بڑی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو جو مقام اور صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں وہ قابل دید تھیں اور قابل داد بھی، آپ جب ''الادب العربی'' پڑھاتے تو عربی کی فصاحت وبلاغت پر زبردست گفتگو کرتے اور ان کا پورا درس قرآنی آیات سے مربوط ہوتا، قرآن مجید کی مختلف آیتوں کو بطور مثال پیش فرماتے اور بتاتے کہ قرآن کا یہ اعجاز ہے اور یہ بلاغت ہے، اس وقت ہم اپنے شعور کے مطابق جو کچھ سمجھ سکے اور جو اخذ کر سکے، بعد میں اس کا بڑا فائدہ ہوا اور اندازہ ہوا کہ ان کا انداز تدریس واقعی منفرد تھا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا تھا، وہ ایک کامیاب مدرس ہونے کے ساتھ بڑی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ادیب وصحافی تھے اور اسی کے ساتھ ایک اچھے منتظم بھی تھے، غرض کہ گوناگوں صفات حمیدہ کے مالک تھے، لیکن بنیادی طور پر وہ مدرس ہی تھے اور ایک استاد کی جو شان ہوتی ہے وہ ساری کی ساری چیزیں ان کے اندر مکمل طور پر پائی جاتی تھیں، چونکہ مسائل ومشاغل کی کثرت تھی اور مختلف عہدوں اور متعدد ذمہ داریوں کی مصروفیت تھی، اس لیے مستقل طور پر تدریس کے لیے وقت فارغ کرنا مشکل تھا، مگر پھر بھی درجہ میں حاضری ضرور ہوتی تھی اور آپ کا حال یہ تھا کہ جب آپ تشریف لاتے تو آپ کی جلالت علمی اور جلالت شان سے ہر طالب علم مبہوت ہو جاتا، آپ کے درس کو سن کر صاف محسوس ہوتا تھا کہ آپ کتاب حل کرنے کے بجائے فن کی تفہیم پر زور دے رہے ہیں، دراصل ان کے پیش نظر اصل چیز فن کی تفہیم تھی اور اسباق کا حل کرنا ثانوی چیز تھی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے تخصص ادب عربی میں ہمیں ''الادب العربی'' پڑھائی اور اس وقت ان کی کتاب زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی تھی، ان کے کچھ نوٹس تھے جن کی روشنی میں ان کے وقیع محاضرات ہوتے تھے اور ہم لوگ ان سے مستفید ہوتے تھے، یہ دروس اتنے قیمتی ہوتے تھے کہ بعض اوقات وہ باتیں جو حضرت مولاناؒ بیان فرماتے تھے' تاریخ ادب عربی کی اہم ترین کتابوں میں بھی نہیں ملتی تھیں، تاریخ ادب عربی کے حوالہ سے حضرت مولاناؒ کے محاضرات میں بعض مرتبہ ایسے نکات سامنے آتے تھے جنہیں یاد کر کے آج ہم عش عش کرتے ہیں اور اپنے طلبہ کے سامنے بھی وہ بیان کرتے ہیں۔

تاریخ ادب عربی میں شعر جاہلی کی نثر کے مقابلہ میں خاص اہمیت ہے، کیونکہ اس زمانہ میں شاعری سے شغف زیادہ تھا، لیکن کسی بھی مؤرخ نے اس کے اسباب بیان نہیں کیے ہیں کہ ایسا کیوں تھا؟ البتہ اس کا سبب پہلی مرتبہ ہم نے حضرت مولاناؒ ہی کی زبان سے سنا، انہوں نے شعر جاہلی کی کثرت کا سبب بیان کرتے ہوئے جو کہا وہ آج بھی دل ودماغ پر نقش ہے، انہوں نے فرمایا:

''شعر جاہلی کی کثرت کا سبب یہ ہے کہ زمانہ جاہلیت میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہیں تھا اور کسی چیز کو ضبط تحریر میں لانے کے وسائل بھی نہیں تھے، ایسے ماحول میں اپنی تاریخ، اپنے کارنامے اور اپنے خاندانی احوال وکوائف کو محفوظ رکھنے کے لیے شاعری سب سے زیادہ بنیادی چیز تھی، اگر اس زمانہ میں شاعری نہ ہوتی تو ان کا بڑا نقصان ہوتا، اسی جذبہ نے عربوں کو شاعری کی طرف متوجہ کیا اور ان لوگوں نے کثرت سے اس میدان میں ایسے کارہائے نمایاں انجام دیے جو آج کے زمانہ میں عہد جاہلی کی تاریخ کو جاننے کا تنہا ذریعہ ہیں۔''

حضرت مولاناؒ کی تدریس کا یہ ایک نمونہ میں نے ذکر کیا، ورنہ اس طرح کی نہ جانے کتنی اہم باتیں ہمیں ان سے سیکھنے کا موقع ملا، ان کے یہاں غیر معمولی مواد کی فراوانی تھی اور خاص بات یہ تھی کہ جب وہ اس طرح کا کوئی دعویٰ کرتے تو اس کو ایسے دلائل سے ثابت کرتے جس سے بات بالکل واضح ہوجاتی، بلاشبہ یہ انہی کی شان تھی۔

حضرت مولاناؒ سے ہمیں سیرت ابن ہشام پڑھنے کا موقع بھی ملا، سیرت کی تدریس میں بھی ان کا یہی انداز تھا کہ وہ اس کے ادبی پہلوؤں کو اجاگر کرتے تھے، الغرض آپ بے پناہ صفات وخصوصیات کے مالک تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں آپ سے استفادہ کا موقع عنایت فرمایا، اس پر خدا کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے، سچی بات یہ ہے کہ ان سے تعلقات کی داستان بتانے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

مجھے زمانہ طالب علمی کا ایک واقعہ یاد آتا ہے کہ جب میں معہد میں زیر تعلیم تھا اور رواق سلیمانی میں رہتا تھا، اس وقت ندوہ کی چھٹی ہوئی، تو کسی ساتھی سے میری لڑائی ہوگئی اور نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی، اس موقع پر حضرت مولاناؒ دار العلوم کی طرف سے تشریف لا رہے تھے اور ہم لوگ آپس میں لڑ رہے تھے، حضرت مولاناؒ نے بڑی ہی خاموشی کے ساتھ میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور میرا بازو پکڑ کر اپنے ساتھ لے لیا، پھر اسی طرح مجھے رواق سلیمانی تک لائے اور ہاتھ چھوڑنے کے بعد صرف اتنا فرمایا کہ آپ لوگوں کو لڑائی جھگڑا کرنا اور وہ بھی دار العلوم کے احاطہ میں مناسب معلوم نہیں ہوتا، یہ کہہ کر آپ مہمان خانہ تشریف لے گئے۔ مجھے آپ کے اس انداز تربیت پر غیر معمولی رشک آیا۔

ندوہ سے فراغت علمی کے بعد بھی الحمد للہ مجھے ان کی شفقتیں وعنایتیں حاصل رہیں، جب میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی آیا، تب میں انہی کی سرپرستی میں رہا اور اس کا نتیجہ تھا کہ آپ بھی مجھے ہمیشہ یاد رکھتے تھے، کئی بار انہوں نے خود ندوہ آنے کی دعوت دی اور ہفتہ بھر ندوہ میں قیام کرنے کا مجھے موقع ملا اور حضرت مولاناؒ سے خوب استفادہ کرنے کا سلسلہ جاری رہا، ایک مرتبہ جب ندوہ میں علامہ یوسف القرضاویؒ تشریف لائے اور تقریباً پندرہ دن ان کا ندوہ میں قیام رہا، اس وقت حضرت نے باقاعدہ مجھے گاڑی بھیج کر ندوہ بلوایا اور مجھے اس موقع پر ان کے ساتھ رہنے کی سعادت ملی۔

یہ بھی ان کی شفقت کا نرالا انداز تھا کہ کسی کا دل نہیں توڑتے تھے، ۲۰۰۲ء میں جب میری شادی ہوئی، اس وقت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے اپنی شادی کا کارڈ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ سردی کا زمانہ تھا اور حضرت مولانا مہمان خانہ کے بالائی حصہ میں تشریف فرما تھے اور کسی کام میں مصروف تھے، میں نے آپ کی خدمت میں کارڈ پیش کیا، آپ نے کارڈ دیکھ کر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا، پھر میں نے عرض کیا کہ ''حضرت! میری خواہش تھی کہ میرا نکاح آپ پڑھائیں،'' بس میں نے اتنے ہی الفاظ کہے تھے، جن پر ان کے کرم کا یہ انداز دیکھنے میں آیا کہ وہ بخوشی راضی ہوگئے اور پورے نورانی قافلہ کے ساتھ میری دلجوئی کے لیے تشریف لائے۔

ایک گوہر نایاب

مولانا محمد وسیم صدیقی ندوی
(استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء-لکھنؤ)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ۲۱؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ء بروز جمعرات انتقال فرما گئے اور جمعہ کی صبح ان کے آبائی وطن تکیہ کلاں رائے بریلی میں ایک عظیم الشان جم غفیر کی موجودگی میں نماز جنازہ اور تدفین ہوئی۔

مولاناؒ کی مقبولیت ومحبوبیت کا اندازہ اس وقت ہوا جب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں آپ کے جنازہ کی پہلی نماز جمعرات کی رات ساڑھے دس بجے ہوئی، انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ یہ بندہ بخشا بخشایا ہے، رمضان کا مہینہ، اخیر عشرہ، جمعرات کی شب، جمعہ کو تدفین اور لاکھوں آدمیوں کی موجودگی' یہ سب مغفرت کے ایسے دلائل ونشانیاں تھیں جس کا کوئی انکار کر ہی نہیں سکتا اور یہ اللہ کا بندہ تھا بھی ایسا ہی، بہت حلیم وبردبار، ہمدرد وغمگسار، دوسروں کا خیر خواہ، نافع ومفید، ہر ایک کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ' نہایت مخلص وبے لوث' مستغنی وبے نیاز' دنیا کی لالچ وحرص وہوس سے پاک، یہ ایسی خوبیاں تھیں جن کی گواہی ہر وہ شخص دے سکتا ہے جس کا مولانا سے ادنیٰ سا بھی رابطہ رہا ہو۔

مولانا فرشتہ صفت' نبوی صفات کے حامل انسان تھے، مولانا کی جوانی سے موجودہ عمر تک آپ کی خدمات تقریباً ایک صدی پر محیط ہیں اور سب نظروں کے سامنے ہیں۔ مولانا سے ذاتی طور پر مجھے بڑی انسیت ومحبت تھی، جب کبھی ملاقات کرتے بڑی اپنائیت وشفقت سے ملتے، جیسے بہت گہرا تعلق ہے، جب کہ کبھی کبھی ملاقات کو ایک مدت گذر جاتی، لیکن مولانا اسی خندہ پیشانی اور بشاشت سے ملتے، انتقال سے ایک ماہ پہلے ملاقات ہوئی، بڑی دیر تک گفتگو فرمائی، مختلف امور پر باتیں کیں، کچھ سعودی سفارت خانہ سے بھی متعلق تھیں، ایک بار نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: لوگوں کے لیے نافع اور مفید بنئے: "خیر الناس من ینفع الناس"

آپ کے اندر زہد واستغناء، توکل، انابت الی اللہ، صبر وتحمل انتہائی درجہ کا پایا جاتا تھا، آپ کا ہونا امت کے لیے ایک سایہ دار درخت کی مانند تھا، بہت سے فتنے، شرور وآفات کے لیے آپ آہنی قلعہ تھے، آپ کے جانے سے امت یتیم وبے سہارا ہوگئی اور بظاہر امت کے لیے بہت سے فتنوں کا دروازہ کھل گیا، خدا حفاظت فرمائے۔

آپ نے بڑی محتاط زندگی گذاری، کبھی بھی اپنی ذات پر ندوۃ العلماء کا ایک پیسہ خرچ نہ کیا، بلکہ خود اپنا پیسہ لگا دیا۔ آپ عربی اردو دونوں زبانوں میں بڑی مہارت وقدرت رکھتے تھے، چنانچہ دونوں زبانوں میں آپ کی مختلف تصنیفات ہیں اور کئی کتابیں ندوۃ العلماء کے نصاب میں بھی داخل ہیں۔

آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، آپ نے ہر میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں، چاہے تقریر کا میدان ہو' تحریر کا' علم کا میدان ہو یا ادب کا، نظم وانتظام کا معاملہ ہو یا امت کے پیچیدہ مسائل، آپ نے ہمیشہ جوڑنے کا کام کیا، حضرت مولانا علی میاںؒ کے بعد جس طرح کے خطرات نظر آرہے تھے ان کا سد باب کیا، آپ نے ان کی جانشینی کا حق ادا کر دیا، ندوۃ العلماء کو ترقی کے بام عروج پر پہنچایا، آپ نے مختلف مکاتب فکر کے لوگوں کو ندوہ سے جوڑے رکھا۔

آپ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے آپ سچے جانشین ثابت ہوئے، علم وادب، تحریر وتقریر، نظم وانتظام اور اس کے ساتھ ساتھ صورت وشکل کی مشابہت۔ آپ کو دیکھ کر کبھی کبھی یہ شبہ ہوتا تھا کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب تشریف فرما ہیں۔

ایک پیکر یقیں اور پیکر استغنا کی رحلت

مولانا وزیر احمد اعظمی ندوی
(شارجہ-متحدہ عرب امارات)

آہ مربی جلیل رحمۃ اللہ علیہ! آہ! کیسے لکھوں، کیا لکھوں، اپنے جذبات کو الفاظ کے سانچوں میں کیسے ڈھالوں، دل پر جو گذری ہے گذر رہی ہے، اس کو کیسے بیان کروں، دل غمگین کو کیسے سنبھالوں، دماغ ماؤف ہے، دل پژمردہ ہے، اس کو کیسے تسلی دوں؟

میرا محسن چلا گیا، میرا مربی گذر گیا، اپنے آپ کو کیسے سمجھاؤں؟

اس آیت ربانی پر مکمل یقین ہے: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ☆ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَام﴾

پھر بھی دل میں ایک کسک ہے، ایک غم ہے جو اندر سے کھائے جارہا ہے، اس آیت قرآنی پر مکمل اذعان ہے: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ پر دل ہے کہ مانتا ہی نہیں۔

ہم لوگوں نے مربی جلیل استاذ محترم حضرت مولانا محمد رابع صاحب حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بغیر ندوہ کا تصور بھی نہیں کیا تھا، ہم نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ مولانا محمد رابع صاحب ندوہ ہیں، ان سے ندوہ کا وجود ہے، دارالعلوم کی درسگاہوں کی رونق مولانا کی رہین منت ہے، مولانا ہیں تو مادر علمی کی ضیاء پاشیاں ہیں، مولانا ہیں تو مسلم پرسنل لا بورڈ کی سرگرمیاں ہیں، مولانا ہیں تو رابطہ ادب اسلامی کی ادبی وثقافتی کہکشائیں ہیں، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور معارف کی موشگافیاں ہیں، تکیہ رائے بریلی کی پرنور محفلیں ہیں۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرت آیات پر ندوہ کے بام ودر نوحہ کناں ہیں، کلیۃ اللغۃ العربیہ کی کلاسوں میں غم واندوہ کی چادر تن گئی ہے، رائے بریلی کی رونق بار مجالس خاموش ہیں، دار المصنفین اور معارف کی مجلس ادارت ماتم کناں ہے، مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت میں بھی غم والم پسرا ہوا ہے۔

مولانا کیا گئے، ان کے ساتھ پتہ نہیں کتنی چیزیں چلی گئیں، وہ صرف ایک استاذ نہیں نسلوں کے مربی تھے، ندوی روایات وثقافت کے امین تھے، خاندان حسنی کی لاج تھے، تقدس وتقویٰ کا بھرم ان سے قائم تھا، تواضع وخاکساری طغرائے جبین نیاز تھی، علم وادب سے لگاؤ ان کی شناخت تھی، فکر سلیم، اعتدال اور مثبت سوچ ان کی شخصیت کے تانے بانے تھے، مختلف افکار ونظریات کے حامل افراد وتحریکات کے درمیان تال میل قائم کرنے کا ان کو سلیقہ تھا، تدریس، تصنیف وتالیف اور دعوتی واصلاحی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ نظم ونسق کی خوبیوں سے بھی مالا مال تھے، وہ ادب اسلامی کے نقیب، دعوت اسلامی کے سالار اور فکر اسلامی کے عظیم رہنما تھے۔

انہوں نے ادب عربی کو اپنی لٹریچر سے مالا مال کیا، تو فن نقد کو بھی اصلاحی اور تعمیری رموز ونکات سے روشناس کرایا، عصر حاضر میں دعوت اسلامی کے تقاضوں، رجحانات اور ضرورتوں پر روشنی ڈالی تو جزیرۃ العرب کا جغرافیہ اس وقت لکھا جب کہ تیل وپٹرول کی دولت سے مالا مال عرب ممالک تہی دامن تھے، دنیا ان کے جغرافیائی حدود سے نا آشنا تھی۔

ربطہ ادب اسلامی کے بینر تلے انہوں نے ادب اسلامی کی آبیاری کی، ''ادب برائے ادب'' نظریہ کی بیخ کنی کی، ادب برائے زندگی کی انہوں نے بھر پور وکالت کی اور عربی اور اردو دونوں زبانوں میں اپنے سینکڑوں مقالات کے ذریعہ ادب اسلامی کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ کیا، مستقبل میں ان کی تصنیفات وتالیفات

ادب اسلامی کے بیش قیمت مراجع ومصادر کی حیثیت سے معروف ومشہور رہوں گی۔

مربی جلیل کی کن خوبیوں کا تذکرہ کروں، کن کن صفات کو گناؤں، کون کون سے کمالات کو بیان کروں، کن خدمات کو خراج عقیدت پیش کروں، مربی جلیل اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

ان کے اخلاق حسنہ اور صفات جلیلہ کو بیان کرنے چلوں تو دفتر کا دفتر سیاہ ہوجائے، وہ پیکر عشق، پیکر یقین اور پیکر استغنا تھے، علامہ اقبال کے ان اشعار کی وہ جیتی جاگتی تصویر تھے:

اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب اس کی نگاہ دل نواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل وپاک باز

ان کی وفات سے عالم اسلامی اور ندوہ میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے، اس کا پر ہونا بظاہر مشکل نظر آتا ہے، ایسا لگتا ہے کہ حضرت مولانا علیہ الرحمۃ کے سانحہ وفات سے ہر چیز پر سکوت سا چھا گیا ہو اور غم والم کی اس کیفیت سے دنیا کی ہر چیز دوچار ہے، ان کی وفات کا غم صرف ایک فرد کا غم نہیں پوری امت کا غم ہے۔ بقول شاعر۔

یہ مجھے چین کیوں نہیں آتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

مولاناؒ تو اس دنیا سے رخصت ہوکر رب کے حضور پہنچ چکے ہیں، لیکن ان کی یادیں ندوہ کے ذرہ ذرہ میں بسی ہیں، ان کی خدمات نے پورے عالم اسلامی کو اپنے دامن میں سمیٹ رکھا ہے، ادب اسلامی، فکر اسلامی اور دعوت اسلامی کے گوشوں کو جلا بخشی ہے، امت اسلامیہ ہندیہ کی انہوں نے کس مپرسی کی عالم میں قیادت کی ہے۔

بارالہا! میرے محسن کی مغفرت فرما، اس کی خدمات کے شایان شان اس کو بدلہ عطا فرما، اس پر اپنی رحمت ومغفرت کو سایہ فگن کر، جنت الفردوس میں جگہ نصیب کر، اس کے پس ماندگان، خانوادہ حسنی کے ایک ایک فرد، ندوہ کے اساتذہ، منتظمین اور ارباب حل وعقد کو اس حادثہ فاجعہ پر صبر واستقامت نصیب فرما۔ امت اسلامیہ ہندیہ اور تمام متعلقین ندوہ اور ان کے شاگردوں کو اس المناک سانحہ پر صبر و استقامت سے سرفراز فرما اور مولاناؒ کا نعم البدل عطا فرما۔ آمین!

تعلیم-ترقی کا ایک اہم ذریعہ

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

”یہ ملک سیکولر ہے، حکومت مسلمانوں اور اسلام کی سرپرستی نہیں کررہی ہے، ہم نہ تو مطالبہ کرسکتے ہیں، نہ توقع کرنی چاہیے، نہ ان کو امت کے مسائل کی مدد کرنی ہے اور نہ وہ کریں گے، خاص طور سے تعلیم کے مسئلہ میں۔ تعلیم آدمی کو آدمی بناتی ہے، اس سے صلاحیتیں پیدا ہوتی ہیں، ملک کی طرف سے جو تعلیم دی جارہی ہے، وہ ہم کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے والی تعلیم ہے، ضرورت ہے کہ نئی نسلوں کو ایسی تعلیم دلوائیں کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرسکیں۔ حکومت جو تعلیم دے گی وہ سیکولر ہوگی، یا دوسرے کسی مذہب کی تعلیم ہوگی، تھوڑی بہت کوشش کرکے کم سے کم ایسی بنیادی تعلیم تو دے دی جائے کہ دین باقی رہے، اللہ، رسول ﷺ کو تو پہچانتے رہیں، نئی نسل جانے گی نہیں تو کیسے سیکھے گی، تعلیم کی فکر کرنی چاہیے، جب تک ہم اس کی فکر نہیں کریں ترقی نہیں کرسکتے، تعلیم یافتہ تو ہوجائیں گے لیکن مسلمان نہیں رہیں گے، مسلمان مسلمان نہیں رہے گا تو امت ہی ختم ہوجائے گی، اس وقت میڈیا پر یہودیوں کا قبضہ ہے، اقتصادیات پر یہودیوں کا قبضہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہودی لڑکے علم کے پیچھے پاگل ہورہے ہیں۔“ (عالم اسلام اور سامراجی نظام: ۲۰۸)

لیکن تو چیزے دیگری

مولانا ضیاء الدین قاسمی ندوی
(خیرآباد-مئو)

۲۱؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ-۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ء بروز جمعرات فضلائے ندوہ کے مؤقر فورم "ملتقی الندویین" پر سوا تین بجے کے قریب ایک دل دوز پوسٹ پر نظر پڑتے ہی ہوش وحواس مختل، دل کی دھڑکن بے قابو اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا، دیر تک مختصر سے مضمون کو گھورتا رہا، عجیب کیفیت طاری ہوگئی، خبر ہی کچھ ایسی وحشت خیز اور سکونِ قلب کو برباد کرنے والی تھی۔ لکھا تھا:

''ندوۃ العلماء کے ناظم اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اب ہمارے درمیان نہیں رہے۔ ۲۱؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ''

استاذ گرامی منزلت مخدومی ومطاعی مرشدی ومربی حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا سانحہ وفات ایسا عظیم حادثہ تھا کہ جس نے بھی سنا سکتہ اور حیرت کی حالت میں آ گیا، جیسے ہی بجلی کی طرح یہ وحشت ناک خبر عام ہوئی، کائنات علم وادب میں سناٹا پسر گیا، ملت اسلامیہ پر رنج وغم کے سیاہ بادل چھا گئے اور فضلائے ندوہ کی جو کیفیت اور حالت تھی بس اللہ ہی جانتا ہے، یہ ندوۃ العلماء اور اس کے ذمہ داروں، اساتذہ وطلبہ اور عملہ کے لیے یوم عسیر تھا، دل خون کے آنسو رو رہے تھے کہ آہ جس برگزیدہ ہستی کی سرپرستی ونظامت میں ندوۃ العلماء کی تحریک چل رہی تھی اور سب اپنی قیادت عالیہ سے نہ صرف مطمئن تھے بلکہ نازاں وفرحاں تھے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اراکین وممبران جس عظیم المرتبت صدر کی صدارت پر مطمئن اور مسرور تھے، آج وہ ذات گرامی ہم سب کو اللہ کے حوالے کر کے خود جوارِ رحمت میں جا پہنچی، کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں؟! ندوۃ العلماء میں سالانہ امتحان کی تعطیل کلاں چل رہی تھی، تمام طلبہ اور اکثر اساتذہ یا تو اپنے وطن جا چکے تھے یا ندوہ کے لیے مالی تعاون فراہم کرنے کی غرض سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں تھے، تکیہ کلاں رائے بریلی میں معتکفین ہزاروں کی تعداد میں اپنے پیر ومرشد کی لکھنؤ سے بصحت وعافیت واپسی کا انتظار کر رہے تھے کہ حضرت تشریف لائیں تو ہم ان کے اصلاحی بیانات اور تربیتی ملفوظات سے ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی پیدا کریں۔

لیکن قدرت کو تو کچھ اور ہی منظور تھا، اس نے اپنے محبوب اور برگزیدہ بندۂ مؤمن کو اپنے دربار عالی شان میں اعزاز واکرام کے ساتھ بلانے کا فیصلہ رمضان المبارک کے اخیر عشرہ کے پہلے دن اکیسویں تاریخ جمعرات کو طے کر رکھا تھا، اعزاز کی بھی کوئی حد وانتہا ہے؟! رمضان کا مبارک مہینہ ہے جب کہ انوار وبرکات کی بارش ہوتی ہے، ثواب کا گراف کئی سو گنا بڑھ جاتا ہے، پھر عشرۂ اخیرہ جس میں قرآن کریم نازل ہوا اور جس میں لیلۃ القدر کو طاق رات میں رکھا گیا، جس کی عظمت میں پوری سورہ نازل فرمائی گئی اور لسان نبوت سے آخری عشرۂ رمضان کی فضیلت وبرکت اور اس میں عبادت کے التزام واہتمام سے متعلق معتد احادیث صادر ہوئی ہیں، خود رسول کائنات ﷺ تا حیات مدینہ منورہ میں آخری عشرہ کا اعتکاف فرمایا کرتے تھے، اللہ رب العزت اس ماہِ مبارک کے آخری عشرہ میں کسی کو اپنے پاس بلائے تو اس سے بڑھ کر نیک فال اور کیا ہوگا کہ عرش الٰہی پر اپنے خاص بندہ کو "براءۃ من النار" کا پروانہ مغفرت ورحمت عطا کرنا چاہتا ہے۔

میں تصور کی نگاہوں میں اسی بے چینی و بے سکونی کی حالت میں سوچنے لگا کہ صلاح وتقویٰ، زہد واستغنا اور اخلاص وللّٰہیت، اعتدال وتوازن اور طاعت وعبادت، ذکر وتلاوت سے معمور، آہ سحر گاہی اور ابتہال وتضرع سے آباد کتنی پیاری زندگی گزاری میرے حضرت نے اور کتنی پیاری وفات پائی میرے مرشد نے! فرشتے ادب واحترام سے خدمت میں حاضر ہوئے ہوں گے کہ نواسۂ خاتم المرسلین (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خدا نے بلایا ہے، اس لیے فرمایا ہوگا: ﴿یَا أَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ☆ ارْجِعِی إِلَی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً﴾ اور جب پاکیزہ روح معطر ومعنبر چادر میں لپٹی ہوئی اپنے خالق ومالک کے حضور حاضر ہوئی ہوگی تو رب العالمین نے پیار سے فرمایا ہوگا: ﴿فَادْخُلِی فِی عِبَادِی ☆ وَادْخُلِی جَنَّتِی﴾

اللہ اکبر! یہ اعزاز ہر ایک کی قسمت میں کہاں؟! یہ تو انہی خاصانِ خدا کو نصیب ہوتا ہے جس نے اپنی زندگی کے شب وروز اور ماہ وسال کو اپنے رب کی رضا جوئی اور اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں گزارا ہے، جن خاصانِ خدا کو اللہ نے ﴿عِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِینَ یَمْشُونَ عَلَی الْأَرْضِ هَوْناً﴾ سے یاد فرمایا ہے، انہی سے کہا جائے گا: ﴿فَادْخُلِی فِی عِبَادِی﴾ اور یقین ہے کہ ہمارے حضرت ''عباد الرحمٰن'' میں سے تھے۔

موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے سب کو گزرنا ہے، جب انبیاء ومرسلین علیہم السلام کو حیات جاودانی نہیں ملی تو باقی تو سب ان سے ہزار ہا درجہ نیچے ہیں، یہ نظام قدرت کا ایک حصہ ہے کہ جو بھی اس دنیائے فانی میں آئے گا، وہ ایک دن یہاں سے جائے گا، یہی اعلان قرآن کرتا ہے: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَیْهَا فَانٍ ☆ وَیَبْقَی وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ کہ اس کائنات ارضی میں جو بھی ہیں سب کو فنا کے گھاٹ اترنا ہے، باقی آپ کے رب کی ذات رہنے والی ہے جو بڑی عظمت وجلالت اور اکرام واحترام والا ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا سید محمد رابع حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے اوراق ہمارے درمیان مرتب شکل میں موجود ہیں، نیز ہمارے جیسے ہزاروں تشنگان علوم وفنون اور بے شمار علماء صالحین اور بزرگان دین نے ہمارے حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بہت قریب سے دیکھا ہے، ہر زبان سے ان کے محاسن ومحامد ہی سننے کو ملے ہیں۔ ان کی ذات علم ومعرفت کا سرچشمہ صافی تھی، جس کے پانی میں قلب وجگر کی اصلاح کرنے کی تاثیر تھی، آپ آسمان رشد وہدایت کے وہ نیر تاباں تھے جس کی پاکیزہ شعاعوں نے ہزاروں دلوں کو روشن کیا، آپ کی شخصیت مشتاقان علوم وفنون کی مرجع ومنبع اور طالبان علوم نبویہ کے لیے منارۂ نور تھی، ہمارے جیسے ہزاروں طلبہ نے ان کے بحر علم ومعرفت سے حسب توفیق جرعہ کشی کی اور جس کی حلاوت ولذت ابھی تک محسوس کرتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ یقیناً اس عہد زوال وانحطاط میں ''برکۃ من برکات اللہ'' تھے، آپ کی پوری زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ ان نفوس قدسیہ میں سے تھے جن کی حیات طیبہ اتباع سنت اور اطاعت رب میں گزرتی ہے، وہ اللہ کی رضا کے لیے جیتے اور مرتے ہیں، شریعت کے احکام کی پاسداری اور ایمان وعقیدہ کی درستگی وپختگی، ملت اسلامیہ کی خیر خواہی اور غضب ورضا کی حالت میں بھی اخلاق حسنہ کی رعایت جن کی پہچان ہوتی ہے، ﴿وَالْكَاظِمِینَ الْغَیْظَ وَالْعَافِینَ عَنِ النَّاسِ﴾ جن کا شعار ہوتا ہے، ﴿إِنَّ الَّذِینَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا﴾ جس کی پہچان وشناخت ہوتی ہے۔

حضرت الاستاذ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی امتیازی خصوصیات پر لکھنے والے اپنے اپنے تجربات ومشاہدات اور جذبات کے تحت لکھیں گے، اسلوب وانداز کا تنوع ہوگا، کیوں کہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اللہ رب العزت نے ان کو بے پناہ متنوع صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا تھا، وہ اپنی ذات وصفات میں مجمع الکمالات اور محور المحاسن تھے، بہت کم ایسا دیکھنے کو ملتا ہے کہ اس دور زوال اور عہد بے عملی میں کوئی شخصیت بیک وقت مختلف علوم وفنون اور معارف کی جامع ہو، قرون ماضیہ میں یہ بات نادر ونایاب نہیں

تھی، لیکن ہمارے دور میں تو صدیوں میں چند ایک شخصیات ہی گزری ہیں، انہی نادرۂ روزگار شخصیات میں مرشدی ومخدومی مولانا محمد رابع حسنی رحمۃ اللہ بھی تھے، وہ ایک مفکر ومدبر قائد تھے، کامیاب اور مقبول استاذ تھے، مخلص وبے لوث مربی تھے، صاحب اسلوب ادیب اور اردو وعربی زبان کے رمز شناس قلم کار، راہِ سلوک وتصوف کے بلند مقام مصلح اور دعوت وتبلیغ کے میدان میں سرگرم عمل عالم وداعی تھے، ان کی تحریروں میں امت کی فلاح وبہبود کے اسرار پنہاں ہوتے تھے، رابطۂ ادب اسلامی کے سربراہ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر نشین ہونے کے ساتھ متعدد ملی ودینی جماعتوں اور تنظیموں اور تعلیمی اداروں کے سرپرست اور رکن رکین تھے، ان کا دنیا سے گزر جانا سب کے لیے عظیم خسارہ اور بین الاقوامی سانحہ تھا، ایک دنیا نہیں کئی دنیا ویران ہوگئیں۔

وہ اپنے خاندانی پس منظر میں بھی ممتاز ونمایاں مقام رکھتے تھے، اولیاء اللہ کی چند گھروں پر مشتمل چھوٹی سی بستی تکیہ کلاں رائے بریلی سے آپ کا نسبتاً حسنی رشتہ تھا، اپنے عہد کے مصلح ومربی بزرگ شاہ علم اللہ اور سید احمد شہید، حضرت شیخ ضیاء النبی، نانا سید عبدالحی حسنی ندوی، سید امین نصیر آبادی جیسے بزرگان دین اور صالحین امت جن کا براہ راست شجرۂ نسب مختلف مستند واسطوں سے حضرت حسن بن علیؓ سے اور حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا سے ملتا ہے، اتنا پاکیزہ رشتہ پھر آپ کی ابتدائی تعلیم وتربیت میں خال محترم مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی خصوصی توجہات، ان کے بعد آپ پر اپنی محبت وشفقت نچھاور کرنے والی ذات مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی تھی، سال ولادت (۱۹۲۹ء) اور سال وفات (۲۰۲۳ء)، اس ترانوے سالہ زندگی میں سے ستر سال آپ کا حضرت مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ کی نگرانی وتربیت اور معیت ومصاحبت میں گزرا، آپ نے اپنے آپ کو اپنے مربی جلیل خال محترم مولانا علی میاں ندوی کے حوالے کر دیا تھا، سفر وحضر میں ان کے معاون ووزیر بنے رہے، کسی موقع پر بھی اپنی رائے اور جذبات کو ترجیح نہیں دی، ان کے اشارۂ ابرو کو حکم مان کر عمل کرنا ہمارے استاذ محترم کا شیوہ بن گیا تھا اور اسی کے ساتھ اہل دل علماء صالحین اور بزرگان امت کی خصوصی توجہات وعنایات بھی آپ پر پوری طرح تھیں، حضرت شیخ عبدالقادر رائے پوری، حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی، حضرت تھانوی، حضرت شیخ الحدیث مولانا مسلم عطا جیسے نوابغ زمانہ سے کسب فیض اور اصلاح حال نے آپ کی شخصیت کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا تھا اور پھر اللہ نے ہمارے استاذ محترم کی ذات میں وہ اوصاف وکمالات پیدا کر دیئے کہ آپ کی ذات امت واحد کا مصداق بن گئی، کسی عربی شاعر کا یہ شعر آپ پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے:

لیس علی اللہ بمستنکر
أن یجمع العالم فی واحد

حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو ندوۃ العلماء میں اپنی طالب علمی کے آغاز ۱۹۷۹ء سے ۱۹۸۴ء تک ایک استاذ ومربی کی حیثیت سے بہت قریب سے دیکھا، ہم علیا ادب کے طلبہ کا براہ راست آپ سے استاذ وشاگرد کا واسطہ تھا۔

استاد محترم کتاب وسنت کی روشنی میں:

مولانا کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا کے عمید تھے، اس بڑی ذمہ داری کے ساتھ پورے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے تعلیمی نظام کی درستگی، اساتذۂ کرام کی صلاحیتوں کے اعتبار سے کتابوں کا ان کے لیے انتخاب، تدریسی ذمہ داریوں کی تفویض بھی آپ کے ذمہ تھی، کب جزوی طور پر نصاب میں تبدیلی کرنی ہے، مزید برآں حضرت مفکر اسلام علی میاں ندویؒ کی تمام انتظامی وتنظیمی امور کی ذمہ داری بھی آپ کے سر پر تھی اور ہم دیکھتے تھے سب کو ساتھ لے کر کسی قدر حکمت عملی سے چل رہے تھے، انھوں نے بڑے سے بڑے منصب کا استعمال اپنی ذات کو نمایاں کرنے میں کبھی نہیں کیا، بلکہ حزم واحتیاط اور دیانت کا یہ حال تھا کہ دفتر کی کسی بھی چیز کا استعمال اپنی ذاتی ضرورت کے لیے نہیں کیا اور آخری دور تو بغیر تنخواہ لیے گزرا، سچ کہتا

ہوں کہ آپ جیسا خلیق ومتواضع، منکسر المزاج اور بردبار، حلیم الطبع، راسخ فی العلم والفن، بے لوث وبے ریا اور طلبہ کے حق میں مخلص، شیریں کلام، نرم مزاج استاذ کہیں نہیں دیکھا، جب میں آپ کی زندگی اور سیرت وطبیعت کا قرآن وسیرت کی روشنی میں جائزہ لیتا ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ آپ کی زندگی قرآن کی اس آیت سے عبارت تھی:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْناً وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوا سَلَاماً☆وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَقِيَاماً﴾(الفرقان: ٦٣-٦٤)

(اوراللہ کے پیارے وہ لوگ ہیں جو زمین پر وقار وسکون سے چلتے ہیں اور جب کوئی نادان ان سے الجھتا ہے تو سلامتی کی باتیں کرتے ہیں اور اپنی راتیں اپنے رب کے سامنے رکوع کرتے سجدہ کرتے گزارتے ہیں)

سورۂ فرقان کی ان تین آیتوں پر غور کریں، پھر مرشد امت حضرت الاستاذ مولانا محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے اوصاف پر غور کریں، آپ کی عملی زندگی ان آیات کریمہ کی تفسیر نظر آتی ہے، ان کی چال ڈھال نہایت متوازن، باوقار اور سنجیدہ ہوتی تھی، نہ چلنے میں عجلت نظر آتی، نہ بدن کو جھٹکے لگتے، نپے تلے قدم اٹھاتے تھے، انتہائی پرسکون انداز میں مسکراتے ہوئے کلاس میں تشریف لاتے اور اسی سکون ومتانت کے ساتھ باہر جاتے، آفس میں جائیں یا مہمان خانہ کی طرف فٹ بال گراؤنڈ سے ہوتے ہوئے روڈ پر چلیں یا تنگ راستہ پر، ہم نے نہ کبھی آپ کی چال میں تیز رفتاری دیکھی، نہ ہی انتہائی سست روی، بلکہ سبک خرامی ہی پائی، جوتوں کی چاپ بھی نہیں سنائی دیتی، اکثر دیکھا کہ گیٹ پر آپ اور مولانا واضح رشید صاحب رکشہ سے اترتے، دونوں بھائیوں کے ہاتھ میں ضروری کاغذات سے بھرا ہینڈ بیگ ہوتا، پھر اِدھر اُدھر دیکھے بغیر حد درجہ متانت سے مہمان خانہ کی جانب یا پھر درس گاہوں کی طرف چلے جاتے، راہ میں ملنے والے طلبہ سلام کرتے تو ہونٹوں پر مسکراہٹ کے ساتھ واضح الفاظ میں جواب دیتے، تواضع وانکساری کا یہ عالم ہوتا کہ اگر کوئی طالب علم یا شہر کا کوئی شخص درمیان راستہ میں اپنی بات عرض کرتا تو کھڑے ہوکر سکون سے سنتے، لبوں پر تبسم رقصاں ہوتا، جب تک وہ پوری بات نہ کر لیتا استاذ محترم جگہ پر کھڑے رہتے اور سن کر فرماتے: ''اچھا غور کریں گے، ملتے رہیں، یاد دلاتے رہیں'' بعض دفعہ میں نے دیکھا کہ دوپہر ایک بجے کے بعد جیسے کلاس ختم ہوتی، آپ اور مولانا واضح رشید صاحب ایک ساتھ باہر نکلتے، اکثر وسیع میدان عبور کر کے آنے جانے کا عام معمول اس وقت طلبہ واساتذہ کا تھا، اسی دوران میدان میں ہی کوئی طالب علم کسی ضرورت سے ملاقات کر لیتا تو وہیں دھوپ میں کھڑے ہوکر سننے لگتے، بسا اوقات دس پندرہ منٹ کا وقت لگ جاتا تھا، یہ تو بار بار کا تجربہ ومشاہدہ تھا اور ملنے والے ذرا سنجیدہ قسم کے طلبہ ہوتے تھے، اگر کوئی عام ملازم بھی بات کرتا تو غور سے سماعت فرماتے، بعض نادان اور ان کے مقام ومرتبہ سے ناواقف ملاقاتی تیز وتند لہجہ میں بات کرنے لگتے تھے، اس وقت بھی آپ کی سنجیدگی اور خوش اخلاقی قائم رہتی، بہت ہی نرم اور شیریں انداز میں جواب دیتے اور سمجھاتے تھے، پورے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں کوئی طالب علم یا ملازم نہیں ملا جس نے حضرت مولانا محمد رابع صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس قرآنی وصف کو تسلیم نہ کیا ہو، خوش اخلاقی کا یہ معیار رسول کائنات ﷺ کے اخلاق حسنہ کا نمایاں حصہ تھا، آنحضور ﷺ سے بھی جب کوئی ملتا، بات کرتا یا مصافحہ کرتا تو آپ پوری توجہ سے مخاطب کی بات سنتے تھے، ذرہ برابر بھی بے التفاتی نہ فرماتے اور جب مخاطب اپنی بات پوری کر لیتا تب نرم وشگفتہ انداز میں جواب مرحمت فرماتے، مصافحہ کرنے والا جب تک اپنا ہاتھ خود نہ ہٹاتا، حضور پاک ﷺ بھی ہاتھ از خود نہ کھینچتے تھے۔

ایسا نہیں کہ یہ میرا اپنا چند سال کا تجربہ ومشاہدہ ہے، بلکہ تادم واپسیں حضرت مولانا کا یہی اخلاق رہا، مہمان خانہ میں بھی اگر کوئی اجنبی ملاقاتی آجاتا تو دیر دیر تک اپنے مسائل ان کے سامنے بیان کرتا، ان کی صحت وعلالت کی پرواہ کیے بغیر لمبی لمبی گفتگو کرتا، کبھی بھی آپ نے نہیں فرمایا کہ اب تشریف لے جائیں پھر سنیں گے، اس وقت ذرا مصروف ہیں، ہر قسم کے لوگ آتے تھے، سیاسی مسئلہ لے کر، گھریلو

معاملہ لے کر، امداد وتعاون کے لیے، سب کی سنتے بلکہ اجنبی ہوتا تو آپ احساس بھی نہیں ہونے دیتے کہ پہچانا نہیں، ملاقاتی سے اس قدر بشاشت اور خوش دلی سے ملاقات فرماتے گویا برسوں سے جانتے ہیں، ہر ملنے والا یہی محسوس کرتا کہ مجھ سے خصوصی محبت فرماتے ہیں۔

زندگی کے آخری چند سالوں میں جب چند بے عقل وخرد لوگوں نے ندوہ میں طوفان بدتمیزی برپا کیا تھا، طرح طرح سے ان جاہلوں نے حضرت کو اذیت دی، اللہ کے اس ولی کی شان میں پے در پے گستاخیاں کیں، قسم قسم کے الزامات لگائے، بہتان تراشیاں کیں بلکہ گالیاں تک دیں، لیکن آپ نے لفنگوں بدقماشوں کے حق میں سلامتی کی باتوں کے سوا کبھی کچھ تیز لب ولہجہ میں نہیں کہا، ہمیشہ صبر وتحمل اور برداشت سے کام لیا، یہ انداز صرف ہمارے صحابہ کرام اور سلف صالحین میں پڑھنے کو ملتا ہے، میں اکثر ندوہ حاضر ہوتا رہتا ہوں، جب بھی حاضری ہوئی تو میں نے اپنے احباب کا سلام پہنچایا اور ان کے گستاخانہ لب ولہجہ اور جارحانہ خطوط، غیر انسانی اسلوب پر اپنے دوستوں کے غصہ اور ناراضگی کو بتایا، غور سے سنتے تھے اور فرماتے: ''اگر ہم بھی وہی انداز اختیار کریں گے تو سوائے نقصان ہونے اور بات بگڑنے کے کچھ نہیں ہوگا، ہر بات پر ردعمل نہیں ظاہر کیا جاتا۔'' یہ تفصیلی گفتگو حضرت سے تکیہ رائے بریلی میں جناب مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی اور مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی، مولانا محمد وثیق ندوی اور مرحوم حشمت اللہ ندوی کی موجودگی میں ہوئی، حضرت اس وقت انتہائی کرب واضطراب میں تھے لیکن آپ کی طبعی بشاشت میں کوئی فرق نظر نہیں آیا، انھوں نے اس موقع پر مکہ والوں کے ساتھ یوم فتح کے موقع پر رویہ کا ذکر فرما کر ہم سب کو پرسکون رہنے اور لہجہ کو غیر معتدل ہونے سے بچانے کی نصیحت بھی فرمائی تھی، یہ تھا ﴿وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَاماً﴾ کا نمونۂ عمل!

اللہ کے رسول ﷺ کے شمائل کا ذکر کرتے ہوئے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

"لم يكن النبي صلّى الله عليه وسلّم فاحشاً متفحشاً ولا صخاباً في الأسواق ولا يجزي بالسيئة السيئة ولكن يعفو ويصفح۔" (سنن الترمذي، رقم الحديث: ٢٠١٦)

(نبی اکرم ﷺ نہ فحش گو تھے، نہ فحش حرکتیں کرتے تھے، نہ ہی بازاروں میں چلا کر بولنے والے تھے اور آپ نے کبھی برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیا، بلکہ آپ معاف اور درگذر کرنے والے تھے۔)

یہ حدیث حضرت ناظم صاحب پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے، ہم نے اپنی پوری طالب علمانہ زندگی اور بعد کی زندگی کبھی بھی مرشد امت کو اپنی زبان کو نازیبا اور عامی لفظوں سے آلودہ کرنے والا نہیں پایا، آپ کی تیز کلامی، تند مزاجی اور غضب ناکی کی ایک بھی روایت دوست یا دشمن سے نہیں سنی، جس نے جب بھی آپ سے ملاقات کی، تبسم ریز مشفقانہ انداز ہی پایا، مشکل سے مشکل گھڑی میں بھی انھوں نے اپنے وقار، خاندانی شرافت اور طبعی وجاہت کو ترک نہیں کیا، اگر ہر وقت ساتھ رہنے والے برادر صغیر استاذی ومخدومی مولانا سید واضح رشید ندوی صاحب کسی بات پر غصہ بھی ہو جاتے تو حضرت فرماتے: ''واضح! یہ لہجہ مناسب نہیں ہے'' اور مولانا فوراً پر سکون ہو جاتے، میں نے سینکڑوں بار حضرت الاستاذ سے مختلف اوقات میں شرف ملاقات حاصل کیا، ان کے دسترخوان پر ساتھ میں بارہا ظہرانہ اور عشائیہ تناول کرنے کا اعزاز پایا، تنہا ان کے ساتھ متعدد بار صبح کا ناشتہ بھی کیا، لیکن ایک دفعہ بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ کی ذات سے کسی کے حق میں بدگوئی یا غیبت صادر ہوئی ہو، اگر کوئی کسی کا شکوہ کرتا یا برائی بیان کرتا تو حضرت مرشد ملت انتہائی دور اندیشی سے بات کا رخ موڑ دیتے تھے، میں ذرا گستاخ اور جری قسم کا واقع ہوا ہوں، بڑوں کی قدر ومنزلت اس احترام سے نہیں کر پاتا جس کے وہ حق دار ہوتے ہیں، اس لیے ذرا کھل کر بات کرنے لگتا تھا، بہت سارے سوالات، ملکی حالات، سیاسی حالات وغیرہ سے متعلق کر گذرتا تو حضرت بہت ہی نرم اور شیریں انداز میں جواب دیتے، حالات کا رخ بتاتے، مسکرا کر ہر بات کرتے، ان کے لبوں پر تو گویا ملکوتی تبسم اللہ نے ثبت کر دیا تھا، یہ وہ فطری خوبیاں تھیں جو ہمارے حضرت

رحمۃ اللہ علیہ کو قدرت حق سے ودیعت ہوئی تھیں، سیرت النبی ﷺ کا عکس جمیل نمایاں تھا، ان کی زندگی کے کسی گوشہ میں تندخوئی، بدمزاجی، شدت پسندی، سخت دلی، ترش روئی کا رویہ نہ دور شباب میں کسی نے دیکھا، نہ ہم نے اپنے چالیس سالہ ربط وتعلق اور تلمذ زندگی میں کبھی محسوس کیا، یہی اسباب تھے کہ آپ کی محبت اللہ نے لوگوں کے دلوں میں بیٹھادی تھی، جو بھی خواہ عالم ہو کہ عامی آپ سے ملاقات کر لیتا تو آپ کے اخلاق حسنہ، سلوک خسروانہ اور انداز دلبرانہ کا شیدا بن جاتا تھا، یہ خالص نبوی اوصاف ہیں جو رسول اللہ ﷺ سے خونی رشتہ ونسبت کی برکت سے خانوادۂ حسنی کے اکابر واصاغر میں منتقل ہوتے آرہے ہیں، اپنے رسول ﷺ کے اوصاف ومحاسن کا ذکر کرتے ہوئے اللہ رب العالمین نے فرمایا:

﴿وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ﴾ (آل عمران: ۱۵۹) (اے رسول! اگر آپ بدخو سخت دل ہوتے تو یہ صحابہ آپ کے پاس سے منتشر ہو کر چلے جاتے)

حضرت الاستاذ رحمۃ اللہ علیہ کے بھی چاہنے ماننے اور محبت کرنے والوں میں دن بدن اضافہ ہی ہوا۔ ندوہ کے مہمان خانہ کے ایک تخت پر بیٹھنے والی ذات کے سامنے حکومت کے بڑے بڑے عہدہ دار سر جھکانے آتے تھے اور محبت وعقیدت کے جذبات لے کر واپس جاتے تھے۔

عام طور پر جب عمر طویل ہو جاتی ہے تو دیکھا گیا ہے کہ لوگوں کے اعضاء وجوارح کمزور ہونے کے ساتھ دماغ بھی متأثر ہوتا ہے، یادداشت بھی متأثر ہوتی ہے، لیکن حضرت نے زندگی کے ۹۳ رسال پائے، عزیمت وعظمت اور طاعت وعبادت، صبر واستقامت، تحمل وبرداشت اور اعتدال وتوازن سے بھرپور زندگی گزاری، لیکن تمام تر جسمانی ضعف کے باوجود آپ کا دماغ تر وتازہ، دل بیدار اور یاد داشت قابل رشک رہی، یہ اہل اللہ اور عاشقان رسول عربی ﷺ کے اوصاف حمیدہ میں سے ہے، اللہ کے رسول نے ارذل عمر سے پناہ مانگی ہے، لیکن طاعت وعبادت اور صلاح وتقویٰ سے معمور طویل عمر کو اللہ کا انعام قرار دیا ہے، ایک مرتبہ کسی سائل نے خدمت نبوی میں عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! کون آدمی سب سے بہتر ہے؟ فرمایا:

"من طال عمره و حسن عمله."

(جس کی عمر طویل ہو اور عمل اچھا ہو)

(مسند أحمد و مشكاة المصابيح: ٤٥٠)

کوئی بھی شخص جس نے حضرت مولانا محمد رابع حسنی رحمۃ اللہ علیہ کو قریب سے دیکھا ہے گواہی دینے کو تیار ملے گا کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ اس حدیث کے سچے مصداق تھے۔

حضرت الاستاذ کا انداز تدریس وتربیت:

میں نے اپنے درسی احباب کے ساتھ تقریباً مسلسل تین سال درجات علیا میں حضرت سے کسب فیض کیا ہے، آپ کا انداز انتہائی فطری، سادہ، سلیس، رواں اور معلومات سے لبریز ہوتا تھا، ایسا لگتا تھا کہ معلومات کا خزانہ کھل گیا، اسلوب تدریس ایسا من موہنا اور دل آویز ہوتا تھا کہ گویا منھ سے پھول جھڑ رہے ہیں، کوئی شور وشغب نہیں، حد درجہ سنجیدہ اور مؤثر، گفتگو کرنے جیسا انداز، موضوع پر آپ پوری طرح غالب رہتے تھے، تفسیر وحدیث، ادب وتاریخ اور جغرافیہ اور عالمی سیاسی وجغرافیائی اور ماحولیاتی مسائل پر تبصرہ وجائزہ جب لیتے تو ہم طلبہ کو ایسا محسوس ہوتا کہ گویا یہی آپ کا خاص موضوع ہے، دور اندیشی، بالغ نظری، سیاسی بصیرت، اصابتِ رائے میں آپ ممتاز تھے، جب جغرافیہ جزیرۃ العرب پڑھاتے تو یوں محسوس ہوتا کہ عرب ممالک کے جغرافیائی حدود کا نقشہ ہمارے سامنے ہے، عربوں کی تہذیب وثقافت، مزاج اور ترجیحات، حجاز ونجد کے عربوں کے درمیان مزاج کا تفاوت، اس کے اسباب نیز ان کی خشونت وسنگ دلی پر عرب کی سرزمین کے اثرات، مزید جب صحرائے اعظم الربع الخالی کا تذکرہ فرماتے اور اس کی وسعت وہول ناکی پر گفتگو کرتے تو ایک عجیب سی دہشت محسوس ہوتی، گویا ہمارے سامنے وہ صحرا موجود ہے، موضوع سے متعلق بات کرتے کرتے کوئی بات ضمناً آجاتی تو پھر معلومات کا دریا اس سمت بہنے لگتا، آپ کے درس سے ہم نے بین

الاقوامی سیاسی، فکری، جغرافیائی تغیرات کو نہ صرف جانا بلکہ ہماری فکروں میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، تجزیہ کرنے کا سلیقہ آیا۔

اسی طرح جب اپنی کتاب ''الادب العربی بین عرض ونقد'' پڑھاتے تو ایسا لگتا کہ عربی ادب کی پوری تاریخ کا خلاصہ ہمارے سامنے ہے، اشعار کا معیار اور قدیم وجدید شعرائے عرب کے درمیان فرق، جریر وفرزدق کے نقائض اور دونوں کی شاعری کا معیار وگراف، شعراء جاہلی کے اشعار کی خصوصیات، ان کے طبقات کی تعیین اور شعرائے مخضرمین کے امتیازات سب سمجھ میں آنے لگا، ہم نے آپ سے ''دیوان المتنبی'' بھی پڑھی اور ''الفکر الاسلامی العالمی'' بھی، ہر موضوع اور ہر فن پر دسترس، عبور اور رسوخ حاصل تھا، پڑھانے کے دوران حضرت اتنا منہمک ہو جاتے کہ محدود وقت ختم ہو جاتا، لیکن گفتگو کا تسلسل نہیں ٹوٹتا، بات ادھوری بھی رہ جاتی اور مکمل بھی محسوس ہوتی، معلومات کا ایک سبک خرام دریا بہتا نظر آتا، جس کی روانی میں نہ تندی وتیزی ہوتی، نہ سست رفتاری اور ہماری طلب کی کھیتی سیراب ہوتی چلی جاتی۔

کیا کیا لکھا جائے، کس کس وصف پر لکھا جائے، ہر وصف ایسا کہ پوری کتاب تیار ہو جائے، اب ہمارے درمیان حضرت کی باتیں اور یادیں ہیں جو آئندہ نسلوں کے لیے بھی مشعل راہ ہوں گی، اللہ رب العزت حضرت الاستاذ مرشدامت مولانا محمد رابع حسنی ندوی کے درجات کو بلند فرمائے، ان کی ہر قسم کی دینی، علمی، روحانی وتربیتی خدمات کو قبول فرمائے۔ آمین!

وقت کی ایک اہم ضرورت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''اس وقت مسلمانوں کی صورت حال بہت قابل فکر ہے اور اس کے لیے بڑی ضرورت ہے کہ ایسے لوگ تیار ہوں جو لوگوں کو متنبہ کریں اور لوگوں کو صحیح راستہ پر لانے کی کوشش کریں۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں ان کی اصلاح کی کوشش کریں، ورنہ غلط رہنمائی ہوگی۔ آج بہت سے لوگ اہل بدعت ہیں، طرح طرح کی چیزیں گڑھ لی ہیں اور اس کو یہ لوگ اچھے کام سمجھتے ہیں۔ ان کے سمجھ لینے سے وہ کام اچھے تھوڑے ہی ہو جائیں گے، اچھے وہ ہیں جو قرآن وحدیث کی روشنی میں اچھے ہوں۔ جو کام قرآن وحدیث کے مطابق ہیں وہ اچھے کام ہیں اور جو کام قرآن وحدیث کے مطابق نہیں، آدمی نے ان کو اپنے دماغ سے اچھا بنا لیا ہے، چاہے وہ دیکھنے میں کتنے ہی اچھے معلوم ہوتے ہوں، وہ اچھے نہیں ہیں، اس وقت مسلمانوں کے حالات بہت قابل فکر ہیں اور ڈرنے کے ہیں، ہم کو تاریخ بتاتی ہے کہ مسلمان کئی مرتبہ ان حالات سے گذرے ہیں کہ ان کو سزائیں ملیں، بغداد کی تباہی ہے، اندلس کی تباہی ہے، یہ سب یوں ہی تھوڑی ہوئی ہے، بلکہ حالات بہت خراب ہو گئے تھے، اللہ کی نافرمانی بہت بڑھ گئی تھی، تو اللہ نے انہیں سزا دی، لہٰذا کسی کا استثناء نہیں ہے، ہم لوگوں کو اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ ہماری دینی حالت ایسی ہو کہ اللہ کے عذاب سے ہم محفوظ رہیں، اللہ کی پکڑ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ہم کو نواز دے، اللہ کے یہاں بہت رحم ہے، جود وسخا ہے، وہ بندے کو دیکھتا ہے کہ بندہ اللہ کی رضا کے کام کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو برکتوں سے نواز دیتے ہیں، اس کو نعمتوں سے نواز دیتا ہے، لیکن اگر اللہ کی نافرمانی ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ سزا دینے میں جلدی نہیں کرتا، جب انسان نافرمانی میں حد سے بڑھ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سزا دیتا ہے۔''

(علم کی اہمیت اور علماء ومدارس کا کردار: ۱۹)

ایک مثالی شخصیت

ڈاکٹر محمد انس ندوی
(جنرل منیجر اے این آئی سی حلال اتھارٹی - آسٹریلیا)

دارالعلوم دیوبند سے ۱۹۷۴ء میں دورۂ حدیث سے فراغت کے بعد وہیں رہ کر تکمیل ادب کے شعبہ میں داخلہ لیا، مولانا وحید الزماں کیرانویؒ جیسی مردم ساز اور ادب عربی کی باکمال شخصیت سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا، عربی زبان وادب سے شناسائی ہوئی، مولانا رحمہ اللہ کا تعلیم وتربیت کا منفرد انداز تھا، طلبہ کے ساتھ اپنائیت ومحبت، شفقت وہمدردی طلبہ کو ان کا گرویدہ بنا دیتی تھی، ان کا وقار وسنجیدگی طلبہ کے دلوں میں ان کے لیے احترام وعقیدت کے جذبات پیدا کرنے کے لیے کافی ہوتا، زبان سے کچھ کہے بنا طلبہ سے اپنی باتیں منوا لیتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک امتحان کے موقع پر درسگاہ میں طلبہ کو سوالات کا پرچہ دینے کے بعد یہ کہتے ہوئے باہر چلے گئے کہ مجھے یقین ہے کہ آپ لوگ سوالات کے جوابات دینے میں نقل یا ایک دوسرے سے پوچھنے کا خیال بھی نہ لائیں گے اور ہوا بھی یہی، کسی نے دوران امتحان کسی کی طرف نگاہ بھی نہ اٹھائی۔

دارالعلوم میں تکمیل ادب کا کورس پورا ہوا، مجھے تکمیل کی سند تو مل گئی، پر احساس یہی رہا کہ جیسے ابھی تو ہمارا عربی زبان وادب سے بس مختصر سا اور ابتدائی تعارف ہی حاصل ہوا ہے، نہ عربی بولنا آئی اور نہ لکھنا سیکھا، سوائے درسی کتابوں کے دوسرے معاصر عرب مصنفین کی کتابوں یا عربی رسائل ومجلّات کو سمجھنا وپڑھنا بہت مشکل تھا۔ میں نے مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحب کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا: حضرت! تکمیل ادب کا کورس تو پورا ہوگیا، مگر مجھے بڑی تشنگی ہے، ایک سال بعد بھی جدید عربی رسائل ومیگزین پڑھنے و سمجھنے میں بہت دشواری ہوتی ہے، لکھنے کا یہ حال ہے کہ ایک مختصر سا خط یا ادھ صفحے کی تحریر لکھنا بھی آسان نہیں۔

مولانا نے غور سے میری باتیں سنیں، پوچھا: کیا ارادہ ہے؟ اگر عربی زبان وادب کی تعلیم جاری رکھنا ہے تو میرا مشورہ ہے کہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لے لو اور مجھ سے وعدہ لیا کہ ندوہ میں رہتے ہوئے مجھ سے مراسلت جاری رکھنا اور مجھے خط عربی میں خط لکھا کرنا، مجھے وہاں کے تعلیمی نصاب، اسلوب تعلیم وتربیت کے بارے میں مطلع کرتے رہنا، جسے میں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں رہتے ہوئے کافی حد تک پورا کیا۔

۱۹۷۶ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے تعلیمی مہرجان میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی اور اسی سال ندوہ میں تخصص ادب عربی میں میرا داخلہ ہوگیا، میری کلاس میں کل پانچ طالب علم ہی تھے، یہ تعداد دوسرے وآخری سال امتحان کے وقت صرف تین ہی رہ گئی، اتنی مختصر تعداد کو اس وقت ندوہ کے بلند پایہ اساتذہ سے تعلیم وتربیت، خاص توجہ، شفقت وعنایت کا جو حصہ ملا وہ یقیناً بے بہا تھا، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سرفہرست اساتذۂ کرام علم کا سمندر تھے اور دریا کے دریا بخشنے کے لیے تیار تھے، پر یہ ہماری کم ظرفی تھی کہ چند قطروں ہی پر راضی رہے، تخصص ادب دوم کے مقابلے اس وقت فضیلت دوم میں تقریباً ۱۰/ یا ۱۲/ طلبہ ہی تھے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عالمیت، فضلیت اور تخصص ادب کی کلاسز میں طلبہ کی تعداد بہت کم ہوا کرتی تھی اور ان کے تعلیم وتربیت پر مقرر اس وقت کے بہترین اساتذہ تھے جو طلبہ سے بے پناہ محبت وشفقت رکھتے، ان کی تعلیم وتربیت پر ان کی خاص توجہ ہوتی، ہر ایک طالب علم کو یہ احساس ہوتا کہ اس کے اساتذہ کی اس پر خاص توجہ ہے، اس وقت ندوہ کے پرنسپل انتہائی مشفق شخصیت مولانا محبّ

اللہ لاری صاحبؒ اور طلبہ کے مابین وہی تعلق تھا جو ایک مشفق باپ کا اپنے بچوں کے ساتھ ہوتا ہے، ہر ایک کے بارے میں خبر رکھتے اور اور اس کے لیے ہر ممکن خیر خواہی اور ہمدردی کے جذبات رکھتے۔ تخصص ادب دوم کا رزلٹ آنے کے بعد مہتمم صاحب نے اپنی رہائش گاہ پر بلایا اور فرمایا: تمہارے لیے شملہ میں ایک بڑی اچھی ملازمت (امامت وتدریس) کی آفر ہے، تمہارا کیا ارادہ ہے؟ سوچ کر اور اپنے بڑوں سے مشورہ کر کے بتانا، میں نے اپنے گھر اور استاذ مکرم مولانا رابع صاحب سے مشورہ کیا اور طے کیا کہ ندوہ ہی میں رہ کر اپنی تعلیم جاری رکھوں، تکمیل ادب کے یک سالہ کورس میں داخلہ ہوگیا، حضرت مولانا رابع صاحب نے مطالعہ کے لیے ادب عربی کے قدیم وجدید کتابوں کی فہرست مرتب فرمائی اور میں نے حضرت کی اور حضرت مولانا واضح رشید ندویؒ کی نگرانی میں تعلیمی وتدریبی پروگرام شروع کیا، اسی سال ملیشیا کے چند طلبہ نے ندوہ میں داخلہ لیا تھا، اردو زبان ان کے لیے اجنبی تھی، ان طلبہ کی اعدادی تدریس اور درجہ سوم عربی کی انشاء کی کلاسز میرے ذمہ کی گئی، جس سے تعلیم کے عملی میدان میں کام کرنے کا تجربہ وسلیقہ ملا۔

حضرت مولانا رابع صاحب اور مولانا واضح رشید صاحب کی محبت وشفقت نے ان کا گرویدہ بنا دیا تھا، ہر چھوٹے بڑے کام کے لیے بے تکلف ان کے پاس پہنچ جاتا اور بھرپور توجہ اور رہنمائی پاتا، ملاقات کا ہم لوگوں کے لیے مناسب وقت مہمان خانے میں دو پہر کے کھانے کے بعد ہوتا، یہ حضرات اپنے قیلولہ اور قدرے راحت کا وقت اپنے طلبہ عزیز کو دینے سے نہ کتراتے۔

اسی سال ۱۹۷۸ء میں جامعۃ الامام محمد بن سعود کے لیے ندوہ سے دو طالب علموں کا انتخاب ہوا، رفیق محترم مولانا سعید احمد مرتضیٰ بستویؒ کے ساتھ احقر کا نام شامل تھا، ریاض جانے سے قبل ایک دن مہمان خانہ کے باہر ہی حضرت مولانا رابع صاحبؒ سے ملاقات ہوئی، استاذ مکرم مولانا واضح رشید صاحبؒ بھی حضرت کے ساتھ تھے، فرمایا: انس میاں! میں واضح کے ساتھ تمہارے بارے میں ہی بات کر رہا تھا، اللہ نے تم کو اچھی علمی صلاحیتوں سے نوازا ہے، ہمیں اندیشہ ہے کہ باہر جا کر کہیں یہ ضایع نہ ہوجائے، اس وقت سے لے کر اب تک حضرت کے یہ الفاظ رہ رہ کر یاد آتے رہتے ہیں، درست کہا جس نے کہا: قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید۔

ندوہ کے سب ہی اساتذۂ کرام سے قریبی تعلقات رہے، سب ہی سے شفقت ومحبت کا وافر حصہ پایا، خاص طور سے حضرت مولانا رابع صاحب ومولانا واضح رشید صاحب، مولانا سعید الرحمٰن اعظمی صاحب کی عنایات بندہ پر خوب رہیں، بے پناہ اپنائیت ومحبت اور شفقت پدرانہ سے نوازا، اپنی خوش نصیبی پر بجا طور پر فخر محسوس ہوتا ہے۔

ریاض سے تحصیل علمی کے بعد بطور امام ومرشد دینی لندن منتقل ہوگیا، دس سال لندن میں قیام کے بعد اپنے اور بچوں کے لیے بہتر تعلیمی مواقع اور اسلامی ماحول کی خاطر واپس انڈیا آگیا، اپنے وطن الہ آباد میں ۱۹۹۳ء تا ۲۰۰۳ء قیام رہا، اس دوران لکھنؤ اور ندوہ سے ربط مزید بڑھا، برابر حاضری دیتا رہا۔ میرے لیے باعث فخر ہے کہ ان قدسی صفات ہستیوں کے مبارک قدموں نے الہ آباد میں میرے گھر کو رونق بخشی، سخت گرمی کا زمانہ تھا، حضرت مولانا قمر الزماں صاحب مدظلہ العالی کے دولت کدہ پر دو پہر کے کھانے کے بعد قیلولہ ولکھنؤ سفر سے قبل آرام کے لیے میری درخواست قبول فرما کر عزت بخشی اور میرے گھر قبیل مغرب تک قیام فرمایا۔

حسنی خانوادہ کا ایک ایک فرد تواضع، سادگی، زہد وقناعت، استغنا وخودداری اور اخلاص وایثار کا پیکر ہے، حضرت مولانا سید محمد رابعؒ ومولانا واضح رشیدؒ اور مولانا سعید الرحمٰن اعظمی صاحب اُطال اللہ بقاءہٗ بالصحۃ والعافیۃ طلبہ کے ساتھ جس محبت، ہمدردی وخیر خواہی کا معاملہ فرماتے وہ محتاج بیان نہیں، اپنے شاگردوں کی صرف تعلیمی ہی نہیں، ان کے عائلی ومعاشرتی احوال کی خبر گیری، فکر واہتمام اور ہر ممکن اخلاقی ومادی تعاون کے لیے فکرمند رہتے، کئی ایک واقعات دل ودماغ میں مرتسم ہیں۔

سالانہ امتحان ختم ہونے پر مولانا رابع صاحب سے اجازت

چاہی اور عرض کیا کہ کل الہ آباد جانے کا ارادہ ہے، فرمایا: اچھا اتنی جلدی؟ دیکھو ایسا کرو جانے سے قبل کل صبح خاتون منزل آجانا اور ہمارے ساتھ ناشتہ کرنا۔ حضرت کی اس محبت وعنایت سے بہت خوشی ہوئی، محبوب احمد (ابن مولانا قمر الزمان صاحب جوندوہ میں زیر تعلیم تھے) کو یہ خوش خبری سنائی، ہم دونوں کو ساتھ ہی الہ آباد جانا تھا، دوسرے دن صبح رکشہ کر کے خاتون منزل پہنچ گئے، پہنچنے میں کچھ تاخیر ہوگئی تھی، اوپری منزل پر بلایا گیا جہاں دو چار پائیاں جوڑ کر مولانا رابع صاحب، مولانا محمد الحسنی صاحب اور مولانا واضح صاحب گھر کے دوسرے افراد کے ساتھ بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔ ناشتہ کیا تھا؟ بہت سادہ' کچھ تازی و باسی روٹیاں اور آلو کی سبزی، ہم لوگوں کے پہنچنے پر حضرت مولانا رابع صاحب نے کسی کو ناشتہ لانے کے لیے اشارہ کیا اور ہم لوگوں کے لیے تازہ وگرم پوڑیاں، سبزی وجلیبی لائی گئی، یہ منظر دیکھ کر عجیب سا احساس ہو رہا تھا، کتنی سادہ و زاہدانہ زندگی تھی ان حضرات کی، ان قدسی صفات اللہ والوں کی، اپنے لیے کبھی کوئی اہتمام نہیں کرتے تھے، دوسروں کے لیے اور خاص طور سے مہمانوں کے لیے ہر ممکن ایثار کے لیے تیار رہتے، اس کا مشاہدہ سینکڑوں بلکہ ہزاروں نے کیا ہوگا، ندوہ کا مہمان خانہ ہو یا تکیہ رائے بریلی، کھانے کے وقت مہمانوں کے لیے کھانے کا خاص اہتمام ہوتا تھا، ہر ایک کے پاس جانا اور اطمینان کرنا کہ اس تک دسترخوان پر موجود ہر چیز پہنچ گئی، خود یہ حضرات اور ان کے اہل خانہ میزبان گھر سے آئے ہوئے اپنے سادے کھانے ہی پر اکتفا کرتے تھے اور ایسا کہ کسی کو احساس بھی نہ ہو۔

حضرت مولانا رابع صاحب کی عنایات اور آپ کی توجہ ومہربانیوں کو کبھی بھلایا نہیں جاسکتا، رفیق محترم مولانا سعید مرتضیٰ صاحب کے ہمراہ جامعۃ الامام محمد بن سعود (ریاض) کے لیے سفر طے پایا اور لکھنؤ ہو کر جانا تھا، ایک دن قبل ندوہ پہنچ گیا، میرے خالو اور ماموں مجھے لکھنؤ تک چھوڑنے آئے، ندوہ میں حضرت مولانا رابع صاحب سے ملاقات کی اور تعارف ہوا، حضرت نے پوچھا آپ لوگوں کا قیام کہاں ہوگا؟ عرض کیا: لکھنؤ شہر میں کہیں ہو جائے گا، آپ نے فرمایا: نہیں بلکہ یہیں مہمان خانے میں قیام کریں، اتفاق سے اس وقت مہمان خانہ خالی بھی تھا، پھر حضرت نے مجھے الگ لے جا کر کہا: انس میں چاہتا تھا کہ جانے سے قبل تمہاری کھانے کی دعوت کرتا، مگر مصروفیت ایسی ہے کہ ممکن نہیں اور جیب سے بیس روپئے نکال کر دیئے اور فرمایا: لو میری طرف سے یہ رکھ لو۔ اللہ اللہ! ایک گمنام طالب علم اور شاگرد کے ساتھ یہ عنایت وکرم۔ حضرت کی اس عنایت ومحبت نے آنکھیں اشک بار کر دیں، وہ منظر آج اتنے سال گزرنے کے بعد بھی اسی طرح تازہ اور نگاہوں کے سامنے ہے، اس وقت کا بیس روپئے کافی قیمت ومعنی رکھتا تھا اور ایسے استاد کی طرف سے جس کی ماہانہ تنخواہ چار سو روپئے سے شاید ہی زیادہ ہو، اس روپئے کو کافی مدت تک برکتی تعویذ کی طرح محفوظ رکھا۔

لندن میں دس سال قیام (1983-1993) کے دوران کئی بار حضرت مولانا رابع صاحب سے ملاقات ہوئی، آپ مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ کے رفیق سفر ہوتے، آکسفورڈ کے سنٹر برائے اسلامک اسٹڈیز کی میٹنگوں میں شرکت کے لیے تشریف لاتے تو لندن بھی دو ایک روز کے لیے قیام ہوتا، لکھنؤ کے منصور صاحب میزبانی فرماتے، حضرت مولانا کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا اپنے لیے خوش نصیبی سمجھتا، ایک بار آپ حضرات امریکہ کے لمبے سفر سے لندن پہنچے، طویل سفر کافی تھکا دینے والا ہوتا ہے، رات کھانے کے بعد جب سونے کی تیاری ہونے لگی، میں نے استاذ محترم سے کہا: اس سفر نے آپ کو کافی تھکا دیا ہے، مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کا پیر دبا دوں؟ مولانا نے فرمایا: ارے نہیں! اس کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے اصرار کیا تو کہا: اگر یہ خدمت کرنا چاہتے ہو تو ماموں جی کا پیر دبا دو، مجھے تو اجازت دیتے نہیں، تم کوشش کر لو، انہیں واقعی اس کی شدید ضرورت ہے، حضرت مولانا دوسرے کمرہ میں سونے کے لیے تشریف لے جا چکے تھے، بستر پر لیٹے ہوئے تھے، میں دبے پاؤں گیا اور آہستہ سے آپ کے قدموں کو دبایا ہی تھا کہ حضرت

اٹھ کر بیٹھ گئے اور منع کرنے لگے، ارے انس میاں! یہ کیا کر رہے ہو؟ نہیں نہیں! اس کی ضرورت نہیں، میں بھی مصر ہو گیا کہ نہیں حضرت! مجھے تھوڑا سا موقع عنایت فرمائیں، حضرت کو شدید تکان اور پیروں میں درد تھا، جس نے نیند کو بھی دور کر رکھا تھا، میں باصرار حضرت کی پنڈلیوں اور قدموں کو دباتا رہا، اس دوران حضرت نے اتنی دعاؤں سے نوازا کہ بتا نہیں سکتا، کچھ ہی دیر بعد منع کر دیا، اب بس! اتنا کافی ہے، بہت آرام مل گیا، پھر حضرت نے میرا ہاتھ پکڑ کر پُر شفقت کچھ نصیحتیں کیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ روزانہ تین تسبیحات پڑھنے کا التزام کیا کرو، خاص طور سے چونکہ انگلینڈ میں رہتے ہو جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کا ملک ہے، یہاں رہتے ہوئے ایک تسبیح رسول اللہ ﷺ پر صلاۃ وسلام کی ضرور پڑھا کرو۔

لندن قیام کے دوران جب بھی حضرت مولانا علی میاںؒ اور مولانا رابع صاحب تشریف لائے ان حضرات کے پاس ایک ایک لمحہ گزارنا میرے لیے قیمتی سوغات ہوتا، اس دوران حضرت کو میٹنگ میں یا کسی دینی اجتماع میں لے جانا، لوگوں کا دور دراز سے ملاقات کے لیے آنا، تفریح کے لیے پارک میں جانا، ایر پورٹ سے لانا اور لے جانا سب کچھ اور ساری یادیں تازہ ہیں، جو چیز نوٹ کی جانے والی ہوتی وہ کہ سفر میں ہوں یا حضر میں حضرت مولانا رابع صاحب اپنے ماموں جیؒ کے لیے ایک خادم کی طرح پیش آتے، ان کی ہر چھوٹی بڑی چیز کی فکر رکھتے، اپنی ساری ضرورت وخواہش کو پس پشت ڈال دیتے، تواضع وانکساری کا پیکر تھے، اپنے آپ کو مٹا دیا تھا، آپ کے صبر وتحمل اور رواداری کی مثال ملنا مشکل ہوگا۔

مولانا رابع صاحبؒ کے دور نظامت میں ندوہ نے کئی بحرانی حالات سے گزرنے کے باوجود ہمہ جہت کافی ترقی کی، آپ کی حکیمانہ قیادت اور دور اندیشی نے تعلیمی معیار کی بلندی کے ساتھ ندوہ کے نظم ونسق اور تعمیر وترقی کے روشن ابواب درج کیے ہیں۔

اللہ حضرت کی قبر کو نور سے بھر دے، انہیں جزائے خیر سے نوازے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

امت مسلمہ کی امتیازی صفات

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

”ملت کے کسی بھی فرد کو نبی کریم ﷺ کے آنے کے بعد ان سے گریز کی گنجائش نہیں اور اس کے بغیر ایمان معتبر نہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی امت کو ”خیر امت“ قرار دیتے ہوئے اس کا عمل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور خصوصیت ایمان باللہ بتائی ہے اور تاریخ اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ چودہ سو سال اس امت کو شروع ہوتے گذرے ہیں، اس دوران اس کے عمل امر بالمعروف اور عنہی عن المنکر کے نتیجہ میں خدائے واحد کا پیغام دنیا کے ہر سرے میں پہنچا اور جہاں جہاں اور جن جن لوگوں نے اس کو سننے اور جاننے کی طرف توجہ کی، وہاں وہاں یہ قبول بھی کیا گیا اور جہاں اس کی پرواہ نہیں کی گئی وہاں اس کو نظر انداز کیا گیا، لیکن حجت پوری ہوگئی، اقصائے مشرق سے لے کر اقصائے مغرب، اقصائے شمال سے لے کر اقصائے جنوب تک کون سی جگہ ہے جہاں اس کے پیغام کے جاننے اور عمل کرنے والے کچھ نہ کچھ پائے نہ جاتے ہوں اور جن کی زندگی اور جن کا وجود اس بات کی دعوت نہ دیتا ہو کہ ہم کو دیکھو اور اس بات کو سمجھو کہ ہم کیا کہتے اور کیا کرتے ہیں اور وہ تمہارے لیے بھی ضروری ہیں۔ اس پر مزید یہ بات بھی ہے کہ جگہ جگہ اس دین کی اور خدا کی صحیح بندگی کی راہ کی تلقین کرنے والے پورے اخلاص اور محنت کے ساتھ اس پیغام کو پہنچانے اور سمجھانے پر محنت کرتے رہے اور بعض بعض کی محنتوں کا ثمرہ پورے کے پورے علاقہ کی ہدایت پر ظاہر ہوا، اس کی بے شمار مثالیں ہیں اور تاریخ اس کی گواہ ہے، ایران، افغانستان، سندھ وہند اور ممالک مشرق اقصیٰ بنگال تا جاپان، چین، کوریا، منگولیا، سائبریا، فلپائن اور آسٹریلیا سب جگہوں پر یہ دعوت اور اس کے نمونے پہنچے، پہنچانے والوں کا تذکرہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔“ (امت مسلمہ- رہبر اور مثالی امت: ۱۰۹-۱۱۰)

ریاست ٹونک اور حضرت مرشد الامت

مولانا محمد عامر خان ندوی ٹونکی
(ناظم جامعہ سید احمد شہید-ٹونک)

ٹونک اور اہل ٹونک سے آپ کا اور آپ کے خاندان سے تعلق کے گواہ یہاں کے در و دیوار ہیں۔ تاریخی کتابیں ہیں، مسجد قافلہ، محلّہ قافلہ، کلومیاں کی حویلی سادات قافلہ کے مکانات ہیں۔ مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب ندویؒ کا ٹونک سے بہت دیرینہ اور بڑا گہرا تعلق ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ بانی ریاست ٹونک کے ساتھ تقریباً سات سالوں تک رہے۔ تلوار بازی، نیزے بازی وغیرہ کی تربیت نواب صاحب کی فوج میں رہ کر حاصل کی۔ دوسرے نواب سراج الدولہ خان بہادر جنگ سید احمد شہیدؒ سے بیعت تھے۔ آپ کا سید صاحب سے محبت و شفقت کا اتنا معاملہ تھا کہ آپ نے ایک کاتب سید صاحب کے ہمراہ کر دیا جو آپ کے واقعات کو قلمبند کرتا رہتا۔ بعد میں ''وقائع احمدی'' کے نام سے فارسی میں اور پھر اردو میں مجلس نشریات اسلامی ندوۃ العلماء سے یہ مکمل کتاب شائع ہوئی۔ مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے والد محترم جناب سید عبدالحی حسنی صاحبؒ نے ''نزہۃ الخواطر'' میں جہاں علامہ حیدر حسن خان صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا ہے وہاں آپ نے تحریر فرمایا: "بيننا و بينه ودٌ قديم."

علامہ حیدر حسن خان صاحب ندوۃ العلماء میں شیخ الحدیث بھی تھے اور بحیثیت مہتمم کے بھی آپ نے خدمت انجام دی ہے۔ مفکر اسلام کے خاص الخاص اساتذہ میں آپ کا شمار ہوا ہے۔ یہی تعلق و نسبت حضرت مولانا محمد رابع حسنی صاحب ندویؒ نے ہمیشہ اہالیان ٹونک سے رکھی۔ حضرت مفکر اسلامؒ جب ٹونک تشریف لاتے تو یہ شعر بار بار پڑھتے، یہ شعر ورد زبان ہوتا:

چمن کے تخت پر جس دم شہ گل کا تجمل تھا
ہزاروں بلبلیں تھیں باغ میں اک شور تھا غل تھا
کھلی جب آنکھ نرگس کی نہ تھا جز خار کچھ باقی
بتاتا باغباں رو رو یہاں غنچہ یہاں گل تھا

حضرت مولانا رابع حسنی صاحب رحمہ اللہ کا ایک تاریخی سفر تھا۔ اس سفر میں شہر کی کئی اہم شخصیات نے آپ سے بیعت کی اور آپ نے خاص وظائف بتائے۔ قافلہ کے پروگرام سے واپسی پر حضرت آرام کے لیے چلے گئے۔ اور برابر میں برادرم جناب عارف خاں صاحب کے گھر پر چہار بیت اور نعت خوانی کی خوبصورت مجلس سجی جس میں دیر رات تک حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی صاحب تشریف فرما رہے۔ سید مبارک شاہ صاحب کی خوبصورت نعتوں اور غزلوں نے مولانا کو بہت متاثر کیا۔ رات قیام کے بعد دوسرے دن حضرت کا سفر تھا۔ ٹونک سے واپسی پر جے پور جاتے وقت بناس ندی کے کنارے جامعہ سید احمد شہید ٹونک کے باہر روڈ پر حضرت کچھ دیر رکے رہے، اسی دوران جب جانے لگے تو مجھے سو سو روپے کے دس نوٹ کل ایک ہزار روپے نکال کر دیے اور فرمایا: عامر! یہ رکھ لو کام آئیں گے۔ وہ نوٹ آج تک میرے پاس محفوظ ہیں اور اس پر اس سفر کا نوٹ بھی ڈالا ہوا ہے۔

رمضان سے چند روز قبل میرے بیٹے عزیزم مفتی محمد عادل خان ندوی نے حضرت سے میری بات ٹیلیفون پر کرائی تو آپ بار بار یہی جملہ فرما رہے تھے: ٹونک تو ہمارا وطن ہے، ہمارے خاندان کا ایک بڑا طبقہ وہیں قیام پذیر رہا ہے۔ ٹونک اللہ والوں کی بستی ہے۔ حضرت مولانا سے میرا بذات خود بہت گہرا تعلق رہا۔ حضرت میرے استاذ بھی تھے، ''الادب العربی'' آپ سے پڑھی۔ آپ کی خاندانی مسجد پکریا والی مسجد (مسجد نوازی) میں میں نے تین سال امامت کی۔ وہیں قیام رہا۔ آپ کے گھر سے کھانا آتا تھا۔ میں ندوہ میں زیر تعلیم تھا، حضرت مولانا سید سلمان صاحب حسنی مجھے امامت کے لیے

کہتے۔ وہیں مع اہلیہ اور بچوں کے مسجد کے حجرہ میں رہتا تھا۔ حضرت مولانا رابع صاحب، حضرت مولانا ابوبکر صاحب، حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب حسنی، حضرت مولانا واضح رشید صاحب ندوی اور آپ کے خاندان کے دوسرے افراد سے فجر کے بعد روزانہ ملاقاتیں ہوتیں۔ چائے ساتھ میں پیتے۔ اس دوران تربیت بھی ہوئی اور سرپرستی بھی ہوئی۔ ایک مرتبہ ایسا بھی موقع آیا رمضان میں تراویح بھی سنائی۔ تکیہ جانا ہوتا حضرت مولانا علی میاں کو معلوم ہوتا کہ عامر آیا ہوا ہے وہ نماز پڑھانے کے لیے ضرور کہتے۔

۲۱۰۵ء میں جب آپ ٹونک تشریف لائے تو غریب خانے قیام وطعام کا نظم رہا۔ آپ کا عمومی بیان مسجد قافلہ میں ہوا اور آپ قیام کے دوران بار بار یہ فرماتے رہے: ٹونک ہمارا وطن ہے، ہمارے خاندان کا بڑا حصہ یہاں عرصہ دراز تک مقیم رہا۔ اس موقع پر آپ کے ساتھ ہمیشہ کے ساتھی ادیب بارع حضرت مولانا واضح رشید صاحب اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے موجودہ ناظم حضرت مولانا سید بلال عبد الحی حسنی دامت برکاتہم تھے۔ قیام کا نظم کسی اور جگہ تھا لیکن جب ہمارے غریب خانہ پر ضروریات سے فارغ ہونے پہنچے تو حضرت مولانا واضح رشید صاحب نے فرمایا: عامر! ہم یہیں قیام کریں گے، ہمیں یہاں انسیت محسوس ہو رہی ہے۔ یہ وہی کمرہ تھا جہاں مفتی احمد حسن صاحب ٹونکیؒ، مولوی سعید صاحب مدظلہ العالی اور مفتی ولی حسن صاحب ٹونکیؒ نے برسہا برس تعلیم حاصل کی۔ یہ وہ کمرہ تھا جہاں مفکر اسلام رحمہ اللہ نے بھی قیام فرمایا تھا۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں ٹونک کی عدالت شرع شریف کے آخری ناظم شریعت حضرت مولانا قاضی محمد عرفان خان صاحبؒ کی قیام گاہ اور مطالعہ گاہ تھی، یہ وہی جگہ تھی جہاں بوعلی شاہ قلندر سے نسبی تعلق رکھنے والی ایک نیک خاتون میری خوش دامن سیدہ حفصہؒ نے عرصہ دراز تہجد پڑھی ہے۔

اس سفر میں حضرت نے جامعہ سید احمد شہید اور مدرسہ عالیہ فرقانیہ اور مرکز الامین الاسلامی کا معائنہ فرمایا۔ دعاؤں سے نوازا۔ رات میں بعد نماز عشاء اجلاس عام جس مسجد میں رکھا گیا وہ مسجد قافلہ آپ ہی کے بزرگوں کی بنائی مسجد ہے۔ اولاً حضرت مولانا سید بلال حسنی صاحب کا خطاب ہوا پھر حضرت کا خطاب ہوا۔ مسجد کھچا کھچ بھری ہوئی تھی باہر اسکرین لگی ہوئی تھی۔ مجمع حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی رحمۃ اللہ کی زیارت کا مشتاق تھا۔ حضرت کے نصیحت آمیز پر مغز بیان سے سامعین محو ہو گئے اور دیرینہ نقش دلوں پر منقش ہو گئے جو آج تک باقی ہیں، اس سفر میں آپؒ کے ایک مرید و مجاز و خلیفہ حضرت مولانا ابراہیم صاحب بھی ٹونک تشریف لائے اور حضرت کے ساتھ رہے۔ اس موقع پر خصوصی ملاقات میں مولوی محمد سعید صاحب مدظلہ العالی نے حضرت سے عرض کیا مسجد قافلہ کے اوقات نماز جب سے مسجد بنی ہے شوافع کے لحاظ سے ہیں لیکن ابھی نہ کوئی شافعی ہے مقتدیوں میں اور نہ امام شافعی ہے۔ میں پچاس سالوں مسجد کی خدمت اسی وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کر رہا ہوں اب ایک حلقہ پیدا ہو گیا وہ اس وقت کو بدلنے کی بات کرتا ہے۔ آپ کے بزرگوں کا بنایا ہوا وقت ہے۔ آپ اپنے ہاتھ سے تبدیل کر دیں، تو حضرت نے فرمایا: میں یہ جرأت نہیں کر سکتا۔ امام شافعیؒ بھی ہمارے امام ہیں، ان کا مسلک بھی قرآن وسنت سے ماخوذ ہے۔

مفکر اسلامؒ کی حیات میں ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد سعید صاحب، مولانا محمد عمر خان صاحب ندوی اور میں احقر حضرت مولانا سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے، دوران ملاقات اجازت حدیث کی خواہش ظاہر کی تو حضرت نے اول وآخر احادیث پڑھوا کر اجازت حدیث ان الفاظ میں مرحمت فرمائی "أمانتكم رُدّت إليكم"

میں نے تین سال سے زاید عرصہ تک مسجد پکریا گوئن روڈ لکھنؤ میں امامت کی، میں نے حسنی خانوادہ کو بہت قریب سے دیکھا ہے، ان کی زندگیاں اسلاف کی نمونہ ہیں، خاندان کے مرد ہوں یا خواتین، عبادت، تلاوت، صدقات وخیرات خدمت خلق پاکدامنی و پاکبازی، شرافت و امانت دیانت داری، دنیا سے بے رغبتی جیسی سینکڑوں صفات حمیدہ سے یہ خاندان متصف ہے اور خصوصیت کے ساتھ حضرت مولانا رابع صاحب بے پناہ منکسر المزاج تھے۔ اگر شان ندوہ مفکر اسلام مولانا علی میاں ندوی ہیں تو جان ندوہ مولانا محمد رابع صاحب حسنی ہیں، پورا خاندان آفتاب ومہتاب ہے۔

ایک عبقری و مثالی استاد

ڈاکٹر سید راشد نسیم ندوی
(صدر شعبہ عربی ای ایف ایل یونیورسٹی-حیدرآباد)

استاذ الجیل، مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ (1929-2023ء) ان معدودے چند اکابر علماء ومشاہیر ادباء میں سے تھے جن کی جلیل القدر خدمات اور مابہ الامتیاز خصوصیات کے تذکرے کے لیے مفصل تصنیف درکار ہے، مجلّے کے خصوصی شمارے کے لیے اختصار کے دائرہ میں رہ کر آپ کی خدمات کے کسی ایک پہلو کو سمیٹ لینا ایک پیچیدہ اور حساس علمی کام ہے، چہ جائیکہ سارے کارہائے نمایاں کا احاطہ کرنے کی کوشش ناتمام کی جائے، اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے راقم السطور حضرت الاستاذ مرشد الامت خضر راہ، ناظم ندوۃ العلماء وصدر مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی تدریسی خدمات کو محور کلام بنا کر اپنی جانب سے اپنی بساط کے مطابق خراج عقیدت پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اگر چہ اس عنوان پر بھی اہل قلم کی متعدد نگارشات منظر عام آئیں گی۔ تاہم راقم کو اس جسارت پر کوئی تردد نہیں ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ نہ صرف اس عاجز نے عالمیت وفضیلت میں کئی سال حضرت الاستاذ سے اکتساب فیض کیا بلکہ میرے والد مرحوم پروفیسر سید ابراہیم ندویؒ نے آپ سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا اور وہ حضرت الاستاذ کے ابتدائی دور کے قریبی شاگردوں میں سے ایک تھے۔ مندرجہ بالا سبب میرے لیے ایسا مہمیز بن گیا ہے کہ میں اس عنوان کو نظر انداز نہیں کر پا رہا ہوں، چنانچہ حضرت الاستاذ کی کتاب حیات کے اس باب کو نمایاں کرنے کے لیے چند سطور سپرد قرطاس کر رہا ہوں۔

حضرت الاستاذ کی شخصیت ایسی ہمہ گیر وکثیر الجہات تھی کہ ایک طویل سوانح عمری بھی احاطہ نہیں کر پائے گی، لیکن یہ حقیقت بھی نا قابل تردید ہے کہ تدریسی خدمات آپ کی زندگی کا جزء لاینفک رہی، یہاں تک کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے اہتمام کی ذمہ داری آپ کے سپرد کی گئی تب بھی آپ نے اہم مضامین کی تدریس اپنے ذمہ رکھی پھر 2000ء میں ندوۃ العلماء کے ناظم قرار پائے تب بھی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے کچھ نہ کچھ تدریس کا معمول برقرار رکھا، اس نصف صدی سے زائد تدریسی خدمات میں حضرت الاستاذ ہمیشہ محبوبیت ومقبولیت کے بے تاج بادشاہ رہے، اس مدت میں تلامذہ کی کئی نسلیں پروان چڑھیں لیکن اس طویل عہد تدریس میں نہ اس بزم معرفت کی شمع کی لو ماند پڑی اور نہ ہی پروانوں کی کمی ہوئی، ایسے فایق وعبقری استاد کا بلند وبالا مقام حاصل کرنے میں جن تکوینی عناصر نے اہم رول ادا کیا وہ اگر چہ متعدد رہے اور ان کی تفصیل اختصار کے مقصد کو نقصان پہنچانے کا سبب بن سکتی ہے، لہٰذا ان میں سے چند اہم عناصر کا ذیل میں اشارہ از حد ضروری محسوس ہوتا ہے اور ان سے صرف نظر کرنا علمی خیانت کے مترادف ہوگا۔

ا: تبحر علمی:- حضرت الاستاذ جن مضامین کو تدریس کے لیے منتخب فرمایا کرتے تھے، ان مضامین پر آپ کو وہ دسترس حاصل تھا کہ معاصرین میں آپ کا ہم پلہ کوئی نہ ہوتا، عالیہ ثالثہ میں جب آپ کتاب جزیرۃ العرب پڑھانے تشریف لاتے تو کتاب ڈسک پر رکھی رہ جاتی اور آپ کاینات کی ساخت، گنبد نیلوفر کی حقیقت اور کرہ ارض کی جغرافیائی حیثیت پر ایسی آمد کے ساتھ محاضرہ دیا کرتے کہ قلم وقرطاس ساتھ دینے سے قاصر ہو جاتے، ادب عربی کے تو آپ سوق عکاظ تھے، جب کبھی ادب کی تدریس کا موقع آتا تب اشعار کی تشریح، بندش کا حسن، بلاغت کے رموز واسرار کی وضاحت اور الفاظ کی تحقیق وتحلیل کرتے ہوئے اس کے استعمال کے مختلف مواقع ایسے اجاگر فرماتے تھے کہ ایسا لگتا کہ بس علم کا رود رواں ہے کہ تھمتا نہیں۔

موجودہ دور میں ہم جیسے نا تجربہ کار مدرسین اپنے مضمون میں

اختصاص کی شان پیدا کرنے پر توجہ دینے کے بجائے دیگر ذرائع سے طلبہ میں مقام حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو بارآور ثابت نہیں ہوتی، حضرت الاستاذ کی یہ صفت اختصاص اور مضمون پر کامل عبور مدرسین کے لیے ایسا قابل تقلید نمونہ ہے جس سے گریز کرنا اپنے علمی مقام کو زک پہنچانے کا سبب بنتا ہے۔

۲: مضمون پر ارتکاز- حضرت الاستاذ کی فن تدریس میں دوسری مابہ الامتیاز خصوصیت مضمون پر ارتکاز وتوجہ مرکوز رکھنے کی صفت تھی، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت الاستاذ سے اکتساب فیض کا شرف اس ناقص کو لگاتار چار سال ملتا رہا، اس پوری مدت میں کسی ایک دن بھی ایسا نہیں ہوا کہ آپ نے موضوع سے ہٹ کر گفتگو فرمائی ہو، مکمل تعلیمی وقت میں گفتگو موضوع پر مرکوز رہتی، حالانکہ آپ کی عالم اسلام پر نگاہ، تحریکات کا مدبرانہ مطالعہ اور تفقہ فی الدین کی کیفیت اس بات کی متقاضی ہوتی کہ آپ خارج از درس موضوعات پر ہم طلبہ کو مستفید و مستفیض فرماتے لیکن آپ طلبہ اور ان کے وقت کو ایک ایسی امانت مانتے جس میں کوئی ملاوٹ نہیں ہونی چاہیے، یہ ان مدرسین کے لیے ایک تربیتی پیغام ہے جو اثناء تدریس غیر متعلقہ وغیر ضروری مباحثہ چھیڑ دیا کرتے ہیں اور سارا وقت اسی گفتگو کے نذر ہو جاتا ہے جو وقت طلبہ عزیز کے لیے متاع گراں مایہ ہوتا ہے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہو رہا ہے کہ طلبہ میں وہ درسی استعداد اور علمی پختگی پیدا نہیں ہو پا رہی ہے جس سے وہ مستقبل میں علم وعرفان کی کہکشاں کے چمکتے ستارے بن سکیں چنانچہ آج یہ ضرورت شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ حضرت الاستاذ کی اس صفت کو تعلیم وتربیت سے وابستہ افراد میں عام کیا جائے اور اساتذہ کرام اپنے مضامین میں کامل دستگاہ پیدا کریں اور قبل از درس مطالعہ کا اہتمام بھی کیا کریں تاکہ وقت گزارنے کے لیے غیر ضروری گفتگو کا سہارا لینے کی ضرورت نہ پیش آئے اور عصر حاضر میں درس وتدریس عام سہی طرز استاذ عام نہیں۔

۳: نرم دم گفتگو، گرم دم جستجو:- حضرت الاستاذ کے منہج تدریس پر گفتگو اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک آپ کی وہ نادر وکمیاب صفت کا تذکرہ نہ کیا جائے جو آپ کا شخصی امتیاز بھی ہے، حسنی میراث بھی، جو صفت نبوی اسوہ بھی ہے اور کامیاب قاید کا اصلی جوہر بھی۔

حضرت الاستاذ کی یہ صفت جو گفتار وکردار کی نرمی سے عبارت ہے وہ بندہ کو عنداللہ ماجور اور عندالناس مقبول بنا دیتی ہے، جس کے بارے میں فرمان نبوت ہے: "إن المؤمن هين لين" اور خادم رسول حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں: میں نے رسول اللہ ﷺ کی دس سال خدمت کی، اس اثناء کبھی آپ نے اف نہیں فرمایا، کسی کام کے کرنے پر یہ نہیں فرمایا کہ کیوں کیا اور کسی کام کے نہ کرنے پر یہ نہیں فرمایا کہ کیوں نہیں کیا۔ (بخاری ومسلم)

آپ کی نرم مزاجی کا عالم یہ تھا کہ ساری تعلیمی مدت میں میں نے حضرت الاستاذ کو کبھی ڈانٹتے ہوئے نہیں دیکھا۔ کبھی تلخ کلامی نہیں سنی، بسا اوقات بعض طالب علم تاخیر سے درس میں شامل ہوتے، بعض طلبہ غیر درسی کام کرتے ہوئے نظر آتے تھے لیکن آپ کی ایک ہلکی سی نگاہ، چہرے کا جاہ وجلال اور خموش نظر طالب علم کی کایا پلٹ کر رکھ دیتی، حضرت الاستاذ کی ذات اقدس میں جو علم کا بحر بیکراں اور جذبات کا سمندر سمویا ہوا تھا، اس میں تلاطم خیزی نہ تھی اور نہ موج کی اٹکھیلیاں، وہ ایک پرسکون آبشار کی مانند تھے جس سے نسل در نسل سیراب ہوتی رہی، چنانچہ حضرت الاستاذ کو غصہ ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، آپ کی آواز میں کبھی زیر وبم نہیں پایا۔ لہجہ میں نہ کرختگی دیکھی اور نہ الفاظ میں سختی۔ حضرت الاستاذ کی یہ صفت طبعی تھی اور یہ اداء وہبی تھی، اس میں نہ تصنع تھا اور نہ ہی دکھاوا۔ یہ صفت کسی کو اگر وہبی طور پر نہ ملی ہو تب بھی اسے چاہیے کہ وہ ریاضت ومحنت سے حاصل کرے کیونکہ فرمان نبوت ہے: "من يحرم الرفق يحرم الخير كله. أو كما قال رسول اللہ ﷺ" (جو نرمی سے محروم رہا وہ سارے خیر سے محروم رہا)

علاوہ ازیں حضرت مولانا رابع حسنی ندوی کی طلبہ کے ساتھ ہمدردی وشفقت، ان کی خیر خواہی کی فکر اور ان کے مسائل کی یکسوئی کے لیے مثبت موقف نے ایک نسل تیار کر دی جو ہند وبیرون ہند، دینی اداروں اور عصری دانش گاہوں میں تدریس کے فرائض منصبی انجام دے رہی ہے۔

بہار اب جو گلشن میں آئی ہوئی ہے
یہ سب پود انہیں کی لگائی ہوئی ہے

اب یاد نہ آؤ رہنے دو

مولانا ممشاد علی قاسمی
(بانی جامعہ فلاح دارین الاسلامیہ بلاس پور- یوپی)

۳۵ رسال پہلے تکیہ رائے بریلی حاضری پر پہلی ملاقات سے لے کر ۲۶ رشعبان المعظم ۱۴۴۴ھ کو الوداعی معانقہ تک مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ سے بہت قریبی تعلق رہا۔ اپنے اہم ترین معاملات میں مشورے کیے۔ ان کی ہدایات و ہمدردی سے استفادہ کیا اور اب تو ان کے سامنے عرض حال کرنے کی ایسی عادت سی ہوگئی تھی کہ ان کے بغیر زندگی اور اس کے مسائل کا تصور ہی نہیں رہا تھا۔

۲۱ رمضان المبارک کو جو خبر سنی تو لگا کہ جیسے زندگی بکھر گئی ہے۔ شفقت کا وہ سایہ اور سچی ہمدردی کا وہ احساس اندر سے ٹوٹتا پھوٹتا سا محسوس ہوا۔ محبت کا وہ فطری اور سادہ طریق اچانک گم ہوگیا۔ معرفت کا وہ آبگینہ جس کا عکس دلوں کو روشنی، رہنمائی اور طاقت بخشتا تھا چکنا چور ہوگیا اور ایسا لگا کہ آسمان کی طرف سے کوئی نورانی دروازہ کھلا اور یہ نفس مطمئنہ یہ پاکیزہ روح قفس عنصری سے نکل کر احترام واطمینان کے ساتھ خوشی خوشی اس میں داخل ہوگئی جس نے بے شمار نفوس کو جنت کے راستے دکھائے تھے۔

اپنے کمزور و بیمار جسم پر آلام و حادثات کا ایک لامتناہی سلسلہ برداشت کرتے کرتے وہ تھک گئے تھے، مقابلہ بھی خوب کیا، جسم بستر سے لگ گیا، روح زخمی ہوگئی، انہوں نے سب کچھ برداشت کیا لیکن کبھی سرعام حرف شکایت لبوں پر نہیں آیا۔ سب کچھ سہتے رہے اور خاموش رہے، مسکراتے رہے، خود پر کچھ بھی گزر گئی، لیکن جس مسند پر اکابر نے بٹھا دیا تھا اس کے وقار پر کبھی آنچ نہیں آنے دی۔ آخری سانس تک اس کا تحفظ کیا۔ آخر کار تھک کر ہمیشہ کے لیے سو گئے۔

کڑے سفر کا تھکا مسافر، تھکا ہے ایسا کہ سو گیا ہے
خود اپنی آنکھیں تو بند کرلیں، ہر آنکھ لیکن بھگو گیا ہے

وہ اپنی ذات کو ملت کے لیے، ندوۃ العلماء کے لیے مٹا کر وفا اور محبت کی ایک لازوال کہانی رقم کر گئے اور بعد والوں کے لیے بہترین مثالیں چھوڑ گئے۔

جہاں جہاں نظر آئیں تمہیں لہو کے چراغ
مسافران محبت ہمیں دعا دینا

کیا ندوہ اور اس کے فرزندان کبھی ان کی بے مثال محنت اور ان کی لازوال قربانیوں کو بھلا سکیں گے؟ کیا اس کا ذرہ ذرہ ان کی محبت و فنائیت کی گواہی نہیں دیتا رہے گا جو اس ادارہ کی ایک ایک اینٹ پر ثبت ہے۔ ان کے نقش قدم آئندہ آنے والے تمام منتظمین کے لیے رہنمائی کرتے رہیں گے اور ان کے کارنامے ان کی یاد دلاتے رہیں گے۔ ان کے نقش قدم سے راہوں میں اجالے رہیں گے۔

میں نے بہت نقش قدم چھوڑ دئے ہیں
جب میں نہ رہوں گا مرا افسانہ رہے گا

آج وہ بھلے ہی ہمارے درمیان سے ملاء اعلیٰ کی طرف چلے گئے، مگر انہوں نے ہمارے لیے جہد مسلسل کی ایک طویل داستان، تحمل ورواداری اور اعلیٰ اخلاقی وروحانی اقدار کے انمٹ نقوش چھوڑے ہیں، یہ چیزیں ان کی ذات والا صفات کو ہمیشہ زندہ رکھیں گی، وہ زندگی میں بھی مرشد تھے، بعد میں بھی مرشد رہیں گے۔ حیات مستعار میں بھی ہمارے دل میں بستے تھے اور اب بھی ہمارے دلوں میں ان کی خوبصورت یادوں کے نقوش جگمگاتے رہیں گے۔

اللہ اپنے ولی کو کبھی مرنے نہیں دیتا۔ وہ آنکھوں سے اوجھل ہوکر دل میں بس جاتے ہیں۔ وہ فنا اور بقاء سے بالاتر ہوجاتے ہیں، کیوں کہ وہ اللہ کے ہوجاتے ہیں اور اللہ ان کا ہوجاتا ہے۔

مجھ کو نا سنا خضر و سکندر کے فسانے
میرے لیے یکساں ہے فنا ہو کہ بقاء ہو

۲۱؍اور ۲۲؍رمضان کو لکھنؤ و رائے بریلی نے اپنے محسن، اپنے مرشد کے لیے دلوں سے اٹھتا ہوا محبتوں کا سیلاب دیکھا جو چاروں طرف سے امڈ آیا تھا۔ جذبات اور اظہار عقیدت کا موجیں مارتا سمندر دیکھا۔ آنکھوں سے برسنے والی آنسوؤں کی جھڑی دیکھی۔ یہ سب ان کی زندگی بھر ملت کے لیے خدمت، مخلوق خدا کے لیے جذبہ احسان و ہمدردی، مخلصانہ رہنمائی اور شفقت وعنایت پر ایک ادنی خراج عقیدت تھا جو دلوں سے نکل کر آہوں، سسکیوں اور آنسوؤں کے ذریعہ پیش ہورہا تھا، جو دوسروں کو ضبط کی تلقین کرتے تھے وہ بھی آج رورہے تھے۔

نازاں تھے ضبط غم پہ بہت حضرت خمار
رو رو دئے جو پیار کے دن یاد آگئے

میں رمضان سے دو تین دن پہلے کئی روز تک حضرت مولانا کی خدمت میں رہ کر ان کو ہشاش بشاش چھوڑ کر آیا تھا، اس لیے ۲۱؍ رمضان کو حضرت کے وصال کی خبر نے حیرت وصدمہ میں ڈال دیا۔

مجھے اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عمر اور نازک صحت کے باوجود اللہ تعالیٰ نے آخر کے چند سال حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے خاص طور پر عنایت فرمائے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ندوہ کے مسلک کی حفاظت اور اسلاف کی اس محترم ومقدس امانت کو دیانت دار ہاتھوں میں سونپ کر جانے کے لیے خاص طور پر باقی رکھا تھا اور الحمدللہ وہ یہ کام بخوبی کر گئے۔

ہم نے پچھلے سالوں میں ان کی صحت کی کمزوری مایوس کن حد تک دیکھی، عمر کا بھی تقاضا تھا، لیکن سنبھل گئے اور اسی حالت میں پے در پے حادثوں اور ندوہ میں اٹھنے والے طوفانوں اور سازشوں کا پورے وقار اور اعتماد کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے، حالانکہ ان حالات میں جوان تندرست آدمی کے بھی اعصاب جواب دے جاتے ہیں، لیکن یہاں تو یہ حال تھا کہ

نہ ہارا ہے عشق اور نا دنیا تھکی ہے
دیا جل رہا ہے ہوا چل رہی ہے

وہ سکون سے اپنا کام کرتے رہے اور مجال نہیں کہ مسلسل بد زبانی کے جواب میں اس طویل عرصہ میں ایک بھی نامناسب لفظ زبان سے نکلا ہو۔ حالات کتنے بھی خراب ہوگئے مگر انہوں نے پرسکون و پراعتماد طریقہ پر بلکہ پرشفقت انداز میں جواب دیا ؎

دعا کرو کہ سلامت رہے میری ہمت
یہ اک چراغ کئی آندھیوں پہ بھاری ہے

انتہائی کرب ناک حالات میں بھی مسکراتے رہے، لگتا تھا کہ اکابر دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی ساری ہمت وحکمت اور فراست ان میں سرایت کر گئی ہے۔ حالات کتنے بھی بگڑ گئے لیکن ندوۃ العلماء کی حرمت اور اپنے وقار پر ہلکی سی خراش بھی نہیں آنے دی۔ ذرا بھی قدم نہیں ڈگمگائے اور سخت ترین حالات میں بھی ایک مضبوط چٹان کی طرح جمے رہے۔

ندوۃ العلماء کے مسلک (اہل سنت والجماعت) کا ایسا دفاع اور تحفظ کیا کہ پوری جماعت مطمئن ہوگئی اور بزرگوں کی روحیں بھی مسرور ہوگئی ہوں گی۔

نہ ڈگمگائے قدم کبھی وفا کے رستے میں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے رستے میں

ندوہ میں حضرت کے پاس میری حاضری ہوتی تو عام طور پر تین دن قیام رہتا، واپسی پر بہت محبت کے ساتھ دعائیں دے کر رخصت کرتے، اکثر فرماتے: ''اتنی جلدی کیوں جارہے ہو؟ جلدی کی کوئی

خاص وجہ ہے کیا؟ ابھی اور قیام کرتے۔'' اس طرح کے جملے اکثر فرماتے۔اس دن ۲۶ رشعبان ۱۴۴۴ھ کو بھی ایسا ہی ہوا۔فرمایا: ''اچھا واپس جارہے ہو اور ٹھہر جاتے۔'' عرض کیا: حضرت! دوبارہ جلد ہی حاضری ہوگی انشاء اللہ، میرے اور بچوں کے لیے دعائیں دیں۔نور نظر مولوی احمد ممشاد سلمہ کے بارے میں ہمیشہ پوچھتے تھے اور مجھ سے فون ملوا کر بات کرتے، دعائیں دیتے اور حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ اس دن بھی احمد سے فون پر بہت شفقت سے باتیں کیں۔

ٹیک لگا کر لیٹے ہوئے تھے، میں نے مصافحہ کیا تو مصافحہ کے ساتھ معانقہ کے انداز میں سینے پر میرا سر لگا کر دعائیں دیں اور یہ پہلی بار نہیں تھا، ایسا تو اکثر ہوتا تھا، رخصت کرتے وقت بعض مرتبہ حضرت مولانا جذباتی بھی ہوجاتے تھے، اس لیے اس دن یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی اور یہ تو سان وگمان بھی نہیں تھا کہ حضرت سے یہ آخری معانقہ ہے۔ رخصت کرنے سے پہلے بھائی مصباح صاحب کو اشارہ کیا، وہ اندر سے ایک بڑا سا تھیلا لے کر آئے جس میں مٹھائیاں وغیرہ تھیں۔ میں نے عرض کیا: حضرت! یہ تو بہت زیادہ ہے۔فرمایا: نہیں نہیں! آپ رکھ لیجیے ہماری طرف سے۔

حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی نور اللہ مرقدہ سے جن حضرات کا تعلق تھا اس کو انہوں نے ہمیشہ یاد رکھا، زندگی بھر بہت اہمیت دی اور خصوصیت کے ساتھ نبھایا۔ اس خادم کے ساتھ بھی خصوصی نوازش اسی بنا پر تھی۔ بہت سے مواقع پر متعدد حضرات کے سامنے اس کا اظہار بھی فرماتے تھے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحب سے ان کا خصوصی تعلق تھا، مولانا ان سے بہت محبت فرماتے تھے، اسی لیے ہمارا بھی ان سے بہت خاص تعلق ہے اور یہ صرف زبانی باتیں نہیں تھیں بلکہ ہر موقع پر اس کا عملی طور پر احساس بھی دلایا، ایک مرتبہ حضرت ندوہ سے تکیہ رائے بریلی جارہے تھے، میں بھی دو روز سے وہیں تھا، میں نے عرض کیا کہ میں بھی آپ کے ساتھ تکیہ چلوں گا تو بہت خوش ہوکر فرمایا: ''بالکل بالکل، آپ کا تکیہ ہے، آپ کا گھر ہے، آپ کا حق ہے، ضرور چلیں، بہت خوشی ہوئی آپ کی محبت دیکھ کر۔''

مجھے تکیہ حضرت کے جانے کا صحیح وقت معلوم نہیں تھا، اس لیے ظہر بعد جاتے وقت میں مہمان خانہ میں سے کسی کام سے چلا گیا تو باقاعدہ آدمی کو ادھر ادھر بھیج کر فون کرا کر تلاش کروایا، اس میں انہیں دیر بھی ہوگئی اور مجھے بہت شرمندگی ہوئی اور پھر تکیہ میں تین دن قیام رہا۔ اس دوران وہاں اور بھی بہت سارے مہمان آتے جاتے رہے، لیکن میرے لیے حضرت والا کا خصوصی حکم تھا کہ کھانا حضرت کے ساتھ گھر پر کھاؤں، مولانا جعفر صاحب اور میں حضرت کے ساتھ ہی کھانا کھاتے پھر چلتے ہوئے ایک جوڑا کپڑے اور عمدہ قسم کا عطر عنایت فرمایا اور بہت خوشی کے ساتھ رخصت کیا۔اس طرح کا یہ صرف ایک واقعہ نہیں، خصوصی شفقت کا سایہ ہمیشہ ہی رہتا تھا۔اب وہ باتیں، وہ محبتیں رہ رہ کر یاد آتی ہیں۔

تیری کمی میں روز اضافہ کرے گی عمر
اور اس کمی کو کم بھی نہیں کر سکوں گا میں

ایک معمولی خادم پر ان کی اس طرح کی مسلسل نوازشیں خاص طور پر اس لیے تھیں کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندویؒ کے ساتھ میرا خادمانہ تعلق تھا اور حضرت اس تعلق کو بہت قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

میں ۲۶ رشعبان ۱۴۴۴ھ کو ندوۃ العلماء حاضر ہوا تھا، حضرت مولاناؒ دیکھ کر مل کر ہمیشہ کی طرح بہت خوشی ہوئے۔ حال احوال دریافت کیے، میں نے تھوڑی سی عجوہ کھجور پیش کی تو محبت سے فرمایا کہ آپ کو اس تکلف کی ضرورت نہیں، آپ کی محبت خالص ہے اور آپ سے تعلق بہت پرانا ہے، آپ کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ آپ آتے ہیں، آپ کے آنے سے دل بہت خوش ہوتا ہے۔

عصر کے بعد میں نے اپنی کتاب ''بڑوں کی باتیں'' پیش کی تو اسے دیکھ کر بہت مسرور ہوئے، دعائیں دیں اور الٹ پلٹ کر دیکھا، کچھ دیر کتاب کو دیکھنے کے بعد فرمایا کہ بزرگوں کے حالات بہت

دلچسپ اور خوبصورت انداز میں آپ نے تحریر فرمائے ہیں، بہت سی دل نواز شخصیات کے حالات ذاتی مشاہدات کی روشنی میں جمع کر دئے ہیں۔اس کتاب سے بہت فائدہ ہوگا اور یہ کتاب تمام حلقوں میں نہایت دلچسپی سے پڑھی جائے گی ان شاءاللہ!

عشاء کے بعد مجلس میں مہمان علماء کرام اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ موجود تھے۔ حضرت مولانا نے از راہ شفقت ومحبت میرا تعارف کرایا، حالانکہ حاضرین مجلس میں سے اکثر پہلے سے واقف بھی تھے اور پھر کتاب کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ

''بڑوں کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ تحکم (حکم دینے) کے بجائے اپنی سیرت سامنے رکھتے ہیں، اسی سے اثر لے کر سیکھ کر چھوٹے اس کی نقل کرتے ہیں اور اسی کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھال لیتے ہیں اور بہت سے لوگ تو اس حد تک نقل کرتے ہیں اور اس میں ان کی عادت اور حالات اتنے پختہ ہوجاتے ہیں گویا وہ اپنے بڑوں کا چربہ ہوجاتے ہیں، لوگ انہیں دیکھ کر ان کے بڑوں کے حالات واعمال کا اندازہ کرتے ہیں۔

بڑوں کی صحبت اور نقل سے یہ فائدہ بھی ہوتا ہے کہ اس سے اعمال کے ساتھ کیفیات بھی منتقل ہوتی ہیں بشرطیکہ قدردانی اور استفادہ کے جذبہ سے بڑوں کی مجلس میں حاضر ہو، کوئی غرض نہ ہو، تو باتوں کی نقل کے ساتھ روحانی کیفیات بھی منتقل ہوتی ہیں۔ خالص علم اور کتابوں سے یہ بات حاصل نہیں ہوتی۔ بزرگوں کی عظمت کے ساتھ دل سے ان کی نقل ہو تو شخصیت سازی میں اس کا اہم کردار ہوتا ہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نقل سے ہی بنے، انہوں نے بے غرض ہوکر صرف اللہ کی رضا کے لیے رسول اللہ ﷺ کی محبت وعظمت اور قدردانی کے ساتھ ان کی نقل کی، استفادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو کیا سے کیا بنادیا۔

آدمی اپنے بڑوں کے حالات اور عادتوں کا بھرپور اثر لیتا ہے، اچھا بھی اور برا بھی۔ ان کی نقل بھی کرتا ہے۔ اس لیے بچوں کی تربیت بہت احتیاط سے کرنی چاہیے۔ بچہ کم عمری میں ماں باپ کو دیکھ کر انہی سے اچھی یا بری حرکتیں سیکھتا ہے اور پانچ سال کی عمر تک اس کی یہ عادت پختہ ہوجاتی ہے۔ اٹھارہ سال کی عمر کے بعد آپ بچے کو حکم دے سکتے ہیں کہ یہ کرو یہ نہ کرو لیکن اٹھارہ سال تک بچہ آپ کے عمل سے سیکھتا ہے۔''

حضرت مولانا معین اللہ صاحب ندوی نوراللہ مرقدہ (سابق نائب ناظم ندوۃ العلماء) کے دو صاحبزادے اپنے بچوں (مولاناؒ کے پوتوں) کے ساتھ تشریف لائے ہوئے تھے، وہ رخصتی مصافحہ کے لیے حاضر ہوئے، بچے بھی ساتھ تھے تو ان سے بہت اپنائیت اور خصوصیت کے ساتھ گفتگو فرمائی، پھر جاکٹ کی جیب سے کچھ رقم نکال کر دونوں کو الگ الگ رقم ہدیۃً پیش فرمائی۔

ان کے رخصت ہونے کے بعد بتایا کہ یہ مولانا معین اللہ صاحبؒ کے صاحب زادے ہیں۔ ان حضرات کے آنے سے حضرت مولانا کی مسرت اور آنکھوں کی چمک جو مجلس کے پورے ماحول پر چھائی ہوئی تھی، دیکھ کر میں نے خود ہی عرض کیا کہ حضرت! آپ کا تو مولانا سے بہت گہرا تعلق رہا ہے، تو خوشی سے آنکھیں بند کرتے ہوئے فرمایا: ہاں! بہت بہت۔

پھر آنکھیں کھولیں تو میں نے دیکھا کہ ان میں پرانی دوستی کی یادیں تھیں، خوشی کا احساس تھا، اچھے اور برے وقتوں میں گہرے تعلقات کی مٹھاس تھی۔ حضرت مولانا معین اللہ صاحبؒ ندوی کی مخلصانہ خدمات کا اعتراف تھا اور یہ اظہار بھی کہ خلوص پر مبنی تعلقات کبھی مرتے نہیں، نسلوں تک چلتے ہیں۔ شخصیتیں چلی جاتی ہیں لیکن محبتیں باقی رہتی ہیں۔ وفائیں اور ان کا پاس رکھنے والے ہمیشہ تر وتازہ رہتے ہیں۔

عشاء بعد مجلس میں بہت پرلطف باتیں ہوئیں، حرمین شریفین اور وہاں کے قدیم وموجودہ حالات کا ذکر چل رہا تھا۔ اس پر حضرت مولانا نے سنایا کہ اب تو لوگ ملازمت کے سلسلے میں بہت جارہے

ہیں اور وہاں رہ کر ایک عام آدمی بھی وہاں کی عام زبان اور اصطلاحات سیکھ لیتا ہے، پہلے زیادہ تر لوگ صرف حج وعمرہ کے لیے جاتے تھے،اس لیے اس مختصر قیام میں زبان واصطلاحات سے واقف نہیں ہو پاتے تھے۔عربوں کی عادت ہے کہ اگر آپس میں کوئی جھگڑا یا سخت کلامی ہو جائے تو سامنے والے کو ذرا ٹھنڈا کرنے کے لیے کہتے ہیں:"صل علی النبي" (نبی ﷺ پر درود بھیجو)۔کسی عرب کا ایک ہندوستانی سے جھگڑا ہو گیا، ہندوستانی بہت غصہ میں تھا، اسی دوران عربی نے کہا:"یا أخی! صل علی النبی" ہندوستانی چونکہ اس بات کو سمجھتا نہیں تھا،اس نے یہ سمجھا کہ عربی مجھے کوئی سخت بات کہہ رہا ہے، اس لیے اس نے غصے میں فوراً جواب دیا: تجھ پر"صل علی النبی" یہ واقعہ سنا کر حضرت خود بھی ہنسے اور حاضرین بھی ہنسنے لگے۔

حضرت مولانا کی طبیعت میں بشاشت دیکھ کر میں نے عرض کیا کہ آپ کی طبیعت اللہ کا شکر ہے پہلے سے بہت بہتر ہے، بہت دل خوش ہو رہا ہے آپ کی طبیعت کو دیکھ کر۔فرمایا کہ ہاں الحمد اللہ اب بہتر ہے، بس بیٹھنے میں تکلیف ہوتی ہے، اس لیے ٹیک لگا کر بیٹھنا پڑتا ہے، اچھا نہیں لگتا کہ مہمان بیٹھے ہیں اور ہم اس طرح لیٹے ہیں لیکن مجبوری ہے۔

حالات کیسے بھی رہے لیکن ملاقات کے لیے آنے والوں کو کبھی دل کا درد آنکھوں سے ظاہر نہیں ہونے دیا، چہرے پر اس کے اثرات کسی کو نظر نہیں آئے۔ ہمیشہ وہی فطری مسکراہٹ جسے دیکھ کر آنے والے کی آدھی پریشانی ختم ہو جاتی تھی۔گفتگو میں نرمی، لہجے میں شیرینی، برتاؤ میں ہمدردی، سخت ذہنی کشمکش اور اعصابی دباؤ کے وقت بھی کبھی ان کو جھنجھلاہٹ میں بات کرتے نہیں دیکھا۔

حضرت مولانا نے پوری عمر ملت کی خدمت کی۔تدریس اور تصنیف وتالیف، ادب وصحافت، اہتمام وانتظام، بیعت وارشاد، نظامت وقیادت، ملکی وعالمی سطح پر بڑے بڑے اداروں کی سربراہی، ندوۃ العلماء اور اس کے باہر بڑی اہم ذمہ داریوں کو پوری دیانت واحتیاط کے ساتھ نبھایا اور اپنے دامن پر ہلکا سا داغ بھی نہیں لگنے دیا۔

مزاج میں فطری طور پر نرمی اور اصول پسندی تھی۔وہ غصہ اور جذبات میں کوئی فیصلہ نہیں کرتے تھے، البتہ سوچ سمجھ کر جو بات کہتے تھے، جو فیصلے کرتے، تمام خدشات کے باوجود ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنے موقف پر قائم رہتے۔وہ اقبال کے اس شعر کے صحیح مصداق تھے۔

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
معرکہ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

وہ ایک طویل صاف ستھری کامیاب اور نمونے کی زندگی گزار کر اپنے رب کے حضور پیش ہوئے۔

حضرت نور اللہ مرقدہ اپنے رب کے پاس چلے گئے، دل غمگین واداس ہے لیکن یہ وہ خانوادہ ہے کہ ان کے جد اعلیٰ حضرت شاہ علم اللہ صاحبؒ کے جوان بیٹے کا انتقال ہوا (جن کی قبر تکیہ میں مسجد کے صحن سے ملی ہوئی ہے) تو انہوں نے یہ کہہ کر خوشی میں مٹھائی تقسیم کرنے کی بات کہی تھی کہ میرا بیٹا ایمان کے ساتھ دنیا سے گیا ہے۔

اس واقعہ کے پس منظر میں یہ عرض کرنے کا دل چاہتا ہے کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحبؒ نے اپنی ۹۴ رسالہ طویل عمر میں ملکی وعالمی سطح پر ملت کی بڑی بڑی ذمہ داریوں کو پورے وقار کے ساتھ بخوبی نبھایا۔ اللہ کی رضا اور اللہ کے بندوں کی خدمت اور رہنمائی کرتے ہوئے بے داغ پاکیزہ زندگی گزاری۔آخر میں ملت کی امانتیں خاص طور پر ندوۃ العلماء اور خانقاہ تکیہ رائے بریلی کو مضبوط اور امانت دار ہاتھوں میں سونپ کر گئے اور دین کی خدمت کے لیے اپنے تربیت یافتہ افراد کی ایک بڑی تعداد چھوڑی، پھر وقت موعود آیا تو ایک بھی نماز قضا کیے بغیر اللہ اللہ کرتے ہوئے رب کریم کے حضور پیش ہو گئے۔حضرت کو ایسی کامیاب زندگی اور ایسی قابل رشک موت مبارک!

کہکشاں فکر و نظر کے بدر منیر

ڈاکٹر محمد انور حفیظ ندوی
(چیئرمین انڈیا الخیر فاؤنڈیشن- جون پور)

کشادہ پیشانی، پروقار نورانی چہرہ، تواضع وانکساری کا مظہر، حلم ومروت کا پیکر، گفتگو میں جامعیت کی جھلک، اعلیٰ سیرت وکردار کی جیتی جاگتی تصویر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ۲۱ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳ اپریل ۲۰۲۳ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔"ولا نقول إلا ما یرضی ربنا عز وجل، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون!"

حضرت والا رحمہ اللہ کی تربیت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی نگرانی میں ہوئی، وہ ان کے ساختہ و پرداختہ تھے، جامعیت اور فکر وخیال کی بلندی میں ان کی سچی تصویر تھے۔

حضرت والا نرم خوئی، صلہ رحمی، اخلاص عمل اور خلق حسن جیسی صفات حسنہ سے متصف تھے، مہمان نوازی، عبادت میں انہماک، ذکر ودعا اور تلاوت کے اہتمام، رشتوں کے پاس ولحاظ، مسکینوں کی حاجت روائی، اسلام کی برتری کی فکر، علماء کی توقیر، دولت وحشمت کے معاملے میں استغنا اور دیگر بے شمار اعلیٰ خوبیوں میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ہم وصف تھے۔ مفکر اسلام کی رحلت کے بعد حضرت والاؒ ہند و بیرون ہند ان کے نمائندہ کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔ حضرت والا کی شخصیت اس دور قحط الرجال میں سلف صالحین کی ایک یادگار تصویر تھی۔ علم وادب، تعلیم وتعلم، رشد وہدایت، دعوت وتبلیغ اور ملی قیادت میں حضرت والا کی گراں قدر خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ حضرت دنیا کی مشہور تحریکوں، تنظیموں اور تعلیمی اداروں کے ممبر، سرپرست، صدر اور بعض کے فاؤنڈر بھی رہے ہیں۔ آپ دنیا کے متعدد ممالک جن میں امریکہ، جاپان، مراکش، ملیشیا، مصر، تونس، الجزائر، ازبکستان، ترکی، جنوبی افریقہ کے ممالک شامل ہیں کے اسفار بھی کر چکے تھے۔

حضرت والا کی جامع شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے، آپ کے خاندانی کوائف، اوصاف وکمالات اور تعلیمی زندگی نیز ملی وسماجی خدمات کے احوال پر میرے بڑوں کی جانب سے پہلے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔ اس لیے میں نے اپنے اس مختصر مضمون میں ان کا اعادہ نہ کرتے ہوئے اپنے چند ذاتی تاثرات پیش کرنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ بچپن میں مجھے ایک مرتبہ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ (جو مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ کے دست گرفتہ اور مجاز صحبت تھے) کے ہم راہ دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں حاضری کا موقع ملا، اسی سفر میں مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ نے میری عربی تعلیم کی ابتداء قصص النبیین پڑھا کر کروائی تھی، چنانچہ اسی موقع پر میں نے پہلی مرتبہ استاد محترم حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کو دیکھا تھا، بعد میں دوران تعلیم ندوہ میں حضرت والا کو دور سے دیکھا کرتا تھا، پھر ایک وقت آیا کہ مجھے حضرت سے شرف تلمذ بھی حاصل ہو گیا، درجہ ہفتم عربی میں حضرت نے جزیرۃ العرب (جغرافیہ) پڑھائی۔ حضرت بڑی تفصیل سے جزیرۃ العرب کا جغرافیہ سمجھایا کرتے تھے۔

ویسے بذات خود جغرافیہ ایک دلچسپ موضوع ہے اور خاص طور پر جغرافیہ جزیرۃ العرب- جہاں جانے اور جسے دیکھنے کا بچپن ہی سے بڑا اشتیاق تھا- کے پڑھنے اور سننے میں بڑا لطف آتا تھا۔

حضرت والا کے سمجھانے کا انداز بڑا دل کش ہوا کرتا تھا، بعد میں اللہ کے فضل سے مجھے وہاں ایک طویل عرصے تک بسلسلہ ملازمت قیام کا موقع ملا، چنانچہ جب کبھی وہاں کے مختلف شہروں اور صحرا میں بسنے والی چھوٹی چھوٹی بستیوں سے گزر ہوتا تو حضرت کی بتائی ہوئی باتیں اکثر یاد آجایا کرتی تھیں اور بعینہٖ مشاہدے سے اور بھی مستحضر ہو جایا کرتی تھیں۔ درجہ ہشتم عربی میں حضرت والا سے ''الادب العربی بین عرض ونقد'' پڑھنے کا موقع ملا۔ میرے درجے میں ایک یمنی طالب علم تھا، چنانچہ اس کی رعایت سے حضرت اکثر عربی میں درس دیا کرتے تھے، بڑی آسان عربی میں مضامین کی تشریح فرماتے تھے۔ وہ یمنی ہم سبق مجھ سے کہا کرتا تھا کہ

"فضيله الأستاذ الشيخ محمد الرابع يلقى المحاضرة بالبسط والتفصيل ويمكن للطالب فهمها بسهولة، وأسلوب محاضرته رائع وحلو."

حضرت سے ''الادب العربی'' کے اسباق پڑھنے سے عربی زبان کے سیکھنے اور اس کے فہم وادراک کا ایک قیمتی موقع ملا، جس سے بعد میں ملازمت کے کاموں میں مجھے بڑی مدد ملی۔

میرے تعلیمی دور میں فضیلت سال دوم کے طلباء کو کچھ دنوں کے لیے تکیہ کلاں رائے بریلی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی خدمت میں بھیجا جایا کرتا تھا اور ان کے لیے ایک منظّم پروگرام تیار کیا جاتا تھا اور وہاں پر بڑے اساتذہ کرام کی جانب سے محاضرات کا بھی اہتمام ہوا کرتا تھا، چنانچہ وہاں پر بھی مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت والا سے مجھے مستفید ہونے کا ایک قیمتی موقع ملا تھا۔ ندوے سے فراغت کے بعد والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت والا سے میرے بارے میں مشورہ کیا تو حضرت نے راقم کو شبلی لائبریری سے منسلک کر دیا، لیکن یہ سلسلہ زیادہ طویل نہ رہ سکا، والد ماجد نے مزید تعلیم جاری رکھنے کے لیے مجھے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی بھیج دیا، اس طرح سے حضرت والا سے براہ راست استفادہ کا موقع جاتا رہا، لیکن حضرت سے رابطہ برابر قائم رہا، والد صاحب حضرت والا سے بڑی عقیدت رکھتے تھے، والد صاحب جب مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے کے لیے پہلی مرتبہ رائے بریلی حاضر ہوئے تھے تو حضرت والا کے توسط سے ہی حضرت سے پہلی ملاقات ہوئی تھی اور بیعت ہونے کے بعد آپ ہی نے پہلے والد ماجد کو مبارک باد بھی دی تھی۔ مفکر اسلام حضرت علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد حضرت والا ہی ان کے مربی ومرشد ہو گئے تھے۔ حضرتِ والا والد ماجد سے بعض اہم امور میں مشورے بھی کیا کرتے تھے، کئی مرتبہ حضرت والا جونپور گھر پر بھی تشریف لائے، ریاض سے لوٹنے کے بعد حضرت والا کی خدمت میں برابر حاضری کی سعادت ملتی رہی۔ سن ۲۰۲۰ء میں راقم کی مرتب کردہ کتاب ''نقوش زندگی'' خودنوشت وکیل احمد انصاری (ایڈوکیٹ) رحمۃ اللہ علیہ پر حضرت نے ایک وقیع پیش لفظ لکھ کر والد صاحب سے اپنے تعلق کا اظہار فرمایا اور میری اس کوشش پر اپنی خوشی ظاہر فرمائی۔

حضرت کی شفقت ومحبت کو یاد کر کے دل کی عجیب کیفیت ہو جاتی ہے اور زبان سے بے ساختہ یہ الفاظ نکل پڑتے ہیں:

"إن القلب ليخشع وإن العين لتدمع وإنا لفراقك يا أستاذنا وشيخنا لمحزونون."

اللہ تعالیٰ حضرت کو بہترین جزائے خیر عطا فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین!

مسئلہ تحفظ شریعت

''مسلمانوں کے لیے اسلامی شریعت ویسی ہی لازم اور ضروری ہے جیسے ان کا عقیدہ، شریعت میں تبدیلی کرنے یا تبدیلی کو صحیح سمجھنے کے بعد مسلمان مسلمان نہیں رہتا، اس طرح شریعت کی تبدیلی مسلمان کے لیے گویا مذہب کی تبدیلی ہے، اسی لیے مسلمانوں نے ہمیشہ اپنی شریعت کی حفاظت کے لیے پورے عزم وہمت کا ثبوت دیا ہے۔'' (مسلمانوں کا عائلی قانون: ۷-۸)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

سرمایہ ملت کا پاسباں

مفتی راشد حسین ندوی
(مہتمم مدرسہ ضیاء العلوم-رائے بریلی)

آخر وہ حادثہ پیش آ گیا جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا اور ناظم ندوۃ العلماء، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، سینکڑوں مدارس وملی تنظیموں کے سرپرست مرشد الامت، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا رابع صاحب بھی راہی ملک بقا ہو گئے۔ إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ، كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ.

مولانا کی وفات بلاشبہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے دھچکا ہے، بلاشبہ ہر انسان کی جان قیمتی ہوتی ہے، لیکن بعض کا جانا صرف گھر والوں کو متاثر کرتا ہے، کچھ کی وفات خاندان پر اثر انداز ہوتی ہے، جب کہ کچھ کی وفات بڑے علاقوں بلکہ پورے ملک کو سوگوار کرتی ہے، مولانا رابع حسنی صاحبؒ ان معدودے چند افراد میں سے ہیں جن کی جدائی نے پوری اسلامی دنیا کے باشعور طبقہ کو سوگوار کر دیا، اسی لیے ہر طرف سے تعزیتی پیغامات کے تانتے بندھے ہوئے ہیں اور ندوۃ العلماء لکھنؤ اور تکیہ رائے بریلی میں اب تک مختلف جگہوں سے تعزیت کے لیے آنے والوں کا سلسلہ جاری ہے، ندوۃ العلماء میں جنازہ کی نماز میں انسانوں کے ہجوم بلکہ سیلاب کا منظر سوشل میڈیا پر دیکھا اور تکیہ کی نماز جنازہ کا بچشم خود سامنے سے مشاہدہ کیا، دونوں مناظر دیکھ رہا تھا اور ذہن میں امام احمد بن حنبل کا تاریخی جملہ گونج رہا تھا:

"بيننا وبينهم الجنائز"

اور یہ سب کیوں نہ ہوں کہ اس آخری دور میں مولانا رابع صاحبؒ پوری ملت اسلامیہ کی امیدوں کا مرکز اور موجودہ ملکی وغیر ملکی پیچیدہ حالات میں مسلمانوں کی طوفانوں اور منجدھار میں پھنسی ہوئی ہچکولے کھاتی کشتی کو ساحل تک پہنچانے کی جادوئی صلاحیت رکھنے والے ناخدا تھے اور بلاشبہ عبدہ بن طبیب کے الفاظ میں:

وما كان قيس هلكه هلك واحد
ولكنه بنيان قوم تهدما

مولانا کی انتظامی صلاحیتوں اور غیر معمولی دور اندیشی کا اعتراف قریب سے جاننے والا ہر شخص کرے گا، خواہ اس کی آپ سے مناسبت رہی ہو یا نہ رہی ہو۔

مولانا کا نام میں نے سب سے پہلے اس وقت سنا جب ۱۹۸۰ء یا ۱۹۸۱ء میں درجہ حفظ میں داخلہ لینے کے لیے ندوۃ العلماء حاضر ہوا، ایک کیسٹ میں عربی میں کچھ کہا جا رہا تھا، میں اس وقت تک صرف حضرت مولانا علی میاں صاحب کا نام شناس تھا، میں نے پوچھا کہ کیا یہ حضرت مولانا کی آواز ہے؟ بتایا گیا کہ نہیں! یہ مولانا رابع حسنی صاحب کی آواز ہے، یہ فلاں کا عربی میں تعارف کرا رہے ہیں، پھر جلد ہی مولانا رابع صاحب کی زیارت بھی ہوئی، میرا داخلہ حضرت مولانا علی میاں صاحب کے ڈرائیور سید نصیر مرحوم نے مولانا رابع صاحب کے تعاون سے ہی کرایا، پھر مختلف مراحل طے کرتے ہوئے جب عالیہ اولیٰ میں پہنچا تو ایک دن جمعرات کو "النادی العربی" کے پروگرام میں ہمارے درجہ کے امین الصّف ثناء اللہ (ڈاکٹر ثناء اللہ صاحب، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے طے کیا کہ آج معینہ موضوعات پر تقریریں کرنے کے بجائے فلاں موضوع پر (جواب یاد نہیں) عربی میں مباحثہ کیا جائے، وہ خود ماشاء اللہ بڑی روانی اور طلاقت سے عربی بول لیتے تھے بقیہ ہم سب کمزور تھے، لیکن تیار ہو گئے، درجہ کے مشرف موجود نہیں تھے، زور دار مباحثہ ہو رہا تھا، اسی دوران مولانا رابع صاحب نے باہر چھپ کر ہمارا مباحثہ سنا، پھر درجہ میں آ گئے، اس وقت بھی مولانا ندوہ کے کلیۃ اللغہ کے سربراہ اور سینئر ترین اساتذہ میں سے تھے، ہم لوگوں کو جھجک تو ہوئی، لیکن مولانا کی تشجیع کے بعد

مباحثہ جاری رہا، مولانا نے مباحثہ کے اختتام پر عربی میں مختصر خطاب بھی کیا اور بڑے تشجیعی کلمات کہے، جس سے ہمارے تمام ساتھیوں کو (جن میں موجودہ ناظم ندوۃ العلماء مولانا بلال حسنی بھی تھے) بڑی خوشی محسوس ہوئی اور اتنے بزرگ استاذ کے اپنے درجہ میں آنے اور ہمت افزائی کرنے کو ہم سب نے اپنا بڑا اعزاز قرار دیا۔

پھر مختلف مراحل طے کرتے ہوئے جب ہم عالیہ ثالثہ پہنچے تو مولانا سے خود انہی کی کتاب ''جزیرۃ العرب'' پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، مولانا کے اندر ہر چیز کو خواہ کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو، نہایت سہل کر کے پیش کرنے کی غیر معمولی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے دے رکھی تھی، آپ نے جزیرۃ العرب بھی اس طرح نقشے اور چارٹ وغیرہ بلیک بورڈ پر بنا بنا کر سمجھائی کہ ہم کو جغرافیہ سے دلچسپی پیدا ہوگئی، پھر عالیہ رابعہ میں ہمیں مولانا ہی کی کتاب ''الادب العربی'' مولانا سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، فضیلت اول میں ''تہذیب سیرت ابن ہشام'' اور فضیلت دوم میں ''سبع معلقات'' ہماری جماعت نے مولانا ہی سے پڑھی، ان کتابوں کا پورا درس آپ عربی میں دیتے تھے، لیکن درس میں جس طرح آپ با صلاحیت طلبہ کی سطح اور ان کے اشکالات کو پیش نظر رکھتے تھے، وہیں کمزور ترین طلبہ کی سطح کا بھی خیال رکھتے تھے، اسی لیے فضیلت دوم تک میں آپ آخر میں اشعار کا اردو میں ترجمہ بالالتزام کیا کرتے تھے، کوئی اچھا سوال کیا جائے تو بہت خوشی کا اظہار کرتے تھے، بڑی بشاشت کے ساتھ جواب دیتے تھے، بعض اوقات یہ بھی کہتے تھے کہ اس سوال کا جواب دینے کے لیے مزید مطالعہ کی ضرورت ہے۔

مولانا صحیح معنی میں استاذ الاساتذہ تھے، کئی نسلوں کی تدریس کا اللہ نے آپ کو موقع دیا، زیر تدریس کتاب کا درس مضمون پر پوری طرح حاوی ہو کر اور پوری تیاری کے ساتھ دیتے تھے، آپ کی تواضع اور انکساری کو دیکھ کر بعض اوقات ناسمجھ لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو جاتی تھی کہ آپ کا میدان صرف ادب عربی تھا، علوم شرعیہ کا حق ادا کرنے میں آپ کو کمال نہ تھا، لیکن عالیہ ثالثہ میں حماسہ پڑھاتے ہوئے مولانا شفیق الرحمٰنؒ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ ندوہ میں ایک استاد ایسے ہیں جو کسی بھی کتاب کا حق ادا کر سکتے ہیں اور وہ مولانا رابع صاحب ہیں، اسی طرح فقہی مسالک کے پھیلنے میں جغرافیائی حالات کے اثرات سے متعلق آپ جو کچھ فرمایا کرتے تھے، وہ فقہ میں آپ کی گہری نظر کی عکاسی کرتا ہے، مثلاً: فقہ شافعی میں سمندری حیوانات کی حلت میں وسعت کے سبب ساحلی علاقوں میں شافعی مسلک ماننے والوں کی زیادہ تر اکثریت ہے اور امام مالک کے نزدیک نجاست کے ملنے سے ماء قلیل بھی نجس نہیں ہوتا، اسی لیے جن ممالک میں پانی کا حصول دشوار ہوتا ہے، وہاں زیادہ تر فقہ مالکی کے ماننے والے ہیں۔ اس طرح کی کئی مثالیں آپ بیان فرماتے تھے جو اس وقت ذہن میں نہیں ہیں۔

جہاں تک ادارتی ذمہ داریوں کو نبھانے کا تعلق ہے، تو اس میں جس خوبی سے سب کو ساتھ لے کر آپ نے چل کر دکھایا اور جس خوبی اور حسن تدبیر سے بہت سے اٹھتے فتنوں کا سر کچلا اور ندوۃ العلماء کو بربادی سے بچایا اور دوسری طرف جس طرح پرسنل لا بورڈ کو بکھرنے سے بچایا، اس کو آنے والے دور کا مؤرخ فراموش نہیں کر سکتا، حضرت مولانا علی میاں صاحب جیسی عبقری شخصیت کے بعد ندوہ اور بورڈ کا پہلی حالت میں باقی رکھ پانا ہی کسی کرامت سے کم نہیں تھا، لیکن آپ نے تو تعمیری اور تعلیمی اعتبار سے زمانہ کے شانہ بشانہ چلتے ہوئے ندوۃ العلماء کو آگے بڑھایا، نصاب تعلیم میں کئی مفید تبدیلیاں کی گئیں، کئی نئی عمارتوں کا اضافہ کیا گیا، کوئی بھی ان ترقیات کو نظر انداز نہیں کر سکتا، اسی طرح جب مختلف مسالک والوں نے اپنے اپنے مسالک کے نام سے پرسنل لا بورڈ بنانے کا اعلان کیا تو آپ جبل استقامت بنے رہے، پھر دنیا نے دیکھا کہ دشمن پرسنل لا بورڈ میں جس انتشار کا انتظار کر رہے تھے وہ ان کا محض خواب ثابت ہوا اور ان کے ہاتھ صرف مایوسی لگی، جہاں تک تنقید کرنے والوں کا تعلق ہے تو انسان کوئی بھی عمل کرے تنقید سے نہیں بچ سکتا، بس تنقید کرنے والوں کے نام بدل جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی بال بال مغفرت فرمائے، جنت الفردوس عطا فرمائے اور ان کی جگہ کام کرنے والوں کو ان کا نعم البدل بنائے اور ہمارے ان اداروں کی حفاظت فرمائے اور ہر طرح کے فتنوں اور حاسدین کے حسد اور انتشار پسند عناصر کے فتنوں سے محفوظ کرے۔ آمین!

برکۃ العصر وریحانۃ الہند

مولانا عبدالسبحان ناخدامدنی ندوی
(نائب مہتمم مدرسہ ضیاءالعلوم-رائے بریلی)

اللہ رب العزت کا فیصلہ اپنی مخلوقات کے تعلق سے یہ ہے کہ ہر ایک کو موت کا مزہ چکھنا ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾ (ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے)

زمین والوں کے بارے میں اللہ نے اپنے فیصلہ کا اعلان یوں فرمایا ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ☆ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (زمین پر جو ہیں سب فنا ہو جائیں گے، بس آپ کے رب کی ذات باقی رہے گی جو جاہ وجلال اور عزت واکرام والی ہے)

زمین وآسمان کی کل مخلوق کے تعلق سے اس نے اپنا فیصلہ یہ سنایا

﴿وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَصَعِقَ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَمَن فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَن شَاءَ اللَّهُ﴾ (صور پھونکا جائے گا تو جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں سب کے ہوش اڑ جائیں گے (یعنی سب کو موت آئے گی) ہاں جسے اللہ چاہے)

بلکہ اپنی ذات اقدس کے علاوہ ہر چیز کے بارے میں اس نے یہ فیصلہ کن اعلان فرمایا:

﴿كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ لَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (اس کی ذات کے علاوہ ہر چیز ہلاک ہو کر رہے گی، فیصلہ بس اسی کا ہے اور صرف اسی کی طرف تم سب لوٹائے جاؤ گے)

اس کا دوسرا فیصلہ کن اعلان یہ ہے کہ ہر جان اپنے متعین وقت ہی پر رخصت ہوتی ہے، کسی کی موت بے وقت نہیں ہوتی' ارشاد ہے:

﴿وَمَا يُعَمَّرُ مِن مُّعَمَّرٍ وَلَا يُنقَصُ مِنْ عُمُرِهِ إِلَّا فِي كِتَابٍ إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ﴾ (کسی عمر والے کو جو عمر دی جاتی ہے اور کسی کی عمر جو کم رکھی جاتی ہے سب کتاب میں (یعنی لوح محفوظ) میں درج ہے اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے)

موت کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ کا تیسرا اعلان یہ ہے کہ کوئی اس کی مشیت کے بغیر نہیں مرتا، موت اس کے فیصلہ سے آتی ہے، زندگی اور موت کا مالک تنہا وہی ہے، ارشاد ہے:

﴿وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللهِ كِتَاباً مُّؤَجَّلاً﴾ (ممکن نہیں کہ کوئی جان مرجائے مگر اللہ کی مشیت سے، یہ بات لکھی ہوئی ہے طے شدہ ہے)

یہ بھی ارشاد ہے:

﴿قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ﴾ (کہیے: اللہ تمہیں زندگی بخشتا ہے پھر موت دینے والا بھی وہی ہے، وہی تمہیں قیامت تک جمع کرتا رہے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں)

ان تمام آیات کے ذریعہ درحقیقت تمام انسانوں کو یہ پیغام دیا گیا ہے کہ وہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہیں، چاہے کسی عزیز ترین ہستی کی موت سے قوم وملت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے، چاہے اس کی ضرورت اس وقت سب سے زیادہ محسوس کی جائے، لیکن بندوں کا طرز فکر اور طرز عمل یہی ہونا چاہیے کہ وہ اللہ رب العزت کے فیصلے کو دل وجان سے قبول کریں اور کسی حرف شکایت کو نہ زبان پر آنے دیں' نہ دل میں جگہ دیں۔ آپ ﷺ کے فرزند عزیز حضرت ابراہیم کا جب انتقال ہوا تو آپ نے ان مبارک الفاظ میں اپنے قلبی جذبات واحساسات کا اظہار فرمایا جو رہتی دنیا تک تمام انسانوں کے لیے ایک نمونہ ہے:

"یحزن القلب وتدمع العین ولا نقول إلا ما یرضی به ربنا، وإنا بفراقك یا ابراهیم لمحزونون" (دل غمگین ہے، آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہیں لیکن ہم وہی کہیں گے جس سے ہمارا رب راضی ہو، ابراہیم! تمہاری جدائی سے ہم بہت غم زدہ ہیں)

ان تمام حقائق کے ساتھ یہ بات بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ کچھ عزیز ترین ہستیاں اپنے پیچھے ایسا خلا چھوڑ جاتی ہیں کہ مدتوں اسے بھرا نہیں جاسکتا، بعض ہستیوں کا خلا ذاتی طور پر محسوس کیا جاتا ہے، بعض ہستیاں گھر کا اجالا ہوتی ہیں، ان کا جانا پورے گھر کو ویران کر جاتا ہے، بعض وہ مبارک ہستیاں ہوتی ہیں جو قوم وملت کا سرمایہ ہوتی ہیں اور ان کے جانے سے پوری ملت یتیم ہوجاتی ہے۔

مخدوم گرامی قدر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی رحمۃ اللہ علیہ کا تعلق بھی ان ہی ہستیوں سے تھا جو سرزمین ہند میں سرمایہ ملت کے نگہبان تھے، آپ کی رحلت سے رہ رہ کر وہ احادیث یاد آرہی ہیں جو حضور ﷺ نے ارشاد فرمائی تھیں، جن میں یہ خاموش پیغام دیا گیا ہے کہ صالحین کی قدر کی جائے، وہ چلے جائیں گے تو پھر ان کا بدل ملنا مشکل ہوگا، ارشاد رسالت ہے:

"یذهب الصالحون الأول فالأول ویبقی حفالة کحفالة الشعیر أو التمر لا یبالهم الله بالة" (صالحین ایک ایک کرکے رخصت ہوجائیں گے، کوئی پہلے کوئی بعد میں اور ردّی قسم کے لوگ رہ جائیں گے، جیسے ردّی کھجور اور جو ہوتی ہے، اللہ کو ان کی کوئی پرواہ نہیں ہوگی)

یہ بھی ارشاد فرمایا:

"إنما الناس کالإبل المائة لا تکاد تجد فیها راحلة" (لوگ تو سینکڑوں اونٹوں کی طرح ہوتے ہیں، ان میں سواری کے قابل اونٹ تو بمشکل ہی ملتے ہیں)

اسی طرح انسانوں میں قابل قدر انسان بہت ہی کم ہوتے ہیں۔

مولانا کے رخصت ہونے کے بعد یہ احساس اور شدت اختیار کرگیا ہے، فطرتِ انسانی جو ظاہری سہاروں کی متلاشی رہتی ہے اور ان سے تسکین پاتی ہے، اب چند ایک کو چھوڑ کر دور دور تک کوئی ایسا سہارا نظر نہیں آتا جس سے دل کو تسلی ملے اور نگاہوں کو قرار آئے۔

مولانا کا خیال آتا ہے تو بے اختیار ذہن کے پردہ پر وہ مبارک آیات جھلملانے لگتی ہیں جن میں رحمٰن کے بندوں اور ان کی دل کش صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ تمام صفات حضرت مولانا کی زندگی میں مجسم پائی جاتی تھیں، آپ ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْأَرْضِ هَوْناً وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُوْنَ قَالُوا سَلَاماً﴾ سے سورہ کے آخر تک پڑھتے چلے جایئے اور ذہن میں حضرت مولانا رابع صاحب کا تصور لایئے، آپ کو آیات کے صاف شفاف آئینے میں مولانا پوری طرح فٹ نظر آئیں گے۔

امتیازات-کمالات-خصوصیات

اللہ رب العزت نے آپ کو بڑی اعلیٰ صفات عطا فرمائی تھیں، ان میں دو بنیادی صفات جن کو پورے دین کا خلاصہ کہنا چاہیے، آپ میں سب سے زیادہ نمایاں طور پر پائی جاتی تھیں، وہ ہیں: عبادت حق اور شفقت علی الخلق، ان کو حقوق اللہ اور حقوق الناس کی ادائیگی سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، خود اللہ کے رسول ﷺ کی پاکیزہ ترین زندگی کا خلاصہ بیان کیا جائے تو وہ یہی ہوگا کہ آپ ﷺ کی پوری زندگی حقیقت میں اللہ رب العزت کی عبادت کے لیے اور ظاہر میں بندگان خدا کی سچی خدمت کے لیے وقف تھی۔ اس مبارک ترین زندگی کی جھلکیاں ہم نے مولانا رابع صاحبؒ کی زندگی میں دیکھیں اور خوب دیکھیں، آپ کی راتیں اللہ کی سچی بے ریا عبادت میں بسر ہوتی تھیں، ان میں خاص طور پر خشیت وابتہال اور دعا وتضرع کی کیفیات غالب ہوتیں، اس دعا میں بھی خوف آخرت اور خلق خدا پر شفقت کا پہلو غالب ہوتا، دوسری طرف آپ کے دن بندگان خدا کی دل جوئی ودل داری میں صرف ہوتے تھے، جو بھی آپ کے پاس آتا آپ کسی کو واپس نہیں فرماتے، اس کی غیر اہم باتیں بھی توجہ سے سنتے اور ممکن حد تک اس کی تسلی فرماتے۔

فکر اسلامی:

فکر اسلامی صرف مقالات لکھنے اور توسیعی خطبات دینے کا نام نہیں ہے، یہ حقیقت میں شمع کی طرح سلگنے اور قطرہ قطرہ پگھلنے کا

نام ہے، یہاں تک کہ انسان کی پوری شخصیت مجسم فکر اسلامی بن جائے۔ رفتار، گفتار، تحریر، تقریر، اخلاق، کردار، وعظ ونصیحت، یعنی ہر ادا فکر اسلامی میں ڈھل جائے، میں نے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو اس باب میں انتہائی ممتاز پایا ہے، آپ کے ساتھ اگر اور شخصیت کو جوڑا جاسکتا ہے تو وہ آپ کے برادر اصغر حضرت مولانا سید محمد واضح رشیدؒ کی مبارک شخصیت ہے، میں نے ان دونوں بھائیوں کو کبھی بے فکری کے ساتھ ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، مسکراہٹ چہرہ پر بسی رہتی، ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے، کوئی ہنسنے والی بات ہوتی تو مسکراہٹ اور گہری ہوجاتی، لیکن میں نے زندگی کے کسی بھی مرحلہ میں دونوں بھائیوں کو ایک لمحہ کے لیے بھی بے فکری کی کیفیت میں نہیں دیکھا، یہ حقیقت میں رسول اللہ ﷺ کی مبارک سنت کا عکس تھا جو آپ میں اور آپ کے بھائی میں صاف نظر آتا تھا، رسول اکرم ﷺ کے بارے میں راوی کہتے ہیں:

"كان رسول الله صلى الله عليه وسلم دائم الفكرة متواصل الأحزان طويل السكت ليست له راحة"

(آپ ﷺ ہمیشہ متفکر رہتے، اکثر غم گین رہتے، بہت خاموش رہتے، ایسا لگتا جیسے آپ کو کسی پل چین نہیں)

دوسری طرف راوی یہ بھی کہتے ہیں:

"كان رسول الله صلى الله عليه وسلم دائم البشرة متهلل الوجه" (رسول اللہ ﷺ پر ہمیشہ ایک مسکراہٹ رہتی اور چہرہ انور ہمیشہ دمکتا رہتا)

یہ دونوں مبارک کیفیات دونوں بھائیوں میں خوب خوب نظر آتی تھیں۔

قرآن کریم کے بارے میں ہر طالب قرآن جانتا ہے کہ اس میں کوئی ہنسنے ہنسانے والا لطیفہ نہیں ہے، اس کی ہر بات سچی، اس کا ہر حکم سنجیدگی پر مبنی ہے، لیکن اس کے باوجود اللہ کا کلام اس قدر لطیف ہے کہ اس کی لطافت کے سامنے دل وجان قربان ہوجائیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے اخلاق کا منبع قرآن کریم تھا، آپ کی سیرت کا سرچشمہ اللہ کا کلام اور اللہ کے رسول ﷺ کی مبارک ذات تھی، اس لیے آپ کی مجلس میں ہم نے کبھی کوئی لطیفہ نہیں سنا، جس پر بے فکری کے ساتھ ہنسا جائے، لیکن دوسری طرف آپ کی مجلس میں کوئی بوجھل پن بھی نہیں تھا، وہی لطیف باتیں، وہی انسانیت کے درد کو اجاگر کرتے کلمات، وہی تسلی آمیز انداز، وہی تسکین بخش کیفیات، وہی دل جوئی ودل داری، وہی فکر آخرت اور خوفِ خدا کا پاکیزہ شعور کہ انسان اور زیادہ اللہ سے قریب ہوتا چلا جائے، وہی امت کی زبوں حالی کا لہولہو احساس، یوں لگے کہ دل چیر دیا گیا ہو، اس احساس میں صرف درد ہی درد کہیں تعلّی اور اپنی بڑائی کا کوئی شائبہ تک نہیں، وہی فکر انگیز خاموشی، صاف معلوم ہوتا کہ دل رو رہا ہے۔ یہ آپ کی مبارک مجلس کی خصوصیات تھیں۔ کوئی سوال کرتا تو کبھی بے دلی سے جواب نہیں دیا، شاید زندگی بھر میں ایک دفعہ بھی نہیں۔

اللہ نے حسن باطن کے ساتھ حسن ظاہر سے بھی خوب نوازا تھا، چہرہ مبارک پر نظر پڑتی تو لگتا کہ سارے غم دور ہوگئے اور ساری دھول جھڑ گئی، بلکہ بعض حضرات کے بقول اخیر میں یہ کیفیت ہوگئی تھی کہ لگتا تھا کہ نور برس رہا ہے، حدیث پاک میں اللہ کے انتہائی نیک بندوں کی جو ایک خاص پہچان بتائی گئی ہے کہ ان کو دیکھنے سے اللہ یاد آتا ہے، اس کا ہم نے آپ کی ذات میں خوب مشاہدہ کیا ہے، رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

"خيار عباد الله الذين إذا رءوا ذكر الله" (اللہ کے سب سے بہترین بندے وہ ہیں جن کو دیکھ کر اللہ کی یاد آتی ہے)

"إن خيار عباد الله من هذه الأمة المؤمنون المطيبون" (اس امت میں اللہ کے نہایت بہترین بندے وہ ہیں جو خوب پاک ہوں اور خوب بھر بھر کر دیں) یعنی پاک باز، پاک دل، پاک نگاہ اور پاکیزہ صفات انسان، جو لوگوں کے حقوق کو بھرپور طریقہ سے ادا کرتے ہوں وہ اس امت کے سب سے بہترین انسان ہیں)

خدا کرے کہ یہ غلو اور مبالغہ نہ ہو، میں نے آپ کو اس حدیث قدسی کے مطابق پایا ہے، جس میں آپ ﷺ اللہ کے حوالہ سے یہ

بات ارشاد فرماتے ہیں:

"فإذا أحببته كنت سمعه الذى يسمع به وبصره الذى يبصر به ويده التى يبطش بها ورجله التى يمشى بها ولئن سألنى لأعطينه ولئن استعاذنى لأعيذنه" (میں جب اپنے بندے سے محبت کرتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں ضرور اسے نوازوں اور وہ میری پناہ لے تو یقیناً میں اسے پناہ دوں)

ایسا شخص شرعاً معصوم نہیں ہوتا، یہ مقام صرف حضرات انبیاء علیہم السلام کا ہے، البتہ ایسے شخص کی زندگی عملاً ایک معصومانہ زندگی بن جاتی ہے۔

خیر وبرکت:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے تعلق سے یہ بات ارشاد فرمائی تھی:

﴿وَجَعَلَنِيْ مُبَارَكاً أَيْنَ مَا كُنتُ﴾ (میں چاہے جہاں رہوں اللہ نے مجھے مبارک بنایا ہے)

مولانا کی ذات میں یہ صفت بہت نمایاں نظر آتی ہے، قوم وملت کی خدمت کرنے والے جس ادارے میں آپ رہے، وہاں اللہ کی طرف سے برکت نظر آتی ہے، چاہے وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء ہو یا مسلم پرسنل لا بورڈ ہو، رابطہ ادب اسلامی ہو، یا مدارس اسلامیہ کی سربراہی ہو، آپسی اختلاف کے باوجود لوگ آپ کی ذات بابرکات پر جمع ہوتے تھے اور آپ سب کے لیے نقطہ اتفاق بنتے۔ آپ کے وجود مسعود کی وجہ سے نہ کوئی ادارہ ٹوٹا، نہ کسی میں دراڑیں آئیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"عند اللّٰه خزائن الخير والشر مفاتيحها الرجال، فطوبى لمن جعله اللّٰه مفتاحا للخير ومغلاقا للشر وويل لمن جعله اللّٰه مفتاحا للشر ومغلاقا للخير" (خیر وشر کے خزانے اللہ کے پاس ہوتے ہیں، مرد حضرات ان خزانوں کی چابیاں ہوا کرتے ہیں، خوش نصیب ہے وہ جسے خداوند قدوس خیر کو کھولنے اور شر کو بند کرنے کا ذریعہ بنائے اور بربادی ہے اس کے لیے جسے اللہ شر کو کھولنے اور خیر کو بند کرنے کا ذریعہ بنائے)

اس پرآشوب دور میں مولانا کی ذات گرامی "مفتاح الخیر" اور "مغلاق الشر" تھی، آپ جہاں بھی رہے سراسر خیر بن کر رہے، آپ کے ذریعہ پتہ نہیں کتنے فتنوں کا دروازہ بند رہا۔

صدیقیت:

ان تمام صفات وکمالات کے نتیجہ میں آپ کی جو مبارک شخصیت بنی تھی، اسی شخصیت کا شاید سب سے نمایاں امتیاز آپ کی صدیقیت تھی۔ اس امت کے تعلق سے اللہ رب العزت کا فیصلہ یہ ہے کہ جو بھی دل وجان سے اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھے گا، اسے مقام صدیقیت اور مقام شہادت تک پہنچا دیا جائے گا، ارشاد ربانی ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُوْلَئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُونَ وَالشُّهَدَاء عِندَ رَبِّهِمْ لَهُمْ أَجْرُهُمْ وَنُورُهُمْ﴾ (جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر (پورا پورا) ایمان لے آئے، اپنے رب کے نزدیک وہی تو صدیق وشہید ہیں، ان کو اپنا اجر اور اپنا نور مل کر رہے گا)

ہم سب جانتے ہیں کہ اس امت کے صدیق اکبر حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں، صدیق استقامت فی القلب والاعتقاد کا سچا نمونہ ہوتا ہے، جس طرح شہید استقامت فی العمل کا نمونہ ہوتا ہے۔ صدیقیت کی ایک امتیازی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ انتہائی نازک موقع پر پوری استقامت کے ساتھ درست فیصلے کرتا ہے اور صراط مستقیم سے بال برابر بھی نہیں ہٹتا، حضرت صدیق اکبر کی مبارک زندگی میں اس طرح کے نمونے خوب ملتے ہیں، معراج کے موقع پر جب کافروں نے آپ ﷺ کا مذاق اڑایا اور ایک شب میں معراج کے سفر کو ناممکن بتانے لگے اور بعض اہل ایمان بھی کچھ بے چین سے نظر آنے لگے تو اس وقت حضرت صدیق اکبر کی ذات تھی، جس نے پورے انشراح کے ساتھ اس کی تصدیق کی اور اس پر ڈٹ گئے۔ کہنے لگے کہ جب ہم شب وروز آپ پر اترنے والی وحی کی تصدیق کرتے ہیں تو پھر آپ کے خود آسمان پر جانے کی تصدیق کیوں نہ

کریں گے؟ آپ کی اسی بے نظیر صداقت کو دیکھ کر اوروں کا ایمان مضبوط ہوا اور اسی کیفیت پر آپ کو دربار نبوت سے صدیق کی سند ملی، صلح حدیبیہ کے موقع پر رسول اکرم ﷺ کے بعد جو ہستی سب سے زیادہ مطمئن و پرسکون تھی وہ حضرت صدیق اکبرؓ کی ذات تھی، یقینی بات ہے کہ اس سے دوسرے صحابہ کو کیسی تقویت ملی ہوگی؟!

آنحضرت ﷺ کی وفات پر جب عظیم ترین حضرات بھی اپنا حوصلہ کھونے لگے تھے، اس وقت تنہا حضرت ابوبکر صدیقؓ کی شخصیت تھی، جس نے سب کو کنٹرول کیا اور بروقت ایسا خطاب فرمایا جس سے بکھراؤ کی کیفیت ختم ہوتی چلی گئی اور ہر ایک حقیقت پسندی کے ساتھ معاملہ کو سمجھنے لگا۔ مانعین زکوٰۃ کا معاملہ آیا تو بعض حضرات کی رائے نرمی کی تھی، لیکن آپ ڈٹ گئے اور ان سے جنگ کی اور آپ کی زبان مبارک سے یہ مشہور جملہ نکلا جو امت کے لیے تمام غیور مردان کار کے دل کی آواز ہے:

"أينقص الدين وأنا حي" (کیا یہ ممکن ہے کہ میں زندہ رہوں اور دین کو نقصان پہنچایا جائے؟!)

(یہی جملہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زندگی کا سب سے روشن باب تھا۔)

اسی طرح حضرت اسامہ کے لشکر کی روانگی کا معاملہ پیش آیا تو بعض حضرات کی رائے یہ ہوئی کہ اس وقت مدینہ کو مضبوط و مستحکم رکھنے کی ضرورت ہے، لہٰذا لشکر نہ روانہ کیا جائے تو بہتر ہے، لیکن حضرت صدیق اکبرؓ نے باصرار لشکر کو روانہ فرمایا۔ اپنی عمر کے سب سے آخری مرحلہ میں آپ نے حضرت فاروق اعظم کو مسلمانوں کا خلیفہ مقرر فرمایا، بعض جانب سے دبی دبی آوازیں بھی آئیں، بلکہ بعض حضرات نے یہ تک کہا کہ آخر آپ اپنے رب کو کیا جواب دیں گے؟ آپ نے فرمایا: میں یہ عرض کروں گا: پروردگار! میں تیری مخلوق پر سب سے بہترین بندہ کو خلیفہ مقرر کر کے آیا ہوں۔

ان تمام مثالوں میں جو بات ہر جگہ نظر آرہی ہے وہ یہی ہے کہ انتہائی نازک وقت میں بروقت انتہائی صحیح فیصلہ۔ بعد میں زمانہ کی آنکھوں نے دیکھا کہ جو فیصلہ صدیق اکبر کا تھا وہی صحیح تھا اور اسی سے امت کو بے پناہ فائدہ حاصل ہوا، بلکہ امت بسا اوقات شدید نقصان سے محفوظ رہی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ کی زندگی میں یہ باب انتہائی روشن نظر آتا ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کو جس بلند ترین سطح پر پہنچایا تھا، اس معیار کو باقی رکھنا کوئی کھیل نہیں تھا، لیکن مولانا رابع صاحبؒ نے یہ معیار جوں کا توں برقرار رکھا اور اس میں ادنیٰ کمی آنے نہ دی، بعد میں کتنے فتنوں نے سر اٹھایا لیکن آپ نے عین موقع پر بروقت انتہائی درست فیصلے فرمائے، جس کے نتیجہ میں ہر فتنہ اپنی موت آپ مر گیا۔ یہی معاملہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا ہے، آپ نے جس وقت یہ ذمہ داری سنبھالی اس وقت سب سے بڑا مسئلہ امت مسلمہ ہندیہ کی شیرازہ بندی کو قائم رکھنے کا تھا، اللہ نے آپ کو وہ محبوبیت عطا فرمائی کہ سب آپ کی ذات بابرکات پر مجتمع ہوئے اور ملت کی وحدت قائم رہی ؏

ایماں کے جہاں پڑتے ہیں قدم پیدا وہیں زمزم ہوتا ہے

دار العلوم ندوة العلماء:

آپ کی ذات گرامی دارالعلوم ندوۃ العلماء کی عظیم شخصیات کا عکس جمیل تھی، اس عظیم عالمی ادارہ کے اہداف و مقاصد کا آپ جیتا جاگتا نمونہ تھے، اس آخری دور میں آپ کی ذات عالی قدر اور دار العلوم ندوۃ العلماء ایک دوسرے کے لیے اس قدر لازم ملزوم بن گئے تھے کہ ممکن نہیں تھا کہ ایک کا ذکر خیر آئے تو دوسرے کا حسین تصور ذہن کے نہاں خانوں میں نہ ابھرے، کہنے والے نے سچ کہا:

"كان يعيش في ندوة العلماء وندوة العلماء تعيش فيه" (ندوۃ العلماء میں آپ زندگی بسر کرتے تھے اور ندوہ آپ کی ذات میں بستا تھا)

آپ نے ایک سے زائد بار خود مجھ سے یہ بات فرمائی کہ دو عظیم شخصیات ایسی ہیں جن کے بغیر ندوۃ العلماء کی تاریخ ہی نہیں بلکہ ندوۃ العلماء کا تصور بھی ادھورا ہے، ایک شخصیت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی ہے اور دوسری شخصیت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی

ہے۔اس سلسلۃ الذہب میں اگر بعد کے حضرات میں کسی کڑی کا اضافہ کیا جاسکتا ہے تو وہ خود آپ کی ذات گرامی ہوسکتی ہے۔آپ کی طالب علمی کے دور کو الگ سے شامل کیا جائے تو ندوہ میں آپ کے قیام کی مدت قریب اسّی پچاسی سال ہوتی ہے، اس طویل مدت میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے تعلق سے جتنی اہم ترین ذمہ داریاں ہوسکتی ہیں، آپ نے وہ تمام ذمہ داریاں نبھائیں اور خوب نبھائیں۔

ایک طرف آپ دار العلوم ندوۃ العلماء کے باوقار استاد رہے، جن کا وزن ہر دور میں محسوس کیا جاتا رہا ہے، جن کی حیثیت کو کبھی نظر انداز نہ کیا جاسکا، دوسری طرف آپ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے دست راست تھے اور علمی، عملی بالخصوص انتظامی لحاظ سے آپ کے لیے راحت واطمینان کا سب سے بڑا ذریعہ بنے رہے، جناب مولانا محبّ اللہ لاریؒ کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ کے لیے آپ نے اہتمام کی ذمہ داری بھی سنبھالی، پھر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنیؒ کے وصال کے بعد بالاتفاق ندوۃ العلماء کی نظامت کے لیے آپ کا انتخاب عمل میں آیا اور حضرت مولاناؒ نے دار العلوم ندوۃ العلماء کو جس معیار ومقام پر پہنچایا تھا، آپ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کے ذریعہ دار العلوم کو اسی معیار پر برقرار رکھا اور اس میں کسی قسم کی گراوٹ آنے نہیں دی، حضرت مولاناؒ کے بعد آپ کی ذات ندوۃ العلماء کے لیے ایک مثالی شخصیت بنی اور آپ کے ذریعہ ادارے کے وقار میں اضافہ ہوا۔ بلاخوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس زمانہ میں جس نے مولانا سید محمد رابع حسنیؒ کو سمجھا، اس نے ندوۃ العلماء کی فکر کو علی وجہ البصیرۃ سمجھا۔جس نے آپ کی زندگی کو اپنے اندر اتار لیا وہ ندوۃ العلماء کے سانچہ میں ڈھل گیا، ہر صاحب علم اور صاحب فکر یہ بات جانتا ہے کہ فکر سے ذہن کو جلا ملتی ہے اور نگاہ کے سامنے ہمیشہ ایک بلند ترین نصب العین رہتا ہے، دوسری طرف شخصیات سے زندہ وتابندہ جیتے جاگتے نمونے ملتے ہیں، جو حقیقت میں فکر ونظر کا حسین وجمیل پیکر ہوتے ہیں، اس دور میں مولانا سید محمد رابع حسنیؒ کی ذات والا صفات ندوۃ العلماء کے بلند ترین نصب العین کا ایک حسین ودل کش نمونہ تھی۔

مسلم پرسنل لا بورڈ:

مسلم پرسنل لا بورڈ ہندوستانی مسلمانوں کا وہ باوقار ادارہ ہے جس پر قریب قریب سب کا اتفاق ہے، دوسری تمام جماعات وجمعیات کے اعتراف کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اکثر ملی معاملات میں مسلمانوں کی نگاہیں پرسنل لا بورڈ کی طرف اٹھتی ہیں، مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے بعد کچھ عرصہ تک قاضی مجاہد الاسلامؒ اس عظیم ادارہ کے صدر نشین رہے، آپ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ اس ادارہ کے سربراہ ہوئے۔آپ نے اس عظیم ادارہ کی مرکزیت کو برقرار رکھا، اس دوران جتنے آزمائشی مرحلے آئے یا بورڈ کو جن انتہائی نازک مراحل سے گزرنا پڑا، آپ کی ذات سب کے لیے اطمینان قلب کا باعث بنی رہی اور تمام نازک ترین مراحل خوش اسلوبی سے عبور کیے گئے، بورڈ کی افادیت مسلم رہی اور تمام ملی مسائل میں بورڈ کے موقف کو مسلمانان ہند کا ہمیشہ اعتماد حاصل رہا، آپ کی دانش وبصیرت اور حکیمانہ قیادت کی وجہ سے پرسنل لا بورڈ اپنا کام کرتا رہا اور ہر قسم کے انتشار سے محفوظ رہا۔

سلف صالحین کے جانشینوں کی ذمہ داری:

کوئی بڑی شخصیت دنیا سے چلی جاتی ہے تو بعد والوں پر اس کے مختلف اثرات نظر آتے ہیں، بعض لوگوں میں اس شخصیت کے تعلق سے خاص قسم کا غلو پیدا ہوتا ہے، جس کی وجہ سے اس کے حقیقی کمالات چھپ جاتے ہیں اور عام لوگوں کے لیے اس شخصیت کو سمجھنا مشکل ہوجاتا ہے اور لوگ اس سے صحیح فائدہ بھی نہیں اٹھاپاتے۔

دوسری طرف وہ طبقہ ہوتا ہے جو مایوسی کا شکار ہوجاتا ہے اور یہ سوچنے لگتا ہے کہ جب فلاں شخصیت ہی نہ رہی تو اب زندگی کا کیا مزہ رہ گیا، لہٰذا وہ اپنے رہے سہے کام بھی چھوڑ دیتا ہے۔

تیسرا طبقہ جانے والے کی پوری قدر دل میں رکھتے ہوئے اصل مشن سے جڑا رہتا ہے اور اسے آگے بڑھانے کی کوشش کرتا ہے، وہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ ہم نے فلاں کا زمانہ پایا،

فلاں سے استفادہ کا ہمیں موقع ملا، فلاں کی پوری زندگی ایک صاف آئینہ کی مانند ہمارے سامنے رہی، لہٰذا ان کی زندگی کو مشعل راہ بنا کر ہمیں اس مشن کو آگے بڑھانا ہے۔

اللہ رب العزت نے سب سے عظیم انسان یعنی حضرت محمد ﷺ کی وفات کا تذکرہ فرما کر یہ بتا دیا کہ اچھے اسلاف کے اچھے اخلاف کون ہوتے ہیں؟ ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِن مَّاتَ أَوْ قُتِلَ انقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَن يَنقَلِبْ عَلَى عَقِبَيْهِ فَلَن يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئاً وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ﴾ (محمد (ﷺ) تو اللہ کے رسول ہیں، آپ سے پہلے کئی رسول گذر چکے ہیں، اگر آپ کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید کر دیے جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے؟ بس جو بھی الٹے پاؤں پلٹ جائے گا وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہیں کر سکے گا، عنقریب اللہ تعالیٰ شکر گزاروں کو خوب عنایت فرمائے گا)

ان مبارک آیات میں خود رسول اکرم ﷺ کی مثال دے کر یہ بتایا گیا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، جیسے اور رسول گذرے ہیں، آپ بھی اسی طرح رسول ہیں، یعنی آپ کے تمام کمالات کمال رسالت سے ماخوذ ہیں، آپ کو مقام رسالت سے اٹھا کر ہرگز مقام الوہیت تک نہ پہنچایا جائے، صاف معلوم ہو رہا ہے کہ اس ٹکڑے کے ذریعہ امت کو غلو اور مبالغہ سے پرہیز کرنے کی ہدایت دی جا رہی ہے، خود آپ ﷺ نے اپنے بارے میں یہ بات ارشاد فرمائی:

"لا تطرونی کما أطرت النصاریٰ عیسیٰ ابن مریم، قولوا عبد اللہ ورسولہ" (مجھے اپنے مقام سے اس طرح آگے نہ بڑھاؤ جس طرح نصاریٰ نے عیسیٰ بن مریم کو آگے بڑھایا، بس یہ کہو کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا رسول ہوں)

دوسرا پیغام یہ دیا گیا ہے کہ اگر اللہ کے رسول کا انتقال ہو جائے یا آپ شہید کر دیے جائیں تو ہمت ہار کر بیٹھ نہ جانا، نہ اپنا مشن چھوڑنا، اس میں مایوسی اور بد دلی سے صاف صاف منع کیا گیا ہے، لہٰذا بڑی سے بڑی شخصیت چلی جائے تو بعد والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہرگز مایوس نہ ہوں، اللہ کی ذات سب سے بڑھ کر طاقتور اور بلند ہے۔

تیسرا پیغام ﴿وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ﴾ کہہ کر یہ دیا گیا ہے کہ جو اپنے اسلاف کے سچے جانشین ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ مشن سے جڑے رہتے ہیں اور عملاً شکر گزار ہو کر اللہ کی طرف سے بے پناہ عنایات کے مستحق ہوتے ہیں، لہٰذا اخلاف کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس پر شکر ادا کریں کہ انہوں نے اپنے سلف صالح کا زمانہ پایا، پھر ان کے مشن سے وابستہ ہو کر ممکن حد تک اسے آگے بڑھانے کی سعی محمود کریں۔

رسول اکرم ﷺ نے اپنی مبارک عمر کے آخری دور میں اپنے محبوب صحابی حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا اور ارشاد فرمایا کہ معاذ! ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد میں تمہیں اس دنیا میں نہ ملوں، تمہارا گذر میری قبر کے پاس ہو۔ اس پر حضرت معاذ کی جو کیفیت ہوئی ہوگی اسے بتانے کی ضرورت نہیں، جان چھڑکنے والے صحابی کو جب حضور (ﷺ) خود اپنی وفات کی خبر دیں تو ان پر کیا گذری ہوگی؟! اس وقت بھی آپ نے نبوی مشن سے وابستہ ہونے کی ان کو تلقین کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"ألا إن أولیائی المتقون من کانوا وأینما کانوا" (سنو! مجھ سے گہرا تعلق رکھنے والے اور سچی محبت رکھنے والے وہ لوگ ہیں جو اپنے اندر خوفِ خدا رکھتے ہوں چاہے جو ہوں اور چاہے جہاں رہتے ہوں)

حضرت مولاناؒ کی زندگی کا مشن:

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ کا مشن بھی یہی تھا، میرا کہیں دعوتی سفر ہوتا اور خدمت میں حاضری ہوتی تو اکثر یہ فرماتے کہ لوگوں میں صحیح عقیدہ کا شعور پیدا کرو اور دلوں میں خوف خدا کی جوت جگاؤ، آخرت میں جواب دہی کا احساس پیدا کرو، تاکہ زندگی صحیح بنیاد پر قائم ہو جائے۔ اکثر یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اس زمانہ کا خاص مرض مفاد پرستی اور شدت پسندی ہے، مزاج میں تشدد رچ بس گیا ہے اور نفسانیت و مفاد پرستی بے انتہا بڑھ گئی ہے، اس کا مقابلہ نرمی و قربانی

ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ آخر کے چند سالوں میں آپ کی تقریروں میں دنیا وآخرت کا موازنہ ہوتا تھا اور بڑی تاکید کے ساتھ اس پر زور دیا جاتا تھا کہ اپنی آخرت کو ممکن حد تک بہتر سے بہتر بنایا جائے، تاکہ وہاں کی رسوائی سے محفوظ رہا جاسکے۔

صدق وصفا اور اخلاص ووفا کا یہ پیکر ۲۱ر رمضان المبارک بروز جمعرات اپنے رب کے حضور حاضر ہوا۔ (اس وقت ہمارے یہاں بھٹکل واطراف میں رمضان کی ۲۲ر تاریخ تھی) اور ایک جہاں کو اشک بار کر گیا۔ ہم سب کے قافلہ سالار رخصت ہوئے، دل پر چوٹ تو پڑے گی ہی، آنکھیں بھی اشک بار ہوں گی، رہ رہ کر ان کی یاد آتی رہے گی اور دل کی چوٹوں کو ابھار جائے گی، وہ ہم سب کے لیے مشفق باپ کی طرح تھے، آپ کی شفقتوں کو کون بھلا پائے گا؟ اس کے باوجود قافلہ چلتا رہے گا، یہ مبارک قافلہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ترتیب دیا ہوا ہے، اسے تو مسلسل چلتے رہنا ہے، اس کی آخری منزل تو بس دیدار الٰہی ہے، ایک سورج غروب ہوا جو ہمیں نہایت محبوب تھا، امید ہے کہ اس کے بعد نئے چاند تارے طلوع ہوں گے، پھر وہی نئے چاند تارے سورج بنیں گے اور افق تا افق اجالے بکھیرتے چلے جائیں گے اور یہ مبارک سلسلہ انشاء اللہ تا قیامت جاری رہے۔ وما ذلك على الله بعزيز!

اللہ رب العزت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی کو بلند ترین درجات پر پہنچائے، پھر اس میں مسلسل ترقی ہوتی رہے۔

﴿وَمَنْ يَأْتِهِ مُؤْمِناً قَدْ عَمِلَ الصَّالِحَاتِ فَأُوْلَئِكَ لَهُمُ الدَّرَجَاتُ الْعُلَى ☆ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِيْنَ فِيْهَا وَذَلِكَ جَزَاءُ مَن تَزَكَّى﴾ (اور جو ایمان کی حالت میں اس کے پاس آئے گا، نیک کام اس نے کر رکھے ہوں گے تو ایسوں ہی کے لیے بلند درجات ہیں، ہمیشہ رہنے والے باغات جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے اور یہ بدلہ ہے اس کا جو پاک ہوا)

مرشد الامت کی جامع شخصیت

حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ

’’حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا اپنی طویل تدریسی زندگی میں تعلیمی وتربیتی ذمہ داریوں اور دعوتی اور علمی مشغولیتوں کے ساتھ صحافت سے قریبی تعلق رہا ہے، انہوں نے ۱۹۵۹ء میں پندرہ روزہ عربی اخبار ’’الرائد‘‘ نکالا اور اس میں انہوں نے اداریے لکھے، جو عالم عربی میں بڑی وقعت کے ساتھ پڑھے جاتے رہے، عالم عربی کے ممتاز ادیبوں اور صحافیوں سے ان کا ربط رہا، جو محض صحافی یا ادیب نہیں تھے، بلکہ ملت کا درد رکھتے تھے اور ملت کو درپیش آنے والے مسائل اور خطرات اور عالمی سازشوں سے واقف تھے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی چونکہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے سب سے زیادہ قریب رہے ہیں اور ان کے اسفار میں شریک رہے ہیں، جن میں اہم شخصیتوں اور حکمرانوں سے ملاقات اور تبادلہ خیال کا بھی کثرت سے موقع ملا، اس لیے مولانا کو حقیقت حال اور مسائل کی نزاکت سے واقفیت کا جو موقع ملا وہ بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل سے واقفیت اور ان کے حل کے اسباب ووسائل کا علم بھی اس سرچشمہ سے منسلک رہنے کی وجہ سے زیادہ حاصل ہوا۔‘‘

(ماخوذ از: مقدمہ عالم اسلام اور سامراجی نظام: ۵-۶)

مقبول بارگاہِ انام

مولانا مفتی محمد ذاکر نعمانی
(مفتی شہر جے پور)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ میں بہت ساری خوبیاں ومحاسن تھے، وہ منجانب اللہ ایام طفولیت سے تادم واپسیں انعامات ربانی کا موردرہے، من جملہ ان کے:

(۱) نابغۂ روزگار شخصیت مفکر اسلامؒ سے تعلیم وتربیت ابتدائے ادراک وشعور سے حاصل رہی، بعض خاص خاندانی افراد جن کو مفکر اسلام کی اصلاح وتربیت نے کندن بنادیا تھا اور وہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور مثالی کارناموں میں مصروف بھی تھے اوران سے مستقبل میں بڑی امیدیں وابستہ تھیں، خاص کر مفکر اسلامؒ کے بعد ان کی فکر ومشن کو آگے بڑھانے میں خواص وعوام کی نظریں ان پر مرکوز ہوجاتی تھیں، لیکن ان کی زندگی نے زیادہ وفانہ کی اوروہ عہد شباب ہی میں مولائے حقیقی کے حضور حاضر ہوگئے، پھران کے بعد جس شخص کے حصہ میں مفکر اسلام کی حیات میں سفر وحضر میں شرکت، کارہائے نمایاں میں شمولیت اور مستقبل وابستگی ہم خیالی وہم مزاجی حصہ میں آئی وہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی ذات والاصفات تھی جنہوں نے اپنے آپ کو کبھی اصلاح وتربیت سے مستغنی وفارغ نہیں سمجھا۔

(۲) مفکر اسلام کے خاص تربیت کردہ جبال العلم حضرات میں بھی مرحوم معتمد خاص ہم آہنگ تھے، تعلیم وتدریس، تصنیف وتالیف، تاریخ وادب، نصاب ونظام ہر اعتبار سے پختہ صلاحیت کے مالک تھے۔

(۳) مفکر اسلام کے لب ولہجہ کو سمجھنے والے، ان کی لے میں لے ملادینے والے، ان کے خطوط وآثار پر مکمل گامزن تھے۔

اہل سلوک نے جس مشابہت کو نسبت اتحادی سے تعبیر کیا ہے وہ مرحوم کی ذات میں مکمل جھلکتی نظر آتی ہے، ایک موقع پر (۱۹۸۵ء) مولانا محمد منظور نعمانیؒ نے مولانا محمد عبدالرشید نعمانیؒ سے اپنے مرشد ومربی مولانا شاہ عبدالقادر رائپوریؒ کا ذکر خیر کیا، اس ضمن میں یہ بھی فرمایا کہ حضرت رائے پوری کے بعد میں نے حافظ عبدالعزیز صاحبؒ سے اصلاحی تعلق قائم رکھا اوران کے بعد شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی صاحبؒ سے، اس پر مولانا عبدالرشید نعمانیؒ نے فرمایا: حضرت رائے پوری کے بعد حافظ عبدالعزیز صاحب' حضرت رائے پوری کے مشابہ ہوگئے تھے، چال ڈھال، نشست وبرخاست حتی کہ چہرہ مہرہ بھی حضرت رائے پوری کے مشابہ ہوگیا تھا، راقم نے بھی حضرت مولاناؒ میں اپنے ماموں جان ومربی سے اسی طرح کی مشابہت محسوس کی۔ بقول جگر مرادآبادی:

یہاں تک جذب کرلوں کاش تیرے حسن کامل کو
تجھی کو سب پکار اٹھیں گزر جاؤں جدھر ہوکر

(۴) حضرت مولانا کی سعادت وخوش نصیبی رہی کہ بچپن سے اولیاء کاملین، عبادِ صالحین سے عقیدت ومحبت اوران سے استفادہ وصحبت میسر آئی، جس کے نتیجہ میں مختلف ہائے رنگارنگ خوبیاں اور الگ الگ چشموں سے سیرابی کی وجہ سے متعدد صفات حمیدہ حصہ میں آئیں۔

(۵) حضرت مفکر اسلام نے نہ صرف اپنے چاہنے والوں بلکہ اغیار وغیر مانوس افراد تک کو اپنی شفقت ومحبت، خدمت وسخاوت کے ذریعہ ان انعامات واحسانات کا عادی بنادیا تھا۔

حضرت مفکر اسلام کے بعد حضرت مرحوم نے جس انداز وسلیقہ سے مفکر اسلام کے محبین، مسترشدین ومتعلقین کو نبھایا، وہ واقعی مثالی عمل ہے۔ فجزاهم الله خيراً!

یہی وجہ ہے کہ مفکر اسلام کے بعد واردین وصادرین واہل تعلق کی آمدورفت وحاضری میں کمی نہیں آئی۔

راقم جب ۴؍نومبر ۲۰۲۱ء بروز جمعہ تکیہ کلاں حاضر ہوا، حضرت مولانا نے خاص توجہ فرمائی، ظہرانہ پر خاندانی افراد (جن میں محترم مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی حفظہ اللہ بھی موجود تھے) کے سامنے راقم کے بزرگوں کا خانوادۂ حسنی سے قدیم ربط وتعلق کا ذکر فرما کر اس تعلق کو قائم وبرقرار رکھنے کی نصیحت فرمائی۔

ہائے رے چشم تصور تو نے کیا دکھلا دیا

(۶) حضرت مولانا نے طبع سلیم پائی تھی، وسعت وعالی ظرفی آپ کی ذات میں ودیعت تھی، آپ اعتدال کا اعلیٰ نمونہ تھے، فرقہ بندی کا آپ کے کوچہ سے کبھی گزر نہ ہوا، مذاہب فقہیہ ومسلک ومشرب کا اختلاف کبھی کسی بھی شخص، فرد وانجمن یا تنظیم وتحریک سے دوری کا سبب نہ بن سکا، اسی لیے ہر ہر فرد وہر کسی جماعت وجمعیت وادارہ نے آپ کو اپنا سمجھا، آپ سے اپنی کتب پر تقاریظ لکھوائیں، مقدمات وپیش لفظ سے اپنی تصنیفات کو سجایا، آپ کی آمد وتشریف آوری سے اپنی محافل ومجالس کو روشن کیا، آپ کو اپنا سرپرست ورہبر مانا اور مسلمانان ہند کا متفقہ پلیٹ فارم اور ملت اسلامیہ ہندیہ کا مرکز نظر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے عظیم منصب کے لیے علماء ومشائخ خواص وعوام کی نظریں آپ پر آ کے رک گئیں اور تاحیات آپ اس منصب جلیل پر جلوہ افروز رہے۔

(۷) حضرت مولانا نے اپنے پیش رو حضرت مفکر اسلام کے نقش قدم چلتے ہوئے ملک کے دیگر بڑے، معتمد، معتبر، اداروں جامعات ودرسگاہوں کو ندوہ سے قریب رکھا اور ندوہ کو ان کے شانہ بشانہ رکھا، جس کی برکت سے ان مکاتب فکر میں باہمی الفت ومحبت، انسیت واپنائیت نہ صرف یہ کہ باقی رہی بلکہ روز افزوں ہوتی رہی۔

(۸) پروردگار نے آپ کو علم کے ساتھ ساتھ حِلم کا وافر حصہ عطا فرمایا تھا، صبر، تحمل، بردباری کا گویا مجسمہ تھے، عجلت پسندی، تعجیل سے کوئی سروکار نہ تھا، کسی عظیم الشان ادارہ کے ذمہ دار اور تمام تر مکاتب فکر کے مشترکہ پلیٹ فارم کے صدر میں یقیناً ان صفات سے متصف ہونا ضروری ہے، اسی لیے کبھی آپ نے جذباتیت پر مبنی بیانات نہیں دیئے، نوخیز نوعمر طبقہ یا وہ عمر رسیدہ، حضرات جن کو تاریخی علم اور تدبیر وتدبر سے وافر حصہ نہیں ملا ہوتا وہ جلد بازی میں غیض وطیش، غضب وللکار کے الفاظ سننے کے خواہاں ہوتے ہیں، ایسے حضرات بعض مرتبہ وقتی طور پر غیر مطمئن نظر آتے ہیں، لیکن ملت کا دانشور طبقہ بہرحال مطمئن رہتا ہے۔

(۹) حضرت مولانا کی ذات جتنی مشہور تھی، اتنی ہی مقبول بھی تھی، لوگوں کے دل ودماغ میں عقیدت وعظمت واحترام پایا جاتا رہا ہے، بعض بڑی شخصیات کے قریبی وہم نشین احباب اپنی عقیدت کو عروج پر نہیں لے جا پاتے، لیکن بعض اہل اللہ ایسے محبوب ومودود ومرغوب ہوتے ہیں کہ اکثر حاضر باش افراد بھی کسی پہلو سے کوئی غیر معتدل قول وعمل نہیں دیکھ پاتے اور اس طرح ان کی عقیدت ومحبت بھی کسی سے کم نہیں ہوتی، بلکہ ایسے حضرات ایسی نعمت غیر مترقبہ کو کھودینے کے بعد شاعر کا یہ شعر گنگنانے لگتے ہیں:

کس طرف جاؤں کدھر دیکھوں کسے آواز دوں
اے ہجوم نا امیدی جی بہت گھبرائے ہے

(۱۰) رب العالمین نے خانوادۂ حسنی کو علم وعمل، رفع وفضل سے خوب نوازا اور بافیض بنایا، ساتھ ساتھ سلوک وتزکیہ کے باب میں بھی قابل رشک خدمات کے مواقع عطا فرمائے جنہوں نے سلوک وتصوف کے نام پر ہونے والی بدعات وخرافات رسومات وواہیات سے بچتے بچاتے، خالص سنت شریعت کے تابع بن کر اور رہ کر دوسروں کو بھی تعلیم وتلقین کی اور "إنما الأعمال بالنيات وأن تعبد الله كأنك تراه" کا صحیح مفہوم سمجھایا۔

خالق ارض وسماء حضرت مولانا کی حسنات کو بارگاہ عالی میں قبول فرمائے، ان کی امامت، سیادت قیادت کا ملت کو نعم البدل عطا فرمائے جو ان کی نہج پر کام آگے بڑھائے، اللہ تعالیٰ پس ماندگان ومحبین وتلامذہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

تھا وہ مقبول بارگاہ اَنام
اس کو جنت میں ہو نصیب آرام

رفتید و لے نہ از دلِ ما

ڈاکٹر محمود الرحمٰن فاروقی ندوی
(پروپرائیٹر: رضوان انٹرنیشنل۔ ممبئی)

آج سے کوئی انتالیس سال قبل کی بات ہے، (۱۹۸۴ء) سے مراد مولانا رابع صاحب ہوگئے اور اب تک حضرت مولانا سے اورنگ آباد مہاراشٹر کے جامعہ کاشف العلوم میں زمانہ طالب علمی کے دوران جب ہم عمر کی پندرہویں بہار دیکھ رہے تھے اور عالیہ اولیٰ میں زیر تعلیم تھے، تو یکا یک بادِ نسیم کا ایک ایسا جاں فزا جھونکا آیا کہ دل و دماغ پر اس کی یادیں ثبت ہو کر رہ گئیں۔ لکھنؤ میں کوئی سیمینار کی مناسبت سے ہم تین طالب علموں کا انتخاب ہوا تھا اور اس قدر کم عمری میں ندوہ اور اساتذۂ ندوہ سے ملاقات کا موقع میسر آ رہا تھا، دل بلیوں اچھل رہا تھا، استاذ محترم حضرت مولانا نسیم صاحب کی معیت میں ہمارا مختصر قافلہ بھساول سے لکھنؤ روانہ ہوا، جیسے ہی ندوہ میں قدم رکھا، دل و دماغ معطر ہوگیا، اتنی کھلی فضا، اس قدر نورانی ماحول اور اتنی کثیر تعداد میں طلبہ و اساتذہ دیکھ کر دل پر ایک قسم کی ہیبت طاری ہوگئی۔

اتنی ساری تمہید صرف اس لیے بیان کی گئی کہ یہی وہ موقع تھا جب استاذ مکرم حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کے پرنور چہرہ پر پہلی نظر پڑی۔ یہ وہ وقت تھا جب حضرت مولانا علی میاںؒ بھی حیات تھے اور حضرت مولانا رابع صاحب، مولانا علی میاںؒ کے ہر طرح سے معاون تھے، سارے انتظامات اور ساری سفری کارروائیاں حضرت مولانا رابع صاحب ہی انجام دیتے تھے، ساتھ ہی ساتھ تدریس کا فریضہ بھی بخوبی نبھاتے تھے، ایک بڑا سا فائل نما بیگ بغل میں دبائے یہاں سے وہاں جاتے آتے یہ سادہ سے انسان، ہرگز پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ عظیم انسان عربی زبان و ادب میں عالمی شہرت یافتہ شخصیت ہے۔ ہمارے اس دور میں حضرت مولانا سے مراد حضرت علی میاںؒ ہی ہوتے تھے، پھر جب حضرت علی میاں کا وصال ہوا تو حضرت مولانا مراد یہی حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی ذات گرامی مراد لی جاتی ہے۔

اول اول شاخ سے ندوہ آنے والے طالب علم کی مثال ایسی ہی ہوتی ہے جیسے کنویں کا مینڈک کسی دریا میں چھوڑ دیا جائے، سو ہماری بھی وہی کیفیت تھی، ہم ایک طرف ندوہ کے اساتذہ اور طلبہ کو دیکھتے، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی شخصیت سے روبرو ہوتے اور دوسری طرف ندوہ کی لق و دق عمارتوں کے سحر میں کھو جاتے، ندوہ کیا تھا اچھا خاصا ایک محلّہ آباد تھا، جس میں ہاسٹل کی کئی عمارتوں کے علاوہ اساتذہ کے رہائشی مکانات، بڑی سی لائبریری، نہایت خوب صورت مسجد، پوسٹ آفس، اسٹیشنری کی دوکان، بینک اور ریسٹورنٹ جیسی تمام سہولیات موجود تھیں، یہ سب ہمارے لیے کسی میوزیم سے کم نہ تھا، ہر ہر عمارت کو آگے پیچھے سے خوب غور سے دیکھتے اور سوچتے جاتے کہ یہ ہم کس دنیا میں آ گئے۔

پھر سنہ ۱۹۸۸ء آیا اور ہم لوگ عالیہ رابعہ میں پہنچ گئے، موجودہ ناظم حضرت مولانا بلال حسنی صاحب مدظلہم العالی، ڈاکٹر سرور عالم پٹنہ، ڈاکٹر ثناء اللہ علی گڑھ، مولانا خالد فیصل بھاگلپوری سب ہمارے ساتھیوں میں تھے۔ حضرت مولانا رابع صاحب سے ”جزیرۃ العرب“ پڑھنا ایک نہایت دلچسپ تجربہ تھا، ہمیں ذاتی طور پر جغرافیہ سے اس قدر دلچسپی تھی اور ابھی بھی ہے کہ ہندوستان ہی نہیں پوری دنیا کا نقشہ ہمیشہ آنکھوں کے سامنے رہتا تھا اور اسی کا نتیجہ تھا کہ بعد میں جب ہمیں تقریباً ۳۵/ سے زیادہ ممالک کی سیر و سیاحت کا موقع ملا تو جغرافیہ سے عشق کی حد تک لگاؤ خوب کام آیا اور ہمارے چاروں سفرنامے بشمول

ناقابل یقین جاپان وچین الحمدللہ خوب مقبول ہوئے۔

مجھے خدشہ ہے کہ آپ یہ نہ سوچ رہے ہوں کہ عنوانِ تحریر حضرت مولانا رابع صاحبؒ سے متعلق ہے اور صاحب تحریر اپنے ہی بارے میں لکھے جارہے ہیں، دراصل مجبوری یہ ہے کہ قاری کے ذہن میں مختصر طور پر اپنا اور اس زمانۂ طالب علمی کا پس منظر نہ ہو تو بات پوری طرح سمجھ میں نہیں آئے گی، صرف ۱۹۸۷-۱۹۹۰ء لکھ دینے سے وہ دور سامنے نہیں آجاتا ہے، کچھ اپنی کچھ ساتھیوں کی تفصیل اس کو آسان بنادیتی ہے۔

خیر! اس کے بعد تخصص ادب عربی میں حضرت مولانا سے خود ان کی اپنی تصنیف "الأدب العربي بين عرض و نقد" پڑھنے کا موقع ملا، صاحب کتاب سے براہ راست پڑھنا، استفادہ کرنا ایسے ہی ہے جیسے درخت سے خود پھل توڑ کر کھانا، مارکیٹ سے کتنے ہی خوب صورت پھل خرید لایئے وہ لطف نہیں آئے گا جو درخت سے اپنے ہاتھ سے توڑا ہوا پھل کھانے میں آتا ہے، چاہے وہ امرود پوری طرح پکا نہ ہو کچا ہی ہو، لطف لیکن ہاتھ سے توڑ کر کھانے کا اور ہی ہوتا ہے۔

حضرت مولانا رابع صاحب نہایت متواضع اور نرم مزاج انسان تھے، کبھی درجہ میں کسی سے بھی سختی پیش نہیں آتے، تخصص ادب عربی میں اول تو طلبہ کی تعداد ہی محدود ہوتی ہے، ہمارے دور میں لگ بھگ بیس طلبہ تھے، اس میں بھی حضرت مولانا کی نرمی وشفقت کا فائدہ اٹھا کر ہماری طرح کے نالائق طلبہ غائب ہوجاتے تھے، نتیجہ یہ ہوتا کہ کبھی چار چھ طلبہ ہی حاضر رہتے، لیکن حضرت مولانا پوری تندہی اور ذمہ داری کے ساتھ پڑھاتے تھے، یہ ہماری حرماں نصیبی کہ اس وقت بڑی ناقدری ہوئی، بعد میں اس کا شدید احساس ہوا، پھر بھی جو کچھ عربی زبان وادب سے رغبت اور لگاؤ ہوا، وہ انہی نابغۂ روزگار شخصیات کی وجہ سے ہوا اور ہم تو صاف کہتے ہیں کہ اللہ نے آج جس مقام پر پہنچایا اور اس قدر ترقیات سے نوزا، چار دانگ عالم میں شہرت عطا فرمائی، اس میں بلاشک وشبہ والدین کے ساتھ ساتھ اپنے انہی مخلص اساتذہ کی توجہات اور دعاؤں کا اثر ہے، ورنہ ہم لوگ کسی لائق نہیں تھے۔ والحمدللہ علی ذلک!

آیئے اب آگے بڑھتے ہیں، ۱۹۹۰ء میں تخصص ادب عربی سے فراغت کے بعد ممبئی کے سعودی کونسلیٹ میں تقرری ہوئی اور یوں چاروناچار، خواہی نہ خواہی بمبئی مستقر بنا، کچھ عرصہ بعد حضرت مولانا علی میاںؒ انتقال فرما گئے اور زمام کار حضرت مولانا رابع صاحبؒ کے ہاتھوں میں آگئی، اب حضرت مولانا رابع صاحب ناظم تھے، بمبئی دوروں کے موقع پر حاضری ہوتی، سہاگ پیلس میں بہت سے ندوی جمع ہوتے، فکریں ہوتیں۔ ۲۰۰۷ء کی بات ہے، حضرت مولانا رابع صاحبؒ بھٹکل تشریف لے جارہے تھے، بمبئی میں قیام کے دوران خواہش ظاہر فرمائی کہ اگر رابطہ ادب اسلامی کا ایک سیمینار بمبئی میں ہوجائے تو بہت فائدہ ہوسکتا ہے۔ الحمدللہ سبھی ساتھیوں نے کمر کس لی اور پھر حج ہاؤس میں ۲۰۰۷ء میں وہ تاریخی سیمینار ہوا جس میں بڑی تعداد میں پورے ملک سے نمائندگی ہوئی اور باری تعالیٰ نے بڑی کامیابی سے نوازا۔ حضرت مولانا بے حد خوش ہوئے۔

میرا جاپان وچین کا سفرنامہ بھی اسی وقت منظر عام پر آیا، حضرت مولانا نے از راہِ عنایت اس پر بیش بہا مقدمہ تحریر فرمایا اور اس قدر حوصلہ افزائی فرمائی کہ میرا جی چاہتا تھا شرمندگی سے زمین میں گڑ جاؤں، کہاں یہ عالمی فرشتہ صفت شخصیات اور کہاں ہم جیسے ناکارہ، بے عمل انسان! وہاں سے ذاتی طور پر حضرت مولانا سے قلبی تعلق بے حد مضبوط ہوگیا، جب بھی بمبئی تشریف لاتے گھنٹوں بات ہوتی اور میرے اسفار کے بارے میں تفصیل سے بات ہوتی، اگلے تین سفرناموں پر بھی بیش قیمتی آرا سے نوازا اور خوب خوب حوصلہ افزائی فرمائی، یہ خوردنوازی لاجواب تھی اور میری زندگی میں ایک انوکھا انقلاب لانے کے لیے مہمیز ثابت ہوئی۔ نہایت اہمیت کی حامل ان حوصلہ افزائیوں سے روح کی بالیدگی اور قلب ودماغ کے معطر ہونے کا سامان پیدا ہوگیا، کئی بار ایسا ہوتا کہ سہاگ پیلس بمبئی میں حضرت تشریف فرما ہیں اور سب بیٹھے ہیں، فرط محبت سے بلا مبالغہ آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے۔

جب جب حضرت مولاناؒ بمبئی تشریف لاتے، حضرت مولانا واضح صاحبؒ بھی ساتھ ہی رہتے تھے، پھر تو دونوں سے استفادہ کا ایسا بہترین موقع ہاتھ آتا کہ بیان نہیں کرسکتا۔ عصر بعد کی مجلسوں میں بیسیوں ایسے اشکالات کا حضرت مولانا اتنی متانت وسنجیدگی سے ایسا شافی وکافی جواب عنایت فرماتے کہ طبیعت خوش ہوجاتی، حاضرین میں سے بہت کم لوگ حضرت مولانا سے ہم کلام ہونے، سوال کرنے کی جرأت کرتے، ایک تو حضرت کا مقام ومرتبہ نیز فکری وروحانی اعتبار سے حضرت کی بالغ نظری، جلدی کسی کی ہمت ہی نہ ہوتی، طویل خاموشی چھائی رہتی، ایسے میں ایک یہ ناچیز ہی ہمت کرکے حضرت کے ذوق ومزاج کو مدنظر رکھ کر نہایت ادب واحترام سے کوئی سوال چھیڑ دیتا، پھر حضرت مولانا اس پر سیر حاصل گفتگو فرماتے۔ آج یہ سوچ کر ہی دل کانپ جاتا ہے کہ اب وہ مجلسیں نہ ہوسکیں گی کہ رونق مجلس ہی نہ رہی، دل خون کے آنسو روتا ہے کہ حضرت ہی نہ رہے، ہائے! اب ہم ان مجلسوں کی رونقوں کو کہاں سے سمیٹیں، دونوں بھائیوں نے بمبئی والوں کو اس قدر محبت وشفقت سے نوازا کہ بیان نہیں ہوسکتا، کنواں خود چل کر پیاسوں کے پاس آجاتا تھا۔ خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را!

حضرت مولانا واضح صاحبؒ تو اتنی دلچسپی سے میرے اسفار کی تفصیلات سنتے اور فرماتے کہ لکھا کرو، کیوں نہیں لکھتے ہو؟ بھٹکل تشریف لے جارہے تھے، میں نے اپنی کتاب ناقابل یقین جاپان وچین پیش کی، واپسی پر فرمایا: بھئی محمود! تمہارے سفرنامہ نے ہم دونوں بھائیوں کو رات بھر سونے نہیں دیا۔ جب تک ختم نہ کرلیا سو نہیں سکے، یہ اتنا بڑا تبصرہ تھا کہ مارے حیرت کے میں بھونچکا رہ گیا، یہ عالمی شخصیات مجھ جیسے کم علم کی کتاب اور اس کے اسلوب کو اس قدر پسند فرمائیں، مجھے شدید کم مائیگی کا احساس ہوتا اور میرے آنسو جاری ہوجاتے۔ ہائے وہ محبتیں، وہ شفقتیں، وہ عنایتیں، وہ لطف وکرم کہاں سے لائیں، لکھنے کا حوصلہ نہیں، تحریر بیانیہ نہیں مرثیہ ہوئی جا رہی ہے، کیا کریں، ایسے مربی، ایسے مشفق ومہربان، ایسے سرپرست، ایسے خوردنواز کہاں سے لائیں؟! شدید محرومی کا احساس ہے، لکھنے کو ہزار باتیں ہیں، لیکن دل ودماغ ساتھ نہیں دے رہا ہے، یہ وہ چند باتیں ہیں جو ہماری آنکھوں دیکھی اور دلی تاثرات سے تعلق رکھتی ہیں، یوں تو عمومی باتیں بے شمار ہیں، جو ویسے بھی آپ تک پہنچتی رہیں گی، لیکن یہ ہماری اپنی ذاتی تجربات پر مبنی باتیں ہیں۔

اس کے علاوہ حضرت مولانا کی ذاتی زندگی کے متعلق ہم نے جو کچھ دیکھا وہ مختصر یہی ہے کہ وہ سادگی کے پیکر تھے، نہ کوئی تام جھام، نہ کوئی زرق برق لباس، سادہ سا مکان، ورع وتقویٰ کی سچی تصویر۔ سارے حالات سے باخبر رہتے۔ وضع دار شخصیت کے مالک، حضرت مولانا جب کسی سے ملتے تو بڑے تپاک سے ملتے، تواضع وانکساری ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس قدر بڑے ادارہ کے ناظم ہونے کے باوجود وہ ایک عام سے سادہ انسان نظر آتے۔ اگر مجمع میں کوئی ان کا تعارف نہ کرائے تو پہچاننا مشکل تھا کہ یہ اتنی بڑی شخصیت ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ ندوہ میں ان سے براہ راست شرف تلمذ حاصل ہوا اور بارہا بمبئی میں حضرت کی مجالس میں باریابی کا شرف ملا، ہماری دعاء ہے کہ اللہ انہیں غریق رحمت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین!

ملک کے اقلیتی طبقہ سے اپیل

”جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں سہولتیں زیادہ ہیں مسائل کم ہیں، جہاں اقلیت میں ہیں وہاں سہولتیں کم اور مسائل زیادہ ہیں، اگر ہم ان مسائل کو حل نہیں کریں گے تو حکومت ان مسائل کو حل نہیں کرے گی، مسلمانوں کو اپنی صلاحیتوں سے ان مسائل کو حل کرنا ہے، ان تقاضوں کو پورا کرنا ہے جو مذہب کے سلسلہ میں پیش آرہے ہیں، تاکہ وہ دین پر صحیح طور پر عمل کرسکیں اور عمل کرا سکیں اور دین کے تعلق سے بعض لوگ اشتباہ پیدا کرتے ہیں اس اشتباہ کو دور کرسکیں۔“ (تحفہ جنوب:۹۴)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

ماموں جی

ڈاکٹر حسن رشید
(گروپ چیئرمین جی ای ٹی انڈسٹریز)

ماموں جی رابعؒ (۲۹؍اکتوبر ۱۹۲۹ء-۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ء) صرف بھارت کے ہی نہیں بلکہ عالم اسلام کے چند نامور علماء دین میں سے ایک تھے، انہوں نے بطور صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ' مہتمم اور پھر بطور ناظم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ' خدمات انجام دیں، اس کے علاوہ وہ اسلامک فقہ اکیڈمی ہند کے سرپرست، رابطہ ادب اسلامی ریاض کے نائب صدر اور رابطہ عالم اسلامی کے رکن تاسیسی بھی تھے، وہ دار المصنفین اعظم گڑھ کی کمیٹی کے رکن اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز برطانیہ کے رکن تاسیسی بھی تھے، وہ سن ۲۰۰۷ء سے تادم وفات دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن بھی رہے۔ دنیا کی ۵۰۰؍ بااثر مذہبی شخصیات کی فہرست میں آپؒ کا نام مسلسل شائع ہوتا رہا۔

ماموں جی رابع صاحبؒ ایک عظیم المرتبت علمی شخصیت کے حامل تھے، جن کی بزرگی' اخلاص وللّٰہیت' نام ونمود سے دوری اور بے رغبتی اور دین وملت کی بے لوث خدمت کا اعتراف عرب وعجم دونوں میں کیا جاتا ہے، علم وادب کی شاندار خدمات نے مولاناؒ کو اپنے ہم عصر شخصیات میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے وصال کے بعد آپؒ عالم اسلام میں مولانا علی میاں ندویؒ کے جانشین' نمائندہ اور نائب کی حیثیت سے جانے جاتے تھے۔

ماموں جی مولانا رابع صاحبؒ بھارت کے صوبہ اتر پردیش کے ایک ضلع رائے بریلی میں واقع ایک مردم خیز علاقہ تکیہ کلاں میں آباد ایک مشہور علمی' ادبی اور دعوتی خانوادہ سید احمد شہیدؒ میں یکم اکتوبر ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی کا نام سید رشید احمد حسنیؒ تھا۔ ابتدائی تعلیم وتربیت خاندانی روایات کے مطابق تکیہ پر ہی اپنے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ کی سرپرستی اور چھوٹے ماموں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی رہنمائی میں مکمل کی، پھر سن ۱۹۴۴ء میں وہ نظام الدین تبلیغی مرکز تشریف لے گئے، جہاں انہوں نے کچھ عرصہ حضرت مولانا الیاس کاندھلویؒ کی زیر تربیت اور ان کی صحبت میں گذارا، ۱۹۴۶ء میں بغرض تعلیم مظاہر علوم سہارن پور میں شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے حدیث کی سند مسلسلات حاصل کی اور پھر دار العلوم دیوبند چلے گئے، جہاں انہوں نے حضرت حسین احمد مدنیؒ سمیت مختلف اساتذہ سے فقہ وتفسیر اور دیگر فنون کی تربیت حاصل کی۔ وہاں سے دار العلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے، جہاں سے انہوں نے ۱۹۴۸ء میں فضیلت کی سند حاصل کی۔

۱۹۴۹ء سے انہوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء میں بطور معاون مدرس تدریس کے شعبہ میں اپنی عملی زندگی اور خدمات شروع کیں، دوران تدریس سن ۱۹۵۰ء اسے ۱۹۵۱ء کے دوران اعلیٰ تعلیم کے حصول کی خاطر حجاز میں اپنے ماموں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ساتھ قیام کیا، جہاں انہوں نے ایک مصری عالم عبد المہیمن ابو السمح اور دیگر علماء عرب سے استفادہ اور اکتساب فیض حاصل کیا۔

آپ کی عظیم علمی خدمات کے اعتراف میں انہیں کئی صوبائی اور قومی اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ آپ ۱۹۷۰ء میں ندوۃ العلماء کے شعبہ کلیۃ اللغہ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے، ۱۹۹۳ء سے انہوں نے بطور مہتمم اپنی خدمات انجام دینا شروع فرمادیں، دسمبر ۲۰۰۰ء میں مفکر اسلام کلید بردار کعبہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے

وصال کے بعد شوریٰ نے آپ کو ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء چن لیا، اس کے کچھ عرصہ بعد ۲۲؍جون ۲۰۰۲ء میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر قاضی مجاہد الاسلام القاسمی صاحبؒ کے وصال کے بعد مولانا رابع صاحبؒ کو متفقہ طور پر بورڈ کا صدر منتخب کرلیا گیا۔

ماموں جی حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی شخصیت اس دورِ قحط الرجال میں سلف صالحین کی ایک گراں قدر یادگار اور تزکیہ نفس، علم وادب کا حسین ومتوازن گلدستہ تھی، جو عرب وعجم میں تشنگان علم کے مشام جاں کو معطر کرتی رہی ہے۔ مولانا عبداللہ عباس ندویؒ مولانا رابع صاحبؒ کی شخصیت کے بارے میں کچھ یوں تبصرہ کرتے ہیں:

''مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی خود مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تصویر ہیں، بلکہ تصویر مجسم ہیں، صورت شکل بھی مولانا سے مل گئی ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بخشش کا نمونہ ہے کہ مولانا کو ایسا جانشین ملا جو بلانزاع ان کا آئینہ ہے۔'' (عہد ساز شخصیت: ۲۲)

خود ماموں جی مولانا سید محمد رابع صاحبؒ اپنے سرپرست ومربی اور چھوٹے ماموں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تربیت کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''مجھ کو اپنے چھوٹے ماموں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی نگرانی اور سرپرستی کا زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہوا، بلکہ میری تعلیم کا خاصا حصہ براہ راست ان کی استادی میں گذرا اور پھر شاید اسی مناسبت سے بعد میں مجھ کو ان کی علمی مشغولیات میں خدمت اور ذیلی طور پر معاونت کا موقع ملا اور باہر کے سفروں میں جو زیادہ تر بلاد عربیہ میں ہوئے اکثر ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ ان کے علمی مسودات کو صاف کرنے اور پروف دیکھنے کا اور طباعت واشاعت کے سلسلہ میں جو خدمات درکار تھیں، اس میں بھی خاصی حد تک لگنا ہوا۔ اس طریقہ سے ان کے ساتھ رہنے اور ان کو مختلف موقعوں پر کام کرنے اور کسی مسئلہ میں رائے رکھنے سے واقفیت کا موقع ملا اور ان کی خدمت سے بڑی حد تک ان کے اطمینان ورضا مندی کی سعادت حاصل ہوئی، ایک طرف مجھے ان کا بھانجہ ہونے کی وجہ سے شفقت حاصل ہوئی، دوسری طرف شاگردی کا تعلق ہونے سے عقیدت حاصل ہوئی اور تیسری طرف ان کے کاموں میں خدمت کا شرف حاصل ہونے سے ذیلی مناسبت بھی حاصل ہوئی۔'' (ایضاً: ۱۸-۱۹)

ماموں جی رابع حسنی ندویؒ کا میری والدہ سے خالہ زاد بھائی کا رشتہ تھا اور کیونکہ میری والدہ کے بھائی صغر سنی میں ہی وفات پاگئے تھے، تو انہوں نے میری والدہ صاحبہ کو کبھی بھی بھائی کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیا، راقم کو ان سے ویسی ہی الفت ومحبت اور اُنس تھا جیسا کہ حقیقی ماموں سے ہوا کرتا ہے اور انہوں نے بھی ہمیں حقیقی ماموں کی شفقت سے نوازا، جب والد صاحبؒ نے ہمیں ندوہ اکتساب فیض کے لیے بھیجا تو مولانا علی میاں ندویؒ نے ماموں جی رابع صاحبؒ کو ہمارا سرپرست مقرر فرمایا، ماموں جی نے انتہائی شفقت سے ہماری نگرانی فرمائی اور وہ روزانہ شام کے وقت ہم سے سارے دن کی رپورٹ لیا کرتے کہ آج کیا پڑھا جو کچھ پڑھا ہے اس کو سمجھنے میں کوئی دقت تو نہیں، یہی نہیں بلکہ ہر دو تین روز بعد انتہائی شفقت سے کچھ نہ کچھ روپے جیب خرچ کو دے دیا کرتے، اس جیب خرچ کو ہم جمع کرتے رہے اور جب اتنے روپے جمع ہوگئے کہ اس سے تحفہ خرید سکیں تو ہم نے تین ململ کے کرتے خرید کر ایک مولانا علی میاں ندویؒ، دوسرا ماموں جی رابع صاحبؒ اور تیسرا چھوٹے ماموں واضح حسنی صاحبؒ کی خدمت میں بطور تحفہ پیش کیے اور تینوں بزرگوں سے خوب دعائیں سمیٹیں الحمدللہ۔

یادش بخیر! ایک مرتبہ عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کے جانور خریدنے کی ذمہ داری ملی، اس زمانہ میں جانور بہت ہی سستا مل گیا، اس موقع پر ہمارا دل بھی للچایا کہ اپنے جیب خرچ سے ایک قربانی کی جائے، یوں ہم بھی اپنے لیے الگ سے ایک قربانی کا جانور لے آئے، کسی طرح اس بات کی خبر ماموں جی رابع صاحب کو ہوگئی، ہمیں بلا کر پوچھا کہ ''ہم نے سنا ہے کہ تم اپنے لیے قربانی کا جانور

لائے ہو، ذرا ہمیں بھی تو دکھاؤ کیسا ہے؟'' ہم خوشی خوشی انہیں لے جا کر دکھانے لے گئے، دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور برکت وقبولیت کی دعا دی اور پوچھا: کتنے کا ملا ہے؟ ہم نے قیمت بتادی، انہوں نے اپنی واسکٹ کی جیب سے وہ رقم نکالی اور انتہائی شفقت سے ہمارے سر پر ہاتھ رکھ کر فرمایا: ''یہ رکھو، بڑوں کی موجودگی میں بچوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے، اگر تم اپنی خواہش کا پہلے اظہار کرتے تو اور بھی خوشی ہوتی۔'' ہم نے رقم لینے سے انکار کیا تو شفقت سے فرمایا: ''یہ تمہاری والدہ کا ہم پر ہمارا تم پر حق ہے۔''

ماموں جی رابع صاحبؒ نے مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے ساتھ پاکستان کے کئی اسفار کیے تھے اور معمول تھا کہ قیام ہمارے گھر پر ہوتا تھا، راقم کو ان اسفار کے دوران ماموں جی سے مل کر حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی مصروفیات، تقاریر اور انٹرویوز کا پروگرام ترتیب دینے اور ان تقاریر کو ریکارڈ کرنے کا موقع ملا اور بہت کچھ سیکھنے کو ملا الحمد للہ، مولانا علی میاں ندویؒ کی پاکستان کے اسفار کی روداد وتقاریر پر مشتمل کتابیں ''حدیث پاکستان'' اور ''تحفہ پاکستان'' انہی ریکارڈنگ کی کتابی شکل ہیں۔

مولانا رابع حسنی ندویؒ سے راقم نے جو چیز سیکھی ہے وہ ہر انسان سے محبت کرنا، تمام انسانوں کو برابر سمجھنا، اپنے آپ کو کسی سے برتر اور بڑا نہ سمجھنا، اپنے اہل وعیال، اعزاء واقرباء کی ضرورتوں کا خیال رکھنا، اگر کسی کی بیماری کی خبر مل جائے تو اس کی تیمارداری کرنا، کوئی اگر اپنی ضرورت لے کر آجائے تو خاموشی سے اس کی مدد کردینا، غرور وتکبر، نام ونمود سے کنارہ کشی اختیار کرنا ہے۔

آخر میں راقم یہ اقرار کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ جیسی نابغہ روزگار شخصیت پر قلم اٹھانے کا یہ راقم اپنے آپ کو اہل نہیں سمجھتا، لیکن اپنے برادر عزیز مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی کے حکم کی تعمیل میں اور ماموں جی کا مجھ نالائق پر جو حق ہے، اس وجہ سے قلم اٹھانے کی جسارت کرسکا ہے، ماموں جی کو بزبان اقبال یوں خراج عقیدت پیش کرتا ہے کہ ؎

زندگی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

فکر ایک بنیادی چیز

''دنیا کی کوئی بھی تہذیب وہ ایک فکر رکھتی ہے، فکر بنیادی چیز ہے، اسلامی فکر الگ ہے، غیر اسلامی فکر الگ ہے، اسلامی فکر کیا ہے؟ یعنی کوئی چیز اتفاق نہیں ہے، سب اللہ کی طے کردہ ہے اور اللہ کے علم میں ہے، دو چیزیں ہوئیں؛ اللہ کے علم میں ہونا اور اللہ کا طے کردہ ہونا، تو اس نے بڑے پیمانہ پر سب چیزوں کو طے کردیا، اس نے اپنی کتاب جو اس نے اپنے نبیوں پر اتاری، اس میں ساری چیزیں لکھ دیں کہ انسان کو نعمتیں اور لذتیں کیوں دی ہیں؟ تاکہ آزمائے، اس لیے نہیں کہ اللہ کو ضرورت ہے، اللہ کو نہ ہمارے ایمان کی ضرورت ہے، نہ ہمارے اعمال کی ضرورت ہے، اللہ کو کیا چاہیے، اللہ کے پاس سب کچھ ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں جانچنے کے لیے نعمتیں دی ہیں کہ ان نعمتوں کے ملنے پر تم اللہ کا شکر ادا کرتے ہو کہ نہیں کرتے، یہیں سے فرق ہوجاتا ہے ایمان اور کفر کا، کافر اس کو اپنی محنت کا نتیجہ سمجھتا ہے اور مومن اس کو اللہ کا عطیہ سمجھتا ہے، قرآن مجید نے اس کو بیان کیا ہے، سورۂ کہف میں دیکھ لیجیے، سورۂ نون میں دیکھ لیجیے اور دوسری سورتوں میں واقعات بیان کیے ہیں۔'' (تحفہ جنوب:۳۶) مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

مولانا محمد یاسین کاکوسی مظاہری
(مہتمم دارالعلوم جامعہ نذیریہ کاکوسی- گجرات)

محمود رامپوری کا شعر ہے ؎

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں بلکہ عالم اسلام کے لیے ایک بڑا حادثہ ہے، خاص کر دینی، دعوتی اور فکر اسلامی سے وابستہ حلقوں کے لیے ایک بڑے خسارہ سے کم نہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے سروں سے خاندان کے ایک مشفق سر پرست کا سایہ عاطفت اٹھ گیا اور حقیقت بھی یہی ہے کہ حضرت مولاناؒ ہم ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک مشفق سر پرست تھے۔

آپ اردو اور عربی کے باکمال ادیب، ماہر انشاء پرداز، سیرت نگار، زمانہ کے نبض شناس، دنیا اور خاص کر مسلمانوں کے حالات سے واقف اور دل بریاں اور دیدہ گریاں کے ساتھ اس کے حل کے لیے متفکر اور کوشاں، باعمل عالم دین اور صاحب قول و حال پیر طریقت تھے، غرض کہ آپ ہندوستان میں سرمایہ ملت کے نگہباں اور امت مسلمہ کے میر کارواں تھے۔

حضرت مولاناؒ کی خدمت میں راقم کی پہلی حاضری:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے علمی و عملی کارناموں کی وجہ سے واقفیت تو پہلے ہی سے تھی، لیکن پہلی تفصیلی ملاقات (جو بعد میں محبت اور پھر عقیدت وارادت میں بدل گئی) ۱۹۷۷/۷۸ میں آپ کی مدرسہ کنز مرغوب پٹن گجرات تشریف آوری کے موقع پر ہوئی تھی، اس وقت راقم الحروف اور مفتی محمد قاسمی ڈینڈرولوی مرحوم (مصنف ''مومن قوم اپنی تاریخ کے آئینے میں'') مدرسہ کنز مرغوب پٹن کے دفتر میں ملاقات کے لیے حاضر ہوئے تو حضرت مولانا نے کھڑے ہوکر بڑے پرتپاک انداز میں ملاقات کی اور بڑی محبت اور تواضع کے ساتھ پیش آئے، پھر آپؒ مولانا حبیب اللہ فیروز پوریؒ (سابق مہتمم دارالعلوم چھاپی اور مدرسہ کنز مرغوب پٹن اور سابق استاذ حدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء) سے ملاقات کے لیے ان کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور پھر آپ نے مدرسہ کی مسجد میں اساتذہ، طلبہ اور مہمانوں کے سامنے خطاب بھی کیا۔ آپ کا قیام پٹن کے مشہور تاجر، بزرگوں کے میزبان (مقیم جدہ) نورولی صاحب کے یہاں دو دن رہا تھا، دراصل حضرت مولاناؒ کی مدرسہ کنز مرغوب میں تشریف آوری نورولی صاحب کی درخواست پر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ایماء سے ہوئی تھی۔

مئی ۲۰۱۴ء (رجب ۱۴۳۵ھ) میں حضرت مولانا نے گجرات کا دورہ کیا اور علاقہ پالن پور کے ایک گاؤں ''فیروز پورہ'' میں حاجی یاسین داؤد بھائی بھولا کے یہاں تشریف لائے تھے تو اس موقع پر راقم الحروف نے آپ کو ہمارے یہاں دارالعلوم جامعہ نذیریہ کاکوسی (پٹن) تشریف آوری کی دعوت دی تو آپ اپنے رفقاء کے ساتھ مدرسہ میں تشریف لائے، آپ کے رفقاء میں حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ، حضرت مولانا سید بلال حسنی، مولانا نذر الحفیظ ندویؒ، مولانا عبدالقادر صاحب ندوی پٹنی، جناب شاہد حسین، مولانا اسماعیل ندوی بھولا اور مولانا عبداللہ ندویؒ (فرزند حاجی علاء الدین صاحب سابق رکن شوریٰ ندوۃ العلماء) وغیرہ حضرات تھے اور علماء

کے ایک بڑے مجمع کے سامنے حضرت مولانا سید بلال حسنی کے تمہیدی بیان کے بعد حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے بہت مختصر مگر جامع خطاب فرمایا تھا، جس میں آپ نے حالات حاضرہ میں علماء کی ذمہ داری اور ان کے منصب و مقام کو واضح کیا تھا اور اخلاص اور اخلاق کی اہمیت جتائی تھی، اس موقع پر آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں ہے، اگر ہم صحیح طریقے سے کام نہیں کریں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس منصب سے ہٹا دے گا اور اس موقع پر راقم کو اپنے غریب خانہ میں ضیافت کا شرف حاصل ہوا تھا۔

اس سفر میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے رفقاء کے ساتھ شفاء ہسپتال سیدھپور (ضلع پٹن شمالی گجرات) میں بھی تھوڑی دیر کے لیے تشریف لائے تھے جس کا نظام علاقہ پالن پور کے بعض ذمہ دار علماء کے ہاتھ میں ہے، حضرت مولاؒ نے شفاء ہسپتال دیکھنے کے بعد بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور تائیدی تحریر عنایت فرمائی جو حسب ذیل ہے:

"بسم اللہ الرحمن الرحیم

شفاء ہسپتال میں آج مؤرخہ ۱۱/ رجب المرجب ۱۴۳۵ھ یوم شنبہ آنا ہوا، یہاں دین دار طبقہ کی چند باہمت اور انسانی ہمدردی وتعاون کے جذبہ کی حامل شخصیات نے اس کو قائم کیا ہے اور سال بھر کی کوششوں کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی خدمت کا یہ کام کس قدر ضروری اور اللہ رب العزت کی خوشنودی کا حامل کام ہے، اس سے تکلیف زدہ اشخاص کو کس قدر سہولت ملتی ہے اور مدد ہوتی ہے۔

ہسپتال بہت کم ریٹ کو اختیار کرتے ہوئے مسلمانوں کو خاص طور پر اور غیر مسلموں کو بھی مدد پہنچاتا ہے اور امراض کے مختلف اقسام کا علاج مہیا کرتا ہے۔

یہ کام اسلامی بنیاد پر بھی بہت اچھی خدمت کا کام ہے اور اس سے مریضوں کی تکلیف دور ہونے کے ساتھ اسلامی تعلیمات کے متعلق غیر مسلموں کی نظر میں جو بدگمانیاں ہیں ان کو بھی دور کرتا ہے، مجھے ہسپتال دیکھ کر اور اس کی کامیاب خدمت گذاری سے واقف ہوکر بہت مسرت ہوئی، میں اس کے لیے پوری قدردانی کا اظہار کرتا ہوں اور اس کی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

(حضرت اقدس سید) محمد رابع حسنی ندی

۱۴۳۵ھ

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے شعبان المعظم ۱۴۳۹ھ- اپریل ۲۰۱۸ء کو گجرات کا ایک دینی و دعوتی سفر کیا تھا، اس سفر میں حضرت کا قیام حاجی یاسین صاحب بھولا کے مکان پر رہا اور ان کے صاحب زادہ مولانا اسماعیل صاحب ندوی بھولا نے سفر کی ترتیب اور سہولیات مہیا کیں تو اس سفر میں ایک دن شفاء ہسپتال کے دوسرے منزلہ (جو تقریباً پندرہ ہزار فٹ میں زچگی خانہ اور اسٹاف کوارٹر پر مشتمل ہے) کے افتتاح کے لیے تشریف لائے تھے اور وہ افتتاحی تقریب مغرب اور عشاء کے درمیان منعقد ہوئی تھی، اس موقع پر حضرت مولانا نے خطاب بھی فرمایا تھا، جس میں آپ نے کام کرنے والوں کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا:

"یہ شفا خانے خدمت خلق کا اور مریضوں تک اسلامی تعلیمات پہنچانے اور انسانی اخوت کے متعلق اسلامی ہدایات سے واقف کرانے کا بہترین ذریعہ ہیں، جس سے اسلام کے نظامِ اخلاق کو سمجھنا عملی طور پر آسان ہوجاتا ہے، مسلم حکومتوں میں پہلے اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ مریض کو اعصابی طور پر طاقت پہنچائی جائے اور اس کو اطمینان دلایا جائے کہ تم اتنے بیمار نہیں ہو جتنا اپنے کو بیمار سمجھ رہے ہو، یہ چیز قوت مدافعت کو بڑھانے میں بہت کام دیتی ہے، جب کہ آج اس کے برعکس ہو رہا ہے اور لوگ مریض کو ڈرا کر اس کو دہشت زدہ کر دیتے ہیں اور تیمارداروں کو اور خود مریض کو زمین اور جائداد فروخت کر کے اپنا علاج کرانا پڑتا ہے، یہاں تک کہ مقروض ہوجاتے ہیں اور ذہنی مریض ہوجاتے ہیں، اس لیے ایسے شفا خانے جگہ جگہ قائم کرنے کی ضرورت ہے، جہاں مریض آکر اپنے کو ہسپتال میں نہ سمجھے بلکہ اپنے کو اپنے گھر میں سمجھے اور یہ یقین پیدا کر دیا جائے کہ شفا اللہ عطا فرمائے گا، بعض بڑے اچھے ڈاکٹر ومعالج ہوئے ہیں مگر شفا ان کے ذریعہ مقدر نہیں، تو ہمدرد ڈاکٹر

دوسرے کی طرف رجوع کرنے کو کہتے ہیں، ہمارے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی بڑے اچھے معالج تھے، مگر بڑے عالم اور بڑے پرہیز گار اور اللہ سے ڈرنے والے تھے، وہ انگریزی، یونانی اور ہومیوپیتھی تینوں علاج سے واقف تھے، مگر جب مناسب معلوم ہوتا تو کسی دوسرے ڈاکٹر یا حکیم کی طرف رجوع کرنے کو کہتے اور پتہ بھی بتادیتے، اس کی بالکل فکر نہ کرتے کہ ان کا اپنا دواخانہ متاثر ہوگا، اللہ نے ان کے ہاتھ میں بڑی شفاء رکھی تھی، یہ ان کے تقویٰ، اخلاص اور انسانی ہمدردی کی کھلی برکت تھی۔

یہ شفا ہسپتال جیسا کہ معلوم ہوا ہمارے ہمدرد مخلص اہل تعلق جن میں علماء بھی ہیں چلا رہے ہیں، وہ ان تمام خصوصیات کا خیال رکھتے ہیں، اس طرح یہ ایک نمونہ کا ہسپتال بن گیا ہے اور نام کا اثر ہوتا ہے اور اسی طرح نیتوں اور مقاصد کا بھی اثر ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ یہاں مریض آتے ہیں اور الحمدللہ شفایاب ہوکر جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان کوششوں کو قبول فرمائے اور لوگوں کو زیادہ سے زیادہ اس کا نفع پہنچائے۔'' (تحفہ گجرات: ۲۶۲-۲۶۱)

آپ کی دعاء پر یہ مجلس ختم ہوئی اور آپ نے ہسپتال کا نظام دیکھ کر اور اس کے قیام کا مقصد جان کر بہت مسرت کا اظہار فرمایا تھا۔

حضرت مولانا سے ارادت و بیعت:

حضرت مولانا سے آپ کے علمی، دعوتی و دینی کارناموں کی وجہ سے واقفیت تو پہلے سے ہی تھی، پھر ۸/ ۱۹۹۷ء میں آپ سے ملاقات ہوئی اور مئی ۲۰۱۴ء کو حضرت والا ہمارے مدرسہ میں تشریف لائے تھے، اس موقع پر حضرت مولانا کی شخصیت اور آپ کے اخلاق وعادات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، تو دل پر خاص اثر ہوا اور موقع بہ موقع آپ کی خدمت میں حاضری بھی ہوتی رہی اور پھر تو یہ کیفیت دن بدن بڑھتی رہی، تا آں کہ ارادت و بیعت کے تعلق میں بدل گئی۔

چنانچہ ۱۹/ نومبر ۲۰۱۹ء کو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضری کے لیے ندوۃ العلماء لکھنؤ کا سفر کیا، ۲۰ر کی دوپہر کو ندوہ پہنچے اور پہنچتے ہی حضرت مولانا سید بلال صاحب حسنی کے واسطے سے آپؒ سے ملاقات ہوگئی اور اس دن دوپہر اور رات کا کھانا حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں کھایا اور ۲۲/ نومبر بروز جمعہ بعد نمازِ فجر آپ سے بیعت ہونے کا شرف حاصل ہوگیا اور حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی خاص نوازشات اور عنایات ہمیشہ حاصل رہیں۔

اس موقع پر اوراد و وظائف اور دعاء کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ:

''اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کریں، دعاؤں کا اہتمام کریں کہ ہر چیز اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے، اللہ تعالیٰ نے والدین کے لیے دعاء کا حکم دیا ہے، اس لیے والدین اور ایمان والوں کے لیے دعائیں کرتے رہیں اور نیک کام نیک نیت کے ساتھ کرتے رہیں۔''

الطاف و عنایات:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں جب بھی حاضری ہوتی تو آپ کی وسعت ظرفی کہیے یا بلند اخلاقی سطح، راقم الحروف کو کھانے کے اوقات میں اپنے ساتھ ٹیبل کرسی پر بٹھا کر کھانے کا موقع عنایت فرماتے (چوں کہ حضرت مولاناؒ کو راقم کے پیروں کے آپریشن کا علم تھا) اور واپسی کے وقت ہدایا اور راستے کے توشے سے نوازتے، دوران قیام اکثر و بیشتر اوقات آپ کی خدمت میں حاضر رہنے کا موقع عنایت کرتے اور منصبی، تدریسی اور تربیتی فرائض کے تعلق سے نصیحت فرماتے، راقم کو جب بھی کوئی الجھن اور پریشانی لاحق ہوتی تو حاضر خدمت ہوکر تفصیلی خط کے ذریعے مطلع کرتا اور حضرت مولاناؒ کی خصوصی عنایات اور توجہات اور دعائیں حاصل کرتا، نیز مختصر اور بلیغ انداز میں اس کا حل اور اس سلسلے میں مشورہ دیتے، اس پر عمل کرنے سے بڑا اطمینان اور سکون قلبی حاصل ہوجاتا اور بتوفیق الٰہی سال میں دو تین بار ضرور حاضری کا شرف حاصل ہوتا، اس صحبت کی برکت سے گناہوں سے بچنے اور طاعات کرنے میں بڑی آسانی پیدا ہوتی (اور واپسی کے بعد بھی عرصہ تک ان عنایات اور نوازشات کا قلب پر ایک خوشگوار اثر رہتا۔)

چنانچہ جب فروری ۲۰۱۲ء کو چند رفقاء کے ساتھ حاضر خدمت

ہوا تھا تو حسب معمول بہت ہی قیمتی نصیحتیں کیں جو ایک رفیق سفر مفتی محبوب قاسمی (استاذ حدیث وفقہ دارالعلوم جامعہ نذیریہ کاکوسی پٹن) نے ضبط کرلی تھیں جو حسب ذیل ہیں:

☆ بچوں کی تربیت کا صحیح وقت دس سال تک کی عمر کا زمانہ ہے، اس عمر میں بچہ اپنی عقل سے سوچ کر من مانی نہیں کرتا ہے، وہ ہر چیز میں اپنے آپ کو والدین کے تابع سمجھتا ہے اور والدین کو سنتا اور پڑھتا ہے، ہمارے خاندان میں ماں باپ اسی عمر میں بچوں کی تربیت کرلیتے ہیں۔

پھر گیارہ سال سے بیس سال تک کی عمر میں بچے میں شعور پیدا ہوجاتا ہے تو بچہ اس عمر میں اپنے طور پر سوچنا شروع کردیتا ہے اور اپنی عقل سے والدین کی باتوں کو دفع کرنے لگتا ہے، اس لیے اس عمر میں تربیت نہیں ہوپاتی ہے۔

پھر بیس سال کے بعد جب عقل میں پختگی آجاتی ہے تو پھر وہ بڑوں کی باتوں کو توجہ دینا شروع کردیتا ہے اور اہم امور میں ان سے مشورے کرتا ہے اور اسی سے رجال کار تیار ہوتے ہیں۔

☆ تربیت بھی ایک فن ہے جس میں سلیقہ مندی اور حکمت عملی نہایت ضروری ہے، بے جا سختی سے بغاوت پیدا ہوتی ہے۔

☆ اب زمانہ ہی پورا بدل گیا ہے، کوئی کسی کو کچھ نہ کہے یہ اصل بن گیا ہے اور تربیت کا اصل نظام باقی نہیں رہا، لہٰذا اب دینی مدارس کو طلبہ کی تربیت کی فکر کرنا ضروری ہے، دین کے تقاضوں میں یہ بات شامل ہے، تعلیم کتابوں سے آتی ہے اور تربیت اشخاص سے ہوتی ہے، لہٰذا اساتذہ کرام اور منتظمین سب کی ذمہ داری ہے کہ وہ طلبہ کی تربیت کی فکر کریں۔

☆ جب تک بڑے حضرات اپنے چھوٹوں کو نہیں ٹوکیں گے اور چھوٹوں میں انشراح قلبی کے ساتھ ماننے کا مزاج پیدا نہیں ہوگا، تب تک تربیت نہیں ہوگی یعنی تربیت کے لیے دو اصول ضروری ثابت ہوئے؛ اول: بڑوں کا ٹوکنا، دوم: چھوٹوں کا انشراح قلبی کے ساتھ مان لینا، اسی وجہ سے چھوٹوں کا بڑوں کے ساتھ وقت گزاری کرنا ضروری ہے، اگر یہ مذکورہ طریقہ نہ ہوگا تو خواہشات غالب رہیں گی، بلکہ بسا اوقات آدمی غلط نظریات بھی قائم کرلیتا ہے۔

☆ بڑوں کے تابع رہ کر ہی آدمی تربیت پاتا ہے اور کام کا بنتا ہے۔

☆ ذہنی تربیت اور نشو ونما بتدریج ہوتی ہے، ایک دم نہیں ہو پاتی ہے۔

☆ انہی اساتذہ کا انتخاب ہونا چاہیے جن میں خوبیاں ہوں تاکہ وہ طلبہ کے اندر منتقل ہوں۔

☆ کتابوں کے انتخاب میں بھی تربیت کا پہلو ملحوظ رکھنا چاہیے یعنی نصاب میں ایسی کتابیں شامل کی جائیں جن سے تربیت ہو جیسے حضرت مولانا اسماعیل میرٹھیؒ کی کتابیں (اردو کی پہلی دوسری وغیرہ) کہ وہ تعلیم (اردو ادب) بھی سکھاتی ہے اور اخلاق (تربیت) بھی۔

☆ طلبہ کی تربیت کے لیے اساتذہ کرام نظر رکھیں، ہر آدمی یہ کوشش کرتا رہے کہ میرے بارے میں کسی کے ذہن میں غلط گمان قائم نہ ہو تو جب اساتذہ کرام نظر رکھیں گے تو طلبہ کوشش کریں گے کہ ہمارے بارے میں اساتذہ کے ذہن میں غلط گمان قائم نہ ہو، ایک استاذ اپنے طلبہ پر نظر رکھتے تھے اور طلبہ کی کمی کوتاہی پر صرف اتنا کہتے تھے کہ ”اچھا آپ بھی“ یہ جملہ بہت مؤثر ہوتا تھا۔

☆ نئے مدرسین کی تربیت کے سلسلے میں دو باتیں ملحوظ رکھنی چاہیے؛ اول: اپنے اوپر لے کر ان کو سمجھائے، دوم: اچھائیوں پر ان کی تعریف کرے۔

☆ زکوٰۃ کی شرح اللہ تعالیٰ نے ایسی معتدل رکھی ہے کہ اگر سب زکوٰۃ نکالنے لگے تو کوئی غریب نہ رہے اور دینے والوں کے لیے بوجھ بھی نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے دینے والوں اور مستحقین دونوں کا فائدہ ملحوظ رکھ کر شرح طے فرمائی ہے۔

☆ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں سوال کیا گیا کہ حضرت میں خاص بات کیا تھی؟ تو فرمایا کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ غایت درجہ متواضع تھے، اکثر خاموش رہا کرتے تھے، البتہ سوال کا جواب بہت وضاحت کے ساتھ تسلی بخش دیتے تھے۔

☆ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں استفسار کیا گیا تو فرمایا کہ سید صاحب میں غایت درجہ سنت کے اتباع کی اہمیت تھی، ہندوستان میں حج کا احیاء کیا اور فریضہ جہاد متروک ہو گیا تھا تو آپ نے اس کو جاری کیا۔

حضرتؒ سے راقم کا تقریباً دس سال تک تعلق رہا۔ سال میں دو تین مرتبہ حاضری کا شرف حاصل ہوتا، حضرت والا ویسے تو گونا گوں کئی صفات کے حامل تھے، مگر خاص بات جس کا ذکر کرنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ آپ والا مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے معتمد علیہ اور ظاہری و باطنی صفات کے مکمل حامل تھے، اعتدال، اخلاص نیت، غایت درجہ تواضع، حلم اور کم گوئی آپ کے نمایاں وصف تھے، باوقار، مدبر اور مہمان نواز تھے، عادت و اخلاق میں اتباع سنت کا بڑا اہتمام ہوتا تھا، چھوٹے بچوں سے بھی ملاقات کے وقت مسکراتے تھے، بڑے بڑے مسائل کو ایک دو جملوں میں حل فرما دیتے تھے، ندوۃ العلماء کی تقریباً پچیس سالہ نظامت اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی اکیس سالہ صدارت کو بحسن وخوبی انجام دیا، حضرت والا کی شخصیت مسلمانوں کے تمام طبقات اور مکاتب فکر کے لیے مرجع ومسند کی حیثیت رکھتی تھی۔

لیکن اب حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نہیں رہے بس آپ کی یادیں رہ گئی ہیں!

ثُمّ اِنقَضَت تِلكَ السُنونُ وَأَهلُها
فَكَأَنّها وَكَأَنَّهُم أَحلامُ

اور اب آپ کے اس فراق پر صرف یہی کہہ سکتے ہیں:

"وإنا لفراقك لمحزونون"

اور خالد شریف کا شعر بالکل صادق آتا ہے ؎

بچھڑا کچھ اس ادا سے کہ رت ہی بدل گئی
اک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

خلافت فی الارض کی ذمہ داری

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

''ہم ایسے ملک میں ہیں جہاں مسلمان اکثریت میں نہیں ہیں، یہاں مسلمانوں کے معاملات ہم کو خود طے کرنے ہیں، اقلیت حکومت سے توقع نہیں رکھتیں، حکومت کا بھکاری نہیں بننا ہے، اپنے معاملات خود طے کرنے ہیں، یہود جہاں ہیں اقلیت میں ہیں مگر وہ ترقی وفلاح کی پلاننگ خود کرتے ہیں اور جہاں رہتے ہیں وہاں مؤثر بن کر رہتے ہیں، چوں کہ ان کو صرف دنیا کی فکر ہوتی ہے، اس لیے انہیں انسانی حقوق کا خیال نہیں رہتا، ہم کو ایسا بننا ہے کہ ہم سارے انسانوں کے لیے مفید ہوں اور ہمارے طرز زندگی سے ان کے لیے ہدایت کا سامان ہو۔

اگر آپ علم دین حاصل نہیں کرتے اور صنعت سیکھتے ہیں، تجارت کے اصول سیکھتے ہیں تو آپ سمجھ لیجیے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ ہم سے کام لینا چاہتا ہے، اس کے ذریعہ بھی ہم اللہ کی معرفت اور اللہ کے یہاں مقبولیت حاصل کر سکتے ہیں اور اس کے ذریعہ بھی لوگوں کے دل ودماغ میں پہنچ سکتے ہیں اور اللہ کی معرفت دوسروں میں اس کے ذریعہ بھی پیدا کر سکتے ہیں، اسی طرح سائنس کا علم ہے، حیوانات کا علم ہے، نباتات کا علم ہے، ڈاکٹری کا' طب کا علم ہے، انجینئرنگ کا علم ہے اور یہ علوم وفنون ہیں اور معلومات کے یہ راستے ہیں، ان سب کو اللہ کی نسبت سے ہم اگر سیکھیں تو اس کے ذریعہ بھی ہم اللہ تک پہنچ سکتے ہیں اور دوسرے انسانوں کو اس کے ذریعہ ہم اللہ کی طرف لانے اور اس کی معرفت پیدا کرنے اور زندگی کا صحیح مقصد بتانے کا کام لے سکتے ہیں۔'' (تحفہ گجرات: ۱۵۳)

کچھ پھول یادوں کے چمن سے

مولانا سیف الدین اسلام پوری
(جامعۃ العلوم گڑھا، ہمت نگر- گجرات)

مؤرخہ ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۹ء مطابق ۲۱؍رمضان المبارک ۱۴۲۰ھ بروز جمعہ عالم اسلام اور بالخصوص مسلمانان ہند کے لیے غضب کا تاریک اور حوصلہ شکن دن تھا، جب عالم اسلام کے مقبولیت کے شہنشاہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ تمام کو اشک بار، غم گین وحزین چھوڑ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور بیک وقت کئی کئی علمی، دعوتی، تصنیفی واصلاحی میدانوں میں بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا، جس کو پاٹنا ناممکن تھا، یاس و ناامیدی، حوصلہ شکنی و بے مائیگی اور درست قیادت سے محرومی کا وہ کوہِ گراں گرا جو لفظوں اور تعبیرات کے دائرہ سے باہر تھا، حضرت کے مریدین، محبین اور متعلقین کا ناگفتہ بہ حال تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے سارا جھنڈ جیسے فکری اتفاق کر کے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ سے مربوط ہو گیا اور آپ کی زیر قیادت وسیادت آنے کو اپنا اعزاز وفخر سمجھنے لگا، حضرت مفکر اسلام کے خلفاء ونائبین تک نے بلاتردد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ سے اپنا اصلاحی وروحانی رشتہ جوڑ کر ایک مثال قائم کی، مولانا مرحوم نے حضرت مفکر اسلامؒ کے تمام علمی وعملی میدانوں میں نیابت کا فرض بحسن وخوبی انجام دینا شروع فرمایا، منتشر شیرازہ کو جمع کیا اور کبیدہ خاطر لوگوں کو سنبھالا دیا اور حضرت کے سینچے ہوئے لالہ زار کی حکمت وتدبیر کے ساتھ آبیاری فرمانے لگے۔

حضرت مفکر اسلام کی خدمت میں جب بھی حاضری کی سعادت نصیب ہوئی تو اکثر وبیشتر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ سے ضرور ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور انہی ملاقاتوں نے حضرت مولانا کے صفات حمیدہ، فراست و ذہانت، علمی تعمق، ذوق عبادت وانابت، صلاحِ نفس وصفاء باطن کو قریب سے دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع فراہم کیا اور بس پھر کیا؟ حضرت رحمہ اللہ کی عظمت وعقیدت اور محبت برابر بڑھتی چلی گئی۔

حضرت مفکر اسلامؒ کی وفات کے بعد ایک سفر میں حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری کے موقع پر ندوہ کے ایک مؤقر اور معمر استاذ نے ہم سے پوچھا کہ

''آپ بھی حضرت مولانا سے منسلک تھے؟''

بس اس سوال کے معاً بعد ہم نے بھی اسی روز سے اپنا اصلاحی تعلق حضرت مولانا سے جوڑ لیا اور حضرت کی اصلاح وتربیت کے خوشہ چینوں کے زمرے میں داخل ہو گئے اور یہ ہمارے لیے بڑے اعزاز وشرف کی بات ہے۔

حضرت مولانا نہیں رہے، ان کی یاد نہ جانے کتنوں کے لیے سہارا ہے، یہ یاد زندہ رہنی چاہیے، یہ زندہ رہے گی نظر کی روشنی کے لیے، دل کو گرمانے اور تڑپانے کے لیے، مشکل وقت میں راہ نما کے طور پر۔"فإن ذكره هو المسك ما كررته يتضوع."

حضرت مولانا مرحوم کے تعلق ہمیشہ حضرت جی مولانا انعام الحسن کاندھلویؒ کی دعا کا یہ جملہ منطبق ہوتا نظر آتا ہے، حضرت جی فرمایا کرتے تھے کہ''اے اللہ! بھلا مانس بنا دے۔'' حضرت مولانا مرحوم فی الواقع بھلے مانس کے مصداق تھے۔ عجز، سادگی، انکساری، بے خودی، نرم خوئی، خوش خلقی، ملنساری، علمی گہرائی، بندگی وعبدیت، آہ سحر گاہی، آہ وزاری یہ تمام صفات حضرت میں بلاتکلف وتصنع اس طرح موجود تھے کہ یہ صفات آپ کی فطرت ومزاج میں داخل تھے۔ بھولا بھولا شریف

پرنور چہرہ، قد وقامت کا اعتدال وتوازن، سرخی آمیز سفیدی، ہتھیلیوں کی گدازی اور عام انسان کے لبادہ و جامہ میں خوبیوں اور صفات کا شاندار وحسین مرقع تھے۔ سچائی وحق گوئی کا زندگی بھر بلا کا اہتمام و التزام رہا۔ غیبت و بدگوئی، الفاظ وکلمات کی رکاکت، ناگوار حالات وواقعات پر بھی چہرہ کی ترشی، مخاطبین وحاضرین کی سبکی اور انتقامی جذبہ سے زندگی بھر احتراز، آپ کی پاکیزگی زندگی کی بہت بڑی کرامت تھی۔ صبر وتحمل، قوت برداشت، حلم اور خندہ جبینی کے ساتھ مصائب ومشکلات کا سامنا کر لینا اور گزر جانا کوئی آپ سے سیکھے۔ حضرت مولانا مرحوم میں فراست تھی نورِ ایمان کے ساتھ، بصیرت تھی عاقبت اندیشی کے ساتھ، زیرکی تھی وسعت قلبی وخوش خلقی کے ساتھ اور معاملہ فہمی تھی احترام غیر کے ساتھ۔

اپنے بزرگوں اور بڑوں کے حضور اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنا، نہ کوئی امتیازی کیفیت بنانا اور نہ دل میں اس کا خیال اور کھٹکا آنے دینا اور بڑوں اور بزرگوں کے کسی حکم پر نہ عذر بیانی اور نہ مجبوری نمائی، یہ وہ دل وگردے کے کام تھے جنہوں نے آپ کو بڑوں کی نظر عنایت کا مرکز بنایا اور بڑی محبوبیت ومقبولیت حاصل ہوئی۔

تدریسی خدمات میں یکسوئی و پابندی، مطالعہ میں گہرائی، فن کی مراجع و امہات الکتب کی مراجعت اور طلبہ کی مطلوب ومحمود ہمت افزائی اور شخصیت سازی اور دورِ اہتمام میں بے لاگ و بے لوث انتظامی خدمات مگر علمی وقار وتمکین کے ساتھ، متعلقہ شعبوں میں رسائی وآگہی مگر تحمل و برداشت کے ساتھ، انتظامی پیچیدہ مسائل کی تحلیل مگر بصیرت، حکمت ودانائی کے ساتھ، پھر ۲۳ رسالہ کامیاب دور نظامت، نظامت کی مطلوب آن بان اور شان کے ساتھ، نظامت مگر بے غرضی و بے لوثی کے ساتھ، خودداری کے ساتھ، حضرت مفکر اسلام کی صحیح جانشینی ونیابت، وہی رنگ، وہی بو، وہی رو، وہی خو کے ساتھ۔ ناظم مگر بے پناہ کاظم، سب کے مقتدیٰ ومطاع مگر حد درجہ کا فطری تواضع، مسلم پرسنل لا جیسے امت کے باوقار ومشترکہ بورڈ کی ۲۰ رسالہ صدارت، سینے کی رحابت اور عقل کی رجاحت کے ساتھ، صدارت مختلف المشارب والمذاہب والمسالک والمناہج ارکان وممبران کے باوجود، صدارت سوزِ دل وسوزش اندروں کے ساتھ، صدارت بلا متنازع ومقابل، صدارت پیرانہ سالی، نقاہت، ضعف اور بیماریوں کے ساتھ۔ علاوہ ازیں کئی کئی علمی، فکری، تحقیقی اور دعوتی اداروں کی رکنیت انہی اطوار، کردار، گفتار اور رفتار کے ساتھ۔

اللہ پاک حضرت کو غریق رحمت فرمائے، کروٹ کروٹ چین وسکون نصیب فرمائے، درجات بلند فرمائے اور پوری امت کی طرف سے جزائے خیر نصیب فرمائے۔

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

حضرت مولاناؒ نے عاجز کو بارہا اپنی ذات سے مستفیض ہونے کا موقع بخشا، اپنی عنایتوں اور نصیحتوں سے نوازا، خانقاہی سادے سے مگر روح کی غذا سے بھرپور دسترخوان پر مہمان خانہ میں بلاوا بھیج کر اپنی معیت ومصاحبت سے نوازا اور یوں خود اعتمادی، حوصلہ، ہمت اور کچھ کرنے کا داعیہ پیدا فرماتے رہے اور اپنے نرالے پیارے اور اچھوتے انداز تربیت سے ہم خوردوں کی تربیت واصلاح فرماتے رہے۔ ہمارے جامعہ کے قیام کے لیے پشت پناہی بھی فرمائی، رہبری بھی، "أرض اللّٰہ واسعة" فرما کر ادارہ کو قائم کرنے کی ہمت بھی جگائی اور حکم بھی دیا اور نام بھی تجویز فرمایا "جامعۃ العلوم" اور یہیں پر بس نہیں بلکہ حضرت مولانا کے مایہ ناز وافتخار برادر حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کے ساتھ ادارہ کو تین بار اپنے ورودِ مسعود سے تابندگی بخشی، معاینہ فرمایا، شعبہ در شعبہ تشریف لے گئے، مجالس منعقد فرمائیں، معرفت وعلم کا فیضان فرمایا، تقریریں وخطابات فرمائے اور محبین ومنتسبین کو حسب موقع ومناسبت یہاں کی ملاقات کا مشورہ دے کر ہماری ہمت افزائی کا سامان فرمایا اور خوردنوازی کا ثبوت دیا۔

جولائی ۲۰۱۱ء کا وہ ناقابل فراموش دن اچھی طرح یاد ہے، جب پہلی بار حضرتؒ کی تشریف آوری ہمارے یہاں ہونے جارہی تھی، عید کا سماں تھا، طفل، جواں وپیر ہر کوئی آمد کا منتظر تھا، بارش کا

موسم تھا، ادارہ میں سڑکیں پکی بھی ہوئی نہ تھیں، قیام کے لیے مہمان خانہ کا معقول انتظام نہ تھا، لہٰذا حضرت کا قیام عاجز کے آبائی وطن اسلام پورہ میں طے ہوا۔ ٹوٹی ہوئی بارش سے متاثر دیہاتی سڑکوں سے حضرت کو قیام گاہ لایا گیا، سڑکوں کے تعطل کی وجہ سے سواری قیام گاہ تک نہ جاسکی تو اس پیرانہ سالی میں حضرت والا پیدل چلے، تھکان کی وجہ سے راستہ پر ایک بار کرسی لگائی گئی، میزبانوں کا حال ناگفتہ بہ مگر حضرت ان تمام متاعب کو بڑی خندہ جبینی سے جھیل کر میزبانوں پر اپنی روحانی حکومت قائم فرماتے رہے۔ نماز وغیرہ سے فراغت پر عشائیہ تیار تھا پھر گھر کے تحتانی کمرہ میں آرام فرمایا، صبح حسب معمول وقت تہجد پر بغیر کسی شور و ہنگامہ بڑی لطافت سے بیدار ہوئے، نماز اور دعا سے فارغ ہوکر کسی ستون کے سہارے ٹیک لگا کر ایک پاؤں کو بچھا کر دوسرے پاؤں کو نصب کر کے متواضعانہ انداز سے نشست اختیار کر کے پتہ نہیں کس انہماک سے عام مسلمان بن کر ذکر باری میں مصروف ہو گئے۔ ندوہ کا وہی سادہ مہمان خانہ ہو، رائے بریلی تکیہ کا وہ بنگلہ یا کسی ترقی یافتہ ملک کا اعلیٰ معیار کا ہوٹل، صبح کا یہی معمول، یہی انہماک اور یہی اپنے رب سے راز و نیاز۔

اس سال رمضان میں ترکی و عمرہ کے مقدس سفر کے بعد عشرۂ اولیٰ کے اختتام پر بارہا حضرت سے ملاقات کا اشتیاق تیز سے تیز تر ہوتا گیا اور نہ جانے کیوں بلا دلیل ایک چھپا سا ڈر و خدشہ حضرت کے تعلق سے ہوتا گیا، مگر آج کل پر بات ٹلتی گئی، بالآخر ۲۱ر رمضان ظہر کی نماز حسب معمول پڑھ کر تلاوت کے لیے ہم مسجد میں بیٹھے تھے کہ عزیزم ثمیر ندوی نے آکر صاعقہ خیز خبر سنائی کہ حضرت مولانا انتقال فرما گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

خبر سن کر دل بیٹھ گیا، روحانی باپ و مرشد سے محرومی کا عجیب احساس ہوا، ہر آن ہر لحظہ وہ پرنور بھولا بھالا چہرہ بھلائے نہ بھلایا جا سکا۔ "ضَاقَتِ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ" کا عملی احساس ہوا اور ۲۳ر رمضان کی فلائٹ سے رائے بریلی پہنچ گئے۔ نماز جنازہ تو نہ مل سکی مگر حضرت کی لحد پر کھڑے ہوکر فاتحہ خوانی کرتے ہوئے آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور بیتے ہوئے دن یاد آنے لگے۔ تمام چیزیں بے رونق معلوم ہونے لگیں۔ جب بھی رائے بریلی جاتے حضرت سے ملاقات ہوتی مگر اب کی بار حضرت نہ دارد، ڈھیروں اور منوں مٹی تلے مدفون علم، عمل، تقویٰ اور طہارت کا پہاڑ ؎

ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں روز شب لیکن
غضب تو یہ ہے کہ اب آفتاب ٹوٹا ہے

فاضل جفا کشان محبت کی موت کیا
جب تھک گئے سو گئے آرام سے

تعلیم کے ساتھ تربیت کی ضرورت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

"تعلیم کے ساتھ اگر تربیت نہیں اور دعوت کا کام شامل نہیں تو وہ طالب علم کو اچھا انسان نہیں بنائے گی، وہ تعلیم تو ایسے انسانوں کو وجود میں لائے گی جو دیکھنے میں انسان ہوں گے، لیکن ان کو کھانے پینے کی، پیٹ پالنے کی فکر کے علاوہ کوئی فکر نہیں ہوگی، اچھی باتوں کو اختیار کرنے کی جدوجہد ان میں نہیں ہوگی اور نہ وہ دوسروں کے کام آنے کے لائق ہوں گے۔ تربیت اور تعلیم دونوں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں، تعلیم کو تربیت کہنا زیادہ صحیح ہے، تعلیم میں تو سکھایا جاتا ہے بنایا جاتا ہے، اچھی باتیں اگر آپ بتائیں گے، اس سے تربیت ہوگی اور اگر اچھی باتیں آپ نہیں بتائیں گے، صرف پیٹ پالنے کی باتیں کریں گے، تو آدمی کا کام یہی رہ جائے گا، یہ کام تو تمام جانور بھی کرتے ہیں، پھر آدمی کے اندر انسان ہونے کی کیا خصوصیت رہی۔" (تحفہ گجرات: ۱۱۲-۱۱۳)

میر کارواں — چند مشاہدات و تاثرات

مولانا خالد رشید فرنگی محلی
(چیرمین اسلامک سنٹر آف انڈیا و ناظم دارالعلوم فرنگی محل۔لکھنؤ)

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

میر کارواں، مفکر ملت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ بلاشبہ ایک عہد آفریں و تاریخ ساز شخصیت کے حامل تھے۔ انہوں نے ۹۴ ربرس کی طویل عمر پائی۔ ان کی حیات مستعار کا ایک ایک لمحہ اعلائے کلمۃ الحق کے لیے وقف تھا۔ مولانا مرحوم اسلامی شریعت پر عامل اور طریقت کے حامل تھے۔ وہ عربی اور اردو کے بلند پایہ مصنف اور صحافی تھے۔ وہ ایک مثالی مدرس اور ماہر منتظم تھے۔ مولانا مرحوم نسلوں کے معمار اور مربی تھے۔ ان کے دامن علم و عمل سے وابستہ ہوکر اور ان کی تربیت پاکر نہ جانے کتنے ذرے آفتاب بن گئے۔

مضمون کی ابتدا میں پیش کردہ علامہ اقبال کا شعر اپنی معنویت کے ساتھ مولانا مرحوم کی شخصیت پر صادق آتا ہے۔ وہ ارض ہند میں سرمایہ ملت کے نگہ بان تھے۔ وہ فرزندان اسلام کے قافلہ سالار تھے۔ وہ میر کارواں تھے۔ ان کی تحریریں، تقریریں، باتیں اور نشستیں، حکمت، دانائی، عقل، فرزانگی، ہوش مندی، علم و عمل اور مقصدیت و معنویت سے پُر ہوتی تھیں۔ ان میں جذباتیت، وقتی جوش و خروش، محاذ آرائی، ہنگامہ خیزی اور فتنہ و فساد کا گزر نہیں ہوتا تھا۔

حضرت مولاناؒ ان خدا رسیدہ علمائے کرام میں سے تھے جن کو دیکھنے سے خدا تعالیٰ یاد آتا ہے۔ آپ کی مجلسوں سے معرفت الٰہی حاصل ہوتی تھی۔ مولاناؒ کی شخصیت اتنی نورانی، من موہنی اور جاذب نظر تھی کہ دیکھتے ہی آدمی مسحور ہوجائے۔ ان کی باتیں، نصیحتیں اور ارشادات سننے والا تو ان کا گرویدہ اور فریفتہ ہوجاتا تھا۔

حضرت مولاناؒ کو راقم کے والد ماجد مولانا ابوالطیب احمد میاں فرنگی محلیؒ اور خاندان فرنگی محل سے گہرا تعلق تھا۔ اس کا اظہار انہوں نے والد مرحوم کے انتقال پر اپنے تاثراتی مضمون میں کیا ہے۔

مولانا مرحوم ارقام فرماتے ہیں:

''امام عیدگاہ لکھنؤ حضرت مولانا ابوالطیب احمد میاں رحمۃ اللہ علیہ اپنے عہد کی ایک موقر اور محترم شخصیت تھے اور ان کا خاندانی تعلق فرنگی محل عالم اسلام کی مشہور علوم دینیہ کی درس گاہ کے جلیل القدر بانیوں اور بزرگوں سے ہونے کی بنا پر ان کو بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا رہا تھا۔ لکھنؤ کی بڑی اور اصل عیدگاہ کی امامت کی ذمہ داری نے ان کو اہل لکھنؤ اور لکھنؤ کے اطراف کے علاقوں میں مسلمانوں میں اور زیادہ معروف بنا دیا تھا۔ انہوں نے جس اخلاق و کردار کی زندگی گزاری وہ ان کی محترم شخصیت کی علامت بنی۔ اولاً ان کا فرنگی محل کے خاندان کے فرد ہونے کا جو تعلق تھا وہ خصوصیت اور احترام و قدردانی کا باعث تھا۔ فرنگی محل کے اس خاندان کو استاذ الہند علامہ نظام الدین محمد فرنگی محلی بانی درس نظامی کی وجہ سے خصوصی شہرت ملی۔ علوم دینیہ کی تعلیم کے سلسلے میں ان کے مقرر کردہ نصاب درس کو برصغیر کی علمی دنیا میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔''

(ملاحظہ ہو؛ تذکرہ مولانا احمد میاں فرنگی محلیؒ: ص ۹)

حضرت مولانا مرحوم مزید رقم طراز ہیں:

''لکھنؤ شہر میں ندوۃ العلماء کے ہونے کی بنا پر ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں کا بھی ربط فرنگی محل کے علماء سے رہا ہے۔ مولانا ابو الطیب میاں سے یہ ربط مزید قریبی ہوا۔ انہوں نے اپنے دو صاحب

زادوں کو ندوہ میں تعلیم دلوائی۔ اس تعلق سے ان سے ملنا اور مختلف معاملات میں تعاون رہتا تھا اور خاص ہم آہنگی تھی جس کو ان کے صاحب زادگان کے ذریعے مزید تقویت حاصل ہوئی۔ ان کے صاحب زادگان نے اپنے والد معظم کی سرپرستی میں فرنگی محل کے تعلیمی ماضی کا احیاء کرنے کے لیے ایک مستقل ادارہ قائم کیا جو ملی خدمات کے ساتھ تعلیمی عمل بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔ مولانا کے صاحب زادگان میں مولوی خالد رشید صاحب ندوی اس سلسلے میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اور مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی صحت کی کم زوری کے موقع پر عیدگاہ کی امامت نائب امام کی حیثیت سے کرتے تھے اراب باقاعدہ امام کی حیثیت حاصل ہے۔'' (حوالہ سابق، ص:۱۱)

مولانا مرحوم راقم اور اس کے بڑے بھائی مولانا طارق رشید فرنگی محلی (مقیم فلوریڈا، امریکہ) پر بہت شفقت کرتے تھے۔ دسمبر ۲۰۲۲ء میں بڑے بھائی لکھنؤ آئے، ہم دونوں حضرت مولاناؒ کو سلام کرنے گئے۔ مل کر بہت خوش ہوئے۔ راقم کی کتاب ''متاع علم ودانش'' کا اجرا کیا۔ اس کی اشاعت پر مسرت کا اظہار کیا۔ اسی طرح جنوری ۲۰۰۱ء میں والد مرحوم نے مدرسہ نظامیہ کا احیا کیا تو اس کی افتتاحی تقریب میں حضرت والاؒ اور مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ نے شرکت کی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے متعلق راقم نے متعدد موقعوں پر حضرت والا سے رہ نمائی حاصل کی۔ مارچ ۲۰۱۰ء میں لکھنؤ میں ہونے والے بورڈ کے اکیسویں اجلاس میں تو راقم کی پوری رہ نمائی حضرت ہی نے کی۔

اس کے علاوہ اسلامک سنٹر آف انڈیا کے متعدد اجلاس اور کانفرنسوں میں مولانا مرحوم نے بڑی دل چسپی سے شرکت فرمائی۔ ان میں علمائے ''فرنگی محل-حیات وخدمات'' عالمی کانفرنس اور ۲۰۱۲ء میں امام حرم شیخ ڈاکٹر خالد غامدی کی آمد ۲۰۱۶ء میں امام حرم ڈاکٹر شیخ صالح ابوطالب کی تشریف آوری پر عیدگاہ لکھنؤ میں عظیم الشان بین الاقوامی کانفرنسوں کی صدارت قابل ذکر ہیں۔

حضرت مولانا قدس سرہ گونا گوں صفات کے حامل تھے۔ وہ ایک عالم، مبلغ، معلم، مصلح، مزکی، مفکر، مدبر، مصنف، منتظم اور صحافی تھے۔ تقریباً ایک صدی پر محیط ان کی مختلف الجہات خدمات کا احاطہ کرنا اس مختصر تاثراتی مضمون میں دشوار ہے۔ تاہم راقم سطور نے اپنی سعادت سمجھ کر استاد گرامی قدر کی بلند وبالا شخصیت پر یہ تاثرات تحریر کیے ہیں۔

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

فرنگی محل اور علمائے فرنگی محل

''فرنگی محل دراصل اس حویلی کا نام ہے جس میں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد میں کوئی اہم فرنگی رہا تھا، اس کے نام سے حویلی منسوب تھی اور خالی تھی، وہ بادشاہ نے حضرت ملا نظام الدین کے والد مکرم مولانا قطب الدین سہالوی کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے ان کو قیام کے لیے پیش کی تھی جو اسی سابقہ نام سے موسوم ہوتی رہی، ان کے خاندان کی بعد میں بھی اسی میں سکونت رہی اور ان میں ممتاز اہل علم افراد پیدا ہوتے رہے اور کئی خاندان میں علم کا چرچا رہا اور شہرت دور دور تک پہنچی، اس طرح اس کے فرنگی محل نام کے ساتھ علم کی خدمت کی درخشاں تاریخ جڑ گئی۔

علمائے فرنگی محل نے مختلف اسلامی علوم وفنون پر پانچ سو سے زائد کتابیں تحریر کیں، ان کا یہ تحریری سرمایہ اسلام کے کتب خانے کی امتیازی شان ہے، یہی وجہ ہے کہ برس ہا برس گزر جانے کے بعد بھی ان کے علمی مآثر پر تحقیق وتخریج کا کام نہ صرف برصغیر میں بلکہ عالم عرب کی متعدد یونی ورسٹیوں اور دانش گاہوں میں جاری ہے۔'' (یادوں کے چراغ: ۱/۳۵۴-۳۵۵)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

مولانا سید محمد رابع علیہ الرحمہ کے غیر ملکی سفرنامے

پروفیسر جمشید احمد ندوی
(شعبہ عربی ممبئی یونیورسٹی۔ممبئی)

سفر انسانی زندگی کا ایک حصہ ہے جو کبھی اعلیٰ مقاصد کے پیش نظر کیا جاتا ہے تو کبھی صرف دنیا دیکھنے، سیر وتفریح اور وقت گذاری کے لیے کیا جاتا ہے۔ سفر کا مقصد کچھ بھی ہو، حاصل سفر کو ''ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں'' کی عملی تصویر کشی کرنے کے نمونے زمانہ قدیم ہی سے ملتے ہیں۔ حاصل سفر کی روداد نے ادب کی ایک مستقل صنف کی شکل اختیار کر لی ہے جسے ''سفرنامہ'' سے موسوم کیا جاتا ہے۔

''سفرنامہ'' ادب کی ایک ایسی صنف ہے جس میں مسافر اپنی آپ بیتی کے ساتھ جگ بیتی بھی بیان کرتا ہے۔ قدرت کے حسین وجمیل شاہکار کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کرتا ہے کہ اسے پڑھنے والا گویا دیکھ رہا ہے۔ تاریخ کے اچھے یا برے دریچوں کو اس طرح وا کرتا ہے اس زمانہ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ کر رہ جاتا ہے۔ تہذیب وثقافت کی عکاسی اس طرح کرتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو اسی تہذیب وثقافت کا حصہ سمجھ بیٹھا ہے۔

''سفرنامہ'' مسافر کی شخصیت کا عکاس ہوتا ہے اور اس کے جذبات وکردار کا آئینہ ہوتا ہے لہذا ہر سفرنامہ میں قاری کو وہی کچھ ملتا ہے جو مسافر کو پسند اور محبوب ومرغوب ہوتا ہے جس کی وجہ سے ہر سفرنامہ کا اسلوب اور اس کا بیانیہ مختلف ہوتا ہے اور اس میں مندرج معلومات کے پیمانے اور مقاصد بھی الگ الگ ہوتے ہیں جو اسے دوسرے سفرناموں سے کبھی مکمل طور اور کبھی جزوی طور پر منفرد شناخت وپہچان دیتے ہیں۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے اشہب قلم سے متعدد کتب منظر عام پر آچکی ہیں جو قرآنیات، سیرت نگاری، اسلامیات، سماجیات، اخلاقیات، نصابیات، خطبات ومواعظ ونصائح، سوانح نگاری، خودنوشت، جغرافیہ، تعلیم، ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل اور ان کے حل وغیرہ کے ساتھ ساتھ سفر نامے جیسے موضوعات پر محیط ہیں۔ مذکورہ تمام موضوعات پر استاد گرامی قدرؒ کی تصانیف اپنے اپنے موضوعات کا بھرپور احاطہ کرتی ہیں اور انھیں اچھے انداز میں قاری کے سامنے پیش کرتی ہیں کہ قاری ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔

استاد محترمؒ کے سفرنامے ہند اور بیرون ہند کے اسفار پر محیط ہیں۔ درج ذیل سطور میں مولانائے محترم کے بیرون ملک کے سفر ناموں کا تعارف کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

دو مہینے امریکہ میں:

اس سفرنامہ میں سفر امریکہ کی روداد بیان کی گئی ہے۔ استاد گرامی قدرؒ نے امریکہ کا یہ دعوتی سفر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی معیت میں کیا تھا جو دو مہینے اور آٹھ دن - اواخر مئی ۱۹۷۷ء تا اوائل اگست ۱۹۷۷ء - پر محیط تھا۔ سفر کا پس منظر اور سفرنامہ مرتب کرنے اور اس کے طریقۂ کار کا ذکر مولاناؒ نے اپنے پیش لفظ میں کیا ہے کہ ''امریکہ کے سفر کا یہ روزنامچہ دراصل خال معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی صاحب ندوی مدظلہ کے دو ماہ کے سفر امریکہ کی روداد ہے۔ مولانا مدظلہ نے یہ سفر دعوتی مقصد سے کیا تھا..... سفر کے اختتام پر مولانا نے اس سفر کی روداد لکھنے کی ذمہ داری بھی مجھ پر ڈالی۔ سفر کے واقعات وحالات کے بارے میں ضروری اشارے سفر کے دوران ہی قلم بند کیے جاتے رہے تھے، اس روزنامچہ کی تیاری میں ان سے بنیادی مدد لی گئی ہے، پھر مولانا مدظلہ نے اس کو شروع سے آخر

تک پڑھوا کر سنا اور جگہ جگہ اضافہ وتصحیح فرمائی، اس طرح یہ روزنامچہ دورۂ امریکہ کی بڑی حد تک صحیح تصویر ہے جس میں میں نے اپنے کو زیادہ تر مولانا مدظلہ کے ترجمان کی حیثیت دینے کی کوشش کی ہے، تاثرات واحساسات بڑی حد تک مولانا مدظلہ اور میرے درمیان مشترک ہیں البتہ زبان وتعبیر میری ہے۔'' (ص ۱۳)

سفر نامہ کے مرکزی عنوان کا ذکر کرتے ہوئے مولانا علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ ''یہ سفر دعوتی تھا اس لیے اس میں مسلمانوں کے معاملات اور دعوتی تقاضوں کا حصہ نمایاں ملے گا۔ اس کے علاوہ چونکہ امریہ اس دنیا کا دولت مند ترین ملک ہے، نیز ٹیکنالوجی کی ترقی اور عمومیت کے لحاظ سے تقریبا دنیا کے تمام ملکوں سے آگے ہے اس لیے اس پہلو کی تصویر بھی ملے گی۔ میں نے امریکی زندگی کے بعض اہم پہلوؤں کو کسی قدر زیادہ تفصیل اور اعداد وشمار کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔'' (ص ۱۴)

مولانا علیہ الرحمہ نے اپنے مقدمہ میں امریکہ میں پائی جانے والی بے مہار اخلاقی زندگی، مادی وصنعتی ترقی، تعلیم وتحقیق کے میدان میں ترقی وغیرہ اس سفر کا اجزائے ترکیبی اور وہاں پائی جانے والی نیگرو آبادی کو ایک انتظامی واخلاق مسئلہ قرار دیا ہے اور ان میں سے جنھوں نے اسلام قبول کرلیا ہے ان کی زندگی کو اسلام نہ قبول کرنے والوں کے مقابلہ میں بہتر قرار دیا ہے لیکن ان کے اسلام قبول کرنے پر سوالیہ نشان لگاتے ہوئے لکھا ہے کہ ''اسلام سے ان کی وابستگی کس حد تک اور کس نوعیت کی ہے یہ تشریح طلب بات ہے، اس کتاب میں اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔'' (ص ۱۵)

استاد محترم علیہ الرحمہ کا امریکہ کا یہ سفر 'تقریبا ۶ ہزار میل کی مساحت پر مشتمل ہے جس میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مشرقی ساحل سے لے کر مغربی ساحل تک بشمول کناڈا تقریبا دو درجن مقامات پر جانے کا اتفاق ہوا تھا اور امریکی تمدن اور طرز ہائے زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا تھا۔'' (ص ۱۴)

سفر نامہ کی ابتداء وجہ سفر کے بیان سے ہوتی ہے شمالی امریکہ میں مسلم طلباء کی تنظیم ایم ایس اے (مسلم اسٹوڈنس ایسوسی ایشن) شکاگو کی جانب سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو مئی ۱۹۷۷ء میں منعقد ہونے والی سالانہ کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔ حضرت مولانا علیہ الرحمہ سے اس دعوت کو قبول کرلیا اور مجھے اپنے ساتھ رفیق سفر کے طور پر لے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

وجہ سفر کے بعد امریکہ کا مختصرا تعارف پیش کرتے ہوئے خاص طور پر امریکہ کے مشہور شہر نیویارک کا ذکر کیا گیا ہے اور ضمناً امریکہ کے دریافت ہونے، یورپین استعمار اور اس سے آزاد ہونے کی کوششوں کے ساتھ ہی ساتھ امریکہ کی آبادی اور دولت کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ معاً بعد سفر کی کاروائی اور سفر کے آغاز، نیویارک آمد اور وہاں مختصر قیام، نیویارک سے کانفرنس کے مقام 'انڈیانا اسٹیٹ یونیورسٹی تک پہنچنے کے دوران پیش آنے والے واقعات کو قلم بند کیا گیا ہے۔ ضمنی طور امریکہ معاشرہ کے بعض پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے وہاں کی فضائی کمپنیوں کی صورت حال، امریکہ میں مسلمانوں کی تعداد کا ذکر کرتے ہوئے مسلم طلباء کی تنظیم ایم ایس اے (مسلم اسٹوڈنس ایسوسی ایشن) اور دیگر اہم انجمنوں کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ مزید برآں ایم ایس اے کی جانب سے منعقدہ چار روزہ کانفرنس (۲۷-۳۰ مئی ۱۹۷۷ء) کی تفصیلات اور اس کے شرکاء، انتظامات وموضوعات وغیرہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ کانفرنس میں حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی فعال شرکت کا ذکر خاص طور پر کیا گیا ہے اور ان کی تقاریر وگفتگو کا خلاصہ نقل کیا گیا۔ سو صفحات پر مشتمل سفر نامہ کا یہ ابتدائی حصہ -تقریبا 'سفر نامہ' کے مقابلہ میں کانفرنس کی روداد زیادہ معلوم ہوتا ہے تاہم اس کمی کو وہاں کی معاشرتی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ذکر کر کے کسی حد تک دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سفر نامہ کے اس حصہ میں مختلف اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے اور ان سے اپنے روابط کا ذکر کیا گیا ہے جن میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی کا تعارف قدرے بڑا ہے۔ ان اشخاص کے تعارف کو اگر الگ سے جمع کردیا جائے تو خاصے کی چیز اکٹھا ہوجائے گی اور اگر ان کا موازنہ ان

ہی کے متعلق بعد میں لکھی جانے والی تحریروں سے کیا جائے گا تو اس بات کے امکانات سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ مولانا علیہ الرحمہ کے اسلوب بیان اوران کے مشاہدہ میں کچھ فرق محسوس کیا جائے۔

کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد مولانا علیہ الرحمہ نے وہاں کی دیگر مصروفیات جیسے مسلم طلباء کی تنظیم ایم ایس اے (مسلم اسٹوڈنس ایسوسی ایشن) کے صدر دفتر شکاگو میں حاضری، حضرت مولاناؒ کی آنکھوں کی بیماری کے حوالہ سے بالٹی مور میں ڈاکٹر شوکت یوسف خاں صاحب سے تفصیلی ملاقات کے بعد امریکہ مشہور ترین ڈاکٹر شے سے وقت لینا، ڈاکٹر جاوید شفیع صاحب کے مکان پر قیام امریکہ میں نیویارک جانے کے لیے ریل کا پہلا سفر اور اس کے تاثرات اور نیویارک ریلوے اسٹیشن کی تصویر کشی وغیرہ۔

نیویارک پہنچنے کے بعد اس سفر نامہ کا بنیادی حصہ شروع ہوتا ہے کہ ایک ہفتہ کے لیے امریکہ کے مشرقی منطقہ میں دعوتی سفر کی سرگرمیوں کا آغاز ہوتا ہے۔اس مقام پر مولانا علیہ الرحمہ کے اندر کا جغرافیہ داں بیدار ہوجاتا ہے اور وہ دعوتی سرگرمیوں کو بیان کرنے سے قبل نیویارک کے محل وقوع اوراس کے اہم حصوں کی تصویر کشی کرتا ہوا نظر آتا ہے۔اس کے بعد دعوتی سفر کے پروگرام کی ہفتہ واری تفصیلات بیان کی ہے اور ضمناً ان علاقوں کا محل وقوع اور ان کی اہمیت کا ذکر بہت ہی اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے جو اس سفر کے پروگرام میں شامل تھے۔اس دعوتی سفر میں امریکہ کی گیارہ اور کناڈا کی دو ریاستوں کے اہم اور مشہور شہروں کا احاطہ کیا گیا تھا۔

جمعہ ۳؍جون ۱۹۷۷ء سے شروع ہونے والے اس دعوتی سفر میں نیویارک، جرسی سٹی، مین ہاٹن، بوسٹن، شکاگو، مونٹریال (کناڈا) ٹورنٹو (کناڈا) کیلیفورنیا، لاس اینجلس، سان جوزے، سان فرانسسکو، سالٹ لیک سٹی، ڈیٹرائٹ، ڈیربن، واشنگٹن کے اسفار ہوئے اور وہاں کی دعوتی سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔حضرت مولاناؒ کے خطابات اوران کے بعد ہونے والے سوالات وجوابات کا خصوصاً ذکر کیا گیا ہے۔دینی ودعوتی سرگرمیوں سے فرصت ملنے کے بعد وہاں کے مشہور سیاحتی مقامات وعمارات کو دیکھنے کا ذکر بھی کیا گیا ہے جیسے رابطۂ عالم اسلامی کا دفتر اور اقوام متحدہ کا دفتر، ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ، پان امریکن ایرویز بلڈنگ، ورلڈ ٹریڈ سینٹر، اسٹیچو آف لبرٹی (نیویارک)، سی این ٹاور (ٹورنٹو) نیاگرا آبشار (کناڈا)، سان فرانسسکو کے گولڈن گیٹ برج، چائنا برج اور دیگر سیاحتی مقامات، سالٹ لیک سٹی میں واقع مارمن فرقہ کے مراکز اور وہاں کے پہاڑی دامن، مسلم کمیونٹ سینٹر (شکاگو) اسلامک سینٹر، واٹر گیٹ، وائٹ ہاؤس، امریکی پارلیمنٹ کی عمارت کیپیٹال (واشنگٹن) میکڈانلڈ فرم (فلاڈلفیا) سیرس ٹاور، سائنس میوزیم اور پلینٹیریم (شکاگو) کے علاوہ کولمبیا یونیورسٹی، ٹمپل یونیورسٹی، کیلی فورنیا یونیورسٹی، اوٹا یونیورسٹی، شکاگو یونیورسٹی، الّلی یونیورسٹی اور امریکہ کے مختلف کمیونٹی سینٹرس اور ہالس وغیرہ۔ مذکورہ بالا یونیورسٹیز اور سینٹرس میں سے اکثر میں حضرت مولاناؒ کا خطابات ہوئے تھے جنھیں لوگوں نے کافی پسند کیا تھا۔

اس سفر نامہ میں شامل شہروں کے اہم ونمایاں مقامات کی زیارت اور وہاں کی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے۔اسی طرح ان تمام شہروں کے محل وقوع، وہاں کے اہم مقامات وتجارتی وصنعتی سرگرمیوں کا ذکر کیا ہے۔اس سفر نامہ میں مولانا علیہ الرحمہ کی جغرافیہ سے دلچسپی اور جغرافیائی معلومات ودرک کا اندازہ بار بار ہوتا ہے۔

اس سفر نامہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں متعدد افراد واشخاص سے ملاقاتوں کا ذکر کیا گیا ہے اوران کا مختصر تعارف کے ساتھ ساتھ ان کی مصروفیات وخدمات کا بھی ذکر گیا ہے۔ان اشخاص وافراد میں ہندوستانی، پاکستانی، امریکی اور عرب وغیرہ سب شامل ہیں۔ان اشخاص کے تذکرہ کو اگر اکٹھا کردیا جائے تو مولانا علیہ الرحمہ کی ایک اور کتاب منظر عام پر آسکتی ہے۔ان اشخاص میں محمد خورشید (ص۳۱) ڈاکٹر یوسف قرضاوی (ص۷۲)، قاضی بیابانی اور فصیح صدیقی (ص۸۰)، ڈاکٹر یوسف العظم (ص۹۱) ڈاکٹر مطیع صدیقی، نیاز احمد صدیقی برادر رشید احمد صدیقی (ص۱۰۹) مزمل حسین صدیقی (ص ۱۱۶)، سید ساجد حسین، حاجی متین احمد (ص۱۱۸)، سید ساجد حسین

(ص۱۱۹)حاجی عبدالرقیب (ص۱۲۰- ۱۲۱)،ولی محمد(ص۱۲۱)،شیخ سلیمان دنیا (ص۱۲۱-۱۲۲)،مدثر حسین صدیقی (ص۱۳۶) مجاہد صواف(ص۱۴۶)ڈاکٹر ناصرالدین (ص ۱۴۸) ڈاکٹر ظفر اسحاق (ص۱۴۹)،وارث الدین محمد (ص۱۵۳-۱۵۹) ایجاز محمد (ص۱۵۴-۱۵۷تا۱۵۹)،مالکم ایکس(ص۱۵۵) ڈاکٹر عبد السلام انصاری (ص۱۶۵)،محمد علی کلے (ص۱۷۰)،سید عظمت اللہ قادری حیدرآبادی (ص۱۷۱)انیس احمد(ص۱۷۳)ڈاکٹر شے(ص۱۷۵تا۱۷۶-۱۸۰تا ۱۸۱)،طارق کرگہی (ص۲۲۷) احمد زکی حماد(ص۲۶۶-۳۵۴)ڈاکٹر عمر فاروق عبداللہ(ص۲۷۱) فخری صاحب (ص ۲۷۱)ڈاکٹر مصطفیٰ عطار (ص۲۸۱)مجدی فوزی خطیب(ص۳۱۱)غلام حیدر آسی (ص۳۲۷)صفوت علی(ص۳۱۷-۳۲۷)ڈاکٹر دجانی(ص۳۵۵)ودیگر شامل ہیں۔

امریکہ کے اس سفر میں وہاں کے دوتین شہروں جیسے نیو یارک، شکاگواور فلاڈلفیا کا ذکر بار بار کیا گیا ہے کہ وہاں ایک بار سے زائد جانا ہوا تھا۔

یہاں اس بات کی طرف اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے دعوتی سفر کے پروگرام میں فلاڈلفیا کا دورہ شامل نہیں تھا لیکن ماہر امراض ڈاکٹر شے کے اپائمنٹ کی وجہ پروگرام میں معمولی رد وبدل کرتے ہوئے فلاڈلفیا کے لیے رخت سفر باندھا گیا اور ڈاکٹر شے سے ملاقات کر کے حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی آنکھ کا معائنہ کرایا گیا تھا اور جولائی میں آپریشن کی تاریخ طے ہوگئی تھی۔ فلاڈلفیا کے دوسرے چکر میں حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی آنکھ کے آپریشن کی تفصیلات اور اس سے متعلق دوسرے امور کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے' سفرنامہ کا آخری حصہ اسی علاج ومعالجہ کی تفصیلات کے ساتھ ساتھ دیگر مصروفیات اور سیر وسیاحت وغیرہ اور وہاں دعوتی کام کرنے کے مواقع اور وہاں مقیم مسلمانوں کی ذمہ داریوں کے ذکر پر مشتمل ہے۔

اس سفرنامہ کا ماحصل مولانا علیہ الرحمہ کی کتاب میں شامل اس درج ذیل اقتباس کو قرار دیا جاسکتا ہے:

''اب امریکہ سے ان سب دوستوں اور محبوں کی نہ بھلائی جانے والی یادیں لے کر واپس جانے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ دوماہ دس روز کی مدت اب کنارے لگ گئی ہے۔اس میں نئی اور عظیم دینا دیکھی،نفرت کے قابل باتیں بھی دیکھیں اور سیکھنے کے لائق کام بھی دیکھے،اپنوں کی محبت دیکھی،غیروں کی رواداری دیکھی،دنیاوی جدوجہد میں لگن اور فرض شناسی دیکھی،تہذیب جدید کی ملمع کاری بھی دیکھی،سائنسی تحقیق اور ایجاد کی معراج بھی دیکھی،اجتماعی زندگی کی سلیقہ مندی وشائستگی دیکھی اور نجی زندگی کا بگاڑ اور زبوں حالی دیکھی۔امریکہ جو اس وقت ایک دوہری کیفیت اور متضاد حالات کا ملک بنا ہوا ہے،صرف مشرق ہی کو نہیں متاثر کر رہا ہے بلکہ اب یورپ پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔اس نے اس کو اپنے ہی قافلہ کا مسافر بنا دیا ہے۔اس امریکہ کو اگر زندگی کا صحیح رخ میسر ہو جائے تو وہ ساری دنیا کو سنوار سکتا ہے اور راحت وعافیت سے بہرہ ور ہو سکتا ہے ورنہ یہی امریکہ ایسی تباہی لا سکتا ہے جو دنیا کو ہزاروں سال پہلے کی پسماندگی کی طرف پہنچا دے گی۔(ص۳۵۷-۳۵۸)

امریکی معاشرہ کی تصویر کشی:

اس سفرنامہ کی سب سے بڑی خصوصیت امریکی معاشرہ کی بہترین انداز میں تصویر کشی کرنا ہے۔ جگہ جگہ مولانا علیہ الرحمہ نے وہاں کی سماجی اور معاشرتی زندگی کا تذکرہ کیا ہے اور وہاں کی تہذیب وتمدن کو الفاظ کا قالب پہنایا ہے۔امریکی سماج ومعاشرہ کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ برائیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔اسی طرح ان کی تہذیب سے مشرقی ممالک اور وہاں کے باشندوں کے متاثر ہونے کا ذکر لطیف پیرایہ میں بیان کیا ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کتاب کے آخری صفحات اس سفر کا ماحصل ہیں کہ ان صفحات میں وہاں کی تہذیب وتمدن، اخلاقی اور سماجی برائیوں کا ذکر بہت واضح الفاظ میں کیا گیا ہے کہ اگر ہماری آنکھیں مغربی تہذیب کی چکاچوند سے متاثر نہ ہوں تو اس سماج ومعاشرہ میں ایک حساس انسان کا دم گھٹ سکتا ہے۔امریکی معاشرہ کی تصویر کشی کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

-امریکہ میں ہر کام اجرت پر ہوتا ہے، یہاں اخلاق، مروت،

شرافت جیسے کسی لفظ کے معنی میں مفت کام شامل نہیں ہے.....ہاں صرف زبانی خوش اخلاقی مفت ہے اور اس میں یہاں بخل نہیں ہے، اس میں امریکہ انگلستان سے بہت فائق ہے کیونکہ انگلستان والے تو شاید زبانی اخلاق برتنے کو بھی یہ سمجھتے ہیں کہ ان کی جیب سے کچھ گیا۔ (ص۴۰-۴۱)

-امریکہ میں ٹپ یعنی کام کرنے والے کو انعام دینے کا بہت رواج ہے۔اس کا ریٹ یا مقدار بھی مقرر ہے جس کا التزام کرنا پڑتا ہے۔ (ص۴۱)

-صنعتی پیداوار اور مادی طاقت سے زندگی کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور انسان کو جسمانی محنت سے بڑی حد تک مستغنی بنایا گیا ہے۔اکثر کام بٹن دبا کر انجام دیے جاتے ہیں، بس پیسے ہونے چاہئیں۔ (ص۶۷)

-ہوٹل کے ماحول کا یہ حال تھا کہ سروس کے لیے سب لڑکیاں جن کے لباس میں توجہ مبذول کرانے کی رعایت رکھی گئی تھی۔ (ص۸۸)

-ہیاٹ ہوٹل میں دعوت کا نظم تھا.....ہوٹل کے نچلے حصہ میں استقبال کا انتظام تھا، لوگ برابر آرہے تھے، آزادانہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری تھا، آنے والے عورت، مرد محتاط کم، غیر محتاط زیادہ لوگ تھے۔لباس اور وضع کے لحاظ سے نیز ملنے ملانے میں بے باکی کے مناظر تصدیق کر رہے تھے کہ ہم یقیناً امریہ میں ہیں۔(۱۶۹)

- یہ کالے لوگ اپنی بساط اور مذاق کے مطابق اور گورے لوگ اپنے معیار کی حرکتیں کرتے ہیں اور سب امریکی بلکہ مغربی تہذیب کے تربیت یافتہ ہیں۔اس مغربی تہذیب کی تربیت ٹیلی ویژن اور سنیما اور اخبارات کے ذریعہ ہوتی ہے۔یہ تربیت اب ہمارے مشرقی ملک بھی خوب حاصل کرنے لگے ہیں چنانچہ مشرقی قوموں کے نوجوان مغربی قوموں کے نوجوانوں کے برابر نہ سہی، شاگرد تو ہو ہی گئے ہیں۔(۳۱۹)

-جنسی زندگی کا بگاڑ اور بے محابا آزادی اور ان کے مہیب نتائج جن کی گذشتہ صفحات میں بعض مثالیں دی گئی ہیں، دوسری طرف فریب، چوری، زوردستی اور مار دھاڑ یہ سب موجودہ امریکی زندگی کا فیشن بنتا جارہا ہے۔جب ٹیلی ویژن کی عکاسیاں اور اخبارات کی خبریں، جنسی واقعات، قتل اور مار دھاڑ کے حوادث دکھاتی ہوں اور دوسری طرف مال ومتاع کی ہوس پوری طرح چھائی ہوئی ہو اور مذہب کی طاقت جو دنیا کی محبت کم کرتی ہے، موجود نہ ہو تو بلاشبہ وہی نتائج سامنے آنے چاہئیں جن کی واضح علامتیں امریکی زندگی میں نظر آرہی ہیں اور اس کا بڑا میدان ملک کے زیادہ ترقی یافتہ حصے بن رہے ہیں۔امریکی ذہن ایک طرف جنسی بے راہ روی کے خطرناک نتائج سے پریشان ہونے لگا ہے، دوسری طرف قتل اور لوٹ مار سے گھبرایا ہوا ہے کیونکہ وہاں گھومنے پھرنے والے آدمی کو یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس وقت کوئی قاتل ہاتھ اس کو نشانہ بنائے گا۔ (ص۳۲۰-۳۲۱)

-سوئمنگ پولوں (غسل کے حوض) یا بیچ (ساحلوں) پر تو جانوروں جیسی بے لباسی و بے تکلفی عام ہے۔ماؤں کو اپنے بچوں کی موجودگی سے بھی شرم نہیں اور لڑکیوں کو اپنے والدین کی موجودگی کی پرواہ نہیں بلکہ ماں باپ اپنے لڑکوں کے لیے یہی آداب مناسب سمجھتے ہیں۔وہ اپنی نوخیز اولاد کے لیے سن کے فرق کے ساتھ آپس کی دوستیوں کو ضروری اور مصلحت کے قرین سمجھتے ہیں، ایسا نہ ہونے پر ان کو تشویش ہوتی ہے۔(ص۳۳۳)

-امریکی حکومت اور امریکی صنعتی وتجارتی اداروں کی طرف سے علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کی بڑی سرپرستی ہوتی ہے اور یونیورسٹیوں کو مالی سہولتیں دی جاتی ہیں کہ وہ اپنے یہاں کے مفید تحقیقی کام کرنے والے اساتذہ وطلبہ کی ہمت افزائی ومدد کریں، اس سلسلہ میں کوتاہی یا بخل نہیں کیا جاتا اسی لیے امریکہ میں برابر تحقیقات وایجادات کے میدان میں نئے نتائج سامنے آتے رہتے ہیں۔ان نتائج سے وہ اپنے تمدن اور وسائل زندگی میں مزید ترقی اور بہتری پیدا کرتے رہتے ہیں۔(ص۳۴۲)

-کالج ویونیورسٹی کی کلاسوں میں تعلیم کا طریقہ سیمینار کے طرز کا ہے۔اساتذہ طلبہ پر ہی تیاری اور مطالعہ کا بوجھ ڈالتے ہیں اور خود صرف ان کی رہنمائی اور نگرانی کرتے ہیں۔ان کو اپنی اس رہنمائی اور نگرانی کے لیے خود بھی بہت تیاری کرنا ہوتی ہے نیز اپنے علمی مقام کو یونیورسٹی وکالج کی نظر میں برقرار رکھنے یا بڑھتا ہوا ثابت کرنے کے لیے مسلسل تازہ مطالعہ کرتے رہنا پڑتا ہے۔ان کی یہی فکر ومحنت یونیورسٹی کے رکارڈ میں ان کی تنخواہ وعہدہ کی ترقیات کی بنیاد بنتی ہے نہ کہ وقت کا امتداد جیسا کہ ہمارے برصغیر کا مزاج بن گیا ہے کہ استاد خواہ کچھ بھی ترقی نہ کررہا ہو اس کو محض وقت اور انتظامی ضابطہ کی بنا پر ترقی ملتی رہتی ہے حتی کہ وہ باوجود علمی ترقی سے حروم ہوے کے نہ صرف اپنی یونیورسٹی میں بلکہ سارے ملک میں ایک عظیم عالم کا مقام حاصل کرلیتا ہے۔(۳۴۳-۳۴۴)

محترم عبدالہادی اعظمی ندوی کی مرتبہ فہرست کتب کے مطابق اس سفر نامہ کے دوایڈیشن مجلس تحقیقات ونشریات واسلام دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے بالترتیب ۱۳۹۸ھ/ ۱۹۷۸ء اور ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئے۔پہلا ایڈیشن ۳۶۸ رصفحات پر اور دوسرا ایڈیشن ۴۰۸ رصفحات پر مشتمل ہے۔

سمرقند وبخارا کی بازیافت:

یہ سفر نامہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمہ کے ''سفر روسی ترکستان'' کی روداد ہے جسے استاد گرامیؒ کے قلم گہربار نے الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔مذکورہ بالا سفر کی روداد اتنی حسین وجمیل تھی کہ اس کا پہلا ایڈیشن بہت جلد ختم ہوگیا اور دوسرے ایڈیشن کی نوبت آ پہنچی۔اردو میں کسی کتاب کے دوسرے ایڈیشن کے منظر عام پر آنا اس کی مقبولیت کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔

مولانا علیہ الرحمہ نے اپنے پیش لفظ میں اس سفر کے پس منظر کو بیان کرتے ہوئے سمرقند وبخارا کی زیارت کی خواہش اور اپنی دلچسپی کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:''سمرقند وبخارا کا نام جس طرح تاریخ اسلام کے ہر مطالعہ کرنے والے کی نظروں کے سامنے چمکتا ہوا نظر آتا رہا ہے، میری نظروں میں بھی اس کی چمک دمک آتی رہی ہے چنانچہ اس کی سرزمین کو بلکہ اس کے بسنے والے لوگوں کو جو وہاں کی عظیم شخصیتوں کے فرزند ہیں، دیکھنے اور ان سے ملنے کا اشتیاق مجھ کو بھی رہا ہے۔''(ص ۵)

سمرقند وبخارا کی زیارت کے تئیں اپنی خواہش کا ذکر کرتے مولانا علیہ الرحمہ نے اس سفر اور سفر نامہ کا پس منظر بھی بیان کیا ہے کہ''روس کے آہنی شکنجہ کی وجہ سے سمرقند وبخارا جانا صرف ایک خواب تھا لیکن سویت یونین کی ٹوٹ پھوٹ کی وجہ سے اس خواب کی تعبیر کے امکانات پیدا ہوگئے اور وہاں کے اسفار کیے جانے لگے۔اتفاق سے آکسفورڈ اسلامک سینٹر، لندن کی زیرنگرانی امام بخاری علیہ الرحمہ کی یاد میں ایک علمی ادارہ اور مسجد کی تاسیس کا پروگرام سامنے آیا۔ازبکستان حکومت نے بخارا سے تین سوکلومیٹر کے فاصلہ پر موجود سمرقند میں اس ادارہ کے قیام کی اجازت دی۔سمرقند کے انتخاب کی وجہ وہاں امام بخاری علیہ الرحمہ کے مرقد موجود ہونا تھا۔اسی پروگرام کے ضمن میں ایک سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمہ کی شرکت اس لیے ناگزیر تھی کہ وہ آکسفورڈ اسلامک سینٹر کے صدر تھے لہٰذا اس سفر میں ان کی رفاقت کے نتیجہ میں ایک دیرینہ خواب کی تعبیر سامنے آسکی۔اس تعبیر کو الفاظ جامہ پہنادیا گیا جو'تعمیر حیات' کے صفحات کی زینت بنتے رہے اور محبین ومشفقین کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے اسے کتابی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔''(ص ۵-۶)

یہ سفر ایک مخصوص پس منظر میں کیا گیا تھا لہذا اس کی روداد بھی اس پس منظر کے اردگرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے۔سفر نامہ کی ابتداء ترکستان اور ماوراء النہر کے درمیان پائے جانے والے دو عظیم اسلامی شہر'سمرقند' اور'بخارا' کے تعارف سے ہوتی ہے کہ اول الذکر' حکومت وسلطنت' کے حوالہ سے اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے تو مؤخر الذکر'علم ودین' کے حوالہ سے اسلامی تاریخ کا ایک ایسا نمایاں شہر ہے جہاں سے علم حدیث کے سب سے بڑے اور مستند عالم کا نام نامی جڑا ہوا ہے۔مولانا علیہ الرحمہ نے ان کی قدیم جغرافیائی کیفیت

کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ قدیم جغرافیہ کے مطابق سمرقند و بخارا کا علاقہ ترکستان کے دو مشہور دریاؤں -سیحون اور جیحون- کے درمیانی منطقہ میں واقع ہے جسے نئی سیاسی تقسیم کے مطابق 'ازبکستان' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔اس نئی سیاسی تقسیم کی مناسبت سے غالباً اس سفرنامہ کا نام ''سمرقند و بخارا کی بازیافت'' رکھا گیا ہے کہ نئی نسل اس بات سے واقف ہو سکے کہ ان کے آباء واجداد کے مشہور علاقوں کا کیا نام تھا اور اب انھیں کس نام سے پکارا جارہا ہے۔

استادِ گرامی قدر نے اس سفرنامہ میں قدیم زمانہ کے سمرقند و بخارا کے جغرافیہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ازبکستان کی وادی فرغانہ وسغد، دریائے سیحون وجیحون اور اس کی زرخیزی اور پیداواری کیفیت، وہاں کے صحرائی علاقے، ازبکستان کی قومی خصوصیات کے ساتھ ساتھ اس کے جنوب میں واقع مقامات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

سفرنامہ کے مرکزی علاقہ کے حوالہ سے بیان کردہ جغرافیہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا علیہ الرحمہ کو علم جغرافیہ سے کتنی دلچسپی تھی لہذا انھوں نے اس علاقہ کی مکمل جغرافیائی تصویر کشی کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اس منطقہ میں پائے جانے والے مقامات کی وجہ تسمیہ بھی بیان کی ہے جس سے قاری کو اس علاقہ کے جغرافیہ اور تہذیبی وتمدنی تاریخ کو سمجھنے میں کافی آسانی ہوجاتی ہے۔ممالک کے قدیم وجدید جغرافیہ پر ان کی دسترس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں: ''پورے ترکستان کا وسطی علاقہ ازبکستان ہے اور اس کے جنوبی اور مغربی جانب ترکمانستان واقع ہے۔اس کے اور ازبکستان کے درمیان دریائے جیحون بہتا ہے۔دریائے جیحون کے جنوب میں واقع تمام علاقوں کو بشمول ترکمانستان قدیم عہد میں خراسان کے نام سے موسوم کرتے تھے۔اب یہ سب ترکستانی علاقے وہاں آباد تاتاری نسلوں کے نام سے پانچ چھ حصوں بلکہ ملکوں میں تقسیم ہیں اور وسط ایشیاء اور روسی یا چینی ترکستان کے نام سے پہچانے جاتے ہیں۔'' (ص ۱۶)

ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں: ''روسی ترکستان کے مشرق میں چینی ترکستان ہے۔ترکستان کے اس چینی حصہ سے ازبکستان کی مشرقی سرحد قریب ہے۔ترکستان کا پورا علاقہ وسط ایشیاء اور مقامی آبادی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔یہ علاقہ ایک صدی سے زیادہ مدت سے روس کے دباؤ میں اور ۷۵ رسال سے کمیونسٹ روس کے باقاعدہ جابرانہ اقتدار میں رہے ہیں۔ان کو روسی ترکستان اس بنیاد پر کہا گیا ہے کہ ترکستانی علاقوں کا مشرقی جزء چین کے قبضہ میں ہے جو چینی ترکستان اور سنکیاگ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔'' (ص ۲۲)

مذکورہ بالا وضاحت سے سفرنامہ کے اندرونی سرورق پر مذکور عبارت ''مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی مدظلہ کے سفر روسی ترکستان کی معلومات افزا روداد'' کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے کہ اس سفرنامہ میں کس علاقہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔

سفرنامہ کے مرکزی علاقہ کے جغرافیائی کیفیت کو بیان کرنے کے بعد 'وجہ سفر' کا ذکر کیا گیا ہے کہ آکسفورڈ کے اسلامی سینٹر نے ۱۹۹۵ء میں امام بخاریؒ کی آخری آرام گاہ 'سمرقند' میں بطور 'امام بخاریؒ کی یادگار' ایک بڑی درس گاہ اور ایک مسجد کی تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے دیگر پروگرام کے ساتھ ایک سیمینار بھی منعقد کیا گیا تھا جس میں شرکت اس سفر کا سبب بن گیا تھا۔مولانا علیہ الرحمہ نے دہلی سے تاشقند اور تاشقند سے سمرقند پہنچنے کی روداد کو مختصر انداز میں بیان کیا ہے۔اس روداد نگاری میں بھی ان کے اندر موجود جغرافیہ داں بھی مسلسل جاگتا رہا ہے اور اس علاقہ کی جغرافیائی کیفیت کو اجاگر کرتا ہوا چلا گیا ہے۔

سیمینار کی افتتاحی تقریب، اس میں مختلف ممالک سے شریک ہونے والی شخصیات، مسجد اور درسگاہ منظور شدہ نقشہ کے ساتھ ساتھ اس کی اور دیگر نقشہائے جات تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔خاص طور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی علیہ الرحمہ کی افتتاحی اور اختتامی تقریر کا ذکر کیا گیا ہے جس میں اس منصوبہ کی اہمیت، نوعیت اور مقصد پر روشنی ڈالی گئی تھی۔

سیمینار کی مختصر روداد بیان کرنے کے بعد شہر سمرقند سے تقریباً

تیس کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ''خرتنگ'' نامی مقام کی زیارت کا ذکر کیا گیا جس کا انتخاب امام بخاریؒ کی یادگار کو قائم کرنے کے لیے کیا گیا تھا اور یہ انتخاب امام بخاریؒ کے جائے مدفن ہونے کی وجہ سے کیا گیا تھا۔ضمنا امام بخاریؒ اور ان کے علم وفضل کا ذکر بہت ہی مختصر انداز میں کیا گیا ہے۔اس کے بعد سمرقند و بخارا کا ذکر شروع ہوتا ہے گویا سفر نامہ کی ابتداء ہوتی ہے۔

سب سے پہلے سمرقند و بخارا کے جغرافیہ،ان کی علمی، دینی اور تہذیبی وتمدنی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ضمنا تاشقند، وادی فرغانہ،ازبکستان، خراسان، خوارزم، علاقۂ ماوراء النہر کی تاریخی، علمی ودینی اہمیت اور ان علاقوں کی مشہور شخصیات، وہاں کے علمی اداروں اور مساجد کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔مذکورہ بالا مقامات کے حوالہ سے مذکور تفصیلات سے یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ان علاقوں کی زیارت نہیں کی گئی تھی اور ان کا ذکر محض اس علاقہ کی دینی، مذہبی، علمی اور تمدنی تاریخ کا ذکر کرنے کی خاطر کیا گیا ہے تا کہ سمرقند و بخارا کی اہمیت کا اندازہ ہو سکے۔

مذکورہ بالا علاقوں کی علمی، مذہبی اور تمدنی حالات کا مختصرا ذکر کرنے کے بعد کے تمدنی وسیاسی زوال کا نوحہ کیا گیا ہے بعد ازیں روسی تسلط اور اس کی مذہب دشمنی پر مبنی کاروائیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے مسافر کا قلم یوں اشکبار ہو گیا:

''مذہب سے کسی طرح کا تعلق رکھنا سخت قابل سزا جرم قرار دیا، اکثر مذہبی مقامات کو ختم کر دیا گیا چنانچہ بے شمار مسجدوں کو منہدم کر دیا گیا اور ان میں سے ایک تعداد کو دوسرے مقاصد وضرورتوں کے لیے استعمال میں دے دیا گیا، اذانیں موقوف کر دی گئیں اور مذہبی تعلق سے یکسر روک دیا گیا، مذہبی جگہوں پر جانا یا مذہبی تعلیم دینا یا مذہبی وعظ ونصیحت کرنا حتی کہ مذہب کے بنیادی رسوم ادا کرنا مثلا نکاح شرعی، عقیقہ، نماز جنازہ سب منع کر دیا گیا اور قابل سزا جرم قرار دیا گیا۔ خلاف ورزی کرنے والوں کی ایک تعداد قتل کر دی گئی، ایک تعداد جیل کی سلاخوں کے پیچھے کر دی گئی نتیجتا حالات بہت بدل گئے۔اس طرح اس پورے علاقے سے مذہبی زندگی کے آثار مٹ گئے سوائے چند مسجدوں کے اور ایک آدھ مدرسے کے جن کو بیرونی دنیا کو دکھانے اور اپنی ظالمانہ روش کو چھپانے کے لیے باقی رکھا گیا اور چند علماء کو بحیثیت علماء جھوٹے اظہار کے لیے علماء کی شکل میں باقی رکھا گیا۔

مذہب کو مٹانے کے لیے بار بار سرکلر جاری کیے جاتے تھے، مزید یہ کہ الحاد کے فروغ کے لیے ایک انجمن تشکیل دی گئی تھی جو مختلف مقامات کا جائزہ لیتی اور حسب ضرورت پروپیگنڈہ اور دیگر تدابیر کے ذریعہ مذہب سے تعلق کے ہر نشان کو مٹانے کی تدبیر کرتی۔اس سب کے نتیجہ میں یہ علاقہ جو مدت سے مذہبی علوم کا مرکز اور مذہب سے تعلق کا مظہر تھا اور مذہب کا گہوارہ بن گیا تھا، اس ظالمانہ وقاہرانہ روش کا شکار ہوا۔زار روس کے استبداد پھر کمیونسٹ روس کی ظالمانہ وروش سے جو اس علاقہ کا ثقافتی ومذہبی نقصان ہوا اور سیاسی سطح پر ان ترکستانی مسلمانوں کو ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں جو جانی نقصان ہوا، برداشت کرنا پڑا اس کی داستان بڑی دلخراش ہے۔''

(ص ۴۱-۴۳)

مسافر سمرقند و بخارا نے ''دلخراش داستان'' کو اپنے قلم سے رقم کرنے کے بجائے پاکستانی دانشور ڈاکٹر اعجاز گیلانی کی اس روداد سفر کا سہارا لیا ہے، جب وہ رمضان ۱۴۰۰ھ/ جولائی اگست ۱۹۸۰ء میں ایک کانفرنس میں شرکت کے لیے روس گئے تھے اور ان کے حاصل سفر کو لندن کے پندرہ روزہ جریدہ ''امپیکٹ'' نے شائع کیا تھا، اس روداد کا ملخص ترجمہ ۷/اکتوبر ۱۹۸۰ء کے ''جسارت'' کراچی میں شائع ہوا تھا۔کتاب میں مذکور اس طویل اقتباس سے اسلام اور مساجد جیسے اسلامی شعار سے جس طرح کھلواڑ کیا گیا تھا اس کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔(تفصیل کے لیے دیکھیے: ص ۴۳-۴۷)

ڈاکٹر گیلانی کے طویل اقتباس کے بعد ایک بار پھر اس علاقہ میں اسلام کی آمد اور وہاں کی علمی، مذہبی، دینی اور تمدنی وثقافتی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے وہاں اسلام کے روبہ زوال ہونے اور آخر ایک دن بالکل تقریبا ختم ہو جانے کا ذکر کرتے ہوئے رقم کیا گیا ہے کہ

’’۷۵؍سال کی اس سفاکانہ مدت میں یہاں کے مسلمانوں کی تقریبا تین نسلیں گذریں،ان میں دوسری یا تیسری نسل اپنے شاندار علمی ورثہ اور عظیم ماضی سے بالکل ناواقف تیار ہوئی۔اس کو صرف یہ کہ وہ مسلمان خاندان سے ہے،تقریبا اور کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔‘‘(ص۴۹)

اس صورت حال کے پیدا ہونے کے سبب کو بھی بیان کیا گیا ہے کہ ’’عربی زبان ممنوع کردی گئی اور مقامی قومی زبان کا رسم الخط بدلا جاچکا تھااس لیے ماضی سے نئی نسل کا معلوماتی تعلق بھی قائم نہیں ہوسکتا تھا۔‘‘(ص۴۹)

عہد رفتہ کے سمرقند و بخارا میں مقیم مسلمانوں کی حالت زار کو وہاں سے نکلے ہوئے ایک عالم کی نے تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے جسے استاد محترم علیہ الرحمہ نے کتاب کا حصہ بنا دیا ہے۔اس طویل اقتباس نے کتاب کی معنوی حیثیت بڑھا دی ہے کہ اس سے وہاں کی مسلم آبادی کی مجموعی تعداد کا اندازہ ہوتا ہے،ان پر کئے جانے والے ظلم وستم کی ایک بھیانک تصویر سامنے آتی ہے اور اصل سے رشتہ کٹ جانے کی وجہ سے صرف نام کے مسلمان رہ جانے یا کسی مسلم خانوادہ سے ہونے کا پتہ چلتا ہے۔

(تفصیل کے لیے دیکھیے :ص۴۹-۵۳)

اس سفرنامہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں صرف ماضی کا نوحہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ حال کا بھی ’’حال‘‘ بیان کیا گیا ہے کہ اتنے ظلم وستم اور اسلام اور اس کے آثار کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی باوجود وہاں نہ اسلام باقی رہا بلکہ دھیرے دھیرے پروان بھی چڑھتا رہا حتی کہ ایک دن ایسا آگیا کہ اسلام ایک بار پھر وہ ایک ’’مذہب‘‘ کے زندہ ہوگیا اور اسلامی شعار وغیرہ پر عمل کرنا آسان ہوگیا اور وہاں کے باشندوں کو ہر قسم کی مذہبی آزادی کا پروانہ مل گیا۔

مولانا علیہ الرحمہ نے قانون فطرت کے مطابق روس کے عروج کے بعد زوال پذیر ہونے اور مسلم علاقوں کا ان کے تسلط سے آزاد ہونے کا مختصرا ذکر کرتے ہوئے وہاں کی موجودہ صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے کہ ’’یہاں (سمرقند و بخارا کے درمیان پڑنے والے کسی قصبہ) کے باشندے محنتی، سادہ مزاج اور متوسط حالات یا اس سے کم کی زندگی گذارنے والے ہیں۔۷۵؍سالہ سخت گیر کمیونسٹ اقتدار نے ان میں خوش حالی کا معیار نہیں بننے دیا، بے تکلف اور آزادانہ گفتگو میں قدرے احتیاط اور قدرے کم آمیزی دیکھی۔‘‘

(ص۵۴-۵۵)

موجودہ باشندوں کے طرز لباس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ’’ان کا لباس اور ان کی ثقافت ہند وپاک کے مسلمانوں کے لباس وثقافت سے کسی حد تک ملتا جلتا نظر آیا۔پرانی وضع کے لوگوں میں ہندوستانی مسلمانوں کے کرتے، پاجامے اور شیروانی سے قریب قسم کا لباس دیکھا،عورتوں کا کرتا، پائجامہ ہندوپاک کی مسلمان عورتوں کے کرتے وشلوار سے قریب معلوم ہوااور یہ تعجب کی بات نہیں کیونکہ ہندوستان پر صدیوں حکومت کرنے والا مغل خاندان اسی علاقہ سے تعلق رکھتا تھا اور ہندوپاک کے مسلمانوں کی تہذیب وتمدن ان سے خاصا ماخوذ ہے۔البتہ ترکستان کا یہ لباس وہاں کے اسلامی طریقہ کو پسند کرنے والوں کا ہے ورنہ اکثر وبیشتر یورپین لباس ہی استعمال ہوتا ہے۔‘‘

(ص۵۵)

عہد رفتہ کے ’’سمرقند و بخارا‘‘ (موجودہ ترکستان) کی تہذیب وثقافت کے ضمن میں استاد گرامی قدرؒ نے ترکستانی زبان اور اس پر روسی زبان کے اثرات،علاقائی حالات وخصوصیات،بعض مشترک الفاظ اور ان کے مطالب،روسی رسم الخط کے اثرات،خاص روسی صوبوں میں مسلم آبادیاں، مذہبی طور وطریق،نسلی تقسیم وعصبیت،روسی دباؤ کے اثرات،اس علاقہ میں بولی جانے والی ملکی وغیر ملکی زبانیں، عہدۂ مفتی،ادارۂ دینیہ،دینی تعلیم ودعوت کا کام اور وادیٔ فرغانہ کا ماحول،اقتصادی وانتظامی کیفیت،کھانے کا ذوق وطرز،تمدنی حالت، مزارات ومقبرے،روس کی اقتصادی ناکامی اور ترکستان پر اس کا اثر، سیاسی ابتری اور علاقائی تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے تاتاری قوم کے ماضی وحال کا مختصرا مرقع اور عروج وزوال کی تاریخ سے سبق لینے کو اچھے

اسلوب میں بیان کیا ہے۔

استاد گرامی قدر علیہ الرحمہ کا یہ سفر نامہ موجودہ ترکستان کی دینی، تہذیبی اور تمدنی صورت حال کو اچھے اسلوب میں پیش کرتا ہے اور قاری کو وہاں کی صورت حال سے باخبر کرتا ہے۔ مولانا علیہ الرحمہ کے اسلوب نگارش کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں:

سمرقند و بخارا کے محل وقوع کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''سمرقند و بخارا ترکستان وماوراء النہر کے درمیان واقع وہ دو عظیم تاریخ شہر ہیں جن سے مسلمانوں کے تمدن وعظمت کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ سمرقند حکومت وسلطنت کے میدان میں اور بخارا علم ودین کے میدان میں عظیم تاریخ رکھتے ہیں۔ یہ دونوں شہر تاتاری نسل کے وسیع علاقہ کے وسطی منطقہ میں واقع ہیں۔ یہ منطقہ ترکستان کے دو مشہور دریاؤں سیحوں وجیحون کا درمیانی منطقہ ہے۔ اس درمیانی منطقہ کو اب نئی سیاسی تقسیم میں ازبکستان کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پہلے یہ اور اس کے اردگرد کے علاقے کو سمرقند و بخارا کے نام سے اور جنوبی دریا جیحون کے شمال میں واقع ہونے کی وجہ سے ماوراء النہر سے موسوم کیا جاتا تھا۔ چونکہ سارا علاقہ ترک تاتاری نسلوں کا ہے اسی لیے اس کو ترکستان کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ اس کا مشرقی بازو جو شمالی دریا سیحون کے مشرقی کناروں پر ہے وادیٔ فرغانہ کے نام سے موسوم ہے اور دریا کے دونوں طرف اہم شہروں اور شاداب زمینوں پر مشتمل ہے۔ اس کا وسطی حصہ بالخصوص سمرقند و بخارا کا منطقہ سغد کہلاتا ہے اور اس کا مغربی بازو خوارزم (خیوہ) کے نام سے موسوم رہا ہے۔ ترکستان کے یہ تینوں علاقے بے شمار اہم وتاریخی مقامات پر مشتمل رہے ہیں جن کی طرف اسلامی تاریخ کی بلند پایہ شخصیتوں کی ایک قابل ذکر تعداد منسوب ہے۔'' (ص ۱۵-۱۶)

وادی فرغانہ کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ''یہی وادیٔ فرغانہ ہے تیمور و بابر کا وطن تھا۔ تیمور اسی وادی کے شہر اندجان میں پیدا ہوا تھا، بابر بادشاہ نے یہیں سے ہندوستان کا رخ کیا تھا اور اپنی نسل سے برصغیر ہندو پاک میں حکمرانوں کا ایک سلسلہ چھوڑا جن کی غدر ۱۸۵۷ء تک اسی ملک میں حکمرانی رہی۔ یہ خاندان قائدانہ صلاحیتوں اور مزاج کا حامل رہا ہے اور اس نے برصغیر میں طویل المدت حکومت کی، اس نے یہاں کی اکثریت سے مذہبی رواداری کے ساتھ معاملہ رکھا اور پورے ملک پر گہرے ثقافتی وتمدنی اثرات چھوڑے۔ ان اثرات سے ازبکستان کی ثقافت وتمدن کیساتھ مختلف شکلوں میں برصغیر کی مسلم ثقافت کی ایک حد تک یگانگت ہے۔ تعمیری فن میں اس کا اثر ملتا ہے، تاج محل کا نمونہ سامنے ہے۔ اس کے بڑے معمار ترکستان سے ہی آئے تھے۔''

مدرسہ الغ بیگ کے بانی اور مدرسہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: ''سمرقند میں تیموری خاندان کے عظیم حاکم سلطان الغ بیگ (جو تیمور لنگ کے پوتے تھے اور علم فلکیات کے ماہر اور علوم پر حاوی تھے) کی عظیم الشان وسیع اور متعدد عمارتوں پر مشتمل درس گاہ ہے جو اپنے نادر وشاندار نقش ونگار کے ساتھ اب بھی پروقار وحسین جامعہ معلوم ہوتی ہے، اب غیر آباد ہے۔'' (ص ۳۱)

ترکستان کے فن تعمیرات کا ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھا ہے: ''اس علاقہ کی پرانی یادگار عمارتوں پر نہایت خوبصورت ڈیزائن کے رنگین نقش ونگار دیکھے جو صدیاں گزرنے پر بھی قائم ہیں اور بعض اب بھی جدید معلوم ہوتے ہیں۔ یہ عمارتی نقش ونگار ترکستانی تعمیری فن کا خاص حصہ ہیں۔ وہاں کی تعمیر میں لکڑی کا استعمال خاصا ہے۔ مسجدوں میں جو پرانے طریقہ سے تعمیر شدہ ہیں عموماً ستون لکڑی کے اور ڈیزائن کے ساتھ تراشے ہوئے دیکھے۔'' (ص ۳۳)

مسلمانوں کے عروج وزوال کی تاریخ سے سبق لینے کا سبق ان الفاظ میں پڑھایا گیا ہے جس پر اس سفرنامہ کا اختتام ہوتا ہے: ''گذشتہ تاریخ کی تین صدیاں مسلمانوں کے لیے بڑا سبق رکھتی ہیں۔ یہ ان کے باعروج سے قعر زوال تک پہنچنے کی المناک تاریخ پر مشتمل ہیں لیکن یہ اسی کے ساتھ ان کی اپنی کوتاہیوں، غفلتوں اور بے عملیوں کی رنج دہ داستان بھی ہیں جس سے مسلمانوں کو واقف ہونے کی اشد ضرورت ہے تاکہ وہ اپنا مستقبل درست کرنے اور اپنی کھوئی

ہوئی عظمت حاصل کرنے کی تدبیر صحیح لائنوں پر کرسکیں اور ایسے دشمنوں سے نبرد آزمائی کے محاذوں کو صحیح شکل میں مضبوط کرسکیں۔"

(ص۸۶)

اسی ضمن میں مسلمانوں کی بے عملی کو ان الفاظ میں اجاگر کرتے ہوئے کچھ مشورے دیے گئے ہیں: "یورپ نے علم ومحنت سے کام لیا تو کفر ومذہب دشمنی کے [باوجود] دنیا کا قائد بن گیا۔ ہم سے علم وصحیح حکمت عملی سے لاپروائی ہوئی تو باوجود حق پر ہونے اور باوجود علم وتمدن کی موجودہ ترقیات کے اولیں رہبر ہونے کے ذلیل ورسوا ہیں۔ لیکن اب حالات کروٹ لینے کا اشارہ کررہے ہیں، یورپ اپنے تمدن کی صلاحیت پر ایمان کھوتا جارہا ہے، وہ اپنی صحت مندانہ ضرورتوں کے ساتھ اپنے قدیم مذہب کو سازگار نہیں سمجھ رہا ہے۔ اب اس کے سامنے اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب نہیں جو مداوا بنے لیکن ابھی اسلام کا تعارف کرانے والے کم ہیں، مسلمانوں کی عظمت رفتہ لوٹنے کا اصل ذریعہ ان کا آپسی اتحاد، صحت مندانہ ودانش مندانہ اور مخلصانہ جہد وعمل ہے۔ یہ خوبیاں جہاں جتنی ہوں گی انہی کے مطابق مستقبل میں سربلندی کی امیدیں قائم کی جاسکتی ہیں۔" (ص۸۸)

اس سفر نامہ کا عربی میں ترجمہ ہوچکا ہے۔ یہ ترجمہ محترم محمد یوسف صدیقی صاحب نے کیا ہے اور رابطہ ادب اسلامی عالمی لکھنؤ نے ۲۰۰۲ء میں اسے شائع کیا ہے۔

اس ترجمہ کی ابتدا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے اس مقالہ سے ہوتی ہے جو انہوں نے مذکورہ سیمینار میں پیش کیا تھا۔ اس مقالہ کی شمولیت کی وجہ سے ترجمہ کی اہمیت میں دوچند اضافہ ہوگیا ہے۔

شخصیات:

اس سفر نامہ میں متعدد شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے جن میں سے چند کا ذکر کیا جارہا ہے:

شیخ عبدالحکیم: مرغینان میں ایک بزرگ عالم شیخ عبدالحکیم رہتے ہیں جن کی عمر اسی سال سے اوپر ہوگی۔ علمی، دعوتی اور تقوی وپرہیز گاری کی زندگی گذارتے ہیں۔ ایک طرح سے وہاں کے استادالاساتذہ ہیں جو کمیونزم کے زور کے زمانہ میں بھی پوشیدہ طور پر دین وعلم کی شمع جلائے رکھے تھے۔ حضرت مولانا کا جب ان کے سامنے تذکرہ آیا تو بہت ہی اچھے اور اونچے تاثر کا اظہار کیا۔

(ص۶۴)

شیخ عبدالولی: ترکستان کے علاقوں میں کئی بار دعوتی سفروں میں جانے والے ہمارے ایک دوست سید غلام محمد جیلانی صاحب نے اپنی معلومات میں بتایا کہ جامع مسجد کے امام شیخ عبدالولی کمیونزم کے ظلم وبربریت کے زمانہ میں جب کہ دینی تعلیم پر سخت پابندی تھی، تقریباً ایک ہزار نوجوانوں کو قبرستان اور جنگلوں میں پوشیدہ طور عربی اور قرآن وحدیث کی تعلیم دی تھی۔ وہ اپنی باتوں کی وجہ سے حکومت کی نظر میں مشتبہ بلکہ معتوب ہیں۔ (ص۶۴-۶۵)

شیخ محمد رجب: خوقند شہر کی جامع مسجد کے امام وخطیب محمد رجب ہیں جو ندوہ کے طرز پر ایک مدرسہ قیام وطعام کے ساتھ چلا رہے ہیں جہاں حضرت مولانا کی قصص النبیین اور بعض دوسری کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ (ص۶۵)

مفتی یوسف صادق اور مفتی عبدالعزیز تاشقندی: ملک کے تاحال مفتی اعظم مفتی یوسف صادق کو اسی کشمکش (اسلام پسندی کو رواج دینے اور نہ دینے) کے نتیجہ میں اپنے منصب سے ہٹنا پڑا بلکہ ملک چھوڑ کر باہر چلا جانا پڑا۔ اب ان کی جگہ مفتی عبدالعزیز تاشقندی ہیں جو حکومت سے مصالحت کے ساتھ کام کررہے ہیں۔

خصوصیات:

جابجا قدیم وجدید جغرافیائی معلومات کا ذکر، جس سے قاری کو قدیم اسلامی مقامات کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے اور وہ ان مقامات کے موجودہ نام اور وہاں کی سماجی، سیاسی، علمی ومذہبی اور تہذیبی وتمدنی سے واقف ہوجاتا ہے۔

ماضی کے ساتھ ساتھ حال کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کی رعنائی وخوبصورتی میں تاریخی جھروکوں سے اضافہ کیا گیا ہے۔

استاد محترم نے اس سفر نامہ میں جابجا علمی دیانت داری کا ثبوت پیش کیا ہے کہ انھوں نے اپنی معلومات کے مصادر کا ذکر ہر جگہ کیا ہے۔

مشہور ترین مقامات کی رنگین تصاویر سے کتاب کو مزین کیا گیا ہے۔ ان تصاویر میں سمرقند میں پائے جانے والے مقبرہ حضرت قثم بن عباسؓ (شاہ زندہ)، مدرسہ الغ بیگ اور مقبرہ تیمور لنگ کے علاوہ

بخارا کے مشہور مدارس میں مدرسہ میر عرب اور مدرسہ کوش شامل ہیں۔

قدیم وجدید نقشہائے جات کو شامل سفرنامہ کیا گیا ہے۔

کسی موضوع کے ضمن میں دیگر معلومات کو ذکر کیا گیا ہے جیسے ''ملکی وغیر ملکی زبانیں'' کے تحت تاشقند میں پائے جانے والے مشرقی زبانوں کا مرکز کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہاں کے اساتذہ وطلباء سے مذکورہ سیمینار کے انتظامات کو سنبھالنے میں مدد لی گئی تھی۔اسی کے ضمن وہاں کے ''عہدۂ مفتی'' اور اس کے دائرۂ کار کے ساتھ ساتھ ادارۂ دینیہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔مؤخر الذکر ادارہ میں اس مصحف کی موجودگی کا ذکر کیا جاتا ہے جو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت زیر تلاوت تھا۔

نقائص:

سفرنامہ میں معلومات ،خاص طور علاقوں کے حوالہ سے معلومات کی تکرار پائی جاتی ہے جس سے قاری کہیں کہیں التباس کا شکار ہوجاتا ہے۔

کہیں کہیں معلومات کو ذکر کرنے کی ترتیب میں کچھ کمی سی محسوس ہوتی ہے جیسے ماضی کے بعد حال اور حال کے بعد پھر ماضی۔اس ترتیب کی وجہ سے قاری کبھی کبھی اس التباس میں پڑجاتا ہے کہ ہے یہ ماضی کی بات ہورہی ہے یا حال کی عکاسی کی جارہی ہے۔اس ضمن میں ''سیاسی ابتری اور علاقائی تقسیم'' اور ''تاتاری قوم قدیم وجدید کے آئینہ میں'' جیسے موضوعات کو بطور مثال مثال پیش کیا جاسکتا ہے۔

کہیں کہیں زبان وبیان کا اسلوب بھی کھٹکتا ہے۔ممکن ہے کہ وہ کتابت کی غلطیوں کا شاخسانہ ہو۔

محترم عبدالہادی اعظمی ندوی کی مرتبہ فہرست کتب کے مطابق اس سفرنامہ کے دو ایڈیشن مجلس تحقیقات ونشریات واسلام دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے بالترتیب ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۸ء اور ۱۴۳۴ھ/ ۲۰۱۳ء میں شائع ہوئے۔اس کا ایک ایڈیشن مکتبۂ حراء، لکھنؤ سے شائع ہوا تھا لیکن سنۂ اشاعت مذکور نہیں ہے۔اس سفرنامہ کا مقدمہ پروفیسر وصی احمد صدیقی صاحب نے اپنے مخصوص اسلوب میں لکھا ہے اور سفرنامہ کی خصوصیات کو اجاگر کیا ہے۔

انسانی فطرت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

''اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت بنائی ہے اور انسان کی فطرت بہت ہی متنوع قسم کے پہلو رکھتی ہے، انسان میں بہت متنوع قسم کی کیفیات ہوتی ہیں، خود انسان کے اندر تنہا جو کیفیات ہیں وہ بھی بہت متنوع اور بہت گہری ہیں اور بعض مرتبہ بالکل کھلی اور نمایاں ہوتی ہیں، جیسے: غصہ ہے وہ انسان کی کھلی ہوئی خصوصیت ہے، اس کو جو بات غصہ دلائے اس سے اس کو غصہ آتا ہے، اسی طرح رنج والی بات بھی انسان کی خصوصیت ہے، کوئی تکلیف دہ بات ہو تو انسان کو رنج ہوتا ہے، تو یہ انسان کی موٹی موٹی خصوصیات ہیں، لیکن باریک خصوصیات بھی ہوتی ہیں کہ کوئی بات سن کر انسان کی طبیعت بدمزا ہوجائے، یا کوئی بات سن کر طبیعت میں ایک انشراح پیدا ہوجائے، کوئی بات سن کر آدمی کو اندر سے یہ محسوس ہو کہ یہ بات تو ٹھیک کہہ رہے ہیں، سچی بات کہہ رہے ہیں، ہم اس کا کیسے انکار کریں، آدمی میں ایک صفت جو تکبر کی ہے، یعنی یہ کہ ہم اپنے برابر والے کی بات کیسے مان لیں، وہ تو بڑا ثابت ہوجائے گا، اس میں ہماری توہین ہے، بعض وقت آدمی اس لیے بھی بات نہیں مانتا کہ دوسرا بڑا ثابت ہوجائے گا، درحقیقت یہ انسان کے اندر کا ایک جذبہ ہوتا ہے اور بعض وقت بات کو اس لیے نہیں مانتا کہ اس کے دماغ میں ٹھیک سے نہیں اترتی، یا اس کے دل میں ٹھیک سے نہیں اترتی، کیونکہ دماغ ودل دونوں کا میدان الگ ہے، دماغ کا میدان اسباب کے لحاظ سے چلتا ہے اور دل کا مزاج ہے کہ وہ اسباب پر نہیں چلتا ہے، بلکہ اس کا دارومدار اندر کے احساس پر ہے۔'' (احتساب زندگی: ۱۱-۱۲)

ایک پرانا چراغ نہ رہا

مولانا ناصر سعید اکرمی ندوی
(ناظم معہد الامام حسن البنا بھٹکل)

مؤرخہ ۲۱؍رمضان ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ء بروز جمعرات امت مسلمہ ہندیہ کے لیے ایک المناک دن تھا، جس دن ہم سب کے رہبر ورہنما، مرشد ومربی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء-لکھنؤ) مختصر علالت کے بعد داغ مفارقت دے گئے۔إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون!

آپ کی وفات کی خبر جنگل کی آگ کی طرح ہندوستان بھر میں بلکہ پورے عالم اسلام میں پھیل گئی اور غم واندوہ کی ایک لہر دوڑ گئی، ہر عالم وفاضل، ہر عام وخاص، ہر چھوٹا بڑا، اداروں کے ذمہ داروں سے لے کر مدارس کے طلبہ ومہتمم، نظماء وارباب اقتدار بلکہ ملک کا چپہ چپہ حضرت کے فراق میں نڈھال اور اشک بار ہوگیا، سبھوں نے آپ کی جدائی سے قلبی تاثر لیا، سب نے خود کو تنہا تصور کیا، امت گویا یتیم ہوگئی، جس طرح ایک باپ گھر کا ذمہ دار ہوتا ہے، ہر طرح کے خیر اور بھلائی کا اس کو احساس ہوتا ہے، گھر کی ہر چیز اس کے پیش نظر رہتی ہے، بالکل اسی طرح ہمارے حضرت بھی ہر وقت اس فکر اور سوچ میں ڈوبے رہتے تھے کہ امت کا کیا ہوگا؟ ہندوستان کے مسلمانوں کا کیا ہوگا؟ ان کے دین وایمان کا کیا ہوگا؟ مدارس کا کیا ہوگا؟ مساجد کا کیا ہوگا؟ شریعت کا کیا ہوگا؟ پرسنل لا کا کیا ہوگا؟ جس طرح ایک باپ کے اندر خالص محبت اور اخلاص ہوتا ہے، اس میں کسی طرح کی ملاوٹ اور آمیزش نہیں ہوتی ہے، باپ اپنے بچوں کے کاموں میں اور ان کے مستقبل کے سنوارنے میں مخلص ہوتا ہے، بالکل اسی طرح ہمارے حضرت بھی امت کے لیے بلکہ امت کے ہر فرد کے لیے مخلص تھے، ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے تھے، گھلتے تھے، متفکر اور بے چین وبے کل رہتے تھے، ان کے لیل ونہار اس کے شاہد تھے، ان کی آنکھیں اس کی گواہی دیتی تھیں، ان کا جسم اس کے لیے گھل رہا تھا، "إن العین نائمة والقلب یقظان" بے شک آنکھ تو سوئی ہوتی ہے، لیکن دل بیدار ہے کی سی حضرت کی کیفیت رہتی تھی، آپ ہر وقت امت کے لیے بے چین اور متفکر رہتے تھے، اس کے لیے آپ نے کتنے ملکوں کی خاک چھانی، دور دراز کے اسفار طے کیے، دورے کیے، خط وکتابت کی، مضامین لکھے، یہ سب اس لیے کیا کہ امت میں بیداری آجائے، بے دینی دور ہوجائے، لوگوں میں دین آجائے، مسلمان اپنے تشخص کے ساتھ اسلام پر جئیں، اسلام پر مریں، ان کی شادی وبیاہ، رسم ورواج، لین دین، نکاح، طلاق، خلع، سب دینی احکامات کے ساتھ شریعت کے مطابق ہوں، مدارس محفوظ ہوں، خانقاہیں محفوظ ہوں، مساجد محفوظ ہوں، ان پر غیروں کی دست درازی نہ ہو، بری نگاہ نہ ہو، حضرت نے اپنی پوری زندگی اس کے لیے کھپادی، خود کو اس کے لیے گھلا دیا، زندگی کی آخری سانس تک اس کے لیے لگادی، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، اس کا بھرپور بدلہ دے۔آمین!

حضرت مولانا کے دنیا سے چل بسے ایک ماہ ہوگیا، ظاہر ہے رخصت ہونے والے رخصت ہوتے رہیں گے، دن مہینے اور سال گزرتے رہیں گے اور انسان بہت جلد سب کچھ بھول جاتا ہے، ذہنوں سے سب باتیں محو ہوجاتی ہیں، لیکن مولانا جیسی شخصیت بھلائے نہیں بھول سکتی، آپ کو زمانہ کبھی بھولے گا نہیں، لوگ ہمیشہ آپ کو یاد رکھیں گے، لیکن آپ کی یاد منانے سے زیادہ اہم بات یہ

ہے کہ ہم آپ کے مشن کو یاد رکھیں، آپ کے کاموں کو یاد رکھیں، آپ کے پیغام کو یاد رکھیں، دین کے لیے آپ کی کڑھن کو یاد رکھیں، پیام انسانیت کے لیے آپ کا کڑھنا اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنا یاد رکھیں، مسلم پرسنل لا کے لیے آپ کی بے چینی کو یاد رکھیں، صرف یاد ہی نہ رکھیں بلکہ آپ کے مشن کو پھیلانے کی فکریں اور منصوبے بنائیں، اس کے لیے جو تالیفات اور تصنیفات آپ نے اپنے پیچھے چھوڑی ہیں، ان کی نشر واشاعت میں حصہ لیں، ان کو آگے بڑھائیں، مختلف زبانوں میں ان کے ترجمے کریں، اس سے آپ کی روح کو تسکین ہو گی، آپ کو سکون ملے گا، جنت میں آپ کے درجات کے بڑھنے کا باعث بنے گا، آپ کے اجر وثواب میں اضافے کا باعث بنے گا، اسی طرح منکرات کے خلاف ہماری آوازیں بلند ہو رہی ہیں یا نہیں؟! ہندوستان کے مسلمانوں کے دین کی بقا وتحفظ کے لیے ہم کہاں تک آگے بڑھ رہے ہیں، مولانا مرحوم کے کاموں کی تکمیل کس طرح اور کیسے کر رہے ہیں، حضرت سے سچی محبت کی علامت ہی یہی ہے کہ ہم بھی اسی کام کے لیے کمر بستہ ہوں، جس کام کے لیے حضرت مرحوم نے اپنی زندگی لگادی، سچی محبت کا تقاضا بھی ہے کہ آپ کے ادھورے کام کو پورا کریں، آپ کے مشن کو آگے بڑھائیں۔

اب ہم سب اپنا اپنا جائزہ لیں کہ اب تک ہم نے آپ کے بعد کتنا کام کیا اور آگے کیا کیا منصوبے ہیں، ہم کو بھی حضرت کی طرح طاغوتی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہونا ہے، ان کے خلاف کمر کس لینا ہے، مسلم پرسنل لا کے خلاف ہر اٹھنے والی آواز کو دبانا ہے، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنی ہے، اب خاموش بیٹھنے کا وقت نہیں ہے، حضرت مولانا نے جو حکمت عملی اپنائی تھی، اس کو اپنانا ہے، جوش وجذبہ ہو لیکن ہوش کے ساتھ ہو، حکمت عملی اور سوجھ بوجھ بھی ہو، معاملہ فہمی بھی ہو، عقل بھی ہو، اگر خدانخواستہ ہم نے ایسا نہیں کیا، صرف حضرت سے محبت کا دم بھرتے رہے اور حضرت کی یاد میں دن، ہفتے، مہینے، سال مناتے رہے اور آپ کی یاد میں کتابیں شائع کرتے رہے، رسالوں کے خصوصی نمبرات نکالتے رہے تو یہ آپ سے سچی محبت کی علامت نہیں ہے۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا نے اپنا وہ واقعہ جو ان کے ساتھ پیش آیا تھا سنایا، وہ اب تک راقم کے ذہن میں محفوظ ہے، اس واقعہ میں ہم سب کے لیے بالخصوص آج کل کے نوجوان علماء کے لیے بڑا سبق ہے، واقعہ کچھ یوں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا نے جامعہ اسلامیہ بھٹکل میں اپنی آمد کے موقع پر اساتذہ کے درمیان گفتگو کرتے ہوئے اپنی نوجوانی کا ایک واقعہ سنایا کہ جب میں ندوہ سے نیا نیا فارغ ہو گیا تھا اور درجوں میں میرے گھنٹے لگے تھے، اس دوران لکھنؤ ہی کا ایک تعلیم یافتہ شخص میرے پاس آیا اور کہا کہ حضرت! میری ایک انگریزی کتاب ہے، اس کا اردو میں ترجمہ کرانا چاہتا ہوں تاکہ اردو داں طبقہ اس کتاب سے استفادہ کرے، اولاً تو میں نے ہامی بھر لی، پھر میں سوچنے لگا کہ انگریزی کی اصطلاحات کو سمجھنا پھر اس کو اردو کے قالب میں ڈھالنا یہ میرے لیے پہلا تجربہ ہے، ترجمہ کرنا میرے لیے مشکل ہوگا، ایسا کہہ کر میں کتاب کو واپس کر سکتا تھا، لیکن میرے دل نے کہا کہ کیوں نہ محنت کر کے ترجمہ کر ڈالوں، اس لیے میں نے وہ کتاب ان سے لے لی اور مکمل ایک ماہ اس کو پڑھنے اور اس کی اصطلاحات کو سمجھنے میں لگا دیا، اپنے اساتذہ سے رجوع ہوا، گرمی کا زمانہ تھا، رات گئے دیر تک محنت کرتا رہا، گرمی کی شدت کی وجہ سے پسینے سے شرابور ہو جاتا تھا، اس وقت کہاں ایرکنڈیشن، پنکھے بھی میسر نہیں تھے، لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری، محنت سے جی نہیں چرایا، انگریزی کی جملہ اصطلاحات کو اپنے ذہنوں میں انڈیل دیا اور کتاب کا مکمل ترجمہ کر کے صاحب کتاب کو واپس کر دیا، جوانی تھی، کوئی ۲۰-۲۲/سال کا نوجوان تھا، اگر میں اس وقت محنت سے جی چراتا تو وہ کام نہیں ہوتا اور مجھے انگریزی سے اچھی طرح سے واقفیت بھی نہ ہوتی، اس سے مجھے ذاتی طور پر بھی بہت فائدہ ہوا۔

اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد حضرت نے اساتذہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ اگر اس وقت محنت سے جی چراؤ گے تو پھر کبھی لائق فائق نہ بنو گے، محنت کرو گے تو کام کے بنو گے، خود کو بھی فائدہ

ہوگا اور طلبہ کو بھی فائدہ دو گے، حضرت کی یہ بات ہم علما کے لیے بالخصوص ان نوجوان علماء کے لیے قابل غور اور لائق عمل ہے جو محنت سے جی چراتے ہیں، پڑھنے پڑھانے میں محنت نہیں کرتے ہیں، کتابوں سے دور بھاگتے ہیں، اپنا زیادہ وقت خارجی مصروفیتوں اور سرگرمیوں میں لگاتے ہیں اور جو اصل کام ہے یعنی درس وتدریس میں محنت کرنا اس سے پہلو تہی اور غفلت برتتے ہیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت لائق فائق اساتذہ نہیں ملتے ، مدارس کے ذمہ داروں کو یہی شکایت ہوتی ہے کہ قابل اساتذہ نہیں مل رہے ہیں، اس لیے حضرت کا مذکورہ واقعہ ہم سب کے لیے ایک لائحہ عمل ہے، ہم بھی ابتدا میں اسباق میں خوب محنت کریں اور قوم وملت کے لیے کام کے آدمی بن کر نکلیں۔

راقم کا قریب ایک سال پہلے استاد محترم مولانا محمد صادق ندوی دامت برکاتہم کی معیت میں ندوہ جانا ہوا تھا، وہاں پانچ دن قیام رہا، حضرت کی مجلسوں میں بیٹھنے اور استفادہ کرنے کا خوب موقع ملا، اس وقت مولانا حمزہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا محمود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی بقید حیات تھے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا قرب نصیب ہوا، مہمان خانے میں ساتھ بیٹھ کر کھانے کے مواقع ملے، عصر کی مجلس میں برابر حاضری رہی، پند ونصائح سے اپنے دامن کو بھرتے رہے، عمر کے اس مرحلے میں پہنچنے کے باوجود حضرت کی یاد داشت اتنی قوی اور مضبوط تھی کہ آدمی سن کر عش عش کرے، ایک مرتبہ حضرت دنیا کی بے ثباتی اور فنائیت پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے بچپن میں پڑھے ہوئے وہ اشعار فرفر سنانے لگے جو اس وقت کے نوجوان طلبہ کو بھی یاد نہیں ہوں گے، فرمایا:

دنیاکم حبیبة
بحسنها و الطیبة
لکنها غدارة
خداعة غرارة
لیس لها حبیب
زوالها قریب

یہ اشعار سنانے لگے، راقم خود انگشت بدنداں رہ گیا، دل نے کہا کہ اس عمر میں پہنچنے کے باوجود حضرت کو بچپن میں پڑھے ہوئے یہ اشعار یاد ہیں۔ یا للعجب!

حضرت نے اخیر تک کئی اہم ذمہ داریاں سنبھالیں، ندوہ کی نظامت کی ذمہ داری، مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت، ان ذمہ داریوں کو خوب نبھایا اور حق ادا کر دیا۔ أللهم اغفر له وارحمه!

حضرت کو معاملہ فہمی، سوجھ بوجھ، دانائی و بینائی اور سب سے بڑھ کر حکمت عملی کا وافر حصہ ملا تھا، کس وقت کیا بولنا مفید رہے گا اور کس وقت سکوت اور خاموش رہنا زیادہ مفید ہوگا، اس گر سے حضرت اچھی طرح واقف تھے، حضرت کی تحریر بھی ان باتوں کی گواہی دیتی تھی، جچے تلے، سلجھے ہوئے جملے اور تحریر بھی کہ کوئی حضرت کی گرفت نہیں کر سکتا تھا، حضرت اس میدان کے شہسوار تھے، اس معاملے میں آپ کا ثانی ملنا مشکل ہے۔

جو بات حضرت بولتے یا لکھتے، سوچ سمجھ کر بولتے اور لکھتے تھے، حضرت کی ان باتوں کو ضبط تحریر میں لایا جائے اور سمیٹا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے، کوئی اس ذمہ داری کو اپنے سر لے تو آئندہ آنے والی نسل حضرت کی ان باتوں سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے کہ معہد امام حسن البنا کی ابتداء ۱۹۸۸ء میں مسجد ہدیٰ کے ایک کمرے سے ہوئی تھی، پھر مسجد کے سامنے ایک دوکان میں منتقل ہوا، اس کے بعد اس دوکان کے پیچھے ایک مکان میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مبارک ہاتھوں اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا، پھر وہاں سے مسجد عثمانیہ کے پاس ایک مکان میں اس کی منتقلی ہوئی، اس کے بعد مدینہ کالونی میں معہد کے لیے ایک جگہ خریدی گئی اور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی بھٹکل آمد کے موقع پر ۲۰۰۰ء میں آپ کے ہاتھوں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا، اس موقع پر مولانا سید محمد واضح رشید ندوی کے علاوہ حضرت ڈاکٹر علی ملپا صاحب رحمۃ اللہ علیہ (یکے از بانیان جامعہ اسلامیہ بھٹکل) دیگر عمائدین شہر بھی موجود تھے، اب اس کی

تین منزلہ شاندار اور خوبصورت عمارت ہے، جس کے افتتاح کے لیے مولانا عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ، مولانا نذر الحفیظ ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو دعوت دی تھی۔

معہد حسن البنا کے سرپرست اول حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے، بعد میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی توجہات، آراء اور مشورے حاصل ہوتے رہے اور حضرت بھی اس ادارے کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کے لیے اپنے تشجیعی کلمات سے نوازتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ اپنی خصوصی دعاؤں اور خطوط کے ذریعے اور فون پر تشجیعی اور ہمت افزائی کے کلمات سے نوازتے اور اس ادارے کی قدر کرتے رہتے تھے، کسی اچھے کام پر ہمت بڑھانا اور کلمات حسنہ سے نوازنا یہ حسنی خاندان کا طرۂ امتیاز ہے، مفکر اسلام سے لے کر مرشد امت تک، مولانا سید واضح حسنی مرحوم سے لے کر مولانا حمزہ حسنی مرحوم اور عبداللہ حسنی مرحوم، اسی طرح مولانا محمود حسنی مرحوم تک سب کو راقم نے قریب سے دیکھا ہے اور ان حضرات کے اخلاق عالیہ اور صاف ستھری اور بے لوث خدمات، دنیا سے استغنا اور دنیا سے بے رغبتی کی صفات سے اچھی طرح واقف ہے، ان حضرات نے اپنے لیے کچھ نہیں کیا، اپنی پوری زندگی دین کے لیے وقف کردی، اس کا بین ثبوت رائے بریلی میں ان کا معمولی سا مکان ہے، تواضع اور منکسر المزاجی، خلوص و للّٰہیت، سادگی وخوش مزاجی حسنی خاندان کے امتیازی اوصاف ہیں، اللہ تعالیٰ خلف کو بھی ان صفات پر باقی رکھے، تمام مرحومین کی مغفرت فرمائے اور جو بقید حیات ہیں ان سے خوب دین کی خدمت لے۔

حضرت مولانا بھٹکل کئی بار آئے، حضرت مفکر اسلام کے ساتھ آئے، آپ کے بعد بھی کئی بار آئے، جب بھی تشریف لاتے، جامعہ اسلامیہ میں آپ کا قیام ہوتا اور طلبہ واساتذہ حضرت سے مستفید ہوتے، یہاں کے عوام خواص، علماء وفضلاء جوق در جوق حضرت سے ملنے آتے اور استفادہ کرتے، جامعہ آباد عوام خواص سے آباد رہتا، سب کے چہرے خوشی ومسرت، فرح وانبساط، سرور وشادمانی کی سی کیفیات سے معمور رہتے، لوگ حضرت سے بے پناہ محبت اور اپنائیت کا اظہار کرتے، جامعہ آباد کی وسیع وعریض مسجد نمازیوں سے بھری رہتی، ہر شخص چاہتا کہ حضرت کا قرب حاصل کرے، عوام حضرت سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتے اور حضرت کا بھی یہی حال تھا، آپ بھی سب سے اپنی محبت کا اظہار کرتے، سب سے ملتے، سب کے لیے دعائیں دیتے، جب بھٹکل سے جانے اور رخصت ہونے کا دن ہوتا، تو وہ دن ہم سب کے لیے غم کا دن ہوتا، وہ خوشی اور مسرت جو حضرت کی آمد کے وقت ہوتی، اب وہ خوشی نہ رہتی، عوام بڑی افسردگی وملال کے ساتھ اور بادل ناخواستہ حضرت کو الوداع کرتے، رخصت کرنے والے سواری کے اردگرد جمع ہوتے اور بچشم نم رخصت کرتے۔

حضرت کی بھٹکل آمد کے موقع پر شاذلی مسجد (تبلیغی مرکز) میں بھی آپ کے بیانات ہوتے تھے، ایک مرتبہ کے بیان میں آپ نے فرمایا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آخری امت کی بہ نسبت پچھلی امتوں کی عمریں لمبی ہوتی تھیں، اس اعتبار سے ان کے اعمال بھی اس امت کے مقابلے میں زیادہ ہوتے تھے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آخری امت کو لیلۃ القدر جیسی بابرکت رات عطا کی، اس رات کو جو عبادت کرے گا، اس کو ۸۳ر سال کی عبادت کا ثواب ملے گا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے آخری امت ہونے کی وجہ سے دعوت والا کام مرحمت فرمایا، یعنی لوگوں کو نماز اسی طرح اعمال صالحہ کی دعوت دینا، بھلائی کا حکم دینا اور برائی سے ان کو روکنا اور اس دعوتی فریضہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو خیر امت کا لقب دے دیا، فرمایا: ﴿كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ﴾ یعنی تم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے نکالی گئی ہو، تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتی ہو اور برائی سے روکتی ہو۔ یہ ایک ایسا وظیفہ ہے جو بھی اس پر عمل کرے اس کے لیے ثواب ہی ثواب ہے۔

پھر حضرت نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا تھا: مثلاً کوئی کسی کو نماز کا حکم دے اور وہ نماز پڑھنے لگے، تو اس کا ثواب اس

شخص کو بھی ملے گا جس نے نماز کا حکم دیا تھا، پھر اس دوسرے سے تیسرے کو، تیسرے سے چوتھے کو، اس طرح آگے ان سب کے پڑھنے کا ثواب اس پہلے والے شخص کے نامۂ اعمال میں جاتا رہے گا اور یہ سلسلہ تا قیامت چلتا رہے گا، تو اس اعتبار سے اس امت کی عمریں تو کم ہوگئیں، لیکن اس طرح دعوتی کام کرنے کی وجہ سے اس کے نامۂ اعمال میں ثواب کی کثرت ہوجائے گی۔

معہد کے ابتدائی ایام میں یعنی ۱۹۸۸ء میں اس وقت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ بھٹکل تشریف لائے تھے اور اس وقت معہد میں آپ کی قدم رنج فرمائی ہوئی تھی، اس موقع پر آپ کی لکھی گئی تحریر ہے:

’’مکتبہ حسن البناء الشہید بھٹکل ہی ایک ایسا مرکز علمی ہے جس سے اسلام کی صحیح فکر کی اشاعت وتقویت کی نہ صرف تدبیر سامنے آتی ہے، بلکہ پڑھے لکھے طبقہ کی ذہنی تربیت اسلام کے صحیح خطوط کے مطابق ہوتی ہے، شیخ حسن البنا الشہید اس عہد جدید کے بہت بڑے فکری معمار کی حیثیت رکھتے تھے، انھوں نے لاکھوں لاکھ مسلمانوں کے دلوں کو نہ صرف یہ کہ اسلامی امنگوں اور حوصلوں سے گرم ومتحرک کیا، بلکہ ذہنوں کو بھی اسلام کی صحیح بنیادوں سے وابستہ کیا، ان کے کام اور مقام کو سامنے رکھتے ہوئے جو بھی جدوجہد کی جائے گی سب اچھے اثرات پیدا کرے گی۔

اس نسبت سے یہ لائبریری بہت بڑی خدمت انجام دے سکتی ہے اور یہ فکر وذہن قلب وروح کو پرنور بنانے میں کارنمایاں ادا کر سکتی ہے، خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ اس لائبریری کو صحیح الخیال، باہمت وحوصلہ مند نوجوان چلا رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی محنتوں کو مفید اور بار آور کرے۔ آمین!‘‘

(حضرت مولانا) سید محمد رابع حسنی ندوی؛ ۱۴/۷/۱۹۸۸ء)

اسی طرح دوسری مرتبہ ۱۴۱۳ھ میں جب آپ کی بھٹکل تشریف آوری ہوئی تھی، اس موقع پر بھی آپ معہد حسن البنا تشریف لائے تھے، اس وقت آپ کی لکھی گئی یہ تحریر ہے:

(ابتدا میں چوں کہ یہ ادارہ ایک لائبریری کی شکل میں تھا، اس لیے حضرت نے اپنی تحریر میں ’’مکتبہ‘‘ اور ’’دارالمطالعہ‘‘ تحریر فرمایا ہے، بعد میں اس کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا گیا اور اس کے کئی شعبے ہوئے، اس لیے ’’مکتبہ‘‘ نام بدل کر ’’معہد‘‘ رکھ دیا گیا۔)

’’بھٹکل میں نوائط کالونی میں شیخ حسن البنا شہید لائبریری کے نام سے عزیزی محمد ناصر اکرمی نے اور ان کے معاونین نے دارالمطالعہ قائم کیا ہے، دارالمطالعہ کے مذکورہ نام سے اور محمد ناصر اکرمی کے اس کام کو انجام دینے سے یہ بات خود بخود ظاہر ہوتی ہے کہ یہ دارالمطالعہ اچھے اور بلند مقصد کے لیے قائم کیا گیا ہے۔

لوگوں کے ذہن کی تشکیل واصلاح میں دارالمطالعہ کا جو حصہ ہے وہ پڑھے لکھے لوگوں سے مخفی نہیں، ان دارالمطالعوں سے صرف علم ومعلومات کی ہی اشاعت نہیں ہوتی بلکہ ذہنوں کی تعمیر وتشکیل بھی ہوتی ہے اور جب ذہن بدلتے ہیں تو معاشرہ کا معاشرہ بدل جاتا ہے اور حالات کا رخ بدل جاتا ہے، اس لیے دارالمطالعوں کا قیام پھر ان کے لیے بامقصد کارکردگی اور فکرمندی اور کتابوں کا انتخاب کسی بھی سوسائٹی کے لیے بعض وقت آب حیات کا کام انجام دیتا ہے۔

میں اس لائبریری کے لیے دعا گو ہوں اور میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ یہ زیادہ سے زیادہ فیض کا باعث ہو، مجھے آج یہ لائبریری دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ ابھی ابتدائی منزل میں ہے لیکن ترقی کرنے اور وسیع ہونے کی اس میں گنجائش بھی ہے اور اس کی توقع بھی ہے۔‘‘

(حضرت مولانا) سید محمد رابع حسنی ندوی؛ ۲۲/۵/۱۴۱۲ھ)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی بھٹکل میں آخری آمد ۴/فروری ۲۰۱۸ء کو رابطہ ادب اسلامی کے جلسے کے موقع پر ہوئی تھی اور اس وقت حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ پر ادبی سیمینار منعقد ہوا تھا اور اس وقت پیام انسانیت کا بھی بہت بڑا پروگرام بمقام جامعہ اسلامیہ جامعہ آباد ہوا تھا، کثیر تعداد میں اس وقت غیر مسلموں نے شرکت کی تھی، وہ ایک کامیاب اور مفید جلسہ ثابت ہوا تھا، حضرت کا بھی اس موقع پر خطاب ہوا تھا، یہی آپ کا

بھٹکل کے اعتبار سے آخری جلسہ اور آخری خطاب تھا، اس کے بعد پھر آپ نہیں آئے، اس کے ایک سال بعد مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی اللہ کو پیارے ہوگئے، پھر کرونا آیا اور حضرت کی اپنی پیرانہ سالی اور کمزوری کی وجہ سے لمبے سفر کی ہمت بھی نہ رہی۔

لیکن بھٹکل اور بھٹکل والوں سے اور جامعہ سے آپ کا برابر رابطہ اور تعلق رہا اور آپ حضرت مفکر اسلام کے بعد جامعہ کے سرپرست بھی تھے، اس لیے بھی جامعہ اور ذمہ داران جامعہ سے برابر روابط رہے، جامعہ کے ارباب شوریٰ اور ممبران بھی لکھنؤ سفر کر کے حضرت کے پاس جاتے رہے، اساتذہ اور طلبہ کا بھی حضرت سے ملنا اور استفادہ کا سلسلہ رہا اور یہ سلسلہ حضرت کی زندگی کی آخری سانس تک جاری رہا، اس سال رمضان میں راقم نے فرزند سید قطب سے تاکیداً کہا تھا کہ اس سال رمضان رائے بریلی میں حضرت کے پاس گزارنا، ندوہ سے وہ سیدھے حضرت کے پاس رائے بریلی چلا گیا اور وہاں آخر تک رہا، حضرت کے مرض وفات پھر جنازہ میں بھی شریک رہا، اسی طرح فرزند قطب کو حضرت کا آخری دیدار نصیب ہوا، اس سے پہلے بھی فرزند کو وہاں حضرت کی خدمت میں ایک دو مرتبہ رہنے کے مواقع ملے تھے۔

آخری مرتبہ جب حضرت بھٹکل تشریف لائے تھے تو اس موقع پر معہد کا تیسرا فلور جس کو حضرت مولانا مفکر اسلام ابوالحسن علی ندوی کی طرف منسوب کر کے ''مولانا علی میاں ہال'' رکھا گیا ہے، اس ہال کا افتتاح حضرت کے ہاتھوں ہوا تھا، اس موقع پر کئی اکابر حضرات تشریف لائے تھے، مولانا عبدالعزیز ندوی (نائب مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء) کے علاوہ استاد مکرم مولانا محمد اقبال ملا ندوی، مولانا غزالی ندوی خطیبی وغیرہ حضرات بھی تشریف فرما تھے، اس وسیع وعریض ہال میں لڑکیوں کے حفظ کے درجات ہیں، اللہ تعالیٰ خیر وبرکت کا معاملہ فرمائے۔

یہ مختصر سی تحریر ہے جو حضرت کے بارے میں لکھی گئی ہے، لکھنے والے حضرت پر بہت لکھیں گے اور حق بھی ہے کہ حضرت پر لکھا جائے، حضرت کی پوری زندگی پر لکھا جائے تا کہ آئندہ آنے والی نسل اس سے فائدہ اٹھائے۔

معہد امام حسن البنا کے ذمہ داروں نے بھی سوچا ہے کہ حضرت کی سوانح پر ایک مبسوط کتاب بنام ''تذکرہ حضرت مولانا سید رابع حسنی ندوی'' منظر عام پر لائی جائے اور اس کے لیے کام بھی شروع ہو چکا ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو اس کی توفیق دے، حضرت کے دنیا میں کیے ہوئے تمام کاموں کو شرف قبولیت بخشے اور آپ کے لیے جنت میں درجات عالیہ کا سبب بنائے۔ آمین!

موت ایک اٹل حقیقت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

''ہر آدمی کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور مرنے کے بعد حساب کتاب کا ہونا بھی یقینی ہے، جو اس دنیا میں آیا ہے، جو پیدا ہوا ہے اس کو مرنا یقینی ہے، اس دنیا کے آثار میں ہر چیز پر شبہ کیا جا سکتا ہے، لیکن اس بات پر شبہ نہیں کیا جا سکتا کہ آدمی کو مرنا ہے اور مرنے کا مطلب بالکل ختم ہو جانا نہیں ہے، اس کا مطلب ہے کہ اس زندگی سے منتقل ہو کر دوسری زندگی میں آپ چلے جائیں گے، اس زندگی کی فکر ہم کو اس دنیا کی زندگی میں کرنی ہوگی، وہاں جا کر ہم فکر کریں اس کی کوئی گنجائش بالکل نہیں ہوگی۔ آخرت کا معاملہ یہ ہے کہ ہم دنیا کی فکر کریں گے تو آخرت میں فائدہ ہوگا اور دنیا میں کوتاہی کریں گے تو ہمیں آخرت میں اس کی سزا ملے گی۔''

(خطبات رابع: ۶۹-۷۰)

وہ کوہ کن کی بات.....

ڈاکٹر مظفر حسین ندوی کشمیری
(کشمیر یونیورسٹی-کشمیر)

حضرت علامہ سید محمد رابع حسنی ندوی مرحوم کا اثر میری زندگی پر اتنا گہرا ہے کہ ان کے بارے میں لب کشائی کرنے کی جسارت کرنا ﴿فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا﴾ کا مصداق پیش کرتا ہے، ایک طرف تو آپ میرے مشفق استاد ہیں، تو دوسری جانب آپ میری زندگی پر گہرے نقوش ڈالنے والے مربی ومحسن ہیں، میرے انگ انگ اور مجاریٔ دم میں ان کی محبت جاگزیں ہے۔ میں نے انہیں پورے چھ سال جو میں نے ان کی نگرانی میں گزارے، غفلت میں بھی غصہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا، آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان میں "المؤمن هيِّن لين" کی تصویر پیش کرتے تھے، ان کے خادم مصباح صاحب بھی گواہی دیں گے کہ "ما قال لی قط: أف، ولا قال لشیء فعلته لم فعلته؟ ولا لشیء لم أفعله أ لا فعلت كذا." (البخاری: ۱۹۷۳ و مسلم: ۲۳۳۰)

ایک پرسکون وخوش گوار اور اطمینان پزیر مسکراتی ہوئی اعلیٰ شخصیت اور علم کی اتنی بلندی جو صنادید علم وفن، اساطین تعلیم وتعلم، علماء ومشائخ کا محور کی مصفی ومنقی زندہ مثال پیش کرتی ہے، پھر اتنی نرمی وتواضع وانکساری پر البحتری کا شعر یاد آرہا ہے:

دان إلى أيدى العفاة و شاسع
عن كل ند فى الندى و ضريب
كالبدر أفرط فى العلو وضوؤه
للعصبة السارى جد قريب

اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے اسلاف کی طرح افراد کے مختلف خصائل کو اچھی سمت دینے کا عظیم ملکہ عطا کیا تھا، معاملات کو بھانپ کر ان کے اچھے پہلوؤں کو غیر مناسب پہلوؤں پر تغلیب کا عمل معاشرے سے بہت سے منفی اوسلبی اثرات زائل کرنے اور مثبت اثرات پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے، یہ تحویلی عمل ان کے پورے خاندان کا خاصہ ہے، تاہم مربی جلیل علامہ ابوالحسن علی ندوی اور علامہ محمد رابع حسنی ندوی اس ترشیدی وتحویلی عمل کے رائد وقائد تھے، وہ ہر قسم کی پیچیدہ سے پیچیدہ حالت کو اپنی قوتِ دانائی اور وہبی حکمت سے ٹھنڈا کرنے کی عظیم صلاحیت رکھتے تھے۔ ان کی خلوص بھری مسکراہٹ اراضی قاحلہ کے لیے بھروقت بارش کا سا عمل کرتی تھی۔ وہ سخت ترین احوال میں بھی ایک مطمئن سمندر کی طرح رہنے کا فن جانتے تھے، شکویٰ وشکایت کا لفظ ان کی ڈکشنری میں کہیں بھی پایا نہیں جاتا تھا، وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرح معاملہ اللہ کے حوالے کردیتے تھے اور کہتے: ﴿إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ﴾

لگتا ہے کہ درید بن الصمہ نے پیشگی کے طور پر انہی کے بارے کہا تھا:

قليل التشكى للمصيبات ذاكر
من اليوم أعقاب الأحاديث فى غد

تواضع میں اللہ نے انہیں عبقری مقام عطا کیا تھا، بہ فحوائے حدیث: "من تواضع لله رفعه الله." (مسلم: ۲۵۸۸)

اس رفعت کی وجہ سے وہ ہر دل عزیز بنے ہوئے تھے، اس میں کیا شک ہے کہ تواضع، طہارتِ نفس اور صفائی باطن کا غماز ہے، اس سے محبت ومودت پیدا ہوتی ہے، معاشرہ میں یکسانیت اور بے خوفی کا ماحول پیدا ہوتا ہے، متواضع انسان لوگوں کی آنکھوں کا تارہ بن جاتا ہے، علامہ مرحوم کے چلنے کا انداز ﴿وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ﴾ ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحاً﴾ اور انداز کلام ﴿وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ﴾ اور مواجہہ کا تبسم ﴿وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ﴾ کا عملی پیکر تھا، علم

وفضل، تقی وورع، تفکر وتدبر کی اتنی بلندی سے تواضع وانکساری کا یہ عالم ان کے پرخلوص و بے داغ داعی ومفکر ہونے پر ایک برھان ہے، کیوں نہ ایسا ہوتا وہ تو نبی کریم ﷺ کے شیدائی اور بے لوث جاں باز تھے، ان کی ایک ایک سنت پر من وعن اور ہو بہو عمل پیرا تھے، جن کی اس بھلائی ہوئی حدیث کو زندہ کرنے والے تھے:

"إن اللّٰه أوحى إلى أن تواضعوا حتى لا يفخر أحد على أحد و لا يبغى أحد على أحد."(أبوداؤد: ٤٨٩٢)

مرحوم استاد کا حلم وبردباری ضرب المثل مانا جاتا ہے، آہ کتنے حلیم الطبع تھے، کتنے منکسر المزاج تھے اور 'حلیم' اللہ کی عظیم صفات میں سے ایک صفت ہے، دسوں جگہ قرآن کریم میں اللہ کے حلیم ہونے کا ذکر ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں قرآن مجید میں ہے:

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ﴾(التوبة:١١٤)

شعیب علیہ السلام کو ان کی قوم نے طعنے کے طور پر کہا تھا:

﴿إِنَّكَ لَأَنتَ الْحَلِيمُ الرَّشِيدُ﴾(هود: ٨٧)

حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ کو تو اللہ تعالیٰ نے (غلام حلیم) کی خوش خبری دی اور کہا: ﴿فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ﴾

اس میں کیا شک ہے کہ پھل دار درخت ہی جھکتا ہے اور اس کا کام ہی لوگوں کی راحت رسانی ہے، اس سے غرض نہیں کہ کس نے پھل توڑنے کے لیے پتھر مارا، وہ تو برائی کا بدلہ بھلائی سے دیتا ہے، "يجزى السيئة بالحسنة" بقول شاعر ؎

کام اپنا ہے جلاتے رہیں چراغ
رستے میں چاہے دوست یا دشمن کا گھر ملے

ان کی خموشی بولتی تھی، ان کا سکوت خطابت سے کئی گنا زیادہ معنی رکھتا تھا، ان کا چلنا دعوت دین تھا، وہ مصنف کتب سے زیادہ مصنف رجال تھے، وہ ایک مرکزی کردار تھے، ان کی مرکزیت پر کبار علماء وفضلاء کا اتفاق تھا، علماء کا سولر سسٹم ان کے گرد گھومتا تھا۔

غصہ کو پی لینا علامہ کی عام عادت تھی، یہ عظیم عمل ایک جداگانہ عمل تھا، کیونکہ اس کے لیے انانیت قربان کرنا پڑتی ہے اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہے، لیکن اس سے ہزاروں مشکل مسائل حل ہوتے ہیں، پھر درگزر اور معاف کرنا اولوالعزم انسانوں کا کام ہے، حضرت مولانا ہر معاملہ میں ﴿فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا﴾ اور ﴿وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ﴾ کے عملی پیکر تھے اور ﴿وَإِذَا مَا غَضِبُوا هُمْ يَغْفِرُونَ﴾ کو حقیقی طور پر اپنانے والے تھے۔

انسان کو دنیا میں ناگوار حالات سے گزرنا پڑتا ہے، لیکن نفس کو تھامنا' غصے کو گھونٹ گھونٹ کر پی لینا ہر ایک کے بس کا کام نہیں ہے، حضرت مولانا کو اللہ نے اس کا ملکہ عطا کیا تھا اور اس حدیث نبوی کے مصداق بنے تھے جس میں نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

"ما من جرعة أعظم أجرا عند اللّٰه من جرعة غيظ كظمها عبد ابتغاء وجه اللّٰه."(ابن ماجه:٤١٨٩)

جس عظیم خانوادہ سے حضرت کا تعلق تھا، اس کا ایک ایک فرد احسان الی الآخرین کی صفت سے متصف ہے، اس صفت کا بڑا حصہ حضرت کے حصہ میں آیا تھا، مذہب کی تفریق کے بغیر سخاوت وفیاضی' دینے کا مزاج' راحت رسانی' خیر خواہی' غریبوں ومساکین کی امداد کا مزاج اس خانوادہ کے خمیر میں بھرا ہوا ہے، جس کے عینی شاہدین ہزاروں کی تعداد میں اب بھی موجود ہیں، اس کے نتیجہ میں انہیں استغناء کی عظیم نعمت مل گئی تھی، جس نے عوام وخواص' ہندوؤں اور مسلمانوں میں ان کی محبت وعقیدت میں چار چاند لگا دیئے، امانت داری' ایمان داری' وفا شعاری ان کی ضرب المثل ہے، حضرت علامہ نے کبھی صبر کا دامن شدید ترین حالات میں نہیں چھوڑا، اتنے ٹھنڈے دل ودماغ والے تھے کہ مسائل کو شیریں تبسم اور خندہ پیشانی سے رخصت کرتے تھے، صبر کا یہ اعلیٰ معیار ان کو الٰہی تحفہ کے طور پر ملا ہوا تھا اور اس سے وہ اللہ ہی کی خوشنودی چاہتے تھے۔

﴿وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللّٰهِ﴾(النحل: ١٢٧)

صبر وتحمل ان کی فطرت ثانیہ بنا ہوا تھا، سہنے کی قوت اور برداشت کی طاقت ان کی سرشت میں تھی، علوی خاندان کے اس سپوت کو یہ صفت علی سے ہی ملی تھی، جن کی طرف مندرجہ ذیل شعر منسوب ہے:

سأصبر حتى يعجز الصبر عن صبرى
سأصبر حتى ينظر الرحمان فى صبرى
سأصبر حتى يعلم الصبر
أنى صبرت على شيء أمر من الصبر

الاخلاص فی العمل اورالاخلاص فی العبادہ ان کے تمام اعمال کا خلاصہ تھا، وہ لوجہ اللہ اور فی رضا اللہ ہر کام انجام دیتے تھے، یہ للّٰہیت ان کو شاہ علم اللہ، سید احمد شہید، شاہ اسماعیل شہید اور اخیر میں علامہ ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہم اجمعین سے وراثت میں ملی تھی، اس للّٰہیت نے ان میں بقول مولانا سیف اللہ رحمانی سمندر کا سا سکوت' زمین کا سا بچھاؤ اور جھکاؤ پیدا کیا تھا، یہی اخلاص ہے جس نے آپ کو "کثیر التدبر، جزیل التفکر" اور "قلیل التکلم" بنادیا تھا۔

تزکیہ اللہ کی دین ہے جسے دے اپنے فضل سے دے:

﴿لَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكَا مِنكُم مِّنْ أَحَدٍ أَبَداً وَلَكِنَّ اللَّهَ يُزَكِّي مَن يَشَاءُ﴾(النور: ۲۱)

جہاں بولنا ہوتا تھا وہیں بولتے ورنہ نہ بولتے، کبھی پوچھنے پر "نہیں" کہنا عادت نہ تھی:

ما قال: لا إلا في تشهده
لو لا التشهد لكان لاؤه نعم

مولانا کو عہد ساز شخصیت بنانے میں امت کے جن عظیم سپوتوں کا عمل دخل ہے، وہ اپنے عہد کے عباقرہ واساطین علم وعمل تھے؛ حضرت مولانا عبد القادر رائے پوریؒ، حضرت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی، حضرت مولانا ابرار الحق ہردوئی، حضرت مولانا زکریا کاندھلوی، حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی ضیا افشانی نے ان کی زندگی کو اتنا منور کیا کہ جبل نور بن گئے، لیکن کوئی ریاکاری نہیں، تواضع ان کا شعار' انکساری ان کی حیات کا معیار تھا، اس سے اس حدیث کے سند ومتن کی تصدیق ہوتی ہے اور احادیث مبارکہ کا اعجاز مبرہن ہوجاتا ہے:

"ما نقصت صدقة من مال، و ما زاد الله عبدا بعفو إلا عزا، و ما تواضع أحد إلا رفعه الله." (مسلم۲۵۸۸)

اس بات میں کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے، کیونکہ زمانہ میں ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جن سے آج سے پندرہ سو سال پہلے نازل شدہ آیات کی اب جدید ٹیکنالوجی کے ذریعہ اور سائنسی تحقیقات سے تصدیق ہوتی ہے۔ اللہ اس کائنات کو ان بندوں سے خالی نہیں رکھتا ہے جن پر انبیاء وشہداء بھی قیامت میں رشک کریں گے، الصادق المصدوق کا قول صحیح ہے:

"إن من عباد الله أناسا ما هم بأنبياء و لا شهداء يغبطهم الأنبياء و هو الشهداء يوم القيامة بمكانهم من الله تعالىٰ، قالوا: يا رسول الله! تخبرنا من هم؟ قال: هم قوم تحابوا بروح الله غير أرحام بينهم و لا أموال يتعاطونها فوالله إن وجوههم لنور و إنهم على نور و لا يخافون إذا خاف الناس و لا يحزنون إذا حزن الناس و قرآ هذه الآية: ﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاء اللّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾"
(سنن أبی داؤد: ۳۵۲۷)

اس خاندان کی اعلیٰ خصوصیات میں سے صدق بیانی ہے، یہاں کذب بیانی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے، جس نے ان کے اقوال وافعال کو ایک معیار اور کسوٹی بنایا، عام لوگوں میں ہی نہیں عرب وعجم کے محققین ومدققین اور بڑے بڑے علماء وفضلاء اور فقہاء ومشائخ نے ان کے علم وفضل کا' ان کی صاف گوئی کا جس میں کسی کی رورعایت نہیں، "كلمة حق عند سلطان جائر" کا حق ادا کرنے کا بار بار اعتراف کیا ہے۔ جگر مرادآبادی کی زبان میں:

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھینچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

اس میں کیا شک ہے کہ صدق میں اطمینان ہے اور کذب بیانی میں شک وتردد ہے: "فإن الصدق طمأنينة والكذب ريبة"
(سنن الترمذی: ۲۵۱۸)

اور اللہ تعالیٰ نے صادقین کے ساتھ رہنے اور ان کی مدد کرنے کا حکم دیا ہے اور فرمایا: ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ اتَّقُواْ اللّهَ وَكُونُواْ مَعَ الصَّادِقِينَ﴾(التوبة:۱۱۹)

عام طور پر اہل تفکر وتدبر پر متانت کا شدید غلبہ ہوتا ہے، پھر لوگوں کو ان کے متکبر ہونے کا خدشہ ہوتا ہے، حالانکہ حقیقت میں ایسا

نہیں ہوتا، ان کا ایک میدان ہوتا ہے وہ ملی وعالمی مسائل کے حل کرنے میں محو ہوتے ہیں، ان کا دماغ وسیع تر دینی، اجتماعی، سیاسی واقتصادی قضایا کے علاج و معالجہ میں مشغول ہوتا ہے، اس سے بداہۃً عام ملاقی کو ایسا خدشہ ہوتا ہے، حضرت مرحوم چونکہ بے بدل ادیب وانشاپرداز تھے اور ادب ادیب کو ظرافت عطا کرتا ہے، جس کی وجہ سے مولانا نے اس چیز کو بیلنس کیا ہوا تھا جو اور مفکرین سے عام طور پر رہ جاتا ہے، یہ بھی تجربہ ہے کہ علم فلسفہ ومنطق، علم الکلام اور علم المناظرہ سے ترش روئی اور مزاج میں یک گونہ سختی پیدا ہوتی ہے، جو اسلامی مزاج کے بالکل خلاف ہے، کیونکہ اس سے تنفر اور بعد پیدا ہوتا ہے، حتی کہ رسولِ خدا ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے مخاطب ہوکر فرمایا:

﴿فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ﴾(آل عمران: ۱۵۹)

لیکن یہ خانوادۂ دعوت وتبلیغ، خانوادہ علم وعمل شرافت کے اعلیٰ معیار پر تھے، وہ ہمیشہ خندہ پیشانی اور مسکراہٹ سے پیش آتے تھے، وہ اس میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا چاہتے تھے، ابوذرؓ کہتے ہیں کہ مجھے نبی ﷺ نے فرمایا: "لا تحقرن من المعروف شيئا و لو أن تلقى أخاك بوجه طلق." (مسلم: ٢٦٢٦)

حضرت کا خاندان کوئی خشک قسم کا علمی خاندان نہیں، قرآن وحدیث، سیرت وتاریخ، فقہ وفلسفہ، ادب وتنقید نگاری، صحافت ونظامت، ادارت وتربیت، ملی وعالمی مسائل، درس وتدریس، تحقیق وتصنیف کے ساتھ ساتھ ایک جیتا جاگتا خالص اسلامی تصوف اور انابت الی اللہ اور اہل القلوب کا گہوارہ ہے، جہاں دلوں کو سکون واطمینان اور روحوں کو روحانی غذا ملتی ہے، توبہ واستغفار کی مجالس سجائی جاتی ہیں، سخت دلوں کو نرمایا جاتا ہے، شدت وسختی کو ایمانی حرارت میں تبدیل کیا جاتا ہے، انابت الی اللہ کی تمام آیات بینات کی یاد تازہ کی جاتی ہے، راقم نے حضرت علامہ ابوالحسن علی ندویؒ، حضرت علامہ محمد رابع حسنی ندوی اور حضرت مولانا واضح رشید ندوی مرحومین سے درساً علم حاصل کیا ہے، میں نے ہر درس سے علمی استفادہ کے ساتھ ساتھ قلبی سکون محسوس کیا ہے، ہر لحظہ بس توبہ وانابت کی گھڑی محسوس ہوتی تھی، دل تر ہوجاتے اور آنکھیں نم، دل ودماغ کو ہر آن نئی نئی غذا ملتی تھی۔

مولانا مطالعہ کتب کا شوق دلاتے، ایک دن فرمایا کہ میں دن ورات میں ڈیڑھ سو صفحات پڑھا کرتا تھا، تو میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں پونے دو سو صفحات مطالعہ کرتا ہوں، تو بے حد خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔ ایک دن میں نے افغانیوں کے بارے میں سوال کیا کہ وہ اتنے اولیاء اللہ ہوکر بھی کامیاب کیوں نہیں ہوتے؟ تو جواباً فرمایا: یہ دنیا دار الاسباب ہے، یہاں اسباب کا اسباب سے ٹکراؤ ہوتا ہے اور ابھی ہوا بھی کیا نتیجہ باقی ہے۔ تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا: ہر ایک کی ضرورت ہے، محاذ مختلف ہوتے ہیں، ہر محاذ کے اپنے اپنے افراد ہوتے ہیں-لكل فن رجال- امریکا وفرانس اور برطانیہ کا اگر انحطاط وزوال ہو اور بالکل third world کی طرح بن جائیں، پھر اس حالت پر ایک صدی گزر جائے، پھر کوئی مولانا مودودیؒ کی مغربی تہذیب وثقافت کے رد میں لکھی ہوئی کتابیں پڑھ لے، تو کہے گا کہ مولانا کو کیا ہوا تھا کہ third world اور گیے گزرے ملکوں کی رد میں کتابیں لکھیں ہیں، مگر اسے معلوم نہیں کہ کن حالات میں یہ کتابیں تصنیف ہوئی تھیں، اسی طرح مسلمانوں ہی کی چہل پہل اور دھوم دھام ہو، صرف اسلام ومسلمانوں کا چرچا ہو، پھر کوئی کہے کہ مولانا الیاس کو کیا ہوا تھا کہ تبلیغی کام کو جاری کیا، مگر اسے معلوم نہیں کہ کن حالات میں اس کام کا آغاز ہوا تھا۔

یہ چند معروضات تھیں جن کو میں بڑی معذرت کے ساتھ سپرد قلم کر رہا ہوں، میرا مرحوم کے ساتھ ایک جذباتی لگاؤ ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔

صنائع فاق صانعها ففاقت
وغرس طاب غارسه فطابا
وكنا كالسهام إذا أصابت
مراميها فراميها أصابا

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے

مولانا اشہد جمال ندوی
(سکریٹری ادارہ تحقیقات اسلامی-علی گڑھ)

استاذ گرامی کی رحلت کا صدمہ دل ودماغ پر چھایا ہوا ہے۔ انتقال پر ملال کی خبر سوشل میڈیا پر وائرل ہوتے ہی پوری اسلامی برادری غم میں ڈوب گئی کہ ان کا سالار رخصت ہوگیا، عزیزوں، شاگردوں اور ماتحتوں کے لیے ذاتی صدمہ بھی تھا کہ ان کے سر سے سایہ عاطفت اٹھ گیا۔ جس کے بس میں تھا، جنازے میں شریک ہو نے کے لیے لکھنؤ یا رائے بریلی کی طرف بھاگا۔ اپنے ہاتھ سے اللہ کی امانت اللہ کے سپرد کر کے خود کو تسلی دی۔ باقی جو جہاں تھا وہیں سے دعائیں کرتا رہا۔ روزے کی حالت میں ہے، نمازوں میں سجدہ ریز ہے۔ رات میں کھڑے ہوکر رب ذوالجلال کے سامنے گڑگڑا رہا ہے، ہر حال میں اپنے مشفق مہربان سرپرست کو بھی یاد کر رہا ہے۔ نماز تراویح کے بعد جنازہ اٹھا، سوشل میڈیا پر پھر ویڈیوز وائرل ہوگئیں، مجمع کثیر کی سسکیوں نے ایک بار پھر کہرام مچادیا۔ جو دیکھتا رو رو پڑتا۔ کون سخت دل وسخت جاں ایسا ہوگا جو اپنے جذبات پر قابو رکھ پایا ہوگا۔ حقیقت ہے پاک طینت و پاک باز شخصیات کا جنازہ بھی بہت کچھ سبق دے جاتا ہے۔

راقم الحروف بھی ان خوش قسمت لوگوں میں ہے جس نے حضرت والا کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔ بہت قریب سے دیکھا اور استفادہ کیا ہے۔ اسے بھی شفقت ومحبت کا وافر حصہ ملا ہے۔ نہ صرف کلاس روم میں بلکہ کلاس کا رشتہ ختم ہونے کے بعد بھی فیض یاب ہوتا رہا ہے۔ یہ اس کے لیے بہت قیمتی سرمایہ ہے۔

دنیا میں جو آیا ہے سب کو جانا ہے۔ انبیاء کرام علیہم السلام بھی مہلت عمل پوری کر کے اپنے خالق ومالک سے جا ملے۔ استاذ گرامی کی مہلت عمل بھی تمام ہوئی، اللہ تعالیٰ نے اُنھیں کارکردگی پیش کرنے کے لیے طویل عمر عطا کی اور اپنے دین کا خوب خوب کام لیا۔ یہ رتبہ بلند سب کو نہیں ملتا۔ اللہ اپنے خاص بندوں کو ہی نوازتا ہے۔ حضرت کے متوسلین کے لیے یہ بات اطمینان کا باعث ہے کہ ان کے ممدوح نے بھرپور علمی وعملی زندگی گزاری اور دین وملت کی خوب خدمت انجام دی۔

حضرت والا کی ذات وصفات پر ایک نظر ڈالی جائے تو شخصیت کا بہت ہی خوبصورت مرقع سامنے آتا ہے۔ شریف، دیندار اور علمی خانوادے میں آنکھ کھولی۔ تعلیم وتربیت کا پاکیزہ ماحول ملا۔ نہایت بزرگ، معتبر اور محترم شخصیات کی سرپرستی نصیب ہوئی۔ وطن عزیز سے ضروری تعلیم حاصل کر کے ندوہ آگئے۔ علم وآگہی، بصیرت وتفقہ کے اس چشمہ صافی سے سیرابی حاصل کرنے کے ساتھ دیوبند سے بھی استناد حاصل کیا۔ پھر ساری زندگی مادر درسگاہ پر نثار کردی۔ بچپن سے جوانی تک اور جوانی سے بڑھاپے تک زندگی کا ہر لمحہ پاکیزہ ماحول میں گزرا۔ پاکیزہ صحبت میں گزرا۔ پاکیزہ کاموں میں گزرا۔ دنیا کی آلائشوں سے آپ کا دامن آلودہ نہیں ہوا۔ اللہ نے اس طرح کی آزمائشوں اور آلائشوں سے بچائے رکھا۔ حلم، بردباری، معاملہ فہمی، دوراندیشی اور خوش خلقی آپ کی پہچان بنی۔ آپ کے نورانی چہرہ، متین وچال اور نرم لب ولہجہ میں اتنی کشش تھی کہ جو دیکھتا گرویدہ ہوئے بغیر نہ رہتا۔

استاذ گرامی کی خدمات مختلف الجہات ہیں۔ آپ ہر دل عزیز استاذ تھے، بلند پایہ مصنف تھے، بردبار قائد اور خداترس مرشد ومربی!

کارِ معلّمی تو کارِ نبوت ہے۔ نبوی فریضہ کی طرح ہی اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کرتے۔ میری طرح ہزاروں شاگرد شہادت دیں گے کہ جو مضمون پڑھاتے اس کا حق ادا کر دیتے۔ آخری طالب علم کے ذہن و دماغ تک رسائی حاصل کر لینا آپ کے طرزِ تدریس کا امتیاز تھا۔ اس مقدس فریضہ کا یہی بنیادی تقاضا بھی ہے۔ مجھے سیرتِ طیبہ کا درس لینے کی سعادت حاصل ہوئی، سیرت آپ کا اختصاصی موضوع تھا اور ذات گرامی میں بھی اس کا بھرپور انعکاس تھا۔ درس دیتے تو موضوع میں ڈوب جاتے۔ بولتے تو منھ سے الفاظ نہیں پھول جھڑتے۔

آپ کا قلم بھی بہت رواں تھا۔ سوشل میڈیا پر تین درجن کتابوں کی فہرست گشت کر رہی ہے۔ یہ قرآن، سیرت، ادب، تاریخ، جغرافیہ، تعلیم، سماجیات اور مشاہدات جیسے موضوعات پر محیط ہے۔ موضوعات میں تنوع کے ساتھ ہر کتاب کا ایک خاص رنگ وآہنگ ہے۔ زبان نہایت سادہ اور اسلوب ایسا دلنشیں کہ بات سیدھے قاری کے دل میں اتر جائے:

اوراق میں ہیں گوہر و معنی کے خزینے
الفاظ میں وہ حسن بیان چھوڑ گیا ہے

ادارے قائم کرنا، چلانا اور چلوانا بھی آپ کی خدمات کا ایک قابل قدر باب ہے۔ رابطہ عالم اسلامی کے تاسیسی ممبروں میں شمار ہوتے ہیں۔ رابطہ عالمی ادب اسلامی کے قیام واستحکام میں فعال کردار ادا کرتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بے شمار مدارس و مکاتب آپ کی تحریک پر شروع ہوئے۔ متعدد علمی اکیڈمیاں اور تحقیقی ادارے بھی شروع کرائے اور سرپرستی کی۔ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اور اسلامی فقہ اکیڈمی انھیں اپنا سرپرست تصور کرتی تھیں۔ ملی اداروں کی خدمت اور تعاون میں آپ کبھی پس وپیش نہ کرتے۔ آپ کے اشارے سے ہی بعض دفعہ اداروں کا بھلا ہو جاتا۔

ندوۃ العلماء لکھنؤ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی ذمہ داریاں قبول کرنے کے بعد آپ زیادہ گراں بار ہو گئے۔ اول الذکر کے ناظم اور آخر الذکر کے صدر کی حیثیت سے بیش بہا خدمات حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیں۔ دونوں ادارے ملت کی آبرو کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں اور ان کی سربراہی کو لوگ عزت واکرام کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ مگر امر واقعہ یہ ہے کہ یہ تاج جس کے سر چڑھ جاتا ہے۔ وہ اسے کانٹوں بھرا تاج ہی مانتا ہے:

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

ان اداروں کی شہرت اور مقبولیت کی وجہ سے قوم نے بڑی توقعات وابستہ کر لی ہیں، بعض ایسی توقعات بھی جو ان کے دائرہ کار میں نہیں آتیں۔ یہ توقعات اور خوش گمانیاں مولانا محترم کے لیے بہت بڑا چیلنج ثابت ہوئیں۔ مولانا کے زمانے میں دونوں اداروں کو کئی طرح کی افتاد و آزمائشوں کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ یہ آزمائشیں اندرون سے بھی اٹھیں اور بیرون سے بھی۔ استاذ گرامی قدر نے ہر آفت ومصیبت کا پامردی کے ساتھ مقابلہ کیا اور حکمت و بردباری کے ساتھ ڈگمگاتی کشتی کو منجدھار سے باہر لے آئے۔ بعض دفعہ دوبدو مقابلہ کرنے اور سخت اقدام کا مطالبہ بھی ہوتا رہا۔ مگر حضرت والا کے سامنے دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے دولخت ہونے کی خوچکاں تاریخ تھی۔ قوم کا برانگیختہ مزاج تھا۔ شکست وریخت کے بعد خوشی کے شادیانے بجانے والوں کے عزائم اور حوصلے تھے۔ اس لیے اشتعال میں آنے کے بجائے صبر وتحمل کو ڈھال بنایا اور حلم و بردباری سے مسائل کو حل کیا۔ مولانا محترم کی زندگی کا یہ سب سے یادگار پہلو ہے۔ ان اداروں کو جب قوم کے سپرد کر کے رخصت ہوئے تو بحمد اللہ دونوں ادارے پوری طرح محفوظ ہیں، مضبوط ہیں اور اپنی اصل حالت پر قائم ہیں۔ اللہ انھیں نظر بد سے بچائے:

رہتا ہوں چپ تو ہوتی ہے دل میں گھٹن عزیز
اظہارِ غم کروں تو کریں سنگسار لوگ

میر کارواں کی رحلت

مولانا جمال احمد ندوی
(رکن مجلس انتظامیہ ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

موت ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور نہ جانے اس پورے عالم وگل میں ہر صبح وشام کتنے لوگ موت کی آغوش میں جاتے ہوں گے، لیکن اسی دنیا میں اللہ کے کچھ ایسے مخصوص بندے بھی ہوتے ہیں جن کا وجودِ مسعود ستاروں کی مانند ہوتا ہے، جن کی جگمگاہٹ اور روشنی سے متلاشیان حق رہبری حاصل کرتے ہیں اور منزل مقصود سے ہم آغوش ہوتے ہیں اور ان کی رحلت سے پورا عالم سوگوار ہوجاتا ہے، رات کی تاریکیاں بڑھ جاتی ہیں، دن کے اجالے مدھم پڑ جاتے ہیں، برگ وبر مرجھا جاتے ہیں۔

ان ہی عبقری شخصیات میں میر کارواں، مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات بابرکت تھی، جن کے وجود سے توحید وسنت کی روشنی پھوٹتی تھی، کفر وشرک کی تاریکیاں چھٹ جاتی تھیں، لیکن مشیت ایزدی اور قضائے الٰہی سے حضرت مولانا بھی مؤرخہ ۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء مطابق ۲۱/رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ کو داغ مفارقت دے گئے۔إنا للّٰه وإنا إليه راجعون، إن للّٰه ما أخذ وله ما أعطى وكل شئ عنده بأجل مسمى!

اس مبارک مہینہ میں آپ کی رحلت نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تاد تازہ کردی ہے۔

مولانا آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر، ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نائب صدر، رابطہ عالم اسلامی کے رکن تاسیسی ہونے کے ساتھ ساتھ متعدد دینی اداروں اور انجمنوں کے سرپرست ونگراں تھے۔

انسان کی سیرت وشخصیت کی تشکیل میں جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں، ان میں سب سے اہم خاندانی اور نسبی شرافت وثقافت ہے، اس کے بعد ماہرین وکاملین کی صحبت، مبدأ فیاض نے حضرت مولانا کو جہاں ایک طرف سادات حسنی خاندان کی نسبت سے بہرہ ور فرمایا تو دوسری جانب حضرت مفکر اسلام مولانا علی میاں ندویؒ کی صحبت کیمیا اثر نے مولانا کی فکر ونظر میں کمال گہرائی وگیرائی عطا کی، حضرت مولانا کی شخصیت مولانا علی میاں ندویؒ کا عکس جمیل اور فکری وراثت کی امین تھی، تقریباً ۶۰/سالوں تک اپنے شیخ ومرشد حضرت مفکر اسلام رحمہ اللہ کے زیر تربیت رہ کر ملک وملت کے مسائل ومشکلات حل کرنے کی صلاحیت حاصل کی تھی، بعد کے حالات میں پرسنل لا بورڈ اور ندوۃ العلماء نے آپ کی شخصیت پر کلی اعتماد کرتے ہوئے آپ کی قیادت وسرپرستی پر مہر اتفاق ثبت کردی۔

مولانا کی ذات تواضع وانکساری، صبر واستقامت اور حلم وبردباری میں اپنے ہم عصر علماء میں ممتاز حیثیت کی حامل تھی، مسلم پرسنل لا اور ندوۃ العلماء گذشتہ چند سالوں میں بہت سے مشکل مسائل سے دوچار رہے، نازک سے نازک ترین صورت حال میں مولانا نے جس نگہ بینی اور دور اندیشی سے حالات کا مقابلہ کیا اور مثبت حل پیش فرمایا، اس سے آپ کی بصیرت افروز قیادت کا اندازہ ہوتا ہے، حضرت مولانا نے خودنمائی اور صلہ وستائش سے ہمیشہ اپنے آپ کو گریزاں رکھا، بہت خاموشی سے اپنے متعلقین وارادت مندوں کو دین ودعوت اور اخلاص وللّٰہیت کی تلقین فرماتے تھے۔

حضرت مولانا سے احقر کا انتہائی والہانہ وعقیدت مندانہ تعلق تھا، متعدد بار غریب خانہ پر آمد کا شرف بخشا اور متعلقین ومحبین کو قیمتی پند

ونصائح سے مستفید فرمایا، بہ وقت ملاقات خانگی حالات دریافت فرماتے، برادران مکرم کی خیریت سے آگہی طلب کرتے، نیز ہر مشکل موڑ پر اور خانگی معاملات میں بہترین مشوروں سے نوازتے، زہد وقناعت اور بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ متعدد بار بطور ہدیہ آپ کی خدمت میں کچھ نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی جسارت کی، لیکن صرف دل جوئی کے لیے بہت ہی معمولی رقم لے کر سب واپس کر دیا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت مولانا کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے مادی ومعنوی پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور خاص طور پر دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مسلم پرسنل لا بورڈ کا تحفظ فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

ادب کی طاقت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''ادب اسلامی نقطہ نظر سے نہ محض وعظ ونصیحت میں محدود ہے اور نہ محض عبادت ودعا میں اور نہ محض تحریک ودعوت میں اور نہ محض لطف وتسکین ذوق میں، اسلام میں ادب تاثرات وجذبات کی ترجمانی میں ملتا ہے، زندگی کے نشیب وفراز کی حکایت میں ملتا ہے، وہ دوستوں کی محفل کا ساتھی ہے تو دشمنوں کے مابین معاملات کا گواہ ہے، وہ بروں کی برائی کی نشان دہی کرتا ہے اور اچھوں کی اچھائی بھی دکھاتا ہے، وہ اپنی خوش اسلوبی سے دلوں کو متوجہ کر لیتا ہے اور اپنی اثر پذیری سے دلوں کو موہ لیتا ہے، اس میں آدمی کو ایک دل پسند دوست اور ہم ذوق ساتھی کا سا لطف ملتا ہے اور ہم جب اسلامی کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو ادب کی وسعت کو تنگ کرنا نہیں چاہتے، بلکہ ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کے ساتھ لباس کو گندا نہ کیا جائے اور اس لباس میں کہیں گندگی آجائے تو اس کو ہاتھ کے اشارہ سے بتایا جائے، اس سے چمٹ کر اپنے کو پراگندہ نہ کیا جائے، اسلام نے ادب کو اسی خوبی واحتیاط کے دائرہ میں رکھنا پسند کیا ہے اور اس کا حکم دیا ہے۔ اس کا لحاظ رکھنا ہے اور اس کی رہنمائی میں رہتے ہوئے کام کرنا ادب کے بے بس کر دینے یا اس کی وسعت وتنوع کو نقصان پہنچانے کے مرادف نہیں ہے۔

ادب میں دلوں کو متوجہ کر لینے کی جو طاقت ہے اس کی وجہ سے مختلف زبانوں اور سوسائٹیوں میں اس سے جمہور وعوام کو متاثر کرنے کا کام بھی لیا جاتا رہا ہے، اس کی مثالیں برے اور اچھے دونوں مقاصد کے لیے تاریخ میں ملتی ہیں، فرانس کے انقلاب میں روس اور کمیونسٹ اور وولیٹر کے ادب کا کتنا بڑا حصہ ہے اور کمیونزم کو متعدد ملکوں کے عوام میں پسندیدہ بنانے میں کمیونسٹ ادیبوں نے ادب سے کتنا کام لیا؟ اور اس وقت بھی یورپ کی ثقافت وتہذیب کو عام کرنے میں مغرب زدہ ادب کی کتنی خدمات ہیں؟ اس سے اسلام کی تاریخ میں اصلاح ودعوت کے کاموں میں کتنی مدد لی گئی؟ اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کو ان کی قوموں میں جب دعوت واصلاح کے لیے بھیجا تو ان کو فصیح اللسان بنایا، فرمایا:

﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهِ﴾ (ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس کی قوم کی زبان میں)

یعنی اس زبان میں بات کرنے کی صلاحیت کے ساتھ، تاکہ وہ ان کے لیے واضح اسلوب میں بات کو رکھ سکے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کو اپنی زبان میں کچھ دشواری کا احساس ہونے کی بنا پر اپنے پروردگار سے یہ عرض کرنا پڑا کہ میرے بھائی ہارون مجھ سے زیادہ فصاحت رکھتے ہیں، ان کو میرا معاون بنا دیجیے اور ان کی یہ عرض قبول ہوئی اور ان کے بھائی کو بھی رسول بنا کر ان کے ساتھ کر دیا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں موثر ڈھنگ پر بات کرنے کی بکثرت مثالیں ملتی ہیں اور ادب کے متنوع پہلو ملتے ہیں مثلاً: گفتگو، خطابت، حکایت، نصیحت، دعا، اظہار تاثر اور رعایت ذوق ادبی۔ ان سب اصناف سخن کی مثالیں حدیث شریف کی کتابوں میں چند در چند موجود ہیں۔''

(غبار کارواں: ۹۸-۱۰۰)

ملت اسلامیہ ہندیہ کا ایک درخشاں ستارہ

مولانا مطیع الرحمٰن عوف ندوی
(ناظر معہد دارالعلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی کی شخصیت کم وبیش ستر سال کے عہد زریں پر محیط یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم کا سنہرا عنوان تھی، انہوں نے نہ صرف ندوۃ العلماء کی ترویج وترقی کی ایک تاریخ رقم کی بلکہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی قیادت وسیادت کا ایسا کارنامہ انجام دیا جس کی نظیر کم ملتی ہے۔

مولانا کی پیدائش برطانوی عہد حکومت میں ہوئی، ہندوستان میں اس وقت تحریک آزادی زوروں پر تھی اور ملک میں نامور علماء ربانین اور مجاہدین اسلام کی ایک بڑی تعداد موجود تھی، مولانا حسین احمد مدنیؒ جہاں تحریک آزادیٔ ہند میں ایک انقلابی شخصیت بن کر نمودار ہوئے وہیں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی فن حدیث میں یکتائے روزگار ہوئے، مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی نے دونوں چشمہ فیض سے سیرابی کی، تو دوسری طرف مجمع البحرین ڈاکٹر سیّد عبدالعلی حسنی ناظم ندوۃ العلماء اور مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی خاص تربیت اور پرداخت کے مواقع میسر آئے، انہوں نے جہاں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے کسب فیض کیا، وہیں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند جیسے شہرۂ آفاق اداروں سے بھی علم و فن اور معرفت خداوندی کی صحبتیں اٹھائیں، گویا وہ جدید وقدیم کا ایسا حسین امتزاج تھے جس پر جتنا بھی رشک کیا جائے کم ہے۔

عالمی شہرت یافتہ ادارہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس کے ذریعہ عملی زندگی میں قدم رکھا تو دیکھتے ہی دیکھتے ادیب دوم اور پھر ادیب اوّل قرار پائے، تصنیف وتالیف کے میدان میں قدم رکھا تو منثورات، الادب العربی اور جزیرۃ العرب جیسی شہرۂ آفاق کتابیں تصنیف کیں جنہوں نے ملک وبیرون ملک کی جامعات کے نصاب میں جگہ پائی، جب ڈاکٹر سیّد عبدالعلی حسنیؒ کی وفات کے بعد مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی ندوۃ العلماء کے ناظم بنے تو یہی مولانا رابع حسنی ان کے معاون اور بنیاد کا پتھر ثابت ہوئے، انہوں نے ناظم ندوۃ العلماء کو اپنے علمی وفکری کاموں، بین الاقوامی اسفار، ملت اسلامیہ ہندیہ کی قیادت وسیادت کے لئے یکسو کر دیا اور ندوۃ العلماء کے امور انصرام شب وروز کی جانفشانی سے انجام دیتے رہے، وہ بیک وقت مدرس بھی تھے، مصنف ومؤلف بھی اور ندوہ کے انتظام وانصرام کی انجام دہی کے علاوہ مفکر اسلام کے رفیق سفر اور شریک کار بھی ہوتے، چنانچہ مفکر اسلام کے دور نظامت میں ندوۃ العلماء کا بام ہندوستان کی سرحدوں سے نکل کر عالم عرب اور امریکہ اور افریقہ تک پہنچا اور ندوہ کی فکر اپنی صلابت، صحت اور اعتدال میں چہار دانگ عالم میں ممتاز ہوئی۔

مفکر اسلام حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی وفات کے بعد باضابطہ ندوۃ العلماء کی ذمہ داری مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی کے سر آئی، وہ اپنے ماموں کے سچے جانشین اور نیک خلف ثابت ہوئے اور انہوں نے ندوۃ العلماء کو عروج وکمال کی بلندیوں پر پہنچایا، زمینی وسعتوں کے ساتھ ساتھ دنیا نے ندوہ کی افادیت کو تسلیم کیا، چنانچہ پورے عالم میں چار سو سے زائد ندوۃ العلماء سے ملحق ادارے اس قافلہ علم وفن اور فکر وادب میں شامل ہوگئے، نئے رواق تعمیر ہوئے، دارالعلوم کی قدیم تاریخی عمارت کا کشادہ دامن تنگ ہوگیا تو جدید درسگاہ کی پرشکوہ عمارت کا وجود ہوا، مختلف شعبے اور

کلیات منصۂ شہود پر آئے اور نہ صرف ہندوستان بلکہ دیگر ممالک کے طلبہ بھی اپنی علمی تشنگی بجھانے کے لئے اس ادارے میں داخل ہونے لگے۔ مولانا سیّد محمد رابع حسنی اب بھی یہاں منتظم تھے، لیکن صرف منتظم نہیں بلکہ اخیر عمر تک انہوں نے درس وتدریس کے سلسلہ کو جاری رکھا، تصنیف وتالیف کا سلسلہ بھی رواں دواں رہا، حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کی وفات کے بعد ارشاد واصلاح امت کا سلسلہ بھی دراز ہوتا گیا اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کا منصب ملنے کے بعد ملت اسلامیہ ہندیہ کی سیادت و قیادت بھی حصہ میں آئی، جملہ امور ایسی سنجیدگی، خوش اسلوبی اور حکمت کے ساتھ انجام دیئے کہ کوئی پہلو کمزور نہ پڑا، جب تک مولانا مرحوم حیات رہے وہ جملہ مسلمانانِ ہند کے ایک نقطۂ اتفاق بنے رہے، جو ہر مسلک اور مکتب فکر کے افراد کو ساتھ لے کر چلتے رہے، جب کہ ان تمام مشاغل کے ساتھ رابطہ ادب اسلامی، پیام انسانیت اور دینی تعلیمی کونسل کی تحریکیں بھی کسی نہ کسی حد تک اپنا اپنا کام کرتی رہیں اور مولانا ان کی سرپرستی فرماتے رہے۔

مولانا عملی زندگی کا یہ ستر سالہ عہد ایک ذات کے بے پناہ کمالات اور اوصاف کو نمایاں کرتا ہے، نظم وانصرام کا ایسا اعلیٰ نمونہ بڑی مشکل سے نظر آتا ہے، اپنی دیدہ وری اور دور رسی سے جہاں ندوۃ العلماء کو مہمیز دیتے رہے، وہیں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے وقار کو تمام سرد وگرم کے باوجود مجروح نہ ہونے دیا، اللہ تعالیٰ نے مولانا مرحوم کو ایسے اوصاف وکمالات سے متصف کیا تھا جنہوں نے ان کے کاز اور مشن کو استحکام بخشا، ان کے شاگردوں کی ایک بڑی تعداد دنیا کے کونے کونے میں نظر آتی ہے جو صرف ایک معمول کے شاگرد ہی نہیں بلکہ اس نسبت کو وہ باعث فخر سمجھتے ہیں اور مولانا سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں، وہیں سالکین کی ایک بڑی تعداد اپنے دلوں کی سرد بھٹی کو گرم کرتی اور معرفت خداوندی اور اصلاح وارشاد کے پر لطف جھونکوں سے فیضیاب ہوتی نظر آتی ہے، وہ اپنے شاگردوں کے بھی محبوب تھے، ہم عصروں کے بھی، خاندان کے بھی ہر دلعزیز تھے اور عوام الناس کے بھی دل میں گھر کرتے تھے، یہ محبوبیت انہیں کے حصہ میں آئی جس کا ایک ہلکا سا مشاہدہ ان کی وفات کے موقع پر نظر آیا، مختلف ملکوں میں غائبانہ جنازہ کی نمازیں ادا کی گئیں، تعزیتی اجلاس ہوئے، مغفرت کی دُعائیں ہوئیں اور غم واندوہ کا یہ عالم تھا کہ گویا ہر فرد بشر اپنے حقیقی سایہ سے محروم ہوگیا ہو، یہ عنداللہ مقبولیت کی دلیل ہے، اور یہ مقبولیت اللہ تعالیٰ صرف اپنے مقرب اور خاص بندوں کو ہی عطا کرتا ہے۔

مولانا کی وفات سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا، ملت اسلامیہ ہندیہ نے محسوس کیا کہ اس نے متاع گراں مایہ کو گم کردیا ہے، وہیں ارکان ندوۃ العلماء ایک مربی، سرپرست اور باپ جیسے شفیق اپنے محسن سے محروم ہوگئے، اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے اور ان کو جنت الفردوس کے اعلیٰ مقام پر فائز کرے۔

سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

اصلاح حال کی ضرورت

مرشد الامت حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندویؒ

”مسلمانوں کے لیے اس دنیا میں بھی فلاح اس میں ہے کہ وہ شریعت کے احکام پر چلیں، ورنہ پروردگار کی نصرت ومدد کے وہ ہرگز مستحق نہیں ہوسکتے، ان کے اسلاف کے ساتھ نصرت خداوندی کے واقعات ان کی فرمانبرداری کی زندگی کی بنا پر تھے، دنیا کی زندگی میں بداعمالی اختیار کرنے پر دنیا میں صرف کافروں کو کمتر سزا ملتی ہے، کیونکہ ان کے لیے اصل سزا آخرت میں رکھی گئی ہے، لیکن مسلمان کی دنیا بھی اسی وقت کامیاب ہوتی ہے جب وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی بجا آوری کرتے ہوں۔“ (بنیاد پرستی اور دہشت گردی- مجرم کون؟:۱۰)

ملت کا بے لوث قائد اور پیکر اخلاص وعمل

مولانا مفتی محمد شمشاد ندوی
(استاذ جامعۃ الہدایہ وقاضی دارالقضاء-جے پور)

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ کے صدر مفکر ملت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب ندویؒ کے سانحۂ ارتحال سے ناقابل تلافی خسارہ ہوا ہے، ان کی رحلت سے عالم اسلام خصوصیت سے ملت اسلامیہ ہندیہ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے، آنکھیں اشکبار ہیں اور دل ودماغ پر غم وافسوس کا سایہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا نعم البدل عطا فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

حضرت مولانا با صلاحیت وباعمل عالم دین، علوم اسلامیہ کے رمز شناس، کامیاب مدرس ومنتظم، دور اندیش وبے لوث قائد اور اخلاص وعمل کے پیکر تھے۔

حضرت والا نے اپنی پوری زندگی علوم اسلامیہ کی تحصیل اور ان کی نشر واشاعت میں گذاری۔ دار العلوم ندوۃ العلماء کے با کمال اساتذۂ کرام سے اکتساب فیض کیا۔ ۱۹۴۸ء میں سند فضیلت حاصل کی۔ ۱۹۴۹ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں بحیثیت معاون مدرس تدریس کا آغاز کیا۔ دعوت وتبلیغ کے سلسلہ میں دوسال حجاز میں مقیم رہے۔ اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تدریس سے وابستہ ہوئے۔ آپ کے طلبہ آج پوری دنیا میں علمی وادبی، تدریسی وتصنیفی اور دینی واصلاحی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ حضرت والا ۱۹۵۵ء میں کلیۃ الادب کے وکیل اور ۱۹۷۰ء میں عمید کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ حضرت مولانا محبّ اللہ لاریؒ کے وصال کے بعد ۱۹۹۳ء میں آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم بنائے گئے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی صاحب ندویؒ کے سانحۂ ارتحال کے بعد ۲۰۰۰ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم منتخب کیے گئے۔ آپ نے بحیثیت ناظم تاریخی خدمات انجام دیں۔ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ کی رحلت کے بعد ۲۰۰۲ء میں باتفاق رائے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب کیے گئے۔ بورڈ کے سابقہ تمام صدور حضرت مولانا حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحبؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ اور قاضی القضاۃ حضرت مولانا مجاہد الاسلام صاحب قاسمی آپ پر اعتماد فرماتے تھے۔ بورڈ کی مختلف سرگرمیوں میں آپ شریک رہے۔ بڑوں کے حکم وسرپرستی میں مختلف خدمات انجام دیں۔ جب آپ امت مسلمہ ہندیہ کے متحدہ پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب کیے گئے تو آپ نے بورڈ کے مقاصد وسرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں نمایاں رول ادا کیا اور اپنی حکمت وبصیرت سے امت کی بہترین رہنمائی فرمائی۔

امت پر جب بھی کوئی مصیبت آئی، حضرت والا نے آگے بڑھ کر امت کی آزمائش ومصیبت دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ آپ نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف پھیلائے گئے شکوک وشبہات کا ازالہ کیا اور اپنی صلاحیت ولیاقت، حکمت وبصیرت اور تجربات کے ذریعہ باطل قوتوں کی سازشوں وتدبیروں کو ناکام بنانے اور امت کو ایمان ویقین اور عزم وحوصلہ بخشنے کی حتی المقدور کوشش کی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب ہونے کے بعد آپ نے کئی اقدامات کیے اور بورڈ کو مزید مستحکم وفعال بنایا۔ آپ نے اصلاح معاشرہ کمیٹی کو باقاعدہ ملک گیر پیمانہ پر وسعت دی۔

حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانیؒ نے آپ کی سرپرستی میں اس

سلسلہ میں اہم رول ادا کیا۔صوبائی کنوینز کا انتخاب عمل میں آیا تا کہ اس تحریک کو عام کیا جائے اور معاشرہ کی برائیوں کو ختم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں تحریک اصلاح معاشرہ کے تحت بورڈ نے اصلاحی عناوین منتخب کیے۔ بورڈ کے منتخب عناوین پر حضرت مولانا محمد فضل الرحیم صاحب مجددی امیر جامعۃ الہدایہ جے پور وکنوینز تحریک اصلاح معاشرہ راجستھان کے حکم سے میں نے اصلاح معاشرہ اور اسلام کے نام سے ایک علمی وتحقیقی کتاب تصنیف کی۔اس کتاب پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب ندویؒ نے جامع مقدمہ تحریر فرمایا جو جامعۃ الہدایہ کے تحقیقی واشاعتی ادارہ الہدایہ اسلامک اسٹڈیز اینڈ ریسرچ سینٹر سے شائع ہو کر بڑے پیمانے پر تقسیم ہوئی، خصوصیت سے یہ کتاب علماء کرام، ائمہ عظام، دعاۃ اور مقررین کو دی گئی، تا کہ ان عناوین پر جمعہ اور مختلف اصلاحی پروگراموں میں خطاب کریں۔اصلاح معاشرہ کے تحت حضرت مولانا شاہ محمد ہدایت علی نقشبندی مجددیؒ کی تصنیفات معیار السلوک، احسن التقویم، در لا ثانی حصہ اول، درلا ثانی حصہ دوم، در لا ثانی حصہ سوم اور جامعۃ الہدایہ کے اساتذہ کی کتابیں تمبا کو اور اسلام، جہیز ایک ناسور، اسلامی خاندان، عورت اسلامی معاشرہ میں اور ہندوستان میں عورتوں کو در پیش مسائل ومشکلات بھی تقسیم کی گئیں۔اساتذہ کرام نے بھی شہر جے پور کی مساجد میں جمع میں خطاب کیا۔الحمد للہ اصلاح معاشرہ کی تحریک راجستھان میں کامیاب ہوئی۔آپ کے دور صدارت میں دار القضاء کے قیام کی طرف بھی خصوصی توجہ دی گئی۔حضرت مولانا عتیق احمد صاحب بستوی کنوینز دار القضاء کمیٹی نے آپ کی سرپرستی میں اہم رول ادا کیا۔آپ کے دور صدارت میں ساٹھ سے زائد مقامات پر نئے دار القضاء کا قیام عمل میں آیا۔راجستھان میں پانچ دار القضاء قائم ہوئے، جس میں دار القضاء آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جامعۃ الہدایہ جے پور کو مرکزیت حاصل ہے۔ دار القضاء کا موجودہ نظام امارت شرعیہ بہار واڑیسہ وجھارکھنڈ ۱۹۲۱ء میں قائم ہوا لیکن اس کے نظام کو ملک گیر سطح پر عام کرنے کی تجویز جامعۃ الہدایہ جے پور میں منعقد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے گیارہویں کل ہند اجلاس ۱۹۹۳ء میں پاس ہوئی، اس کے بعد ہی آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تحت دار القضاء کے قیام کا سلسلہ شروع ہوا۔ آپ کے دور صدارت میں تفہیم شریعت کمیٹی کی تشکیل عمل میں آئی، جس کے کل ہند کنوینز حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی ہیں۔اسلام کے خلاف پھیلائے جارہے شکوک وشبہات کے ازالہ کے ساتھ مسلم وکلاء، عصری علوم یافتہ سیاسی قائدین اور سماجی کارکنوں کو اسلامی قوانین سے واقف کرانے کے لیے یہ کمیٹی تشکیل دی گئی ہے۔اس سلسلہ میں حضرت مولانا خالد سیف اللہ صاحب رحمانی جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی تصنیفات وخطبات اور طریقہ کار سے مثبت نتائج سامنے آرہے ہیں۔ یہ کمیٹی بڑی فعالیت کے ساتھ کامیابی کی راہ پر گامزن ہے۔

آپ نے عالمی رابطہ ادب اسلامی کے صدر کی حیثیت سے اسلامی ادب کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا۔آپ کی سرپرستی میں کئی اہم سمینار وکانفرنس کا انعقاد ہوا اور قیمتی مقالات لکھے گئے اور اسلامی فکر عام ہوئی اور اس کے مثبت اثرات پوری دنیا پر مرتب ہوئے۔مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ اور مرکز الامام ابی الحسن الندوی للبحوث والدعوۃ والفکر الاسلامی دار عرفات رائے بریلی کا علمی وتحقیقی کام آپ کی سرپرستی میں آگے بڑھا اور کئی اہم نئی کتابیں شائع ہوئیں۔ قدیم مطبوعات کی بھی نئے سرے سے اشاعت ہوئی، آپ نے دنیا کے اکثر ملکوں کا علمی وادبی، دینی واصلاحی سفر کیا اور آپ کی ذات سے دنیا فیضیاب ہوئی۔آپ کی عربی زبان میں ۲۰/ کتابیں اور اردو میں تقریباً پچاس کتابیں ہیں، جن میں جزیرۃ العرب، سماج کی تعلیم وتربیت، الادب العربی، دو مہینے امریکہ میں، رہبر انسانیت، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی عہد ساز شخصیت خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

آپ کے قدوم مبارک سے راجستھان کی سرزمین بھی مشرف ہوئی۔ جامعۃ الہدایہ میں خصوصیت سے بار بار آمد ہوئی۔ حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی معیت میں بھی جامعہ تشریف

لائے۔ جامعہ کے جشن افتتاح کا موقع ہو یا عالمی رابطہ ادب اسلامی کا سیمینار ہو، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا گیارہواں اجلاس ہو، یا بورڈ کا چوبیسواں اجلاس ہو، ان پروگراموں کے موقع پر آپ جامعۃ الہدایہ تشریف لائے۔

جامعۃ الہدایہ میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا گیارہواں اجلاس اس وقت ہوا جب حضرت علی میاںؒ بورڈ کے صدر تھے اور بورڈ کا چوبیسواں اجلاس جامعۃ الہدایہ جے پور میں منعقد ہوا تو آپ بورڈ کے صدر تھے۔ جے پور تشریف لائے۔ جامعۃ الہدایہ جے پور کی میزبانی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے دونوں اجلاس تاریخی ثابت ہوئے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کے بعد آپ ہی جامعۃ الہدایہ کے سرپرست تھے۔ آپ کی رحلت سے حضرت مولانا شاہ محمد فضل الرحیم صاحب مجددی، انتظامیہ، اساتذہ کرام، طلبہ اور وابستگان جامعہ سوگوار ہیں اور اپنے آپ کو یتیم محسوس کر رہے ہیں۔ آپ مختلف تعلیمی و تحقیقی اداروں کے رکن اور سرپرست تھے۔ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے رکن رکین، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نائب صدر، عالمی رابطہ ادب اسلامی ایشاء کے صدر، مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء لکھنؤ کے صدر، دینی تعلیمی کونسل کے صدر، تحریک پیام انسانیت کے سرپرست، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے سرپرست، آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی برطانیہ کے ٹرسٹی، تحقیقی واشاعتی ادارہ مرکز الامام ابی الحسن الندوی للبحوث والدعوۃ والفکر الاسلامی دارعرفات کے صدر، عربی مجلّہ الرائد کے بانی ایڈیٹر، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے مجلّات پندرہ روزہ تعمیر حیات اردو، انگریزی مجلّہ The Frangrance of East اور ہندی ماہنامہ سچارا ہی کے سرپرست تھے۔

آپ کو عربی زبان وادب کی خدمات کے اعتراف میں صدر جمہوریہ نے ۱۹۸۲ء میں ایوارڈ سے نوازا۔ آپ کی دینی وعلمی، ملی واصلاحی اور تعلیمی وسماجی خدمات کے اعتراف میں رضا لائبریری نے اعزاز سے اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز نے بھی شاہ ولی اللہ ایوارڈ سے نوازا۔

استاذ محترم حضرت مولانا سید رابع حسنی صاحب ندوی اعلیٰ اوصاف وصفات کے حامل تھے۔ آپ جہاں علوم اسلامیہ اور عربی زبان وادب کے رمز شناس تھے وہیں آپ کی زندگی سیرت نبویہ سے آراستہ تھی، آپ میں مردم شناسی ومردم سازی کا جذبہ بھی بدرجہ اتم اللہ نے عطا فرمایا تھا۔ ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہونے سے پہلے ۱۹۴۹ء میں بحیثیت معاون مدرس دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں تدریس کا آغاز فرمایا اور اخیر تک تدریسی خدمات انجام دیتے رہے۔ مجھے بھی ان سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ آپ طلبہ سے بہت شفقت فرماتے تھے اور تدریس کا پورا حق ادا فرماتے تھے۔ مجھے ان سے کئی کتابیں پڑھنے اور مختلف مواقع پر استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ حضرت والا نے میری اٹھارہ مطبوعہ کتابوں میں سے چار کتابوں؛ جہیز ایک ناسور، اصلاح معاشرہ اور اسلام، ہندوستان میں عورتوں کو درپیش مسائل ومشکلات اور اسلامی خاندان پر پیش لفظ تحریر فرمایا اور اپنی نصیحتوں ودعاؤں سے نوازا۔ آپ کی ایک تحریر بطور نمونہ پیش کرنا یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے۔

”دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے فرزند عزیزی مولانا محمد شمشاد ندوی جو جامعۃ الہدایہ جے پور میں استاذ کے منصب پر تدریس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا مشغلہ رکھتے ہیں، ان کے اس مشغلہ کے جو نمونے سامنے آئے وہ مفید اور تعمیری صفات سے متصف نظر آئے۔ ان میں کئی پر انہوں نے مجھ سے مقدمہ لکھوایا۔ مقدمہ لکھنے کے تعلق سے ان کی متعلقہ تصنیفات پر نظر ڈالنے کا موقع ملتا رہا۔ خوشی ہوتی تھی کہ وقت کی ضرورت اور سہل الفہم انداز میں انہوں نے اسلامی نقطۂ نظر کو پیش کیا اور اسی کے ساتھ ساتھ محتاط علمی طرز کو بھی اختیار کیا، ان کی ان تصنیفات کے ذریعہ علمی پہلو سے اچھے فوائد بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں اور اصلاحی وتربیتی مقصد میں بھی مدد ملتی ہے۔

انہوں نے عام طور سے ایسے موضوعات اختیار کیے جن کا موجودہ زندگی سے گہرا تعلق ہے اور وقت کا موضوع بنے ہوئے ہیں

مثلاً؛ جہیز ایک ناسور، ہندوستان میں عورتوں کے مسائل ومشکلات، اصلاح معاشرہ اور اسلام۔ ان کی یہ تصنیفات ملک کی متعدد اشاعتی اداروں مثلاً فرید بک ڈپو نئی دہلی، مکتبہ مدنیہ دیو بند اور الہدایہ اسلامک ریسرچ سینٹر جامعۃ الہدایہ جے پور سے شائع ہوئیں۔ اب ان کی یہ نئی کتاب ''اسلامی خاندان'' شائع ہونے جارہی ہے۔ اس طریقہ سے ان کی یہ تصنیف خاندان کے اسلامی نظام کے خدوخال کے بیان کرنے پر ایک رہنما کتاب بن گئی ہے جس کا پڑھنا ان سب لوگوں کے لیے جو اس سلسلہ میں اسلام کا نقطۂ نظر جاننا چاہتے ہیں اور اپنے خاندانی تعلقات میں خداوندی احکام کی پیروی کے طریقوں سے واقف ہونا چاہتے ہیں ایک مفید تصنیف ہے۔ ہم کو خوشی ہے کہ عزیز گرامی مولانا محمد شمشاد ندوی نے یہ ایک اچھا کام انجام دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مفید بنائے۔''

(حضرت مولانا) محمد رابع حسنی ندوی

تکیہ کلاں رائے بریلی

۱۴۳۰/۳/۱۷ھ

۲۰۰۹/۳/۱۵ء

جہیز ایک ناسور کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں کہ:

''زیر نظر کتاب مولانا محمد شمشاد صاحب ندوی نے جو ایک بڑے صاحب علم اور عمل کے حامل ہیں، مسلمانوں کے ذہنوں میں اس کی شناعت بتانے کے لیے قرآن وسنت کی روشنی میں تیار کیا ہے۔ میں اس کام کو بہت مفید سمجھتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کی کتاب سے بہت فائدہ ہوگا اور جہیز کے سلسلہ میں مسلمانوں کے غلط رواج کی تصحیح ہوگی۔ اللہ قبول فرمائے۔''

(حضرت مولانا) محمد رابع حسنی ندوی

ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۲۰۰۱/۲/۱۵ء

میری کتابوں پر چار پیش لفظ کے علاوہ حضرت کے کئی خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ حضرت والا کی شفقت ودعائیں مجھ کو ہمیشہ حاصل رہیں اور ان کی نصیحتیں بھی حاصل ہوتی رہیں۔ ان کی رحلت کی خبر سن کر یقین نہیں ہوا لیکن موت برحق ہے۔ اللہ ہمیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ حضرت والا اب اس دنیا میں نہیں لیکن ان کی تصنیفات وخدمات ہمیشہ باقی رہیں گی۔ ان کی نصیحتیں اور یادیں ہمیشہ ہمارے ساتھ رہیں گی۔ اللہ تعالیٰ حضرت کی بال بال مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، تمام اداروں کو ان کا نعم بدل عطا فرمائے اور ان کی قبر کو نور سے بھر دے۔ آمین!

آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

دارالقضاؤں کے قیام کی اہمیت وضرورت

''تحفظ شریعت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی عائلی زندگی میں جو نزاعات ابھرتے ہیں، ان کے حل کے لیے ہم کو ان عدالتوں کی طرف رجوع کم سے کم کرنا چاہیے جہاں اسلامی عائلی قوانین سے واقفیت یا ان کی پسندیدگی نہیں ہے، کیونکہ ان سے ہمارے لیے مطلوبہ حل حاصل کرنا مشکل ہے اور عدالتوں میں مقدمات کی کثرت کی وجہ سے فیصلہ آنے میں بہت تاخیر بھی ہوتی ہے، اس طرح کے امور کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ دارالقضاء قائم کیے جائیں اور مسلمانوں کو اپنے شرعی نزاعات ان میں لے جانے کو کہا جائے، چنانچہ اس پر عمل ہوا اور وہ جہاں بھی ہوا بہت مفید ثابت ہو رہا ہے اور دارالقضاء کا قیام قانونی طور پر صحیح بھی ہے، کیونکہ قانونی طور پر برادریوں کے جھگڑے ان کی پنچایتوں کے ذریعہ خاصی حد تک حل کیے جاتے ہیں اور قانون اس کی اجازت دیتا ہے، لہٰذا دارالقضاء کی حیثیت مسلمانوں کے لیے ایک طرح سے بلکہ قانون کی رو سے شرعی پنچایت کی بنتی ہے، لہٰذا یہ مسلمانوں کے عائلی جھگڑوں اور شرعی نزاعات کے حل کے لیے مفید اور مطابق شریعت حل ہے، چنانچہ ہمارے بورڈ نے اس حل کو مناسب سمجھا ہے، ضرورت ہے کہ دارالقضاؤں کا قیام وسیع اور کثیر طریقہ سے کیا جائے۔'' (حالات حاضرہ اور مسلمان: ۱۷۸-۱۷۹)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

خوشبوان کی یادوں کی

ڈاکٹر عبدالقادر چوغلے
(ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی-جنوبی افریقہ)

16/دسمبر 1989ء میں پہلی مرتبہ ندوۃ العلماء میں حاضری اور عظیم عالم دین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، انہی دنوں حضرت مولاناؒ کی اہلیہ کا سانحہ ارتحال ہوا تھا، جس کی وجہ سے تعزیت کے لیے ہمیں تکیہ کلاں رائے بریلی کا سفر بھی کرنا پڑا اور وہاں پہلی مرتبہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے ہماری ملاقات ہوئی، پہلی ہی ملاقات میں راقم سطور مولانا کی سادہ مزاجی، جاذبیت اور ان کی خوش اخلاقی سے بہت متاثر ہوا، ان کی گفتگو مختصر مگر پُر اثر ہوتی تھی۔

علم وعمل کے اس ماہتاب سے میری دوسری ملاقات 2000ء میں ہوئی اور یہ وہ موقع تھا جب حضرت والاؒ میرے وطن Springs جنوبی افریقہ تشریف لائے تھے، انہوں نے ہمارے یہاں ایک مسلم اسکول کی زیارت کی، جہاں میں کئی برسوں سے بحیثیت استاد خدمت انجام دے رہا تھا، اسکول میں آپ کا بیان بہت جامع اور مسحور کن تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ اللہ والوں میں من جانب اللہ ایسی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ اپنی سادہ بیانی اور پر اثر شخصیت سے لوگوں کی زندگی بدل سکتے ہیں اور حضرت مولانا کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہیں جنہوں نے اللہ والوں کی تمام صفات کو اپنی پر کشش شخصیت میں سمولیا تھا۔

اس کے بعد 2005ء میں حضرت مولانا سے ملاقات اور مزید استفادہ کا موقع ملا، دراصل مجھے اپنی PhD کے دوران بعض ایسی دستاویزات اور محفوظہ کتب کی ضرورت تھی جو ندوۃ العلماء کے کتب خانہ شبلی میں موجود ہیں، کیونکہ میری PhD کا موضوع تھا:

"Islamic Resurgence: Sayyid Abul Hasan Ali Nadwi and his Contemporaries"

(تجدید اسلامی: سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ان کے معاصر)

میں نے اسی سلسلہ میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے فون پر رابطہ کیا اور ان سے اپنی ریسرچ کا تذکرہ کیا، پھر انہی کے ایماء پر ندوہ حاضر ہوا اور ایک ہفتہ مہمان خانہ میں مقیم رہا، اس دوران حضرت کی طرف سے مکتبہ شبلی کے ملازمین کو تعاون کے لیے بطور خاص ہدایات دی گئیں، تاکہ میرے ہفتہ بھر کا قیام زیادہ سے زیادہ مفید ہوسکے۔ ندوۃ العلماء میں ہفتہ بھر کے قیام سے نہ صرف یہ کہ علمی فائدہ ہوا، بلکہ ذاتی زندگی میں بھی بڑا نفع حاصل ہوا۔

میں نے اس مدت میں دیکھا کہ حضرت مولاناؒ کی میزبانی اور فیاضی مثالی تھی، سچی بات یہ ہے کہ مجھے زندگی میں جو کچھ ادب حاصل ہوا وہ انہی مشائخ کی صحبتوں کا نتیجہ ہے، جن کی تواضع اور قرب مع اللہ کو دیکھ کر مجھے بھی کچھ سیکھنے کا موقع ملا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی شام روحانیت سے لبریز اور آداب سے بھرپور ہوتی تھی، ان کی مجلسی گفتگو میں زیادہ تر ملفوظات نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرنے پر ہوتے تھے، یا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ ہوتا تھا، اس کے علاوہ مجلس کے اندر ان کی خاموشی ان کی روحانی بلندی کو بیان کرتی تھی، بلاشبہ وہ حاضر ہونے والے راہِ سلوک کے طالبین کی زندگیوں کو تبدیل کرنے کی انتہائی صلاحیت رکھتے تھے۔

2011-2012ء میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی حیات اور کارناموں پر مشتمل میری دو اہم کتابیں زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آئیں۔ دراصل اصلاح وتجدید کا

موضوع فکر اسلامی کا ایک اہم جز ہے، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی اہم کتابوں پر میرے اس کام کا مقصد اسی موضوع پر جدید طریقہ سے افہام وتفہیم پیدا کرنا تھا۔

الغرض میں نے اپنی یہ دونوں کتابیں حضرت مولاناؒ کی خدمت میں تبصرہ کی غرض سے ارسال کیں، جن کے موصول ہونے پر حضرت مولاناؒ نے مجھے بذریعہ ای میل مبارک باد دی اور اصلاح وتجدید کے موضوع پر حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے کارناموں پر مشتمل میری دونوں کتابوں کو بہت پسند فرمایا اور بڑی خوشی کا اظہار کیا۔

واقعہ یہ ہے کہ فون پر حضرت مولانا رابع صاحبؒ کے ہمت افزا کلمات اور ان کے دعائیہ الفاظ مجھے بڑا حوصلہ بخش دیتے تھے، اگر کبھی میں ذہنی تناؤ کا شکار ہو جاتا، یا میرے تحقیقی کاموں میں بعض وجوہات کی بنیاد پر کوئی رکاوٹ آجاتی، تو یہ میرا ذاتی تجربہ تھا کہ آپ جیسی مبارک اور عظیم شخصیت سے تھوڑی دیر بات کرنے کے بعد وہ تمام پریشانیاں دور ہو جاتی تھیں اور آپ کے ہمت افزا کلمات گویا میرے اندر یہ تحریک پیدا کر دیتے تھے کہ میں اپنا کام مسلسل جاری رکھوں۔ اس طرح کے ذاتی تجربات اتنے زیادہ ہیں جنہیں میں شمار بھی نہیں کرسکتا کہ کتنی بار میں نے اس انداز میں حضرت مولاناؒ سے مدد لی اور ان سے حوصلہ پایا۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے انہیں انتہائی درجہ کی مومنانہ فراست وذکاوت عطا کی تھی، جس کے نتیجہ میں ان کی ہر بات متصوفانہ رنگ میں ڈوبی ہوتی تھی اور وہ اس میدان کے بہترین شہسوار تھے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی تحریروں کو سمجھنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع مجھے اس وقت زیادہ قریب سے حاصل ہوا جب مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی سے میرا رابطہ ہوا، میں نے ان کے جدید ذہنوں کو اسلامی تعلیمات پیش کرنے کے اسلوب سے بہت کچھ سیکھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی پر مغز تحریروں نے عربی ادب کو فروغ بخشنے کے ساتھ عرب وعجم میں ایک اہم مقام پیدا کرلیا تھا۔

مولانا رابع حسنی ندویؒ نے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی سرپرستی میں رہ کر قرآن وحدیث کی تعلیمات کی روشنی میں موجودہ مسائل پر خوب لکھا، خاص طور پر ہندوستان کے مسلم سماج پر انہوں نے توجہ دی جو صحیح اسلامی تعلیمات سے منحرف ہو چکا ہے۔

2017ء میں ''خلیق احمد نظامی مرکز علوم القرآن'' کی جانب سے مجھے ''سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ان کی قرآنی خدمات'' کے موضوع پر سالانہ محاضرہ کی دعوت ملی، جس میں شرکت کے بعد میں لکھنؤ حاضر ہوا اور حضرت مولانا رابع صاحبؒ سے ندوہ میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا، یہ ملاقات گرچہ بہت مختصر تھی، لیکن اس میں بھی ان کی مہمان نوازی مثالی تھی، جس نے مجھے ہمیشہ سب سے زیادہ متاثر کیا، اسی کے ساتھ ان کے یہاں طعام کی سادگی بھی ان کی انتہائی تواضع کی سند تھی۔ اس موقع پر حضرت نے مجھے ''قرآن مجید- انسانی زندگی کا رہبر کامل'' ایک نسخہ پیش کیا۔ بلاشبہ یہ کتاب قرآن کے دائمی پیغام اور اس کے معانی ومفاہیم کو سمجھنے میں بڑی اہم ہے، مثلاً: توحید کے باب میں اسلامی عقائد سے متعلق سلیس اسلوب میں ایسی معلومات ہیں جن کو کسی دوسری جگہ سمجھنا آسان نہیں ہے، لیکن حضرت مولانا رابع صاحبؒ نے ایسے منطقی انداز میں اس تفصیل کو پیش کیا ہے جو ان کے قرآن سے گہرے ربط وتعلق کی حقیقی آئینہ دار ہے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے مضامین سے میرے استفادہ کا سلسلہ عرصہ دراز سے جاری ہے، میرے نزدیک ان کی تحریروں میں بڑی گہرائی وگیرائی اور امت کے لیے ایک درد پنہاں ہوتا ہے، جن کا خلاصہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنی زندگیوں کو قرآن وحدیث کے مطابق ڈھال لیا جائے۔

حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی عظیم شخصیت سے پوری امت متاثر تھی اور مسلمانوں کے ہر طبقہ سے ان کا خلا ملا تھا، اسلامی تنظیموں اور مختلف جگہوں کی تحریکوں کے نزدیک وہ ہمیشہ الفت ومحبت کا مرکز اور نقطہ اتفاق بنے رہے، اس کے علاوہ متعدد عالمی تنظیموں میں بھی ان کی شرکت رہی اور سب سے بڑھ کر انہوں نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے امت مسلمہ ہندیہ کی ایسی رہنمائی کی جس کے نتیجہ میں ان کا ''مرشد الامت'' لقب یقیناً درست ہے۔

پاکیزہ زندگی — پاکیزہ موت

مولانا ڈاکٹر ہارون رشید ندوی
(دفتر اہتمام دارالعلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی ولادت ۱۹۲۹ء میں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب برطانوی حکومت کے خلاف مسلمان اور ہندو دونوں ایک ساتھ ہندوستان کی آزادی کی تحریک چلا ہی نہیں رہے تھے بلکہ یہ تحریک عروج سے آگے بڑھ کر تقریباً فتح کے قریب تھی اور ہندوستان کے اقتصادی حالات دوسری عالمی جنگ کے بعد بہت خراب تھے، ان حالات سے مسلمان اور ان کے ادارے بھی متاثر تھے، حتی کی زندگی گزارنا مشکل ہوگیا تھا، ایسے حالات میں حضرت کی ولادت ہوئی اور آپ کی تعلیم وتربیت آپ کے بڑے ماموں حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ اور چھوٹے ماموں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی میاں ندویؒ نے کی۔

آپ کا ننہال دینی وملی شخصیات کا مرکز تھا، دیکھئے حکیم الامت لکھنؤ آرہے ہیں تو ڈاکٹر عبدالعلی سے ملنے گوئن روڈ تشریف لا رہے ہیں اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب لکھنؤ آرہے ہیں تو وہ بھی از خود ان کے مکان پر تشریف لا رہے ہیں، اسی طرح شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو دیکھئے کہ وہ بھی تشریف لا رہے ہیں۔ گویا اس طرح حضرت مولانا رابع صاحب کو جلیل القدر ہستیوں کی خدمت کا خوب موقع ملا اور دینی وملی شخصیات کی خوب توجہات حاصل ہوئیں، کیونکہ وہ سب ہستیاں ان کے ماموں کی نسبت سے ان کے گھر قدم رنجاں ہوتی تھیں۔

آپ کا خاندانی پس منظر:

آپ کا تعلق سید احمد شہیدؒ کے خاندان علم اللہی میں شاہ محمد ہدیٰ کی شاخ سے تھا، جس میں کئی ممتاز اور کئی بزرگ شخصیات کے حامل عالم اور مصلح پیدا ہوئے، خاندان علم اللہی میں مولانا سید شاہ آیت اللہ کی شاخ میں بھی کئی ربانی شخصیات یکے بعد دیگرے پیدا ہوئیں، حسنی خاندان صرف علم اللہی سلسلہ پر مشتمل نہ تھا، اس کی دیگر شاخوں میں بھی متعدد بڑی شاخیں پیدا ہوئیں اور علم اللہی شاخ میں شامل ہوگئیں۔

علم اللہی شاخ میں شاہ محمد عدل، شاہ ابوسعید حسنی، مولانا سید شاہ محمد واضح، مولانا سید محمد صابر، مولانا محمد ظاہر، شاہ ضیاء النبی ان مذکورہ بالا شخصیتوں کے تسلسل کے طور پر اخیر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نمایاں ہوئے، ان ہی میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی بھی ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ کے والد کے چچازاد اور خالہ زاد بھائی بیرسٹری کی تعلیم لندن سے حاصل کر کے آئے تھے اور حقیقی ماموں زاد بھائی امریکہ سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے، ان کا چرچہ تھا، وہ مولانا کے بھائیوں پر بڑے شفیق تھے اور باوجود زمین، جائداد کے بڑی تنگی اور پریشانی تھی، اگر مولانا چاہتے تو عصری تعلیم حاصل کر کے ملازمت حاصل کر کے خوش حال ہوجاتے، لیکن حضرت کے والد ماجد سنتے بولتے نہیں تھے مگر انہوں نے خود دینی تعلیم حاصل کی اور مستقل مطالعہ کرتے تھے اور مزاج بھی دینی تھا، صاف طور پر انہوں نے مولانا رابع صاحب سے فرمایا کہ تم اپنے لیے علی کو نمونہ بناؤ، چنانچہ حضرت نے مولانا علی میاں کا ساتھ مضبوطی سے پکڑ ہی نہیں لیا بلکہ آپ حضرت مولانا علی میاں کے ساتھ رہنے لگے، سفر

حضر، خلوت وجلوت میں آپ ہی آپ تھے۔

جہاں تک عربی زبان وادب کی تعلیم کا تعلق ہے، اس میں بلا شبہ سب سے بڑا حصہ خود آپ کے ماموں حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کا دکھائی دیتا ہے، آپ فرماتے تھے کہ ماموں جی سخت تعلیمی اصول اختیار فرماتے تھے، غلطی بہت مشکلوں سے معاف کرتے تھے اور کئی کئی روز تک اور بعض اوقات ہفتوں اس پر ملامت اور تکلیف کا اظہار کا سلسلہ چلتا رہتا جس کی وجہ سے دوبارہ غلطی کرنے کی جرأت نہ ہوتی بلکہ چوکنا رہنا پڑتا، غرض کہ آپ کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔

ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد آپ کا داخلہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں ہوا، دار العلوم سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے، وہاں کے بڑے اساتذہ سے ذاتی طور پر استفادہ کیا، کچھ وقت آپ نے حرمین شریفین میں بغرض تعلیم وقت گزارا۔

دار العلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد:

آپ نے تقریباً ۱۹۴۹ء میں تدریسی فرائض انجام دینا شروع کردیے، آپ کے درس سے طلبہ مطمئن ہی نہیں بلکہ آپ کے انتظار میں رہتے تھے، آپ جب پڑھانا شروع فرماتے تو الفاظ کی کڑیاں سلجھاتے ہوئے الفاظ کی ابتداء وتاریخ اس طرح بتاتے جیسے آنکھوں دیکھا حال ہو۔ عربی زبان وادب سے خصوصی لگاؤ تھا۔ ''البعث الاسلامی'' جیسا شہرآفاق آرگن آپ ہی کی زیرنگرانی نکلتا تھا، جس میں مضامین لکھتے تھے۔ عربی فہمی کے لیے آپ مجلس میں فرماتے تھے کہ ہم لوگ عربی زبان وادب میں مہارت حاصل کرنے کے لیے مصری ریڈیو سے خبریں سننے کے لیے ایک صاحب کے گھر جاتے تھے، اس لیے کہ اس زمانہ میں ریڈیو ہر ایک کے پاس نہ ہوتا تھا۔ فرماتے کہ کبھی وہ صاحب سو جاتے اور کبھی کہتے ریڈیو خراب ہے مگر ہم پھر بھی روز جاتے تھے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ یہ ناکام کوششیں اللہ نے قبول کرلیں جس کے نتیجہ میں کچھ لکھنے کی شد بد پیدا ہوگئی، آپ کی تدریس کا انداز نرالا تھا، جس نے آپ سے تعلیم حاصل کی وہ آپ کا گرویدہ ہی ہوگیا۔

پندرہ روزہ عربی رسالہ الرائد کے آپ بانی ہیں، آپ نے طلبہ کے لیے یہ مجلّہ نکالا، اس میں طلبہ کے بھی مضامین شامل فرماتے تھے، اس سے طلبہ میں لکھنے کی مشق ہوئی اور آج بھی الرائد میں طلبہ کے مضامین طلبہ کی ہمت افزائی کے لیے شامل کیے جاتے ہیں۔

مولانا نے تقریباً ۷۵ یا ۸۰ رسال طلبہ کی تربیت کی، آپ کے شاگردوں کی ان گنت تعداد ہے، مولانا دار العلوم میں تدریس کے ساتھ اہتمام کی کرسی پر جلوہ افروز ہوئے اور وہ بھی ایک سنہرا دور رہا۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کے انتقال کے بعد تقریباً ۲۳ رسال دار العلوم کی نظامت کے فرائض بھی بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے بھی آپ صدر رہے، امت کی خیر خواہی فرماتے رہے اور بہت سے اداروں کے صدر وسرپرستی کرتے رہے۔ آپ امت کی خدمت کرتے ہوئے مورخہ ۲۱ر رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ جمعرات کو اس دار فانی سے دار بقاء کی طرف ہم سب سے جدا ہوکر چلے گئے۔ دار العلوم کی در و دیوار کو سوگوار کرکے رخصت ہوگئے، حضرت کی مقبولیت کا اندازہ حضرت کے جنازے سے ہوا کہ لکھنؤ واطراف لکھنؤ سے انسانوں کا سیلاب دار العلوم ندوۃ العلماء میں امڈ آیا، پورا دار العلوم حضرت کے چاہنے والوں سے بھر گیا، دار العلوم میں نماز جنازہ ہوئی، اس میں لوگ مسجد ومہمان خانہ سے لے کر باہر بندھے تک لوگ موجود تھے، حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب نے نماز جنازہ پڑھائی۔

دوسری نماز جنازہ صبح آٹھ بجے تکیہ کلاں رائے بریلی میں ایک جم غفیر نے حضرت مولانا سید بلال حسنی دامت برکاتہم کی اقتدا میں ادا کی، اللہ تعالیٰ ہم سب کو حضرت کی تعلیمی وتدریسی عمل کو اسوہ بنا کر کام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

حافظ سید محمود اشرف اشرفی
(مہتمم مدرسہ سید احمد شہید، تکیہ کلاں-رائے بریلی)

ساری حمد وثنا اس قادر مطلق اور رب کائنات کی ہے جس نے اپنے دین حنیف کی تکمیل اپنے محبوب حضرت محمد ﷺ کے ذریعہ فرمائی، جو اس آخری اور مکمل دین کی حفاظت واشاعت کے لیے ہر زماں ومکاں میں ایسے محبوب بندے بھیجتا رہا جنہوں نے اصلاح امت اور اشاعت دین کا کام وسیع پیمانے پر انجام دیا، انہی مقبول اور بلند پایہ شخصیات میں جن کو ہم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے نام سے جانتے ہیں، جن کے پیش نظر صرف اور صرف اللہ رب العزت کے کلمہ کو بلند کرنا اور اس کے دین کو غلبہ دینا اور اس کی شریعت کو رواج دینا تھا اور حضور ﷺ کی سنتوں کو زندہ کرنا اور بدعات وخرافات کو ختم کرنا تھا۔

احقر تقریباً ۲۶/سال سے مدرسہ سید احمد شہید (تکیہ کلاں-رائے بریلی) سے وابستہ ہے، شروع میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جب حیات تھے، تو حضرتؒ سے زیادہ سابقہ نہیں ہوتا تھا، لیکن ان کے وصال کے بعد مدرسہ کے کام کے سلسلہ میں اکثر ملاقات کرنا ہوتا تھا، تو حضرت اتنی نرمی اور محبت کا معاملہ کرتے تھے کہ بسا اوقات ہم کو خود شرمندگی ہوتی تھی اور تعجب بھی ہوتا تھا، حضرت والاؒ نے کبھی کسی بھی بات کو رد نہیں کیا اور اس طرح گفتگو کرتے تھے کہ کوئی شخص بھی اپنی ہر بات کہہ سکتا تھا، بیماری کی حالت میں بھی اگر دستار بندی کے لیے کہا تو انکار نہیں کیا، حالانکہ بارہا ایسا ہوا کہ اسی وقت طبیعت خراب ہوگئی۔

ایک مرتبہ حضرت والاؒ نے نصیحت فرمائی کہ تم مدرسہ کا جتنا کام کر سکتے ہو کر دیا کرو، لیکن دوسرے کسی بھی شخص سے اتنے کام کی امید مت رکھو، معاملات وہاں خراب ہوتے ہیں جب انسان کام کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ جب ہم نے اتنا کام کیا ہے تو دوسرا بھی اتنا کام کرے۔

حضرت والاؒ دین کی خدمت کرنے والوں سے بہت خوش ہوتے تھے اور بڑی محبت کرتے تھے اور حضرت والاؒ نے کبھی احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا، بہت پہلے کی بات ہے جب حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو دبئ کا ایوارڈ ملا تھا اور رقم تقسیم ہو رہی تھی، مدرسہ سید احمد شہید (تکیہ کلاں) کو صرف دس ہزار کی رقم دی گئی، ہم نے حضرت والاؒ سے کہا تو حضرتؒ نے فرمایا کہ رقم اس لیے کم دی ہے کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اپنے گھر کے مدرسہ کو بہت زیادہ دیا ہے۔

میری آخری ملاقات ۱۳/مارچ ۲۰۲۳ء کو ندوہ میں ہوئی، کافی دیر تک حضرت والاؒ بات کرتے رہے، ساتھ میں کافی نصیحت کی اور مدرسہ کے بارے میں بھی بات کی، جب ہم نے بتایا کہ رمضان میں انشاء اللہ عمرہ کے لیے جاؤں گا تو حضرتؒ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میرے لیے خوب دعا کرنا۔ معلوم نہ تھا کہ یہ آخری ملاقات ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور حضرتؒ نے جو رہنمائی فرمائی ہے ہمیں اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

> ”ملک ہندوستان میں ہم مسلمانوں کو زیادہ سوجھ بوجھ اور محنت سے کام کرنا ہوگا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اعلیٰ قسم کی صلاحیتیں دی ہیں، اگر ان صلاحیتوں سے وہ کام لیں تو تمام قوموں سے وہ فائق ہو سکتے ہیں۔ (تحفہ جنوب:۶۱)
>
> مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

حسن اخلاق کا حسین پیکر

مولانا شیخ ابرار احمد ندوی
(استاد دار العلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

یہ میرے لیے بڑی سعادت کی بات ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں قیام کی برکت سے اپنے اساتذۂ کرام میں جن سے سب سے زیادہ قرب اوران کی مجالس میں بیٹھنے اور علمی و دینی استفادہ کا موقع ملا، ان میں سب سے نمایاں نام مربی جلیل حضرت الاستاذ مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا ہے۔ حضرت مولاناؒ سے سب سے پہلے باقاعدہ ہم نے ''الادب العربی بین عرض ونقد'' کا درس ۱۹۹۴ء میں لیا، پھر سبع معلقات کا درس علیا ثانیہ شریعہ میں لیا۔ حضرت مولانا کا درس بڑا پرسکون ہوتا تھا، جس پر علمی متانت و وقار کی فضا غالب رہتی تھی۔ ہمارے رفقاء بھی بہ نسبت دوسرے گھنٹوں کے اس گھنٹے میں زیادہ سنجیدہ اور ہمہ تن گوش رہتے تھے اور آج یہ تحریر لکھتے ہوئے بھی حضرت مولاناؒ کی شیریں گفتگو کی حلاوت اور مسکراتے ہوئے لبوں کی شفقت کا حسین منظر دل کو موہتا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مولاناؒ ہم طلبہ کے لیے ایک کتابی استاذ ہی نہیں بلکہ مربی بھی تھے۔ ہماری تربیت اور حوصلہ افزائی کے لیے حضرت مولانا خاص طور سے ذاتی ملاقاتوں میں بے تکلف اپنے بچپن کے تعلیم وتربیت کے وہ واقعات بھی سناتے جن میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی توجہ اور تنبیہات کا تذکرہ ہوتا۔ جب ہم دار العلوم میں استاد ہو گئے تو حضرت مولاناؒ اپنے زمانہ تدریس کے واقعات جن میں پڑھنے پڑھانے کے لیے کس طرح محنت کی جاتی ہے اور آپ نے کس طرح محنت کی، ہمیں سناتے، جو ہم نوعمر اساتذہ کے لیے بڑے چشم کشا ہوتے۔

بلاشبہ آپ کو نئی نسل کی تربیت کی فکر ایسی دامن گیر رہتی تھی کہ جب کبھی آپ کے پاس بیٹھتے بس خیر وخیریت کے بعد موضوع گفتگو دینی، علمی اور فکری رہنمائی کا رخ اختیار کر جاتا۔ ۲۵؍سال پرانی بات ہے، ۲؍جون ۱۹۹۸ء بروز منگل ۶؍صفر ۱۴۱۹ھ بعد نماز عصر آپ مہمان خانہ کے برآمدے میں کرسی پر تشریف فرما تھے، میں خدمت میں حاضر ہوا تو شفقت سے اپنے پاس بٹھایا، حال دریافت کرنے کے بعد فرمایا:

''ایک استاذ کے لیے فکر اسلامی کی پختگی و رصانت بہت ضروری چیز ہے۔''

اور پھر فرمایا:

''اس سلسلہ میں احمد امین کی "فجر الإسلام، ضحى الإسلام" اور "ظهر الإسلام" کو اول تا آخر پڑھنا بہت مفید ہے اور "حاضر العالم الإسلامي" میں شکیب ارسلان کے اضافے خاص طور سے پڑھنا چاہیے اور مقدمہ ابن خلدون جغرافیہ کے باب کو چھوڑ کر ثقافت کے باب کو پڑھنا چاہیے اور اس میں جاحظ کی کتاب "البیان و التبیین" اور ابن قتیبہ کی ''أدب الکاتب'' بہت مفید ہیں۔''

بلاشبہ ایک نوعمر استاذ کے لیے یہ رہنمائی لعل وگہر سے کم نہ تھی۔

''آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ ہر انسان اپنی محنت سے بنتا ہے، ماں کے پیٹ سے کوئی سیکھ کر نہیں آتا۔ ہمارے پاس جو کچھ معلومات کا ذخیرہ ہے وہ سب ایک دوسرے سے ہی سیکھا ہے، اس لیے انسان کو اچھی صحبت اور اچھے ماحول میں رہنے کی کوشش کرنا چاہیے اور اچھی تحریریں پڑھنا چاہیے۔''

حضرت مولانا حسن اخلاق کا پیکر اور گفتگو میں بہت محتاط تھے بلکہ اس میدان میں نہ صرف ہمارے لیے بلکہ اس زمانے کے لیے بلا

مبالغہ آئیڈیل ونمونہ تھے، بلاشبہ اہل تعلق میں کوئی ایسا نہ ہوگا جو اس بات کی شہادت نہ دے کہ ہماری ملاقات ہوئی اور آپ کے لبوں پر تبسم و مسکراہٹ نہ ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس مادی، خودغرضی، تکلف وتصنع کے زمانہ میں آپ "ولو أن تلق أخاك بوجه طلق" کی عملی تصویر تھے۔

۱۰-۱۱رسال پہلے کا واقعہ ہے کہ کانپور سے ایک صاحب تشریف لائے ان کی وضع داری، حلیہ ولباس سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی شریف خاندان سے تعلق ہے، لیکن وہ مایوس اور پریشان سے تھے۔ اچانک عصر کی نماز کے بعد مسجد کے باہر مہمان خانہ کے پاس ملاقات ہوئی، انہوں نے مجھ سے عرض کیا کہ میں حضرت مولانا محمد رابع حسنی صاحب سے ملنا چاہتا ہوں اور میرا بھائی (P.G.I) ہسپتال میں ایڈمٹ ہے، موذی مرض میں مبتلا ہے، اس کا آپریشن ہونا ہے اور مصارف کا کوئی معقول نظم نہیں ہے، انہوں نے ایک مسلم وزیر کا نام لیا، ان کے نام میں سفارشی تحریر چاہتا ہوں۔ میں نے ان کو ہمارے بڑوں کے مقام ومرتبہ اور ان کی ایسی تحریروں سے مجبوری اور احتیاط کرنے سے واقف کرایا۔ بہرحال حضرت مولانا سے ان کی ملاقات ہوئی، حضرت مولانا ان سے حسب عادت خندہ پیشانی سے ملے اور میں یہ منظر دور سے دیکھ رہا تھا، کیا گفتگو ہوئی مجھے معلوم نہیں۔ البتہ جب یہ صاحب ملاقات کے بعد واپس آئے تو اب ان کا بیان سنیے، وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے کہ

"حضرت مولانا سفارشی تحریر دیں یا نہ دیں، حضرت کی مسکراہٹ اور محبت کے ساتھ ملنے سے میرا آدھا غم دور ہوگیا ہے۔"

اسی طرح حضرت مولانا کی خدمت میں ایک دہائی سے زیادہ عرصہ گزارنے والے ہمارے رفیق مولانا سید سبحان ثاقب ندوی بھٹکلی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء سے میں نے مختلف اوقات میں تقریباً دو تین بار سوال کیا کہ آپ حضرت مولانا کی خدمت میں ایک زمانہ سے ہیں، یہ بتائیں حضرت مولانا کی سب سے نمایاں خوبی آپ نے کیا محسوس کی؟ تو ان کا ایک ہی جواب رہا کہ آپ اخلاق نبوی کا عملی پیکر تھے۔

حضرت مولانا جس طرح اخلاق وکردار میں بلند تھے، گفتار میں بھی بہت محتاط تھے، اس موقع سے مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے کہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے پہلی مرتبہ صدر منتخب ہونے کے بعد آپ کا پہلا سفر آسام کا ہوا، یہاں آپ کا لاکھوں مسلمانوں نے شاندار تاریخ ساز استقبال کیا۔ اس کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں عشاء کے بعد طلبہ کی مجلس میں رفیق سفر ومعاون ناظر عام جناب حاجی شاہد حسین صاحب زید مجدہ نے سفر کی مختصر روداد سناتے ہوئے عرض کیا:

"حضرت آسام کے مسلمانوں نے آپ کا ایسا استقبال کیا کہ ابھی قریبی زمانہ میں ہمیں ایسا دیکھنے اور سننے کو نہ ملا۔"

تو حضرت نے برملا فرمایا:

"اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں، یہ تو درحقیقت ان کی دین سے قلبی محبت اور اس کی عظمت کا اظہار تھا۔"

اس کے بعد موضوع کو دوسرا رخ دے دیا۔

اس طرح کے دسیوں واقعات، یادیں اور باتیں ہیں جن کو اہل تعلق خوب جانتے ہیں اور اہل قلم لکھیں گے اور ہم ان سے اپنی زندگی میں رہنمائی لیتے رہیں گے۔

بس اللہ تعالیٰ ان سب کو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی حسنات میں اضافہ کا ذریعہ بنائے۔ آمین!

صحبت کا اثر

"صحبت کا بہت اثر پڑتا ہے، انسان جو بھی سیکھتا ہے، اس میں صحبت کا خاص حصہ ہوتا ہے، اگر زندوں کی صحبت میسر نہ ہو تو اسلاف کی کتابوں کا بھی اثر پڑتا ہے، وہ صحبت کا قائم مقام ہوجاتی ہیں اور ان کتابوں کے مصنفین کے اثرات پڑھنے والوں پر مرتب ہوتے ہیں۔" (افادات علم وحکمت: ۵۷)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

بیاباں کی شب تاریک میں قندیلِ رہبانی

مولانا محمد وثیق ندوی
(استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

سہ پہر بروز جمعرات ۲۱؍رمضان ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ء کو امت مسلمہ اپنی ایک ممتاز علمی، ادبی، تعلیمی، تربیتی، فکری، اصلاحی، دعوتی اور قائدانہ صفات کی حامل شخصیت سے محروم ہوگئی؛ یعنی آسمان علم وادب کے ماہِ تاباں، فکر وآگہی کے روشن چراغ اور علم وعمل کے بحر بیکراں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے درمیان سے رخصت ہوگئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغِ رخ زیبا لے کر

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ؛ نرم وخوئی وبردباری ان کا شیوہ، حکمت ودانائی ان کا امتیاز، علم وآگہی ان کی شان اور سخن شناسی وادب پروَری ان کی پہچان تھی۔ وہ برصغیر ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلامی میں علم ودانش کے علم بردار تھے، ہندوستان سمیت دنیا کے مختلف حصوں میں رہنے والے مسلمانوں نے ملاقاتوں کے ذریعہ، تحریر وصحافت کے ذریعہ، درس وتدریس کے ذریعہ، اصلاح ودعوت کے ذریعہ، خط وکتابت کے ذریعہ، خطبات اور لیکچرز کے ذریعہ اور سماجی رابطہ کے نئے وسائل کے ذریعہ ان سے خوب استفادہ کیا۔ انہوں نے اپنی طویل بابرکت عمر (۹۶؍سال) اسلام اور اہل اسلام کی خدمت کے لیے گزاردی، ان کی زندگی تعلیم وتربیت، درس وتدریس، تحریر وتقریر، تبلیغ ودعوت، اصلاح ورہنمائی اور نصیحت وخیرخواہی کے لیے وقف تھی۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی پرورش بڑے اہتمام سے ہوئی تھی، وہ ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو علم وادب کی خوشبو سے معطر، دین داری وتقویٰ کے نور سے منور، تواضع ونرم خوئی کی دولت سے مالا مال، عزم وحوصلہ کی قوت سے بہرہ ور اور جہد مسلسل اور جہاد فی سبیل اللہ کے جذبہ سے سرشار تھا۔ اس نورانی ماحول میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور علم وادب کا چشمہ خود اپنے گھر میں بہتے دیکھا، اسلام کا گہرا علم، عمل کا سچا جذبہ، دعوتِ دین واصلاحِ قلوب کی فکر، خلوص وللّٰہیت اور امانت ودیانت کی دولت انہوں نے اسی روح پرور اور پاکیزہ ماحول میں پائی۔ خاندان کے اہل علم اور اساتذہ کے علاوہ انہوں نے عالم ربانی حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، محدث جلیل شیخ محمد زکریا کاندھلویؒ اور مجاہد آزادی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے احسان وسلوک میں خاص طور پر استفادہ کیا۔ اپنے بڑے ماموں ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ کی بھی خصوصی توجہات انہیں حاصل تھیں اور چھوٹے ماموں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی تربیت اور نگرانی میں انہیں ایک طویل مدت تک رہنے اور ان سے علمی، ادبی، فکری، دعوتی، اصلاحی اور تربیتی امور میں فائدہ اٹھانے کا موقع ملا۔ چنانچہ وہ ان کے سفر وحضر کے رفیق رہے اور ان سے استفادہ کا کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا، یہاں تک کہ اخلاق وعمل اور شکل وشباہت میں ان کا پرتو بن گئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ وہ سیرت وکردار، فکر وخیال، منہج دعوت وطریقۂ اصلاح، حکمت ودانائی، ”بلند نگاہ، سخن دل نواز اور جاں پرسوز“ میں ان کا عکس جمیل تھے تو مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ ان کے بہترین جانشین اور زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے نقطہ نظر اور ان کے فکر وعمل کے صحیح ترجمان اور نمائندہ تھے۔ یوں کہیے کہ مایوس کن اور حوصلہ شکن ماحول میں امت

مسلمہ کے روشن مستقبل کی ضمانت کے لیے روشنی کا جو امید افزا چراغ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تحریر وتقریر، تصنیف وتالیف اور اپنی شبانہ روز سرگرمیوں اور جہد مسلسل کے ذریعہ روشن کیا تھا، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے اس چراغ کی روشنی مدھم نہ پڑنے دی، بلکہ کوشش کی کہ انہوں نے جو کام شروع کیا تھا اسے دن دونی رات چوگنی ترقی دیں اور مختلف اسلامی تحریکات اور اسلامی تنظیموں اور اداروں کی سرپرستی وراہ نمائی، نسل نو کی دینی اور ایمانی تربیت اور سب سے بڑھ کر فکر اسلامی کی عالمی پیمانہ پر برتری کی جو ذمہ داری ان کے کاندھوں پر تھی اس کو پورا کرنے کا کوئی بھی لمحہ ضائع نہ ہونے دیں اور حضرت مفکر اسلام کی وفات سے جو خلا پیدا ہوگیا تھا اسے پر کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں، ان کے شاگرد آج پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور مختلف یونیورسٹیوں، کالجوں، دینی وعصری دانش گاہوں، علمی وتحقیقی اداروں، لسانی وادبی مراکز اور دعوتی واصلاحی تنظیموں میں اعلی عہدوں پر فائز ہیں اور زندگی کے مختلف میدانوں میں اہم اور نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو جماعت تیار کی تھی، ہمارے شیخ ومربی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اس کے سرخیل اور روح رواں تھے۔ مولانا نذر الحفیظ ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ کی کتاب ''الی نظام عالمی جدید'' کے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے:

''گذشتہ صدی کی نصف دہائی میں مغربی یلغار کا مقابلہ کرنے اور علم محمدی بلند رکھنے کے لیے حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ نے اسلام کی روح سے سرشار ایک جماعت تیار کی، اس جماعت کے نمایاں افراد میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، حضرت مولانا محمد الحسنی، حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی اور حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جنہیں بلاشبہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا دست راست کہا جا سکتا ہے۔ یہ لوگ فکری، عقائدی، تہذیبی اور ثقافتی ارتداد کا مقابلہ کرنے میں اپنے روحانی قائد اور معلم کے شانہ بہ شانہ اس معرکہ میں صف اول پر تھے، جب کہ یہ معرکہ ایک ایسے دور میں ہو رہا تھا جب مذہب کا دفاع کرنا سخت ایثار اور قربانی کا ہم معنی تھا، بلکہ اس معرکہ میں حصہ لینا گویا ہر وقت اپنی جان ہتھیلی پر رکھنے کے مرادف تھا لیکن اسلام کے یہ جانباز سپاہی اس محاذ پر ڈٹے رہے جس پر ان کے روحانی مربی اور قائد نے انہیں تعینات کر دیا تھا اور کبھی بھی اپنے پایہ استقلال میں جنبش نہ آنے دی۔ مصر کے سابق صدر جمال عبدالناصر نے ندوۃ العلماء سے جاری ہونے والے اسلامی رسالے ''البعث الاسلامی'' اور ''الرائد'' میں ان حضرات کی طاقتور اور جرأت مندانہ تحریروں سے پریشان ہوکر جو اس کے خود مختار ظالمانہ نظام حکومت پر کھل کر تنقید کر رہی تھیں ہندوستانی حکومت سے شکایت کی جس پر انہیں دارالحکومت دہلی طلب کیا گیا، لیکن اس سے نہ ان کے حوصلے پست ہوئے اور نہ ہی ان کے آہنی عزم وارادہ میں کوئی کمزوری پیدا ہوئی اور وہ پوری قوت سے ''عرب قومیت'' کے نعرے کا فکری اور تحریری طور پر مقابلہ کرتے رہے، جب کہ اس جاہلی نعرہ کو اس وقت کی اسلام مخالف اور دین بیزار بہت سی طاقتور حکومتوں اور تنظیموں کی کھل کر حمایت حاصل تھی، اس کے باوجود اسلام کی محبت سے لبریز اور اسلام کی روح سے سرشار یہ جماعت اس جاہلی نعرے کا بھرپور جواب دیتی رہی، بلکہ اس کا سر کچل کر رکھ دیا۔''

(الی نظام عالمی جدید، ص: ۱۴-۱۵)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اپنے کاموں اور ذمہ داریوں کی انجام دہی اور تصنیف وتالیف میں ایک نمونہ تھے، وہ کسی بھی سخت سے سخت معاملہ میں بغیر کسی عجلت کے خاموشی سے پرسکون ماحول میں گفتگو کرنے اور معاملہ حل کرنے کو ترجیح دیتے اور طویل غور وفکر کے بعد مضبوط اور محکم منصوبہ بندی کرتے۔ انہوں نے معاصر اسلامی ذہنوں پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں، ان کی عربی اور اردو زبان میں بیسیوں کتابیں ہیں، سیکڑوں مضامین ہیں، دروس ہیں، تقاریر اور لیکچرز ہیں، ان کی تصنیفات کا دنیا کی کئی زبانوں میں

ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی وفات سے ہم نے ایک ایسے قابل مصنف کو کھویا ہے جو احوال زمانہ سے باخبر اور درپیش چیلنجز سے نمٹنے کے ہنر سے واقف تھا۔ وہ گزشتہ صدی میں مغربی استعمار کے سامنے ڈٹے رہے اور اس کی اصلیت اور محرکات کو بے نقاب کرتے رہے، عیار و مکار سامراجی ذہنیت کی حامل صہیونیت کا سامنا کرتے رہے، جس نے مسلمانوں کو ان کے عقیدہ سے محروم کرنے کی ہمیشہ کوشش کی ہے اور اس کا منشا یہ رہا ہے کہ مسلمان صلیبی اور مغربی افکار کے غلام بن جائیں۔ عرب قومیت اور ناصریت کے سامنے وہ ہمیشہ سینہ سپر رہے، مادہ پرست مغربی تہذیب اور اس کے نسلی و قومی عصبیت کا کھل کر مقابلہ کرتے رہے اور مذہب بیزار تصورات کا جواب دیتے رہے، اگرچہ ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' کی روشنی میں انہوں نے مغرب سے آنے والے مثبت علوم و معارف اور افکار و خیالات سے فائدہ اٹھانے سے بھی دریغ نہ کیا۔ وہ ایک صاحب فکر و نظر، بہترین قلم کار، مخلص داعی اور ماہر تعلیم تھے اور انہوں نے اپنی زندگی اور قلم کو صحیح اسلامی فکر کی حمایت کرنے اور زندگی کو انسان اور کائنات کے بارے میں اسلام کے صحیح تصور کو پیش کرنے کے لیے وقف کر دیا تھا، جیسا کہ ان کی کتابوں: ''العالم الإسلامی: قضایا و حلول'' اور ''قیمة الأمة الإسلامیة و منجزاتها'' سے معلوم ہوتا ہے۔

ان کی وفات ایک ایسے صاحب فکر، بلند نگاہ اور ذہن رسا ادیب اور اسلامی مفکر کی وفات ہے جسے علمی و ادبی حلقوں میں ایک صحیح الفکر، نباض زمانہ اور حکمت و دانائی سے بھرپور شخصیت کے طور پر دیکھا جاتا تھا۔ اہل علم و دانش ان کی علمی و ادبی برتری پر متفق تھے اور انہیں معاصر اسلامی فکر کا سربراہ اور اسلامی ادب کے علمبرداروں میں سے ایک سمجھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں افہام و تفہیم کا وہ بہترین ملکہ اور حالات و واقعات کا تجزیہ کرنے کی وہ اعلیٰ صلاحیت دی تھی کہ حاضرین عش عش کر اٹھتے۔ ان کے اعلیٰ ادبی ذوق کا بہترین ثبوت نثری اور شعری انتخابات پر مشتمل ان کے تیار کردہ مجموعے اور ان کی دوسری کتابیں ہیں جن میں سے یہ کتابیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

''منشورات من أدب العرب''، ''مختار الشعر العربي'' ''الأدب العربي بین عرض و نقد'' ''تاریخ الأدب العربي (العصر الإسلامي)''، ''الأدب الإسلامي و صلته بالحیاة'' ''الأدب الإسلامي فکرته و منهاجه''، ''أضواء علی الأدب الإسلامي'' اور ''الغزل الأردی و محاوره''

ان کی وفات ایک دانش مند رہنما، ایک طویل تجربہ رکھنے والے سرپرست، ایک تجربہ کار منتظم، کسی بھی معاملہ کے مخفی پہلوؤں اور ان کے نتائج کا ادراک کر لینے والے ایک صاحب بصیرت اور زیرک و دانا، فراست ایمانی، صائب الرائے، چشم دور بیں، اور نگہ بلند رکھنے والے شخص کی وفات ہے۔ انہوں نے حکمت دانائی اور کامیابی کے ساتھ متعدد اسلامی اداروں اور تنظیموں کی قیادت کی، چنانچہ ایک مدت دراز تک مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر رہے اور اسے بڑی دانشمندی اور حکمت کے ساتھ ٹوٹنے سے محفوظ رکھا۔ انہوں نے اسلامی بیداری کے لیے جد و جہد کی، اسلامی ادب کی تحریک کو قوت بخشی، اسلامی صحافت کو ترقی دی اور ندوۃ العلماء کی کامیاب سرپرستی فرمائی، چنانچہ ان کے دور میں ندوۃ العلماء نے خاطر خواہ پیش رفت کی اور اس کا دائرۂ عمل وسیع ہوا۔

ان کی رحلت ایک سچے محبّ رسول ﷺ، اسلام کے ایک وفا دار و جاں نثار اور اس کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینے والے ایک پختہ مسلمان کی رحلت ہے۔ وہ سیرت نبوی کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ایک پاکیزہ کردار شخص تھے، بلکہ سیرت نبوی کے ایک پرتو تھے اور ہر ہر قدم پر نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ اور اسوۂ حسنہ سے رہنمائی حاصل کرتے تھے اور ہر معاملے میں آپ ﷺ کی پیروی کرتے تھے، اس طرح وہ گویا نبی پاک ﷺ کی سیرتِ طیبہ کے چلتے پھرتے ایک نمونہ تھے۔ انہیں نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ سے بڑا شغف تھا اور وہ اس کا وسیع اور گہرا علم رکھتے تھے، انہوں نے ۶۰/ سال سے زیادہ عرصہ نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ پر لکھی گئی کتابوں

کے مطالعہ میں گزارا اور وہ اس موضوع پر سامنے آئیں، جدید تحقیقات پر بھی مبصرانہ نظر رکھتے تھے اور ایک مدت تک اس موضوع کو پڑھایا بھی اور پھر ایک نہایت وقیع اور جامع کتاب ''رہبر انسانیت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم'' کے نام سے تالیف کی۔

وہ راقم سطور کے شیخ ومربی اور استاذ ومرشد تھے، سن شعور سے ہی انہیں قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور ان سے فیض اٹھانے کا موقع ملا، بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اقبال کے اس شعر کے مصداق تھے ؎

نگہ بلند سخن دل نواز جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لیے

وہ نگاہِ بلند، زبان ہوشمند اور دل دردمند کی دولت سے مالا مال تھے، ان کا کردار پاکیزہ، ان کی گفتار شیریں اور ان کے معاملات صاف ستھرے تھے، ان کے ایمان میں پختگی، باتوں میں سچائی، کاموں میں خلوص، خیالات میں پاکیزگی، اخلاق میں بلندی اور عمل میں دوام تھا۔ وہ بھلائی کے کاموں کے دل دادہ، دین کے معاملہ میں باحمیت وغیرت منداور ظلم وناانصافی سے نفرت والے تھے۔

میں نے انہیں قریب سے دیکھا اور انہیں ایک ایسا شخص پایا جو صرف اور صرف اسلام کے لیے جیتا ہو، اسلام اس کی روح میں رچا اور بسا ہو، اسلام پر ہی اس کی صبح اور شام ہوتی ہو، اسلام ہی اس کی زندگی اول اور آخر مقصد ہو اور وہ اسلام کی سربلندی کے لیے اپنی تمام تر طاقت وتوانائی لگادینے والا ہو، ممکن ہے آپ ان کے بعض اعمال وافکار میں اختلاف کریں بلکہ ہوسکتا ہے کہ ان کا کوئی اقدام آپ کی نظر میں قابل تنقید بھی ہو لیکن آپ کو ان کی صدق نیت، ان کے اخلاص عمل اور دین کے تئیں ان کی غیرت وحمیت میں شک نہیں ہوسکتا۔

وہ ایک ایسے شخص تھے جن کے دل میں کسی مسلمان کے لیے کوئی کینہ نہ تھا، وہ کسی سے بغض نہیں رکھتے تھے، کسی سے نفرت نہیں کرتے تھے، ان کی زبان نہایت پاکیزہ تھی، وہ سنجیدگی یا ہنسی مذاق میں کوئی بھی نامناسب لفظ اپنی زبان سے نہ نکالتے تھے، وہ کسی شخص کی نہ اس کے سامنے اور نہ اس کے پیٹھ پیچھے کوئی برائی کرتے تھے، ان کے مزاج میں سخاوت اور دریادلی تھی، وہ ضرورت مندوں اور مسکینوں کی حتی المقدور مدد کرتے تھے، ان کی طبیعت میں حیا اور پاکیزگی تھی، کوئی غلط بات سنتے تو ان کا چہرہ سرخ ہوجاتا۔

وہ ربانی اخلاق اور للہی صفات سے متصف تھے، اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہتے تھے، دیر تک نفل پڑھتے اور اپنے رب کے حضور سربہ سجود رہتے، طویل رکوع اور سجدہ میں لذت محسوس کرتے اور اپنے رب سے مناجات کرتے، وہ فطری طور پر ایک مربی، ایک معلم اور سب سے بڑھ کر علم وادب کے عاشق تھے۔ ان کی ذات ایک محبت کرنے والے باپ، ایک تعمیری ذہن رکھنے والے رہنما اور ایک مخنتی اور مخلص استاذ کی حیثیت رکھتی تھی، یہی وجہ ہے کہ اپنے شاگردوں کی تعلیم وتربیت اور اپنے متعلقین کی دینی رہنمائی کے لیے وہ ہر وقت فکرمند رہتے اور انہیں بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے خود انہیں ناقدانہ بصیرت اور اعلیٰ ادبی اور دینی ذوق سے سرفراز فرمایا تھا، جس کا وہ بروقت استعمال کرتے اور اصلاح ودعوت کے ہر موقع کو غنیمت سمجھتے۔

وہ روادار، نرم مزاج، خوش اخلاق، متواضع، خوش گفتار اور خوش خو تھے۔ دعوت واصلاح کے معاملہ میں وہ ربانی تعلیم ﴿ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾ پر عمل پیرا تھے۔ حالات کیسے بھی ناگفتہ بہ ہوں، باد مخالف خواہ کتنی ہی تیز وتند ہو، وہ کبھی بھی ﴿لَا تَيْأَسُوا مِن رَّوْحِ اللَّهِ﴾ کا دیا بجھنے نہ دیتے۔ مایوسی کی گھڑی میں ان کی امید کی شمع ہمیشہ روشن رہتی، وہ شام غم حیات کو ہمیشہ صبح نو کا مژدہ سناتے رہتے۔

وہ نہایت ہی رقیق القلب، نرم طبیعت، چشم گریاں رکھنے والے، نیک طینت، پاکیزہ روح، خلیق، ملنسار، شگفتہ مزاج، شیریں سخن، نکتہ آفریں، سادہ مزاج، متواضع، نرم خو، تکلف اور تصنع سے دور اور نام ونمود سے بہت بیزار شخص تھے۔ کسی کی تکلیف یا پریشانی سے خود پریشان ہوجاتے، آنکھیں نم ہوجاتیں اور دل تڑپ اٹھتا۔ نعمت خداوندی کا ذکر اٹھتا یا آخرت کی بات ہوتی تو بے چین ہوجاتے۔ علم

کے اس قدر دل دادہ کہ اپنے شاگردوں سے بھی سیکھنے میں انہیں عار نہ ہوتی۔ ہر قابل اور صلاحیت مند شخص کی قدر کرتے، اس کا اعتراف کرتے اور اس سے کسی بھی طرح کا حسد یا بغض نہ رکھتے، ان کی شخصیت "من تواضع للّٰہ رفعه اللّٰه" کی زندہ ثبوت تھی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں مقبولیت، محبولیت اور دل نوازی عطا کی تھی جس کا اندازہ ان کے جنازہ میں شریک لوگوں کی بڑی تعداد اور ملک اور بیرونِ ملک سے آنے والے تعزیتی پیغامات اور ندوۃ العلماء اور تکیہ رائے بریلی میں حاضر ہونے والے تعزیتی وفود سے لگایا جاسکتا ہے۔

انہیں سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ امت مسلمہ کی فلاح و بہبود اور دینی و دنیاوی کامیابی و کامرانی کے لیے کام کرنے والی تحریکوں، تنظیموں، اداروں اور دانش گاہوں کے افکار و نظریات اور طریقۂ کار و دائرۂ عمل خالص اسلامی اصولوں پر قائم ہوں، ان کے تصورات واضح اور درست ہوں اور ان کے اندر اسلامی شعور، حکمت و دانائی اور ہوشمندی و دانشمندی سے کام کرنے کا مزاج پیدا ہو۔ چنانچہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے دیگر ذرائع کے ساتھ ساتھ انہوں نے ایک اسلامی و ادبی اعلیٰ معیاری پرچہ بھی "الرائد" کے نام سے جاری کیا جو نصف صدی سے زائد عرصہ سے آج تک بحمد اللہ اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس پرچہ کے بنیادی مقاصد میں شریعت اسلامیہ کی روشنی میں اور وسیع فکری و اجتہادی طریقۂ کار پر نسل نو کو درپیش مشکلات کا حل پیش کرنا، امت اسلامیہ کے مسائل کو عالمی سطح پر اٹھانا، فکر اسلامی کی ترجمانی کرنا اور اسلامی تہذیب کی ترویج و اشاعت کرنا ہے۔ یہی ندوۃ العلماء کی بنیادی فکر ہے اور یہی اس پرچہ کا نصب العین ہے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے بارے میں اور کیا لکھوں؟ کتنا لکھوں؟ وہ ایک بحر بے کراں تھے، ان کے اندر آب رواں کی سی نرمی، پہاڑوں کی سی صلابت، فلک عنبریں کی سی وسعت، ارض گیتی کی سی تواضع تھی۔ جی تو کہتا ہے لکھتا جاؤں لیکن تابہ کے! بقول شاعر:

به قدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے

اور

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحر بے کراں کے لیے

(عربی سے ترجمہ: مولانا مبین احمد اعظمی ندوی)

فریضہ دعوت کی ایک مؤثر شکل

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

"اگر مسلمان دعوت کے فریضہ کو اپنی زندگیوں کو اسلامی سیرت کا نمونہ بناتے ہوئے انجام دیں تو اس کے بڑے اچھے نتائج نکل سکتے ہیں اور ان کے مصائب اور پریشانیوں میں بہت کمی آسکتی ہے اور وہ اس سے عنداللہ سرخ رو اور کامیاب بھی ہوں گے اور یہ جو سیاسی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ مختلف ملکوں میں واقعات پیش آرہے ہیں، اس کے نقصانات بھی کم ہوں گے، کیونکہ سامنے سے اسلام اور مسلمان دشمنی کی کیفیت ہٹ جائے گی اور مسئلہ خالص سیاسی یا معاشی رہ جائے گا، جس کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے مناسب حکمت عملی سے ان کو روکنے کی کوشش کی جاسکتی ہے، مسلمانوں میں اگر اپنے پروردگار کی اطاعت اور دین کی نصرت کا صحیح جذبہ ہو اور اس کی صحیح فکر ہو اور اس پر ہم دردی اور انسانی خیر خواہی کے بتائے ہوئے جذبہ سے عمل ہو تو مسلمانوں کے مخالفوں میں بھی مسلمانوں سے نفرت کا جذبہ نہیں رہے گا، پھر مسئلہ صرف کاروباری اور دنیاوی فائدہ کے حصول کا رہ جائے گا اور اس کا مداوا زیادہ مشکل نہیں۔" (حالات حاضرہ اور مسلمان: ۶۳)

نگاہ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

مولانا محمد رزین اشرف ندوی
(شیخ الحدیث دارالعلوم نظامیہ-پونہ)

مرشدی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بندہ کے استاذ اور مرشد تھے، ماشاء اللہ دنیا بھر میں آپ کے ہزاروں شاگرد پائے جاتے ہیں، حضرت والا کے وصال کے بعد سے ہی مستقل تعزیت سیمینار اور جلسوں کا سلسلہ جاری ہے، زمانہ سوشل میڈیا کا ہے، آئے دن حضرت والا پر آن لائن پروگرام منعقد ہورہے ہیں جس سے حضرت مرشدیؒ کی ہمہ گیر و ہمہ جہت شخصیت پر روشنی پڑتی ہے، یہ در اصل حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے مقام و مرتبہ کا حصہ ہے جو انہیں اللہ پاک کی طرف سے حاصل ہے۔ ماشاء اللہ ایک کامیاب شخصیت کے جو اوصاف ہوتے ہیں وہ سب کے سب آپ میں پائے جاتے ہیں۔

بندہ نے اپنے اس مضمون میں ذاتی تعلقات سے کچھ ملاقاتوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

حضرت مرشدی مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ خورد نوازی میں اخلاق کریمانہ کے بلند مقام پر فائز تھے، بندہ کو یوں تو کئی مواقع پر اس کا تجربہ ہوا لیکن حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے انتقال پُر ملال کے بعد جب پہلی ملاقات حضرت مرشدی مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ سے حرم کعبہ بیت اللہ شریف میں ہوئی تو اس وقت مزید تجربہ ہوا، یہ سن ۲۰۰۴ء کی بات ہے کہ آپ اس وقت مکہ مکرمہ میں باب مدینہ منورہ اور باب ہجرہ کے درمیان بالکل میزاب رحمت کے سامنے تشریف فرما تھے، آپ کے ہمراہ آپ کے خانوادہ کے میزبان جناب طارق عسکری صاحب اور غالباً مولانا محمود حسنیؒ بھی موجود تھے، بندہ آپ کے سامنے بیٹھا تھا اور دل میں ایک آرزو انگڑائی لے رہی تھی کہ حضرت بیعت فرمالیں تو بندہ پر خدا کا فضل ہوجائے، لیکن زبان کھل نہیں رہی تھی اور ہمت کر نہیں پارہا تھا، طارق صاحب نے جن سے پہلے ہی بندہ اپنی غرض کہ میں بیعت ہونا چاہتا ہوں کہہ چکا تھا' مجھے حضرت کے مزید قریب کردیا اور خود ہی حضرت مولانا مرحوم سے عرض کیا کہ یہ حضرت مولانا علی میاںؒ سے بیعت تھے، آپ سے رجوع ہونا چاہتے ہیں، جوں ہی طارق صاحب نے حضرت مولانا رابع صاحب سے فرمایا' حضرت مولانا راضی ہوگئے اور بغیر کسی تامل کے بیعت فرمالیا۔ جزاھم اللہ خیرا!

حضرت مرشدیؒ اپنے عزیزوں شاگردوں کو جن کی تعداد ہزاروں میں ہوگی یاد رکھتے اور کوئی موقع آتا تو اس کا اظہار فرماتے تھے، چنانچہ سال ڈیڑھ سال بعد آپ کا سفر پونے کا ہوا اور دارالعلوم نظامیہ صوفیہ میں تھوڑی دیر کے لیے آمد ہوئی حضرت والا کا تعارف اور استقبالیہ اسی سیاہ کار کے ذمہ تھی جب بندہ نے حرم کعبہ کی اس مبارک مسعود واقعہ کا ذکر تعارف میں پیش کیا تو حضرت استاذیؒ بہت خوش ہوئے اور ایسا لگا کہ وہ اپنوں میں تشریف فرما ہیں۔ ہمارے ایک ادب نواز دوست شاعر جناب مشتاق عرب مرحوم نے پروگرام کے بعد یہ تاثر دیا تھا۔

میرے بڑے بھائی بزرگ عالم دین حضرت مولانا محمد امین اشرف قاسمی رحمۃ اللہ علیہ حضرت استاذی رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے ادارہ دعوۃ الحق لے جانا چاہتے تھے، بھائی صاحب مرحوم نے مجھے پونے سے لکھنؤ بلالیا کہ ہم دونوں حضرت کو دعوت دیں، ہم لوگ حضرتؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرت والا کا جو انداز مہمانوں سے ملنے کا تھا وہ نہایت ہی پرکشش انکساری و عاجزی بھرا انداز ہوتا کہ ملنے

والے بہت متاثر ہوتے اور گہرے احساسات لے کر واپس ہوتے۔

غرض جب ہم لوگ حضرت والا کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضرت والا نے بہت شفقت فرمائی اور محبت سے بٹھایا، نرم لب ولہجہ تو حضرت والا کا تھا ہی مزید اس میں مٹھاس ہم لوگوں نے محسوس کی جب بھائی صاحب نے حضرت کو دعوت دی تو حضرت نے بھائی صاحب کی باتیں سنیں اور فرمایا کہ بلال (حضرت مولانا سید بلال حسنی ندوی مدظلہ العالی موجودہ ناظم ندوۃ العلماء) کو لے جایئے، میں نے سفر کرنا چھوڑ دیا ہے، بھائی صاحب مرحوم کو لگا کہ حضرت والا نے ہم لوگوں کو نہیں پہچانا تو میری طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ یہ آپ کے شاگرد ہیں، اِس پر حضرت نے فرمایا کہ ہم جانتے ہیں یہ تو ہمارے نمائندہ ہیں، ہمارا کام کر رہے ہیں، بھائی صاحبؒ حضرت والا مرحوم کے ان جملوں سے مارے خوشی کے آب دیدہ ہو گئے، ہم لوگ تھوڑی دیر حضرت والا کی مجلس سے مستفیض ہوئے، بھائی صاحب نے اس درمیان اپنے احوال پیش کیے اور حضرت سے بعض امور میں مشورہ چاہا، حضرت والا نے قیمتی مشورے دئے اور ہدایات فرمائیں، ہم جب باہر نکلے تو بھائی صاحب مرحوم پر حضرت والا کی اس مختصر صحبت کا بڑا اثر تھا، بعد میں بار بار اس مجلس کا ذکر کرتے اور حضرت والا سے اپنی عقیدت کا اظہار فرماتے۔

ایک ملاقات میں مدارس کے گرتے ہوئے معیار اور نا اہلوں کا مدارس ومساجد پر تسلط اور کچھ دیگر ذاتی مسائل پر حضرت والا کے سامنے اپنی بات رکھی، اس پر حضرت والا نے صبر وضبط سے کام کرنے کی ہدایت دی اور فرمایا: مدارس ومساجد سے وابستہ رہیے اور ارشاد فرمایا کہ جب تک کام کرنا اور وہاں رہنا ممکن ہو رہیے، اللہ پاک اخلاص کا صلہ دے گا۔

ہمارے شیخ ومرشد کے یہاں ہٹو بچو کا معاملہ نہیں تھا، سادگی تھی، ہر آنے جانے والے کو عزت ورتبہ ملتا تھا، اس طرح خلق خدا کو حضرت والا سے خوب فائدہ پہنچا، جب آپ مہمان خانہ میں حضرت والا کی صحبت میں بیٹھتے تو آپ غیر معمولی سکون کی کیفیت پاتے، اگر آپ کے دل ودماغ میں کوئی بے چینی، پریشانی یا شکوک وشبہات ہوتے تو آپ بجا طور پر انہیں کافور ہوتا ہوا دیکھتے۔

اس بات کے اظہار میں کوئی حرج نہیں ابھی ۱۶ رمئی/۲۰۲۳ء کو جب بندہ حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ العالی ناظم ندوۃ العلماء لکھنو کی خدمت میں حضرت مرشدیؒ کی تعزیت کے لیے حاضر ہوا اور مہمان خانہ میں ناظم صاحب سے اپنے اس تاثر کو بیان کیا تو مولانا نے فرمایا: جی! سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا الیاس صاحب کاندھلویؒ، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ، حضرت مولانا امیر شریعت منت اللہ رحمانیؒ اور مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ اور نہ جانے کیسی کیسی عظیم باکمال شخصیات کا فیض اس مہمان خانہ کو حاصل ہے۔

مجھے یاد ہے کہ چند سال قبل حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا واضح رشید ندویؒ اور ہمارے رفیق درس محترم مولانا محمود حسنی ندویؒ پونے تشریف لائے یہیں این آئی بی ایم کونڈوا میں محمد بھائی (ممبئی آندھرا ٹرانسپورٹ) کے اعزہ کے مکان میں قیام تھا، ملکی حالات اور ملت کی پریشانیوں کا شکوہ لے کر شہر کی چند اہم شخصیات حضرت والا کے پاس آئے، بندہ بھی ان کے ساتھ تھا لوگوں نے اپنی اپنی باتیں رکھیں اور ایسا تاثر دیا کہ اب اسلام کو بڑا خطرہ پیش آچکا ہے اور اس ملک میں مسلمان ختم ہونے والے ہیں۔

حضرت والا نے لوگوں کی باتیں بغور سنیں، انداز وہی منکسرانہ نگاہیں جھکیں جھکیں، چہرہ پر اعتماد وابتسام، لوگوں نے اپنی اپنی بات جب کہہ لیں تو حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ نے چند جملوں میں انہیں جواب دیا اور فرمایا: اسلام کو کوئی خطرہ نہیں اللہ اس کا خود محافظ ہے، ہمیں اپنی فکر کرنی چاہیے، اپنے اخلاق وکردار سے اسلام کی نمائندگی کا بیڑا اٹھانا چاہیے، تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اہل اسلام پر بڑے بڑے خطرات آئے اور ٹل گئے، بندہ کا خیال ہے کہ جس مایوسی میں لوگ آئے تھے غیر معمولی اعتماد میں واپس ہوئے۔

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اوراقِ زندگی — ایک مطالعہ

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی
(صدر مدرس مدرسہ تحفیظ القرآن مبارکپور-اعظم گڑھ)

مجھے ابتداء سے ہی تاریخ وتذکرہ اور بزرگوں کے حالات وواقعات سے خاص دلچسپی رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ پرائمری درجات میں ہی خانوادہ حسنی کے گل سرسبد حضرت مولانا علی میاں ندوی اور اس خاندان کے دیگر حضرات اور ان کی تصانیف سے واقفیت ہوگئی تھی، اس وقت ان خاصان خدا کی محبت وعقیدت کا جو تخم میرے دل میں پڑا تو وہ روز افزوں ترقی کرتا رہا۔ حفظ قرآن کریم کی تکمیل کے بعد جب استاذی مولانا ضیاء الدین صاحب قاسمی ندوی کی صحبت وتربیت نصیب ہوئی تو ان کی زبان سے ندوۃ العلماء اور خانوادۂ حسنی کی نابغہ روزگار شخصیات کے محامد ومحاسن اور ان کی امتیازی خصوصیات کو بار بار سننے کی سعادت ملتی رہی، مولانا جس والہانہ انداز میں ان کی شان میں عقیدت واحترام کے پھول نچھاور کرتے رہتے تھے اس کا دل پر خاص اثر ہوتا تھا۔ پھر تقدیر الٰہی نے مجھے ہمارے دیار کے مشہور عالم ومربی استاذی مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ کی آغوش تربیت میں پہنچادیا۔ حضرت الاستاذ کو بزرگان دین، صالحین امت اور خاصان خدا سے جو والہانہ لگاؤ، انسیت ومحبت اور عقیدت تھی، اس کا ثبوت ان کے درجنوں مضامین وتصنیفات ہیں۔ ان کی زبان سے جن بزرگوں کے حالات بکثرت سننے کا اتفاق ہوا، ان میں حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی علیہ الرحمہ کی ذات گرامی سرفہرست تھی، وہ حضرت سید صاحب اور ان کے خانوادہ کے بزرگوں کے احوال وکوائف سنایا کرتے تھے، حضرت سید صاحب کے حج کی داستان دل نواز کو انھوں نے مرتب کرنا شروع کیا تھا، جو بعد میں ''کاروانِ حرم'' کے نام سے شائع ہوئی۔ حضرت سید صاحب کے حالات وواقعات کو جاننے کے لیے وہ اپنے تلامذہ ومتعلقین کو حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی ''سیرت سید احمد شہید'' کے مطالعہ کا مشورہ دیتے تھے، وہ کہتے تھے کہ میں نے بیسیوں مرتبہ یہ کتاب پڑھی ہے۔ ان کے کہنے پر میں نے یہ کتاب خریدی اور پڑھی۔ اس کتاب کو پڑھ کر صاحب کتاب اور مصنف کتاب دونوں کی محبت دل کے نہاں خانوں میں رچ بس گئی۔ اسی طرح مولانا محمد الحسنی، مولانا سید محمد ثانی، مولانا سید محمد رابع اور مولانا واضح رشید ندوی علیہم الرحمہ کی کتابوں کو پڑھنے کا موقع ملا، تو اس پورے خانوادے کی محبت وعظمت سے قلب معمور ہوتا گیا۔

حضرت علی میاں ندویؒ کی محبت وعقیدت مجھے زمانہ طالب علمی میں متعدد بار ندوہ لے گئی اور میں نے حضرت مولانا سے ملاقات کا شرف حاصل کیا اور ان کی متعدد مجلسوں میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی۔ میری فراغت کے پہلے سال ہی حضرت مولانا کی وفات کا سانحہ پیش آیا جس کا دل پر گہرا اثر ہوا، ان کی وفات پر استاذ محترم مولانا اعجاز احمد اعظمی علیہ الرحمہ کی یہ سطریں اب تک یاد ہیں:

''حضرت مولانا علی میاں علیہ الرحمہ کوئی ایک شخصیت نہ تھے، وہ شاید تنہا ایک امت تھے، بہت ضعیف ہوچکے تھے، بیمار بھی بہت رہتے تھے، ان کی وفات غیر متوقع نہ تھی، مگر کیا کہیے جب ان کی وفات کی خبر سنی تو ایسا محسوس ہوا کہ دلوں کی دنیا، علم کی دنیا، دعوت انسانیت کی دنیا ویران ہوگئی، تکیہ رائے بریلی کا فقیر منش عالم، صاحب دل درویش، اسلام کا منادی، انسانیت کا نقیب، اللہ کا مخلص بندہ، نبی کا سچا امتی، دنیا کے ہر گوشے میں صدائے حق بلند کرتا ہوا، بارگاہ حق میں

حاضر ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہو۔ وہ اللہ سے خوش ہو۔

مرنا تو ہر ایک کو ہے، مگر کتنی خوش نصیبی ہے ایسی موت جس پر زندگی کو رشک آئے۔ رمضان شریف کی موت، وہ بھی اخیر عشرہ میں، جمعہ کا مبارک دن، قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے اور تلاوت بھی اس سورہ کی جسے جمعہ کے روز پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے کہ اس کے پڑھنے سے ایک خاص نور حضرت حق کی بارگاہ سے عطا ہوتا ہے، یعنی سورۂ کہف پڑھتے ہوئے حالت اعتکاف میں، اللہ کے صالح بندوں کے جھرمٹ میں، فرشتے قید زندگی سے رہائی کا پروانہ لے کر آئے اور رمضان کی ۲۳ رویں شب میں تدفین ہوئی، جس کے شب قدر ہونے کا احتمال تھا اور تدفین ایسی سرزمین میں ہوئی جو عرصہ دراز سے انوار ولایت سے جگمگا رہی ہے، مسلسل اور بلا انقطاع اس کی آبادی سے لے کر اب تک نور ولایت وہاں چمک رہا ہے۔ اتنی سعادتوں کے بعد کس کا جی نہ چاہے گا کہ کاش ساری زندگی لے لی جاتی اور یہی موت نصیب ہوتی۔ خیر وسعادت کے تمام اسباب اس مسبب الاسباب نے جمع کردیے ہیں۔ اللہ کی رحمت سے یہی امید ہے کہ حضرت مولانا گزشتہ بزرگوں کے درمیان رضاء الٰہی وخوشنودی انبیاء وصالحین سے نوازے گئے ہوں گے۔'' ☆

(ماہنامہ ''الاسلام'' شیخوپور، شوال ۱۴۲۰ھ، ص:۲)

زمانہ طالب علمی کی وجہ سے حضرت مولاناؒ سے ملاقات واستفادہ کا زیادہ موقع نہ مل سکا، لیکن بفضلہٖ تعالیٰ ان کے جانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ سے بارہا ملاقات کا اعزاز ملا، ندوہ کے مہمان خانہ متعدد بار مختلف عناوین سے حاضری کی سعادت ملی اور اس پاکیزہ نفس شخصیت کی خدمت بابرکت میں کچھ حسین وخوشگوار لمحات گزارنے کا موقع ملا۔ جمعیۃ علماء نے جب اپنی صدی تقریبات کی مناسبت سے جمعیۃ کے اکابر پر سیمیناروں کا سلسلہ شروع کیا تو مولانا سید محمد میاں دیوبندی پر ہونے والے سیمینار کا مجھے کنوینر بنایا، اس سلسلہ میں کئی بار حاضری ہوئی اور حضرت سے بالمشافہ گفتگو کرنے اور دعوت دینے کا موقع ملا۔ حضرت نے اس موقع پر بے حد شفقت فرمائی اور مضمون لکھنے کا وعدہ فرمایا اور مضمون لکھ کر بھیجا جو ان کے نمائندہ مولانا منصور حسنی نے سیمینار میں پیش کیا اور یہ مجموعہ مقالات ''تذکرہ سید الملت'' میں شائع ہوا، جسے میں نے حضرت کو پیش کرکے ان کی دعا لی۔ اس کے علاوہ مولانا وزیر احمد اعظمی ندوی کی کتاب ''میری محسن شخصیات'' اور ''یارانِ مہر ووفا'' کے رسم اجراء کے سلسلہ میں کئی کئی دن ندوہ کے مہمان خانہ میں قیام کا موقع ملا اور مولانا سید جعفر حسنی کی توجہ والتفات کے نتیجہ میں حضرت سے خصوصی ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا، ایک ملاقات میں میرے دونوں بچے عزیزان حافظ احمد ضیاء ومحمود ضیاء سلمہما بھی ساتھ تھے، حضرت نے ان کو اپنی دعاؤں سے نوازا۔ ایک ملاقات میں اپنی کتاب ''تذکرہ علماء خیرآباد'' پیش کی تو بہت خوش ہوئے اور خوب دعائیں دیں، اللہ تعالیٰ اسے میرے اور میری اولادوں کے حق میں قبول فرمائے۔ آخری ملاقات وفات سے دو تین ماہ پہلے ۲۵ رجنوری ۲۰۲۳ء کو ندوہ کے مہمان خانہ میں ہوئی جس میں حضرت نے اپنی کتاب ''رہبر انسانیت'' اپنے دستخط کے ساتھ عنایت فرمائی، اس بخشش وعطا پر طبیعت نہال ہوگئی۔ حضرت مولانا کی جود وسخا، بخشش وعطاء، خوش خلقی واعلیٰ ظرفی اور شرافت نفس اس عملی انحطاط کے دور میں قرون ماضیہ کے بزرگوں کی یاد دلاتی تھی۔

میرے اس مقالے کا موضوع حضرت مولانا کی خودنوشت ''اوراق زندگی'' ہے، لیکن جب قلم اٹھایا تو بہت سی باتیں نوک قلم پر آتی چلی گئیں اور میں نے بھی اسے روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ مجھے خود نوشت سوانح سے خاص دلچسپی ہے، جن خودنوشتوں کو میں نے متعدد بار پڑھا ہے، ان میں سے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ''کاروانِ زندگی'' کو خاص اہمیت حاصل ہے، دسمبر ۱۹۹۱ء میں جب میں حفظ پڑھ رہا تھا، اس کی چار جلدیں شائع ہوچکی تھیں، میں نے اس وقت اسے خریدا تھا، جب ساری جلدیں پڑھ چکا تو اگلی جلد کا شدت سے انتظار تھا، اس کے بعد ۱۹۹۴ء میں اس کی پانچویں جلد

☆ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا انتقال سورۂ یس کی آیت "فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَأَجْرٍ كَرِيمٍ" پڑھتے ہوئے ہوا تھا۔ (مرتب)

شائع ہوئی تو اسے بھی منگوایا، اسی طرح سب جلدیں منگوائیں اور اہتمام سے پڑھا، اس وقت سے اب تک نہ جانے کتنی بار پڑھ چکا ہوں۔اس کتاب کو پڑھ کر اس کے مصنف کے ساتھ ان کے پورے صاحب عزیمت خانوادہ سے ہی ایک قلبی تعلق پیدا ہوگیا۔اس لیے جیسے ہی ''اوراقِ زندگی'' کی اشاعت کی اطلاع ملی، میں نے اس کو منگوایا اور پوری کتاب چند نشستوں میں پڑھ ڈالی۔

یہ کتاب اپنے نام کی مناسبت سے مولانا سید محمد رابع حسنیؒ کی زندگی کے مختلف گوشہائے حیات سے ہمیں روشناس کراتی ہے؛ خاندانی پس منظر، مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی و مولانا علی میاں ندوی علیہما الرحمہ کی تربیت کے اثرات، مولانا علی میاں ندوی کے ساتھ گزرے ہوئے اوقات، دارالعلوم دیوبند میں بیتے ہوئے لمحات، ندوہ کی تعلیمی وتدریسی زندگی اور انتظامی تجربات، یہاں کی علمی وادبی فضا و ماحول اور ثقافتی سرگرمیوں کی داستان، اپنے اسفار کی روداد، ملکی وبین الاقوامی علمی وادبی اور سیاسی شخصیات سے ملاقات۔ان تمام امور سے متعلق بڑی قیمتی معلومات اس کتاب میں آگئی ہیں۔

کتاب کا آغاز خاندان اور وطن کی تفصیلات سے ہوتا ہے، مولانا کے والد کا نام سید رشید الدین حسنی ہے اور دادا کا نام مولوی سید خلیل الدین ہے۔ان کی والدہ سیدہ امۃ العزیز حضرت مولانا علی میاں ندوی کی بڑی بہن تھیں۔گیارہویں پشت میں جدی و مادری سلسلہ نسب ایک ہوجاتا ہے۔مولانا کی ابتدائی تعلیم تکیہ رائے بریلی میں ہوئی، اس کے بعد لکھنؤ آئے اور یہاں پہلے ندوہ کے مکتب میں پھر عربی درجات میں داخلہ ہوا، یہاں آپ نے ماسٹر محمد سمیع صدیقی سے انگریزی پڑھی اور اس میں اتنی لیاقت بہم پہنچالی کہ انگریزی اخبارات وکتب پڑھ کر اپنے کام کی باتیں اخذ کرلیں۔اس وقت مولانا سید حمید الدین فیض آبادی یہاں شیخ الحدیث تھے، ان سے عربی سوم میں کچھ کتابیں پڑھیں۔اپنے ماموں کے علاوہ دیگر اساتذہ میں مولانا شاہ حلیم عطا، مفتی سعید احمد اعظمی، مولانا ناظم ندوی اور اسحاق سندیلوی علیہم الرحمہ تھے۔درمیان میں ۴۷-۱۹۴۶ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا جہاں جلالین وہدایہ وغیرہ پڑھی، درسی ساتھیوں میں مولانا محمد سالم قاسمی وغیرہ تھے۔۱۹۴۷ء میں دورہ حدیث کے لیے دیوبند جانے کا ارادہ تھا مگر اس وقت کے حالات کی وجہ سے دیوبند نہ جاسکے اور ۱۹۴۸ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے فضیلت کی تکمیل کی اور اسی وقت یہاں بحیثیت معین مدرس تقرری ہوئی۔تعلیم کے باب میں جن حضرات سے درس کے علاوہ استفادہ کیا ہے ان میں مولانا سید حسین احمد مدنی، مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مولانا اسعد اللہ صاحب اور مولانا حبیب الرحمٰن محدث الاعظمی رحمہم اللہ کا ذکر ہے، ان میں مولانا سید حسین احمد مدنی علیہ الرحمہ کا بطور خاص تذکرہ کیا ہے، ص:۴۸/ پر لکھتے ہیں:

''دورہ حدیث میں حضرت کے درس میں شرکت تو نہ کرسکا لیکن گھر حاضری دے کر اور مسجد میں حاضر ہوکر استفادہ کا موقع حاصل ہوجاتا۔حضرت کی جب نظر پڑتی تو فرماتے: کہیے حضور! یہ خاص شفقت کا انداز تھا جس کا لطف آج بھی آتا ہے۔

دیوبند سے واپسی پر بھی حضرت سے ربط وتعلق رہا اور حضرت کی شفقت حاصل رہی۔۱۹۵۳ء میں جب میرا نکاح میرے بڑے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی سے ہوا تو حضرت نے ہی نکاح پڑھایا۔''

بیعت وارادت کا تعلق مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری علیہ الرحمہ سے تھا۔اجازت حدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، مولانا علی میاں ندوی، مفتی احمد حسن خاں ٹونکی اور شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمہم اللہ سے ہے۔حکیم الامت مولانا تھانوی اور مولانا محمد الیاس کاندھلوی اور ان کی تبلیغی تحریک، آزادی کے بعد لکھنؤ میں ہونے والے جمعیۃ کے اجلاس اور ملکی فضا پر اس کے مرتب ہونے والے اثرات، ۵۱-۱۹۵۰ء کے حج کا ذکر بڑے مؤثر انداز میں ہے۔ندوہ کی تدریس کے ضمن میں نصابی خدمات کی تفصیلات بھی آگئی ہیں۔ اس کے علاوہ اسفار کی روداد، کانفرنسوں کی رپورٹ، مختلف اداروں کے پروگراموں میں شمولیت، رابطہ ادب اسلامی کا قیام اور اس کی تفصیلات وغیرہ حسب موقع آگئی ہیں۔

یہ کتاب ۱۹۹۳ء تک کے احوال پر مشتمل ہے۔ مولانا محمود حسن حسنی کو اللہ جزائے خیر دے اور ان کی مغفرت فرمائے، دنیا سے جاتے جاتے یہ اہم کام کر گئے کہ اس کتاب کو مرتب کر کے لائق اشاعت بنا گئے۔ دوران مطالعہ اس بات کا احساس رہا کہ کہیں کہیں اس قدر اجمال ہے کہ تشنگی ہنوز برقرار ہے، جیسے زمانہ طالب علمی اور تدریس کے دور کے حالات تو بہت ہی مجمل ہیں۔ طبع دوم کے موقع پر مولانا کے وہ مضامین جو شخصیات پر لکھے گئے ہیں اور ان کے انٹرویوز وغیرہ دوبارہ پڑھ کر اس پر اضافے کی مزید گنجائش ہے۔ مخدومی مولانا جعفر مسعود حسنی و مولانا بلال عبدالحی حسنی وغیرہ سے توجہ کی گزارش ہے۔ ڈاکٹر خالد ندیم (پاکستان) نے اس طرح کی کوشش سے شبلی و اقبال کی شاندار آپ بیتی تیار کر دی ہے۔

معلوم نہیں ۱۹۹۳ء کے بعد کے حالات پر کہاں تک کام ہوا ہے؟! اب حضرت مولانا کے جانشین و متعلقین اس کی طرف توجہ فرمائیں اور اس کی تکمیل کا سامان پیدا کریں۔

انسانی زندگی کی اصلاح کا انحصار

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھنا اور کراماً کاتبین کا تصور رکھنا کہ وہ کیا کر رہے ہیں؟ اس پر انسان کی زندگی کی اصلاح کا بڑا انحصار ہے، اللہ تعالیٰ جس کی یہ قوت ہے کہ اس نے یہ ساری کائنات بنائی، آسمان و زمین بنائے، اس کو دیکھنے سے نظر عاجز آجاتی ہے کہ اس نے اتنا بڑا اور وسیع عالم بنایا ہے، لیکن اس سے ہم نہیں ڈر رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ ایک معمولی افسر سے ڈرتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ کی اس بات پر یقین نہیں ہے، جو اس نے ہمیں اپنے خاص بندوں کے ذریعہ سے بتائی اور جب یقین نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا جو نتیجہ ہوتا ہے وہ سامنے آئے گا، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بطور خاص انبیاء کا ذکر کر کے یہ دکھایا ہے کہ سب اس کے سامنے چھوٹے ہیں، معلوم نہیں تم دنیا میں کس کو بڑا سمجھ لیتے ہو؟ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسانوں میں سب سے افضل انبیاء ہیں اور ان کے ساتھ اللہ کا معاملہ حاکمیت والا ہے۔

انبیاء کا حال ذکر کرتے ہوئے ایک طرف اللہ تعالیٰ نے یہ دکھایا کہ کچھ لوگوں کو اللہ نے اس مقام پر پہنچا دیا کہ وہ ہوا کے دوش پر اڑے چلے جا رہے ہیں، وہ شیاطین و جنات کو مجبور کر رہے ہیں کہ سمندر میں گھسو، محل بناؤ اور یہ کرو وہ کرو اور ان سب کا حال یہ ہے کہ وہ سب مجبوراً بنا رہے ہیں، ایسے مجبور ہو کر بنا رہے تھے کہ قرآن مجید میں آتا ہے کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہوا تو کسی کو پتہ نہیں چلا، وہ ڈنڈے پر ٹیک لگائے کھڑے تھے اور سب یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ زندہ ہیں، جب ان کو معلوم ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا انتقال ہو گیا تو وہ افسوس کرنے لگے کہ اگر ہم کو پہلے معلوم ہوتا تو ہم کیوں اتنی مصیبت میں پڑے رہتے، ہم تو ڈر کے مارے کام کر رہے تھے، جب وہی نہیں رہے تو ہم آزاد ہو جاتے، معلوم ہوا حضرت سلیمان علیہ السلام کو اتنا اختیار دیا گیا تھا۔ اسی طرح یہ بھی دکھایا کہ ہم نے اپنے بعض انبیاء کو شدید حالات سے بھی گذارا، حضرت ایوبؑ اس کی مثال ہیں، گویا اللہ تعالیٰ نے یہ صاف کر دیا کہ ہم جس کو چاہیں اتنا اختیار و مقام دیں، یہ سب ہمارے سامنے تابع ہیں۔

(احتساب زندگی: ۹۲-۹۳)

ادب اسلامی کے قافلہ سالار

ڈاکٹر شاکر فرخ ندوی
(مدیر التحریر عربی مجلّہ المظاہر جامعہ مظاہر علوم-سہارنپور)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا شمار عالم اسلام کی ان نمایاں شخصیات میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی پوری زندگی خدمت اسلام کے لیے وقف کردی، جنہوں نے اپنی زبان اور اپنے قلم کے ذریعہ خدمت دین متین کا فریضہ انجام دیا اور ہر محاذ پر ملت اسلامیہ کی رہبری ورہنمائی کی۔ یہی وجہ ہے کہ عالم اسلام کی مقتدر شخصیات نے حضرت مولانا کی وفات کو ''موت العالم موت العالَم'' قرار دیا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا تعلق اس عظیم خانوادہ سے ہے جس کی خدمات سے ہر دور میں ملت اسلامیہ گراں بار رہی ہے، بالخصوص وطن عزیز ہندوستان میں حضرت سید احمد شہیدؒ نے احیائے اسلام کا جو فریضہ انجام دیا وہ تاریخ اسلامی کا ایک روشن اور زریں باب ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ جن کی خدمات جلیلہ کا اعتراف پوری اسلامی دنیا کرتی ہے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو ابتدا ہی سے حضرت مفکر اسلام کی خصوصی توجہ حاصل رہی اور انہی کے زیر سایہ آپ نے نشو ونما پائی، جس کے اثرات آپ کی زندگی میں نمایاں محسوس کیے جاسکتے ہیں۔

یوں تو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے، آپ نے مختلف زاویوں سے اسلام کے شجر طوبیٰ کی آب یاری کی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت کرتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کی رہبری کا فریضہ انجام دیا، دار العلوم ندوۃ العلماء کی نظامت کا دور بھی آپ کی زندگی کا ایک سنہری دور ہے، اس کے علاوہ عالم اسلام کی بڑی تنظیموں کے اسٹیج سے بھی آپ نے خدمات انجام دی ہیں، انہی خدمات میں سے ایک نمایاں خدمت اسلامی ادب کے حوالہ سے بھی آپ نے انجام دی اور حضرت مفکر اسلام کے شانہ بشانہ کھڑے ہوکر پوری دنیا کے اہل علم وفضل کو یہ احساس دلایا کہ ادب کا اصل سرمایہ اسلامی علوم کی کتابوں میں موجود ہے اور اس کے لیے آپ نے عملی طور پر بھی اقدامات کیے اور تصنیفی وعلمی طور پر بھی اپنی اس فکر اور سوچ کی ترویج کی اور پھر اس میدان میں نصف صدی سے زائد تک ملت اسلامیہ کی رہبری ورہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیا اور ادب اسلامی کے قافلہ سالار بن کر پوری دنیا کے ادباء اور قلم کاروں کے لیے راہ کا تعین بھی کیا ہے اور آپ کے قلم گہربار سے اس میدان میں ایسی تحریریں منظر عام پر آئیں جنہوں نے عالم اسلام کے قلم کاروں کو ایک نیا حوصلہ عطا کیا اور ادب اسلامی کا صحیح مفہوم اور مغربی ادبی تحریکات کے مقابلہ میں اسلامی ادب کی اہمیت وضرورت اور افادیت کو واضح کیا، ذیل میں اسلامی ادب کے حوالہ سے حضرت مولانا کی تصنیفات اور خدمات کا مختصر تذکرہ ہے۔

رابطہ ادب اسلامی کا قیام:

اسلامی ادب کا تصور کوئی نیا نہیں ہے، بلکہ اسلام کے اولین عہد ہی سے اس کی داغ بیل پڑ گئی تھی اور قرآنی تعلیمات اور نبی کریم ﷺ کی احادیث مبارکہ نے اسی دور میں ادب کے لیے صحیح راہ کا تعین کردیا تھا اور ادب کو تخریبی فاسد عناصر سے پاک کردیا تھا اور پھر یہ ادب سماج ومعاشرہ کی تعمیر وتشکیل اور صالح مقاصد کی تکمیل کا فریضہ انجام دے رہا تھا، لیکن عصر حاضر میں عالم اسلام میں فرانسیسی انقلاب اور مغربی تہذیب وتمدن کو فروغ حاصل ہونے کے بعد ایک مرتبہ پھر ادب کے حوالہ سے افکار ونظریات میں تبدیلی پیدا ہوگئی تھی

اور ادب کو تعمیر کے بجائے تخریب کا ذریعہ سمجھا جانے لگا تھا اور پھر ادب کو مذہب بیزاری کی علامت تصور کیا جانے لگا تھا، ایسے حالات میں ملت کے غیور افراد میدان عمل میں آئے اور ادب کے صحیح راہ کا تعین کرتے ہوئے رابطہ ادب اسلامی کے نام سے ایک تنظیم قائم کی، جن میں سرفہرست حضرت مفکر اسلام اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ تھے۔ ادب اسلامی کے تئیں جدوجہد اور آپ کی خدمات کی وجہ سے آپ کو اس تنظیم کا جنرل سکریٹری بھی متعین کیا گیا، چونکہ ۱۹۸۱ء میں جب ندوۃ العلماء میں پہلا عالمی سمینار منعقد ہوا تھا جس میں عالم اسلام کے ادباء وفضلاء اور یونیورسٹیز کے پروفیسران اور دیگر علمی وادبی اداروں کے چنیدہ افراد نے شرکت کی تھی، اس وقت اس سمینار کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے ہی انجام دی تھی، جیسا کہ حضرت مفکر اسلام نے ایک کتاب کے مقدمہ میں اس ابتدائی سمینار کے متعلق مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مولانا محمد رابع ندوی ان لوگوں میں صف اول میں تھے جنہوں نے اس سمینار کے متعلق فکر پیدا کی اور اس علمی مذاکرہ کی ذمہ داری سنبھالی، اس علمی وادبی مذاکرہ کو جو بھی کامیابی حاصل ہوئی، جو اعتماد ملا اور جو شہرت حاصل ہوئی اس میں مولانا ہی کا اہم رول اور کردار ہے۔'' (الادب الاسلامی وصلتہ بالحیاۃ:۵۱)

پھر ۱۹۸۴ء میں حضرت مفکر اسلام کی قیادت وسرکردگی میں باقاعدہ ایک عالمی تنظیم کی حیثیت سے رابطہ ادب اسلامی کا قیام عمل میں آیا اور اس کے لیے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اجلاس منعقد ہوا، اس اجلاس کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری بھی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے بخوبی انجام دی اور پھر اس اجلاس میں ادب اسلامی کے فروغ کے تئیں آپ کی سنجیدہ وٹھوس کاوشوں کے پیش نظر آپ کو رابطہ ادب اسلامی کا جنرل سکریٹری مقرر کیا گیا اور حضرت مفکر اسلام کی وفات تک آپ اسی عہدہ پر فائز رہے، حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے انتقال کے بعد مولانا کو رابطہ ادب اسلامی عالمی کی شاخ برصغیر کا صدر اور عالمی رابطہ کا نائب صدر بنایا گیا پھر ڈاکٹر عبد القدوس ابو صالح کی وفات کے بعد آپ کو رابطہ کا صدر بنایا گیا۔

رابطہ نے ابتدا میں ادب اسلامی کے فروغ اور ترویج واشاعت کے لیے جو اہداف ومقاصد متعین کیے تھے، مولانا نے رابطہ کے ان مقاصد کو کبھی فراموش نہیں کیا، سب سے پہلے آپ نے نصابی کتابوں کی جانب توجہ کی اور ''منثورات من أدب العرب'' جیسی شاہکار تصنیف طالبان علوم نبوت اور ادب اسلامی کی کوششیں کرنے والوں کے سامنے پیش کی، اس کے علاوہ رابطہ کے تحت مختلف ادبی مذاکرات وعلمی سمینار ہندوستان کے مختلف علاقوں میں منعقد کرنے کا اہتمام کیا اور اسی سلسلہ میں مصر، ترکی، بنگلہ دیش ودیگر مسلم ممالک میں بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی، رابطہ ادب اسلامی کے مختلف مراکز اور دفاتر سے میگزین اور مجلّات نکالنے کا بھی اہتمام کیا، تاکہ قلم کاروں کے اندر ذوق وشوق پیدا ہو اور اسلامی ادب کے بہترین نمونے دنیا کے سامنے پیش کیے جاسکیں اور ادب اسلامی کے خط وخال نمایاں ہوسکیں۔

تصنیفی خدمات:

جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا کہ رابطہ ادب اسلامی کا ایک اہم مقصد یہ بھی تھا کہ ادب کے نصاب پر نظر ثانی کی جائے اور نوجوان نسل کے ذہن ودماغ کی تطہیر کی جائے، بلاد عربیہ ودیگر دینی اداروں میں ادب عربی کے نام پر یا تو قدیم تقلیدی ادب کی تدریس کا رواج تھا یا پھر مغرب سے متاثر قلم کاروں کی تحریریں شامل نصاب تھیں، لہٰذا اس سلسلہ میں پہلی کاوش مفکر اسلامؒ کی تیار کردہ نصابی کتابیں ''القراءۃ الراشدۃ'' ''مختارات'' ''قصص النبیین'' ہیں جن کو رابطہ کے قیام سے پہلے ہی مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ نے امت کے سامنے پیش کر دیا تھا، اسی طرح مولانا محمد رابع حسنی ندوی نے رابطہ کے قیام سے بہت پہلے اپنی ادبی تدریس کے تجربہ کی روشنی میں طلبہ کے لیے منثورات کی شکل میں ایک بیش قیمت تحفہ پیش کیا، جس میں پہلے اسلامی دور

سے لے کر عصر حدیث تک کے نمونے جمع کیے ہیں اور جو مختارات ہی کے طرز پر ہے، البتہ اس میں طلبہ کے معیار کے اعتبار سے آسان اور سہل عبارتوں کو منتخب کیا گیا ہے، ادب اسلامی کے فروغ کے لیے یہ مولانا کا اہم علمی کارنامہ ہے۔

اس کے علاوہ علیا درجات کے طلبہ کے لیے مولانا نے ''مختارات من شعر العرب'' تیار کی جو دار العلوم ندوۃ العلماء میں علیا درجات کے نصاب میں شامل ہے، اس کتاب میں بھی مختلف ادوار کے شعراء کے کلام کو جمع کیا گیا ہے۔

الأدب العربي بين عرض و نقد:

اس کتاب کا موضوع نقد ادبی ہے، اس میں مؤلف رحمۃ اللہ علیہ نے زمانہ جاہلیت سے لے کر عصر حاضر تک کے تمام ادوار کا احاطہ کیا ہے اور ہر دور کے شعر و نثر کے نمونے پیش کیے ہیں، ہر عہد کی ادبی خصوصیات و اسلوب نگارش کو نہایت عمدہ انداز میں پیش کیا ہے، یہ کتاب بھی دار العلوم ندوۃ العلماء میں شامل نصاب ہے، جس کے ذریعہ طلبہ مختصر وقت میں تمام ادبی مراحل و ادوار کا احاطہ کر لیتے ہیں اور ہر عہد کی ادبی خصوصیات و امتیازات اور شعری و نثری نمونے سامنے آجاتے ہیں۔

الأدب الاسلامي وصلته بالحياة:

عربی زبان میں ۹۶ رصفحات پر مشتمل ایک رسالہ ہے، جس پر مفکر اسلام رحمۃ اللہ علیہ کا وقیع مقدمہ ہے، جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ رسالہ اسلامی ادب کی خدمت ہی کے لیے تصنیف کیا گیا اور جیسا کہ مولانا نے خود اس کتاب کے آغاز میں تحریر کیا ہے کہ یہ مقالہ در اصل ندوۃ العلماء میں ۱۴۰۱ھ میں منعقد ہونے والے ادب اسلام کے پہلے ورکشاپ کے لیے لکھا گیا، جس میں اسلام اور ادب اور ادب اسلامی اور زندگی کے درمیان تعلق و ربط کو واضح کیا، اس رسالہ میں مولانا نے دلائل کے ساتھ اس تصور کا شدت کے ساتھ انکار کیا ہے کہ دینی لبادہ اوڑھ لینے کے بعد ادب ادب باقی نہیں رہ جاتا، جیسا کہ مولانا اس کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ادب جب تک فسق و فجور اور جاہلیت کے لبادہ میں رہے گا، تو اس کی ادبیت قابل اعتبار ہوگی اور اگر لبادہ دینی ہو تو اس کو ادب نہیں کہا جائے گا، چونکہ وہ لطف اندوزی اور لہو و لعب کے سامان سے خالی ہے۔''

آگے واضح کرتے ہیں کہ ''یہ بات صحیح ہے کہ ادب کے اندر کبھی کبھی فسق و فجور اور فحاشی بھی پائی جاتی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ فسق ادب کے مقومات میں شامل ہے اور اس کی بنیادی خصوصیت ہے۔ آگے ادب اسلامی کے حوالہ سے دوٹوک گفتگو کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''اسلامی ادب میں نقص اور عجز و بے بسی وہی لوگ محسوس کرتے ہیں جو در حقیقت مذہب اسلام ہی میں نقص اور عجز و بے بسی تصور کرتے ہیں، جب کہ اسلام اسی طرح کے تمام عیوب سے پاک ہے۔''

مفکر اسلام حضرت مولاناؒ اس رسالہ کے متعلق مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں: ''سید محمد رابع حسنی ندوی نے ادب اسلامی کے اس ورکشاپ کے لیے "الأدب الاسلامي وصلته بالحياة" کے عنوان سے یہ رسالہ تحریر کیا جس میں خاص طور پر اسلام سے ادب کے تعلق کو واضح کیا، عالمی آداب کے درمیان اسلامی ادب کی خصوصیات و امتیازات کو سامنے رکھا، نبی کریم ﷺ اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ادب سے شغف کا تذکرہ کرتے ہوئے کلام رسول ﷺ کے ادبی شہ پارے پیش کیے۔''

(مقدمہ ص:۵۱)

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اس رسالہ کے ذریعہ یہ پیغام دیا کہ ادب کا تعلق زندگی سے اور اسلام سے بہت گہرا ہے اور اسلامی ادب دیگر تمام آداب سے نمایاں اور ممتاز ہے، وہ تعمیری ادب ہے، دعوتی و دینی اور تربیتی ادب ہے اور اس میں اسلوب کے اعتبار سے وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جس کی وجہ سے کوئی بھی

عبارت ادب کہلانے کی مستحق ہوتی ہے اور پھر دلیل کے طور پر نبی کریم ﷺ کی احادیث اور صحابہ کرام کے اقوال پیش کیے اور ان کے اسالیب کا ادبی تجزیہ کیا، زمانہ جاہلیت اور زمانہ اسلام کی شاعری کے درمیان موازنہ کیا، تاکہ اسلامی ادب کی حقیقت واضح ہوجائے۔

أضواء على الأدب الإسلامی:

یہ مولانا کے ان مقالات کا مجموعہ ہے جو اکثر رابطہ ادب اسلامی کے عربی صحیفہ کے افتتاحیہ کے طور پر لکھے گئے، یا ہندو بیرون ہند میں علمی وادبی ورکشاپ اور سمینار کے لیے لکھے گئے۔

ان مقالات میں ادب اسلامی کی اہمیت وافادیت اور مسلم معاشرہ میں اس کی ضرورت کو اجاگر کیا گیا ہے، اسلامی زاویہ سے ادب کے مطالعہ اور ادب کی ترویج پر زور دیا گیا ہے، ادب اسلامی کے صحیح رخ کا تعین کیا گیا ہے اور جب مادہ پرستوں اور استحصال کرنے والوں نے ادب کو اپنی خواہشات کا پابند بنایا، جس کی بنیاد پر یہ تصور عام ہوگیا کہ دین واستقامت سے ادب کا کوئی تعلق نہیں، اس تصور کی مکمل طور پر نفی کی گئی اور اس قید وبند سے ادب کو آزاد کرنے پر زور دیا گیا، پھر عرب وعجم کے ان قافلہ سالاروں کا تذکرہ کیا گیا جنہوں نے ادب برائے ادب نہیں بلکہ ادب برائے تعمیر واصلاح کے اصول پر عمل کرتے ہوئے اپنی تخلیقات اور نگارشات پیش کیں، جن میں برصغیر ہند میں شاعر اسلام علامہ اقبال، ترکی میں استاذ محمد عاکف اور عالم عرب میں مشہور شاعر محمد شوقی کا نام نمایاں ہے اور پھر مفکر اسلام حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کیا گیا جنہوں نے اس جانب خصوصی توجہ کی اور عالم اسلام کے ادباء وشعراء کو رابطہ ادب اسلامی کے پلیٹ فارم پر جمع کیا۔ اسی طرح ایک مقالہ میں اسلامی ادب اور جاہلی ادب کا موازنہ کیا گیا اور پھر ادب پر دعوت اسلامی کے اثرات کو واضح کیا گیا، ایک مقالہ میں ادب اسلامی کی اہم صنف مناجات وابتہالات کی ادبی قدر وقیمت اور ان کی فنی خوبیوں اور امتیازات کو اجاگر کیا گیا، ادب کو تہذیب نفس اور روح کی پاکیزگی کا اہم ذریعہ بتایا گیا، مغربی طرز زندگی اور ادب کی آزادی پر کھل کر تنقید کی گئی اور پھر ان چند اسلامی شخصیات کا تذکرہ کیا گیا جنہوں نے اسلامی ادب کو مالا مال کیا، ان میں علامہ سید سلیمان ندوی کے عربی ذوق کا تذکرہ کیا گیا، مشہور اسلامی شاعر عمر بہاء الدین الامیری کے دیوان کا علمی وادبی جائزہ لیا گیا۔

مجموعی طور پر یہ مقالات قاری کے ذہن کے اندر اسلامی ادب کی اہمیت وافادیت کو پیدا کرتے ہیں اور مولانا محمد رابع حسنی ندوی ان مقالات میں اسلامی ادب کے پاسباں کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔

غبار کارواں:

یہ حضرت مولانا کی ان ادبی نگارشات کا مجموعہ ہے جو مولانا نے لکھنؤ سے شائع ہونے والے کاروان ادب کے لیے تحریر کی ہیں اور بقول مولانا: ان پیشکشوں میں ادب اسلامی کے بعض پہلوؤں کا تذکرہ، اسلامی ادب کے بعض زریں نمونے، رابطہ ادب اسلامی کا تعارف شامل ہے، ان کے ذریعہ انجمن رابطہ ادب اسلامی کے کام کی رفتار کی ایک جھلک دیکھی جاسکتی ہے۔'' (عرض مصنف: ۴۱)

ان مقالات میں رابطہ ادب اسلامی کا قیام، ادب اسلامی کا تخیل و محرکات، اسلامی ادب اور مغربی تحریکات، ادب اسلامی کیوں؟ اسلامی ادب جامع ترین ادب، ادب کی طاقت، حمد ودعاء ومناجات کی ادبیت، حدیث شریف کا ادبی امتیاز، اسلامی بیداری میں ادب کا حصہ، بچوں کا ادب، صحافت عصر حاضر میں جلی عناوین کی حیثیت رکھتے ہیں، مقالات کا اسلوب دل آویز اور سہل ہے، مدلل انداز میں گفتگو کی گئی ہے۔

کتاب کے آغاز میں پروفیسر وصی احمد صدیقی کا گراں قدر مقدمہ ہے جو خود کسی ادبی شہ پارہ سے کم نہیں، اس مقدمہ میں پروفیسر وصی احمد صدیقی ان مقالات کے تعلق سے یوں تحریر فرماتے ہیں:

''مضامین کا یہ مجموعہ دھنک کے خوبصورت رنگوں کی طرح ہے، الگ الگ مگر جن کا حسن سب کے ایک ساتھ ہونے میں ہے، علم طبعیات کا ایک مبتدی بھی یہ جانتا ہے کہ یہ سارے رنگ ایک

سفید رنگ سے بنتے ہیں، جس کو بادلوں کی مختلف تہیں منتشر کر دیتی ہیں، مولانا کے لیے یہ سفید رنگ اپنے دین کی حقانیت پر پورا اعتماد، اپنے رسول سے بے پناہ محبت، اسلام کے ماضی اور حال پر گہری نظر اور ایک گداز دل کے مالک ہونے کی علامت ہے، اس کتاب کے مضامین احساسات کو چھوتے ہیں، افکار اور حقیقتوں کا بیان ضرور ہے مگر طرز انشاء اتنا دلکش اور رعنائی سے بھرپور ہوتا ہے کہ مولانا جو کچھ کہتے ہیں وہ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔ مضامین اونچی علمی سطح پڑھنے والے کو مرعوب کرنے کے بجائے متاثر کرتی ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے، بقول غالب ''یہ تحریر کی لذت ہے۔''
(مقدمہ/۷)

مولانا عموماً اپنی تحریروں میں سادہ زبان استعمال کرتے ہیں اور معقد و پیچیدہ اسلوب سے گریز کرتے ہیں جس کی وجہ سے آپ کے مضامین دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، غبار کارواں کے اس بیش قیمت مقدمہ میں پروفیسر وصی احمد صدیقی لکھتے ہیں:

''مولانا پرجوش عبارت اور استعاروں کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں، بالکل سادہ عبارت لکھتے ہیں، جسے شاعری کی زبان میں سہل ممتنع کہیں گے، نفس مضمون اتنا سنجیدہ اور علمی بیان اتنا سادہ اور پرکار، یہ ہر لکھنے والے کے بس کی بات نہیں۔''
(مقدمہ ص/۷)

دین و ادب:

یہ درحقیقت دار العلوم ندوۃ العلماء میں منعقد ہونے والے ادب اسلامی کے پہلے بین الاقوامی مذاکرہ کی روئیداد ہے، جس میں مذاکرہ کی اہم تفصیلات، عالم اسلام کی اہم شخصیات کا تذکرہ، خطبہ صدارت اور اہم خطابات و مضامین اور تجاویز تفصیل کے ساتھ درج کیے گئے ہیں، کتاب پڑھ کر ادب اسلامی کا مفہوم اور خط و خال واضح ہو جاتے ہیں اور اس سلسلہ میں ان علماء کرام کی فکر مندی اور ادب کے تئیں سنجیدہ علمی کاوشوں کا اندازہ ہوتا ہے، جن کا مقصد محض یہی تھا کہ ادب کو دین سے علاحدہ نہ کیا جائے اور اسلامی علوم کی کتابوں کو محض دین کی کتابیں سمجھ کر الماری میں بند کر کے نہ رکھ دیا جائے، بلکہ انہی کتابوں کے اندر ادبی شہ پاروں کو تلاش کیا جائے اور نسل نو کے لیے اسلامی ادب کا پورا ذخیرہ تیار کیا جائے۔

ان تصنیفات کے علاوہ تحفہ گجرات، تحفہ جنوب، دو مہینہ امریکہ میں، سمرقند و بخارا کی بازیافت، اصحاب رسول ﷺ، فہم قرآن و حدیث کی حامل ربانی شخصیت، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عہد ساز شخصیت۔ سوانحی ادب میں رہبر انسانیت، رحمۃ للعالمین، سیرت محمدی انسانیت کے لیے اعلیٰ نمونہ، سیرت طیبہ کے عنوان پر اسلامی ادب کی ترجمان تحریریں ہیں۔

ان سب کے ساتھ ساتھ پندرہ روزہ عربی صحیفہ ''الرائد'' کا اجرا اور اس کے لیے مستقل اداریے لکھنا، یہ بھی حضرت مولانا کا اہم ترین کارنامہ اور ادب اسلامی کی عظیم خدمت ہے، الرائد کے ذریعہ جہاں ایک جانب عربی زبان کا شعر و سلیقہ اور ذوق پیدا ہوتا ہے وہیں دوسری جانب اسلامی تہذیب و ثقافت پر اعتماد میں پختگی آتی ہے اور دینی اقدار و قیم ذہن و دماغ میں راسخ ہو جاتی ہیں، پندرہ روزہ الرائد کا بڑا کردار یہ ہے کہ اس نے اسلامی ادب لکھنے والوں کی اور عربی زبان کا ذوق رکھنے والوں کی ایک کھیپ تیار کر دی ہے، جو ہندوستان کے طول و عرض میں جہاں ایک جانب عربی زبان و ادب کی ترویج و اشاعت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، وہیں دوسری جانب ادب اسلامی کے فروغ میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ادبی خدمات کا یہ ایک مختصر تذکرہ ہے، ظاہر ہے کہ اس کی حیثیت مشتے نمونہ از خروارے کی ہے، باری تعالیٰ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ کو اپنے شایان شان اجر جزیل عطا فرمائیں، ملت اسلامیہ کو نعم البدل عطا فرمائیں اور ہمیں ان کے مشن اور کام کو زندہ رکھنے اور آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین!

عظیم المرتبت استاد کی رحلت

مولانا خورشید انور ندوی
(ڈائیریکٹر اَنڈر اسٹینڈ قرآن اکیڈمی-حیدرآباد)

ہر روش خاک اڑائے گی صبا ”تیرے“ بعد

ہوا آہستہ یا تیز چلتی رہتی ہے، روشنی کی کرن ٹھہرتی نہیں، چلتے انسان کا آیک پاؤں پیچھے تو اگلے لمحے آگے ہوتا ہے، زندگی رواں دواں رہتی ہے، یہ آیک تسلسل ہے اور دوامی ہے، لیکن کبھی کبھی زندگی رک سی جاتی ہے، یہ کبھی کبھی ہی ہوتا ہے، زندگی سانس لینے نہیں رکتی، بلکہ کروبی بدوش کسی روح پاک کی سواری کا گزر ہوتا ہے جو عالم ملکوت کی جانب سج دھج سے جارہی ہوتی ہے۔ ۲۱ر رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ کے دن یہ ساعتِ حیران کسی لمحہ تھی، کوئی ایسے گزرا کہ سب کچھ اجڑ گیا، امت مسلمہ ہندیہ نے چمن کا مالی کھودیا، نزار ندویوں کا والی نہ رہا، حضرت الاستاذ مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ ہم میں نہ رہے، اللہ کا بندوں کے ساتھ رحمت کا نشان یہ بھی ہے کہ غم آنے سے پہلے اس کی دھمک آتی ہے، دل ناصبور دکھ سہنے کے لیے سنبھلنے لگتا ہے اور آنی کی آہٹ پانے لگتا ہے، وفات سے چند روز پہلے جب اطلاع آئی کہ طبیعت گراں ہے تو دل یک گونہ خلش مند ہوا اور طبیعت کے سنبھلنے کی خبر سے کچھ بھی اطمینان نہیں ہوا، 93ر سال کی عمر خستہ جان ہوتی ہے، سفر کی متحمل بمشکل ہوتی ہے، لیکن رائے بریلی تکیہ پر معمول کے مطابق صفائے باطن اور دوائے دل کے متلاشی اہل تعلق کی والہانہ آمد نے ضرور مجبور کیا ہوگا کہ آپ وہاں جائیں اور مژدہ جانی فرمائیں، خاندانی وضع داری اور چاہنے والوں سے امتنان آمیز تعلق خاطر آپ کی اپنی پہچان تھی، قلق یہ ہے کہ اس پہچان نے جان لے لی، اسباب پر قدرے ہمارا اختیار ہے گو کہ ان کے نتائج پر نہیں، کاش آپ ندوہ سے باہر نہ نکلتے، لیکن یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہماری زندگیوں میں اللہ کا حکم جاری وساری ہے، ہمارا آنا ہی ہمارا جانا ٹھہرتا ہے، وہ ہوگیا جو اللہ کا حکم تھا اور اسی وقت ہوا جب ہونا تھا۔ ”ذلك تقدير العزيز الحكيم. رضينا بقضاء الله فينا“

اللہ کے فیصلوں میں وقت بے وقت کوئی چیز نہیں، ہاں ہم ناتواں کچھ چیزوں کی وقت وزمان کے دائرے میں تفسیر نہیں کر پاتے، اس حادثہ جاں کاہ کی ہم پریشان حال کیا تفسیر کرسکیں گے کہ امت بے حال کو جس عقدہ کشا ”طلسمی سکوت“ کی ضرورت تھی وہ ہنگام ہنگام ہمیں چھوڑ گیا، چوطرفہ آفتوں کے شور اور شورش میں وہ خاموش دست گیر چل بسا، جس کی خاموشی نے کتنے سرکش طوفانوں کے رخ موڑ دئے۔

میں دل گرفتہ ہوں اور بے بیان بھی، ندوے میں پڑھنے کے زمانہ میں ترقی پسندوں کی فکری لادینیت اور نئی نئی جدیدیت پسندی کی بے قالب بیانیہ کے رسیا ایک شاعر ندا فاضلی کا ایک شعری تخیل مستعار لیتا ہوں جو میرے لیے کبھی بھی پسندیدہ تو کیا قابل قبول شاعر بھی نہیں رہے کہ

آپ (میرے استاد) دفن ہوکر مجھ میں زندہ ہیں اور میں زندہ رہ کر آپ میں دفن ہوچکا۔ رحم الله أبانا كما ربانا صغارا.

استادِ گرامی منزلت مولانا محمد رابع حسنی صاحبؒ اب ہماری یادوں کی کہکشاں کے بدر منیر ہیں، ان کی یادوں کی نسبت خاکی اب دل کو گوارا نہیں، اگر میری یادیں بہت پرانی نہ ہوگئی ہوتیں تو ان کے تذکرے سے گریز کرتا، زمانہ کا بُعد اک رنگ تقدس رکھتا ہے، تقدس کے اس دھندلکے نے استاد گرامی سے خود کو منسلک کرنے کی جرأت

عطا کردی، ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ جرأت اظہار!

مادر علمی میری طالب علمی کے دور میں دوسرے روایتی اداروں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں رہ گیا تھا، نصابی ڈھانچہ دوسرے اداروں میں تین چار سو سال پرانا تو یہاں سو سال پون سو سال پرانا ہو چکا تھا، نئے پرانے کی خلیج پاٹنے کا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا، ہم خود پوری طرح پرانے ہو چکے تھے، گرمئ تقریر کی حد تک ہم نئے پرانے کے نقطہ اتصال پر تھے، حقیقت میں نہیں رہ گئے تھے، نئے سے بہت دور بہت پہلے ہی ہو چکے تھے، بلکہ پرانی تہمتیں مٹانے کے مشن پر تیز گام تھے، میں درس نظامی پس منظر رکھتا تھا اور مادر علمی کے طرزِ تدریس میں لاابالی پن محسوس کرتا تھا، کچھ رونقیں لگتی تھیں تو وہ انہی اساتذہ کرام کی کلاسز میں ہوا کرتی تھیں جو درس نظامی سے آئے تھے، مولانا حبیب الرحمٰن سلطانپوریؒ کے سوا درسیات میں غیر دیوبندی اساتذہ رنگ نہیں جماپاتے تھے، مولانا زکریا سنبھلی مدظلہ العالی اور مولانا نور عالم امینیؒ نہایت مؤثر اور پائیدار مدرس تھے جو خالص دیوبندی پس منظر سے تھے، عالمیت کی تکمیل تک میری یہی کیفیت قیل وقال رہی، اس کچی اور نجی پرکھ نے مجھے تاریخ، ادب، سماجیات، سیاسیات اور مطالعہ عام کی طرف راغب کر دیا جس کا مادر علمی میں زبردست انتظام تھا۔ مطالعاتی مواد کی فراوانی، وسیع النظری کا ماحول، حضرت مولاناؒ کی کرشماتی، مقناطیسی اور محوری شخصیت کی موجودگی نے سارے منظروں سے بے نیاز کر دیا تھا، نظر کہیں جاتی بھی تھی تو لوٹ کر یہیں آجایا کرتی تھی، زنبیل طالب ہمیشہ خالی رہتی ہے اور علم کی طلب ایک مستقل ناآسودگی کا دوسرا نام ہے۔ عالمیت کی تکمیل تک ہم پورے ندوی اور ادھورے عالم تھے جو آج بھی ہیں، ادھورے پن کے احساس نے دو سال مزید چشمہ حیوان علم ودانش سے منہ لگائے رکھنے پر مجبور کیا، اب یہاں سے کتاب علم کا نیا باب رقم ہونا شروع ہوتا ہے اور یہیں سے مادر علمی کا امتیاز کلی، تشخص بالغ اور مکمل انفرادیت کا آغاز ہوتا ہے۔ حضرت الاستاذ مرحوم، مولانا واضح رشید صاحبؒ، مولانا عبداللہ عباس ندویؒ اور مولانا نور عظیم ندویؒ، مولانا سعید الرحمٰن صاحب مدظلہ، مولانا شفیق الرحمٰن صاحب ندویؒ اور استاد الاساتذہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب سلطانپوریؒ سے ارتکازی استفادہ کا موقع ملتا ہے اور اسی مرحلہ پر ندوے کی تعلیمی و تدریسی خصوصیات کا اندازہ ہوتا ہے۔ تاریخ کے تاریخی کرداروں کی الگ الگ شناختوں کی طرح انسانوں کے معمار اساتذہ واتالیق کی شناختیں بھی ہمہ رنگ ہوتی ہیں۔ شوخی تقریر کے رسیا اور بلند آہنگی کے دلدادہ طالب علموں کے لیے حضرت الاستاذؒ کے دروس میں کچھ خاص نہیں تھا، لیکن موضوعی مواد کے متلاشی، دعویٰ ودلیل کا ربط دیکھنے والوں اور نظری اختلاف وتنوع میں علمی ملکہ تحکیم کا فروغ چاہنے والوں کے لیے سب کچھ ہوا کرتا تھا، ان کا لہجہ متوجہ کرنے والا نہیں ہوتا تھا، لیکن ایک بار اگر کوئی ان کو توجہ سے سن لے تو پھر شوخی تقریر کا ہر نقش مٹ جاتا تھا اور چند منٹ کا لکچر سینکڑوں صفحات کا نچوڑ اور حاصل لگنے لگتا۔ میری ایک طالب علمانہ یاد یہ رہ گئی ہے کہ میں اکثر کلاس میں ان کے لیکچرز کے نوٹس لینے لگا تھا جو دورانیہ کی طوالت واختصار کے بقدر ثبت قرطاس ہوا کرتا تھا، استاد محترم نے ایک دوبار لے کر دیکھا تو پھر کلاس میں یا ان کے دفتر میں دکھانے کا ایک معمول بن گیا، یہ بس وہ دیکھ لیتے اور کبھی کبھی کچھ اضافے کا کہہ دیتے، ایک مرتبہ میں اور مولوی ممتاز قاسمی (جو کچھ وقت ہمارے ہم سبق رہے اور پھر چلے گئے، میرے ہم وطن بھی تھے) حضرت الاستاذ کے کمرے تک گئے تو انھوں نے ہاتھ بڑھایا اور نوٹ طلب فرمایا، اتفاق کہ ہم نے اس دن نوٹ نہیں لیا تھا، ان پر سخت ناگواری کی کیفیت طاری ہوئی، ایک لمحہ توقف کیا اور کہا: ''شاید آپ میری بات سمجھ نہیں سکے، اگر سمجھ گئے ہوتے تو ضرور لکھ لیتے''، میں اور مولوی ممتاز ایک لمحے کے لیے زمین میں پیوست ہو گئے، ندامت کی کہر چھا گئی، کچھ سمجھ نہ آیا، درجات علیا کا طالب علم اتنا کم کاست نہیں ہوتا کہ اوسان بحال ہو جائیں، تو دن دو دن کے درسی مشمولات ضبط تحریر میں نہ لا سکے، اس دوران کوئی اور کمرہ میں آ گیا اور استاد محترم ان کے ساتھ مصروف گفتگو ہو گئے، میں وہیں بیٹھ گیا اور کاپی پر استحضار کے ساتھ قدرے عجلت سے لکھنے لگا، اچھا برا جو بن پڑا لکھ کر جیسے ہی آپ گفتگو سے فارغ ہوئے سامنے رکھ

دیا، انہاک سے پڑھ لیا، نہ اچھا کہا نہ برا، لیکن یک لخت چہرہ پر جو بشاشت آئی اس نے میرے وجود کو سکون واطمینان کی پھوار سے شرابور کر دیا، مولوی ممتاز صاحب کچھ مہینے پہلے ممبئ میں انتقال فرما گئے، اس سے پہلے وطن کے سفر میں میرے گھر پر ملاقات میں ہم دونوں نے اس واقعے کو یاد کیا اور دیر تک اس استادانہ تنبیہ کے معیار اور اس کے گہرے تاثر کو یاد کرتے رہے۔

تخصص کے شعبوں میں پڑھنے پڑھانے کا مزاج قدرے مختلف ہو جاتا ہے، اسباق کے حصے پڑھ سمجھ کر خوش ہو رہنے سے کام نہیں چلتا، طلباء زیادہ سے زیادہ کی طلب رکھتے ہیں، موضوع سے دن بدن دلچسپی بڑھتی جاتی ہے، عام طور پر گھنٹے خالی مل جائیں تو یک گونہ خوشی ہوتی ہے، لیکن درجات تخصص میں یہ بار بار ہو تو گرانی ہونے لگتی ہے، ہمارے پاس ایک بڑے استاد کی کلاسز لگیں جو علم وفضل، کمال فن میں یکتا تھے اور مرتبے میں بڑائی رکھتے تھے، ان کے مقام اور پھیلی ہوئی ذمہ داریوں کی وجہ سے عدیم الفرصتی رہا کرتی تھی، درجہ میں آمد نہایت غیر یقینی رہتی، جب کبھی لائبریری کا رخ کر لیتے استاد محترم کلاس میں آجاتے، ایسا کئی بار ہو گیا اور میرے ساتھ ہی ہوا تو جھلاہٹ ہونے لگی، اساتذہ کرام کی بے مثال شفقت کی وجہ سے ان سے کھلے دل سے بات کرنا کچھ مشکل نہ تھا، ہمارے جونیئرز جانتے ہیں کہ ہم لوگ اپنے اساتذہ سے شائستگانہ بے تکلفی اس قدر ضرور رکھتے تھے کہ کھل کر بات کر سکیں، اعلیٰ درجات کے طلباء کو ہمارے اساتذہ سب کچھ دے دینے کی حرص رکھتے تھے اور اپنے شاگردوں کو خود سے نہایت قریب رکھتے تھے، بلکہ اکثر کے مستقبل کی منصوبہ بندی میں مشورہ وعملی تعاون دونوں سے نوازتے رہتے تھے، بنا بریں ہم طلباء خاندان کے چھوٹے اور اساتذہ بڑے ہوا کرتے تھے، اس ماحول میں حدود تکلم کا ادیبانہ پاس قدرے نازک ہو جاتا ہے، میں حضرت الاستاذ کی جناب تک گیا اور مذکور استاذ محترم کی غیر یقینی آمد اور اچانک تشریف آوری کے بارے میں کچھ سخن گسترانہ عرض معروض کر بیٹھا، انھوں نے کمال تحمل سے بات سنی، نہایت دل فریب تبسم اور پورے چہرے کے ساتھ متوجہ ہوئے اور میرا پورا نام لے کر فرمایا: ''جائز بات بھی اس طرح الجھ کر کی جاتی ہے؟'' میری طالب علمانہ جسارت نے یکسر ندامت کا لباس اوڑھ لیا، اس پدرانہ تنبیہ پر آگے کیا کہا جا سکتا تھا، میں سرنگوں تھا، میرے مسئلے کا کوئی حل تو نہیں نکلا لیکن صوت حال کی جو توجیہ وتفسیر حضرت الاستاذ نے فرمائی واقعۃً وہ عمر بھر کے لیے اثاثہ ہے، میں نے اس وقت یہ سیکھ لیا کہ زندگی کے حقائق صرف وہ نہیں ہوتے کچی آنکھ جنھیں دیکھ رہی ہوتی ہے، بلکہ وہ ہوتے ہیں جنھیں ہمارے بڑے ہمارے لیے دیکھ رہے ہوتے ہیں، جن استاد کے بارے میں میں کچھ کہنے گیا تھا، آج ان کی نسبت شاگردی ہم کم ریش پرندوں کے لیے سرخاب کا پر ہے۔

وقت جہاں بھی اور جیسے بھی گزرے گزر جاتا ہے، لیکن گزرگاہ تمنا اور شبستان آرزو میں تو اسے پر ہی لگ جایا کرتے ہیں، سبک سار، بادرفتار جیسے تیز ہواؤں کے دوش پر اڑتے بادل، نہ چھاؤں جیسی چھاؤں، نہ دھوپ جیسی دھوپ، شاید محفل یار ہمیشہ سے ہی درچشم زدن آخر ہوتی ہے، سارے عاشقان زار یہی رو رو مرے ؎

حیف در چشم زدن محفل یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدم کہ بہار آخر شد

ندوہ کے شب وروز آدھی ساعتوں میں پورے گزر گئے، سنا ہے کہ قید وبند میں روز وشب دو روز شمار ہوتے ہیں، نہ معلوم یہ کون سی رسم جفا ایجاد ہوئی کہ ادھر طائران خوش نوا نے نوا سنجی سیکھی، بال وپر آئے اور ادھر صیاد نے مانوس قفس کے در کھول دیے اور نوآموز بازوؤں کو حکم پرواز مل گیا۔

اس شیش محلی درودیوار میں چھ سال گزر رہے تھے، ہماری ساخت پرداخت کا تکوینی ''ستہ ایام'' پورا ہو رہا تھا۔ ہر سو ہمارا عکس خیال بکھرا ہوا تھا اور ہم اس کے شہرزاد اسیر تھے، باہر کی دنیا سے دور اور اس سے زیادہ بے نیاز، ہمیں تو چاند ستارے بھی ندوے سے دیکھیں تو بھلے لگتے تھے، کہیں اور دیکھیں تو بے نور اور شب گزیدہ، عادت یہی ہو چلی تھی کہ بانگ درا ہوئی اور اذن رحیل مل گیا، اسیران وفا کو ساتھ

ہی ایک دن کی آدھی ادھوری آزادی بھی ملی کہ جاتے جاتے جو کہنا ہو کہتے جاؤ مڑ مڑ کر نہ دیکھنا، ہم سال آخر کے طلباء کے لیے الوداعیہ کا اہتمام ہوا، یہ ایک بڑی اچھی روایت تھی، کسے کچھ کہنے کا یارا ہوتا ہے، لیکن جب لب آزاد ہوتے ہیں تو زمزمہ خوانی ہو ہی جاتی ہے، ہم نے بھی کچھ کہا، کچھ حرف شکایت بھی ادا ہوئے اور ہو ہی گئے، شاید آدابِ فرزندی مکمل نہیں تھے، سالانہ امتحانات ہو گئے اور ایک ایک کر کے مسافر اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے، بڑا عجیب سماں ہوتا ہے، جن کو لوٹنا ہوتا ہے ان کی سرخوشی دیدنی ہوتی ہے لیکن جن کو دیار شوق لوٹنا نہیں ہوتا ان کے دل ٹوٹتے ہیں، ایک افسردگی ہوتی ہے اور سب سے بچھڑنے کا غم ہوتا ہے، میرا ارادہ فوراً گھر کے بجائے کہیں اور جانے کا تھا، دو ہفتے کے قیام کی اجازت دفتر اہتمام سے لے چکا تھا، ندوے میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام کی محاسبہ میں ایک صاحب حسنین قادری مرحوم کام کرتے تھے جو ہمارے ہم جماعت ابود جانہ تسنیم کے عزیز ہوا کرتے تھے، وہ مدینہ منورہ میں طویل عرصہ سے قیام پذیر اور سعودی اتصالات میں انجینئر طارق عسکری صاحب کے بھانجے تھے، طارق عسکری صاحب حضرت مولاناؒ کے بہت قریب اور ارادت مند تھے، اس بنا پر حسنین مرحوم سب سے قریب رہتے تھے، حسنین مرحوم سے میری اچھی رہتی تھی، وہ رائے بریلی سے واپس آئے تو یہ اطلاع لائے کہ استادِ محترم نے کہا ہے کہ خورشید انور کو رائے بریلی لے آؤ اور کرایہ بھی مجھے دے دیا ہے، یہ خبر ایسی وحشت ناک اور اوسان خطا کرنے والی تھی کہ میں سکتہ کی کیفیت سے دوچار ہو گیا، میرا دل وسوسہ نہیں خوف کا شکار تھا، صرف ایک ہی خیال تھا کہ بدلحاظی ہو گئی ہے اور اب بازپرس کا سامنا ہے، زندگی میں کبھی ایسی بدنما صورت حال کا شکار نہیں ہوا تھا، میرے سامنے صرف بے بسی اور بے بیانی کی لاچاری تھی، ایک دو دن بعد حسنین صاحب نے بتایا کہ میرے کام نمٹ گئے، رائے بریلی چلنا ہے، بوجھل دل اور بھاری قدموں سے روانہ ہوئے، تکیہ پہنچے، استادِ محترم سے ملاقات کی، میں نہایت خوفزدہ پریشان دل اور ہلا ہوا تھا، یہ بات نہایت حیرت ناک تھی کہ ان پر کوئی تاثر نہیں تھا، بالکل نارمل اور چہرہ پر مانوس بشاشت لیکن خوف اندر سے ہوتا ہے اور یہ ایک عذاب ہے، اس کے ساتھ انسان بے اعتماد ہو جاتا ہے، جو میں تھا اور بعد عصر استاد نے بلایا اور چند رسمی جملوں کے بعد فرمایا کہ تمہاری نقد ادب کی امتحانی کاپی دیکھی، تم نے بہت اچھا لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ (کچھ اور فرمایا جو میں لکھنا نہیں چاہ رہا) اس جملے کے بعد میری جان میں جان آئی، لیکن میری زندگی میں آج تک ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں جانے کا کوئی تجربہ اس سے زیادہ پرتحیر نہیں ہے، عالموں کے لیے علم کی کوئی حد نہیں ہوا کرتی، یہی ناموس فطرت ہے، لیکن اس ہمت افزائی کے بعد مجھ جیسے کم توشہ نے نقد ادب میں کچھ اور زیادہ پڑھنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی، یہ میری چند طالب علمانہ یادیں تھیں۔ کچھ ''شاگردانہ'' بھی ہیں، کبھی حوصلہ ہوا تو لکھوں گا۔

تعلق اور تعلق کا اظہار گو کہ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی لیکن دو الگ الگ فعلی وحدت ہیں، دنیاداری میں تعلق اظہار کے بغیر کس طرح محسوس کیا جائے؟ تعلق کا اظہار تعلق کے احساس کے لیے ایک جبری تقاضا ہے، لیکن بے لوثی اور چاہت کی تیز حرارت کسی دائرے میں خود کو قید نہیں کرتی، اس کے اپنے ہی تفسیری حدود ہیں، بے لوثی چاہتی ہے کہ میں محسوس کی جاؤں، میرا اعتراف کیا جائے، خواہ مجھے کسی قالب اظہار میں قید نہ کیا جا سکے، یہ نازک احساس، زود رنج، آزردہ مزاج، شکوہ سنج اور بدگمان طبع ہوا کرتی ہے، آپ بے مزہ نہ ہوں یہ احساس کی کائنات ہے اور گداز دل کی مملکت ہے، اس کے رنگ ڈھنگ الگ اور اس کا روپ سروپ جدا ہوتا ہے، بدقسمتی سے میں محبت میں بھی پامالی کا عادی نہیں، مظاہر محبت میں رکوع تک تو حلال' پر سجدہ حرام باور کرتا رہا ہوں، رہروانِ شوق سے یہیں میری راہیں قدرے جدا ہو جاتی ہیں، حوصلہ مند بحر محبت میں شناوری کرتے ہیں تو میں کم ہمت' کنارہ کنارہ چلتا رہتا ہوں، ہاتھ نہیں جھٹکتا، وفا سرشت ہوں اور اہل محبت سے امید وفا رکھتا ہوں، ۔طالب علمی کبھی ختم نہیں ہوتی، اس کا مخصوص دورانیہ ضرور ختم ہو جاتا ہے، طالب علمی شاید

ایک وقفہ زمنی کا نام ہے،اس کے بعد شاگردی شروع ہوتی ہے جو آپ کی حیات مستعار کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی، اس قید غلامی سے کبھی آزادی نہیں ملتی اور آزاد انسانوں کوتو کبھی بھی نہیں ملتی، بدنہاد اور غلام فطرت لوگ موقع ملتے ہی اپنی گردن سے یہ جوا نکال پھینکتے ہیں، لیکن ہمارے جیسے مجبور لوگ یہ جسارت نہیں رکھتے، ندوہ سے نکل گئے تو کافی دنوں اساتذہ سے بے ربط رہے، کچھ دن دلی اور پھر حیدرآباد دکن ٹھکانہ بنا، حیدرآباد آنے میں میرے مرحوم استاد مولانا ابوالعرفان خان ندویؒ کی غائبانہ دست گیری تھی، میرا کوئی رابطہ کسی سے نہیں تھا، استاد مرحوم نے کسی اہل غرض کو میرا نام بتایا اور تلاش کر لینے کی ہدایت دی، حیدرآباد کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا، لیکن یہ شہر دل پسند تھا، میرے نہایت عزیز دوست ڈاکٹر شعیب اسلم صاحب کا وطن تھا، پسندیدہ شاعر شاذ تمکنت کا شہر تھا، ہوش بلگرامی کی یادایام، صدق جائسی کی دربار دُربار، جوش ملیح آبادی کی یادوں کی بارات، مولانا ماجد دریابادی اور حکیم عبدالقوی صاحب کے صدق جدید کے نوٹس کے حوالے سے شہر مانوس تھا، مولانا دریابادی تو حیدرآباد کو حیدرآباد مرحوم لکھا کرتے تھے اور اس سے پہلے اور بہت پہلے تاریخ اردو ادب کے جھروکوں سے تو قلعہ گول کنڈ کی خوش منظری ہی دکھتی تھی، آخر قلی قطب شاہ کے تخیل کا بانکپن اور چھب کا اثر در و دیوار پر پڑا ہی تھا، جہاں شبلی و فراہی فروکش ہو چکے تھے، جہاں داغ دہلوی اور بڑے غلام علی خاں صاحب آسودہ خاک تھے، ہر گام ”کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی“ کا منظر نامہ تھا۔

حیدرآباد اپنے استاد کی غائبانہ فرستادگی کے سبب آ گیا، دن گزرتے رہے کہ ادب اسلامی کے اجلاس کا قرعہ فال اس شہر کے نام کا نکل آیا، میں تقریباً نہیں مکمل بے ربط تھا، اجلاس کا کنوینر ایک ایڈوکیٹ کو بنا دیا گیا جس کا ادب تو کیا سلیقے کی بے ادبی سے بھی کوئی واسطہ نہیں تھا، یہ میری جھلاہٹ کے لیے کافی تھا، میں پنبہ بہ آتش تھا، اساتذہ کی ایک ٹیم ندوہ سے آئی، میں ابتدائی اجلاسوں میں نہیں گیا، میرے استاد کو معلوم تھا کہ یہ شاگرد عربی ادب میں ان کا شاگرد ہے اور اردو ادب میں نو آموز ہے، اپنی تحریروں پر الاصلاح کے انعامات سمیٹتا رہتا تھا، از راہ مرحمت انھوں نے میری غیر حاضری پہلے اجلاس سے نوٹ فرمائی، میرے پاس فرستادہ بھیج کر بلوایا اور وجہ دریافت کی، میں نے اپنی روایتی سادگی سے عرض حال کر دیا اور بقیہ اجلاسوں میں حاضر رہا، اختتام پر مجھے ندوہ آنے اور اگلے اجلاس میں شرکت کی پیشگی دعوت کا حکم دیا، اس دوران میں پھر بے رابطہ رہا، سوائے اس کے حضرت مولاناؒ جب بھی حیدرآباد تشریف لاتے تو بہر شرف ملاقات حاضری ہو جاتی تھی، غالباً سنہ 95-94 کی بات ہے کہ ندوہ میں ادب اسلامی کا اجلاس مقرر تھا، میری قضا حاضری ہوئی، استاذ محترم نے از راہِ شفقت ایک اجلاس کی نظامت میرے سپرد فرمائی، میری مشکل یہ تھی اس موقع پر مجھ سے بہت سینئرز کئی ندوی موجود تھے، ان کی موجودگی میں میرے لیے یہ بڑا امتحان تھا، میں نے روایت کی پاس داری کا حوالہ دے کر مولانا ظفر احمد صاحب پروفیسر بنارس ہندو یونیورسٹی کا نام تجویز کیا، استاذ محترم نے یہ ذمہ داری میرے سپرد کی کہ میں جا کر ان سے درخواست کر لوں، جو کر لی گئی، غالباً اسی سال میں بغرض ملازمت سعودی عرب چلا گیا اور پھر پورے بیس سال فی غیاہب الجب! علم و دانش اور اہل علم و دانش سے دور چلا گیا، پورے چوبیس سال بعد بیٹھے بٹھائے اک ہوک سی اٹھی اور میں اچانک اساتذہ کرام سے ملنے ندوہ پہنچ گیا، ندوہ میں چھٹیاں تھیں، مولانا واضح صاحبؒ سے تفصیلی ملاقات رہی، ملاقات کے بعد گھر گیا، وہاں سے حیدرآباد واپسی کے لیے ایرپورٹ روانہ ہو رہا تھا کہ حضرت الاستاذ مولانا واضح صاحبؒ کے انتقال کی خبر ملی۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ!

حضرت الاستاذ مولانا محمد رابع صاحبؒ کی طبیعت اتنی ناساز تھی، میں ان کی کوئی بات سمجھ نہیں پا رہا تھا، عند الملاقات میرے سینئر اور ندوہ کے استاد مولانا وسیم صاحب ساتھ تھے، ان سے پوچھا کہ مولانا کیا فرما رہے ہیں، انھوں نے کہا: کہہ رہے ہیں کہ ”اس قدر دور دور نہیں رہا کرتے۔“ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی جو ایسے پر محبت عتاب پر ختم ہوئی، جس کے آگے روز روز ملنے کی طراوٹ بھی شرمندہ رہے۔

رابع لاخامس لہ

مولانا توقیر احمد عبد الفتاح ندوی
(مسقط-عمان)

کسے کو نکو نام میرد ہمے
ز مرگش تاسف خورد عالمے

عالم اسلام کی مایہ ناز شخصیت اور ندوۃ العلماء کے محسن ومیر کارواں بتاریخ ۲۱؍رمضان ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ء بروز جمعرات بعد نماز ظہر اس دنیا سے رخصت ہوئے۔

خوشی کے آنسو اور صدمے کا سکتہ یہ انسانی فطرت کی بے بسی اور احساس کی برق روی دونوں کا پتہ دیتے ہیں، اس صدمے کی خبر نے ایسا حملہ کیا کہ وہ ستارہ جو زمانے کے افق پر صدی کے دو تہائی حصے تک چمکتا رہا، اس کے ہمیشہ کے لیے غروب ہو جانے پر ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' لکھنا بھی دشوار ہو گیا، آنکھوں کے سامنے اندھیرا' انگلیاں بے حرکت اور چند جملوں کی ترتیب بھی محال ہو گئی۔

اس بجلی اثر صدمے کی خبر کا ایسا تانتا بندھا جیسے آسمان سے بارش کی طرح بجلی کی دھار چل پڑے۔

کچھ لمحوں کے بعد حواس بحال ہوئے اور مختلف تبصرے اور تحریریں نظر نواز ہوئیں، مولانا شکیل ندوی صاحب اعظمی بحرین، پھر استاذ گرامی ڈاکٹر محمد اکرم ندوی صاحب کے تعزیتی تاثرات نے تھوڑا سہارا دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخصیت خود بھی استاذ رہی ہو اور اس کے سینکڑوں شاگرد بھی استاذ بن گئے ہوں، تو یقینی ہے کہ اس کے نیاز مندوں کی جم گھٹ کسی کہکشاں سے کم نہ ہوگی۔

ہمیں ندوۃ العلماء کے آستانے پر ۱۹۸۶ء سے ۱۹۹۴ء تک کا زمانہ ملا، ۱۹۷۵ء میں منعقد جشن پچاسی سالہ کے آب وتاب کے ہلکے پھلکے جھونکے وقتاً فوقتاً چلتے رہتے تھے، اس جشن کے چرچے مجلسوں اور نشستوں میں گاہے بگاہے دہرائے جاتے، یہ جشن ندوۃ العلماء کے علمی وفکری نصف النہار اور تصنیف وتحقیق کے عروج کا ترجمان تھا، ایک طرف یہ جشن مقبولیت کا نغمہ تھا تو دوسری طرف اس تحریک کی کامیابی کا تمغہ۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں تعلیم کا موقع ملنا بڑی سعادت اور خوش نصیبی کی بات ہوگی۔

ہمارے زمانے میں ندوۃ العلماء چار ناموں کا مکعب تھا، اس میں سب سے نمایاں نام حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کا تھا، دوسرا مولانا کے عکس کے طور پر متعارف مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کا، تیسرا نام مہتمم بے مثال مولانا محبّ اللہ لاریؒ اور چوتھا نام منتظم عالی شان مولانا معین اللہ ندویؒ کا تھا۔

یہ شخصیتیں نچلے درجے کے طلبہ کے لیے چار سمتوں کے چار قطب کی حیثیت رکھتے تھے، جنہیں دور سے دیکھ لینا بھی کسی مجلس میں گفتگو کا حوالہ بن جاتا۔

ان میں سے مولانا محمد رابع صاحب کے علاوہ ہم لوگوں کے زمانے میں تدریس کسی سے وابستہ نہ تھی، لہٰذا مولانا رابع صاحب سے پڑھنے کی تمنا میں عالیہ رابعہ کا انتظار عالیہ اولیٰ سے ہی شروع ہو جاتا۔

آخر وہ گھڑی آئی جب عالیہ رابعہ کے تمام سیکشن کے طلبہ مولانا کی تصنیف ''الادب العربی بین عرض ونقد'' کو مولانا سے براہ راست پڑھنے کے لیے عباسیہ ہال میں اکٹھا ہوتے۔

ہال کا رعب، مضمون کا جلوہ اور پھر مصنف کی شان پر شکوہ سے یہ گھنٹہ طلبہ کے اعتماد کی نفسیات کو ثریا پر پہنچا دیتا، مولانا سے عالیہ رابعہ کے بعد فضیلت میں بھی ''جزیرۃ العرب'' اور ''سیرت ابن ہشام'' پڑھنے کی سعادت ملی، مولانا بہت مختصر پڑھاتے اور بہت جامع پڑھاتے، اگر کسی نے دوران درس غور سے اور توجہ سے پڑھا تو کوزے کو سمندر میں پھیلانا اس کے لیے کوئی الجھن کی بات نہیں۔

مولانا بہترین مدرس، بلند نظر مدبر اور جہاں دیدہ تھے۔ حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ کے ساتھ علماء وصلحاء سے ملاقات ہو، امراء وسلاطین کے دربار ہوں، خواہ عجم ہو یا عرب ہر جگہ حاضر رہے۔

مولانا ندوۃ العلماء میں عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ رہے، مہتمم بھی ہوئے، نائب ناظم بھی ہوئے اور آخر میں بطور ناظم زندگی تمام کی۔ ندوہ العلماء کے تمام اہم مناصب مولانا کی زندگی کے اہم ابواب ہیں۔

مولانا کو اللہ نے بات سمجھانے کا نرالا انداز بخشا تھا، حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے بعد یہ خصوصیت پورے طور پر مولانا محمد رابع صاحب میں موجود تھی، ہمیں یاد ہے بابری مسجد کے انہدام کے روز حضرت مولانا علی میاں ندوہ میں ہی تھے، اگلے روز پورے ملک کی تشویش ناک اور کرب ناک خبروں نے طلبہ کو مایوس بنا دیا تھا، حضرت مولانا نے طلبہ کو مسجد میں جمع کروایا اور عجیب خطاب فرمایا، جس سے طلبہ کی کیفیت بالکل بدل گئی، اسی طرح جب عراق کے صدر صدام حسین نے کویت پر حملہ کیا تو صدام حسین کی واہ واہی بہت ہو رہی تھی، طلبہ کی اکثریت صدر صدام حسین کی والہانہ طرف داری کر رہی تھی، اس موقع پر مولانا رابع صاحب نے طلبہ کو مسجد میں جمع کروایا اور ایسے حقائق وواقعات سنائے جو چشم دید تھے، اس خطاب نے طلبہ کی ذہنیت کو یک لخت بدل دیا۔

زندگی کی یادگار گھڑیاں :

ادھر پانچ سالوں میں ندوۃ العلماء دو مرتبہ جانا ہوا، حضرت کی صحبت میں تفصیل سے بیٹھنے کی سعادت ملی، دسترخوان پر بار بار ساتھ کھانا نصیب ہوا، بعد مغرب حضرت کی چائے کے موقع پر باقی ماندہ تبرک کئی مرتبہ نصیب ہوا اور دعائیں ونصیحتیں ملیں، آخری ملاقات ۱۶/جون ۲۰۲۲ء کی ہے، ان سعادتوں کے حصول میں ہمارے مولانا وثیق صاحب کی عنایتوں کا بڑا دخل ہے۔ جزاہ اللہ خیرا!

آج ان لمحات کو یاد کر کے بڑی خوشی ہو رہی ہے اور افسوس بھی کہ اب ان سعادتوں کا موقع کبھی میسر نہ ہوگا۔

حضرت مولاناؒ کی وفات پر پورا ملک غم زدہ ہے، مولانا ہر نشست کے صدر نشین تھے، جس ذات پر اختلاف دم توڑ دے مولانا اتحاد کی ایسی دیوار تھے۔

عالم اسلام اور سرزمین بھارت کے علاوہ ندوۃ العلماء میں بالخصوص مولانا کی ذات سے ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کا پر ہونا اللہ کی رحمت خاص کے علاوہ ممکن نہیں۔

ندوۃ العلماء کا مہمان خانہ حضرت مولانا علی میاں سے مولانا رابع صاحب کی ہم رنگی اور ہم آہنگی کی بنا پر کبھی بے بہار محسوس نہیں ہوا، وہ بہار اب بے رنگ ہوتی نظر آ رہی ہے، مگر رب کے نظام مشیت میں کوئی شام ایسی نہیں جس کی صبح نہ ہو۔

اللہ کی ذات سے امید قوی ہے کہ اس کے فضل سے وہ بہار دوبارہ چمن کو بارونق کرے گی اور یہ چمن اپنے نئے باغباں کے جواں حوصلوں پر نئے گل وبلبل سے ایک خوبصورت چمن کی تاریخ رقم کرے گا ؎

خدا سرسبز رکھے اس چمن کو مہرباں ہوکر

اللہ حضرت مولانا کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کی علمی خدمات پر مولانا کو امت کی طرف سے اجر عظیم بخشے، گھر والوں اور ابنائے مادر علمی کو صبر وشکیبائی سے نوازے۔ آمین ثم آمین!

ملت اسلامیہ کی محترم شخصیت

مولانا محمد اسعد قاسمی
(ناظم دارالعلوم الاسلامیہ-بستی)

بلاشبہ ہندوستان کے تمام مسلم فرقوں، تحریکوں اور تنظیموں کے لیے مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی نقطۂ اتحاد واجتماعیت تھی۔ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ندوۃ العلماء، دینی تعلیمی کونسل، رابطہ عالم اسلامی اور عالمی رابطہ ادب اسلامی اور نہ جانے کتنے اداروں کی سرپرستی قیادت اور رکنیت کا بارگراں ان کے مبارک کاندھوں پر تھا، ملت اسلامیہ ہندیہ کے ہر طبقہ میں ان کو عظمت واحترام اور محبت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کا سب سے بڑا مرجع انہی کی شخصیت تھی۔

حضرت مولانا علم وحلم کا سرچشمہ صبر وتحمل کا پیکر، فکر ندوہ کے امین اور حقیقی معنوں میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے سچے جانشین تھے اور چوبیس سال تک انھوں نے نیابت کے فریضہ کو بطریق احسن انجام دیا۔ مولانا رومؒ کے بقول؛ حلم اور بردباری کی تلوار لوہے کی تلوار بلکہ لشکر جرار سے بھی زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت ہوتی ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حضرت مولانا کے دور نظامت میں جو خارجی اور داخلی حالات ومسائل پیدا ہوئے اور مسلم پرسنل لا بورڈ پر بھی وقتاً فوقتاً اُن کے دور صدارت میں جو حملے ہوتے رہے انہوں نے بڑی حکمت عملی، تدبر اور صبر وتحمل کے ساتھ ان کا سامنا کیا اور موجودہ حالات میں انہوں نے مسلمانوں کی جس طرح رہنمائی کی ہے وہ بھی ان کا ایک مثالی کام ہے، نیز حضرت مولانا ایک بلند پایہ مصنف، ماہر تعلیم، عربی کے مایہ ناز ادیب اور انتہائی مشفق اور بافیض استاد ومربی تھے۔

حضرت مفکر اسلام کی طرح حضرت مرشد الامت میں بھی دوسری قوموں اور لوگوں کے سلسلے میں بڑا اعتدال وتوازن تھا، اس لیے ملک کے ہر حلقے میں ان کے غم فراق کو شدت سے محسوس کیا گیا۔

ہمارے ادارہ دارالعلوم الاسلامیہ کی مجلس شوریٰ کے وہ ایک اہم رکن تھے۔ وہاں کے تعلیمی اور انتظامی امور میں بڑے اہم مفید اور صائب مشوروں سے نوازتے اور ہمہ وقت اس کے بارے میں مفکر رہا کرتے تھے، بانی دارالعلوم الاسلامیہ والد ماجد حضرت مولانا محمد باقر حسین سے بڑے گہرے اور دیرینہ مراسم تھے، تمام متعلقین دارالعلوم اور خاص طور پر مجھ سے بڑا مشفقانہ ومخلصانہ تعلق رکھتے تھے، ہر ملاقات پر یہ محبت بھرا شکوہ ضرور فرماتے کہ ”آپ کی یہاں حاضری مزید اور تسلسل کے ساتھ ہونی چاہیے، میری صحت متحمل نہیں ہے، ورنہ بستی ضرور حاضری دیتا، آپ اور آپ کے والد گرامی سے گہرے اور دیرینہ تعلقات ہیں۔“ اور مستقل دعاؤں اور قیمتی مشوروں سے نوازتے، حضرت مفکر اسلام کی طرح وہ بھی حضرت والد ماجد اور ان کے افراد خاندان سے عزیزوں کا سا معاملہ اور بزرگانہ شفقت فرماتے تھے۔

حضرت والد ماجد کی شخصیت وخدمات پر جب ایک ضخیم اور دستاویزی کتاب منظر عام پر آئی تو انہوں نے اس کا قیمتی مقدمہ تحریر فرمایا اور اس کے اجراء کی تقریب بھی اپنے مبارک ہاتھوں اور مختصر خطاب سے انجام دی، جس کا ایک اہم اور قیمتی ٹکڑا یہ بھی تھا:

”جب لوگ دنیا میں پڑ کر دین کو بھول جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کچھ دین کے مبلغین ومصلحین اور علوم دینیہ کی فکر کرنے والوں کو پیدا فرمادیتا ہے جن کے ذریعہ سیکڑوں اور ہزاروں انسانوں کی اصلاح ہوتی ہے، مولانا محمد باقر حسین نے متحدہ بستی اور مرادآباد میں جو دین وعلم کی ترویج واشاعت کی شجرکاری کی ہے، رہتی دنیا تک اس کا پھل انسانیت کو ملتا رہے گا اور ہزاروں طلبہ دین کے سرچشمے سے سیراب ہوتے رہیں گے، آپ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ ناقابل فراموش ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو اجر عظیم سے نوازے۔“

وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے

مولانا ظہیر انوار قاسمی
(مہتمم دارالعلوم الاسلامیہ-بستی)

تیری لحد پہ خدا کی رحمت تیری لحد کو سلام پہنچے

یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ موت کی دستبرد سے کوئی متنفس محفوظ نہیں رہ سکتا، اس عالم آب وگل سے جدائی یقینی ہے جو اس دنیا میں آیا ہے اسے جانا ضرور ہے: ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ بس آگے پیچھے کی بات ہے، اسی مقدر امر نے مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ (تغمده الله برحمته الواسعة) کو ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا اور وہ اس فانی دنیا کو چھوڑ کر دارِ بقا کی طرف کوچ کر گئے، مگر بعض انفاس قدسیہ کی موتیں اپنے قرب وجوار کے نفوس ہی کو نہیں بلکہ دور دور تک کے لوگوں کے قلب ودماغ کو ہلا کر رکھ دیتی ہیں، حضرت مولانا کی وفات کی خبر ہم سب کے دلوں پر بجلی بن کر گری اور پوری فضا سوگوار ومغموم ہوگئی، مولانا مرحوم اپنی عمر طبعی سے زیادہ مدت گذار کر اس دنیا سے رخصت ہوئے، مگر ان کی وفات کے صدمے کو نہ صرف ملت اسلامیہ ہندیہ ہی نے بلکہ پورے عالم اسلام نے محسوس کیا، وہ ایسے وقت میں دنیا سے رخصت ہوئے جب ملت اسلامیہ ہندیہ کو ان کی بہت ضرورت تھی، ان کی جدائی نے ملت اسلامیہ ہندیہ کے ساتھ ساتھ پورے عالم اسلام کو سوگوار بنا دیا، ایسا لگا کہ روحانیت کا چراغ ہی گل ہوگیا ؎

بچھڑا کچھ اس طرح سے کہ رُت ہی بدل گئی
ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا

حضرت مولانا کی وفات علمی، فکری، دعوتی دنیا کا عظیم سانحہ ہے، تاریخ کا ایک زرّیں باب بند ہوگیا، حضرت والاؒ بلاشبہ ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہے، اس پُر آشوب دور میں حضرت مولاناؒ کی ذاتِ گرامی ملتِ اسلامیہ ہندیہ کی عزت وناموس کے لیے آخری ڈھال تھی، آپ کی وفات صرف ندوۃ العلماء، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا نہیں بلکہ پوری امت کا ناقابل تلافی نقصان وخسارہ ہے۔ اخلاص وللّٰہیت، نام ونمود سے دور، صلہ وستائش سے بے پرواہ، دین وملت کی بے لوث خدمت آپ کا طرۂ امتیاز تھا، آپ کا تعلق ایک عظیم علمی ودینی خانوادہ سے تھا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے علوم ومعارف کے آپ امین اور ان کے علوم ظاہری وباطنی کے صحیح جانشین تھے، تواضع، انکساری، کریمانہ اخلاق، وسعتِ ظرفی میں اپنے اسلاف کا بہترین نمونہ تھے۔ وہ پوری ملت کے لیے ایک نقطہ اتحاد تھے، حضرت مولانا مرحوم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ جیسے مؤقر ادارہ کے صدر رہنے کے ساتھ ساتھ رابطہ عالم اسلامی مکۃ المکرّمہ کے رکن تاسیسی، ازہر ہند دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے ممبر اور نامعلوم کتنے اداروں، علمی وفکری مجلسوں کے نگراں وسرپرست بھی تھے۔ حضرتؒ دارالعلوم الاسلامیہ بستی کی مجلس شوریٰ کے اہم رکن تھے۔ دارالعلوم الاسلامیہ بستی اور اس کے خدام سے والہانہ ومخلصانہ تعلق رکھتے تھے اور اس ادارہ کے لیے ہمیشہ فکرمند رہا کرتے تھے۔

وہ اپنی اعتدال پسندی اور غیر متنازع شخصیت ہونے کے سبب ہر مسلک ومشرب میں نہایت عزت واحترام سے دیکھے جاتے تھے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ان کی صدارت کے زمانے میں بڑے

نازک دور سے گذرا اور اُسے بڑے حساس مسائل کا سامنا کرنا پڑا، مگر آپ کی حکمت وفراست اور تدبر سے بورڈ ہر چیلنج کا بخوبی مقابلہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا رہا اور آپ کی رہنمائی میں پوری توانائی کے ساتھ ملت کی بیش بہا خدمت انجام دیتا رہا، آپ ایک مضبوط قائد تھے جن کی بابرکت زندگی کے سایے میں بہت سے فتنے وقت سے قبل ہی کچل دیئے گئے، آپ کی حکمت عملی اور فراست وتدبر نے مسلم پرسنل لا بورڈ کو ہر محاذ پر سازش کا شکار ہونے سے محفوظ رکھا اور حضرت مولاناؒ نے پوری دیانت داری اور خود احتسابی کے ساتھ ملت اسلامیہ ہندیہ کی قیادت کے فرائض انجام دیئے، بلاشبہ آپ کی شخصیت ہندوستان میں سرمایۂ ملت کی نگہبان تھی ؎

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ان کی زندگی قناعت وتوکل کی زندگی تھی، رہنے سہنے کا انداز سادہ اور تکلفات سے دور تھا، ان کی سج دھج میں کوئی امتیازی شان نہ پائی جاتی تھی، ان میں علم کے پندار اور تفوق کا کوئی شائبہ نہ تھا، سادگی دیکھ کر یقین نہ آتا کہ اس پُرسکون سمندر کی تہہ میں علم کے بیش قیمت موتی بھی موجود ہوں گے۔ وہ بولتے تو ان کی باتوں سے گلوں کی خوشبو آتی:

ع وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے

طبیعت نہایت متواضع، فروتنی، انکساری، بے نفسی، بے غرضی، ایثار پسندی، خردوں کی حوصلہ افزائی، ان مؤمنانہ صفات سے حضرتؒ کی شخصیت مرکب تھی، ان صفاتِ کریمانہ کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے انہیں فراستِ مؤمن بھی عطا کی تھی۔

حضرتِ والا کے مزاج میں سادگی اور خاموشی غالب تھی، مگر وہ بڑے عزم وحوصلہ کے مالک تھے، اپنی ایمانی فراست، معاملہ فہمی اور فطری ذہانت سے بڑی بڑی گتھیاں سلجھا دیتے، حضرتِ والا ہمیشہ ہر ایک سے ہمیشہ مسکرا کر خندہ روئی اور خندہ پیشانی سے ملتے، ان میں یہی ممتاز وصف تھا جو ہر ملنے والے کو اپنا گرویدہ بنالیتا ؎

بہت لگتا تھا جی صحبت میں ان کی
وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے

آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اساتذہ وملازمین وطلبہ کو خاندان کا ایک فرد سمجھتے، سب کے ساتھ برادرانہ، خیرخواہانہ، مخلصانہ، ہمدردانہ، مشفقانہ معاملہ فرماتے، ہمیشہ اس کا خیال رکھتے کہ ان کے اکرام واعزاز اور حوصلہ افزائی میں کسی طرح کی کوتاہی نہ ہونے پائے، سب کو اپنی بزرگانہ شفقت اور عزیزانہ محبت سے نوازتے، اپنی نگاہ جوہر شناس سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے لیے لائق، باصلاحیت، اسلامی فکر ومزاج کے حامل، سلیم الطبع، باکمال، جیدالاستعداد، تجربہ کار اساتذہ کا انتخاب کرتے تاکہ نظام تعلیم بہتر سے بہتر ہو۔

حضرت مولاناؒ نے ندوۃ العلماء کو اپنے لیے سرمایۂ حیات جانا اور اس کی ہمہ جہت ترقی کے لیے کسی طرح کی قربانی دینے میں کبھی دریغ نہیں کیا اور اپنی بھرپور خداداد صلاحیت سے ندوۃ العلماء کو ترقی کے بام عروج پر پہنچایا، ربِّ کریم اس تعلیمی وفکری ودعوتی دانش گاہ کو تمام قسم کے شرور وفتن سے محفوظ فرمائے، امت اسلامیہ کا یہ قیمتی سرمایہ ہمیشہ کی طرح ثمرآور ہو۔

حضرت والا اپنے عمدہ انتظام وانصرام کے ساتھ ساتھ تدریس وتربیت بھی بہت مؤثر انداز میں کرتے تھے، آپ ایک بافیض استاذ بھی تھے، طلبہ میں آپ کا درس بے حد مقبول تھا، آپ کے تلامذہ اور فیض یافتگان پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔

عربی زبان وادب کے اعتبار سے معاصر اہل علم میں آپ اپنی مثال تھے، بلکہ آپ کو ادبِ اسلامی کے ہراول دستے کا امام خیال کیا جاتا تھا، آپ کی عربی اور اردو دونوں زبانوں میں بہت ساری تصنیفات بھی ہیں جو علم وادب کے حلقے میں بے حد مقبول ہیں۔ بعض کتابیں بہت سی جامعات اور مدارس میں داخل نصاب بھی ہیں جو نہایت مفید اور مقبول گردانی جاتی ہیں۔

حضرتِ والاؒ کی وفات سے ایک ڈیڑھ ماہ قبل مزاج پرسی کے لیے ندوۃ العلماء حاضری ہوئی، کمزوری ونقاہت چہرے سے محسوس ہورہی تھی، میں نے اپنی حسب عادت سلام کرکے دعا کی درخواست پیش کی، ان کے آرام وراحت کے پیش نظر رخصت ہونے کے لیے اجازت چاہی، حضرت نے فرمایا: بیٹھئے، پھر ہندوستان پر انگریزوں کے تسلط اور اپنے علماء واسلاف کی ملک کی آزادی میں قربانیوں کا ذکر کرنے لگے، فرمایا کہ ہندوستان تقسیم ہوجانے کے بعد یہاں کے مسلمانوں کے اقتصادی حالات بے حد خراب ہوگئے، مگر ہمارے بزرگوں کی فکر نے یہاں مدارس کو قائم کرکے مسلمانوں کے عقائد اور ان کے اسلامی تشخص کو تو محفوظ رکھا ہی، وہیں پر مدارس کے ذریعہ مسلمانوں کی معاشی حالت سدھارنے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ انہی مدرسوں میں کتنے لوگ معلم اور ملازم ہوئے اور ان کے بچوں کا معاشی مسئلہ بھی حل ہوا۔ یہ انہی مدرسوں کا طفیل تھا۔ حضرتِ والا نے ہندوستان میں مدارس اسلامیہ اور مکاتب دینیہ کے قیام کے سلسلے میں اپنے اسلاف کی کوششوں کا تفصیل سے ذکر فرمایا۔

اسی طرح ایک بار جانشین شیخ الاسلام حضرت مولانا سید ارشد مدنی صاحب دامت برکاتہم جمعیۃ علماء کی کسی میٹنگ میں شرکت کے لیے لکھنؤ تشریف لائے تھے، حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ کیا ندوہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے ملاقات کے لیے چلوگے؟ میں نے کہا: کیوں نہیں! ایسے رجالِ باصفا اور اصحاب زہد وتقویٰ سے ملاقات میرے لیے باعث نجات ہے۔ میں حضرت کی معیت میں ندوہ حاضر ہوا، اس وقت حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ بھی بقید حیات تھے، حضرت والا کو ان دونوں حضرات کے معمولات کے بارے میں کچھ غلط فہمی ہوئی، حضرت والا نے سمجھا کہ یہ حضرات ابھی تلاوت ومعمولات میں مصروف ہوں گے اور ندوہ پہنچنے تک اپنے معمولات سے فارغ ہوجائیں گے، مگر یہ حضرات اپنے معمولات پورا کرکے مہمان خانے کے کمرے میں آرام فرمارہے تھے، جب انہیں بتایا گیا کہ حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم ملاقات کے لیے تشریف لائے ہیں تو ایسے باادب اور متواضعانہ اپنے کمرہ سے مہمان خانہ میں تشریف لائے جیسے کوئی شاگرد اپنے استاذ یا مرید اپنے پیر سے ملتا ہو۔ یہ منظر دیکھ کر آنکھیں آب دیدہ ہوگئیں کہ یہ ہیں نمونۂ اسلاف۔ پھر جانشین شیخ الاسلام کو ایک مصلیٰ اور ایک شال ہدیہ میں پیش کیا، جانشین شیخ الاسلام نے فرطِ عقیدت میں دونوں چیزوں کو پہلے چوما اور پھر اپنے سر پر رکھ لیا، یہ تھا حضرت مولانا مرحوم کا تواضع، انکساری اور محبت فی اللہ کا عملی ثبوت، ہائے کیا سادگی پائی تھی ؎

مدتوں رویا کریں گی بستیاں در بستیاں
روز کب پیدا ہوا کرتی ہیں ایسی ہستیاں

اس مردِ قلندر نے ۲۱؍رمضان ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ء بروز جمعرات ندوۃ العلماء کی روحانی وعلمی فضا میں اپنا آخری سانس لیا اور علم وعمل، زہد وتقویٰ کا یہ چمکتا ستارہ موت کے دبیز گہرے بادلوں میں چھپ گیا۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون. فإن للّٰہ ما أعطی وله ما أخذ و کل شئ عنده بأجل مسمیٰ، فلنصبر ولنحتسب، وإن العین لتدمع، والقلب لیحزن، ولانقول إلا ما یُرضی ربنا وإنا لفراقکم لمحزونون.

حضرتِ والا کی پہلی نماز جنازہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے وسیع میدان میں پڑھی گئی جس میں لاکھوں افراد شریک ہوئے اور دوسری نماز جنازہ ان کے وطن تکیہ رائے بریلی میں ہوئی اور دائرہ شاہ علم اللہ کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ بندۂ عاجز کو بھی تکیہ رائے بریلی پہنچ کر نماز جنازہ میں شرکت کی سعادت ملی جس کو یہ بندہ اپنے لیے باعث نجات خیال کرتا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت والاؒ کی قبر پر اپنی رحمتوں کی شبنم برسائے اور اعلیٰ علیین میں مقام کریم عطا فرمائے نیز نبی کریم ﷺ کی شفاعت کا وافر حصہ نصیب فرمائے۔ آمین!

موت اُس کی ہے کہ کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آتے ہیں مرنے کے لیے

ہم آپ کے فراق سے محزون ہیں اے مرشد امت!

ڈاکٹر صباح اسماعیل ندوی
(منیجر جبریل انٹرنیشنل اسکول-کلکتہ)

دل فگار ہیں، آنکھیں اشک بار ہیں، یہ خیال ہی ہمارے لیے روح فرسا ہے کہ آپ ہمارے درمیان نہیں رہے، مگر ہم اپنے رسول ﷺ کی سنت کے مطابق وہی بات کہتے ہیں جس سے ہمارا رب راضی ہو، ہم آپ کے فراق سے مغموم ومحزون ہیں اے مرشد امت!

"وإنا بفراقك 'يامرشدى' لمحزونون"

سب جانتے ہیں کہ موت سے کسی کو مفر نہیں، خدائے رب العالمین نے رسول رحمۃ للعالمین ﷺ سے بھی کہہ دیا تھا:

﴿إِنَّكَ مَيِّتٌ وَ إِنَّهُمْ مَيِّتُوْنَ﴾

اس دنیا میں باقی کوئی نہیں رہے گا، آپ بھی چلے جائیں گے اور بقیہ سب لوگ بھی چلے جائیں گے۔ باقی تو بس اسی کو رہنا ہے۔ اگر آج آپ چلے گئے ہیں اے مرشد امت! تو کل ہم سب بھی چلے جائیں گے۔ إنا للّٰه وإنا إليه راجعون!

ہم جانتے ہیں کہ جس خدا نے ہم سب کو آپ کے کربِ فراق میں مبتلا کیا ہے، وہ ہم سب کو صبر وشکر کی توفیق بھی دے گا اور غم واندوہ کے اس پہاڑ کے پار اترنے کا حوصلہ بھی بخشے گا، مگر آپ کی جدائی کا غم معمولی نہیں ہے۔ آپ نے جن حالات میں امت کی کشتی کو سنبھالا ہے اور ہزار مصیبتوں کے باوجود ہمت واستقلال کے ساتھ امت مسلمہ ہندیہ کو جینے کا سلیقہ سکھایا ہے، اس کے لیے آپ ہر موڑ پر ہم کو یاد آتے رہیں گے۔ آپ تھے تو' رندوں کو تسلی تھی کہ اس بزم میں 'تم' ہو۔

دنیا جانتی ہے کہ اکیسویں صدی ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایجادات واختراعات کے سیلاب کے ساتھ نت نئی مصیبتوں اور پریشانیوں کا طوفان بھی لے کر آئی تھی، مگر آپ مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ایسے جانشین تھے جنہوں نے ان کی خلافت وجانشینی کا حق کما حقہ ادا کر دیا اور ان کے انتقال پر ملال کے بعد رشد وہدایت اور قیادت وامامت کی ایسی مثال پیش کی جو بلاشبہ اپنی مثال آپ ہے۔

قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے بعد ۲۰۰۲ء سے اپنی تاریخ وفات ۱۳/اپریل ۲۰۲۳ عیسوی تک بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ آپ نے مسلمانان ہند کی جس حکمت وفراست کے ساتھ قیادت ورہنمائی فرمائی وہ آپ پر اللہ جل شانہ کے فضل خاص کا مظہر تھی۔ اس حقیقت کا سب کو اعتراف ہے کہ آپ بلاشبہ ہند میں سرمایۂ ملت کے نگہبان تھے۔ آپ نے انتہائی نامساعد حالات میں بھی ملت کو جوش وہیجان میں مبتلا ہونے سے محفوظ رکھا اور ان کو اللہ مالک یوم الدین پر یقین کامل رکھتے ہوئے صبر واستقامت کے صراط مستقیم پر گامزن رہنے کی تلقین کی۔

شہر کلکتہ جہاں آپ کی صدارت میں بورڈ کے دو اہم اور تاریخی اجلاس ہوئے، ایک مارچ ۲۰۰۸ء میں اور دوسرا نومبر ۲۰۱۶ء میں اور ان دونوں اجلاس میں اس راقم آثم کو بھی بحیثیت نائب سکریٹری مجلس استقبالیہ بورڈ کے اراکین اور دیگر معززین کی خدمات انجام دینے کا موقع نصیب ہوا۔ یہ دونوں اجلاس آپ کی بصیرت وبصارت' آپ کی دور بینی ودور اندیشی اور آپ کی قائدانہ صلاحیت کے بہترین گواہ ہیں اور سرزمین بنگالہ کا ہر فرد اس کا معترف ہے۔ آپ کی صدارت وقیادت میں شہر نشاط کلکتہ میں رابطہ ادب اسلامی عالمی کے دو اہم اجلاس منعقد ہوئے، ایک فروری ۲۰۰۵ء میں اور دوسرا دسمبر ۲۰۱۲ء میں، باب العلوم اور جبریل انٹرنیشنل اسکول کے زیر اہتمام منعقدہ ان کامیاب ترین کانفرنسوں کے اختتام پر شہر کے مرکزی علاقہ میں واقع

پارک سرکس میدان میں جو عوامی جلسہ منعقد ہوا ان میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو دیکھنے اور سننے کے لیے لاکھوں لوگ جمع ہوئے اور اس وقت تک اپنی جگہوں پر موجود رہے، جب تک کہ مولاناؒ کا بصیرت افروز ایمانی وروحانی بیان مکمل نہ ہوگیا۔

آپ اس مشہور زمانہ سید خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس نے شاہ علم اللہ حسنی (متوفی ۱۶۸۵ء)، سید احمد شہید (متوفی ۱۸۳۱ء)، حکیم سید عبدالحی حسنی (۱۹۲۳ء)، ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (متوفی ۱۹۶۱ء)، سید محمد الحسنی (۱۹۷۹ء)، سید مولانا ابوالحسن علی ندوی (متوفی ۱۹۹۹ء)، مولانا سید محمد واضح رشید ندوی (متوفی ۲۰۱۹ء) جیسے علماء، خطباء، دانشوران اور روحانی وایمانی رہنما پیدا کیے۔ آپ اس جگمگاتے آسمان کے ایسے تابندہ ودرخشندہ ستارے تھے جس نے لاکھوں افراد کو رشد وہدایت کی روشنی فراہم کی اور ان کی جانب سے تعزیت اور دعائے مغفرت کے مستحق ثابت ہوئے، آپ کے جنازے میں عوام کا ازدحام اس بات کا اعلان تھا کہ وہ اپنے دلوں میں آپ کے لیے بے پناہ محبت وعقیدت رکھتے تھے اور آپ کی جدائی ان کے لیے انتہائی حیران کن اور تکلیف دہ تھی۔

عالم اسلام کی مشہور ترین درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کو آپ نے ۷۵ر سالوں تک اپنے خون جگر سے سینچا، آپ ۱۹۴۹ء میں ندوہ میں استاد مقرر ہوئے اور دم آخر تک اس کی تعمیر وترقی کو اپنا اولین مقصد حیات بنائے رکھا، ۲۳ر سالوں پر محیط آپ کا دور نظامت ندوہ کی تاریخ کا سنہرا باب ہے، آپ ایک عظیم استاذ، بہترین خطیب، لائق احترام داعی، قابل فخر مصنف ومؤلف اور نہایت مشفق مربی وسرپرست تھے۔ ہزاروں طلباء اور اساتذہ نے آپ سے علم وتربیت حاصل کی۔ تعلیمی وتربیتی میدان میں آپ کی نمایاں خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ آپ ان دیدہ ور ودانش ور لوگوں میں سے ہیں جن کا نام ان کی مثالی زندگی اور قابل رشک کارناموں کی وجہ سے ہزاروں سال تک فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

آپ نے بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی، رکن دارالعلوم دیوبند، سرپرست اسلامی فقہ اکیڈمی۔ نئی دہلی، صدر اکیڈمی آف اسلامک ریسرچ اینڈ پبلی کیشن۔ لکھنؤ، سرپرست مولانا آزاد میموریل اکیڈمی لکھنؤ اور ممبر آکسفورڈ سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز (برطانیہ) جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، ان کا بہترین صلہ تو آپ کے رب ہی کی جانب سے ملنے والا ہے، کیونکہ آپ نے ان غیر معمولی خدمات کے بدلہ میں دنیا والوں سے کبھی کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا۔ اتنے سارے بڑے بڑے عہدے آپ کو اللہ نے اسی لیے عطا کیے تھے کہ آپ صرف اسی سے امید لگاتے تھے اور اسی کی رضا کی خاطر تمام کام انجام دیتے تھے۔ ہماری آنکھوں نے اس دنیا میں آپ سے بہتر انسان نہیں دیکھا۔ ابھی رمضان سے چند دنوں قبل ہی ہم نے ندوہ کے مہمان خانہ میں آپ سے دعائیں لی تھیں۔ ہمیں کیا خبر تھی کہ یہ ہماری آپ سے آخری ملاقات ہے۔ کل اس کی آنکھ نے کیا زندہ گفتگو کی تھی۔ گمان تک نہ ہوا وہ بچھڑنے والا ہے۔

ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ اللہ کے نیک بندے تھے، آپ اسوۂ رسول ﷺ کا بہترین نمونہ تھے، آپ کی ذات میں ان 'عباد الرحمان' کی تمام صفات بدرجہ اتم موجود تھیں جن کے حاملین کے فوز وفلاح کی بشارت اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام مقدس میں بیان کی ہے۔ آپ نے ہمیشہ سب کا بھلا چاہا اور اپنوں پرایوں سب کو اپنی دعاؤں میں شامل رکھا۔ آپ اپنے پیش رو مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی طرح رمضان کے مبارک مہینے میں مبارک قرآنی آیات کا ورد کرتے ہوئے اپنے رب کی بارگاہ میں حاضر ہوگئے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ جس خدا کی محبت میں جیتے مرتے رہے اس خدائے رحمان ورحیم نے آپ کا نہایت شاندار استقبال کیا ہوگا اور اس کے فرشتوں نے سلام کے ساتھ آپ کو یہ پیغام دیا ہوگا کہ اے نفس مطمئنہ! تو اپنے رب کے پاس اس حال میں لوٹ جا کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ☆ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ☆ فَادْخُلِي فِي عِبَادِي ☆ وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾

دعوت وفکر کا سورج غروب ہوا

مولانا منہاج الدین قریشی ندوی
(استاد مدرسہ مظہر الاسلام بلوچ پورہ۔لکھنؤ)

یوں تو تیرہ اپریل کی تاریخ نہ جانے کتنی مرتبہ آئی اور چلی گئی ہوگی، اس تاریخ میں کبھی کوئی ایسی بات پیش نہیں آئی جو قابل اعتناء ہو، لیکن ۲۰۲۳ء کی تیرہ اپریل کی تاریخ کے سانحہ نے تو دل ودماغ کو ہلا کر رکھ دیا، یہ سانحہ ایسے رنج وغم اور داغ مفارقت کا زخم دے کر گیا کہ ایک عہد چاہیے اس کو بھلانے اور بھرنے کے لیے۔

ہوا یوں کہ مقدس مہینہ کا بابرکت دن تھا، رمضان المبارک کا اخیر عشرہ تھا، روزہ کی حالت تھی، ظہر کی نماز سے فارغ ہوئے بھی تقریباً دو گھنٹے ہو چکے تھے، ہاتفِ غیبی کے بلاوے پر لبیک کہنے کے لیے ایک پاک روح تیار تھی، وہ پاک روح جس کو طویل عمر اور اعمالِ صالحہ کی توفیق سے نوازا گیا تھا، قرآن وحدیث کی بیان کردہ خوش بختی اور سعادت کی ساری علامتیں عطا کی گئی تھیں، یہ کہنے میں کوئی تردد نہیں کہ زندگی بھی پائی قابل رشک اور موت بھی پائی قابل رشک!

"ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء"

یہ وہ ہستی تھی جو محبوبیت ومقبولیت میں اپنی مثال آپ تھی، غیر مختلف فیہ شخصیت کے مالک، صلحاء، علماء کے سہارہ، طلباء کے لیے اسوۂ حسنہ، عوام کے ولی اللہ، خواص کے ملجا وماویٰ تھے۔ علم وعمل کے پیکر، خلوص وللّٰہیت کے لیے معتبر، اخلاق وکردار، تواضع وانکساری کے رہبر، تقویٰ ومہارت میں جن کا نہیں کوئی ہمسر۔

میری مراد استاد محترم پیر ومرشد جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنیؒ، ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ، مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر ذی وقار، رابطہ عالم اسلامی کے صدرِ ذی مآب اور نہ جانے کتنی مقامی وبیرونی تنظیموں کے رکن وذمہ دار مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ وبرہ مضجعہ!

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

ہمارے یہاں ہند وپاک میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کی حیات بابرکت میں ان کی قدر نہیں کرتے جس طرح والدین کی ان کی زندگی میں قدر نہیں کرتے الا ماشاء اللہ!

انتقال کے بعد آنکھ کھلتی ہے، ارے کتنی قیمتی چیز جدا ہوگئی، ایک انمول ہیرہ ہم سے چھین لیا گیا، پھر ایک ایک کر کے ان کی خوبیاں اور اچھائیاں نظروں کے سامنے پھرنے لگتی ہیں، یادوں کے جھروکوں سے ایک ایک بات سامنے آنے لگتی ہے۔

یاد پڑتا ہے کہ بچپن ہی میں ان بزرگوں کے نام کان میں پڑے ہوئے تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے والد حاجی سراج الدین قریشی صاحب غفرلہ اور ڈاکٹر ابرار صاحب، مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں نور اللہ مرقدہ سے بیعت تھے، ڈاکٹر صاحب تو تیل کی مالش کرنے اکثر جایا کرتے تھے، ان ہی حضرات کے ذریعہ بزرگوں کے نام سن رکھے تھے، ۱۹۸۵ء میں جب دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ ہوا تو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، لیکن چونکہ لڑکپن تھا اس لیے ان بزرگوں سے نہ ہی قربت بڑھا سکے اور نہ ہی استفادہ کر سکے۔

بات ۱۹۹۲ء کی ہے جب ہم عالیہ رابعہ میں پہنچ گئے تو مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ وبرد مضجعہ سے "الادب العربی" (جس کے مصنف خود حضرت مولانا ہیں) پڑھنے کا موقع ملا، آپ کے پڑھانے اور سمجھانے کا انداز بالکل منفرد تھا، الفاظ وکلمات کی خاص طور سے ایسی تشریح فرماتے تھے کہ دل ودماغ میں سرایت کر جاتی تھی، مولانا کے بولنے کا انداز اتنا نرالا تھا گویا کہ آپ کی زبان سے الفاظ نہیں بلکہ پھول جھڑ رہے ہوں، بہت جچے تلے الفاظ کا استعمال انتہائی سلیس اور آسان زبان میں فرماتے تھے کہ بڑے بڑوں کی موشگافیاں جس کے سامنے پانی بھریں اور اچھے اچھوں کی چمک دمک ماند پڑ جائے۔

ایسے ہی ۱۹۹۳ء میں جب حضرت مولانا دار العلوم کے مہتمم ہوگئے، تو علیا اولیٰ میں حضرت سے سبع معلقہ پڑھنے کا موقع ملا، امرؤ القیس کے بعض وہ اشعار جن میں کچھ غیر شریفانہ مضمون ہے، حضرت مولانا نے ایسے اچھوتے ادیبانہ اور شریفانہ انداز میں تشریح فرمائی کہ حضرت کی شرافت پر ذرہ برابر آنچ نہ آئی۔

حضرت مرشد الامت کے تواضع وانکساری کا یہ عالم تھا کہ درجہ میں جوتا اتار کے داخل ہوتے تو یہ کوشش ہوتی کہ کوئی ان کا جوتا سیدھا نہ کرے اور درجہ سے نکلتے وقت طلباء جوتا سیدھا کرنے کے لیے لپکتے تو حضرت منع فرمادیتے تھے، اپنا بیگ بذات خود پکڑ کر چلتے تھے، چلتے وقت نگاہیں نیچے رہتی تھیں، آپ کے چہرے سے حیا اور معصومیت ٹپکتی تھی، پورے طالب علمی کی زمانے میں حضرت کے سلسلہ میں کوئی ایسی بات نہ معلوم ہوئی نہ خود سنی جس سے یہ ثابت ہو کہ حضرت اپنے آپ کو مخدوم ثابت کرنا چاہتے ہیں، "البذاذة من الإیمان" کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔

مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں رحمہ اللہ علیہ مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب کو اپنے ساتھ سایہ کی طرح رکھتے تھے، کوئی بھی کام ان کے مشورے کے بغیر نہیں کرتے تھے، سفر وحضر میں ہمیشہ ساتھ رہتے تھے، اسی سنگت نے مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ کی بہت سی خوبیاں حضرت کے اندر منتقل کر دی تھیں اور بہت سی ان کی صفات اللہ تعالیٰ نے مرشد الامت حضرت مولانا رابع حسنیؒ کے اندر ودیعت فرمادی تھیں، جن کی وجہ سے آپؒ ان کے سچے جانشین ثابت ہوئے، وہ سارے عہدے اور ذمہ داریاں جو حضرت مولانا علی میاںؒ کے پاس تھیں، وہ سب کی سب مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی طرف منتقل ہوئیں، حضرت مولانا نے اپنے ماموں جان کی روحانی وعلمی یہاں تک کہ جسمانی (اخیر میں مولانا کی شکل حضرت سے بہت ملنے لگی تھی) جانشینی کا حق ادا کر دیا۔

خدا رحمت کند ایں پاک طینت را

اس ناچیز کی حضرت سے قربت اس وقت سے بڑھی جب چند برس قبل حضرت کے بڑے نواسے اور مولانا حمزہ صاحبؒ کے صاحب زادے مولوی رشید احمد حسنی ندوی أطال اللہ عمرہ نے اس ناچیز کو خاتون منزل بلا کر حضرت سے باقاعدہ بیعت کرائی، اسی وقت سے حضرت سے دور رشتے ہو گئے، ایک استاد وشاگرد کا، دوسرے پیری ومریدی یعنی اصلاح کا، اس کے بعد پھر ندوہ کے مہمان خانہ کی آمد ورفت کا آغاز ہوا جو الحمد للہ آخر تک برقرار رہا۔

حضرت کی خدمت میں حاضر ہونے سے بہت سی باتوں کا تجربہ ہوا مثلاً: وہاں حاضری دینے میں کبھی کوئی اصول وضابطے بگھارتے ہوئے کسی کو نہیں دیکھا، کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہیں، جو کوئی حضرت سے ملنا چاہے برملا مل سکتا تھا، آپ کی مجلس میں بیٹھ سکتا تھا، کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی، حضرت کے قریب بیٹھنے کا بہت بار موقع ملا حضرت کے نواسوں (مولوی رشید احمد اور مولانا جعفر صاحب کے صاحب زادوں کو) کو پیر دباتے دیکھا تو لاکھ چاہا کہ یہ سعادت ہم بھی حاصل کر لیں لیکن حضرت نے منع فرمادیا، حضرت اپنے اہل خانہ کے سوا کسی سے بھی خدمت کرانے کے روا گیر نہیں تھے۔

کبھی بھی حضرت کو بے وجہ بولتے ہوئے نہیں دیکھا، حضرت کے یہاں اخفائے حال بہت زبردست تھا، آپ کی نمازیں عام سی لگتی تھیں، دعاؤں کا ظاہراً کوئی اہتمام نہیں دکھتا تھا اور ذکر واذکار کے لیے کوئی محفل نہیں سجاتے تھے، ظاہراً حضرت کے کسی بھی عمل سے اللہ کے یہاں آپ کے مقام کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ حالانکہ بتانے والوں نے بتایا کہ شب داری کرتے ہوئے اللہ رب العزت سے مناجات کرتے وقت اور اللہ کی جانب گریہ وزاری کرتے وقت حضرت کی حالت دگرگوں ہو جایا کرتی تھی، امت کے لیے آپ کی تڑپن قابل رحم ہوا کرتی تھی۔

بہر حال اکتوبر ۱۹۲۹ء کو طلوع ہونے والا یہ سورج اپنی زندگی کی تقریباً ۹۴/ بہاریں دیکھ کر ایک عالم کو مستفید کر کے، ایک بڑی تعداد کی اصلاح فرما کر، مریدین کا ایک بڑا حلقہ چھوڑ کر، طلباء واساتذہ کی علمی وعملی تشنگی کو دور فرما کر، اس دنیائے فانی کو چھوڑ کر، ۱۳/اپریل بروز جمعرات ۲۰۲۳ء کو ۳/ بجے کے آس پاس دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانے میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

دعا ہے کہ اللہ حضرت کو غریق رحمت فرمائے، ردائے رحمت سے ڈھانپ دے، درجات بلند فرمائے، جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے، اپنی رضا نصیب فرمائے، پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

ایک عہد آفریں شخصیت

پروفیسر مجیب الرحمٰن ندوی
(شعبہ عربی جواہر لال نہرو یونیورسٹی-نئی دہلی)

13/اپریل 2023ء کی شام پوری ملت اسلامیہ ہند بلکہ عالم اسلامی کے لیے نہایت غم ناک شام تھی، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے سانحہ ارتحال کی خبر سوشل میڈیا پر گردش کر رہی تھی، ہر طرف خاموشی اور اداسی چھائی تھی، ہر دل سوگوار، ہر دل غمگین تھا، ہر کسی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنا نہایت ہی عزیز انسان کھو دیا ہے، عرصہ بعد پورے ہندوستان میں کسی اسلامی شخصیت کے گذرنے پر اس قدر سوگواری اور ملال کا احساس ہر مسلمان کے دل پر چھا گیا تھا، مجھے یاد ہے کہ علامہ سید ابوالحسن علی ندویؒ کے سانحہ ارتحال پر پورے عالم اسلامی میں ایک ماتم کا ماحول چھا گیا تھا، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے انتقال پر اسی طرح کی کیفیت کا احساس ہوا، شاید ہی کسی مسلمان کا دل ہو، چاہے وہ کسی بھی فرقہ یا طبقہ کا ہو، جو رو نہ رہا ہو اور اسے تکلیف اور غم کا احساس نہ ہو رہا ہو، حضرت مولانا کی نماز جنازہ میں شرکت کرنے والوں کا جم غفیر اور ہر جگہ ہر محفل میں تعزیتی جلسوں کا انعقاد یہ حضرت مولانا کی للّٰہیت اور اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کی بے پناہ مقبولیت اور محبوبیت کا بین ثبوت ہے اور کیوں نہ ہو؟ شاید ہی کوئی ایسا مسلمان ہوگا جو یہ کہہ سکے کہ حضرت نے کبھی اس کی دل آزاری کی، یا سخت لہجہ میں بات کی، یا حضرت نے کبھی اس کی جائز مانگ نہ پوری کی ہو، یقیناً آپ ایک جیتے جاگتے ولی اللہ تھے اور بقول مصری عالم جلال سعید حفناوی آپ اصحاب رسول کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ اتباع سنت، للّٰہیت، اخلاص فی اللہ، سادگی، کفایت شعاری، قناعت پسندی، حسن اخلاق، گفتار میں نرمی، مسلمانوں سے محبت، خدمت دین کا بے پناہ جذبہ، دعوت الی اللہ کی راہ میں انتھک جدوجہد، تصنیف وتالیف، تدریس وتعلیم، ایک عظیم علمی ودینی ادارہ کی سربراہی، مسلم پرسنل لا بورڈ کی سرپرستی، ہندوستانی مسلمانوں کی دینی وفکری قیادت، یہ وہ اوصاف ہیں جو آپ کو اپنے ماموں جان علامہ سید ابوالحسن علی ندوی سے وراثت میں ملے تھے اور جو آپ کو اپنے ہم عصر علماء سے ممتاز کرتے ہیں، آپ نے بغیر کسی تام جھام اور نمائش کے وہ کارنامے انجام دیے ہیں جنہیں شاید کوئی بڑا ادارہ بھی انجام نہ دے سکے، آپ نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو خدمت دین کے لیے استعمال کیا، اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم نافع سے نوازا تھا، آپ کا علم اس بارش کی طرح تھا جو کہ فصلوں کو سیراب کرتی ہے اور وادی کو گل وگلزار بناتی ہے۔

آپ کی وفات کے بعد آن لائن تعزیتی جلسوں میں شرکت کا موقع ملا، بیشتر شرکاء ندوی حضرات تھے اور آپ سے ندوہ میں فیض یافتہ، ہر کسی کے پاس کوئی نہ کوئی ذاتی تجربہ تھا حضرت مولانا کے ساتھ، کچھ ایسے بھی ذاتی واقعات سننے کو ملے جن سے حضرت مولانا کی انسانی اور اخلاقی عظمت کا احساس ہوتا ہے، میں نے بھی ایک اجلاس میں اپنے دو ذاتی تجربے بیان کیے، 1988ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں فراغت کے بعد میری خواہش تھی کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عصری تعلیم حاصل کروں، دراصل میرے بڑے بھائی صاحب چاہتے تھے کہ گریجویشن کے بعد میں آئی اے ایس کے امتحان میں شرکت کروں، مشورہ کے لیے میں حضرت مولانا کے پاس گیا اور اپنے گھر والوں کی خواہش کا آپ کے سامنے اظہار کیا، آپ نے بڑے غور سے میری بات سنی اور فرمایا کہ عزیزم! آپ کے

گھر والے جو مشورہ دے رہے ہیں اس میں یقیناً آپ کی مادی اور دنیاوی ترقی ہے، مگر آپ ابھی جہاں ہیں وہ آپ کی آخرت کے لیے زیادہ بہتر ہے، آپ ضرور جامعہ ملیہ جائیں اور خوب ترقی کریں، مگر کبھی بھی اپنی آخرت کو نہ بھولیں۔ میں نے جامعہ ملیہ سے ''تاریخ'' میں بی اے اور ایم کیا اور آئی اے ایس کے امتحان میں بیٹھا، مگر چوں کہ میں بہت سنجیدہ نہیں تھا' کامیاب نہیں ہوا اور پھر یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگا، اتنے سالوں میں کبھی بھی حضرت مولاناؒ کی نصیحت نہیں بھولا اور پچھلے کچھ سالوں سے ہمیشہ آپ کی نصیحت یاد آتی ہے اور بے اختیار حضرت کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔

علامہ اقبال کا مشہور شعر ''نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز۔ یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے'' ہر کس و ناکس پر چسپاں کر دیا جاتا ہے، مگر میں سمجھتا ہوں کہ ''میرِ کارواں'' کے لیے جن تین اوصاف کا ذکر علامہ اقبالؒ نے کیا ہے، وہ تینوں اوصاف حضرت مولانا رابع ندویؒ کی شخصیت میں بدرجہ اتم پائے جاتے تھے، آپ بہت دور بین تھے، مسلمانوں کے مسائل کو آج کے پیچیدہ حالات میں بخوبی سمجھتے تھے، کیونکہ آپ کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور آپ علامہ اقبال' علامہ سید سلیمان ندوی اور علامہ ابوالحسن علی ندوی کے فکری سرچشموں سے فیض یاب ہوکر ان کی اعلیٰ ترجمانی کر رہے تھے، حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی کے انتقال کے بعد آپ ہی نے ہندوستان میں مسلمانوں کی فکری اور علمی قیادت کا بیڑہ اٹھایا، کیوں کہ ہندوستان میں آپ کے علاوہ کوئی اور شخصیت شاید ایسی نہ تھی جس پر سب کا اتفاق ہو، آپ قوموں کے عروج و زوال پر گہری نظر رکھتے تھے اور اس کے مدنظر ہندوستان میں مسلمانوں کے معاشی' علمی وفکری ترقی کے لیے فکر مند اور کوشاں رہتے تھے، آپ کا سخن نہایت دل نواز اور دل نشین تھا، کبھی کسی نے آپ کو اونچی آواز میں بات کرتے نہیں سنا، جو بھی ایک بار آپ سے ملتا، آپ سے محبت کرنے لگتا تھا، جو بھی آپ کی باتیں سنتا وہ متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا، اللہ اللہ کیا نورانی چہرہ تھا، کیا پیاری آواز تھی اور اس آواز میں کتنی نرمی' کتنی مٹھاس' تقریروں میں بھی کبھی کسی نے آپ کو بلند اور تیز آواز میں بات کرتے نہیں سنا، باتیں اتنی حکیمانہ جیسے علم و آگہی اور بصیرت کے لعل و گہر آپ کے منہ سے نکل رہے ہوں اور جہاں تک تیسرے وصف کی بات ہے یعنی جاں پرسوز' واقعۃً آپ جاں پرسوز تھے، آپ کا دل ذکر اللہ سے معمور رہتا تھا اور اقبال کی آہ سحر گاہی کا نمونہ!

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی گوناگوں صفات کے مالک تھے، آپ کی یہ صفت بہت باوزن اور بیش قیمت تھی، ابھی تک ہم نے آپ کے تقویٰ اور للّٰہیت اور آپ کی ہندوستانی مسلمانوں کی علمی وفکری رہنمائی کی بات کی ہے، مگر ایک اہم پہلو آپ کا علمی وادبی کارنامہ ہے، خاص کر عربی زبان وادب کی خدمت میں آپ کا عظیم الشان کارنامہ ہے، آپ ایک صاحب اسلوب ادیب تھے اور آپ کی زبان بہت سلیس اور خوبصورت تھی، میں نے محسوس کیا کہ عربی زبان میں بہت سلیس اسلوب میں لکھنے والوں میں آپ کا نام آتا ہے، آپ کی تصنیفات کی تعداد 60/ سے زیادہ ہے، ان تصنیفات میں کچھ تو نصاب درس میں شامل ہے، ان میں "الهداية القرآنية سفينة نجاة للإنسانية" "سيرة خاتم النبيين" "جغرافية جزيرة العرب" "مقالات فى التربية والمجتمع" "الأدب العربي بين عرض ونقد" "منثورات من أدب العرب" اہم ہیں، جغرافیہ جزیرۃ العرب آپ خود اپنے مخصوص انداز میں پڑھاتے تھے اور طلباء کے اندر جغرافیہ کے تئیں دلچسپی پیدا کر دیتے تھے، جغرافیہ اور سائنس میں میری خود کی دلچسپی اسی کتاب کی رہین منت ہے، خاص کر آپ کے طرز تدریس کی، "الأدب العربي بين عرض ونقد" عربی کے تنقیدی اصولوں کی وضاحت کرتی ہے اور ایک پیچیدہ موضوع کو نہایت ہی خوش اسلوبی سے طلباء کو متعارف کراتی ہے، اسی طرح "منثورات من أدب العرب" ایک اہم انتخاب مانی جاتی ہے اور دار العلوم ندوۃ العلماء اور دیگر اداروں میں داخل نصاب ہے، اس

کے علاوہ ''الرائد'' کو شروع کرنا اور اس کو لمبے عرصہ تک اپنی نگرانی میں جاری رکھنا' آپ کے صحافتی کارناموں کی بین دلیل ہے۔

آپ کی وفات سے نہ صرف دارالعلوم ندوۃ العلماء کو عظیم خسارہ ہے، بلکہ پوری امت اسلامیہ کا عظیم خسارہ ہے، آپ ایک عظیم اسلامی اسکالر' مفکر' ماہر تعلیم' مؤرخ' ادیب' استاذ' مصلح' رہنما' صحافی اور سیرت نگار تھے اور اپنے ماموں جان علامہ ابوالحسن علی ندویؒ کے حقیقی جانشین تھے، آپ نے اور آپ کے چھوٹے بھائی حضرت مولانا واضح رشید ندویؒ نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی وہ آبیاری کی ہے جس کی مثال نہیں ملے گی، لیکن اگر پوچھا جائے کہ آپ کی زندگی کے سب سے اہم پہلو کیا ہیں؟ تو یقیناً آپ کا استغنا' آپ کا اخلاق' سادگی اور تقویٰ اور اپنی ذات سے خلق خدا کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانا ہے۔

حضرت مولاناؒ کو آپ کی زندگی میں بہت سارے انعامات واعزازات سے نوازا گیا جن میں صدر جمہوریہ ایوارڈ، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کی طرف سے دیا گیا شاہ ولی اللہ ایوارڈ، آکسفورڈ سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز کی رکنیت، ندوۃ العلماء کی نظامت، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت، مسلم ورلڈ لیگ کی رکنیت، دار العلوم دیوبند کے ایگزیکٹو کمیٹی کی رکنیت، فقہ اسلامی اکیڈمی کی سرپرستی، مولانا آزاد میموریل کمیٹی لکھنؤ کی سرپرستی وغیرہ ہے، مگر کبھی بھی حضرت مولانا نے ان ایوارڈ کو کوئی اہمیت نہیں دی، جس طرح حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ ان ایوارڈز کو اہمیت نہیں دیتے تھے، درحقیقت ولی اللہ کا ایوارڈ دنیا میں نہیں اللہ کے یہاں ہوتا ہے، اس لیے اولیاء اللہ دنیاوی اکرامات واعزازات کی پرواہ بالکل نہیں کرتے، کیوں کہ ان کا مطمح نظر اللہ کی خوشنودی سے بڑا کوئی اعزاز نہیں، پھر چاہے پوری دنیا کی دولت وعزت وشہرت سامنے آجائے، ولی اللہ کی نظر میں وہ سب ہیچ ہیں۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں شہداء اور صالحین کے ساتھ جگہ دے اور مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء کی حفاظت فرمائے اور مدد فرمائے اور جانشین ناظم مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ کی اس ادارہ کی نگہبانی اور فروغ دلانے میں مدد فرمائے۔ آمین!

اسلام کا تصورِ انسان

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''اسلام کا تصور انسان جامع تصور ہے کہ وہ خوبیوں کی مختلف شکلوں کو جمع کرتا ہے، وہ ایک طرف تواضع وانکساری پر زور دیتا ہے، دوسری طرف وہ خودداری اور عزت نفس کی بھی تعلیم دیتا ہے، اسی طرح وہ جہاں غریبی' مسکینی کے حالات پر صبر وبرداشت کی تلقین کرتا ہے، وہاں وہ شوکت وسطوت اور جلال وجمال دونوں کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے، اسلام کا تصور انسان دنیا کے امن وسلامتی اور ترقی وخوش حالی کے لیے دونوں قسموں کی قوتوں میں امتزاج پیدا کرتا ہے، چنانچہ اسلام کا تصور انسان اپنے ماننے والوں میں صرف عاجزی' انکساری اور مسکینی ہی پیدا نہیں کرتا، بلکہ اس کے ساتھ عزم' بلند ہمتی' استقلال' ثبات' عزتِ نفس اور خودداری کے جوہر بھی اجاگر کرتا ہے۔

قرآن مجید کے تصور انسان کی خوبی یہ ہے کہ اس نے دنیا کو انسانی اخلاق کا ایسا جامع نظام دیا جو انسان کے معیار بلند کے مطابق ہے، اسی کے ساتھ اس کو انسانی فطرت اور عمل کی قابلیت کے مطابق قابل عمل اور آسان بنایا کہ ہر شخص' ہر قوم اور ہر زمانہ کے لیے قابل عمل ہو، یہ اسلام ہی کے تصور انسان کی دَین ہے کہ محکوموں نے حاکموں کی، پست نے بلند کی، ادنیٰ نے اعلیٰ کی اور تنزل نے ترقی کی جگہ حاصل کی۔''

(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل: ۷۸-۷۹)

نقوش وتاثرات

مولانا محمد ارشد اعظمی
(مکہ مکرمہ)

حضرت اقدس مولانا محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کی شخصیت پر کچھ لکھنا بڑے لوگوں کا کام ہے، جو صاحب قلم ہوں، جن کے یہاں علم غزیر ہو، صفائے باطن ہو، قرطاس وقلم پر قدرت کاملہ ہو۔

حضرت کی شخصیت شش جہات ہی نہیں کثیر الجہات تھی، آپ عالم کامل، ادیب بارع، مدرس قدیر، مربی صالح، مصنف، مؤرخ، ملت اسلامیہ ہندیہ کے نہایت سنجیدہ قائد، حلم وبردباری کا ایک مجسم نمونہ، صاحب بیعت وارشاد بزرگ تھے۔ ان سب کمالات کا احاطہ آسان کام نہیں ہے۔ یہ عاجز تو فقط کچھ نقوش وتاثرات ہی قلم بند کر سکتا ہے، امید ہے کہ قبول کرلیا جائے گا۔

حضرت سے میرا تعارف تلمذ شفقت ونیاز ۱۹۸۰ء سے شروع ہوا، جب میں ندوہ میں ادب عربی میں تخصص کے لیے داخل ہوا، حضرت کے پاس سال اول اور سال دوم میں کئی اسباق تھے، کلاس میں تعارف ہوا ہوگا، کچھ کام سے مہمان خانہ میں وقتاً فوقتاً حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کی خدمت میں حاضری ہوئی تھی، اس سے بھی شناسائی میں اضافہ ہوا ہوگا۔

ایک مرتبہ حضرت مولانا ندوی رحمہ اللہ نے مجھ سے رائے بریلی جانے کے لیے کہا کہ کچھ دن وہاں رہ سکتے ہو، حضرت کی کچھ تحریروں کی تبییض مقصود تھی۔ میں چونکہ ایک طالب علم تھا، اس لیے حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ سے اجازت چاہی، اس لیے کہ وہی ان دنوں کلیہ لغہ عربیہ کے ذمہ دار تھے، مولانا نے بڑی بشاشت سے اجازت دے دی اور خوشی کا اظہار فرمایا، اس واقعہ سے بھی شناسائی میں اضافہ ہوا ہوگا، رائے بریلی ہفتہ عشرہ رہا اور پھر ندوہ آکر ایک طالب علم کی طرح زندگی بسر کرنے لگا۔

چند ایسے مواقف کو ذکر کردینا مناسب ہوگا، جن سے حضرت کی اعلیٰ ظرفی، طلبہ کے ساتھ خوش گمانی، خوردنوازی کی شان نمایاں ہوتی ہیں:

میرے تخصص سے فراغت کے بعد حضرت نے مجھے (بغیر کسی طلب کے) ایک ہاسٹل کا نگراں بنا دیا اور کچھ چھوٹی کتابیں بھی میرے ذمہ کردیں، چھ ماہ کے بعد فلاح دارین ترکیسر گجرات ادب عربی کے استاذ کی حیثیت سے مجھے بھیج دیا اور الحمدللہ میں نے وہاں پانچ سال تک تدریسی خدمات انجام دیں اور یہ پانچ سال میری زندگی کے علمی وتعلیمی لحاظ سے بہترین ایام تھے، فلاح دارین ایک شاندار مدرسہ تھا جس کی تفصیل پھر کبھی۔

ترکیسر کے قیام کے دوران خط وکتابت کے ذریعہ برابر رابطہ رہا، الرائد اور البعث الاسلامی میں میری بعض تحریریں شائع ہوئیں، وہ بھی حضرت کے علم میں آتی رہی ہوں گی۔

جب مجھے ۱۹۸۷ء میں پاکستان کے راستہ سعودی عرب جانا ہوا تو دیکھا کہ پاسپورٹ ختم ہورہا ہے کیسے سفر کرسکیں گے، حضرت کی خدمت میں حاضر ہوکر ذکر کیا، تو سبحان اللہ آپ نے لکھنؤ کے ہی ایک مسلم آفیسر کے پاس بھیجا جو شاید پاسپورٹ ڈپارٹمنٹ میں کام کرتے رہے ہوں گے، اللہ جزائے خیر دے مولانا کو اور ان آفیسر صاحب کو کہ انہوں نے ایک ہی دن میں میرا وہی پاسپورٹ پانچ سال کے لیے تجدید کرکے دیدیا اور میرا بہت بڑا مسئلہ حل ہوگیا۔

مجھے پاکستان جانے کے لیے ویزہ کی ضرورت تھی اور وہ

پاکستانی سفارت خانہ دہلی میں کافی مشکل کام تھا، حضرت کی عنایت کہ ندوہ کے لیٹر پیڈ پر مجھے ایک خط دے دیا جس کی وجہ سے مجھے ایک دن میں پاکستان کا ویزہ بڑی آسانی سے مل گیا، ان دنوں پاکستان کے حاکم جنرل ضیاء الحق تھے جن کے حضرت مولانا ندویؒ سے بہت اچھے تعلقات تھے۔

اسلام آباد میں سعودی ملحق تعلیمی (cultural attache) میں جناب مولانا احمد حسنی صاحب سے ملاقات ہوئی، جب انھیں علم ہوا کہ میں ندوہ سے آیا ہوں اور حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ سے تعلق رکھتا ہوں تو انھوں نے خصوصی معاملہ فرمایا، راولپنڈی میں اپنے ایک قرابت دار کے یہاں شاندار دعوت کھلائی، ان کی وجہ سے میرے لیے بڑی آسانیاں پیدا ہوگئیں۔

مکہ مکرمہ میں حضرت مولانا علی میاںؒ کے ساتھ حضرت کی آمد ہوتی تھی، مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کے گھر پر قیام ہوتا تو ہم نیاز بردار بھی حاضر ہوتے اور حضرت کی شفقت وعنایات سے محظوظ ہوتے تھے۔

ایک مرتبہ میں نے مکہ مکرمہ میں اپنی رہائش گاہ پر آنے کی دعوت بھی دی تو حضرت بخوشی تشریف لائے اور وہاں میرے بعض سعودی اور پاکستانی دوستوں سے ملاقات کر کے بہت خوش ہوئے۔

ندوہ کے مہمان خانہ میں بارہا ملاقاتیں رہیں، ہمیشہ خصوصی توجہ حاصل رہی، ساتھ کھانا کھلاتے اور شفقت فرماتے نیز حضرت مولانا واضح رشید ندویؒ نے کئی بار فرمایا کہ مکہ مکرمہ میں تم ہم لوگوں کے نمائندہ ہو، دعائیں کرتے رہنا۔

بیعت وارشاد کے بھی تعلقات رہے جن کے ذکر کی چنداں ضرورت نہیں۔ رحمه الله رحمة واسعة وأسكنه فسيح جناته

بیت اللہ کی عظمت

مرشد الامت حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

”بیت اللہ کی ایک خصوصیت یہ بھی سامنے آئی ہے کہ دنیا کے علاقوں کو سامنے رکھ کر اس کو دیکھا جائے تو وہ مرکزی نقطہ پر ہے، گویا بیت اللہ کو اللہ تعالیٰ نے مرکز بنایا اور دنیا کو اس کے اردگرد آباد کیا ہے۔

بیت اللہ اس عمارت کو سمجھا جاسکتا ہے جو کعبہ کی ہے، لیکن اس کے علاقہ کو صرف اسی تک محدود نہیں رکھا گیا ہے، بلکہ پورا حرم مکی جس کے حدود بتائے گئے ہیں، اسی میں شامل کیے گئے ہیں۔

کیا عظیم ترین مقام ہے! گویا آسمان کا ایک ٹکڑا یہاں زمینی حیثیت کو ہٹا کر اس کی جگہ رکھ دیا گیا ہے کہ حق پرست انسان کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے اور الحمدللہ اس جگہ کو ایسی مقبولیت حاصل ہے کہ لاکھوں کی تعداد میں محبت الٰہی سے سرشار لوگ وہاں ہر سال پہنچتے ہیں اور اپنے دل کی دینی پیاس بجھاتے ہیں اور خاص سرور اور قلبی راحت حاصل کرتے ہیں۔

عجیب مقام ہے! جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کے لیے مہیا کر دیا ہے، جو اللہ کی رحمتوں کا مرکز ہے اور اللہ والوں کی اجتماعیت کا عظیم نشان ہے، تمام اہل ایمان اپنے رنگ وکیفیت کے فرق کے باوجود وہاں ایک جیسے مؤمن کی حیثیت سے اکٹھا ہوتے ہیں اور ایمان کی اجتماعیت کا مظاہرہ پیش کرتے ہیں اور ایمانی برکات کی سوغات اپنے ساتھ لاتے ہیں اور اپنے وطن کے لوگوں تک پہنچاتے ہیں۔“

(شعائر اللہ کی عظمت: ۴۳-۴۴)

آئینہ ذات وصفات

ڈاکٹر فہیم اختر ندوی
(مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی-حیدرآباد)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات پوری امت مسلمہ کے لیے عام طور پر اور امت مسلمہ ہندیہ کے لیے خاص طور پر پھر جو لوگ ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے ہیں ان کے لیے خصوصی طور پر ایک ناقابل تلافی نقصان اور بڑا حادثہ ہے، اللہ تعالیٰ آپ کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

اللہ تعالیٰ نے آپ کو عمر طبعی عطا فرمائی، مگر جس وقت آپ کی وفات کی خبر ملی تو ذہن قبول کرنے کو تیار نہ تھا، اس طرح نہ جانے کتنے لوگ ہوں گے جو اپنے جذبات پر میری طرح قابو نہ رکھ سکے ہوں گے، جب مجھے وفات کی خبر ملی اس وقت میں آفس میں تھا، میں نے اپنے ساتھیوں کو جا کر بتانا چاہا تو میں بتا نہیں سکا، خدا کا شکر ہے کہ وفات سے چند ماہ قبل مجھے آپ کی خدمت میں حاضری کی سعادت نصیب ہو چکی تھی۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مجھے گیارہ برس ندوۃ العلماء میں رہنے کا موقع دیا، گویا اس طرح ایک لمبے عرصہ تک حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو مجھے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، میں نے آپ کا وہ زمانہ بخوبی دیکھا جب آپ مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے ساتھ رہتے تھے، لیکن اس پورے عرصہ میں سب سے نمایاں طور پر ان کے اندر میں نے جو چیز دیکھی وہ ان کی خاموش مزاجی، یکسوئی، علم سے تعلق اور ایک فکر مند انسان کی طرح زندگی گذارنا تھا۔ حضرت مولاناؒ نے اس دور پرفتن اور انتشار کے زمانہ میں ایسی زندگی گذاری جو بالکل بے داغ، محفوظ، متقی، صبر وتحمل والی زندگی تھی، علمی وتصنیفی اور انتظامی مشغولیات والی زندگی تھی۔

بڑی خوش قسمتی کی بات ہوتی ہے کہ آپ کوئی فن اس فن کے ماہر شخص سے پڑھیں اور اس فن کی کتاب صاحب کتاب ہی سے پڑھیں، اس لحاظ سے مجھے یہ سعادت حاصل ہے کہ میں نے مولاناؒ سے ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''جزیرۃ العرب'' پڑھی ہے، اللہ کا فضل ہے کہ انہوں نے ہمیں اس فن کو اس انداز سے پڑھایا کہ اس موضوع کا ذوق پیدا ہو گیا، اسی طرح ان کی مشہور کتاب ''الادب العربی بین عرض ونقد'' بھی ان ہی سے پڑھنے کا موقع ملا۔ دراصل مولاناؒ کا اصل ذوق تدریس ہی تھا، جس سے وہ اخیر تک وابستہ رہے۔

یہ حقیقت ہے کہ حضرت مولاناؒ سے ندوہ کے زمانہ قیام میں میری بہت زیادہ قربت نہ رہی، البتہ مختلف مناسبتوں سے اپنائیت وفدائیت کا تعلق ضرور رہا، جن سے حضرت کی محبت دل میں سما گئی، زمانہ طالب علمی میں ایک مرتبہ عرب کے کچھ بڑے مہمان ندوہ تشریف لائے، تو رواق سلیمانی میں جمعیۃ الاصلاح کے ذمہ داران نے ان کے اکرام میں عصرانہ کا اہتمام کیا، حضرت مولانا رابع صاحبؒ بھی ان مہمانوں کے ساتھ تشریف لائے، عصرانہ سے پہلے ان کو ایک استقبالیہ دیا گیا، جس میں اس ناچیز نے اپنا مقالہ پیش کیا، اس موقع پر حضرت مولاناؒ میرے برابر میں کھڑے ہو گئے اور مستقل میری رہنمائی فرماتے رہے کہ اب یہ بولو اور اب یہ کہو، وہ حسین منظر اب تک میری نگاہوں میں ہے۔ اسی طرح ان کے بعض مضامین کا ترجمہ کرنے کی بھی مجھے توفیق حاصل ہے، جن کے متعلق بعد میں علم

ہوا کہ حضرت مولانا نے انہیں نے اپنی کتاب میں شامل فرما کر اعتبار بخشا ہے اور صرف مضامین ہی شامل نہیں کیے ہیں، بلکہ میرا نام بھی درج کیا ہے اور میری کوشش کو سراہا ہے۔ اسی طرح ابھی چند سال قبل جب ندوہ میں مجلس تحقیقات شرعیہ کی مشاورتی کمیٹی کا انتخاب عمل میں آیا تو انہوں نے اس کے اندر میرا نام بھی شامل فرمایا۔

حضرتؒ کی یہ خوبی تھی کہ وہ ہر ایک سے تعلق کو نبھانے کی بڑی فکر رکھتے تھے، مجھے خود ذاتی طور پر بعض مواقع پر اس کا احساس ہوا۔

حضرت مولاناؒ سے میرے استفادہ کی ایک نوعیت یہ بھی رہی کہ جب میری پہلی کتاب ''حضرت شاہ ولی اللہ کے فقہی اختلافات اور ان کا موقف'' طباعت کے لائق ہوگئی، تو میں نے آپ سے ایک مقدمہ تحریر کرنے کی درخواست کی، جسے آپ نے از راہِ شفقت قبول فرمایا اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ اس پر مقدمہ لکھا۔ اس کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی اصل کتاب "عقد الجید فی أحکام الاجتهاد والتقلید" کی تحقیق وتعلیق کا مجھے موقع ملا، تو اس پر بھی میں نے حضرت مولاناؒ سے ایک تحریر کے لیے گذارش کی، تاکہ کتاب کی قیمت میں اضافہ ہوسکے، الحمد للہ اس پر بھی حضرت مولانا نے بھرپور مقدمہ لکھا۔

ظاہر ہے یہ سب مثالیں تعلقات کو نبھانے اور شفقت کی ہیں اور ان کا یہ انداز سبھی کے ساتھ تھا، جو ایک مشکل بات ہے، یہ بات بولنا آسان ہے، مگر ہر ایک کے ساتھ ایسا عملاً کرنا آسان نہیں ہے۔

اللہ رب العزت نے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو بہت سی خوبیوں سے نوازا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ کسی بھی سماج کے ذمہ دار طبقہ کے لیے ان خوبیوں کا ہونا انتہائی ضروری بھی ہے، یہی وہ خوبیاں تھیں جن کے سبب ان کے عہد نظامت میں ندوۃ العلماء نے غیر معمولی ترقی کی اور وہاں ایک پرامن ماحول بنا رہا، صرف ندوہ ہی نہیں بلکہ جن اداروں کے بھی حضرت مولاناؒ رہنما رہے، بالخصوص آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، وہاں بھی ادب واحترام اور استحکام واتحاد کا ایک ماحول برقرار رہا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی سب سے بنیادی خوبی ان کی خاموش مزاجی اور نرم زبانی تھی، آپ بہت ہی میٹھی گفتگو فرمایا کرتے تھے، کبھی یاد نہیں پڑتا کہ آپ کو دیکھا ہو یا کسی سے آپ کے متعلق یہ سنا ہو کہ آپ کسی سے الجھ گئے ہوں یا کسی کو کچھ سخت بولا ہو۔

حضرت مولاناؒ کی دوسری خوبی آپ کی انتظامی صلاحیت کی تھی، مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے سفر وحضر میں آپ ساتھ رہتے تھے اور ان کے کاموں کو بھی آپ ہی دیکھتے تھے، پھر جب ان کی وفات کے بعد ندوہ کی نظامت کی ذمہ داری آپ کے ذمہ آئی تو آپ نے ندوہ کا نظام بہترین طریقہ پر چلایا، بلاشبہ ایک بڑے ادارہ میں مختلف مزاج کے لوگوں کو جوڑ کر رکھنا اور ان سب کو ساتھ لے کر چلنا اور آگے بڑھتے رہنا' آسان کام نہ تھا۔

حضرت مولاناؒ کی تیسری خوبی آپ کا صبر وتحمل تھا، حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نرمی پر جو چیز عطا فرماتے ہیں وہ سختی پر نہیں دیتے، واقعہ یہ ہے کہ آپ کا صبر وشکیبائی کا جو مزاج تھا اب وہ عنقا ہے، سخت سے سخت حالات کا سامنا کرنا اور ان کو برداشت کرنا اور ان پر کوئی ری ایکٹ نہیں کرنا، یہ واقعی بہت بڑی خوبی ہے، یہ ایسی خوبی ہے جس کے نہ ہونے کی وجہ سے آج ہر جگہ انتشار پیدا ہو رہا ہے اور دلوں میں دوریاں ہو رہی ہیں، ضرورت ہے کہ حضرت مولاناؒ کی زندگی کے اس اہم وصف کو ہم سب لوگ اپنائیں۔

حضرت مولاناؒ کی تصنیفات میں ان کا علمی ذوق اور درد دل جھلکتا ہے، اسی طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اسٹیج سے دیے گئے آپ کے صدارتی خطبات بھی بڑے پرمغز اور درد بھرے ہیں، مستقبل کا لائحہ عمل کیا ہوگا؟ عمل کی مضبوطی کیسے ہوگی؟ عزم وحوصلہ کی پختگی اور اتحاد کے ساتھ ہمیں اپنے کام کو کیسے جاری رکھنا ہے؟ ان خطبات میں یہ پیغام پوری طاقت کے ساتھ موجود ہے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی نمایاں خدمات

ڈاکٹر محمد وقار الدین لطیفی ندوی
(آفس سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ - نئی دہلی)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا وصال بلاشبہ ایک عہد کا خاتمہ ہے، آپ کی شخصیت ہر مکتب فکر کے نزدیک معتبر و متفق علیہ تھی، ۹۴ رسالہ زندگی کے بیشتر ایام آپ نے ملت کی فلاح وصلاح میں گذار دیے، مسلمانان ہند کے متفقہ ادارہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے متفقہ طور پر سب سے طویل مدت تقریباً اکیس سالوں تک مسلسل صدر رہے۔ آپ کی زندگی کا ایک مختصر اور خاص طور پر آپ کے عہد صدارت میں بورڈ کی نمایاں خدمات کا ایک اجمالی خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، آپ کے والد ماجد کا نام سید رشید احمد حسنیؒ تھا، آپ کی ولادت اکتوبر ۱۹۲۹ء مقام تکیہ کلاں رائے بریلی میں ہوئی، والدہ ماجدہ کا نام امۃ العزیزؒ صاحبہ تھا، (ہمشیرہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ) آپ کی ابتدائی تعلیم خاندانی مکتب رائے بریلی میں ہوئی، پھر دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ۱۹۴۸ء میں فضیلت کی سند حاصل کی، ۱۹۴۷ء میں دار العلوم دیوبند میں ایک تعلیمی سال گذارا۔

آپ سابق صدر بورڈ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بھانجہ تھے، تعلیم سے فراغت کے بعد ۱۹۴۹ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں شعبہ عربی میں معاون استاذ مقرر ہوئے، ۱۹۵۰ء کے آخر سے ۱۹۵۱ء کے آخر تک ایک سال علمی استفادہ کی غرض سے حجاز مقدس میں گذارنے کی سعادت حاصل ہوئی، ۱۹۵۲ء میں ندوہ کے ادیب دوم (اسسٹنٹ پروفیسر) مقرر ہوئے، ۱۹۵۵ء میں ندوہ میں شعبہ عربی کے صدر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۰ء میں عمید کلیۃ اللغۃ العربیہ دار العلوم ندوۃ العلماء مقرر ہوئے، ۱۹۸۲ء میں عربی ادب کے میدان میں نمایاں کارکردگی پر انڈین کونسل اتر پردیش کی طرف سے ایوارڈ ملا، پھر اسی سال عربی زبان وادب کی خدمات کے سلسلہ میں صدر جمہوریہ ایوارڈ آپ کو ملا اور ۱۹۹۳ء میں آپ مہتمم دار العلوم بنائے گئے اور ۱۹۹۹ء میں نائب ناظم بنائے گئے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے وصال کے بعد جنوری ۲۰۰۰ء میں ناظم ندوۃ العلماء منتخب ہوئے، سابق صدر بورڈ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمیؒ کی وفات کے بعد جون ۲۰۰۲ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس میں حیدرآباد میں آپ کو اتفاق رائے سے بورڈ کا چوتھا صدر منتخب کیا گیا۔

آپ کو اکثر ممالک بلاد عربیہ نیز بلاد یورپ وامریکہ، مشرق بعید جاپان، ملیشیا، افریقہ، مراکش، مصر، تونس، الجزائر، ازبکستان، ترکی، جنوبی افریقہ وغیرہ کے سفر کا موقع ملا، آپ کی اس وقت عربی زبان میں مطبوعہ تقریباً ۲۰ رکتابیں ہیں اور اردو زبان میں تقریباً ۵۰ ر، اس کے علاوہ غیر مطبوعہ کی تعداد الگ ہے، آپ کی تمام تصنیفات اپنی جگہ منفرد مقام رکھتی ہیں۔

مختلف عہدے ومناصب:

☆ نائب صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی ریاض (سعودی عرب)
☆ رابطہ ادب اسلامی عالمی ایشیا کے صدر
☆ صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام - لکھنؤ
☆ صدر مجلس صحافت ونشریات ندوۃ العلماء - لکھنؤ
☆ صدر دینی تعلیمی کونسل - اتر پردیش

☆صدردارعرفات-رائے بریلی

☆رکن تاسیسی رابطہ عالم اسلامی-مکہ مکرمہ

☆رکن دارالمصنفین-اعظم گڑھ

☆سرپرست تحریک پیام انسانیت

☆سرپرست اسلامک فقہ اکیڈمی-انڈیا

☆ٹرسٹی آکسفورڈ سینٹر آف اسلامک اسٹڈیز، آکسفورڈ یونیورسٹی برطانیہ

☆آپ بورڈ کے صدر، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے چانسلر اور بے شمار تنظیموں اور اداروں کے ذمہ دار و سرپرست رہے۔

بحیثیت صدر نمایاں خدمات:

بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نمایاں خدمات کے ذیل میں حضرت الاستاذ نوراللہ مرقدہ کی دوررسی اور تدبر و فراست سے بھری زندگی کی ایک جھلک نظر آتی ہے، آپ کے دور میں مسلم پرسنل لا بورڈ کی چند نمایاں خدمات درج ذیل ہیں:

☆آپ نے صدارت کی کرسی کو رونق بخشنے کے بعد اصلاح معاشرہ کمیٹی کو باقاعدہ ملک گیر پیمانہ پر وسعت دی اور اس کی ملک گیر مرکزی کمیٹی تشکیل دے کر کاموں میں تیزی لانے کی طرف توجہ دلائی۔ دوسری طرف دارالقضاء کے قیام پر توجہ مرکوز کرائی اور آپ کے دور میں تقریباً ۶۰؍سے زائد مقامات پر نئے دارالقضاء کا قیام عمل میں آیا اور الحمد للہ اس طرف عوام کا رجحان بڑھا ہے اور مسلمانوں کو اس کی طرف متوجہ بھی کیا گیا ہے، دارالقضاء کی بڑھتی مقبولیت وافادیت کے پیش نظر ۲۰۰۵ء میں سپریم کورٹ میں وشولوچن مدن نامی ایڈوکیٹ نے ایک درخواست کے ذریعہ نظام دار القضاء والافتاء کو چیلنج کیا اور عدالت سے درخواست کی کہ یہ متوازی عدالت کے طور پر کام کر رہے ہیں، اس کو روک دیا جانا چاہیے۔ سپریم کورٹ نے اس درخواست پر مسلم پرسنل لا بورڈ کو فریق بنایا اور جواب طلب کیا، آپ سرکردگی اور محترم جناب عبد الرحیم قریشی صاحب کی نگرانی میں اس درخواست کا مدلل جواب دیا گیا پھر عدالتی کارروائی ہوتی رہی اور بورڈ مسلسل اس میں سرگرم حصہ لیتا رہا، چنانچہ ۲۰۱۴ء میں سپریم کورٹ نے اس کا فیصلہ دیا اور دارالقضاء کے قیام کو جائز ٹھہرایا۔

☆مسلم پرسنل لا بورڈ کے اٹھارہویں اجلاس بھوپال منعقدہ ۲۹؍اپریل تا یکم مئی ۲۰۰۵ء میں شدت سے ضرورت محسوس کی گئی کہ قانون دانوں کو شریعت کے مسائل سے واقف کرانے کے لیے ایسی کوئی کمیٹی بنائی جائے جس سے یہ ضرورت پوری ہو، چنانچہ اسی اجلاس میں تفہیم شریعت کمیٹی بنائی گئی، جس کے الحمدللہ آج تک اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔

☆بورڈ کے اسی بھوپال اجلاس میں بزرگوں کی برسوں محنت کے بعد نکاح نامہ کو فائنل کر کے جاری کیا گیا۔

☆اسی طرح ایک معاملہ کیرالا ہائی کورٹ میں وراثت سے متعلق آیا، جس میں شریعت کے قانون وراثت میں صنفی مساوات کا مطالبہ کرتے ہوئے قانون وراثت کو چیلنج کیا گیا تھا، دس بارہ سالوں تک یہ مقدمہ ہائی کورٹ میں چلا اور الحمدللہ بورڈ کی اس میں جیت ہوئی، لیکن بعد میں یہ معاملہ پھر سپریم کورٹ آیا اور ابھی سپریم کورٹ میں زیر دوراں ہے۔

☆ناز فاؤنڈیشن کی طرف سے ایک معاملہ ہم جنسی کا دہلی ہائی کورٹ میں تھا، جس میں بورڈ نے بھی فریق بن کر کامیاب لڑائی لڑی اور اس میں بورڈ کو کامیابی ملی۔

☆آپ کے دور صدارت میں مسلم پرسنل لا بورڈ باقاعدہ ۲۰۰۶ء میں سوسائٹی رجسٹریشن ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہوا۔

☆۲۹؍فروری تا ۲؍مارچ ۲۰۰۸ء میں بورڈ کے بیسویں اجلاس کلکتہ میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے مجموعی ارکان ۲۰۱؍میں اضافہ کر کے ۲۵۱؍کیا گیا۔

☆آپ کے عہد صدارت میں اپریل ۲۰۰۵ء سے سہ ماہی خبر نامہ کا سلسلہ جاری ہوا جو بعض وجوہات کی بنا پر ۲۰۱۸ء تک ہی جاری رہ سکا۔

☆ آپ کے دور میں وقف ایکٹ ۱۹۹۵ء میں ترمیم کی کوشش کی گئی اور اس سلسلہ میں خود آپ کی قیادت میں حکومت کے اہم ذمہ داروں سے کئی مرتبہ ملاقات کی گئی اور ۲۰۱۳ء میں ایک مضبوط وقف ایکٹ منظور ہوسکا۔

☆ ۲۶/نومبر ۲۰۱۱ء کو مجلس عاملہ کی تجویز کے مطابق ملک گیر آئینی حقوق بچاؤ تحریک کامیابی کے ساتھ چلائی گئی۔

☆ ۷/جون ۲۰۱۵ء کو مجلس عاملہ کی تجویز کے مطابق دین اور دستور بچاؤ تحریک کامیابی کے ساتھ چلائی گئی۔

☆ مسلم پرسنل لا سے متعلق قانونی معاملات پر بورڈ کی کارکردگی سے لوگوں کو متعارف کرانے نیز ملک کی مختلف عدالتوں میں پرسنل لا سے متعلق مسائل ومعاملات کو عوام تک پہنچانے کے لیے آپ ہی کی صدارت کے زمانہ میں ضرورت محسوس کی گئی کہ ایک دستاویزی مجلّہ پابندی سے نکالا جائے، چنانچہ ''جرنل آف لا اینڈ ریجیس افیرس'' کے نام سے چھ ماہی دستاویزی مجلّہ نکالا گیا، جس کے پہلے شمارے کا رسم اجراء نئی دہلی میں ۲۳/دسمبر ۲۰۲۱ء کو ہوا، یہ مجلّہ لوگوں نے بہت پسند کیا، اس کا دوسرا شمارہ منظر عام پر آیا اور ہاتھوں ہاتھ قبول کیا گیا۔

☆ طلاق ثلاثہ کو چیلنج کرنے والی درخواست کا قانونی تعاقب کیا گیا اور مضبوطی کے ساتھ سپریم کورٹ میں مقابلہ کیا گیا مگر ؎

بگڑتی ہے جس وقت ظالم کی نیت
نہیں کام آتی ہے دلیل اور حجت

☆ لاکمیشن کے چیئرمین بلبیر سنگھ کے ایک سوال کے ذیل میں چار مرتبہ آپ کے دور صدارت میں اور مولانا محمد ولی رحمانی کی قیادت میں کل جماعتی نشستیں ہوئیں اور دو مرتبہ کل جماعتی پریس کانفرنس بھی کی گئی، جس کا مثبت پیغام گیا اور آپ کی اجازت سے ملک گیر سطح پر ۲۰۱۶ء میں دستخطی مہم شروع کی گئی اور (48347596) چار کروڑ تراسی لاکھ سینتالیس ہزار پانچ سو چھیانوے دستخط صدر جمہوریہ، حکومت اور اس کے مختلف ذمہ داروں کو بھجوائے گئے، جو ہندوستان کی ایک تاریخ ہے اور اس کی ہارڈ ڈسک اور میمورنڈم کے ساتھ ۱۳/اپریل ۲۰۱۷ء کو لاکمیشن کے چیئرمین جسٹس بلبیر سنگھ کو بورڈ کے ایک وفد نے مولانا محمد ولی رحمانی ومولانا سید جلال الدین عمری کی قیادت میں براہ راست سونپا۔

☆ اگست ۲۰۱۷ء میں طلاق ثلاثہ پر سپریم کورٹ کے فیصلہ کے بعد حکومت نے اعلان کیا کہ اب اس میں کسی قانون سازی کی ضرورت نہیں ہے، مگر چند ہفتوں بعد ہی حکومت نے قانون کا ایک مسودہ پارلیمنٹ میں پیش کردیا پھر کیا تھا پورے ملک میں دنیا کی ایک نئی تاریخ رقم کی گئی ہے کہ تقریباً ملک کے ڈھائی سو مقامات پر خواتین کا پرامن منظّم جلوس نکالا گیا جس میں بعض پرامن مظاہرہ میں ایک لاکھ سے پانچ لاکھ تک بہنوں نے اسلامی احکام پر عمل کرتے ہوئے مکمل حجاب کے ساتھ مظاہرہ کیا اور بلاک/ضلع سطح پر میمورنڈم پیش کیا۔

☆ بابری مسجد کا مقدمہ جگ ظاہر ہے، سارا کچھ اعتراف کرنے کے باوجود فیصلہ نے کیا گل کھلایا ہے یہ کسی سے مخفی نہیں ہے، جج کا متفقہ فیصلہ ہوا مگر اس فیصلہ کے ذیل میں ججوں نے متفقہ اعتراف بھی کیا:

(۱) مسجد کسی مندر کو توڑ کر نہیں بنائی گئی۔

(۲) ۲۲/دسمبر ۱۹۴۹ء کی شب مسجد میں غلط طریقہ سے مورتی رکھی گئی۔

(۳) ۶/دسمبر ۱۹۹۲ء کو مسجد کی شہادت ایک مجرمانہ عمل ہے۔

(۴) بابری مسجد کے بیچ والے گنبد کے نیچے رام چندر جی کی جائے پیدائش کی شکل میں پوجا کیا جانا ثابت نہیں ہے۔

(۵) سپریم کورٹ نے مانا کہ ۱۵۲۸ء میں بابر کے کمانڈر میر باقی نے مسجد تعمیر کرائی تھی، ۱۹۴۹ء تک اس میں نماز ہوتی رہی ہے۔ ۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۹ء تک مسلمانوں کے قبضہ اور استعمال میں رہی ہے۔

☆ بورڈ کی ایک اہم خدمت ''مجموعہ قوانین اسلامی'' کی ترتیب واشاعت ہے، آپ کے دور صدارت میں مجلس عاملہ کی ایک نشست میں یہ بات آئی کہ اس کے حاشیہ میں مسلک شوافعی، اہل حدیث اور اثنا عشری کے مسائل کو بھی درج کردیا جائے، چنانچہ یہ

دقت طلب کام بھی الحمد للہ مسلک شوافعی اور اہل حدیث کے مسائل البتہ اثنا عشری کی طرف سے بعض وجوہات کی بنا پر حاصل نہ ہوسکا، سر دست دونوں مسلک کے مسائل کو جمع کرکے آپ کے دور صدارت کے آخر میں مکمل ہوا اور نئے سرے سے مجموعہ قوانین اسلامی کو طبع کرایا گیا جس کی رسم اجرا ۵۱ر فروری ۲۰۲۳ء کو مجلس عاملہ کے اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں ہوئی۔

☆ بورڈ کی مجلس عاملہ منعقدہ ۲۷ر مارچ ۲۰۲۲ء مقام ندوۃ العلماء لکھنؤ کی تجویز کے مطابق خواتین ارکان بورڈ کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانے کے لیے بورڈ کی تمام ذیلی کمیٹیوں میں ان کی نمائندگی شامل کی گئی جو پہلے نہیں تھی۔

☆ آپ کی صدارت میں بورڈ کے گیارہ اجلاس عام (مونگیر، بھوپال، مدراس، کلکتہ، لکھنؤ، ممبئی، اجین، جے پور، کلکتہ، حیدرآباد اور کانپور) میں ہوئے۔

☆ آپ کی صدارت میں بورڈ کی مجلس عاملہ کی ۵۱ر میٹنگیں ہوئیں۔

☆ حضرت کے دور میں گرچہ مسلم پرسنل لا بورڈ مسلسل آزمائشوں سے گھرا رہا، مگر حضرت کی دوراندیشی اور حکمت وفراست سے ہر آزمائش پر کامیابی حاصل کی اور بورڈ کی آبرو کو نہ صرف بچایا بلکہ بورڈ کے وقار واعتبار میں ہمیشہ اضافہ فرمایا۔ حضرت الاستاذؒ نے چند دنوں کی مختصر علالت کے بعد ۱۳ر اپریل ۲۰۲۳ء مطابق ۲۱ر رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ کو بعد نماز ظہر ۳:۳۵ پر اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

اللہ حضرت کو غریق رحمت فرمائے اور شایان شان بدلہ دے اور اس ملت کو ان کا بدل عطا فرمائے۔ آمین!

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

ہندوستان میں تحفظ شریعت کا راستہ

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

”ملک کے دائرہ میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ایک شہری پر عائد ہوتی ہیں ان کو ہم اسلام کے حقوق انسانی کے دائرہ میں رکھتے ہوئے، جو فرائض وحقوق انسانی وحدت کے دائرہ میں آتے ہیں، ان میں ہم کو مملکت کے اختیار کردہ اصولوں کو اپنانے میں دشواری نہیں اور یہ حقوق وذمہ داریاں زیادہ تعداد میں اسلام کی ہدایات کے اندر آجاتی ہیں اور جو بچ جاتی ہیں ان میں ہماری حیثیت مجبوری کی ہے اور اس مجبوری کا کوئی خاص بدل اس وقت موجود نہیں، کیونکہ اسلامی تعلیمات پر مکمل عمل کی سہولت مسلم اقتدار رکھنے والے ملکوں میں بھی نہیں، مزید یہ کہ کسی ملک کو دارالکفر قرار دے کر وہاں کے باشندوں کی کسی دوسری جگہ منتقلی قابل عمل نہیں، البتہ ایسے نظام میں مسلمانوں کے اپنے مذہبی عمل کے جاری رکھنے کے لیے دو اداروں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک شریعت کے تحفظ کا ادارہ جو مذہبی احکام پر عمل کے اختیارات کے بقا اور جو اختیارات روکے گئے ہوں ان کے حصول کے لیے قانونی ودستوری کوشش کی ذمہ داری انجام دے۔

دوسرا ادارہ فقہ اسلامی کے جدید مسائل کے لیے کہ بدلتی ہوئی زندگی اور نظام زندگی میں ابھرتے ہوئے فقہی سوالات کا حل قرآن وحدیث اور ائمہ فقہ کی روشنی میں پیش کرے اور الحمد للہ ہمارے ملک میں یہ دونوں ادارے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور اسلامک فقہ اکیڈمی کے نام سے قائم ہیں اور اپنی موقر ذمہ داریوں کو انجام دے رہے ہیں۔“

(فقہ اسلامی اور عصر جدید: ۹۹-۱۰۰)

میراثِ علم وآگہی

ڈاکٹر مسعود عالم فلاحی
(صدر شعبہ عربی خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی۔لکھنؤ)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد سے اب تک دین اسلام کی چودہ سو سالہ تاریخ میں متعدد عظیم شخصیات نے اس دنیائے رنگ وبو کو اپنی ثمر آور کوششوں سے وقار بخشا اور امت مسلمہ کے اعتزاز وافتخار میں اضافہ کیا ہے، یہ مذہب اسلام کی سب سے ممتاز صفت ہے کہ ہر دور میں ایسے مفکرین، قائدین، مرشدین، صالحین اور ادباء وعلماء ہوتے رہے ہیں جنہوں نے حالات کا رخ موڑ دیا اور ایک زمانہ نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا اور ان کی شخصیت کو اپنا آئیڈیل سمجھا ہے۔ بلاشبہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ بھی تاریخ اسلام کی انہی عظیم شخصیات میں شمار ہوں گے جن کی ذات اختلاف وانتشار کے سخت زمانہ میں امت مسلمہ کے ہر طبقہ کے لیے نقطۂ اتفاق تھی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ عالم اسلام کی عبقری شخصیت اور برصغیر ہند وپاک کی قافلہ سالار ہستی تھے۔ قیادت وسیادت اور تعلیم وتعلم کے ساتھ آسمانِ علم وادب کا بدرِ کامل، ادبِ عربی کے رمز شناس ہی نہیں، ذوق اور ذائقہ شناس، اردو ادب کے افق پر ایک چمکتا دمکتا ستارہ ہی نہیں بلکہ مہر جہاں تاب، اصحاب علم وفضل کی توجہات کا مرکز ہی نہیں بلکہ ان کا ملجا وماویٰ اور بہترین مقتدیٰ، اہل علم ودانش کے فقط رسمی سرپرست ہی نہیں بلکہ ان کے عملی رہنما، اہل سیاست کے لیے ان کا مرجع ہی نہیں بلکہ ایک روحانی معالج بھی تھے۔

اسلامی دنیا کے منظر نامے سے ایسی شخصیات کا اٹھ جانا یقیناً پورے عالم کا خسارہ ہوتا ہے، مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ دنیائے علم وادب کا ایک بڑا نام تھا، ادبِ اسلامی کے حوالہ سے ان کی شبانہ روز محنتیں نصف صدی سے زیادہ کے عرصہ پر محیط ہیں۔ قائدانہ خطوط پر قومی وملی خدمات کے حوالہ سے ان کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے، لیکن یہ بتانے کی یقیناً ضرورت ہے کہ انہوں نے ''زبان وادب'' کے تصور کو آفاقیت بخشی، عالمی سطح پر اس کی تحریک چلائی اور اس کی خاطر کامیاب عملی کوششیں کیں، انہوں نے اپنی قوتِ فکر سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام اور ادب بے جوڑ چیزیں نہیں ہیں، بلکہ باہم مربوط ہیں اور ادب الحاد وزندقہ اور فحاشی وعریانی کے مناظر ومعانی کو الفاظ کا جامہ پہنا دینے کا نام نہیں ہے، بلکہ ادب انسان کے ذوق ووجدان کا نام ہے اور حقیقی ادب وہ ہے جو ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کا مصداق ہو۔ اس کے علاوہ ان کا ایک دوسرا بڑا کارنامہ وہ ہے جو انہوں نے اپنے اشہب قلم سے قومیت عربیہ کے فتنہ کی بیخ کنی میں فکر انگیز تحریریں رقم کیں اور عالم اسلامی میں انہیں ہاتھوں ہاتھ قبول کیا گیا اور وہ تحریریں وہاں کے حلقوں میں غیر معمولی اثر انداز ہوئیں۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی علم وفکر کی تابانی کے ساتھ تواضع وانکساری، عاجزی ونرم خوئی، انسانیت دوستی اور محبت وہمدردی کی اعلیٰ مثال تھے، وہ ایک جہاندیدہ شخص تھے، مگر ان کے ظاہر سے انسان کو دھوکہ ہوتا کہ شاید یہ محض ایک بوریہ نشین بزرگ ہیں، جنہیں دنیا کے پیچ وخم اور تاریخ کے مد وجزر کا علم نہ ہوگا، مگر نظریہ انصاف کی بات یہ ہے کہ وہ اقوام عالم کی تاریخ سے واقف اور امتوں کے اسبابِ عروج وزوال سے باخبر تھے، جس کا مطالعہ انہوں نے قرآن کی روشنی میں کیا تھا، ان کے سفرناموں کا مطالعہ اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ دنیاوی زرق برق اور موجودہ مادّی ترقیات ان کی نگاہ میں قابل التفات نہ تھیں، بلکہ ان کی طائر فکر کا نشیمن اور ان کی نگاہ میں اہم ترین چیز صالح وبامقصد انسانی سماج کی تشکیل تھی، جس کے لیے وہ تاعمر سرگرم عمل رہے۔ خدا آپ کو بہتر بدلہ اور امت مسلمہ کو آپ کا بہتر بدل عطا کرے۔ آمین!

سالارِ کاروانِ ملت — چند یادیں چند باتیں

مولانا سعود الحسن ندوی
(مدرسہ دینیہ — غازی پور)

۲۱ رمضان ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳ اپریل ۲۰۲۳ء جمعرات کی سہ پہر دل کو ایسا زخم لگا جس کی ٹیس ساری زندگی بھلائی نہ جا سکے گی۔ جس دن مرشدالامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنی اولاد و احفاد، تلامذہ اور مریدین و محبین کو چھوڑ کر اس جہان فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔ صحت و علالت کا سلسلہ تو جاری تھا بلکہ چند دنوں قبل ۷ اپریل کو اچانک رائے بریلی سے لکھنؤ تشریف لے جانے کی خبر سے ہی دل بے چین ہوا اٹھا تھا، جلد ہی افاقہ کی اطلاع سے دل مطمئن بھی ہوا، مگر رمضان کی ۲۱ تاریخ کو تقریباً ۲ بجے کسی نے اطلاع دی کہ ''حضرت کی طبیعت زیادہ ناساز ہے، دعا کی سخت ضرورت ہے۔'' اس جملہ نے دل کا سکون چھین لیا اور اضطراب بڑھتا گیا۔ دل کسی اَنہونی کے اندیشے سے مضطرب رہا، نماز ظہر ہو چکی تھی، ذرا آرام کرنا چاہا مگر کیسی نیند کیسی راحت؟ زبان پر دعائیہ کلمات، آنکھوں میں نمی، نہ چاہتے ہوئے بھی بار بار ہاتھ فون کی طرف بڑھتا رہا، اس امید پر کہ شاید کوئی ایک ہفتہ پہلے والی خبر دہرا دے اور کہہ دے کہ ماشاء اللہ! اب حضرت اچھے ہیں۔ مگر ہائے افسوس کہ ٹھیک ۳:۴۵ پر مختصر سی خبر صاعقہ اثر آئی کہ ''حضرت کا وصال ہو گیا۔'' انا للہ وانا الیہ راجعون!

اس غم ناک اور روح فرسا خبر نے دل و دماغ کو گویا کہ مفلوج کر دیا، حواس بحال ہوا تو ذہن کے پردے پر لاتعداد واقعات گردش کرنے لگے، وہ لمحے یاد آتے رہے جن میں یہ بے ضاعت ان کے لطف و عنایات سے بہرہ ور ہوا۔ ندوہ کی عمومی مجلسوں میں آپ کے فرمودات ہوں یا دارالعلوم کے درجہ میں علمی و تحقیقی نکات کا بیان، ندوہ کے مہمان خانہ میں، تکیہ کی رہائش گاہ پر، راقم کے غریب خانہ پر ایسے کتنے ہی مواقع آئے جب اس بے نوا کو شرف باریابی نصیب ہوا، اجازت ملی کہ قدموں میں بیٹھ کر دلِ مضطر سکون حاصل کرے۔ اس بے مایہ کے نام وہ مکتوب بھی ذہن میں آئے جن میں ایک اہم مسئلہ کے سلسلہ میں راقم کی یوں دل جوئی فرمائی:

''لیکن اگر قدرتی طریقہ سے مانع پیش آ رہا ہے تو اس کو خدا کی طرف سے سمجھئے اور اس پر مقتنع ہو جایئے اور سمجھئے کہ اللہ کو منظور غازی پور رہ کر ہی خدمتِ دین و علم کرنا ہے۔''

ایک دوسرے مکتوب میں فرمایا:

''آپ کو دینی وراثت بھی حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا تو بہت ترقی کریں گے، مدرسہ کی ذمہ داری بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک انعام ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خدمتِ دین و ملت کی نیت رکھیں، ان شاء اللہ فائدہ ہوگا۔''

یہ بھی یاد آیا کہ وہ پیکر اخلاق و مروت جسے شرافت و نجابت ورثہ میں ملی تھی، وہ اعلیٰ صفت انسان خوردوں کو کس طرح نوازتا تھا۔ یہ سن کر دل کیسا مسرور ہو جاتا تھا کہ ''ہم جتنا اظہار کرتے ہیں اس سے زیادہ ہمیں آپ سب سے تعلق ہے۔'' لکھنؤ کی جماعت دعوت و تبلیغ سے وابستہ کوئی شخص آیا تو اس سے فرما دیا کہ فلاں سے مل لیجیے گا اور وہ جب اس ناچیز سے ملتا تو اس کا انداز اور باتیں سن کر شرم سے پانی پانی ہو جاتا کہ کی اس سے کیا کچھ فرما دیا گیا۔ وفات سے ایک ماہ قبل ۱۱ مارچ کو والد صاحب کے ساتھ جب ہم نیاز حاصل کرنے آستانہ پر حاضر ہوئے تو اس کا پھر مشاہدہ ہوا بلکہ ہم نااہلوں نے بارہا

اس تعلق خاطر کا مشاہدہ کیا۔ جب غازی پور تشریف آوری کی دعوت پیش کی جاتی تو ضرور تشریف لاتے۔ ایک بار تو پروگرام طے تھا اور حضرت بخار میں مبتلا ہو گئے ذرا افاقہ ہوا تو اسی حالت میں تشریف لائے اور رفقاء سے فرمایا کہ ہم غازی پور چلیں گے، کیونکہ ہمیں انکار کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ اللہ اکبر! ایک عظیم قائد و رہنما، شیخ وقت اور اخلاق و تواضع اس درجہ کا اور خورد نوازی کا یہ انداز؟!

یوں ہی نہیں تو نے اسیر ہم کو کیا ہے
یوں ہی نہیں ہم ترے دیوانے ہوئے ہیں

جب کسی کو مراحم خسروانہ حاصل ہو جاتے ہیں تو عام انسان بھی اس عطا و بخشش پر نازاں ہو جاتا ہے۔ راقم کے ساتھ بھی ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا، تقریباً ۲۰ رسال پرانا واقعہ ہے۔ ایک دفعہ باریابی ہوئی، تحفہ پیش کرتے ہوئے یہ بھی عرض کر گیا کہ ''اس کو استعمال فرمالیجیے گا، خواہ ایک بار ہی سہی۔'' صبح حاضری ہوئی تو نگاہ پڑتے ہی فرمایا: ''.....صبح نماز سے پہلے ہی استعمال کر لیا تھا، بلکہ نماز بھی اس کے ساتھ ہی ادا کی۔'' لڑکپن کا جوش کہیے جس نے نگاہِ التفات سے خدا جانے کتنا حوصلہ پا لیا تھا یا کسی زعم میں آ گیا تھا؟ جو ایسا مطالبہ کر بیٹھا تھا۔ اب خیال آتا ہے تو شرم آتی ہے مگر یہ شعر بھی لبوں پر آ جاتا ہے ؎

ترے عشق نے دیا ہے وہ مقام خسروانہ
ہے جہاں جنوں حقیقت ہے جہاں خرد فسانہ

گزشتہ چند سالوں میں آپ کو پیہم صدموں سے گزرنا پڑا۔ عمر کے اس مرحلہ میں قریب ترین خاندانی عزیزوں کی ابدی جدائی کے غیر معمولی صدموں کو صبر و شکیب اور پوری ایمانی قوت کے ساتھ آپ نے برداشت کیا۔ نہ صرف یہ کہ ان جانکاہ مراحل میں آپ سراپا پیکر تسلیم و رضا رہے بلکہ جانے والوں کے ورثاء اور خوردوں کے لیے آپ کی ذات باعث تسلی رہی اور گویا کہ ان کا غم بھی خود ہی اوڑھ لیا اور ان کے لیے سائبان بنے رہے۔ یقیناً یہ آپ ہی کا حصہ تھا اور اسے ذات باری تعالیٰ کے ساتھ کامل یقین اور بھروسہ کی دَین بھی کہا جا سکتا ہے۔

سچ ہے کہ جب کسی کی محبوبیت آسمان پر لکھ دی جاتی ہے تو زمین والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی مقبولیت اور محبوبیت عطا فرمائی تھی۔ لوگوں نے آپ کو دل و نگاہ میں بسا رکھا تھا۔ آپ کے ساتھ لوگوں کی یہ محبت اور شیفتگی مثالی تھی، جس کا مشاہدہ آپ کی حیات میں بھی کیا جاتا رہا نیز وقت رخصت لکھنؤ اور رائے بریلی میں لاکھوں چاہنے والوں کے اژدحام نے اس کی گواہی دی۔ پہلی نماز جنازہ میں تو ایسا لگا کہ پورا لکھنؤ امڈ آیا ہو۔ والد محترم کے ساتھ راقم ایک قدیم ملکی سطح کی تنظیم کی دہلی میں منعقد انتخابی نشست میں حاضر تھا، ایک ممبر کو کہتے ہوئے سنا: ''ہم کو تو حضرت مولانا رابع حسنی جیسا صدر چاہیے۔'' یقیناً آپ کی ذات نقطہ اتحاد اور قافلہ ملت کے سالار کی تھی۔ آپ نے مختلف الخیال افراد کو مجتمع کر رکھا تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ آپ نے بڑی سے بڑی قربانیوں سے دریغ نہیں کیا، طبیعت اور مزاج کے خلاف باتوں کو برداشت کیا اور انتشار برپا کرنے والے افراد کی ناشائستہ حرکتوں سے بھی صرف نظر کیا مگر امت کا شیرازہ منتشر نہیں ہونے دیا۔ فراست کو بروئے کار لا کر اداروں کو شکست و ریخت سے محفوظ رکھا۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ آپ کی شخصیت نے حصار کا کام کیا۔ طوفانوں کی بے رحم لہریں ناکام سر پٹک کر فنا ہو گئیں۔

آپ کی وفات سے نہ صرف ندوۃ العلماء، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، تحریک پیام انسانیت، عالمی رابطہ ادب اسلامی بلکہ متعدد اداروں اور تنظیموں کو بے لوث سرپرست و مربی اور مخلص قائد و رہبر کی مفارقت کا غم سہنا پڑا، جو اپنے اخلاص و بے لوثی، سادگی و نرم خوئی، صبر و تحمل، بصیرت و دانائی اور حکمت و بالغ نظری سے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کی گتھیاں سلجھا دینے کی مہارت رکھتے تھے۔

آپ کی تصانیف، تلامذہ، منتسبین و مریدین اور آپ کی خدمات ان شاء اللہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ثابت ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات کا بہترین صلہ عطا فرمائے۔ ع

ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد

ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پرواہ

مولانا مسعود حسن حسنی ندوی
(استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

اسلام کی آبیاری میں جن لوگوں کا حصہ رہا ہے تاریخ بھی ایسے لوگوں سے خالی نہیں رہی، تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں ایسے افراد پیدا کرتا رہا ہے جن سے دین کی خدمت کا کام لیا گیا ہے، جب ہم اپنے ماضی کا جائزہ لیتے ہیں تو ایسی عظیم شخصیتوں کا نام ہمارے ذہنوں میں دوڑنے لگتا ہے، صحابہ کرام کی جماعت قدسیہ سے کون انکار کرسکتا ہے جن کا ایک ایک فرد پوری امت کا کردار ادا رہا تھا، اسی طرح صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تربیت یافتہ جماعت تابعین کی جماعت تھی جس نے امت کو عظیم فقہی سرمایہ سے روشناس کرایا اور مسائل کے پورے ذخیرہ کو تحقیق وتدقیق کے زاویوں کے ذریعہ ہمارے سامنے پیش کردیا، اس طرح ہر زمانہ میں ایسے افراد امت کو ملتے رہے ہیں جنہوں نے اسلام کی عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں، ان ناموں میں جو زیادہ مشہور ہوئے ہیں ائمہ اربعہ، عمر بن عبدالعزیزؒ، ابوالحسن اشعریؒ، شاہ ولی اللہ دہلویؒ، سید احمد شہیدؒ اور دیگر حضرات ہیں جن کا ذکر کتابوں میں مل جائے گا۔

پھر اس کے بعد مختلف الجہات قسم کی شخصیتیں کم وجود میں آئیں لیکن وہ شخصیتیں وجود میں آتی رہی ہیں جنہوں نے اپنے میدان میں ضرورت کے ہوتے ہوئے کارہائے عظیم انجام دیئے ہیں۔

ان میں زمانہ قریب میں جب مغربی افکار ونظریات کا بحر بیکراں پورے انسانی معاشرہ کو متاثر کررہا تھا اور اسلام کے دریا کو ڈبونے کی فکر میں لگا تھا، اس وقت ایسی شخصیتیں نمودار ہوئیں جنہوں نے مادیت کے اس سیلاب کو نہ صرف روکا بلکہ اس پر کاری ضرب لگائی، اس میں علامہ اقبالؒ کی شخصیت نمایاں شخصیت تھی اور مولانا مودودیؒ نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعہ اس کا مقابلہ کیا اور اس زمانہ کی نمایاں شخصیت حسن البناء شہید کی تھی جنہوں نے ایک ایسی جماعت تیار کی جو اسلام کے تئیں نہایت حساس تھی اور اس جماعت نے قرون اولیٰ کی یاد تازہ کرادی۔

جب یہ مادیت کا سیلاب بڑھا اور فکری ارتداد پر لوگوں کو آمادہ کرنا شروع کیا اور اس کے ساتھ دوسرے وہ سیلاب بھی وجود میں آنے لگے جنہوں نے امت اسلامیہ کے افراد کے اندر فکری بے چینی پیدا کی تو اللہ نے اپنے ایک بندہ کے ذریعہ اس کا مقابلہ کرادیا، جس کو لوگ ابوالحسن علی حسنی کے نام سے جانتے ہیں، انہوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ مادیت کے اس سیلاب پر سخت ترین ضرب لگائی اور اسلام کے بارے میں نئی نسل کے اندر جو بے اطمینانی کی کیفیت پیدا ہورہی تھی اور اعتماد متزلزل ہورہا تھا اس کو ختم کیا اور اسلام کے تابناک ماضی کو اس طرح پیش کیا جس نے عقل کے دریچوں کو کھولا اور نئی نسل کے سامنے عقل ونقل کی ایسی دلیلیں دیں کہ لڑکھڑاتے قدم ماضی کے دریچوں میں مضبوطی کے ساتھ جم گئے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے ایک ایسی نسل تیار کردی جس کو اپنے ماضی سے جڑنے میں فخر محسوس ہوتا تھا اور مادیت کے نہاں خانوں سے گھن آتی تھی، ان کے سینے دل دردمند سے بحرہ ور تھے اور اپنے تابناک ماضی کو یورپ کے ایوانوں میں پیش کرنے کا جذبہ رکھتے تھے، ان کے اندر اخلاص تھا للّٰہیت تھی، وہ صلاح وتقویٰ سے آراستہ تھے، کبھی بھی وہ یورپ کی مادہ پرستانہ تحریک سے متاثر نہیں ہوئے، درہم ودنانیر کی چمک سے کبھی ان کی نگاہیں خیرہ نہیں ہوئیں، وہ اسلام کے تئیں وفاداری کی قسم کھاچکے تھے، ان کی زندگی کا مقصد اسلام کی آبیاری اور دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری دنیا میں تنفیذ تھا۔

وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی نگاہیں دورس اور دور بین تھیں، یہ دراصل وہی لوگ تھے جن کے بارے میں قرآن مجید میں رب العالمین نے فرمایا ہے کہ وہ آنکھ بند کرے سجدہ میں نہیں جاتے مؤمنین کی جو صفات ﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ﴾ میں بیان کی گئیں وہ اس کا نمونہ بن چکے، انہی شخصیات میں ایک عظیم شخصیت حضرت مولانا سید رابع حسنی ندویؒ کی تھی، انہوں نے اپنے آپ کو اپنے عظیم ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کا پرتو بنالیا، ان کی ایک ایک ادا اور ایک ایک فکر کو اپنے دل و دماغ کے نہاں خانوں میں سمولیا تھا، حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی کی وفات کے بعد اور حضرت مولانا محمد الحسنیؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی کے سب سے زیادہ معتمد علیہ بن گئے تھے، ایسے صائب الرائے تھے کہ حضرت مولانا ہر مسئلہ میں انہی سے رائے لیتے تھے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی تربیت میں خاص طور پر دو آدمیوں کا حصہ نظر آتا ہے، ان میں ایک شخصیت حکیم عبدالعلیؒ کی ہے جن کو تربیت کا خاص ملکہ حاصل تھا اور خاندان کے تمام افراد جوان سے وابستہ تھے وہ ان کی تربیت کرتے تھے، علمی تربیت، اخلاقی تربیت، دینی تربیت کرنے میں وہ نہایت ہی ممتاز شخصیت کے حامل تھے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا جہاں تک تعلق ہے تو ان کے حوالہ جو کام کیا جاتا وہ اس کو کرتے اور کبھی بڑوں کے حکم عدولی کے مرتکب نہ ہوتے تھے، ان کا کہنا تھا کہ ایک مرتبہ ماموں صاحب (حکیم عبدالعلی) نے ایک انگریزی کی کتاب ہمیں ترجمہ کے لیے دی، مجھے انگریزی نہیں آتی تھی لیکن میں نے وہ کتاب لے لی اور ترجمہ کرنا شروع کردیا، آدھی کتاب ترجمہ کرنے میں بڑی محنت لگی، بار بار ڈکشنری دیکھنے کی ضرورت پڑتی تھی لیکن پھر آدھی کتاب میں وہ محنت نہیں پڑی بلکہ آسانی کے ساتھ اس کا ترجمہ ہوگیا۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان جب کسی کام کو کرنے کا ارادہ کر لے تو اللہ رب العزت آسانی پیدا کرتے ہیں۔

اسی طریقہ سے ڈاکٹر صاحب نے جزیرۃ العرب لکھنے کا حکم دیا، مولانا نے اس کام کو بحسن خوبی انجام دیا اور یہ کتاب کتب بیں حلقہ کے لیے ایک عظیم سرمایہ بنی، اس کے علاوہ مولاناؒ کے اندر لوگوں کے لیے کام آنے کا ایسا جذبہ تھا کہ خاندان کے افراد اپنے علاج اور اپنی ضروریات کے لیے مولاناؒ سے مدد کے طالب ہوتے تھے اور مولاناؒ ان کے کام آتے تھے، یہ صفت سید احمد شہیدؒ کے ذریعہ مولانا میں منتقل ہوگئی تھی۔

اسی طرح دوسری شخصیت جن کی تربیت میں مولاناؒ رہے وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنیؒ کی ہے، جن کے ساتھ مولانا ایسے منسلک ہوئے کہ زندگی کے آخری ایام تک حضرت مولانا سے وابستہ سفر و حضر میں ساتھ رہا۔ مولاناؒ نے حضرت مولاناؒ سے علمی استفادہ تو کیا ہی روحانی استفادہ بھی کیا اور حضرت مولاناؒ کے مجاز بیعت ہوئے اور پھر وہ حضرت مولاناؒ کے مشیر خاص ہوئے، حضرت مولانا جن تحریکوں سے وابستہ تھے، ہر مسئلہ میں وہ مشورہ مولاناؒ سے کرتے تھے، ایک مرتبہ حضرت مولاناؒ نے اپنی بہن سے کہا کہ رابع اور واضح کی مثال نہیں، حضرت مولاناؒ کو جو محبت ان دونوں بھائیوں سے تھا وہ کم دیکھنے میں ملتا ہے، مجھے یاد ہے کہ جب حضرت مولانا تکیہ رائے بریلی میں ہوتے تھے اور یہ دونوں بھائی اپنی والدہ سے ملنے رائے بریلی جمعرات کو آتے تھے تو حضرت مولاناؒ گھر کے بچوں کو بار بار باہر بھیجتے کہ دیکھو رابع واضح آگئے یا نہیں آئے اور جب تک یہ دونوں آنہ جاتے ان کو اطمینان نہ ہوتا۔

ان دونوں حضرات کا اپنی والدہ سے ملنے کا یہ معمول ایسا تھا جس میں کبھی تخلف نہیں ہوا اور ان کی والدہؒ پورے ہفتہ ان دونوں کے آنے کا انتظار کرتی تھیں اور ان کے لیے مونگ کا حلوا بنا رکھتیں تھیں اور پلاؤ پکواتی تھیں، یہ چیزیں آج کے اس پرآشوب دور میں جب کہ نفسا نفسی کا عالم ہمیں اخلاص وللّٰہیت اور والدین کے ساتھ حسن سلوک اور معاشرہ کے ہم آہنگ رہنے کا ایک پیغام دیتی ہیں، یہ ہمیں سبق دیتی ہیں کہ ایک انسان جو بڑا بنتا ہے اس کے پس منظر میں کچھ ایسی چیزیں چھپی ہوتی ہیں جس کی تہوں میں جانا ہمارا فرض بنتا ہے۔

والدہ کی بیماری کے موقع پر تقریباً روزانہ لکھنؤ سے رائے بریلی تکیہ آتے تھے، اس کے علاوہ خاندان کے افراد کی خبر گیری رکھنا اور فکر کرنا ان کی زندگی کا حصہ تھا، اپنے خاندان کے افراد کو عزیز واقارب کی مدد کی تلقین کرتے تھے، ضرورت کی بنیاد پر دنیا کو برتنے، بے ضرورت کاموں کے کرنے کے قائل نہیں تھے اور جتنی ضرورت ہوتی اتنا کرتے تھے، ان کے پردادا اور دادا بڑے زمیندار تھے، لیکن ان لوگوں نے کبھی بھی جائداد کو اصل نہ سمجھا، اپنے دونوں ماموؤں اور اپنی والدہ کی تربیت کی وجہ سے علمی کاموں سے ایسے وابستہ ہوئے کہ جائداد پر کوئی توجہ دنہ دی جس کی وجہ سے سیکڑوں بیگھوں زمین پر لوگوں نے قبضہ کرلیا اور اس کی ذرا بھی فکر ان تینوں بھائیوں اور ان کی اولاد کو نہ ہوئی، ان کے سامنے علمی ماحول سے وابستہ ہونا اور علم کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنانا ہی اصل اہمیت کا حامل تھا، مولانا کی ایک ممتاز خصوصیت یہ تھی کہ وہ خاندان کے افراد کی نہ صرف یہ کہ خبر گیری رکھتے تھے اور موقع بموقع تعاون کی ضرورت ہونے کی صورت میں ان کا تعاون بھی کرتے تھے، اس کے علاوہ غریبوں کی مدد اس طرح کرتے تھے کہ کسی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔

اسی طرح ایک ممتاز خصوصیت غیبت نہ کرنا تھا، مجھ کو یاد ہی نہیں کہ کبھی انہوں نے کسی کے بارے میں غیبت کی ہو یا اس پر بہتان باندھا ہو، ان کا دل صاف وشفاف آئینہ کی طرح تھا۔ حسد، کینہ سے پاک، تکبر وریا دے دور، تواضع وانکساری کے پیکر، علم وحسن اخلاق سے آراستہ، وقار وسنجیدگی کے آئینہ دار، متانت و بردباری واستقلال کی صفت سے متصف، کسی کی تکلیف سے ان کو تکلیف ہوتی تھی، کسی کی پریشانی ان کو پریشان کردیتی تھی، امت کا درد ایسا دل میں سما گیا تھا کہ ہر وقت امت کی فکر میں کڑھتے تھے، دینی بے راہ روی پر بے چین ومضطرب ہوجایا کرتے تھے، جب تنہائی میں ہوتے تو دعاؤں کا ایسا نرالا انداز کہ دیکھنے والا دیکھتا تو لگتا کہ رب العالمین سے گفتگو کررہے ہیں، رات کی تنہائیوں میں روتے، امت کے لیے بے چین رہتے، زبان سرکار دوعالم ﷺ کے اسلوب کا آئینہ دار تھی، آپ ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ ﷺ نہ لعان تھے اور نہ طعان۔

مولانا کے بارے میں کوئی یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے کبھی سخت کلامی کی ہو، زبان ان کی ہمیشہ ناپسندیدہ کلمات کے نکالنے سے محفوظ رہی، قلم کی جولانی میں الفاظ کی سختی نہ آسکی، یہ شان صرف اللہ رب العزت کے ان بندوں کی ہوتی ہے جن کا انتخاب اللہ رب العزت کی طرف سے ہوتا ہے اور ایسا ہوتا ہے کہ دنیا رشک کرتی ہے، پھر یہ انتخاب ایسا ہوتا ہے کہ ہر چند میں اس کو منتخب کرلیا جاتا ہے اور اس کو محبوب الخلائق کا مرتبہ عطا کردیا جاتا ہے اور کوئی بھی ایسا کام لے لیا جاتا ہے جو اس کو تجدید کے منصب پر فائز کردیتا ہے، اس میں صلاحیتیں نہیں دیکھی جاتیں، تفقہ نہیں دیکھا جاتا، علم کی سیطرت وغلبہ نہیں دیکھا جاتا، لوگوں کا ہجوم، امارت وسیادت نہیں دیکھی جاتی۔

یہ محض فضل خداوندی کی جانب سے ایک عطا ہوتی ہے جو اللہ رب العزت اپنے خاص بندوں کو عطا فرماتا ہے، اس میں تواضع، تذلل کی کیفیت اللہ کو پسند ہے، اپنے نبی ﷺ سے ایک والہانہ تعلق کو اہم دخل حاصل ہے، آپ ﷺ کے اسوہ کو اپنانا اس کی بنیاد ہے۔

مولاناؒ کے ساتھ بھی رب العالمین کا خصوصی فضل یہ رہا کہ اللہ رب العزت نے امت کی فلاح وبہبود، اتفاق واتحاد اور باطل نظریات کی بیخ کنی کے لیے ان کو منتخب فرمایا، امت ان پر یکجا ہوئی اور بہت سے ایسے کام اللہ رب العزت کی طرف سے ان سے لیے گئے جس سے وہ مثال بن گئے اور بڑوں کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں، تفصیل کے لیے یہ مضمون ناکافی ہے، اس میں اشاروں سے کام لیا جاسکتا ہے۔ کسی نے ملوکیت کے بعد خلافت کے فریضہ کو انجام دیا، تو کسی نے تدوین فقہ واحادیث کی آبیاری کا کام کیا، کسی نے اعتزالی فکر کی بیخ کنی کی، کسی نے الحاد ودہریت کی فضا کو ختم کیا، یورپ کے مادیت پرستانہ نظام پر کسی نے کاری ضرب لگائی، آپسی جھگڑوں کو کسی نے ختم کیا، کسی نے خلق قرآنی کے مسئلہ میں کسی مداہنت سے کام نہیں لیا تو کسی نے باطل نظریات وعقائد کی بیخ کنی

کی تو کسی نے عدالت صحابہ کو مجروح ہونے سے بچایا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو جو فراست دینی کا وافر حصہ عطا کیا تھا، تقریباً ۷۰ر سے ۸۰ر سال انہوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی خدمت کی، اس مدت میں مولانا نے جس طرح ذمہ داروں اور اساتذہ کے دمیان اتفاق واتحاد کی فضا کو قائم رکھا اور ہر قسم کی غلط فہمیوں کے ازالہ میں جو کردار ادا کیا وہ خالصتاً لوجہ اللہ تھا۔

مولانا کا اصول یہ تھا کہ بڑوں کے ساتھ نا انصافی نہ ہو اور چھوٹوں کی حق تلفی بھی نہ ہو، اسی طرح طلبہ کے سلسلہ میں وہ بڑے حساس طبیعت کے مالک تھے، ان کی رائے تھی کہ اساتذہ کو طلبہ کے ساتھ باپ جیسا معاملہ کرنا چاہیے، جب وہ طلبہ سے باپ کے جیسا مشفقانہ تعلق رکھیں گے تو طلبہ بھی ان کو باپ کا رتبہ دیں گے اور ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے گا جو محبتوں اور الفتوں سے ہم آہنگ ہوگا۔

مولانا کی ایک بڑی خصوصیت جود وسخا کی تھی، اکرام ضیف ہر وقت مدنظر رکھا، حدیث "ومن کان یؤمن باللّٰہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفہ" کی بنیاد پر ہر مہمان کا اکرام کرتے، جب تک مولانا صحت مند تھے بارہا دیکھا گیا جو مہمان آتا یا مولانا کا شاگرد آتا جو مولانا سے متعلق رہا ہوتا، یا حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنیؒ سے متعلق ہوتا تو مولانا گھر پر اس کی ضیافت کرتے تھے۔

مولانا کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ بڑے بڑے معاملات کو نہایت خاموشی اور خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیتے تھے۔ کوئی کتنی سخت بات مولانا کے بارے میں کرتا اس کا جواب نہیں دیتے، خاموشی سے ان کو نظر انداز کر دیتے، کوئی ان سے کسی کے بارے میں کسی قسم کی شکایت کرتا تو اس کو خاموشی سے ٹال جاتے، اس پر کسی طرح کا ردعمل ظاہر نہ کرتے۔

ایک بار کسی نے ان سے کسی بارے میں شکایت کی اور اس کے عمل پر ناراضگی کا اظہار کیا تو مولانا نے بس اتنا کہا کہ تم سے تمہاری زبان کے بارے میں پوچھا جائے گا اور ان سے ان کی زبان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

مولانا ذاتی بنیاد پر کبھی کسی کے خلاف کاروائی نہیں کرتے تھے بلکہ ہر فرد اور ہر ملازم کی خیر خواہی کا جذبہ ان کے اندر موجزن تھا۔ ہاں شریعت کی بنیاد پر جس کو وہ صحیح سمجھتے عمل کرتے تھے لیکن فوری طور پر جذبات کے دائرہ میں بہہ کر کسی قسم کی کاروائی سے وہ پرہیز کرتے تھے بلکہ خطوط لکھ کر سمجھانے کی کوشش کرتے اور صحیح کو اختیار کرنے کا مشورہ دیتے، اس کے بعد پھر اس معاملہ کو اہل شوریٰ کے سامنے رکھ کر ان کی رائے لے کر کوئی فیصلہ کرتے۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے جو حساس دل دیا تھا، تقویٰ وپرہیز گاری، تواضع وانکساری واستغناء کی جو کیفیت عطا کی تھی، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کو بے اختیار مقبولیت عطا کر دی تھی، بقول مولانا عبدالعزیز صاحب کہ حضرت مولاناؒ کی بزرگی محض عطاء خداوندی ہے، لہٰذا ان کی مخالفت یا معارضت گویا اللہ رب العزت کی تقسیم پر اعتراض ہے اس سے سب کو بچنا چاہیے۔ مولاناؒ کا کہنا تھا کہ مجھ کو جو بھی عہدے یا چیزیں ملیں، اس میں کبھی بھی میری کوشش کا دخل نہیں، اس سلسلہ کا ایک واقعہ مولانا اکثر سنایا کرتے تھے کہ جب مولانا عمران خان مہتمم تھے تو اس وقت تک میں نہ استاد مقرر ہوا اور نہ کسی شعبہ میں تھا تو انہوں نے میرے نام کی سفارش شوریٰ کے جلسہ میں کی جس کو باتفاق رائے منظور کر لیا گیا، اس طرح مولاناؒ کا تقرر ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک ایسی شخصیت تھی جس نے ہر کام خالصتاً رضاء الٰہی کی بنیاد پر کیا، بزرگوں کے حسب ایماء کیا، اپنی ذات کو تج دیا، زندگی کی رعنائیوں کو پس پشت ڈال دیا، اپنے بڑوں کے لیے اپنے کو مٹایا، تو اللہ رب العزت نے ان کو بلند کر دیا اور ایسے افراد ان کو عطا فرما دیئے جو ان سے محبت کرنے والے تھے اور ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے مخلصین کے کاموں کی حفاظت کرتا ہے، لہٰذا ان کے کاموں کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایسے افراد تیار کرا دیئے جو اخلاص کے ساتھ ان کے کاموں کو آگے بڑھانے میں لگے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ حضرت کی مغفرت فرمائے اور ان کے جانشینوں کی جان مال وصحت کی حفاظت فرمائے اور ہر فتنہ سے سب کو محفوظ رکھے۔

زینت دشت و دمن رونق پروانہ گیا

مولانا سید ہاشم نظام ندوی
(چیف ایڈیٹر ''فکر وخبر'' بھٹکل)

کسی بھی شخصیت کے اوراقِ گزشتہ اور عہدِ پارینہ سے پرانی یادیں کھوجنا ایک امتحان ہے، بالخصوص پہلی ملاقات سے کر آخری ملاقات تک کے ذہن و دماغ میں محفوظ نقوش کو صفحۂ قرطاس پر لانا کسی بھی صاحبِ قلم کے لیے آسان مرحلہ نہیں ہوتا، چوں کہ حضرت استاذِ گرامی مولانا سید رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت اور آپ کی حیات وخدمات پر اب تک ہزاروں صفحات سیاہ ہو چکے ہیں اور ان شاءاللہ آگے بھی ہوتے رہیں گے، چھوٹے مضامین سے لے کر ڈاکٹریٹ کے مقالات تک ان تمام گوشوں کا احاطہ کرتے رہیں گے، اور نوخیز قلم کاروں سے لے کر کہنہ مشق تاریخ نگاروں کے قلم سے بھی ان کی زندگی کے پوشیدہ گوشے سامنے آتے رہیں گے، لہٰذا راقم الحروف نے بھی جب اپنے استاذ و مربی کی زندگی پر کچھ لکھنے کی سعادت حاصل کرنے کے لیے قلم کو سپردِ قرطاس کیا تو اس طرف مائل ہوا کہ اپنے تعلقات اور روابط کو بنیاد بنا کر ماضی کی دریچوں سے کچھ یادداشتیں سپردِ قلم کروں، جس میں قارئین کے لیے شاید کچھ نئے گوشے سامنے آئیں اور راقم الحروف کے لیے تسکین ہو۔

مصرعہ اقبال میں سن لے میرا پیغام تو
لوٹ پیچھے کی طرف اے گردشِ ایام تو

حضرت مولانا کے وجود مسعود سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی علمی فضا معطر ومشکبار تھی، آپ کا وجود صرف اہل ندوہ کے لیے نہیں بلکہ وطن عزیز ہندوستان کے لیے ایک قابل فخر سرمایہ تھا۔ آپ کی رحلت سے ایک فرد یا ایک خانوادہ نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ مغموم ورنجور ہے، آپ ملت اسلامیہ ہند کے لیے جہاں ایک گراں مایہ اور قیمتی اثاثہ تھے، وہیں اہل بھٹکل کے لیے عظیم ترین سرمایہ تھے۔ آپ پوری نوائط برادری کے لیے دل دردمند رکھتے ۔ بالخصوص جامعہ اسلامیہ بھٹکل کے آپ سرپرست تھے اور وہ بھی ایسی سرپرستی تھی کہ اس کے ہر مسئلے میں فکرمند رہتے، جسے ایک واقعہ کے پس منظر میں اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ کے نزدیک اپنے محبوب ادارے جامعہ اسلامیہ بھٹکل کی کیا اہمیت تھی؟۔

سن ۲۰۱۲ عیسوی کا زمانہ جامعہ اسلامیہ کے قیام پر پچاس سال مکمل ہونے پر عظیم الشان تعلیمی اجلاس کا انعقاد ہو رہا تھا، جو اجلاس اپنی نوعیت میں منفرد اور تاریخی بھی تھا، جس میں صرف ہندوستان کے اکابرین و بزرگانِ دین ہی نہیں بلکہ کئی ممالک کی اہم ترین علمی اور دعوتی شخصیات تشریف فرما تھیں۔ اس لیے اکثر بڑے مہمانوں کی رہائش کے لیے بھٹکل کے کئی بڑے مکانوں کو مخصوص کر دیا تھا، جب کہ اکثر شخصیات کا قیام جامعہ اسلامیہ میں تھا، سہ روزہ پروگرام کے پہلے دن ہی رہائشی جگہوں میں بجلی کی کمی کی شکایت موصول ہونے لگی، جس میں مہمان خانہ بھی شامل تھا، جس میں حضرتِ والا کا قیام تھا، عشاء کی نماز کے بعد راقم الحروف حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت حضرت مولانا تقی الدین صاحب مظاہری ندوی دامت برکاتہم تشریف فرما تھے، سلام کیا حضرت نے جواب دیتے ہوئے اندر آنے کی اجازت دی، دونوں کے بیچ حائل ہونا اگر چہ خلافِ ادب تھا، مگر حضرت نے بیٹھتے کا اشارہ فرمایا، ابھی دونوں کے بیچ گفتگو جاری ہی تھی کہ بجلی میں کمی اور ایر کنڈیشن کام نہ کرنے کی وجہ سے گرمی کی شدت میں اضافہ ہونے لگا۔ اس پر مولانا تقی الدین

صاحب دام ظلہ نے بصد احترام حضرت سے درخواست کی کہ میرا قیام شہر میں ہے، مظفر صاحب کا عالی شان بنگلہ بھی ہے، وہیں پر آپ کا قیام بھی طے کرا دیتے ہیں، میں ہی خود بات کرتا ہوں، اس پر مولانا مرحوم نے کچھ دیر کے لیے خاموشی اختیار کی، پھر مسکراتے ہوئے بڑے دردمندانہ اسلوب میں ارشاد فرمایا کہ ''جامعہ اسلامیہ میرے گھر کی مانند ہے، ہمیشہ میرا قیام یہیں ہوتا ہے اور اگر اپنے گھر میں گرمی محسوس ہو یا بجلی چلی جائے تو کوئی گھر چھوڑ کر دوسرے کے گھر جا کر قیام نہیں کرتا ہے، اس لیے مجھے یہاں بہت اطمنان ہے اور آپ کا معاملہ مہمانوں کی طرح ہے، آپ کے لیے اچھے سے اچھے قیام گاہ کا انتظام ہمارا حق ہوتا ہے۔'' سبحان اللہ!

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

اللہ تعالیٰ نے آپ کو قرطاس وقلم کی بے پایاں قوت واستعداد سے سرفراز کیا تھا، حضرتِ والا کی بیش قیمت تصنیفات وتالیفات سے بلاتفریق ہر خاص وعام نے کسبِ فیض کیا۔ بلاشبہ آپ کی ذات والا صفات ہر چند کہ ہمارے تعریفی کلمات یا توصیفی تحریروں اور خطابات سے بے نیاز ہے، لیکن اس کا اظہار کرنا خود ہمارے لیے باعث سعادت ہے۔ اسی لیے ہر کوئی آپ کی غیر معمولی علمی خدمات کے اعتراف میں رطب اللسان ہے۔ یقیناً ان کی خدمات ہمارے لیے ناقابل فراموش ہیں۔

مولانا علیہ الرحمہ گوناگوں معاشرتی حالات ومسائل کے پیش آنے کے باجود پوری ہمت اور حوصلے کے ساتھ اپنا قائدانہ کردار انجام دیتے رہے، ہر طبقے اور ہر مکتب فکر کے لوگوں کا احترام فرماتے اور سب کے ساتھ عزت ورواداری سے پیش آتے رہے۔ آپ اپنے شب وروز میں علمی وتعلیمی، سماجی وفلاحی اور گوناگوں ثقافتی مصروفیتوں کے باوجود اسلامی ادب کی ترویج، اہم ترین محفلوں میں شرکت، اداروں کی نظامت وصدارت کے ذریعے عملی میدانوں میں کام کرنے والوں کی ہمت افزائی فرماتے رہے۔ مختلف ادبی، سماجی اور فلاحی اداروں کی سرگرمیوں میں ممکنہ حد تک شرکت کر کے ان میں آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کرتے رہے اور آخری دور میں اپنی پیرانہ سالی کے باوجود کئی بار دور دراز علاقوں اور شہروں وریاستوں کا سفر بھی طے کرتے رہے۔

آپ نے زمانہ کی رفتار اور تقاضوں کو ملحوظ رکھا اور دنیا کی سائنسی نئی ایجادات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حدودِ شریعت میں رہ کر اس کے استعمال کو سراہا، سوشیل میڈیا کے کاموں کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا، افراد میں موجود خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرنے لیے قابل عمل صلاح ومشورے دیے۔ اسی طرح ملک کو عدل وانصاف اور قومی یکجہتی کے دائرے میں رکھنے کے لیے مسلمانوں کو درکار حکمت عملی اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔ قومی بیداری اور سیاسی شعور کو ملک کی بہتری اور جمہوریت کی بقا کے لیے ضروری سمجھتے ہوئے، کبھی سامنے رہ کر تو کبھی کام کرنے والوں کی رہنمائی فرماتے ہوئے خاموش خدمات انجام دے کر ملک میں پیدا ہونے والی سیاسی دشواریوں اور مشکلات کے ہوتے ہوئے باہمی اعتماد کو بحال رکھنے کے لیے معقول کوششیں کیں۔

جہاں آپ کے وجود سے مختلف دینی ودعوتی اور تعلیمی وثقافتی ادارے استفادہ کرتے رہے تھے، وہیں فرزندانِ جامعہ اسلامیہ بھٹکل اور فرزندان دارالعلوم ندوۃ العلماء کے قائم کردہ صحافتی ادارہ ''فکر وخبر بھٹکل'' نے بھی آپ کی شخصیت سے فائدہ اٹھایا۔ بلکہ آپ کا وجود اس ادارے کے لیے ایک بیش بہا نعمت تھا، مولانا کے مشورے اور ہدایات ادارے کے قیام کے روزِ اول سے ہی اس میں شامل رہے۔ جس کے قیام کے روزِ اول ہی سے ادارہ کے لیے مولانا کے مشورے شامل رہے اور جب بھٹکل میں اس کے افتتاحی پروگرام میں بنفس نفیس شرکت نہیں فرما سکے تو لکھنؤ ہی سے مولانا محمود حسنی ندویؒ کے توسط سے ایک تحریری پیغام ارسال فرمایا، جس میں مولانا نے دینی اور دعوتی خدمات کے مقاصد کے لیے اس ادارہ کے قیام پر مسرت کا اظہار کیا اور اپنے الفاظ میں اظہارِ قدر دانی فرمائی، جو پیغام اس کے افتتاحی اجلاس میں پڑھا گیا تھا، جس کے اقتباسات مندرجہ ذیل ہیں:

''اس اطلاع سے بڑی مسرت ہوئی کہ عزیز گرامی سید ہاشم ندوی بھٹکلی اپنے رفقاء کے ساتھ ایک آن لائن اخبار فکر وخبر ڈاٹ کام

کا اجرا کرنے جارہے ہیں اور صحیح اسلامی فکر کو عام کرنے کے لیے ویب سائٹ لانچ کرنے کا انہوں نے ایک جامع منصوبہ تیار کیا ہے، جس میں ان کو اپنے اساتذہ، مقامی علماء اور اصحاب دین و دعوت اشخاص کی رہنمائی اور تعاون بھی حاصل ہے۔ اس سے وہ دعوت وارشاد، فقہی مسائل، تعلیم وتربیت کا جہاں ایک طرف کام لیں گے، وہیں اسلام اور مسلمانوں کی روشن تصویر دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کرنے کا بھی فریضہ سرانجام دیں گے، تاکہ اس وقت انسانی معاشرہ جو سائنسی ترقی کے ساتھ اخلاقی گراوٹ کی آخری حدوں کو چھورہا ہے اور انسانیت ہلاکت کی کگار پر کھڑی ہے، اس کو اسلام کی رہنمائی میں ہلاکت سے بچایا جاسکے۔

میڈیا کی ترقی یافتہ شکلیں جو اس وقت سامنے آئی ہیں، اس میں آن لائن کا کردار بہت اہم ثابت ہورہا ہے، اگر وہ صحیح ہاتھوں میں رہے تو اس سے انسانیت کی قدروں کو تقویت حاصل ہوگی اور انسانی قدروں سے جو انحراف اس وقت میڈیا کے ذریعہ پیدا ہورہا ہے جس کے نتیجہ میں انسان انسانیت سے دور ہوتا چلا جارہا ہے، اس کی روک تھام بہت ضروری ہے، اس بات کا احساس ہمارے دانشور طبقہ کو برابر ہے اور ایسی کوئی کوشش جس میں انسان کو انسانی قدروں پر باقی رکھنے کی فکر کی جائے سب کی طرف سے قدردانی کی مستحق ہوگی۔ لہٰذا میں اس کوشش کو سراہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس سے بھلائی کو تقویت حاصل ہوگی۔''

مندرجہ بالا پیغام سے یہ بات صاف واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت مولاناؒ ہمارے ادارے ''فکر وخبر بھٹکل'' کو اس کے قیام کے روز اول سے اپنی دعاؤں اور مفید مشوروں سے نوازتے رہے تھے۔

اس موقع پر قارئین کو یہ بات بھی واضح کرتے چلیں کہ ''فکر وخبر'' (www.fikrokhabar.com) صرف ایک آن لائن اخبار نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا ادارہ ہے جس کے بنیادی مقاصد میں میڈیا اور جدید ٹیکنالوجی کا استعمال کرتے ہوئے محبت کے خداوندی پیغام اور حق اور حقیقت کی آواز کو دنیائے انسانیت تک پہنچانا، صالح نوجونوں اور بالخصوص علماء کو صحافت سے جوڑتے ہوئے پورے معاشرہ کو درپیش تعلیمی، ثقافتی اور سماجی مسائل کا معقول اور صحیح حل پیش کرنا ہے۔ ساتھ ہی خدمت خلق کے عظیم فریضہ کو انجام دیتے ہوئے نئی نسل کو تعلیمی میدان میں آگے بڑھا کر ملت کی صحیح قیادت کے لیے تیار کرنا ہے۔ جس کے سرپرست اول حضرت الاستاذ مولانا محمد اقبال صاحب ملاندوی (سابق قاضی جماعت المسلمین بھٹکل، سابق صدر جامعہ اسلامیہ بھٹکل) اور پہلے صدر مشفق مربی حضرت مولانا عبد الباری ندوی رحمۃ اللہ علیہ (سابق مہتمم جامعہ اسلامیہ بھٹکل اور سابق خطیب جامع مسجد بھٹکل) تھے اور حالیہ صدر مولانا محمد الیاس فقیہ احمدا ندوی دامت برکاتہم ہیں۔

مزید اس کی اہمیت اس سے بھی آشکارا ہو جاتی ہے کہ اسی سال سن ۱۴۳۳ ہجری (۲۰۱۲ عیسوی) میں افتتاحی تقریب کے فورا بعد لکھنؤ کا سفر ہوا اور حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا سید واضح حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس کام کو بہت سراہا اور دارالعلوم کے احاطے میں مہمان خانے کے سامنے حضرت مولاناہی کی صدارت میں ایک تعارفی نشست رکھی گئی اور پورا ویب سائٹ بڑے پروجیکٹر کے ذریعے تفصیل کے ساتھ دکھایا گیا، جسے آپ نے سراہتے ہوئے ہمت افزائی کے کلمات ارشاد فرمائے اور ماضی میں صحافتی دنیا میں علماء کے کردار کو بیان کرتے ہوئے عصر حاضر کے تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے نئی ایجادات سے بھرپور استفادہ کرنے کا مشورہ دیا اور شاید ہی اس کے بعد کا کوئی سفر ہوگا جس میں ان دونوں نے فکر وخبر کی ترقی یا مستقبل کے منصوبوں کے متعلق کوئی بات نہ کی ہوگی۔

بالخصوص سن ۲۰۱۸ء کے سفر میں روانگی سے قبل بعد نماز فجر اپنے دوست مولانا ابوبکر صدیق بھٹکلی ندوی کے ہمراہ حضرتِ والا کی خدمت میں حاضر ہوا، تو تفصیل کے ساتھ ہر دور کے دعوتی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اس دور میں میڈیا کو دعوتی وسیلہ کے طور پر استعمال کرنے کی ضرورت کو باصرار بتایا، ساتھ ہی اردو سے زیادہ عالمی زبان انگریزی اور کرناٹک کی ریاستی زبان کنڑا میں کام کو وسعت

دینے پر زور دیا جو ملاقات ایک گھنٹے سے زیادہ رہی اور جس ملاقات کے کافی نکات سفر کی ڈائری میں درج ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ پرانے زمانوں میں اگر چہ وسائل تبلیغ محدود تھے مگر تاثیر زیادہ تھی، ہر دور میں اس کے لیے اپنے مخصوص وسائل اور عوامل رہے ہیں، مگر بالخصوص بیسویں صدی سے سائنس اور ٹکنولوجی کی نئی نئی ایجادوں اور اکسیویں صدی میں اس کی بڑھتی ہوئی مختلف شکلوں اور ترقیوں میں اضافہ ہی ہو رہا۔ آج علم وخبر کی ترسیل میں آسانیاں پیدا ہو چکی ہیں، افکار ونظریات کی ترویج کے لیے دائرہ عمل وسیع تر ہو چکا ہے، اس تناظر میں دیکھا جائے تو اس کی افادیت اور اہمیت بھی دو چند ہو چکی ہے۔ الغرض اہل باطل اپنی شر پسندی اور بد اخلاقی کی ترویج میں کوشاں ہیں اور اہل حق اپنی غفلتوں میں محو خواب ہیں، محدود دائروں میں رہ کر باہمی نفرتوں میں مست ہیں۔ اندھیری رات میں ایک دیا لے کر آگے بڑھتے ہوئے گھبراتے ہیں، حق کی آواز ببانگ دہل کہتے ہوئے ڈرتے ہیں، اپنے تحفظات کے لیے اپنی زبانیں بند کیے ہوئے ہیں۔ شکایت کے لہجوں میں بولتے اور اسی انداز میں مخاطب ہوتے ہیں، دولت، اقتدار اور شہرت منزلِ مقصود بن چکے ہیں۔ آج صحافت آزادیٔ رائے کا غلط فائدہ اُٹھا کر مسلم دشمن عناصر کے مقاصد کو پورا کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ پوری دنیا مسلمانوں کے خلاف زہر اگل رہی ہے۔ اور اپنی من گھڑت باتوں کو عوام کے ذہنوں میں پیوست کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ افسوس صد افسوس کے کچھ اپنے میڈیا بھی اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ ایسے میں ایک مسلمان کا کیا مقصد رہ جاتا ہے؟! یہی کہ صحافت کو اس کا عکس بتائے۔ آزادیٔ رائے کی حقیقت کو سمجھایا جائے اور مجلس کے اختتام میں فرمایا کہ ہمارے ندوۃ العلماء کے مقاصد قیام میں اشاعت اسلام ایک بنیادی مقصد ہے، مزید یہ کہ "خذما صفا و دع ما کدر" (جو اچھا ہے اس کو لے لو اور جو برا ہے اس کو چھوڑ دو) اس کا ذرین اصول ہے اور تمہارے سب کام بھی اسی میں شامل ہیں، مولانا نے موجودہ حالات کا جائزہ لیتے ہوئے جس رنج والم اور غم وافسوس کا اظہار کیا تھا اس کا اظہار ہمارے جملوں یا ناقص تحریر سے نہیں ہو سکتا۔ شاید شاعر نے انہی جیسی کیفیات اور اسی طرح کی شخصیات کے احساسات کو اس شعر میں قلمبند کیا ہوگا۔

زخم دل چاک جگر جا کے دکھائیں کس کو
قصہ درد سنائیں تو سنائیں کس کو

آپ کی ذات والا صفات میں حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھا، آپ کی شخصیت میں سادگی، مزاج میں انتہائی انکساری، طبیعت میں حلم وبردباری اور زبان وبیان میں شیرینی تھی، ذہن ودماغ غور وفکر کا خزینہ تھا۔ آپ قومی اور ملی اتحاد کا اعلی نمونہ تھے۔ مولانا کی زندگی میں اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ آپ کی نشست وبرخاست، اہم شخصیتوں سے روابط وملاقات، احباب سے تعلقات، ملاقات کے لیے آنے والوں سے حسن سلوک اور حسنِ استقبال، طبیعت اور قول وفعل میں رواداری جیسے صفات ان کا خاندانی وصف تھا، جس میں بالخصوص مفکر اسلام کی حسن صحبت اور فیض تربیت نے جلا بخشی، جن صفاتِ حمیدہ اور اخلاقِ کریمانہ نے ہر ایک کو متاثر کر دیا تھا۔ گویا حضرت مونا رابع صاحب رحمۃ اللہ علیہ حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ایک عکس تھے یا صوفیائکی اصطلاح میں ایک نسبت اتحادی تھی جو دونوں میں یکساں نظر آتی تھی۔

آپ کی وفات اسلامی دنیا کا ایسا نقصان ہے جس کی تلافی مشکل نہیں تو اتنی آسان بھی نظر نہیں آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ رب ذوالجلال آپ پر اپنی رحمتوں کی بارش فرمائے، انہیں جنت الفردوس میں اعلی مقام عطا فرمائے اور امت اسلامیہ کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

زینت دشت و دمن رونق پروانہ گیا
جس پہ ذی ہوش بھی قربان تھی وہ دیوانہ گیا
شیشہ و ساغر و ساقی و پیمانہ گیا
وائے تقدیر کہ میخانے کا میخانہ گیا
رند و زاہد کے لیے مرکز ایمان تھا وہ
وہ فرشتوں سے بھی بڑھ کر تھا کہ انسان تھا وہ

مرشد الامت — علم وفکر کے آئینہ میں

مولانا محمد شعیب ندوی
(مدرسہ سید ابوالحسن علی ندوی - پرتاب گڈھ)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ علم وعمل، فکر ونظر، فراست وبصیرت، زہد وورع، استغنا وتوکل، اخلاق وکردار کے جامع انسان تھے، لیکن ان اوصاف وکمالات کے درمیان ان کی امتیازی شان یہ تھی کہ ان کا علم بہت گہرا اور وسیع، فکر نہایت پختہ اور سلیم تھی، حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیم وتربیت جس ماحول اور جن شخصیتوں کے زیر سایہ ہوئی تھی وہ خود علم وعمل کے پیکر، قلب سلیم اور ذہن رسا کے حامل، نبوی اخلاق وکردار کا نمونہ، قرآن وسنت کے ماہر، دعوت واصلاح کے علم بردار، جہاد واجتہاد کے اوصاف سے متصف تھے۔ حضرت مولانا کی والدہ امہ العزیز صاحبہ اور نانی خیر النساء بہتر کی خالص ایمانی وروحانی تربیت ودعاء نیم شبی، ماموں ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی نگرانی وسرپرستی، ہدایت ورہنمائی اور تعلیم وتربیت نے انھیں کندن بنا دیا تھا، خاص طور پر حضرت مولانا علی میاںؒ کی شب وروز کی صحبت، سفر وحضر کی ہم رکابی نے صیقل کر کے گوہر کامل بنا دیا، چنانچہ وہ علم کی وسعت، فکر ونظر کی بلندی وپختگی، اخلاق وکردار، تواضع وانکساری، جاہ وشہرت طلبی سے اجتناب وگریز، اخفاء حال، شرافت واعلیٰ ظرفی حتی کہ شکل وصورت میں بھی اپنے ماموں جان حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے مثنی بن گئے تھے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا علمی وتحقیقی مقام بہت بلند تھا، حضرت مولانا نے اپنا اصل میدان علم وتحقیق اور درس وتدریس اور افراد سازی ہی کو بنایا، یقیناً وہ اپنے زمانہ میں فن تعلیم وتربیت کے امام تھے، چونکہ وہ ماہر نفسیات تھے جس کا فن تعلیم وتربیت میں اہم کردار ہوتا ہے، لہٰذا اس میدان میں آپ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیئے وہ آپ کی زندگی کا سب سے روشن باب ہے، ''سماج کی تعلیم وتربیت'' ''امت مسلمہ ایک رہبر ومثالی امت'' ''منثورات'' ''الادب العربی بین عرض ونقد'' ''تاریخ الادب العربی'' وغیرہ کی شکل میں جو بیش بہا سوغات پیش فرمائی، اس سے اس فن میں آپ کی عبقریت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے، نیز اپنی خصوصی اور خاموش تربیت وافراد سازی کے ہنر سے علماء ودعاۃ کی ایک بہت بڑی جماعت تیار فرمائی جو آج پوری دنیا میں مغرب ہو یا مشرق ہر جگہ تبلیغ واشاعت اسلام کا بہترین فریضہ انجام دے رہی ہے، علماء کی صف میں آپ کا بالکل منفرد اور جداگانہ وصف ''فن جغرافیہ'' میں مہارت ہے جس کے نمونے ''جزیرہ العرب'' ''سمرقند وبخارا کی بازیافت'' ''دو مہینے امریکہ میں'' موجود ہیں، بقول پروفیسر وصی احمد صدیقی ''مصنف کتاب علم جغرافیہ کے ماہرین میں ہیں ـــــــ میں بغیر کسی مبالغہ کے مولانا کو البیرونی سے تشبیہ دے سکتا ہوں۔'' (مقدمہ سمرقند وبخارا کی بازیافت: ۱۰)

حضرت کا موضوع عربی زبان وادب تھا، وہ باکمال ادیبوں کی فہرست میں سرفہرست تھے، چنانچہ وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ادیب اول قرار دیے گئے، اس فن میں آپ کی تصنیفات کو مختلف جامعات اور یونیورسٹیوں کے نصاب تعلیم میں جگہ دی گئی اور ان خدمات پر صدر جمہوریہ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا، دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ''الرائد'' کا اجراء آپ ہی کا رہین منت ہے، آپ نے اپنے قلم گہربار سے عالم عربی میں اٹھنے والے فتنوں کی سرکوبی میں

اہم کردار ادا کیا اور صحیح رہبری ورہنمائی کا فریضہ انجام دیا، عالم عرب میں عربی ادب کو صحیح رخ دینے والوں اور اس کا رشتہ دین واخلاق سے استوار کرنے والوں کا جب نام آئے گا' بالخصوص سرزمین ہند پر جب عربی زبان وادب کی تاریخ لکھی جائے گی اور بحیثیت ایک زندہ زبان کے اس کے عروج وارتقاء کی بات ہوگی، تو سچ یہ ہے کہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے تذکرہ کے بغیر وہ تاریخ ادھوری اور بات ناقص رہے گی، اس سلسلہ الذہب کی وہ ایک ایسی کڑی تھے جن کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا، برصغیر ہند و پاک میں عربی زبان کا کوئی ادیب ان کے علم وفن سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔

عربی زبان وادب پر مہارت ہی کا نتیجہ تھا کہ آپ کی نظر قرآن پاک کے ادبی پہلو بطور خاص اس کی فصاحت و بلاغت، الفاظ کے معانی وحقائق پر بہت گہری تھی، بلکہ اس پر عبور حاصل تھا، فقہ اللغہ آپ کا خاص فن تھا، اس میدان میں آپ کی اعلیٰ تحقیقات اور غیر معمولی درک وکمال کا اظہار دوران درس یا علمی مجلسوں میں ہوتا تھا، مولانا جب عرب شعراء کے اشعار یا ادب کی کتابیں پڑھاتے اور اس دوران قرآن پاک کے الفاظ وتراکیب اور اس کے اعجازی پہلو پر گفتگو فرماتے تو دل اس بات کی گواہی دینے پر مجبور ہوتا کہ کم از کم برصغیر میں اس پایہ کا کوئی عالم نہیں اور نہ اس فن میں ان کا کوئی ثانی ہے، حقیقت یہ ہے کہ وہ اس میدان میں علم کا وہ بحر بیکراں تھے جو شاید ان کے رخصت ہونے سے خشک ہوگیا، قرآن اور قرآنی علوم میں آپ کی امتیازی شان کا کچھ اندازہ کرنا ہو تو ''قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل'' ''احتساب زندگی-سورۂ انبیاء کی روشنی میں'' ''صبر وتقویٰ کی زندگی-سورۂ یوسف کی روشنی میں'' ''اسلامی معاشرہ -سورۂ حجرات کی روشنی میں'' کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

قرآن پاک کے ساتھ سیرت نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام بھی آپ کا خاص موضوع رہا ہے، جس میں صرف سیرت کے واقعات ہی نہیں بلکہ فقہ السیرہ میں مجتہدانہ نگاہ کے حامل تھے، آپ کی مقبول خاص وعام کتاب ''رہبر انسانیت'' دعوتی نقطہ نظر سے ایک انمول خزانہ ہے، حضرت کا اسلوب نہایت سہل وآسان بلکہ سہل ممتنع کا مصداق ہے، الغرض حضرت کی شخصیت بہت جامع اور بعض پہلوؤں پر منفرد وبے مثال تھی۔

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا جہاں علمی مقام بہت بلند تھا، وہیں آپ کی فکر بہت پختہ اور صائب تھی، آپ کو دربار الٰہی سے قلب سلیم کی دولت بے بہا ودیعت ہوئی تھی، آپ اپنی دور اندیشی اور تجربہ کی بنیاد پر جو رائے قائم فرماتے اس میں خطا کا امکان بہت کم ہی ہوتا تھا، آپ کی طبیعت میں حقیقت پسندی کا عنصر بھرپور طریقہ پر موجود تھا، وہ لوگوں کے تبصروں اور پروپیگنڈوں سے متاثر نہیں ہوتے تھے، بلکہ حقیقت حال کا پوری گہرائی سے غیر جانب دارانہ جائزہ لے کر کوئی بات کہتے تھے، اسی لیے آج کے ناگفتہ حالات میں بھی تاریخی حقائق کی روشنی میں ایسی ہمت افزا باتیں ارشاد فرماتے جنہیں سن کر بجائے مایوسی وہمت شکنی کے بڑی ہمت وحوصلہ اور نئی روشنی ملتی تھی، وہ صبر واستقامت کے پہاڑ تھے، بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کو اپنے فہم وفراست اور حکمت ودانش مندی سے بہت پرسکون ماحول میں حل کردیتے، آپ نے ایک طویل عرصہ تک ملت اسلامیہ ہندیہ کی قیادت وامارت کا جو نازک فریضہ دیا اور سب کو ایک لڑی میں پروئے رکھا اور اس پر آشوب دور میں جس طرح سب کو سنبھالا، وہ آپ ہی کا ظرف اور آپ ہی منصب ومقام تھا۔

الغرض مولانا اعلیٰ انسانی واسلامی اخلاق وکردار کے علمبردار، ایک بالغ نظر، دوراندیش، بیدار مغز، فراست ایمانی کے جوہر سے متصف، لیکن خاموش مزاج و بردبار، صبر وشکر کے پیکر ایک عظیم انسان، ایک کامیاب منتظم، ایک زبردست رہبر ورہنما تھے، آپ کی ہر ادا اخلاق نبوی کے سانچہ میں ڈھلی ہوئی تھی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ڈاکٹر محمد نصر اللہ ندوی
(استاد دار العلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

آج ملت اسلامیہ ہندیہ یتیم ہوگئی، آج وہ بزم سونی ہوگئی جس کی روشنی سے عالم اسلام منور تھا، آج وہ قائد چل بسا جس کا وجود اس امت کے لیے ایک نعمت خداوندی تھا، وہ عالم رخصت ہوگیا جس کے علم وفضل سے ایک جہان آباد تھا، وہ پیر دانا راہی ملک بقا ہوا جو اپنی حکمت ودانائی سے ملت کی گتھیاں سلجھاتا تھا، وہ استاد اس دار فانی سے کوچ کر گیا جس نے نسلوں کو علم وفن کے آداب سکھائے اور جو زندگی بھر علم وحکمت کے گیسو سنوارتا رہا، وہ مصنف نہیں رہا جس کے قلم گہر بار سے گراں قدر تصنیفات وجود میں آئیں، وہ ادیب رخصت ہوگیا جو پوری زندگی ادب وانشاء کی خدمت کرتا رہا، وہ قلم کار الوداع کہ گیا، جس کی نگارشات نے قلم وقرطاس کو اعتبار بخشا، وہ مدبر اس دنیا سے اٹھ گیا جس کی مدبرانہ صلاحیتوں سے اداروں اور تنظیموں کو استحکام نصیب ہوا، وہ مفکر داغ مفارقت دے گیا جس کے فکر انگیز خیالات بیاباں کی شب تاریک میں قندیل رہبانی کا کام کرتے تھے، وہ مرشد چل بسا جو گم گشتہ راہ انسانوں کو ہدایت کے راستہ پر گامزن کرنے کے لیے کوشاں تھا، وہ شیخ طریقت اٹھ گیا جو اخلاق وکردار کا تزکیہ کرتا تھا، وہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا صدر نشیں اور ندوۃ العلماء کا شہ نشیں تھا، وہ ایک عظیم صحافی تھا جس کی تحریریں عالم اسلام میں شوق سے پڑھی جاتی تھیں، وہ ایک جہاں دیدہ اسکالر تھا جس کی نگاہیں عالم اسلام کے حالات پر بہت گہری تھیں، اس کی علمی خدمات کا ایک طویل سلسلہ تھا، اس کی ملی خدمات نہایت قابل قدر ہیں، اس کا انتقال عالم اسلام کا عظیم خسارہ ہے جس کی تلافی بہت مشکل ہے۔

وہ ایک عظیم استاد تھا، جس کے سامنے ہزاروں تشنگان علم نے زانوئے تلمذ تہ کیا، اس کی تدریس کا انداز نرالہ اور جداگانہ تھا، اس کا ہر جملہ معنویت سے لب ریز ہوتا، جس سے علم وفن کی گرہیں کھلتیں، اس کے ہر لفظ سے معلومات میں اضافہ ہوتا، اس کا اسلوب نہایت سادہ تھا، لیکن اس سادگی میں بلا کی دل آویزی تھی، وہ طلبہ کی نفسیات سے اچھی طرح واقف تھا، وہ نفس مضمون کی ایسی تشریح کرتا کہ دلوں میں اتر جاتا، اس کا برتاؤ بالکل حکیمانہ تھا، وہ طلبہ کے اشکالات کو بڑے تحمل سے سنتا اور ایسا جواب دیتا کہ پھر کوئی اشکال باقی نہ رہتا، اس کی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، اس کی گفتگو میں چاشنی تھی، اس کی ادا دل فریب تھی اور اس کی صدا دل نواز تھی، جو دل ودماغ کو اپیل کرتی تھی، وہ ایک بے مثال بے مربی تھا، جس کی تربیت نے نسلوں کی تعمیر کی، اس کے فیضان نظر نے کتنوں کو آداب فرزندی سکھائے، اس کی خموشی گفتگو ہوتی، اس کی بے زبانی بھی زبان ہوتی، اس کے اندر علم کے ساتھ حلم تھا اور یہی اس کی کامیابی کا راز تھا، اس کی خاموشی بہت سے سوالات کا جواب ہوتی، اس کے اندر دیانت داری تھی اور اس نے پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ تعلیم کا فریضہ انجام دیا، علم کی اشاعت اس کا مقصد حیات تھا، زندگی بھر وہ نبوت کی میراث تقسیم کرتا رہا، اس کی ہر مجلس علم وحکمت سے درس ہوتی، اس کے پاس بیٹھنے والا کبھی محروم نہیں رہتا، وہ اتنی اپنائیت سے حکمت کے موتی بکھیرتا کہ کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹتا، اس کے اردگرد ہمیشہ علم کے پروانوں کا ہجوم رہتا، جو اپنے اپنے ظرف کے مطابق دامن مراد کو لعل وگہر سے بھرتا، افسوس کہ یہ مجلس اب برخاست ہوگئی اور وہ چشمہ خشک ہوگیا جس سے سے علم وآگہی کے سوتے پھوٹتے اور طالبان علوم

نبوت اپنی تشنگی دور کرتے۔

وہ ایک عظیم انسان تھا، اس کا سینہ انسانیت کی ہمدردی سے لب ریز تھا، اس کے اخلاق میں بلندی تھی، اس کے کردار میں پاکیزگی تھی، وہ تقویٰ وطہارت اور خلوص وللّٰہیت کا پیکر تھا، اس کی راتیں خوف خدا سے معمور تھیں، اس کی شخصیت میں زمین کا سا بچھاؤ اور سمندر سی گہرائی تھی، اس کے اندر غیر معمولی تواضع تھا، اس کی فکر میں گہرائی تھی، اس کے گفتار میں صداقت تھی، اس کی رفتار میں متانت تھی، وہ سادگی وانکساری کا نمونہ تھا، اس کے قلم میں جولانی تھی، اس کے خیالات میں رعنائی تھی، اس کی زباں ذکر خداوندی میں ہر وقت تر رہتی تھی، وہ چھوٹوں پر شفیق اور مہربان تھا، اس کے اندر نصح وخیر خواہی کا جذبہ غیر معمولی تھا، اس کی زندگی تعلیم وتعلم کے لیے وقف تھی، اس نے نسلوں کی آبیاری کی اور اپنے پیچھے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی پوری فوج چھوڑ گیا، جو یقیناً اس کے لیے صدقہ جاریہ ہے، وہ دین متین کا بے لوث سپاہی تھا، اسلامی علوم کا شارح اور ترجمان تھا، وہ ایک سیرت نگار تھا، جس کے قلم نے سیرت نگاری میں ایک مقام حاصل کیا، وہ ایک مؤرخ تھا جو تاریخ نویسی کے فن سے آشنا تھا، وہ اعتدال اور توازن کی بہترین مثال تھا، ہر طبقہ اور مکتب فکر میں اس کو مقبولیت حاصل تھی، وہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی متفق علیہ شخصیت تھا، وہ فکر ابوالحسن کا امین اور ترجمان تھا، اس کا انتقال ندوہ کے ایک عہد کا خاتمہ ہے، اس نے ندوہ کو ایک ذرہ سے عالم اسلام میں ایک روشن ستارہ بننے تک کا مرحلہ دیکھا تھا، اس کا سینہ ملک وملت کے رازہائے سربستہ کا امین تھا، اس کی زندگی نہایت روشن اور تابناک تھی اور اس کی موت بھی قابل رشک ہے، حق مغفرت کرے، بڑی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

ظلم کا انجام

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''تاریخ عالم میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری پوری ایسی بستی کو توڑ دیا اور ختم کر دیا جس میں بڑے بڑے لوگ موجود تھے، لیکن ان کا کردارِ زندگی بہت برا ہو گیا تھا اور اس کے بعد نئے لوگ پیدا کر دیئے جو وہاں آباد ہوئے اور وہ پرانے لوگ جنہوں نے معصیت کی حد کر دی تھی اور اپنے نبیوں کو پریشان کیا تھا، ان کو اللہ تعالیٰ نے ختم کر دیا، ان لوگوں کو نبی دعوتِ حق دیتے تھے تو وہ کہتے تھے کہ ہم نہیں مانیں گے، جب نبی ان کو معجزے دکھاتے تو وہ کہتے کہ یہ جادوگری ہے، اس لیے ہم اس کو بھی نہیں مانیں گے، بس ہم اپنے باپ دادا کے طریقہ پر ہی قائم رہیں گے، خواہ تم کچھ کہو۔

جب اللہ تعالیٰ یہ دیکھتا ہے کہ نبیوں کے کہنے کے باوجود، ان کی کوششوں کے باوجود قوم کی اصلاح نہیں ہوئی تو اللہ یہ فیصلہ فرما دیتا ہے کہ دنیا میں ان کے رہنے کی ضرورت نہیں ہے، دنیا میں انسان کو اللہ نے امتحان کے لیے بھیجا ہے، یہ دیکھنے کے لیے بھیجا ہے کہ وہ نیکی کا راستہ اختیار کرتا ہے یا نہیں؟ اللہ کی عبادت کرتا ہے یا نہیں؟ اس کے حکموں پر چلتا ہے یا نہیں؟ اگر انسان یہ ثابت کر دے کہ ہم بات نہیں مانیں گے اور اپنی خواہش پر چلیں گے، تو اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں کہ انسان زمین پر رہے، اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ قیامت اس وقت آئے گی جب روئے زمین پر اللہ کا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہ جائے گا۔'' (احتسابِ زندگی: ۴۸-۴۹)

ایک دور اندیش، بلند اخلاق اور اعلیٰ ظرف شخصیت

مفتی رحمت اللہ ندوی
(استاد حدیث وفقہ دار العلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

یوں تو دنیا میں آنے جانے کا سلسلہ روز ازل اور تخلیق انسان کے بعد ہی سے جاری وساری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا، لیکن ماضی قریب کے چند سالوں میں اس کی رفتار کچھ تیز ہوگئی ہے اور ہر چند ماہ بعد اپنے اساتذہ، بزرگوں اور اہل تعلق میں سے کسی نہ کسی کی رحلت کے صدمہ سے دو چار ہونا پڑتا ہے اور داغ مفارقت سے دل چھلنی ہوا جاتا ہے۔ کسی کا انتقال کوئی نئی اور تعجب خیز بات نہیں ہے، البتہ افسوس ناک ضرور ہے، لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ کسی اہم اور بھاری بھرکم شخصیت کے چلے جانے سے ناقابل تلافی نقصان اور نہ پر ہونے والا خلا پیدا ہو جاتا ہے جس کی بھرپائی آسان نہیں ہوتی۔

ایسا بھی نہیں کہ صلاحیت مند اور لائق افراد نہیں ہیں، ہیں! لیکن باوزن شخصیات نہیں ہیں۔ کہتے ہیں کہ ''قدر نعمت بعد از زوال''

ہم لوگ بھی کسی شخصیت کی قدر اس کے جانے کے بعد کرتے ہیں۔

انسان کی اصل شناخت اور اس کا حقیقی جوہر مال ومنصب اور عہدہ ودولت نہیں، اگر چہ آج کل معیار اور پیمانہ بدل گیا ہے اور ان دونوں ہی کو اصل سمجھ لیا گیا ہے۔ جب کہ انسان کا حقیقی جوہر اور اصل پہچان اس کی انسانیت، اخلاق، کردار، سیرت، شرافت ونجابت اور سلوک وبرتاؤ ہے۔ کسی کے جانے کے بعد اس کی خوبیاں، اچھائیاں، کارنامے اور کمالات ہی اس کو زندہ رکھتے ہیں۔

تمہاری خوبیاں زندہ تمہاری نیکیاں باقی

۲۱ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳ اپریل ۲۰۲۳ء کی تاریخ تھی، جمعرات کا دن اور سہ پہر کا وقت تھا، آرام کے لیے بس آنکھ لگی ہی تھی کہ موبائل فون کی گھنٹی بجی اور فون کرنے والے نے بہت ہی احتیاط کے ساتھ پوچھا کہ کیا ندوہ میں کچھ ہوا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ آپ پوچھنا کیا چاہتے ہیں؟ تو فون کرنے والے نے کہا: سوشل میڈیا پر حضرت ناظم صاحب کے انتقال کی خبر گردش کر رہی ہے۔ جب میں نے واٹس ایپ کھولا تو واقعی یہی بات تھی۔ مزید اطمینان اور تحقیق کے لیے ایک استاد کو فون کیا تو انھوں نے تصدیق کر دی، دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! پڑھ کر تیزی سے مہمان خانہ گیا اور آخری زیارت کی۔ تھوڑی ہی دیر میں وہاں اساتذہ، ملازمین اور اہل تعلق کی بھیڑ لگ گئی، سب صدمے میں تھے اور سب کی عجیب حالت وکیفیت تھی، پوری فضا سوگوار اور ماحول اداس تھا، جو جہاں تھا بالکل ساکت وساکن، ایسا لگ رہا تھا کہ سب لٹے پٹے ہیں۔

کارواں تو ہے لیکن ''میر کارواں'' نہیں ہے، چمن ہے لیکن اس کا مالی نہیں ہے، باغ تو ہے لیکن باغباں جاتا رہا۔ استاد محترم سے متعلق بہت سی یادیں اور باتیں ہیں، بہت سے تاثرات اور نقوش ہیں، لیکن سب کو قلم بند کرنا ممکن نہیں، اس لیے چند ہی باتیں تحریر کی جا رہی ہیں۔

استاد محترم سے پڑھنے اور کسب فیض کرنے کا موقع عالمیت کے آخری سال عالیہ رابعہ میں ملا، تین سیکشن تھے اور سب کو سینچر اور اتوار کو اجتماعی طور پر آخری گھنٹے میں اپنی کتاب ''الادب العربی'' پڑھاتے تھے، اس وقت آپ ہی منصب اہتمام پر فائز تھے، ہفتہ میں دو یوم کا یہ اجتماعی نظام اس لیے بنایا گیا تھا، تاکہ سب کو شرف تلمذ حاصل ہو جائے، کیوں کہ طلبہ کی بڑی تعداد عالمیت کر کے اپنی زندگی کا رخ بدل دیتی ہے، بعض عصری تعلیم میں لگ جاتے ہیں، بعض تدریس سے وابستہ ہو جاتے، تو بعض تلاش معاش میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ جب کہ تھوڑی تعداد فضیلت میں داخل ہوتی۔

اتفاق سے اس سال ڈاکٹر عبدالحلیم ندوی مؤلف ''تاریخ ادب

عربی‘‘ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی سے ریٹائر ہوکر کچھ وقت ندوہ میں گزارنے اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے فیضیاب ہونے آئے تھے، مہتمم صاحب (مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی) نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے اپنا یہ گھنٹہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کے حوالہ کردیا، تاکہ تدریس میں ان کا وقت بسر ہو اور طلبہ کو بھی فائدہ پہنچے، یہ حسن انتظام اور مہمان نوازی کی دلیل ہے۔ یہ واقعہ ہے ۱۹۹۷ء کا ہے۔

علیا ثانیہ شریعہ (فضیلت دوم) میں ’’معلقات سبعہ‘‘ میں امرء القیس کا معلقہ پڑھنے کا موقع ملا، جو اشعار نامناسب ہوتے اور ان میں عریانیت ہوتی، ان کو ترک کرکے آگے گزر جاتے اور کہتے ان کو آپ لوگ حل کرلیجیے گا۔

انداز تدریس بڑا دلکش تھا، افہام وتفہیم کی صلاحیت بھرپور تھی۔ طرز تدریس پر تفصیلی گفتگو کا یہ موقع نہیں، کسی دوسری تحریر میں۔

گزشتہ سال ۲۳-۲۴ر نومبر مجلس تحقیقات شرعیہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کا دوروزہ سیمینار ہوا، جو مجلس کے قیام کے نصف صدی سے زائد کے بعد اپنی نوعیت کا پہلا سیمینار تھا، آپ ہی کی سرپرستی اور صدارت میں ہوا، اگرچہ اپنی پیرانہ سالی اور ضعف کی وجہ سے کسی نشست میں شرکت نہ فرما سکے، لیکن افتتاحی نشست کے لیے جو صدارتی کلمات تحریر فرمائے، وہ بہت جامع، طاقتور اور وقیع تھے۔

پروگرام ختم ہونے کے چند دن بعد مجلس تحقیقات شرعیہ کی مطبوعات پیش کرنے اور پروگرام کی صورت حال سے مطلع کرنے کے لیے استاد محترم مفتی عتیق احمد بستوی صاحب اور برادرم مفتی محمد مسعود حسن حسنی ندوی کے ساتھ خدمت میں حاضری ہوئی، مفتی عتیق احمد بستوی صاحب نے پروگرام کی تفصیل بتائی، اس کے ساتھ میرا تعارف کرایا تو برجستہ فرمایا: ’’ان کو جانتا ہوں، ان کا نام اور ذکر آتا ہے لیکن یہ خود نہیں آتے۔‘‘

یہ سن کر مجھے اپنی کوتاہی پر افسوس ہوا اور خجالت بھی، کیوں کہ میں ملاقات میں متساہل واقع ہوا ہوں۔ کیا خبر تھی کہ یہ میری حضرت والا سے آخری ملاقات ثابت ہوگی۔ اللّٰھم اغفر له وارحمه.

آپ کے اندر بہت سی خوبیاں تھیں، آپ بڑے بااخلاق اور بلند کردار انسان تھے، خاندانی شرافت اور نجابت کا وافر حصہ عطا ہوا تھا، مروت زیادہ تھی اور ایک دوسرے کا پاس ولحاظ بہت تھا، تعلقات کو نبھانا کوئی ان سے سیکھے، آج کل تو یہ حال ہے کہ

نئے جب یار ملتے ہیں پرانے بھول جاتے ہیں

تعلق نبھانا کوئی آسان کام نہیں، اچھے اچھے اس معاملہ میں کچے ہوتے ہیں۔

آپ میں تواضع وانکساری بے حد تھی، اس کا اندازہ ہر ملنے والے کو تو ہے ہی، مزید ایک نمونہ اس وقت سامنے آیا جب امام حرمین شیخ خالد بن علی الغامدی ۲۰۱۲ء میں لکھنؤ تشریف لائے اور ان کے استقبال میں ایک نشست ندوہ کی مسجد میں رکھی گئی، جب آپ کی تعریف وتوصیف ہونے لگی تو سر اتنا جھکا لیا کہ سامنے میز سے جا لگا، میں بھی اس منظر کے عینی شاہدین میں سے ہوں۔

یہ دیکھ کر فتح مکہ کے موقع پر حضور اکرم ﷺ کے مکہ مکرمہ میں عاجزانہ داخلہ کا واقعہ یاد آگیا، جبکہ آپ کا سر اونٹنی کے کجاوہ سے جا لگا تھا۔ سچ ہے:

جو اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملتے ہیں
صراحی سرنگوں ہوکر بھرا کرتی ہے پیمانے

یہ بھی حقیقت ہے کہ پھل دار درخت لچک دار ہوتا ہے، جب کہ شجر بے ثمر تنا کھڑا رہتا ہے، سمندر پرسکون اور دریا پرشور ہوتا ہے:

کہہ رہا تھا شور دریا سے سمندر کا سکون
جس میں جتنا ظرف ہے، اتنا ہی وہ خاموش ہے

صبر وتحمل اور قوت وبرداشت کا مادہ اتنا تھا کہ اس کی نظیر ملنی مشکل ہے، ندوہ جیسے عالمی ادارہ کی نظامت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت کے طویل عرصہ میں نہ معلوم کتنے ناخوش گوار واقعات اور ناقابل تحمل حالات پیش آئے، لیکن صبر وضبط کا دامن نہیں چھوٹا۔ خاندان کے نہ معلوم کتنے عزیز، بزرگ اور خورد دنیا سے رخصت ہوگئے، کتنے ہر دل عزیز تلامذہ رحلت کرگئے، لیکن سب انگیز کرگئے، زبان سے کسی تکلیف کا اظہار نہ کیا۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ اپنے برادر خورد مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی سے جو تعلق ومحبت کا رشتہ تھا، آج کل دو بھائیوں کے باہمی تعلق کی ایسی مثال نہیں ملے گی۔ کبھی یہ خیال آتا تھا کہ اگر دونوں بھائیوں میں ایک کی وفات ہوگئی تو دوسرے پر کیا بیتے گی اور وہ کس طرح صبر کرے گا؟ اللہ تعالیٰ کی مرضی کہ چھوٹے بھائی کا انتقال پہلے ہوا، رنج والم کا کیا پہاڑ ٹوٹا ہوگا؟! لیکن بعض تعزیت کرنے والوں کا بیان ہے کہ آپ تعزیت کرنے والے کی تعزیت کرتے اور تسلی دیتے۔ یہ کوئی اللہ کا ولی اور برگزیدہ ہی کرسکتا ہے۔

حسن انتظام کی صلاحیت بھی بہت اچھی تھی، ایک بڑے ادارہ اور اس کے اساتذہ وطلبہ کے مختلف مسائل پھر سب کو ساتھ لے کر چلنا اور ہر طرح کے مسائل حل کرنا کوئی معمولی بات اور آسان کام نہیں ہوتا ہے، لیکن آپ نے اپنے تدبر، تدبیر، دور اندیشی اور حسن انتظام سے ایسا کر دکھایا۔

نظام الاوقات پر گہری نگاہ ڈالتے، گھنٹے لگانے اور کتابوں کا تعین کرنے میں سینئر جونیئر کا فرق ملحوظ رکھتے، اساتذہ کے ذوق اور تخصص کا خیال کرتے، ترقی بالتدریج دیتے، اس لیے نہ کسی کی حق تلفی ہوتی اور نہ کوئی شکوہ۔

آپ حزم واحتیاط میں طاق اور بے مثال تھے، زبان وقلم کے استعمال میں غایت درجہ محتاط تھے، جب کہ بڑے بڑے ذی علم جوش وخروش میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ بعد میں معذرت خواہی کرنی اور صفائی دینی پڑتی ہے، بعض اہل علم وقت بے وقت اور ضرورت وبلاضرورت بولنے اور لکھنے کو اپنا کمال یا قابلیت سمجھتے ہیں اور اس کا خیال نہیں رہتا کہ ہماری تقریر وتحریر کا کیا اثر ہوگا اور کیا نتیجہ نکلے گا؟ لیکن آپ زبان وقلم کا استعمال بہت محتاط طریقے سے کرتے، اگر کبھی اخباری بیان دینا پڑ گیا تو بقدر ضرورت مختصر اور جامع بیان دیتے۔

دہلی کے ایک سفر پر میری ملاقات ایک سرکاری مسلم افسر سے ہوئی جو محکمہ تفتیش میں کام کرتے ہیں، انھوں نے بیان کیا کہ میں نے بڑے بڑے علماء کے بیانات کا جائزہ لیا ہے، لیکن مولانا محمد رابع حسنی ندوی سے بڑھ کر محتاط کسی کو نہیں پایا، ان کی کسی تقریر یا تحریر پر کوئی گرفت نہیں ہوسکتی۔

آپ کوئی فیصلہ یا کوئی مشورہ بغیر شرحِ صدر کے نہ دیتے، خواہ کچھ تاخیر ہی کیوں نہ ہو۔ آپ نے اساتذہ کی میٹنگ میں طلبہ کی تعلیم وتربیت پر گفتگو کرتے ہوئے کئی بار اپنا یہ واقعہ سنایا کہ ماموں جان (حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) تربیت کے سلسلے میں ہم پر گہری نظر رکھتے، اگر ہم نے نماز کہیں اور پڑھ لی تو سوال کرتے اور دوبارہ اپنے سامنے پڑھواتے اور تاکید کرتے کہ نماز ہمارے ساتھ ہی پڑھنی ہے۔ یہ بھی بتایا کہ حماسہ پڑھاتے ہوئے غلط عبارت پڑھنے پر ڈانٹ دیتے اور ناراض ہوجاتے کہ ہم رونے لگتے۔

تعلیم حاصل کرنے کے لیے محنت ومشقت بہت کی، جب ندوہ کے ''ادیب اول'' کا منصب ملا تو کتب خانہ علامہ شبلی نعمانی میں موجود ادب کا پورا ذخیرہ پڑھ گئے اور مطالعہ میں اتنا انہماک تھا کہ راحت وآرام بھول گئے، حتی کہ یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں دماغ پر اثر نہ پڑ جائے۔

یہ رتبہ بلند جسے ملنا تھا مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ بزرگوں کی ابتدا دیکھو انتہا نہیں، انتہا تو پھل توڑنے اور کھانے کا وقت ہوتا ہے، شروع میں جو محنت ومجاہدہ کیا ہے، اسی کا ثمرہ آخر میں ملتا ہے۔

استاد محترم کی زندگی بھی قابل رشک گزری اور موت بھی قابل صد رشک ہوئی، پوری زندگی جو تقریباً ایک صدی پر محیط ہے، تعلیم وتربیت، ملک وقوم کی خدمت اور اچھے کاموں اور بڑے کارناموں میں بسر ہوئی، ایسے شخص کے لیے حدیث شریف میں بشارت ہے جس کی عمر طویل ہو اور نیکیوں میں زندگی صرف ہو۔

وفات رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں شب قدر کو ہوئی، بہرحال آپ کی وفات سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا۔ اللہ کامل مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے اور اپنی شایان شان بدلہ اور صلہ دے۔

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم

ڈاکٹر مہدی حسن خان ندوی
(استاذ معہد الفردوس الرحمانی۔لکھنؤ)

۲۱؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ء کو روضہ والی مسجد صدر بازار ضلع مئو میں بعد نماز عصر تلاوت قرآن مجید میں مشغول تھا کہ اسی دوران پہلے کچھ واٹس ایپ پر میسج آئے اور پھر موبائل پر گھنٹی بجی اور دوسری طرف سے فون کرنے والے نے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کا انتقال ہوگیا ہے۔اول وہلہ میں تو یقین ہی نہیں ہوا کہ ابھی رمضان سے ایک روز پہلے ہی تکیہ کلاں رائے بریلی میں حضرت مولانا سے ملاقات ہوئی تھی، تو وہ بالکل ٹھیک لگ رہے تھے اور میرے اپنے خیال کے مطابق پوری طرح صحت مند تھے اور مولانا نے خاکسار کی کتاب ''حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے سیاسی خطوط'' کا اپنے دست مبارک سے اجرا کیا تھا اور اس کتاب کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے تھے۔ اتنے ہی دنوں میں ایسا کیا ہوگیا کہ حضرت کا انتقال ہوگیا، لیکن یہ بات مسلم ہے کہ موت کا وقت متعین ہے، جس وقت اور جہاں موت آنی ہوگی آجائے گی۔

حضرت مولاناؒ کو بہت قریب سے دیکھنے اور مصافحہ کرنے کا موقع تو الحمدللہ کئی بار ملا تھا، لیکن مولانا کے ساتھ کھانا کھانے کا شرف کبھی حاصل نہیں ہوا تھا، الحمد للہ حضرت کے ساتھ کھانا کھایا اور حضرت کو جی بھر کر دیکھا، یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی کرم تھا ورنہ ہم نے تو کبھی خوابوں میں بھی نہیں سوچا تھا کہ حضرت کے ساتھ کبھی کھانا کھانے کا موقع نصیب ہوگا، لیکن اللہ جب نوازنے پر آتا ہے تو خوب نوازتا ہے، "ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء" (یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے نوازتا ہے) اس کے لیے ہم اپنے محسن وکرم فرما جناب مولانا جعفر مسعود حسنی دامت برکاتہم کے شکرگزار ہیں کہ انھوں نے ہم پر اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ہے کہ جس کو ہم تاحیات کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اللہ رب العزت انہیں اس کا بہترین اجر دونوں جہان میں عطا فرمائے، یہ سب ان کی محبتوں اور کاوشوں سے ہی ممکن ہوسکا، کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

ایسا لگتا تھا کہ یہ دن دلی تمناؤں کی تکمیل کا دن تھا، جتنا سوچا تھا اس سے کہیں زیادہ پایا، ساتھ میں میرے بڑے بیٹے سیف حسن خان متعلم تخصص فی علوم الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء بھی تھے۔ مولانا نے ہمارے اور ہمارے بیٹے سیف حسن خان کے سر پر دست شفقت پھیرا اور خوب دعاؤں سے نوازا۔

افسوس! حضرت کے انتقال کے وقت مئو میں تھا، دل بس یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اُڑ کر پہنچ جاؤں اور حضرت کے جنازہ میں شریک ہوجاؤں، کاش ایسا ہوگیا ہوتا، لیکن اسی وقت سوچ لیا تھا کہ جیسے ہی لکھنؤ میں قدم رکھوں گا سب سے پہلے رائے بریلی جاؤں گا اور حضرت ناظر عام صاحب دامت برکاتہم اور مولانا جعفر مسعود حسنی صاحب سے ملاقات کروں گا اور حسب ارادہ لکھنؤ پہنچ کر رائے بریلی کا سفر کیا اور وہاں پہنچ کر اپنے محسن وکرم فرما جناب مولانا جعفر مسعود حسنی دامت برکاتہم کو فون کیا، مولانا نے کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے بخار ہے، آپ مولانا بلال صاحب سے ملاقات کر لیجیے، مولانا مسجد میں ہیں، میں مسجد میں داخل ہوا تو مولانا کو بیان

کرتے ہوئے پایا، مولانا کے بیان سے مستفید ہوا۔ جب مولانا بیان سے فارغ ہوئے تو مولانا سے ملاقات ہوئی، مولانا نے خوب محبتوں سے نوازا اور میرا ارادہ دریافت کیا، میں نے عرض کیا کہ واپسی کا ارادہ ہے، چونکہ مدرسہ بورڈ کے امتحانات کی تیاریاں چل رہی تھیں اور اس کی بعض اہم ذمہ داریاں خاکسار کے سپرد تھیں، اس لیے واپس آنے پر مجبور تھا ورنہ ضرور ٹھہر جاتا۔

یقیناً حضرت مولانا کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، آپ کے متعلق کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے، آپ اہل حق اور اہل دل علماء کی فہرست میں سب سے اونچا مقام رکھتے ہیں، آپ نے بچپن ہی سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کی آغوش تربیت میں نشو ونما پائی اور سفر وحضر میں حضرت کے ساتھ رہے۔ ندوۃ العلماء اور دوسرے اداروں اور تحریکوں کے مشیر خاص اور معاون رہے، حضرتؒ کو ان پر جتنا اعتماد تھا وہ دوسری کسی شخصیت کو حاصل نہیں تھا۔

حضرت مولانا عبداللہ عباس ندوی صاحب' حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کی بہت ہی اہم کتاب ''مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ عہد ساز شخصیت مشاہدات وتجربات کی روشنی میں'' کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''مجھے بعض مرتبہ یہ خیال آیا کہ مولانا رابع میاں خود حضرت مولاناؒ کی تصویر ہیں اور تصویر مجسم ہیں، صورت شکل بھی حضرت سے مل گئی ہے۔ خیر یہ بات اس لیے بھی ہے کہ وہ ان کے حقیقی بھانجے ہیں اور ایک خون کے دو پیکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ پر جو انعامات خصوصی فرمائے ہیں ان میں یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بخشش کا نمونہ ہے کہ حضرت مولاناؒ کو ایسا جانشین دیا جو بلانزاع ان کا آئینہ ہے، مولانا رابع حسنی نے مولانا کے نظریۂ تعلیم کو نہ صرف سمجھا بلکہ اس کو اپنے اندر جذب کرلیا ہے اور یہی حال مولانا محمد الحسنی مرحوم کا ہے، یہ دونوں اس لحاظ سے ممتاز ہیں کہ انہوں نے صرف معلومات نہیں حاصل کی ہیں، نظریہ کو پی لیا ہے، اپنے اندر جذب کرلیا ہے، وہ خود ایسی آنکھ بن گئے ہیں جس سے مولاناؒ دیکھا کرتے تھے اور یہ ان کے خاندان کی خصوصیت بھی ہے۔

حضرت مولانا عبداللہ عباس ندویؒ کے ان فرمودات سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کی شخصیت کتنی عظیم تھی اور کتنی اہمیت کی حامل تھی اور کیوں نہ ہو مولانا جس گھرانے کے چشم وچراغ تھے، وہ سینکڑوں سال سے مسلسل مذہب واخلاق، رُشد وہدایت، تصنیف وتالیف اور زبان وادب کا گہوارہ رہا ہے۔

مولانا سید محمد رابع ندوی ضلع رائے بریلی کے موضع تکیہ کلاں میں ۱۹۲۹ء کو پیدا ہوئے۔ رائے بریلی شہر سے مغرب کی جانب تقریباً ۴-۳ر کلومیٹر کے فاصلے پر سئی ندی کے بائیں کنارے پر شہر کی آبادی تکیہ کلاں یا دائرہ شاہ علم اللہ ہے۔ لب دریا ایک مسجد ہے جس کے سامنے ایک حظیرہ ہے، یہ روضہ شاہ علم اللہ ہے جن کے نام سے یہ بستی موسوم ہے۔ شاہ علم اللہ گیارہویں صدی ہجری کے وسط میں ترک وطن کے بعد نصیر آباد سے یہاں آئے تھے، انہی بزرگ کے ہاتھوں اس بستی کا پہلا مکان ۱۰۵۰ھ میں اور مسجد کی تعمیر ۱۰۸۴ھ میں عمل میں آئی۔ اسی دائرہ شاہ علم اللہ کی فضاؤں میں سید احمد شہیدؒ پروان چڑھے اور جہاں سے انھوں نے قوم کی اخلاقی ودینی اصلاح کی جد وجہد شروع کی، غیر ملکی باطل طاقتوں سے ملک وقوم کو آزاد کرانے کے لیے علم جہاد بلند کیا، حضرت مولانا حکیم سید عبدالحی اور مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندویؒ کے شب وروز بھی اسی کی فضاؤں میں گزرے تھے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی طرح مولانا محمد رابع حسنیؒ کی بھی فکری ونظریاتی خصوصیات میں اصلاح باطن اور تزکیہ نفس کا خصوصی امتزاج تھا، جو ان کے زمانہ کے اہل حق اور اہل دل بزرگوں سے ربط اور تزکیہ باطن کے حاملین سے تعلق واستفادہ کے اثر سے وجود پذیر ہوا تھا، مولاناؒ کے اس پہلو نے ان میں زہد فی الدنیا' تصور آخرت اور استغناء وقناعت کے غلبہ جیسی صفات پیدا کیں، ان کے اثر سے مولاناؒ کے متعلقین میں مولانا سے محبت وعقیدت میں اضافہ ہوا اور

کام میں اثر پذیری بڑھی اور بڑھتی چلی گئی اور اس طرح ان کے کاموں اور کاوشوں کو مقبولیت نصیب ہوئی۔

مولانا کی وفات یقیناً پوری ملت اسلامیہ کے لیے ایک بڑا خسارہ ہے، مولانا کی ذات صبر واستقامت اور حلم وبردباری میں ایک امتیازی حیثیت کی حامل تھی، مسلم پرسنل لا بورڈ اور ندوۃ العلماء کے مشکل سے مشکل مسائل کا حل مثبت انداز میں پیش کرتے، اس سے آپ کی بصیرت افروز قیادت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ مولانا اپنے آپ میں ایک انجمن تھے، ملک کے ہر مکتب فکر کے اہل علم ودانش آپ کے افکار وخیالات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور سر تسلیم خم کرتے تھے جو مزاج یار میں آئے۔

اسی رمضان کے مبارک مہینہ میں علی میاںؒ کا بھی انتقال ہوا تھا اور اسی مہینہ میں حضرت مولانا کا بھی انتقال ہوا، حضرت حسن واخلاق کے پیکر تھے اور قوم وملت کے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھتے تھے اور ان کی رشد وہدایت کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ افسوس صد افسوس حضرت ہمارے بیچ نہیں رہے، لیکن حضرت ہمارے دلوں میں آج بھی زندہ ہیں اور کل بھی زندہ رہیں گے۔ ان کے ساتھ دوران درس گزارا ایک ایک لمحہ نظروں میں ہے، آپ کی پیار بھری باتیں اور آپ کا طریقہ تدریس کون بھلا سکتا ہے۔ حضرت ہمارے بیچ نہیں رہے یقین نہیں ہوتا ہے، یقین ہونے میں ایک زمانہ لگے گا۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل عطا کرے اور حضرت کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

شاعر شاد عظیم آبادی نے کیا خوب کہا ہے:

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
جو یاد نہ آئے بھول کے پھر اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

شریعت اسلامیہ کی اہمیت اور یونی فارم سول کوڈ کا مسئلہ

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

”جہاں تک اسلامی شریعت کی اہمیت کی بات ہے، تو وہ مسلمانوں کے لیے ویسی ہی لازم اور ضروری ہے جیسے ان کا عقیدہ، شریعت میں تبدیلی کرنے یا تبدیلی کو صحیح سمجھنے کے بعد مسلمان مسلمان نہیں رہتا، اس طرح شریعت کی تبدیلی مسلمان کے لیے گویا مذہب کی تبدیلی ہے، اس لیے مسلمانوں نے ہمیشہ اپنی شریعت کی حفاظت کے لیے پورے عزم وہمت کا ثبوت دیا ہے، جیسا کہ مطلقہ کے نان نفقہ کے مسئلہ میں پیش آیا تھا اور مسلمانوں نے متحد ہوکر اس کے خلاف آواز اٹھائی اور پارلیمنٹ کے ارکان کو سمجھایا، وزیر اعظم نے اہمیت کو تسلیم کرکے قانون بنا کر مسلمانوں کو مستثنیٰ کیا، یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ مسلمانوں کو اسلامی شریعت کا ماننا ویسا ہی ضروری ہے جیسا اپنے مذہب کو ماننا، شریعت میں تبدیلی کو تسلیم کرنا مذہب کو تبدیل کرلینے کی طرح کا عمل قرار پاتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو پوری صراحت کے ساتھ قرآن مجید میں ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اللہ کے رسول کے دیے ہوئے احکام کی پیروی کریں اور جن باتوں سے انہوں نے منع کیا ہے ان سے باز رہیں۔

قرآن اور نبی ﷺ کے فرمانوں اور فیصلوں میں یہ احکام ملتے ہیں ان کو ماننا مسلمان ہونا ہے اور ان کا انکار کرنا یا بدل دینا اپنے کو اسلام سے خارج کردینا ہے، اس لیے مسلمانوں کو اپنی شریعت اسلامی کو قائم رکھنے اور تبدیلی نہ ہونے دینے پر اصرار ہے، کیونکہ یہ مسئلہ ان کے مسلمان نہ رہنے کا بن جاتا ہے۔ ہندوستان کا دستور ہندوستانی عوام کا دستور ہے، ان میں ہندو بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں، سکھ بھی ہیں، عیسائی بھی ہیں، جینی بھی ہیں، بدھسٹ بھی ہیں۔ دستور میں اپنے مذہب کے مطابق زندگی گذارنے کا حق سب کا تسلیم کیا گیا ہے اور یونی فارم سول کوڈ کی ضرورت بھی بتائی گئی ہے، لیکن سب کے مذہبی حق کو بھی تسلیم کیا گیا ہے، لہٰذا یونی فارم سول کوڈ اس حق کو ختم کرکے نہیں ہوسکتا۔ اس کا لحاظ کرکے ہوسکتا ہے۔“ (مسلمانوں کا عائلی قانون؛ مخالفت اور موافقت کی روشنی میں: ۷-۱۰)

متاعِ دین ودانش

محمد نفیس خاں ندوی
(دارعرفات، تکیہ کلاں-رائے بریلی)

اخلاص وتواضع کے سوز اور للّٰہیت وفنائیت کے ساز سے مل کر جو چیز بنتی ہے یا دوسرے لفظوں میں ابر نیساں کی بخشش بلکہ جلال و جمال کے حسین امتزاج سے جو موتی ڈھل کر سامنے آتا ہے اس گوہر آبدار کو محبوب ملت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کہتے ہیں، آپ کا نام نامی زبان پر آتے ہی ایک صوفی ثقہ، مرشد روحانی، ماہر ادبیات ونصابیات اور جامع علوم شرعیہ کا تصور ذہن میں آجاتا ہے ،اور نگاہوں کے سامنے ایک ایسا وجود جھلملانے لگتا ہے جس کی زندگی دین سے وفاداری، قرآن کریم سے وابستگی، سنت نبوی سے شیفتگی، اسلام کو سربلند دیکھنے کی تڑپ اور امت مسلمہ کی عزت وآبرو باقی رہنے کی آرزو سے عبارت تھی۔

آپ اس دور کی عظیم اسلامی شخصیات پر نظر ڈالیے، آپ کو بہت سے علماء ومصنفین مل جائیں گے، صوفی باصفا مل جائیں گے، میدان کار کے سیاسی قائدین اور مصلحین مل جائیں گے، عظیم روحانی شخصیتیں بھی مل جائیں گی لیکن کسی شخصیت میں ان تمام خصوصیات کا اجماع آپ کو نہیں ملے گا، اگر آپ ان تمام خصوصیات کی جامع شخصیت کا انتخاب کرنا چاہیں تو لامحالہ آپ کی تمامتر کوششیں حضرت مولانا پر ہی آکر تمام ہوں گی۔

حضرت مولانا سیکڑوں استادوں کے استاد، بڑے بڑے مرشدین کاملین کے مرشد اور بہتیرے قومی لیڈروں کے مربی وراہنما تھے، آپ اسلاف کی وہ یادگار تھے جن کو دیکھ کر ٹوٹتے ہوئے حوصلے مضبوط ہوتے اور ہمتیں جواں ہوتی تھیں، عالم اسلام کی زبوں حالی، مسلمانوں کی عام پستی اور اخلاقی گراوٹ دیکھ کر جو احساس نامرادی ودل شکستگی پیدا ہوتی وہ چند لمحوں کے لیے ختم ہوجاتی اور یہ احساس ہوتا کہ اللہ تعالیٰ جب تک ایسے بندوں کو پیدا کررہا ہے مسلمانوں کو مایوس ہونے یا حالات کے سامنے سپر ڈالنے کی بالکل ضرورت نہیں۔ آپ کے نقش حیات کا ایک ایک صفحہ عظمت کی بارگاہ ہے، حق بات تو یہ ہے کہ آپ اس وقت دنیائے اسلام کے سب سے بڑے دینی وروحانی بزرگ تھے۔

رائے بریلی کے سادات قطبی جن کی اولاد میں حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ علم اللہؒ پیدا ہوئے ہیں اسی کی ایک شاخ پر ثمر میں فرشتہ خصائل جناب الحاج سید رشید احمدؒ بھی گذرے ہیں جن سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی ہمشیرہ منسوب تھیں، جن کی ذات نبوی ﷺ سے عشق ووابستگی کا یہ اثر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں پانچ اولادیں دیں اور انھوں نے پانچوں کا نام ''محمد'' رکھا، حضرت مولانا انہیں پانچ بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے اور ''محمد الرابع'' کے نام سے مشہور ہوئے۔

حضرت مولانا کی پوری زندگی پر ''محمد'' نام نامی کے حسین اثرات صاف دیکھے جاسکتے ہیں، آپ کی شخصیت میں سوز ومستی اور جذب وشوق کی کیفیت تھی، ذات نبوی سے والہانہ تعلق آپ کی شخصیت کی پہچان تھی، جب کبھی نام محمد ﷺ آجاتا تو آپ کی کیفیت بدل جاتی، آنکھیں نم ہوجاتیں، اور محبت ووارفتگی کے جذبات ظاہر ہونے لگتے، سیرت نبوی ﷺ پر آپ کے قلم سے جو تحریریں سامنے آئیں وہ اسی محبت وفدائیت کا عکس جمیل ہے۔ ''رہبر انسانیت (ﷺ)'' جیسی معرکہ آراء کتاب کا قلم کو خون جگر میں ڈبوئے بغیر

وجود میں آنا ممکن نہ تھا، اس کتاب کی انقلاب آفرینی، اثر پذیری ودل آویزی اور قبول عام اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے مصنف کو بادۂ عشق رسولؐ سے حصہ وافر نصیب ہوا تھا۔

سچ تو یہ ہے کہ عشق نبوی حضرت مولانا کے ضمیر وخمیر میں داخل تھا، سنت نبوی کو اگر کوئی زندہ شکل میں دیکھنا چاہتا تو حضرت کی روحانی رفتار وگفتار کا مشاہدہ اس کے لیے کافی تھا، چند دن آپ کی صحبت میں گذارتا تو اسے معلوم ہوجاتا کہ اولیاء اللہ کا انداز نشست وبرخاست اور طریق بود وباش کیسا ہوتا ہے، عشق نبوی کس طرح گفتار وکردار میں جھلکتا ہے، کس طرح ایک روح دین محمدیؐ کی سربلندی کے لیے بے قرار رہتی ہے، اور کس طرح اللہ اپنے محبوب بندوں کو بے سروسامانی کے باجود نوازتا ہے اور مقبولیت ومحبوبیت کا تاج اس کے سر پر رکھ دیتا ہے!

یہ کیسے ممکن ہے کہ عشق نبوی میں پروان چڑھی شخصیت کی زندگی میں اسوہ رسول ﷺ کی پاسداری نہ ہو، کیا یہ ممکن ہے کہ جس گھرانہ میں قال اللہ وقال الرسول کی صدائیں گونجتی ہوں وہاں کسی کا دل دکھایا جائے یا کسی کی حق تلفی کی جائے؟! بغیر کسی مبالغہ کے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ حضرت مولانا اخلاق رسول کا حسین پرتو تھے، سادگی و وضع داری کے پیکر، اخلاص وللّٰہیت کے سراپا مجسم تھے، شرافت و خودداری، تواضع، انکسار اور ملنساری آپ کی خاص پہچان تھی، جب بھی ملتے 'خنداں پیشانی سے ملتے، اپنائیت وخلوص اور محبت کا اظہار فرماتے، اہل تعلق واہل شناسا کی خبر گیری کرتے، بیواؤں کی مالی امداد کرتے، ضرورتمندوں کے احوال معلوم کرتے اور ان کے لیے ماہانہ تعاون مقرر فرماتے، ماتحتی میں کام کرنے والوں کے حالات دریافت کرتے، بعض مرحوم مدرسین کے پسماندگان کا تکفل بھی کرتے، مولانا کے ذہن میں حاجت مندوں کی ایک فہرست ہوا کرتی تھی جن کی ان کو مسلسل فکر رہتی تھی۔ آپ نرم مزاج، کرم گستر اور بلند اخلاق کے مالک تھے، ملت کے لیے تڑپنے اور امت کے غم میں گھلنے والا دل آپ کو ودیعت ہوا تھا اور تمام اوصاف وخصوصیات میں اتباع سنت اور اخلاص وللّٰہیت آپ کی زندگی کا بہترین زیور ہے۔

اگر ایک طرف بڑے بڑے سیاسی وسماجی لیڈر آپ سے مشورے لیتے تھے اور آپ کے تعاون پر فخر کرتے تھے تو دوسری طرف آپ عظیم روحانی رہنما ومرشد کامل بھی تھے۔ خدائے پاک کی صفت جمال کی تجلی آپ پر عیاں تھی، آپ کی ذات قوم وملت اور وابستگان تربیت کے لیے رحمت حق کا رمز تھی۔ آپ خدا کے سچے بندہ اور ولی کامل تھے، یہ سچ ہے کہ کسی کی ولایت کی شہادت وہی دے سکتا ہے اور اسی کو دینا بھی چاہیے جو خود اس راہ کا سالک اور اس مقام پر فائز ہو، لیکن جب ولی کی صفات اتنی جلی ہوجائیں کہ محروم بینائی بھی تماشائی بن جائے تو اس کی لب کشائی کو بے جا اور اس کی گواہی کو مبالغہ آرائی سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔

ایک خدا رسیدہ بندہ کی معراج یہی ہے کہ وہ نہ لوگوں کی مدح خوانی سے متاثر ہو نہ ان کے سب وشتم سے دل گیر ہو، اگر دنیا اس کے قدموں آجائے تو اس کے احساس بندگی و بے مائیگی پر غرور کی پرچھائیں نہ پڑے اور اگر ساری دنیا اس سے منہ موڑ لے تو اللہ کی معیت ونصرت میں خود کو تنہا نہ محسوس کرے، جو لوگ حضرت مولانا کو قریب سے جانتے ہیں وہ گواہی دیں گے کہ حضرت ان اوصاف کے بہترین حامل تھے، یہی وجہ ہے کہ آپ کے عقیدت مندوں میں جہاں عامۃ الناس شامل ہیں وہیں بڑے بڑے اولیاء، شریعت وطریقت کے شہسوار اور وارثین منبر ومحراب بھی آپ کی عقیدت میں گرفتار ہیں۔

حضرت مولانا کی پوری زندگی اسلام ومسلمین کی خدمت اور تعلیم وتربیت سے عبارت تھی، آپ کی زندگی کا لمحہ لمحہ رضائے الٰہی اور مسلمانوں کی خیر خواہی میں بسر ہوا، آپ نے شدید آندھیوں کی زد پر عشق وعرفان کا چراغ جلائے رکھا، لاکھوں دلوں میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت کی شمع روشن کی، سماج اور معاشرہ میں پھیلی ہوئی بہت سی برائیوں کو ختم کرنے اور نیکیوں کے پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کی صحبت میں بیٹھنے والے اور آپ کی پرکشش شخصیت سے متاثر بہت سے افراد سماج اور معاشرہ کی تمام

برائیوں سے دور نیکی کے راستے پر گامزن اور سماج کے لیے ایک نمونہ اور ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

حضرت مولانا مرحوم ایک ٹکسال تھے جہاں کے ڈھلے ہوئے سکے دنیا کے ہر بازار کو خریدنے کی جرأت رکھتے ہیں، وہ ایک گنجینہ تھے جن کے سینہ میں علوم ومعارف کے خزینے مدفون تھے، وہ ایک منارۂ نور تھے جس کی روشنی میں بھٹکے ہوئے مسافر منزل کا پتہ پاتے تھے، وہ ایک نباض وقت تھے جن کے سامنے لوگوں کے امراض عیاں تھے اور وہ ہر مرض کے نسخہ اکسیر کے مالک تھے، وہ ایک قطب نما تھے جس کی رہنمائی میں اللہ والے اپنے دلوں کا قبلہ درست کرتے تھے۔ دیکھنے والی گواہی دیں گے کہ کتنے پریشان حال، پراگندہ خیال اور زندگی کے جنجال میں الجھے ہوئے لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ،نہ وقت کی قید نہ آرام کی فکر، وضع قطع بھی غیر شریفانہ و غیر مانوس، وہ گھنٹوں بیٹھ کر اپنا حال دل بیان کرتے اور زندگی کی الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتے اور جب تک اطمنان نہ ہوجاتا اپنے مسائل بیان کرتے رہتے اور مشورے ورہنمائی لیتے رہتے ،کوئی ایک فرد نہیں کہہ سکتا ہے کہ حضرت مولانا نے کبھی خود سے گفتگو ختم کی ہو یا مجلس برخواست کی ہو جبکہ عمر کے آخری مرحلہ میں زیادہ دیر تک بیٹھنا مشکل تھا، صحت کمزور تھی ،طبیعت نڈھال تھی، ڈاکٹروں کی سخت ہدایات تھیں، ہر کسی کی لن ترانی سننا طبیعت پر گراں تھا، کوئی صحت مند انسان بھی ذہنی طور پر ہر کسی کی مفید وغیر مفید باتیں سننے کے لیے ہمیشہ حاضر نہیں رہتا لیکن جب وہ اپنے نفس کو تج دیتا ہے اور ''عیال اللہ'' کی خیر خواہی کو اپنا مقصد بنالیتا ہے تو نہ وقت کی قید، نہ صحت کا خیال، نہ اپنی مرضی اور نہ ذاتی تقاضے۔ وفات سے دو دن قبل ہی جبکہ حضرت مولانا کی حالت نازک تھی، طرح طرح کے اندیشے گذر رہے تھے، ایک صاحب تہنیک کی غرض سے آئے اور حضرت نے اس نازک وقت میں بھی انھیں مایوس نہیں کیا۔

حضرت مولانا تاریخ ندوہ کی ان چنیدہ اور کلیدی شخصیات میں سے تھے جنھوں نے ندوہ کی خدمت میں اپنے جسم وجان کی توانائی، اپنی جوانی وپیری اور اپنی ساری صلاحیتیں جھونک دی تھیں، دارالعلوم کی فضاؤں کو علمی و ادبی رنگ وآہنگ دیا، تعلیم وتربیت اور امت کی رہنمائی کا جو ہمالیائی معیار مفکر اسلام نے قائم کیا تھا آپ نے ان کی جانشینی کرتے ہوئے اس معیار کو بحسن وخوبی قائم رکھا۔ شاید لوگوں کو گمان ہو کہ اس کے ذریعہ آپ نے اپنی میں راحت رسانی اور فارغ البالی کا ذریعہ نکالا ہو، ایک واقف کار شخص کے لیے یہ حقیقت سے متضاد بات ہے، حضرت مولانا نے انتہائی سادگی اور جفاکشی اور قناعت کے ساتھ زندگی گزاری اور اس راہ میں جو ہ اذیتیں اٹھانا پڑیں وہ آپ کو اصحاب عزیمت افراد امت کی صف میں کھڑا کرتی ہیں۔

واضح رہے کہ ندوہ صرف ایک تعلیمی ادارہ ہی نہیں بلکہ متضاد افکار ونظریات کی جامع تحریک بھی ہے، مختلف النوع اداروں اور جماعتوں کے لیے سنگ میل بھی ہے، مختلف رنگ ونکہت اور متنوع خوشبو کا حسین گلدستہ بھی ہے لیکن پھولوں کے ساتھ کانٹے بھی ہیں، فکر ونظر میں اعتدال کے ساتھ شدت بھی ہے، مزاج کی لطافتیں بھی ہیں اور طبائع کی سختیاں بھی، مخلصین بھی ہیں اور مفاد پرست بھی، اس لیے ایسی تحریک کی باگ ڈور سنبھالنا اور اسے سلف صالحین کے نہج پر قائم رکھتے ہوئے مقصد اصلی کی طرف متوجہ رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔

ندوہ کے ساتھ یہ المیہ رہا ہے کہ بانیان ندوہ سے لے کر خادمین ندوہ تک ہر کسی پر انتہائی ہمت شکن تبصرے کیے گئے، دل آزار جملے کہے گئے، گھناؤنی پھبتیاں اور تمسخر آمیز فقرے کسے گئے، سازشیں رچی گئیں، گمنام خطوط لکھے گئے اور اس عظیم تحریک کو کبھی باہر سے تو کبھی اندر سے کمزور کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ حضرت مولانا مرحوم کو بھی اس کرب انگیز مراحل سے گذرنا پڑا، گستاخانہ جملے کسے گئے، نازیبا کلمات کہے گئے، الزمات لگائے گئے، اور تقریباً ستر سالہ خدمات پر پانی پھیرنے کی کوششیں کی گئیں لیکن روز اول سے ندوہ پر خدا کا خصوصی فضل رہا ہے کہ مخلصین ندوہ کے خلاف سارے تبصرے جھاگ ثابت ہوئے اور ساری سازشیں مکڑی کا جالا! معاندین و مخالفین نے کھلے دبے لفظوں میں حضرت مولانا کے فضل وکمال،

اخلاص وللّٰہیت، دور بینی و دور اندیشی کے ساتھ حسن انتظام اور حسن کارکردگی کا اعتراف کیا اور اپنی گستاخیوں، غلطیوں اور غلط فہمیوں پر اظہار شرمندگی۔ ہاں کچھ کور باطن و مفلوج ذہنیت کے افراد ہمیشہ سے رہے ہیں جو اولیاء اللہ کے دنیا سے رخصت ہو جانے کے باوجود ان کے محاسب بنے رہتے ہیں، اور بے جا تنقیدات، نامناسب تبصرے اور سخت الفاظ کے ذریعہ اپنی بدبختی کا ثبوت دیتے ہیں، جبکہ شرافت نفسی کا تقاضا یہ ہے کہ مرحومین کے محاسن کا تذکرہ کیا جائے، ذاتی خصوصیات کو بیان کیا جائے، ان کی خدمات کو سراہا جائے اور اجتماعی امور میں ان کی کوتاہیوں سے سیکھ حاصل کی جائے۔

جن لوگوں نے کبھی قوم وملت کے لیے خلوص اور ایمان داری سے کام کیا ہے ان کو بہتر اندازہ ہوگا کہ اگر کام کرنے والوں کی داد و تحسین نہ ہو جب بھی وہ استقامت کے ساتھ کام کر سکتے ہیں لیکن اگر کردار کشی کی جائے، الزامات لگائے جائیں اور خود اپنے ہی تیور دکھانے لگیں تو اس وقت خود کو سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن ایسے موقع پر اتہامات کو برداشت کرنا، لومۃ لائم کی پروا کیے بغیر سب کی خیر خواہی چاہنا' وارثین انبیاء ہی کو زیب دیتا ہے۔

حضرت مولانا ایک ہشت پہل شخصیت اور جامع علوم وکمالات تھے، آپ کی تالیفات وتصنیفات آپ کے علمی ذوق وفکری وسعت کا مظہر ہیں، ''قرآن مجید- ایک رہبر کامل'' آپ کے قرآنی ذوق کی دلیل ہے، ''میزان عمل'' حدیث نبوی سے شغف کی مثال ہے، ''رہبر انسانیت (ﷺ)'' ذات نبویؐ سے عشق ومحبت کا نذرانہ ہے، ''فقہ اسلامی اور عصر جدید'' فقہی بصیرت کا نمونہ ہے، ''غبار کارواں'' زبان وادب کے نفیس شہہ پارے ہیں، ''سماج کی تعلیم وتربیت'' معاشرہ کی اصلاح وسدھار کی فکر ہے، ''سمرقند وبخارا کی بازیافت'' مسلمانوں کے شاندار ماضی کی عصری معنویت ہے، ''دو مہینے امریکہ میں'' عبرت وموعظت کا حسین بیانیہ ہے، ''یادوں کے چراغ'' محسنین ومتعلقین کو خراج محبت ہے، ''الادب العربی- بین عرض نقد'' نصابیات کے باب میں روشن قندیل ہے، ''امت مسلمہ- رہبر ومثالی امت'' متاع گم گشتہ کی تلاش وجستجو ہے، ''جزیرۃ العرب'' مہبط وحی کا جغرافیہ اور اس کے ادراک کی کنجی ہے، اور ''مولانا سید ابوالحسن علی ندوی- عہد ساز شخصیت'' مربی کامل ومرشد برحق کی خدمات کا اعتراف اور اپنی محبت ووفاداری کا اظہار ہے۔

موضوعات کی وسعت سے علم وفکر کی گہرائی کا فقط اندازہ کا جاسکتا ہے، بحر بیکراں کی تہہ سے صرف آبدار موتی چنے جاسکتے ہیں، لعل وگوہر کی جستجو کی جاسکتی ہے، اس کی سطح تک رسائی ہر کس وناکس کے بس میں کہاں! سچ تو یہ ہے کہ آپ کی مثالی زندگی کے تشکیلی عناصر اور آپ کے علوم ومعارف کی وسعت چند صفحات کے مضامین یا مقالات میں نہیں سمیٹی جاسکتی ہے بلکہ اس کے لیے ایک مستقل اکیڈمی کی ضرورت ہے جو ریسرچ کرے اور اہل علم کو اس کے نتائج سے باخبر کرے تاکہ ان نتائج سے تعمیر ملت کا کام لیا جاسکے۔

حضرت مولانا عربی واردو دونوں زبانوں پر قادر تھے، تحریر میں بانکپن بھی تھا اور جدت بھی تھی، جو کچھ لکھتے سادہ ورواں لکھتے اور پوری ذمہ داری کے ساتھ لکھتے، خود کو ہر ہر لفظ کا جوابدہ تصور کرتے، اسی لیے ایک ایک تحریر کی کئی کئی بار اصلاح کرتے، نوک وپلک ٹھیک کرتے، سوچ سمجھ کر الفاظ کا انتخاب کرتے، مخاطب کے علمی معیار اور ذہنی سطح کے ساتھ موضوع کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے، سادہ اور چھوٹے جملوں میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے، انشاء پردازی میں آپ کسی کے مقلد نہیں تھے، آپ کی تمام تحریریں سادہ، رواں اور بے تکلف ہیں، ذہن ودل کو معطر کرنے والیں اور ایک خوشگوار تاثر قائم کرنے والی ہیں، کہیں یہ محسوس نہیں ہوسکتا کہ جملے بنائے گئے ہیں، تراکیب وضع کی گئی ہیں یا مترادفات سوچے گئے ہیں بلکہ ایک بے ساختہ اور بے تکلف زبان ہے جو اپنے موضوع پر رواں ہے۔

حضرت مولانا مرحوم کی علمی وادبی صلاحیتوں اور انتظامی مہارت کا ان سب کو اعتراف ہے جنھوں نے آپ کی تحریریں پڑھی ہیں، یا آپ کو کسی مجمع میں خطاب کرتے ہوئے دیکھا ہے، یا اسے آپ کی ماتحتی میں کام کرنے کا موقع ملا ہے، لیکن آپ کی زندگی کا وہ

نمایاں پہلو جسے دیکھنے کا ہر شخص کو موقع نہیں ملا، وہ تھی آپ کی مروت وتواضع، خندہ جبینی وشیریں گفتاری، خودنمائی ونام نمود سے پرہیز۔ آپ نے یہ مشہور روایت پڑھی اور سنی ہوگی: "ما تواضع أحد لله إلا رفعه الله" یعنی جس نے اللہ کی خاطر خود کو فروتر سمجھا، عجز وانکسار کو اختیار کیا اور اپنی خواہشات کو رضائے الٰہی کے تابع کردیا؛ اللہ نے اسے رفعت وبلندی عطا کی۔ اس حدیث کی اگر عملی تصویر دیکھنی ہو تو حضرت مولانا کی ذات گرامی بہترین نمونہ ہے۔

حضرت مولانا کوئی انقلابی مصنف یا شعلہ بیاں مقرر نہیں تھے، میڈیا وسوشل میڈیا کی زینت بھی نہیں تھے، نہ آپ کے بیانات کی سرخیاں بنتیں اور نہ آپ کے فیصلوں پر ٹی وی ڈِبیٹ ہوتے، یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات خالی الذہن وسادہ لوگ یہ سوچتے کہ ملک میں حالات کہاں سے کہاں جارہے ہیں لیکن حضرت کی طرف سے کوئی آواز نہیں آتی جبکہ فلاں فلاں نے آسمان سر پر اٹھا رکھا ہے، لیکن اہل دانش وبینش اس حقیقت سے واقف ہیں کہ آپ ایک عظیم مفکر اور مرشد کامل تھے، سماج کا ہر طبقہ آپ کی رہنمائی کا محتاج تھا، نام ونمود سے دور آپ کی خاموش قیادت ہر نمائندۂ قوم کی رہنما تھی، آپ کی ہدایات وآپ کے مشورے مشعل راہ تھے، چنانچہ ملک کے عظیم قائدین کے جو پرجوش بیانات نظر آتے ہیں ان میں حضرت مولانا کی خود اعتمادی شامل تھی، اہل قلم کی جو سرخیاں نظر آتی ہیں ان میں حضرت مولانا کی فکر رچی بسی تھی، اہل دعوت کی جو سرگرمیاں دکھائی دیتی ہیں ان میں حضرت مولانا کی تڑپ جلوا گر تھی، اہل تصوف کے دلوں میں جو گرماہٹ محسوس ہوتی ہے اس میں حضرت مولانا کی تپش بھی کارگر تھی، اور سواد اعظم کا جو فیصلہ نظر آتا ہے وہ حضرت مولانا ہی کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔

ہندی مسلمانوں کی یہ تاریخ رہی ہے کہ وہ اپنے قائد ومرشد و سے کبھی مطمئن نہیں رہتے، بدگمانی اور عدم اعتمادی ایک عام مرض ہے، بڑے سے بڑے قائد کی کردار کشی کی گئی، ذاتی اکتساب ومالی بدعنوانی کے الزامات لگائے گئے اور ان کے بہت سے فیصلوں کو غیر دور اندیشی پر محمول کیا گیا، لیکن تاریخ ہند میں حضرت مولانا کی تنہا ذات ہے جو ایسے الزامات سے پاک ومبرّا ہے، آپ ہندوستان کی سب سے بڑی مسلم تنظیم "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" کے صدر تھے، عالمی ادارہ "ندوۃ العلماء" کے ناظم تھے، کوئی ممبر یا کوئی ملازم یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضرت مولانا نے کبھی کوئی فیصلہ اجتماعیت کے خلاف کیا ہو یا کوئی حکم ایسا جاری کیا ہو جو ادارہ کے حق میں غیر مفید ہو، اور نوے سالہ زندگی میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ملے گا جو مالی خیانت یا ذاتی مفاد کی نسبت بھی آپ کی طرف کرسکے۔ حساس ونازک عہدوں پر ہوتے ہوئے آپ نے کسی بھی طرح کی طرفداری، مخالفت یا مداہنت کے بجائے وہ فیصلے کیے جسے آپ نے قوم وادارہ کے حق میں مفید وضروری سمجھا۔ حیات اجتماعی کے تلاطم خیز دھارے میں آپ کا دامن کسی شکوہ وشکایت، کسی کی اذیت وحق تلفی، کسی کی گرانی وانقباض سے آلودہ نہیں ہوا، وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے، ہر ایک کے بہی خواہ اور خیر خواہ بن جاتے، ہر ایک کی ترقی اور اس کی صلاحیت کو مفید تر بنانے کی کوشش کرتے۔

بلاشبہ آنے والے دنوں میں حضرت مولانا کی شخصیت مختلف زاویوں سے دیکھی وسمجھی جائے گی؛ مرشد کامل، عظیم مصنف، کامیاب صحافی، ماہر نصابیات، بہترین منتظم اور قابل تقلید راہنما؛ لیکن ان تمام خصوصیات میں بحیثیت مدرس واستاذ آپ کی ذات سب سے نمایاں تھی، یوں کہیے کہ آپ ایک ایسا نگینہ تھے جس میں تدریس کا فن سب سے زیادہ چمکدار، شفاف اور خیرہ کن تھا، آپ کی تدریس کوئی روایتی انداز کی تدریس نہ تھی، موضوع پر گہری گرفت اور تفہیم کا غیر معمولی ملکہ تھا، الفاظ کی تحلیل وتحقیق اور موضوع درس پر کمال حاصل تھا، فقط ایک گھنٹہ آپ طلباء کے روبہ رو ہوتے لیکن ذہنوں میں چوبیس گھنٹے سمائے رہتے تھے، طلباء میں شعوری وغیر شعوری طور پر موضوع سے وابستہ ہوجاتے، پینتالیس منٹ کا وقفہ اپنے آپ میں ایک نئی دنیا تھا جہاں زبان وسخن کی داستان تھی اور اس کی نت نئی انگڑائیاں بھی، زبان ادب کا بیان بھی تھا اور اس کی نزاکتیں بھی، فکر وشعور کے

جلوے بھی تھے اور تخلیق وفن کی رعنائیاں بھی، علم وآگہی کے حسین نظارے بھی تھے اور طلب وجستجو کے ذوق کی ضمانتیں بھی!

۱۹۴۹ء سے لے کر ۲۰۲۳ء تک تقریباً پچھتر سال کے طویل عرصہ تک آپ مسند درس پر متمکن رہے، تدریس کی سحر کاری وجادو گری جو عنفوان شباب میں تھی وہی پیرانہ سالی تک قائم رہی، دار العلوم ندوۃ میں مختلف موضوعات کے دروس ہوں یا رمضان المبارک میں تفسیر قرآن کے حلقے، آپ کی تدریس وتفہیم کا نقش دل ودماغ پر چھایا رہتا، آپ کا مشفقانہ انداز تدریس نہ صرف دماغ کو متاثر کرتا اور دلوں کو موہ لیتا تھا بلکہ اولین صحبت میں قلوب کی جو تختیاں آپ کے اختیار میں آتی تھیں، ان پر تصرف میں آپ سال بھر ہر طرح آزاد ہوتے تھے، آپ کے قدیم وجدید شاگرد دل ہارنے کے خوشگوار تجربے کی گواہی دیں گے اور یہ اعتراف کریں گے کہ آپ ایک مدرس نہیں نقاش تھے جس نے دلوں کی سادہ تختیوں پر علم ومعرفت کے حسین گلدستے سجائے ہیں۔

حضرت مولانا' اللہ تعالیٰ کے محبوب بندہ تھے، اور جب اللہ اپنے کسی بندہ سے محبت فرماتے ہیں تو روئے زمین پر اس کے مظاہر بھی دکھادیتے ہیں، حضرت مولانا اپنے عزیزوں، دوستوں اور ہم عصروں میں محبوب تھے، طلباء بے پناہ محبت کی نظروں سے دیکھتے تھے، عام لوگوں میں بھی محبوبیت کی یہی شان نظر آتی تھی، حیات مستعار کے آخری سالوں میں عوام وخواص کا رجوع عام تھا، ملک وبیرون ملک گویا ایک ندا لگادی گئی ہو، لوگ ملاقاتوں کے لیے بلکہ ایک نظر دیکھنے کے لیے بھی بے قرار رہتے، عالم اسلام میں آپ کی مقبولیت کی ایسا فضا چلی کہ جماعت در جماعت آپ سے اجازت حدیث لینے پر فخر محسوس کرتی، خرابی صحت کی اطلاع ملتے ہی کیا اپنے کیا پرائے سب کے ہاتھ دعائے صحت کے لیے اٹھ گئے، لیکن خدا کی مرضی اس نے اپنے محبوب اور اپنے محبوب کے محبوب کو اپنے پاس بلالیا اور پھر دنیا نے ایک ولی کامل کی محبوبیت عامہ اپنی آنکھوں سے دیکھی، نماز جنازہ میں ایسا جم غفیر تھا کہ لکھنؤ کی تاریخ اس کی مثال نہیں پیش کرسکتی، لاکھوں کے مجمع کو سنبھالنا، آنے جانے کا نظم کرنا، ضروری انتظامات کا ہونا یقیناً ناممکن تھا لیکن خدا کی رحمت پوری طرح متوجہ تھی، رمضان المبارک کی تجلیات تھیں، اطمنان وسکینت کی ایک فضا تھی دلوں میں رقت، آنکھوں میں آنسو اور زبان پر دعائے مغفرت تھی۔

اللہ کی رحمت بے پایاں کا ایک مظہر یہ بھی ہے کہ تقریباً چار عشرے گذرنے کے بعد بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حضرت مولانا اپنے کمرہ میں جلوہ افروز ہیں، اور اب یا تب نکل کر آنے ہی والے ہیں، بقول جگر مرادآبادی مرحوم کے ؎

وہ کب کے آئے بھی اور چلے بھی گئے، نظر میں اب تک سمارہے ہیں
یہ چل رہے ہیں وہ پھر رہے ہیں، یہ آرہے ہیں، وہ جارہے ہیں

تعزیت کرنے والوں کی آمد سلسلہ قائم ہے، ندوہ کے در وبام کی رونق بدستور ہے، ایک روحانی سکون کی فضا جو پہلے تھی وہ آج بھی ہے، حضرت مولانا کے علمی وفکری جانشین ومنتسبین، ندوۃ العلماء کے ناظم اور دار العلوم کے مہتمم ودیگر اساتذہ کرام واراکین پوری دلی ودماغی کاوشوں اور یکسوئی کے ساتھ سرگرم عمل ہیں، اور یہ نتیجہ ہے اس بات کا کہ حضرت مرحوم نے جو لگن سب کے دل میں لگائی تھی وہ اخلاص وللّٰہیت کی لگن تھی اور جس راستہ پر چھوڑا تھا میں اس میں کسی طرح کی کوئی کجی نہیں۔ آپ نے اپنے افراد خاندان، خدام اور نیاز مندوں کے لیے کوئی مادی دولت نہیں چھوڑی، آپ نے جو ورثہ چھوڑا ہے وہ عالم اسلام کے لیے عام ہے، اور پوری امت کی وراثت ہے، وہ وراثت انابت الی اللہ، غیرت دینی اور رسول اکرم ﷺ سے والہانہ جذباتی وعقلی تعلق ہے۔

حضرت مولانا نے جس دل سوزی ودردمندی، جس کڑھن وتڑپ اور جس صبر وثبات کے ساتھ قوم وملت کی خدمات انجام دی ہیں، اور جس پاکبازی وپاک نظری اور جس عبدیت کے ساتھ زندگی گذاری ہے اس کا حسین صلہ اور بہترین ثمرات وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں گے اور ان کی روح ندا لگا رہی ہوگی: ﴿یَا لَیۡتَ قَوۡمِیۡ یَعۡلَمُوۡنَ ☆ بِمَا غَفَرَ لِیۡ رَبِّیۡ وَجَعَلَنِیۡ مِنَ الۡمُکۡرَمِیۡنَ﴾ (کاش میرے لوگوں کو معلوم ہوجاتا کہ میرے رب نے کیسی میری مغفرت فرمائی ہے اور کتنا مجھے نوازا ہے!)

جامع اور متوازن شخصیت

مولانا سلمان نسیم ندوی
(استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

کسی بھی انسان کے تذکرہ میں دو پہلو ہوتے ہیں، پہلا پہلو اس کی ذاتی زندگی کے احوال ہیں، یعنی اس کی پیدائش کب ہوئی، تعلیم کہاں حاصل کی اور اس کا خاندانی پس منظر کیا ہے؟ آج کے گلوبل ایج میں عموماً یہ تفصیلات مل جاتی ہیں، اگر وہ شخص کسی پہلو سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے، لیکن دوسرا پہلو اس کی شخصیت سے متعلق ہوتا ہے جو بہت اہم ہونے کے باوجود آسانی سے دستیاب نہیں ہوتا، درج ذیل سطور میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی شخصیت سے متعلق چند ضروری باتیں حیطہ تحریر میں لانے کی کوشش کی ہے، امید ہے کہ وہ قارئین کے لیے مفید ثابت ہوں گی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی تعلیمی زندگی کے تین ایسے اہم واقعات ہیں جن سے آپ کی شخصیت کی تعمیر وتشکیل کے بنیادی عوامل واسباب کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، الحمدللہ حضرت مولاناؒ نے عاجز کو بذات خود یہ واقعات سنائے ہیں اور یہ ایسے ہیں جو ہر شخص کے لیے سبق آموز ہیں۔ ایک موقع پر آپ نے اپنی تعلیمی زندگی کے واقعات سناتے ہوئے فرمایا کہ

''ہمارے گھر میں مشورہ ہوا کہ رابع اور واضح میں سے واضح تعلیم کے لیے زیادہ مناسب ہیں، اس لیے کہ واضح نسبۃً تیز ہیں اور رابع ان کے مقابلہ میں اتنے فائق نہیں ہیں، لہٰذا واضح کو تعلیمی لائن میں ڈالا جائے اور رابع کے لیے کچھ اور سوچا جائے۔ لیکن اس وقت ماموں جان (مولانا علی میاںؒ) سفر پر تھے، جب وہ واپس آئے اور انہیں یہ بات معلوم ہوئی تو سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے اس فیصلہ کو قطعی منظور نہیں کیا، بلکہ فرمایا کہ رابع بھی تعلیم کے میدان ہی میں رہیں گے۔''

بلاشبہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا یہ فیصلہ کیسا مفید، نتیجہ خیز اور ثمر آور ثابت ہوا، اس کا ایک دنیا نے مشاہدہ کیا، بعض مرتبہ بہت سے لوگوں کے متعلق شروع میں یہی سوچ ہوتی ہے کہ وہ کیا کرسکیں گے، لیکن صاحب نظر کی نظر دیکھ رہی ہوتی ہے کہ اس سے کیا کیا ہوگا، چنانچہ دنیا نے دیکھا کہ مولانا کے وجود سے کس طرح امت مسلمہ کو نہ صرف یہ کہ ہندوستان میں بلکہ عالم میں فیض پہنچا۔

دوسرا واقعہ حضرت مولاناؒ نے سنایا کہ

''اگر تمہیں یہ دیکھنا ہو کہ میں نے کتنی محنت سے پڑھا ہے؟ تو حماسہ کی وہ کتاب جو میں نے زمانہ طالب علمی میں پڑھی ہے، اس کو اگر دیکھو تو تمہیں اس میں جابجا میرے آنسوؤں کے دھبے مل جائیں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں ماموں جان (مولانا علی میاںؒ) کے پاس حماسہ پڑھنے جاتا تھا، مجھے سبق تیار کرکے لے جانا ہوتا تھا اور کتاب میں طباعت کی غلطیوں کو بھی درست کرنا ہوتا تھا نیز عبارت بھی حل کرنا ہوتی تھی اور ماموں جان (مولانا علی میاںؒ) کا یہ حال تھا کہ اگر مجھ سے کہیں کوئی غلطی ہوجاتی تو غضب ناک ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ جن علماء اور شعراء نے یہ اشعار کہے تھے وہ بھی انسان ہی تھے اور تم بھی انسان ہو، آخر تم یہ اشعار کیوں نہیں سمجھ پارہے ہو اور میں وہیں بیٹھ کر روتا تھا، میرے آنسو کتاب پر گرتے تھے، لیکن ماموں جان کو رحم نہیں آتا تھا، اس طرح میری تعلیم وتربیت ہوئی ہے۔''

مولانا نے ایک تیسرا واقعہ بھی سنایا کہ

''جب میں ندوہ میں ادیب اول کی حیثیت سے مقرر ہوا تو

اس زمانہ میں ماموں جان نے مجھے فوری طور پر عربی میں کسی پروگرام کی رپورٹ بنانے کا مکلّف کیا، اتفاق سے جب رپورٹ تیار ہوگئی تو ماموں جان کسی پروگرام کی صدارت فرما رہے تھے، جہاں بڑے بڑے لوگ موجود تھے، میں وہیں آپ کی نظر سے گذارنے کے لیے وہ رپورٹ لے کر حاضر ہوا، لیکن انہوں نے وہ تحریر دیکھ کر اسٹیج ہی پر اسے پھاڑ کر پھینک دیا۔"

غور کا مقام ہے کہ اس وقت حضرت مولانا رابع صاحبؒ ندوہ کے استاد تھے، عربی کے ادیب اول کی حیثیت سے مشہور تھے، لیکن اس کے باوجود حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے تربیت میں ذرا کسر نہ چھوڑی اور تمام لوگوں کے سامنے ہی تنبیہ فرمائی۔

ان تینوں واقعات سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ کس طرح حضرت مولانا علی میاںؒ نے حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی شخصیت کو تعمیر کیا اور ان کی تربیت فرمائی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کی شخصیت کے تین پہلو سب سے زیادہ ممتاز نظر آتے ہیں:

سب سے پہلا پہلو یہ ہے کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ایک ادیب تھے اور ۱۹۴۹ء میں بحیثیت ادیب ہی وہ ندوہ میں مدرس مقرر ہوئے تھے، پہلے وہ ادیب دوم کی حیثیت سے رہے اور اس کے بعد ادیب اول قرار پائے، پھر "کلیة اللغة العربیة وآدابھا" کے عمید ہوئے، اس کے بعد مہتمم اور معاون ناظم کے عہدوں کو وقار بخشتے ہوئے حضرت مولانا علی میاںؒ کی وفات کے بعد ناظم ندوۃ العلماء منتخب ہوئے، لیکن ان تمام مراحل میں ان کی شخصیت کا سب سے پہلا امتیاز اور سب سے پہلی علامت ان کے ادیب ہونے ہی کی ہے اور ادیب وہ ہوتا ہے جو بہت حساس اور باذوق ہو اور تمام مسائل پر بڑی گہری نظر رکھتا ہو، اشیاء اور اشخاص کے خواص کو پہچانتا ہو اور ان کو الگ زاویہ نگاہ سے دیکھتا ہو۔ بلاشبہ حضرت مولانا رابع صاحبؒ ایک ایسے ہی ادیب تھے، جو اشیاء اور اشخاص کو بخوبی پہچانتے تھے، ظاہر ہے اس کے بغیر کوئی ادیب ادیب ہو ہی نہیں ہوسکتا اور نہ کوئی فنکار فنکار ہوسکتا ہے۔ حضرت مولانا رابع صاحبؒ افراد شناسی میں بڑے ماہر تھے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی شخصیت کا دوسرا امتیازی پہلو ان کے معلم ہونے کا ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جو ادیب جس بلند پایہ کا ہوگا، وہ معلم بھی اتنا ہی اعلیٰ درجہ کا ہوگا، یقیناً ایک ادیب اپنے سماج اور اپنی دنیا کے لیے معلم بن جاتا ہے اور معلم کے بارے میں احمد شوقی نے کہا تھا:

"کاد المعلم أن یکون رسولا" (قریب ہے کہ معلم رسول کے رتبہ کو پالے)

یہ حقیقت ہے کہ ادب و تعلیم کا رسالت و نبوت سے بڑا گہرا رشتہ ہے، آپ ﷺ کی ذات گرامی بھی ادبیت اور تعلیم و تربیت کی جامع تھی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی شخصیت کا تیسرا امتیازی پہلو ان کی ربانیت ہے، یقیناً اگر معلم کی تعلیم میں اخلاص اور جدوجہد ہو تو پھر وہ تیسرے درجہ میں ربانی ہی ہوتا ہے، جس کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَلَـٰكِن كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنتُمْ تَدْرُسُونَ﴾ (آل عمران: ۷۹) (اور لیکن اللہ والے بن جاؤ چونکہ تم کتاب کی تعلیم کرتے رہے ہو اور تم خود اس کو پڑھتے رہے ہو)

ربانی وہ ہوتا ہے جو حکیم و فقیہ ہو، متقی ہو، علم رب سے بہرہ ور ہو اور بتدریج لوگوں کی تربیت اپنی تدبیر سے کرتا ہو۔ اگر ہم غور کریں تو واقعی حضرت مولاناؒ ان تمام صفات پر صد فی صد کھرے اترتے تھے، انہوں نے اپنی اسی ربانی صفت کے ساتھ ندوۃ العلماء، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، دینی تعلیمی کونسل، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام اور درجنوں تنظیموں اور تحریکات کی قیادت فرمائی اور اس سب کے ساتھ ان کی پوری زندگی کا مشغلہ صرف پڑھنا پڑھانا ہی رہا، ان کے آس پاس رسالے اور کتابیں ہمیشہ بکھری ہوئی ملتیں۔

جو لوگ تاریخ سے کما حقہ واقف نہیں ہیں اور حضرت مولاناؒ کی شخصیت کا انہوں نے مطالعہ نہیں کیا ہے، بعض مرتبہ ان کے ذہن

میں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ مولانا کی قیادت میں جوش وخروش نہیں تھا، حالانکہ قیادت کا مطلب ہمیشہ جھنڈا لے کر سڑک پر اترنا یا ہمیشہ ایٹک کے موڈ میں رہنا ہی نہیں ہوتا، بلکہ بعض اوقات قیادت خاموش بھی ہوتی ہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں کس کو شبہ ہوسکتا ہے؟ لیکن موتہ کی جنگ میں جب مسلمانوں کے پانچ ممتاز جرنیلوں کی شہادت کے بعد مسلم فوج شکست کی حالت سے دوچار ہورہی تھی، اس وقت قیادت کا فریضہ ان کے سپرد ہوا، جس کے لیے وہ بالکل تیار نہ تھے، لیکن اس نازک موقع پر ان کی قیادت کا سب سے بڑا جوہر یہ سامنے آیا کہ انہوں نے اپنی غیر معمولی شجاعت وبہادری کے ساتھ ساتھ جنگ کی پوری حکمت عملی کو تبدیل کر دیا اور دو اہم کام انجام دیے، پہلا کام تو یہ کیا کہ جنگی فوجوں کے مقامات تبدیل کر دیے، یعنی آگے کی فوج کو پیچھے، پیچھے کی فوج کو آگے اور دائیں جانب کی فوج کو بائیں اور بائیں جانب کی فوج کو دائیں کر دیا، یقیناً اگر اس وقت کوئی ماہر فن حرب وضرب ہوتا تو یہی کہتا کہ یہ عجیب آدمی ہیں اور ان کو ذرا بھی تجربہ نہیں ہے، انہوں نے جنگ کا پورا نقشہ ہی بدل دیا۔ لیکن انہوں نے اس کی ذرا پرواہ نہ کی اور یہ تبدیلی کر دی۔ اسی کے ساتھ دوسری تبدیلی تکنیکی انداز میں یہ کی کہ انہوں نے فوج کو پیچھے ہٹانا شروع کیا اور ہٹاتے ہٹاتے جتنی فوج بچ گئی، اس کو لے کر وہ مدینہ منورہ پہنچ گئے، جب مدینہ پہنچے تو اللہ کے رسول ﷺ نے ان سے اور واپس لوٹنے والوں سے ارشاد فرمایا کہ تم لوٹ کر تو آئے ہو لیکن لوٹ کر آنے کا مقصد پلٹ کر حملہ کرنا ہے، تم بھاگ کر آنے والوں میں سے نہیں ہو۔

اسی طرح اگر ہم ان حالات کا جائزہ لیں جن میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے ذمہ قیادت کے فرائض سپرد ہوئے تو اندازہ ہوگا کہ وہ حالات انتہائی نازک تھے، آپ کو ندوہ کی ذمہ داری اس وقت ملی جب حضرت مولانا علی میاںؒ کا انتقال ہوا، ظاہر ہے حضرت مولانا علی میاںؒ کی شخصیت کیا تھی اور دنیا میں ان کا کیا مقام تھا، اس سے ہر شخص واقف ہے، ان کی وفات سے نہ جانے کتنی تنظیمیں اور تحریکیں سایہ سے محروم ہوگئیں، لیکن یہ حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی شخصیت تھی، جنہوں نے تمام اداروں، تنظیموں اور تحریکوں کو سایہ فراہم کیا۔ اسی طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ میں بھی آپ اس وقت صدر منتخب ہوئے جب چوٹی کے قائدین دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، ایسے حالات میں مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کے اس متحدہ پلیٹ فارم کو سجا کر اور سنبھال کر رکھا اور اس کے اندر کوئی انتشار پیدا نہ ہونے دیا۔ دراصل حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا دور ایک عبوری دور تھا، تاکہ وہ ملی سرمایہ کو اگلی نسل کے حوالہ کر دیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی حکیمانہ قیادت کا اثر یہ تھا کہ ایک مرتبہ ہمارے ایک قریبی دوست جو خفیہ ایجنسی میں کام کرتے ہیں، انہوں نے راقم سطور کو بتایا کہ ہندوستان کے بڑے بڑے لیڈران، بڑے بڑے شعراء اور قائدین ومقررین جن کی تقریروں میں دسیوں لاکھ لوگ نعرے لگاتے ہیں، جب ان کا کوئی بیان اخبار میں آتا ہے تو ہمارے یہاں کوئی ہڑبونگ نہیں مچتی اور نہ ہی نوٹس لیا جاتا ہے، کیونکہ سب جانتے ہیں کہ یہ محض ایک بیان ہے اور بیان تو آتا جاتا رہتا ہے، لیکن حضرت مولانا رابع صاحب کی زبان سے حکومت، یا تنظیموں، تحریکوں اور ملی معاملات کے سلسلہ میں اگر ایک لفظ بھی آجائے، تو ہمارے یہاں فوراً لوگوں کے کان کھڑے ہوجاتے ہیں اور اس پر غور کیا جاتا ہے۔

اللہ مولانا کو غریق رحمت کرے، ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے اور ان کے پیغام وحکمت کو ہمیں آگے بڑھنے کے مواقع عطا فرمائے۔ آمین!

ہم سفر اب مرے پہلو میں مرا دل نہ رہا

ڈاکٹر قمر شعبان ندوی
(شعبہ عربی بنارس ہندو یونیورسٹی-وارانسی)

آج امت مسلمہ ماتم کناں ہے کہ وہ اپنے ایک مخلص، دور اندیش، دردمند، جفاکش اور حکیم ودانا قائد ومرشد سے محروم ہوگئی۔ علم وعرفان، زبان وادب، فکر وآگہی، زہد وقناعت، تقویٰ وانابت، استغناء وانکساری سب اشک بار ہیں کہ ان کا ایک رمز شناس، قدرداں اور دُرِّ نایاب ان سے چھن گیا۔ ان کی آب یاری کرنے والے ایک باغ باں نے آنکھیں موند لیں۔ عربی نقد وادب کو برصغیر ہندوپاک میں اس کے معیار ومزاج کے مطابق آباد وشاداب رکھنے والا ایک نادرہ روزگار جدا ہوگیا۔ فکر علی، عرفان علی، روح علی، تحریک علی، پیغام علی اور فلسفہ علی کا جانشین آج خاموش ہوگیا۔ اردو غزل سے عربوں کو روشناس کرانے والے مصنف اور ترجمان نے آج داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ ربع الخالی، دجلہ وفرات، نیل واھرام، بحر عرب، بحر احمر، بحر میت، بحر متوسط، صحراء ونخلستان عرب کے رازہائے سربستہ کو اردو دانوں کے سامنے واشگاف کرنے والا وہ نباض آج نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

عالمی پیمانہ پر اسلامی ادب نالہ گیر ہے کہ اس نے اپنا ایک شہ سوار کھودیا۔ علم بردارانِ فقہ اسلامی اور شریعت اسلامی نوحہ کناں ہیں کہ انہوں نے "أضواء على الفقه الإسلامي ومكانة الإجتهاد فيـــه" کا مصنف کھودیا، جس نے ہر صورت میں اسلامی شریعت کی دفاع اور ائمہ مجتہدین کی اجتہادی کوششوں کی وکالت کرتے ہوئے ہر دور میں اجتہاد کی اہمیت وضرورت کی تائید کی اور آپسی اختلافات کو ختم کرنے پر زور دیا۔ آج اسلام اور عربی زبان وادب کے ایک عظیم محافظ نے داغ مفارقت دے دیا، جس کی حکیمانہ خاموشی اور سنجیدہ طبیعت اور کوششوں نے بے شمار ملی، سماجی، فکری، تعلیمی، تربیتی، اصلاحی اور سیاسی مسئلوں کو حل کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔

حضرت نے اپنے وقت کی عظیم المرتبت شخصیتوں سے تربیت پائی تھی، ندوۃ العلماء کے بحر بے کراں سے ہزار ہا ہزار موتی چنے تھے، شبستان شبلی وسلیمان کی خوبصورت اور عطر بیز فضاؤں میں سانسیں لی تھیں، کئی دہائیوں تک امت مسلمہ ہندیہ، عالم عرب، عالم اسلام اور پوری دنیا کی سیاسی، فکری، نظریاتی اور سماجی اتھل پتھل، مدوجزر اور ہنگاموں کا مشاہدہ کرکے قرآن وحدیث، فکر اسلامی اور پیام انسانیت کے ترازو میں انہیں پرکھنے کا تجربہ کیا تھا۔ سفر وحضر اور خلوت وجلوت میں حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی صحبت نے انہیں مجلّٰی ومصفّٰی کیا تھا۔ اسلامی تاریخ، فکری تاریخ، انسانی تاریخ، ادبی تاریخ، ہندوستانی تاریخ اور تہذیب وتمدن کی تاریخ کے تمام ادوار ان کی نگاہوں کے سامنے تھے، وہ مشخص بھی تھے اور معالج بھی، انہوں نے ندوۃ العلماء، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، رابطہ عالم اسلامی، رابطہ ادب اسلامی، پیام انسانیت اور دوسرے بہت سے اسٹیجوں سے امت کو، امت کے نوجوانوں کو اور عام لوگوں کو انسانی قدروں، علمی قدروں، سماجی قدروں اور مذہبی قدروں کی ہر دور میں دُہائی دی تھی۔ ادب کے نام پر، شاعری کے نام پر، ناول وافسانہ کے نام پر، قصہ وکہانی کے نام پر، پوری دنیا میں عریانیت، فکری ناہمواری، بگاڑ اور بے راہ روی کا جو بازار گرم تھا، اس کی بیخ کنی کے لیے ادب اسلامی کے عنوان پر ایک شمع روشن کی گئی تھی اور جو عالمی تحریک چلائی گئی تھی، حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ روز اول سے اس کے صف اول کے رہنماؤں میں سے ایک تھے،

انہوں نے تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ مختلف علاقائی، صوبہ جاتی، قومی اور بین الاقوامی سیمیناروں اور کانفرنسوں کے ذریعہ، مجلسوں اور رسالوں کے ذریعہ اس کی کوششوں کو سرسبز وشاداب رکھا اور اپنی کتاب "أضواء على الأدب الاسلامي" میں فکر ادب اسلامی کا لب لباب، اس کا جوہر، اس کی عطر اور اس کا خلاصہ نچوڑ کر پیش کیا، "رسالة المناسبات الإسلامية" میں عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، رمضان، لیلۃ القدر، اعتکاف، حج وعمرہ، ہجرت، معراج اور ربیع الاول کی حکمتوں کو ادب اسلامی کے قالب میں ڈھال کر منظر عام پر لانے کی کوشش کی، اسلامی قدروں کے حامل، فارسی اور اردو کے رومی، سعدی، خسرو، شیرازی، جامی، فغانی، سراج، مظہر جانِ جاناں، سودا، درد، میر، ذوق، ظفر، مومن، غالب، حالی، شبلی، اکبر، اقبال، جگر اور عاجز جیسے ممتاز اور استاذ شاعروں کے کلاموں میں اخلاقی قدروں کی تلاش کی اور انہیں ادب اسلامی کے نگینے میں پرو کر عزت وعظمت کا تاج پہنا دیا۔

قرآنیات مولانا کا ایک اہم موضوع تھا، قرآنی ماحول میں تربیت پائی تھی، اساطین قرآنیات کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا، قرآنی تعلیمات وخصوصیات زندگی کے ہر ہر قدم اور ہر ہر نفس میں رچی بسی تھیں، قلم اٹھایا تو "قرآن مجید-انسانی زندگی کا رہبر کامل" منصۂ شہود میں آیا، قرآن مجید اور علم، قرآن مجید اور انسان، خالق کائنات کی تابع داری، انبیاء کرام کی بعثت، قرآن آخری کتاب ہدایت، فضائل قرآن، قرآن کے مختلف علوم ومباحث، قرآن کی اعجازی خصوصیت، تعلیماتِ قرآنی، نبی آخر الزماں کا مقام وکام اور حسن سیرت اور اخلاق حسنہ جیسے اہم مباحث پر سیر حاصل گفتگو کی اور قرآنی رہبری کی حقیقتوں اور حکمتوں کو اردو بولنے والوں کے سامنے واضح اور مبین کیا۔ قرآنیات کے ساتھ ساتھ تصنیف وتالیف کا ایک نہایت ہی اہم اور سنجیدہ میدان جو حضرت کی خاندانی تربیت اور خاندانی ورثہ کا حصہ تھا، وہ ہے سیرۃ النبی ﷺ، اس موضوع پر "رہبر انسانیت" اپنی نوعیت کی ایک انوکھی کتاب ہے، جس میں بعثت نبوی کے انسانی، دعوتی، اصلاحی اور تربیتی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ بھی مولانا کا ایک تصنیفی کارنامہ ہے، جو ہزاروں لاکھوں لوگوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوگا۔

ملک وملت کی ہر مشکل گھڑی میں مولانا پوری تیاری اور ثابت قدمی کے ساتھ ہمیشہ میدان میں ڈٹے رہے۔ درازی عمر کے باوجود نقد وادب پر مولانا کے محاضرات اور دروس طلبائے ندوۃ العلماء کے لیے کسی گراں قیمت نعمت سے کم نہیں تھے۔ ادب وتاریخ مولانا کا اہم موضوع تھا، کئی دہائیوں تک ندوۃ العلماء میں زبان وادب، تاریخ وجغرافیہ اور سیرت وتفسیر کی کامیاب تدریس کا تجربہ تھا، ہزاروں طلبہ مولانا کی تدریسی خوبیوں کے گواہ تھے۔ ملک کے بڑے بڑے سیاسی لیڈر مولانا کی مختصر ملاقات کو اپنے لیے باعث فخر وعزت سمجھتے تھے، ان کا تعلق کانگریس پارٹی سے ہو، یا بی جے پی سے، یا سماج وادی سے، یا بہوجن سماج وادی سے، یا جنتا پارٹی سے، ہر لیڈر کے لیے مولانا کا ایک ہی پیغام تھا، پیغام محبت، پیغام انسانیت، پیغام مساوات، پیغام امن۔ آج حضرت ہم سے ایسے رخصت ہوئے کہ گویا کوئی سہارا ہم سے چھن گیا ہو ؎

ہم سفر اب مرے پہلو میں مرا دل نہ رہا
جس میں تو گرم سفر تھا وہی محمل نہ رہا

ربِّ ذوالجلال محسن انسانیت، رحمت عالم کے اس عظیم وارث کو خلد بریں میں حوض کوثر کا سایہ عنایت فرمائے اور امت مسلمہ کو نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

راہِ عمل

"کسی فرد مسلم کے لیے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت سے استثناء نہیں، بلکہ اسی میں اس کی فلاح اور نجات ہے، لیکن اگر وہ یورپ کی تقلید کو اختیار کرتا ہے، تو اسے راستہ میں ایسی گھاٹیاں اور سراب پیش آئیں گے جو آسمانی نظام زندگی کی اتباع سے روک دیں گے۔" (امت مسلمہ-رہبر اور مثالی امت: ۱۲۰)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

زیبِ لوح و قلم

ڈاکٹر عبید الرحمٰن ندوی
(استاد دار العلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

اس دنیا میں تین طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ایک طبقہ تو وہ ہے جو صرف اپنے لیے سوچتا ہے، دوسروں سے اس کا کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ دوسرا طبقہ وہ ہے جو اپنے لیے زیادہ سوچتا ہے، لیکن دوسروں کا بھی خیال رکھتا ہے اور تیسرا طبقہ وہ ہے جو اپنے لیے کم لیکن دوسروں کے لیے زیادہ سوچتا ہے۔ یقیناً مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا شمار تیسرے طبقے میں ہوگا۔ یہی وہ طبقہ ہے جو انبیاء' صدیقین وصالحین کا طبقہ ہے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی' ناظم ندوۃ العلماء اور صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ ایک ممتاز عالم دین تھے۔آپ ایک ادیب اور انشاپرداز تھے۔۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء کو آپ کا انتقال ہوگیا۔

آپ سادات کے ایک ایسے خاندان کے چشم وچراغ تھے جس میں شاہ علم اللہ حسنی (متوفی ۱۶۸۵ء)، سید احمد شہید (متوفی ۱۸۳۱ء)، حکیم سید عبد الحی حسنی (متوفی ۱۹۲۳ء)، ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی (متوفی ۱۹۶۱ء)، سید محمد الحسنی (متوفی ۱۹۷۹ء)، مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی (متوفی ۱۹۹۹ء)، مولانا سید واضح رشید ندوی (متوفی ۲۱۰۹ء) وغیرہم جیسے علماء' مفکرین اور مذہبی رہنما پیدا ہوئے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔اللہ تعالیٰ نے انہیں غیر معمولی علم اور حکمت سے نوازا تھا۔ ان کی مختلف الجہات صلاحیتوں کو مختلف نوعیّتوں سے بیان کیا جاسکتا ہے، جیسے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بہ حیثیت ایک بڑے عالم دین، مولانا سید محمد رابع حسنی بہ حیثیت ایک مفکر، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بہ حیثیت ایک ماہر تعلیمات، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بہ حیثیت ایک مؤرخ، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بہ حیثیت ایک ادیب، مولانا سید محمد رابع حسنی بہ حیثیت ایک ماہر علوم الٰہیہ، مولانا سید محمد رابع حسنی بہ حیثیت ایک استاد، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بہ حیثیت ایک مصلح، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بہ حیثیت ایک خطیب، مولانا سید محمد رابع حسنی بہ حیثیت ایک صحافی، مولانا سید محمد رابع حسنی بہ حیثیت ایک فقیہ، مولانا سید محمد رابع حسنی بہ حیثیت ایک مصنف، مولانا سید محمد رابع حسنی بہ حیثیت ایک ہمدرد عوام شخص، مولانا سید محمد رابع حسنی بہ حیثیت ایک سیرت نگار، مولانا سید محمد رابع حسنی بہ حیثیت غریبوں کے ترجمان وغیرہ۔

صحیح معنوں میں وہ اپنے پیش رو مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی حقیقی تصویر تھے۔ وہ نہ صرف مولانا علی میاں کے بھانجے تھے بلکہ کئی دہائیوں تک ان کے معتمد رہے۔ مولانا ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندوی رقمطراز ہیں:

''شیخ رابع شیخ ابوالحسن علی حسنی ندوی کے سفر وحضر میں ہر وقت ساتھ رہتے تھے، انہوں نے متعدد موقعوں پر ان کی نیابت کی اور کئی باران کی ترجمانی کی۔اگر شیخ ندوی کوئی ذمہ داری قبول کرتے تھے تو شیخ رابع ہی اسے عملی جامہ پہناتے تھے۔''

وہ مزید فرماتے ہیں:

''مولانا رابع کی شباہت بھی شیخ ابوالحسن علی حسنی ندوی جیسی ہوگئی تھی۔ بلاشبہ مولانا رابع بلا اختلاف ان کے حقیقی جانشین تھے۔''

آپ کی تعلیم:

مولانا سید محمد رابع حسنی تکیہ کلاں' رائے بریلی' اتر پردیش' ہندوستان میں ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی اور اعلیٰ تعلیم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں حاصل کی۔ مولانا

سید ابوالحسن علی حسنی ندوی، مولانا محمد شاہ حلیم عطا، مولانا مفتی محمد سعید، مولانا سید حمید اللہ، مولانا اویس نگرامی ان کے ممتاز اساتذہ تھے۔ ندوۃ العلماء سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ دیوبند تشریف لے گئے اور مولانا حسین احمد مدنی اور وہاں کے ممتاز علماء سے بھرپور علمی استفادہ کیا۔

آپ نے ایک سال حجاز (سعودی عرب) میں گزارا، جہاں حجاز کے نامور علماء سے کافی استفادہ کیا۔

آپ کا کردار اور علمی زندگی:

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی خود رقمطراز ہیں:

''میرے پردادا سید خلیل الدین احمد حسنی (سید شاہ ضیاء النبی حسنی کے بھتیجے) جو ایک نامور زمیندار تھے' نے میرے والد میں اپنی ذاتی اور گھریلو ضروریات کی دیکھ بھال کرنے میں مہارت پیدا کرنے کے لیے خاص انتظامات کیے۔ چنانچہ میرے والد کے ذمہ داریاں زمین اور کھیتی کے معاملات کی دیکھ بھال تک محدود تھیں اور انہوں نے ہمارے ماموؤں (شیخ ندوی اور ان کے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی) کو ہماری تعلیم و تربیت کا پورا ذمہ دار بنایا تھا۔''

(ماخوذ از: عہد ساز شخصیت)

انہوں نے ان دونوں سے قابل ذکر استفادہ اور فیض حاصل کیا۔ صحیح معنوں میں ڈاکٹر عبدالعلی نے ان میں اہلیت کا بیج لگایا اور مولانا سید ابوالحسن علی حسنی نے اسے پروان چڑھایا۔ پھر وہ جہاں بھی گئے ایک گلاب کی طرح کھلے۔ بلاشبہ وہ ایک شفاف شخصیت اور عمدہ صفات کے حامل شخص تھے۔ وہ مجموعۂ اخلاق تھے۔ ان کے اندر کبھی بھی انانیت' کبر اور غرور نظر نہیں آتا تھا۔ وہ پوری قوم کے لیے ایک دھڑکتا ہوا دل رکھتے تھے۔ وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔

وہ نرم دل' باضمیر اور صالح شخص تھے۔ وہ پختہ ذہنیت اور پختہ شعور کے مالک تھے۔ وہ ہمیشہ خود کو ناموری اور شہرت سے دور رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کے نمایاں پہلوؤں میں ان کا استغنا' اخلاص' سادگی اور تقوی تھا۔ وہ سنت کی پوری پیروی کرتے تھے۔ اپنے پیش رو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی طرح انہوں نے ایک صالح اور مثالی زندگی گزاری۔ وہ سلف صالحین کے حقیقی خلف تھے۔

بہ حیثیت ایک استاد:

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی تقرری بہ حیثیت استاد ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔ آپ ایک وقف شدہ استاد تھے۔ آپ کے اندر وہ تمام بلند اوصاف اور خوبیاں پائی جاتی تھیں جو ایک اچھے استاد کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ آپ کا طریقۂ تدریس بے نظیر تھا۔ یہ آپ کی وہ تیغ تھی جسے آپ اتنے پراثر انداز میں برتتے تھے کہ جس کے مماثل کم ہی لوگ تھے۔ لاتعداد طلبہ نے آپ سے اپنی علمی پیاس بجھائی۔

آپ نے اپنے پیچھے طلبہ کی ایک کہکشاں چھوڑی ہے جو اپنے اپنے میدانوں میں تعلیمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ آپ کے لیے ایک صدقہ جاریہ ہے۔ تعلیمی میدان میں آپ کی لامتناہی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔

بہ حیثیت ناظم ندوۃ العلماء - لکھنؤ:

مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے انتقال کے بعد ۲۰۰۰ء میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہوئے۔ آپ کے دور نظامت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء نے تعلیمی میدانوں میں خوب ترقی کی۔ علاوہ ازیں متعدد دارالاقامے' درجاتِ علیا کی علیحدہ عمارت' کچھ پرشکوہ ہال' مرکزی مسجد اور مطبخ کی توسیع بھی آپ کے دورِ نظامت میں ہوئی۔ بلاشبہ آپ نے اپنی پوری زندگی ندوۃ العلماء کی ترقی کے لیے وقف کردی۔ آپ نے ندوے کی ترقی اور فروغ میں تعمیری کردار ادا کیا۔ ندوۃ العلماء کے لیے آپ کی غیر معمولی خدمات اور کارنامے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔

بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ:

مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی وفات کے بعد ۲۲/جون ۲۰۰۲ء کو مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بورڈ کے چوتھے صدر منتخب ہوئے۔ دو دہائیوں تک مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اس عہدہ پر رہے۔ بورڈ کو پیش آنے والے مسائل کو حل کرنے میں آپ نے محوری کردار ادا کیا۔ آپ کے عہد میں لاتعداد اہم مسائل حل ہوئے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ آپ ایک دانشمند عالم تھے۔ مولانا رابع

حسنی ندوی کے علم کی جامعیت اوران کے شعوری ذکاوت کا اعتراف ان کے معاصرین نے کیا ہے۔ دینی اور عصری علوم میں آپ کے تبحر کی وجہ سے آپ کوکئی اہم عہدے اور ذمہ داریاں ملیں نیز آپ کو متعدد باوقار اعزازت سے بھی نوازا گیا، جن میں عربی زبان وادب میں آپ کی غیر معمولی خدمات کے لیے صدر جمہوریہ ایوارڈ قابل ذکر ہے۔

مناصب:

۱- ناظم ندوۃ العلماء، لکھنؤ۔
۲- صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ۔
۳- صدر رابطہ ادب اسلامی۔
۴- رکن تاسیسی رابطہ عالم اسلامی، مکہ مکرمہ۔
۵- رکن مجلس عاملہ دارالعلوم دیوبند۔
۶- سرپرست اسلامک فقہ اکیڈمی، نئی دہلی۔
۷- صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ۔
۸- صدر دارعرفات، رائے بریلی، یوپی۔
۹- سرپرست مولانا آزاد میموریل اکیڈمی، لکھنؤ۔
۱۰- سرپرست مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اکیڈمی، بھٹکل، کرناٹک۔
۱۱- رکن آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز (انگلینڈ)۔
۱۲- صدر تحریک پیام انسانیت۔
۱۳- صدر دینی تعلیم کونسل، یوپی۔
اور ہندو بیرون ہند کے لاتعداد اداروں کے رکن اعزازی۔

اعزازات:

☆ صدر جمہوریہ ایوارڈ ۱۹۸۲ء۔
☆ شاہ ولی اللہ ایوارڈ، منجانب انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز ۲۰۱۵ء۔

بہ حیثیت مصنف:

آپ ایک بارآور مصنف تھے۔ آپ نے عربی اور اردو میں چار درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں۔ آپ کے ادبی کام کثیر الجہات ہیں۔ آپ کے تخلیقی کام خود میں مکمل ہیں۔ آپ نے تقریباً نثر کی تمام قسموں میں لکھا ہے۔ آپ کی مختلف کتابیں مختلف اداروں بشمول دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ داخل نصاب ہیں۔ آپ کی کچھ اہم مطبوعات درج ذیل ہیں:

عربی مطبوعات:

۱- منثورات من أدب العرب.
۲- الأدب العربي بين عرض ونقد.
۳- فی ظلال السيرة.
۴- حركة ندوة العلماء: فكرتها ومنهاجها.
۵- فی وطن الإمام البخاري.
۶- مقالات فی التربية والمجتمع.
۷- الأدب الإسلامی: فكرته ومنهاجه.
۸- تاريخ الأدب العربي: العصر الإسلامي.
۹- الأدب الإسلامي وصلته بالحياة.
۱۰- أضواء على الأدب الإسلامي.
۱۱- مختار الشعر العربي. (دوجلدیں)
۱۲- موافقات ومفارقات فی المدنية الغربية.
۱۳- روائع من الأدب الإسلامي القديم.
۱۴- أضواء على الفقه الإسلامي ومكانة الإجتهاد منه.
۱۵- الغزل الأردي: محاوره ومكانته فی الشعر.
۱۶- أضواء على الأدب الإسلامي.

اردو مطبوعات:

۱- دین وادب
۲- جزیرۃ العرب (جغرافیہ، تاریخ، تہذیب وثقافت)
۳- حج ومقامات حج
۴- رہبر انسانیت
۵- قرآن مجید- انسانی زندگی کا رہبر کامل
۶- فقہ اسلامی اور عصر جدید
۷- مسلم سماج: ذمہ داریاں اور تقاضے
۸- سماج کی تعلیم وتربیت

۹- عالم اسلامی: اندیشے اور امکانات
۱۰- غبارِ کارواں
۱۱- سمرقند و بخارا کی بازیابی
۱۲- حالاتِ حاضرہ اور مسلمان
۱۳- نقوشِ سیرت
۱۴- دو مہینے امریکہ میں
۱۵- امت مسلمہ: رہبر اور مثالی امت
۱۶- یادوں کے چراغ
۱۷- اوراقِ زندگی
۱۸- خطباتِ رابع
۱۹- تحفۂ گجرات
۲۰- معلم الانشاء (حصہ سوم)
۲۱- اصحاب رسول ﷺ
۲۲- مولانا ابوالحسن علی ندوی- ایک عہد ساز شخصیت
۲۳- اسلامی معاشرہ- سورۂ حجرات کی روشنی میں
۲۴- صبر و تقویٰ کی زندگی- سورۂ یوسف کی روشنی میں
۲۵- احتساب زندگی- سورۂ انبیاء کی روشنی میں
۲۶- حق و باطل کی کشمکش- سورۂ کہف کی روشنی میں

مترجم کتب:

۱- فضائل الدعوة إلى الله.
۲- بين التصوف والحياة.

به حیثیت صحافی:

آپ ایک مکمل صحافی بھی تھے۔ آپ نے صحافت کے میدان میں ایک مقام حاصل کیا تھا۔ تمام مذہبی علوم بشمول فقہ اور مختلف زبانوں جیسے اردو، عربی، انگریزی، فارسی وغیرہ میں آپ کی وسعت علمی کی وجہ سے آپ ہر موضوع پر بے باکانہ طور پر اچھی طرح روشنی ڈالتے تھے۔ سینکڑوں مضامین آپ کے نام ہیں۔ آپ ندوۃ العلماء سے شائع ہونے والے پانچ مجلّات جیسے: الرائد، البعث الاسلامی، تعمیر حیات، The Fragrance of East اور سچا راہی کے سرپرست تھے اور مستقل ان میں مضامین لکھتے تھے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی وفات میرا ذاتی خسارہ ہے۔ اپنے چھوٹے بھائی مولانا سید محمد واضح رشید ندوی (۲۰۱۹-۱۹۳۳ء) کی مانند آپ بھی میرے لیے وجہِ تحریک و ترغیب تھے۔ میری پہلی کتاب "The Plain Truth" کا رسم اجراء انہی کے ہاتھوں ۲۰۰۸ء میں ہوا اور انہوں نے بطور انعام مجھے 5000/روپیہ انعام دیا۔ میں کافی خوش نصیب ہوں کہ میری تازہ ترین تصنیف "Islam and Education" کی رسم اجراء بھی انہی کے مبارک ہاتھوں 21/مارچ 2023ء کو مہمان خانہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں ہوئی۔

قطعی طور پر مولانا کی وفات ندوۃ العلماء کے لیے خصوصی طور پر اور ملت اسلامیہ کے لیے عمومی طور پر ایک عظیم خسارہ ہے۔ ان کی وفات سے ایک نہ پر ہونے والا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ عالم اسلام نے ان کی وفات پر گہرے رنج و افسوس کا اظہار کیا ہے۔ دنیا کے ممتاز علمائے اسلام نے مولانا سید بلال عبد الحی حسنی کو اپنے تعزیتی پیغامات بھیجے ہیں۔ مختلف ممالک میں ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی گئی۔ وزیر دفاع راجناتھ سنگھ، وزیر اعلیٰ یوگی آدتیہ ناتھ، سابق وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو، سابق وزیر اعلیٰ مایاوتی وغیرہ نے اپنے تعزیتی پیغامات ارسال کیے۔

سب سے حیرت انگیز واقعہ ان کا آخری سفر تھا۔ ان کی دو مرتبہ نماز جناز ہوئی۔ پہلی نماز جنازہ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی کی امامت میں ندوہ میں ہوئی اور دوسری مولانا سید بلال عبدالحی حسنی کی امامت میں تکیہ کلاں میں ہوئی اور تکیہ کلاں رائے بریلی کے آبائی قبرستان میں آپ کی تدفین ہوئی۔ اندازہ ہے کہ پچاس ہزار سے زائد افراد نے آپ کی مشایعت کی۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ آپ کی کوتاہیوں کو درگزر فرمائے اور آپ کی قبر کو نور اور درخشانی سے معمور کردے اور آپ کی روح کو تسکین عطا فرمائے۔ آمین!

بات میں سادہ وآزاد، معانی میں دقیق

ڈاکٹر محمد اعظم ندوی
(استاذ المعہد العالی الاسلامی-حیدرآباد)

قلم ہاتھ میں ہے اور اس سوچ میں گم ہوں کہ کیا لکھوں! جب شخصیت ایسی عظیم المرتبت اور جلیل القدر ہو جس میں کئی رنگ قوسِ قزح کے رنگوں سے زیادہ سمٹ آئے ہوں تو مجھ جیسے قلیل البضاعت طالب علم کے الفاظ ومعانی کا دامن تنگ ہو جاتا ہے اور ایک قامت زیبا کے لیے کوئی قبائے موزوں تیار کرنا دشوار ہو جاتا ہے، مشہور ادیب اور امام لغت ابو منصور ثعالبی (و:۴۲۹ھ) نے "یتیمة الدهر" میں اپنے زمانہ کے صاحب اسلوب ادیب اور وزیر کبیر الصاحب بن عباد طالقانی (و:۳۸۵ھ) کے بارے میں لکھا ہے:

"ليست تحضرني عبارة أرضاها للإفصاح عن علو محله في العلم والأدب، وجلالة شأنه في الجود والكرم، وتفرده بغايات المحاسن، وجمعه أشتات المفاخر؛ لأن همة قولي تنخفض عن بلوغ أدنى فضائله ومعاليه، وجهد وصفي يقصر عن أيسر فواضله ومساعيه، ولكني أقول: هو صدر المشرق، وتاريخ المجد، وغرّة الزمان، وينبوع العدل والإحسان"

(يتيمة الدهر في محاسن أهل العصر: ج٣، ص: ٢٢٥)

(میرے ذہن ودماغ میں ایسے الفاظ تازہ نہیں جن سے میں علم وادب میں ان کے عالی مقام، نوازش وکرم میں ان کی جلالت شان، محاسن وفضائل اور ہمہ جہت کارناموں میں ان کی جامعیت وانفرادیت کی صحیح تعبیر وتفسیر کرسکوں؛ اس لیے کہ میرے اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ کے الفاظ بھی ان کے ادنی سے ادنی فضائل وکمالات کا احاطہ نہیں کرسکتے اور مدح وتوصیف میں میری آخری کوشش بھی ان کے فضل وکمال اور سعی وکاوش کی کم سے کم درجہ کی منظر کشی سے قاصر ہے، لیکن میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ مشرقی دنیا کے میر کارواں، اپنے آپ میں خود شرافت وعظمت کی ایک تاریخ، یکتائے روزگار اور سرچشمہ عدل واحسان تھے۔)

اگر سچ کہوں تو میرے احساسات سیدی ومولائی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کے بارے میں اس سے بڑھ کر ہیں، لیکن اظہار کا سلیقہ نہیں، میرے استاذ ربانی ومرشد روحانی، عالم اسلام کے ممتاز مفکر ومصلح، فکر ابوالحسن کے وارث وامین اور خلیفہ وجانشین حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ بھی علماء رفتگاں میں شامل ہوگئے، وہ ایک دردمند قائد، ممتاز روحانی پیشوا، اردو وعربی زبان کے کامیاب ادیب وانشاپرداز، صحافی ومدیر، مدبر منتظم اور سب سے بڑھ کر ایک عظیم وحکیم اور ستودہ صفات انسان تھے، ندوۃ العلماء سے ان کا تعلق ایک طالب علم، استاذ، ادیب اول، مہتمم، ناظم اور نہ جانے کن کن حیثیتوں سے رہا، مولاناؒ کو اللہ تعالی نے زندگی میں ہر طرح کی بلندیاں اور رفعتیں عطا فرمائیں، لیکن وہ ایک ابر رحمت بن کر خلق خدا پر سایہ فگن رہے اور ان کو یہ کہنے کا حق تھا کہ:

ہے بلندی سے فلک بوس نشیمن میرا
ابر کہسار ہوں گل پاش ہے دامن میرا

مواقع کے عدم دستیابی کا شکوہ کیا جاتا ہے، لیکن کتنے لوگ بڑے زریں مواقع خوراک وپوشاک کے معمولی ذوق وشوق کی تسکین میں گنوا دیتے ہیں، نہ جانے کتنے نوجوانوں کو سجادگی میراث میں ملتی ہے، لیکن نہ ہنر نہ کمال، نہ خوف نہ ملال، نہ سلیقہ نہ مطالعہ، وہ مواقع نہ صرف رائیگاں ہو جاتے ہیں، بلکہ خلائق کا ہجوم اور داد ودہش کی دھوم اس طرح

بدمست وغافل کیے دیتی ہے کہ یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ کس نسبت سے عزت ملی تھی، دین، علم، قلم، زبان، دعوت، خدمت اور ان جیسے الفاظ زبان کے چٹخارے بن جاتے ہیں اور قوم وملت کا جو نقصان عظیم ہوتا ہے وہ الگ ہے، یہ وہ لوگ ہیں جو ''عِظامی'' ہوتے ہیں، ان کو مسند ارشاد پر کھوں سے ملتی ہے، وہ اسے اس حال میں چھوڑتے ہیں کہ کچھ توقیر بڑھا نہیں پاتے، بلکہ بچا بھی نہیں پاتے اور ''نام نیک رفتگاں'' کو ضائع کر کے اس دنیا سے بے فیض سدھار جاتے ہیں، کچھ ''عِصامی'' ہوتے ہیں جو اپنی محنت اور خود اعتمادی کے بل بوتے ترقی کرتے ہیں اور بڑی امانت واحتیاط کے ساتھ زندگی کے ایام گذار کر ملت کے لیے سرمایہ فخر ومباہات میں اضافہ کا سامان کرتے ہیں، خاندانی لوگوں میں اگر کوئی ''عصامی صفات'' پیدا ہوجائے کہ اس میں جفاکشی بھی ہو، علم وفضل بھی، صلاحیت وذکاوت بھی، شعور وآگہی بھی اور پھر وہ خود جاہ ومنصب کا طلب گار نہ ہو، وہ عہدہ کی نزاکت، اپنے عہد کے تقاضوں کا ادراک اور عہد وفا کا پاس رکھتا ہو تو اسے صرف خاندانی سمجھ کر اور موروثیت کے الزام سے بچنے کے لیے مواقع نہ دینا بھی بڑا ظلم ہوتا ہے، ندوۃ العلماء کے ارباب حل عقد نے حضرت مولانا رابع صاحبؒ پر ان کی علمی وانتظامی صلاحیت، ان کی فطری شرافت، ان کے احساس مسؤولیت، اور کارواں کو لے کر چلنے کی ہمت وطاقت کو دیکھتے ہوئے مختلف مناصب کے لیے ان کا انتخاب کیا، مولانا نے غایت درجہ حکمت وفراست کے ساتھ اپنے دور اہتمام ونظامت کو کامیاب بنایا، ملک وملت کی نظر مولاناؒ کی کامیاب قیادت پر پڑی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بحیثیت صدر آپ کا انتخاب کیا اور مسلسل کم وبیش دو دہائیوں تک آپ اس عہدۂ صدارت پر فائز رہے اور ملت کے اجزائے پریشاں کی شیرازہ بندی کرتے رہے، گو کہ مولانا کا احساس ازراہ تواضع یہی تھا کہ:

خَلَت الديارُ فسُدت غيرَ مُسَوَّدِ
ومن الشقاء تفَرُّدی بالسؤدَدِ

(بڑے لوگ رخصت ہوگئے، ملک خالی ہوگیا تو میں سردار ہوگیا، جب کہ میں سرداری کا اہل نہ تھا اور اس منصب سیادت میں میرا تنہا رہ جانا بھی حرماں نصیبی کی بات ہے۔)

لیکن حق یہ ہے جیسا کہ ابن خلکان نے حضرت سفیان ثوریؒ کے بارے میں لکھا ہے:

"أجمع الناس على دينه وورعه وزهده وثقته"

(لوگ ان کی دین داری، تقوی، زہد اور معتمد علیہ ہونے کی صفات پر متفق تھے۔)

اس عہد کے معتبر اور ثقہ حضرات حضرت مولانا رابع صاحبؒ پر نہ صرف اعتماد کرتے تھے اور ان کو نقطۂ اتفاق سمجھتے تھے، ان سے سچی محبت کرتے تھے بلکہ ان پر جان چھڑکتے تھے، مجھے حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب دامت برکاتہم جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی ایک دہائی سے زیادہ عرصہ سے رفاقت وہم نشینی اور ان کے زیر سرپرستی تدریسی وتحقیقی انداز کی کچھ خدمت انجام دینے کے مواقع حاصل ہیں، مولانا دامت برکاتہم کو خود بایں ہمہ جلالت شان حضرت مولاناؒ کے ساتھ تخاطب اور مراسلت میں جتنا باادب پایا کسی اور شخصیت کے ساتھ نہیں اور حضرت مولاناؒ کی آمد کی خبر پاکر جتنا پرجوش اور جس قدر خوش وخرم دیکھا کسی اور موقع سے نہیں، بیسیوں لوگ اس عہد کی مختلف نادرۂ روزگار شخصیات کے بارے میں حضرت مولاناؒ کے تعلق سے یہ گواہی دیں گے، یہ سب مولاناؒ کے کمال ذاتی کے علاوہ مولانا علی میاںؒ کی تربیت کا اثر تھا اور دنیا نے دیکھا کہ یہ جانشینی ایسے ہی حصہ میں نہیں آجاتی، خلاق ازل کے اصطفاء کے بعد خلق خدا کی شہادت کو اس میں دخل ہوتا ہے، سچ یہ ہے کہ ایسی خصوصیات اس دور میں عنقا ہیں، آج کسے ''تمنائے سروری'' نہیں، لیکن کوئی خود کو ویسا بنا کر تو دکھائے، اقبال نے کہا تھا:

چاہتے سب ہیں کہ ہوں اوج ثریا پہ مقیم
پہلے ویسا کوئی پیدا تو کرے قلب سلیم

اور ان کی یہ نصیحت کہ:

آں عزم بلند آور آں سوز جگر آور
شمشیر پدر خواہی بازوئے پدر آور

(اگر تم اپنے باپ کی تلوار چاہتے ہو تو اپنے باپ سا مضبوط بازو، بلند ارادہ اور حرارت جگر بھی پیدا کرو۔)

یاد ان دنوں کی آتی ہے جب میں مدرسہ ضیاء العلوم میدان پور رائے بریلی میں پڑھتا تھا، کبھی کبھی مولاناؒ کے مفصل بیانات ہوتے تھے جن میں ایک جملہ یاد رہ گیا کہ ''طلب علم کی لذت جب تک محسوس نہ ہو جسے "متعة الطلب" یا "متعة القراءة" کہتے ہیں، سمجھو ابھی تمہیں علم سے مناسبت پیدا نہیں ہوئی، اس میدان میں خود کو گھلانا ہوتا ہے۔''

مولاناؒ کے دست مبارک سے سالانہ مسابقات کے انعامات حاصل کرنے کا بھی شرف حاصل ہوتا رہتا تھا، اس وقت مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ باحیات تھے، تکیہ کلاں میں عصر کے بعد کی مجالس میں حضرت مولاناؒ کو بڑے پیارے سے ''رابع'' اور ''واضح'' کہہ کر خطاب کرتے ہوئے سنا، ایک مرتبہ مولانا ابوبکر صاحبؒ نے فیصل ایوارڈ سے متعلق کچھ چٹکی لی کہ اور کوئی ہوتا تو بڑی سی چادر میں وہ ایوارڈ حاصل کرتا، آپ نے گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا، لپک کر گئے نہیں اور سب تقسیم کر دیا، تو حضرت مولاناؒ نے گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے پوچھا: ''رابع! ایوارڈ کی عربی کیا ہوتی ہے؟'' مولانا واضح صاحبؒ قریب ہی تھے، انہوں نے فوراً کہا: وہی انعام والی "الجائزة"۔ الرائد کے اداریئے جو اکثر مولانا رابع صاحبؒ کے قلم سے ہوتے تھے، عربی مضمون نگاری کا طریقہ سیکھنے میں ہمارے اولین رہبر ثابت ہوئے، پھر مولاناؒ کے منتخب کردہ ادبی شہ پاروں کا مجموعہ ''منشورات من أدب العرب'' جو ایک ادیب ساز کتاب ہے، نصاب میں پڑھی، مجھے خاص طور پر "بيني وبين بني أبي" "الربانيون" اور "بغداد" جیسے اسباق بہت پسند آتے تھے، ان کی تعبیرات، الفاظ اور اشعار یاد کرتا تھا، اس وقت اس کتاب کی اہمیت کا اندازہ کہاں ہو سکتا تھا، بعض اسباق کو سمجھنے میں کافی دشواری بھی ہوتی تھی، لیکن بعد میں کچھ کچھ سمجھ آئی کہ مولاناؒ نے اپنے انتخاب میں زمان ومکان کے کتنے وسیع عرصہ اور رقبہ کا احاطہ کیا ہے اور کتنا قیمتی علمی اثاثہ مدارس کے طلبہ کے لیے تیار کیا ہے، جس سے عصری اداروں میں بھی استفادہ کیا جا رہا ہے اور نہ جانے بعد کے کتنے منتخبات میں اس سے فائدہ اٹھایا گیا، کاش درس نظامی میں اسے نصابی کتاب کے طور پر قبول عام حاصل ہوتا۔

افسانہ از افسانہ می خیزد، معلم الانشاء کی جلد سوم کو عربیت نوازی میں کہاں فراموش کیا جا سکتا ہے، یہ کتاب ہاتھ پکڑ کر قدم بہ قدم مضمون نگاری کے گر سکھاتی ہے، اگر کوئی طالب علم صبر کے ساتھ جو حصول علم کا لازمہ ہے، اس کتاب کی روشنی میں انشا نگاری کی مشق کرے تو اسے ایک مضمون کے اجزائے ترکیبی سے بھی واقفیت ہوگی اور ان کی ترتیب وتہذیب کے اسالیب بھی معلوم ہوں گے، جو اردو زبان کی مضمون نگاری میں بھی کام آ سکتے ہیں، لیکن افسوس کہ عام طور سے طلبہ اس کتاب سے کما حقہ استفادہ نہیں کرتے بلکہ صرف ترجمہ نگاری کو ہی انشا پردازی اور عربی دانی سمجھتے ہیں، حالانکہ عربی نویسی کا اصل جوہر مافی الضمیر کے قلمی وزبانی اظہار میں ہے، اسی ضمن میں مولانا کی ''الادب العربی بین عرض ونقد'' کا ذکر کیا جا سکتا ہے، کتاب تو تاریخ ادب عربی اور نقد ادبی میں شد بد پیدا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اور اصلاً اس کا ابتدائی خاکہ مولاناؒ کے دروس ومحاضرات سے ہی تیار ہوا تھا، لیکن یہ کتاب طریقہ اظہار بھی سکھاتی ہے اور عناصر ادب کو بڑی اہمیت کے ساتھ اجاگر کرتی ہے، بطور خاص اس کا تمہیدی مقدمہ جو حقیقت ادب اور تحلیل ونقد وغیرہ سے متعلق ہے اور جس کی تدریس ایک عرصہ تک مولاناؒ ہی کے ذمہ رہی، مجھے بھی مولاناؒ سے یہ حصہ پڑھنے کا موقع ملا، مولانا کی تدریس میں اصل ترکیز معانی سے پہلے الفاظ کی حقیقت تک رسائی پر ہوتی تھی، عبارت خوانی کے دوران ایک ایک لفظ پر غور فرمایا کرتے تھے، مترادف الفاظ کے معنوی فروق اور حرکات کے فرق سے جو تبدیلیاں الفاظ کے معانی میں آتی ہیں اور وہ بسا اوقات بڑی نازک ہوتی ہیں، ان پر خاص توجہ فرماتے تھے مثلاً "حسب" "أجل" اور

"وسط" جیسے الفاظ ساکن الاوسط ہوں تو کیا معنی ہوں گے اور متحرک الاوسط ہوں گے تو کیا معنی ہوں گے، ایک مرتبہ ایک طالب علم نے ابوالفرج اصبہانی کے پڑھنے میں غلطی کی تھی تو سخت تنبیہ فرمائی تھی اور فرمایا: ''اعلام کو صحیح ضبط کرنا سیکھو اور یہاں تو لفظ سے واضح ہے، بفتحتین پڑھو۔'' مولانا نے عاطفہ، فکرہ، خیال اور صورت لفظیہ یعنی عناصر ادب کی بھی بڑی دلنشیں تشریح فرمائی تھی جو ہمیشہ کام آئی، اسی طرح علمی وادبی تحریر میں کیا فرق ہوتا ہے اس کو بڑی خوبصورتی سے سمجھایا، فنون لطیفہ کی کیا خصوصیات ہوتی ہیں ان کو واضح کیا اور بتایا کہ دراصل یہ چیزیں وجدان اور فطری ذوق سے زیادہ تعلق رکھتی ہیں، اگر آپ کہیں کہ یہ گلاب کا پھول مجھے اچھا لگتا ہے تو یہ آپ کے وجدان کی کیفیت ہے، اس کی وجہ نہیں بتائی جاسکتی، سرخ ہے تو اور بھی چیزیں سرخ ہوتی ہیں، ساخت ہے تو اس سے زیادہ خوبصورت بناوٹ کی چیزیں موجود ہیں، خوشبو اور اس کی نزاکت، ہر دلیل پر یہی سوال ہوسکتا ہے، اخیر میں آپ کہتے بس مجھے پسند ہے، یہ آپ کے ذوق کی بات ہے، ہوسکتا ہے کسی کو کوئی اور پھول پسند ہو اور اس کے پاس بھی اپنی دلیلیں ہوں جن سے آپ متفق نہ ہوں، ہاں ذوق سلیم میں جب فرق آیا تو نقد اور ادب کے مناہج بھی وجود میں آگئے، اب ادب منہجی اور نقد منہجی پر بھی گفتگو کی جاتی ہے اور اس طرح کسبی طور پر بھی آپ ان میں مہارت حاصل کرتے ہیں۔

علیا ثانیہ میں ''مختار الشعر العربی'' مولانا سے پڑھی جو خود دو جلدوں میں مولانا کا شعری انتخاب ہے، اس میں ابوتمام کے قصیدہ بائیہ "السیف أصدق إنباء من الکتب" کی بھی خوب تشریح اور منظر کشی فرمائی تھی، ایسا لگتا تھا ہم بھی فتح عموریہ کے سفر میں معتصم کے کارواں میں شریک ہیں اور پھر "وا معتصماہ" کو مفکر اسلامؒ نے کس جذبہ ایمانی کے تحت اپنا عنوان بنایا، اس پر گفتگو فرمائی، اسی ضمن میں مولاناؒ کے مخصوص اور نادر عناوین پر بھی روشنی ڈالی جیسے: "فلو لا کان من القرون من قبلکم أولوا بقیة" یا "اللّٰہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادة العباد إلی عبادة اللّٰہ" اور "أنتم فی رباط دائم" اور یہ بتایا کہ دعوتی اسپرٹ، ذوق سلیم اور "سلیقة أدبیة" کے ساتھ قرآن وحدیث کا مطالعہ کرو یا ادب عربی اور تاریخ اسلامی کا، تمہیں وہ سرا ہاتھ آجائے گا جو تمہاری تحریر وتقریر میں امتیاز واثر پیدا کردے گا، یہیں سے تم حضرت مولانا کی تحریک ادب اسلامی کی معنویت کا بھی ادراک کرسکتے ہو، مولاناؒ دوران درس بعض اسلامی احکام کے اسرار وحکم پر بھی روشنی ڈالتے تھے، مثلاً اسلام نے غلام باندی بنانے کے سلسلہ کو کیوں جاری رکھا اور اس سلسلہ میں اسلام نے کیا اصلاحات کیں اور کیسے رفتہ رفتہ ان کو آزاد کرنے کی سمت قدم بڑھایا، اس سلسلہ میں آج دنیا کے کیا قوانین ہیں، یہ تفصیلات پہلی مرتبہ مولانا سے ہی سے سنیں، مولانا نے کسی لفظ کی تشریح میں سورۂ محمد کی آیت: ۴ کے اس حصہ ﴿فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً﴾ کا حوالہ دیا اور اسی سیاق میں یہ گفتگو فرمائی، دو باتیں کثرت سے بیان فرماتے تھے، ''جاہلیت'' حلم کی ضد ہے علم کی نہیں، اس دور میں کچھ خاص قسم کے علوم موجود تھے، جیسے شاعری وعلم نجوم وغیرہ، لیکن ان میں حلم نہیں تھا اور دوسری بات یہ کہ عہد عباسی علم وفن کے عروج کا دور تھا؛ اس لیے اس دور کے نمونوں میں تمہیں شعری غنائیت کے ساتھ ساتھ علم وفلسفہ کا رنگ ملے گا، جس سے جاہلی شاعری کا دامن خالی ہے، لیکن اس دور کی شاعری فطرت سے قریب ہے، اس میں رنگ آمیزی نہیں، شعور واحساس کا بے ساختہ اظہار ہے، دونوں کی اپنی اپنی خصوصیات ہیں، بعد میں یہ چیزیں تفصیل سے پڑھنے کا موقع ملا، لیکن حضرت مولاناؒ کے فکر وادب اور نقد وتاریخ میں رچے بسے ہوئے یہ فقرے ان مضامین کے فہم میں ہمیشہ کام آئے، جس ادیب القرن نے تقریباً تین چوتھائی صدی عربی زبان وادب کی خدمت میں گذار دی ہو اس کو بجا طور پر یہ کہنے کا حق ہے کہ:

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدہ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوق وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

مولاناؒ جب آغاز سال میں خطاب فرماتے تو طلبہ کو تنظیم وقت، سحر خیزی، یکسوئی اور تعمیر شخصیت کے اہم پہلوؤں کی جانب

خاص توجہ دلاتے، اس سلسلہ میں مختلف مواقع پر چند اشعار مولانا کے سنائے ہوئے یاد آتے ہیں، ایک جگر کا یہ شعر:

گھٹے اگر تو بس اک مشت خاک ہے انساں
بڑھے تو وسعت کونین میں سما نہ سکے

اور اکبر الہ آبادی کا یہ شعر:

ہم کیا کہیں احباب کیا کار نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی، پھر مر گئے

اور علامہ محمد اقبال کی مشہور نظم ''محراب گل افغان کے افکار'' کا یہ قطعہ:

موسم اچھا، پانی وافر، مٹی بھی زرخیز
جس نے اپنا کھیت نہ سینچا، وہ کیسا دہقان

اپنی خودی پہچان
او غافل افغان!

مولاناؒ نے اس میں جزوی ترمیم کرتے ہوئے ''او غافل انسان!'' پڑھا، ایک موقع سے فرمایا: پاس ظنون کا مجموعہ ہے: "وإن الظن لا یغنی من الحق شیئاً" تمہیں اتنی محنت کرنی چاہیے کہ تحقیقی علم حاصل ہو اور کچھ بننا ہے تو لگن سے کام کرتے رہو، بے جا بہانے مت بناؤ، دنیا بڑی ظالم ہے، جو پیچھے رہ گیا، رہ گیا، کوئی اس کا عذر نہیں سنتا، حتی کہ یہ بھی نہیں کہ ہم بیمار تھے اور ہمارے ساتھ یہ مجبوری تھی، اس لیے عالی ہمت بنو اور آگے بڑھو، مولاناؒ کو عبادت و تلاوت میں آداب و مستحبات کی بھرپور رعایت کرتے ہوئے دیکھا، تلاوت کے وقت یک زانو ہو جاتے تھے۔

مولانا انتہائی باوقار اور بلند اہداف انسان تھے، گفتگو تول کر کرتے تھے، عزم بے حزم ان کو گوارا نہ تھا، جب شروع شروع پرسنل لا کے صدر ہوئے تو میڈیا کے نمائندے ٹوٹ پڑے اور بار بار انٹرویو لینا چاہتے اور ہر بار بات توڑ مروڑ کر پیش کی جاتی، مولانا احتیاط کرنے لگے اور بیانات لکھوا کر بھیجتے، ۲۰۰۶ء میں جمشید پور تشریف لائے، امارت شرعیہ کی جانب سے منعقدہ جلسہ عام میں خطاب فرمایا، اس میں ایک جملہ اس قسم کا آیا کہ مسلمان حرام کے پیسے اور حرام لقمہ سے خود کو بچائیں، دوسرے دن ہندی روزنامہ ہندوستان (رانچی) میں چھپا: ''حرام خور مسلمان ہوشیار: رابع ندوی'' مولانا کو معلوم ہوا تو بہت ناراضگی کا اظہار کیا، دوسرے دن جب اخباری نمائندے مزید انٹرویو کے لیے پہنچے، مولانا نے اس غلط آہنگ خبر کا حوالہ دیا اور فرمایا کہ آپ سوالات قلمبند کرا دیں، میں تحریری جوابات ارسال کر دوں گا، تاکید کی کہ ان میں کوئی ردوبدل نہ کیا جائے، مولانا موقع محل کے اعتبار سے گفتگو فرماتے تھے، اب وہاں کی جامع مسجد کے صدر صاحب نے اپنے استقبالیہ میں مسجد کے تعلق سے ایسا تعارف کرایا اور مستقبل کا ایسا تعلیمی خاکہ پیش کیا کہ معلوم ہوا وہ اسی تعلیم و تربیت کے موضوع پر منعقد ہونے والی نشست ہے، چنانچہ مولانا نے بھی اپنے خطاب میں ساؤتھ افریقہ اور امریکہ وغیرہ کے دینی و عصری تعلیم میں امتزاج کے تجربات اور اس سلسلہ میں اپنی رائے پیش فرمائی، وہ گفتگو بڑی عالمانہ اور دانشورانہ تھی، جب مولانا کو معلوم ہوا کہ نہیں، یہ حضرات کسی تعلیمی نظام پر نہیں بلکہ حضرت کی عمومی نصیحت سننے آئے تھے اور عام مصلیان مسجد تھے، تو مولانا نے افسوس کا اظہار کیا اور فرمایا کہ کسی کو متنبہ کرنا چاہیے تھا، اس میں کوئی حرج نہیں، حسب حال گفتگو ایک امانت ہے جس کا ہمیں خیال رکھنا چاہیے۔

مولاناؒ کی عادت تھی کہ کسی بھی شہر میں بالعموم ایک ہی خاندان کے مہمان ہوتے، یہ پاس خاطر کی وجہ سے تھا، کہیں جاتے تو قریبی وقت میں انتقال کرنے والے اہل تعلق کے ورثا کے یہاں تعزیت، یا بیماروں کی مزاج پرسی اور عیادت کے لیے جاتے، ضعف پیری ضرور تھا مگر ذہن و دماغ الحمد للہ شاداب تھے، مولاناؒ کے یہاں قدر شناسی اور ہنر پروری کا بھی خوب جذبہ اور ملکہ تھا، جس کا اندازہ ان کے تربیت یافتگان کو دیکھ کر کیا جا سکتا ہے، اخیر اخیر میں کچھ ہنگامہ آرائیاں اور تلخ کامیاں بھی ہوئیں اور منہ چڑانے سے بد دعائیں دینے تک کی گستاخیاں کی گئیں، زباں بگڑی، دہن بگڑا، لیکن مولاناؒ نے اپنے قلم اور اپنی زبان پر جیسے تالا لگا لیا اور self respect میں

کوئی کمی نہ آنے دی، ہی مولاناؒ کی عادت تھی، ہم نے بنجارہ ہلز، حیدرآباد میں غالباً حضرت مولاناؒ کے آخری سفر میں دیکھا کہ علی الصباح نماز فجر کے بعد مختلف مسلک ومشرب کے نمائندہ افراد مولانا کی قیام گاہ پر حاضر ہوئے، کچھ تنظیمی معاملات میں شکوہ کناں تھے، مولاناؒ آرام فرمارہے تھے، یہ حضرات کمرہ کے باہر ہال میں زور زور سے انہی نکات پر گفتگو کررہے تھے جو انہیں مولانا کے سامنے پیش کرنے تھے، ہم لوگوں کے اشارہ کرنے کے باوجود ان کی جہری گفتگو میں کوئی خاص فرق نہ آیا، مولانا کو اور ان کے تمام رفقاء کو نیند میں خلل ہوا، رات آنکھوں میں گزاری تھی، فجر پڑھ کر آرام کا تقاضا تھا، لیکن مولانا کو جیسے ہی معلوم ہوا کہ کچھ لوگ ان کے انتظار میں ہیں، مولانا فوراً باہر تشریف لائے، میں نے ان حضرات کو دیکھا، وہ مولانا کو دیکھتے ہی بالکل باادب ہوگئے، ان کا جوش ٹھنڈا ہوگیا اور سب ایک دوسرے کو گفتگو کے لیے آگے کرنے لگے، مولاناؒ نے پوری توجہ سے ان کی بات سنی، ایک صاحب دوبارہ پرجوش ہوگئے اور نام لے کر شکایت درج کرانے لگے، مولاناؒ نے ان کو اپنی بات کہنے کا پورا موقع دیا اور اخیر میں بہت مختصر گفتگو کی، جس میں ان کو معاملات کی یکسوئی کا پورا اطمینان دلایا، مولاناؒ نے ذرہ برابر اپنی تکلیف کا اظہار نہ ہونے دیا اور مسکرانے کی کوشش کرتے رہے، بات طویل ہوگئی، پھر بھی ان کو روک ٹوک نہیں کیا اور بیک وقت کئی سنتوں پر عمل کرکے دکھایا، پیرانہ سالی، ضعف ونقاہت، سفر کی تکان اور کاموں کے ہجوم کے باوجود یہ صبر وتحمل اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ ہوتا ہے جو ان بزرگوں کو عطا ہوتا ہے اور یہی ان کی محبوبیت کا راز ہے، تحمل کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ اپنے کئی خوردوں اور عزیزوں اور اخیر میں اپنے عزیز ترین بھائی کے جنازہ کو کاندھا دینا پڑا، لیکن اف تک نہ کیا اور آس پاس کے لوگوں نے صاف محسوس کیا کہ:

نہ سکت ہے ضبط غم کی نہ مجال اشکباری
یہ عجیب کیفیت ہے نہ سکوں نہ بے قراری

ذاتی تعلق کی بات کروں تو ربط وتعلق میں ہمیشہ کوتاہی ہوئی، بلکہ بسا اوقات جب ملاقات کرتا اور مولانا پہچان نہ پاتے تو مولانا واضح رشید صاحبؒ حضرت کو یاد دلاتے کہ زاہد کے بھائی ہیں؛ چونکہ میرے عزیز از جان ودل بھائی اور رفیق وہمدم مولانا محمد زاہد حسین ندوی کی تکیہ حاضری معمول کے مطابق ہوتی رہتی ہے اور ان حضرات علم وفضل سے ان کا گہرا تعلق تھا اور ہے اور وہ عشق ہے جس نے ان کے دشت وکوہسار آباد کر ڈالے ہیں، البتہ مجھے بھی کچھ نمائندگی کے مواقع ہاتھ آئے، المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے قرآن سیمینار (۲۰۱۱ء) اور سیرت سیمینار (۲۰۱۶ء) کے اجلاس عام میں دوبار مجھے مولانا کا پیغام پڑھ کر سنانے کی سعادت ملی، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے فقہی سیمینار منعقدہ ممبئی (۲۰۱۷ء) میں عرب مہمانوں کو بروقت خطابات اور مناقشات کا تحریری طور پر ترجمہ فوریہ پیش کرنا تھا، اس موقع سے مولاناؒ کے خطاب کا بطور خاص ترجمہ مکمل طور پر پیش کرنے کا شرف حاصل ہوا، ایک واقعہ بھی ہوا، ایک رسالہ کا میں نے عربی میں ترجمہ کیا تھا، جس کی بعض عبارتوں سے ایسا مترشح ہوتا تھا کہ ندوۃ العلماء کسی ماضی کی تعلیمی تحریک کا ہی امتداد ہے، اس کا کوئی نمایاں امتیاز نہیں، بعض حضرات کو اس پر اعتراض تھا، شدہ شدہ یہ بات مولاناؒ تک بھی پہنچی، مجھے معلوم ہوا مولاناؒ کو بھی یہ بات پسند نہیں آئی، گوکہ مؤلف نے بھی اس کی وضاحت کردی، لیکن میں نے الگ سے مولاناؒ کو خط لکھا کہ میں نے اصل عبارت کے ترجمہ میں کوئی ترمیم نہیں کی، لیکن حاشیہ میں ندوۃ العلماء کا وہ تعارف کرادیا جو خود عمائدین ندوہ میں معتبر ہے، پھر بھی مجھے اس حصہ کو قلم انداز کرنا چاہیے تھا، میں موضوع کی نزاکت کو سمجھ نہیں سکا، مولاناؒ نے فرمایا: مترجم بھی آدھا مصنف ہوتا ہے، لیکن کوئی بات نہیں، وہ تو بات آئی گئی، تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں، یہ ہوتا ہے اور اس سے تجربہ بھی ہوتا ہے۔ میں نے مولاناؒ کو پایا کہ انہوں نے اپنے انداز سے مجھے اطمینان دلادیا کہ مجھے تمہاری نیت پر شبہ نہیں، بے فکر رہو اور یہی چیز میرے لیے فرحت اور اطمینان قلب کا باعث ہوئی، یہ خط لے کر میں حیدرآباد میں مولاناؒ کی قیام گاہ پر ملا تھا اور دوسرے

دن روانگی کے وقت ٹرین کی بوگی میں دوبارہ الوداعی ملاقات کی تھی، مولانا پہچان بھی گئے اور رازدارانہ طور پر اتنی بشاشت سے یہ سب باتیں ارشاد فرمائیں کہ میں آج تک اس کی ٹھنڈک اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں، نہ غبار خاطر نہ بار خاطر۔

مولاناؒ کی یہی خوئے دل نوازی تھی جس نے ان کو مرجع خلائق بنادیا تھا، کوئی بڑا سے بڑا عالم بھی "فظ وغلیظ" (تندخو اور سنگ دل) ہو تو لوگ اس کے اردگرد سے چھٹ جاتے ہیں، میں نے مولانا کے بعض سینئر شاگردوں سے سنا کہ مولانا یہ بھی گوارا نہیں فرماتے تھے کہ وہ اوپر بیٹھے ہوں اور کوئی شاگرد ان سے ملنے گیا ہو اور وہ نیچے بیٹھ جائے بلکہ اوپر بٹھاتے، کسی ایک موقع سے فرمایا کہ تمہیں تو لوگ با ادب کہیں گے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ مجھے مغرور کہیں، بے تکلف اوپر بیٹھو، لیکن اس کے ساتھ اگر کسی سے نشست میں غلطی ہوئی تو اس پر نکیر بھی فرماتے، ایک صاحب سے حضرت مولانا مخاطب تھے، دوران گفتگو ایک قدیم شاگرد آگئے، فرط جذبات میں گرم جوشی سے ملے اور وہیں مولانا کے سامنے بیٹھ گئے اور مولانا اور ان صاحب کے درمیان جن سے مولانا مخاطب تھے حائل ہوگئے، تو فرمایا: آپ اس طرف آجائیں، کسی کی طرف پیٹھ کرکے نہیں بیٹھا جاتا، یہ مولاناؒ کا انداز تربیت تھا اور یہی عادت شریفہ:

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہو متاع
تخیل ملکوتی وجذبہ ہائے بلند

مولانا کے مزاج ومذاق میں سادگی کا عنصر غالب تھا، یہاں تک وہ تحریر وتقریر میں بھی فطری طور پر نرم گو اور نرم رو واقع ہوئے تھے، عربی زبان ہو یا اردو زبان، مولانا کی نظر "یفقھوا قولی" پر رہتی تھی کہ قاری تک میری بات آسانی سے منتقل ہوجائے، بسا اوقات اس کے لیے مولانا بھاری بھرکم الفاظ وتعبیرات پر مشتمل انشا پردازی سے بھی گریز کرتے تھے، ان کی کیفیت فرزدق کی طرح "ینحت من صخر" کی نہ تھی، بلکہ جریر کی طرح بلاتمثیل "یغرف من بحر" ان کا خاصہ تھا، پروفیسر وصی صاحب مرحوم سابق معتمد مال ندوۃ العلماء نے بجا طور پر لکھا تھا کہ مولانا کے "مضامین کی اونچی علمی سطح پڑھنے والوں کو مرعوب کرنے کے بجائے متاثر کرتی ہے۔"

(مقدمہ غبار کارواں، ص ۶)

انہوں نے ہی کہیں لکھا تھا کہ شاعری میں جسے سہل ممتنع کہتے ہیں، اس کے نمونے مولانا کی نثر میں جابجا مل جاتے ہیں، اس تسہیل کی کچھ مثالیں یہاں میں صرف مولانا کی کتاب "غبار کارواں" سے ہی نقل کرتا ہوں؛ چونکہ یہ میری پسندیدہ کتابوں میں ایک ہے، ان میں مولانا کی کسر نفسی اور احتیاط کی جھلکیاں بھی مل جائیں گی، مولانا لکھتے ہیں:

"رابطہ ادب اسلامی کا قیام ۱۹۸۴ء میں باقاعدہ ایک عالمی انجمن کی حیثیت سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی سرکردگی میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں عمل میں آیا، مجھے بھی اس کی کچھ خدمت کا موقع ملا جو میرے لیے عزت ومسرت کا باعث ہے۔" (ص ۳۱)

مولانا مراکز کے بجائے مرکزوں اور ذرائع کے بجائے ذریعوں لکھتے ہیں تاکہ اردو داں قاری پر سمجھ بوجھ میں کوئی بوجھ نہ رہ جائے۔ (ص ۳۱)

"اس طرح یہ تحریریں رسالہ کی فائلوں میں دبی رہنے کے بجائے کتابی شکل میں منظر عام پر آجائیں گی، امید ہے کہ ادب اسلامی کی خدمت کے ضمن میں یہ بات مناسب ہوگی۔" (ص ۴۱)

"ان میں اس راقم کا بھی کچھ حصہ رسدی ہے۔" (ص ۵۱)

"یہ جھلک اس راقم سطور کی کم بضاعتی کے باعث شاید دل آویز جھلک نہ محسوس ہو، لیکن بہرحال اس سے سرگرم سفر کارواں کا حال سفر دیکھا جاسکتا ہے۔" (ص ۵۱)

ان عبارتوں میں کہیں ادعا کا کوئی کا شائبہ نظر نہیں آتا، بلکہ ہر بات بہت سنبھال کر اور احساس ذمہ داری کے ساتھ کہی گئی ہے، لیکن مولانا کی تحریریں بے آب ورنگ بھی نہیں ہوتیں، مولاناؒ کے یہاں کہیں کہیں اس سادگی کے باوجود پرکاری اور تفنن طبع کے نمونے بھی ملتے ہیں، اسی کتاب میں لکھتے ہیں:

’’ہمارے کرم فرما پروفیسر وصی احمد صدیقی رکن مجلس عاملہ رابطہ ادب اسلامی کے قلم کو ایسا ادبی اسلوب نگارش حاصل ہے جس سے وہ قطعہ صحراء کو چمن بنا دیتے ہیں۔‘‘ (غبار ص ۵۱)

مولاناؒ نے اپنے استاذ و مربی مولانا علی میاںؒ سے ہر طرح کی نسبت و شباہت کے باجود ان کے اسلوب کی نقل کرنے کے بجائے اپنا الگ اسلوب نکالا، مولانا علی میاںؒ کا رنگ دوسرا تھا، ان کے یہاں الفاظ کی برجستگی اور مضامین کی آمد غالب کے اس شعر کی مصداق تھی:

تیرا انداز سخن شانہ زلف الہام
تیری رفتار قلم جنبش بال جبریل

لیکن مولانا رابع صاحبؒ کے بارے میں بھی خود ان کی زبان حال سے غالب کے اشعار میں ہی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ:

فکر میری گہر اندوز اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموز عباراتِ قلیل
میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

مولانا خیالات کے شیش محل میں نہیں رہتے تھے، ایک عملی انسان تھے، لیکن فکر و نظر کا سرمایہ ہی ان کی زندگی کا اصل جوہر اور جزو اعظم ہے، ان کے افکار کی دنیا لامحدود اور بے ثغور نہیں بلکہ بڑی با شعور اور جرأت بے جا سے دور ہے، وہ صرف دور بینی نہیں خورد بینی کے عادی تھے، مولانا بجا طور پر ندوہ کے اساطین فکر و ادب میں شمار کیے جائیں گے، زندہ جاوید ہستیوں میں ان کو یاد رکھا جائے گا، وہ اس دور میں کاروان ایمان و عزیمت کے سرخیل تھے، مرد راہ داں، میر کارواں، ملکوتی صفات، علم دوست، انسانیت نواز:

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزاد، معانی میں دقیق

الفاظ کی تاثیر

مرشد الامت حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندویؒ

’’ادب میں الفاظ اصلاً موقع و محل، حالات و کیفیات کے حق کو ادا کرتے ہیں اور صاحب الفاظ کے اندرونی محسوسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کام کے لیے وہ کہیں محاوروں کی شکل میں ظاہر ہوتے ہیں اور کہیں تلمیحات کا روپ اختیار کرتے ہیں، کہیں حقیقت کی عکاسی کرتے ہیں اور کہیں مجاز کی اور کہیں کسی دل نواز یا دل فگار واقعہ کی یاد دلاتے ہیں اور کہیں صدق بیانی کا فرض انجام دینے کے لیے نرم اسلوب اور سادہ انداز میں دل کو چھونے والی بات کہتے ہیں۔ یہی وہ رنگ ہے جو ادب کو قوت و اثر کا حامل بناتا ہے اور عبارت میں وہ اثر و کشش پیدا کر دیتا ہے جس سے وہ دلوں میں اتر جاتا ہے اور رجحانات کو نیا موڑ دیتا ہے۔ اپنی انہی خصوصیات کے ذریعہ وہ کبھی خواہشات نفس کا ترجمان بن جاتا ہے اور کبھی بہکتے ہوئے قدموں کو تھام لیتا ہے۔ ادب کے ان دونوں طرح کے اثرات کے نمونے ادب کی تاریخ میں خاصے ملتے ہیں اور ان کو ادب کے مؤرخ اپنی اپنی پسند اور رجحان کے مطابق کرتے ہیں اور اپنے ذوق کے مطابق ان کو ادب کے اصل اور قابل توجہ نمونہ قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ کا عمل ذہنوں کی تفریح و لذت اور کچھ کا عمل انسانی رجحانات کی تشکیل و تربیت ہوتا ہے۔ ادب کے ذریعہ تشکیل رجحان و تربیت کے عمل نے تاریخ کے بعض ادوار میں غیر معمولی اثر ڈالا ہے اور پوری پوری قوم کا مزاج بدل دیا ہے، جس سے بعض وقت کسی کسی قوم و ملک میں انقلاب برپا ہو گیا ہے اور اسی قسم کے عمل نے مسلمانوں کے سماج میں بارہا بہکتے قدموں کو راہ پر لگا دیا ہے۔‘‘

(غبار کارواں: ۸۰-۸۱)

۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء کو ہم نے کیا کھویا؟

مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی
(نگراں شعبہ تحقیق، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز-نئی دہلی)

رمضان کا مقدس مہینہ، جمعرات کا بابرکت دن، عصر کی مقبول ساعتیں، دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مبارک ماحول، فضا پر سکینت کی چادر، اچانک ہاتفِ غیبی کی صدا آئی:

﴿یَا أَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ☆ارْجِعِی إِلَی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً☆فَادْخُلِی فِی عِبَادِی☆وَادْخُلِی جَنَّتِی﴾ (اے مطمئن نفس! پلٹ آ اپنے پروردگار کی طرف، اس حال میں کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی، میرے پیارے بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنت میں داخل ہو)

اس صدا کا آنا تھا کہ ایک ترانوے سالہ پاکیزہ روح نے جھرجھری سی لی اور عالم بالا کی طرف چل پڑی۔ فانی دنیا دیکھتی رہ گئی اور ناتواں انسان آنکھیں پھاڑے تکتا رہ گیا۔ کبھی بجلی سے زیادہ تیز آسمان کی طرف جاتی روح کو اور کبھی بستر پر دراز مبارک جسم کو۔ کچھ ہوش آیا تو پتا چلا کہ کیا ہو گیا؟ کون اٹھ گیا؟ کون دنیا کو الوداع کہہ گیا؟ لیکن یہ ظلوم وجہول انسان سمجھنے کے بعد بھی کہاں سمجھا؟ ہاں! مشرق ومغرب اور عرب وعجم میں ایک شور ضرور بلند ہوا کہ ملت اسلامیہ ہندیہ کے قائد اعلیٰ، مرشد الامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے دنیا کو الوداع کہہ دیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

کوئی کہہ رہا ہے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدرِ عالی قدر نے وفات پائی۔ کوئی کہتا ہے کہ ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ کا انتقال ہو گیا۔ کوئی عالمی رابطہ ادب اسلامی کے صدر اور الرائد کے بانی کا غم منا رہا ہے۔ کوئی وقت کے ایک عظیم مرشدِ روحانی کا ماتم کر رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ جانشین مفکر اسلام اٹھ گیا۔ کوئی شیخ الحدیث علامہ حیدر حسن خان ٹونکی (وفات: 1942) اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی (وفات:1943) کا دیدار کرنے والی آخری آنکھوں کو رو رہا ہے۔ کسی کو امام التبلیغ مولانا محمد الیاس کاندھلوی (وفات:1944) محدث کبیر علامہ شاہ محمد حلیم عطا سلونوی (وفات:1955) شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی (وفات:1957) مجمع البحرین مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی (وفات:1961) شیخ المشائخ مولانا عبدالقادر رائے پوری (وفات: 1962) مربیِ کامل مولانا سید محمد طلحہ حسنی ٹونکی (وفات:1970) اور شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی (وفات:1982) کے محبوب فیض یافتہ کے جانے کا غم ستا رہا ہے۔ یہ سب باتیں درست اور ان میں سے ہر غم بجا۔ لیکن مرشد الامت کے سب سے ادنیٰ منتسب کو لگتا ہے کہ اس غم کو ذرا وسیع معنوں میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ تبھی یہ احساس ہو سکے گا کہ 13/اپریل 2023 کو ہم نے کیا کھویا؟

آیئے! اس سوال کا جواب جاننے کے لیے مرشد الامت کے متعلق تین اوصاف کے حوالے سے گفتگو کی جائے۔ وہ تین اوصاف جو حقیقی انسان کے نمایاں ترین اوصاف ہوتے ہیں۔ ان کے بغیر انسانیت مکمل نہیں ہوتی۔ یعنی اخلاص، تواضع اور حکمت۔

اخلاص:

اخلاص انسانیت کا عطر اور ایمان کا جوہر ہے۔ امام ابوالقاسم قشیری (وفات:465ھ/1072م) نے اپنی عظیم تصنیف "الرسالة القشیریة" میں اخلاص کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تصفیة الفعل عن ملاحظة المخلوقین"

یعنی انسان کے کسی بھی کام میں کسی بھی مخلوق کے سامنے

دکھاوے کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ ہو۔

جس انسان کی زندگی کا ہر کام اس معیار پر پورا اتر جاتا ہے، وہ قرآن کی اصطلاح (Term) میں مخلص کہلاتا ہے۔ ایسے لوگ ہی انسانیت کا نمک ہوتے ہیں۔ وہ ہیں تو یہ کائنات ہے۔ وہ نہ ہوں تو کائنات اپنا مقصدِ وجود کھو دے۔ مرشد الامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی سے تھوڑا قریب رہنے والے بھی اس حقیقت کا اندازہ لگا سکتے تھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ''مخلص'' بندے تھے۔ ان کی زندگی کا ہر چھوٹا بڑا کام اللہ کو خوش کرنے کی نیت سے ہوتا تھا۔ یہ بات کہنی آسان ہے، لیکن اس پر عمل پہاڑ ڈھونے سے کم مشکل نہیں ہے۔ ہر قدم اٹھاتے ہوئے اپنے ارادے کو تازہ کرنا۔ ہر کام کرنے سے پہلے رضائے الٰہی کی نیت کرنا۔ ہر لمحے اس بات کی فکر رکھنا کہ میں یہ کام کیوں کر رہا ہوں؟ ان کی زندگی پر حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کا یہ ارشاد پوری طرح صادق آتا ہے:

"المخلص لربه كالماشي على الرمل لا تسمع خطواته ولكن ترى آثاره" (رب کے مخلص بندے کی مثال ریت پر چلنے والے شخص کی سی ہے۔ تمھیں اس کے قدموں کی چاپ تو نہیں سنائی دیتی، لیکن اس کے نشان ضرور نظر آتے ہیں۔)

جی ہاں! ہمارے پیارے مولانا ایسے ہی تھے۔ یہ سنی بھی ہے اور آنکھوں دیکھی بھی۔

ایک مرتبہ میں نے نفلی اعتکاف کے متعلق چند باتیں دریافت کیں۔ جواب ملا: ''مہینے دو مہینے میں ایک دن آدھے دن کا اعتکاف کرنے سے بہتر یہ ہوسکتا ہے کہ جب بھی فرض نمازوں کے لیے مسجد میں داخل ہوا جائے تو مختصر وقت کے اعتکاف کی نیت بھی کر لی جائے۔ اس سے بہ یک وقت بڑے منافع ہوتے ہیں۔'' اس البیلے جواب کے بعد میں یہ پوچھنے کی ہمت تو نہ کر سکا کہ کیا یہ آپ کا معمول مبارک بھی ہے؟ لیکن اس کے بعد میں نے ان کی مسجد تشریف آوری اور وہاں کے معمولات کو خصوصیت کے ساتھ دیکھنا شروع کیا۔ کسی کی طرف متوجہ نہ ہونا، ایک گوشے میں بیٹھ کر تلاوتِ قرآن میں مصروف رہنا، تکبیر سن کر نماز کے لیے کھڑے ہونا اور اکثر رقت طاری ہونا، حسبِ موقع نماز بعد بھی تلاوت کرنا اور پھر خاموشی سے باہر تشریف لے جانا۔ ان تمام چیزوں کو لمبے عرصے تک بہت غور سے دیکھنے کے بعد مجھے تقریباً یقین ہے کہ ہر فرض نماز کے وقت اعتکاف کی نیت صرف تعلیم نہیں، معمول بھی تھا۔

اس بات کو تقویت اس واقعے سے بھی ملی جو مجھے مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی (وفات: 1999) کے خلیفہ مجاز اور ام القریٰ یونی ورسٹی مکہ مکرمہ کے سابق پروفیسر ڈاکٹر شاہ عبد الرحمٰن نشاط (وفات: 2020) نے سنایا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ ''ایک مرتبہ میں تکیہ کلاں گیا ہوا تھا۔ وہاں کے دوران قیام بنگلے پر بیٹھا تھا۔ قریب میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اور مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا واضح صاحب نے فرمایا کہ ندوہ تو پرسوں کھل رہا ہے، تو ہم یہاں کل بھی رک جاتے ہیں۔ اس پر مولانا رابع صاحب نے فرمایا: ہم صلہ رحمی کی نیت سے رشتے داروں سے ملنے آئے تھے۔ اب مزید قیام میں کیا نیت کریں گے؟''

چھ سات سال پہلے اس واقعے کو سن کر میں جتنا حیران ہوا تھا، آج بھی اتنا ہی حیران ہوں۔ کیا اپنے وطن کا سفر کرنے کی بھی کوئی نیت ہوسکتی ہے؟ اپنے کنبے والوں سے ملنے جلنے کی بھی نیت کی جاتی ہے؟ اس طرح کے واقعات تو ہم عہدِ نبوی یا قرونِ اولی کے متعلق سنتے ہیں۔ کیا اکیسویں صدی میں بھی ایسے قدسی نفوس ہوسکتے ہیں؟ اگر ہاں، تو ایسے لوگوں کو برکۃ العصر اور برکۃ الدنیا کیوں نہ کہا جائے؟ اللہ اکبر! اخلاص کا یہ معیار کہ انسان اپنے رشتے داروں سے ملنے اور اپنے وطن جانے کی بھی نیت کرے؟ اس معیار کو عوام تو عوام اکثر خواص بھی نہیں حاصل کر پاتے۔ یہ مقام تو صرف ان لوگوں کے لیے ہے جن سے پروردگارِ عالم بھی پیار کرنے لگتا ہے۔ ربِ کائنات ان کی چال ڈھال، بول چال اور سماعت و بصارت بن جاتا ہے۔ ہر قدم پر اس کی دست گیری ہوتی ہے اور ہر اقدام میں اسی کی رہنمائی۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ مرشد الامت بہ ظاہر خاموش، لیکن ان کی خاموشی بڑی بڑی شعلہ بیانیوں پر بھاری۔ وہ خاصے کم آمیز، لیکن

لاکھوں انسانوں کے دلوں پر حکمرانی۔ اپنے رویے کے لحاظ سے وہ غیر عوامی، لیکن خواص وعوام سب ان کی صحبت اٹھانے کے تمنائی۔

سکے کا ایک رخ دیکھنے والے نہ جانے کیا کیا کہتے تھے۔ ان گناہ گار آنکھوں نے ایسے ایسے ''حوصلہ مند'' بھی دیکھے جو وقت آنے پر راہِ فرار اختیار کرنے والوں میں سب سے آگے، لیکن مرشد الامت کی خاموشی اور کم آمیزی انھیں مداہنت اور بزدلی لگتی تھی۔ میرا بہت سے ایسے ''قائدوں'' سے بھی واسطہ پڑا، جو سوچ کے اتنے کچے کہ آج آگ کے ساتھ تو کل پانی کے ہم نوا، لیکن مرشد الامت انھیں قیادت کے لیے نااہل نظر آتے تھے۔ ندوے میں ناظم اعلیٰ ہونے کے باوجود چند گز کے رہائشی کمرہ کا کرایہ ادا کرنے والے سراپا اخلاص کو ''ناقابل فہم'' کہنے والے ایسے ایسے بھی دیکھے، جو دھڑلے سے اپنے اداروں کی بجلی پانی، کمروں اور عملے کا استعمال اپنی ذات کے لیے کرتے ہیں۔ مرشد الامت کے جوتے اٹھانے والے ہم جیسوں کو ایسے جملے بھی سننے پڑتے کہ ''مولانا رابع صاحب کو تو لکھنؤ میں بھی کوئی نہیں جانتا۔'' اس طرح کے مواقع پر ہم کبھی خون کا گھونٹ پی کر رہ جاتے، کبھی سامنے والے کی عقل پر ماتم کرتے، کبھی سکے کا دوسرا رخ دکھانے کی کوشش کرتے اور کبھی کبھی تن بھی جاتے لیکن آج ہم مطمئن ہیں۔ مرشد الامت کی رحلت نے سب کچھ صاف کر دیا۔ ہمارے مولانا رمضان کی مبارک ساعتوں میں اس دنیا سے رخصت ہوئے، انھوں نے جلدی جلدی کر کے ظہر کی نماز پڑھی اور اپنے نامہ اعمال پر ایک قضا نماز کا بوجھ رکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ بستر پر دراز ہوئے اور اللہ اللہ کا ورد کرتے ہوئے دنیا کو الوداع کہہ دیا پھر ہم نے دلی کی چھوٹی بڑی مسجدوں میں وفات کا اعلان اور دعا کا اہتمام ہوتے دیکھا۔ اس کے بعد جنازے میں جو مناظر سامنے آئے وہ تو دنیا نے دیکھے۔ امام اہل سنت احمد ابن حنبل (وفات 241ھ/855م) کا قول "بيننا وبينكم يوم الجنائز" (ہمارے اور تمہارے درمیان حق وباطل کا فیصلہ جنازوں کے دن ہوگا) مرشد الامت کے وصال پر سمجھ میں آیا۔ لکھنؤ کے باشندوں نے اطلاع دی کہ تراویح کے بعد مسجدوں سے نکلنے والے نمازی جوق در جوق ندوے کی طرف جا رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ پورا شہر امڈ آیا ہے۔ رائے بریلی میں جنازہ کے مناظر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے۔ رائے بریلی پہنچنے کے بعد جہاں بھی ہمارے ڈرائیور نے راستہ معلوم کرنے کے لیے گاڑی روکی، وہیں بغیر پوچھے کسی نے خود بہ خود تکیے جانے والے راستے کی طرف اشارہ کر دیا۔ آٹھ بجے صبح نماز جنازہ ادا کی گئی اور قبر مبارک پر مٹی ڈالنے کا موقع دس بجے کے قریب ملا۔ صرف چند گھنٹوں کا موقع ہونے کے باوجود تمل ناڈو، کیرلا، کرناٹک، مغربی بنگال اور بہار جیسے دور دراز علاقوں کے لوگ بھی موجود تھے۔ لکھنؤ اور رائے بریلی دونوں جگہوں پر امڈ آنے والے اس انسانی سیلاب میں اکثریت عام شہریوں کی تھی، طلبہ مدارس تو اپنے اپنے گھروں پر تھے۔ جنازے میں شرکت کرنے والے اس انسانی سیلاب نے فیصلہ کر دیا کہ شعلہ بیانی بے اصل اور دلی دردمندی اصل ہے۔ بیان بازی بے سود اور ٹھنڈے دل سے فیصلے لینا سودمند ہے۔ عوام کو زبان وقلم کے ذریعے جذباتی کر کے بے سمت چھوڑ دینا نالائقی اور مسائل کی جڑ تک پہنچ کر مستقبل بعید تک کے لیے رہنمائی کرنا قیادت ہے۔ وقتی ہنگامہ آرائی سے دنیا کی واہ واہی تو لوٹی جا سکتی ہے، عرش الٰہی کی تائید حاصل نہیں کی جا سکتی۔ عرش کی تائید نام نہاد قائدین کو نہیں مخلص قائدین کو ملتی ہے۔ ایسے لوگوں کے پیچھے جسموں کا غول تو نظر نہیں آتا، لیکن دلوں کا رخ انہی کی طرف ہوتا ہے۔ ایسے مخلصین کی روحیں تو مقبول ہوتی ہی ہیں، روح کے جسم سے نکلتے ہی جسم کی مقبولیت ومحبوبیت بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ 13 اور 14 اپریل کو ہمیں ان حقائق کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوا۔

انکسار:

انکسار ایک عظیم انسانی وصف ہے۔ قرآن کریم اور احادیث نبوی میں انکسار وتواضع اختیار کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ دنیا کے دوسرے مذاہب اور بڑی شخصیات نے بھی اس پر زور دیا ہے۔ مشہور امریکی فاضل Ralph Waldo Emerson (انتقال: 1882) کا یہ قول ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے:

"A great man is always willing to be little."

(ایک عظیم انسان ہمیشہ چھوٹا بن کر رہنا چاہتا ہے۔)

آزاد ہندستان کے بابائے قوم موہن داس کرم چند گاندھی

(انتقال: 1948) نے اپنی آپ بیتی ''تلاش حق'' (ترجمہ سید عابد حسین) میں لکھا ہے: ''انسان کی نجات اسی پر موقوف ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہر ذی حیات سے کم تر سمجھنے لگے۔''

ایک مرتبہ داعی اسلام مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی (وفات: 2012) نے دائرہ شاہ علم اللہ میں رمضان کے آخری جمعے کو خطاب کرتے ہوئے عارف باللہ شاہ علم اللہ حسنی (وفات: 1685) سے لے کر مرشد الامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی تک خاندان کے ممتاز بزرگوں کے امتیازی اوصاف بیان کیے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ انھوں نے مرشد الامت کا امتیازی وصف انکسار و تواضع قرار دیا تھا۔ اس امتیازی وصف کے حوالے سے ہر اس شخص کے پاس کوئی نہ کوئی تجربہ ہوگا، جسے کچھ دیر کے لیے بھی مرشد الامت کی صحبت حاصل رہی ہے۔

تقریباً بیس سال پرانی بات ہے۔ مرشد الامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ندوے کی مسجد میں نماز ادا کرنے کے کچھ دیر بعد مہمان خانے کی طرف کھلنے والے چھوٹے سے دروازے سے نکل رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک نہایت غریب سا میلے کچیلے کپڑوں والا انسان ان کی طرف بڑھا۔ بہ ظاہر وہ کوئی رکشے والا یا اسی طرح کا کوئی شخص معلوم ہوتا تھا۔ مرشد الامت کے پاس پہنچا تو وہ رک گئے۔ میں یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ کچھ تشویش بھی تھی لیکن وہاں صرف سکون و اطمینان تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ شخص ہاتھ جوڑ کر کچھ بول رہا ہے۔ بول چکا تو مولانا نے مسکراتے چہرے کے ساتھ اس کے ہاتھ سیدھے کرتے ہوئے اس کے کندھے پر دست مبارک رکھا، اس سے کچھ کہا اور وہ شخص پیچھے پیچھے مہمان خانے کی طرف چلا گیا۔ میں کچھ نہ سمجھ سکا۔ کئی ماہ بعد مجھے وہ شخص ندوے کے مرکزی دروازے کے پاس پھر نظر آیا۔ خوش و خرم، ہنستا مسکراتا۔ میں نے سلام کر کے کچھ تعارف چاہا تو وہ سب کچھ خود ہی بول پڑا۔ اس نے بتایا کہ ''مجھے کئی خطرناک بیماریاں تھیں۔ علاج کے لیے پیسے نہیں تھے۔ جسم سوکھتا جا رہا تھا یا تو علاج کرا لیتا یا بال بچوں کا پیٹ پال لیتا۔ ایک دن سبزیاں دینے کے لیے ندوے کے باہر ایک دکان پر آیا۔ ندوے میں اذان کی آواز سنی تو سوچا کہ آج ندوہ بھی دیکھتا چلوں۔ بہت سے لوگوں کو ''حجرت'' کا احترام کرتے دیکھا تو سمجھ گیا کہ یہ کوئی اللہ والے انسان ہیں۔ نماز کے بعد انتظار میں رہا کہ ان سے دعا کے لیے کہوں۔ میں نے دعا کو کہا تو انھوں نے پریشانی کی تفصیل پوچھی۔ تفصیل سن کر اطمینان دلایا اور اپنے ساتھ لے گئے۔ کمرے میں پہنچ کر ایک پرچی لکھ کر دی اور کہا کہ لکھنؤ کے کسی بڑے مسلم ڈاکٹر سے مل کر یہ دے دیجیے گا۔ اللہ نے چاہا تو پریشانی حل ہو جائے گی۔ میں نے لوگوں سے معلوم کیا اور PGI اسپتال کے ایک بڑے مسلم ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ وہ پرچی دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے بہت عزت بھی دی اور کئی ماہ تک مفت علاج بھی کیا۔ اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میرے کہے بغیر اس نے اپنی جیب سے پرچی بھی نکال کر دکھائی۔ پرچی کو اس نے لیمی نیشن کرا لیا تھا اور سب کو فخر سے دکھاتا پھرتا تھا۔ پرچی کی اصل عبارت تو یاد نہیں۔ اتنا ضرور یاد ہے وہ چھوٹے سائز کا ذاتی لیٹر پیڈ تھا۔ اس پر صرف مولانا کا اسم گرامی لکھا تھا۔ کوئی عہدہ نہ تھا۔ مولانا نے کسی ڈاکٹر کا نام لیے بغیر صرف ''محترم ڈاکٹر صاحب!'' لکھ کر مخاطب کیا تھا تاکہ وہ کسی بھی ڈاکٹر کو دکھا سکے۔ نیچے دو تین جملوں میں اس شخص کا تذکرہ کر کے علاج کی درخواست کی گئی تھی۔

ایک مرتبہ کی بات ہے۔ مرشد الامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دلّی تشریف لائے ہوئے تھے۔ جناب سید حسین حسنی (وفات: 2008) کے ہاں قیام تھا۔ وہاں کے دوران قیام ایک دن عصر کے بعد ایک مرحوم عالم ملنے آئے۔ ان کا جسم خاصا پھیلا ہوا تھا۔ مولانا نے انھیں اپنے برابر میں بٹھا لیا اور بات چیت ہونے لگی۔ تھوڑی دیر بعد کچھ لوگ مولانا کی زیارت کے لیے آئے۔ میں مولانا سید محمود حسن حسنی ندوی (وفات: 2022) کے ساتھ گھر کے دروازے پر کھڑا تھا۔ ان لوگوں نے پوچھا: ''حضرت کہاں ہیں؟ ملاقات کرنی ہے۔'' میں انھیں اندر لے گیا اور اشارہ کر کے بتا دیا۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ اندر جانا ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ لوگ بڑی عقیدت کے ساتھ ان عالم کے سامنے بیٹھے ہیں جنھیں مرشد الامت نے اپنے

برابر میں جگہ دی تھی۔ کیوں کہ اپنے ذہن میں وہ جس بڑی شخصیت کی تصویر بنا کر آئے تھے وہ انھی کے ڈیل ڈول پر فٹ ہو رہی تھی۔ لیکن کچھ وجہوں سے ان کے چہروں سے بے چینی بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک صاحب کی نگاہ مجھ سے ٹکرائی تو میں نے اشارہ سے بتایا کہ آپ کی مراد ادھر ہے۔ سب بہت خوش ہوئے۔ انھیں مراد حاصل ہوگئی اور مجھے اسلامی تاریخ کے وہ واقعات یاد آ گئے جن میں انکسار کی وجہ سے مرید کو مراد اور مراد کو مرید سمجھ لیا گیا تھا۔

میں ایک منظر کبھی نہیں بھولتا۔ 2004 کی بات ہے۔ بابری مسجد کا مسئلہ حل کرنے کے لیے کاچی کاما کوٹی پیٹھ کے شنکر آچاریہ کے فارمولے کا ملک بھر میں چرچا تھا۔ میڈیا والے حسب معمول دن رات اندھیرے میں تیر چلا رہے تھے۔ شنکر آچاریہ نے کیا فارمولہ پیش کیا ہوگا؟ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کو بھیجے گئے خط میں کیا لکھا ہوسکتا ہے؟ بورڈ کے صدر کو خط کب مل رہا ہے؟ خط دیکھ کر ان کا رویہ کیا ہوگا؟ آخر کار وہ خط ندوے پہنچ گیا اور مرشد الامت نے بورڈ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ بلالی۔ علامہ شبلی لائبریری کے ہال میں میٹنگ ہوئی۔ ہر طرف پولیس کے حفاظتی دستے تعینات تھے۔ لائیو ٹیلی کاسٹ کے لیے تمام بڑے نیوز چینلز کے نمائندے موجود تھے۔ میٹنگ ختم ہوئی تو سب کی نظریں بورڈ کے صدرِ عالی قدر کی طرف، لیکن انھیں عصر کی نماز کا وقت ختم ہونے کی فکر۔ میڈیا سے گفتگو کی ذمے داری دوسرے افراد کو دی اور خود حفاظتی گھیرے میں بھیڑ کو چیرتے ہوئے باہر تشریف لائے، اپنی گاڑی میں بیٹھ کر مہمان خانے پہنچے، شیروانی اتاری، وضو فرمایا اور مسجد پہنچ کر پہلی صف کے دائیں کنارے پر نماز میں مصروف ہوگئے۔ تمام نیوز چینلز پر جس شخص کی تصویریں دکھائی جا رہی تھیں، جس کے جملے نقل کیے جا رہے تھے اور اہم لوگوں کی بھیڑ جسے یہاں وہاں تلاش کر رہی تھی، وہ اپنے رب کے سامنے سر بہ سجود تھا۔ اس کے جسم پر موجود ململ کے کرتے میں سے بنیان میں موجود دو چار انچ کا سوراخ بھی صاف نظر آ رہا تھا۔

ہائے ہائے! اپنے عقیدت مندوں کی سب سے آخری صف میں بیٹھنے والے ہم جیسوں سے بھی وہ بارہا فرماتے تھے کہ ''آپ ہمیں جیسا سمجھ رہے ہیں ہم ویسے نہیں ہیں''، ''ہم کچھ نہیں ہیں''، ''ہمارے پاس لوگوں کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ لوگ غلط فہمی میں ہیں۔'' سچ یہ ہے کہ مرشد امت کے انکسار و تواضع کے واقعات جمع کیے جائیں تو مناسب ضخامت کی ایک کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ ان کے مبارک جسم کو مٹی کے سپرد کرتے وقت مجھے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر اس وقت انھیں گویائی کی طاقت مل جائے تو شاید قمر جلالوی (وفات:1968) کے الفاظ میں وہ اس وقت بھی یہی فرمائیں گے:

شکریہ اے قبر تک پہنچانے والو شکریہ
اب اکیلے ہی چلے جائیں گے اس منزل سے ہم

انکسار و تواضع کا یہ اونچا مقام لوگوں کے لیے بہت اجنبی سا تھا۔ اس لیے بہت سی ظاہر بیں آنکھیں اس تواضع کو بے حیثیتی سمجھ لیتی تھیں۔ مزاجی اینٹھن کا شکار رہنے والے بہت سے لوگ اس انکسار کو کمزوری سمجھنے کی غلطی کرتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ اپنے ماتحتوں کا استحصال کرنے والے اور ہر معاملے کو دادا گیری سے حل کرنے کی ناکام کوشش کرنے والے بھی اس سادگی کو بے جا شرافت اور پستی سے تعبیر کرتے تھے۔ ایسا نہیں ہے کہ مرشد الامت کو ان باتوں کا علم نہیں تھا۔ وہ سب جانتے تھے۔ لیکن وہ مخلوق کی وجہ سے خالق کا در کیسے چھوڑ سکتے تھے؟ افرادِ امت کی کج فہمی کی وجہ سے رسولِ امت کے صراطِ مستقیم سے کیسے ہٹ سکتے تھے؟ وہ سارے اعتراضات کو جھیلتے ہوئے اسی راہ پر چلتے رہے جو انھیں ارحم الراحمین نے سجھائی اور رحمۃ للعالمین نے دکھائی تھی۔ وہ اپنے رویّے کے متعلق ہونے والے بے شمار ڈھکے چھپے اعتراضات کے جھاڑ جھنکاڑ سے مسکراتے ہوئے گزرتے چلے گئے اور انسانوں کو یہ پیغام دیتے رہے کہ عاجزی میں بلندی اور بڑائی میں پستی ہے۔ دبے کچلے لوگوں سے کھل کر ملنا انسان کو بڑا بناتا ہے اور اصحابِ جاہ و منصب سے ملاقاتوں کا شوق انسان کو چھوٹا بنا دیتا ہے۔ اپنے آپ کو کچھ نہ سمجھنا انسان کو بہت کچھ بنا دیتا ہے اور خود کو کچھ سمجھنا ''نا کچھ'' بنا ڈالتا ہے۔

حکمت:

اللہ تعالیٰ نے انسان پر جو عظیم ترین انعامات کیے ہیں، ان

میں سے ایک بڑا انعام حکمت ہے۔حکمت انسانیت کا نقطہ امتیاز ہے۔دوسری مخلوقات پر انسانوں کی افضلیت کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ انسان کو حکمت عطا کی گئی ہے اور دوسری مخلوقات کو نہیں۔ویسے تو ہر انسان کے اندر حکمت کا کچھ نہ کچھ حصہ موجود ہوتا ہے، لیکن اصل حکمت وہ ہے، جو اللہ کے محبوب اور چیدہ بندوں کو ودیعت کی جاتی ہے۔مخلوقات میں حکمت کا سب سے عظیم خزانہ سرورِ کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو عطا کیا گیا تھا۔اس بے حساب خزانے کے کچھ چھینٹے آقا کی امت پر پڑے تو دنیا کو امام حسن بصری (وفات: 110ھ) ابوالمعالی عبدالملک جوینی (وفات: 478ھ) ابوحامد غزالی (وفات:505ھ) محمد ابن رشد (وفات:595ھ) عبدالرحمٰن ابن جوزی (وفات:597ھ) فخرالدین رازی (وفات:605ھ) محی الدین ابن عربی (وفات:638ھ) عبدالرحمٰن ابن خلدون (وفات:808ھ) احمد سرہندی (وفات:1030ھ) اور ولی اللہ دہلوی (وفات:1176ھ) جیسی حکیم ہستیاں ہاتھ آئیں۔

ان بزرگوں کے خزانہ حکمت سے جب ندوۃ العلماء معمور ہوا تو امام سید محمد علی مونگیری (وفات:1927م) سے لے کر مرشد الامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی تک اصحابِ حکمت کی ایک مبارک صف نظر آتی ہے۔ہم خوش قسمت ہیں کہ ہم نے مرشد الامت کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کی ہیں۔ان کی صحبت اٹھائی ہے۔ان کی مبارک زبان سے جاری ہونے والے حکمت پاروں سے اپنے دامن بھرے ہیں۔مسائل کے حل کے لیے ان کے رویے کا کھلی آنکھوں مشاہدہ کر کے سمجھا ہے کہ حکمت کیا ہوتی ہے؟ فراست کیا چیز ہے؟ اگر ہم انسانی تاریخ کے تمام حکیم و دانا اشخاص کی زندگیوں کا مطالعہ کریں تو ایک خوبی سب میں نظر آئے گی۔عدم جذباتیت، مستقل مزاجی، ذہنی یکسوئی، ٹھنڈے دماغ سے غور و فکر کرنا اور معاملات کی جڑ تک پہنچ کر نتائج اخذ کرنا۔بہ ظاہر ان صفات میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے، لیکن ہیں یہ سب لازم ملزوم۔مرشد الامت کی مبارک زندگی کا مطالعہ کرنے والا ہر غیر جانب دار انسان اس بات کی گواہی دے گا کہ ان کے اندر یہ صفات پوری شان کے ساتھ موجود تھیں۔ان کے ساتھ شب و روز رہنے والے افراد کا تو خیر پوچھنا ہی کیا، مجھ جیسے ادنیٰ ترین منتسب کے ذہن میں بھی اس وقت ڈھیروں واقعات گردش کر رہے ہیں۔ان میں سے ہر واقعہ صاحب واقعہ کی حکمت و دانش اور تدبر و تفکر کی دلیل بن سکتا ہے۔بس دو چار جھلکیاں دیکھیے۔

غالباً 2004 کی بات ہے۔مرشد الامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا صدر بنے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا۔ایک دن اچانک ٹی وی پر یہ خبر چلنے لگی کہ بورڈ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔شیعہ حضرات، بریلوی حضرات اور مسلم خواتین نے اپنے اپنے الگ پرسنل لا بورڈ بنا لیے۔دو لوگوں کی لکھنؤ سے اور ایک صاحب کی بریلی سے تصاویر دکھائی جانے لگیں۔گل پوشی کے مناظر اور پریس کانفرنس نشر کی جانے لگی۔ہر سنجیدہ حلقے میں رنج و غم اور مایوسی کا ماحول بن گیا۔ملت کا ہر مخلص فرد تشویش میں مبتلا تھا۔پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے ایسا ماحول بنا دیا گیا تھا کہ صف اول کے علماء و قائدین کے بھی ماتمی مضامین شائع ہونے لگے۔مرشد الامت کو کبھی منظر عام پر رہنے کا ذوق رہا نہ شوق۔لیکن اس موقعے پر انھوں نے صحافیوں سے بات چیت کی۔پوچھا گیا: ”مسلم پرسنل لا بورڈ ٹوٹ گیا ہے۔اس پر آپ کیا کہتے ہیں؟“ حسب معمول نہایت سکون کے ساتھ جواب ارشاد ہوا:

”کوئی ادارہ اس وقت ٹوٹتا ہے جب اس سے کچھ افراد نکل کر کوئی الگ اتحاد بنا لیں۔مسلم پرسنل لا بورڈ میں جو شیعہ اور بریلوی حضرات ہیں اور جو خواتین ہیں، وہ سب پہلے ہی کی طرح بورڈ کا حصہ ہیں۔ان میں سے کسی نے بورڈ سے علاحدگی اختیار نہیں کی ہے۔ہم نے سنا ہے کہ پرسنل لا کی بنیاد پر تین الگ ادارے قائم ہوئے ہیں، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔کام کرنے کے بہت سے طریقے ہو سکتے ہیں۔وہ لوگ بھی کام کرنا چاہتے ہیں تو انھیں کرنے دینا چاہیے۔البتہ اگر اپنے اداروں کے ناموں پر دوبارہ غور کر لیں تو بہتر ہوگا۔یکساں نام رکھنا مناسب نہیں ہوتا، لوگوں کو غلط فہمی رہتی ہے۔“

اسی روز یہ بیان الفاظ کے کچھ فرق کے ساتھ الیکٹرانک میڈیا میں اور آئندہ روز پرنٹ میڈیا میں عام ہوگیا۔ اس حکیمانہ بیان نے مخفی ہاتھ کی پشت پناہی میں قائم ہونے والے تینوں اداروں کے غباروں کی ایسی ہوا نکالی کہ انھیں آج تک کوئی ہوا بھرنے والا نصیب نہ ہوسکا۔ اس طرح مسلمانانِ ہند کی مشترکہ امانت محفوظ رہ گئی۔

2006 کا واقعہ ہے۔ پروفیسر مشیرالحسن (انتقال: 2018) جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر تھے۔ دینی حلقوں میں انھیں ایک غالی سیکولر اور دین بے زار شخص کی حیثیت سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی دوران ایک مرتبہ مرشدالامت دلی تشریف لائے۔ پروفیسر سید محمد اجتباء ندوی (وفات: 2008) کے گھر پر ایک علمی مجلس منعقد ہوئی۔ مجلس کے بعد ایک ندوی عالم نے لہک لہک کر اپنے کارنامے گنانے شروع کیے۔ آخر میں یہ بھی کہا کہ ''ایک دن تو مشیرالحسن صاحب نے یہاں تک کہہ دیا کہ لگتا ہے کہ جامعہ ملیہ کے ندوی اساتذہ دوسروں کو مسلمان ہی نہیں سمجھتے۔'' یہ جملہ نقل کر کے انھوں نے فاتحانہ انداز میں زور کا قہقہہ بھی لگایا۔ مرشدالامت اب تک خاموشی سے سب کچھ سن رہے تھے، لیکن اس جملے پر خاموش نہ رہ سکے۔ اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے فرمایا:

''اس کا مطلب ہے کہ آپ لوگوں نے یہاں ندوے کا صحیح تعارف نہیں کرایا ہے۔ ندوہ دوسری عصبیتوں کو مٹانے کے لیے قائم ہوا ہے۔ ایک الگ عصبیت بننے کے لیے نہیں۔'' ان الفاظ نے پوری مجلس پر سکوت طاری کر دیا اور ان صاحب پر سکتہ۔

اسی طرح دلّی کے ایک سفر کا واقعہ ہے۔ 2009 چل رہا تھا۔ اچھی طرح یاد ہے کہ اس سفر میں مرشدالامت کی صحت خاصی گری ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ان دنوں ایک مشہور مسلم ماہر قانون نے مسلم پرسنل لا بورڈ کے خلاف محاذ کھول رکھا تھا۔ ان کی منفی تحریروں سے ملی فضا خاصی مکدر تھی۔ عصر بعد مجلس لگی ہوئی تھی۔ ان صاحب کا ذکر آیا تو ایک حاضر مجلس نے کہا: ''حضرت! ویسے اُنھیں بورڈ میں شامل کر لینا چاہیے۔'' مسکراتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ ایک شخص جو گھر کے باہر بیٹھ کر گالیاں دے رہا ہے، اسے گھر کے اندر بلا لیا جائے کہ اب آپ یہاں بیٹھ کر گالیاں دیجیے۔''

اسی مجلس میں دہلی کے ایک ندوی عالم نے اپنی ''دعوتی فتوحات'' کی داستان چھیڑ دی۔ مجلس میں موجود دہلی کے اکثر لوگ جانتے تھے کہ یہ داستان صداقت کے لحاظ سے داستان امیر حمزہ سے کم نہیں ہے۔ اپنی ''سرگرمیوں'' کی کارگزاری انھوں نے یہ کہہ کر ختم کی کہ ''حضرت! بس آپ دعا فرما دیں! نظام الدین ریلوے اسٹیشن پر ہم ایک بک اسٹال لینے والے ہیں، بات ہو چکی ہے، انشاءاللہ وہاں سے دعوت کا بہت بڑا کام ہوگا۔'' اس پر مرشدالامت نے بڑے پیار بھرے لہجے میں فرمایا: ''نہیں، شاید یہ مناسب نہیں ہوگا۔ آپ اپنا بک اسٹال لیں گے تو اس کا نام بھی اسلامی رکھیں گے، اس پر تمام کتابیں بھی اسلامی رکھیں گے۔ اس سے یہ ہوگا کہ جو لوگ اسلام سے بدگمان ہیں وہ آپ کے اسٹال کا نام دیکھ کر اور کتابوں کا انتخاب دیکھ کر دور سے ہی کٹ جائیں گے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ وہاں جو اسٹال پہلے سے موجود ہیں، آپ ان لوگوں سے ملیں، روابط بنائیں، پھر سب پر گھوم گھوم کر اپنی چند منتخب کتابیں رکھوائیں اور دیکھیں کہ لوگوں کو کتنی دلچسپی ہے۔ اس کے بعد اگر بہت زیادہ دلچسپی نظر آئے تو اپنا اسٹال لینے کا سوچیں۔''

2019 میں ندوۃ العلماء میں برپا کیا جانے والا فتنہ کس کو یاد نہ ہوگا؟ مرشدالامت سے وابستگی رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ان واقعات نے اس 90 سالہ مبارک وجود کو سخت متأثر کیا تھا۔ لیکن وہ ذاتِ گرامی عمر کے آخری مرحلے میں صبر و استقلال اور عزم و ثبات کی ایسی ناقابل تسخیر چٹان ثابت ہوئی، جسے ہزار تھپیڑوں کے باوجود ایک انچ ہلایا نہ جا سکا۔ ایسی مقدس چٹان، جو خود تو اپنی جگہ سے کیا ہلتی، ندوے کے منہج اور نظام پر بھی آنچ نہ آنے دی۔ ساتھ ہی امریکا سے لے کر آسٹریلیا تک پوری مخلص ندوی برادری کے لیے سکینت و طمانیت کا باعث بھی بنی رہی۔ کئی ہفتوں تک جاری رہنے والے اس ہنگامے میں مجھے سب سے زیادہ حیرانی ایک واقعے پر ہوتی ہے۔ ندوے کے ایک ہال میں سوا گھنٹے کی دھواں دھار تقریر ہوئی۔ تقریر

میں صحابہ کرام پر تبرا بھی بکا گیا، نوحہ بھی ہوا، ندوے کے مؤقر اساتذہ پر گھٹیا تبصرے بھی کیے گئے، ندوے کے ارتقاء کی پُراسرار تاریخ بھی بیان کی گئی اور ندوہ انتظامیہ کے خلاف سخت جذباتی باتیں کر کے طلبہ کو بھڑکایا بھی گیا۔ سوا گھنٹے کی تقریر کے بعد طلبہ کو کربلائے معلیٰ کی یاد دلا کر ناظم ندوۃ العلماء کی قیام گاہ کا گھیراؤ کرنے پر بھی مجبور کر دیا گیا۔ اس شدید ہنگامے کے درمیان ندوۃ العلماء کا حکیم قافلہ سالار مسجد پہنچا اور طلبہ سے صرف سات منٹ گفتگو فرمائی۔ ایک طرف سوا گھنٹے کی شعلہ باری تو دوسری طرف سات منٹ کی شبنم فشانی۔ نہ شور، نہ جذباتیت، نہ جھوٹ، نہ مبالغہ، نہ سطحیت۔ نپے تلے چند جملے اور بس۔ فتنے کی آتش جوالہ حکمت کی پھوار سے ایک دم بجھ گئی۔ اس کے بعد پھر کبھی ایسی فتنہ انگیزی نہ ہوسکی۔ ہر منصف شخص اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اس پورے ہنگامے میں اگر مرشدالامت کی ذات بابرکات نہ ہوتی تو ندوہ میں کیا کچھ نہ ہو جاتا، نہیں کہا جاسکتا۔

مرشدالامت نے صحابیت کے متعلق ندوے کے مسلک کی حفاظت بھی فرمائی، کتابچہ بھی تصنیف فرمایا، ندوے سے نکلنے والے رسائل کو بھی اس مبارک مشن پر لگایا، بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چلنے کے لیے حجت بھی تمام کی اور آخر میں بڑے اقدامات کر کے ندوے کا تحفظ بھی فرمایا۔ ندوے کی تاریخ اس احسان کے لیے ہمیشہ مرشدالامت کی احسان مند رہے گی۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا بیان کیا جائے؟ اور کتنا بیان کیا جائے؟ مرشدالامت کے وابستگان کی صف نعال میں بیٹھنے والے اس شخص کے حافظے میں ان کی حکمت وفراست کے اتنے واقعات ہیں تو دوسروں کے پاس کیا کچھ نہ ہوگا۔ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جارہی ہے کہ آج اس قد کی شخصیات میں حکمت و دانش مندی سے لبریز ایسی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی۔

آخری بات:

اپنے اس مضمون میں ہم نے تین اہم ترین انسانی اوصاف (اخلاص، انکسار اور حکمت) کی روشنی میں مرشدالامت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی شخصیت کو دیکھنے کی کوشش کی ہے، تاکہ ہمیں یہ احساس ہوسکے کہ 13/اپریل 2023 کو ہم نے کیا کھویا؟ اس مختصر جائزے سے ہمیں پتا چلا کہ 13/اپریل کو ہم نے اخلاص کا وہ آئینہ کھو دیا، جس کو اپنے سامنے رکھ کر آج کا پریشان حال انسان اپنے امراض کا پتا لگا سکتا تھا، داغ دھبے صاف کرسکتا تھا اور خود کو ابدی سکون سے بہرہ ور کرسکتا تھا۔ ہم نے روحانیت کا وہ مینارۂ نور کھو دیا جو مادیت کے تاریک سمندر میں اپنے حال وقال سے روحانیت کی راہ دکھا رہا تھا۔ ہم نے خلوص و ہمدردی کا وہ گھنیرا بادل کھو دیا، جو آخری دم تک مادہ پرستی، جاہ طلبی، لوٹ کھسوٹ اور دھوکہ دہی کی آگ پر رحمت وشفقت کی بوندیں برساتا رہا۔ ہم نے انکسار اور فنائیت کا وہ شجر سایہ دار کھو دیا، جو ہمیشہ دوسروں کو اپنے پھل، پھول، پتوں اور ٹہنیوں سے مستفید کرتا رہا۔ کسی لالچی نے پھل کے لالچ میں پتھر پھینکا تو آہ نہ کی، کسی نے پھل کی تلخی کا شکوہ کیا تو مسکرا کر بھلا دیا۔ ہم نے حکمت وفراست کی وہ وسیع وعریض چادر کھو دی، جس نے ملت کے سروں پر سایہ کر کے نہ جانے دھوپ کی کتنی سخت کرنوں سے ملت کی حفاظت کر رکھی تھی۔ ہم نے تین مرکزی انسانی اوصاف یعنی اخلاص، انکسار اور حکمت کا وہ حسین سنگم کھو دیا، جو اپنی آخری سانس تک انسانیت کو ان اوصاف کو اختیار کرنے کا درس دیتا رہا۔

مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے 13/اپریل کو وہ نورانی وجود کھو دیا، جس کو دیکھ کر انسان، انسانیت کا سبق لے سکتا تھا اور اپنے بنیادی مسائل کا حل تلاش کرسکتا تھا۔

روح کے کانوں سے سنیے تو ندوے کے در و دیوار اور تکیے کے ہر گل وخار سے مدھم سے البیلے انداز میں یہ صدا سنائی دے گی:

حقیقت حقیقت کہاں میرے بعد
کہ ابھریں گی پرچھائیاں میرے بعد
تماشائیو! چن کے رکھ لو انھیں
تبرک ہیں یہ دھجیاں میرے بعد
مثالوں میں ذکر وفا آئے گا
چلے گی مری داستاں میرے بعد

خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

مولانا عبید اللہ شمیم قاسمی
(استاذ جامعہ اسلامیہ مظفر پور-اعظم گڑھ)

ملت اسلامیہ ہندیہ کے سرپرست، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظم، مختلف خصوصیات وامتیازات کے مالک اور عظیم نسبتوں کے حامل حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی جنہیں اب تک ہم دامت برکاتہم لکھا کرتے تھے، اب وہ بھی رحمتہ اللہ علیہ ہوگئے اور ۲۱ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳ اپریل ۲۰۲۳ء بروز جمعرات کو (امارات میں ۲۲ رمضان المبارک) خالق حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

یہ دنیا چند روزہ ہے، یہاں کسی کو قرار نہیں جو بھی یہاں آیا ہے اسے جانا ہے، باقی رہنے والی ذات صرف اللہ رب العزت کی ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ☆ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾

مگر بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی وفات کا صدمہ ہر شخص محسوس کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ایسی محبوبیت عطا فرماتے ہیں کہ دور ونزدیک کا رہنے والا ہر شخص اس کے جانے پر آنسو بہاتا ہے۔

اسی طرح کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں کہ اپنے لا زوال کارناموں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی نور اللہ مرقدہ کی ذات گرامی بھی ایسی ہی تھی کہ آپ کو تمام مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے بہت عزیز رکھتے تھے، آپ کی خدمات کے سبھی معترف تھے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی رحمہ اللہ کا اس دار فانی سے رخصت ہوجانا اتنا بڑا سانحہ ہے جس کا پر ہونا بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے، آپ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر تھے اور مختلف حالات اور نازک صورت حال میں ملت اسلامیہ کی نگاہیں آپ کی طرف اٹھتی تھیں، آپ اپنی خاندانی نجابت وشرافت اور فطری سنجیدگی کی وجہ سے ان مسائل کو حل فرمادیتے تھے۔

آپ کی ذات بہت سی خصوصیات کی حامل تھی، آپ جہاں ایک بہترین ادیب واستاذ تھے، وہیں اللہ رب العزت نے آپ کے اندر انتظامی صلاحیت کا جوہر بھی رکھا تھا، جہاں مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے آپ خدمات انجام دے رہے تھے وہیں دار العلوم ندوہ جیسی عظیم دینی درسگاہ کے نظامت کے عہدہ پر رہتے ہوئے اس کے انتظام وانصرام کو بہت باریکی سے دیکھتے تھے اور دن بدن ندوہ ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔

حضرت مولانا ایک عظیم داعی اور مرشد بھی تھے اور حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ کی نسبتوں کے وارث وامین اور جانشین تھے، لاکھوں بندگان خدا آپ سے وابستہ تھے اور آپ کے ارشادات وفرمودات پر عمل کرکے اپنی دنیا وآخرت کو سنوار رہے تھے، آپ رمضان المبارک رائے بریلی میں گزارتے تھے اور سالکین طریقت کی آمد کا سلسلہ ہمیشہ لگا رہتا تھا۔

حضرت مولانا ایسے خاندان کے فرد تھے جس میں ہمیشہ اولیاء اللہ اور علماء کرام گزرے ہیں۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت سید احمد شہید رائے بریلوی رحمہ اللہ سے ملتا تھا، جن کی تحریک سے وابستہ افراد نے ہر محاذ پر اپنی خدمات انجام دیں۔

آپ کی تربیت میں آپ کے ماموں حضرت مولانا ڈاکٹر عبد العلی صاحب اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہما اللہ کا بہت

گہرا اثر تھا، انہیں کے زیر سایہ رہ کر تعلیمی مراحل مکمل کیے اور زندگی کے ہر موڑ پر ان سے فیض اٹھاتے رہے، حضرت ڈاکٹر سید عبد العلی صاحب کے انتقال کے بعد آپ پورے طور پر حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ کی سرپرستی میں آگئے اور زندگی کی آخری سانس تک مولانا کی ذات گرامی سے وابستہ رہ کر فیوض وبرکات سے مالا مال ہوتے رہے اور ان کے انتقال کے بعد ان کی باطنی نسبت بھی آپ میں پورے طور پر منتقل ہوگئی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ندوی پر شروع ہی سے بزرگوں کی شفقت وعنایت رہی ہے۔ حضرت مولانا شاہ عبد القادر صاحب رائے پوری، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمہم اللہ کی خصوصی توجہات آپ کو حاصل تھیں۔

یہی وجہ تھی کہ طالب علمی کے زمانے میں آپ کو کچھ دنوں کے لیے دار العلوم دیوبند حضرت مدنی کی خدمت میں بھیجا گیا، نیز آپ حضرت مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ کے ساتھ سفر وحضر میں شریک رہتے تھے اور رائے پور اور سہارنپور بارہا حاضری ہوئی اور بزرگوں کے فیض سے استفادہ کیا۔

مولانا محمد رابع حسنی ندوی کی ولادت یکم اکتوبر ۱۹۲۹ء کو رائے بریلی کے تکیہ کلاں میں ہوئی، آپ کے والد کا نام سید رشید احمد تھا اور دادا کا نام مولوی سید خلیل الدین احمد تھا جو مولوی سید رشید الدین کے بڑے صاحبزادہ اور مولانا سید عبد العلی نصیر آبادی کے نواسہ تھے۔

آپ کے دادا کو اوائل عمر ہی سے علم کا شوق اور اہل علم ودین کی مجلسوں میں بیٹھنے کا شوق تھا، خاندان کے انساب اور حالات و واقعات پر گہری نظر رکھتے تھے، طبیعت میں وقار ومتانت بہت تھی، ان کی مجلس میں رعب رہتا، اطراف وجوانب میں بڑا اثر تھا، عمائد اور حکام میں بھی کافی رسوخ تھا۔

حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ سے قلبی تعلق تھا اور اپنی ہر مجلس میں ان کا بڑا ذکر کرتے، ان کی خواہش تھی کہ ان کے سلسلے میں بیعت ہوں، ان کی نظر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی محدث رحمہ اللہ پر پڑی، اپنے برادر عزیز مولانا حکیم سید عبد الحی صاحب کے ہمراہ گنگوہ حاضر ہوئے اور بیعت کی خواہش ظاہر کی، حضرت گنگوہیؒ نے استخارہ کروایا اور حضرت سید احمد شہید کے سلسلہ احمدیہ میں ۱۲/ شعبان المعظم ۱۳۱۲ھ کو بعد نماز عصر بیعت ہوئے، شرک وبدعت سے بڑی نفرت کرتے تھے، ۷۶/ سال کی عمر میں شعبان ۱۳۵۲ھ میں دائرہ شاہ علم اللہ میں انتقال فرمایا، ایک فرزند سید رشید احمد اور ایک صاحبزادہ کو یادگار چھوڑا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب کے والد ماجد کا نام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے نام پر رکھا گیا، ۱۳۱۱ھ میں پیدائش ہوئی، سماعت وگویائی کی طاقت پیدائش کے وقت سے مسلوب تھی، والد صاحب نے تعلیم کا مستقل انتظام کیا، اس لیے لکھنے پڑھنے اردو، انگریزی، قرآن شریف کی تلاوت سے روشناس ہوئے، نماز باجماعت کے بہت پابند اور خوش اخلاق تھے، ۱۳۹۵ھ میں دائرہ شاہ علم اللہ میں انتقال کیا، ان کے پانچ فرزند ہوئے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب اپنے بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے، آپ سے بڑے سید محمود حسنی، سید محمد مسعود اور مولانا محمد ثانی موحوم تھے۔

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے خاندانی مکتب رائے بریلی میں ہی مکمل کی، اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے۔ ۱۹۴۸ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء سے فضیلت کی سند حاصل کی، اس دوران ۱۹۴۷ء میں ایک سال دار العلوم دیوبند میں بھی قیام رہا، ۱۹۴۹ء میں تعلیم مکمل ہونے کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء میں معاون مدرس کے طور پر تقرر ہوا، اس کے بعد دعوت وتعلیم کے سلسلہ میں ۱۹۵۰-۱۹۵۱ء کے دوران حجاز سعودی عرب میں قیام رہا۔

۱۹۵۵ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے وکیل منتخب ہوئے اور ۱۹۷۰ء میں عمید کلیۃ اللغۃ مقرر ہوئے، عربی زبان کی خدمات کے لیے انڈیا کونسل اتر پردیش کی جانب سے اعزاز

دیا گیا، اس کے بعد اسی سال صدارتی اعزاز بھی دیا گیا۔

۱۹۹۳ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم بنائے گئے، اس کے بعد ۱۹۹۹ء میں نائب ناظم ندوۃ العلماء اور ۲۰۰۰ء میں حضرت مولانا ابو الحسن علی حسنی ندوی رحمہ اللہ کی وفات کے بعد ناظم ندوۃ العلماء مقرر ہوئے، دو سال بعد جون ۲۰۰۲ء میں حیدر آباد دکن میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سابق صدر قاضی مجاہد الاسلام قاسمی مرحوم کی وفات کے بعد متفقہ طور پر صدر منتخب ہوئے، آپ ۱۴۲۸ھ-۲۰۰۷ء سے دار العلوم کی شوریٰ کے مؤقر اور اہم رکن تھے۔

آپ عربی اور اردو زبانوں میں تقریباً ۳۰؍ کتابوں کے مصنف تھے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب کو مختلف علوم وفنون پر مکمل عبور تھا، آپ کی تصانیف اس پر دلالت کرتی ہیں، خاص طور پر عالم عربی کے احوال اور جغرافیائی خطوں کے بارے میں کافی معلومات تھیں، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی مدنی نور اللہ مرقدہ نے اپنی کتاب ''جزء حجۃ الوداع'' میں کئی جگہ "أفادني العزيز محمد رابع" کہہ کر حوالہ دیا ہے، اسی طرح آپ کی تصانیف میں سے بعض کتابیں نصاب میں بھی شامل ہیں، جیسے: "منشورات من أدب العرب" "الأدب العربي بين عرض ونقد" "تاريخ الأدب العربي (العصر الإسلامي)" "معلم الإنشاء (الجزء الثالث - بالعربية والأردية)"

حضرت مولانا عابد وزاہد اور زندہ شب بیدار تھے، رمضان المبارک میں عبادت کے لیے یکسو ہو جاتے تھے اور رمضان المبارک کا اکثر حصہ اپنی جائے قیام تکیہ کلاں دائرہ شاہ علم اللہ رائے بریلی میں گزارتے تھے جہاں خلق خدا حاضر ہو کر آپ کے بیانات سن کر اپنے حالات کو تبدیل کر کے قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارنے کا عہد وپیمان کرتے، امسال بھی آپ کا قیام رائے بریلی میں تھا کہ رمضان المبارک کے دوسرے عشرہ میں آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تو آپ کو علاج کے سلسلے میں لکھنؤ لایا گیا، جہاں علاج کے بعد کچھ افاقہ ہو گیا تھا اور رائے بریلی واپسی کا ارادہ تھا، لیکن اچانک ۲۰؍ رمضان المبارک بروز بدھ طبیعت پھر خراب ہوگئی اور تمام تدبیریں اختیار کی گئیں، مگر دوسرے روز ۲۱؍ رمضان المبارک بروز جمعرات آپ ہمیشہ ہمیش کے لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

اللہ تعالی آپ کی مغفرت فرمائے، درجات بلند فرمائے، امت مسلمہ کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے اور آپ کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

اسلام مکمل دین- مستقل تہذیب

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''آج اسلام کو کلچر سمجھ لیا گیا ہے، جیسے ہر قوم اور ہر ملک کا ایک تمدن وکلچر ہوتا ہے، ویسے اسلام بھی ایک کلچر ہے، عمل کرو تو صحیح، نہ کرو تو بھی صحیح، اس سے بڑھ کر کیا خطرہ کی بات ہو سکتی ہے، ایسی صورت میں جو کرنے کے کام ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) ہم اپنے بچوں کو ایسے ماحول میں رکھیں جس سے ان کے دین کی حفاظت ہوتی ہو، افسوس ہے کہ آج ماں باپ ہر چیز کی حفاظت کرتے ہیں، لیکن دین کی حفاظت نہیں کرتے۔

(۲) مکاتب کھولے جائیں جن میں چند دن ہی سہی بچوں کو دین کی اہم بنیادوں سے واقف کرا دیا جائے، اس عمر میں وہ دین کی بنیادوں سے واقف ہو جائیں گے، تو زندگی کے ہر مرحلہ میں وہ ان کے کام آئیں گی۔'' (افادات علم وحکمت: ۱۳)

چلتا نہیں ہے زور کسوں کا قضا کے ہاتھ

مولانا محمد جمیل اختر جلیلی ندوی
(پوچری دھنباد- جھارکھنڈ)

موت تو برحق ہے، ہرایک کو آنی ہے، چار پل کی یہ زندگانی ہے، موت سے کسی کو رستگاری نہیں، ہرایک کی ایک دن باری ہے: ﴿کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ﴾ (ہر جان کو موت کا مزہ چکھنا ہے) لیکن جانے جانے والے میں فرق ہوتا ہے، کچھ کے جانے سے اہل وعیال اور رشتہ دار ہی مغموم ہوتے ہیں، کچھ کے جانے سے اہل شہر بھی غم زدہ ہوتے ہیں، کچھ کے جانے سے قوم وملک رنج والم میں ڈوب جاتا ہے؛ لیکن کچھ کے جانے سے کئی کئی ممالک، قرب وجوار کے بھی اور دور دراز کے بھی اشک ریز ہوجاتے ہیں، یہ وہ ہوتے ہیں جو اس دنیا میں کام نہیں کارنامے کر جاتے ہیں، کار نہیں کارہائے نمایاں انجام دے جاتے ہیں، اسی لیے ان کے جانے سے زمانہ افسوس کرتا ہے اور کہتا ہے:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

رمضان المبارک کی اکیس تاریخ کو ظہر کے بعد تلاوت قرآن میں مصروف تھا اور رات کی تراویح کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک واٹس اپ پر ایک خبر گردش میں آئی کہ ”حضرت مولانا سید رابع حسنی ندوی انتقال فرما گئے“ دل دھک سے رہ گیا، تھوڑی دیر کے لیے اوسان خطا ہوگئے کہ یہ کیا ہوگیا؟ ابھی تو ہم بھارتیوں کو ان کی سخت ضرورت تھی کہ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر ہونے کی حیثیت سے یہ وہ نقطہ تھے جن پر پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کا اتفاق تھا لیکن ہاتف اجل کو اس کی پرواہ کب ہوتی ہے کہ کس کی کب کتنی ضرورت ہے؟ یہاں تو بس گھنٹی بجتی ہے اور پھر انسان ٹس سے مس نہیں کرسکتا، ﴿فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ﴾ ایک مؤمن کا شیوہ قضا وقدر کے ہر فیصلہ پر راضی رہنا ہے، سو ہم سب بھی اس پر راضی ہیں کہ:

تابع رضا کا اوس کی ازل سیں کیا مجھے
چلتا نہیں ہے زور کسوں کا قضا کے ہاتھ

زبان سے ہم بھی وہی کلمات نکالتے ہیں اور لکھتے ہیں جو ہمیں سکھایا گیا ہے: ”إنا للّٰه و إنا إليه راجعون، إن للّٰه ما أخذ، وله ما أعطى، و كل شئ عنده بأجل مسمى، اللهم اغفر له و ارحمه و أدخله فى فسيح جناته ويلهم أهله وذويه الصبر والسلوان“

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کو میں بچپن سے جانتا ہوں، جی ہاں بچپن سے، لگ بھگ سات آٹھ سال کی عمر میں عم محترم جناب مولانا آفتاب عالم ندوی دھنبادی مدظلہ کے توسط سے میرا داخلہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبہ حفظ میں ہوا، یہ عمر بچپن کی ہوتی ہے، یہ دور قلم وقرطاس کے لحاظ سے تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی نظامت کا تھا؛ لیکن عملی طور پر نظامت کے سارے امور حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ہی انجام دیا کرتے تھے، منصب اہتمام پر حضرت مولانا محبّ اللہ لاریؒ فائز تھے، یہ ان کے اہتمام کا چراغ سحری دور تھا؛ کیونکہ اسی سال ۲۹/نومبر ۱۹۹۳ء صبح کی اولین ساعتوں میں وہ دار بقا کی طرف کوچ کر گئے، کارگزار مہتمم حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ تھے۔

حضرت مولانا محبّ اللہ لاریؒ کی وفات کے بعد منصب اہتمام کے لیے جس شخص کا انتخاب عمل میں آیا وہ ایک سیدھے سادھے صوفی منش جو حضرت مولانا سعید الاعظمی مدظلہ اور مولانا

مرتضیٰ مظاہریؒ کی طرح بارعب بھی نہیں یعنی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ تھے، لوگوں کے سان وگمان بھی نہ تھا کہ وہ اس طرح اتنی جلدی اس طرح طلبہ کو قابو میں کریں گے، جس طرح ماہر چرواہا بدکے ہوئے جانور کو کر لیتا ہے لیکن جاننے والے جانتے ہیں اور اس وقت وہاں پر رہنے والے حضرات گواہی دیں گے کہ انھوں نے طلبہ کو قابو میں کیا، لباس وپوشاک اور طرز زندگی میں تبدیلی آئی، اشراف اور نگرانی کے شعبے میں تبدیلی لائی گئی؛ تاکہ طلبہ پر صحیح گرفت ہوسکے، اسی زمانہ میں جالی والی ٹوپی کو ''ندوہ دروہ'' قرار دیا گیا، یاد پڑتا ہے کہ اس تعلق سے حضرت مہتمم صاحب (مولانا رابع صاحب) نے ندوہ کی وسیع مسجد میں طلبہ کے سامنے خطاب بھی کیا اور یہ بتایا تھا کہ اس ٹوپی سے یہودی ربیوں کی مشابہت لازم آتی ہے، وہ بھی یہی ٹوپی پہنتے ہیں اور جس طرح طلبہ بال نکال کر آدھے سر میں پہنتے ہیں وہ بھی اسی طرح پہنتے ہیں، گیٹ سے باہر جانے پر پابندی لگائی گئی اور اس کے لیے نگراں سے پرچی لینے کو ضروری قرار دیا گیا، نمازوں کے معاً بعد ہاسٹلوں میں نگرانوں کی ایک جماعت کو گشت کا پابند بنایا گیا؛ تاکہ ان طلبہ کی تنبیہ کی جاسکے جو نماز ترک کر کے کمروں میں پڑے رہتے ہیں، اس طریقہ سے بڑا فائدہ ہوا اور نماز چھوڑنے والے طلبہ کی تعداد تقریباً ختم ہوگئی، خلاصہ یہ کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے دور اہتمام کو ہم ایک سنہرا دور کہہ سکتے ہیں، یہ دور تقریباً چھ سال پر محیط ہے؛ لیکن ان چھ سالوں میں ندوہ کی جو کایا پلٹ ہوئی ہے، یہ کسی بھی محبّ ندوہ سے مخفی نہیں ہے، اس سے حضرت مولانا کی اہتمامی صلاحیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

۳۱؍دسمبر ۱۹۹۹ء کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نوراللہ مرقدہ کی وفات حسرت آیات کے بعد ندوۃ العلماء کے ناظم کی حیثیت سے حضرت مولانا رابع صاحب کو منتخب کیا گیا اور ان کی جگہ مہتمم حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ کو بنایا گیا، ایک ناظم اور مہتمم کے کام وکار اور ذمہ داری ومسؤلیت میں کافی فرق ہوتا ہے اور ندوہ میں یہ فرق اور زیادہ ہے؛ کیوں کہ مہتمم تو صرف دارالعلوم کا ہوتا ہے، جب کہ ناظم ندوۃ العلماء کا اور ندوۃ العلماء کوئی ادارہ نہیں؛ بل کہ ایک تحریک کا نام ہے جس سے اس کی وسعت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، حضرت مولانا رابع حسنی صاحب کے لیے اس ذمہ داری کو نبھانا اس لیے آسان تھا کہ برسوں سے اپنے ماموں مولانا علی میاں ندویؒ کی یہ ذمہ داری عملی طور پر وہی انجام دیتے آرہے تھے، سو انھوں نے اس ذمہ داری کو بھی حسن وخوبی کے ساتھ نبھایا اور اس وقت ندوہ ظاہری ومعنوی طور پر جس اوج پر پہنچا ہوا ہے اور اس وقت ندوہ میں جو باغ وبہار ہے، وہ حضرت ہی برکت سے ہے، حضرت نے اس ذمہ داری کو آخری وقت تک نبھایا؛ حتی کہ اس پیرانہ سالی میں بھی ایک فائل کی ورق گردانی بذات خود کرتے اور جہاں دستخط کی ضرورت پڑتی، دستخط ثبت فرماتے۔

میں نے الحمدللہ حضرت کے اہتمام اور نظامت دونوں دور کو پایا ہے اور جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ دونوں دور میں ندوہ کو جس طرح کے فرد کی ضرورت تھی، حضرت اس کے بجا طور پر لائق تھے، ایک مہتمم کے لیے کچھ ضروری اوصاف ہوتے ہیں، اگر مہتمم ان اوصاف سے متصف نہ ہو تو ادارہ کی عظمت تو خاک میں ملتی ہی ہے، خود لفظ مہتمم کو بھی داغدار ہونا پڑتا ہے، مثلاً: مہتمم کے لیے صرف عالم ہونا ہی کافی نہیں؛ بل کہ جید الاستعداد اور ہمہ جہت صلاحیتوں کا مالک ہونا بھی ضروری ہے، فہم وفراست کا مالک ہونا اور حلم وتدبر سے لیس ہونا بھی ضروری ہے، اس کے اندر مضمون نگاری اور تصنیف وتالیف کی بھی بھرپور صلاحیت ہونی چاہیے، اسے طلبہ اور ادارہ کے لیے ہر وقت فکرمند ہونا چاہیے اور ان سب سے زیادہ اس کے اندر امانت دار کی صفت ضرور ہی پائی جانی چاہیے، یہ اور ان جیسے صفات سے متصف ہونا ایک مرکزی ادارہ کے مہتمم کے لیے ضروری ہے اور یہ تمام وہ اوصاف ہیں جو حضرت میں بدرجہ اتم موجود تھے، جس کی شہادت حضرت کے دور اہتمام کے لوگ خوب دیں گے۔

حضرت مولانا ایک شریف، نیک وصالح، متقی وپرہیز گار، ذاکر وشاغل، امانت دار، حلیم وبردبار، فہم وفراست کے پیکر، انتظام

وانصرام میں ماہر، خوش اخلاق، خوش اطوار، ملنسار، چھوٹوں کے لیے مشفق ومہربان، بڑوں کے حق میں مشیر وخیر خواہ، ملتے تو مسکرا کر، چلتے تو تواضع کے ساتھ جھک کر، رشد وہدایت کا چشمہ، کام کے قدر دان، گزشتہ سال میری دو کتابیں منصۂ وجود میں آئیں، ایک ''مقاصد شریعت: ایک تعارف'' اور دوسری ''عصری نظام تعلیم: مسائل اور حل''، بطور تبرک حضرت ہی کے ہاتھوں رائے بریلی میں ان دونوں کتابوں کی رسم اجراء ہوئی، جس میں تعاون استاذ محترم مولانا بلال حسنی ندوی مدظلہ نے کیا، حضرت سردی کی وجہ سے گھر کے اندرون میں کمبل لپیٹے نیم دراز تھے، کتاب دیکھ کر اٹھ بیٹھے، خوشی کا اظہار کیا، استاذ محترم نے تعارف میں بتایا کہ یہ مولانا آفتاب دھنبادی کے بھتیجے ہیں تو اور زیادہ خوش ہوئے، عم محترم کی بھی خیریت پوچھی، یہ میرے لیے خوش قسمتی کی بات ہے کہ انھوں نے ان دونوں کتابوں کی رسم اجراء اپنے ہاتھوں سے انجام دی۔

آج حضرت ہمارے درمیان نہیں رہے جس کا قلق اور اضطراب پورے عالم کو ہے؛ لیکن یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ ہے جو بھی آیا جانے کے لیے ہی آیا ہے، ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ، وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ اب ہمیں چاہیے کہ ہم حضرت کے مشن کو آگے بڑھائیں، ان کے لیے دعائے مغفرت کرتے رہیں اور یہ بھی دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم اخلاف اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

امت مسلمہ کا ایک بڑا المیہ

''بڑی عجیب بات ہے کہ اس امت کو ہم ایک خدا، ایک رسول، ایک کتاب اور ایک کلمہ پر تو متحد پاتے ہیں لیکن اتحاد کا یہ رشتہ ہمیں اس کے معاملات کے اندر نظر نہیں آتا، درحقیقت اس امت کا روگ اور اس کی سرحدوں کا خطرناک پہلو اور حساس علاقہ یہی ہے، اگرچہ یہ اپنی وحدت کو بحال کرنے اور استوار کرنے کے لیے تنظیمیں، انجمنیں اور جماعتیں قائم کرتی ہے، لیکن اس کی وحدت کے اندر بالکل استقامت وپائیداری نہیں ہوتی اور نہ سنجیدگی واستقلال ملتا ہے، چنانچہ مستحکم بنیادوں پر قائم نہ رہنے کی وجہ سے اس کو سطحی منفعت ومصلحت اور انانیت پر غلبہ حاصل نہیں ہو پاتا ہے، آج اس امت کو کتنے مشکل مسائل درپیش ہیں اور یہ کتنے سخت خطرات کا نشانہ بنی ہوئی ہے، جانی ومالی خسارے بھی اور ذلت ورسوائی بھی اس کو مختلف اطراف سے گھیرے رہتی ہے، لیکن اس سے بھی تکلیف دہ جو بات ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کی نگاہوں میں رسوا اور ذلیل ہوتی جارہی ہے، اس کی رسوائی کا بڑا سبب ہم یہ پاتے ہیں کہ اس کے احکام وامراء درپیش مسائل کو بچکانہ نظر سے دیکھتے ہیں اور ان کے حل کے سلسلہ میں وہ عموماً سیاسی لاعقلی کا شکار ہیں۔

اس صدی کے اوائل میں یورپ امت اسلامیہ کے مادی وسائل اور اس کی بشری قوت سے خوف کھاتا تھا، اس کو اسلام کی روحانی قوت سے ڈر اور خطرہ لگا رہتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ اس پر ضرب لگائے اور اس کو نیست ونابود کردے، چنانچہ وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوگیا اور اس کو سب سے بڑی کامیابی یہ ملی کہ دشمنوں کے دلوں سے مسلمانوں کی ہیبت ودبدبہ جاتا رہا اور جن کو اسلام کے نام سے لرزہ آتا تھا، ان کو یہ احساس ہوگیا کہ اس امت کی حیثیت ایک غبارہ کے مانند ہوگئی ہے، جس کی بہت کچھ ہوا نکل چکی ہے۔'' (عالم اسلام اور سامراجی نظام: ۵۸-۵۹)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

ایسا ملا ہے دردِ دل جس کی کوئی دوا نہیں

حافظ مصباح الدین
(مہمان خانہ ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

کس کو سناؤں حال غم کوئی غم آشنا نہیں
ایسا ملا ہے دردِ دل جس کی کوئی دوا نہیں

میرے شیخ ومرشد اور میری کل کائنات حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات کو ایک ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہو چکا، مگر ابھی بھی ان کی وفات کا غم ذرہ برابر ہلکا نہیں ہوا اور یہ غم ہلکا بھی کیوں کر ہو؟ دن دو دن نہیں، ماہ دو ماہ نہیں، سال دو سال نہیں بلکہ میری زندگی کے مکمل ۴۸ر سال ان کی شفقتوں کے سایہ میں گذرے ہیں، جن میں سے ۲۳ر سال کا عرصہ تو ایسا گذرا کہ ایک لمحہ کے لیے بھی ان سے جدائی دشوار تھی، اس پورے عرصہ کی داستان یقیناً بڑا وقت چاہتی ہے، جو کرب والم کی شدت کے عالم میں سنانا ممکن نہیں۔

ابھی بھی میری نگاہیں انہی کو تکتی ہیں جن کا نام سنتے ہی آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہو جاتے ہیں، ان کا وہ تخت جس پر وہ جلوہ افروز ہوتے تھے اور یہ خدمت گذار اس تخت نشیں کا ہمہ وقت طواف کرتا رہتا تھا، آج وہ تخت اپنی ویرانی پر ماتم کر رہا ہے اور یہ خادم سراپا ماتم بنا ہوا ہے۔ ابھی بھی اس کمرہ کی طرف جاتے ہوئے قدم لڑکھڑا جاتے ہیں جو کمرہ میرے محبوب کی تشریف آوری سے پر رونق رہتا تھا اور پورے عالم کی توجہ کا مرکز ہوتا تھا۔ ابھی بھی اس الماری کو دیکھ کر کلیجہ منھ کو آجاتا ہے جس میں میں اپنے حضرت کے کپڑے بڑے شوق ومحبت سے سجا کر رکھتا تھا۔ ابھی بھی اس دسترخوان کو دیکھ کر آنکھیں بھر آتی ہیں جسے میں اپنے حضرت کی خدمت میں بے تکلف سجاتا تھا۔ ابھی بھی بعد نماز عشاء مہمان خانہ میں پسرا ہوا سناٹا دیکھ کر حرکتِ قلب تیز ہو جاتی ہے جس میں علم وفضل اور دانائی وحکمت کے موتی بکھرا کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر حواس اس وقت مختل ہو جاتے ہیں جب رات کو مہمان خانہ سے گھر جانے کا وقت آتا ہے، اس وقت اپنے حضرت کی یاد بڑی ستاتی ہے، جن سے جاتے وقت ہمیشہ سلام کر کے دعائیں لے کے اور اطلاع دے کر رخصت ہوتا تھا۔

اللہ اللہ! کیا ہی اعلیٰ ان کی شان تھی، شاہ وگدا سب ان کی خدمت میں عقیدت مندانہ حاضر ہوتے تھے، ان سے مشورے لیتے، ان کو اپنی کارگذاریاں پیش کرتے، ان سے رہنمائی حاصل کرتے اور اخیر میں دعائیں لے کر رخصت ہوتے تھے، اب ہم کہاں سے لائیں گے ایسا روشن دماغ؟! کہاں سے پائیں گے ایسا مرشد؟! کہاں سے لائیں گے ایسی محبوب ومقبول اور جامع حسنات شخصیت؟!

۴۸ر سال کے طویل عرصہ میں ان کی زندگی کا کون سا ایسا موقع تھا جس میں یہ فدوی ان کے ساتھ نہ تھا، میں نے ان کا وہ دور بھی دیکھا جب وہ حضرت مولانا علی میاںؒ کے دست راست تھے اور ان کے دن رات ندوہ کی ترقی کے لیے وقف تھے، حضرت مولانا علی میاںؒ کی ذات بجائے خود ایک انجمن تھی، ان کے اسفار کی ترتیب بنانا، ان کے بیانات اور پروگراموں کی روداد تیار کرنا، اہم لوگوں سے ملاقات کے اوقات متعین کرنا، یہ سب اہم کام حضرت مولانا رابع صاحبؒ ہی کے ذمہ تھے، اس کے علاوہ ندوہ کے تمام تر انتظامی امور کو نبھانا، اساتذہ وطلبہ کے مسائل حل کرنا، اپنی تصنیفی وتالیفی اور صحافتی خدمات کو مقررہ وقت پر مستقل مزاجی کے ساتھ انجام دینا، اسی کے ساتھ اپنے اہل خانہ اور اعزہ اقرباء کے حقوق کا مکمل خیال رکھنا اور اس سب سے بڑھ کر اللہ تبارک وتعالیٰ سے اپنا رشتہ مضبوط رکھنا، راتوں کو اٹھ اٹھ کر امت کے لیے دعائیں کرنا، رونا اور گڑگڑانا ان کی یہ سب باتیں پہلے دن سے میرے مشاہدہ میں ہیں۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کے بعد میرے حضرت ہی ان کے حقیقی جانشین قرار پائے، پھر میں نے آپ کا ۲۳ رسالہ عہد نظامت بھی خوب دیکھا، مجال ہے کہ ایسے عظیم منصب پر فائز ہونے کے بعد بھی ان کی گفتار و کردار میں ذرہ برابر فرق واقع ہوا ہو، بلکہ چشم بینا کا مشاہدہ تو یہ ہے کہ اس ذمہ داری کے ملنے کے بعد ان کی تواضع وفروتنی اور عاجزی وانکساری میں انتہائی درجہ اضافہ ہوگیا تھا۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی وفات کے بعد جب حضرت والاؒ عید کے بعد بحیثیت ناظم ندوۃ العلماء پہلی مرتبہ تکیہ سے ندوہ تشریف لائے تو ان کے ایک واقعہ نے مجھے بڑا متاثر کیا اور بہت کچھ سکھایا، آپ نے مجھے بلا کر فرمایا کہ

''ہماری طبیعت چاہتی ہے کہ ہم جلد از جلد حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحب کی خدمت میں حاضری دیں، اس وقت وہ حضرت تھانوی کے جلیل القدر خلیفہ ہیں اور بہت بزرگ شخصیت ہیں، ماموں جان (حضرت مولانا علی میاںؒ) کی وفات کے بعد ان کی تھوڑی دیر کی صحبت بھی یقیناً طبعی سکون وراحت اور تقویت کا باعث ہوگی۔ اس لیے تم فوری طور پر ہمارے اس سفر کے انتظامات کی فکر کرو اور وہاں بھی اطلاع دے دو، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اپنا نظام دیکھ کر چلیں اور حضرت والا کے نظام اور ان کے اصولوں میں خلل واقع ہو۔''

اس خادم نے یہ حکم اپنے لیے سعادت سمجھا، سب سے پہلے ہردوئی اطلاع کی، وہاں سے جواب آیا کہ ان حضرات کی آمد پر کسی پروٹوکول یا اصول وضابطوں کے لحاظ کی ضرورت نہیں ہے، یہ ان کا گھر ہے وہ جب چاہیں اور جیسے چاہیں تشریف لائیں۔

یہ نورانی قافلہ جس میں یہ خادم بھی ساتھ تھا' ہردوئی کے لیے روانہ ہوا، پہنچ کر حضرت والا ہردوئی سے ہمارے حضرت کی ملاقات ہوئی، اس موقع پر ہمارے حضرت کی کیفیت قابل دید تھی، جوان کے احترام میں بالکل جھکے جاتے تھے، حضرت والا ہردوئی نے بھی آخری درجہ کی محبت کا اظہار فرمایا، خصوصی قیام گاہ میں ٹھہرایا، پھر بذات خود چل کر تخلیہ میں حضرت مولانا رابع صاحب سے ملاقات کو آئے اور دیر تک گفتگو فرمائی۔ اس کے بعد اپنے ادارہ کے اہم اساتذہ وذمہ داران کو متوجہ کیا کہ وہ سب لوگ مولانا رابع صاحب سے ملاقات کریں اور زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں، اگر ممکن ہوسکے تو تھوڑی دیر ان کی قیمتی نصیحتیں بھی سنیں، یہ لوگ جن میں بالخصوص مولانا افضال الحق صاحب بھی موجود تھے، حضرت ہردوئی کے ایما پر حضرت مولانا رابع صاحب کی قیام گاہ تشریف لائے اور دیر تک استفادہ کیا، پھر مسجد میں طلبہ واساتذہ کے درمیان تھوڑی دیر خطاب کے لیے درخواست کی، مگر حضرت راضی نہیں ہوئے، ان لوگوں نے جب زیادہ اصرار کیا تو حضرت نے فرمایا کہ میں یہاں بذات خود کچھ لینے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں نہ کہ دینے کے لیے۔ لیکن ان کا مسلسل اصرار رہا، جس پر فدوی نے بھی درخواست کی کہ اگر تشریف لے چلیں اور کچھ عرض کردیں تو بڑا اچھا ہو، اس پر فرمایا: یہ بڑی گستاخی ہوگی کہ ہم اپنے حضرت کی موجودگی میں کچھ نصیحت کی جرأت کریں، میں نے کہا: حضرت اپنے کمرہ میں رہیں گے اور وہ اس مجلس میں شرکت نہیں کریں گے۔ مگر اس کے باوجود آپ میرے حضرت کی تواضع وانکساری ملاحظہ کریں، فرمایا:

''کیا ان کے کمرہ تک مائک کی آواز نہیں جائے گی؟''

اس کے بعد ہمارے پاس کوئی جواب نہ تھا، لیکن چونکہ حضرت والا ہردوئی کی جانب سے مسلسل یہ اصرار تھا کہ بیان ہونا چاہیے، اس لیے حضرت کا ایما دیکھ کر تھوڑی دیر حکم کی تعمیل کی۔

ہردوئی کے نورانی ماحول میں خاصا وقت گذارنے سے حضرت کی طبیعت بڑی ہشاش بشاش معلوم ہوئی، جہاں انہوں نے حضرت ہردوئی کی نیک صحبت سے فائدہ اٹھایا اور ان کی محبتوں وشفقتوں کے سایہ میں رہے۔ پھر جب چلنے کا وقت ہوا تو سبھی کے چہروں پر افسردگی چھا گئی اور بڑا اثر محسوس ہوا، لیکن ہمارے حضرت نے فرمایا کہ ماموں جان کی وفات کے بعد شدت سے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اب ہم بے سایہ ہوگئے، لیکن حضرت ہردوئی کے یہاں حاضر ہوکر یہ احساس کسی قدر جاتا رہا اور طبیعت بڑی مطمئن ہوئی۔

حضرت ہردوئی نے بھی بڑے بلند کلمات ارشاد فرمائے اور فرمایا کہ آپ جب چاہیں تشریف لائیں، میرے لیے آپ کا آنا

خوشی کا سبب ہے، بلکہ صرف میرے لیے نہیں، میرے گھر والوں اور تمام احباب کے لیے بھی انتہائی خوشی کا باعث ہے۔

حضرت ہردوئی کی محبت کا یہ بھی ایک نمونہ تھا کہ جب ہمارے حضرت وہاں تشریف لے جاتے، تو حضرت ہردوئی بطور خاص مجھ سے اصرار کے ساتھ پوچھتے کہ مولانا رابع صاحب کو کھانے میں سب سے زیادہ کیا چیز پسند ہے؟ میں ہر مرتبہ عرض کرتا کہ انہیں سادہ کھانا پسند ہے، مگر پھر بھی ازراہ نوازش سوال ضرور فرماتے۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی وفات کے بعد حضرت مولانا رابع صاحبؒ ہی ہم سب کے سرپرست تھے، سب لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور رہنمائی لیتے تھے، مگر بعض اوقات آپ کی طبیعت سخت بوجھل ہوتی اور بہت تھکان ہوتا تھا، لیکن یہ ان کا کمال تھا کہ کبھی بھی مخاطب کو یہ احساس نہ ہونے دیا کہ ان کے لیے بیٹھنا مشکل ہے، بلکہ لبوں پر مسکراہٹ اور پوری بشاشت قلبی کے ساتھ مخاطب کی بات سنتے رہتے اور مفید باتیں بتاتے رہتے، پھر جب تخلیہ ہوتا اور یہ فدوی معلوم کرتا کہ ''حضرت! تکان تو نہیں ہوا؟'' تو انتہائی دھیمے اور نرم انداز میں گویا ہوتے ''محسوس ہو رہا ہے'' یہ سن کر اگر میں کبھی جذباتی ہو جاتا تو مسکرا دیتے اور فرماتے: ''لوگ بڑی امیدوں کے ساتھ آتے ہیں، ان کے مسائل سننا بھی ثواب ہوگا۔''

حضرتؒ کی خدمت میں صف اول کے چنیدہ طبقہ کی بلا ناغہ حاضری میرے لیے عام بات تھی، لیکن میرے لیے سب سے اہم اس بات کی فکر تھی کہ حضرت کو زیادہ سے زیادہ راحت کیسے پہنچائی جائے؟ اسی لیے میں حضرت کی ہر ہر چیز کی فکر رکھنے کی کوشش کرتا، حضرت نے بھرپور نیند لی کہ نہیں؟ حضرت کا بی پی نارمل ہے کہ نہیں؟ حضرت کی طبیعت ہشاش بشاش ہے کہ نہیں؟ حضرت نے مقدار کے مطابق غذا لی کہ نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اگر کوئی بھی چیز مجھے ایسی محسوس ہوتی کہ یہ حضرت کے لیے عدم راحت کا ذریعہ ہے یا حضرت کو فلاں تکلیف ہے تو میں آخری حد تک اس کے ازالہ کی کوشش کرتا، حتی کہ بعض اوقات نو وارد مہمان میرے طرز عمل کو دیکھ کر سخت برہم ہو جاتے، مگر مجھے کسی کی پرواہ نہ ہوتی، اس لیے کہ میرا مقصود صرف اپنے حضرت کی راحت رسانی تھا جو پوری ملت کا عظیم سرمایہ تھے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی اعلیٰ اخلاقی زندگی بیان کرتے ہوئے بتایا جاتا ہے کہ آپ ﷺ جب کسی سے مخاطب ہوتے تو پوری طرح متوجہ ہوتے، جب تک سامنے والا خود اپنی بات ختم کر کے واپس نہ ہو جاتا تب تک آپ ﷺ بھی اس کی رعایت فرماتے۔ آپ ﷺ نرم خو اور نرم مزاج تھے۔ آپ ﷺ نے اپنی ذات کے لیے کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ اسی طرح آپ ﷺ کی ذاتی زندگی بیان کرنے والوں نے آپ کے ''الامین'' لقب کو بطور خاص ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب آپ ﷺ کفار مکہ کی ایذا رسانی کے نتیجہ میں ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے، اس وقت بھی دشمنان اسلام کی امانتیں آپ کے پاس رکھی تھیں۔ ان تمام اوصاف کے ساتھ آپ ﷺ کے متعلق ان کے خادم خاص حضرت انسؓ کی وہ گواہی بھی یقیناً قابل رشک ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ میں پورے دس سال اللہ کے رسول ﷺ کی خدمت میں رہا، مگر آپ کی سراپا رحمت ذات نے کبھی بھی مجھے اف تک نہ کہا، اگر میں نے کبھی کوئی کام کیا تو آپ ﷺ نے یہ نہ پوچھا کہ ایسا کام کیوں کیا اور ایسا کام کیوں نہیں کیا؟

آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کے انہی روشن نقوش کی جھلک کا مشاہدہ اب آپ حضرتؒ کی زندگی میں ملاحظہ کیجیے، جن کی خدمت میں فدوی نے عمر عزیز کے ۴۸ر سال گذارے ہیں:

حضرت کی خدمت میں صف اول کے جو لوگ آتے تھے، ان کے ساتھ حضرتؒ کا سلوک واکرام تو یقیناً ہر شخص جانتا ہے اور وہ لوگ خود بھی بہترین پیرایہ میں اپنی باتیں پیش کریں گے، لیکن میں نے ایسے لوگوں کے ساتھ بھی خندہ جبینی سے پیش آتے دیکھا ہے جن کو شاید حضرت پہچانتے بھی نہ ہوں، وہ لوگ مہمان خانے آجاتے اور حضرت کے پاس بیٹھ کر اپنی دنیا بھر کی باتیں بتاتے رہتے، حضرت ان کی باتیں بشاشت کے ساتھ اور پوری طرح متوجہ ہو کر سماعت فرماتے، پھر حضرت کا سلوک اس حد تک بڑھ جاتا کہ سامنے والے کو گھنٹوں کی صحبت بھی تھوڑی معلوم ہوتی، حالانکہ اس دوران حضرت کو شدید تکان ہو جاتا اور بعض مرتبہ استنجا کا تقاضا بھی شدید ہوتا، مگر

حضرت مخاطب کے مزاج کی مکمل رعایت فرماتے اور اپنی طبیعت پر پوری طرح جبر کرتے تھے۔ صرف ایسا نہ تھا کہ ملنے والوں کا سلسلہ قیام گاہ پر ہی ہوتا تھا، بلکہ درجات سے نکلتے ہوئے اور آفس آتے جاتے ہوئے یا سرراہ چلتے ہوئے اور گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بھی اگر ملاقات کرنے والے آجاتے تب بھی حضرت کا یہی سلوک ہوتا۔

حضرتؒ کی نرم خوئی ونرم مزاجی سے تو ایک عالم آشنا ہے، بارہا ایسے مواقع بھی دیکھنے میں آئے کہ چند بے توفیق لوگوں نے بدسلوکی کا معاملہ کیا یا بے توقیری کا اظہار کیا، مگر آپ کی طرف سے ہمیشہ حسن سلوک ہی کا مظاہرہ ہوا۔ بعض مرتبہ ان کے سامنے گستاخانہ عمل کی باتیں بالکل کھل گئیں، لیکن اس کے باوجود کبھی اپنی ذات کے لیے کوئی انتقام نہ لیا۔ کتنی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ ہر طرح کے حاضر ہونے والے لوگوں میں کوئی ایسا بھی آجاتا جو شعوری یا غیر شعوری نتیجہ میں ایسی بات کہہ جاتا جس سے آپ کو تکلیف پہنچے، لیکن کبھی آپ برملا اس کا اظہار نہ فرماتے، بلکہ لبوں پر مسکراہٹ رہتی۔ یہ بھی آپ کی نرم مزاجی ہی کا حصہ ہے کہ اگر کوئی شخص آپ سے مشورہ لیتا، یا آپ کسی شخص کو کسی بات کی طرف متوجہ کرتے تو کبھی بھی براہ راست اس سے یہ نہ کہتے کہ ''تم ایسا کرلو'' یا ''تم کو یہ کرنا ہوگا'' یا ''تمہارے اوپر یہ لازم ہے'' بلکہ انتہائی شفقت بھرے لہجہ میں ارشاد فرماتے: ''ہم یہ سمجھتے ہیں کہ شاید تمہارے لیے یہ چیز زیادہ مناسب ہو'' یا کہتے کہ ''ہمارے خیال میں تمہارے لیے یہ زیادہ مفید ہوگا'' وغیرہ وغیرہ۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اندر امانت داری کا جوہر بھی بے مثال تھا، لاکھوں اور کروڑوں کی رقمیں ان کے لیے بے حیثیت تھیں، مختلف مدوں کی خطیر رقمیں ان کی خدمت میں روزانہ آتی جاتی رہتی تھیں، لیکن عہد شباب سے لے کر پیرانہ سالی تک میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے کسی بھی امانت کو خلط ملط کیا ہو، پھر اس کو استعمال کرنا تو بہت ہی دور کی بات ہے، اس سلسلہ میں احتیاط کا پہلو ان کے یہاں آخری درجہ کا تھا، وفات کے بالکل آخری وقت تک ان کی یہ احتیاط باقی رہی، انتقال سے چند روز قبل اپنی ایک ذاتی رقم مجھے عنایت کی اور فرمایا: میری وجہ سے جو لوگ یہاں مقیم ہیں، یہ رقم ان کے اوپر خرچ کرنا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! یہاں تمام انتظامات موجود ہیں، اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر آپ نے باصرار وہ رقم دی اور فرمایا کہ اس وقت یہ لوگ ندوہ کے لیے نہیں بلکہ میری خاطر مقیم ہیں اور ان کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔

فدوی ۴۸ رسال حضرتؒ کی شفقتوں کے سایہ میں رہا، اس دوران کتنے ایسے موقعے آئے ہوں گے جب میرا لہجہ گستاخانہ ہوا ہوگا، کتنی بار ایسا ہوا ہوگا جب میں نے نیند میں خلل ڈال دیا ہوگا، کتنی مرتبہ ایسا ہوا ہوگا جب میں نے خلاف مزاج بات کہہ دی ہوگی، کتنی دفعہ ایسا ہوا ہوگا جب میں نے فرط محبت وعقیدت میں ان کی عدم خواہش کے باوجود زبردستی کچھ کھلا پلا دیا ہوگا، کتنی مرتبہ ایسا بھی ہوا ہوگا کہ وہ تصنیف وتالیف میں غرق ہوں گے اور میں نے درمیان میں ذہن منتشر کردیا ہوگا، کتنی بار ایسا ہوا ہوگا جب وہ مراقبہ کی حالت میں اللہ سے لو لگائے ہوں گے اور میری بے سلیقہ حرکتوں سے ایذا پہنچی ہوگی، لیکن محبوب کی اداؤں پر قربان جایئے، انہوں نے نصف صدی سے فقط دو سال کم کے ایک طویل عرصہ میں کبھی یہ نہیں فرمایا کہ مجھے تمہارے اس عمل سے تکلیف پہنچی، کبھی یہ نہیں فرمایا: تم نے ایسا کیوں کردیا، کبھی یہ نہیں فرمایا: تم نے فلاں کام کیوں نہیں کیا۔ فرمانا تو دور کی بات انہوں نے کبھی اپنے ظاہری خدوخال سے محسوس تک نہ ہونے دیا کہ انہیں میرے کسی عمل سے ناگواری ہوئی ہے۔ بلکہ ان تمام گستاخیوں کے باوجود وہ ہمیشہ ایسے شفیق رہے کہ انہوں نے ایک والد کی کمی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔

اپنے حضرتؒ کی محبت وشفقت کے کس کس انداز کو یاد کروں، اگر میں کبھی عرض کرتا کہ حضرت! ایک ضروری کام کی وجہ سے تھوڑی دیر کے لیے مجھے لکھنؤ سے باہر جانا ہے۔ تو اولاً ان کی منشا نہ ہوتی، لیکن اگر ضروری سمجھتے تو معلوم کرتے کہ واپس کب تک آجاؤ گے؟ یا فرماتے کہ کام پورا ہوتے ہی میرے پاس واپس آجانا۔ اسی لیے اس پورے عرصہ میں انگلیوں پر دن گنے جاسکتے ہیں جن کے اندر میں ان

کی نگاہ کے سامنے نہ رہا ہوں۔ اگر کبھی مجھے واپسی میں تاخیر ہوجاتی اور رات زیادہ ہوجاتی، تب بھی میں ہلکا دروازہ کھول کر حضرت کو دیکھتا، ہلکی سی روشنی میں مجھے نظر آتا کہ آپ سر مبارک پر ہاتھ پھیر رہے ہیں یا کروٹ لے رہے ہیں، جس سے اندازہ ہوتا کہ ابھی تک جاگ رہے ہیں، میں اندر بڑھتا تو فوراً چوکنا ہوجاتے، میں سلام کرتا تو نام کے ساتھ جواب دیتے اور حال خیریت دریافت کرتے، میں عرض کرتا: آپ ابھی تک نہیں سوئے؟ فرماتے: تمہارا انتظار کررہے تھے، اب نیند آجائے گی۔ اس کے بعد ہی میں اپنے گھر جاتا۔

اسی سال جب رمضان گذارنے کے لیے تکیہ تشریف لے آئے تو بلاناغہ ہر دوسرے دن فون پر حال خیریت دریافت فرماتے، ایک دن کہنے لگے: تم نے وعدہ کیا تھا میرے پاس آنے کا، مگر تم آئے نہیں؟ میں نے عرض کیا: حضرت! تراویح میں بچہ قرآن سنا رہا ہے، جس کی وجہ سے آنا مشکل ہے، مگر میں جلد حاضر ہوتا ہوں۔ اس کے اگلے دن پھر فون پر بات کی تو فرمایا: تم ملاقات کے لیے جلدی آنا اور فلاں فلاں امانت احتیاطاً اپنے ساتھ لیتے آنا۔ لیکن سوئے قسمت مجھے کیا معلوم تھا کہ میرے محبوب اور میری کل کائنات کیوں اس قدر بے تابی سے مجھے بار بار فون کررہے ہیں اور کیوں وہ بلا رہے ہیں؟ بالآخر دسویں رمضان سے آپ کی طبیعت ناساز ہونا شروع ہوگئی اور پھر دن بدن گرتی ہی چلی گئی، پندرہ رمضان بروز جمعہ جب اندازہ ہوا کہ طبیعت زیادہ ہی خراب ہے تب میں نے فوراً بے سروپا تکیہ رائے بریلی کا رخ کیا، تکیہ پہنچ کر دیکھا تو عجیب منظر تھا، حضرتؒ کی حالت بہت اچھی نہیں تھی، ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ آپ کو جلد از جلد لکھنؤ منتقل کردیا جائے، لیکن حضرت کی منشا نہ تھی اور مزید کسی کے اصرار کرنے کی ہمت نہ تھی، ایسے میں مجھ سے بھی ضبط نہ ہوسکا، میں نے اولاً تو سفر کے ضروری انتظامات تیار کرلیے اور اس کے بعد نیازمندانہ التجا کی کہ حضرت! ڈاکٹروں کا مشورہ ہے اگر آپ لکھنؤ تشریف لے چلیں تو آپ کو انشاء اللہ جلد از جلد آرام مل جائے گا اور پھر دوبارہ ہم لوگ تکیہ واپس آجائیں گے۔ عجیب بات ہے میرا اتنا کہنا تھا کہ حضرت نے رضامندی کا اظہار کیا اور پھر حضرت آناً فاناً اپنے پورے قافلہ کے ساتھ لکھنؤ کے لیے چل دیے، لیکن اس بار جانا عام طریقہ کے مطابق نہ تھا، بلکہ مریدین کا ایک ہجوم تھا، گاڑیوں کی قطاریں لگی تھیں اور جس گاڑی میں حضرت کو لے جانا تھا، اس میں آکسیجن سلینڈر کے ساتھ حضرت کو لٹا دیا گیا تھا، درمیان میں فدوی بیٹھ گیا تھا اور آگے کی جانب ڈاکٹر صاحب موجود تھے۔

ہم لوگ جمعہ کی شام تک ندوہ پہنچ گئے، جہاں سبھی بڑے اور ماہر ڈاکٹرز کی پوری ایک ٹیم جمع ہوگئی اور سب نے اپنے اپنے نسخے آزمائے مگر مرض اور تکلیف میں ذرا بھی افاقہ نہ ہوا، انفیکشن ایسا زبردست ہوگیا تھا کہ کوئی دوا کارگر ثابت نہ ہوئی، تقریباً چھ روز کی مسلسل تکلیف برداشت کرنے کے بعد بروز جمعرات ان کا وقت موعود آپہنچا، جمعرات کے روز چاشت کے بعد فدوی نے کچھ کھلانے کی کوشش کی اور تھوڑی دیر بات کی، مگر آپ کی آنکھیں بند رہیں، البتہ گذشتہ دنوں کے مقابلہ میں کچھ افاقہ معلوم ہوا، اس کے بعد جیسے ہی ظہر کا وقت شروع ہوا، حضرتؒ نے نماز ظہر کی ادائیگی کا حکم فرمادیا، متعلقین نے عرض کیا کہ ابھی تھوڑی ہی دیر بعد انشاء اللہ نماز ادا کرا دیں گے، مگر انہوں نے باصرار ساڑھے بارہ بجے تک بالکل اول وقت میں باجماعت ظہر کی نماز ادا کرلی، جس کے بعد زبان ذکر الٰہی میں مشغول ہوگئی اور رفتہ رفتہ سانسیں کم ہوتی گئیں اور دل کی حرکت بند ہونا شروع ہوگئی، وفات کا منظر بھی اس قدر عجیب تھا کہ نہ پیروں میں کپکپاہٹ محسوس ہوئی، نہ ہاتھ پیروں کو پٹخنے کی نوبت آئی، بلکہ وہ جس حالت میں آرام کے لیے لیٹے تھے، اسی حالت میں ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کرکے سوگئے اور اعلیٰ علیین میں داخل ہوگئے۔

یہ حادثہ پیش آجانے کے بعد ہماری ہمتیں جواب دے گئیں اور آوازیں پست پڑ گئیں، لوگوں نے تسلی دلائی اور سہارا دیا، پھر تجہیز وتکفین ہوئی اور لاکھوں لوگوں نے جنازہ میں شرکت کی، جمعہ کے دن تدفین عمل میں آئی اور پرنم آنکھوں کے ساتھ ہم نے اپنے مثالی رہبر ومرشد کو سپرد خاک کردیا۔ اللہ آپ کو اعلیٰ درجات عطا فرمائے۔ آمین!

(گفتگو پر مبنی)

چچا میاں کی دل آویز شخصیت

محمد مکی حسنی ندوی
(رفیق دارعرفات تکیہ کلاں-رائے بریلی)

جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ رشتہ میں میرے چچا تھے اور ہم انہیں ''چچا میاں'' ہی کہتے تھے، راقم الحروف اپنے بچپن میں جب والد ماجد کے ساتھ جدہ میں رہتا تھا، اس زمانہ میں ابا جان (حضرت مولانا علی میاں ندویؒ) اور ان کے ساتھ چچا میاں کا حجاز مقدس آنا جانا ایک عام بات تھی، ابا جان اور چچا میاں جب وہاں تشریف لاتے تو اکثر وبیشتر ہمارے گھر پر بھی تشریف لاتے، بچپن کی یادیں ہونے کے باوجود آج بھی ان خوش گوار اور حسین لمحوں کی یادیں تازہ ہیں۔

ہمارے لیے بچپن ہی کے زمانہ سے چچا میاں کی ذات انتہائی قابل عزت واحترام تھی، کیونکہ جب چچا میاں حجاز مقدس آتے تو اس کے اگلے ہی دن ہمارے والد ماجد فجر کی نماز کے بعد ہم سے کہتے کہ جلدی ٹی وی آن کرو، آج صبح سب سے پہلے تمہارے چچا میاں کا پروگرام نشر ہورہا ہوگا۔ ہم جب ٹی وی آن کرتے تو حسب معمول چچا میاں عربی زبان میں تقریر فرمارہے ہوتے، اس وقت ظاہر ہے ہمارے لیے کچھ سمجھنا ممکن نہ تھا لیکن پھر بھی بڑے شوق سے ہم تب تک ٹی وی کے سامنے بیٹھے رہتے جب تک چچا میاں تقریر کرتے۔

جب ہم لوگ جدہ سے اپنے گھر شفٹ ہوگئے اور راقم نے دینی تعلیم حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو ندوہ میں خصوصی درجات کے لیے رہنمائی اور وہاں تک رسائی چچا میاں ہی کے ذریعہ ممکن ہوئی، پھر زمانہ طالب علمی میں چچا میاں کی رہنمائی مستقل حاصل رہی۔

چچا میاں کی دل آویز شخصیت ہر ایک کے لیے متواضع وملنسار اور محبت کرنے والی تھی، اپنے قریبی اور دور کے سبھی رشتہ داروں کے ساتھ بھی ان کا معاملہ یکساں تھا بلکہ بعض اوقات زیادہ ہی تھا، رشتوں کے پاس ولحاظ کا انہیں بہت خیال تھا، ہر ایک کی خبر رکھنا، ہر ایک کی فکر رکھنا اور اگر ممکن ہوسکے تو چل کر جانا یہ سب خوبیاں چچا میاں کے مزاج میں شامل تھیں۔

والد ماجد کی وفات کے بعد چچا میاں نے اس عاجز کے ساتھ جس محبت وشفقت اور کرم کا معاملہ فرمایا، اس کا منظر آج بھی نگاہوں کے سامنے ہے، ان کی وفات کے بعد متعدد لوگوں نے یہ لکھا اور کہا ہے کہ حضرت کی وفات سے یتیمی کا احساس ہوا، سچی بات یہی ہے کہ چچا میاں کی وفات سے مجھے بھی شدت سے یہی احساس ہوا کہ اب ہم بے سایہ ہوگئے، اب ہم یتیم ہوگئے، اب کوئی ایسا نہ رہا جس سے مل کر سکون حاصل ہو، کوئی ایسا نہ رہا جو ہمارے والد کے قائم مقام ہو، کوئی ایسا نہ رہا جو ہم پر گھنے بادل کی طرح سایہ فگن ہو۔

چچا میاں کی خدمت میں جب بھی حاضری ہوتی تو بڑی محبت وشفقت کے ساتھ فرماتے کہ تم ہمارے لیے بہت عزیز ہو، ہمیں تم سے بہت محبت ہے، تمہارے والد ہمارے بھائی تھے، ان کے ساتھ ہمارے بچپن کی بڑی خوبصورت یادیں وابستہ ہیں۔ کبھی کبھی ملاقات میں کوتاہی پر تنبیہ بھی فرماتے، ایک دفعہ جب کسی کو ملوانے لے گئے تو فرمایا کہ تم مصباح کے لڑکے ہونا؟ یہ کہہ کر فرمایا کہ ملتے رہا کرو، ورنہ اسی طرح بھول جائیں گے، اس وقت تمام اہل خانہ جمع تھے، چچا میاں کی یہ بات سن کر میرے پاس سوائے شرمندگی کے کچھ نہ تھا، گھر کے تمام افراد ان کی اس بلیغانہ نصیحت پر اندر ہی اندر محظوظ ہورہے تھے اور میں سراپا شرم سار تھا، مگر انہوں نے اخیر وقت تک جس طرح کی شفقت اور محبت فرمائی اس کی مثال نہیں ملتی۔

راقم کے گھر میں شادی کے تقریباً دس سال بعد ولادت ہوئی تھی،

اس وقت والدین کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا، چنانچہ ایسے خوشی کے موقع پر والدین کا احساس اوران کی یاد طبعی طور پر ہر ایک کو ستاتی ہے، لیکن قربان جایئے چچا میاں پر جنہیں اگر ایک طرف اس بات کا احساس تھا کہ وہ عالمی درس گاہ ندوۃ العلماء کے ناظم ہیں، مسلمانوں کے متحدہ پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر ہیں اور بے شمار دینی اداروں وتنظیموں کے روح رواں ہیں تو دوسری طرف انہیں یہ احساس بھی بڑی شدت کے ساتھ تھا اور وہ اس کو بخوبی نبھانا بھی جانتے تھے کہ وہ اپنے خاندان کے سرپرست ہیں، ہر ایک کی خبر گیری کرنا ان کا فرض ہے اور دکھے دلوں کو جوڑنا اور بہتے آنسو پونچھنا ان ہی پر لازم ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب چچا میاں نے راقم کے گھر میں ایک طویل عرصہ کے بعد ولادت کی خبر سنی تو انتہائی خوشی کا اظہار فرمایا، دیر تک بات کی اور ڈھیروں مبارک باد دی اور بڑی دعائیں دیتے رہے، پھر جب جمعرات کے دن ندوہ سے اپنے گھر تشریف لائے تو ان کی خدمت میں حاضری ہوئی، اس موقع پر بھی آپ انتہائی شفقت سے پیش آئے اور دیر تک اس طرح گفتگو کی کہ والد کی کمی کا احساس تک نہ ہونے دیا۔

چچا میاں اپنے چھوٹوں کی تعلیم وتربیت اوران کا دینی مزاج بنانے کی بہت فکر رکھتے تھے، اسی کے ساتھ اگر وہ کسی میں کوئی نمایاں خوبی دیکھتے یا کسی کے اندر ممتاز صلاحیت کا اندازہ ہوجاتا تو اس کی بڑی ہمت افزائی فرماتے اور بلند کلمات ارشاد فرماتے، بالخصوص اپنے افراد خاندان کی علمی لیاقت دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی اور بعض اوقات وہ اس کا ذکر بھی کرتے تھے۔ میرے لیے وہ لمحہ عید سے کم نہیں جب رمضان کے موقع پر کسی مہمان نے ان کے سامنے کمپیوٹر اور ٹکنالوجی کی دلچسپ باتیں بیان کیں اور چچا میاں نے ان سے اس عاجز کا نام لے کر یہ فرمایا کہ ہمارے خاندان میں بھی ہمارا ایک بھتیجہ ہے جس کو ان چیزوں سے بڑی دلچسپی ہے۔

رمضان المبارک میں جب آپ کی طبیعت خاصی ناساز چل رہی تھی، سخت نزلہ اور بخار کی شکایت تھی، سانس لینے میں تکلیف ہورہی تھی اور بات کرنا بھی مشکل تھا، ۱۴؍رمضان کو جب مرض نے شدت اختیار کرلی تو تراویح سے فارغ ہوکر راقم الحروف فوراً چچا میاں کے گھر پر حاضر خدمت ہوا، دیکھا کہ چچا میاں کی کیفیت اطمینان بخش نہ تھی، راقم نے پہنچ کر جو خدمت کی توفیق حاصل ہوئی اس کو کرنے کی کوشش کی، اس وقت استنجا میں اتنا وقت لگ چکا تھا کہ جسم میں جو معمولی سی توانائی تھی وہ بھی بے حد کمزور پڑ چکی تھی، فارغ ہوئے تو کھڑا ہونا مشکل تھا اور اس حالت میں تھے کہ استنجا خانہ سے نکل کر بیڈ پر بٹھانے میں بھی سہارا دیا گیا، ظاہر ہے اس وقت کیفیت ایسی تھی کہ چچا میاں کے لیے آنکھیں کھولنا بھی مشکل تھا، لیکن اتنا ہوش وحواس میں ضرور تھے کہ ہر ایک کی آواز سن رہے تھے اور اچھی طرح آس پاس کے پورے ماحول سے واقف تھے، اسی دوران جب انہوں نے میرے بولنے کی آواز مسلسل سنی، تو بڑی ہمت کے ساتھ آنکھیں کھولیں اور فرمانے لگے کہ ارے مکی! کیسے ہو، تمہارے ابا میرے بھائی تھے، ان کے ساتھ بچپن کی بڑی یادیں ہیں، اسی لیے ہمیں تم سے بھی بڑا تعلق ومحبت ہے، ہماری طبیعت خراب رہتی ہے، اس لیے ہم زیادہ یہاں نہیں آسکتے اور یہی وجہ ہے کہ تم سے ملاقات بھی بہت کم ہو پاتی ہے۔ تم ضرور آجایا کرو، تم سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ہم شرمندہ سر جھکائے غور کررہے تھے کہ اللہ نے آپ کی شخصیت کو کیسا دل آویز بنایا ہے کہ تکلیف کے اس عالم میں بھی آپ سے اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت ومحبت کے انداز نہیں چھوٹے۔

اگلے روز جمعہ کی نماز کے بعد راقم الحروف بنگلہ حاضر ہوا، دیکھا کہ طبیعت رات سے بھی زیادہ خراب ہوچکی ہے، آکسیجن کا سلینڈر بھی لگانے کے لیے انتظامات جاری ہیں اور ہر ایک فکرمند ہے، کچھ دیر دور ہی سے آپ کی زیارت کی، پھر اسی روز عصر کے وقت آپ کو ندوۃ العلماء لکھنؤ لے جایا گیا، جہاں علاج کی بہتر صورتیں ممکن تھیں، وہاں تقریباً ایک ہفتہ آپ زیر علاج رہے، مگر بالآخر ملت اور خانوادۂ حسنی کا یہ روشن آفتاب غروب ہوگیا اور پوری امت اس کے داغ مفارقت سے غمگین ہوگئی۔ لاکھوں لوگوں نے نماز جنازہ میں شرکت کی اور اگلے روز ہزاروں افراد نے پرنم آنکھوں سے سپرد خاک کیا۔

قصۂ دو عظیم اور مثالی بھائیوں کا ایک عینی شاہد کی نظر سے

مولانا زاہد حسین ندوی جمشید پوری
(جمشید پور-جھارکھنڈ)

اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ میں نے ایسے دو بھائیوں کو دیکھا ہے جو آپس میں ایک دوسرے کے ہم درد تھے، ہم راز تھے، دم ساز تھے، بھائی تو تھے ہی دوست بھی تھے، راز دار بھی تھے اور یار غار بھی اور شاید اپنے زمانے میں ان دونوں کی کوئی مثال نہ ملے، جیسا کہ مشہور عربی شاعر ابو تمام نے کہا ہے ؎

هيهات لا يأتي الزمان بمثله

إن الزمان بمثله لبخيل

(ہرگز زمانہ ان جیسا نہیں لاسکتا، کیونکہ زمانہ ان کی مثال پیش کرنے سے سے قاصر ہے)

تو آپ کو شاید اس میں کچھ مبالغہ لگے لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں (اور میں اپنی قسم میں حانث نہیں ہوں گا) کہ میں نے ایسے دو بھائیوں کو دیکھا ہے اور بہت قریب سے دیکھا ہے، سفر میں بھی حضر میں بھی، خلوت میں بھی جلوت میں بھی۔

اور یہ دونوں بھائی کوئی اور نہیں، بڑے استاذنا ومرشدنا حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اور چھوٹے محسن من حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ تھے۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں، نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت وغم، اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

یہاں تذکرہ تو مجھے اصلاً بڑے بھائی کا کرنا ہے، جو ابھی ۲۱/ رمضان ۱۴۴۴ھ کو اپنے بہت سے ہم عصروں بلکہ چھوٹوں کو بھی رخصت کر کے اخیر میں اللہ کے پاس حاضر ہوئے جو میرے استاد بھی تھے اور شیخ بیعت بھی۔ لیکن یہ میرے لیے ممکن نہیں کہ میں صرف ایک بھائی کا تذکرہ کر پاؤں، لازم ہے کہ اگر بڑے بھائی کا تذکرہ ہوگا تو چھوٹے بھائی کا ذکر بھی یقیناً آئے گا کیونکہ دونوں ''ایک جان دو قالب'' کا حقیقی مصداق تھے۔

علمی مقام اور علمی گفتگو:

اپنے ماموں جی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی علمی تربیت اور ان کے علمی کاموں میں دیرینہ رفاقت ومعاونت کا نتیجہ تھا کہ دونوں بھائی اپنے زمانہ کے امام اور اعلام بن گئے، تصنیف وتالیف، تعلیم وتدریس اور عربی کتابت وصحافت میں تو ان دونوں بھائیوں کا نام' کام اور مقام اتنا بلند ہے ہے کہ شاید ہی اپنے زمانے میں کوئی ان کی ہمسری کر سکے (جتنے بڑے ہیں وہ بھی ان کے شاگرد وخوشہ چیں ہی نظر آتے ہیں) اور اس کا اعتراف عجم سے زیادہ عربوں کو ہے۔ ابھی وفات کے موقع پر جامعۃ الازہر میں جو تعزیتی نشست ہوئی، اس میں شاعر شیخ محمد المعصرانی نے ایسا مرثیہ پڑھا کہ اس میں اپنا خون جگر نکال کر رکھ دیا، اس میں بھرپور اعتراف بالجمیل پایا جاتا ہے اور وہ بغور سننے سے تعلق رکھتا ہے۔

وہاں کی ممتاز ترین یونیورسٹیوں میں ان دونوں بھائیوں کی تالیف کردہ عربی کتابیں داخل نصاب ہیں، ان کے عربی مقالات مصر وحجاز میں بڑے شوق سے پڑھے جاتے ہیں بلکہ عربوں کی صحیح خطوط پر رہنمائی کرتے ہیں، ۱۹۵۹ء میں بڑے بھائی نے جب ''الرائد'' نامی پندرہ روزہ جریدہ نکالا تو چھوٹے بھائی نے اس کی ادارت سنبھالی، اس کے افتتاحیات بڑے وقیع ہوا کرتے تھے، افتتاحیہ کبھی بڑے بھائی لکھتے تو کبھی چھوٹے بھائی اور کبھی ہمارے

محسن استاذ و شیخ تربیت حضرت مولانا شیخ عبداللہ محمد الحسنی ندویؒ۔

''البعث الاسلامی'' جسے ان کے ماموں زاد بھائی اور صاحب اسلوب عربی انشاء پرداز حضرت مولانا سید محمد الحسنیؒ (والد گرامی حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہٗ حال ناظم ندوۃ العلماء) نے شروع کیا تھا اور حضرت الاستاذ مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم جن کے شروع دن سے علمی رفیق و ''صاحب البعث'' رہے) میں بڑے بھائی کے اگر علمی و تو جیہی مقالات شائع ہوتے تو چھوٹے بھائی "صور و أوضاع" نامی کالم کے تحت عالم اسلام کے مسائل پر روشنی ڈالتے، ان کا حل پیش کرتے اور مستشرقین و ملاحدہ کی دسیسہ کاریوں کا حکیمانہ اسلوب میں جواب دیتے اور وہ بھی ایسے معاصر اسلوب میں کہ عرب بھی پڑھ کر دنگ رہ جاتے اور جب دونوں بھائی آپس میں علمی گفتگو کرتے تو ایسا لگتا کہ بس ''وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔''

بعض دفعہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ کون افادہ کر رہا ہے اور کون استفادہ۔ ایک مرتبہ تکیہ پر مغرب بعد حضرت مولانا سید محمد واضح صاحبؒ قرآن مجید کی بلاغت اور اس کے اعجاز لغوی و معنوی پر گفتگو فرمانے لگے تو میں نے خود دیکھا کہ حضرت مولانا محمد رابع صاحبؒ باوجود اپنے چھوٹے بھائی کے استاذ ہونے کے نہ صرف یہ کہ بغور ان کی گفتگو سنتے رہے بلکہ درمیان میں ایک طالب علم کی طرح استفسار بھی فرماتے جاتے۔ موضوع گفتگو سورۂ قلم کی یہ آیتیں تھیں:

﴿وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ☆ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ☆ مَنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ☆ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ﴾

(القلم: ۱۰-۱۳)

عملی زندگی، زہد و انابت اور تقوی وطہارت:

اپنی ایمانی و عملی زندگی میں بھی یہ دونوں بھائی اپنے معاصرین میں بہت ہی ممتاز اور فائق تھے، بڑوں کی صحبت اٹھائے ہوئے، بزرگوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے سلف صالحین کی زندہ یادگار تھے، اگر کوئی زہد و انابت اور تقویٰ و طہارت جیسی کتاب و سنت کی مطلوبہ صفات کو عملی طور پر دیکھنا چاہتا تو ان بھائیوں کی زندگی میں بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔

نماز باجماعت کا اہتمام، قرآن مجید کی بلاناغہ تلاوت، تہجد وقیام اللیل کی پابندی، پچھلے پہر کی آہ و آزاری، امت کے غم میں تڑپنا اور کڑھنا، دعاؤں سے حد درجہ اشتغال، اذکار و اوراد پر مداومت، زہد و استغنا کا حد درجہ اور ہمہ وقت خیال، حرام تو حرام مشتبہات سے بھی کلی احتراز، یہ ان بھائیوں کی عملی زندگی کے وہ امتیازات تھے جو اہل نظر سے مخفی نہیں تھے، ورنہ ان لوگوں نے تو خود کو علم و ادب کے پردے میں چھپا رکھا تھا، سمندر پے بیٹھے تھے لیکن کبھی بھی اسے چھلکنے نہ دیا، ایسے پرسکون جیسے سمندر کا سکوت ؎

کہہ رہا ہے موج دریا سے سمندر کا سکوت
جس میں جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

اور یہ تو ہوئی انفرادی زندگی کی خوبیاں اور نیکیاں، اجتماعی زندگی (جس میں نیک ہونا بڑا مشکل کام ہوتا ہے) میں بھی یہ دونوں بھائی بہت ہی نیک اور شرعی احکام پر عمل پیرا تھے۔ مجھے کوئی شخص بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ میں نے حضرت مولانا کو کبھی کسی کا نام لے کر غیبت کرتے سنا ہو یا کبھی انھوں نے کسی کی دل آزاری کی ہو بلکہ انتہا تو یہ ہے کہ ان کے ساتھ بھی جنہوں نے چھوٹے ہونے کے باوجود آپ کے سامنے آکر حق گوئی کا عنوان دے کر بدزبانی و بدکلامی کی، ان کو بھی برداشت کیا اور پورے حلم و بردباری سے کام لیتے ہوئے اگر کچھ کہا بھی تو بس اتنا کہ ''آپ کا لہجہ غیر مناسب ہے۔''

اپنی ذات کے لیے کبھی بھی کسی سے کوئی انتقام نہیں لیا، یہ بہت اعلیٰ درجہ کی اخلاقی صفت ہے، جو لوگ اجتماعی کاموں اور اداروں و تنظیموں کے انتظام و انصرام سے تعلق رکھتے ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ اسے نبھانا کتنا مشکل کام ہے، لیکن ہمارے حضرت مولانا نبی پاک ﷺ کی ظاہری سنتوں کے ساتھ ان باطنی سنتوں پر بھی سختی کے ساتھ عمل پیرا تھے، جس کا ذکر شمائل کی حدیثوں میں آتا کہ

"ما انتقم رسول الله صلى الله عليه وسلم لنفسه في

شیء قط" (صحیح البخاری: ٦١٢٦) (اللہ کے رسول ﷺ نے کبھی بھی اپنی ذات کے لیے کسی سے کسی معاملے میں بھی کوئی انتقام نہیں لیا)

عشق الٰہی و عشق رسول :

اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے نام سے تو آپ کو ایسا تعلق تھا کہ شاید ہی کوئی جملہ اللہ کا نام لیے بغیر کہتے ہوں اور پھر وہ بھی اس والہانہ انداز میں جیسے معلوم ہوتا کہ "اللہ تعالیٰ" خاص انہی کا ہے، قریب رہنے والا ہر شخص اس کی گواہی دے گا کہ جب بھی آپ کچھ بولتے یا کسی سوال کا جواب دیتے تو پہلے فرماتے "اللہ تعالیٰ!"

یہ "اللہ تعالیٰ" ہی گویا ان کی سخن کی جان تھا، ہونٹوں پر تراوٹ سی آجاتی تھی اور جہاں تک نبی پاک ﷺ سے عشق کا تعلق ہے تو وہ نہ پوچھئے، زندگی بھر سیرت پڑھا اور پڑھایا، اسی موضوع کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنایا اور اخیر عمر میں تو اس موضوع میں ایسے غوطہ زن ہوئے کہ اس سے بڑے قیمتی موتی نکالے اور نئے نتائج اخذ کیے، سیرت کو پوری تسہیل اور نئے نتائج کے ساتھ پیش کرنے میں آپ کی تصنیف کردہ کتاب "رہبر انسانیت" سیرت کے بیش بہا کتب خانے میں ایک ایسا قیمتی اضافہ ہے جو ہر خاص و عام مسلمان ہی نہیں غیر مسلم بھائیوں کو بھی بے تکلف دی جاسکتی ہے اور یقیناً سیرت سے روشناس کرانے میں یہ کتاب بہت مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ (ہندی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا اور بہت مقبول ہوا، دعوتی کام کرنے والوں کو اسے ضرور اپنے ساتھ رکھنا چاہیے اور خوب عام کرنا چاہیے۔)

یادش بخیر! ایک مرتبہ رمضان میں تراویح کے بعد بنگلہ کے اسی درمیانی ہال میں جس میں کبھی حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی مجلسیں ہوا کرتی تھیں، حضرت کی مجلس لگی ہوئی تھی، اتنے میں حضرت مولانا واضح صاحبؒ نے اندر اپنے کمرہ سے آکر حضرت مولانا سے کہا کہ "ناطق صاحب سے نعت سنی جائے" (واضح ہو کہ حضرت ناطق صاحب مدظلہ حضرت طارق حسن عسکری رحمۃ اللہ علیہ (مقیم مدینہ وعاشق مدینہ ومدفون مدینہ) کے چھوٹے بھائی ہیں اور تصوف میں حضرت پیر طلحہ صاحبؒ اور حضرت مرشد الامت مولانا رابع صاحبؒ کے خلیفہ ومجاز ہیں، شعر وشاعری کا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور ضلع اورنگ آباد بہار میں سکونت رکھتے ہیں) جب ناطق صاحب مدظلہ نے مرحوم اقبال عظیم کی عالمانہ نعت کا یہ مطلع پڑھا۔

کہاں میں کہاں مدح ذات گرامی
میں سعدی نہ رومی نہ قدسی نہ جامی
پسینے پسینے ہوا جا رہا ہوں
کہاں یہ زباں اور کہاں نام نامی

تو حضرت مولانا کے ضبط عشق کا باندھ گویا ٹوٹ گیا، عجیب سی ہچکی بندھی، آنکھیں اشکبار ہوگئیں پھر حضرت نے فوراً خود کو سنبھالا اور ایسی معصومیت ظاہر کی جیسے نہ کچھ ہوا ہو اور نہ کسی نے کچھ دیکھا ہو، یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے حضرت مولانا کا جام عشق چھلکتے دیکھا۔

قصہ مختصر یہ کہ ابونواس نے جو کہا ہے کہ

ليس على اللّٰه بمستنكر
أن يجمع العالم في واحد

حضرت مولاناؒ سو فیصد اس کے مصداق تھے، وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، انہوں نے بقول حضرت مولانا علی میاںؒ "ایک آدمی نہیں بلکہ اکیڈمی کا کام کیا۔"

بندہ نے جب سے شعور کی آنکھیں کھولیں تب سے حضرت مولاناؒ کو دیکھ رہا ہے، ۱۹۹۵ء سے لے کر ۲۰۲۳ء تک تقریباً ۲۹ رسال کا عرصہ ہے اور یہ کوئی معمولی عرصہ نہیں۔

حضرت مولانا علی میاںؒ کی بھی ان گنہگار آنکھوں نے تقریباً ۵ رسال زیارت کی ہے، ان کی وفات کے بعد بقول "حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب ان کے عکس جمیل بن کر ابھرے۔" تو گویا بڑے حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد ہم لوگوں کے لیے چھوٹے حضرت مولاناؒ ہی "حضرت مولانا" تھے اور اب جب کہ حضرت بھی ہم سے رخصت ہوگئے تو ذہن ودل پر یادوں کے اتنے نقوش ابھرتے اور ڈوبتے ہیں کہ اگر سب کو ضبط تحریر میں لاؤں بھی تو کیسے، وہ بھی ایک مضمون میں۔

(دعا فرمائیں کہ حضرت مولاناؒ کی خوبیوں اور کمالات کی جو

عینی شہادت میرے پاس امانت ہیں، اسے پوری دیانت کے ساتھ تفصیل کے ساتھ قریبی وقت میں دوسروں تک منتقل کرسکوں)

بس اخیر میں اتنا عرض کرتا ہوں کہ ہمارے حضرت مولاناؒ کو اللہ نے علم وآگہی، حکمت ودانائی، فہم وفراست، شوکت وشہامت، عزت و وجاہت، سیرت و کردار، تواضع وانکساری، عاجزی وفروتنی میں، اسی طرح اپنے بڑوں کی عزت اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت، ہر مسلمان کے ساتھ نصح وخیر خواہی کا معاملہ کرنے اور مشورہ لینے والے کو ایسا جچا تلا مشورہ دینے میں (کہ اس سے اس کے قلب کو انشراح اور کام میں استقرار نصیب ہوجائے) ہر کس وناکس کے ساتھ مہمان نوازی وکرم گستری، اداروں وملی تنظیموں کی حکیمانہ وکامیاب قیادت کرنے، ملت کے شیرازہ کو مجتمع رکھنے، آپسی معاملات میں اعلیٰ ظرفی ووسیع القلبی سے کام لینے، بے مثال حلم وبردباری سے پیش آنے، نازک ترین مواقع پر بھی پوری حکمت ودانائی اور صبر وشکیبائی سے کام لینے، تزکیہ واحسان کے میدان میں بلند ترین مقام پر فائز ہونے، تلامذہ ومنتسبین کی اصلاح میں پوری نرمی ورواداری برتنے، فرائض منصبی کو ادا کرنے، ٹوٹے دلوں کی ڈھارس بندھانے، حاجت مندوں کی حاجت پوری کرنے، مساکین کے ساتھ محبت ومجالست اختیار کرنے، علمی مجالس میں بعض دفعہ بالکل نامناسب سوالات کا بھی بھرپور متانت اور علمی گیرائی کے ساتھ جواب دینے اور ہر ایک کے ساتھ ایسی محبت کے ساتھ پیش آنے میں (کہ ہر ایک کو یہ احساس ہو کہ حضرت مولانا سب سے زیادہ مجھے ہی چاہتے ہیں ہیں) ایسا عظیم بنا دیا تھا کہ شاید اب اس کی مثال لانا ناممکن نہیں تو تو دشوار ضرور ہے۔

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

اخیر اخیر تک باوجود اپنی پیرانہ سالی، صحت کی خرابی اور شدید ضعف ونقاہت کے باوجود جس طرح حضرت مولانا ہم جیسے دور افتادہ متعلقین پر بھی اپنی شفقت ومحبت کے پھول نچھاور کرتے رہے اور ٹیلی فون کا جواب دیتے رہے، میں نہیں سمجھتا کہ اخلاق کا (وہ بھی اس زمانہ میں) اس سے بھی اعلیٰ کوئی درجہ ہوسکتا ہے۔

بس مسک الختام کے طور پر فرزدق کے اس شعر کا سہارا لے کر اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ

أولئك آبائی فجئنی بمثلهم
إذا جمعتنا یا جریر المجامع

نالۂ غم

نتیجۂ فکر: – مولانا محمد زاہد حسین ندوی جمشید پوری

تڑپا رہی ہے ان کی کرم گستری ہمیں
یاد آرہی ہے ان کی ہر اک بہتری ہمیں

توحید کے جو گائے تھے نغمات آپ نے
اب تک سنائی دیتی ہے وہ بانسری ہمیں

چل کر دکھا گئے وہ سدا سنتوں کی راہ
سنت وہ باطنی ہو کہ یا ظاہری ہمیں

علم وعمل میں ایسے وہ بے تاج شاہ تھے
دکھلا دے ان کی کرکے کوئی ہمسری ہمیں

یکتائے روزگار تھے عربی ادب کے آپ
بتلا گئے ادب کی وہ نکتہ وَری ہمیں

تھا سب کو اعتماد بڑا ان کی ذات پر
حاصل تھی ان کی شکل میں اک سروَری ہمیں

مکر وفریب نفس سے آگاہ کرگئے
باتیں بڑی بتا گئے حکمت بھری ہمیں

محبوب ترین شخصیت

مولانا منصور حسن حسنی ندوی
(استاد دارالمبلغین ۔لکھنؤ)

۲۱؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ کو ہمارے خاندان کے لیے وہ حادثہ پیش آیا جس نے پورے خاندان کو ہلا کر رکھ دیا، بلکہ پوری ملت اسلامیہ کو جھنجھوڑ دیا، یہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کا سانحۂ وفات تھا، آپ برصغیر کی ممتاز اور غیر معمولی شخصیت کے طور پر زندگی گزار کر رمضان المبارک کی بابرکت ساعتوں میں اپنے رب کے حضور حاضر ہوئے، حضرت مولاناؒ خانوادہ علم اللّٰہی کے گل سرسبد اور اپنے جد امجد حضرت شاہ علم اللہ حسنی قدس اللہ سرہٗ کے سچے جانشیں اور اُن کے حقیقی وارث ہوئے جس طرح حضرت شاہ علم اللہ حسنی قدس اللہ سرہٗ سنت نبویؐ کے پیروکار تھے، اُسی طرح آپؒ بھی ان کے نقش قدم پر گامزن رہے، پوری زندگی اتباعِ نبویؐ میں گذار دی، کوئی کام سنت کے خلاف نہیں کیا، ہر کام میں رضائے الٰہی کو ملحوظ رکھا، نیت کی درستگی کا غیر معمولی اثر ان کی زندگی پر تھا اور اللہ رب العزت کی طرف سے فتوحات کے دروازے اُن پر کھلتے چلے گئے۔ انعامات کی بارشیں اُن پر ہوتی چلی گئیں، اپنے معاصرین سے ممتاز ہو کر اپنے اسلاف کی صف میں شامل ہو گئے، اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو ایمان اور عمل صالح اختیار کرتے ہیں اور تواضع وانکساری سے پیش آتے ہیں، اُن کو دین ودنیا کی سرخ روئی عطا فرما کر محبوب خلائق معظم ومکرم بنا دیتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے قرآن شریف میں بشارت دی گئی ہے: ﴿إِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَيَجْعَلَ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا﴾ حدیث شریف میں تواضع وانکساری کا انعام رفعت و عظمت سے تعبیر ہے: "ماتواضع أحد للّٰه إلا رفعه اللّٰه"

اچھے ابا کی محبوبیت اور مقبولیت کا یہ راز کھلی آنکھوں لوگوں نے دیکھا، زندگی میں بھی اور انتقال کے بعد بھی، فدائین کا ایک ریلا تھا، محبین کا ایک سمندر تھا، جو بڑی آب وتاب کے ساتھ ٹھاٹھیں مار رہا تھا، جو اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے، جس کا اللہ ہو جائے تو اس کے کیا کہنے۔ زمین وآسمان، انسان وحیوان، شجر وحجر سے محبت ٹپکتی ہے۔ آسمان وزمین میں اس سے محبت کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو جبرئیل علیہ السلام کو بلاتا ہے اور فرماتا ہے کہ میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ جبرئیل علیہ السلام اس سے محبت کرنے لگتے ہیں، جبرئیل علیہ السلام آسمان والوں میں اعلان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اللہ فلاں سے محبت کرتا ہے، تم بھی اس سے محبت کرو، چنانچہ اس سے آسمان والے بھی محبت کرنے لگتے ہیں، پھر اس کے لیے زمین میں قبولیت رکھ دی جاتی ہے، یہ قبولیت کی ہی بات تھی کہ ہر وقت مہمان خانہ میں لوگوں کا ہجوم رہتا، فرداً فرداً بھی لوگ ملتے اور جماعت در جماعت بھی دیدار کر کے سکون حاصل کرتے وہ نوجوانوں کے دلوں کا درماں تھے، ضعیفوں کی تسلی کا سامان تھے، کسی کو صرف دیکھ کر سکون مل جاتا اور کوئی آپ کے بلند اخلاق دیکھ کر آپ کا ہو جاتا، حضرت مولانا کے پاس بیٹھ کر جو سکون ملتا اور جو اطمینان نصیب ہوتا وہ ناقابل بیان ہے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک طالب علم جن کا چند سال پہلے انتقال ہو گیا تھا اللہ ان کو غریق رحمت کرے ان کے والد جو دیہات سے تعلق رکھتے تھے، حضرت مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مجلس میں بیٹھے، حضرت مولانا کو مسلسل دیکھتے رہے اور اٹھتے اٹھتے دیہاتی زبان میں انہوں نے اس طالب علم سے کہا کہ جب تک یہ مولانا رہیں تو قیامت نہ آیہئے۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو ایسی کشش عطا فرمائی تھیں جس کو ہر شخص محسوس کر لیتا، یہ تقویٰ اور پرہیزگاری کی کشش تھی، تواضع وانکساری کی کشش تھی، استغنا واحسان کی کشش تھی، جود وسخا کی کشش تھی، خاموشی ومتانت کی

کشش تھی جس نے لوگوں کو ان کا گرویدہ بنا دیا تھا۔

مولانا کی زندگی کا اکثر حصہ اپنے دونوں ماموؤں کی سرپرستی اور رہنمائی میں گذرا۔ اپنے ماموں حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کے انتقال کے بعد انہوں نے اپنے آپ کو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی قدس اللہ سرہٗ کے کلی طور پر سپرد کر دیا تھا، ہر کام ان کے ہی مشورہ سے کرتے تھے۔ اپنی طرزِ زندگی میں اُن کا ہی نمونہ اختیار کیا، ان کے طریقہ کو بڑے ذوق وشوق سے لیا، مزاج میں یکسانیت و مشابہت اور سفر وحضر کی رفاقت نے آپ کو مفکر اسلام علیہ الرحمہ کا مثنیٰ بنا دیا تھا، آپؒ نے ان کی جانشینی کا حق ادا کر دیا، آپ بیرونی اسفار میں بطور رفیق وخادم ان کے ساتھ رہے، جو احتیاط حضرت علیہ الرحمہ کے یہاں تھی، اسی احتیاط کے ساتھ پوری زندگی گذاری، اسی لیے حضرت علیہ الرحمہ کا بھرپور اعتماد آپ کو حاصل رہا، ایک موقع پر حضرت علیہ الرحمہ نے اپنی بہن یعنی والدہ حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا: میں نے بہت سے اندرونی وبیرونی اسفار کیے لیکن رابع وواضح جیسا نہیں دیکھا۔ شیخین نے بھی اپنے ماموں کو ٹوٹ کر چاہا۔ اپنے والدین کی جیسی خدمت کی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ والد صاحب پیرانہ سالی کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے، دونوں بھائی ان کو سائیکل پر بیٹھا کر مسجد لے جاتے تھے، ایک ہینڈل تھامتا تو دوسرا کیریئر پکڑ کے چلتا، والد صاحبؒ بھی ان کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے، ایک موقع پر مولانا فرما رہے تھے: جب میرے ماموں جی کے ساتھ اسفار ہوتے تو والد صاحبؒ اسفار کی روداد سنتے اور بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے تھے، ہر جمعرات کو والدین کے لیے لکھنؤ سے رائے بریلی تشریف لے جاتے۔ والدہ صاحبہؒ حلوہ اور پلاؤ کا اہتمام کرتی تھیں، ان دونوں کی آمد کی شدت سے منتظر رہتی تھیں، کئی کئی دفعہ کسی نہ کسی کو باہر بھیجتیں کہ دیکھو رابع وواضح آئے کہ نہیں؟ ان کو دیکھتے ہی ان کا چہرہ خوشی سے کھل جاتا تھا۔ حضرت مولانا علیہ الرحمہ نے اپنی والدہ کی عمر پائی، والدہ کی طرح رمضان المبارک میں وفات پائی، اللہ تعالیٰ غریق رحمت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔ آمین!

آپؒ صفت احسان سے متصف تھے، نماز اسی استحضار کے ساتھ پڑھتے تھے کہ "أن تعبد الله كأنك تراه فإن لم تكن تراه فإنه يراك" کا مصداق ہو جاتے۔ نیت باندھتے وقت ایسی کپکپی طاری ہوتی کہ گویا آپ اپنی آواز کو دبا رہے ہوں کہ دوسرا شخص آپ کی اس صفت کو نہ دیکھ لے۔ ریا اور نام ونمود سے دور رہنے والے تھے۔ ہر کام اللہ کے لیے کرتے تھے۔ تعلق قائم کرتے تو اللہ کے لیے۔ بے تعلق ہوتے تو اللہ کے لیے۔ اتفاق واختلاف میں دین مطمح نظر رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہر کام میں برکت ڈال دی تھی جو بھی فیصلہ کیا اس میں بڑی برکت دیکھنے کو ملی۔ اللہ تعالیٰ کی مدد ونصرت شامل حال رہی۔ آپؒ کے بعض فیصلے مجددانہ شان کے حامل تھے جس نے امت کو صحیح نہج پر کار بند رکھا، آپ کے اندر دین وملت کی خدمت کا جذبہ ایسا موجزن تھا کہ کسی کو بھی اصول دین سے ہٹتے اور غلط فکر اور نظریات کا حامل پاتے تو اس کی نکیر کرتے۔ عالم عربی کے حالات پر کڑھتے تھے۔ عرب حکمرانوں کے دین بیزار رویئے سے سخت نالاں تھے جو بھی مؤثر طریقہ ہوتا اس کو اپنانے میں دریغ نہ کرتے، لیکن زبان کو قابو میں رکھ کر خط وکتابت کے ذریعہ کو بہتر وسیلہ سمجھتے تھے۔

مولانا کی ایک صفت دوسروں کی دل آزاری سے پرہیز رہی ہے۔ بے جا دل آزاری تو بڑی بات تھی، بلکہ مولانا کا معاملہ تو ایسا تھا کہ کوئی شخص مولانا کی تحقیر وتنقیص کرتا تو مولانا اس کا جواب نہ دیتے بلکہ صبر وتحمل کرتے، زبان پر کبھی حرف شکایت نہ آنے دیتے۔ عیب جوئی اور غیبت سے دور رہتے۔ نجی مجلسوں میں بھی منفی تبصروں سے احتراز کرتے۔ آپ کے مثبت رویہ سے لوگ مخالفانہ رویہ رکھنے والے کے تعلق سے غلط فہمی کا شکار ہو جاتے۔ بڑی وسعت قلبی کا معاملہ کرتے۔ دین وملت کی تعمیر میں حصہ لینے والوں کا احترام کرتے۔ ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے، بشرطیکہ وہ اسلام کے مسلمہ اصولوں کے خلاف نہ ہو، انہی اوصاف کی وجہ سے تمام مکاتب فکر کے اشخاص نے آپ کو اپنا قائد تسلیم کیا۔ مسلم پرسنل لا بورڈ جس میں تمام مکاتب فکر کی نمائندگی ہے سب کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے میں قیادت کا حق ادا کر دیا، آپ ملت اسلامیہ کے لیے نقطہ اتفاق سمجھے جاتے رہے، اللہ تعالیٰ آپ کی کاوشوں کو قبول فرمائے اور ملت کو آپؒ کے نقش قدم پر چلائے۔ آمین!

ابا اپنی انفرادی خصوصیات کے آئینے میں

خلیل احمد حسنی ندوی
(استاد مدرسہ ضیاء العلوم - رائے بریلی)

کسی بھی شخصیت کو سمجھنے اور مقام اور مرتبہ کو بلند کرنے کے لیے اس کو چار حیثیتوں سے دیکھنا ہوگا:

(۱) اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق

(۲) صلہ رحمی

(۳) لوگوں سے خیر خواہی

(۴) ملی اور اجتماعی کاموں سے دلچسپی اور ان میں شمولیت۔

چاروں میں جب توازن ہوتا ہے تو پھر انسان مثالی بنتا ہے۔

بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو عبادت میں بہت بڑھے ہوئے ہوتے ہیں، لیکن رشتہ داروں کے ساتھ معاملہ ان کا خراب ہوتا ہے اور بہت سے ان دونوں پہلوؤں کو تو ساتھ لے کر چلتے ہیں، لیکن غیروں کے ساتھ خیر خواہی کا وہ جذبہ نہیں رکھتے جو ہونا چاہیے اور بعض لوگ ان تینوں حیثیتوں سے ممتاز نظر آتے ہیں، لیکن ملی اور اجتماعی کاموں سے کچھ سروکار نہیں رکھتے اور مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا یہ کمال تھا کہ وہ ان چاروں حیثیتوں سے نہ صرف یہ کہ ممتاز نظر آتے ہیں، بلکہ حقیقت میں مثالی نظر آتے ہیں۔

حضرت علی زین العابدینؒ کے بارے میں (جو حضرت علیؓ کے پوتے اور نواسہ رسول حضرت حسینؓ کے صاحبزادہ ہیں) آتا ہے کہ وہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو بدن پر کپکپی طاری ہوجاتی، کسی نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں کس کے سامنے کھڑا ہونے جارہا ہوں اور کس سے مناجات کرنے جارہا ہوں؟

یہ کیفیت حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ میں ہم میں سے ہر شخص محسوس کرتا تھا، اکثر ان کے ساتھ نماز پڑھنے میں یہ ہوتا کہ نماز کے دوران ان پر طاری رقت دیکھ کر دوران نماز میری توجہ ان کی طرف ہوجاتی اور مجھے سجدہ سہو کرنا پڑتا۔

اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا یہ احساس اور اس کا اتنا اثر جو دل کے ساتھ ساتھ جسم پر بھی پڑنے لگے کم دیکھنے کو ملتا ہے۔

تہجد کی ایسی پابندی جس کی نظیر ملنی مشکل ہے، بارہا میں نے مشاہدہ کیا کہ ابا کے ساتھ سو رہا ہوں، اچانک کسی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی، میں نے دیکھا کہ ابا نماز میں مشغول ہیں، گھڑی دیکھی، دو بج رہے تھے، میں نے ابا سے کہا کہ ابھی رات کا ابتدائی حصہ ہے، آپ تھوڑا آرام کرلیں، تو لیٹ جاتے تھے۔ کئی بار ایسا دیکھا کہ کمرہ میں اندھیرا تھا اور میں ان کو لیٹا چھوڑ کر گیا تھا، کچھ دیر کے بعد جب آیا تو یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ سو رہے ہوں گے، لیکن جب اندھیرے میں کمرہ میں داخل ہوا تو ہلکے ہلکے رونے کی آواز آرہی تھی اور وہ کچھ کہہ رہے تھے، ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے وہ اللہ میاں سے باتیں کررہے ہوں، لیکن دوسرے کی آہٹ پاکر ایسے ہوجاتے کہ جیسے وہ سو رہے ہوں۔

ایک معمول آپ کا سفر پر نکلنے سے پہلے دو رکعت نفل پڑھنے کا تھا، یہ معمول تب سے دیکھ رہا ہوں جب میں سن شعور کو بھی نہیں پہنچا تھا، اس وقت سوچتا تھا کہ یہ کون سی نماز ہے، جس کو ابا اتنی پابندی سے ادا کرتے ہیں، طبیعت ناساز ہوتی تو تیمّم کرکے نفل ادا کرتے، مگر ترک نہیں فرماتے تھے۔

رمضان کے آخری عشرہ میں اعتکاف کا معمول تھا، مگر ادھر دو چار برسوں سے بعض اعذار کی وجہ سے اس کو ترک فرمادیا تھا۔

صلہ رحمی:

صلہ رحمی میں آپ کی نظیر اس دور میں ملنی مشکل ہے، کسی ایسے

شہر میں جانا ہوتا جہاں رشتہ دار موجود ہوں، رشتہ داری ان سے قریب کی ہو یا دور کی، یا تو ان کے ہاں قیام کرتے، اگر قیام کرنے میں کوئی عذر ہوتا تو ان سے ملنے کا اہتمام ضرور کرتے اور ہدایا بھی پیش کرتے' تکیہ میں ہوتے تو بیچ بیچ میں صلہ رحمی کی نیت سے ہر گھر میں جانے کی کوشش کرتے، ہر ایک کی برابر خیریت لیتے رہتے، آپ کے ایک بھانجے سید حسین حسنی دہلی میں سعودی سفارت خانہ میں تھے، جس کی وجہ سے وہ اپنی فیملی کے ساتھ دہلی میں مقیم تھے، جب بھی دہلی جاتے تو قیام انہی کے یہاں کرتے، ان کے انتقال کے بعد اپنے ایک دوسرے بھانجہ جاوید فریدی صاحب کے یہاں قیام کا معمول رہا اور اگر کسی صاحب تعلق کے اصرار پر ان کے ہاں قیام کرتے تو بھی باوجود عمر میں غیر معمولی فرق کے خود ملنے تشریف لاتے اور قیام نہ کر سکنے کی وجہ سے معذرت ظاہر کرتے تھے، اسی طرح صلہ رحمی کی نیت سے آپ رشتہ داروں سے ملاقات کی خاطر سفر کرتے، خاص کر اگر کوئی بیمار ہے تو عیادت کے لیے اس کے ہاں جاتے اور مزاج پرسی کرتے، آپ کے اطمینان دلانے یا تسلی دینے کا انداز اتنا پیارا ہوتا تھا کہ بیمار اپنے کو صحت یاب یا مطمئن محسوس کرتا تھا، جو اعزہ مالی طور پر کمزور ہوتے ان کی خاص فکر کرتے اور ان کا خاص خیال رکھتے اور ہم لوگوں سے بھی اعزہ کے ساتھ حسن سلوک کی تلقین کرتے رہتے، بارہا اس کا مشاہدہ ہوا کہ تکیہ میں کوئی بیمار ہوتا، ابا اور اچھے ابا ندوہ میں ہوتے تھے، آپس میں مشورہ کرتے تھے' دن متعین کرتے تھے اور عیادت کی نیت سے تکیہ تشریف لاتے اور عیادت کر کے واپس ہو جاتے تھے۔

لوگوں کے ساتھ خیر خواہی:

لوگوں کے ساتھ خیر خواہی کا یہ معاملہ تھا کہ نہ اپنا آرام دیکھتے، نہ اپنی راحت، جتنی دیر وہ بیٹھنا چاہتا وہ بیٹھتا، جتنی دیر وہ اپنا حال دل بیان کرنا چاہتا بیان کرتا، آپ پوری توجہ کے ساتھ خیر خواہی کے پورے جذبہ کے ساتھ اس کی باتیں سنتے، مخلصانہ مشورہ دیتے، اس کی صحیح رہنمائی کرتے، کئی بار لوگوں نے کہا کہ لوگ آپ کے پاس آتے اور آپ کی علالت کی پرواہ کیے بغیر آدھے آدھے گھنٹے آپ کے سامنے اپنے مسائل رکھتے ہیں، آپ کا وقت بھی ضائع ہوتا ہے، آرام میں خلل بھی پڑتا ہے تو جواب دیتے کہ ایک آدمی بڑی امیدوں سے آیا ہے اور وہ کسی نہ کسی مشکل میں مبتلا ہے، ہم اس کی مشکل دور نہیں کر سکتے تو کم سے کم اس کی باتیں سن کر اس کا دل تو ہلکا کر سکتے ہیں، اگر اس کو اپنی بات کہہ کر اطمینان ہو جاتا ہے اور اس اطمینان کا ذریعہ اللہ تعالیٰ ہمیں بنا دیتا ہے تو ہمیں اس میں کاہلی نہیں کرنا چاہیے۔

ایک عادت آپ کی یہ تھی کہ اگر کوئی آپ سے دعا کی درخواست کرتا تو ایک تو آپ اسی وقت دعائیہ کلمات بول دیتے، دوسرے اس سے کہتے کہ اپنی دعاؤں میں مجھے بھی اور تمام مسلمانوں کو یاد رکھیے گا، یہ میرا شب و روز کا مشاہدہ ہے فرماتے تھے: دعا کے لیے کہنے والا کس جذبہ اور پریشانی میں دعا کی درخواست کرتا ہے، اس کے اس جذبہ اور پریشانی کو دیکھ کر اللہ تعالیٰ اس کی درخواست پر دعا قبول کر لیتے ہیں، قبولیت کے آثار دیکھ کر اس کو خوش گمانی مجھ سے ہوتی ہے، جب کہ حقیقت میں اسی کی دعا قبول ہوئی ہوتی ہے۔

نیت کا استحضار:

ہر کام نیت سے کرتے تھے، قربانی کا جانور اپنے ہاتھ سے ذبح کرتے تھے، باوجود ضعف اور نقاہت کے جب کہ جانور پر چھری چلانا دشوار تھا، پھر بھی آپ نے سہارے سے جانور کو ذبح کیا، آپ کا یہ عمل یقیناً اتباع نبی میں تھا کہ حضور ﷺ بھی قربانی اپنے مبارک ہاتھوں سے فرماتے تھے، مولوی اجمل فاروق' ڈاکٹر نشاط صاحب خلیفہ مفکر اسلام کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ آپ بغرض عیادت تکیہ تشریف لائے، جب واپسی کا ارادہ کیا تو مولانا واضح رشید صاحب ندویؒ نے عرض کیا: ایک دن اور رک جائیے، آپ نے فرمایا: عیادت کی نیت سے آئے تھے، اب رکنے کے لیے کیا نیت کریں؟ آپ کے گھر تشریف لانے میں بھی نیت حسن معاشرت کی ہوتی تھی۔

دوسرا آپ کا نمایاں وصف جو آج کے دور میں عنقا ہے، اس حدیث شریف پر عمل ہے: "لا تحقرن من المعروف شيئا ولو أن تلق أخاك بوجه طلق" ایک دوسری حدیث شریف میں

ہے:"کل معروف صدقة وإن من المعروف أن تلق أخاك بوجه طلق" جب آپ عمر کے آخری مرحلہ میں ہوں، دن بھر کی تھکان ہو، وقت آرام کا ہو اور ملنے والوں کی فوج ہو، جن سے کوئی علیک سلیک اور واقفیت پہلے سے نہ ہو، اس وقت ہر ایک سے مسکرا کر ملنا' اس کی بات سننا' یہ سب سے مشکل اور نفس پر انتہائی شاق گزرنے والا عمل ہے، ہر ایک تعلق رکھنے والا اور ابا کے شب و روز کا مشاہدہ کرنے والا اس بات کی گواہی دے گا کہ ایسے وقت میں ابا ہر ایک سے کس طرح ملتے تھے، ہونٹوں پر خاص دل موہ لینے والی مسکراہٹ ہوتی تھی، جو نہ صرف اس شخص کو اسیر کر لیتی تھی بلکہ خدام کو دھوکہ میں مبتلا کر دیتی تھی کہ یہ شخص شاید بہت قریبی ہے، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہوتی تھی۔

اخلاق کریمانہ:

خدا کے ترازو میں سب سے بھاری عمل اخلاق کریمانہ ہیں، ارشاد نبوی ہے:"ما من شئ أثقل في الميزان من حسن الخلق" اور بھی احادیث ہیں جو بتاتی ہیں کہ اللہ کے نزدیک اعلیٰ اخلاق کی کتنی اہمیت ہے اور کیوں نہ ہو؟ سب سے مشکل کام بھی یہی ہے، اپنوں سے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرنا یا موڈ خوشگوار ہو اس وقت اعلیٰ اخلاق برتنا اتنا مشکل کام نہیں، مگر ہر ایک سے اخلاق کریمانہ کا مظاہرہ کرنا' اپنوں اور غیروں میں تفریق نہ کرنا' وقت چاہے آرام کا ہو' طبیعت میں جتنی بھی گراوٹ ہو' انتہائی دشوار ترین اور نفس پر شاق گزرنے والا عمل ہے، کئی بار اس کا مشاہدہ ہوا کہ ایسے ملنے والوں کو بھی دیکھا ہے جن سے خدام خود سے عرض کرتے، ابھی حضرت آرام کر رہے ہیں، صبح سے آرام کا موقع نہیں ملا ہے، لیکن وہ ملنے پر مصر ہوتے تھے، دور سے آنے کا عذر پیش کرتے تھے، ایسے لوگ جب آپ کے روبرو ہوتے اور ملاقات کرتے تو ابا اس کیفیت میں بھی ان سے اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرتے اور جب تک وہ خود اپنی بات ختم نہ کرتے ابا ان کی بات پوری توجہ سے سنتے اور کہیں سے اس بات کا احساس نہ ہونے دیتے کہ طبیعت مضمحل ہے اور صبح سے آرام کا موقع نہیں ملا۔ ایک بار تو ایک واقعہ ایسا پیش آیا کہ ایک صاحب ملنے آئے، اس وقت ابا کی طبیعت بہت نڈھال تھی اور ان کے دل پر اثر پڑ رہا تھا اور صورت حال ایسی کہ ہاتھ تک ہلانا ان کے لیے مشکل ہو رہا تھا، وہ صاحب آئے، کچھ دیر کھڑے رہے اور چلے گئے، جب مولانا کی طبیعت بہتر ہوئی اور ایک دو دن گزرنے کے بعد وہ صاحب پھر آئے تو ابا نے معذرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس دن آپ تشریف لائے تھے اور میں آپ سے بیٹھنے کے لیے بھی نہ کہہ سکا، مجھے معاف کیجیے گا۔

تواضع اور فنائیت:

تواضع اور فنائیت ایک ایسا وصف ہے جس پر خدا کی طرف سے رفعت کا وعدہ ہے، ارشاد نبوی ہے:"من تواضع للّٰه رفعه اللّٰه" ابا کی زندگی میں یہ وصف انتہائی نمایاں تھا، فرماتے تھے کہ لوگ مسائل سے گھرے ہیں، دعا کے لیے آتے ہیں اور جس کیفیت میں دعا کی درخواست کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اسی وقت ان کی دعا قبول کر لیتا ہے، وہ قبولیت کے اثرات دیکھ کر میرے تعلق سے حسن ظن میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ورنہ ہم اپنی حقیقت سے خوب واقف ہیں۔

حضرت شاہ ابرار الحق رحمۃ اللہ علیہ جب تک حیات تھے، ابا باقاعدہ اہتمام سے ان سے ملاقات کی نیت سے اور دعا کی درخواست کے لیے ہردوئی تشریف لے جاتے، ان کو زحمت نہ ہو اس وجہ سے زیادہ دیر قیام نہ کرتے اور تھوڑی دیر ان کی مجلس میں بیٹھ کر اور دعا کی درخواست کر کے واپس ہو جاتے تھے، ایک بار میں بھی ساتھ تھا، میں نے جو دیکھا اس نے مجھے ششدر کر دیا، ابا ایک کمرہ میں آرام کر رہے تھے، حضرت شاہ ابرار الحق صاحب کے خادم نے آکر عرض کیا، حضرت تشریف لانا چاہتے ہیں، ابا کو میں نے دیکھا کہ ننگے پیر کمرہ سے نکل ان کے کمرہ کی طرف لپکے، تاکہ ان کو زحمت نہ ہو۔

حضرت حکیم کلیم اللہ صاحب، حضرت مولانا قمر الزماں صاحب الہ آبادی جو عمر میں ابا سے چھوٹے ہیں، ابا ان دونوں حضرات کے سامنے جس تواضع سے بیٹھتے اور ان کی بات سنتے اور ان سے دعا کے لیے کہتے' دیکھنے والا دھوکہ کھا سکتا تھا کہ ابا چھوٹے ہیں، ان حضرات کو

فون کر کے دعا کی درخواست کرتے، ان حضرات کی موجودگی میں خود دعا نہیں کراتے تھے، بلکہ اصرار کر کے ان حضرات سے دعا کرواتے تھے۔

تواضع کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے، ایک طالب علم جو نیا نیا آیا تھا، پیر دبانے کے لیے بیٹھ گیا، ابا نے پاؤں سمیٹتے ہوئے کہا: آپ تکلیف نہ کریں، آپ بیٹھ جائیں، وہ طالب علم نہ جانے کیا سمجھا اور اٹھ کر چلا گیا، ابا پر اس کا بہت اثر پڑا، وہ سمجھے کہ شاید اس طالب علم کو ان کی بات بری لگ گئی، یا وہ سمجھا کہ میں اس سے جانے کیے لیے کہہ رہا ہوں، میرا مطلب یہ نہیں تھا اور ایک صاحب کو بھیجا کہ اس طالب علم کو تلاش کر کے لاؤ، کسی طرح وہ طالب علم ملا اور آیا، مولانا نے اس سے معافی مانگتے ہوئے کہا کہ میں نے آپ سے جانے کے لیے نہیں کہا تھا، شاید آپ کو میری بات بری لگ گئی، مجھے معاف کیجیے گا، آپ جب چاہیں آئیں اور بیٹھیں۔

صبر:

صبر یہ ایک ایسا وصف ہے جس کی تلقین انتہائی آسان ہے، مگر عملی طور پر اس کو اختیار کرنا انتہائی مشکل ہے، تبھی خدا کی طرف سے غیر معمولی انعام کا وعدہ ہے: "إنما يوفى الصابرون أجرهم بغير حساب" صرف چار واقعات بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں، جنہوں نے خاندان کے ہر ایک فرد کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

مولانا عبداللہ حسنی ندویؒ جو ابا کے داماد تھے، ابا کو ان سے کتنی امیدیں ہوں گی، وہ عملی میدان میں کام بھی کر رہے تھے، بہت سے امور میں ابا کے دست و بازو بھی تھے، ایک لمبا عرصہ بیمار رہے اور اللہ کے حضور حاضر ہو گئے، پسماندگان میں ایک زوجہ اور ایک لڑکا چھوڑا، اس حادثہ کا سب سے زیادہ اثر فطری طور پر ابا پر پڑا ہوگا، جس سے امیدیں وابستہ تھیں، وہ رخصت ہو گیا، نگاہوں کے سامنے بیٹی اور نواسہ کا غمزدہ چہرہ ہے، مگر قربان جایئے صبر و استقامت کے اس پہاڑ پر جس کی زبان پر صرف ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' تھا، جو خود تعزیت مسنونہ اور تسلی کا سب سے زیادہ حقدار تھا، وہ دوسروں کو تسلی دے رہا تھا اور قضائے الٰہی پر صبر کی تلقین کر رہا تھا۔

دوسرا واقعہ انتہائی محبوب اور چہیتے بھائی کی مختصر بیماری اور پھر اچانک انتقال کا سانحہ ہے، وہ بھائی جس کے بغیر زندگی کی صبح و شام کا تصور بھی محال تھا، ابتدائے عمر کی دو دہائیوں کی وہ مصروفیت اگر ہٹا دی جائے جو حضرت مولانا واضح رشید ندویؒ نے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں بطور ملازمت گزاری ہے، تو زندگی کے تقریباً ستر سال کا طویل عرصہ ایک ساتھ ہی گزرا ہے، چاہے ندوہ کا قیام ہو، یا تکیہ کے ایام ہوں، کہیں کا سفر ہو یا کسی پروگرام میں شرکت ہو، ندوہ کا انتظام ہو یا ملی مسائل کا حل ہو، ہر موقع پر وہ بھائی نہ صرف ایک مشیر تھا بلکہ ایک مضبوط بازو اور ایک طاقتور سہارا تھا، ایسے عزیز از جان بھائی کا وقت نزع ہے' تہجد کا وقت ہے' ابا تکلیف سے بے چین بھائی پر نظر ڈالتے ہیں اور اس کی صحت یابی کے لیے دعا میں مشغول ہو جاتے ہیں، تہجد کا وقت نکلتا دیکھ کر نماز کی نیت باندھ لیتے ہیں، ادھر نماز پوری ہوتی ہے، ادھر مؤذن صدائے اللہ اکبر بلند کرتا ہے اور عزیز از جان بھائی کی روح اپنی منزل کی طرف پرواز کر جاتی ہے، بھائی کا بے جان جسم دیکھ کر کیا بیتی ہوگی اس انسان پر، جس سے اگر پوچھا جاتا کہ آپ کی متاع حیات کیا ہے تو شاید وہ اپنا اشارہ اسی بے جان جسم کی طرف کرتا، مگر قربان جایئے اس صبر و استقامت کے پہاڑ پر کہ اس کی زبان سے پہلا لفظ نکلا: ''انا للہ وانا الیہ راجعون، نماز کا وقت ہو گیا ہے، نماز پڑھ لی جائے۔'' نماز بعد اپنے بھتیجے مولانا جعفر حسنی ندوی کو صبر کی تلقین کرتے ہیں، نیک لوگوں کے لیے اللہ کے وعدوں اور بشارتوں کا تذکرہ کر کے غم کو ہلکا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تیسرا واقعہ مولانا حمزہ حسنی ندوی جو داماد بھی تھے اور ندوہ کے معاملات میں آپ کے معاون اور دست و بازو بھی تھے، ان کا حادثہ وفات پیش آتا ہے، ان کے فرزند مولوی رشید حسنی اور مولوی سعید حسنی ابا کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، آنکھوں سے آنسو رواں ہیں، وہاں موجود ہر آنکھ اشکبار ہو جاتی ہے، مگر صبر و ضبط کا یہ پہاڑ ان کے سر پر ہاتھ رکھتا ہے، زبان سے یہ کلمات ادا ہوتے ہیں: ''حمزہ اللہ کی امانت تھے، اللہ نے اپنی امانت واپس لے لی۔'' ان کو تسلی

دیتے ہیں، صبر کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں، سوچئے تسلی کون دے رہا ہے؟ صبر کا حوصلہ کون پیدا کررہا ہے؟ وہ جو خود سب سے زیادہ متاثر ہے، ان کا دل کتنا تڑپا ہوگا، مگر ایمان کی طاقت ہر آزمائش کے موقع پر ثابت قدم رکھتی ہے۔

انتہائی چہیتی بھتیجی اور مولانا حمزہ حسنی ندویؒ کی حقیقی بہن آپ کے سامنے دنیا سے رخصت ہوتی ہیں، ان کے فرزند آپ کے معاون اور سفر وحضر میں آپ کے رفیق مولانا محمود حسنی ندویؒ ایک طویل بیماری سے گزر کر اس دار فانی کو الوداع کہتے ہیں، یہ دونوں حادثات بھی آپ کے سامنے پیش آتے ہیں، مگر زبان پر وہی ایک جملہ انا للہ وانا الیہ راجعون اور اہل خانہ کو صبر کی تلقین اور تسلی کے کلمات، ان پہ در پہ واقعات کے موقع پر آپ کی کیفیت کا مشاہدہ کرنے والا یقیناً گواہی دے گا کہ یہ حدیث یقیناً آپ کی نگاہوں میں ہے:

"إن العين تدمع والقلب يحزن ولا نقول إلا ما يرضى ربنا وإنا لفراقك لمحزونون."

ابا کے صبر وتحمل کی کہانی ان کے حقیقی ماموں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زبانی:

"اس مجلس (دار المصنفین کے اسلام ومستشرقین پر سیمینار) میں شرکت کرنے کا فیصلہ خود بڑا دشوار تھا، لیکن احساس فرض اور عزیز القدر سید محمد رابع ندوی سلمہ کی ہمت کو دیکھ کر جو عزیز مرحوم کے حقیقی چھوٹے بھائی ہیں، (بارک اللہ فی حیاتہ) اور جن کے سامنے محبوب بھائی کی بیماری اور جدائی کے سارے مراحل گذرے تھے' ہمت بندھی۔" (کاروان زندگی: ۲/۳۴۹)

کہاں سے لائیں ایسا صبر، یقیناً یہ اللہ کا فضل ہے۔ "ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء والله ذو الفضل العظيم." خدا کو آپ کو بے حساب نوازنا تھا، اسی لیے آپ کو ان آزمائشوں سے گزارا، صحابی رسول ﷺ حضرت سعد بن ابی وقاص نے حضور ﷺ سے عرض کیا: سب سے زیادہ آزمائش کس پر آتی ہے؟ آپ نے فرمایا: انبیاء اور رسولوں پر پھر جو ان کے بعد مرتبہ میں ہیں، پھر جو ان کے بعد ہیں، بندے کی آزمائش اس کے دین کے حساب سے ہوتی ہے، اگر بندہ اپنے دین میں مضبوط اور پختہ ہے تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے، اگر وہ اپنے دین میں نرم ہوتا ہے تو اس کے دین کے حساب سے آزمائش ہوتی ہے، یہ آزمائش بندے کے ساتھ رہتی ہے، یہاں تک کہ بندہ روئے زمین پر اس حال میں چلتا ہے کہ اس پر کوئی گناہ نہیں ہوتا، ابا کو بھی سخت ترین آزمائش سے گزارا گیا اور عمر کے اختتامی مرحلہ تک گزارا جاتا رہا، کیونکہ فضل خداوندی آپ پر ہر لمحہ تھا، وراثت نبوی کے آپ حامل تھے اور امید ہے خدائے بزرگ وبرتر سے کہ آپ اس حال میں اس کے حضور حاضر ہوئے ہوں گے کہ آپ بالکل پاک صاف ہوں گے۔

شکر:

اسی طرح آپ کی ایک امتیازی خوبی یہ بھی تھی کہ جس طرح آپ نے آزمائشوں پر صبر کا عملی نمونہ پیش کیا، اسی طرح نعمتوں پر شکر ادا کرنے میں کبھی غفلت نہیں برتی، ہم لوگوں سے ہمیشہ فرماتے رہتے تھے کہ ہر حال میں اللہ کا شکر ادا کرتے رہنا، اللہ کا بے پناہ کرم ہے، جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے، والدین کی نیکیوں کا پھل ہے جو ہم لوگوں کو مل رہا ہے، کبھی اپنے ابتدائی دور کا تذکرہ فرماتے کہ اس وقت کے کیا حالات تھے، دین مخالف ماحول تھا، مدرسہ میں پڑھنا معیوب سمجھا جاتا تھا، جاتے آتے تبصرے سننے کو ملتے تھے، خدا کا فضل ہے کہ حالات اب ویسے نہیں ہیں، اب علماء کی عزت ہے، ان کی قدر ہے، اس پر جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے، فرماتے تھے کہ میں اس لائق نہیں تھا کہ ندوہ میں بحیثیت مدرس میرا تقرر ہوتا، لیکن خدا کا فضل ہے کہ میرا تقرر ہوا اور طلباء مطمئن ہیں، آپ کی زبان پر ہر لمحہ شکر کے نغمے تھے اور دل شکر کے جذبات سے لبریز تھا، اس طرح "من لم يشكر الناس لم يشكر الله" پر بھی آپ عمل پیرا تھے۔

اخفاء:

آپ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے

بھانجہ تھے، ان کے تربیت یافتہ تھے، بیعت حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری سے تھے، لیکن حضرت مولانا عبدالقادر رائپوریؒ نے تربیت کی ذمہ داری مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کو دے دی تھی، مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ آپ سے غیر معمولی محبت کرتے تھے، اسفار میں آپ کو اپنے ساتھ رکھتے تھے، نہ جاسکنے کی صورت میں آپ کو اپنے نمائندہ کی حیثیت سے بھیجتے تھے، مگر کبھی آپ نے نجی مجلسوں میں بھی ان باتوں کا اظہار نہیں کیا، ہم لوگ کبھی پوچھتے تو خوبصورتی سے بات بدل دیتے تھے، مگر ان باتوں کا اظہار کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

تحمل وبرداشت:

ابا کی ہارٹ کی دوائیں تھیں جن کو صبح ناشتہ کے معاً بعد اور سوتے وقت کھانا ہوتا تھا، جب ابا تکیہ میں ہوتے تھے تو ناشتہ گھر میں کرتے تھے، مولوی سحبان ثاقب ندوی یا مولوی عین الحسن ندوی ہم میں سے کسی کو دوا دے دیتے تھے کہ ناشتہ کے بعد ابا کو کھلا دینا، بارہا ایسا ہوا کہ ہم میں سے کوئی بھی دوا دینا بھول گیا اور دوپہر کو یاد دلانے پر یاد آیا او رابا کو دوا دی، کبھی زبان سے ایک لفظ بھی نہیں کہتے تھے، نہ چہرہ پر کوئی شکن ہوتی تھی، اگر دوا دینے والا ندامت کا اظہار کرتا تو اس کی ندامت دور کرتے، نہ کوئی زجر وتوبیخ، نہ کوئی ڈانٹ ڈپٹ، نہ کوئی طعنہ۔

مولوی عبدالسمیع ندوی کہتے ہیں کہ ایک صاحب تھے، جن کا تعلق ایران سے تھا، ان کا اصرار تھا کہ حضرت سے بات کرائیں، حضرت بیمار تھے، لیکن میں نے اندازہ کر کے کہ اب طبیعت سنبھل گئی ہے بات کرادی، بعد میں احساس ہوا اور ندامت کا اظہار کیا تو حضرت نے بات ہی بدل دی تا کہ ندامت کا احساس زائل ہوجائے۔

رمضان کے بابرکت مہینے میں بعد نماز فجر ہم سب کا سونے کا معمول ہے، ابا کا معمول صبح آٹھ بجے اٹھ جانے کا تھا، اسی وقت گھر آنے کا تقاضا ہوتا تھا، مولوی عین الحسن ہم میں سے کسی کو فون کرتے کہ باہر تک آجاؤ، تا کہ حضرت کو زحمت نہ ہو، بسا اوقات گہری نیند ہونے کی وجہ سے فون کال پر آنکھ نہ کھل سکی، ابا دھوپ میں باہر وہیل چیر پر بیٹھے رہتے یا تھوڑا انتظار کر کے گھر کے اندر تشریف لے آتے، مگر کبھی ایک لفظ بھی شکایت کا زبان پر نہیں آیا، جیسے ہی سامنا ہوتا، سلام کرتے تو مسکرا کر جواب دیتے تھے۔

زبان کی حفاظت:

حدیث شریف میں ہے ”تم دو چیزوں کی ضمانت لے لو میں تمہاری جنت کی ضمانت لیتا ہوں: زبان اور شرم گاہ۔“

ابا کی مجلس میں بیٹھنے والا اس بات کی گواہی دے گا کہ آپ پوری زندگی ”من حسن إسلام المرء ترکه ما لا یعنیه“ پر عمل پیرا رہے، آپ کی مجلس لایعنی گفتگو سے پاک تھی، جو بھی گفتگو ہوتی تھی دینی نسبت سے ہوتی تھی یا پھر آپ خاموش رہتے تھے، خاموشی آپ کی طویل ہوتی تھی، کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ اتنے لوگ آپ کی مجلس میں شرکت کے لیے آئے ہیں اور آپ مسلسل خاموش ہیں، یہ کیا سوچ رہے ہوں گے، لیکن اب سمجھ میں آتا ہے کہ آپ کی خاموشی لوگوں کو ایک سبق دیتی تھی کہ لایعنی گفتگو سے کیسے بچنا ہے، حضور ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ بوقت ضرورت تکلم فرماتے تھے ورنہ خاموش رہتے تھے، آپ ہنسنے ہنسانے والی باتوں سے اجتناب کرتے تھے اور اس کو قساوت قلب کا ذریعہ سمجھتے تھے، آپ کے ہاں کسی کی بے جا تعریف سے کلی اجتناب تھا، آپ کی زبان غیبت سے محفوظ تھی، آپ کو کبھی کسی کی غیبت کرتے یا منفی تبصرہ کرتے نہیں دیکھا گیا۔

استغنا:

استغنا کا درس دینا آسان ہے، عملاً اس کو اختیار کرنا مشکل ترین کام ہے، ابا میں یہ صفت بدرجہا پائی جاتی تھی، ایک صاحب حیثیت شخص ابا کو بطور ہدیہ رقم پیش کرتے اور قبول کرنے پر اصرار کرتے تھے، ابا ان سے ہدیہ لے لیتے اور دارالعلوم کی مد میں دے دیتے تھے، ایک بار ایک انتہائی قریبی (جن کا نام لینا مناسب نہیں) سے فرمایا کہ وہ باصرار دیتے ہیں، میں اگر چہ ندوہ کو دے دیتا ہوں، اپنی ذات یا اپنے گھر والوں پر ایک پیسہ بھی خرچ نہیں کرتا، پھر بھی لیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ جو بھی ہدایا آپ کی خدمت میں پیش کیے جاتے

تھے آپ اس کو اہل تعلق کے درمیان تقسیم کردیتے تھے، ملنے آنے والوں کو کچھ نہ کچھ دینے کا آپ کے ہاں بہت اہتمام تھا، گھر بھجوانا بالکل پسند نہیں کرتے تھے، ایک بار میرے سامنے ایک صاحب نے سیب لاکر پیش کیے، مصباح بھائی نے عرض کیا: خلیل موجود ہے، یہ سیب گھر چلے جائیں تو اچھا ہے۔ فرمایا: نہیں، اس کو فلاں صاحب کے ہاں بھجوادو، بعض ڈاکٹر جن سے آپ کا علاج معالجہ کا رابطہ تھا، ان کو مسلسل کچھ نہ کچھ بھجواتے رہتے، پھر بھی جب بھی ملاقات ہوتی، ان کے اس احسان کا تذکرہ کرتے اور ممنونیت کا اظہار کرتے تھے۔

تقسیم میں انصاف:

آپ کے الحمدللہ سات نواسے تھے، آپ کے ہاں اس بات کا غیر معمولی اہتمام تھا کہ جو بھی دیں سب کو یکساں دیں، عام طور پر آپ ہم سب کو قلم دیتے تھے، کسی ایک کو سات قلم دیتے کہ آپس میں تم سب بانٹ لینا، ایک بار ہم میں سے ایک نے آپ سے ایک صدری کے کپڑے کا مطالبہ کیا، آپ نے اس سے پوچھا کہ بقیہ جتنے لڑکے ہیں سب کے پاس موجود ہے؟ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا، آپ نے اس سے فرمایا: تم بھی رہنے دو، کیونکہ سب کو دیا نہیں جا سکتا، اس سے آپ نے دو سبق دیئے کہ مانگنا مناسب نہیں ہے اور ہر حال میں انصاف کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

احتیاط اور تقویٰ:

آپ کی پوری زندگی ان دونوں صفتوں سے عبارت تھی، آپ نے پوری زندگی ندوہ کے لیے وقف کردی تھی، آپ کے نواسہ ابوالحسن علی حسنی نے آپ کے بارے میں اپنے جذبات اشعار کے قالب میں یوں پیش کیے ہیں ؎

شان ندوہ، جان ندوہ، جانشین بوالحسن

دونوں وقت آپ کا کھانا گھر سے ندوہ جاتا تھا اور ناشتہ حضرت مہتمم صاحب کے ہاں سے آتا تھا، ہم لوگ جب ندوہ میں ہوتے تھے تو آپ تاکید کرتے تھے کہ کھانا گھر کا کھانا، مہمانوں کے لیے مطبخ سے جو کھانا آتا تھا، گرچہ اس کا بل آپ ادا کرتے تھے، مگر تاکید گھر کا کھانا کھانے کی تھی اور نگاہ بھی رکھتے تھے، آپ کا تربیت کا انداز بڑا پیارا تھا، جب ندوہ میں زیر تعلیم تھا، اس وقت خالی گھنٹہ میں ابا یعنی حضرت مولانا واضح رشید صاحب ندویؒ کے دفتر ابا سے ملنے چلا جاتا تھا، ابا جب مہمان خانے سے ناشتہ بغیر کیے دفتر تشریف لے آتے تو ملازم سے ناشتہ کے طور پر چائے اور اس کے ساتھ کچھ منگوالیا کرتے تھے، ایک بار میں وہیں موجود تھا، ناشتہ میں ابا کے ساتھ شریک ہوگیا، اتفاقاً اسی وقت اچھے ابا یعنی حضرت مولانا رابع حسنی ندوی تشریف لے آئے، آپ کو اشتباہ ہوا کہ یا تو میں نے ناشتہ منگوایا ہے، یا ابا نے میری وجہ سے منگوایا ہے، مجھے ناشتہ کرتے دیکھ کر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور فرمایا: واضح کے دفتر میں تمہارا ناشتہ منگوانا مناسب نہیں، آئندہ احتیاط کرنا، اس قدر آپ کے ہاں احتیاط تھی، مولانا حمزہ حسنی ندویؒ نے اپنا ایک واقعہ سنایا کہ قطر کے ایک سفر میں مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی معیت میں حضرت مولانا رابع حسنی ندویؒ اور ہم بھی تھے، تین ملکوں کا دورہ تھا، قطر، دبئی اور سعودی عرب، علماء عرب نے وسعت ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم تینوں کو یکساں تحفے دینے کا اہتمام کیا، واپسی پر حضرت مولانا رابع حسنی ندویؒ نے مجھ سے فرمایا: ہم کو اور تم کو جو بھی ملا ہے ماموں جان کی وجہ سے ملا ہے، اس لیے ماموں جان کو دو حصے ملنے چاہئیں اور ایک حصہ میں ہم او رتم شریک ہوں گے اور ایسا ہی کیا، تکیہ میں قیام کے دوران جو بھی تحفہ آپ کو پیش کیا جاتا اس کو ماموں جان یعنی مفکر اسلام کی طرف محمول کرتے کہ میں اس کا حقدار نہیں ہوں، ماموں جان کی برکت ہے یہ، یا تو اس کو اہل تعلق میں تقسیم کرتے اور اگر گھر بھیجنا ہوتا تو اس کا آدھا حصہ حضرت مولانا کے ہاں بھیجنے کا اہتمام کرتے، فرماتے تھے: جو بھی مل رہا ہے ماموں جان کی برکت سے مل رہا ہے۔

بنگلور کے ایک صاحب حیثیت تعلق والے ابا کو ایک کار ہدیہ میں پیش کرنے پر مصر تھے اور ابا کی طرف سے مسلسل انکار تھا، وہ لکھنؤ آئے اور کار بک کی اور ابا سے آکر کہا: میں نے کار خرید لی ہے، آپ کو لینا ہی ہوگا، ڈرائیور کی تنخواہ میرے ذمہ ہوگی، ابا نے کہا: میں نے

آپ سے کہا ہے، اگر آپ دینا ہی چاہتے ہیں تو ندوہ کو دیجیے، مجھے ضرورت نہیں ہے، انہوں نے کار ندوہ کو دے دی اور ڈرائیور کی تنخواہ سے معذوری ظاہر کردی۔

دل رکھنا:

کم حیثیت یا غرباء خلوص دل سے جو کچھ پیش کرتے تھے، ابا اس کو انتہائی خوش دلی سے قبول کرتے تھے، بارہا ایسے موقعوں پر یہ فرماتے سنا ہے کہ اس کو حفاظت سے رکھو اس کا استعمال میں خود کروں گا۔

مزاج میں نرمی:

ارشاد نبوی ﷺ ہے:

"إن اللّٰه يحب الرفق ويعطى على الرفق ما لا يعطى على العنف" (اللہ تعالیٰ نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر وہ دیتا ہے جو سختی پر نہیں دیتا ہے۔)

میں نے آج تک ابا کو کبھی حالت غصہ میں نہیں دیکھا، ہمیشہ آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رہتی تھی، لہجہ میں شہد جیسی مٹھاس ہوتی تھی، سوائے دو موقعوں پر ایک واقعہ ڈنمارک پر اور ایک بار ایک صاحب نے کہا: میں پائلٹ بن سکتا تھا، مگر دینی تعلیم کو حاصل کیا ہے، لیکن مجھے ملا کیا، اس موقع پر میں نے ابا کو غصہ میں دیکھا، ان سے فرمایا: اگر آپ نے دنیا کے حصول کے لیے دینی تعلیم کو حاصل کیا ہے تو بہت بہتر تھا کہ پائلٹ ہی بن جاتے۔ ان دو موقعوں کے علاوہ میں نے کبھی آپ کو غصہ میں نہیں دیکھا۔ آپ ﷺ کی ایک صفت بیان کی جاتی ہے کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لیے انتقام نہیں لیا، نہ ہی غصہ ہوئے، ہاں دینی شعائر کی پامالی ہو تو آپ کے غصہ کے سامنے کوئی ٹک نہیں سکتا تھا، مزاج نبوی سے جو جتنا قریب ہوگا اتنا ہی وہ متبع سنت بھی ہوگا، جب دینی علوم کی تحقیر آپ نے محسوس کی تو غصہ کا اظہار کیا، جب ناموس رسالت پر چند بدبختوں نے بھونکنے کی کوشش کی تو اس وقت ابا کا غصہ میں نے دیکھا۔

صحابی رسول ﷺ حضرت انسؓ فرماتے ہیں: میں نے آپ ﷺ کی دس سال خدمت کی، کبھی آپ نے مجھے اف تک نہیں کیا اور نہ کبھی یہ کہا کہ فلاں کام کیوں کیا اور اور فلاں کام کیوں نہیں کیا۔

انسان جس سے محبت کرتا ہے، اس کی ہر ادا کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی لیے "المرء مع من أحب" کہا گیا ہے، کیونکہ محبت محبوب کی اتباع پر آمادہ کرے گی اور یہ اتباع محبوب کی معیت کا سبب بنے گی، ابا کی زبان پر نہ کسی کے لیے شکوہ تھا نہ شکایت، آپ کے ایک خادم مولوی سحبان ثاقب ندوی بھٹکلی جو تقریباً ۱۳ سال سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہے ہیں، بیان کرتے ہیں کہ ان تیرہ سالوں میں حضرت مولانا نے کبھی مجھے کسی بات پر سرزنش نہیں کی اور نہ ہی کبھی میرے کسی کام پر فرمایا کہ یہ کیوں کیا اور یہ کیوں نہیں کیا؟ ایک مرتبہ میں نے حضرت سے فرمایا: حضرت انسؓ نے آپ ﷺ کے تعلق سے جو فرمایا ہے، آپ وارثِ انبیاء ہیں، میری زبان پر آپ کے لیے یہی الفاظ ہیں۔ آپ خاموش رہے۔

بے چینی اور فکرمندی:

آپ ﷺ کے بارے میں آتا ہے: "كان رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم متواصل الأحزان، دائم الفكرة."

شیخ الاسلام ابن تیمیہ فرماتے ہیں: حزن سے مراد مستقبل میں پیش آنے والے مسائل پر بیدار مغزی اور تیقظ ہے۔ میں نے ابا میں ایک بے چینی دیکھی ہے، خاص کر مسلمانوں کی دین سے دوری آپ کو مسلسل بے چین رکھتی تھی، اس کے تعلق سے آپ فکرمند رہتے تھے، اور فرماتے تھے کہ ہمارے اعمال اس سے بھی برے حالات کا نتیجہ بن سکتے تھے مگر اللہ کا فضل ہے۔ جزیرۃ العرب کے حالات پر انتہائی کڑھتے تھے، سفارت خانے خطوط بھیج کر ان کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتے تھے، انتقال سے دو دن قبل ڈاکٹر کوثر عثمان ملاقات کے لیے آئے، وہ عمرہ کر کے سیدھے مہمان خانے آئے اور وہاں کے حسن انتظام کا نقشہ کھینچا، ابا نے انتہائی درد میں ڈوبے لہجہ میں فرمایا: ایک طرف یہ انتظام اور حجاج اور معتمرین کو آرام پہنچانے کا اتنا اہتمام، دوسری طرف شعائر اسلام کی مسلسل پامالی، اللہ خیر کا معاملہ فرمائے۔

وفات:

رمضان مبارک کا مہینہ شروع ہوا، شروع کے دو جمعہ آپ نے مسجد میں خطاب کیا، دین وایمان کی باتیں بتائیں، تیسرے جمعہ سے طبیعت متاثر ہونی شروع ہوئی، کمزوری اور نقاہت بڑھتی جارہی تھی، بستر سے اٹھنا مشکل ہوگیا تھا، مگر اس حالت میں بھی نماز کا غیر معمولی اہتمام تھا، وقت پر ادائیگی کا غیر معمولی خیال تھا، تکیہ میں طبی سہولیات اتنی نہیں تھیں، اس لیے ڈاکٹروں کا مشورہ تھا کہ لکھنؤ شفٹ کیا جائے، مگر ابا مطمئن نہیں تھے، ڈاکٹر ناصر جو ابا کے معالج تھے، وہ تشریف لائے اور شفٹ کرنے کی تاکید کی، رائے یہ ہوئی کہ ابا کو وہی تیار کریں، بہر حال ابا تیار ہوگئے اور ان کی گاڑی میں لکھنؤ کا سفر ہوا، لکھنؤ پہنچ کر طبیعت بہتر ہوگئی، ڈاکٹروں کی پوری ٹیم آگئی تھی، ابا نے ان کے سامنے وعظ فرمایا، فرمایا: آپ لوگ خدمت خلق کا کام انجام دے رہے ہیں، ثواب کی نیت سے یہ کام کیجیے، آپ کا یہ عمل عبادت بن جائے گا اور تقرب الٰہی کا ذریعہ ہوگا، تقریباً دس منٹ آپ نے ان سب کو نصیحت کی، پھر سب رخصت ہوگئے، اگلے دن پھر طبیعت متاثر ہوگئی، اونچ نیچ ہوتی رہی، کبھی افاقہ محسوس ہوتا، کبھی طبیعت گرتی محسوس ہوتی، انتقال سے تین دن قبل بخار آیا جو کسی انفیکشن کا نتیجہ تھا، بخار اتارنے کی دوائیں دی جاتی رہیں، مگر بخار کم نہیں ہورہا تھا، ماتھے پر اور پاؤں پر پانی میں بھگو کر کپڑا رکھا جارہا تھا، مگر اس سے بھی آرام نہیں ہوا، پانی بھی بیچ بیچ میں ماتھے اور پاؤں پر ٹپکایا جاتا رہا، مگر اس سے بھی بخار میں تخفیف نہیں ہوئی، غنودگی بڑھتی گئی، نماز اشارے سے ادا کررہے تھے۔

انتقال کے روز طبیعت بہتر ہوگئی، ناشتہ کیا، ظہر کی نماز کا جیسے ہی وقت ہوا، آپ نے نماز پڑھنے کے لیے کہا، والد صاحب نے فرمایا: ابھی وقت نہیں ہوا ہے، مطلب تھا کہ جس وقت آپ نماز پڑھتے ہیں وہ وقت ابھی نہیں ہوا ہے، مگر آپ نے پڑھنے پر اصرار کیا اور نماز پڑھی، نماز پڑھتے ہی طبیعت پھر متاثر ہوگئی، ایسا محسوس ہورہا تھا کہ کاتب تقدیر نے آپ کو آخری نماز پڑھنے کے لیے صحت یاب کردیا ہو، جس کی پوری زندگی نماز کے اہتمام میں گزری، آخری نماز سے وہ کیسے محروم رہتا، محسوس کرنے والے نے محسوس کیا کہ زبان ہل رہی ہے، صاف محسوس ہورہا تھا کہ آپ کچھ پڑھ رہے ہیں، آدھا ایک گھنٹہ اس کیفیت میں گزرا اور پھر عمر بھر کی بے قراری کو قرار آہی گیا، روح آپ کو بلند کرنے کے لیے بلندی کی طرف پرواز کرگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

آسمان تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

اجتماعی انتشار وافتراق سے نجات کا راستہ

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

”اگر ہم مسلمان صرف دو باتوں کی پابندی کرسکیں تو ہمارے اجتماعی انتشار وافتراق کا سدباب ہوسکتا ہے، ایک تو یہ کہ امیر ومامور کے احکام پر عمل کریں، ہم اپنے کسی بھی اجتماعی نظام میں خواہ وہ جماعت ہو انجمن ہو ادارہ ہو یا خاندان ہو اپنے میں سے کسی ایک کو امیر کی حیثیت دے دیں پھر اس کے مامور ہونے کا حق ادا کریں، اس کے خلاف رویہ صرف اسی اصول پر اختیار کریں جو شریعت میں بتایا گیا ہے اور ہم کو یہ جاننا چاہیے کہ اسلام میں بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا ہر اجتماعی نظام امیر ومامور کے اصول پر قائم ہے اور امیر ومامور کے قاعدے شریعت نے واضح کردیے ہیں۔

دوسری بات یہ اختیار کرنی ہے کہ غیبت سے پوری طرح پرہیز کیا جائے، جس سے ہمارا معاشرہ پوری طرح داغ دار ہے، ہم میں سے ہر شخص ذرا اپنی مرضی یا اپنی رائے کے خلاف کوئی بات دیکھتا ہے تو غیبت ومذمت سے اپنے ماحول کو بھر دیتا ہے، اس میں وہ نہ تو امیر ومامور کے اصول کا خیال کرتا ہے اور نہ دوستی ورفاقت کے تقاضوں کا لحاظ کرتا ہے اور نہ اخوت ومحبت کے روابط کی پرواہ کرتا ہے۔“

(مسلم سماج - ذمہ داریاں اور تقاضے ۱۰۰-۱۰۱)

اچھے ابا کی شخصیت-ذاتی تاثرات

محمد امین حسنی ندوی
(رفیق دارعرفات تکیہ کلاں-رائے بریلی)

ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ☆ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ (الرحمٰن: ۲۶-۲۷)

خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو اس کی تیاری پہلے سے کر لیتے ہیں، توفیق الٰہی ان کے ساتھ ہوتی ہے، ارشاد نبوی ہے: "الكيس من دان نفسه وعمل لما بعد الموت" (سنن الترمذی)

یہی وہ لوگ ہیں جن کا تعارف زبان رسالت یوں کراتی ہے:

"من أحب لقاء الله أحب الله لقاءه" (صحيح مسلم)

(جو اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملنا پسند کرتا ہے)

یہی وہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ سے ملنے کی تمنا بے چین و بے قرار رکھتی ہے اور کیوں نہ ہوں؟ ان کو اپنے رب سے خیر کی امید ہوتی ہے: ﴿وَمَن يَقْنَطُ مِن رَّحْمَةِ رَبِّهِ إِلَّا الضَّالُّونَ﴾ آیت ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہے۔

(اچھے ابا) حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ انہی بابرکت نفوس میں سے ہیں، جو ایک طرف اعمال صالحہ سے اپنا رشتہ مضبوط سے مضبوط تر رکھتے ہیں، وہیں دوسری طرف لغزشوں اور کوتاہیوں پر خلوت میں اپنے رب کے حضور اشک ندامت بہاتے ہیں اور اپنے رب سے خیر کی امید رکھتے ہیں، حدیث قدسی میں ہے:

"أنا عند ظن عبدي وأنا معه حين يذكرني" (البخاري)

(میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوں جب وہ مجھے یاد کرے)

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ ان کے گمان کے مطابق معاملہ فرماتے ہیں۔

کسی بھی شخصیت کی تشکیل میں بنیادی طور پر تین عناصر کارفرما ہوتے ہیں، ابتدائی عمر میں اس کی ماں کی تربیت اور نگہداشت، جوانی کی عمر میں والد کی نگرانی اور اساتذہ کی خصوصی توجہ، تیسرے خود اس کے اندر کی صالحیت۔

یہ کہنا بجا ہوگا کہ آپ کی تربیت میں بھی ان تین عناصر کا کردار رہا ہے، آپ کی والدہ مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی ؒ کی حقیقی بہن تھیں اور انہی کی طرح دینی جذبہ سے سرشار تھیں، جس زمانہ میں دینی تعلیم کی کھلم کھلا تحقیر کی جاتی تھی، فقرے کسے جاتے تھے، مادی ترقی کی راہ میں اس کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا تھا، ایسے وقت میں انہوں نے اپنے تینوں بیٹوں کے لیے دینی تعلیم کو ترجیح دی اور ان کو پوری طرح مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے حوالہ کر دیا، خود حضرت مولانا رابع حسنی ندویؒ نے بارہا فرمایا کہ جب ہم پڑھنے جاتے تھے تو ہر روز ایسے لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا جو بڑی ہمدردی کا اظہار کرتے اور کہتے: میاں! مستقبل میں کیا ہوگا، ابھی بھی وقت ہے، راستہ بدل لو اور ایسے سخت جملے کہتے کہ ان کے سامنے سے گذرنا مشکل ہو جاتا۔

والدین کی دعاؤں کے سایہ میں اور اپنے حقیقی ماموں مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی کی زیر نگرانی حضرت مولانا کا تعلیمی سفر جاری رہا، مفکر اسلام کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، حقیقی بہن کی اولاد ہونے کی وجہ سے ان کو حضرت مولانا رابع حسنی ندویؒ سے

خصوصی تعلق رہا، ایک بار یاد ہے حضرت مولانا تکیہ میں مقیم تھے، مولانا رابع حسنی ندوی کوندوہ سے آنا تھا، اس وقت حضرت مولانا بس سے رائے بریلی آیا کرتے تھے، حضرت مولانا مغرب بعد گھر کے اندر تشریف لا چکے تھے، بار بار کسی فرد کو باہر بھیجتے کہ دیکھو رابع آ گئے یا نہیں؟ فرماتے: اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟ تاخیر پر ان کی پریشانی، فکرمندی اور بے چینی ہر شخص محسوس کر سکتا تھا۔

حضرت مولاناؒ کی تربیت میں جن لوگوں کا بہت اہم کردار ہے، ان میں سب سے بنیادی تربیت ان کی والدہ اور ان کے دونوں ماموں کی ہے، والدہ نے اپنے دونوں بھائیوں کی تربیت میں ان کو دیا تھا، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے اس تربیت سے بھر پور فائدہ اٹھایا اور بالکل اپنے آپ کو ان دونوں کے لیے مٹا دیا، اپنی خوشی اور اپنی تکلیف تک کو بھلا دیا اور اور اپنے بڑوں کو اس کا احساس تک نہ ہونے دیا، خود بتاتے تھے کہ ماموں جی (حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ) کے ساتھ سفر پر جانا ہے لیکن حضرت مولاناؒ کو انتظار نہ کرنا پڑے اس کے لیے بہت سی پریشانیاں اٹھانی پڑیں، جہاز کا سفر نہایت شاق اور پر مشقت لگتا لیکن کبھی ایسا نہ ہوا کہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے یہ کہا ہو کہ میں نہیں جا سکتا مجھے پریشانی ہوتی ہے۔

سب سے زیادہ تعلق اگر کسی کو کسی سے ہوتا ہے تو گھر والے ہیں، خاندان کے افراد ہیں اور اگر کسی کے بارے میں صحیح طور پر جاننا ہو تو اس کے گھر والوں سے پوچھنا چاہیے، کیوں کہ اکثر ایسا دیکھا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی زندگی کچھ اور ہوتی ہے اور گھر کے باہر کی زندگی کچھ اور، لیکن اگر کوئی شخص خلوت و جلوت دونوں جگہ یکساں ہے تو یقیناً وہ دوسروں سے مختلف ہے اور اس کے کرنے اور نہ کرنے میں اللہ کی رضا پیش نظر ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"خیر کم خیر کم لأهله وأنا خیر کم لأهلی" (ابن ماجة)

(تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہتر ہو اور میں تم سب سے زیادہ اپنے گھر والوں کے لیے بہترین ہوں)

اس تعلق سے بھی اگر ہم اچھے ابا کی شخصیت کا جائزہ لیں تو وہ بہت ممتاز نظر آتے ہیں، والدین کی ایسی تابعداری اور خدمت گذاری اور محبت میں ایسا والہانہ پن اور پھر اس عمر میں جب کہ وہ خود نانا بن چکے تھے اگر دیکھا نہ ہوتا تو یقین نہ آتا۔

انبیاء علیہم السلام سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ کے قریب کون ہو سکتا ہے؟ لیکن اللہ کی مشیت اور اس کی سنت یہ رہی ہے کہ اپنے محبوب بندوں کو آزماتا ہے اور جب آزما لیتا ہے تو انہیں وہ اعزاز سے نوازتا ہے جس کے لیے انسان رشک کرے، کبھی متقین کا امام بناتا ہے اور کبھی معراج عطا فرماتا ہے، اسی طرح انبیاء کے بعد اللہ کے نیک بندوں کی بھی آزمائش کی جاتی ہے، حضرت مولاناؒ کو بھی اس طرح کی سخت آزمائش سے گذرنا پڑا، انسان کے لیے سب سے بڑا حادثہ والدین کی وفات کا ہوتا ہے، لیکن ایک وقت آتا ہے کہ انسان ان حوادث کو بھول کر آگے بڑھتا ہے، لیکن اگر یہ حوادث یکے بعد دیگرے اس کی زندگی میں پیش آنے لگیں تو وہ ٹوٹ جاتا ہے، بکھر جاتا ہے، مایوس ہو جاتا ہے اور سکون کی تلاش میں گوشہ نشینی کی راہ اختیار کر لیتا ہے، حضرت مولاناؒ کی زندگی صبر و عزیمت اور برداشت کی تھی، انہوں نے جن حوادث کا سامنا کیا اور ان کو کس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ کی رضا کے لیے برداشت کیا اس کا تصور بھی مشکل ہے، کیسی سخت آزمائش ہوئیں، والدین کا حادثہ، پھر اپنے مربی و محسن مشفق ماموں کی وفات اور اس کے بعد اپنے چھوٹوں کا اس دنیا سے جانا، کیسا صبر، کیسی برادشت، اپنے چھوٹوں کے زخموں پر کیسے مرہم رکھا ہوگا، وہ ہر اس چھوٹے کے بڑے بن جاتے تھے جس کا بڑا دنیا سے رخصت ہو گیا ہوتا تھا، کیوں کہ وہ جانتے تھے کہ اگر ہم نے ہمت نہیں بندھائی، اگر ہم نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا تو ان کا کیا ہوگا؟! اللہ کا محبوب بندہ صبر و ہمت کا پہاڑ بنا رہا، وہ اپنے چھوٹوں کی ہمت بندھاتے، ان سے بات کرتے، ہر حادثہ پر یہ احساس ہوتا کہ ابھی اچھے ابا ہیں اور صبر آ جاتا، لیکن یہ احساس نہیں ہوتا کہ وہ کیسے صبر کر رہے ہوں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق آتا ہے کہ جو آپ سے ایک بار بھی مل

لیتا، تو آپ کی محبت اس کے دل میں بیٹھ جاتی کہ پھر کسی کی محبت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی، اس کا دل آپ ﷺ کی عظمت سے سرشار ہوجاتا، یہی بات ان لوگوں میں منتقل ہوتی ہے جو نبی ﷺ کے وارث ہوتے ہیں، جن کا دل اللہ تعالیٰ کی محبت سے آشنا ہوجاتا ہے، اللہ ان کی محبت آسمانِ دنیا سے زمین تک پہنچادیتے ہیں، حدیث میں ہے:

"إذا أحب اللّٰه العبد نادىٰ جبريل أن اللّٰه يحب فلانا فأحبه، فيحبه جبريل، فينادى جبريل فى أهل السماء أن اللّٰه يحب فلانا فأحبوه، فيحبه أهل السماء ثم يوضع له القبول فى الأرض." (صحيح البخارى)

(جب اللہ بندہ سے محبت کرتا ہے تو جبریل سے کہتا ہے کہ مجھے فلاں بندہ سے محبت ہے، تو جبریل بھی اس سے محبت کرتے ہیں اور آسمان والوں میں ندا لگاتے ہیں کہ اللہ کو اپنے فلاں بندہ سے محبت ہے تو تم بھی اس سے محبت کرو، پھر آسمان والے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں اور روئے زمین پر بھی اس کے لیے قبولیت لکھ دی جاتی ہے)

اچھے ابا سے جو بھی ملتا وہ ان کا گرویدہ ہوجاتا، ان کے انتقال سے لوگوں نے ایسا محسوس کیا کہ ایک باپ کا سایہ چھن گیا، ان کے پاس لوگ آتے اپنے مسائل ومشکلات کے حل کے لیے اور ان کی شفقت اور خلوص دیکھ کر وہ کچھ دیر کے لیے اپنی پریشانی بھول جاتے اور انہی کے ہوکر رہ جاتے، کتنے ایسے لوگ آئے کہ بس حضرت کا دیدار ہوجائے، ایک صاحب نے خود کہا کہ حضرت مولاناؒ کے پاس آکر دل کی کیفیت بدل جاتی تھی، ایسا لگتا تھا کہ دل صاف ہوگیا، کتنے ایسے لوگ ہیں جو گھنٹوں بالکل خاموش بیٹھے رہتے، بس ٹکٹکی باندھے انہیں دیکھتے رہتے، ایسا محسوس ہوتا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی محبت دلوں میں داخل کردی، جب کہ وہ خاموش رہتے، بوقت ضرورت بولتے، کبھی منفی بات کرتے ہوئے یا منفی تبصرہ کرتے نہیں دیکھا گیا، نہ ہی کبھی مایوسی کی بات کی، جو آتا اس سے یہی کہتے کہ امت کے لیے دعا کیجیے، حالات پر روشنی ڈالتے تو کہتے کہ اس سے بھی سخت حالات سے امت دوچار ہوئی ہے، تاتاریوں کی مثال دیتے اور قریب میں ملک کی تقسیم کی مثال دیتے اور اس وقت ہونے والے فسادات، لوٹ مار، خوں خرابہ اور مذہبی منافرت اور تعصب کے واقعات بیان کرکے ڈھارس بندھاتے اور کہتے کہ ایک وقت تھا کہ ہم لوگوں کو دینی تعلیم حاصل کرنے پر طعنے دیے جاتے تھے اور نہایت کمتر سمجھا جاتا تھا لیکن آج اللہ نے جو عزت دی وہ صرف اس دین کی وجہ سے ہے، حضرت عمر بن خطابؓ نے کہا تھا:

"نحن قوم أعزنا اللّٰه بالإسلام فمهما ابتغينا العزة فى غيره أذلنا اللّٰه" (اللہ تعالیٰ نے ہماری امت کو اسلام کے سبب باعزت کیا ہے، لہٰذا ہم جب بھی اس کے علاوہ کسی ذریعہ سے عزت کے خواہاں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں ذلیل ورسوا کرے گا)

اچھے ابا پر خلوت میں اس طرح رقت طاری ہوتی کہ کئی بار دیکھا کہ نمازوں میں اقامت ہورہی ہے تو ہچکیاں بندھ گئیں، ان کا دل اتنا صاف وشفاف تھا، خیالات پاکیزہ، جذبات واحساسات پاکیزہ، ان کو حلاوت ایمانی مل چکی تھی، وہ غیبت سن نہیں سکتے تھے، اپنی مجلس میں کسی پر منفی تبصرہ کرتے دیکھتے تو فوراً متنبہ کرتے، وہ کہتے کہ جس نے کچھ غلط کیا یا کہا تو اس کا معاملہ اللہ کے حوالے، ہم کون ہوتے ہیں؟!

اللہ تعالیٰ نے اچھے ابا کو لمبی عمر عطا فرمائی، کیوں کہ ان سے تجدیدی کام کروانے مقصود تھے، کتنے ایسے کام ہیں جو ان کی برکت سے ہوگئے، اگر ان کو برکۃ العصر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، ان کی شخصیت نے فتنوں کا سدباب کیا اور ملت کو مجتمع رکھا، ذاتی مفاد کو یا ذاتی خیالات کو امت کی اجتماعیت کے لیے رکاوٹ نہیں بننے دیا، ہر آن ہر لمحہ ان کو امت کا خیال تھا، آخری زمانہ میں جو بھی دعا کے لیے آتا تو اس سے یہی کہتے کہ آپ بھی ہم کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور امت کے لیے خاص دعا کا اہتمام کریں، وہ کہتے کہ آج جو حالات سے ہم گذر رہے ہیں وہ سب ہمارے اعمال کا نتیجہ ہے، ہم نے اللہ سے اپنا رشتہ کمزور کیا تو یہ حالات ہوئے، اگر آج بھی ہم اللہ سے اپنا رشتہ مضبوط کریں گے تو حالات بدلیں گے۔

رندوں کو تسلی تھی کہ میخانہ میں تم ہو

مولانا سعد چشتی ندوی
(استاذ جامعہ کنز العلوم جمالپور- گجرات)

۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء دوپہر ۲/بجے جب حضرت مولانا کے وفات کی خبر سنی تو ایک پل کے لیے دل دھک سے بیٹھ گیا، دل پر ایک ایسا اثر ہوا جسے بیان نہیں کیا جا سکتا، جیسے دل چاہ رہا ہو کہ ندوہ کا کوئی پرانا ساتھی مل جائے اور گلے مل کر جی بھر کر روئیں، اس وقت کیفیت ایسی طاری ہوئی کہ جیسے آج کوئی اپنا چھوٹ گیا، ہمارے خاندان کا بڑا جاتا رہا، وہ جو ہم سب کی ہمت تھا وہ جسے دیکھ کر دل خوش ہوتا تھا، جس کی موجودگی رونق محفل تھی، جس کا تکلم درد کا درماں تھا آج وہ نہ رہا، آج اس کی جدائی سے دل مغموم ہے، آنکھیں اشک بار ہیں، دل پریشان ہے کچھ سمجھ نہیں آتا کیا کیا جائے؟!

جو دل پر بوجھ ہے یا رب ذرا بھی کم نہیں ہوتا
زمانہ غم تو دیتا ہے شریک غم نہیں ہوتا

آج بھی جب حضرت کی وفات یاد آتی ہے تو دل مغموم ہو جاتا ہے اور ذھن ماضی کی یادوں میں کھو جاتا ہے۔

آج جب ہم ماضی کے اوراق پلٹتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ حضرت مولانا رابع صاحب سے پہلے مولانا علی میاں صاحب ندوی کا چہار دانگ عالم میں ڈنکا بج رہا تھا، آپ کی شخصیت کا شہرہ پورے عالم میں تھا، وہ لوگ بڑے خوش نصیب ہیں جنہوں نے حضرت مولانا علی میاں صاحب کا زمانہ پایا، آپ سے درس پڑھا، یا کسی بھی شکل سے استفادہ کیا۔

لیکن ہماری قسمت اس معاملے میں کوتاہ دست رہی کہ ہم نے حضرت مولانا علی میاں صاحب ندوی کا زمانہ نہیں پایا، حضرت مولانا علی میاں صاحب کی وفات سنہ ۱۹۹۹ء کے آخری دن ۳۱/دسمبر مطابق ۲۳/رمضان کو ہوئی اور جنوری ۲۰۰۰ء مطابق ۴/شوال یعنی کہ وفات کے بیس دن بعد تقریباً ۱۵یا۱۶/سال کی عمر میں ہمارا ندوہ میں شعبہ حفظ میں داخلہ ہوا، مولانا رابع صاحب کی نظامت کا یہ پہلا سال تھا، اس بنا پر ہمارے لیے تو مولانا رابع صاحب ہی حضرت مولانا تھے، ہم نے آپ ہی کو ندوہ کی سب سے بڑی شخصیت کے طور پر جانا اور آپ ہی کے دور نظامت میں مکمل تعلیمی سفر طے کیا، جو تقریباً ۱۱/سال پر محیط ہے اور حفظ تا تخصص فی الحدیث پر مشتمل ہے۔

ہمیں آج بھی یاد ہے جب ہم حفظ میں تھے اس وقت جب ندوہ میں آپ کی آمد ہوتی تو آپ کو دیکھنے کو دوڑتے، ملاقات کے لیے پوری کوشش کر کے بھیڑ میں گھس جاتے اور جب مصافحہ کا موقع مل جاتا تو دیر تک ہاتھ کے لمس کو اور اس کے نرم و گداز پن کو محسوس کرتے، ناک تک ہاتھ لے جا کر خوشبو سونگھتے اور دوستوں کو بھی سنگھاتے۔

پھر آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا، حفظ کی تکمیل ہوئی تو ندوہ سے سکروری منتقلی ہوئی، سکروری میں آپ کی آمد ہلال عید ہوتی، آپ کی آمد سے قبل ہی ایک ہنگامہ بپا ہوتا اور جب آپ آتے اور طلبہ کے مابین آپ کا خطاب ہوتا تو پورا معہد گوش گزار ہو جاتا، سراپا کان بن جاتا اور آپ کی ایک ایک بات کو دل کے کانوں سے سن کر محفوظ کر لیتا۔

سکروری سے پھر جب واپس ندوہ آنے کا موقع ملا، اس وقت آپ کی مجلسوں میں بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، عشاء کی نماز کے بعد آپ کی مجلس مہمان خانے میں لگتی، طلبہ کی ایک بڑی تعداد شرکت کرتی، مولانا نذر الحفیظ صاحبؒ اور مولانا شمس الحق صاحب مجلس میں اکثر موجود ہوتے، اکثر آپ دونوں سوال کرتے اور حضرت

مولانا جواب دیتے، طلبہ ان باتوں کو غور سے سنتے، یہاں پر بہت سی باتوں کو سیکھنے کا موقع ملا۔

مولانا نذر الحفیظ صاحب اور مولانا شمس الحق صاحب دونوں اپنے تئیں بڑی شخصیتیں تھیں، لیکن پھر بھی سوال کرنے کا انداز اور اسلوب، مجلس میں آپ دونوں کی نشست و برخواست عملی طور طلبہ کے لیے بہت مفید اور کارآمد ہوتی، ہمیں پتہ چلتا کہ سوال کرنے کا انداز کیا ہو؟ اسلوب کیسا ہو؟ اپنے بڑوں کے سامنے بیٹھنے کا طریقہ کیا ہو؟

اس کے بعد آخری سالوں میں ایک سال آپ کے پاس ''الادب العربی'' اور دوسرے سال ''فقہ السیرۃ'' پڑھنے کا موقع ملا، الادب العربی خود آپ کی تصنیف ہے، جب مصنف خود اپنی تصنیف پڑھاتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس نے کتنی محنت سے ایک بڑی بحث کو چھوٹے سے پیرایہ میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے، جہاں تک فقہ السیرۃ کا تعلق ہے تو اس درس میں سیرت کو ایک الگ اور نئے انداز سے پڑھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، سیرت میں غور و فکر کے نئے نئے زاویے سامنے آئے، یقیناً آپ کا یہ درس ہفتہ میں ایک یا دو دن ہوتا، لیکن اس درس سے کافی فائدہ ہوا اور فکر و نظر کے بہت سے پہلو سامنے آئے۔

جب سنہ ۲۰۱۰ء میں جمعیۃ الاصلاح کی نظامت کی ذمہ داری فدوی کے ناتواں کاندھوں پر آئی، اس وقت محسوس ہوا کہ آپ ندوہ کے ہر شعبہ کے متعلق کتنی معلومات رکھتے ہیں، اس سے پہلے تو یہی گمان ہوتا تھا کہ آپ ندوہ کے سب سے بڑے عہدے پر فائز ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اور بھی مصروفیات لگی ہوئی ہیں، دوسرے بڑے بڑے منصبوں کی ذمہ داری آپ پر عائد ہے، اس کی وجہ سے طلبہ کی انجمن ''الاصلاح'' اور اس کے شعبہ جات کی جانب اتنی توجہ نہیں ہوگی، کیونکہ اس کے لیے آفس سے مربی الاصلاح کے نام سے ایک استاذ متعین کیا جاتا ہے، جن کی نگرانی میں جمعیۃ الاصلاح اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔

لیکن حیرت ہوتی ہے اس بات سے کہ ایک مرتبہ کسی مناسبت سے آپ کے پاس جانا ہوا تو ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ''الاصلاح'' کے ایک ادنیٰ شعبہ ''دارالاخبار'' کے متعلق بھی ساری معلومات آپ کے پاس موجود ہیں اور آپ کو اس کے متعلق ساری واقفیت حاصل ہے، یہ دیکھ کر یقیناً کام کرنے کا حوصلہ اور بڑھا اور یہ محسوس ہوا کہ ہمارا کام حضرت ناظم صاحب کی نظر میں ہے۔

ندوہ سے فراغت کے بعد بھی خطوط کے ذریعہ آپ سے رابطہ رہا اور وقتاً فوقتاً آپ کو اپنے کاموں کی اطلاع کرتے رہے اور آپ سے رہنمائی طلب کرتے رہے، فدوی کے لیے بڑی سعادت کی بات ہے کہ آپ نے ہم جیسے خوردوں کو بھی دو تین بار خط کا جواب دینے کے لائق سمجھا۔ (اس معاملہ میں ہم اپنے استاذ محترم مولانا وثیق صاحب ندوی دامت برکاتہم کے بھی ممنون ہیں کہ آپ ہی کی عنایت سے یہ ممکن ہو پایا۔)

ان خطوط میں ہمیں مفید مشوروں سے بھی نوازا جس میں سے ایک مشورہ یہ بھی تھا کہ وقتاً فوقتاً چھوٹے چھوٹے پمفلٹ شائع کرتے رہیں، یہ کام بھی فائدے سے خالی نہیں، اسی پر عمل کرتے ہوئے ہم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر کچھ پمفلٹ بھی شائع کیے، جس میں ''ماہِ رمضان'' کے عنوان سے شائع کیے گئے، پمفلٹ کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

لیکن پھر جیسے جیسے مصروفیت بڑھتی گئی، اپنی کوتاہی کی بنیاد پر مراسلت میں کمی آتی گئی، لیکن پھر بھی آپ سے ایک قلبی لگاؤ تھا، آپ کو دیکھ کر یا آپ کو سن کر دل خوش ہوتا تھا، آپ کی موجودگی باعث تسکین تھی۔ لیکن جب آپ کی وفات کی خبر سنی تو پھر وہی ندوہ کے ابتدائی دن یاد آگئے، ہاتھ بار بار آپ کے وہ لمس کو یاد کر رہا ہے، بے ساختہ ہاتھ کبھی ناک کے پاس اٹھ جاتا ہے اور وہی خوشبو محسوس کرنے کو دل چاہتا ہے اور آپ کی وہ مجلسیں بار بار یاد آتی ہیں۔

بند کر دے کوئی ماضی کا دریچہ مجھ پر
اب اس آئینے میں صورت نہیں دیکھی جاتی

سچ بات یہی ہے کہ آپ کی یہ رحلت دلوں پر بڑی شاق ہے، آج اس پرآشوب دور میں حضرت مولانا ہم سب کا حوصلہ تھے، آپ کی موجودگی سے ہمت بندھی ہوئی تھی، آپ کی تقریریں دلوں میں

امید جگاتی تھیں، آپ کی باتیں مایوس کن ماحول میں امید کی راہ سجھاتی تھیں، زمانہ پر گہری نظر کے ساتھ اس سے متاثر ہوئے بغیر کیسے زندگی گزاری جائے یہ آپ کو دیکھ کر سیکھنے کو ملتا تھا۔

اس دور جذباتیت میں اپنے جذبات کو قابو کر کے کیسے اپنی بات پیش کی جائے یہ ہنر آپ میں دیکھنے کو ملتا تھا، کب' کہاں' کس وقت' کتنا بولنا ہے اور کہاں خاموشی اختیار کر اپنے کام میں مصروف رہنا ہے؟ یہ آپ کا وصف خاص تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ کی شخصیت مقبول خاص وعام تھی اور اس مصرعہ کا مصداق تھی کہ

رندوں کو تسلی تھی کہ میخانہ میں تم ہو

تقریر کا میدان ہو یا تصنیف کا، انتظامی امور کا میدان ہو یا کسی تنظیم کو لے کر چلنے کا، مسئلہ قیادت کا ہو یا رہنمائی کا، ہر میدان میں آپ کی شخصیت کے متنوع رنگ ہمیں دیکھنے کو ملتے ہیں۔

آپ کی حیات مستعار پر نظر ڈالتے ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی اور آپ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، ایک ایسا خلا جس کا پر ہونا ناممکن ہے اور ہم جیسوں کو جن کا مکمل تعلیمی سفر آپ کے دور نظامت میں گزرا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آج ہم اپنے کنبہ کے سرپرست اور ذمہ دار سے محروم ہو گئے۔

حضرت کی وفات سے خاص طور پر ندوی برادری اور عام طور پر پورا علمی حلقہ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ پورا عالم اسلام تعزیت کا مستحق ہے۔ اللہ حضرت مولانا کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ کے گھر والوں' تلامذہ اور متوسلین ومحبین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

نماز کی اہمیت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''اللہ تعالیٰ نے نماز میں بڑی خصوصیات رکھی ہیں، اگر ان کو اس کے ساتھ ادا کیا جائے تو نماز سے آدمی کو بہت فیض اور قوت حاصل ہوتی ہے، کیونکہ نماز مومن کی معراج قرار دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے دو اہم چیزیں بیان کی گئی ہیں، ایک نماز اور دوسرے زکوٰۃ جن سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو نماز کا عمل بہت محبوب ہے اور اس کی فرضیت بھی آسمان کے اوپر معراج میں ہوئی، اس کے ذریعہ بڑا روحانی عروج حاصل ہوتا ہے اور بندہ اللہ کے قریب ہوتا ہے، اس عبادت کی ادائیگی کے لیے جو انداز عمل اور جو قلبی احساس کی تعلیم دی گئی ہے، اس کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے، اس کے ہونے پر زمینی خوبی سے انسان آسمانی خوبی میں پہنچ جاتا ہے۔ نماز کی عبادت کا عمل بھی ہمہ وقت نہیں رکھا گیا، تاکہ بندہ کے لیے یہ عمل آسان رہے، ۲۴ر گھنٹے میں صرف پانچ بار، نصف یا ربع (چوتھائی) گھنٹے میں نماز کا عمل پورا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن اخلاص کے ساتھ عنداللہ قبولیت رکھتا ہے، جس کا ذکر صحابہ کی تعریف میں بھی کیا گیا ہے۔ اسلام کے دین حق میں مقبولیت عنداللہ کے لیے عبادت کے پانچ عمل بتائے گئے ہیں: نماز، زکوۃ، روزہ، حج، اس میں سوائے نماز کے ہر عمل حسب استطاعت فرض کیا گیا ہے، لیکن نماز کے متعلق جسم انسانی میں روح رہنے تک اس پر عمل کی تعلیم دی گئی ہے۔''

(شعائر اللہ کی عظمت: ۶۶-۶۷)

ایک عہد کا خاتمہ

جناب عبدالماجد نظامی
(گروپ ایڈیٹر روزنامہ راشٹریہ سہارا)

بیسویں صدی کے بالکل آخری دن یعنی 31 دسمبر 1999ء کو جب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا انتقال ہوا تھا تو اس وقت مسلم دنیا میں غم اور سوگ کا ماحول چھا گیا تھا اور یہ گمان کیا جارہا تھا کہ شاید ان کا بدل مل پانا ممکن نہیں ہوگا۔ اس گمان میں گرچہ پوری سچائی اور حقیقت پسندی پائی جاتی تھی اور یقیناً مولانا علی میاںؒ کا نعم البدل آج تک اس ملک کو نہیں مل سکا ہے، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ اتنی ہمہ جہت شخصیت صدی میں پیدا ہوتی ہے، جنہیں دینی و دنیوی علوم پر یکساں دسترس حاصل ہو اور جن کی ایمانی غیرت وحمیت اس قدر بلند ہو کہ دنیا کے شہنشاہوں کے سامنے بھی اپنی ایمانی جرأت کا اظہار کرنے سے ایک لمحہ کے لیے نہ ہچکچاتے ہوں، جن کی مومنانہ فراست کا عالم یہ ہو کہ وہ حالات کے رُخ کو پرکھنے اور اس کی روشنی میں مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنے کا ہنر رکھتے ہوں، جیسا کہ مولانا علی میاںؒ نے اپنی زندگی میں کیا اور اپنی قوم کے لوگوں اور اس ملک کے عوام کو جن خطرات سے آگاہ کیا تھا، وہ آج حقیقت بن کر مسلمانان ہند کے ہوش اڑا رہے ہیں، کیونکہ ان کی پیش گوئیوں پر توجہ نہیں دی گئی تھی، البتہ مولانا علی میاںؒ نے اپنی زندگی میں اس مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا خاص التزام فرمایا تھا کہ مسلم نوجوانوں کی ایک ایسی نسل تیار کردی جائے جو ان کی عدم موجودگی میں ملک وملت کی رہنمائی کا فریضہ بخوبی انجام دے سکے۔

حضرت مولانا رابع حسنی ندویؒ ایسے نوجوانوں کے سرخیل کے طور پر ابھرے اور چونکہ ان کی دینی، فکری اور علمی وادبی تربیت ان کے باکمال ماموں جان حکیم عبدالعلیؒ اور مولانا علی میاںؒ کی رہنمائی میں تکمیل پائی تھی، اس لیے ان میں وہی ولی اللّٰہی دینی جوش، فکری صلابت اور علمی بلندی پائی جاتی تھی، جو ان کے خاندان کا تمغہ امتیاز بن چکا ہے۔ مولانا رابع حسنی ندویؒ نے ندوہ جیسے عالمی اسلامی ادارہ کی قیادت کی ذمہ داری ایسے وقت میں سنبھالی تھی جب صرف ملکی سطح پر ہی نہیں بلکہ عالمی پیمانہ پر اسلام اور مسلمانوں کو کٹہرہ میں کھڑا کیا جارہا تھا اور امریکہ پر نائن الیون حملہ کی وجہ سے اسلاموفوبیا کا جو طوفان مغرب کی اسلام دشمنی کے نتیجہ میں اٹھ چکا تھا، اس کی زد میں اسلامی مدارس کو خاص طور سے نشانہ بنایا گیا تھا۔ خود ہندوستان میں تشدد پسند ہندوتوا کی سیاست حکومت واقتدار پر قابض تھی اور مدارس اسلامیہ ہند پر بے جا طور پر یہ الزام عائد کیا جاتا تھا کہ یہ مدارس دہشت گردی کے اڈے ہیں اور انہیں بند ہونا چاہیے۔ ایسے مشکل ترین تاریخی مرحلہ میں مولانا نے مدارس اسلامیہ سے وابستہ افراد اور تنظیموں میں یہ حوصلہ پیدا کیا کہ وہ جرأت مندی کے ساتھ اس منفی پروپیگنڈہ کا نہ صرف مقابلہ کریں، بلکہ پوری قوت کے ساتھ یہ پیغام سماج اور معاشرہ میں پھیلائیں کہ اسلام پر دہشت گردی کا الزام صرف نام نہاد تنگ نظر مغربی مفکرین اور ان کے حاشیہ بردار ہندوستانی دانشوروں کی ذہن کی اُپج ہے، جو اسلام سے ناواقفیت بلکہ دانستہ عداوت پر مبنی ہے۔

مولانا نے اس مقصد کی خاطر عملی کوشش یہ کی کہ مدارس اسلامیہ پر عوام کا اعتماد بحال کیا جائے اور خود علماء کے اندر یہ شعور بیدار کیا جائے کہ وہ پروپیگنڈوں سے متاثر ہوکر مدارس سے وابستگی میں خوف وعار محسوس نہ کریں، بلکہ پہلے سے زیادہ قوت اور خوداعتمادی کے ساتھ مدارس کی اہمیت وافادیت کو ملک میں ثابت کریں، اس کے لیے خود ندوۃ العلماء میں بڑے پیمانہ پر توسیع کا کام کیا گیا، طلبا کے لیے نئے ہاسٹلوں کی تعمیر عمل میں آئی، ندوہ کی شاندار مسجد کی توسیع ہوئی اور ندوہ

سے ملحق اداروں اور مدارس میں بھی اس کام کو خوب ترقی ملی۔ اس انتھک کوشش اور بے لچک قیادت کا اثر یہ ہوا کہ اسلاموفوبیا کا سیلاب ہندوستانی مدارس کو بہا نہ سکا، بلکہ پہلے سے زیادہ بڑی تعداد میں ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے جگر گوشوں کو چمکتی دمکتی ماڈرن کلاسوں کے بجائے مدارس کی سادہ بوریوں پر بیٹھنے اور اسلام سے اپنا گہرا علمی و فکری ربط پیدا کرنے کے لیے بھیجنا شروع کر دیا۔

اس کے علاوہ دوسرا چیلنج ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے یہ تھا کہ ان کے پرسنل لا کو کیسے مضبوط قیادت فراہم کرائی جائے؟ مولانا رابع صاحب سے قبل مولانا مجاہدالاسلام قاسمی بورڈ کی صدارت فرما رہے تھے، جو اپنی فقہی بصیرت میں امتیازی شان رکھتے تھے، اس حساس عہدہ کے لیے بھی جب ایسی شخصیت کی تلاش شروع ہوئی جو تمام پہلوؤں سے اس کی کمر توڑ ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی اہل ہو تو متفقہ طور پر تمام ممبران کی نظر مولانا رابع حسنی ندویؒ پر ہی جم گئی اور ان کی شخصیت سے ایسا لگاؤ اور اعتماد محسوس کیا گیا کہ اتفاق رائے سے 2002ء کے حیدرآباد اجلاس میں آپ کو پرسنل لا بورڈ کا صدر منتخب کر لیا۔ اس میں ان کی علمی بلندی، فکری پختگی اور دینی غیرت کے علاوہ امت کے مسائل کے تئیں ان کی مسلسل بے چینی اور ان کا حل تلاش کرنے کی لگن جیسے اوصاف شامل تھے۔ ندوہ کی نظامت کے ساتھ ساتھ پرسنل لا بورڈ کی قیادت بھی آپ نے عمر کے آخری لمحہ تک فرمائی، گرچہ پرسنل لا بورڈ کو بابری مسجد تنازع پر سپریم کورٹ کے فیصلہ اور طلاق ثلاثہ معاملوں پر تنقیدوں کا سامنا بھی کرنا پڑا، لیکن حالات پر گہرائی سے نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ ایسے مشکل دور میں اس سے بہتر قیادت کی امید نہیں کی جاسکتی تھی، جس میں مولانا کی دل پذیر شخصیت کو بڑا دخل تھا۔

اس کے علاوہ آپ نے آکسفورڈ سے لے کر ہندوستان کے بے شمار تصنیفی و تحقیقی اداروں کی رہنمائی اور سرپرستی فرمائی اور انہیں وقت کے تقاضوں کو پورا کرنے والے لٹریچر کی فراہمی کی طرف راغب کیا جس میں وہ پورے طور پر کامیاب ہوئے، خود ان کا اپنا سیال قلم اس روانی سے چلتا رہا کہ حیرت ہوتی ہے کہ اتنی مشغولیات کے باوجود کوئی شخص اتنی وقیع تصنیفات اتنی بڑی تعداد میں کیسے لکھ سکتا ہے، لیکن چونکہ انہوں نے اپنی پوری زندگی نظم وضبط کے ساتھ گزاری تھی اور علم وادب سے اپنا گہرا رشتہ قائم کیا تھا، اس لیے علمی مقالات وتصنیفات منظر عام پر لانا ان کی طبیعت کا خاصہ بن چکا تھا۔

وہ ایک کامیاب مصنف وادیب اور صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب معلم تھے، جنہوں نے اپنے طلباء کی ایک بڑی کھیپ تیار کردی ہے، جو ان کے بعد بھی ان کے کاموں کو آگے بڑھاتے رہیں گے اور اسلام کے چراغ کو ہر آندھی میں بجھنے سے بچانے کا فریضہ انجام دیتے رہیں گے۔ ان کی کتابیں جو جغرافیہ عرب، عربی ادب وتاریخ، سیرت وسوانح اور قرآن وسنت تمام موضوعات پر موجود ہیں، آئندہ نسلوں کی رہنمائی کا کام انجام دیں گی۔ لیکن اس کے باوجود ہندوستان کے مسلمان اور ان کے ادارے مولانا رابع حسنی ندویؒ کی موت سے پیدا ہونے والے خلا کو ہمیشہ محسوس کریں گے۔ اب یہ ذمہ داری ان کے بعد کی نسل کی ہے کہ وہ ان کے کام بحسن وخوبی انجام دے اور ندوہ و پرسنل لا بورڈ کی قیادت کے لیے ایسی شخصیتوں کا انتخاب کرے جو اس مشکل دور میں امت کو صحیح سمت میں لے جانے کی اہلیت رکھتی ہوں، ان کی موت سے ایک شاندار عہد کا خاتمہ ضرور ہوا ہے، لیکن یہ امت بانجھ نہیں ہے اور اس کی پوری امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ پاک ان کا نعم البدل امت اسلامیہ ہند کو فراہم کرے گا۔

تعلیم کا مقصد

”تعلیم کا مقصد انسان سازی ہے، انسان سازی کا مطلب وہ انسان بنانا ہے جو اپنے مستند معتقدات، معتبر اخلاق اور پختہ دین وایمان کا حامل ہو، نہ کہ ہر چمکتی چیز کا دل دادہ اور دوسروں کی کسی بھی برتری کے سامنے مبہوت ہو کر اپنی ہر خصوصیت کا منکر ہو جائے۔“ (مسلمان اور تعلیم: ۶۰)

جانشینِ مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

مجمع الکمالات

مولانا محمد عاصم ندوی
(شیخ الحدیث مدرسہ ابی بکر الاسلامیہ ماندلے- برما)

اسلامی وعربی ادب کے واقف کار اور اسلامی صحافت سے مناسبت رکھنے والے نیز انتظامی امور کے دیدہ ور کے لیے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی شخصیت پوشیدہ نہیں ہوسکتی۔اسی طرح یہ کیسے ممکن ہے کہ جو شخص علوم مرتبت اور صلاح وتقویٰ سے مناسبت رکھتا ہواور اس کی نگاہوں سے ہمارے حضرت کی شخصیت اوجھل ہو؟

یقیناً حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت عزت ورفعت کے اس مقام بلند پر فائز نظر آتی ہے جو محتاج تعارف نہیں۔

مولانا نے ایک ایسی زندگی کو ترجیح دی جو تجارت وسیاست کے شور سے دور، سادگی، کسر نفسی اور کم مائیگی سے عبارت تھی، آپ کی شخصیت ہمارے اور نسل نو کے دلوں میں ہمیشہ زندہ وجاوید رہے گی اور آپ کے نقوش دلوں پر ثبت رہیں گے اور آپ کی شخصیت کا عکس جمیل علمی وثقافتی مجالس اور دروس ومحاضرات میں ہمیشہ غالب رہے گا۔

بلا شک وشبہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے علوم وفنون کی عظیم شاہ راہوں کو طے کیا، چنانچہ آپ کی شخصیت اسلامی عربی ادب میں مرجع کی حیثیت رکھتی تھی، جس کی گواہی علامۃ العصر شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد یونس جونپوریؒ نے ان الفاظ میں دی ہے کہ ”آپ صحیح معنی میں ادیب ہیں، اس میدان میں آپ کی نظیر نہیں۔“

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ تفسیر وحدیث میں بھی ایک خاص مقام رکھتے تھے، جس کے شاہد عدل رمضان المبارک میں آپ کے دروس ہیں، اسی کے ساتھ ساتھ آپ فکر اسلامی کے ایسے علمبردار ہیں گویا فکر اسلامی ہی آپ کا وصف امتیازی ہو، چنانچہ فکر بوالحسن کی آپ نے حقیقی ترجمانی کی، آپ سیرت وتاریخ کے خوشہ چیں بھی ہیں، جس کی واضح مثالیں آپ کی تحریروں وکتابوں میں نمایاں طور پر دیکھی جاسکتی ہیں اور علم جغرافیہ میں آپ مصدر ومنبع تھے، جیسا کہ آپ کی شاہ کار اردو تصنیف ”جزیرۃ العرب تاریخ ثقافت اور جغرافیہ“ میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔

آپ کی حیات وخدمات کے ذیل میں آپ کی اعلیٰ نسبی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، جب کہ محدث کبیر حضرت جونپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے ان کے خاندان کے بارے میں فرمایا تھا کہ ”آپ کے خاندان کی اہل بیت کی طرف نسبت میں مجھے ادنی شک نہیں ہے، کیونکہ حکم مصطفیٰ ﷺ سے مجھے اطمینان قلب حاصل ہوا کہ ”اذهب إلى ابنى لقد صعب عليه البحث“ چنانچہ کیسے ہم ان لوگوں کی تطہیر نہ کریں جن کی تطہیر اللہ رب العالمین نے قرآن مجید میں خود فرمائی ہے: ﴿إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيُذْهِبَ عَنكُمُ الرِّجْسَ﴾ اور کیسے ہم آپ پر خامہ فرسائی نہ کریں جب کہ آپ کی تعظیم وتقدیر اور نقوش حیات کو اجاگر کرنا ہم پر لازم ہے؟ اور کیسے ہم ان سے محبت نہ کریں جن کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت حاصل تھی؟ اور کس طرح آپ کے عظیم احسانات کو فراموش کردیں؟ اس عظیم شخصیت کے کمالات کا جتنا تذکرہ کریں کم ہے، کیونکہ آپ فضل وکمال میں ایک بحر زخار ہیں۔

ذیل میں آپ کی مثالی زندگی کے چند ایمان افروز گوشوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے:

پاک طینت جوانی:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ پر خدا کا فضل خاص تھا، آپ خدا

کی حفظ وامان میں تھے، چنانچہ آپ فریب داماں اور جوانی کی امنگوں اور میلانات کے دام سے محفوظ رہے، کیونکہ آپ کی نشو ونما ایک ایسے دینی خانوادہ میں ہوئی جس کا شعار پاکیزگی اور جس کا مطمح نظر راہ حق میں جاں نثاری تھا، آپ کی اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ جوانی کی لغزشوں اور اس کے دام فریب میں نہ آئے، آپ نے ایک پاک طینت، شفاف، بامقصد، بے داغ اور پروقار مثالی زندگی گزاری۔

حصول علم کی سعی:

ہم نے بارہا حضرت مولانا کے بارے میں سنا اور دیکھا کہ آپ کا محبوب ترین مشغلہ حصول علم تھا، آپ کے شب وروز کتابوں کی ورق گردانی، مطالعہ ومذاکرہ، تصنیف وتالیف اور تحقیق میں نیز فکر اسلامی کے استنباط میں گزرتے تھے، ہمیشہ آپ کو کسی کتاب کے مطالعہ میں منہمک یا کسی صالح کی صحبت میں یا طلبہ کے ساتھ مذاکرہ کرتے ہوئے دیکھا گیا۔

آپ کا تبحر علمی:

علوم وفنون میں کسی ایک علم اور کسی ایک فن کے ممتاز افراد لاتعداد ہیں، لیکن حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کا یہ امتیاز تھا کہ آپ علوم وفنون کا گنج گراں مایہ تھے، ایک طرف عربی ادب میں تفوق حاصل تھا جس کی گواہی محدث کبیرؒ نے خود دی ہے، تو قرآن کریم کی تفسیر کا خاص ذوق بھی حاصل تھا اور حدیث نبوی کی معرفت بھی حاصل تھی، اسی طرح سیرت نبوی سے گہری واقفیت بھی تھی، جو آپ کی سیرت کی کتاب میں نمایاں ہے۔

رہا تعلق آپ کی صحافت کا تو اس فن میں آپ امامت کے منصب پر فائز تھے، صحافت کے دقیقہ شناس اور نکتہ سنج تھے، مزید فکر اسلامی کے ہمہ جہت پہلو میں بھی ممتاز تھے، آپ نے اپنی پوری زندگی دعوت دین کے لیے وقف کردی، آپ کی دعوت کو انفرادی، اجتماعی، سماجی، سیاسی، عمومی اور پیام انسانیت کے نام سے غیر مسلموں میں دعوت کے خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، چنانچہ آپ کی زندگی کا ہر لمحہ دعوت دین سے عبارت تھا۔

حمیت:

اسلامی حمیت اور غیرت وہ شعلہ فروزاں ہے جس کو حاصل ہوجائے گویا اس کو فضل الٰہی حاصل ہوگیا، حضرت مولانا محرمات ومنہیات کے سلسلہ میں باحمیت تھے اور حدود شرع کی پامالی پر سخت نالاں بھی ہوتے تھے۔

آپ ناموس رسالت کے سچے محافظ اور جاں نثار تھے، آپ کی غیرت ایمانی کو اس وقت جوش آجاتا جب ناموس رسالت کی پامالی کی کوشش کی جاتی، چنانچہ آپ اپنی زبان وقلم کے ذریعہ اور پرسنل لا بورڈ کے ذریعہ پوری قوت سے حرمت نبویؐ کے دفاع کا فریضہ انجام دیتے۔

زہد:

لایعنی امور سے آپ بہت دور تھے، چنانچہ دنیا کی رونق اور اس کی چمک آپ کو متاثر نہ کرسکی، آپ نے زہد وقناعت کو ترجیح دی اور آخرت کو اپنا مطمح نظر بنایا، تجارت وصنعت سے کوئی واسطہ نہ رکھا، نہ ہی علم سے روگردانی کی۔ آپ زہد وانابت، خلوت پسندی اور دنیا سے بے رغبتی اور دنیاداروں سے لاتعلقی میں بہترین نمونہ تھے، آپ اہل علم، صالحین اور متقین سے تعلق رکھتے تھے۔

شیخ و مرشد:

مولانا کی زندگی کا اگر جائزہ لیں تو یہ بات آشکارا ہوجاتی ہے کہ آپ نے رہنمائی، دعوت وتبلیغ اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ کو خوب انجام دیا، تربیت اور نصائح، افراد سازی میں تو اپنی مثال آپ تھے۔

اختتامیہ:

آپ کی شخصیت ایک دبستان فکر تھی اور اپنی ذات میں ایک انجمن تھی، آپ ان اوصاف وکمالات کا مجموعہ تھے جو پوری جماعت یا ادارہ کے لیے کافی ہوتے ہیں، آپ ان اشعار کا حقیقی مصداق ہیں:

أرى كل ذى جود إليك مصيره

فإنك بحر والملوك جداول

ترجمانی: مولوی سعد عبدالرقیب ندوی

آتی ہی رہے گی تیرے انفاس کی خوشبو

مفتی محمد جابر بن عمر پالن پوری مظاہری
(استاد جامعہ قاسمیہ عربیہ بھروچ- گجرات)

راقم الحروف مدرسہ مظاہر علوم (جدید) میں ۱۴۲۴ھ تا ۱۴۲۷ھ میں طالب علم تھا، اسی اثناء میں (حتمی طور پر یاد نہیں کہ کس سال) مرشد امت، جانشین مفکر اسلام کی مظاہر علوم (جدید) میں تشریف آوری ہوئی تھی، آپ کا تعارف بس اتنا تھا کہ آپ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم اور مفکر اسلام حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ہم شیر زاد اور معتمد ہیں، اس سے زیادہ تعارف نہیں تھا، اس زمانہ میں راقم مولائی ومرشدی حضرت شیخ محمد یونس صاحب جون پوری نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں رہتا تھا، اس مشغولی کی وجہ سے حضرت مولاناؒ سے اس وقت زیارت وملاقات نہ ہوسکی، اس کا احقر کو بڑا قلق وافسوس ہوا تھا۔

ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے...

ہمارے جامعہ میں آمد:

تقریباً ۲۰۰۹ء میں ہمارے جامعہ قاسمیہ عربیہ کھروڈ میں عین عصر کی جماعت کے وقت مرشد امت جانشین مفکر اسلام کا ورودِ مسعود ہوا تھا، نماز کے بعد ہمارے جامعہ کے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد حنیف صاحب لوہاروی اور سابق مہتمم حضرت مولانا ابراہیم صاحب مظاہری نے حضرت سے دعا کرانے کی درخواست کی تو حضرت نے مختصراً دعا کرائی۔ یہ تھی راقم کی سرسری طور پر پہلی زیارت وملاقات، آپؒ سفید سادہ لباس میں ملبوس تھے، صدری پہن رکھی تھی، جو بظاہر قدرے لمبی تھی، آپ جب مسجد کے صحن میں چل رہے تھے تو ایک قابل دید منظر تھا، آپ کے ہاتھ میں عصا تھا، لیکن اسے زمین پر ٹیک نہیں رہے تھے، دونوں جانب سے آپ کو جامعہ کے شیخ الحدیث اور مہتمم صاحب سہارا دے رہے تھے، لیکن آپ کو سہارے کی ضرورت نہیں تھی، یہ صرف آپ کی خدمت کا شرف حاصل کرنے کے لیے کیا جارہا ہوگا۔ آپ کے چہرے پر معصومیت، نور کی بارش، ہونٹوں پر مسکراہٹ، آنکھوں میں ایمان کی چمک اور پیشانی سے عفت کی روشنی ابلتی ہوئی نظر آرہی تھی، ان چند لمحوں کی زیارت نے آپ کے آستانے پر حاضری کا مشتاق بنادیا۔

حضرتؒ سے تعلق:

مولائی ومرشدی حضرت شیخ محمد یونس صاحب نور اللہ مرقدہ کی وفات کے بعد کاتب تقدیر نے محض اپنے فضل وکرم سے ملک کی برگزیدہ عبقری شخصیات سے استفادہ کا موقع عنایت فرمایا، ان میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظم، مفکر اسلامؒ کے سچے جانشین، قطب زمان، سید السادات، مرشد امت، ملتِ اسلامیہ کے عظیم قائد ورہبر، مصدرِ فیوض وافادات، جامع البرکات حضرت اقدس سید محمد رابع حسنی نور اللہ مرقدہ بھی تھے، حضرتؒ کی خدمت میں حاضری اور تین چار مرتبہ فون پر گفتگو ہوئی، حضرتؒ سے تعلق مضبوط کرانے میں حضرت مولانا محمود حسن حسنی صاحبؒ کا اہم کردار رہا ہے، ایک مرتبہ مولاناؒ نے راقم سے کہا کہ حضرت سے فون پر بات کیجیے، تو تھوڑی دیر کے لیے مجھ پر سکتہ سا طاری ہوگیا، کہاں میں اور کہاں مرشد امت؟! خیر ہمت کر کے حضرتؒ سے فون پر بات کی، ایسا لگ رہا تھا کہ راقم نے حضرتؒ کے در پر سالہا سال گزار کر اپنا تعلق قائم کیا ہوگا، لیکن ایسا نہیں تھا، یہ پہلا موقع تھا، حضرتؒ کے پیار بھرے اور شفقت بھرے الفاظ سے راقم کے قلب میں حضرتؒ کی ایسی محبت جاگزیں ہوگئی کہ اسے تحریر میں پیش کرنے سے بندہ عاجز ہے، ایسی ہی پیار بھری

ادائیں چھوٹوں کو بڑا بناتی ہیں اور بڑے تو بڑے ہی ہوتے ہیں۔

اس گفتگو میں راقم نے حضرتؒ سے عرض کیا کہ حضرت! خصوصی توجہ کا محتاج ہوں۔ فرمایا: میں بھی توجہ کا محتاج ہوں۔ احقر نے دل میں کہا: میرے حضرت! آپ نے تو اس لفظ سے تواضع کی حدود پار کرلیں۔ پھر آپ نے فرمایا: ''دعا فرمائیں کہ آج کل جو حالات کی خرابی ہے اللہ تعالیٰ انہیں درست فرمائے۔'' (لاک ڈاؤن کے زمانہ میں جن حالات سے لوگ دوچار تھے ان کی طرف اشارہ تھا۔)

امت کی فکر میں بے چین:

حضرت کی صحبت پانے والوں، تحریر پڑھنے والوں اور تقریر سننے والوں نے اس بات کا اندازہ لگایا ہوگا کہ آپ کی امت مسلمہ کی بہتری کے لیے کیا کیا فکریں تھیں؟ آپ کبھی تو امت محمدیہ کی پستی وزوال کے علاج وتدبیر کی فکریں فرماتے، تو کبھی امت محمدیہ میں بڑھتی ہوئی بے دینی کو دیکھ کر متفکر نظر آتے، اسی طرح مسلمانوں کے آپسی انتشار کا ذکر فرماتے، تو دوسری طرف مدارس اور مختلف دینی شعبوں کی تنزلی آپ کو بڑھاپے میں چین سے رہنے نہ دیتی۔

سال رواں ۱۴۴۴ھ میں حکومت کی طرف سے مدارس کا سروے ہورہا تھا، اس مدت میں راقم کا حضرتؒ کی خدمت میں جانا ہوا تھا، تو حضرت کو دیکھا کہ اپنے خاص معتمد جناب مولانا اسماعیل بھولا صاحب بمبوی (پالن پوری) کے سامنے اظہار افسوس کرتے ہوئے سوال کیا: حکومت یہ سروے کیوں کروا رہی ہے؟ ان کے کیا مقاصد ہیں؟ اسی طرح کے سوال کرتے رہے اور مولانا اسماعیل صاحب جواب دیتے رہے۔ اسی طرح وقف بورڈ کے چیئرمین صاحب حضرت کی خدمت میں آئے تو ان کے سامنے بھی اسی طرح کا تبادلہ خیال حضرت نے فرمایا۔

لکھنے والے اس طرح کے واقعات تو بہت لکھیں گے، یہ تو صرف اس بات کو بتانے کے لیے کہ آپ اپنی پیرانہ سالی میں بھی امت کے لیے گھل رہے تھے، یہ ایک نبوی وصف تھا جو حضرت والا میں بدرجہ اتم پایا جاتا تھا۔

شفقتیں و عنایتیں:

دوسری مرتبہ فون پر بات کرنے کی سعادت اس وقت حاصل ہوئی جب احقر کی بیٹی آمنہ کا ''بسم اللہ'' کروانا تھا، مولانا محمود حسنی صاحبؒ نے دوبارہ بات کروا کر اس عاجز پر احسان فرمایا، اس وقت حضرت نے خیر خیریت کے بعد فرمایا: بچی کہاں ہے؟ میں نے عرض کیا: حضرت! قریب ہی بیٹھی ہوئی ہے، تو حضرت نے فرمایا: بیٹا! پڑھو: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، احقر نے فون کا اسپیکر آن رکھا تھا، جس کی آواز بچی کے ساتھ اہل خانہ بھی سن رہے تھے، بچی شرما رہی تھی، حضرت نے دوبارہ پڑھایا، پھر حروفِ تہجی کے کچھ حروف پڑھائے، اس کے بعد دعا کروائی، تقریباً سات منٹ یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح کی سعادت نہ معلوم مجھ جیسے کتنے لوگوں کو نصیب ہوئی ہوگی، صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں، راقم کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی، تو دوسری طرف آنکھوں سے مسلسل آنسو جاری تھے، دِل دِل میں حضرت کے لیے دعا کررہا تھا کہ یا اللہ! حضرت کے سایہ عاطفت کو ہم پر باقی رکھ، تاکہ اس طرح کی شفقتیں وعنایات ہم خردوں اور امت مسلمہ پر ہمیشہ باقی رہیں۔

یہ سب یادیں ہیں جو ستارہی تھیں، انہیں قلم بند کرکے تسکین کر رہا ہوں، ۲۱؍رجب المرجب ۱۴۴۲ھ کو دو دن کے لیے ندوۃ العلماء لکھنؤ حضرتؒ کی خدمت بابرکت میں استفادہ کے لیے حاضری ہو رہی تھی، اس وقت کی خوشی کو نہ پوچھئے، اس لیے کہ راقم اپنے اہل خانہ اور ملنے جلنے والوں سے یہ کہہ کر سفر کررہا تھا کہ میں وقت کے ایک بہت بڑے ولی اور آلِ رسول ﷺ کے ایک فرد کی خدمت میں جارہا ہوں، وہاں پہنچ کر بھی یہ خیال بار بار آتا گیا اور زیارت کرتا گیا کہ ہمارے حضرت ہمارے نبی پاک ﷺ کے خاندان سے ہیں، بس اس تصور سے جو خوشی ہوتی تھی وہ ناقابل بیان ہے۔

یہ سفر احقر کے لیے ندوہ کا پہلا سفر تھا، اس کے بعد پھر دو سفر ہوئے، آخری ملاقات ۱۴؍اکتوبر ۲۰۲۲ء کو ہوئی، پہلے سفر کے موقع پر راقم کے محسن، بزرگوں کے عزیز حضرت مولانا محمود حسن حسنی ندوی

صاحبؒ نے احقر کا اس طرح تعارف کراتے ہوئے ملاقات کرائی کہ حضرت! یہ مولانا جابر ہیں گجرات سے، جنھوں نے مولانا شیخ محمد یونس صاحبؒ کے ملفوظات جمع کیے ہیں، بس حضرت شیخ کی نسبت سے حضرت نے احقر پر لطف وکرم اور شفقتوں کا معاملہ فرمایا اور اپنے قریب سے قریب تر فرمایا۔

اخلاقِ کریمانہ:

حضرت کی خدمت میں بہت کچھ سیکھنے کو ملا، ایک بات جس کا ہر مرتبہ مشاہدہ کیا کہ آپ کسی کی موجودگی میں اپنے پیر پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے، آپ کے چہرے سے صاف نظر آرہا تھا کہ آپ شرم وحیا کے پیکر ہیں، ربِّ کریم نے آپ کو اَن گنت اوصافِ جمیلہ سے متصف فرمایا تھا، ان میں شرم وحیا نمایاں وصف تھا، راقم نے حضرت کے خادمِ خاص بھائی مصباح سے کہا کہ مجھے کچھ رقم حضرت کی خدمت میں دینی ہے تو کب دوں؟ بھائی مصباح نے کہا کہ جب حضرت تنہا ہوں تب دینا، معاً بھائی مصباح نے یہ بات بھی فرمائی کہ اپنے قریبی ترین لوگوں سے بھی سب کے سامنے ہدیہ قبول کرنے میں حضرت کو حیا ہوتی ہے۔

دوسری چیز اس سفر میں جو دیکھی وہ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی اور ذرہ نوازی۔ احقر نے حضرت سے اجازتِ حدیث کے لیے درخواست کی تو حضرت نے فرمایا: آپ حدیث مسلسل بالاولیت پڑھیے، احقر نے پڑھی، حضرت نے زبانی بھی اجازت دی اور تحریری بھی، پھر صبح واپسی کی ملاقات کے لیے گیا تو فرمایا: میرے پاس صحاح ستہ کی بھی سند ہے، احقر سے فرمایا کہ آپ سب کتابوں میں سے ایک ایک حدیث پڑھ لیجیے، احقر نے بخاری شریف کی پہلی حدیث پڑھی، دیگر کتب کی احادیث مستحضر نہیں تھیں، حضرت نے تحریری طور پر اجازتِ حدیث شریف لکھ کر عنایت فرمائی، اسی مجلس میں ایک اور صاحب تھے، انہوں نے بھی اجازتِ حدیث شریف کی درخواست کی، حضرت نے فرمایا: سب کے لیے نہیں، بس حدیث پڑھانے والوں کے لیے۔ احقر کا یہ واقعہ حضرت کی دور بینی پر محمول کروں یا کرامت پر؟ اجازتِ حدیث کے واقعے سے پہلے احقر کے ذمہ حدیث شریف کی کوئی کتاب نہیں تھی، اس کے بعد جب مدرسہ کھلا تو احقر کے نام دو کتابیں آئیں: (۱) مؤطا محمد (۲) ریاض الصالحین۔

اس سے ملا جلا ایک اور قصہ پیش آیا کہ چلتے وقت حضرت نے اپنے دست بابرکت سے ایک قیمتی قلم عنایت فرمایا، سفر سے واپسی کے بعد حضرت کو بخیر رسی کا خط ارسال کیا، جو اسی قلم سے لکھا، پھر احقر کا حال یہ ہوگیا کہ جب تک دِن میں ایک خط نہ لکھوں چین نہیں آتا تھا، حضرت پر بھی گاہے گاہے خط لکھتا رہا، حضرت کی طرف سے بعض خطوط کے جوابات بھی موصول ہوتے رہے، جو عام طور پر کمپوز کروا کر اپنے لیٹر پیڈ پر بھیجتے، ان جوابی خطوط میں سے ایک خط حضرت نے اپنے دست بابرکت سے لکھا تھا، جو ایک صفحہ پر مشتمل تھا، احقر کے لیے یہ ایک یادگار ہے، اس خط کے بارے میں مولانا محمود حسنی صاحب نے فرمایا تھا: ارے! اس کو کم مت سمجھنا اور بطورِ مزاح فرمایا یہ لائق ہے کہ گلے میں لٹکا دو۔ یہ خط ۲؍ذوالقعدہ ۱۴۴۲ھ کا ہے۔

شاید یہ تحریر پڑھنے میں قارئین کو کلفت ہو رہی ہوگی، لیکن حضرت کی شفقتیں اور عنایات اتنی ہیں کہ بس لکھتا ہی جارہا ہوں، تینوں مرتبہ کی حاضری میں حضرت نے مختلف مادی ہدایا سے بھی نوازا تھا۔

ملفوظات:

اب کچھ ان باتوں کا بھی تذکرہ کرلوں جو حضرت سے سنی ہیں، راقم نے ایک مرتبہ عرض کیا: حضرت! توجہ فرمالیجیے، فرمایا:

”جیسی محبت ہوگی ویسی توجہ ہوگی۔“

مولائی ومرشدی حضرت شیخ محمد یونس صاحب کے مکاتیب کے مسودے پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کی تو کچھ دیر مطالعہ فرمانے کے بعد فرمایا:

”مولانا یونس صاحب بڑے تھے۔“ پھر فرمایا:

”بڑے بڑے لوگ چلے جارہے ہیں، ان کی جگہیں پُر ہونا بظاہر مشکل معلوم ہورہا ہے، ایسا لگتا ہے کہ آخری دور چل رہا ہے۔“

ایک موقع پر فرمایا: (جب احقر کے ساتھ ہمارے دوست

جناب مولانا صادق صاحب ابن الحاج صوفی معین الدین پٹھیڑوی سہارن پوری تھے)

''ہم لوگ بھی رائے پور حضرت رائے پوری کی خدمت میں بہ کثرت جایا کرتے تھے، اسی طرح سہارن پور حضرت شیخ زکریا صاحب کی خدمت میں بھی، ان کے یہاں بہت اچھا لگتا تھا، فائدہ ہوتا تھا۔''

ایک موقع پر فرمایا:

''آپ کام کرتے رہیے، اللہ تعالیٰ آپ سے کام لے گا۔''

اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو اس وقت یاد نہیں آرہی ہیں، جو ذہن کے دریچے میں تھیں، انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کردیا۔

اصلاح کا نرالا انداز:

حضرت انتہائی باکمال، بافیض، پختہ علم، عالم باعمل، اہم کتابوں کے مصنف، عظیم داعی اور رہبر تھے، تو دوسری طرف تصوف وسلوک کے امام بھی تھے، آپ کے ہاتھ پر ہزاروں لوگوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کروائی، آپ کی اصلاح وتربیت کا انداز بھی بڑا نرالا تھا، آپ نے ایک صاحب کے نام جوابی خط لکھا تھا، اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے، طالب نے کچھ اس طرح اپنے خط میں لکھا تھا کہ

''احقر آپ کے فیض بابرکت سے مستفید ہونا چاہتا ہے اور آپ کی صحبت میں رہ کر تعلق مع اللہ چاہتا ہے، الحمدللہ بطورِ تحدیث بالنعمۃ کے بیان کرتا ہوں کہ احقر پر موجودہ کچھ اکابر نے اعتماد فرمایا ہے۔''

اس خط کا جواب ملاحظہ فرمائیں اور حضرت کی فراست پر سر دُھنیں، خط یہ ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی ومحترمی.....

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

امید ہے کہ بعافیت وصحت ہوں گے۔

آپ کا یاددہانی کا خط ملا اور ملاقات کی بھی آپ نے زحمت کی، میری کوتاہی پر آپ کو جو کوفت ہوئی مجھے افسوس ہے، لیکن ایک ماہ سے علالت کے جن اثرات میں رہا ہوں ان کے پیش نظر آپ میری کوتاہی کو نظر انداز کردیں گے۔

آپ نے اپنے عنایت نامے میں اپنے معمولات اور روحانی تعلقات کا ذکر کیا ہے، اس لیے اپنے تجربات کے لحاظ سے مجھے جلدی نہیں کرنی تھی، میرے ناقص تجربات میں ایسے معاملات میں کچھ دیر کی جاتی ہے، تاکہ ملاقاتی تجربات سے گزرنا ہوجائے، بیعت کے سلسلے میں دو مرحلے ہوتے ہیں: پہلا مرحلہ بیعت کا ہے، یعنی اپنا ہاتھ کسی کے ہاتھ میں دینے کا، پھر ترقی وصلاحِ دینی دیکھ کر اجازت دینے کا، دوسرے مرحلے میں جلدی نہیں ہوتی، عموماً پہلا مرحلہ عرصے تک چلتا ہے۔

آپ نے اپنے معمولات اور متعدد شیوخ عظام کا اعتماد حاصل ہونے کا جو تجربہ ذکر کیا ہے، اس کے تحت مجھے اپنی کم بضاعتی کا احساس ہوا، مذکورہ لوگوں میں میں بہت کم بضاعت ہوں، بیعت کا معاملہ لینے اور دینے کا ہوتا ہے، دینے والے کا حال جب لینے والے سے زیادہ نہ ہو تو اس کو احتیاط لازم ہے۔ بہرحال مجھے ذرا غور کرنے اور اپنی کم بضاعتی کو بھی سامنے رکھنا ہے، اس میں میری کوتاہی اور دیری کو برا نہ سمجھیں، آپ متعدد بزرگوں سے استفادہ کو سامنے رکھتے ہوئے میری کوتاہی کو کوتاہی نہ مانیں، شکرگزار ہوں گا۔ والسلام!

دعا گو

محمد رابع حسنی ندوی

ناظم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ''

زبان خلق کو نقارۂ خدا سمجھو:

ہمارے جامعہ میں ندوۃ العلماء کے فاضل جناب مولانا یونس صاحب پٹنی ندوی (رنوج) سے احقر نے درخواست کی کہ آپ اپنے دورِ طالب علمی کے کچھ تاثرات حضرت کے باب میں پیش کریں، تو ان ہی کی تحریر قارئین کی نذر ہے:

''حضرت اقدس مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کی حیاتِ طیبہ کا جو حصہ طالب علمانہ دور میں دیکھا ہے، وہ یہ ہے کہ مرحوم

کی زندگی کا سب سے زیادہ ممتاز اور نمایاں پہلو یہ تھا کہ آپ متحمل مزاج ہونے کے ساتھ ساتھ خاموش طبیعت سے آراستہ تھے، میں نے حضرت والا کو ﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ ☆ اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ﴾ (لقمان:۱۹) پر ہمیشہ عمل پیرا پایا ہے۔ آپ اپنی پیدل چال میں ﴿وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا﴾ (الفرقان:۶۳) اور ﴿وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ (الفرقان:۷۲) کے پیکر تھے۔

اسی طرح آپسی معاملات میں ہم نے آپ کے برادرِ صغیر مرحوم حضرت مولانا واضح رشید ندوی صاحب اور خود حضرت کے دونوں بھائیوں کی زندگی میں ندوہ کی طالب علمانہ زندگی میں لوگوں کے زبان زد جو چیز مشہور تھی وہ یہ کہ دونوں بھائی جب پڑھانے کے لیے ندوہ آیا کرتے تھے تو رکشہ والے سے کرایے کے سلسلے میں اگر چونی یا اٹھنی کا بھی بقایا ہوتا تو آپس میں ایک دوسرے سے لے کر ادا کر دیا کرتے تھے۔

ٹھیک اسی طرح حضرت کی تدریسی زندگی کا حال جو میں نے بذات خود دیکھا ہے وہ یہ کہ کتاب مسمی ''الادب العربی'' کی گھنٹی حضرت والا کے ذمے تھی، درس کے متعلق آپ والا پابند وقت تھے، مقررہ وقت پر گھنٹی بجتے ہی حضرت ''کلیۃ اللغۃ العربیۃ'' کے تحتانی ہال میں اپنے گھما گھمی امور کو بالائے طاق رکھ کر درس دینے کے لیے حاضر ہو جایا کرتے تھے، آپ والا کے خاندان کا مخاطب کو موہ لینا اور سچی اور صداقت بھری تڑپ پیدا کر دینے کا جو خاص نرالا اور انوکھا انداز ہے وہ بخوبی ہم نے آپ کے درس میں بھی پایا تھا، خاموش مسکراہٹ کے ساتھ جچے تلے الفاظ کے پیرایہ میں حضرت والا ''الادب العربی'' کے عویصات کو آسان اور سہل طریقے پر سلجھاتے ہوئے ادبائے عرب کی ہلکی سی تاریخی زندگی کی جھلک دکھلاتے ہوئے اپنے ایک گھنٹے کے درسی سفر کو تقریباً چار سو (۴۰۰) طلبہ کے سامنے اس طرح طے فرماتے گویا ابھی تو ہمارا درسی سفر شروع ہی ہوا تھا اور اگلے دن کے انتظار میں بے تاب و بے قرار چھوڑ کر روانہ ہو جاتے۔

کتابی علم تقسیم کر کے جاتے جاتے بھی اپنے ہاتھ میں بستہ (پاکیٹ) لے کر زبانِ حال سے عملی زندگی کا یہ پیغام بھی دے کر جاتے کہ اپنا معمولی سے معمولی کام بھی بذاتِ خود انجام دینا، اسی میں آپ کی بھلائی ہے۔ آپ صرف عربی اسلامی ادب کے استاذ ہی نہیں بلکہ تعلیم و تربیت کے باب میں ایک ماہر اتالیق بھی تھے۔''

مبشرات:

اللہ تعالیٰ کے مقبول بندوں کے آثارِ قبولیت میں سے کچھ اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی من جانب اللہ دِکھا دیے جاتے ہیں، حضرتؒ کی وفات کے بعد تدفین سے قبل احقر نے ایک خواب دیکھا جس کی تعبیر شیخ الزمان' برکۃ العصر حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب الٰہ آبادی دامت برکاتہم العالیہ سے احقر نے دریافت کی تھی، حضرت نے اس کی ایسی تسلی بخش اور خوش کن تعبیر فرمائی کہ حضرتؒ کی وفات کے صدمہ میں احقر نے تخفیف محسوس کی، وہ خواب اور اس کی تعبیر قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں:

''۲۲ر رمضان المبارک کی صبح بعد فجر سویا تو ایک خواب دیکھا' اٹھ کر جتنا یاد رہا اس کو قلم بند کر رہا ہوں:

خواب یہ ہے کہ حضرت (پیر طریقت حضرت اقدس مولانا محمد قمر الزماں صاحب دامت برکاتہم العالیہ) اور حضرت مولانا (مرشد امت حضرت اقدس مولانا محمد رابع حسنی صاحبؒ) دونوں اکابر کے ساتھ احقر ہے اور دونوں اکابر کی خدمت کا شرف مل رہا ہے، خاص طور سے چلنے میں سہارا دینے کا، کسی ایک جگہ کی طرف جا رہے ہیں جو بہت ہی بلندی پر واقع ہے اور یہ اوپر چڑھنا لفٹ کے ذریعے ہوا، اتنی بلندی پر پہنچے کہ چاند چوڑائی میں بالکل قریب سے لٹکتا ہوا نظر آ رہا ہے (ماشاء اللہ) اور چاند کی چوڑائی کی جانب سے چاند کے کچھ حصے ہیں، جس جگہ یہ سب دیکھ رہے تھے بڑی خوب صورت تھی۔ (ماشاءاللہ)

بس یہ تھا خواب' ملاحظہ ہو کہ حضرت مولانا کی ابھی تک تدفین عمل میں نہیں آئی تھی، اس کی کیا تعبیر ہو سکتی ہے؟

(ماشاءاللہ خواب نہایت مبارک ہے، ان شاءاللہ ہم سب کا سفر آخرت میں ایسا ہی ساتھ رہے گا، مبارک ہو یہ خواب ہم سب کے لیے)

دوسرا خواب وفات کے پانچ چھ دن بعد دیکھا کہ مفکر اسلام حضرت اقدس مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب، حضرت مرشد امت رحمہما اللہ اور دیگر حضرات ہیں، مختلف مقامات پر جارہے ہیں، دونوں اکابر ایک ہی ساتھ نظر آرہے ہیں، خواب لمبا تھا، اکثر حصے میں مختلف مقامات پر جاتے ہوئے دیکھا۔

ملاحظہ ہو کہ دنیا میں دونوں حضرات ہمیشہ ساتھ رہے اور دونوں کا مشن بھی ایک ہی رہا، اللہ تعالیٰ کی ذات سے قوی اُمید ہے کہ آخرت میں بھی دونوں اعلیٰ مقام پر ساتھ ہوں گے۔

مضمون طویل ہوتا جارہا ہے، حضرت اقدس مرشد امت گونا گوں صفات کے مالک تھے، آپ اس دور کے بابرکت و بافیض متبع سنت بزرگ، ملت اسلامیہ کی دھڑکن، ہزاروں شاگردوں و مریدوں کے استاذ و مربی اور مرجع الخلائق تھے۔ آپ کے دنیا سے چلے جانے سے بڑا خلا ہوگیا، اللہ تعالیٰ حضرت والاؒ کی کامل مغفرت فرما کر اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

اب میں اپنے مضمون کو حضرتؒ کے ان الوداعی الفاظ پر ختم کرتا ہوں جو احقر کو حضرت کے یہاں سے رخصت ہونے کے وقت کہے گئے تھے: ”آپ نے بڑی تکلیف اٹھا کر سفر کیا۔ معذوری کی وجہ سے میں آپ کی خدمت نہیں کرسکا۔ مجھے دعا میں یاد کرتے رہیے۔“

آتی ہی رہے گی تیرے اَنفاس کی خوشبو
گلشن تیری یادوں کا مہکتا ہی رہے گا

بیعت کسے کہتے ہیں؟

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

”بیعت حقیقت میں توبہ ہے کہ کسی شخص کے مشورہ اور دین سے واقف کے سامنے جو اس کا مجاز ہو توبہ کرنا، جس کے سامنے یہ عمل کیا جاتا ہے وہ اس کا گواہ بن جاتا ہے، توبہ اللہ کا بڑا انعام اور تحفہ ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا بسائی ہے انسانوں کا امتحان لینے کے لیے کہ اللہ کو مانتے ہیں، یا کسی دوسرے کو مانتے ہیں، مسئلہ یہ آجاتا ہے کہ جی کچھ چاہ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی اور چاہت کچھ اور ہے، اب آدمی کیا فیصلہ کرتا ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ تمہارے سامنے ایسا مسئلہ آجاتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اپنے دلوں کی مانو گے یا اللہ کی مانو گے؟ مگر مزا اور لطف دل چاہنے میں ہوتا ہے، اس لیے انسان وہاں پھسل جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ دیا، زندگی دی، طاقت دی، دولت دی، عزت دی اور سب کچھ دیا، وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اللہ کا احسان وانعام مانتے ہو کہ نہیں؟ اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں کہ ہم اللہ کی عبادت کریں، اس کے لیے بڑی مخلوق ہے، فرشتے ہیں اور دوسری سب مخلوقات ہیں، مگر انسان اور جنات کو اختیار دیا گیا، جن وانس کے لیے یہ مواقع بہت آتے ہیں کہ دل کچھ چاہ رہا ہے اور اللہ کی مرضی کچھ اور ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے دونوں کا مقصد حیات صاف صاف بتادیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ اور اللہ کی مرضی اور چاہت کے خلاف کرنے کی صورت میں مؤاخذہ اور سزا کی بات بھی صاف فرمادی: ﴿مَن يَعْمَلْ سُوءاً يُجْزَ بِهِ﴾ کہ برائی کی سزا دی جائے گی، مگر اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے توبہ رکھی ہے کہ بندہ معافی مانگ لے اور اعتراف قصور کرلے کہ غلطی ہوگئی، اس پر اللہ معاف کردیتا ہے۔ توبہ کے اس عمل کو تھوڑا اہتمام کرکے کیے جانے کی ضرورت ہے کہ دوسرے کو گواہ بنا کر کی جائے، اس کا اثر پڑتا ہے، جس کے ہاتھ پر یا جس کے کہلاتے ہوئے الفاظ پر اس کے سامنے یہ عمل کیا جاتا ہے اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر اس عمل کو انجام دے، اس کو اطلاع کی جاتی ہے، اس میں وہ صورت پیدا ہوجاتی ہے کہ اس کو گواہ بنایا اور اپنی نئی ایمانی زندگی گذارنے کے لیے جو عہد کیا اس میں اس کو اپنا امیر بنایا، اس سے لحاظ اور حیثیت کی ایک کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور دل میں اہمیت پیدا ہوتی ہے۔“ (تحفہ گجرات: ۲۵۸-۲۵۹)

ایک یادگار ملاقات

مولانا محمد صادق مظاہری
(جامعہ ضیاء العلوم خانقاہ پٹھیڑ-سہارنپور)

۱۴؍مارچ ۲۰۲۳ء کو بندۂ عاصی حضرت اقدس نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قبیل مغرب پہنچا، پہنچتے ہی ندوہ کے مہمان خانے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ مغرب کی نماز کا وقت ہو چکا ہے، تو مہمان خانے ہی میں حضرت اقدسؒ کی معیت میں نماز مغرب ادا کرنے کا شرف حاصل ہوا۔

بعد نماز حضرت والاؒ سے ملاقات ہوئی، حضرتؒ نے بہت شفقت فرمائی، ملاقات کا انداز عجیب، جیسے مدتوں سے بچھڑا شخص مل رہا ہو، حضرتؒ نے احقر کے لیے اسٹول منگوایا، اس پر بیٹھنے کا حکم فرمایا، خیر خیریت اور گھر کے احوال معلوم کیے، اخلاق تو حضرتؒ کے عالی تھے ہی، بوقت ملاقات ایسا معلوم ہوتا تھا گویا کہ ایک حقیقی باپ اپنے بیٹے سے مل رہا ہو۔

بہر حال کچھ دیر بیٹھنے کے بعد کچھ اور لوگ بھی ملاقات کے لیے آگئے، کیوں کہ ایک روز قبل شوریٰ کا اجلاس تھا، اس لیے مہمان ٹھہرے ہوئے تھے، ان میں کچھ دیگر ممالک سے بھی تعلق رکھتے تھے، ان سب سے حضرتؒ نے بات چیت کی اور حال احوال دریافت کیے، یہ مجلس کافی دیر تک قائم رہی۔

حاضرین میں سے کسی کے سوال کے جواب میں کہ پہلا حج کب کیا؟ فرمایا کہ ۱۹۵۰ء میں پہلا حج کیا تھا اور یہ حج پانی کے جہاز سے کیا تھا، چودہ دِنوں میں ہمارا قافلہ جدہ پہنچا اور پھر مکہ، یہ اونٹوں کا زمانہ تھا، حجاج کرام اونٹوں کے ذریعہ سفر کیا کرتے تھے لیکن موٹریں بھی چلنے لگی تھیں، مکہ سے مدینہ لوگ اونٹوں پر جاتے تھے لیکن ہم تو موٹر سے گئے تھے اور دو دِن لگے تھے۔

فرمایا: اس وقت مطاف میں بھی کنکریاں بچھی ہوئی تھیں۔

کچھ اور باتیں بھی ہوئیں جو سمجھ میں نہ آسکیں، پھر ان لوگوں کو واپس جانا تھا، مجلس برخواست ہوگئی اور سب حضرات چلے گئے، میں بھی اپنے کمرہ میں چلا گیا، عشاء کے وقت پھر آیا، پتہ چلا کہ حضرتؒ نے اول وقت میں نماز پڑھ لی، مسجد میں نماز تیار تھی، میں نے عشاء کی نماز مسجد ہی میں ادا کی، بعدہ حضرتؒ کے حجرہ میں گیا تو بھائی مصباح نے مجھ سے کہا کہ حضرت کے ساتھ کھانا کھالو، میں نے کہا: حضرت سے الگ ہی کھالوں گا؛ لیکن انھوں نے حضرتؒ کے سامنے ذکر کر دیا کہ بھائی صادق کو بلالوں؟ حضرتؒ نے بشاشت سے فرمایا کہ ہاں بلالو، میرے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ حضرت کے ساتھ کھانا کھایا۔

بعدہ حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے، کچھ دیر ان حضرات کی ملاقات رہی، پھر کوئی حدیث کی کتاب پڑھی گئی، جس میں طلبہ واساتذہ نے شرکت کی، یہ کتاب آج پوری بھی ہونے والی تھی، تو اس کے ختم پر حضرتؒ نے دعا کرائی پھر کچھ باتیں بیان فرمائیں۔

کچھ دیر بعد حضرتؒ نے فرمایا: جاؤ سو جاؤ، تو سب حضرات چلے گئے، احقر نے خدمت عالیہ میں تین ملفوف ہدیے پیش کیے، ایک والد صاحب کی طرف سے، دوسرا مفتی جابر صاحب پالن پوری کی جانب سے اور تیسرا اپنی طرف سے، حضرت نے فرمایا: ان کو صبح میں دیکھوں گا۔ کمرہ کی لائٹ دھیمی کر دی گئی اور سب حضرات باہر آگئے، احقر بھی اپنے مستقر پر لوٹ گیا۔

صبح ہوئی، حضرت کا معمول تقریباً دس بجے ناشتہ کرنے کا تھا،

احقر بھی اسی وقت پہنچا تو دیکھا کہ حضرت کو دوسری طرف لے جانے والے ہیں، وہیل چیئر کھڑی ہے، کچھ دیر میں حضرت کو بٹھا کر دوسری طرف لے گئے، بھائی مصباح نے مجھ سے کہا: تم بھی ساتھ ہی آجاؤ، میں بھی ساتھ ساتھ ہولیا، حضرت کو پلنگ پر بٹھا دیا اور وہیں کچھ دیر میں ناشتہ لگا دیا گیا اور مجھے بھی حضرت کے ساتھ ناشتہ کرنے کا شرف حاصل ہوا اور مولانا اسماعیل صاحب (بھولا بمبوی پالن پوری) جو حضرت کے مجاز بھی ہیں، وہ بھی موجود تھے، ہم تینوں نے ٹیبل پر اکٹھا ناشتہ کیا۔

ناشتے کے بعد میں نے عرض کیا کہ حضرت! اب مجھے کچھ دیر میں جانا بھی ہے، تو کچھ باتیں ارشاد فرمائیں:

حضرت والاؒ نے فرمایا کہ

''میں نے حضرت مدنی، حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری اور حضرت شیخ زکریا رحمہم اللہ ان تینوں بزرگوں کو اکٹھے باتیں کرتے دیکھا ہے۔ حضرت مدنی کے یہاں گول دسترخوان ہوتا، چند لوگ اکٹھے بیٹھ جاتے تھے اور کھاتے تھے، تاکہ سب فیضیاب ہوں۔ حضرت شیخ کے یہاں جس کی جو جگہ ہوتی وہ وہیں بیٹھتا تھا اور حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کے یہاں سادہ کھانا اور سادہ دسترخوان ہوتا جن کو جہاں جگہ ملے بیٹھ کر کھاؤ، پتلا سا سالن ہوتا تھا۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحبؒ کی خاص بات یہ تھی کہ آپ خاموش رہتے تھے، مجلس میں بھی خاموشی ہوتی، مگر ذاکرین جب ذکر اللہ کیا کرتے تھے تو بستی ذکر کی آواز سے گونجا کرتی تھی۔ پھر فرمایا کہ میرے ماموں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ مجھے تہجد کے وقت حضرت کے حجرہ میں لے گئے اور فرمایا کہ حضرت! اس کو بیعت فرما لیں تو حضرت رائے پوریؒ نے فرمایا:

''بیعت تو کرلوں گا مگر دیکھ رکھ تم کرتے رہنا۔''

حضرت مدنی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ حضرت کے پاس لوگ سفارشیں لے کر آتے تھے، ایک ہندو آیا، حضرت مدنی زینے سے اُتر رہے تھے، اس نے حضرت کو ایک پرچہ دیا جس کو حضرت پڑھنے لگے اور وہ ہندو ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا، حضرت نے اس کی طرف دیکھا تو زور سے اس کو ہاتھ مارا اور فرمایا: میرے سامنے ہاتھ جوڑتے ہو؟ چھوڑ وان کو۔

بہر حال پھر کچھ باتیں روح سے متعلق بیان فرمائیں، فرمایا کہ روح کا تعلق انسانی جسم سے کرنٹ کی طرح ہے، جس طرح تار میں کرنٹ آئے تو بلب جلے گا، ایسے ہی روح کا معاملہ ہے۔ یہاں بہت ساری باتیں میں بھول گیا۔

کچھ دیر بعد میں نے چلنے کا تقاضا کیا، تو حضرت نے بھائی مصباح سے فرمایا: ''ان کو ایک رومال دے دو، کیوں کہ احقر نے خود ہی تبرک کے طور پر کسی چیز کا مطالبہ کیا تھا، جس پر حضرت والاؒ نے رومال کے متعلق فرمایا، بھائی مصباح رومال لے کر آئے جس کو حضرت نے اپنے مبارک ہاتھوں سے احقر کو اُڑھایا اور دعائیں دیں، اس کے بعد میں بیٹھ گیا، تو حضرت نے اپنی جیب سے پانچ سو روپیے نکال کر احقر کو مرحمت فرمائے اور بہت ساری دعائیں دے کر احقر کو اجازت دی اور دو کتابیں ''رہبر انسانیت'' جو حضرت کی تصنیف ہے عنایت فرمائیں اور ایک کتاب پر اپنے دستخط کر کے فرمایا کہ اس پر تم اپنا نام لکھ لینا۔ اخیر میں حضرت نے احقر کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں کیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے اور فرمایا کہ آپ نے بڑا طویل سفر کیا، ہم سے کچھ خدمت نہ ہو سکی، برا نہ ماننا۔

اس دوران احقر جب حضرت کے پاس بیٹھا تھا، ایک عجیب بات دیکھنے کو ملی، وہ یہ کہ بھائی مصباح اپنے ہاتھ میں ایک چھوٹا بیگ لے کر آئے اور کہنے لگے کہ دفتر والوں نے آپ کا آدھار کارڈ اور پین کارڈ منگوایا ہے، اس بیگ میں ہے یا کہیں اور رکھا ہے؟ تو حضرت نے فرمایا: اسی میں ہوگا اور کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر فرمایا: آدھار کارڈ کیا ہوتا ہے؟ پھر کچھ دیر کے بعد فرمایا: آدھار کے کیا معنی ہیں؟ مجھے یہ سن کر بڑا تعجب ہوا کہ یہ عجیب بات حضرت معلوم فرما رہے ہیں، لیکن پھر احساس ہوا کہ کتابوں میں بعض اکابر کے حالات میں لکھا ہے کہ ان حضرات کو اپنا خود کا نام بھی بتانا پڑتا تھا، گویا کہ اللہ

تعالیٰ کی یاد میں اس درجہ مستغرق رہتے تھے، یہی منظر آنکھوں سے دیکھنے کو ملا اور واقعۃً بات بھی یہی ہے کہ حضرت کو عجیب کیفیت کے ساتھ بار بار دیکھا کہ خاموش بیٹھے ہیں، کوئی سوال کرتا اس کا معقول جواب دیتے، ورنہ پھر خاموش ہو جاتے۔

اس کے بعد احقر واپس آ گیا، لیکن یہ باتیں بار بار ذہن میں گردش کرتی ہیں، خصوصاً اخیر کے جملے جن میں حضرت نے چلتے وقت اپنی عاجزی کا اظہار فرمایا تھا۔

الحمدللہ چند بار حضرت کی خدمت میں غلامانہ حاضری کا شرف ملا، جس کا یہ اثر ہوا کہ دل میں حضرت کی عقیدت و محبت اس درجہ پیوست ہوگئی کہ ایک بار ملاقات کر کے واپس آتا، اگلی بار ملاقات کا داعیہ پیدا ہو کر دِل بے قرار ہو جاتا، اس کیفیت میں بالآخر ایک ایسا اندوہ ناک دِن بھی آ پہنچا جس نے قلب کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا۔

۲۱؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ کی دوپہر کو اچانک واٹس ایپ پر نظر پڑی تو حضرت کی رحلت کی خبر دیکھنے کو ملی، احقر کی حالت متغیر ہو گئی، ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ زمین باوجود اپنی وسعت کے تنگ ہوگئی، ہمت جواب دے چکی تھی، آنکھوں سے آنسوؤں کا چشمہ پھوٹ پڑا، بے قراری کا یہ عالم تھا کہ کبھی اندر کبھی باہر آ جا رہا تھا، آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے، جنازے میں شرکت کے لیے بہت سی کوششیں کیں لیکن سب ناکام رہیں، نہ ٹرین تھی، نہ فلائٹ، آخر کار آخری دیدار کی جو تمنا تھی وہ ناکام ہوگئی جس کا قلق پوری زندگی رہے گا۔

آج بھی جب حضرت کی باتیں اور ملاقاتیں یاد آتی ہیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اور حالت خراب ہو جاتی ہے اور یہ تمام باتیں احقر بلا مبالغہ لکھ رہا ہے، آخر پھر جب یہ بات دل میں آتی ہے کہ موت تو بہر حال آ کر ہی رہتی ہے، یہ تو ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی مفر نہیں، تو کچھ سکون حاصل ہو جاتا ہے، بار بار اب تک یہی حالت ہوتی رہتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب متعلقین و پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور حضرت کے درجات کو بلند فرمائے، قبر کو منور فرمائے، ہماری طرف سے حضرت کو بہترین بدلہ عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین

عقیدہ و مذہب کی اہمیت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

”یہ ملک جس میں ہم رہ رہے ہیں، سیکولر دستور و نظام کا ملک ہے، جس کی رو سے ہر مذہب کے پیروکار کو اپنے عقیدہ و مذہب کے احکام کے مطابق عمل کرنے کی آزادی دی گئی ہے اور عقیدہ و مذہب‘ ہر مذہب کے ماننے والے کے لیے زندگی کی بنیادی ضرورت کا مقام رکھتا ہے، اس کی حیثیت انسان کی اخلاقی و انسانی زندگی کے لیے ایسی ہی ہے جیسی انسانی جسم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی ہوتی ہے، اگر ریڑھ کی ہڈی میں خرابی پیدا ہو جائے تو جسم کی حرکت و عمل مفلوج ہو سکتا ہے، تو اگر مسلمانوں کے دین و عقیدہ پر کوئی آنچ آتی ہے تو اس سے مسلمانوں کی اسلامی خصوصیت ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا مسلمان کو مسلمان رہنے کے لیے اس بات کی پوری فکر کرنا ہوتی ہے کہ اس کے دین و عقیدہ کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور اس کو اپنے دین و عقیدہ پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے، ہندوستانی دستور بھی اس کی پوری اجازت دیتا ہے، کیونکہ ہندوستان مختلف و متنوع مذہب کا مالک ہے، یہاں دین و عقیدہ کے لحاظ سے مختلف فرقوں کے اپنے اپنے طریقے اور اصول ہیں۔“ (خطباتِ رابع: ۳۳-۳۴)

علم وفن کی آبرو

ڈاکٹر قطب الدین ندوی
(جواہر لال نہرو یونیورسٹی- دہلی)

جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ جنہیں ہم اب تک بڑی محبت وعقیدت کے ساتھ ''دامت برکاتہم العالیہ'' کہہ کر یاد کرتے تھے، بڑے ہی افسوس کی بات ہے کہ اب ہمیں ان کے لیے ''رحمۃ اللہ علیہ'' کہنا پڑ رہا ہے، اس کیفیت کو وہ شخص زیادہ سمجھ سکتا ہے جس کو حضرت مولاناؒ سے فدائیت ومحبت کا تعلق ہو، مگر موت بہر حال ایک حقیقت ہے جس کو ہمیں قبول کرنا ہوگا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ راقم الحروف کو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی شاگردی اختیار کرنے کا شرف حاصل ہے اور الحمد للہ جب تک ندوہ میں قیام رہا تب تک ان سے مسلسل استفادہ کرنے کا موقع ملتا رہا، بالخصوص مجھے آپ سے عربی ادب پڑھنے کی سعادت حاصل ہے۔

حضرت مولاناؒ نے اپنی پوری زندگی پڑھنے پڑھانے ہی میں وقف کردی اور یہ حقیقت ہے کہ اگر ان کے سامنے یہ مبارک مشغلہ نہ ہوتا تو دنیا ان کے قدموں کے نیچے ہوتی۔ نہ صرف ملک ہندوستان بلکہ عرب ممالک میں بھی انہیں بہت سارے ایسے مواقع ملے، جہاں رہ کر وہ مادی منفعت بہت زیادہ حاصل کر سکتے تھے، لیکن ان سب کو انہوں نے ترک کیا اور ندوۃ العلماء میں رہنا پسند فرمایا، انہوں نے یہاں کے طلبہ کی تعلیم وتربیت پر بھرپور توجہ دی اور ندوہ کے ماحول کو دینی، اسلامی وتعلیمی بنانے کی کامیاب کوششیں کیں۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے، وہ ایک ماہر استاد ومربی تھے اور اسی کے ساتھ بہترین مصنف بھی تھے، حضرت مولاناؒ کی تصنیفات کو اگر غور سے دیکھیں اور ان کا مطالعہ کریں تو بہت ہی واضح طور پر یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ جس اسلامی ادب کی ہم بات کرتے ہیں، وہ حضرت مولاناؒ کی تمام تصنیفات میں بدرجہ اتم موجود ہے، اسلامی ادب کی جو تعریف ممکن ہے، حضرت مولاناؒ کی تمام تصنیفات اس کی سچی تصویر ہیں۔

اہل علم وفن کے لیے حضرت مولاناؒ کا سب سے نادر تحفہ جغرافیہ کے موضوع پر ان کی شہرۂ آفاق تصنیف ''جزیرۃ العرب'' ہے، میں سمجھتا ہوں کہ حضرت مولاناؒ نے یہ کتاب اس وقت تصنیف فرمائی جب ہندوستانی مدارس میں جغرافیہ نام کی کوئی چیز پڑھائی ہی نہیں جاتی تھی، لیکن آپ نے اس فن کی ضرورت محسوس کی اور یہ سمجھا کہ قرآن مجید، دینی کتابوں اور دین اسلام کو اس وقت تک نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ طالبان علوم نبوت جزیرۃ العرب کے جغرافیہ کو نہ سمجھیں اور وہاں کی چیزوں سے واقف نہ ہوں، اسی کے مدنظر آپ نے یہ معرکۃ الآراء کتاب تصنیف کی۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جغرافیہ پر قلم اٹھانا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں، یہ کام وہی کرسکتا ہے جو بجائے خود فن جغرافیہ کا ماہر ترین شخص ہو۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے اخلاقی پہلو کی اگر بات کی جائے تو سب جانتے ہیں کہ آپ اخلاق حسنہ کے پیکر تھے، آپ کی شخصیت میں انتہا درجہ کی تواضع تھی، کم سخن وکم گو تھے، لیکن جب بھی گفتگو فرماتے تو کام اور عقل مندی کی بات کہتے، ان کو دیکھ کر حقیقی معنی میں اسلاف کی یاد تازہ ہوجاتی تھی، واقعہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک اچھے انسان کی جو صفات بیان کی ہیں، وہ تمام صفات ان کے اندر پائی جاتی تھیں۔

مثل خورشید سحر فکر کی تابانی میں

ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن ندوی
(اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ-نئی دہلی)

دنیا میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جنھیں تاریخ بناتی ہے اور کچھ ایسی شخصیتیں ہوتی ہیں جن سے تاریخ بنتی ہے، ان عہد ساز شخصیتوں میں استاذ الاساتذہ، ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء، صدر مسلم پرسنل لا بورڈ، رابطہ ادب اسلامی کے صدر، درجنوں کتابوں کے مصنف، عربی زبان کے مایۂ ناز ادیب وصحافی، پندرہ روزہ عربی رسالہ ''الرائد'' کے بانی، بہترین ماہر تعلیم، مشفق ومثالی استاذ ومربی، ادب اسلامی کے سفیر، عظیم مفکر نیز اعلیٰ اخلاق اور دوسری بڑی خوبیوں کے مالک ہونے کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت ہے جن سے ایک زمانہ متاثر ہے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ایک عظیم ادیب واسکالر، بڑے مصلح، اچھے منتظم، منفرد اور مشفق استاذ ومربی، امت اسلامیہ ہندیہ کے قائد اور ایک عظیم مفکر کے ساتھ ساتھ عالمی سطح کے عظیم عالم کے ساتھ معروف شخصیت کے مالک تھے۔ آپ کی وفات کے بعد ہندوستان کا ہر ہوش مند اور جس کا بھی دین اور ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے کچھ بھی تعلق ہے وہ مغموم ہے اور مولانا کی وفات کو اپنا ذاتی غم شمار کررہا ہے اور اس وقت ایسا محسوس ہورہا ہے کہ ملت اسلامیہ ہندیہ اپنے سرپرست کی سرپرستی سے محروم ہوگئی ہے اور ہر ایک مغموم ہے اور ہر کوئی مولانا کی وفات کو ایک عظیم سانحہ شمار کررہا ہے۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں میرا داخلہ ۱۹۹۵ء میں درجہ پنجم معہد میں ہوا تھا، میں نے اپنے والد علیہ الرحمہ سے حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت، ان کے علمی مرتبہ اور دینی صفات کے بارے میں بہت ساری باتیں سن رکھی تھیں، لیکن ندوہ میں آنے کے بعد حضرت مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سب سے زیادہ جس شخصیت کا نام سنا وہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کی شخصیت تھی، مولانا اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم تھے۔

ندوہ کی روایت کے مطابق تعلیمی سال کے آغاز میں مسجد میں سینئر اساتذہ کے پند ونصائح میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کو بھی پہلی بار سننے اور دیکھنے کا موقع ملا، میں اس وقت معہد کے پرائمری درجہ کا طالب علم تھا، اس وقت میری سمجھ کتنی رہی ہوگی، لیکن مولانا رحمہ اللہ کے خطاب کو غور سے سنا اور صرف یہ سمجھ سکا کہ ایک طالب علم کا فرض منصبی یہ ہے کہ وہ علم کو محنت اور لگن کے ساتھ حاصل کرے اور یہی اس کی کامیابی کی کنجی ہے، یہ پہلا موقع تھا جب مولانا کو میں نے پہلی بار دیکھا تھا، بہت خوش بھی تھا اور الحمد اللہ اس کے بعد بار بار دیکھنے کا موقع ملا اور جب عالیہ رابعہ میں پہنچا تو ہمیں آپ سے آپ کی مشہور کتاب ''الادب العربی بین عرض ونقد'' کو پڑھنے کا موقع بھی ملا۔ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ کے پڑھانے کا انداز اتنا اچھا اور اسلوب اتنا جاذب ہوا کرتا تھا کہ طلبہ ان کی کلاس کا شدت سے انتظار کیا کرتے تھے اور جس دن کلاس ہوتی عالیہ رابعہ کے تمام سیکشنز کے طلبہ جلدی سے مسجد میں جمع ہوجاتے اور آپ کا درس سنتے، آپ نیا درس شروع کرنے سے پہلے پچھلے درس کو مختصر اور جامع انداز میں بیان کرکے نیا درس شروع کرتے تھے، تاکہ طلبہ پورے طور پر موضوع سے جڑے رہیں اور پورے موضوع کو اچھی طرح سے سمجھ سکیں، آپ ہر ایک چیز کی

وضاحت فرماتے اور طلبہ کے معیار کا پورا خیال رکھتے تھے، جس کی وجہ سے ہم طلبہ آپ کے درس کو آسانی سے سمجھ جاتے تھے اور ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی۔ مولانا کی یہ سب سے بڑی خوبی تھی کہ آپ جس مضمون کو پڑھاتے تھے اس سے ہمیں دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی اور حقیقت یہ ہے کہ راقم کے اندر جو بھی ادب سے دلچسپی ہے اس میں آپ کے دروس کا بڑا کردار ہے۔ آپ کی تدریس میں شخصیت سازی کا عنصر ہوا کرتا تھا۔

مولانا علیہ الرحمہ کے علم میں بڑی وسعت اور گہرائی کے ساتھ بڑا تنوع بھی تھا، جب آپ گفتگو فرماتے یا خطاب کرتے تھے تو لگتا کہ علم کا سمندر بہہ رہا ہے، آپ علم کو تعمق اور محنت کے ساتھ حاصل کرنے کے قائل تھے اور طلبہ کو اس کی نصیحت بھی فرماتے تھے، ہم نے آپ کو کہتے ہوئے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ اگر کسی چیز کے بارے میں کسی شخص کو یقین نہیں ہے تو علم نہیں ہے، بلکہ وہ ظن (گمان) ہے اس لیے علم کو محنت اور لگن کے ساتھ حاصل کرنا ضروری ہے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اخلاق کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے، ہر ایک کو خوش آمدید کہتے تھے اور کسی سے مرعوب نہیں ہوتے تھے، آپ کے یہاں بڑا توسع تھا، آپ کی تحریروں، تقریروں نیز ذاتی مجلسوں میں ہم نے کسی مسلک یا کسی کی شخصیت کے بارے میں منفی باتیں نہیں سنیں اور نہ پڑھیں، یہی وجہ ہے کہ آپ سے پوری امت اسلامیہ ہندیہ کو عقیدت تھی اور آپ کی وفات کے بعد سب کو بڑی محرومی کا احساس ہے۔

آپ سادگی کو پسند فرماتے تھے، آپ کی ذات کردار کے لیے ایک اعلیٰ نمونہ تھی، آپ کے یہاں اخلاقی بلندیاں اور بڑی خوبیاں تھیں اور اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ حقیقت میں آپ عصر حاضر میں علماء اور مصلحین کے اخلاق کے سفیر اور نمونہ تھے۔

اخیر میں مولانا علیہ الرحمہ کے بارے میں پروفیسر وصی احمد صدیقی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اقتباس پر اپنی بات کو ختم کرتا ہوں جسے انھوں نے مولانا کی شخصیت کے بارے میں لکھا تھا:

''مولانا کی شخصیت مثل ماہتاب ہے جو کہ اپنی ٹھنڈی اور آنکھوں کو تراوٹ پہنچانے والی روشنی بکھیر رہا ہے اور یہ روشنی علم و عمل کی روشنی ہے۔ مولانا کی دل آویز تحریریں پڑھی جاتی ہیں اور پڑھی جاتی رہیں گی، کتابِ دل کی تفسیریں لکھی جارہی ہیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔'' (غبار کارواں:۵)

حقیقت میں مولانا کی شخصیت مثل ماہتاب تھی، جس سے سب کو علم و روحانیت کی روشنی اور ٹھنڈک ملتی رہی ہے اور ملتی رہے گی، کیونکہ آپ نے اپنی کتابوں کے علاوہ لاکھوں شاگردوں کو علم کے زیور سے آراستہ کیا ہے، آپ کے علم سے کروڑوں لوگ فیض یاب ہو رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ آپ کی حیات ہی میں آپ کی زندگی اور آپ کی علمی و ادبی خدمات پر لوگوں نے تحقیق کی ہے اور مستقبل میں بھی آپ کی زندگی اور علمی و ادبی کارناموں پر تحقیق کرتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ استاذ محترم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور پوری ملت اسلامیہ کو آپ کا نعم البدل عطا کرے۔ آمین!

یورپ کا نظریہ تعلیم

''تربیت کو تعلیم سے الگ کر دینا یا تربیت کو خالص مادی بنا دینا، یورپ کا نظریہ تعلیم اور فلسفہ تعلیم ہے، یورپ والے تربیت تو دیتے ہیں، لیکن صرف پیٹ پالنے کی تربیت ہوتی ہے، وہ اپنی فکر کی تربیت دیتے ہیں، ان کے یہاں اچھائی اور برائی میں تمیز نہیں سکھائی جاتی، آپ ان کے مفکرین کی سیرت پڑھیں تو معلوم ہوگا کہ جھوٹ کوئی چیز نہیں ہے، یہ ان کے یہاں بے کار ہے کہ جھوٹ بولنا برا ہے، جو لوگ ان سے متاثر ہیں انہیں یہ سب سمجھنا چاہیے اور اس کو سمجھنے کے لیے سب سے ضروری بات یہ ہے کہ اپنا مقصد پہچاننا چاہیے۔'' (تحفہ گجرات:۱۱۱)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

آنسو بہا رہی ہے فضا تیری موت پر

مولانا عین الحسن ندوی
(مہمان خانہ ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ''الرجل القرآنی'' کی ایک زندہ مثال تھے، حضرت تہجد کے لیے اذان سے ایک گھنٹہ پہلے اٹھتے تھے، تہجد میں حضرت دس بارہ رکعت نفل ادا کرتے تھے، پھر دعا ومناجات کرتے تھے، یہاں تک کہ فجر کی اذان ہوجاتی پھر سنت پڑھتے اور نماز فجر باجماعت ادا کرتے، نماز کے فوراً بعد قرآن مجید سنتے تھے پھر چائے پیتے تھے اور آرام کے لیے لیٹ جاتے، آٹھ بجے اٹھ جاتے اور ناشتہ کرتے، ناشتہ کے فوراً بعد اخبار پڑھتے پھر کچھ علمی کام کرتے پھر لوگوں سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا، یہاں تک کہ ظہر کی اذان ہوجاتی، پھر حضرت وضو فرماتے اور ظہر کی نماز باجماعت ادا کرتے اور جب بھی نماز کے لیے تکبیر کہی جاتی تو اس وقت حضرت پر گریہ طاری ہوجاتا اور پورا بدن کانپنے لگتا تھا، یہ کیفیت کچھ دیر رہتی، ہر نماز کے وقت یہ کیفیت ہوجاتی تھی، ایک دن ایک اللہ والے نے ہم سے کہا کہ جانتے ہو حضرت کی اس کیفیت کے بارے میں؟ ہم نے کہا: نہیں، انہوں نے کہا: جب مکبر اللہ اکبر کہتا ہے تو حضرت پر اللہ کی عظمت وبڑائی کا احساس طاری ہوجاتا ہے۔ حضرت ہر وقت یاد الٰہی میں ڈوبے رہتے تھے، ظہر کی نماز کے بعد کھانا کھا کر کچھ دیر لوگوں سے ملتے پھر آرام کرتے، عصر کی نماز کے بعد قرآن مجید تھوڑی دیر سنتے پھر ملنے والوں کی آمد ہوتی، حضرت ہر ایک سے بہت خوش دلی اور محبت سے ملتے اور خیریت پوچھتے اور ہر ایک کی پوری بات سنتے اور بہتر سے بہتر مشورہ دیتے۔ جب مغرب کی اذان ہوجاتی تو حضرت باجماعت نماز ادا فرماتے، نماز سے فارغ ہوکر بستر پر بیٹھ جاتے، چائے دی جاتی، مہمانوں کے ساتھ چائے پیتے اور آنے والے سے اس طرح بات کرتے جیسے بہت پرانا تعلق ہو، جب کہ بہت سے لوگ نئے بھی ہوتے تھے، ملنے والے حضرت کے اخلاق ومحبت کو دیکھ کر بہت زیادہ متاثر ہوتے تھے۔ پھر عشا کی اذان ہوجاتی تو حضرت وضو فرماتے اور نماز باجماعت ادا فرماتے۔ بستر پر یادِ الٰہی میں مراقب رہتے، یہاں تک کہ دستر خوان لگ جاتا، کھانے سے فارغ ہوکر بیٹھ جاتے، طلبہ واساتذہ آجاتے، آدھا گھنٹہ مجلس ہوتی، حدیث کی کتاب ریاض الصالحین پڑھی جاتی، پڑھنے کے دوران حضرت کچھ گفتگو بھی فرماتے، کبھی کبھی مجلس کے اختتام پر آرام کرنے کے لیے لیٹ جاتے، کچھ طلبہ ہمارے ساتھ خدمت کرتے، تھوڑی ہی دیر میں حضرت فرماتے: آپ لوگ آرام کیجیے۔ رات حضرت کی اللہ سے راز ونیاز میں گزرتی، کبھی بیٹھ کر اور کبھی لیٹ کر، کبھی کروٹیں بدل کر، میں نے بعض وقت دیکھا کہ حضرت اپنی پیشانی تکیہ پر رکھ کر دیر تک کراہ رہے ہیں، بے چین ہیں، کبھی کبھی پوری رات بے قراری وبے چینی میں گزر جاتی، اللہ پاک کے اس ارشاد کے مطابق:

﴿إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ☆ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَاماً وَقُعُوداً وَعَلَى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ (بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور رات ودن کی گردش میں عقل والوں کے لیے (بڑی) نشانیاں ہیں، جو کھڑے اور بیٹھے اور اپنی کروٹوں پر (لیٹے) اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور

زمین کی پیدائش کے بارے میں غور وفکر کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب تو نے ان کو یوں ہی نہیں پیدا کیا، تیری ذات پاک ہے بس تو ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے)

حضرت کبھی کسی کام کے لیے حکم نہیں دیتے تھے، بلکہ جب بھی ہم حضرت سے چائے وغیرہ کے لیے پوچھتے کہ چائے لائیں؟ تو کہتے کہ جب سب لوگ پئیں گے تو ہم بھی پی لیں گے، جبکہ حضرت کو چائے کا تقاضا بھی ہوتا، لیکن اپنے خاص خدام سے بھی نہیں کہتے، اپنی ضرورت صرف اللہ سے کہتے تھے اور جب کسی کو کسی ضرورت سے بلانا چاہتے تو اس انداز سے کہتے کہ جب آپ کی فلاں سے ملاقات ہو تو ان سے کہیے گا کہ وہ مل لیں، حضرت ہم لوگوں کو بھی کبھی ''تم'' نہیں کہتے تھے، برابر ہم سے ندوہ کی چہار دیواری کے اندر رہنے والوں کے حالات کے سلسلہ میں پوچھا کرتے کہ کون ضرورت مند ہے؟ کون بیمار ہے؟ جب بھی ہم کسی کے متعلق بتاتے کہ فلاں پریشان ہیں، فلاں بیمار ہیں تو ان کے لیے دعا کرتے اور ان کا تعاون بھی کرتے۔ حضرت امت کے لیے راتوں کو اللہ سے بہت روتے اور دعائیں کرتے اور اکثر اوقات فرماتے کہ امت بڑی آزمائش سے دوچار ہے۔ حضرت کو اپنے ملک ہندوستان کی بہت فکر رہتی تھی، کبھی کبھی فرماتے کہ یہ ہمارا ملک بہت نقصان کی طرف جارہا ہے، اہل حکومت کو اپنے مفاد سے مطلب ہے، ملک کہاں جارہا ہے اس سے کوئی مطلب نہیں، اللہ اس ملک کی حفاظت فرمائے اور کبھی فرماتے: اللہ اہل حکومت کو عقل وسمجھ عطا فرمائے۔

ایک طالب علم برابر عصر کے بعد حضرت کے پاس آکر خاموش بیٹھ جاتے، دیر تک بیٹھے رہتے، بڑے درجہ کے طالب علم تھے، ان کو حضرت سے بہت تعلق تھا، ایک دن جب حضرت مغرب کی نماز سے فارغ ہوکر بستر پر بیٹھ گئے تو وہ آئے اور خدمت کرنے لگے، تو حضرت نے ان سے کہا: آپ آرام سے بیٹھیں، خدمت نہ کریں، وہ تھوڑی دیر بیٹھے پھر اٹھ کر چلے گئے، ایک دو گھنٹہ گزر گیا تو حضرت نے ہم سے کہا کہ ایک طالب علم عصر بعد یہاں آتے ہیں، ان کا نام ہمیں یاد نہیں ہے، شاید وہ ہم سے ناراض ہوکر چلے گئے ہیں، ہم نے کہا کہ حضرت وہ آپ سے بہت تعلق رکھتے ہیں، ایسا نہیں ہے، وہ اپنے کسی کام سے چلے گئے ہوں گے، وہ تو صرف عصر سے مغرب تک آپ کے پاس بیٹھتے ہیں، وہ جب دوسرے دن آئے تو حضرت نے ان سے کہا کہ آپ کو ہم سے تکلیف پہنچ گئی ہے، معاف کردیجیے گا، ہم نے تو آپ کو آرام سے بیٹھنے کے لیے کہا تھا کہ آپ تکلیف اٹھا رہے تھے، وہ طالب علم حضرت سے بہت محبت کرتے تھے، وہ بے چارے بہت شرمندہ ہوئے، کہا کہ نہیں! حضرت آپ کے آرام کی وجہ سے ہم چلے گئے تھے۔

حضرت کو سب سے زیادہ جو فکر رہتی تھی وہ تھی طلبہ واساتذہ اور مہمانوں کی راحت وآرام کی، حضرت نے ایک موقع پر ہم سے کہا کہ کبھی کسی کو اس انداز سے نصیحت نہ کرنا کہ وہ محسوس کرے کہ یہ ہم سے اپنے کو بڑا سمجھتے ہیں، نصیحت ہمیشہ ایسی ہو کہ سامنے والا نصیحت کرنے والے کو اپنا ہمدرد سمجھے، پھر اس سلسلہ میں آپ نے مجھے اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان فرمایا کہ ہمارے ایک دوست تھے، ایک مرتبہ ہم ان سے ملنے ان کے گھر گئے، وہ مسجد سے عصر کی نماز پڑھ کر غروب شمس کے وقت نکل رہے تھے، ہم نے ان سے کہا کہ بھائی حدیث شریف میں نماز کو تاخیر سے پڑھنے والوں کے بارے میں سخت وعید آئی ہے اور اسے منافق کی علامت بھی بتایا گیا ہے، اس پر وہ ہم سے ناراض ہوگئے، انہوں نے ہم سے کہا کہ آپ مؤمن رہیے اور ہم کو منافق رہنے دیجیے، ان کو میری بات بری لگ گئی۔ اس سے پتہ چلا کہ نصیحت بھلے انداز میں کرنا مفید ہوتا ہے۔

حضرت مولاناؒ لوگوں سے بہت خندہ پیشانی سے ملتے اور جب لوگ دعا کے لیے کہتے تو حضرت ان کو دعا دیتے اور کہتے: ہم دعا کریں گے انشاء اللہ، آپ سے بھی دعا کی درخواست ہے، حضرت پر خشیت الٰہی غالب تھی، لوگوں کی دل آزاری سے بہت ڈرتے تھے،

لوگوں کے ہدایا اس لیے قبول کرتے کہ دل شکنی نہ ہو، مگر بدلہ میں ضرور کوئی ہدیہ دیتے، اکثر ہدایہ تعلق والوں میں تقسیم کرادیتے، کوئی حضرت پر ذرا سا بھی احسان کرتا تو اس احسان کا بدلہ بہتر سے بہتر انداز میں ادا کرتے۔ حضرت کی تواضع کا حال یہ تھا کہ جب کوئی اپنی اصلاح کے لیے کہتا کہ حضرت میں اصلاح چاہتا ہوں تو فرماتے کہ میں بھی اپنی اصلاح چاہتا ہوں اور جب کوئی کہتا کہ حضرت ہم پر توجہ ڈال دیجیے تو فرماتے کہ ہم کو توجہ ڈالنا نہیں آتا، بہت ہی آسان انداز سے اس کی رہنمائی فرمادیتے اور وہ سمجھ بھی جاتا اور خوش ہوکر جاتا، حضرت ہمیشہ اپنے معاملہ میں دوسرے معتبر علماء سے مشورہ لیتے اور دوسرے کے معاملہ میں کبھی بھی خود سے مشورہ نہیں دیتے اور ہر چھوٹے بڑے کو ''آپ'' کہہ کر بات کرتے۔ حضرت کو مال و دولت سے کوئی مناسبت نہیں تھی اور نہ ہی جاہ و منصب سے کوئی سروکار تھا۔ حضرت رمضان سے پہلے کبھی کبھی فرماتے کہ دنیا بہت بری جگہ ہے خودغرضی بہت بڑھ گئی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ سے حضرت کا رشتہ کیسا مضبوط اور گہرا تھا، اس کا مختلف موقعوں پر دن رات مشاہدہ ہوتا تھا، اس سلسلہ میں نہ جانے کتنے واقعات ذہن کے اندر محفوظ ہیں، ان کا یہ تعلق ایسا تھا کہ اگر انہیں کوئی بڑی سے بڑی مشکل پیش آتی جس کا ان کے پاس بظاہر کوئی حل نہ ہوتا اور وہ پریشان ہوتے، تو ہم نے خود دیکھا کہ وہ کسی سے کچھ کہنے کے بجائے اپنے اللہ سے رجوع ہوتے تھے، خوب گڑگڑا کر دعا فرماتے تھے اور اپنی بے مائیگی و فروتنی کا اظہار کرتے تھے اور اس وقت تک محو دعا رہتے تھے جب تک انہیں خود یہ احساس نہ ہوجاتا کہ اب میرے اللہ نے میری مشکل آسان فرمادی ہے، اسی بات کے ضمن میں ایک واقعہ یاد آگیا جو وفات سے دو چار مہینے قبل ہی کا ہے کہ لکھنؤ کے ایک مدرسہ کی عمارت کے افتتاح کے موقع پر کچھ تعلق والے حضرت سے افتتاح کرانا چاہتے تھے اور کچھ لوگ حضرت کو وہاں جانے سے روک رہے تھے، تنہائی میں ہم نے حضرت سے کہا: جو لوگ آپ کو وہاں جانے سے روکنا چاہتے ہیں، ان کا تعلق ان لوگوں سے اچھا نہیں ہے جو لوگ آپ کو لے جانا چاہتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا: مجھے معلوم ہے لیکن میں کس کو خوش کروں، ان کو خوش کروں یا ان کو؟ میں یہ کہہ کر دوسرے کمرہ میں چلا گیا، حضرت بہت دیر تک روتے رہے اور دعا کرتے رہے، جب حضرت دعا سے فارغ ہوگئے تو میں حضرت کے پاس گیا تو حضرت نے ہم سے کہا کہ اب ہم کو جانا نہیں پڑے گا، اللہ سب کام کرادے گا۔

رمضان سے دو دن پہلے حضرت ندوہ سے تکیہ تشریف لے گئے، رمضان گزارنے کے لیے دن میں گھر والوں کے ساتھ رہتے اور عصر کے بعد باہر بنگلے پر آجاتے، افطاری اپنے خاص مہمانوں کے ساتھ کرتے، دس رمضان تک حضرت نے پوری تراویح باجماعت بنگلے پر ادا کی، لیکن طبیعت میں گراوٹ رہتی تھی، رمضان سے کچھ دن پہلے ہی سے اکثر اوقات یاد الٰہی میں ڈوبے رہتے تھے، آنکھ بند رہتی تھی۔ رمضان سے ایک مہینہ پہلے کی بات ہے کہ ایک دن گھر کے باہری کمرے میں حضرت مولانا بلال صاحب مدظلہ سے حضرت نے فرمایا کہ

''بلال! میرے گرم کپڑے تعلق والوں میں تقسیم کرادو، ایک جوڑا صرف باقی رکھنا، اب بظاہر ضرورت نہیں پڑے گی۔''

۱۱ر یا ۱۲ر رمضان کو نماز فجر کے ایک دو گھنٹے بعد دو تین دست آئے اور شام کو سخت بخار آگیا، دوا دی گئی تو بخار کم ہوگیا لیکن حرارت برابر رہنے لگی اور طبیعت میں گراوٹ و کمزوری بڑھتی گئی، ۱۴ر یا ۱۵ر رمضان کو فجر کی نماز کے کچھ ہی دیر بعد مونڈھے میں سخت درد شروع ہوا، تھوڑی ہی دیر میں بخار بھی تیز ہوگیا، طبیعت میں گراوٹ و کمزوری بڑھتی گئی، ہم نے حضرت مولانا بلال صاحب مدظلہ کو فون کیا کہ حضرت کی طبیعت بہت خراب ہوگئی ہے، مولانا جلدی سے آگئے، حضرت نے فرمایا کہ

''بلال ہم سے تکلیف پہنچی ہو تو معاف کردیجیے۔''

یہ سن کر مولانا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مولانا نے کہا کہ

’’حضرت! آپ کیا کہہ رہے ہیں، آپ نے تو ہمیشہ شفقت ہی فرمائی ہے۔‘‘

دوپہر تک ڈاکٹر ناصر صاحب بھی رائے بریلی آگئے، ان کے مشورہ سے حضرت کو لکھنؤ لایا گیا، قیام ندوہ کے مہمان خانہ میں ہوا، وہیں پر علاج بھی شروع ہوا، حضرت کے علاج کے لیے لکھنؤ کے ماہر ترین ڈاکٹروں کی پوری ایک ٹیم حاضر ہوگئی، جن کی نگرانی میں علاج ہوتا رہا، دو تین دن گزرے تھے کہ حضرت نے ہم سے کہا کہ مہمان خانہ پر بہت بوجھ پڑ رہا ہے، کیونکہ گھر کے بچے بھی یہاں ہیں اور مہمان بھی آرہے ہیں، ہم نے کہا کہ حضرت کل ہی تو آپ نے مہمان خانہ میں ایک بڑی رقم جمع کی ہے، کھانا گھر سے آتا ہے، افطاری کا نظم وہی ہے جو مسجد کا ہے تو فرمایا کہ بھائی اللہ کی ناراضگی سے ڈر لگتا ہے۔

اکثر و بیشتر حضرت یادِ الٰہی میں مشغول رہتے تھے، آنکھ بند کئے رہتے تھے، ہمیں اس بات کا پورا یقین ہوگیا تھا کہ حضرت اللہ کی یاد میں ہر وقت رہتے ہیں، اصل بات یہ ہے کہ حضرت رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ کو جزب کرلیا تھا، انتقال سے ایک ہفتہ پہلے حضرت نے بھٹکل کے بھائی وسیم صاحب سے کہا: آپ میرے لیے دعا فرمائیں کہ اللہ اپنی مرضی پر چلنے کی توفیق دے اور اپنا فضل فرمائے۔

انتقال سے ایک دن پہلے بات کرنا بند ہوگیا لیکن نماز کے لیے اشارہ کرتے، تیمّم کرایا جاتا، حضرت اشارہ سے نماز ادا کرتے، انتقال کے دن صبح کو مولانا جعفر صاحب سے پوچھا کہ ہم کہاں ہیں؟ مولانا نے کہا کہ آپ ندوہ کے مہمان خانہ میں ہیں۔ فرمایا: اچھا ٹھیک ہے۔ پھر ساڑھے نو بجے ناشتہ کے لیے اشارہ کیا تو ہم نے تلبینہ بنا کر کھلایا، بہت شوق سے حضرت نے کھایا، کھانے کے بعد طبیعت بھی اچھی ہوئی، زم زم بھی پلایا، بہت خوش بھی ہوئے، گھر کے بھی سب لوگ موجود تھے۔ سب کو حضرت نے پہچانا، سب کو دعا بھی دی۔ بارہ بجے پھر ہم نے حضرت سے پوچھا: حضرت کھانے کے لیے کچھ لائیں؟ حضرت نے کہا: ہاں! پھر تلبینہ بنایا، اس خیال سے کہ حضرت کی کمزوری میٹھے سے دور ہوتی ہے، طبیعت بہتر ہوگئی، تلبینہ کھلایا، زم زم پلایا، اس کے بعد حضرت نے پوچھا: یہ وقت کون سا ہے؟ مولانا جعفر صاحب نے کہا: ظہر کا وقت ہے، کہنے لگے: نماز پڑھیں گے۔ مولانا نے کہا: ابھی بارہ بجے ہیں، ابھی ایک گھنٹہ وقت ہے۔ حضرت نے کہا: ٹھیک ہے، مولانا بہت تھکے ہوئے تھے، دوسرے کمرہ میں چلے گئے تاکہ تھوڑی دیر آرام کرلیں، سوا بارہ بجے حضرت نے ہم سے کہا: ہم نماز پڑھیں گے، ہم نے کہا: حضرت ابھی سوا بارہ بج رہا ہے۔ کہنے لگے: ٹھیک ہے۔ پھر حضرت نے تھوڑی ہی دیر میں فرمایا: ہم نماز پڑھیں گے، جلدی کیجیے ہم نماز پڑھیں گے۔

اس کے بعد یہ گنہگار جلدی سے مولانا جعفر صاحب مدظلہ کے پاس گیا اور ان سے عرض کیا کہ حضرت نماز کے لیے فرمارہے ہیں، مولانا جلدی سے آئے، مولانا نے وضو کیا، ہم نے بھی وضو کیا، جلدی سے حضرت کو تیمّم اپنے ہاتھ سے کرایا۔ مولانا جعفر صاحب نے کہا کہ تم جلدی سے نماز پڑھاؤ، مولانا نے تکبیر کہی، میں نے نماز جلدی سے پڑھائی، سلام پھیر کر جلدی سے حضرت کے پاس گیا اور حضرت سے کہا: نماز ہوگئی، حضرت نے بہت خوش ہوکر فرمایا: ہاں ہم نے نماز پڑھ لی الحمدللہ۔ ایک یا دو منٹ ہی گزرے تھے کہ حضرت نے کہا کہ ہم بیٹھیں گے۔ مولانا جعفر صاحب نے حضرت کو بٹھایا، ہم بھی بٹھانے کے عمل میں شریک تھے، پھر حضرت نے کہا کہ ہم کو قے ہوگی، جلدی سے ہم نے برتن لگایا لیکن قے نہیں ہوئی، زم زم کا آخری گھونٹ پلایا، زم زم پیتے ہی جیسے کسی فرشتہ نے حضرت کو زور سے ہلایا، سانس تیز ہوگئی اور حضرت کو لٹا دیا، اس وقت صاف اللہ اللہ کی آواز ظاہر ہو رہی تھی، یہ کیفیت دو ڈھائی گھنٹے تک رہی، پھر ایک دم سے دو تین مرتبہ جیسے کسی نے حضرت کو پکڑ کر زور زور سے ہلایا، اس کے بعد سکون ہوگیا اور وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون!

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی

مولانا طلحہ نعمت ندوی
(باحث خدا بخش لائبریری - پٹنہ)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات سے ایک عہد کا خاتمہ ہوگیا، ایک صدی کی تاریخ ان کے ساتھ چلی گئی، ان کی ذات ہم سب کے لیے سرمایہ سکون تھی، ان کی وفات سے چار دن قبل ان کے معاصر ممتاز ندوی فاضل اور ممتاز محدث حضرت مولانا سید یحییٰ ندویؒ نے وفات پائی، تو ہم نے لکھا تھا کہ ندوہ کے قدیم دور کے معاصر بزرگوں میں تین بزرگ باقی رہ گئے تھے، افسوس کہ اب یہ مثلث قطعہ ہوگیا ہے، اللہ تعالیٰ ان دو بزرگوں کا سایہ دراز فرمائے، میری مراد حضرت ناظم صاحب اور علامہ سید سلیمان ندوی کے فرزند گرامی حضرت مولانا ڈاکٹر سید سلمان ندوی دام ظلہم سے ہے، کیا پتہ تھا کہ چار ہی دن میں ایک دوسرا خسارہ بھی دیکھنا پڑے گا اور جلد ہی ایک دوسرا غم سہنا پڑے گا۔ جب حضرت والا کی وفات ہوئی اور وقت رمضان کا اخیر عشرہ تھا اور ایک بڑی تعداد اعتکاف میں تھی، خود راقم بھی معتکف تھا، اس لیے بروقت اپنے تاثرات نہیں پیش کرسکا۔

حضرت والا کی شخصیت ایسی ہے کہ اس پر ہم جیسے ادنیٰ طالب علم کی کیا بساط ہے کہ کچھ لکھے، ان کے اوصاف وکمالات پر ملک وبیرون ملک کے ممتاز اہل علم نے روشنی ڈالی ہے اور مستقل یہ سلسلہ جاری ہے، البتہ راقم کے مشاہدات میں جو باتیں ہیں ان کا ذکر کررہا ہوں۔

ندوہ کے دور طالب علمی میں حضرت والا کی خدمت میں حاضری کے مواقع بار بار ملے اور ایک کم سواد طالب علم نے کسی حد تک اس موقع کو غنیمت سمجھا، ان کی صحبت کی برکت حاصل کرنے کی کوشش کی، کبھی کبھی تنہائی میں بھی حاضری کی سعادت حاصل ہوئی اور دیر تک علمی موضوعات پر استفادہ کا موقع ملا، ایک بار سفر میں بھی رفاقت کا موقع ملا۔

حضرت والا کی خدمت میں حاضری کا موقع تو ندوہ آنے کے بعد سے ہی ملتا رہا، ان کی مجلس میں حاضری ہوتی اور ان کے پند ونصائح اور علمی افادات سے استفادہ کا موقع ملتا، پھر بعد نماز فجر بھی کبھی کبھی دعائیں لینے حاضر ہونے لگا، عالمیت کے آخری سال میں حضرت والا کی کتاب ''الادب العربی بین عرض ونقد'' کا ہفتہ میں ایک سبق خود حضرت والا کے ذمہ تھا، میں نے ان کے دروس وافادات کا عربی میں خلاصہ تیار کیا اور آخری سال میں حضرت کی خدمت میں پیش کیا، ایک نظر ڈال کر اس کی تحسین فرمائی اور فرمایا کہ مجموعی طور پر بہتر ہے، کہیں کہیں کچھ کمی ہے۔ فضیلت کے سالوں میں حاضری کے مواقع نسبۃً زیادہ ملنے لگے، گھنٹوں میں بھی استفادہ کا موقع ملا، سیرت النبی پر ان کے محاضرات اور سال دوم میں ادب عربی میں سبعہ معلقہ کے اشعار ان سے پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی، یہ ہماری سعادت تھی کہ یہ حضرت والا کا آخری دور تھا، اس سے قبل وہ تقریباً چالیس پینتالیس سال تک سبعہ معلقہ کا درس دے چکے تھے، اس لیے آخری عمر میں اس کی تشریح میں اس طویل دور کا پورا مطالعہ وتحقیق شامل ہوگئی، اس لیے کوشش ہوتی کہ کوئی اہم بات نوٹ کرنے سے نہ رہ جائے۔ حضرت والا ادب کی تعلیم وتدریس میں اس پر زور دیتے کہ الفاظ میں کیا کیفیت ہے اس کی تشریح کی جائے، ایک بار ہم نے فراغت کے بعد پوچھا کہ ادب کی تدریس میں کون سا طریقہ اپنایا جائے؟ تو یہی فرمایا کہ الفاظ وتعبیرات میں جو کیفیات ہیں ان کو نمایاں کیا جائے۔ اس کے بعد حضرت والا کو مزید

چند سال ہی درس دینے کا موقع ملا، پھر ضعف کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا۔ ہمارے درجہ کی یہ بھی خوش قسمتی تھی کہ اس سے پہلے فضیلت کے آخری سال کے طلباء کو وہ ایک ہی گھنٹہ صرف سبعہ معلقہ کا پڑھاتے تھے، ہمارے دور میں انہوں نے دو مضامین پڑھائے، ہفتہ میں ایک دن عالم اسلام پر ان کا لیکچر بھی ہوتا جس سے پوری طرح استفادہ کا موقع ملا، اس وقت معلوم ہوا کہ سائنس و جغرافیہ کا مطالعہ بھی حضرت والا کا بہت وسیع ہے اور وہ بے تکلف اس موضوع پر بولتے چلے جاتے۔ ایک بار ہم دو تین طالب ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ تنہا تشریف فرما تھے، ہم نے جغرافیہ کے متعلق کچھ سوالات کیے، اسی وقت سامنے لٹکے ہوئے ایک گلوب کے کلینڈر کو اتار کر اس کے ذریعہ تفصیلات سمجھانے لگے، جس سے ہم لوگوں کو بہت فائدہ ہوا اور بہت سی اہم معلومات حاصل ہوئیں۔

ایک بار فجر کے بعد تنہا کمرہ میں تشریف فرما تھے، حاضر خدمت ہو کر عربی ادب کے متعلق چند سوالات کیے، اسی وقت قدیم شعراء کے مزاج و مذاق پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ قدیم عربی شاعری میں فکر و نظر کی اتنی گہرائی نہیں ملتی کیوں کہ ان کی زندگی تمدن سے آشنا نہ تھی، اس لیے وہی بدویانہ خیالات سے ان کی شاعری معمور نظر آتی ہے۔ ایک بار بلاغت کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ اصطلاحات کو سمجھے کے لیے ایک کتاب کافی ہے، مزید دوسری کتابوں کے مطالعہ کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہے۔ ہم نے کہا: دلائل الاعجاز جیسی کتابیں؟ کہنے لگے اس کے مطالعہ سے چارہ کہاں؟! وہ تو فن کی بنیادی کتاب ہے۔ فضیلت کی تکمیل کے بعد حاضر ہوا تو فرمایا کہ اب اپنا مطالعہ بڑھایئے، ہم نے کہا: کس موضوع پر؟ فرمانے لگے کہ جو بھی علوم اسلامیہ اور اس سے متعلق ہیں، اسی طرح ایک بار اور یہی نصیحت کرتے ہوئے فرمایا کہ کسی موضوع کو اپنا اختصاص بنا کر اس پر مطالعہ کیجیے۔ ایک بار میں نے قرآن پاک میں تدبر کے بارے میں معلوم کیا، انہوں نے فرمایا کہ خود قرآن پاک کو غور سے پڑھیے، ہم نے کہا پھر تلاوت نہیں ہو پاتی تو کیا دونوں کا الگ الگ سلسلہ رکھا جائے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں! تلاوت کا الگ ایک ڈیڑھ پارہ اور تدبر کے لیے الگ ایک ربع روزانہ کا نظام بنایئے۔

حضرت والا کو اللہ تعالیٰ نے شفا کی تاثیر بھی عطا فرمائی تھی، ایک بار والد صاحب بیمار تھے، میں کسی چھٹی میں گھر جا رہا تھا، ان سے پانی دم کرا کر لے گیا اور لے جا کر پلایا تو اللہ تعالیٰ نے شفا عطا فرمائی۔

حضرت والا کی خوبیاں اور کمالات بہت ہیں، ان کو دیکھ کر دل کو سکون ملتا اور قلب کو اطمینان ہوتا کہ ان کی شخصیت ہمارے درمیان موجود ہے، ان کی دعاؤں کی برکت حاصل ہے، ان کی وفات سے محرومی کا احساس ہوتا ہے اور یہ شعر زبان پر آتا ہے

زندگی جن کے تصور سے جلا پاتی تھی
ہائے کیا لوگ تھے جو دام اجل میں پہنچے

مسلم رہنماؤں سے خطاب

”مسلمانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ مشکل سے مشکل حالات میں اور سخت سے سخت دشواریوں میں ان کے مخلص رہنماؤں نے جب بھی مقصد کی لگن اور کام میں یکجہتی اور مستعدی کا ثبوت دیا ہے تو حالات کو بدل دیا ہے اور انسانوں کو اعلیٰ اقدار کا حامل بنایا ہے اور یہ ان کی تاریخ میں بار بار ہوا ہے، چنانچہ ان کے ہر دور میں ان کی رہبری کے لیے علماء اور اہل فکر ضرورت کی تعداد میں ملتے رہے اور وہ اپنی اپنی صلاحیتوں کے مطابق مختلف طریقہ ہائے کار اختیار کرتے رہے اور موجودہ دور میں بھی باصلاحیت لوگ ہیں اور وہ مختلف جماعتوں اور اداروں کی شکل میں تقسیم ہو کر امت کی ضرورت کو پورا کر رہے ہیں، البتہ وہ اگر امت کے کاموں اور ذمہ داریوں کی انجام دہی میں اپنے تنوع اور اختلاف کے باوجود اپنے بنیادی مسائل کے دائرہ میں مقصد کے لحاظ سے یکجہتی اور تعاون پر عمل پیرا رہیں تو امت کی ضرورت بخوبی اور بہتر سطح پر پوری ہو سکتی ہے۔“ (خطبات رابع: ۴۵۰-۴۵۱)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

پیکرِ زہد و عمل

جناب محمد نوید حسن
(مارکیٹ ریسرچر برائے حکومتی ٹورانیڈ ٹریولز- کناڈا)

مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے میری پہلی اور آخری ملاقات اگست ۲۰۱۱ء میں ہوئی جب وہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ایک حجرہ میں مقیم تھے۔ مولانا میرے نانیہالی عزیز محترم جناب مکی حسنی صاحب کے اقارب تھے اور میرے نانیہال سے آپ کے خاندان کا پرانا تعلق ہے۔

جب میں ان کے بتائے ہوئے وقت پر خدمت میں حاضر ہوا، تو باہر دو لوگ میرے منتظر تھے، وہ مجھے برامدے اور ایک کمرہ سے ہوتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئے جہاں حضرت تشریف فرما تھے، اس وقت مولانا کے اردگرد کچھ لوگ جمع تھے۔ حضرت مولاناؒ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور گرم جوشی (Warmly Welcome) سے میرا استقبال کیا۔

میں ابھی آکر بیٹھا بھی نہ تھا کہ حضرت مولاناؒ نے اپنی کتاب "Muhammad: The Perfect Guide for Mankind" مجھے ازراہ کرم پیش کی اور مجھے تاکید کی کہ میں اس کتاب کو پڑھوں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور اپنی حاضر جوابی سے مجبور میں نے فوراً ان سے کہا کہ میں ایسی کتابیں بہت پڑھتا ہوں اور حضرت مولانا علی میاںؒ کے ایک کتابچہ ''میرے مطالعہ قرآن کی سرگزشت'' کا ترجمہ بھی کر چکا ہوں، میری اس بات پر حضرت مولاناؒ نے میری طرف دیکھا لیکن کچھ بولے نہیں، مجھے زیادہ بول دینے پر کچھ شرمندگی (Embarrassment) سی بھی محسوس ہوئی۔

اس کے بعد مولاناؒ نے ''محمود منزل'' سے میرے تعلق کے بارے میں پوچھا اور پھر میرے دادیہال کے بارے میں پوچھا، جب میں نے ان سے بتایا کہ میرا دادیہالی تعلق سنڈیلہ سے ہے، تو مولاناؒ نے 'اچھا، سنڈیلا سے ہے' کہا۔

ابھی یہ سب بات ہو ہی رہی تھی کہ میرے سامنے چائے اور ناشتہ لاکر رکھ دیا گیا اور مولاناؒ نے نہایت محبت سے چائے ناشتہ والی ٹرے کو میری طرف بڑھایا اور مجھ سے مستقل مخاطب رہے۔ اس بات چیت کے دوران میں نے پوچھا کہ مسلمانوں کا جو حال ہندوستان اور دنیا بھر میں ہو چکا ہے، اس سے باہر آنے کے لیے مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اس کا جواب مولاناؒ نے بڑے سادہ انداز میں دیا اور کہا کہ

''مسلمانوں کو فرائض کی پابندی اور موجودہ دینی کتابوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔''

حضرت مولانا یہ متن بول کر خاموش ہو گئے، لیکن مجھ جیسے کم تجربہ کار اور معانی کی گہرائی پر نظر نہ رکھنے والے کے لیے ان کا یہ جواب بظاہر میرے لیے اطمینان بخش (Satisfactory) نہیں تھا، تاہم حضرت کا استقلال (Firmness of Response) دیکھ کر میں کچھ کہہ نہ سکا۔

یہ بات چل ہی رہی تھی کہ جامنی رنگ کی قمیص اور جینس کا پینٹ پہنے ہوئے ایک آدمی داخل ہوا اور مولاناؒ کا ہاتھ پکڑ کر زار وقطار رونے لگا اور روتے ہوئے زمین پر بیٹھ گیا۔ پیچھے سے کسی نے کہا کہ اس کی بیوی بے حد سخت بیمار ہے اور اس کے علاج میں وہ شخص اپنی حیثیت سے کہیں زیادہ خرچ کر چکا ہے، لیکن کوئی فائدہ نہیں، اس شخص کے بچے چھوٹے تھے اور حالت بہت خراب۔ مولاناؒ نے بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اس کو ہمت دلاتے ہوئے کہا کہ وہ بھی اس

کے لیے دعا کریں گے، حضرت مولانا نے روتے ہوئے اس بدحال شخص کو نہ صرف چپ کرایا بلکہ اچھی امید بھی دلائی۔

جب وہ صاحب رخصت ہوگئے، تب مولانا نے میری طرف متوجہ ہوکر فرمایا:

''لوگ بہت پریشان ہیں، دوا' علاج اور تعلیم بہت مہنگے ہیں اور یہ دوا ایسی چیزیں ہیں جو کبھی مہنگی نہیں ہونی چاہیے اور حکومتوں کا یہ فرض ہے کہ اس بات کا خیال کریں، پھر انہوں نے موجودہ حکومت کا ذکر بڑی مایوسی کے ساتھ کیا۔''

حضرت کے اس ارشاد کے بعد تھوڑی دیر مجلس میں خاموشی رہی اور میں نے اپنی توجہ ٹھنڈی ہوتی چائے کی طرف کی، اس موقع پر مولاناؒ نے میری تعلیم اور مستقبل کے ارادوں کے بارے میں بھی پوچھا، چائے ختم ہو جانے کے بعد میں نے مولاناؒ سے رخصت ہونے کی اجازت مانگی، مولاناؒ نے مجھے اجازت دی، میرے سر پر ہاتھ رکھا، پھر مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے میرے روشن مستقبل کے لیے دعا بھی دی۔

اس ملاقات کے بعد حضرت مولاناؒ کی شخصیت کا جو پہلو مجھ پر سب سے زیادہ واضح ہوا، وہ آپ کی سادگی اور نرمی تھی، آپ نے اس ایک گھنٹہ میں مجھ سے بات چیت کے دوران بڑی سے بڑی بات کو بے حد نرمی اور آسانی کے لہجے میں کہا، آپ اپنے آس پاس موجود خدمت گزاروں کے ساتھ بڑے شفیق معلوم ہوئے۔

اس ملاقات کے تقریباً دس دن کے بعد میں لکھنؤ سے کناڈا کے لیے روانہ ہوا، مولاناؒ کی دی ہوئی کتاب میرے ذاتی کتب خانہ کے ان دو کتابوں میں سے تھی جنہیں میں اپنے ساتھ لایا۔ سیرت کی اس کتاب میں کئی ایسے مقام آئے جنہیں پڑھ کر مجھے مولاناؒ کے دل اور ان کی سوچ میں نبی ﷺ کی بے پناہ اور سنجیدہ محبت کا احساس ہوا۔

حضرت مولاناؒ عالم اسلام میں اپنی ایک خاص اہمیت رکھتے تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے آپ ایک بزرگ عالم دین ہونے کے علاوہ سماجی وسیاسی (Socio-Political) رہنما بھی تھے۔ پچھلے رمضان جب مولانا کی طبیعت اور پھر ان کے دنیائے فانی سے رخصت ہونے کی خبر ملی تو مجھے افسوس ہوا اور یہ فکر بھی ہوئی کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی رہبری کے لیے اب مولانا رابع صاحب کا ثانی اور کون ہوگا؟

سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں پھر گہر پیدا

اللہ تعالیٰ حضرت مولانا رابع صاحبؒ کے درجات بلند فرمائے اور ان کے جانشینوں کی نگاہ طرز سلف پر قائم رکھے۔ آمین!

محبت رسول ﷺ کا تقاضا

مرشد الامت حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندویؒ

''ہر مسلمان کو بتایا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو احکام کا پابند بنائے اور سچا اور صحیح مسلمان بنے، آج مسلمانوں میں جو انحطاط اور کمزوری آگئی ہے وہ دراصل حضرت محمد ﷺ کے لائے ہوئے احکام سے ہٹ جانے اور غفلت برتنے سے پیدا ہوئی ہے۔ ہر مسلمان کی زندگی کے لیے حضور مقبول ﷺ کے فرمان اور طریقہ حیات کو نمونہ قرار دیا گیا ہے، جن کی پیروی ہر مسلمان پر واجب ہے، ان کی پیروی دراصل اس وقت ہوسکتی ہے جب حضور ﷺ کے مقام کو ہمارا دل پوری طرح جانتا اور مانتا ہو، ہم کو ان سے سچی محبت ہو، ان کی خوشی ہمارے لیے نعمت کا درجہ رکھتی ہو اور ان کا رنج ہمارے لیے سوہان روح ہو، ہم ہر وقت یہ فکر رکھیں کہ حضور ﷺ کو کیا پسند تھا اور کیا ناپسند؟! آپ ﷺ کس بات سے خوش ہوتے تھے اور کس بات سے ناخوش اور یہ کہ آپ کی خوشی کا کام کیسے کر سکتے ہیں اور آپ ﷺ کی ناخوشی کے کام سے کیسے بچ سکتے ہیں؟!''

(نقوش سیرت: ۵۰-۵۱)

فکر و عمل کے چند گوشے

ڈاکٹر غیاث الاسلام صدیقی ندوی
(سکریٹری رابطہ ادب اسلامی - برانچ دہلی)

مفکرِ اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے جانشین، استاذ الاساتذہ اور ہم سب کے محبوب ومحسن ومربی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات صرف ایک خاندان یا ایک ادارہ کا نقصان نہیں بلکہ عالمی طور پوری امت مسلمہ کا عظیم خسارہ ہے۔آپؒ کے چشمہ فیض سے قومی وبین الاقوامی سطح پر فکر وعمل کے کتنے ہی ادارے سیراب ہورہے تھے، آپؒ عالمی رابطہ ادب اسلامی اور مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر تھے، ندوۃ العلماء کے ناظم اور تحریک پیام انسانیت کے روح رواں تھے۔اس کے علاوہ بڑی تعداد میں علمی وفکری، دینی وتربیتی ادارے آپ کی سرپرستی میں چل رہے تھے۔ ایک دنیا آپ سے استفادے میں مشغول تھی۔رمضان کے مبارک ایام میں عشرہ اعتکاف کی آمد پر عیدالایام جمعہ سے قبل گویا ہاتف غیب نے صدادی: ﴿یَا أَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ☆ارْجِعِی إِلَی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً☆فَادْخُلِی فِی عِبَادِی☆وَادْخُلِی جَنَّتِی﴾ اور حضرتِ والا شاید مدت سے اس دعوتِ وصال کے منتظر تھے۔فوراً دم واپسیں قاصد اجل کے حوالے کر دی اور رفیق اعلی کے حضور پیش ہوگئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون!

۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء کو پیش آنے والے اس حادثہ جانکاہ نے پوری دنیا کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔آپؒ کی وفات حسرت آیات نے عرب وعجم کو گہرے صدمے سے دوچار کیا۔اداروں کی ایک بڑی تعداد کو یتیمی کا احساس ہوا۔ بہت سے اہل علم وقلم اور اصحاب فکر ونظر ایک دوسرے کو تعزیت پیش کررہے تھے کیوں کہ وہ اپنے آپ کو اور ہر ذی علم کو تعزیت کا مستحق سمجھ رہے تھے۔

مولانا محمد علی مونگیریؒ، علامہ شبلی نعمانیؒ، علامہ عبدالحی حسنیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے فراست ایمانی، علم وعمل کی جامعیت اور وسعت نظری کی جو میراث چھوڑی تھی آپ نہ صرف اس کے امین وپاسباں تھے بلکہ آپ نے اس میں گرانقدر اضافہ کیا اور اسلاف کے لگائے ہوئے باغ علم وفکر کے مزید بارآور ہونے کا ذریعہ بنے۔

مختصر حالات زندگی:

مولانا کی ولادت باسعادت ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۹ء کو رائے بریلی دائرہ شاہ علم اللہؒ کے مشہور علمی ودینی خانوادے میں سید رشید احمد حسنیؒ (وفات ۱۹۸۵ء) کے یہاں ہوئی۔ان کے دادا سید خلیل الدینؒ (وفات ۱۹۳۲ء) کی آپ ﷺ سے محبت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے طے کرلیا تھا کہ اللہ تعالیٰ جو پوتا بھی عطا فرمائے گا اس کا نام وہ محمد رکھیں گے۔اللہ تعالیٰ نے ان کے صاحبزادے سید رشید احمد حسنیؒ کو پانچ فرزند عطا کیے اور ان سب کا نام محمد رکھا گیا اور ترتیب کے لحاظ کے لیے عربی عدد کا اضافہ کیا گیا۔مولانا چونکہ اپنے بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے اس لیے آپ کا نام محمد رابع پڑا۔آپ کے بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ (۱۹۲۵-۱۹۸۲ء) ایک عظیم سوانح نگار، زبردست شاعر اور عمدہ منتظم تھے۔ندوہ کا ترانہ ان کا ہی تیار کردہ ہے، آپ کے چھوٹے بھائی محمد خامس جو محمد واضح رشید حسنیؒ (۱۹۳۳-۲۰۱۹ء) کے نام سے مشہور ہوئے ایک عمدہ صحافی، بہترین استاذ اور ندوے کے معتمد تعلیمات تھے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ خانوادہ علم اللہی کے وہ چوتھے عظیم شخص تھے جن کے کندھوں پر ندوے کی نظامت کی ذمہ داری

آئی۔آپ سے پہلے آپ کے نانا حکیم سید عبدالحی حسنیؒ، آپ کے بڑے ماموں ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ، آپ کے چھوٹے ماموں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ خانوادہ علم اللہی سے ندوہ کے ناظم تھے۔اسی طرح یہ ترتیب مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت میں بھی نظر آتی ہے جس کے آپ چوتھے صدر تھے۔آپ کی صدارت کا زمانہ سب سے زیادہ طویل رہا۔آپ قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات کے بعد ۲۰۰۲ء سے اپنی وفات ۲۰۲۳ء تک یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ اس طرح آپ پورے ۲۰/ سال تک ہندوستانی مسلمانوں کے متحدہ پلیٹ فارم سے ان کی قیادت کرتے رہے۔

آپ اپنے ماموں صاحبان ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی دینی و تعلیمی تربیت میں پروان چڑھے۔۱۹۳۹ء کو ندوۃ العلماء کے مکتب میں اور ۱۹۴۱ء کو درجہ اول میں آپ کا داخلہ ہوا۔۱۹۴۳ء تک یہاں تعلیم حاصل کرنے بعد کچھ عرصے آپ نے مظاہر علوم سہارنپور اور دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ سے استفادہ کیا۔حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ سے علمی استفادہ کیا۔شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی شفقت حاصل ہوئی۔ پھر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں شیخ الحدیث مولانا شاہ محمد حلیم عطاؒ سے بخاری شریف، مولانا سعید احمد اعظمیؒ سے مسلم شریف، مولانا محمد ناظم ندویؒ سے حجۃ اللہ البالغہ پڑھی نیز کئی دوسرے اساتذہ سے مختلف علوم وفنون حاصل کیے۔۱۹۴۸ء میں ندوہ سے آپ کی فراغت ہوئی۔

فکر وعمل کے چندگوشے:

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں آپ کا تقرر ۱۹۴۹ء میں بحیثیت معاون مدرس ہوا۔ پھر ۱۹۵۵ء میں ادیب اول کے منصب پر آپ کا تقرر ہوا۔ مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء مولانا محبّ اللہ لاری ندویؒ کے سانحہ انتقال کے بعد ۱۹۹۳ء میں آپ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کا مہتمم مقرر کیا گیا۔حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بعد ۲۰۰۰ء میں آپ ندوۃ العلماء کے ناظم بنائے گئے۔آپ نے فکر وعمل کے کئی گوشوں میں تابندہ نقوش چھوڑے ہیں۔ان میں سے چند گوشوں پر سطورِ ذیل میں مختصراً گفتگو کی جائے گی۔

قرآن کریم کی خدمت:

قرآن کریم اللہ کی وہ آخری کتاب ہے جو رہتی انسانیت تک کے لیے خدا کا آخری دستور قرار پائی ہے۔اس سے تعلق ہر مسلمان کے ایمان کا تقاضا ہے۔ مولانا رابع صاحبؒ تلاوت کا اہتمام تو کرتے ہی تھے وہ مفسر قرآن بھی تھے۔ندوہ میں تدریس کے ابتدائی سالوں میں دیگر موضوعات کے ساتھ تفسیر قرآن کی تدریس کی ذمے داری بھی آپ کو دی گئی۔اس کے علاوہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد آپ دوران رمضان المبارک تکیہ شاہ علم اللہ کی مسجد میں ظہر سے کچھ پہلے پابندی سے قرآن کریم کی تفسیر کیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ زندگی بھر جاری رہا۔ راقم الحروف کو مولانا سے شرفِ تلمذ کے علاوہ اس طرح کی مجالس میں بارہا حاضری کی سعادت ملی ہے۔مولانا اپنے درس قرآن میں متعلقہ آیات کی تفسیر بڑی تفصیل سے بیان کیا کرتے، انسانی نفسیات کی وضاحت کرتے' آیات کے پس منظر کو بیان کرتے۔اس سلسلے میں آپ کی تالیفات ''قرآن کریم انسانی زندگی کا رہبر کامل''، ''اسلامی معاشرہ سورۂ حجرات کی روشنی میں'' اور ''صبر وتقوی کی زندگی سورہ یوسف کی روشنی میں'' عمدہ کتابیں ہیں جن میں آپ نے سمندر کو کوزے میں سمونے کی خوش گوار کوشش کی ہے۔ اول الذکر دونوں کتابوں کے عربی ترجمے "الهداية القرآنية سفينة نجاة للإنسانية" اور "المجتمع الإسلامي: حدوده وآدابه في ضوء سورة الحجرات" مولانا محمد فرمان ندوی کے قلم سے منظر عام پر آچکے ہیں۔

سیرت نگاری:

نبی کریم سے محبت وتعلق مولاناؒ نے خاندانی ورثے میں پایا تھا۔مولانا کے دادا کو آپ ﷺ سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ انھوں نے طے کرلیا تھا کہ ان کے صاحبزادے کے یہاں جس پوتے کی بھی ولادت ہوگی ان سب کا نام محمد رکھا جائے گا۔ چنانچہ ان کی خواہش

کے مطابق مولانا کے تمام بھائیوں کا نام محمد رکھا گیا اور فرق ظاہر کرنے کے لیے عربی عدد کا اضافہ کیا گیا۔ ہمارے حضرت مولانا بھائیوں میں چوتھے نمبر پر تھے اس لیے آپ کا نام محمد رابع پڑا۔ سیرت نگاری میں ''رہبر انسانیت''، ''نقوش سیرت''، ''سیرت محمدی ﷺ - انسانیت کے لیے اعلیٰ نمونہ''، ''رحمۃ للعالمین ﷺ (خصوصیات وشمائل اور خصائل نبوی)'' اور ''محمد رسول اللہ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں'' آپ کے قلم کے تابندہ نقوش ہیں جن میں ہزاروں صفحات کے مطالعہ کو نچوڑ کر پیش کیا گیا ہے۔

ادب اسلامی:

آپ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے اساسی اراکین میں سے تھے۔ اس کے بانی وصدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے انتقال کے بعد آپ کو برصغیر ہندو پاک کے رابطہ کا صدر منتخب کیا گیا۔ پھر رابطہ کے دوسرے صدر ڈاکٹر عبد القدوس ابو صالحؒ کی وفات کے بعد آپ کو بین الاقوامی طور پر عالمی رابطہ ادب اسلامی کا صدر منتخب کیا گیا۔ آپ کی سرپرستی میں رابطہ کا سہ ماہی رسالہ کاروانِ ادب دارالعلوم ندوۃ العلماء میں واقع رابطہ کیدفتر سے مستقل نکلتا رہا۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے طول وعرض میں رابطے کے سالانہ اجلاس آپ کی سرکردگی میں ہوتے رہے۔ ادب اسلامی کے سلسلے میں آپ کی کتابیں "الأدب الإسلامي وصلته بالحياة" "أضواء على الأدب الإسلامي" "رسالة المناسبات الإسلامية" ''دین وادب'' اور ''غبار کارواں'' سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

ادب عربی:

ادب عربی آپؒ کا بنیادی موضوع تھا۔ ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندویؒ کے بعد آپ کو ندوۃ العلماء میں ادیبِ اول کے منصب سے نوازا گیا تھا۔ ندوہ میں آپ کا تقرر عربی ادب کے استاد کی حیثیت سے ہوا۔ اس موضوع پر آپ نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں ''تاریخ الادب العربی- العصر الاسلامی''، ''الادب العربی بین عرض ونقد'' اور ''معلم الانشاء'' (حصہ سوم) کو بڑا نمایاں مقام حاصل ہے۔

مسلم پرسنل لا بورڈ:

آپ مسلم پرسنل لا بورڈ کے چوتھے صدر تھے۔ آپ کی صدارت کا زمانہ سب سے زیادہ طویل رہا۔ قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات کے بعد ۲۰۰۲ء سے اپنی وفات ۲۰۲۳ء تک آپؒ یہ فریضہ انجام دیتے رہے۔ اس طرح آپ پورے ۲۰ سال تک ہندوستانی مسلمانوں کے متحدہ پلیٹ فارم سے ان کی قیادت کرتے رہے۔ اس سلسلے میں آپؒ کی نگارشات ''مسلمانوں کا عائلی قانون- مخالفت اور موافقت کی روشنی میں''، ''مسلم پرسنل لا بورڈ: کام اور پیام'' اور ''مسلم پرسنل لا بورڈ: مزاج اور طریقہ کار'' وغیرہ اس بورڈ کو سمجھنے کے لیے قیمتی تحریریں ہیں۔

آپؒ کی فقہی بصیرت آپ کی عربی کتاب "أضواء على الفقه الإسلامي، ومكانة الإجتهاد منه" سے عیاں ہے۔ اس میں آپؒ نے فقہی اختلاف کی حقیقت سے بحث کرتے ہوئے اس کے فائدے بتائے ہیں، اسے آسانی اور رحمت بتایا ہے۔ دورِ حاضر کے نت نئے مسائل کے حل کی تلاش کو ایک اسلامی تقاضہ مانا ہے۔ مختلف زمانوں میں اجتہاد کا ایک تاریخی جائزہ پیش کیا ہے۔ نیز سودکاری کے پھیلے ہوئے نظام کا اسلامی شریعت کے مخالف ہونا واضح کیا ہے۔ یہ کتاب تحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے جن کو مولانا نے مختلف سیمیناروں میں پیش کیا تھا۔ مولانا ڈاکٹر علی احمد ندوی نیان کو جمع کر کے مرتب کیا اور دارالقلم دمشق سے ۲۰۰۵ء میں اس کی اشاعت ہوئی۔ اس کا اردو ترجمہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے المعہد العالی للقضاء والافتاء نے ''فقہ اسلامی اور عصر حاضر'' کے نام سے ۲۰۰۹ء میں شائع کیا۔

صحافت:

اس میدان میں آپؒ نے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ عربی صحافت میں آپ کا یہ کارنامہ کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ آپ نے عربی جریدہ ''الرائد'' ۱۹۵۹ء میں شروع کیا اور تادم واپسیں آپؒ اس کی سرپرستی فرماتے رہے۔ اس جریدے نے مولانا کے اشراف

میں ترقی کی منزلیں طے کیں اور اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ عربی صحافت میں اپنا کردار ادا کررہا ہے۔ اس میں لکھے گئے آپ کے اداریے اسلامی صحافت کا بہترین سرمایہ ہیں۔ اس کے علاوہ ندوۃ العلماء کے ماہنامہ عربی مجلّے ''البعث الاسلامی'' کو بھی ایک طویل عرصے تک آپ کی سرپرستی حاصل رہی اور اس میں آپ کے معلومات افزا مقالات شائع ہوتے رہے۔ ان دونوں عربی پرچوں کے علاوہ کئی اور علمی وتحقیقی، دینی وادبی رسالوں کو آپ سے شرف انتساب حاصل رہا۔ اور آپ کی رہنمائی میں عربی، اردو، انگریزی اور ہندی زبانوں میں اسلامی اور تعمیری صحافت پروان چڑھتی رہی۔

''البعث الاسلامی'' اور ''الرائد'' میں مولاناؒ کے جو مضامین چھپے ان کا ایک مجموعہ ''العالم الاسلامی الیوم: قضایا وحلول'' کے نام سے ۱۴۲۴ھ مطابق ۲۰۰۴ء میں کتابی شکل میں مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہوا۔ مولانا کی ایک دوسری کتاب ''عالم اسلام اور سامراجی نظام امکانات اندیشے اور مشورے'' ہے۔ اس کے بیشتر مضامین سابق الذکر عربی رسالوں میں نشر ہوئے- پھر ان کے اردو ترجمے ندوے کے اردو رسالے ''تعمیر حیات'' میں نشر ہوئے۔ تیسری کتاب ''مسلم سماج، ذمہ داریاں اور تقاضے'' ہے جس کی دوسری اشاعت ۱۴۳۸ھ مطابق ۲۰۱۷ء میں دارالرشید لکھنؤ سے ہوئی، اس کے بیشتر مضامین ''تعمیر حیات'' میں شائع ہوئے۔

ان کتابوں کے مطالعہ سے ایک مفکر ومدبر، اسلامی بیداری کے متمنی وکوشاں، ماہر تعلیم وتربیت کے ارشادات وملاحظات سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ ان کتابوں میں ہر صاحبِ فکر وعمل کے لیے اور خصوصاً دلِ دردمند رکھنے والے صحافیوں کے لیے بڑی رہنمائی موجود ہے۔

سفرنامے:

آپؒ نے علمی ودعوتی مقاصد کیلیے وطنِ عزیز کے مختلف علاقوں کے علاوہ دنیا کے ایک بڑے حصے کی جہانبانی کی۔ آپ نے امریکہ، کناڈا، لندن، ترکی، سعودی عرب، مراکو (مغرب اقصی)، لیبیا، مصر، ازبکستان، تاجکستان وغیرہ کے اسفار کیے۔ اس سلسلے میں آپ کی کتابیں ''دو مہینے امریکہ میں''، ''سمرقند وبخارا کی بازیافت'' ''تحفہ جنوب'' اور ''تحفہ گجرات'' وغیرہ بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ ان کتابوں میں آپ نے متعلقہ علاقوں کے موجودہ حالات پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ وہاں کی تاریخ اور جغرافیہ کا جائزہ لیا ہے۔ نیز ان ممالک میں مسلمانوں کی صورت حال، دعوتی سرگرمی کی رفتار اور امیدوں واندیشوں کو سپرد قلم کیا ہے۔ آپؒ کی کتاب ''جزیرۃ العرب'' اس سلسلے کی بڑی اہم کڑی ہے۔ اس کی تالیف کا ایک اہم مقصد تعلیمی اداروں کے نصابِ تعلیم کے لیے جغرافیہ کے موضوع پر ایک مناسب کتاب کی تیاری بھی تھی۔ یہ کتاب ۱۹۶۲ء میں تیار کی گئی اور علمی وتحقیقی حلقوں میں مقبول ہوکر ندوۃ العلماء اور کئی تعلیمی اداروں کے نصابِ تعلیم میں داخل ہوئی۔ آپ کے سفرنامے ذاتی مشاہدات، تاریخی حقائق، متعلقہ علاقے کی جغرافیائی حدود، آپ کی دینی فکر وفراست، اور علمی مشوروں سے عبارت ہیں۔

چند اہم تصانیف:

آپؒ کی فکر وعمل کے مختلف گوشوں؛ قرآن کریم کی خدمت، سیرت نگاری، ادبِ اسلامی، ادبِ عربی، مسلم پرسنل لا بورڈ، صحافت اور سفرنامے پر مختصر گفتگو کرنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کی چند اہم کتابوں کا تعارف پیش کیا جائے تاکہ مذکورہ اختصار کی کچھ تفصیل سامنے آجائے۔

قرآن کریم- انسانی زندگی کا رہبر کامل:

مولاناؒ کی عمر کا ایک بڑا حصہ قرآن کریم کی تفسیر وتشریح میں گزرا ہے۔ آپ نے حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے علم وعمل کے مختلف میدانوں میں بھرپور استفادہ کیا، اسی طرح قرآن کی تفسیر وتشریح میں بھی نہ صرف یہ کہ آپ نے ان سے خاطر خواہ استفادہ کیا بلکہ اس سلسلے میں ان کی نیابت وجانشینی کی ذمے داری

بھی سنبھالی۔ مفکر اسلام کی وفات کے بعد سے اپنی وفات تک ہر رمضان میں آپ تکیہ کلاں، رائے بریلی کی مسجد کے اندر تفسیر قرآن کا درس دیتے اور بڑی تعداد میں دور دراز علاقوں سے آئے ہوئے لوگ اس درس قرآن سے مستفید ہوتے۔

کتاب کی ابتدا مؤلف کے پیش لفظ سے ہوئی ہے۔ پھر مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ معتمد تعلیمات ندوۃ العلماء کا بیش قیمت مقدمہ ہے جس میں انہوں نے مختلف زاویوں سے قرآن پر لکھی جانے والی کتابوں کا ایک تاریخی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد کتاب اور صاحب کتاب کا تعارف کرانے کے ساتھ ساتھ سبب تالیف پر بھی گفتگو کی ہے۔

پہلا باب ''قرآن مجید اور علم'' کے عنوان سے ہے جس میں علم کی اہمیت، قرآن مجید کے بلند مقام، کائنات اور خالق کائنات، علم الٰہی کی وسعت کائنات کے مربوط نظام عمل وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا باب ''قرآن مجید اور انسان'' کے عنوان سے ہے جس جنات اور انسان کے درمیان فرق اور ابلیس کی انسان سے دشمنی بیان کرنے کے بعد انسان کی فضیلت وخصوصیت پر گفتگو کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ انسان کا اصل امتیاز اس کا اچھا کردار ہے۔

تیسرا باب ''خالقِ کائنات کی تابعداری'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ خالق حقیقی کی تابعداری قرآن کے احکام کو بجالا کر اور آخری نبی ﷺ کے نمونہ زندگی کو اپنا کر ہی کی جا سکتی ہے۔ چوتھا باب ''انبیاء کرام کی بعثت'' کے بیان میں ہے۔ اس میں مختلف انبیاء کے جو قرآن میں آئیں ہیں ان پر روشنی ڈالنے کے بعد آخری نبی سیدنا محمد ﷺ کی بعثت اور اسوہ حسنہ پر قرآن مجید کی شہادتیں پیش کی گئی ہیں اور اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ قرآن مجید اور آپ ﷺ کی حدیث دونوں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ وحی کے دو جزء ہیں اور ہدایت انسانی کا ذریعہ ہیں۔

پانچواں باب ''قرآن آخری کتاب ہدایت'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں نزول قرآن اور اس کی حفاظت، نزول وحی کی مختلف صورتیں، اول اور آخری قرآنی آیات، مکی اور مدنی سورتیں نیز جمع وتدوین قرآن کے مختلف مراحل سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ دیگر ابواب میں قرآن کی خصوصیات وامتیازات، فنی ومعنوی خوبیوں، علوم ومباحث، اعجاز کے مختلف پہلوؤں کو قاری کے ذہن نشین کرایا گیا ہے۔ قرآن کے احکام کو ایک مستقل باب میں بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ومرتبہ کی وضاحت میں ایک پورا باب ہے۔ کتاب کے آخری حصے میں حسن سیرت واخلاق کے لیے قرآنی ہدایات تفصیل سے بتائی گئی ہیں جو یقیناً ہر صاحب ایمان کے لیے بڑا قیمتی اثاثہ ہیں۔ گیارہ ابواب اور ۳۶۸ر صفحات پر مشتمل یہ کتاب مختلف ناحیوں سے انسانی زندگی میں قرآن کی رہبری واضح کرتی ہے اور قاری کو اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ وہ اللہ کی کتاب سے زندگی کے مختلف گوشوں میں رہنمائی حاصل کرے۔ اس کتاب کی اشاعت دوم دارالرشید لکھنؤ سے ۱۴۳۴ھ-۲۰۱۲ء میں ہوئی۔

دین وادب:

یہ کتاب اس اہم سیمینار کی روداد ہے جو عالمی رابطہ ادب اسلامی تحریک کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور جس کا انعقاد ۱۱ تا ۱۳ر جمادی الاخری ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۷ تا ۱۹ر اپریل ۱۹۸۱ء کو ندوۃ العلماء کی لائبریری کے وسیع وعریض ہال میں ہوا۔ مولانا رابع حسنی ندویؒ کے تمہیدی مضمون ''ندوۃ العلماء میں عربی واسلامی ادب پر تاریخی مذاکراہ'' سے اس کتاب کی ابتدا ہوئی ہے۔ بعد ازاں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے قلم سے عرب مہمانوں کے لیے دعوت نامہ کا اردو ترجمہ جس کو مولانا شفیق الرحمٰن ندویؒ نے تیار کیا تھا وہ شامل کتاب ہے۔ پھر حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا صدارتی خطاب جس کا اردو ترجمہ مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ نے کیا تھا وہ پیش کیا گیا ہے۔ اس خطاب میں مولانا نے بطور خاص اس بات کو واضح کیا ہے کہ ندوۃ العلماء کے ذمہ داروں نے جس نصاب تعلیم کی طرف پہل ہے، اس

میں دین وادب ایک دوسرے کے ہم نوا اور معاون نظر آتے ہیں۔ اسی مولانا نے اس بات پر زور دیا کہ ادب کی ابتدا آسمانی صحیفوں سے ہوئی اور خدا کی آخری کتاب نے اس ہمیشہ کے لیے مہر ثبت کردی۔ انسان قرآن جیسا ادب پیش کرنے سے قاصر ہے۔

اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن رافت پاشاؒ (پروفیسر امام محمد بن سعود یونیورسٹی-ریاض) کا پرمغز خطاب ''اسلام کا ادبی وتنقیدی نظریہ'' پیش کیا گیا ہے۔ اس کا ترجمہ مولانا شمس تبریز خانؒ نے کیا ہے۔ اس میں ادب اسلامی کی دعوت اور اس سلسلے میں سرگرداں لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے ادب اسلامی کے تعارف اور اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شیخ عبداللہ انصاری (ناظم امور مذہبی حکومت قطر) کے خطاب بعنوان ''ادب اسلامی کے عناصر'' کا اردو ترجمہ مولانا شمس الحق ندوی مدظلہٗ کے قلم سے پیش کیا گیا ہے۔ پھر اس سیمینار میں پڑھے گئے مقالات کی فہرست پیش کی گئی ہے جس میں ۲۸/مقالات اور ۱۰/قصیدے عربی میں، ۱۸/مقالات اردو میں، ۵/مقالات انگریزی میں اور ایک مقالہ فارسی میں ہے۔

الغزل الأردي محاوره ومكانته فى الشعر:

غزل سے متعلق مولاناؒ کے مختلف مضامین جو عربی جریدہ الرائد میں نشر ہوئے تھے ان کا مجموعہ یہ کتاب ہے۔ مؤلف نے اپنے مقدمہ میں صنف غزل کی حقیقت سے کرتے ہوئے اسے وجدانی شاعری کی ایک قسم قرار دیا ہے۔ نیز یہ بتایا ہے کہ عربی کے مقابلے میں فارسی واردو اور ترکی کی غزل میں زیادہ توسع پایا جاتا ہے۔ مولانا واضح صاحبؒ نے اپنے فاضلانہ مقدمہ میں عربی ادب کی صنف غزل اور اردو وفارسی ادبوں میں صنف غزل کے درمیان موازنہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان زبانوں کی غزل کا دائرہ تصوف، اخلاق اور وعظ ونصیحت تک وسیع وعریض ہے۔

اس کتاب کی ابتدا میں غزل کی اہمیت پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی حقیقت وماہیت، نسیب وتشبیب، مختلف ماحول ومواقع کی رعایت رکھتے ہوئے اس کے اسلوب میں تبدیلی ہونے پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ پھر فارسی شعراء جلال الدین رومی، شیخ سعدی، امیر خسرو دہلوی، خواجہ حافظ شیرازی، عبدالرحمٰن جامی کی غزل کے نمونے پیش کرتے ہوئے ان کی خصوصیات کو واضح کیا ہے۔ بعد ازاں اردو غزل پر گفتگو کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس میں نسیب وتشبیب، قصیدہ، رباعی، قطعہ اور مثنوی وغیرہ غزل کی قسمیں ہیں۔ مرزا مظہر جان جاناں، مرزا محمد رفیع سودا، خواجہ میر درد، میر محمد تقی میر، محمد ابراہیم ذوق، بہادر شاہ ظفر، محمد مؤمن خان مؤمن اور مرزا اسد اللہ خان غالب کی شاعری کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ زمانہ استعمار کی اردو غزل سے بحث کرتے ہوئے الطاف حسین حالی، علامہ شبلی نعمانی، اکبر حسین الہ آبادی، ڈاکٹر محمد اقبال کی شاعری پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عصر حاضر کی اردو غزل کے لیے جگر مرادآبادی اور کلیم عاجز کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے اور ان کی غزلیہ شاعری کی فنی خصوصیات سے بحث کی گئی ہے۔ ۱۳۵/صفحات پر مشتمل اس کتاب کی پہلی اشاعت دفتر عالمی رابطہ ادب اسلامی ندوۃ العلماء لکھنؤ سے ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۰۰۶ء میں ہوئی۔

الأدب الإسلامي وصلته بالحياة:

اس کتاب میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ادب کا زندگی اور اسلام سے کیا تعلق ہے اور اسلامی اور غیر اسلامی ادب میں کیا فرق ہے۔ جاہلی ادب پر ایک نظر ڈالنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اسلامی ادب تعمیری ہوتا ہے۔ اسلامی ادب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی قسم خالص دینی ادب کی ہے اور دوسری قسم عام ادب ہے جو اسلامی اقدار کے خلاف نہ ہو۔ حدیث نبوی کے ادب کا جائزہ لیتے ہوئے اس میں موجود لطافت، انسانی خیرخواہی وہمدردی، رحمت ومودت، تشبیہات وتمثیلات، تربیتی پہلو، بیان وتفہیم کی خوش اسلوبی وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ صحابہ کرامؓ کی نثر میں ان کے اسلوب بیان پر گفتگو کرتے ہوئے مختلف نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ خاص

طور سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے خطبوں اور رسائل میں پائی جانے والی فصاحت وبلاغت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی وفات پر ان کے تعزیتی کلمات کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ صحابہ کرامؓ کے شعری نمونوں کو پیش کرتے ہوئے مختلف اصناف شعر سے بحث کی گئی ہے۔ یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلام نے صنف شاعری کو وسعت دی ہے اور اس میں نئے موضوعات کا اضافہ کیا ہے۔ حضرت حسان بن ثابتؓ کی جاہلی اور اسلامی شاعری کا جائزہ لیتے اس کی فنی خصوصیات پر گفتگو کی گئی ہے۔ اسی طرح خلفائے راشدین کی شعر گوئی سے بھی تعرض کیا گیا ہے۔

۹۶ رصفحات پر مشتمل یہ کتاب دراصل مؤلف کا وہ علمی وتحقیقی مقالہ ہے جس کو انہوں نے رابطہ ادب اسلامی کے پہلے سیمینار میں پیش کرنے کے لیے تیار کیا تھا اور جس کا انعقاد ۱۴۰۱ھ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اندر ہوا تھا۔ اس کتاب پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا گرانقدر مقدمہ ہے جس میں انہوں نے اسلامی ادب کی حقیقت وماہیت پر گفتگو کرتے ہوئے اس کتاب کی تالیف کا پس منظر بیان ہے۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت ۱۴۰۵ھ مطابق ۱۹۸۵ء میں مؤسسۃ الرسالہ بیروت سے ہوئی۔

أضواء على الأدب الإسلامي:

یہ کتاب مولانا کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان مضامین کا مرکز موضوع اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے کہ دینی مصادر ادب کی چاشنی سے خالی ہوتے ہیں۔ اس میں مولانا نے اس بات پر زور دیا ہے کہ قرآن وحدیث باوجودیکہ خالص دینی واخلاقی اور معاشرتی وروحانی تعلیمات کا منبع وسرچشمہ ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ادب کے لعل وگوہر کا خزینہ بھی ہیں، جس طرح ان سے روح کی سیرابی اور اخلاق حمیدہ کی آبیاری ہوتی ہے اسی طرح علم وادب اور تحقیق وجستجو کی راہ میں بھی ان سے استفادہ ناگزیر ہے۔

قيمة الأمة الإسلامية منجزاتها وواقعها المعاصر:

یہ کتاب عربی کے سات علمی وتحقیقی مقالات کا مجموعہ ہے؛ پہلا مقالہ ”قرآن وحدیث کی روشنی میں امت مسلمہ کی وسطیت“ ہے۔ اس میں دیگر امتوں کے مقابلے میں امت مسلمہ کی حیثیت پر گفتگو کرنے کے بعد وسطیت کے مفہوم سے بحث کی گئی ہے۔ اس امت کی خصوصیات میں بتایا گیا ہے کہ اس کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر مبعوث کیا گیا ہے۔ اس کا دین کامل ہے اور وہ باقی رہنے والی امت ہے۔ اس کی ابتدا کے ساتھ ہی دنیا میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا جو وسیع علم وفکر کا دور تھا۔ اسلام کے سیاسی واقتصادی نظام کا زمانہ تھا۔ معاشرتی حقوق پر روشنی ڈالتے ہوئے مرد وزن کے درمیان جذباتی ہم آہنگی سے بحث کی گئی ہے۔ انسانی کی خوبیوں پر گفتگو کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اسلام ہی تمام مشکلات کا واحد علاج ہے۔

اس کتاب کے دوسرے مقالہ میں امت مسلمہ کی خصوصیات اور اس کی ذمے داریوں سے بحث کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ امت مسلمہ دیگر اقوام وملل کیلیے ایک رہنما کی حیثیت رکھتی ہے، انسانی معاشرے میں اتحاد واتفاق کی ابتدا حق کی دعوت سے ہونی چاہیے۔ نبی آخر الزماں ﷺ کی آمد سے ایک نئے دور کا آغاز ہوا اور آپ کی ذات مبارک انمول خصوصیات سے متصف تھے۔ آپ کو آخری آسمانی کتاب اور سب سے مکمل شریعت سے نوازا گیا۔ ملت اسلامیہ نے علمی میدانوں کو جلا بخشی اور ان کے دائروں کو وسیع تر کیا۔ حق کی دعوت کا دائرہ بھی بڑا وسیع ہے۔ امت مسلمہ کو اپنی ذمے داریوں کے احساس کے ساتھ ساتھ علم وعمل کا جامع ہونا چاہیے۔ اس امت کا قبلہ جغرافیائی اعتبار سے پوری دنیا کا مرکزی خطہ ہے۔ امت مسلمہ کا روحانی تعلق سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے ہے۔ دعوت وتبلیغ میں کوئی جبر نہیں ہونا چاہیے۔ دعوت کے راستے میں آنے والی مشکلات کا سامنا خندہ پیشانی اور عزیمت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ اس امت کی سب سے اہم خصوصیت اعتدال وتوازن ہے۔ جہاد دراصل نفس پر قابو اور قربانی پیش کرنے کا نام ہے۔ دین قبول کرنے پر کسی کو مجبور کرنا کسی طرح بھی درست نہیں۔

عالم اسلام میں انسانی علوم کے عنوان سے ایک مضمون میں

مؤلف نے یونیورسٹیز اور تحقیقی اداروں کے زندگی پر پڑنے والے اثرات کی وضاحت کی ہے۔ انسانی علوم سے استفادہ کرنے میں اسلامی اور مغربی طریقہ کار سے گفتگو کی گئی ہے۔ نیز اس بات سے بحث کی گئی ہے کہ مشرقی قومیں ترقی میں پیچھے کیوں ہیں، انسانی علوم کے تعلق سے مسلمانوں کی کیا ذمے داری ہے اور مسلمان کس احساس کمتری کا شکار ہیں۔ مسلم دنیا کی دانش گاہوں کی افسوس ناک صورت حال پیش کرنے کے ساتھ مؤلف نے مسلمانوں میں احساس ذمہ داری کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

ایک مضمون میں قوموں کی زندگی میں ثقافت کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسلامی ثقافت کے نظام سے بحث کرتے ہوئے اخلاق ومساوات، صلہ رحمی اور معاشرتی زندگی بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ صحیح معنوں میں وہی علم کارآمد ہے جس سے انسان کی رسائی اس کے خالق تک ہو سکے۔ فن اور ذوق کے اسلامی نظریہ کو پیش کرنے کے بعد اس بات سے بحث کی گئی ہے کہ تربیت وراہنمائی میں اسلامی ثقافت کی اسٹریٹیجی کیا ہونی چاہیے۔ آخری مضمون میں شاعر مشرق ڈاکٹر محمد اقبال کے حوالہ سے مسلمان کے مقام ومرتبہ پر روشنی ڈالتے ہوئے اسے ایک ابدی وسرمدی پیغام کا حامل بتایا گیا ہے اور اس کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ کتاب مولانا کے مقالات کا مجموعہ ہے جن کو عرب ممالک میں مختلف سیمیناروں میں پیش کرنے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اس کی دوسری اشاعت ۱۴۲۳ھ مطابق ۲۰۰۲ء میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے ہوئی۔

العالم الإسلامي اليوم قضايا وحلول:

یہ کتاب ان مضامین کا مجموعہ ہے جو البعث الاسلامی اور الرائد میں ایک لمبے عرصے سے شائع ہو رہے تھے۔ ان مضامین کا امتیاز یہ ہے کہ ان کے اندر مسلمانوں کے حساس مسائل پر گفتگو کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ موجودہ زمانے میں مسلمان کن مشکلات سے دوچار ہیں اور انہیں کیا کرنا چاہیے۔

اس کتاب پر مولانا واضح صاحبؒ کا بیش قیمت مقدمہ ہے جس میں انہوں نے کتاب کی افادیت پر گفتگو کی ہے۔ اس کتاب کے موضوعات میں پہلا موضوع تعلیم وتربیت ہے جس میں اس موضوع کی اہمیت واضح کرتے ہوئے معاشرے کی اصلاح میں اسلامی تربیت کے اثر انگیزی پر روشنی ڈالی ہے اور یہ بتایا ہے کہ تعلیمی خدمات انجام دینے والے معاشرے کی ایک اہم ضرورت پوری کرتے ہیں۔ تعلیم وتربیت قوموں کی ترقی کی کنجی ہے۔ اسلامی تربیت انسان کو دونوں جہانوں میں سرخرو بناتی ہے۔

کتاب کا دوسرا موضوع اسلامی معاشرے کی تعمیر اور اس کی خصوصیات ہیں۔ اس میں مختلف حیثیتوں سے مسلم معاشرہ کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اسلامی تعلیم وتربیت ہی سے معاشرے کی صحیح تعمیر ہو سکتی ہے۔ نیز زندگی کے مختلف شعبوں میں حکمت واعتدال، بچوں کی تربیت میں گھریلو ماحول اور خاص طور پر والدہ کے کردار، قدیم صالح اور جدید نافع کو اختیار کرنے، نصاب تعلیم کی اہمیت، مسجدوں میں چلنے والے مکاتب کی اہمیت وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرا موضوع اسلامی دعوت اور اس کے طریقوں کے تعلق سے ہے۔ اس میں عہد حاضر کی مختلف تحریکوں کا جائزہ لینے کے بعد اسلامی دعوت کے مناسب طریقے کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ چوتھا موضوع اسلامی بیداری کی اساسیات سے متعلق ہے۔ اس میں علمی وتحقیقی کاموں اور ذرائع ابلاغ کی اہمیت وافادیت واضح کی گئی ہے۔ معاشرے کی اصلاح کو اسلامی بیداری کی اساسیات میں سے بتایا گیا ہے۔ انفرادی واجتماعی تربیت کو نشأۃ ثانیہ کا پیش خیمہ بتایا گیا ہے۔

پانچواں موضوع فکری یلغار سے مدمقابل ہونے کی ضرورت سے متعلق ہے۔ چھٹا موضوع ملت اسلامیہ کی خصوصیات سے بحث کرتا ہے۔ ساتواں موضوع دعوت کے تعلق سے مسلمانوں کی ذمے داری پر

روشنی ڈالتا ہے۔آٹھواں موضوع سیاست وثقافت کے کچھ اہم حقائق کو بیان کرتا ہے۔نواں موضوع اسلامی تاریخ کے کچھ اسباق کو پیش کرنے میں ہے۔۲۳۶رصفحات پر مشتمل اس کتاب کی پہلی اشاعت ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰۰۴ء میں ہوئی۔ جب کہ دوسری اشاعت ۱۴۳۲ھ مطابق ۲۰۱۱ء میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے ہوئی۔

مختار الشعر العربي:

دوحصوں پر مشتمل یہ کتاب عہد اسلامی سے عہد عباسی تک کے چند شعراء کے منتخب اشعار کا مجموعہ ہے۔ پہلے حصے میں عہد اسلامی کے شعراء حسان بن ثابتؓ، کعب بن زہیرؓ، خنساءؓ اور عہد اموی کے شعراء حطیئہ، فرزدق، جریر، عمر بن ربیعہ اور اخطل کے اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔دوسرے حصے عہد عباسی کے شعراء میں سے ابوتمام، بحتری، متنبّی، ابوفراس، شریف رضی، ابوالعلاء معری کے اشعار کا انتخاب پیش کیا گیا ہے۔یہ کتاب دراصل ندوۃ العلماء کی اصلاح نصاب تعلیم تحریک کی ایک کڑی ہے۔اس کی اشاعت کلیۃ اللغۃ العربیۃ وآدابہا دارالعلوم ندوۃ العلماء سے ۱۴۰۳ھ مطابق ۱۹۸۳ء میں ہوئی۔شعری نمونے پیش کرنے کے علاوہ اس کتاب میں مذکور ہر شاعر کا جامع ترین تعارف کرایا گیا ہے اور اس کے کلام کی فنی خصوصیات سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب ندوۃ العلماء اور دیگر کئی دینی وعصری درسگاہوں میں داخل نصاب ہے۔

معلم الإنشاء:

اس کتاب کے ابتدائی دو حصے مولانا عبد الماجد عظیم آبادی ندویؒ نے تیار کیے تھے۔ تیسرا حصہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے تیار کیا۔ یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں مضمون نگاری کی طرف رغبت دلائی گئی ہے اور اس کی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔دوسرا باب عربی میں انشاپردازی کے اصول وضوابط پر منحصر ہے۔ ۱۳راسباق پر مشتمل اس باب میں مقالہ نگاری، قصہ نویسی، رسائل اور ترجمہ نگاری کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔تیسرے باب میں مختلف موضوعات پر مضمون کے افتتاح واختتام کے طریقوں سے بحث کی گئی ہے اور اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ چوتھا باب اصناف نثر سے متعلق ہے، اس میں فکری مضامین کا تعارف کرایا گیا ہے۔ نیز عربی میں مذکرات لکھنے اہمیت بتائی گئی ہے۔ پانچویں باب میں الفاظ اور جملوں کی درستگی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔اس باب میں مصطفیٰ لطفی منفلوطیؒ، سید قطب شہیدؒ، احمد حسن زیاتؒ، علی طنطاویؒ، مولانا محمد ناظم ندویؒ، مولانا مسعود عالم ندویؒ اور حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ وغیرہ کے ادبی شہ پاروں کو بطور نمونہ پیش کیا گیا ہے۔عربی طرز تحریر کو بہتر سے بہتر بنانے کے سلسلے میں یہ کتاب اہل قلم کے لیے ایک انمول تحفہ ہے۔ اس میں مولانا کی علمی وادبی بصیرت اور تعلیمی وتربیتی مہارت پوری طرح جلوہ گر نظر آتی ہے۔

مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ عہد ساز شخصیت:

۳۶۰رصفحات اور چھے ابواب پر مشتمل یہ کتاب مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے اہم کارناموں پر ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ مولانا رابع صاحبؒ نے مشاہدات وتجربات کی روشنی میں ان کی زندگی کو یوں پیش کیا ہے کہ تمام چیزیں نظروں کے سامنے ہوتی محسوس ہوتی ہیں۔

کتاب کا پہلا باب حالات زندگی کے ایک مختصر جائزہ کو پیشِ کرتا ہے۔ دوسرا باب تعلیم وتربیت اور تعمیر شخصیت کے بیان میں ہے۔تیسرے باب میں عملی زندگی اور جدوجہد کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چوتھا باب مولانا کی قیادت میں تحریکوں اور اداروں کے قیام اور ان کی پیش رفت کے بیان میں ہے۔ پانچواں باب بیرون ملک مولانا کے دعوتی اسفار کی روداد ہے۔ چھٹے باب میں مولانا کی تصنیفات ورسائل کرانے کے بعد مولانا کی شخصیت کے تعارف میں اہل قلم کی مختلف تصنیفات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

عرض ناشر کے عنوان سے مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کی گراں قدر تحریر موجود ہے جس میں انہوں نے کتاب اور صاحب

کتاب کا تعارف کرایا ہے۔ پھر عرض مؤلف میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی بعض خصوصیات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مولانا ڈاکٹر عبد اللہ عباس ندویؒ کے قلم سے کتاب پر فاضلانہ مقدمہ ہے جس میں انہوں نے کتاب کے موضوع سے مؤلف کی مناسبت کو بیان کرتے ہوئے اس موضوع پر قلم اٹھانے کے لیے مؤلف کی موزونیت پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کی پہلی اشاعت ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۰۰۶ء میں مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے ہوئی۔

سمرقند وبخارا کی بازیافت:

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ہمراہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا سفر سمرقند میں منعقد ہونے والے ایک سیمینار میں شرکت کے لیے ہوا۔ یہ کتاب اسی سفر کی روداد ہے۔ پھر موضوع سے متعلق اہم اور قیمتی معلومات کو بھی شامل کرلیا گیا ہے۔ یہ کتاب ایک سفرنامہ بھی ہے اور جغرافیہ وتاریخ سے متعلق ایک قیمتی دستاویز بھی۔ اس کتاب میں مولانا نے ترکستان وماوراء النہر، ازبکستان، وادی فرغانہ وغیرہ کا تعارف کراتے دوران سفر قلمبند کیے ہوئے اپنے مشاہدات کو پیش کیا ہے۔ ان علاقوں کے شاندار ماضی اور موجودہ صورتحال پر روشنی ڈالی ہے۔

اس کتاب پر پروفیسر وصی احمد صدیقی (سابق پرنسپل گاندھی فیض عام پوسٹ گریجویٹ کالج شاہجہانپور) کا بیش قیمت مقدمہ ہے جس میں انہوں نے اس سفرنامے کے موضوع اور متعلقہ علاقوں کی علمی وتاریخی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے۔ ۸۸/صفحات پر مشتمل یہ کتاب ۱۴۱۸ھ مطابق ۱۹۹۸ء میں پہلی دفعہ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ سے شائع ہوئی۔

غبارِ کارواں:

یہ کتاب ادب اسلامی سے متعلق مولاناؒ کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس پر پروفیسر وصی احمد صدیقیؒ کے قلم سے مقدمہ ہے جس میں انہوں نے کتاب کا تعارف کرایا ہے۔ پھر عرض مؤلف کے عنوان سے مولانا نے اس کتاب پر روشنی ڈالی ہے۔ ان مضامین میں رابطہ ادب اسلامی کے قیام، اس کے مقاصد، اس کے تخیل ومحرکات نیز اسلامی ادب کی ہمہ گیری کو بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک مضمون میں یورپ میں وجود پذیر ادبی تحریکوں کا بھی ذکر ہے۔ ادب کے فنی محاسن اور مختلف موضوعات پر لکھی گئی کتابوں میں ادب اسلامی کی نشان دہی کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں:

''علمی استدلالی موضوعات میں سہولت وسلامت ضروری ہوتی ہے اور ادبی وفنی موضوعات میں حسن تعبیر و جمال عبارت، ہمارے سلف اہل زبان وقلم نے ان باتوں کی برابر رعایت کی ہے، خالص ادبی موضوعات تو ادب کی رعایتوں کے بغیر قابل قبول ہی نہیں ہوسکتے تھے، علمی وتعلیمی موضوعات میں بھی اسلاف نے زبان کی صحت اور خوبی کا لحاظ رکھا ہے۔ نحو وصرف، بلاغت ولغت کی کتابیں ادب کے اصولوں اور تقاضوں کو کو پورا کرتی ہیں۔ زمخشری کی ''المفصل'' دیکھئے، ابن ہشام کی شرح ''شذور الذہب'' اور ''شرح قطر الندی'' عبدالقادر جرجانی کی ''دلائل الاعجاز'' اور ''اسرار البلاغۃ'' دیکھئے اور ابن منظور کی ''لسان العرب'' اسی طرح علوم دینیہ وشرعیہ میں ابن القیم کی ''زاد المعاد'' شاہ ولی اللہ کی ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اور امام غزالی کی ''احیاء العلوم'' یہ سب ادب کے تقاضوں کی پوری رعایت پر مشتمل ہیں جس کی وجہ سے ان کی افادیت اور تاثیر میں بڑا اضافہ ہوا ہے۔'' (ص ۷۸)

سوانحی ادب کی نزاکتوں اور اس سلسلے میں مناسب طرزِ تحریر اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہوئے مولانا رقم طراز ہیں:

''تذکرہ نویسی کا داعیہ بعض وقت اپنی کسی پسندیدہ شخصیت کی زندگی کو دوسروں میں متعارف صرف کرنے کا ہوتا ہے اور بعض وقت یہ کام صرف علمی وتحقیقی مقصد سے کیا جاتا ہے۔ اول الذکر صورت میں مصنف اگر پوری احتیاط اور قلمی دیانت سے کام نہ لے تو سانح، مدح وستائش کے بعض غلو والے پہلوؤں کی حامل بن جاتی ہے،

چنانچہ بزرگ شخصیتوں کے بعض تذکروں میں اس طرح کا غلو ملتا ہے، ان کے تذکرہ میں بعض بعض تصنیفیں کرامات اور غیر معمولی اوصاف کے ذکر کی حامل ملتی ہیں۔ بعض میں تو یہ فرق بھی کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ انسان کی سوانح ہے یا کسی مافوق الفطرت ذات کی۔ لیکن علمی انداز کی پابندی رکھنے کی صورت میں سوانح اپنے قارئین کے لیے ایک مؤثر تربیتی ذریعہ بن جاتی ہے۔'' (ص ۱۶۶-۱۶۷)

بچوں کے ادب پر روشنی ڈالتے ہوئے حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کے ادبی کارناموں کا ذکر کیا گیا ہے۔ اسلامی بیداری میں علامہ شبلی نعمانیؒ کا حصہ ''الفاروق'' کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبالؒ کے حوالے سے مرد مومن کی خوبیوں سے بحث کی گئی ہے۔ اردو سے ہندوستانی ثقافت وادب کا رشتہ واضح کرتے ہوئے اس کی اہمیت وافادیت کو بیان کیا گیا ہے۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تحقیقی کاوش ''ارض القرآن'' پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے اسے ایک بڑا علمی کارنامہ قرار دیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں صحافت سے متعلق ایک وقیع مضمون ہے جس میں صحافت کی اہمیت بیان کرنے کے بعد اس حقیقت کو واشگاف کیا گیا ہے کہ عالمی صحافت یہودیت کے چنگل میں ہے اور یہودی صحافت کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ وہ پڑھنے لکھنے، تحقیق ومطالعہ اور بحث ونظر میں کافی جاں فشانی اور عرق ریزی سے کام لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ذرائع ابلاغ کے کلیدی منصوبوں پر یہودی طویل پلاننگ اور سخت فکر وتدبر سے پہنچے ہیں اور اب ذہنوں کی کنجی ان کے ہاتھوں میں ہے۔

اسلامی صحافت سے بحث کرتے ہوئے مولانا نے وضاحت کی ہے کہ عالم اسلام خصوصاً عالم عربی سے ہزاروں کی تعداد میں رسائل وجرائد نکل رہے ہیں۔ ان میں سے متعدد اپنے ظاہری محاسن اور رنگ وجمال کے ساتھ ساتھ معنوی خوبیوں میں بھی ممتاز ہوتے ہیں، دراصل اسلامی صحافت امت مسلمہ کے اتحاد کا علامتی نشان ہے۔

جدید صحافت کے میدانِ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ سیاست، ثقافت، اصلاح معاشرہ، کسب معاش ونفع اندوزی اور اقتصادی مقاصد کا حصول موجودہ صحافت کے مختلف پہلو ہیں۔ لہٰذا ایک حساس قلم کار کی ذمے داری ہے کہ وہ پہلے صحافت کے اصول ومزاج کو سمجھے اور ان حدود کا تعین کرے جن میں اسے کام کرنا ہے نیز اپنے اندر ایسی استعداد پیدا کرے کہ تعلیم یافتہ طبقے کے روبرو اپنی فکر کو طاقتور اور ٹھوس انداز میں پیش کر سکے۔

ادب اور تاریخ وصحافت وغیرہ موضوعات پر مشتمل یہ کتاب درحقیقت دانشور طبقے کے لیے ایک گرانقدر علمی تحفہ ہے جس میں مختلف ناحیوں سے مسلمانوں کے علمی وادبی کارناموں کو پیش کرنے کے ساتھ ساتھ مولانا نے قیمتی ہدایات، مشوروں اور تجاویز کے ذریعہ امت کی رہنمائی کی ذمہ داری ادا کی ہے۔ ۳۱/ مضامین اور ۲۳۴/ صفحات پر مشتمل اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۴۲۲ھ مطابق ۲۰۰۱ء میں جب کہ دوسرا ایڈیشن ۱۴۲۶ھ مطابق ۲۰۰۵ء میں ندوۃ العلماء میں موجود رابطہ ادب اسلامی کے دفتر سے شائع ہوا۔

اوراقِ زندگی:

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی اس کتاب میں ان کی آپ بیتی ہے اور آٹھ دہائیوں سے زیادہ کے عرصے میں پیش آنے والے اہم حادثات وواقعات کا آنکھوں دیکھا حال ہے۔ ماضی کے جھروکوں سے کچھ تاریخی، خاندانی جھلکیاں، زندگی کے کچھ سبق آموز واقعات، مطالعاتی وتدریسی مشاغل، تعلیمی، دعوتی اسفار، اہم دینی، علمی اور ادبی اور شخصیات سے ملاقاتیں، دینی ملی، تعلیمی اور دعوتی تحریکات سے وابستگی کا حال اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔

اس کتاب کی اہمیت اور ضرورت تالیف پر مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی مدظلہ یوں رقمطراز ہیں: ''حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو اپنے نامور ماموں حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کے ساتھ رہنے کا جتنا موقع ملا، یقیناً کسی دوسرے کو اتنا موقع نہیں ملا، سفروں میں ساتھ، کاموں میں ساتھ، مشوروں میں ساتھ، ملاقاتوں

میں ساتھ، کانفرنسوں اور سیمیناروں میں ساتھ بہت کچھ دیکھا، بہت کچھ جانا اور بہت کچھ سمجھا۔ ضرورت تھی کہ ان کی زندگی کے حالات، مشاہدات و تجربات سامنے لائے جائیں تاکہ لوگ اس دور کو دیکھ سکیں، اس دور کے مسائل کو حل کرنے کے لیے جو کوششیں کی گئیں ان کوششوں سے واقف ہوسکیں۔'' (ص ۱۷)

استاذ گرامی حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ کی ایماء پر مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ نے اس کتاب کو مرتب کیا، ''کاروان زندگی'' اور ''تعمیر حیات'' کی مختلف فائلوں میں انھیں موضوع سے متعلق جو چیز بھی ملتی اسے وہ شامل کتاب کر لیتے، اسی طرح سفر و حضر میں جہاں کہیں انھیں موقع ملتا، مؤلف کتاب سے املا لیتے رہتے، اور پھر اس تحریر کو ان کے گوش گزار بھی کر دیتے، اس طرح جہد مسلسل کے بعد یہ کتاب معرض وجود میں آئی۔

یہ کتاب مؤلف کی آپ بیتی ہے اور ان کے خالِ معظم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی سوانح عمری ہے۔ نیز بیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں پیش آنے والے قومی اور بین الاقوامی کئی بڑے حادثات و واقعات پر اس میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس طرح یہ کتاب سوانح کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک قیمتی تاریخی دستاویز کی صفات سے بھی آراستہ ہے۔ ۵۰۴/صفحات پر مشتمل اس کتاب کی اشاعت مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ سے ۱۴۴۳ھ-۲۰۲۲ء میں ہوئی۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی کثیر الجہات شخصیت اور آپ کی تصانیف کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ آپ نے مختلف زاویوں سے قوم وملت کی نہ صرف خدمت کی بلکہ رہنمائی اور قیادت کا فریضہ انجام دیا۔ قرآن وحدیث ہو یا فقہ وادب، سیرت وتاریخ ہو یا جغرافیہ وسفرنامہ، ہر موضوع پر آپ کا قلم گوہر فشانی کرتا نظر آتا ہے۔ آپ کی زندگی میں جہد مسلسل کا عملی نمونہ موجود ہے۔ عمر عزیز کی نو دہائیاں پوری کرنے کے بعد بھی آپ ملت کی قیادت میں پورے نشاط کے ساتھ مصروفِ عمل رہے، آپ کے خطابات سے استفادہ عام کیا جاتا رہا۔ اس عمر میں بھی آپ پوری سرگرمی کے ساتھ اپنی ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہے، وہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ آپؒ ہندوستان میں عربی صحافت کے سرخیل، صدر مسلم پرسنل لا بورڈ، ناظم ندوۃ العلماء، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے روح رواں، قرآن کریم کے نکتہ سنج، فقہ کے رمز شناس، ایک عظیم مربی ومعلم، تحریک پیام انسانیت کے میر کارواں، جہاں دیدہ وعالم آشنا مفکر ومبصر، ایک صاحب اسلوب ادیب، ماہر سیرت نگار اور کثیر التصانیف مصنف ومؤلف تھے۔ آپؒ کی خدمات ایک زمانے کو محیط ہیں۔ آپؒ نے کتنی ہی نسلوں کی دینی تربیت کی، کتنے ہی لوگوں کو آپ کے ذریعے ہدایت ملی نیز ایک بڑی تعداد نے آپ کے ہاتھوں پر گناہوں بھری زندگی سے توبہ کی اور ان کو رجوع الی اللہ کی توفیق ملی۔ آپؒ کئی جہات سے امت مسلمہ کی قیادت کی اہم ذمے داری ادا کرتے رہے۔ قحط الرجال کے اس دور میں آپؒ کی شخصیت ملت اسلامیہ کے لیے یقیناً ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ آپ سلف صالح کی بہترین مثال تھے۔ ماحصل یہ کہ استاذ محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی زندگی کئی حیثیتوں سے لوگوں کے لیے مشعل راہ ہے جس سے دور اور دیر تک فکر وعمل کے مسافر اپنی قندیلیں روشن کرتے رہیں گے:

موت ایسی کہ زمانہ کرے جس پر افسوس
زندگی وہ کہ جو اوروں کے سدا کام آئے

آپؒ کی وفات امت مسلمہ کے تمام علمی، ادبی، دعوتی اور تربیتی حلقوں کے لیے ایک عظیم اور تکلیف دہ سانحہ ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے درجات کو بلند فرمائے، آپ کے ساتھ رحمت ومغفرت کا معاملہ فرمائے اور آپ کی دینی کاوشوں، علمی سرگرمیوں اور قائدانہ خدمات کو قبولیت سے نوازے۔ پوری ملت اسلامیہ کی طرف عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے خصوصاً اللہ تعالیٰ آپ کو اجر عظیم سے نوازے اور جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین!

میرے پیارے ابا یادوں کے آئینہ میں

مولانا سید رشید احمد حسنی ندوی
(ایڈیٹر ماہنامہ رضوان-لکھنؤ)

۱۳؍اپریل بروز جمعرات ستاروں میں سب سے چمکنے والا ستارہ غروب ہوگیا، جو ظلمت وتاریکی میں قندیل وچراغ کا کام کررہا تھا، اس موجودہ دنیا میں وہ چمک رہا تھا اور لوگوں کو نفع پہنچارہا تھا، وہ ستارہ جو موجودہ دنیا میں جانشین مفکر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے نام سے متعارف تھا، آج لوگ دنیا میں آپ کو پھر سے یاد کررہے ہیں، ان کے علمی واصلاحی کارناموں کا تذکرہ کررہے ہیں۔ اب میں حضرتؒ کی مبارک زندگی پر کچھ مختصر سی روشنی ڈالتا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں:

حضرت ابا نوراللہ مرقدہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں آباد خاندان حسنی علم اللہی میں پیدا ہوئے، اس خانوادہ علم اللہی حسنی سادات میں متعدد بڑی شخصیات پیدا ہوئیں، حضرت شاہ علم اللہ حسنی کی اولاد میں حضرت شاہ آیت اللہ حسنی، سید ابو حنیفہ، سید محمد ہدیٰ، سید محمد جی، حضرت سید شاہ آیت اللہ فرزند اکبر تھے اور وہی اپنے والد کے جانشین ہوئے، حضرت شاہ آیت اللہ حسنی کی اولاد میں متعدد شخصیات ہوئیں، مولانا سید محمد صابر حسنی، حضرت مولانا سید محمد واضح محدث حسنی، امیر المومنین حضرت سید احمد شہید، حضرت مولانا غلام جیلانی حسنی، حضرت مولانا سید محمد ظاہر حسنی، حضرت مولانا شاہ ضیاء النبی رحمہم اللہ کا تذکرہ اور ان کی دینی، دعوتی اور ربانی زندگیوں کا تذکرہ ملتا ہے، ان مذکورہ بالا شخصیتوں کے تسلسل کے طور پر آخر میں حضرت مولانا حکیم عبد الحی حسنی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا ڈاکٹر عبد العلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی نوراللہ مرقدہ نمایاں ہوئے، وہ محض اپنی ذات سے ہی بلند دینی اور دعوتی مقام پر فائز نہ تھے بلکہ انہوں نے اپنے عزیزوں کو بھی اسی راہ پر لگایا۔

ولادت ونشو ونما:

جانشین مفکر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ حضرت مولانا حکیم عبد الحی حسنیؒ کے نواسے اور مولانا سید خلیل الدین حسنیؒ کے پوتے ہیں، حضرت ابا مرشد الامت (جانشین مفکر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ) کے والد ماجد سید رشید احمد حسنیؒ تھے اور آپ کی والدہ مخدومہ سیدہ امۃ اللہ العزیز تھیں، ان کی تحریر کے مطابق تاریخ پیدائش ۲۹؍اکتوبر ۱۹۲۹ء مطابق ۲۵؍جمادی الثانی ۱۳۴۸ھ ہے، حضرت ابّاؒ کی تربیت حضرت مولانا ڈاکٹر عبد العلی حسنیؒ اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کی زیر شفقت ہوئی، حضرت ابّاؒ کی دینی تربیت اپنی نانی مخدومہ خیر النساء بہتر اور والدہ ماجدہ سیدہ امۃ اللہ العزیز اور خالہ سیدہ امۃ اللہ تسنیم کی زیر شفقت ہوئی، حضرت ابّاؒ نے اپنی کتاب ''اوراق زندگی'' میں لکھا ہے: ''ہماری عمر تین سال کی رہی ہوگی کہ دادا کا انتقال ہوگیا۔'' دادا سید خلیل الدین کا انتقال ۱۹۳۲ء میں ہوا، ان کو دیکھنا حضرت ابّاؒ کو یاد ہے، آگے یہ لکھا ہے: ''دادی اور نانا کو نہ دیکھ سکا، نانی صاحبہ سیدہ خیر النساء بہتر کا زمانہ پایا، وہ دینی تربیت میں ذرا رعایت نہ کرتی تھیں، نماز دعا وغیرہ کا اہتمام، دینی وشرعی آداب کا خیال اور اس پر روک ٹوک کرتیں، ان کی یہ خصوصیت ان کی صاحب زادیوں میں بھی منتقل ہوئی تھی۔'' ایسے ہی حضرت ابّاؒ کے دونوں ماموں مولانا

ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ اور حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ کی سرپرستی اور رہنمائی ہر ہر قدم پر ملی اور کوشش رہی کہ ان کے مشورہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں اور مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنی اور ان کے بھائی عبد الرحمٰن حسنی بھی تعلیم وتربیت کرتے تھے، ایسے ہی حافظ حبیب الرحمٰن اور مولانا ابو الخیر برق سے بھی علمی تربیتی فائدہ پہنچا، حافظ حبیب الرحمٰن اور مولانا ابو الخیر برق حضرت ابّاؒ کی والدہ کے ماموں زاد بھائی تھے، حافظ حبیب الرحمٰن حسنی آپ کی ہمت افزائی فرماتے تھے۔

والد ماجد سید رشید احمد حسنیؒ:

سید رشید احمد حسنی حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ کی اولاد میں ان کی نسل کے ایک علمی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے، مولانا سید سعید الدین حسنیؒ کے پڑپوتے مولانا سید رشید الدین حسنیؒ کے پوتے تھے، سید رشید احمد حسنی کی پیدائش ۲۰؍صفر ۱۳۱۰ھ مطابق ستمبر ۱۸۹۲ء بروز منگل کو ہوئی، مولانا سید خلیل الدین حسنی کے صاحب زادے تھے، سید رشید احمد حسنی کا نام حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے نام پر رکھا گیا، سید رشید احمد حسنی پیدائشی طور پر قوت گویائی اور قوت سماعت سے محروم تھے، لیکن والد ماجد نے ان کے لیے ایک مستقل استاد رکھا، جس نے ان کو اردو انگریزی اور قرآن مجید کی تعلیم دی، ابتدائی تعلیم دینے میں مولانا فخر الدین خیالی نے بھی اہتمام کیا اور ان کو خود پڑھایا، ۲۷؍سال کی عمر میں مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی کی بڑی صاحبزادی سیدہ امۃ اللہ العزیز رحمہا اللہ سے شادی ہوئی، وہ گونا گوں خصوصیات کے مالک تھے، بڑے مہمان نواز تھے، قرآن کریم کی تلاوت اکثرت کرتے تھے، قطب الارشاد حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے تھے اور ذکر وتسبیح کا اہتمام کرتے تھے، سید رشید احمد حسنیؒ کا انتقال ۱۲؍اگست ۱۹۷۵ء-۱۰؍بجے دن کو ہوا، جنازہ میں بکثرت لوگ شریک ہوئے، حضرت مولانا منظور نعمانیؒ نے اپنے ہاتھوں سے غسل دیا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ نے نماز جنازہ پڑھائی، ۸۴؍سال کی عمر پائی، اپنے پیچھے تین صاحب زادے چھوڑے؛ حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ، جانشین مفکر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ، حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندویؒ۔

والده ماجده سیده امة العزیز رحمها الله:

والدہ ماجدہ سیدہ امۃ العزیز رحمہا اللہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئیں، جانشین مفکر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی والدہ ماجدہ، حضرت مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی ندویؒ کی بڑی صاحب زادی عارف باللہ برکۃ العصر حضرت شاہ ضیاء النبیؒ کی نواسی اور حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ کی بہن تھیں اور ایک برگزیدہ خاتون کو جن صفات وخصوصیات سے آراستہ ہونا چاہیے، اس سے آراستہ اور ذاکر وشاغل خاتون تھیں، بہت ہی مہمان نواز، غم گسار، خیر خواہ، رقیق القلب خاتون تھیں، اسلامی قمری تقویم کے اعتبار سے ۹۳؍سال کی عمر میں رمضان المبارک کی شب کو ۱۴۱۹ھ میں وفات پائی، اللہ اللہ کے ذکر کے ساتھ اپنے مالک حقیقی کے حضور حاضر ہوئیں، خاندانی قبرستان میں مدفون ہوئیں، والدہ ماجدہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے بیعت ہوئی تھیں اور آپ کی والدہ سیدہ امۃ العزیز رحمہا اللہ نہایت ہی عابدہ وزاہدہ وولی صفت خاتون تھیں، پرہیز گار، محتاط، زبان سے بھی اور جسم کے سبھی اعضاء سے اور ہر ایک کا خیال رکھنے والی بی بی تھیں۔

تعلیمی مراحل:

حضرت مرشد الامتؒ کی ابتدائی تعلیم اپنے خاندانی مکتب تکیہ کلاں رائے بریلی میں ہوئی، ابتدائی مرحلہ میں بچوں کی سطح کی تعلیم مولانا سید عزیز الرحمٰن حسنیؒ سے وطن تکیہ کلاں رائے بریلی میں حاصل کی، پھر لکھنؤ جاکر اپنے ماموں مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ کی سرپرستی میں رہتے ہوئے لکھنؤ کے محلّہ گوئن روڈ امین آباد کی گلی محمد علی

لین کی مسجد میں ۱۹۳۷-۱۹۳۸ء میں حاصل کی، مکتب مسجد میں آپ کے استاد مولوی سلیم صاحب تھے، ۱۹۳۹ء-۱۹۴۰ء میں ندوہ کے مکتب میں داخلہ لیا پھر ۱۹۴۱ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے درجہ اول میں داخلہ ہوا، ۱۹۴۲ء میں درجہ دوم عربی میں داخلہ ہوا، پھر حضرت مرشد الامتؒ کے سرپرست ماموں نے درجات کے بجائے اساتذہ کے اصول پر تعلیم شروع کرائی، درجہ سوم عربی میں مولانا سید حمید الدین فیض آبادیؒ (والد مولانا سید رشید الدین سابق مہتمم مدرسہ شاہی مرادآباد) مولانا سید نور الحسن وغیرہ سے بھی پڑھنے کو ملا، ۱۹۴۱ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی لکھنؤ کی مجالس میں اپنے دونوں ماموں کے ساتھ حاضری دی، ۱۹۴۳ء یا ۱۹۴۴ء میں ایک ہفتہ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کی خدمت میں نظام الدین مرکز میں گذارا اور ان کے لکھنؤ کے سفر میں ساتھ رہے، ۱۹۴۶ء میں مظاہر علوم سہارنپور میں ایک ماہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی خدمت میں کچھ تعلیمی وقت گذارا پھر ۱۹۴۷ء میں دار العلوم دیوبند میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی خدمت میں گئے اور وہاں کے مختلف اساتذہ سے دورہ کی کتابیں پڑھیں، ان میں مولانا عبد الجلیل صاحب، مولانا عبد الاحد صاحب جیسے اساتذہ تھے، ہدایہ، جلالین میں خطیب الاسلام حضرت مولانا سالم قاسمی شریک درس تھے، حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی کی سرپرستی رہی، دار العلوم دیوبند میں مہتمم حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ تھے، ان کے حجۃ اللہ البالغہ کے درس میں شرکت کی سعادت آپ کو ملی، وہ بھی خیال فرماتے تھے، ان کی مجلس میں استفادہ کا موقع آپ کو ملا۔

۱۹۴۷ء کے آخر میں لکھنؤ واپسی ہوئی اور شرائط دورہ کی بعض کتابوں کی تیاری لکھنؤ میں رہ کر کرلی تھی، ملا حسن مولانا محمد اسباط سے پڑھنے جاتے تھے، جو مولانا عبد الحی لکھنویؒ کے شاگرد تھے، پھر دار العلوم ندوۃ العلماء میں درجہ نہم میں داخلہ ہوگیا اور کامیابی ملی اور وہیں سے ۱۹۴۸ء میں فضیلت سے فراغت ہوئی، ۱۹۵۰ء کے آخر سے ۱۹۵۱ء کے آخر تک ایک سال علمی استفادہ کی غرض سے حجاز مقدس میں گذارا جس میں وہاں کے علماء وشخصیات اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔

عقد مسنون:

تعلیم کی تکمیل کے بعد عقد مسنون کا مرحلہ انجام پانا تھا، حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنیؒ نے اپنی صاحبزادی سیدہ رقیہ حسنیؒ کا نکاح اپنے بھانجے مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے کیا، حضرت ابا کا نکاح ۱۹۵۳ء کی کسی تاریخ میں امین آباد گوئن روڈ محمد علی لین کی پکریا والی مسجد (نوازی) میں شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے مہر فاطمی پر پڑھایا، حضرت ابّاؒ کی تین صاحبزادیاں ہوئیں، مخدومہ سیدہ میمونہ حسنی، مخدومہ سیدہ آمنہ حسنی، مخدومہ سیدہ ہاجرہ حسنی، اول الذکر کا نکاح حضرت مولانا محمد حمزہ حسنیؒ سے ہوا، دوسری کا نکاح حضرت مولانا سید عبد اللہ محمد الحسنی سے ہوا، تیسری کا نکاح حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی مدظلہ العالی سے ہوا۔

تدریسی دور:

ابّاؒ نے اپنی تدریسی صلاحیتوں سے دار العلوم ندوۃ العلماء کو خوب فائدہ پہنچایا اور طلبہ میں بہت مقبول تھے، ۱۹۴۹ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے شعبہ ادب عربی میں حضرت مرشد الامتؒ کا بحیثیت معاون استاد تقرر ہوا، ۱۹۵۳ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے ادیب دوم مقرر ہوئے، علوم شرعیہ میں تفسیر وحدیث کی کتابیں بھی پڑھائیں اور ریاض الصالحین پڑھائی اور ستر سال تک تدریس میں گذارا۔

تصنیفی خدمات:

حضرت ابّاؒ کو تاریخی وعلمی ذوق اپنے ماموں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندویؒ سے ملا تھا، ان سے فائدہ اٹھایا تھا۔ حضرت ابّاؒ نے بہت سی کتابیں لکھیں، آپؒ کی تحریریں آسان اسلوب وشستگی وشگفتگی کا مرقع ہوتی ہیں، حضرت مرشد الامتؒ کی تصانیف میں

سب سے مشہور ''رہبر انسانیت'' ہے اور سیرت کے موضوع پر دوسری کتاب ''نقوش سیرت'' ہے اور جغرافیہ کے موضوع پر ''جزیرۃ العرب'' ہے، حضرت مرشد الامتؒ کی تصانیف کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے۔ کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں: منثورات، رہبر انسانیت، حج ومقامات حج، امت مسلمہ-رہبری ومثالی امت، سماج کی تعلیم وتربیت، غبار کارواں، یادوں کے چراغ وغیرہ۔

صحافتی خدمات:

بانی اور سرپرست پندرہ روزہ عربی صحیفہ الرائد لکھنؤ، سرپرست اعلیٰ پندرہ روزہ تعمیر حیات لکھنؤ، سرپرست انگریزی مجلّہ دی فری گرینس آف ایسٹ، سرپرست ماہنامہ رضوان لکھنؤ، سرپرست ہندی مجلّہ سچاراہی، سرپرست پیام عرفات وغیرہ۔ ان تمام ماہناموں میں مضامین شائع ہوتے اور پندرہ روزہ تعمیر حیات میں آپ کے بیانات اور علمی واصلاحی مضامین شائع ہوتے رہے اور آپ کے سفر نامے شائع ہوتے تھے، پندرہ روزہ الرائد میں ابّاؒ کے بڑے قیمتی مضامین شائع ہوئے، حضرت مرشد الامتؒ سہ ماہی کاروان ادب کے مدیر تھے، اس سہ ماہی کاروان ادب میں ادبی وعلمی مضامین حضرت ابّاؒ نے لکھے اور ماہنامہ رضوان وماہنامہ پیام عرفات میں بھی بہت سے قیمتی مضامین حضرت ابّاؒ کے شائع ہوئے اور بہت سے ماہناموں میں مضامین ومقالات وملفوظات شائع ہوئے۔

عہدے ومناصب:

حضرت ابّاؒ بہت سے اداروں کے یا تو ناظم یا سرپرست یا رکن تھے یا صدر تھے، کچھ اداروں اور تنظیموں کے نام یہ ہیں:

(۱) ناظم ندوۃ العلماء-لکھنؤ (۲) صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ (۳) صدر عالمی رابطہ ادب اسلامی (۴) صدر مجلس تحقیقات ونشریات اسلام-لکھنؤ (۵) صدر مجلس صحافت ونشریات -لکھنؤ (۶) صدر دینی تعلیمی کونسل، اتر پردیش-لکھنؤ (۷) صدر دار عرفات میدان پور تکیہ کلاں- رائے بریلی (۸) رکن تاسیسی رابطہ عالم اسلامی-مکہ مکرمہ (۹) رکن دار المصنفین -اعظم گڑھ (۱۰) ٹرسٹی آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی-برطانیہ (۱۱) سرپرست مولانا محمد ثانی حسنی میموریل سوسائٹی-رائے بریلی (۱۲) رکن مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی-لکھنؤ (۱۳) سرپرست تحریک پیام انسانیت (۱۴) سرپرست مولانا ابوالحسن اکیڈمی-بھٹکل۔

اسی طرح متعدد مدارس اسلامیہ کے سرپرست تھے اور ۱۹۵۲ء میں ابّاؒ دار العلوم ندوۃ العلماء میں ادیب دوم ہوئے اور ۱۹۵۵ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں صدر شعبہ ادب عربی کے عہدہ پر فائز ہوئے، پھر ۱۹۷۰ء میں عمید کلیۃ اللغۃ العربیہ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ مقرر ہوئے، پھر ۱۹۹۳ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کا منصب اہتمام مولانا محبّ اللہ لاریؒ کے بعد حضرت مرشد الامتؒ کے سپرد ہوا، پھر ۱۹۹۸ء میں نائب ناظم جناب مولانا معین اللہ ندوی کی خرابی صحت کی وجہ سے مہتمم کے ساتھ بحیثیت نائب ناظم خدمات انجام دیتے رہے پھر ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۹ء کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ناظم ندوۃ العلماء کا انتقال کے بعد جنوری ۲۰۰۰ء میں ناظم ندوۃ العلماء کا عہدۂ جلیلہ حضرت ابّاؒ کو تفویض ہوا جس پر تا حیات فائز رہے اور ۲۰۰۲ء میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلامؒ کی وفات کے بعد آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر بنے اور تا حیات صدر رہے۔

حج وعمرے کے اسفار:

حضرت ابّاؒ اپنے ماموں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ساتھ ۱۹۵۰ء کو سفر حج میں تشریف لے گئے، اس طرح ایک سفر حج ابّاؒ نے اپنے والد ماجد سید رشید احمد حسنیؒ کے ساتھ کیا، ابّاؒ نے ابا جان (مفکر اسلامؒ) کے ساتھ کئی سفر کیے اور ابّاؒ نے کئی عمرے کیے، ایسے ہی ۱۴۳۳ھ میں عمرہ کیا، جس میں مولانا محمود حسنیؒ اور مولانا بلال عبد الحی حسنی مدظلہ ساتھ تھے، ان اسفار عمرے کی تفصیل ان محدود صفحات میں مشکل ہے۔

دعوتی اسفار:

حضرت ابّاؒ نے ہندوستان اور بیرون ہند کے بہت سے شہروں

کے اسفار اور دعوتی دورے کیے، حضرت ابّاؒ زیادہ تر اسفار اپنے ماموں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے ساتھ کیے اور کچھ سفر اپنے بھائی حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنیؒ کے ساتھ کیے، ان اسفار کی تفصیل یہاں لکھی نہیں جاسکتی اور ہندوستان کے مختلف شہروں گجرات، کیرلا، ممبئی، پونہ، دہلی، بھوپال، کرناٹک اور اتر پردیش کے مختلف شہروں اور آندھرا وتلنگانہ کے شہروں کے دعوتی دورے کیے اور بیرون ہند کے مختلف شہروں کے دورے کیے اور اکثر ممالک اسلامیہ عربیہ نیز بلاد یورپ وامریکہ، مشرق بعید جاپان، ملیشیا، افریقہ میں مراکش، مصر، تونس، الجزائر، جنوبی افریقہ کے سفر کے نیشنل اور انٹرنیشنل علمی وادبی سیمیناروں اور کانفرنسوں میں شرکت کی اور مقالے پیش کیے جو مقامی وبیرونی اخبارات ورسائل میں شائع ہوئے، ان دعوتی اور علمی واصلاحی دوروں کی مکمل تفصیلات یہاں لکھنا مشکل ہے، اس کے لیے تحفہ گجرات اور دیگر حضرت مرشد الامتؒ کے وہ سفرنامے جو تعمیر حیات میں شائع ہوئے ہیں، اس میں ان دعوتی اسفار کی تفصیلات مل سکتی ہیں۔

اوصاف وامتیازات:

ابّاؒ بہت سی خصوصیتوں اور صلاحیتوں اور امتیازات کے مالک تھے، لیکن اخفاء حال اور تواضع میں بالکل یکتا تھے، قرآن کریم کی تلاوت فرماتے تھے، کبھی ناغہ نہیں کرتے، یہاں تک کہ آخری وقت تک پابندی کی، جب تک صحت رہی مسجد میں نماز باجماعت ادا کرتے تھے اور آپ ہاں صدقہ کا اور ہدیہ دینے کا خاص اہتمام تھا، جب تکیہ کلاں گھر تشریف لاتے تو غریبوں کو صدقہ دینے کے لیے گھر میں صاحب زادیوں کو صدقہ کی رقم دیتے تھے، وہ غریبوں کو صدقہ دیں، تواضع کی خصوصیت آپؒ کے اندر بہت زیادہ تھی، آپؒ تواضع وللّٰہیت وفنائیت کے عملی پیکر تھے، آپؒ انتہائی منکسر المزاج اور حیاوسادگی کے پیکر تھے، استغنا وبے نفسی تو آپ کی فطرت وطبیعت کا حصہ بنی ہوئی تھی، خاموش طبیعت گر ہر وقت فکر وتدبر اور امت کی فکر میں ڈوبا ہوا ذہن، ذکر وعبادت اور لکھنے پڑھنے کا ذوق اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے عشق اور آنحضرت ﷺ کے محبوب صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سچی محبت سے معمور تھا، یہی وہ چیز تھی جس نے ابّاؒ کو متواضع، حلم وبردباری کا پیکر بنایا اور اپنے دونوں ماموں حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنیؒ اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ بنایا، وہ اعلیٰ اسلامی محاسن واوصاف سے متصف تھے، ابّاؒ اپنی رائے میں اصابت وصلاحیت رکھتے تھے، لیکن اپنے بڑوں کی رائے کے سامنے اپنی رائے دبالیتے تھے، اصول پسند تھے، نظم وانضباط کے پابند تھے، جو کام بھی کرتے تھے اللہ کے لیے کرتے تھے، اللہ نے آپؒ کو اسلام اور مسلمانوں کا درد رکھنے والا دل اور آپؒ کی باتوں میں بڑا اثر رکھا تھا، خاندان میں مقبول ومتفق علیہ شخصیت تھے اور خاندان سے باہر بھی وہ محبوب ومتفق علیہ شخصیت تھے، وہ آپ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، سنن نبویہ ﷺ کا عملی پیکر تھے، انداز تربیت اور طور وطریق بڑا خیر خواہانہ ہوتا تھا، ابّاؒ کی تحریر بھی زوردار تھی اور آپ کا وعظ ونصیحت بھی بڑی اثر انداز تھی، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی نیابت ان کی زندگی میں کرنے لگے تھے اور بعد میں ان کے خلیفہ وجانشین ہوکر جانشینی کا مکمل حق ادا کیا، یہ تمام وہ خصوصیات وامتیازات وخصائل ونمونہ اخلاق ہیں جو تادم آپ کی پہچان بنے رہے۔

افراد خاندان واولاد کی تربیت اور صلہ رحمی:

ابّاؒ صلہ رحمی میں بے مثال تھے، آپ کی نظیر اس دور میں ملنی مشکل ہے، جب آپ دہلی جاتے یا کسی بھی شہر جاتے، اگر آپ کو معلوم ہوتا کوئی رشتہ دار رہتے ہیں، چاہیں قریب کی رشتہ داری ہو یا دور کی، ان سے ملنے کا اہتمام فرماتے اور کوئی ہدیہ پیش فرماتے، ایسے ہی اگر رشتہ داروں میں کوئی بیمار ہوتا اور آپ کو معلوم ہوتا تو آپ عیادت کے لیے تشریف لے جاتے اور مزاج پرسی فرماتے اور تکیہ کلاں میں مقیم اپنی صاحبزادیوں سے ملنے ہر جمعرات کو تشریف لے

جاتے، یہ اس وقت تک رہا جب تک صحت رہی، ورنہ مہینے دو مہینے میں تشریف لے جاتے اور ایک صاحب زادی لکھنؤ خاتون منزل میں رہتی ہیں، ان سے ملنے گھر تشریف لایا کرتے تھے، ابّا ماموں جان حضرت مولانا سید بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ العالی کو بہت چاہتے تھے، جب ماموں جان مدظلہ ابّا کے پاس تشریف لے جاتے اور ابّا ماموں جان مدظلہ کو دیکھتے تو بہت خوش ہوجاتے تھے، لگتا تھا صحت اچھی ہوگئی ہو، ماموں جی حضرت مولانا جعفر مسعود حسنی مدظلہ العالی جب ابّا کے پاس پہنچتے، اتنے خوش ہوتے تھے جیسے ابّا صحت مند ہوگئے اور ماموں جی سے باتیں کرتے، ان کی خیریت پوچھتے، ماموں جی مدظلہ بلا ناغہ ابّا کے پاس روز جاتے تھے، وہیں رکتے تھے، خاندان کا کوئی فرد چلا جاتا تو ابّا اس فرد سے خوش ہوتے اور خیریت پوچھتے، ہدیہ دیتے، بچوں پر بہت شفقی تے، مولوی خلیل حسنی، مولوی امین حسنی، مولوی سعید حسنی، مولوی عبدالحی حسنی، مولوی محمد میاں حسنی جب ابا کے پاس جاتے اور کئی دن ابّا کے پاس رکتے تو ابّا ان سب سے بہت خوش ہوتے، خوب دعائیں دیتے، کیونکہ ابّا اپنے تمام نواسوں ونواسیوں سے محبت کرتے تھے اور ان سب کو نصیحت فرماتے تھے، ایسے ہی حضرت مولانا محمد ثانی حسنیؒ کے تمام نواسوں مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ، مولانا مفتی مسعود حسن حسنی مدظلہ العالی اور مولانا سید منصور حسن حسنی مدظلہ العالی سے بھی محبت فرماتے تھے اور ان سب کا بڑا خیال فرماتے تھے، وہ سب بھی ابّا پر فدا تھے اور خدمت کرتے تھے، ایسے ہی ماموں جان مدظلہ العالی کے صاحب زادگان مولوی عبدالعلی حسنی وسید ابوالحسن حسنی ابّا کے پاس جاتے تو ابّا ان دونوں سے خوش ہوتے اور دعائیں دیتے، کئی مرتبہ سید ابوالحسن سے ابّا نے حمد ونعت سنی۔

کچھ یادیں:

ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم کو اس نے ایسا چاہنے والا مشفق نانا عطا فرمایا، جس نے ہمارے لیے دنیا کے مقابلہ میں دین کو پسند کیا اور فکر کی کہ میں کسی مدرسہ میں تدریسی کام میں لگ جاؤں، اس کے لیے جب بھی ابّا کی خدمت میں جاتا یا ابّا گھر اپنی بیٹی سے ملنے تشریف لاتے اور ہم سامنے نظر آتے تو ابّا یہی پوچھتے کیا تم نے پڑھانا شروع کیا؟ یہاں تک کہ جب استاد ہوگیا تو ابّا اتنے خوش ہوئے اور دعائیں دینے لگے اور محبت میں اضافہ ہوگیا اور ہم ابّا سے ذکر کرتے تھے، ہم یہ کتابیں پڑھا رہے ہیں اور ہم نے سیرت نبوی پر لکھی کتاب ''رحمت عالم'' کے سوال جواب تیار کر کے ابّا کو دکھائے تو ابا نے اس کاپی کو دیکھا، اس میں اضافہ فرمایا اور ابّا ہم پر بہت شفقتیں فرمایا کرتے تھے، جب بھی ندوہ میں ابّا کی خدمت میں جاتا تو ابّا خوش ہوکر مسکراتے اور خیریت پوچھتے اور فرماتے: کیا کر رہے ہو؟ تو میں عرض کرتا کہ صبح مدرسہ جاتا ہوں اور ایک بجے آتا ہوں، ابّا میرے پیارے والدؒ کو بہت چاہتے تھے، والد کو ابّا سے ایسا تعلق تھا کہ ان سے ملنے جاتے تو رونے لگتے اور دعا کی درخواست کرتے، حضرت ابّا حوصلہ دیتے اور صبر کے فضائل سناتے، حضرت ابّا جب بھی والدؒ کی عیادت کو جاتے تو والدؒ کی صحت بحال ہوجاتی، ابّا نے والدؒ کو اجازت بیعت سے سرفراز فرمایا تھا، جب والدؒ کا انتقال ہوتا ہے تو ہم اور ہمارے چھوٹے بھائی مولوی سعید احمد حسنی ندوی ابّا کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں، قربان جایئے ابّا کے صبر پر، ہم دونوں کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں، فرماتے ہیں: حمزہ اللہ کی امانت تھے، اس نے واپس لے لی اور تسلی دیتے تھے، صبر کا حوصلہ پیدا کرتے تھے، ابّا کی محبت وشفقت ہم سب کے دل ودماغ پر ایسی نقش ہوتی کہ وفات کے بعد آج بھی ابّا کے نقوش تازہ ہیں اور خوب یاد آتے ہیں، ابّا پورے خاندان کے سرپرست ومربی ومرشد تھے۔

مشائخ عصر ومصلح شخصیات وعالم اسلام کی نامور شخصیات سے ملاقات وزیارت:

جانشین مفکر اسلام مرشدالامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے ۱۹۴۱ء میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی

تھانویؒ کی لکھنؤ کی مجالس میں اپنے دونوں ماموں کے ساتھ حاضری دی، ۱۹۴۳ء میں حضرت مرشد الامتؒ نے حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ سے ملاقات اوران کی خدمت میں ایک ہفتہ رہے، ابّاؒ نے ۱۹۴۶ء میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ سے ملاقات کی، ابّاؒ نے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی سے آٹھ یا نو سال کی عمر میں لکھنؤ میں ملاقات کی، پھر جب دیوبند تعلیم کے لیے گئے تو وہاں حضرت شیخ الاسلام کی خدمت میں رہے، ابّاؒ نے ۱۹۴۸ء میں قطب الارشاد حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ سے ملاقات کی، ابّاؒ نے امام اہل سنت مولانا عبد الشکور فاروقیؒ سے ملاقات کی، حضرت شاہ محمد یعقوب مجددیؒ سے ابّاؒ نے ملاقات کی اور دعالی، ابّاؒ نے مصلح الامت حضرت شاہ وصی اللہ الہ آبادیؒ سے ملاقات کی اور دعالی، حضرت صوفی عبدالرب اناویؒ سے ملاقات کی اور دعا لی، ابا نے عارف باللہ حضرت مولانا شاہ محمد احمد پرتاب گڑھی سے ملاقات وزیارت کی اور دعا لی، ابّاؒ نے حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سے ملاقات کی اور دعائیں لیں، ابّاؒ نے حضرت مولانا سید بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی مصنف ''ترجمان السنہ'' سے ملاقات کی، ایسے ہی حضرت مولانا عبدالغفور نقش بندی مہاجر مدنیؒ سے ملاقات کی، علمائے عرب میں علامہ ابن باز، علامہ عبداللہ بن حمید، شیخ امین شنقیطی، محدث حرم سید علوی مالکی، محدث حرم مدنی شیخ محمد علی الحرکان، امام حرم شیخ عبداللہ خیاط، امام حرم شیخ محمد بن عبداللہ السبیل، امام حرم مسجد نبوی شیخ عبداللہ عبدالعزیز الصالح، ابّاؒ نے ملاقات کی، ایسے ہی اعیان عرب میں شیخ صالح قزاز، استاد علی حسن، شیخ احمد محمد جمال، سید محسن باروم، عبدالمقصود خوجہ، ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف بن ابراہیم آل الشیخ سے ملاقات کی اور احمد عبد الغفور عبد القدوس انصاری، سعید العامودی سے ملاقات کی۔

ابّاؒ نے حضرت محیی السنہ مولانا شاہ ابرار الحق ہردوئیؒ سے ملاقات کی اور دعالی۔

اصلاح وتربیت، اجازت وخلافت:

جانشین مفکر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے قطب الاقطاب حضرت مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ نے آپ کو ذکر واذکار تلقین فرمائے اور ہدایات دیں، حضرت رائے پوریؒ نے فرمایا: تمہارا سلوک یہ ہے کہ علی میاں کے ساتھ لگے رہو اور حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے مشورہ سے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے پورے طور پر مرتبط ہوگئے اور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ سے تجدید بیعت کی اور آپ سے پورے طور پر مرتبط ہوگئے اور کوئی کام ان کے انشراح کے بغیر نہیں کیا اور بیرونی اسفار میں بطور رفیق وخادم ساتھ رہے، اوراد ووظائف، اذکار واشغال کے پابند تھے، ذکر جہری وذکر قلبی کا اہتمام کرتے تھے، حضرت مرشد الامتؒ حضرت مفکر اسلامؒ کی خدمت میں رہتے تھے، یکم مئی ۱۹۹۹ء میں شیخ طریقت برکۃ العصر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ نے اپنے تمام سلسلوں وسلاسل اربعہ؛ قادریہ، نقشبندیہ، چشتیہ، سہروردیہ، مجددیہ، وسلسلہ وطریقہ محمدیہ، سلسلہ امیر المومنین حضرت سید احمد شہید حسنیؒ میں شیخ طریقت جانشین مفکر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو اجازت بیعت وخلافت سے سرفراز فرمایا، حضرت مفکر اسلامؒ کا حضرت مرشد الامتؒ پر اعتماد کلی رہا ہے اور آپ کو بہت چاہتے تھے اور اپنا سب سے زیادہ مقرب خاص ومعتمد علیہ سمجھتے تھے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد حضرت مفکر اسلامؒ کے تمام خلفاء ومریدین اور سبھی حلقوں نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کا بالاتفاق جانشین تسلیم کیا اور دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مہمان خانہ میں بعد نماز عشا حضرت مرشد الامتؒ کی مجلس ہوتی تھی اور رمضان لمبارک میں پورے مہینے تکیہ کلاں رائے بریلی میں تشریف فرما ہوتے تے اور دائرہ حضرت شاہ علم اللہ حسنی تکیہ کلاں رائے بریلی

میں خانقاہ حضرت سید احمد شہید لگتی اور سینکڑوں لوگ آتے، کچھ دن ٹھہرتے اور حضرت مرشد الامتؒ سے استفادہ کرتے اور رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں حضرت مرشد الامتؒ اعتکاف فرماتے تھے، جب تک صحت تھی اعتکاف کرتے تھے، وفات سے کچھ سال پہلے تک رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں لوگوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ جاتی تھی اور حضرت مرشد الامت بیان فرماتے تھے اور بعد نماز عشا بعد تراویح خصوصی مجلس ہوتی تھی، جس میں حضرت مرشد الامتؒ اصلاحی نصیحت کرتے تھے اور اصلاحی دینی واقعات بیان بھی فرماتے تھے، وہ سب انشاء اللہ جلد از جلد کتابی صورت میں شائع ہوگا، جانشین مفکر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے ۵۷؍خوش نصیب لوگوں کو اپنے تمام سلسلوں سے اجازت بیعت عطا فرمائی تھی، ان سب کے نام ایک کتابچہ (غیر مطبوعہ) کی شکل میں درج کردیے گئے ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ تمام خلفائے مرشد الامت کو حضرت مرشد الامتؒ کے سلسلہ محمدیہ وسلاسل اربعہ کو عام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! اور دین اسلام کی نشر واشاعت میں لگیں اور سنت رسول ﷺ کو عام کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

مرشد الامتؒ کے دار العلوم ندوہ چند اساتذہ:

مولانا سید حمید الدین فیض آبادیؒ، مولانا سید نور الحسنؒ، مولانا محمد اسباط، مولانا محمد ناظم ندویؒ، مولانا مفتی محمد سعید الاعظمیؒ، مولانا محمد اسحاق سندیلویؒ، مولانا سید عبد الغفار نگرامیؒ، مولانا محمد عمران خاںؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ، مولانا محمد اویس نگرامیؒ، حضرت قاری منیرؒ، مولانا قاری سید ودود الحی ندوی لکھنویؒ سے تجوید پڑھی اور قرأت سیکھی، حضرت ماسٹر محمد سمیع صدیقیؒ۔

مظاہر علوم ودار العلوم دیوبند کے چند اساتذہ:

حضرت مولانا عبد الجلیلؒ، حضرت مولانا عبد الاحدؒ، حضرت مولانا قاری محمد طیب قاسمیؒ وغیرہ دار العلوم دیوبند کے اساتذہ ہیں، مظاہر علوم سہارنپور حضرت مرشد الامتؒ کے اساتذہ یہ ہیں: حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ، حضرت مولانا مفتی محمود الحسن گنگوہیؒ وغیرہ۔

چند اساتذۂ حدیث ومشائخ حدیث:

حضرت مولانا شاہ محمد حلیم عطا سلونیؒ، مولانا سعید احمد اعظمیؒ، مولانا سید حمید الدین فیض آبادیؒ۔

چند مشائخ حدیث جن سے اجازت حدیث واجازت مسلسلات حضرت مرشد الامتؒ کو ملی، ان کے نام یہ ہیں: شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندویؒ، حضرت مولانا مفتی احمد حسن ٹونکیؒ، سماحۃ الشیخ العلامہ عبد الفتاح ابو غدہؒ۔

وفات:

جانشین مفکر اسلام مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی طبیعت خراب ہوئی اور بخار ہوگیا تھا، سینہ میں جکڑن ہونے لگی تھی، اس کی وجہ سے آپ کو لکھنؤ لے جایا گیا اور مہمان خانے میں ڈاکٹروں نے چیک اپ کیا اور دوائیں دیں، تو طبیعت بہتر ہوگئی، لیکن جب دوا نہ کھاتے تو بخار چڑھ جاتا تھا اور دوا کھا لیتے تو بخار کم ہوجاتا، لیکن بخار رہتا، اسی طرح کچھ ایسے ہی چلا، کبھی بخار اترتا، کبھی چڑھ جاتا، بروز جمعرات ۲۱؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ء کو مہمان خانہ ندوۃ العلماء میں داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مسجد میں پہلی نماز جنازہ حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم نے لاکھوں لوگوں کو پڑھائی، پھر اس کے بعد دوسری نماز جنازہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں بروز جمعہ ۲۲؍رمضان المبارک کو صبح آٹھ بجے جانشین مرشد الامت حضرت مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی دامت برکاتہم نے پڑھائی اور مسجد شاہ علم اللہ کے شمالی جانب اپنے نواسہ مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ کے قریب مدفون ہوئے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے حضرت کو جنت الفردوس میں بلند درجات عطا فرمائے۔ آمین! رحمه الله رحمة واسعة.

ایک عہد ساز شخصیت

مولانا مفتی سید محمد ریاض ندوی کھجناوری
(رئیس جامعۃ الحسنین صبری پور)

بعض انسان وہ ہوتے ہیں جن پر بجا طور پر زمانہ اور اشخاص کو فخر ہوتا ہے اور ان کی موجودگی پیش آمدہ مسائل، اس کے سد باب کے لیے مثل دیوار ہوتی ہے، اس پر مکمل اعتماد اور کامل یقین کی بدولت معاشرے میں بسنے والے انسان بہت سے اہم کاموں کو انجام دیتے ہیں اور یہ مقام ان کو دنیوی اعتبار سے نہیں بلکہ علم وحکمت، خلوص وجفاکشی کی بدولت حاصل ہوتا ہے، دربار خداوندی سے قرب کی بدولت میسر آتا ہے، یہی مقام ہمارے سامنے استاد محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کو حاصل تھا، جس کو ہماری آنکھوں نے دیکھا اور زمانہ بھی گواہ ہے۔

آپ کا خانوادہ سید احمد شہیدؒ اور شاہ علم اللہ کا ہے، جہاں علم وتقویٰ، اسلام کی سربلندی وسرفرازی کی آرزو وتمنا ورثہ میں ملی، ان کے بڑوں ومربیین اور اساتذہ پر نگاہ ڈالیں تو ایک چمکتی دمکتی کہکشاں بلکہ اپنے اپنے فن کے آفتاب وماہتاب اور پھر زہے قسمت کہ ان کے بڑوں نے بھی انہیں اپنی آنکھوں کا تارہ سمجھا، چھوٹوں نے تو بہر حال اپنی آنکھیں بچھا دیں، کیا مدارس وخانقاہیں، کیا اہل علم وقلم، کیا شاہ وگدا، کیا عوام وخواص سب نے سینے سے لگایا، چشم فلک نے ایسی محبوبیت ومقبولیت، ایسی جامعیت وہمہ گیریت کم ہی دیکھی ہوگی، محبت کے ساتھ عزت وتکریم اور اکرام والتفات بھی!

آپ کی زندگی کا بیشتر حصہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے زیر سایہ گزرا اور ان کی زیر تربیت پروان چڑھے، کامل بنے، شاید اتنا طویل عرصہ خدمت وشفقت اور تربیت کا کسی کو نصیب ہوا ہو اور تربیت کا بھی یہ انداز کہ اس طویل مدت میں دوسرے ممالک کے اسٹیج پر زندگی میں ایک مرتبہ حضرت مفکر اسلامؒ نے اپنے سامنے مائک پر جانے کا موقع دیا، آپ اپنی زندگی کے اکثر حصہ میں ''رابع'' ہی رہے، اب یہ کرو، اب وہ کام کرو، بس حکم کی تعمیل میں زندگی گزار دی، جس وجہ سے تواضع ومسکنت کا جوہر ان کے اندر پیدا ہوا، پھر حضرت مفکر اسلامؒ کے وصال کے بعد بھی وہ انکساری کا مظہر بنے رہے، انہوں نے حضرت مولاناؒ کی خوبیوں ومحاسن کی اقتدا و پیروی میں سبقت سے کام لیا اور ان کی سیرت کے چراغ سے روشنی حاصل کرتے ہوئے ترقی کے منازل طے کیے، آپ نے جس آب وتاب کے ساتھ اپنے سفر حیات کا آغاز کیا، زندگی کے ہر مرحلہ میں یہ شمع محض یک رنگی کے ساتھ نہیں رنگارنگی کے ساتھ روشن رہی، ہمہ جہتی اور ہمہ رنگی، خدمات کا تنوع آپ کی تخصیص رہا۔

میں یہ لکھنے کی جسارت نہیں کرسکتا کہ پہلی ہی ملاقات نے قلب وذہن پر گہرے نقوش چھوڑ دیئے، کیونکہ اس وقت ہم کو قلب وذہن پر نقوش مرتسم ہونے کا احساس ہی نہ تھا، البتہ بجا طور پر یہ لکھ سکتا ہوں کہ آپ کی صحبت میں بلا کی تاثیر تھی، جاذبیت وکشش تھی، جو شخص بھی آپ کے پاس وقت گزار لیتا اس کو اپنی زندگی میں تبدیلی محسوس ہوتی، گناہوں سے نفور، اعمال صالحہ کی توفیق میسر آتی اور ایمانی وروحانی بیٹری کا چارج بڑھ جاتا، بیعت کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے، ہر کسی کو بیعت نہ فرماتے، جب تک اس سے اچھی طرح واقف نہ ہوں اور اگر بیعت ہونے والے شخص کے

علاقے میں کوئی عالم موجود ہوتو اسی سے تعلق قائم کرنے کی تلقین فرماتے، ہمارے مغربی یوپی کے بعض افراد کورائے پوراور سنسار پور میں بزرگان دین سے تعلق کرنے کے لیے بولا، سب سے بڑھ کر استغناء کی کیفیت اور دنیا سے بے تعلقی آپ کی ذات کے اندر موجود تھی، آنکھوں کو خیرہ کرنے والے متاع دنیا سے آپ کو ذرا بھی دلچسپی نہ تھی، اصحاب زر کے سامنے بچھنا انہیں آتا نہ تھا اور یہ اس وقت کی بات ہے جب عرب وعجم آپ کو جانتے تھے، اور آپ کا ستارۂ تقدیر بام عروج پر تھا اور خود ہندوستان کی دینی درسگاہیں' اسلامی تحریکیں اپنے کسی اجتماع یا مشاورت میں مولانا کی تشریف آوری کو اپنی کامیابی تصور کرتی تھیں، وہیں عصری درس گاہیں ویونیورسٹیاں بھی آپ کے سامنے جبین احترام خم کرنے کو اپنے لیے سرمایہ وقار سمجھتی تھیں، آپ کے آستانے پر شاہان مملکت بھی آتے اور رؤساءِ زمانہ بھی جبیں سائی کرتے، لیکن ان کے مفاد میں آپ نے اپنا مفاد کبھی تلاش نہ کیا، وہ دل کی غذا اور روح کی دوا بیچتے تھے، قوم کی بے راہ روی انہیں تڑپاتی اور بے قرار رکھتی تھی، لبوں پر تبسم کھیلتا ہوا اور چہرے پر معصومیت نمایاں رہتی تھی، زبان کی حفاظت آپ کے یہاں حد درجہ تھی، کم بولتے، جب بولتے تو پہلے تولتے اور خیر وبھلائی ہی کی باتیں ہوتیں، شکوہ وشکایات، طنز وتعریض کا آپ کے یہاں کوئی گذر نہ تھا۔

آپ کا ایک نمایاں وصف اعتدال ومیانہ روی' زبان وقلم میں احتیاط اور تنقید میں نصح وخیر خواہی تھا، اس لیے برصغیر اور عالم اسلام میں اٹھنے والی اہم تحریکات سے آپ کا تعلق تھا اور قدر کی نگاہ تھی، آپ کی فکر ونظر کا توازن اور اعتدال ہی تھا کہ ایک جانب رشد وہدایت کو آپ کی ذات سے رونق حاصل تھی تو دوسری طرف علم وقلم کی بزم بھی آپ پر نازاں تھی، آپ نے اپنی زندگی کے آخری سانس تک ان روایتوں کو زندہ رکھا اور ان اقدار کا تحفظ کیا جو نسلوں سے منتقل ہوتی چلی آرہی تھیں، آپ اخلاص عمل اور اخلاص نیت کے بلند وبالا ستون تھے۔

آپ حضرت مفکر اسلامؒ کے تربیت یافتہ ایک بلند پایہ مصنف ومفکر اور عربی کے انشاء پرداز اور ممتاز ادیب تھے، البعث الاسلامی، الرائد ودیگر مجلّات میں لکھے گئے مضامین کی بازگشت عالمی سطح پر سنائی دیتی، ہندوپاک کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی آپ کے قلمی شذرات اشاعت پذیر ہوتے۔ مسلمانوں کے اتحاد کی علامت ورمز تھے، اس ناحیہ سے آپ کو مرکزیت حاصل تھی، اسی وجہ سے پرسنل لا بورڈ کے بعد فیصلے انہوں نے تسلیم کیے، مختلف مسالک کی اہم شخصیات کے درمیان قائدانہ کردار ادا کرتے ہوئے اپنے اخلاق وکرم گستری اور نرم مزاجی وحکمت سے اتحاد کو برقرار رکھا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ اور حضرت شیخ رحمہ اللہ کی مجالس سے فیض یابی حاصل کی، آپ نے مفکر اسلامؒ کے ساتھ دنیا کے ممالک کا سفر کیا، مصنفین کو پڑھا اور اپنے خاندانی وتصنیفی ذوق کو جلا بخشی، مفکر اسلام کے دامن سے وابستہ حضرت مولاناؒ کی ذات گرامی فکر وعمل کا ایسا چشمہ صافی تھی جس سے ایک زمانہ سیراب ہورہا تھا اور کتنے زمانے ان کے اخلاص اور فکر کی قوتوں کو بروئے کار لانے کی تیاری میں مصروف تھے، آپ کے دامن فیض اور سلوک وارشاد کے میدان میں جو حضرات منسلک ہوئے اور باطنی استفادہ کیا وہ بھی میدان عمل میں آسمان کے ستاروں کی مانند چمکتے ہیں اور آسمان عظمت کے نجوم وکواکب ہیں، آپ کی شخصیت علمی وفنی لحاظ سے بھی ایک ایسے چمن سے عبارت تھی جس کے آغوش میں ہزاروں گل ولالہ کی مہک ہے جنہوں نے اس مہکتے گلشن سے خوشبو مستعار لی، آپ کی شخصیت ایک عہد اور زمانے کی حیثیت رکھتی تھی، عہد ساز تھی اور اپنے دور کی ایسی ترجمان تھی کہ کسی پیش آمدہ اہم مسئلہ میں آپ کی لب کشائی کا انتظار رہتا تھا اور آپ کی پیش کردہ رائے معتدل اور متوازن ہوتی تھی۔

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پانچ سالہ دور میں تعلیم میں عشاء کے بعد حضرت مولانا کی مجالس میں اکثر حاضری ہوتی، مولانا نذر الحفیظ ندوی ازہریؒ، مولانا شمس الحق ندوی صاحب، مولانا محمد خالد ندوی غازی پوری صاحب اکثر سوال فرماتے، حضرت مولاناؒ جواب

دیتے، ان مجالس سے اساتذہ وطلبہ کو بہت فائدہ پہنچتا اور وہ باتیں جو بڑی ورق گردانی وشب بیداری اور طویل صحبتوں سے میسر ہوتی ہیں وہ چند منٹ میں سامنے آجاتیں، ان مجالس کا موضوع مختلف ہوتا تھا، سوالات میں آزادی تھی، کبھی حضرت مولاناؒ خود ہی کسی اہم امر کی جانب طلبہ کو مخاطب کرتے، آپ کے یہاں بڑوں کا احترام یہاں تک کہ کسی نسبت کا بھی احترام اتنا ہی تھا، چھوٹوں پر بے انتہا شفقت کا رویہ، معاصرین کے ساتھ ہمدردانہ ومتواضعانہ انداز عوام وخواص کے قلوب میں جگہ دیتا تھا، یہاں تک کہ آپ کے پاس آنے والے مہمانان بھی ہدایا وتحائف سے اپنی جھولیاں بھرتے اور شاد قسمت ہوتے تھے۔ حضرت مولانا کو خداوند قدوس نے اہم خصوصیات اور کمالات سے نوازا تھا، آپ فکر وعمل کا ایسا نمونہ تھے جو صدیوں کے بعد صفحہ ہستی پر نمودار ہوتا ہے اور پورے عالم کو روشن ومنور کرتا ہوا اپنی منزل کی جانب قدم بڑھاتا ہے، ایسے باکمال انسان جو اپنے ظاہر وباطن، قول وعمل کے اعتبار سے نمونہ عمل ہوں بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔ اس دور میں آپ کا ایک تفوق یہ بھی تھا کہ آپ جہاں باطنی کمالات کے مالک تھے، وہیں ان کا ظاہری عمل بھی شریعت وطریقت کا مکمل احاطہ کرتا تھا، سنت نبویہ ان کے اعمال وافعال میں چھلکتی تھی، آپ کی زندگی میں لیے گئے بعض اہم فیصلوں کو جب جانچا اور تولا گیا تو عین نبوی طریقہ کے مطابق نکلے اور ان میں کامیابی نصیب ہوئی۔ بڑے دور اندیش اور صاحب فہم وحکمت تھے، عالمیت کے آخری سال میں ہم کو آپ ہی کی تصنیف کردہ ''الادب العربی بین عرض ونقد'' آپ سے پڑھنے کا موقع ملا، عبارت پڑھی جاتی، پہلے اس کا خلاصہ پیش فرماتے اور وہ عربی ادب کے اہم متون وحواشی کی تلخیص ہوتی تھی، خداوند قدوس نے اپنی حکمت ومصلحت کے مطابق ان سے کام لیا، اب وہ مرضی مولیٰ کے مطابق بابرکت مہینہ وعشرہ میں ابدی نیند سو گئے، خدا عزوجل ان کو بلند مقام دے۔

اسوۂ نبویؐ کی جامعیت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''سیرت کا پورا جائزہ لینے سے یہ بات صاف اور نمایاں نظر آتی ہے کہ انسانی معاشرہ کے بھٹکتے ہوئے معاشرہ کو راہِ حق پر لگانا اور انسان کو حیوانی بھٹکتی ہوئی راہوں سے ہٹا کر اپنے خالق ومالک کے احکام کی تابع داری اور شریفانہ انسانی کردار، آپسی انسانی ہمدردی اور انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کے لائق صفات واخلاق اختیار کرنے کی دعوت اور اس کے لیے انتھک کوشش مقصد بنی ہوئی تھی اور سیرت کا مطالعہ کرنے والے کو سارے واقعات اسی کے گرد گردش کرتے نظر آتے ہیں اور یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مقابلہ وجنگ بہت محدود اور اعلیٰ انسانی اخلاق کے دائرہ کے اندر رہتے ہوئے کی گئی، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے واقعات اور حالات آپؐ کے رب کی طرف سے ایسے تشکیل دیے گئے کہ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے زندگی کے ہر موڑ اور ہر صورت حال میں ان سے نمونہ مل سکے، اس کے لیے ایسے نمونے رہتی دنیا تک مہیا کیے جانے کے لیے حضور ﷺ کو مشقتوں سے بھی گذارا گیا، اس طرح آپ ﷺ کی حیات طیبہ ساری انسانی برادری کے لیے اعلیٰ مثال بھی ہے اور تعلیم وتربیت اور حق کی رہنمائی کا بہترین اور اعلیٰ ذریعہ بھی ہے۔ آپ ﷺ پر ہزاروں درود وسلام ہو کہ امت کے فائدہ کے لیے اور رہنمائی کے لیے آپ ﷺ کو سب تکلیفیں اٹھانی پڑیں اور اعلیٰ صبر ورضا اور وسیع القلبی کا ثبوت بھی دینا پڑا۔'' (سیرت محمدیؐ - انسانیت کے لیے اعلیٰ نمونہ: ۲۶-۲۷)

ایک شجر سایہ دار تھا نہ رہا

مولانا محمد فرید حبیب ندوی
(ڈائریکٹر امام بخاری ریسرچ اکیڈمی-علی گڑھ)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بھی اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ کر دارِ آخرت کو کوچ کر گئے۔ آپ کئی نسلوں کے مربی تھے۔ لاکھوں افراد نے آپ سے اکتساب فیض کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات میں گوناگوں اوصاف اور متنوع کمالات ودیعت فرمائے تھے۔ ہماری نسل نے تو آپ کا آخری دور دیکھا ہے، جب آپ بڑھاپے کی عمر کو بھی پار کر کے اس منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں ہمہ وقت آپ کے تعلق سے دھڑکا لگا رہتا تھا، مگر اللہ پاک نے آپ کو طویل عمر عطا فرمائی اور آپ حدیث "من طال عمره وحسن عمله" کا مصداق ٹھہرے۔

ہمارے اس دورِ تاریک میں مولانا کی حیثیت 'قندیل رہبانی' کی تھی۔ آپ سیکڑوں اداروں کے سرپرست تھے۔ لوگ آپ سے مشورے لیتے اور آپ کی بتائی گئی ہدایات پر عمل کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے مولانا کو دور اندیشی، اصابت رائے اور فراست ایمانی سے نوازا تھا۔ وہ چیزوں کا گہرائی سے مشاہدہ کرتے اور بالکل 'جچی تلی رائے' دیتے تھے۔ اس سلسلے میں جن لوگوں کو تجربہ ہوا ہے ان کا کہنا ہے کہ بسا اوقات فوری طور پر مولانا کی رائے سمجھ میں نہیں آتی تھی؛ لیکن مآل کے اعتبار سے وہی مفید ثابت ہوتی اور اسی میں خیر کا ظہور ہوتا۔

مولانا کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔ دل ان کی جانب کھنچتا تھا۔ شخصیت میں ایسی جاذبیت وکشش کم ہی لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔ آپ جب مسجد میں تشریف لاتے تو اساتذہ وطلبہ کی نظریں آپ پر ہی لگی رہتیں۔ آپ جس مجلس میں ہوتے لوگوں کی توجہ کا مرکز ہوتے۔ یوں کہنا چاہیے کہ آپ 'من موہنی شخصیت' کے مالک تھے۔

بعض بزرگوں میں جلالی کیفیت غالب ہوتی ہے تو لوگوں کو ان سے ملنے میں اور ان کے پاس جانے میں ایک طرح کا خوف ہوتا ہے، جب کہ بعض اہل اللہ میں جمالی کیفیت کا غلبہ ہوتا ہے تو لوگوں کا دل ان کی طرف کھنچتا ہے اور وہ بلا کسی تردد اور ہچکچاہٹ کے ان سے ملتے ہیں۔ مولانا کی شخصیت میں یہ دوسرا پہلو ہی غالب تھا۔ لوگ بغیر کسی خوف کے آپ کی مجلس میں شریک ہوتے اور آپ سے مستفید ہوتے۔

مولانا کی شخصیت میں تحمل اور بردباری کا پہلو غالب تھا۔ آپ کو دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ آپ کو غصہ بھی آتا ہوگا۔ آپ کے چہرے پر نرمی وشفقت کے آثار ہی جلوہ گر رہتے تھے اور بجائے خود یہ بڑی خوش بختی کی بات ہے۔ حضور ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے:

"من أعطي حظه من الرفق فقد أعطي حظه من الخير" (سنن الترمذی: ۲۰۱۳) (جس کو نرمی اور رحم دلی میں سے حصہ ملا ہو تو اسے خیر میں سے حصہ مل گیا۔) آپ طلبہ کے لیے بڑے شفیق اور رحم دل ثابت ہوتے تھے۔ کوئی بھی موقع ہو اور کیسا ہی مسئلہ ہو، طلبہ نے آپ کی جانب سے کبھی درشتی اور سختی کا تجربہ نہیں کیا۔

ہمارے یہاں عموماً لوگوں کو مناصب کے لحاظ سے جانچا جاتا ہے، جب کہ ان کو ناپنے کا اصل پیمانہ ان کا انسانی پہلو ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو مولانا رحمہ اللہ سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی انسانیت کو مجسم شکل میں دیکھنے کا متمنی رہا ہو تو اسے چاہیے تھا کہ مولانا کو دیکھ لیتا۔ ذاتی طور پر جب میں اس دور میں انسانیت کا مجسم تصور کرنے کی کوشش کرتا تو سب سے پہلے اور سب سے نمایاں طور پر مولانا کی شخصیت ہی سامنے آتی۔ اس لیے میرے نزدیک مولانا کا اصل وصف؛ آپ کا انسانی اور اخلاقی پہلو ہے۔ شفقت ورحم دلی، تواضع وعاجزی، لوگوں سے محبت اور دوسروں کے تئیں خیر خواہی اور اس طرح کے اصل انسانی اوصاف اور اخلاقی کمالات ہی مولانا کی شخصیت کا اصل جوہر ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو قیادت بھی عطا فرمائی تھی اور دنیا بھر کی

بہت سی تحریکوں اور تنظیموں کے اعلیٰ عہدوں پر آپ فائز رہے۔ ہمارے ملک میں مسلم مذہبی قیادت کا سب سے اعلیٰ مقام بھی آپ کے حصے میں آیا۔ آپ نے بڑی خوبی کے ساتھ ان نازک ذمہ داریوں کو ادا کیا۔ آپ کے دورِ قیادت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ نے چیزوں کو متحد رکھا اور ہر طرح کے انتشار و افتراق سے بچائے رکھا۔ اس دورِ زوال میں کسی تنظیم و تحریک کو متحد رکھنا اور ٹوٹنے سے بچالینا بڑا مشکل کام ہے اور اس مشکل کام میں آپ پوری طرح کامیاب رہے۔ یہ آپ کے ساتھ اللہ کا بہت بڑا کرم تھا۔ یقیناً ملی اور ملکی مسائل میں بعض مواقع پر دیگر علماء و دانشوروں نے آپ سے اختلاف بھی کیا؛ لیکن آپ سب کو ساتھ لے کر چلتے رہے اور دوسروں کی رائے کا احترام کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو وسیع الظرفی اور کشادہ قلبی سے مزین فرمایا تھا۔ آپ مخالف رائے رکھنے والوں سے بھی محبت و احترام سے پیش آتے تھے؛ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ آپ ملنے والوں میں یہ دیکھتے ہی نہیں تھے کہ کون آپ کا ہم نوا ہے اور کون مخالف؟ آپ صرف اسلامی و انسانی بنیادوں پر ملتے تھے اور ملاقات کے وقت چہرے پر ایک خاص قسم کا تبسم ہوتا تھا۔

مولانا نے اعلیٰ اسلامی اخلاق اور بلند ترین انسانی قدروں کو اپنے اندر جذب کرلیا تھا۔ آپ کی زندگی قرآن و سنت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ مفکر اسلامؒ نے آپ کی بہترین تربیت فرمائی تھی، آپ حسنی خانوادے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ خاندانی روایتوں کے امین تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبی تعلق تھا۔ ایمان و عمل صالح کے ساتھ یہ نسبت سب سے بڑے شرف و اعزاز کی بات ہے۔

آپ اپنے وقت کے بہترین مدرس بھی تھے۔ جن حضرات نے آپ سے اس وقت پڑھا جب آپ کا دورِ شباب تھا اور آپ پر تدریس کے علاوہ دیگر ذمے داریوں کا اتنا بوجھ نہیں تھا، وہ آج بھی آپ کی تدریسی خوبیوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ خود میں نے کئی مرتبہ پروفیسر یاسین مظہر صدیقی صاحبؒ کی زبان سے آپ کے تدریسی کمالات کا ذکر سنا۔ وہ جب مولانا کا ذکر کرتے تو کہتے کہ مولانا اصلاً تو مدرس ہیں، پھر وہ مولانا کے درس تفسیر کی خوبیاں بتانے لگتے۔ اس حوالے سے مولانا کی عربی زبان پر دسترس اور مہارت کا ضرور ذکر کرتے۔

ہم نے بھی مولانا سے ''الادب العربی'' کا کچھ حصہ پڑھا ہے جو خود مولانا ہی کی تصنیف ہے۔ اس کے علاوہ بارہا مولانا کی تقریریں اور خطبات سنے ہیں۔ مجھے مولانا کے درس کی سب سے بڑی خوبی ان کا سہل انداز لگتا ہے۔ وہ جب گفتگو کرتے تو اپنی سطح سے نیچے اتر کر بالکل طلبہ اور مخاطبین کی سطح پر آجاتے۔ وہ بات کو اس طرح ہندی کی چندی کر کے سمجھاتے کہ کبھی کبھی شک ہونے لگتا کہ یہ گفتگو اتنے عظیم عالم کی زبان سے نکل رہی ہے۔ بہت ہی سادہ اور آسان گفتگو ہوتی۔ یہی حال مولانا کے اسلوبِ تحریر کا بھی ہے۔ اس میں بھی وہ مخاطبین کو سامنے رکھ کر بہت آسان انداز اختیار کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو درس و تدریس اور تحریر و تقریر کے خوب مواقع عطا فرمائے۔ بلا مبالغہ آپ کے بالواسطہ اور بلاواسطہ لاکھوں شاگرد ہیں جو دنیا بھر میں دعوت و تبلیغ اور اشاعتِ دین کا فریضہ انجام دے رہے ہیں اور جن حضرات نے شاگردی اختیار کیے بغیر دیگر ذرائع سے آپ سے استفادہ کیا، ان کی تعداد تو علام الغیوب کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ آج وہ جو کچھ خدمات انجام دے رہے ہیں، ان کا اجر مولانا کے نامہ اعمال میں بھی ثبت ہو رہا ہے۔ اسی طرح آپ نے کئی درجن کتابیں لکھیں جن میں سے کچھ بعض مدارس کے نصاب میں بھی داخل ہیں۔ ان کتابوں سے فائدہ اٹھانے والوں کی تعداد بھی لاکھوں سے متجاوز ہے۔ اس کے علاوہ سیکڑوں اداروں کی سرپرستی فرمائی۔ ان اداروں کے ذریعے ہونے والے دینی کاموں کا ثواب بھی مولانا کے حصے میں ضرور لکھا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا کو بھرپور زندگی عطا فرمائی، لائق تقلید اور قابل رشک زندگی، ایسی زندگی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے اور جن کو نصیب ہوتی ہے ان کا شمار خاصان خدا میں ہوتا ہے، اللہ مولانا کی مغفرت فرمائے اور ان کے درجات بلند فرمائے، ضرورت ہے کہ مولانا کے مشن کو زندہ رکھا جائے، ان کے چھوڑے ہوئے کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچایا جائے اور ان کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اسے پر کرنے کی کوشش کی جائے، دعا ہے کہ اللہ امت کو مولانا کا نعم البدل نصیب فرمائے اور ملت اسلامیہ ہندیہ کو بہترین قائد عطا فرمائے۔

حضرت الاستاذ کا تصنیفی وتدریسی ذوق

مولانا محمد خالد ضیا صدیقی ندوی
(استاد مدرسہ معینیہ عظمت العلوم مظفر پور- بہار)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ملت اسلامیہ ہندیہ کے ان چند یگانہ ویکتا' جامع کمالات اور کثیر الجہات شخصیات میں سے تھے، جو صدیوں بعد معدن انسانیت سے نکلا کرتی ہیں۔ان کی شخصیت میں اللہ تعالیٰ نے علم وفضل، فکروفن، ادب وتنقید، تعلیم وتربیت، ورع وتقویٰ، تواضع وانکساری، اعتدال وتوازن، حلم وبردباری، فہم وفراست، حکمت وبصیرت، شرافت ونجابت، وقار ومتانت، حسن سیرت اور حسن صورت کو اس قدر خوب صورتی کے ساتھ جمع کر دیا تھا کہ عہد آخر میں ان کی شخصیت فضائل وکمالات کی ایک جامع شخصیت بن گئی تھی۔

یوں تو حضرت الاستاذ علیہ الرحمہ کی دل آویز شخصیت کے کئی پہلو ہیں اور ہر پہلو دامن قلم کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہتا ہے: ''جا ایں جا است'' لیکن کیا کیجیے کہ اس مختصر سے مضمون میں راقم سطور نے آپ کے اوراق حیات کا صرف ایک ورق الٹنے کی کوشش کی ہے اور وہ ہے آپ کا علمی ذوق۔اس لیے وہ مجبور ہے کہ اپنی توجہ صرف اسی ایک پہلو پر مرکوز رکھے۔

اگر حضرت الاستاذ کی علمی خدمات کے دائرے کو متعین کیا جائے جس میں آپ کا علمی ذوق ابھر کر سامنے آیا، تو معلوم ہوگا کہ وہ صرف دو میدان ہیں: تصنیف وتالیف اور تعلیم وتدریس۔اس لیے ذیل میں صرف ان دو گوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔

تصنیف وتالیف:

استاد محترم کا علمی ذوق بہت بلند تھا۔آپ کی علم آموز صحبت میں چند گھڑی بیٹھنے والا بھی بہت کچھ لے کر اٹھتا تھا۔یوں تو آپ کا یہ ذوق آپ کی تدریس وتحریر میں زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آتا، مگر آپ کی نجی محفل اور مجلسی گفتگو بھی علم وادب سے بھرپور رہا کرتی تھی۔ ایسے ایسے علمی نکات اور ادبی جواہر پارے آپ کے خزانہ عامرہ سے ملا کرتے جو برسوں کے مطالعہ سے بھی حاصل نہیں کیے جا سکتے۔

آپ کے ذوق علمی میں بوقلمونی تھی: ایک طرف آپ ادیب وانشا پرداز تھے، تو دوسری طرف صحافی وکالم نگار بھی، تیسری طرف ایک باکمال استاد ومربی بھی، چوتھی طرف اپنے منفرد انداز کے مؤلف ومصنف بھی۔آپ نے تاریخ، تعلیم، سیرت، ادب، جغرافیہ اور نقد وتحقیق کو موضوع بنا کر عربی واردو میں تین درجن سے زائد کتابیں تصنیف کیں، جو سب کی سب ذوق کے ہاتھوں سے لی اور شوق کی نگاہوں سے پڑھی گئیں۔ان کے علاوہ آپ نے درسی کتابیں بھی مرتب فرمائیں، جن میں ''منثورات من أدب العرب'' ''الادب العربی بین عرض ونقد'' ''تاریخ الادب العربی'' (العصر الاسلامی) ''معلم الانشاء'' (حصہ سوم) اور ''جزیرۃ العرب'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

آپ نے اپنے ذوق علمی کی تسکین کے لیے آغاز شباب ہی میں پندرہ روزہ ''الرائد'' کا اجرا کیا اور اپنی نگارشات سے اس جریدہ کے دامن کو نہ صرف مالا مال فرمایا؛ بلکہ اس کو عالمی شہرت ووسعت عطا کی۔اسی طرح ''البعث الاسلامی'' اور ''تعمیر حیات'' میں بھی آپ کے قیمتی مقالات ومضامین اخیر عمر تک شائع ہوتے رہے۔ کاروان ادب (لکھنؤ) جیسے علمی وادبی مجلّے کی ادارت بھی سنبھالی اور اسلامی ادب کے پھولوں سے اس کے دامن کو بھر دیا۔اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ابتدا ہی سے قلم وقرطاس سے جو رشتہ قائم ہوا، وہ

پوری زندگی برقرار رہا۔

آپ کا اسلوب تحریر انتہائی آسان، نہایت سادہ مگر شگفتہ ومؤثر تھا، تکلف وتصنع سے پاک، آورد سے خالی۔ آپ کی تحریر مرعوب کن نہیں متاثر کن تھی۔ مضامین کی علمی سطح چاہے جتنی بلند ہو؛ لیکن وہ دماغ سے پہلے دل کو متاثر کرتی ہے۔ ادب وانشا سے گہری اور دیرینہ ربط ہی کا کرشمہ تھا کہ زبان نہایت آسان اور سادہ استعمال ہونے کے باوجود اس میں ادب وانشا کی تمام لطافتیں موجود ہوتیں۔ پروفیسر وصی احمد صدیقی مرحوم نے آپ کی وقیع تصنیف ''غبار کارواں'' کے مقدمہ میں آپ کی تحریر کی خصوصیات کو جن الفاظ میں بیان فرمایا ہے، اس سے بہتر انداز میں اس پہلو پر روشنی نہیں ڈالی جاسکتی۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا پرجوش عبارت اور استعاروں کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں، بالکل سادہ عبارت لکھتے ہیں جسے شاعری کی زبان میں سہل ممتنع کہیں گے، نفس مضمون اتنا سنجیدہ اور علمی اور بیان اتنا سادہ اور پرکار کہ یہ ہر لکھنے والی کی بس کی بات نہیں..... طرز انشا اتنا دل کش اور رعنائی سے بھرپور ہوتا ہے کہ مولانا جو کچھ کہتے ہیں وہ دل میں اترتا چلا جاتا ہے۔''

مناسب ہوگا کہ آپ کے اسلوب تحریر کا ایک نمونہ پیش کردیا جائے۔ ادب جاہلی کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اگر ہر ادب وزبان کا کوئی خاص طرۂ امتیاز تلاش کیا جائے تو عربی ادب وزبان کا طرۂ امتیاز اس کا زور اور شکوہ ہے، جو زیادہ تر اس کے الفاظ میں پایا جاتا ہے اور عہد جاہلی اس سلسلے میں زیادہ امتیازی خصوصیت کا مالک رہا ہے۔ یہ دور پڑھنے لکھنے کا نہ تھا، امی دور تھا، اس لیے کمال شعری معنی سے زیادہ تعبیر والفاظ میں ظاہر ہوا اور شاید عربوں کی صحرائی اور پرمشقت زندگی سے اسی کو مناسبت زیادہ تھی، پھر اس رجحان کا سایہ عربی شاعری کے تمام ادوار میں کسی نہ کسی حد تک برابر ملتا ہے۔

عہد جاہلی کی دوسری صفت صراحت اور انسانی جذبات واحساسات کی سچی ترجمانی ہے اور الفاظ وعبارت کے شکوہ کے بعد عربی شاعری کی دوسری امتیازی شان اس پہلو میں ملتی ہے اور اس جز نے عربی شاعری کو مضمون ومعنی کے لحاظ سے گہری نہ ہونے کے باوجود خاصی اثر انگیز؛ بلکہ انقلاب انگیز بنادیا۔''

(جزیرۃ العرب، صفحہ ۱۸۵، مولانا محمد رابع حسنی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنؤ، سنہ ۲۰۱۱ء)

ذرا اس نمونے کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے، پھر غور کیجیے کہ پروفیسر وصی احمد صدیقی نے کتنی سچی بات لکھی ہے کہ ''نفس مضمون اتنا سنجیدہ اور علمی اور بیان اتنا سادہ اور پرکار کہ یہ ہر لکھنے والی کی بس کی بات نہیں۔''

تعلیم وتدریس :

آپ کے ذوق علمی کا سب سے زیادہ مظاہرہ درس وتدریس میں ہوتا۔ آپ فراغت کے بعد سے زندگی کے آخری ایام تک اس مقدس پیشے سے وابستہ رہے، اس طرح ایک طویل عرصے تک آپ نے مسند درس کو زینت بخشی اور بلا مبالغہ ہزاروں تشنگان علوم نبوت کو اپنے چشمہ علمی سے سیراب کیا۔ راقم سطور کو بھی آپ کے خوان علم وادب سے بقدر ظرف واستعداد ریزہ چینی کی سعادت ملی ہے، اس کا احساس ہے کہ آپ معلم ومدرس ہونے کی حیثیت سے بھی بڑے فائق اور ممتاز تھے۔ خاص طور سے تفہیم پر قدرت کے حوالے سے آپ کی مثال نہیں تھی۔ آپ کی تدریس کا انداز بالکل سادہ، منفرد اور دل نشیں تھا۔ ایک طویل تدریسی تجربے نے آپ کے ذہن میں یہ بات بٹھادی تھی کہ طلبہ کی صلاحیتوں کا ادارک کیے بغیر کار معلّمی انجام دینا بہت زیادہ کارآمد نہیں؛ بلکہ بسا اوقات یہ نقصان دہ ثابت ہوتا ہے، اس لیے آپ کی پوری کوشش ہوتی کہ تدریس کے لیے ایسا انداز اختیار کیا جائے جو ہر سطح کے طالب علم کے لیے مفید اور دلچسپ ہو؛ اس کے لیے آپ تفہیم کی اس غیر معمولی صلاحیت کو کام میں لاتے جس سے اللہ تعالیٰ نے آپ کو وافر حصہ عطا فرمایا تھا۔

تدریس کے دوران آپ کا سب سے زیادہ جو وصف کھل کر

آتا وہ فقہ اللغہ کا تھا۔ آپ ایک ایک لفظ کی اس طرح ہندی کی چندی اور اس کا تحلیل وتجزیہ کرتے کہ غبی سے غبی طالب علم بھی سبق کو ہضم کرلیتا۔ لفظ کی حقیقت، اس کے مشتقات، اس کے ماخذ، اس کے مدلولات وغیرہ پر جب گفتگو فرماتے تو باذوق طلبہ کے ادبی حاسہ کو خوب غذا ملتی۔ نثر پڑھاتے تب بھی اور شعر پڑھاتے جب بھی صرف الفاظ ونقوش کو منتقل کردینے پر آپ بس نہ کرتے؛ بلکہ اس بات کی پوری کوشش کرتے کہ طلبہ کے ذہنوں میں فن کو منتقل کردیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اشعار کا درس دیتے وقت ان کے ترجمے کے ساتھ ساتھ ان کا پس منظر بھی بیان کرتے، شاعر کا جامع تعارف بھی کراتے، اگر جغرافیہ سے متعلق کوئی بحث آجاتی تو اس پر بھی روشنی ڈالتے۔ اس کے بعد جب ان کی لغوی، ادبی اور بلاغی تشریح کرتے تو متعلقہ سبق بالکل بے غبار ہوجاتا۔

درس کی چند خصوصیات:

راقم سطور کو آپ سے ادب عربی (نثر ونظم) پڑھنے کی سعادت ملی، دوران درس آپ کی تدریس کی جن خصوصیات نے آپ کی طرف مائل؛ بلکہ آپ کی محبت میں گھائل کیا، ان میں سے نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

۱- آپ کے درس کی سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ آپ کا درس طلبہ کو مطالعہ کی وسعت کی طرف رہنمائی کرتا تھا۔ دوران درس بسا اوقات چھوٹے چھوٹے ایسے فقرے استعمال کرتے جو آسان ہونے کے ساتھ ساتھ علمی گہرائی اور ادبی شان لیے ہوتے اور جو اس طرف بھی اشارہ کرتے تھے کہ ایک سچے طالب علم کو تفصیل کے لیے مصادر ومراجع کی کتابوں سے رجوع کرنا چاہیے۔ ''مختار الشعر العربی'' اور ''الادب العربی'' کا درس دیتے وقت ادب اور متعلقات ادب کے حوالے سے بہت سے ایسے فقرے ارشاد فرمائے جو آسان اسلوب میں وسیع اور گہرے مطالعے کا نچوڑ کہے جاسکتے ہیں۔ اس قبیل کی چند مثالیں پیش کرنا فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

ایک بار فرمایا: ''الفاظ کے معانی کے جاننے کا نام زبان اور الفاظ کی کیفیت جاننے کا نام ادب ہے۔''

ایک بار فرمایا: ''ادب کا تہذیب (طرزِ زندگی) سے بڑا گہرا ربط ہے؛ اس لیے کہ تہذیب کیفیات سے بنتی ہے۔''

علم کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ''اگر کسی کلام سے اہم معلومات حاصل ہورہی ہوں، تو وہ علم ہے، اگر سرسری معلومات حاصل ہورہی ہوں تو اسے علم نہیں ''بات'' کہیں گے۔''

فن کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: ''ہر اس عمل کو فن کہتے ہیں جس کو دیکھ یا سن کر تاثر پیدا ہو۔''

علم اور فن کے مابین فرق کو کس قدر آسان انداز میں سمجھایا کہ ''سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو علم اور اثر لینے کی صلاحیت کو فن کہتے ہیں۔''

تعبیر کی حقیقت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''تعبیر کہتے ہیں کیفیت وتاثر کے ساتھ بات کے ادا کرنے کو۔''

زبان وادب کے مابین فرق کو اس طرح واضح فرمایا: ''کلام میں احساس وتاثر ہے تو ادب ہے، ورنہ زبان ہے۔''

ایک بار فرمایا: ''اشعار بغیر ذوق کے کوئی معنی نہیں رکھتے۔'' کتنی گہری بات ہے یہ!

ایک بار فرمایا: ''حقیقت، علم سے آتی ہے اور مجاز، ادب سے آتا ہے۔''

یہ ادبی نکتہ کوئی ادب کا رمز شناس ادیب ہی بتا سکتا ہے۔

ادیب اور غیر ادیب میں فرق بیان کرتے ہوئے ایک بار فرمایا: ''ادیب اس کیفیت کو بھی بیان کردیتا ہے جس سے وہ دوچار نہیں؛ اس لیے کہ وہ کیفیات کے مواقع سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے، جب کہ غیر ادیب ایسا نہیں کرسکتا۔''

غزل، نسیب اور تشبیب کے تعارف کے ذیل میں فرمایا: ''عشق ومحبت کے لطیف جذبات واحساسات کے اظہار کا نام غزل ہے۔ نسیب: دلی تعلق کو کہتے ہیں، جب کہ تشبیب: ظاہری حسن وجمال کے تذکرے کو کہا جاتا ہے۔''

غزل کے بارے میں ایک نکتہ یہ بیان فرمایا کہ ’’غزل میں موضوع مختلف نہیں ہوتا؛ البتہ احساس تبدیل ہوتا رہتا ہے۔‘‘

ایک موقع پر فرمایا: ’’صحیح ادبی ذوق حاصل کرنے کے لیے عربی ادب میں ’’مجازات‘‘ کو سمجھنا اسی طرح ضروری ہے جس طرح اردو میں ’’محاورات‘‘ کو سمجھنا ضروری ہے۔‘‘

ایک موقع پر فرمایا: ’’ادب درحقیقت ثقافت کی تصویر ہوتا ہے، اس لیے ہر ملک اور اور ہر علاقے کا ادب جدا جدا ہوتا ہے۔ جیسے پائجامہ اور پتلون۔ پائجامہ مشرقی ثقافت کا حصہ ہے اور یہ یہاں کے لیے موزوں ہے؛ اس لیے کہ یہاں شدید گرمی ہوتی ہے، جب کہ پتلون مغربی ثقافت کا حصہ ہے اور یہ وہاں کے لیے مناسب ہے؛ کیوں کہ وہاں سردی سخت ہوتی ہے۔‘‘

۲- تدریس کے دوران اکثر آپ خارجی مثالوں سے متعلقہ سبق کو ذہنوں میں پیوست کرنے کی کوشش کرتے؛ چنانچہ ادب عربی کی تدریس کے دوران جب عناصر ادب کی بحث آئی، تو فرمایا:

’’ادب کے چار عناصر ہیں: عاطفہ، خیال، فکر اور صورت لفظیہ جب تک کسی فقرے میں یہ چاروں عناصر بیک وقت نہیں پائے جائیں گے وہ فقرہ ’’ادب‘‘ نہیں کہلا سکتا؛ مگر ان چاروں عناصر کی مقدار میں تناسب بہت ضروری ہے، اگر افراط وتفریط سے کام لیا گیا تو اہل ذوق اس کو معیوب سمجھتے ہیں؛ بلکہ بسا اوقات اس پر ادب کا اطلاق ہی نہیں کرتے۔ پھر فرمایا: جیسے دودھ والی چائے ہوتی ہے، اس کے لیے چار چیزوں کا ہونا ضروری ہے: دودھ، پانی، چائے پتی اور شکر۔ جب تک یہ چاروں چیزیں نہیں ہوں گی، چائے تیار نہیں ہوسکتی۔ پھر بہترین اور نفیس چائے اسی وقت تیار ہوگی جب ان چاروں عناصر کے مقدار میں تناسب درست ہو۔ اگر پانی زیادہ ہو جائے یا دودھ کم ہوجائے یا شکر اور چائے پتی زیادہ یا کم ہوجائے تو پھر باذوق حضرات ایسی چائے نوش کرنا گوارا نہیں کریں گے۔‘‘

غور کیجیے کہ عناصر ادب کی تفہیم کے لیے یہ خارجی مثال کس قدر موزوں اور طلبہ کے ذہن سے کتنی قریب ہے۔

۳- جس دور کا ادب پڑھا رہے ہوتے، تو سب سے پہلے اس دور کی خصوصیات، شعروادب پر اثر ڈالنے والے رجحانات، شعراء کے حالات، ان کی شاعری کے امتیازات وخصوصیات، سب پر ایک جامع اور تعارفی تقریر فرماتے، اس کے بعد اشعار کا ترجمہ کرتے تو ان کا مفہوم خود بہ خود ذہنوں میں اترتا چلا جاتا۔ اس کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیں:

جب یہ راقم آپ کے ادبی دسترخوان کا ریزہ چیں تھا، تو اس وقت عہد عباسی کی شاعری آپ سے متعلق تھی، خاص طور سے ابوتمام کی شاعری کا زیادہ حصہ زیر درس رہا۔ جب آپ نے سبق شروع فرمایا تو سب سے پہلے ادب پر جن رجحانات نے عہد عباسی میں گہرے اثر ڈالے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

’’عہد عباسی میں دو طرح کے رجحانات سامنے آئے: عقلی رجحان، یہ یونان سے آیا اور ثقافتی رجحان، یہ ایران سے آیا۔ ان دونوں رجحانات کے اثرات ادب پر پڑے، نثری ادب پر بھی اور شعری ادب پر بھی؛ البتہ شعری ادب پر اس کا اثر اس لیے کم پڑا کہ عرب اس باب میں اپنے آپ کو سب سے ممتاز سمجھتے تھے، وہ دوسروں کی ہر چیز لینے کے روادار نہیں تھے۔‘‘

پھر گفتگو کا رخ عہد عباسی کی شاعری پر یوں مڑ گیا:

’’عربوں کے یہاں نثری ادب کا رواج نہیں تھا، ان کے یہاں صرف شعری ادب تھا؛ اس لیے کہ نثر کے لیے علم کا ہونا ضروری ہے اور عرب اس دولت سے محروم تھے؛ لیکن جب عربوں کا قرآن مجید سے رابطہ ہوا تو ان کے اندر علم وتمدن اور تہذیب وشائستگی پیدا ہوئی، جس کے نتیجے میں عرب ایک باعزت اور متمدن قوم بن گئے۔ اس لیے عہد عباسی میں آکر شاعری علمی انداز کی ہونے لگی جو زمانہ جاہلیت میں معیوب سمجھا جاتا تھا، اب اس میں تکلفات پیدا ہونے لگے، اصول بلاغت کا سہارا لیا جانے لگا، گویا شاعری کا پیمانہ ہی بدل گیا، لیکن ایسی شاعری کی قدر وقیمت اس لیے بڑھی کہ شعراء کے کمالات اس میں ظاہر ہونے لگے، غور وفکر کا دائرہ اب خواص سے

عوام تک وسیع ہوگیا۔غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس تبدیلی کا سہرا ابوتمام کے سر جاتا ہے۔"

اس کے بعد ابوتمام کی شاعری پر آئے اور اس کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"ابوتمام کی شاعری کی بنیادی طور پر دو خصوصیات ہیں: معنوی نکتہ پیدا کرنا اور پرشکوہ الفاظ استعمال کرنا۔اس نے الفاظ کا شکوہ عربوں سے لیا؛ کیوں کہ عربوں کے یہاں الفاظ پر زیادہ زور ہے اور یہی ان کا ذوق ہے۔لیکن چوں کہ ابوتمام کے دور میں تمدن آگیا تھا اور علم کا دور دورہ تھا، جس کے نتیجے میں مزاج علمیت پسند ہوگیا تھا، اس لیے اس نے علمی اور عقلی جدت کے لیے معانی کا سہارا لیا جو غیر عرب شعراء کے کمالات کا میدان ہے۔اس طرح اس نے دونوں خصوصیات کو اپنی شاعری میں بڑی خوبی سے جمع کرلیا تھا۔"

۴- آپ جب درس شروع فرماتے تو اس بات کا پورا خیال رکھتے کہ طلبہ درس کو اچھی طرح ہضم کرلیں۔اس کے لیے آپ صرف ترجمہ وتشریح کو کافی نہ سمجھتے؛ بلکہ ایک طالب زبان وادب کے ذوق کو پروان چڑھانے میں جن جن چیزوں کی ضرورت پڑسکتی ہے، سب کو زیر بحث لاتے۔چنانچہ آپ اس کے لیے لغوی، نحوی، صرفی، بلاغی اور لطافت زبان اور حسن انشا سے آشنا کرنے والے ان تمام پہلوؤں کو اس طرح اپنے درس میں سمو لیتے کہ باذوق طلبہ عش عش کر اٹھتے۔

ذیل میں اس قبیل کی چند مثالیں پیش کرنا فوائد علمیہ سے خالی نہ ہوگا۔

(الف) آپ کسی لفظ کا معنی بتلاتے ہوئے کبھی کبھی اس کی ضد بھی بتاتے، جیسے "الحطب" کا معنی بتاتے ہوئے فرمایا:

"وہ لکڑی جو جلائی جائے۔"

پھر فرمایا: "اس کی ضد "الخشب" آتی ہے۔"

(ب) کبھی دو مترادف الفاظ کے مابین باریک فرق کو بھی واضح کرتے۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

"اگر کسی کو غصہ ردعمل کے طور پر آئے تو "مُغضَب" ورنہ "غاضب" کہا جائے گا۔"

"البر": ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آنا۔

"الصلة": اعزہ واقارب کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔"

"اللعب": ایسا کھیل جس سے کسی طرح کا فائدہ ہو۔

"اللهو": ایسا کھیل جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔"

(ج) اگر شعری یا نثری ادب میں کوئی بلاغی پہلو ہوتا، تو اس کی طرف بھی اشارہ فرماتے، جب ابوتمام کے ماسٹر پیس قصیدہ (قصیدہ بائیہ جس کا مطلع ہے: السيف أصدق أنباءً من الكتب) کے اس شعر پر پہنچے:

عداك حر الثغور المستضامة عن
برد الثغور وعن سلسالها الحصب

تو لغوی تشریح کے بعد فرمایا: "بلاغی لحاظ سے اس شعر میں طباق بھی ہے اور جناس بھی۔

تشبیہ کی بات نکلی تو فرمایا:

"گائے سے تشبیہ آنکھوں کی خوب صورتی کے لیے دی جاتی ہے، جب کہ ہرن سے درازیِ گردن کے لیے۔"

(د) اگر کوئی محاورہ آتا تو اس کی طرف بھی اشارہ فرماتے، جیسے ابوتمام کے اسی قصیدے میں ایک فقرہ آیا:

"وقد ألجم الخطى منطقه"
(نیزے نے اس کی زبان میں لگام لگادی)

تو فرمایا: "یہ عربی کا ایک محاورہ ہے جو "شدتِ تحیر" کے موقع پر بولا جاتا ہے اور یہاں مفہوم یہ ہے کہ نیزے بازی اس قدر سخت تھی کی شدت تحیر میں لوگوں کی بولتی بند ہوگئی تھی۔

(ھ) اگر کوئی لفظ اپنا کوئی حقیقی معنی بھی رکھتا ہو اور استعمال کسی اور معنی ہوتا ہو، تو دونوں کی وضاحت فرماتے۔جیسے: ایک لفظ آیا:

"برزة الوجه" (کھلے چہرے والی، چہرے کا ظاہری حصہ)

پھر اس کی اصل کی نقاب کشائی کچھ اس طرح فرمائی:

"برزۃ" اصل میں اس عورت کو کہتے ہیں جو بڑی محترم، بارعب اور باوقار ہو اور شان کے ساتھ سامنے آئے جس کی وجہ سے کوئی بد باطن بری نظر نہ ڈال سکے، جیسے شہزادی وغیرہ۔"

(و) اگر کوئی فعل' لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہو اور دونوں کے معنی میں فرق بھی ہو، تو اس کی بھی وضاحت فرماتے، جیسے: "وَلّـی یُـوَلِّـی تَولیةً" لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ فرمایا:

"اگر لازم استعمال ہو، تو اس کا معنی ہوگا: پیٹھ پھیر کر بھاگ جانا اور متعدی استعمال کرنے کی صورت میں اس کا معنی ہوگا: حاکم بنانا۔"

۵- آپ درس میں لمبی تقریر کرنے کے عادی نہ تھے۔ مختصر نپے تلے جملے استعمال کرتے اور انہی جملوں سے سبق کو ذہن نشین کر دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے درس میں اکتاہٹ کبھی نہ ہوتی۔

آخری بات:

اللہ تعالیٰ نے حضرت الاستاد علیہ الرحمہ کو بہ حیثیت استاد محبوبیت کی جو شان عطا فرمائی تھی، وہ کم اساتذہ کے حصے میں آتی ہے۔ یوں تو ہر سطح کے لوگ آپ سے محبت کرتے تھے؛ لیکن آپ کے شاگرد تو آپ پر جان لٹانے کے لیے تیار رہتے تھے اور ایسا اس لیے تھا کہ آپ ایک اچھے استاد تھے اور اچھا استاد اپنے شاگردوں کے دلوں میں رہا ہی کرتا ہے۔ پروفیسر شیخ عبدالرشید نے کتنی سچی بات لکھی ہے کہ "استاد کا انداز حیات اور اس کی گفتار و کردار طالب علم پر اثر انداز ہوتی ہے۔ استاد کی عادات، اظہار، اعتدال، عالی ظرفی، وقار و متانت اور علم و تحقیق ہی اسے محبوب بنا سکتے ہیں۔ اگر استاد کی شخصیت میں محبوبیت کا فقدان ہو، تو وہ اچھا استاد نہیں بن سکتا۔"

افسوس کہ ایسا استاد یگانہ بھی ہمیشہ کے لیے چشم عالم سے نہاں ہو گیا۔ آپ کے روپوش ہو جانے سے صرف آپ کی ذات نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو گئی؛ بلکہ علم و فضل کا ایک روشن چراغ بجھ گیا، علم و ادب کی بارونق محفل بے رونق ہو گئی اور ہم جیسے ہزاروں شاگرد اپنے شفیق و کریم استاد کی شفقت بھری چھاؤں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے۔ آہ!

تم بجھے یوں ساری محفل بجھ گئی

معلم کی اہمیت

"معلم کا اثر و طاقت قدیم سے تسلیم شدہ چلی آ رہی ہے، منتظم کے برعکس معلم بہت اثر و عمل دخل رکھتا ہے اور انسانی زندگی کی تاریخ میں زیادہ کام اسی کا رہا ہے، یہ معلم خواہ کسی بڑے مدرسہ کا ہو یا محلّہ کے ایک چھوٹے گوشے کا ہو یا پرائیویٹ طریقہ سے تعلیم دینے والا ہو، یہ اپنے متعلم کے دل و دماغ میں بہت کچھ اتار دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

قدیم زمانوں میں جب کہ تعلیمی نظام وسیع نہیں ہوتا تھا، معلم ہی سب کچھ ہوتا تھا، اس حقیقت کو سب اہل عقل مانتے اور سمجھتے تھے، تعلیمی نظام کے وسیع ہو جانے پر بھی معلم کے مقام و اہمیت کو کم نہیں سمجھا گیا، چنانچہ پرانی درس گاہیں- خواہ انگلستان کے آکسفورڈ اور کیمبرج ہی کیوں نہ ہوں- استاد کو بہت اہم مقام دیتی ہیں، ان میں طالب علم کو جتنا اپنے استاد پر منحصر اور اس سے وابستہ رہنا پڑتا ہے، یونیورسٹی کے انتظامی ذمہ داروں پر نہیں رہنا پڑتا، استاد ہی پڑھاتا ہے، وہی نظر رکھتا ہے، وہی استعداد کا اندازہ کرتا ہے اور وہی پاس فیل کرتا ہے، یونیورسٹی کی انتظامیہ اسی کی رائے کے مطابق کارروائی و اندراج کرتی ہے۔ اسلامی تاریخ میں بھی برابر معلم کو اصل اہمیت دی گئی ہے اور تعلیم کا انحصار اسی پر سمجھا گیا ہے۔" (سماج کی تعلیم و تربیت: ۷۵-۷۶) مرشد الامت حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندویؒ

دین حق کے ترجمان — ملتِ بیضا کے امین

مولانا محمد سلمان ندوی بجنوری
(استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء — لکھنؤ)

مصائب اور تھے پر دل کا جانا
عجب اک سانحہ سا ہوگیا ہے

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہباں:

وہ عظیم وگراں مایہ ہستی اور بلند پایہ شخصیت جس کے وجود مسعود سے ہندوستانی چمن پُر بہار وگل وگلزار اور سرسبز وشاداب تھا، جس ہستی کے وجود نے مسلمانان ہند کے سروں کو فخر سے بلند کر رکھا تھا، جس کی راتیں اک ایسی امت کی فکر اور اس کی دینی واسلامی سربلندی کے لیے روتے ہوئے گزریں، جس کو یہ بھی احساس نہ تھا کہ ہمارا ہندوستان میں کوئی رہبر ورہنما اور مرشد موجود ہے، جو ہمارے لیے بارگاہ الٰہی میں تڑپ رہا ہے، بستر پر کروٹیں بدل رہا ہے، سسکیاں لے لے کر امت مسلمہ کی فلاح وبہبود کے لیے تضرع وگریہ وزاری اور آہ وبکا کے ساتھ ہاتھ پھیلائے ہوئے بھیک مانگ رہا ہے، جو مینارۂ نور بن کر ملت اسلامیہ ہندیہ کی رہبری ورہنمائی کے لیے بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیل رہبانی کی حیثیت رکھتا تھا، امت مسلمہ پر جب بھی کوئی مصیبت آتی یا کسی آزمائش کے دور سے یہ امت گزرتی تو یہی وہ ہستی تھی جس کو اس امت کی فکر میں بڑا ہی غمزدہ اور افسردہ خاطر دیکھا گیا، گویا خود اس کی ذات یا اس کے اہل خانہ پر کوئی مصیبت آن پڑی ہو، جس وقت ترکی میں زلزلہ آیا اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کا جانی مالی نقصان ہوا، تو حضرت مرشد امت روزانہ اور بار بار ترکی کے متعلق معلوم کرتے کہ اب کیسے حالات ہیں؟ مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ تو نہیں ہوا؟ ایک دن یہ حقیر حضرت مرشد امت علیہ الرحمہ کے قدموں میں ہی بیٹھا تھا اور حضرت کے پاس جناب مولانا سید جعفر مسعود حسنی مدظلہ تشریف فرما تھے، حضرت نے فرمایا کہ کتنا بڑا اور عظیم نقصان ہے، اللہ تعالیٰ اس امت سے ناراض ہیں، پورا شہر تباہ ہوگیا، ہمیں اپنے اعمال کا جائزہ لینا چاہیے، حضرت بڑے غم گین اور افسردہ تھے، حضرت مولانا علیہ الرحمۃ "متواصل الأحزان، دائم الفكرة، ليست له راحة" کی سچی تصویر تھے، مولانا جعفر صاحب نے حضرت کی تسلی کے لیے کہا کہ حضرت بعض علاقے ایسے ہیں کہ وہاں زلزلہ آتا ہی ہے، جغرافیائی اعتبار سے سال میں ایک آدھ بار زلزلہ آ ہی جاتا ہے، لہٰذا اس میں زیادہ فکرمند نہ ہوں، پھر حضرت نے فرمایا کہ ہندوستان سے ابھی تک کسی کا بیان بھی جاری نہیں ہوا، پھر اسی وقت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی دامت برکاتہم سے فون پر بات کی اور ترکی کے تعلق سے مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے ایک تحریر جاری کرنے کا حکم دیا۔

حضرت مولانا کی دینی حمیت وغیرت:

اس حقیر نے حضرت کا تڑپنا اس وقت بھی دیکھا ہے کہ جب کسی قابل رحم شخص نے صحابی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اپنی زبان طعن دراز کی تو حضرت کے چہرہ پر اس وقت سخت ناگواری کے آثار اور ایسا غصہ تھا کہ پتہ نہیں اب کیا ہو؟! جناب مولانا محمود حسن حسنی رحمہ اللہ بھی موجود تھے، لیکن حضرت نے بے انتہا صبر وضبط سے کام لیا اور خاموش رہے اور پھر عشاء بعد کی مجلس میں صحابہ کرامؓ کی شان اور فضیلت کے متعلق کھل کر گفتگو فرمائی، خلاصۃً فرمایا کہ اگر کسی کی زبان یا دل میں کسی ادنیٰ سے صحابی کے متعلق بھی کوئی غلط اور نازیبا بات آتی ہے تو اس کا ایمان خطرہ میں ہے، وہ اپنی خیر منائے۔

حضرت مولانا کی رحلت عظیم خسارہ:

ہمارے حضرت مرشد الامت کیسی عظیم ہستی تھے، حضرت کا رحلت فرمانا پوری امت مسلمہ خصوصاً مسلمانان ہند کے لیے عظیم خسارہ ہے، مسلمانوں کو ملک ہندوستان میں جن ناگفتہ بہ حالات سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، ایسے میں حضرت مرشد الامت کا وجود ہی اس ملک کے لیے خیر و برکت اور رحمت سے کچھ کم نہ تھا، ہندوستانی مسلمان اپنے اندر ایک حوصلہ اور فخر محسوس کرتے تھے اور اس ملک میں جتنی بھی مسلم تنظیمیں اور ان کے ذمہ داران تھے، ان تمام کا قبلہ آپ ہی کی شخصیت تھی، سب آپ ہی سے رجوع کرتے اور آپ کے مشوروں اور ہدایات کے مطابق عمل کرتے، حضرت مولانا نے ہندوستان میں دین اسلام کو باقی رکھنے اور ملی تشخص کو زندہ رکھنے اور اسلامی تہذیب و ثقافت کی بقا کے لیے اپنی قیمتی تحریروں اور مختلف خطابات کے ذریعہ آخری سانس تک جد و جہد جاری رکھی، کبھی اس تعلق سے غفلت یا بے فکری ظاہر نہیں کی۔

ہمیں کیا خبر کہ ہمارے حضرت کیا تھے؟ اس پیرانہ سالی کے عالم میں حضرت مرشد الامت کا وجود مسعود ہی امت مسلمہ کے لیے ہمت و حوصلہ اور پامردی و استقلال کا مضبوط قلعہ اور آہنی دیوار تھا، چہ جائیکہ حضرت مسلمانوں کے خلاف ہونے والی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں نکلتے اور نوجوانوں کو مہمیز لگاتے اور میدان کار میں ان کو اتارتے اور کسی تحریک سے ان کو جوڑتے، حضرت اپنی عمر کی اس طویل مدت میں خاموشی کے ساتھ جتنی خدمات انجام دے چکے اور جس طرح سے اپنے آپ کو مٹایا کھپایا اور گھلایا، آج کے نام نہاد قائدین و لیڈران ان قربانیوں اور خدمات کا تصور تک نہیں کر سکتے، بعض ناخلف لوگوں نے حضرت کے خلاف اپنی گندی زبان سے اپنے بغض و حسد کا اظہار کر کے اپنی عاقبت خراب کی، بعض نے کہا کہ یہ پرسنل لا بورڈ سے استعفیٰ دیں، تو بعض نے کہا کہ ندوۃ العلماء کی نظامت سے استعفیٰ دیں، آج ان لوگوں نے حضرت کے سفر آخرت کا منظر دیکھ کر امت مسلمہ کے مابین حضرت کی مقبولیت و محبوبیت کا اندازہ لگا لیا ہوگا اور یہ بھی جان لیا ہوگا کہ اگر ہم کوئی غلط اقدام کر بیٹھتے تو ہمارا کیا انجام ہوتا، حضرت کے جنازے میں جیسا انسانوں کا سیلاب اور ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا - اس سے قبل ہم کم عمر لوگ کیا دیکھتے - پرانے اور عمر دراز حضرات سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ پوری زندگی گزر گئی لیکن کسی بڑی سے بڑی شخصیت کے جنازے میں بھی ان آنکھوں نے ایسا انسانی سیلاب نہیں دیکھا، معلوم ہو رہا تھا کہ گویا کثیر تعداد میں فرشتوں کا نزول ہوا ہے۔

حضرت کی زندگی کے بعض سوانحی پہلو:

حضرت مولانا کی ولادت باسعادت ۲۵/جمادی الاخریٰ ۱۳۳۸ھ مطابق یکم اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ملک ہندوستان کے معروف و مشہور اور پاکیزہ حسنی خانوادہ میں ہوئی، جو سیدنا حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جا ملتا ہے، آپ کی پرورش خاندان کی پاک سیرت اور خدا ترس خواتین اور خاندانی بزرگوں کے سایہ شفقت و عاطفت میں ہوئی، جس کی بنا پر حضرت مولانا کے نہاں خانہ دل میں صلاح و تقویٰ، للّٰہیت و جذبہ فدائیت، اعلیٰ اخلاق اور اتباع سنت کی محبت ابتداء ہی میں جاگزیں ہو گئیں، ابتدائی تعلیم آپ نے گھر ہی کے بزرگوں سے حاصل کی، اس کے بعد حضرت مولانا دین کی اعلیٰ تعلیم کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ منتقل ہو گئے، جہاں آپ نے عالمیت و فضیلت کا مرحلہ طے کر کے ۱۹۴۸ء میں فراغت حاصل کی، پھر آپ نے تقریباً ایک سال دار العلوم دیوبند میں بھی وقت گزارا، جہاں آپ نے شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور دیگر بزرگوں سے شخصی طور پر استفادہ کیا، آپ نے ۱۹۴۹ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا، اس کے بعد ۱۹۵۲ء میں آپ شعبہ عربی میں ادیب دوم اور ۱۹۵۵ء میں ادیب اول کے عہدہ پر فائز ہوئے، ۱۹۷۰ء میں آپ کا عمید کلیۃ اللغۃ کے لیے انتخاب ہوا، واضح رہے کہ حضرت مولانا کا یہ علمی سفر حضرت مفکر اسلام علیہ الرحمہ کی سرپرستی اور رہنمائی میں جاری رہا، حضرت مولانا کے بچپن سے جوانی اور جوانی کے بعد کے تمام مراحل حضرت مفکر اسلام ہی کی ہدایات کی روشنی میں طے پائے،

آپ بڑی خاموشی اور بے نفسی سے حضرت مفکر اسلام کے ساتھ سایہ کی طرح لگے رہے، کسی کو نہیں معلوم تھا کہ حضرت مولانا حضرت مفکر اسلام کی رحلت کے بعد آپ کے سچے جانشین اور آپ کے مشن کو لے کر چلنے والے ہوں گے، گویا حضرت مفکر اسلام کی تمام خصوصیات و امتیازات حضرت مولانا کے اندر بڑی خاموشی کے ساتھ منتقل ہو گئیں۔

ایک جامع صفات و کمالات شخصیت:

ہمیں کیا اندازہ کہ ہمارے حضرت کیسی عظیم صفات، اعلی اخلاق اور بلند کردار کے مالک تھے، حضرت مولانا جیسی پاکیزہ نفس و پاکیزہ نسب، متقی پرہیزگار، حلیم و بردبار، متواضع و خاکسار، دنیا سے بیزار، عابد و زاہد منجملہ تمام نبوی صفات کی حامل شخصیت شاید ہی کوئی آئندہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے، حضرت مولاناؒ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو حضرت مرشد الامت کی صحبت سے فیضیاب ہوئے یا جس نے حضرت کے پرنور چہرے کا دیدار کر کے اپنے قلب و نگاہ کو روشن اور فکر و خیالات کو بالیدگی بخشی یا جس نے حضرت کی نورانی مجالس میں شرکت کر کے اپنے قلب و نفس کا تزکیہ کیا اور اخلاق و کردار کو پاکیزہ بنایا یا جس نے حضرت کے شب و روز کے معمولات دیکھ کر اپنی زندگیوں میں انقلاب برپا کر لیا یا جس نے حضرت کے عشق نبوی ﷺ کو دیکھ کر اپنے آپ کو سنت نبوی کے سانچے میں ڈھال لیا، یہی وہ لوگ ہیں جو اپنی آنے والی نسلوں سے کہیں گے کہ ہم نے حضرت مرشد الامت کی نورانی مجالس میں شرکت کی ہے، ہم نے حضرت کی دعائیں لی ہیں، ہم نے حضرت مرشد الامت کے وجود میں پیش رو اسلاف کا نمونہ بلکہ نبوی نمونہ دیکھا ہے، ہم نے قرآن و حدیث کا داعی اور سنت رسول ﷺ کا عاشق دیکھا ہے، بلاشبہ حضرت مولانا بقیۃ السلف تھے۔

زفرق تا قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جاں این جاست

حضرت مولانا علیہ الرحمہ کے متوسلین اور معتقدین اور جو حضرت مولانا کے فیض یافتہ اور صحبت یافتہ ہیں، ان کا کہنا ہے کہ ہم نے ایسا پاکیزہ نفس، شرافت و نجابت کا علم بردار، حلم و بردباری، استقامت و پامردی کا جبل عظیم، عمدہ اخلاق و اعلیٰ کردار، حقوق اللہ و حقوق العباد کی ادائیگی میں فکرمند اور ایسا پختہ رائے، مضبوط قلمکار، قوت ارادی اور سوجھ بوجھ رکھنے والا متوازن اور اعتدال پسند انسان نہیں دیکھا، حضرت مرشد الامت کے عظیم شاگرد مخدومی حضرت مولانا ڈاکٹر سعید الرحمٰن اعظمی ندوی دامت برکاتہم حضرت مرشد الامت سے بے انتہا محبت کرتے تھے، اس حقیر نے تنہائی میں حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم کو حضرت مرشد الامت کا بڑے بلند کلمات سے تذکرہ کرتے سنا ہے اور حضرت کی بیماری کے ایام میں حضرت مہتمم صاحب کو بڑا ہی بے کل و بے قرار دیکھا ہے، جن حضرات نے ندوۃ العلماء میں تعلیم حاصل کی ہے، وہ جانتے ہیں کہ حضرت مہتمم صاحب کس طرح حضرت مرشد الامت کی مجلس میں ادب و شائستگی اور انتہائی خاکساری اور بے نفسی کے ساتھ شرکت فرماتے تھے، جیسے کوئی بہت چھوٹا بچہ ہو اور اس کو ادب سکھا کر بھیجا گیا ہو کہ بیٹا با ادب بیٹھنا، حضرت کے سامنے نگاہ بھی نہ اٹھانا، حضرت مہتمم صاحب کی حضرت مرشد الامت کے حضور کم از کم دو مرتبہ (ظہر بعد اور عشاء بعد) ضرور حاضری ہوتی، اس حقیر نے ایک دن حضرت مرشد الامت سے معلوم کیا کہ حضرت مہتمم صاحب آپ کے شاگرد ہیں؟ آپ سے انہوں نے کیا کیا پڑھا ہے؟ حضرت مرشد الامت نے فرمایا:

"مہتمم صاحب، محمد میاں حسنی اور تقی الدین صاحب تینوں کو ہم نے ایک ساتھ پڑھایا ہے اور ہم نے ان کو ادب کی کتابیں پڑھائی ہیں، یہ میرے بالکل ابتدائی دور کی بات ہے، محمد میاں باقاعدہ ندوہ میں داخل نہیں تھے، بلکہ سماعت کے لیے آتے جاتے تھے، یہ دونوں حضرات ندوہ ہی میں تھے، البتہ مہتمم صاحب بڑے فائق تھے، ذہین بھی تھے، یہ مہتمم صاحب کے بہت زیادہ تعلق، محبت اور خلوص کی بات ہے کہ وہ اتنا زیادہ ادب و احترام کرتے ہیں، اللہ

تعالیٰ ان کو خوش رکھے۔‘‘

ایک عظیم استاد کی شان میں ایک عظیم شاگرد کی گواہی:

حضرت مہتمم صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں:

’’حضرت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ میں ۴۹ رسال رہا ہوں، لیکن میں نے اپنی کتاب میں ۴۸ رسال ہی کا تذکرہ کیا ہے، ایسا عظیم انسان میں نے نہیں دیکھا، بڑے بڑے بزرگ دیکھیں ہیں، لیکن حضرت مولانا جیسی عظیم ہستی نہیں دیکھی، میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہمارے حضرت مولانا علیہ الرحمہ نبوی دور میں پیدا ہوئے ہوتے تو بڑے اور مقرب صحابیوں میں آپ کا شمار ہوتا، حضرت مولانا رابع صاحب ہمارے حضرت ہی کے فیض یافتہ ہیں، انہوں نے حضرت مولانا کے ساتھ ایک طویل مدت گزاری ہے، یہ امتیاز کسی کو حاصل نہیں ہے، موجودہ وقت میں حضرت مولانا رابع صاحب حضرت مفکر اسلام سے سب سے زیادہ قربت کی وجہ سے سب سے زیادہ مشابہت اور ان کی تمام صفات سے آراستہ ہیں اور جو تمام خصوصیات حضرت مفکر اسلام کے اندر تھیں وہ اب حضرت مولانا پر صادق آتی ہیں، اس وقت امت مسلمہ کو مجموعی طور پر حضرت مولانا کی طرف رجوع کرنا چاہیے، ہمارے حضرت کے اندر انتہائی درجہ کا استغناء ہے، دنیا سے بیزاری ایسی ہے کہ عہدوں، منصب اور شہرت کی خواہش تو بہت دور کی بات ہے، اس حقیر و ذلیل دنیا اور اس کی آسائشوں کا خیال ایک لمحہ کے لیے ہی ان کے دل میں شاید کبھی آیا ہو، جس طرح ان کا دل آئینہ کی طرح صاف و شفاف ہے اس سے کہیں زیادہ ان کی زندگی پاکیزہ اور صاف و شفاف ہے، حضرت کو بہت سے لوگ ہدیے تحفے پیش کرتے ہیں، لیکن میں اکثر مشاہدہ کرتا ہوں کہ حضرت سنت پر عمل کرنے کی نیت سے ہدیہ لے لیتے ہیں اور پھر اس کو دوسروں کو ہدیۃً پیش کر دیتے ہیں، حضرت نے ندوۃ کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، لیکن ندوہ کا شاید ہی ایک نیا پیسہ اپنے اوپر خرچ کیا ہو، اگر کہیں ایک انسان بھی ایسا مل جائے تو مجھے بتایئے گا، مجھے یقین ہے آپ ایک آدمی بھی ایسا نہیں ڈھونڈ پائیں گے، ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت کے اندر انتہائی درجہ کا تواضع ہے اور انتہائی درجہ کی نرمی ہے، ایسا لگتا ہے کہ شدت، سختی اور غیظ و غضب جانتے ہی نہیں، اگر کسی کو اللہ کا ولی دیکھنا ہے تو ہمارے حضرت کو دیکھ لے۔‘‘

(ماخوذ از: سخن ہائے دل؛ ارشادات حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی)

حضرت مہتمم صاحب سے حضرت مرشد الامت کا تعلق و محبت:

اس حقیر کو حضرت مہتمم صاحب کے ساتھ عشاء کے بعد حضرت مولانا رحمہ اللہ کی خاص مجلس میں حاضری کا موقع مل جاتا، حضرت مہتمم صاحب حضرت مرشد الامت کے ساتھ اکثر تنہا بیٹھنا پسند کرتے، اس کے باوجود یہ حقیر استفادہ کی غرض سے حضرت مولانا کے کمرے میں ایک کنارے بیٹھ جاتا، حضرت مولانا حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں کچھ نہ کچھ کھانے کے لیے ضرور پیش کرتے، کبھی سُوپ تو کبھی گُڑ یا کبھی کچھ اور بھی، حضرت مہتمم صاحب بڑے اہتمام کے ساتھ حکم کی تابعداری میں تبرکاً اس کو نوش فرماتے، مہتمم صاحب کے داماد جناب مولانا عبداللہ مخدومی ندوی کہتے ہیں کہ مہتمم صاحب کا معمول ہے کہ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد کبھی کچھ نہیں کھاتے، چاہے کوئی کتنی ہی قیمتی چیز لے آئے، لیکن حضرت مولانا جو بھی پیش کر دیں بڑی خوشی سے کھا لیتے ہیں، مہتمم صاحب نے کبھی منع نہیں کیا، کبھی ایسا بھی ہوا کہ طبیعت ٹھیک نہیں، لیکن حضرت کا تبرک مہتمم صاحب ضرور کھاتے ہیں۔

بارہا اس حقیر نے مشاہدہ کیا کہ مہتمم صاحب حضرت مولانا سے فرماتے کہ ’’حضرت اس وقت ندوۃ العلماء کی ترقی بام عروج پر ہے، یہ سب آپ ہی کی فکرمندی اور بابرکت وجود کا نتیجہ ہے، ندوۃ العلماء کے تمام کام آپ کی سرپرستی میں بحسن و خوبی انجام پا رہے ہیں۔‘‘

حضرت مرشد الامت مہتمم صاحب کی طبیعت کے متعلق معلوم کرتے تو مہتمم صاحب گھٹنوں اور معدہ کی تکلیف بتاتے اور پھر کہتے کہ

’’حضرت آپ دعا فرما دیں میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا، حضرت آپ اللہ تعالیٰ سے کہہ دیں کہ سعید کو ٹھیک کر دیں، ان شاء اللہ میں فوراً اچھا ہو جاؤں گا، آپ کا یہی کہنا میرے لیے کافی ہے۔‘‘

ایک روز اسی طرح کی گفتگو کے بعد حضرت مولانا علیہ الرحمہ مہتمم صاحب کے کمرے کے دروازے سے نکلتے ہی اس قدر محبت اور حسن ظن کو دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور غایت درجہ تواضع وانکسار میں فرمانے لگے کہ ’’اے اللہ! مجھے یہ کیا سمجھ رہے ہیں، میں تیرا ایک ادنیٰ سا بندہ ہوں، مجھے معاف فرما۔‘‘

یہ حقیر اس وقت دروازے ہی میں تھا اور دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کہ یا اللہ! تیرے یہ عظیم بندے کس مقام ومرتبہ کے حامل ہیں، اے اللہ تعالیٰ حضرت مرشد الامت کو جنت میں بلند ترین مقام پر فائز فرما۔

حضرت مرشد الامت کا روحانی مقام ومرتبہ:

اس حقیر نے بچشم خود بہت سے مشاہدات کیے ہیں اور جن حضرات کا حضرت سے قلبی تعلق ہوگا وہ حضرت مرشد الامت کے روحانی مقام بلند اور تعلق مع اللہ کی کیفیت جانتے ہوں گے، میں یہاں بس ایک بات عرض کر کے قلم رکھتا ہوں، یہ حقیر کچھ دن قبل حضرت کی صحت کے زمانہ میں بعض حوادث اور آزمائش میں گھرا ہوا تھا، اسی دوران پیر میں بھی Fracture ہو گیا، اس حقیر نے حضرت مولانا علیہ الرحمہ کو بذریعہ خط اپنے حالات سے واقف کرایا اور نامکمل کاموں کی تکمیل کے لیے دعاؤں کی درخواست کی، الحمد للہ حضرت مولانا نے توجہ فرمائی اور خصوصی دعاؤں سے نوازا، اسی دن حضرت مولانا اس حقیر کے خواب میں آئے، مصافحہ کر کے اپنے قریب کیا اور فرمایا کہ

’’میں نے تمہارے لیے دعا کر دی ہے، ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔‘‘

جب آنکھ کھلی تو دل کو بڑی ٹھنڈک اور سکون محسوس ہوا، الحمد للہ بہت جلد تمام ادھورے کام تکمیل کو پہنچ گئے، جب کچھ دن بعد حضرت مولانا سے ملاقات ہوئی، تو حضرت نے خط کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ تحریری جواب کی ضرورت تو نہیں ہے، اس حقیر نے عرض کیا کہ حضرت مجھے آپ کا جواب مل گیا تھا اور پھر خواب کا تذکرہ کیا، حضرت نے مسکرا کر اپنا سر جھکا لیا اور کچھ نہیں بولے، میں نے حضرت مولانا بلال عبد الحی حسنی مدظلہ سے خواب کا تذکرہ کیا تو مولانا نے کہا کہ ایسا ہوتا ہے، جس سے تعلق ہوتا ہے، یہ حضرات توجہ ڈالتے ہیں۔

یہ تھے ہمارے حضرت مرشد الامت جن کی زندگی میں ہم لوگ ان کو پہچان ہی نہ سکے، یہ حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی زندگی کے چند پہلو تھے، جن کو بہت اختصار کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، حضرت مولانا علیہ الرحمہ کا سب سے بڑا وصف جو ہو سکتا ہے، وہ زہد و استغناء، دنیا سے بیزاری ہے، یہ صفت بڑی مشکل سے پیدا ہوتی ہے، جناب مولانا سید خلیل حسنی صاحب نے اپنے ایک مضمون میں حضرت مولانا کی بہت سی اعلیٰ صفات و عادات اور معمولات ومشاہدات پیش کیے ہیں، جو قابل مطالعہ اور استفادہ ہے، کتنے ہوں گے جنہوں نے حضرت سے کبھی ملاقات کیا دیدار بھی نہ کیا ہوگا، یہ اس امت کی غفلت اور اسلام کے رہبر اور قائد اور علماء دین سے لاتعلقی اور ناواقفیت کا نتیجہ ہے، یا جو حضرت مولانا سے وابستہ رہے، وہ اپنے ذاتی مفاد اور اغراض کی وجہ سے وابستہ رہے، ہو سکتا ہے وہ اپنے اغراض و مقاصد میں کامیاب ہو گئے ہوں، لیکن جس روحانی نسبت کو حاصل کرنا تھا وہ اس سے محروم ہی رہے ہوں گے۔

جان کر منجملہ خاصان مے خانہ مجھے
مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ مجھے

۲۱ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳ اپریل ۲۰۲۳ء بروز جمعرات کو یہ روشن و تابناک آفتاب جو اپنی روحانی شعاعوں سے پورے عالم کو روشن کر رہا تھا آخر کار غروب ہو گیا اور یہ حقیر اور پوری ندوی برادری اور عموماً امت مسلمہ یتیم ہو گئی، اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کا نعم البدل عطا فرمائے اور حضرت مولانا کے درجات بلند فرما کر اپنا قرب خاص عطا فرمائے، ہمیں حضرت کے نقش قدم پر چلنے اور آپ کی تمام ہدایات اور صفات اپنے اندر پیدا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یا رب العالمین!

ہر آنکھ آج اس کے لیے اشک بار ہے
شمس و قمر اداس فضا سوگوار ہے

عالم اسلام کی ایک عبقری شخصیت

مفتی محمد آصف باقر ندوی مدنی
(فاضل مدینہ یونیورسٹی-سعودی عرب)

مشہور ومعروف نامور عالم دین، ہندوستان کی مشہور علمی ودینی درسگاہ مادرِ علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ناظم، ہندوستانی مسلمانوں کے متحدہ پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر، دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ، عالمی رابطہ ادب اسلامی سعودی عرب کے نائب صدر، تحریک پیام انسانیت اور دیگر مختلف دینی وعلمی مراکز اور دانش گاہوں کے سرپرست اور ہم سب کے مشفق ومربی استاذ محترم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے ۲۱؍رمضان المبارک مطابق ۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ء بوقت پونے چار بجے لمبی علالت کے بعد تقریباً ۹۴؍سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ایک ایسے متقی پرہیزگار عالم دین تھے جن کی بزرگی، اخلاص وللّٰہیت، نام ونمود سے دوری اور دین وملت کی بے لوث خدمت کا اعتراف عرب اور عجم دونوں میں کیا جاتا ہے۔ علم وادب میں آپ کی شاندار خدمات نے عرب وعجم میں آپ کو ایک نمایاں مقام عطا کیا ہے اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی رحلت کے بعد آپ عالم اسلام میں ان کے نمائندہ اور نائب کی حیثیت سے آخری عمر تک پہچانے جاتے رہے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی ولادت یکم اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش میں واقع ضلع رائے بریلی کی ایک چھوٹی بستی تکیہ کلاں کے ایک مشہور علمی ودینی خاندان میں ہوئی، آپ نے اپنے بڑے ماموں حضرت مولانا ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنیؒ کی سرپرستی اور دوسرے ماموں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی رہنمائی میں ابتدائی تعلیم اپنے خاندانی مکتب رائے بریلی میں مکمل کی، اس کے بعد آپ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے، جہاں سے ۱۹۴۸ء میں فضیلت کی سند حاصل کی۔ اسی دوران آپ نے دارالعلوم دیوبند میں بھی ایک سال گزارا، جہاں فقہ، تفسیر، حدیث اور بعض فنون کی کتابیں پڑھیں۔

اس سے قبل ۱۹۴۴ء میں مرکز دعوت وتبلیغ نظام الدین میں بھی ایک ہفتہ حضرت مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ کی خدمت میں رہے۔

۱۹۴۹ء میں تعلیم مکمل ہونے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی میں معاون مدرس کے طور پر آپ کا تقرر ہوا، اس کے بعد دعوت وتبلیغ اور حصول تعلیم کے سلسلہ میں ۱۹۵۰ء-۱۹۵۱ء کے دوران حجاز، سعودی عرب میں قیام رہا، ۱۹۵۵ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے کلیۃ اللغۃ العربیۃ کے وکیل منتخب ہوئے۔ آپ کی عظیم الشان علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں صوبائی اور قومی اعزازات سے آپ کو نوازا گیا۔ چنانچہ آپ ۱۹۷۰ء میں عمید کلیۃ اللغۃ یعنی کلیۃ اللغۃ کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے، عربی زبان کی خدمات کے لیے انڈیا کونسل اتر پردیش کے جانب سے آپ کو اعزاز دیا گیا، اس کے بعد اسی سال صدارتی اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

۱۹۹۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم بنائے گئے، اس کے بعد ۱۹۹۹ء میں نائب ناظم ندوۃ العلماء اور ۲۰۰۰ء میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد آپ باضابطہ ناظم ندوۃ العلماء مقرر ہوئے۔ اس کے ٹھیک دوسال بعد جون ۲۰۰۲ء میں حیدرآباد دکن میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے سابق صدر قاضی مجاہدالاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ متفقہ طور پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے چوتھے صدر منتخب ہوئے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ پانچ بھائی تھے، ایک کا بچپن میں ہی انتقال ہوگیا تھا، بقیہ چار بھائیوں نے علمی دنیا میں کافی شہرت اور کمال حاصل کیا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، عالمی شہرت یافتہ عالم دین مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے محبوب بھانجے اور معتمد اور ان کی وفات کے بعد ان کے جانشین مقرر ہوئے، آپ کا شمار دنیا کے ۵۰۰ر انتہائی بااثر مسلم شخصیات میں ہوتا تھا، یہی وجہ تھی کہ آپ اپنی آخری عمر تک دنیا کی مشہور تحریکوں، تنظیموں اور علمی اداروں کے ممبر، سرپرست، صدر اور بعض کے فاؤنڈر رہے۔

آپ کی شخصیت اس دورِ قحط الرجال میں سلف صالحین کی ایک یادگار تصویر اور علم وادب کا وہ حسین گلدستہ تھی جو عرب وعجم میں تشنگانِ علم کے مشامِ جاں کو معطر کررہے تھی، جب آپ کی علمی وادبی خدمات کی شہرت عرب ممالک کے علاوہ دیگر ممالک میں پہنچی تو آپ کے محاضرات سننے کے لیے دنیا کے مختلف گوشوں سے آپ کو دعوت نامے آنے لگے۔ چنانچہ آپ نے امریکہ، جاپان، مراکش، ملیشیا، مصر، تونس، الجزائر، ازبکستان، ترکی، جنوبی افریقہ کے علاوہ برطانیہ وغیرہ کا سفر کیا اور وہاں علمی ودعوتی محاضرات دیئے۔

آپ بین المذاہب مکالمے کے پرزور حامی تھے اور متعدد کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کرتے تھے، جس کا مقصد مختلف مذہبی برادریوں کے درمیان افہام وتفہیم اور تعاون کو فروغ دینا تھا۔

آپ ایک ماہر مصنف بھی تھے، آپ نے عربی اور اردو دونوں زبانوں میں تصنیفی وتالیفی خدمات انجام دیں، تاحال عربی زبان میں تقریباً ۱۵ر اور اردو زبان میں تقریباً ۱۲ر کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ ان میں کئی ایسی کتابیں ہیں جو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نصاب تعلیمی کا حصہ ہیں اور بعض یونیورسٹیوں میں اور بعض مدرسہ بورڈ میں بھی پڑھائی جاتی ہیں، نصاب کی کتابوں میں ''الادب العربی بین عرض ونقد'' ''منثورات من أدب العرب'' ''جزیرۃ العرب'' (جغرافیہ) اور آپ کی سب سے زیادہ پڑھی جانے والی سیرت نبوی پر شاندار کتاب ''رہبر انسانیت'' (اردو، انگریزی، ہندی، عربی زبانوں میں) شائع ہوچکی ہے اور قرآن مجید کے مضامین پر مشتمل کتاب ''قرآن مجید ایک رہبر کامل'' ہے جو اسی طرح کئی زبانوں میں عام ہے۔

آپ کی سب سے زیادہ عظیم الشان خدمات آپ کی تدریسی خدمات ہیں، جو تقریباً ۵۰ر سال کے طویل عرصے پر محیط ہیں، چنانچہ آپ کے ہزاروں شاگرد دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں اور عظیم الشان دینی وعلمی خدمات انجام دے رہے ہیں اور مجھے بھی آپ (رحمۃ اللہ علیہ) سے ۲۰۱۲ء میں عربی ادب پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

آپ کے سانحہ ارتحال کی خبر سوشل میڈیا کے ذریعہ منٹوں میں پوری دنیا میں پلک جھپکتے ہی پہنچ گئی اور دنیا بھر سے سرکردہ شخصیات کے تعزیتی پیغامات کا سلسلہ جاری ہوگیا تھا، ان میں سے چند تعزیتی پیغام پیش خدمت ہیں:

آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے جنرل سکریٹری حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے آپ کی وفات پر گہرے رنج وغم کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ ''وہ پوری امت کے لیے نقطہ اتفاق تھے، ہر حلقہ میں ان کو محبت وعظمت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، وہ اس وقت مسلمانوں کے لیے سب سے بڑا مرجع تھے، ان کو عالم اسلام خاص کر عرب دنیا میں بھی بہت قدر واحترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا، ان کے عہد صدارت میں پرسنل لا بورڈ نے بہت حکمت کے ساتھ اہم اور مشکل مسائل کا سامنا کیا، وہ بلند پایہ مصنف، ماہر تعلیم، عربی کے مایہ ناز ادیب، بافیض استاذ ومربی تھے، پوری ملت اسلامیہ اس وقت تعزیت کی مستحق ہے، بورڈ تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہے کہ حضرت والا کے لیے دعا کا اہتمام کریں اور اتحاد واتفاق کو قائم رکھیں۔''

حضرت مولانا محمود مدنی صاحب صدر جمعیۃ علماء ہند نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا کہ: ''آپ کی ذات فکر ونظر، عمل، دیانت، تفقہ، تدبیر، تدبر، ایثار، خلوص وللّٰہیت کی مجموعہ تھی، آپ ایک بہترین استاذ، مخلص داعی اور ژرف نگاہ مفکر تھے، جن سے علمی وادبی، دینی وسیاسی رہنمائی حاصل کی جاتی تھی، آپ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن ندویؒ کی وراثتوں کے امین اور ان کی طرح جامعیت اور بلند فکر وخیال کی سچی تصویر تھے، آپ نے حضرت شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا محمد احمد پرتاب گڑھیؒ جیسے بزرگوں سے بھی کسب فیض کیا جس سے فکر وعمل میں آفاقیت پیدا ہوئی۔''

دعا ہے کہ اللہ آپ کو جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، رشتہ دار، متعلقین، محبین کو صبر جمیل عطا فرمائے اور ندوۃ العلماء لکھنؤ، مسلم پرسنل لا بورڈ اور پوری دنیا کے مسلمانوں کو نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!

وہ فیضانِ حق کا نمونہ تھے

مولانا محمد بن یوسف ندوی
(کناڈا)

آج امت نے کیا کھویا ہے؟ اسے اس کا بالکل اندازہ نہیں ہے۔ آج اس نے اپنے میں ایک نمایاں مقام رکھنے والا شخص، ایک بے مثال شخصیت اور ایک انتہائی عالی مقام اور بلند نسبتیں رکھنے والا انسان کھویا ہے۔ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ صرف ایک بزرگ نہیں تھے، وہ صرف ایک مربی نہیں تھے، وہ صرف ایک مدرس نہیں تھے، وہ صرف پرسنل لا بورڈ کے صدر نہیں تھے، وہ صرف ایک مرکزی ادارے کے ناظم نہیں تھے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنیؒ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے، کمالات کا مجموعہ تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس قدر مقبول ومحبوب تھے کہ جنہوں نے ان کو قریب سے دیکھا نہیں ہے، وہ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ طبیعت میں اس قدر اخفاء تھا کہ زندگی میں تو لوگ ان کی قدر و قیمت کو تو پہچان نہیں سکے، لیکن اللہ تعالیٰ نے پھر اپنے اس انتہائی مخلص بندے کا مقام ظاہر کرنے لیے جس مبارک مہینے میں انہیں حسن خاتمہ کی دولت کے ساتھ نوازا اور پھر ان کے جنازے میں جو انسانوں کا سیلاب تھا، وہ پوری دنیا نے دیکھا، کتنے روحانی شخص، کس قدر ان کے وجود و زندگی میں نورانیت، انتہائی با اخلاق انسان، حکمت کے سراپا پیکر، آخری درجہ کی تواضع اور فنائیت، اتحاد کے داعی اور سب کو ساتھ لیکر چلنے والے۔ چنانچہ ان کی ذات اتنی زیادہ اوصاف حمیدہ سے متصف تھی کہ ایک انسان کا اتنے زیادہ اوصاف سے متصف ہونا تقریباً محال سا ہوتا ہے۔ ان کے پاس وہ دولت تھی -واللہ- کہ اگر دنیا جان لیتی تو دنیا ان پر ٹوٹ پڑتی۔ لیکن وہ اس قدر متواضع واقع ہوئے تھے اور طبیعت میں اس قدر اخفاء تھا کہ بہت سے لوگ انہیں صرف ایک روایتی بزرگ ہی سمجھتے رہے۔ ہم نے ان کی خلوت اور جلوت کو بھی دیکھا، ان کے ساتھ سفر بھی کیا، واللہ! اتنا عالی مقام انسان آنکھوں نے نہیں دیکھا۔ آج آنکھیں انہیں دیکھنے کے لیے ترستی ہے، لیکن اب کہاں سے وہ نظر آئیں گے؟ اب کہاں ان کا دیدار آنکھوں کو واپس نصیب ہوگا؟ چنانچہ وہ ایک ایسے عظیم انسان تھے کہ اب ڈھونڈنے سے بھی ایسا مل نہیں پائے گا۔ وہ بہت ہی الگ تھے سب سے، سب سے جداگانہ، ان کی ذات سب سے نرالی تھی۔ وہ ایک انسان ہی نہیں بلکہ انسانی روپ میں ایک فرشتہ تھے، ان کی آنکھوں سے عفت و پاک دامنی کا نور چھلکتا ہوا نظر آتا تھا۔ ان کا چہرہ اس قدر پرکشش تھا کہ انہیں دیکھ کر دل گواہی دے دیتا تھا کہ یہ کوئی سید ہی ہوسکتا ہے، یہ چہرہ کسی نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ہی ہوسکتا ہے۔ کتنی پاکیزہ تھی ان کی زندگی اور کس قدر وہ معرفت الٰہی اور خشیت خداوندی سے معمور رہی۔ واقعہ تو یہ ہے کہ وہ ایک ایسی بے داغ زندگی گزار کر گئے ہیں کہ واللہ آج کوئی ایک شخص بھی ان پر انگلی نہیں اٹھا سکتا۔ ہائے! اب کیا کیا کہوں ان کے تعلق سے؟ کیا کیا بیان کروں؟ آج دل ٹوٹا ہوا ہے، دل بے حد غمزدہ ہے کہ اے رابع! تجھے اب کہاں ڈھونڈنے جاؤں؟ ان سے ہمیں پیار تھا، ہم ان پر فنا تھے، ان سے اتنی زیادہ محبت تھی کہ ہمارے پاس الفاظ نہیں۔ وہ ہمارے لیے سب کچھ تھے۔ آج ان کے جانے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا سب کچھ لٹ گیا۔

مخلص ترین انسان اور اخفاء:

''باہر سے زیادہ مظاہرہ نہ ہو کہ آپ بہت دیندار ہیں۔''

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی جس بات نے ہمیں بہت ہی زیادہ متاثر کیا، وہ ان کی للّٰہیت اور اعلیٰ ترین درجہ کا اخلاص تھا۔ ان کے یہاں ہم نے ان کے قول و عمل سے اس بات کو گہرائی سے

محسوس کیا کہ وہ کوئی بھی کام کسی کو دکھانے کے لیے نہیں کرتے اور نہ اس کا ادنیٰ شائبہ ان کے یہاں محسوس ہوتا۔ ان کے یہاں ہم نے کسی طرح کا تکلف اور تصنع بھی نہیں دیکھا۔ ایسا نہیں تھا کہ ان کی خلوت جدا گانہ تھی ان کی جلوت سے بلکہ ان کی خلوت ان کی جلوت پر بہت ہی زیادہ فائق تھی۔ نہ وہ لوگوں کے سامنے تسبیح کے ساتھ نظر آتے، نہ باہر لمبی نوافل پڑھتے ہوئے دکھائی دیتے، نہ بڑی بڑی باتیں کرتے جس سے ان کی عظمت و بڑائی کا احساس ہوتا، نہ اپنے کارناموں کا کبھی تذکرہ کرتے، نہ اپنے واقعات زیادہ سناتے، نہ لوگوں کے سامنے اپنا انتساب بزرگوں کی جانب کرتے جس سے ان کی عظمت بڑھے، نہ کشف وکرامات کی باتیں سناتے جس سے لوگ کرامات کی دنیا میں کھو جائیں اور نہ کوئی ایسی بات تھی ان کے یہاں کہ جس سے ادنیٰ اندازہ ہوتا کہ یہ بہت ہی بڑے اللہ والے ہیں۔

لیکن ان کا اندرون اور باطن اتنا صاف شفاف تھا، ان کا چہرہ اس قدر پرکشش، منور، وجیہ، بارعب اور باوقار تھا اور ان کی خلوت ان کی جلوت پر اتنی زیادہ فائق تھی کہ ان کے دل کا اثر سامنے والے پر پڑ کر ہی رہتا تھا اور وہ اثر لیے بغیر رہ نہیں سکتا تھا۔ ان کی صحبت اس قدر پرکشش تھی کہ ان کے پاس بیٹھ کر ہر شخص کو اللہ یاد آجاتا تھا اور انہیں دیکھ کر ایمان ویقین تازہ ہو جاتا تھا۔ چنانچہ ان کا وجود خود ہی ایک کرامت تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے پاس بیٹھ کر، ان کی صحبت میں چند لمحات گزار کر، ان کا نہایت ہی وجیہ، بارعب اور منور چہرہ دیکھ کر آدمی کا دل گواہی دے دیتا تھا کہ یہ شخص مقربین خاص میں سے ہی ہوسکتا ہے۔ یہ بھی بڑی عجیب بات تھی کہ ان کی ذات میں کسی طرح کا ادنیٰ مظاہرہ نہیں تھا، وہ نہ اپنے کو لوگوں کے سامنے بڑے بزرگ کے طور پر اور بہت دیندار پیش کرتے، لیکن مظاہرہ کیے بغیر ہر آدمی کا دل ان کے بلند مقام اور اعلیٰ بزرگی کے تعلق سے گواہی دے دیتا تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر ہمارے ایک سوال کے جواب میں بڑی ہی عجیب بات فرمائی کہ ”اندر سے زیادہ ہو باہر سے زیادہ مظاہرہ نہ ہو کہ آپ بہت دین دار ہیں، اس سے فائدہ ہوگا۔“ سبحان اللہ! یہ جملہ واللہ ان کی پوری زندگی سے عبارت تھا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ ان کے غیر معمولی اخلاص، حد درجہ اخفاء اور انتہائی تواضع نے ان کی عنداللہ مقبولیت ومحبوبیت پر ایک حد تک پردہ ڈال رکھا تھا۔ اس مقبولیت ومحبوبیت سے پردہ ان کے جنازے نے اٹھایا، پانچ سے چھ گھنٹے میں اتنا بڑا مجمع ہندوستان کے اطراف واکناف سے جمع ہوا کہ ندوہ کی تاریخ میں اتنا بڑا جنازہ نہیں ہوا (حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کا جنازہ ندوہ میں نہیں ہوا تھا) بھوپال سے، کرناٹک سے، کشمیر سے، دہلی سے، سہارنپور سے اور دیگر مقامات سے اتنے کم وقت میں ایک جم غفیر نے جنازے میں حاضری دی۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کا ان پر خاص فضل تھا اور یہ ان کی کرامت تھی۔ چنانچہ ندوہ کے وسیع وعریض احاطے میں پاؤں رکھنے کی جگہ نہیں تھی، یہاں تک کہ ندوہ کی شاندار اور بڑی مسجد بھی لوگوں سے کچھا کچھ بھر گئی اور پھر معمول کے خلاف مجبوراً جنازے کو ندوے کی تاریخ میں پہلی مرتبہ مسجد کے محراب میں لانا پڑا، اگر جنازے کو صبح تک مؤخر کیا جاتا، تو کوئی شک نہیں کہ مجمع اس کا تین چار گنا ہو جاتا، کنٹرول سے باہر ہو جاتا اور لکھنؤ کی سڑکیں بھر جاتیں۔ چنانچہ یہ جنازہ ان سب لوگوں کے لیے عبرت کا سامان تھا جو حضرت مولاناؒ کے خلاف لکھتے رہے، بولتے رہے، انہیں نشانہ بناتے رہے اور ان کی قدر سے عاری رہے۔ یہ گویا کہ اللہ تعالیٰ نے دکھایا کہ دیکھ لو! ان کا کتنا بڑا مقام ہے ہمارے یہاں۔ یہ ایسا ہی ہے کہ امام احمد بن حنبلؒ نے فرمایا تھا کہ ”ہمارا جنازہ، تمہارے اور ہمارے درمیان فیصلہ کرے گا۔“ بہرحال اب ہم چند نمونے پیش کرتے ہیں کہ جس سے آپ کو حضرت مولاناؒ کے غیر معمولی اخلاص اور حد درجہ اخفاء کے تعلق سے کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

دعا:

حضرت مولاناؒ کو دعا سے نہایت ہی شغف اور تعلق تھا، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ کی اجتماعی دعا یہاں تک کہ ختم قرآن کے موقع پر کی جانے والی دعا بھی تین چار منٹ سے زیادہ نہیں ہوتی

تھی۔ ہوسکتا ہے کہ بہت سے لوگ اس سے دھوکہ بھی کھا گئے ہوں گے۔ ہم نے دیکھا کہ آپ کے اندر یہ احساس بہت ہی زیادہ تھا کہ کوئی عمل بھی ایسا نہ ہو جس سے مظاہرہ ہو یا لوگوں کی خوشی اور واہ مقصود ہو۔ ایسی ہر بات سے آپ بچتے جس سے اللہ تعالیٰ سے نظر ہٹ سکتی تھی۔ لیکن تنہائی میں آپ کی انفرادی دعا دیر دیر تک بلک بلک کر ایک خاص کیفیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی تضرع اور عاجزی سے ہوا کرتی تھی۔ ایسی کیفیت دعا میں کہیں اور دکھائی نہ دی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تعلق آپ کا دعا کے ساتھ جوانی سے ہی پیدا ہوگیا تھا۔ کوئی اپ کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا لیکن حضرت مولاناؒ کثیر البکاء تھے، بہت رونے والے تھے۔ تنہائیوں میں خوب روتے۔ امت کی فکر تھی اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر حد درجے کا یقین اور اعتماد تھا۔ اسی اعتماد اور یقین کی وجہ سے بہت سے لوگ آپ کو انسانی شکل میں اپنا سہارا سمجھتے رہے۔ اللہ تعالیٰ سے نہایت ہی قوی تعلق اور ربط تھا۔ فرماتے کہ ”اللہ تعالیٰ سے مانگو، وہ دیتا ہے۔“ ہم سے بھی فرمایا کہ ”پوری امت کے لیے دعا کیا کرو۔“

چنانچہ دعا سے آپ کے تعلق کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ندوے میں داخلے کے بعد سب سے پہلا خواب جو آپ کے تعلق سے ہم نے دیکھا تھا جبکہ ہمارا کوئی خاص لگاؤ بھی آپ سے نہیں تھا، وہ یہ تھا کہ منظر بڑا نورانی ہے، ایک مسجد ہے اور آپ اس میں تنہا دعا میں لگے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ہم نے اس کے بعد آپ کو خواب میں بھی خوب دیکھا اور عجیب بات یہ ہے کہ جو بھی خواب دیکھا، تمام خواب یا اکثر خواب نورانی ہی تھے۔ بہر حال! حضرت مولانا بلال صاحب نے بھی اپنے خطاب میں یہ بات فرمائی کہ ”راتوں کو آپ کی نیند اڑ جاتی تھی اور امت کی فکر میں آپ رو رو کر دعا کرتے۔“ آپ کے اخلاص کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان چیزوں کا علم اقرباء اور قریب میں رہنے والوں کے علاوہ کسی دوسرے کو نہیں تھا کہ حضرت مولاناؒ کی دعا کی یہ کیفیت ہے یا حضرت مولاناؒ خوب اللہ تعالیٰ کے سامنے رونے والے ہیں۔ واللہ یہ چیزیں ادنی درجے تک ندوے میں بھی عام نہیں تھیں۔ آپ کے آنسوں جب کسی مجمع رواں ہو جاتے، تو آپ انہیں ایسا چھپا لیتے کہ کسی کو معلوم ہی نہیں پڑتا۔ یہ ہم نے خود دیکھا ہے۔

بزرگوں کی جانب اپنا انتساب:

حضرت مولاناؒ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے وقت کے کبار مشائخ کو دیکھنے اور ان کی صحبتوں سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیا تھا۔ ان میں خصوصاً حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا الیاس صاحبؒ، حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ اور حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڑھیؒ۔ چنانچہ حضرت مولاناؒ کو حضرت مولانا الیاس صاحبؒ کے ساتھ سفر کا موقع بھی ملا تھا اور ان کی صحبتوں میں رہنے کا موقع بھی۔ حضرت مدنیؒ کو تو آپ نے خوب دیکھا اور آپ کا ہی گھر لکھنؤ میں حضرت مدنی کی قیام گاہ ہوا کرتا تھا۔ حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کے ساتھ بھی آپ نے سفر کیا، ان سے آپ بیعت بھی ہوئے اور ان کی صحبتوں میں بھی رہنے کا آپ کو موقع ملا۔ حضرت تھانویؒ کو بھی آپ نے دیکھا اور پھر سب سے زیادہ آپ کا حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے ساتھ تو دن و رات کا ساتھ رہا۔

آپ کو حیرت ہوگی کہ حضرت مولاناؒ کو اپنی مجالس میں کبھی بھی ان چیزوں کا تذکرہ کرتے ہوئے ہم نے نہیں سنا اور یہ صرف ہماری بات نہیں، بلکہ بہت سے وہ لوگ جنہیں آپ کی صحبت میں رہنے اور مجلسوں میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، سب کا تجربہ بھی یہی ہے، ہمیں بارہا آپ کی مجالس میں حاضری کی سعادت نصیب ہوئی، آپ کے ساتھ سفر کا بھی موقع ملا، لیکن آپ کو لوگوں کے سامنے ان بزرگوں کی جانب اپنا انتساب کرتے یا ان کے ساتھ اپنے ماضی کے واقعات سناتے ہوئے نہیں پایا۔ چنانچہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کا ذکر بھی اس وقت مجلس میں آجاتا جبکہ کوئی سائل آپ سے کچھ معلوم کرنا چاہتا، یا حضرت مولانا نذر الحفیظ صاحبؒ مجلس میں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے تعلق سے سوالات کا سلسلہ شروع

کرتے، لیکن اپنی طرف سے کبھی نہیں سنا گیا کہ میں اتنا ساتھ رہا، اتنا زیادہ قریب تھا، اتنا ان کے ساتھ سفر کیا، ہمیں اتنا چاہتے تھے، ہم نے ان کا اتنا تعاون کیا، یا فلاں واقعہ ہمارا ان کے ساتھ پیش آیا۔ کچھ بھی نہیں! گھر والوں کے سامنے بھی اتنا اظہار نہیں تھا، لیکن جو بھی چند باتیں ایسی ہوتیں، وہ اکثر ان ہی کے سامنے ہوتیں۔ چنانچہ اگر کسی بزرگ کا تذکرہ مجلس میں ہو جاتا، تو وہ بھی کسی کے سوال پر یا کسی بات کے سیاق وسباق میں ہوتا اور پھر اس پر کچھ گفتگو بھی ہوتی۔ جیسا کہ ''حضرت مدنی کا چہرہ بہت ہی پر کشش تھا، آدمی دیکھتا تو سوچتا کہ یہ کوئی انسان ہیں یا فرشتہ''، یا ''حضرت رائے پوریؒ کی صحبت بہت مؤثر تھی، وہ دیر دیر تک خاموش رہتے لیکن ایک شخص بھی اپنی جگہ سے کھڑا نہیں ہوتا۔'' چنانچہ آپ کے نواسے نے ایک مرتبہ پوچھ ہی لیا کہ لوگ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ سے اپنے تعلق کا اظہار خوب فرماتے ہیں، ہم نے دیکھا کہ آپ ایسا نہیں کرتے تو اس اللہ کے ولی نے عجیب ہی جواب دیا کہ ''اس سے ہمیں عجب معلوم ہوتا ہے۔''

چنانچہ حضرت مولانا رابع صاحبؒ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے سب سے بڑے جانشین تھے، ان کے سب سے چہیتے، ان کی صحبت میں سب سے زیادہ رہنے والے لیکن آپ کی باتوں سے کبھی اس کا احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ آپ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے اتنے قریبی ہوں گے۔ ہمیں بھی یہ بات پہلے سمجھ میں نہیں آئی، لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اور آپ کا مزاج سمجھنے کا موقع ملا، تب یہ بات سمجھ میں ائی اور راز کھلا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کا استحضار غیر معمولی حد تک تھا۔ اتنا استحضار زندگی میں ہم نے کسی کا نہیں دیکھا۔ ہر بات میں یہ استحضار حیرت کی حد تک پہنچ گیا تھا کہ کوئی بھی ایسی بات نہ ہو جس سے اللہ تعالیٰ کی ذات سے نظر ہٹے۔ چنانچہ ہمارے ایک استاد محترم نے فرمایا کہ ''لوگ ان کے پاس آ کر خوب اپنی اپنی باتیں بیان کرتے، لیکن حضرت مولانا رابع صاحب کی زبان سے ایک لفظ تک اپنے تعلق سے نکلتا نہیں تھا۔'' یہ انتہائی مشکل کام ہے۔

اپنے کارناموں سے خاموشی:

حضرت مولانا رابع صاحبؒ سے اللہ تعالیٰ نے خوب کام لیا اور ہر میدان میں کام لیا۔ علمی طور پر اس اعتبار سے کہ آپ نے کافی ساری کتابیں لکھیں جو مقبول بھی ہوئیں اور چند ایسی بھی مقبول ہوئیں کہ وہ مدارس اسلامیہ، عرب وعجم دونوں میں داخل نصاب بھی ہوئیں پھر آپ کا تعلق ندوہ سے بحیثیت استاد کے تقریباً ۷۵ رسال کا رہا، آپ کے کم از کم دس ہزار شاگرد تو ہوئے ہی ہوں گے جن میں اپنے وقت کے کبار علماء بھی شامل ہیں۔ پھر آپ کے مضامین کا سلسلہ لا متناہی ہے جو البعث الاسلامی، مجلّہ الرائد، تعمیر حیات اور دیگر مجلّات میں شائع ہوئے اور ان سے برابر استفادہ کیا گیا اور بڑے ذوق وشوق سے انہیں پڑھا بھی گیا۔ خانقاہی طور پر اس اعتبار سے کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے وصال کے بعد اکثر حضرات کا رخ آپ ہی کی طرف ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہزاروں لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت بھی ہوئے اور پھر آپ کی صحبت میں رہ کر اور آپ کے مشوروں سے سلوک کے مقامات وہ طے بھی کرتے رہے۔ دعوتی طور پر اس اعتبار سے کہ دعوت وتبلیغ کے حضرات برابر آپ کے پاس آ کر مشورہ لیتے رہے اور حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے وصال کے بعد انہوں نے برابر آپ سے تعلق رکھا۔

ایک عجیب بات یہ تھی کہ ہندوستان کے اطراف واکناف سے بڑی تعداد میں لوگ اپنے انفرادی اور اجتماعی معاملات میں صرف مشورہ کی غرض سے آپ کے پاس آیا کرتے۔ آپ کی آراء اور مشوروں سے کئی حضرات اپنے دینی فرائض انجام دے رہے تھے اور کئی تعلیمی ادارے آپ کی سرپرستی میں قائم ہوئے تھے اور چل بھی رہے تھے۔ یہ بات حضرت مولانا بلال صاحب نے بھی اپنے خطاب میں فرمائی کہ آپ ''صائب الرائے'' واقع ہوئے تھے اور آپ کی رائے بہت درست ہوتی۔ چنانچہ آپ کی آراء اور مشوروں سے لوگوں نے خوب فائدہ اٹھایا، ندوے نے بھی ان کی بدولت مشکل مقامات کو آسانی سے پار کیا۔ غرض یہ کہ آپ کی سرپرستی میں پورے ہندوستان میں کئی حضرات کام کر رہے تھے، کئی ادارے چل رہے تھے اور بہت سارے دینی کام آپ کی سرپرستی میں ہو رہے تھے۔ پھر آپ مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر ۲۲ رسال تک رہے اور اس میں بھی آپ کی آراء، حکمت عملی اور ہوشمندی و دانشمندی سے بورڈ نے خوب فائدہ اٹھایا اور سب سے بڑھ کر آپ دار

العلوم ندوۃ العلماء کے ناظم ۲۳ رسال تک رہے اور ندوہ نے اس میں بڑے ہی اطمینان اور ترقی سے اپنا وقت پورا کیا۔ بقول ایک استاد کے کہ ”حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے وصال کے بعد حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی وجہ سے کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی۔“

لیکن ہمارے نزدیک حضرت مولانا رابع صاحبؒ کا ایک بہت ہی بڑا کارنامہ جس سے دنیا ناواقف ہے، وہ یہ کہ مفکر اسلام کے تجدیدی کارناموں میں بنیادی معاون حضرت مولانا رابع صاحب ہی ہیں۔ آپ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کے سب سے بڑے مددگار تھے، حضر و سفر میں، کتابت و تحریر میں، خطوط لکھوانے میں اور ذمہ داریاں سنبھالنے میں۔ ان کے ساتھ آپ پوری زندگی ایک خادم اور معاون کی حیثیت سے رہے۔ ان کی ذمہ داریاں، ان کے ندوہ کے ناظم بن جانے کے بعد آپ نے اپنے سر پر اوڑھ لی تھیں اور انہیں دوسرے تمام کاموں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ آپ ان کے سب سے قریبی تھے، ایک معنی میں رفیق، ان کے سب سے بڑے معاون اور سب سے زیادہ خدمت ہر کام میں آپ ہی نے کی ہے۔ اس میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ آپ کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک خادم، رفیق، معاون اور غم گسار عطا کر دیا تھا۔ چنانچہ یہ سب باتیں بھی خاندان والوں سے ہی ہمیں معلوم ہوئیں۔ مولانا محمود حسنی صاحبؒ نے ایک موقع پر کچھ تفصیل سے ہمیں یہ باتیں سنائی تھیں، یہ بھی فرمایا تھا کہ حضرت مولانا رابع صاحب کے اخلاص کی وجہ سے دنیا یہ سب باتیں نہیں جانتی۔ بہر حال! یہ سب باتیں دوسروں سے تو سنتے رہے لیکن حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی زبان سے تو یہ سب باتیں کبھی سننے کو نہیں ملیں۔

چنانچہ حضرت مولانا کے یہاں اپنے خود کی تعریف، اپنی خود کی باتیں، اپنے واقعات بیان کرنے، اپنے کارناموں اور کاموں کو سنانے، لوگوں کے سامنے اپنا انتساب بزرگوں کی جانب کرنے اور اپنی کوئی ادنیٰ عظمت اور بڑائی کی بات نہیں تھی۔ ہم کیا بیان کریں، واللہ! حیرت انگیز خاموشی تھی۔ ہم نے اپنی زبان پر اتنا کنٹرول اور اپنے نفس پر اتنا قابو زندگی میں کسی کا نہیں دیکھا۔ حیرت انگیز طور پر اپنے پر قابو تھا۔

جو آدمی ندوے کا ناظم ہوں، پرسنل لا کا صدر ہوں، ہزارہا لوگوں کا استاد، سرپرست اور شیخ ہوں، کئی مشہور و معروف کتابوں کا مصنف ہوں، آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کے لیے اپنی باتیں نہ کرنا عام طور پر محال اور ناممکن سا ہو جاتا ہے، کہیں نہ کہیں اس کی زبان سے کچھ نہ کچھ تو نکل ہی جاتا ہے، کہیں نہ کہیں بات کے کسی اسلوب میں وہ اپنے مناقب اشارۃً یا کنایۃً تو بیان کر ہی دیتا ہے، لیکن حضرت مولاناؒ کو اس باب میں ہم نے بہت ہی الگ تھلگ پایا اور اس چیز نے ہمیں حد سے زیادہ متاثر کیا۔ یہ صرف ہمارا تجربہ اور تاثر نہیں ہے، آپ گھر والوں سے بھی پوچھ لیں، ندوہ کے اساتذہ سے بھی پوچھ لیں، ہر شخص ہماری تصدیق کرے گا۔

بہر حال یہ وہ چند نمونے تھے جو ہم نے آپ کے سامنے پیش کیے۔ ہمیں حضرت مولانا کو دیکھ کر، ان کی زندگی پرکھ کر، ان کی صحبت میں رہ کر، اخلاص کا نور ان کے یہاں محسوس کر کے اندازہ ہوا کہ اخلاص واقعی کس چیز کا نام ہے۔ حضرت مولانا کے یہاں ہم نے باتوں سے زیادہ عمل بہت پایا۔ وہ بہت خاموش طبع تھے اور غیر ضروری باتیں نہیں کرتے لیکن عمل میں بہت ہی فائق تھے۔ ان کے پاس قلم بھی تھا اور اس کے وسائل بھی، مرکزی ادارہ بھی تھا، شاگرد بھی تھے، مسترشدین بھی تھے، کسی چیز کی کوئی کمی نہیں تھی، لیکن اپنے کو بڑا بنا کر کبھی پیش نہیں کیا۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کا اتنا مخلص ہوں، کہیں نہ کہیں اللہ تعالیٰ اس کا راز کھول ہی دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا کی غیر معمولی مقبولیت و محبوبیت کو تو ان کے جنازے نے دنیا کے سامنے عیاں کر ہی دیا اور پھر ہم جیسے ادنیٰ شاگرد اور محبّ جنہیں حضرت کو کچھ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، اپنے کچھ تاثرات اور تجربات آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ حضرت مولانا نے اس قدر اخلاص اور فنائیت سے زندگی گزاری ہے کہ سب کا سب اپنی آخرت کے لیے ذخیرہ کر دیا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ

کی ذات سے امید کرتے ہیں کہ اب انہیں اپنے اخلاص کا صلہ وہاں آخرت میں ضرور مل رہا ہوگا۔

روحانیت اور صحبت کی تاثیر:

''یہ میرے بھائی جو ہیں وہ اللہ کے ولی ہیں۔''

یہ وہ بلند کلمات تھے جن کو سب کے سامنے بھرے مجمع میں چالیس سال قبل اپنے انتقال کے وقت حضرت مولانا سید محمد ثانیؒ نے اپنے چھوٹے اور عزیز بھائی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے تعلق سے فرمائے تھے۔ حضرت مولانا رابع صاحب اپنے عنفوان شباب سے ہی سراپا نیکی کے پیکر اور اللہ کے ولی واقع ہوئے تھے۔ ندوہ کے سابق شیخ الحدیث اور آپ کے استاد محترم حضرت مولانا سید شاہ حلیم عطا سلونی (متوفی ۱۹۵۵ء) نے ایک موقع پر آپ کی نیکی اور پرہیز گاری کے تعلق سے گواہی دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ ''وہ اللہ کے چہیتے بندے ہیں، گناہ وُناہ تو اُن سے ہوتے نہیں، جو کچھ معمولی خطائیں ہوجاتی ہوں گی، اللہ تعالیٰ انہیں اسی طرح کی تکالیف سے صاف کردیتا ہے۔''

چنانچہ آپ کا تعلق مع اللہ نہایت ہی مضبوط تھا اور آپ کا روحانی مقام انتہائی ہی بلند تھا۔ آپ کا اصل مشغلہ تو زندگی بھر درس وتدریس کا رہا اور اسی سے آپ جانے پہچانے بھی گئے۔ اسی طرح آپ کا علمی مقام بھی زندگی بھر آپ کی بزرگیت پر چھایا رہا لیکن اپنے آخری دور میں آپ روحانیت اور سلوک کے اس مقام پر پہنچے ہیں کہ آپ کی بزرگی اور روحانیت ہر چیز پر چھا گئی۔ کسی کہنے والے نے بہت ہی سہی کہا کہ ''ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حضرت مولانا رابع صاحبؒ روحانیت کے مقامات کو روزانہ طے کررہے تھے۔'' آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس قدر روحانیت ونورانیت عطا کی گئی تھی کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی فرشتہ ہے جو آسمان سے اتر آیا ہے۔ چنانچہ آپ کا بلند مقام، غیر معمولی روحانیت اور تعلق مع اللہ کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا تھا کہ شاید آپ کا شمار ان لوگوں میں ہوسکتا ہے جنہیں صوفیاء کی اصطلاح میں قطب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ہم آپ کو دیکھ کر بار بار یہ سوچتے تھے کہ دنیا والوں کو کیا معلوم کہ ان کے درمیان کون جی رہا ہے، واللہ بہت ہی عظیم شخصیت کے مالک تھے۔ چنانچہ ہم یہاں ایک خواب بیان کرتے ہیں جس سے ہمارے اس اندازے کو یا کہیے کہ ہماری اس فراست کو تقویت ملی۔ اس خواب کو بیان کرنے والے مولانا محمود حسنی صاحبؒ ہیں اور دیکھنے والے کوئی اور ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب ہردوئی سے حضرت مولانا کے پاس تشریف لائے اور اپنا خواب بیان کیا کہ ''خواب میں بتایا جارہا ہے کہ اس وقت ایک قطب ہیں اور وہ حضرت مولانا رابع صاحب ہیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد قطبیت جزیرۃ العرب منتقل ہوجائے گی۔'' یہ خواب سن کر ہماری ایمانی فراست کو مزید تائید ملی۔ جس چیز کے تعلق سے ہم بار بار سوچ رہے تھے، وہ کسی دوسرے کو خواب کی شکل میں دکھائی دی۔ یہ خواب سننے کے بعد ہمیں کچھ زیادہ تعجب بھی نہیں ہوا اس لیے کہ ہم نے حضرت مولاناؒ کو بہت ہی قریب سے دیکھا تھا اور ہم نے دل کی نگاہوں سے آپ کے مقام ومرتبے کو جانا تھا۔ عرض یہ ہے کہ ہم یہاں خوابوں کا زیادہ سہارا لینا نہیں چاہتے ہیں، چونکہ کھلے عام خوابوں کی تشہیر کرنا یہ حضرت مولانا کے مزاج کے خلاف بات تھی۔ بس ایک خواب بطور دلیل آپ کے سامنے پیش کردیا۔

آپ کی شخصیت اس قدر پرکشش تھی کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ آپ پر تجلیات کی برسات ہے، رحمتوں کی بارش ہورہی ہے اور خدا کی خاص توجہ اور نظر کرم آپ پر مرکوز ہے۔ چنانچہ آپ کی صحبت میں بے پناہ تاثیر تھی۔ اتنی مؤثر صحبت زندگی میں ہم نے کسی کی نہیں پائی۔ صحبت اس قدر مؤثر تھی کہ خاموشی میں بھی دل کی دنیا بدلتی ہوئی محسوس ہوتی۔ آپ کے پاس صرف بیٹھنے سے دل کی کدورتیں اور اندر کی گندگیاں صاف ہوتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ یہ ہمارا ذاتی تجربہ ہے۔ چنانچہ جو بات حضرت رائے پوریؒ کے تعلق سے سنی تھی کہ ''حضرت رائے پوریؒ کی صحبت اس قدر مؤثر تھی کہ دیر دیر تک خاموش رہتے اور کوئی ایک آدمی بھی اپنی جگہ سے کھڑا نہیں ہوتا۔'' عین اسی طرح ہم نے حضرت مولاناؒ کی صحبت پائی ہے۔ آپ طویل السکوت واقع ہوئے تھے، دیر دیر تک خاموش رہتے، طبیعت میں

تکلف بالکل نہیں تھا۔ بسا اوقات مجلس میں دیر دیر تک سناٹا چھایا رہتا اور مجلس پوری کی پوری بھری ہوئی ہوتی۔ ایسا نہیں تھا کہ اتنا مجمع ہے تو کچھ بولنا ہی ہے، کچھ نہیں، بس سناٹا۔ جب تک کوئی سوال نہیں کرتا، وہ سناٹا عام طور پر چھایا رہتا۔ لیکن وہ سناٹا بھی کچھ الگ ہی نوعیت کا تھا، اس میں نور تھا، روحانیت تھی، رعب تھا اور وقار تھا۔ اس سناٹے کے باوجود ایک آدمی بھی مجلس سے کھڑا نہیں ہوتا۔

چنانچہ ندوہ کے جس مہمان خانے میں آپ کا قیام رہتا تھا، وہ اللہ والوں کی قیام گاہ رہا ہے۔ بہت سے قرآن اس میں ختم ہوئے ہیں، کثرت سے اس میں خدا کا ذکر ہوا ہے، بہت ساری تہجدیں اس میں پڑھی گئی ہیں، امت کے لیے اس میں خوب دعائیں مانگی گئی ہیں، دین وملت کے حق میں اس میں بہت سی تدابیر اختیار کی گئی ہیں اور وہ ایک طرح سے اہل اللہ کا مسکن رہا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی یاد کے علاوہ کوئی اور کام ہوا نہیں ہے۔ چنانچہ وہاں مہمان خانے میں آپ کے پاس داخل ہوتے ہی دل کی کیفیت کچھ الگ سی معلوم ہوتی، سکون وطمانیت کا احساس ہوتا اور رحمتوں کا نزول معلوم ہوتا۔ ندوہ کے ایک مؤقر استاد نے ہمیں بتایا کہ ”جب بھی ہمیں پریشانی ہوتی تو ہم حضرت مولانا رابع صاحب کے پاس چلے جاتے تو فوراً ہماری پریشانی دور ہو جاتی۔“ اسی طرح چند ہفتے قبل ہمارے ایک دوست نے بتایا کہ ”حضرت مولانا رابع صاحب کے پاس داخل ہوتے ہی کچھ الگ سا معلوم ہوتا ہے، ان کی شخصیت بڑی ہی پرکشش ہے۔“ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ روحانیت اور صحبت کی تاثیر، اصل میں آپ کے غیر معمولی اخلاص، حد درجہ اخفاء اور اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کے سامنے تواضع و فنائیت کا اثر تھا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ آپ کا وجود کرامتوں سے بڑھ کر تھا۔ لوگ بزرگوں میں کشف وکرامات کی باتیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں، حضرت مولاناؒ خود ہی ایک کرامت تھے۔ آپ کا وجود، آپ کی مؤثر صحبت، آپ کی روحانیت ونورانیت، آپ کا خدا تعالیٰ سے نہایت ہی قوی تعلق اور ربط، یہ سب باتیں ہر کرامت سے بڑھ کر تھیں۔ آپ کی باتیں تو انتہائی سادہ تھیں، لیکن آپ کی شخصیت اور صحبت اس قدر پر کشش تھی کہ تقریباً روزانہ ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا، مہمانوں کا ہجوم ہوتا۔ عشاء کے بعد کی مجلس عام طور پر پوری کی پوری بھری ہوئی ہوتی اور باہر تک جگہ نہ ہوتی۔ بڑے سے بڑا حیثیت دار اور مالدار سے مالدار ترین شخص آپ کے در پر ایک ادنی خادم کی حیثیت سے حاضر ہوتا۔ یہ سب آپ کے غیر معمولی اخلاص اور للّٰہیت کا اثر تھا۔

چنانچہ اس روحانیت کا احساس ہم جیسے گنہگار کو بھی ہوتا تھا اور اس کے اثرات نمایاں طور پر ہم محسوس بھی کرتے تھے۔ اثرات بہت ہی نمایاں تھے۔ روحانیت اس قدر تھی کہ لوگوں کے قلوب، ان کے اذکار، عبادتیں، اور معمولات پر بھی اسکا اثر ظاہر ہوتا۔ چنانچہ آپ کے یہاں نماز پڑھنا، ذکر کرنا، قرآن کی تلاوت کرنا، اس میں بھی آپ کی موجودگی اور عدم موجودگی میں نمایاں فرق معلوم ہوتا۔ آپ جب ندوہ سے تشریف لے جاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ ندوے کی رونق بھی آپ کے ساتھ ساتھ چلی جاتی۔ ہمیں اس کا بڑا تجربہ ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا جعفر حسنی صاحب دامت برکاتہم العالیہ نے آپ کے انتقال کے بعد فرمایا کہ ”ایک اللہ والے کے چلے جانے سے نماز میں بھی فرق آجاتا ہے۔“

بہرحال! روحانیت اور نورانیت کا موضوع وہ ہے جس کو الفاظ کا جامہ پہنانا بڑا مشکل کام ہے۔ یہ چیزیں باتوں سے زیادہ حس سے تعلق رکھتی ہیں۔ حضرت مولاناؒ کا مقام کس قدر بلند تھا، ہم صرف الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں لیکن اس کی روح اور معنویت کو تو آپ تک منتقل نہیں کر سکتے۔

تہجد کی پابندی:

حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنیؒ اپنی پیرانہ سالی اور کمزوری کے باوجود تہجد کے نہایت ہی پابند واقع ہوئے تھے۔ آپ اپنے آخری ایام تک تہجد کے بہت ہی پابند رہے۔ بلا عذر کبھی تہجد فوت نہ ہوئی۔ بسا اوقات تو فجر سے بہت پہلے آپ نماز وعبادت میں مشغول ہو جاتے۔ آپ کے اخلاص کا یہ حال تھا کہ ندوے میں بھی آپ کی تہجد کی پابندی کا ادنی درجے تک چرچا نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی اس بات کو جانتا ہی نہیں تھا حالانکہ آپ کا قیام اکثر

ندوے ہی میں رہتا تھا۔ چنانچہ اس بات کا علم ہمیں بھی غالباً اس طرح ہوا کہ مہمان خانہ کے نگراں یا مولانا سبحان صاحب (حضرتؒ کے خادم خاص) نے ہمیں بتایا کہ حضرت مولانا روزانہ تہجد میں بیدار ہوتے ہیں۔ چنانچہ شروع شروع میں جب بھی ہمیں تہجد کی توفیق مل جاتی، تو ہم ندوے کی مسجد میں جا کر اسے ادا کرلیا کرتے۔ لیکن جب ہمیں اس کا علم ہوا کہ حضرت مولاناؒ کا معمول آخری شب میں بیدار ہونے کا ہے، تو ہم نے طے کیا کہ ہم بھی جا کر دیکھتے ہیں حضرت کی تہجد۔ لہٰذا ہم چلے گئے۔ جا کر دیکھا تو وہ تہجد کیا تھی، وہ خدا کی رحمتوں کی بارش برس رہی تھی اور حضرت مولانا کی باطنی کیفیات کا ظہور ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ خدا کی توجہ خاص حضرت مولانا پر پڑ رہی تھی اور اس کا کچھ حصہ ہمیں بھی مل رہا تھا۔ اتنا لطف آیا اور اس قدر اللہ کے تعالیٰ کے ساتھ تعلق نصیب ہوا کہ اس کے بعد جب بھی ہمیں توفیق ملی، تو ہم نے سیدھے مہمان خانے کا ہی رخ کیا۔ چنانچہ مہمان خانے جانے میں تھوڑی دشواری بھی تھی، اس لیے کہ دروازہ کھٹکھٹانا پڑتا تھا، نگراں کو بیدار کرنا پڑتا تھا اور پھر نگراں کے کان میں جب آواز پڑتی تھی تب وہ دروازہ کھولتے تھے۔ بسا اوقات کھولنے میں دیر بھی ہو جاتی تھی، لیکن حضرت مولانا کے ساتھ تہجد پڑھنے میں وہ نور تھا، وہ روحانیت تھی اور وہ لطف تھا کہ ہم نے طے کر رکھا تھا کہ ہر حال میں یہیں پڑھنا ہے۔ لہٰذا آج ہمیں اس بات کا غم ہے کہ ہم روزانہ حاضری نہ دے سکیں اور ایسی عظیم ہستی کی قدر نہ کر سکیں۔ چنانچہ مہمان خانے میں جب ہم داخل ہوتے تو حضرت مولانا ہمیں دیکھ کر کچھ نہ فرماتے اور ہم بھی کچھ نہ بولتے۔ ایک دھیما سا چراغ کمرے میں جل رہا ہوتا، ہم جا کر آپ سے چند ہی قدم پیچھے آپ کی بائیں جانب کھڑے ہو جاتے، ہم اپنی انفرادی نماز میں مشغول ہو جاتے اور آپ اپنی انفرادی نماز میں مشغول ہو جاتے۔ آپ سے بہت ہی قریب کھڑے رہنے میں حکمت یہ تھی کہ آپ کی باطنی کیفیات اور روحانیت کا اثر پاس والے پر بھی پڑتا تھا اور اس کا اثر وہ محسوس بھی کر سکتا تھا اور پھر آسمان والے کا آپ پر جو لطف و کرم ہوتا تھا، اس کا بھی کچھ حصہ پاس میں کھڑے رہنے والے کو ملتا تھا، چنانچہ ایک عجیب منظر جو تہجد کے وقت ہر بار دیکھنے کو ملا وہ یہ کہ جب جب بھی حضرت مولانا رکوع اور سجدے میں جاتے، تو آپ کے رونے کی آواز اور سسکیاں سنائی دینا شروع ہو جاتیں۔ آپ کی یہ خشیت' گریہ و بکا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رونے کی جو کیفیت بیان کی گئی ہے کہ ''سینے سے ہانڈی ابلنے کی آواز نکلتی تھی'' اسی کیفیت کا کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرح سے مشاہدہ تھا۔ ہم نے کئی بار سوچا بھی کہ ریکارڈ کر لیں، لیکن حضرت مولانا کے رعب کی وجہ سے کبھی ہمت نہیں ہو پائی۔

چنانچہ آپ کی تہجد کی پابندی کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ ہم ٹرین پر ساتھ میں سفر کر رہے تھے، رات کا وقت تھا، اتفاقی طور پر اس رات ہماری آنکھ تہجد کے وقت کھل گئی۔ تو ہمارا گزر حضرت مولانا کے ڈبے پر سے ہوا، ہم نے اندر جھانکا تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت مولانا تہجد میں مشغول ہیں۔ یقین مانئے ہم حیرت میں پڑ گئے کہ یہ ٹرین جو کہ خوب ہلنے والی اور نخرے باز' جس پر وضو کرنا بھی مشکل، استنجاء کرنا بھی مشکل، اس کے باوجود اس نوے سال کے بوڑھے کی تہجد یہاں بھی نہیں چھوٹ رہی ہے۔

چنانچہ آپ کی تہجد اور نماز میں جو چیز آپ کے بغل میں پڑھنے والے کو سب سے زیادہ متاثر کرتی تھی وہ یہ کہ آپ کی جو باطنی کیفیت تھی اور جو خشیت آپ پر طاری ہوتی تھی، اس سے محسوس ہوتا تھا کہ آپ کے اندر کوئی انگیٹھی ہے جو جل رہی ہے۔ آپ کے ایک عزیز نواسے کا بیان ہے کہ ''بعض اوقات ابا کو نماز پڑھاتے ہمیں سہو ہو جاتا تھا، آیت بھول جاتے تھے، اس لیے نہیں کہ آیت یاد نہیں ہوتی تھی، بلکہ پیچھے سے ابا کے رونے کی آواز اور خشیت کی جو آواز آتی تھی وہ متاثر کرتی تھی۔ ابا کے اندر جو باطنی کیفیت ہوتی تھی اثناء نماز اثنا تہجد اور دعا کے دوران، یہ کیفیت ایک الگ کیفیت ہوتی تھی جو بظاہر ہم نے کسی اور میں نہیں دیکھی۔ ہم نے ذاتی طور پر اس کیفیت کا مشاہدہ کسی اور میں نہیں کیا۔''

چنانچہ جو بات ہم نے حضرت مولانا کے یہاں گہرائی سے

محسوس کی تھی، وہ یہ تھی کہ آپ کے اندر اللہ تعالیٰ کی عظمت اور اس کی خشیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ آپ انتہائی تواضع، عظمت اور خشیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوتے تھے۔ جن لوگوں نے آپ کو بہت ہی قریب سے دیکھا ہے، ان کا بیان ہے کہ آپ کی ہچکیاں بندھ جاتیں اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کی بات تھی۔ یہ اسی طرح ہے جیسا کہ امام زین العابدینؒ جب وضو شروع فرماتے، تو ان کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا۔ کسی نے پوچھا کہ ایسا کیوں؟ تو فرمایا کہ تمہیں معلوم نہیں کہ کس ذات کے سامنے میں کھڑے ہونے جا رہا ہوں۔

بہر حال ایسا بلند مقام اور ایسی مقبولیت و محبوبیت اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا ربط اور تعلق بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ایسا اخلاص بھی چاہیے اور اس کے سامنے رات کے اندھیرے میں کھڑے ہونے کا ایسا شوق بھی چاہیے۔ ایسی بلند ہمتی اور ایسے نیک عزائم جب ہوتے ہیں، تب جا کر ایسا کوئی مقام حاصل ہوتا ہے۔ حقیقت تو یہ کہ جس کے ساتھ خدا محبت کرتا ہے، اسے ہی اپنے سامنے رات کے اندھیرے میں کھڑا کرتا ہے اور جو دن کا باغی ہوتا ہے، اس کی چاہت اور ہزار کوششوں کے باوجود اسے عام طور پر یہ توفیق میسر نہیں ہوتی ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ کا قول ہے کہ ”ایک گناہ کی وجہ سے مسلسل چار مہینے تک میں تہجد سے محروم رہا۔“ اتنے بڑے محدث اور اللہ والے کا جب یہ حال ہے، تو ہم جیسوں کا کیا شمار۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ فجر کی نماز بھی مشکل سے ادا ہوتی ہے اور یہاں تو ایک نوے سال کا بوڑھا، اس کی تو تہجد بھی نہیں چھوٹتی تھی۔ آپ سوچئے کہ نوے سال کی عمر میں کس قدر کمزوری، کتنے اعذار لیکن اللہ تعالیٰ سے ایسا قوی تعلق اور ربط کہ اس کے پکارنے پر نرم بستر بھی چھوٹ جاتا تھا اور ہر طرح کی مشقت بھی گوارہ تھی۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے کہ جو لوگ تہجد گزار ہوں گے، قیامت کے دن وہ بلا کسی حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے اور ان کی تعداد بہت کم ہوگی۔ ہم اللہ تعالیٰ کی ذات سے امید کرتے ہیں کہ حضرت مولانا کو بھی یہ مقام شرف قیامت کے روز نصیب ہوگا۔

غیبت سے مکمل اجتناب:

حضرت مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندویؒ غیر معمولی صفات و خصوصیات کے مالک انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی انسان کے اندر اتنی ساری صفات اور خصوصیات رکھ دی تھیں کہ عام طور پر ایسا دیکھنے کو میسر نہیں ہوتا ہے۔ آپ ہر طرح سے ماشاء اللہ بہت ہی نمایاں تھے۔ خدا کے فضل سے ایک غیر معصوم انسان جتنا کامل ہو سکتا ہے، وہ ہم نے آپ کی شکل میں دیکھا ہے۔ آپ شکل وصورت، اقوال و افعال، ادائیں، پاکیزگی، بول چال، ظاہر و باطن، نورانیت و روحانیت اور صفات و خصوصیات، ہر اعتبار سے انسانی روپ میں ایک فرشتہ معلوم ہوتے تھے۔ ایک فرشتہ صفت انسان تھے۔ ایک وہ وقت تھا کہ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا مانگا کرتے تھے کہ ”اے اللہ! اس کرہ ارض پر جو تیرے نزدیک سب سے نیک انسان ہو ہمیں اس کے یہاں پہنچا دیں۔“ وقت آیا کہ ہم وہ دعا بھول بھی گئے لیکن آپ کی خدمت میں جب ہم پہنچے ہیں، تو ایسا معلوم ہوا کہ ہماری وہ دعا قبول ہوئی۔

چنانچہ آپ کی بہت سی باتوں نے ہمیں متاثر کیا، لیکن آپ کی وہ بات جس نے گویا کہ آپ کی عظمت دل میں بٹھا دی، وہ یہ کہ آپ کا غیبت سے مکمل اجتناب تھا اور اپنی زباں پر بے پنا قابو تھا۔ غیبت سے اس قدر اجتناب تھا کہ آپ کے ایک عزیز نواسے کا بیان ہے کہ ”چونتیس سال میں ہم نے اپنے نانا کو کبھی کسی کی غیبت کرتے ہوئے نہیں سنا۔“ اللہ اکبر! کتنی بڑی بات ہے۔ کتنے لوگ ایسے ہوں گے کہ جن کے تعلق سے آپ کہہ سکتے کہ انہیں کبھی کسی کی برائی یا غیبت کرتے ہوئے نہیں سنا گیا؟ یا آپ کو معلوم ہیں کہ انہوں نے کبھی کسی غیبت نہیں کی ہے؟ چنانچہ یہ موضوع وہ ہے جو حضرت مولاناؒ کی زندگی کے باب کا بے حد مؤثر موضوع ہے۔ غیبت سے اجتناب یہ دراصل آپ کے عظیم ماموں حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی صحبت کا فیض تھا۔ آپ نے ہی ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ

''ہم نے حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو زندگی میں کسی کی غیبت کرتے ہوئے نہیں سنا۔''

چنانچہ غیبت سے اجتناب یہ آپ کے تعلق سے قابل بیان اور فضیلت کا باعث زیادہ اس لیے بھی ہے کہ آپ کی بے داغ اور مثالی زندگی کے باوجود، آپ کو اذیت بھی پہنچائی گئی، آپ کے خلاف لکھا بھی گیا، آپ کے خلاف تقریریں بھی ہوئیں، آپ کی تنقیص بھی کی گئی، آپ پر الزامات بھی لگائے گئے، سوشیل میڈیا پر بھی آپ کے خلاف لکھا گیا یا لکھوایا بھی گیا اور آپ سے ناواقف لوگوں کو آپ کے تعلق سے خوب بدگمان کرنے کی کوشش بھی کی گئی، لیکن آپ اس قدر اللہ کے ولی واقع ہوئے تھے کہ ایک بات یا جملہ تو دور کی بات ہے، آپ نے ایک لفظ بھی واللہ کسی کے تعلق سے نہیں کہا اور دوسروں کو بھی آپ اسی کی تلقین کرتے رہے۔ اس بات کا آپ کا پورا خاندان گواہ ہے۔

چنانچہ آپ کو اذیت پہنچانے والوں میں ایسے لوگ بھی تھے کہ جن کا علم اقرباء اور احباب کے علاوہ کسی کو نہیں تھا۔ ایک مرتبہ کسی نے اسی طرح کے کوئی ادمی کا نام چھیڑ دیا، تو اس سے قبل کہ بات اس کی برائی تک پہنچ جاتی، آپ نے اس کے اچھے پہلوؤں کو بیان کرنا شروع کر دیا۔ حضرت مولانا سید جعفر مسعود حسنی صاحب دامت برکاتہم العالیہ اپنا ایک واقعہ سناتے ہیں کہ ایک مرتبہ کسی نے آپ کو اپنے یہاں مدعو کیا، آپ کی واپسی کے بعد اس نے آپ کے تعلق سے بہت برا بھلا کہا جس کا علم مولانا جعفر صاحب کو ہوا۔ تو مولانا جعفر صاحب آپ کے پاس تشریف لائے اور تھوڑے سخت لہجے میں اس صاحب کے تعلق سے کہا اور کہا کہ آپ کو وہاں نہیں جانا چاہیے تھا، اس پر آپ نے فرمایا کہ ''ان کا عمل ان کے ساتھ اور تمہارا عمل تمہارے ساتھ۔'' اللہ اکبر!

چنانچہ ایک وہ وقت تھا کہ آپ کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے خود ہمارے اندر ایک عرصے تک اس بات کی حس بہت زیادہ بڑھ گئی تھی کہ کسی کی غیبت اور برائی نہیں کرنی ہے، یہاں تک کہ ہمارے گھر والوں اور خاندان میں بھی یہ چیز کافی عام ہوئی کہ ہم کسی کی غیبت نہیں کرتے ہیں اور واقعی اس بات کا احساس ہم میں غیر معمولی حد تک پہنچ گیا تھا لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا، تو ماحول اور صحبت کی وجہ سے اس گناہ میں ہم واپس ملوث ہونے لگے یا کہیے کہ اس کے شکار ہو گئے۔ لہٰذا ابھی اس رمضان سے قبل ہی ہم نے حضرت والاؒ کو پیغام بھجوایا کہ ''آپ کی صحبت میں رہ کر ہمارے اندر اس بات کا احساس بہت زیادہ بڑھ گیا تھا، لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہم واپس اس گناہ کا شکار ہو گئے ہیں۔ لہٰذا اس کے تعلق سے کیا کریں؟'' لیکن آپ جواب ہی کیا مرحمت فرماتے، چند ہی ایام گزرے کہ آپ اللہ تعالیٰ کو پیارے بھی ہو گئے۔

چنانچہ آپ کے سامنے جب کسی کی غیبت یا برائی کی جاتی، تو آپ ایسے خاموش رہتے یا بات اس طرح بدل دیتے کہ بات وہیں دفن ہو جاتی۔ ایسے تو کتنے لوگ آپ کے پاس اسی نیت سے آئے ہوں گے کہ فلاں کی بات کرنی ہے لیکن انہیں آپ کے پاس کچھ بھی ملا نہیں ہوگا۔ آپ کا حال تو یہ تھا کہ آپ ان لوگوں کے ساتھ بھی اچھا معاملہ کرتے جن سے آپ کو تکلیف پہنچی ہوتی، یا جن کے تعلق سے آپ کو معلوم ہوتا کہ یہ ہمارے خیر خواہ نہیں ہیں، یا یہ ہمارے خلاف بات کرتے ہیں، اجتماعیت برقرار رکھنے اور امت کی شیرازہ بندی کے لیے آپ نے اذیت بھی گوارہ کی ہے اور صبر و تحمل کا ثبوت بھی دیا ہے۔

چنانچہ آپ کے یہاں بولنے اور لکھنے میں احتیاط بہت ہی زیادہ تھا۔ آپ جذباتی شخصیت کے مالک بالکل نہیں تھے، نہایت ہی ہوش مند واقع ہوئے تھے۔ آپ جذبات میں آکر کوئی قدم نہیں اٹھاتے، کبھی کوئی حکم جاری نہیں فرماتے اور نہ ایسا کچھ بولتے یا لکھتے جس سے بعد میں آپ کو افسوس کا سامنا کرنا پڑتا۔ چوبیس سال تک آپ ندوہ کے ناظم رہے اور ایک لمبے عرصے تک مسلم پرسنل لا کے صدر رہے، لیکن ایک وقت بھی ایسا نہیں آیا کہ آپ نے جذبات میں آکر کچھ تحریر فرما دیا ہو یا ایسا کوئی بیان دے دیا ہو جس کی وجہ سے بعد میں آپ کو افسوس کا سامنا کرنا پڑا ہو۔ آپ کی باتوں سے ایسا معلوم تھا کہ آپ بہت ہی سوچ سمجھ کر کوئی بات کرتے۔ چنانچہ آپ کے

ساتھ اللہ تعالیٰ کی توفیق اور تائید شامل حال معلوم ہوتی تھی۔ کبھی زبان سے تو کوئی غیر مہذب یا نیچے درجے کا لفظ نہیں اور ادیب تو آپ تھے ہی تو ادب آپ کی باتوں سے خوب جھلکتا تھا۔ غیر ضروری اور لایعنی باتوں کے آپ عادی نہیں تھے۔ بہت خاموش طبع تھے اور صرف کام کی بات کرتے۔ چنانچہ ہمارے ایک استاد محترم حضرت مولانا اقبال غازی پوری صاحب ندوی دامت برکاتہم العالیہ نے ایک موقع پر دوران درس فرمایا کہ ”مولانا رابع صاحب جب کچھ تحریر فرماتے ہیں تو اسے بار بار دیکھتے ہیں، پھر رکھ دیتے ہیں، پھر اسے دیکھتے ہیں، پھر رکھ دیتے ہیں، پھر اسے دیکھتے ہیں، پھر رکھ دیتے ہیں، اسی طرح کرتے ہی رہتے ہیں یہاں تک کہ انہیں اطمینان نہیں ہوجاتا ہے۔“ چنانچہ یہ بات بہت سیکھنے کی ہے چونکہ ہمارے اکثر کام جذبات کی رو میں ہوتے ہیں۔ جذبات میں آکر ہم کیا سے کیا بیان دے دیتے ہیں اور لکھنے میں تو بالکل ہوش ہی کھو بیٹھتے ہیں۔ اسی طرح کی جذباتیت سے کام بگڑتے ہیں، تعلقات خراب ہوتے ہیں، افسوس اور پشیمانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے، دل آزاری ہوتی ہے اور ہماری وقعت لوگوں کے مابین کچھ رہ نہیں جاتی ہے۔

چنانچہ حضرت مولاناؒ کے یہاں تحمل اور برداشت بھی غیر معمولی حد تک تھا۔ آپ کے اندر حلم بہت تھا، اپنے جذبات پر قابو خوب تھا، اور قوت برداشت بہت زیادہ تھی جنہوں نے آپ کو قریب سے دیکھا ہے، وہ اس بات کو بخوبی جانتے ہیں۔ مولانا محمود حسنی صاحبؒ نے ایک موقع پر ہم سے فرمایا کہ ”آدمی سلوک کے مقامات طے نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ آزمائش کے مراحل سے نہ گزرے اور اس میں تحمل و برداشت پیدا نہ ہو، حضرت مولانا رابع صاحب ان مراحل سے گزر چکے ہیں۔“ واقعہ تو یہ ہے کہ حضرت مولاناؒ ان مراحل سے اپنی زندگی کے آخری ایام تک گزرتے رہے۔ یہ اسی لیے تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ کے مقام کو مزید بلند کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ان مراحل میں آپ ماشاء اللہ خوب کامیاب بھی ہوئے جس کی وجہ سے پھر آپ کو خدا کی طرف سے وہ مقام ملا جو ملا۔ لوگوں کی تکالیف برداشت کرنے کے علاوہ آپ کے خانوادہ کے وہ افراد بھی آپ کے سامنے دنیا سے چلے گئے جن سے آپ کو بڑی امیدیں وابستہ تھیں، لیکن اقرباء کا کہنا ہے کہ آپ کی زبان پر ایک لفظ بھی شکوہ کا کبھی نہیں آیا، رضا بالقضاء کی آپ تصویر بنے رہے، دوسروں کو آپ خود تسلی دیتے رہے اور غیر معمولی تحمل و برداشت کا ثبوت دیا۔

بہر حال! حضرت مولانا تو ایک قابل رشک اور ایک مثالی زندگی گزار کر اللہ تعالیٰ کے یہاں اپنے اعمال کے ساتھ پہنچ چکے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بھی آپ کے ان اوصاف اور خصوصیات کو اپنی زندگی میں اپنانے کی کوشش کریں تاکہ دنیا و آخرت میں ہمیں بھی کامیابی و کامرانی اور بلندی و سرخ روئی حاصل ہو۔

آج ہمارا تو کیا حال ہوگیا ہے کہ عوام تو عوام، خواص بھی غیبت کی بیماری اور گناہ میں بری طور پر مبتلا ہیں۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ بات بات پر ہم دوسروں کی غیبت کرتے ہیں اور اگر کسی نے ہمیں کوئی تکلیف پہنچا دی ہے، تو پھر غیبت تو اس کی لازمی ہوجاتی ہے اور انتقام لیے بغیر ہمیں چین نہیں آتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ایسے مراحل سے گزرتا رہتا ہے کہ جب ہمارے خلاف کوئی ایسی بات پیش آتی ہے، یا کسی نے ہمیں کچھ کر دیا ہو، تو اس کی غیبت نہ کرنا اور زباں پر قابو رکھنا ممکن نہیں رہتا ہے۔ سکون نہیں ملتا ہے یہاں تک کہ کسی نہ کسی طور پر اس کی غیبت نہ ہوجائے، اس کی دھجیاں نہ اڑا دی جائیں اور اس سے انتقام نہ لیا جائے۔ ہمارے اندر مسلسل ایک آگ بھڑکتی رہتی ہے۔ یہ انتہائی مشکل مرحلہ اور بہت ہی آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پر تو اتنی پاکیزہ اور اس قدر نیکی سے معمور زندگی کے باوجود کھلے عام مخالفت میں لکھا بھی جارہا تھا، لوگ مخالفت میں تقریریں بھی کررہے تھے، تنقیص بھی ہورہی تھی، الزامات بھی لگائے جارہے تھے لیکن کس قدر تحمل و برداشت تھا کہ ایک لفظ بھی زبان سے کسی کے تعلق سے نکلتا نہیں تھا۔ معاملہ پورا کا پورا اللہ تعالیٰ کے سپرد تھا۔ واللہ آپ سوچ سکتے ہیں کہ ایسے شخص کا اللہ کے یہاں کیا مقام ہوگا اور خدا کو وہ کتنے محبوب ہوں گے۔ قربان جایئے ایسی زندگی پر،

ایسی للّٰہیت پر، ایسے تحمل و برداشت پر اور ایسے صبر و استقامت پر ؎

أولَـئِكَ آبـائی فَجِئنی بِمِثلِهِم
إذا جَمَعَتنا یا جَریرُ المَجامِعُ

توحید پر پختگی اور شرک سے نفرت:

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا برصغیر کے جس مشہور ومعروف اور تاریخی خانوادہ سے تعلق رہا، وہ خانوادہ ہمیشہ توحید وسنت کا علمبردار رہا ہے۔ اس خانوادہ میں ہمیشہ توحید وسنت پر پختگی، شرک و بدعات سے نفرت اور اللہ تعالیٰ کی ذات پر حد درجہ توکل رہا ہے۔ اس بات کا اس کے یہاں ہمیشہ خیال رہا ہے کہ کسی بھی چیز میں شرک کی ادنیٰ آمیزش نہ ہو اور ہر وہ چیز جس سے شرک و بدعات کی راہیں کھل سکتی ہوں، اس سے نہایت ہی دوری اپنائی جائے۔ چنانچہ حضرت مولانا کے جو جدامجد تھے اور جن کے نام سے خانوادہ حسنی کا وطن دائرہ شاہ علم اللہ موسوم ہے، وہ تھے سولہویں صدی کے بزرگ حضرت شاہ علم اللہ حسنیؒ، وہ نہایت ہی متبع سنت تھے۔ ان کی اتباع سنت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی وفات ماہ ربیع الاول میں ترسٹھ سال کی عمر میں پیر کے دن واقع ہوئی۔ ان کی زندگی پوری کی پوری توحید و سنت سے عبارت تھی۔ توحید پر پختگی اس قدر کہ شرک خفی کا بھی انہیں اتنا ہی دھیان رہتا تھا جتنا کہ کسی کو شرک جلی کا رہتا ہے۔ اس معاملے میں وہ بہت ہی نمایاں تھے۔ چنانچہ یہ استحضار اور دھیان ان کی اولاد میں نسل در نسل منتقل ہوتا گیا اور ہر ایک کو اس کا کچھ نہ کچھ حصہ ملتا رہا۔ پھر حضرت سید احمد شہید کا دور آیا، تو ان کا بھی یہی حال رہا۔ توحید و سنت کا ان پر اس قدر غلبہ تھا کہ وہ جب حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے یہاں پہنچے ہیں، تو اس وقت وہاں پر بلکہ پورے ہندوستان میں مسنون سلام کا رواج نہیں تھا۔ سید صاحب نے داخل ہوتے وقت نہایت ہی سادگی سے السلام علیکم کہا، شاہ صاحب نے سن کر بہت خوشی کا اظہار فرمایا اور سنت کی ابتدا وہاں سے ہوئی۔ پھر شاہ صاحب کے یہاں مراقبہ میں تصور شیخ کی تعلیم دی جاتی تھی، اس پر سید صاحب رح نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ ”شرک کی کسی طرح ہمت نہیں ہوسکتی، ہاں کتاب وسنت واجماع امت سے کوئی سند لائیں اور اچھی طرح سے اطمینان ہو جائے کہ دونوں ایک چیز نہیں تو خطرہ دور ہو سکتا ہے۔“ اس پر شاہ صاحبؒ بے حد خوش ہوئے، کئی بار پیشانی کو بوسہ دیا اور فرمایا کہ ”اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وانعام سے تمہیں ولایت انبیاء سے نوازا ہے۔“ اسی طرح ایک مرتبہ کسی نے سید صاحبؒ سے عرض کیا کہ آپ کا انتقال جب ہوگا تو آپ کی قبر پر چادریں وغیرہ خوب چڑھائی جائیں گی (بات کا مفہوم) تو سید صاحبؒ نے فرمایا کہ ”جس طرح اللہ تعالیٰ نے زندگی میں شرک سے محفوظ رکھا، موت کے بعد بھی محفوظ رکھے گا۔“ یہ بات ان کی ایسی قبول ہوئی کہ آج تک ان کی قبر نامعلوم ہے جو قبر ان کی بتائی جاتی ہے، وہ حقیقت میں ان کی نہیں ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے کہ اس خانوادہ میں اتنے بڑے بڑے اللہ والوں کے گزرنے کے باوجود آج تک کسی ایک کی قبر پر بھی بدعات وخرافات کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ جو حضرات تکیہ دائرہ شاہ علم اللہ میں مدفون نہیں بھی ہیں، ان کی قبریں بھی ماشاء اللہ ان سب چیزوں سے پاک رہی ہیں۔

بہر حال! یہ اتباع سنت کا جذبہ، توحید پر پختگی، شرک و بدعات سے نفرت اور توکل علی اللہ اس خاندان کا خاص حصہ رہا ہے۔ حضرت مولانا رابع صاحبؒ کے جنازے سے پہلے مولانا بلال صاحب نے جو بار بار یہ بات فرمائی کہ ”یہاں کا پیغام توحید پر پختگی اور اتباع سنت ہے۔“ اس بات کو تو اکثر لوگ سمجھ نہیں پائیں ہوں گے، چونکہ توحید پر پختگی اور اتباع سنت کا پیغام تو ہر جگہ پر ہی ہوتا ہے، لیکن تکیہ کلاں دائرہ شاہ علم اللہ میں جس قدر توحید پر پختگی، شرک و بدعات سے نفرت اور اتباع سنت پر ایک عرصہ دراز سے جو عمل چلا آ رہا ہے، وہ بظاہر کہیں اور نظر نہیں آتا ہے۔ اتباع سنت کا حال یہ رہا ہے کہ آج تک کسی ایک بھی قبر پر کتبہ نہیں لگایا گیا ہے۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے اللہ والے یہاں مدفون ہیں، لیکن کسی ایک کا بھی نام آپ کو نہیں ملے گا۔ شرک و بدعات اور خرافات سے بچنے کے لیے اس خانوادہ میں تبرکات کو بھی محفوظ رکھنے کا رواج نہیں رہا ہے۔ جو شاہ علم

اللہ صاحبؒ کا گھر تھا اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی جائے پیدائش، اسے طلبہ کے ہاسٹل میں تبدیل کر دیا گیا۔ جو سید صاحب کا کمرہ تھا، اسے لائبریری میں تبدیل کر دیا گیا۔ جہاں پر سید صاحب غالباً ذکر کیا کرتے تھے، وہاں پر وضو خانہ بنا دیا گیا۔ ہر بات میں بہت ہی خیال رکھا گیا کہ کہیں سے بھی شرک و بدعات کا سلسلہ ادنیٰ درجہ بھی شروع نہ ہو۔ چنانچہ توحید پر پختگی اور اتباع سنت کا یہ جذبہ نسل در نسل منتقل ہوتے ہوئے آخر میں حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی پر جا پہنچا۔

حضرت مولانا رابع صاحب کو ہم نے توحید و شرک کے معاملہ میں بہت ہی حساس پایا۔ ہر بات میں اللہ تعالیٰ کا اتنا دھیان اور ایسا عجیب شعور تھا کہ کہیں پر بھی شرک کی ادنیٰ آمیزش نہ ہو۔ آپ کی باتیں سن کر تعجب ہوتا تھا کہ کیسے کسی کا ذہن اتنا دور پہنچ بھی سکتا ہے۔ اندازہ نہیں تھا کہ شرکیات کے معاملے میں کوئی اتنا حساس بھی ہو سکتا تھا۔ اس قدر حساسیت کہ ذہن اللہ تعالیٰ سے ہٹ کر کہیں دوسروں کی جانب منتقل نہ ہو، یا نسبت اللہ تعالیٰ سے ہٹ کر دوسروں کی طرف نہ ہونے لگے، آپ اسے شرک سمجھتے تھے۔ لہٰذا ایک دن غیر متوقع طور پر آپ نے مجلس میں طلبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے بہت ہی قیمتی نصیحتیں فرمائیں۔ یہ مجلس بڑی ہی پر رونق اور شاندار مجلس تھی۔ اس وقت آپ کا ایک نہایت ہی قیمتی ملفوظ ہمیں ازبر ہو گیا جو کہ آپ کے استحضار خدا اور شرک سے نفرت کی جانب اشارہ کر رہا تھا، طلبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا کہ ”جب کوئی کام اپنے عروج تک پہنچتا ہے تو اس میں غلو پیدا ہونے لگتا ہے، جب غلو پیدا ہونے لگتا ہے، تو شخصیات کی طرف نسبت ہونے لگتی ہے، جب شخصیات کی طرف نسبت ہونے لگتی ہے، تو وہاں سے نظر خدا سے ہٹ کر شخصات پر ٹکنے لگتی ہے، جب شخصیات پر نظر ٹکنے لگتی ہے، تو شرک پیدا ہونے لگتا ہے کہ فلاں نے یہ کیا، فلاں کی وجہ سے یہ ہوا اور جب شرک ہونے لگتا ہے تو پھر وہاں سے زوال کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آپ (طلباء) جو بھی دین کا کام کریں، اس میں غلو سے احتراز کیجیے اور نسبت ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف کیجیے۔“ یہ نہایت ہی قیمتی نصیحت تھی کہ نظر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی جانب رہنی چاہیے۔ چنانچہ اس ملفوظ کی وضاحت ہم نے بعد میں چاہی بھی تو آپ نے فرمایا کہ ”جو بھی فساد پھیلتا ہے عام طور پر غلو سے پھیلتا ہے اور یہ بات صحیح ہے کہ شخصیات پر نگاہ جانے کے بعد بسا اوقات نگاہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہٹ جاتی ہے۔“

آج ہم سوچ سکتے ہیں کہ ہمارے کتنے کام ایسے ہیں جن میں جا بجا نسبت اللہ تعالیٰ سے ہٹ کر شخصیات کی جانب ہونے لگتی ہے، نظر اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہٹ کر دوسروں کے کمالات یا کاموں پر ٹکتی ہے، پھر کسی شخصیت، جماعت یا ادارے پر ایسا ٹھہراؤ یا اس کے تعلق سے اس قدر غلو ہونے لگتا ہے کہ بات عصبیت تک پہنچ جاتی ہے اور پھر آدمی اللہ تعالیٰ کے لیے مخلص ہونے اور اس کے لیے قربانی دینے کے بجائے کسی شخصیت، جماعت یا ادارے کے نام پر قربانی دینے لگتا ہے۔ بار بار اس کا نعرہ بلند کرنے لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرنے کے بجائے کسی شخصیت، جماعت یا ادارے کی گن گاتا ہوا پھرتا ہے۔ یہ ہمارے لیے بڑا ہی سوچنے کا مقام ہے۔ آج ہماری جماعتوں، اداروں اور تنظیموں میں اختلاف اور زوال کی جو وجوہات ہیں، سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ بہت غلو ہوتا ہے، شخصیات پر نظریں ایسی ٹکتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے نظر ہٹ جاتی ہے، پھر عصبیت ایسی ابھر کر سامنے آتی ہے کہ وہ افراط و تفریط کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور دوسروں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جانے لگتا ہے۔ یہ وہ اسباب ہیں جو کہ خود ہمارے اندر سے ہی جنم پاتے ہیں اور جن سے ہم بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ ان کی وجہ سے کاموں میں برکت ختم ہو جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی تائید ہٹ جاتی ہے۔ بہر حال یہ ملفوظ سن کر ہمارے سامنے بہت ساری باتیں کھلیں اور اپنی زندگی کے لیے ایک راہ ملی۔

حضرت مولانا کا شعور شرکیات کے باب میں اس حد تک تھا کہ نعتیہ کلام میں بھی ان چیزوں کا آپ کو کا احساس رہتا تھا جن سے اکثر لوگ غافل ہوتے ہیں۔ آپ کا شعور اس باب میں نہایت ہی بلند تھا کہ کہیں پر شرک کی آمیزش تو نہیں ہو رہی ہے۔ نعتیہ کلام میں اکثر ایسا اسی وقت ہوتا ہے جبکہ نعت خواں لاشعوری طور پر حضور ﷺ

کو خدا کا درجہ اپنی نعت میں دے دیتے ہیں۔ حضور ﷺ کو اپنی شان عبدیت سے بڑھا کر وہ آپ کو شان ربوبیت تک پہنچا دیتے ہیں۔ اس میں حضرت مولانا کا شعور نہایت ہی بلند تھا۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ نے اپنے برادر اکبر حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کا کلام سن کر جو آپ ہی کا مزاج اور شعور رکھتے تھے، فرمایا کہ ''پوری ہتھیار ہے، شرک کی کوئی آمیزش نہیں۔''

اپنی نفی:

چنانچہ حضرت مولانا جس طرح دوسروں کی تعریف کرنے میں بہت معتدل اور حساس واقع ہوئے تھے، خود اپنے معاملے میں بھی بہت ہی حساس تھے۔ ہم نے ایسا بارہا محسوس کیا کہ آپ کے اندر اپنی نفی بہت زیادہ تھی۔ دل سے یہ چاہتے تھے کہ کوئی آپ کی تعریف نہ کرے۔ ایسے مضامین وغیرہ سننا بھی پسند نہیں فرماتے جن میں آپ کی تعریف ہو رہی ہوتی۔ ہم نے دو الگ الگ موقعوں پر کسی بات پر عرض کیا کہ ''آپ کا تعلق تو آل رسول ﷺ سے ہیں۔'' تو دونوں بار بڑے ہی درد کے ساتھ ایک ہی جواب دیا کہ ''نہیں! نسب سے کچھ نہیں ہوتا ہے، اصل تو آدمی کا عمل ہے۔'' ہمیں اندازہ ہے کہ یہ اس لیے بھی تھا کہ آپ نہیں چاہتے تھے کہ لوگوں کی نظریں کہیں اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہٹ کر آپ کی طرف جم جائیں۔ چنانچہ آپ کا ایک ملفوظ یہاں نقل کرتے ہیں جس سے اس بات کی تائید بھی ہوتی ہے اور حضرت مولانا کا شعور ان چیزوں کے تعلق سے سمجھنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ اس ملفوظ کو بیان کرنے والے حضرت مولانا الیاس صاحب بھٹکلی دامت برکاتہم العالیہ ہیں فرمایا کہ ''کبھی ذہن میں بھول کر بھی یہ بات نہیں آنی چاہیے کہ فلاں سے کام چلتا تھا، فلاں سے کام ہوتا تھا، جس دن سے ذہن میں یہ بات آتی ہے، اللہ کی ذات بڑی غیور ہیں، اس دن اللہ تعالیٰ اس شخص کو اٹھا لیتے ہیں۔''

اللہ اکبر! واللہ یہ سب باتیں کس قدر قیمتی اور کام آنے والی ہیں۔

بہر حال یہ تو وہ باتیں تھیں جو ہمارے ذہن میں ہمیں یاد رہ گئیں۔ بدقسمتی یا افسوس کہیے کہ ہم نے دوران صحبت باتوں کو قلمبند نہیں کیا ورنہ بہت ساری باتیں سامنے آتیں۔ ہم نے حضرت مولاناؒ کی باتوں سے، افعال سے، اداؤں سے اور زندگی دیکھ کر یہ بات بہت گہرائی سے محسوس کی تھی کہ ہر کام میں آپ کو دوسروں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کا استحضار غیر معمولی حد تک تھا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ دراصل آپ کے مبارک خون اور عظیم نسبتوں کا اثر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ جب کچھ بولتے بھی تو الفاظ چن چن کر بات کرتے۔ نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف فرماتے۔ ایسی تو بہت سی باتیں تھیں جو ہمیں یاد بھی نہ رہیں لیکن یہ احساس اور اندازہ آپ کی صحبت میں خوب ہوا کہ نظر ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر رہنی چاہیے، حقیقی نسبت اسی ہی کی طرف ہونی چاہیے اور کہیں پر بھی ادنیٰ شرک کی آمیزش نہیں ہونی چاہیے۔

اسلام کی تاثیر

''پورے عالم اسلام میں مسلمانوں کو ہر طرف سے نشانہ بنایا جا رہا ہے، مختلف طریقوں سے ان کی شبیہ کو مسخ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے، خاص طور سے ذرائع ابلاغ کو استعمال کر کے اور لٹریچر کے ذریعہ مسلمانوں کی شبیہ کو مسخ' ان کی اچھی باتوں کو بری باتیں اور نیکی کو بدی قرار دیا جا رہا ہے، انہیں تخریب پسند کہا جا رہا ہے اور یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ اگر ان کو چھوٹ ملے گی تو دنیا اور انسانیت کو تباہ کر دیں گے، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام ساری دنیا کی ترقی کا خواہش مند ہے، تباہ کرنا تو دور کی بات ہے، اسلام ترقی دینے اور سنوارنے کے لیے آیا ہے، جب تک دنیا کی قیادت' طاقت' سطوت اور علم مسلمانوں کے ہاتھ تھا' انہوں نے دنیا کو مالا مال کر دیا، مسلمان بہت سے ملکوں میں پہنچے جہاں لوگ جانوروں کی طرح زندگی گذارتے تھے، انہیں تہذیب اور انسانیت سے روشناس کرایا، آدمی بننے کا سلیقہ سکھایا۔ الحمد للہ مسلمانوں میں شعور بیدار ہو چکا ہے، وہ زندہ رہنے، باقی رہنے اور اپنی عظمت کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان زندہ ہیں اور زندگی کے سبب رواں دواں ہیں۔''

(حالات حاضرہ اور مسلمان: ۷۹-۸۰)

مرشد الامت حضرت مولانا سیّد محمد رابع حسنی ندویؒ

پیکرِ علم و حکم

مولانا شاہ ارشد علی ندوی
(رفیق العافیہ ٹرسٹ۔لکھنؤ)

اس امت محمدیہ کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ خیر القرون سے لے کر عصر حاضر تک ہر دور میں اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ ایسے خاص بندوں کو پیدا فرمایا ہے جو ایک طرف پاکیزگی وطہارت، زہد وتقویٰ اور خلوص وللّٰہیت کے اعلیٰ مقام پر فائز ہوتے ہیں تو دوسری طرف علوم شرعیہ کے ماہر، حالات زمانہ کے نبض شناس اور حکمت ودانائی کی بیش بہا دولت سے خوب مالا مال ہوتے ہیں۔ قدرت کی طرف سے ایسا انتظام اس لیے ہوتا ہے تاکہ وہ ایک بے داغ مصلح اور دانا حاکم کی طرح قوم کی رہنمائی ورہبری کرسکیں۔

بلا مبالغہ مرشد الامت شیخنا ومرشدنا حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ انہی مخصوص بندگان خدا میں سے ایک تھے۔

حضرت سے میرا تعلق کئی نوعیت کا تھا، ایک طرف آپ ہمارے قابل قدر ومکرم استاد تھے، تو دوسری طرف میری ارادت کا تعلق بھی آپ ہی سے تھا، اسی طرح دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے فراغت کے بعد راقم جس تحریک سے وابستہ ہوا، یعنی ''کل ہند تحریک پیام انسانیت'' اس کے صدر ذی وقار بھی آپ ہی کی ذات گرامی تھی۔

آپ نے اپنے عم مکرم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے بعد جس دانش مندی وہوش مندی کے ساتھ عالم اسلام کی عظیم دینی درس گاہ (یونیورسٹی) دار العلوم ندوۃ العلماء کی باگ ڈور کو سنبھالا اور پھر مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے اسلامیان ہند کے مسائل ومصائب کو جس دور اندیشی وبیدار مغزی کے ساتھ حل فرمایا یہ بس آپ ہی کا حصہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ تاحیات یعنی بائیس سال تک آپ ان دونوں بلند پایہ تنظیموں کے ناظم وصدر رہے۔

اسی طرح حضرت مولاناؒ نے اپنی فراست ایمانی سے تحریک پیام انسانیت کی بہتر انداز میں قیادت فرمائی۔ مقام انسانیت اور حقوق انسانیت کے پارٹ پڑھائے، اپنے ایک مضمون میں قلم بند کرتے ہیں کہ:

''ہندوستان میں آزادی کے بعد ضرورت تھی کہ (یہ ملک ہندو مسلم سکھ عیسائی سب کی مل جل کر کوشش سے آزاد ہوا) ہندوستان کے رہنے والوں کے تحفظ وترقی کے مسائل کو بھی یہ سب مل جل کر حل کرتے اور اجتماعی زندگی کو خوشگوار بنانے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے، ہندوستان کا دستور بھی اسی طریقہ کو واضح کرتا ہے، لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ آزادی کے بعد مسائل کے حل کرنے میں خاندانی، مذہبی اور طبقاتی رشتوں کو زیادہ بنیاد بنایا جانے لگا، اس کی وجہ سے وطنی اور ملکی مفادات کو مدد ملنے میں بڑی کوتاہی ہوئی اور دیگر طبقاتی اور مذہبی ٹکراؤ اور کشمکش کے حالات پیدا ہوگئے، انسانی رشتہ کے تقاضے بھی اس میں نظر انداز ہونے لگے، اس کی وجہ سے ملک میں یکجہتی کے ساتھ ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں، یہ بڑی قابل اصلاح کمزوری اور نقص ہے، جس کی طرف توجہ اچھے اچھے اہل دانش نے بھی بہت کم کی، ہر ایک نے اپنی کسی محدود اجتماعیت کی فکر تک اپنے کو محدود رکھا۔''

پیام انسانیت کے سالانہ اجلاس جو تکیہ کلاں رائے بریلی میں ہوتا ہے، آپ کا بیان اس میں بہت قیمتی اور پر مغز ہوتا تھا۔ ایک مرتبہ وہیں جلسے میں یہ بات آئی کہ جیسے دوسری تنظیموں میں علاقائی صدر اور سکریٹری ہوتے ہیں، اسی طرح اس تنظیم کے بھی علاقائی صدر اور

سکریٹری بنائے جاسکتے ہیں؟ اس پر حضرت مولانا نے اپنی خداداد دانائی وحکمت سے اس بات کا فیصلہ فرمایا کہ نہیں علاقائی صدر سکریٹری نہیں ہوا کریں گے۔ آپ آج کل کے صدر وسکریٹری کے جھگڑوں کو دیکھ کر اندازہ لگاسکتے ہیں کہ یہ فیصلہ کس قدر دوراندیشی اور دور بینی پر مبنی ہے۔ اس طرح سے یہ تحریک موجودہ وقت میں تقریباً ہندوستان کے ڈیڑھ سو اضلاع میں سرگرم عمل ہے، لیکن الحمدللہ کسی جگہ بھی کارکنان کے درمیان عہدہ ومنصب کا نزاع نہیں ہے۔

۲۰۱۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے میری فراغت ہوئی، اس کے بعد داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندویؒ کے دامن دولت سے وابستہ ہوا، ابھی میں اسی پیچ وخم میں الجھا ہوا تھا کہ کسی بزرگ سے بیعت ہونا ضروری ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو کس قدر ضروری ہے؟ بیعت کے فوائد کیا ہیں اور نہ کرنے کے نقصانات کیا ہیں؟ کہ حضرت مولانا عبداللہ صاحبؒ کی ۳۱؍جنوری ۲۰۱۳ء کو وفات ہوگئی۔

اس کے بعد پورے شرح صدر کے ساتھ میں نے سوچا کہ اب کسی اللہ والے کے ہاتھ میں ہاتھ دے دینا چاہیے، لہٰذا اس کے لیے مجھے سب سے موزوں اور بہترین شخصیت حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کی ذات گرامی میں نظر آئی۔

چنانچہ جب میں نے اپنی بیعت کا اظہار حضرت مولاناؒ سے کیا تو حضرتؒ نے بحسن وخوبی میری درخواست قبول فرمائی اور کہا کہ فجر بعد آنا، اگلے دن بعد نماز فجر وہیں ندوۃ العلماء کے مہمان خانہ میں مجھے اپنے حلقہ ارادت میں داخل فرمایا۔ متعدد نصیحتیں فرمائیں، جن میں بطور خاص تین باتوں پر زور دیا اور وہ تینوں باتیں حسب ذیل ہیں:

۱- روزانہ کم از کم ایک پارہ قرآن کریم کی تلاوت۔

۲- والدین کی خدمت، اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک

۳- روزانہ سو سو دفعہ تین تسبیحات کا معمول، یعنی تیسرا کلمہ، درود شریف اور قرآنی استغفار۔

اب اخیر میں اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ حضرت کی قبر کو نور سے منور فرمائے، ان کی خدمات کا بہترین صلہ عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلائے۔ آمین!

تحریک پیام انسانیت کا تعارف

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''پیام انسانیت'' کے نام سے جو فورم ہے، اس کو ''پیام انسانیت'' اسی لیے کہا گیا ہے تاکہ آدمی یہ سمجھے کہ یہ انسانی سطح پر ایک دوسرے کے ساتھ اخلاق برتنے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کرنے کی ایک تحریک ہے، اس تحریک کے پلیٹ فارم سے لوگوں کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ آپس میں مل کر رہو، آپس میں محبت کے ساتھ رہو اور ایک دوسرے کے فائدہ کو دیکھو، یہ نہیں ہونا چاہیے کہ تم صرف اپنے ہی فائدہ کو دیکھو، بلکہ دوسرے کے فائدہ کو بھی دیکھو اور جو پڑوسی ہونے کی حیثیت سے تم پر ذمہ داری ہے اس کو پورا کرو اور یاد رکھو کہ انسانی رشتوں کے نبھانے میں مذہب حائل نہیں ہوتا، بلکہ اپنے اپنے مذہب پر آدمی قائم رہے اور پوری طرح قائم رہے، مگر انسانی رشتوں کا مکمل خیال رکھے، اس سلسلہ میں مذہب اس کی مکمل رہنمائی کرتا ہے، مذہب خود ہم کو یہ بتاتا ہے کہ تمہارے اوپر پڑوسی کا حق ہے، اب خواہ وہ پڑوسی کوئی بھی ہو اور کسی بھی مذہب کا ہو، جب پڑوسی ہے تو اس کے ساتھ پڑوسی والا اخلاق برتنا ہے۔ ''پیام انسانیت'' انسانیت کی صدا بلند کرنے کی ایک تحریک ہے، اس کا پیغام یہ ہے کہ ہمیں انسانی سطح پر آپس میں محبت وہمدردی پیدا کرنا ہے، اس سے ہمارا سماج بہترین سماج بنے گا اور دیکھنے والے اس کی تعریف کریں گے اور رشک کریں گے کہ یہ سماج واقعی ایک مثالی سماج ہے۔''

(ماخوذ از صدارتی خطاب بموقع سالانہ اجتماع کل ہند تحریک پیام انسانیت- منعقدہ ۱۱-۱۲؍نومبر ۲۰۱۷ء)

میر کارواں کا سفرِ آخرت

مولانا محمد توحید خان ندوی
(استاد معہد دار العلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

۲۱؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ مطابق ۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ء کی دوپہر کو ندوۃ العلماء کے سرپرست اعلیٰ وناظم اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر، جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ طویل علالت کے بعد تقریباً ۹۴؍سال کی طویل و بابرکت عمر گزار کر دار فانی سے دار بقاء کو کوچ کر گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون!

یوں تو حضرت مولانا طویل عرصے سے مختلف عوارض سے دوچار تھے، مگر حالیہ رمضان کے پہلے عشرے کے بعد ان کی طبیعت کافی بگڑ گئی تھی اور اُنھیں ان کے وطن تکیہ رائے بریلی سے لکھنؤ میں دار العلوم ندوۃ العلماء کے مہمان خانے منتقل کر دیا گیا تھا، یہاں مہمان خانے میں ماہر معالج اور معروف ڈاکٹروں کی ٹیم مسلسل ان کی نگرانی میں ہمہ تن مصروف تھی، مگر حضرت مولانا کا بخار قابو میں نہیں آرہا تھا، بالآخر یہی بخار ان کی رحلت اور سفر آخرت کا سبب بن گیا اور حضرت مولانا کی ہمہ جہت وباتوفیق شخصیت ۷ دہائی تک دینی، تعلیمی، ادبی، ملی وسماجی خدمات انجام دے کر دنیا سے رخصت ہوگئی، حضرت مولانا نے اپنے پیچھے پر بہار و دین دار، شاد وآباد خاندان، ۶۰؍سے زائد اردو وعربی میں تصنیفات اور پوری دنیا میں پھیلے ہوئے بے شمار شاگرد وفیض یافتہ افراد کی ایسی بڑی تعداد چھوڑی جو ہر میدان میں حضرت مولانا کے فیض کو عام کر رہی ہے اور ان کے دعوتی مشن کی تکمیل کر رہی ہے۔

حضرت کی وفات حسرت آیات سے جو علمی ودعوتی خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا امر محال ہے، حضرت کی وفات علم وادب، فکر ودعوت کے ایک زریں عہد کا خاتمہ واقع ہوئی ہے، خدائے ذوالجلال و الاکرام امت مرحومہ کو حضرت کا نعم البدل نصیب فرمائے۔آمین!

ولادت باسعادت:

حضرت مولانا کی ولادت باسعادت ۲۵؍جمادی الاخریٰ ۱۳۳۸ھ مطابق یکم اکتوبر ۱۹۲۹ء کو ملک ہندوستان کے مستند ومتدین معروف ومشہور حسنی سادات کے اس پاکیزہ خاندان میں ہوئی جو سیدنا حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نسل کے معروف بزرگ امیر کبیر شیخ الاسلام قطب الدین محمد بن احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے، جو مدینہ منورہ سے اشارۂ غیبی پاکر ہندوستان میں منتقل ہوگئے تھے، انہی کی نسل میں دور عالمگیری میں سلسلہ نقشبندیہ کے ایک بزرگ شیخ علم اللہ بن محمد فضیل حسنی رحمۃ اللہ علیہ نے اس خاندان کو نصیر آباد ضلع رائے بریلی سے ''سئی'' نامی ندی کے ساحل پر منتقل کیا اور وہاں پر آج سے چار سو سال پہلے ۱۰۸۴ھ میں خانہ کعبہ کے نقشہ کو پیش نظر رکھ کر ایک ایسی مسجد تعمیر کی جس کا نہ کوئی گنبد بنایا اور نہ ہی مینار، وہ مسجد بیک وقت عبادت وریاضت، دعوت وارشاد، جہاد وسرفروشی اور جذبہ شہادت کا مرکز تھی اور آج بھی اسی فکر ودعوت، سلوک ومعرفت کا سرچشمہ بنی ہوئی ہے۔

اسی مسجد کے اطراف میں آباد بابرکت خاندان دائرہ شاہ علم اللہ حسنی اور تکیہ کلاں کے نام سے مشہور ہے اور اسی خاندان کے صاحب ورع وتقویٰ شخص رشید احمد بن خلیل الدین احمد کے گھرانے میں دختر نیک اختر ہمشیرہ مفکر اسلام امۃ العزیز بنت علامہ عبدالحی حسنی رحمۃ اللہ علیہا کے بطن سے حضرت مولانا پیدا ہوئے۔

ابتدائی تعلیم:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے خدا ترس مبارک خاندان کی پارسا خاتون کی گود میں آنکھیں کھولیں اور اپنی نانی خیر النساء بنت ضیاء النبی (والدہ ماجدہ حضرت مفکر اسلامؒ) کے آغوش محبت وشفقت میں پرورش پائی، چنانچہ یہی دونوں عالمہ فاضلہ عارفہ صالحہ خواتین حضرت کی ابتدائی تعلیم کی تکمیل کے لیے سب سے پہلا مدرسہ ثابت ہوئیں، حضرت نے انبیاء کرام، صحابہ عظام اور علماء ربانیین، صالحین کی حکایات انہی کی پاکیزہ زبانوں سے سنیں، جن کے ذریعہ روز اول ہی سے حضرت مولانا کے نہاں خانہ دل میں صلاح وتقویٰ، سنن وآداب، اعلیٰ اخلاق اور جذبہ اتباع سنت کی محبت جاگزیں ہوگئی تھی، اس کے بعد حضرت مولانا نے قرآن مجید اور ابتدائی چیزیں اپنے رشتے دار اساتذہ شیخ ابوبکر حسنی اور شیخ عزیز الرحمٰن حسنی رحمۃ اللہ علیہما سے سیکھیں، پھر رائے بریلی کے مدرسہ الٰہیہ میں اپنی ثانوی تعلیم کی تکمیل کی۔

دین کی اعلیٰ تعلیم:

بعد ازاں حضرت مولانا دین کی اعلیٰ تعلیم کے لیے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں منتقل ہوگئے، جہاں آپ نے عالمیت وفضیلت کا مرحلہ مکمل کر کے ۱۳۵۷ھ مطابق ۱۹۴۸ء میں فراغت حاصل کی، اس دوران آپ نے ایک سال حدیث کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ازہر ہند دار العلوم دیوبند میں بھی وقت گزارا، جہاں شیخ الاسلام مجاہد کبیر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے درس حدیث میں شرکت کرنے اور استفادہ کرنے کا موقع ملا اور حضرت مدنی کی شفقت خاص حاصل ہوئی۔

عملی و تدریسی زندگی:

حضرت مولانا نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز ۱۳۵۸ھ مطابق ۱۹۴۹ء سے کیا، جب کہ آپ کو دار العلوم ندوۃ العلماء کے شعبہ عربی میں بحیثیت معاون استاد (Assistant professor Department of Arabic) مقرر کیا گیا، اس کے بعد آپ نے ۱۹۵۰ء تا آخر ۱۹۵۱ء ایک سال تعلیم و دعوت کی غرض سے حجاز مقدس میں گزارا، وہاں سے واپسی پر ۱۹۵۲ء میں آپ کا دار العلوم ندوۃ العلماء کے شعبہ عربی میں ادیب دوم کی حیثیت سے تقرر کرلیا گیا، تین سال بعد جب کہ مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندوی رحمۃ اللہ علیہ حجاز منتقل ہوگئے تھے، آپ کو ۱۹۵۵ء میں ادیب اول (وکیل) کے عہدہ پر فائز کردیا گیا، پھر ۱۹۷۰ء میں آپ کو عمید کلیۃ اللغۃ العربیۃ (Dean) کی حیثیت سے منتخب کرلیا گیا، اس کے بعد آپ کی مدبرانہ قیادت اور انتظامی صلاحیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۱۹۹۳ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء کا منصب اہتمام آپ کو تفویض کیا گیا، ۱۹۸۸ء میں نائب ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا معین اللہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی خرابی صحت کو دیکھتے ہوئے منصب اہتمام کے ساتھ ہی ساتھ آپ کو نائب ناظم بھی بنادیا گیا اور آپ پوری تن دہی، امانت داری اور عہدوں کے وقار کی پاسداری کے ساتھ تمام خدمات انجام دیتے رہے، یہاں تک کہ ۳۱؍دسمبر ۱۹۹۹ء کو مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے جانکاہ حادثہ وفات کے بعد ندوۃ العلماء کا عہدہ جلیلہ ''ناظم ندوۃ العلماء'' آپ کو تفویض کیا گیا، جس پر تادم حیات برقرار رہتے ہوئے آپ ندوۃ العلماء کے وقار کو بلندیوں کی طرف لے جانے کے ساتھ ہی ساتھ عالمی وملکی سطح پر اسے امتیاز عطا کرتے ہوئے خدائے ذوالجلال والاکرام سے جاملے، نیز حضرت مفکر اسلام علیہ الرحمہ کے جانشین بننے کے ساتھ آپ کو وہ تمام مناصب اور عہدے تفویض کردیے گئے تھے جو حضرت مفکر اسلام کو حاصل تھے، جن میں خاص طور پر عالمی رابطہ ادب اسلامی کا عہدۂ نیابت اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا عہدۂ صدارت قابل ذکر ہے، چنانچہ آپ ۲۰۰۳ء سے تادم حیات برابر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب ہوتے رہے، اس کے علاوہ آپ مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ، دینی وتعلیمی کونسل اتر پردیش لکھنؤ، دار عرفات رائے بریلی کے صدر بھی تھے، ساتھ ہی ساتھ آپ آکسفورڈ یونیورسٹی کے سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز برطانیہ، مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی لکھنؤ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے مشاورتی

بورڈ، دارالمصنفین اعظم گڑھ، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ جیسے مؤقر اداروں کے رکن بھی تھے اور بھی بہت سے اداروں، تنظیموں کے سرپرست اور صدر رہے۔

راہ سلوک و احسان:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے دور کے بلند پایہ مشائخ و مصلحین کی شفقت و زیارت نصیب ہوتی رہی اور خاص طور پر جن کی صحبت حاصل رہی ان میں سرفہرست شیخ عبدالقادر رائے پوری، مولانا یوسف کاندھلوی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی، شیخ طریقت مولانا محمد احمد پرتاب گڑھی اور آپ کے خال معظم مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمہم اللہ تعالیٰ اجمعین جیسی بابرکت شخصیات ہیں، آپ کے صلاح و تقویٰ، طبیعت کی سلامتی، پاکیزہ نفسی اور بے ضرر شخصیت کو خوب سے خوب پرکھتے اور بچشم خود دیکھتے ہوئے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اجازت و خلافت بھی عطا کردی تھی اور آپ حضرت مفکر اسلام کے ساتھ سفر و حضر، علمی و ادبی، ادارتی و انتظامی کاموں میں طویل صحبت باعتماد رفاقت میں مشہورِ زمانہ رہے اور اسی وجہ سے خدا داد طریقہ پر آپ صفات و اخلاق، عہدے و مناصب میں حضرت مفکر اسلام کے سچے جانشین بنے اور بالاتفاق تسلیم بھی کیے گئے۔

تصنیفات و تالیفات:

آپ نے ۱۹۵۹ء میں عربی زبان میں پندرہ روزہ صحیفہ ''الرائد'' جاری کیا جو اپنے آغاز سے لے کر آج تک برابر پابندی سے نکل رہا ہے، جو اپنی معیاری عربی زبان، سادہ و سلیس اسلوب، پر مغز علمی، ادبی اور اصلاحی مضامین و مقالات کی وجہ سے علمی و ادبی حلقوں میں معتبر و معروف شہرت رکھتا ہے۔

ماہانہ علمی رسالہ ''معارف'' اعظم گڑھ کے علاوہ آپ ندوۃ العلماء کے اسٹیج سے نکلنے والے پرچوں میں ماہانہ عالمی عربی مجلّہ ''البعث الاسلامی''، پندرہ روزہ اردو رسالہ ''تعمیر حیات''، ماہانہ رسالہ ''پیام عرفات اردو''، سہ ماہی ''تعمیر افکار''، سہ ماہی انگریزی مجلّہ ''The Fragrance of East'' اور ماہانہ ہندی رسالہ ''سچا راہی'' کے سرپرست بھی رہے۔

عربی و اردو دونوں زبانوں میں آپ کی تصنیفات کم و بیش ۶۰ رتک پہنچتی ہیں جن میں سے مشہور نام یہ ہیں:

عربی تصنیفات:

١- منثورات من أدب العرب
٢- الأدب العربي بين عرض و نقد
٣- تاريخ الأدب العربي: العصر الإسلامي
٤- الأدب الإسلامي و صلته بالحياة
٥- الأدب الاسلامي: فكرته و منهاجه
٦- روائع من الأدب الاسلامي القديم
٧- أضواء على الفقه الإسلامي و مكانة الإجتهاد منه
٨- الغزل الأردي: محاوره ومكانته فى الشعر
٩- أضواء على الأدب الإسلامي
١٠- فى ظلال السيرة
١١- حركة ندوة العلماء: فكرتها و منهاجها
١٢- مقالات فى التربية و المجتمع
١٣- الأمة الإسلامية و منجزاتها
١٤- فى وطن الإمام البخاري
١٥- مختار الشعر العربي (جزئين)
١٦- موافقات و مفارقات فى المدنية الغربية
١٧- فضائل الدعوة إلىٰ الله (تعريب)
١٨- بين التصوف و الحياة (تعريب)

اردو تصنیفات:

۱- دین و ادب
۲- جغرافیہ جزیرۃ العرب
۳- حج و مقامات حج
۴- رہبر انسانیت

۵-قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل
۶-فقہ اسلامی اور عصر جدید
۷-مسلم سماج: ذمہ داریاں اور تقاضے
۸-سماج کی تعلیم وتربیت
۹-عالم اسلام: اندیشے اور امکانات
۱۰-غبار کارواں
۱۱-سمرقند و بخارا کی بازیافت
۱۲-حالاتِ حاضرہ اور مسلمان
۱۳-نقوش سیرت
۱۴-دو مہینے امریکہ میں
۱۵-امت مسلمہ: رہبر اور مثالی امت
۱۶-یادوں کے چراغ
۱۷-اوراق زندگی
۱۸-اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم
۱۹-خطباتِ رابع
۲۰-تحفہ گجرات
۲۱-معلم الانشاء (ثالث)

ان کے علاوہ آپ کے مضامین و مقالات کی ایک بڑی تعداد ہے جو علاقائی، ملکی، عالمی مجلّات واخبارات میں چھپتے رہے اور بہت سے غیر مطبوعہ بھی ہیں، بڑی چھوٹی کتابوں پر بے شمار مقدمات وتقریظات اس کے علاوہ ہیں۔

ویسے تو آپ کی تصنیفات تقریباً تمام ہی اسلامی علوم وفنون کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہیں، مگر آپ کا اصل موضوع اور کار اختصاص ''عربی زبان وادب'' تھا، جس پر آپ کی گراں قدر عربی تالیفات شاہد عدل ہیں۔

اسی لیے عربی زبان وادب میں آپ کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے ۱۹۸۲ء میں حکومت ہند کی طرف سے صدر جمہوریہ ایوارڈ آپ کو تفویض کیا گیا، پھر اگست ۲۰۱۵ء میں آئی او ایس (Institute of Islamic Studies) کی جانب سے شاہ ولی اللہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اخلاق وعادات:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنے پاکیزہ نسب، اعلیٰ خاندانی اخلاق وکردار کے حامل ہونے کے ساتھ ہی ساتھ علم وعمل، ورع وتقویٰ، زہد واخلاص، تواضع وانکساری، شرافت وطہارت، حلم وبردباری، متانت وسنجیدگی، توازن واعتدال، عقلی وفکری پختگی اور حکمت ودور اندیشی میں سلف صالحین کے منہج مستقیم پر گامزن تھے، ان کا میدان کار دار العلوم ندوۃ العلماء کا چپہ چپہ ان کی بے ضرر طبیعت، سادہ لوحی اور پاکیزہ نفسی وبلند اخلاقی کا گواہ ہے، وہ اپنے علمی وعملی دونوں پہلوؤں سے سب کے لیے قابل تقلید نمونہ تھے، بلاشبہ حقیقت پسند پوری ندوی برادری انہیں اپنا شفیق باپ اور ہر دل عزیز رہبر تسلیم کرتی رہی، حضرت مولانا کے مایہ ناز شاگرد رشید بلند پایہ محقق عالمی شہرت یافتہ اسلامی اسکالر ڈاکٹر محمد اکرم ندوی آکسفورڈ لندن لکھتے ہیں:

"وإنی صحبته منذ أکثر من عشرین عاماً فما وجدت أحداً من العلماء و الطلاب فی دار العلوم لندوة العلماء و خارجها یغمزونه فی شیء من العمل و الأخلاق." (بغیة المتابع لأسانید العلامة الشریف محمد الرابع، ص: ۹۱)

(مجھے حضرت الاستاذ کی ۲۰/سال سے زیادہ رفاقت حاصل رہی، اس دوران میں نے دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے طلباء واساتذہ میں سے کسی کو اندرو باہر کہیں بھی حضرت کے کسی کام کسی عادت پر انگلی اٹھاتے اور تنقید کرتے ہوئے نہیں دیکھا)

حضرت کی بے مثال حلم و بردباری:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عادات وخصائل میں سب سے زیادہ نمایاں صفت آپ کی حلم وبردباری اور تحمل واستقامت تھی، آپ کی یہ صفت جو بہت کم اور اعلیٰ ترین مقام ومرتبہ کے حامل لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، ہر وقت اور ہر پہلو سے ہر جگہ دیکھنے کو ملتی تھی، اشتعال وغضب ناکی کے مواقع پر بھی، فتنہ پروروں کی فتنہ انگیزی

کے وقت بھی اور تقدیری آزمائشوں کے مشکل ترین حالات میں بھی!

چنانچہ عالمی وملکی سطح کے اسلام مخالف اقدامات و واقعات پر آپ کی تحمل مزاجی، دوراندیشی اور مصلحت شناسی قابل دید ہوتی تھی، خاص طور پر جب عالم عربی میں انقلابات کا دور گزرا، مسجد اقصیٰ کی مسلسل بے حرمتی اور نہتے فلسطینیوں پر اسرائیلی مظالم کی خونچکاں داستان رقم کی گئی، حجاز مقدس میں علماء و مصلحین کی ظالمانہ گرفتاریاں کی گئیں، اعتدال و رواداری کے نام پر اصالت کے مستند و متوارث ماڈل کو ختم کر کے اباحیت پسندانہ جدید ماڈل کی تنفیذ کی گئی وغیرہ۔

ملکی سطح پر پارلیمانی، عدالتی اور سماجی ہر پہلو سے اسلام و مسلمانوں کے خلاف جب صریح فیصلے اور اقدامات کیے گئے، بابری مسجد کی دل خراش شہادت، یکساں سول کوڈ کو پاس کرنے کی تجویز، ٹرپل طلاق بل جیسے ملی مسائل میں اور جب ۲۰۱۹ء میں ملک کی سب سے بڑی عدلیہ سپریم کورٹ کے ذریعے بابری مسجد کی زمین کے حق ملکیت کے سلسلے میں ظلم و جانبداری پر مبنی صریح ظالمانہ فیصلہ کیا گیا اور پھر ۲۰۱۴ء کے بعد سے مسلسل اسلام و مسلمانوں کے خلاف گھیرا بندی، ظلم و درندگی کے واقعات پیش آتے رہے، ان تمام اشتعال انگیز حالات میں حضرت کی صبر و استقامت، حکمت و دانائی اور اُھون البلیتین کے اصول پر عمل آوری قابل تقلید رہی اور آج جس کا تمام اہل بصیرت اس کا اعتراف کرتے رہے ہیں۔

ایسے ہی دار العلوم ندوۃ العلماء کے انتظامی کاموں میں آپ کے فیصلے نہایت دوراندیش اور دانشمندانہ ہوتے تھے اور تمام پہلوؤں میں دین متین، درست و متوارث عقیدہ اہل سنت والجماعت اور سلف صالحین کے منہج مستقیم اور ادارتی مصالح ملحوظ خاطر رہتے تھے، قریبی گزشتہ برسوں میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں کچھ ایسے ناگفتہ بہ حالات پیش آئے جنھوں نے پوری ندوی برادری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور دار العلوم کے مثالی اتحاد، اعتدال اور مسلکی رواداری کی مضبوط دیوار کو منہدم کرنے اور ندوۃ العلماء کو دو دھڑوں میں تقسیم کرنے کی مذموم کوششیں کی گئیں، ان تمام فتنہ سامانیوں کے درمیان حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی مدبرانہ قیادت، مخلصانہ شخصیت اور متحمل مزاج طبیعت آہنی دیوار بنی رہی، آپ کی خاموش مزاج تدبیر اور ردعمل کی نفسیات سے دوری نے سلگتے فتنوں، بھڑکتے شعلوں کو نہ صرف یہ کہ خاکستر کر دیا بلکہ انھیں خود اپنی موت مرجانے پر مجبور کر دیا اور حضرت کی شخصیت قرآن مجید کی اس آیت کا مصداق بنی رہی:

﴿وَإِن تَصْبِرُواْ وَتَتَّقُواْ لاَ يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئاً إِنَّ اللّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ﴾ (آل عمران: ۱۲۰) (اگر تم صبر و تقویٰ سے کام لیتے رہو گے تو ان کی سازش تم کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکے گی)

اس کے علاوہ حضرت مولانا کا دامن صبر بے حد وسیع تھا اور آپ نے اپنے بڑے مرتبہ کے لحاظ سے قسام ازل کے یہاں سے بہت بڑا دل پایا تھا، چنانچہ آپ کی شخصیت تقدیری آزمائشوں، خدائی فیصلوں میں ہمیشہ رضا بالقضاء کا وہ نمونہ پیش کرتی تھی کہ جس کی نظیر اس دور بدعقیدگی میں عوام الناس تو دور رہے خود خواص میں بھی بمشکل ہی نظر آتی ہے، حضرت مولانا کی حیات ہی میں رفیقہ حیات (ڈاکٹر عبد العلی حسنی رحمۃ اللہ علیہ کی دختر نیک اختر) اور دو دامادوں (مولانا عبد اللہ حسنی، مولانا حمزہ حسنی) اور چھوٹے بھائی (حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی رحمہم اللہ) اسی طرح نوجوانوں کے مربی اور خانوادہ حسنی کے مؤرخ، پختہ قلمکار مولانا سید محمود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے واقعات ایسے تھے جن کو برداشت کرنا اور پوری یکسوئی سے ندوۃ العلماء اور ملک و ملت کے کاموں میں لگے رہنا محض انسانی ہمت و حوصلے سے ممکن نہیں ہے، جب تک اس کے ساتھ خداداد توفیق شامل حال نہ ہو۔

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا یہ پہلو ایسا ہے جس کی شہادت بڑے بڑے نباض لیڈروں، تجربہ کار لوگوں نے دی ہے، راقم سطور نے تاریخ اسلام کے ایک بڑے محقق کی زبان سے از خود سنا کہ ”حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی سراپا حلیم و بردبار شخصیت نے ندوۃ العلماء کے اتحاد کو پارہ پارہ ہونے اور اس کے توازن و اعتدال پر مبنی متوسط مسلک سے منحرف ہونے سے بچا لیا،

ورنہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کی طرح اس کے بھی دو ٹکڑے ہو چکے ہوتے۔‘‘

یہی وجہ ہے کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اس وصف خاص کا سب ہی کو اعتراف تھا، جس کا اظہار حضرت کی حیات طیبہ میں لکھنے والوں نے بھی کیا اور آپ کی وفات پر تعزیتی پیغامات وتاثرات لکھنے والوں نے بھی کیا ہے، حتیٰ کہ غیر مسلم طبقہ کے بعض سینئر رہنماؤں نے بھی اس پر روشنی ڈالتے ہوئے آپ کی وفات پر تعزیت پیش کی ہے (Art of Living Centre) کے سکریٹری گرودیو شری شری روی شنکر اپنے تعزیتی پیغام میں لکھتے ہیں:

’’مولانا رابع حسنی ندوی جی ایک مہان وِدُوان ہی نہیں اَپِتُ سماج کے ایک ایسے رہنما تھے جنہوں نے اپنی اُدارتا اور میتری بھاو سے سب کا دل جیت لیا، سب دھرموں کے لوگوں کے ساتھ ان کا اِسنیہ پوروَک ویوہار انکرڑیہ ہے، ایشور ان کے پریوار و پریے جنوں کو دھیریے اور شکتی دے۔‘‘

ایسے ہی (Hindustan Times Lko) اپنے پیج in memoriam 2023/4/14 میں لکھتا ہے:

“The death of Maulana Syed Mohammad Rabe Hasani Nadwi (93) is a big loss not only for Muslims but for all Indians because he was someone who put the country first while discussing any issue as president of All India Muslim Personal Law Board.’’

حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے اوصاف وکمالات، اخلاق وعادات پر آپ کی وفات ہی کے دن سے مسلسل تعزیتی پیغامات، اجلاس وبیانات کا سلسلہ جاری ہے، جس کی خبریں پرنٹ والیکٹرانک میڈیا میں برابر چھپ رہی ہیں اور معتبر ومؤقر قلمکاروں کی طرف سے تاثرات پر مبنی مضامین ومقالات لکھنے کا بھی سلسلہ بھی چل رہا ہے اور ماہانہ اردو عربی رسالے حضرت کی حیات وخدمات پر خصوصی نمبر شائع کر رہے ہیں، جن کا سلسلہ تادم تحریر جاری ہے، اس سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی نہ صرف سماجی خدمات کا پتہ چلتا ہے، بلکہ یہ مقبولیت عند اللہ کی بھی نمایاں نشانی ہے۔

راقم سطور پر حضرت کی عنایات:

ویسے تو راقم سطور حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے دور طالب علمی ہی سے واقف اور ارادت مند تھا، مگر فضیلت دوم میں براہِ راست حضرتؒ کے روبرو ہونے، دوران درس کتاب کی عبارت پڑھنے اور بعد عشا عرفانی مجالس میں شرکت کرنے کا بار بار موقع ملا تو حضرت کی پدرانہ شفقت اور مزید قربت نصیب ہوئی۔

پھر جب ۲۰۱۵ء میں والدہ ماجدہ کی رفاقت میں حج بیت اللہ کا شرف حاصل ہوا تو جاتے وقت حضرت کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ سفر حج کی سعادت حاصل کرنے کا ارادہ ہے، دعا ونصیحت فرمادیں، تو حضرت بے حد مسرور ہوئے اور مرحوم مولانا سید محمود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے کہا کہ میری کتاب ’’حج ومقامات حج‘‘ لائیے اور پھر کتاب کے سرورق پر دست خود سے یہ لکھ کر ’’برائے عزیزی توحید خاں ندوی سلمہ از مصنف ۱۴۳۶/۱۱/۵ھ‘‘ کتاب عنایت فرمائی مزید برآں خوب دعائیں دیں اور حج وزیارت کے آداب کے سلسلے میں بہت سی نصیحتیں فرمائیں۔

سفر حج کے دوران جب کہ راقم الحروف منیٰ میں ذوالحجہ کی ۸/ تاریخ کو مقیم تھا، تو مولانا مفتی محمد مسعود حسنی ندوی حفظہ اللہ تعالیٰ کو موبائل سے کال کی تو مفتی صاحب نے اس عاجز کو حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے بھی گفتگو کرنے کا موقع دیا، تو حضرت نے موبائل فون پر منیٰ وعرفات کے ارکان وآداب اور وہاں پر کی جانی والی دعاؤں کے سلسلے میں نصیحت فرمائی اور دعاؤں کے اہتمام کی تاکید کی، چونکہ اس سال منیٰ میں بھگدڑ کا دردناک حادثہ اور اس سے چند دنوں پہلے حرم مکی کے اندر کرین گرنے کا حادثہ بھی پیش آیا تھا، اس لیے حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے دوران سفر اپنا اور اپنی والدہ کا خصوصی

خیال رکھنے کی بھی تاکید فرمائی اور خوب دعائیں دیں اور حرم مکی میں سب کے لیے دعائیں کرنے کے لیے ہدایت دی۔

بعد ازاں جب سفر حج سے واپسی ہوئی تو بندہ اس وقت دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شعبہ قضاء وافتاء میں طالب علم تھا، حضرت اقدس کی خدمت میں حاضر ہوا تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ ظہر کی نماز پڑھ کر دارالعلوم کی مسجد سے اترتے ہوئے مہمان خانے تشریف لے جارہے تھے اور اس وقت حضرت تنہا تھے، راقم نے آگے بڑھ کر عرض کیا کہ حضرت سفر حج سے واپسی ہوگئی ہے تو حضرت نے فوراً والہانہ انداز میں اس حقیر کو گلے لگالیا اور خوب دعائیں دیں اور دعا کرنے کے لیے بھی کہا۔

پھر جب ۲۰۱۶ء میں راقم الحروف افتاء کا کورس مکمل کرکے فارغ ہوا تو میدان کار کے انتخاب اور اس میں مشغول ہونے کے سلسلے میں بڑی عجیب کیفیت طاری تھی کہ اب عملی زندگی کا آغاز کہاں اور کیسے کریں، بار بار دل کہتا کہ یہ وقت تمہاری زندگی کا نقطہ تحول (Turning point) ہے، بہت سمجھداری سے قدم اٹھانا، چنانچہ اسی کشمکش میں مبتلا رہا، پھر الہ آباد کے سفر کے دوران شیخ طریقت حضرت مولانا محمد قمر الزماں صاحب الہ آبادی دامت برکاتہم کی خدمت میں الہ آباد حاضری کا موقع ملا تو حضرت نے بڑی ہی شفقت ومحبت کا معاملہ فرمایا، برسبیل تذکرہ ان سے عرض کیا کہ حضرت دعا فرمادیں کہ اب عملی زندگی کا آغاز کرنے جارہے ہیں، خدا تعالیٰ کسی منحرف اقدام سے حفاظت فرمائے اور اس نازک موڑ پر دست گیری فرمائے تو حضرت نے دعائیں بھی دیں اور کہا کہ آپ کو دارالعلوم ندوۃ العلماء ہی کے لیے اپنی خدمات پیش کرنی چاہیے اور میں آپ کی بابت ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (رحمۃ اللہ علیہ) کو اطلاعی خط تحریر کردوں گا کہ وہ نئے انتخاب میں آپ کا بھی خیال رکھیں اور پھر حضرت الہ آبادی دامت برکاتہم نے حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کے نام خط لکھ دیا جو حضرت مولانا کو موصول بھی ہوگیا تھا۔

اسی سال رمضان المبارک میں حسب معمول آخری عشرے میں روحانی استفادہ کے لیے راقم سطور تکیہ پر حاضر ہوا اور حضرت اقدس سے تنہائی میں ملاقات کی اور اس سلسلے میں گزارش کی تو ”حضرت نے فرمایا: شوال میں مہمان خانے میں ملاقات کرلیجیے گا“ چنانچہ بندہ نے حضرت اقدس کی خدمت میں ماہ شوال کے آخری عشرے میں پانچ صفحات پر مشتمل ایک طویل خط تحریر کیا اور جاکر پیش خدمت کردیا، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اس طویل خط کو پڑھا اور ایک دو دن کے بعد مرحوم مولانا سید محمود حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعہ فون کرایا کہ آپ جاکر دفتر نظامت میں ضروری رسمی کارروائی مکمل کرا لیں، حضرت نے آپ کا معہد دار العلوم ندوۃ العلماء سکروری میں بحیثیت استاد تقرر کرلیا ہے اور وہاں پابندی سے کار تدریس میں منہمک ہو جائیں، اس کے بعد سے تاحال بندہ الحمدللہ معہد دار العلوم ندوۃ العلماء سکروری لکھنؤ میں برابر تدریسی فرائض انجام دے رہا ہے۔

راقم الحروف نے یہ معمول بنالیا تھا کہ ہفتے میں دوبار یا کم از کم ایک بار ضرور حضرت اقدس کی خدمت میں شرف مصافحہ و ملاقات کے لیے حاضر ہوتا اور دعائیں لیتا اور یہ سلسلہ حضرت کی وفات کے تین دن پہلے تک جاری رہا، الحمدللہ رب العالمین، چنانچہ دن بدن حضرت کی شفقتیں محبتیں اس بندہ عاجز پر بڑھتی رہیں، یہاں تک کہ جب ۲۰۱۸ء میں رشتہ نکاح طے ہوگیا تو بندہ حضرت اقدس کی خدمت میں حاضر ہوا اور ایک خط کے ذریعے عرض کیا کہ حضرت عقد مسنون طے پا گیا ہے، آنحضرت سے گزارش ہے کہ محفل نکاح میں ایجاب وقبول اپنی بابرکت زبان مبارک سے کرادیں، تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے منظور فرمالیا اور ۶/مارچ ۲۰۱۸ء بروز منگل بوقت بعد نماز ظہر دار العلوم ندوۃ العلماء کی جامع مسجد میں راقم الحروف کو رشتہ نکاح کے بندھن میں باندھ دیا اور مختصر تقریر کے ذریعے اس رشتے کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں آگاہ کیا اور سر پر دست مبارک پھیر کر مبارک باد بھی دی اور خوب دعائیں دیں، پھر بالترتیب ۲۰۱۹ء اور ۲۰۲۰ء میں حضرت اقدس کی دعاؤں کے نتیجے میں راقم الحروف کے گھر میں دولڑکے پیدا ہوئے، بندہ نے انھیں بھی کئی مرتبہ

حضرت اقدس کی خدمت میں لے جا کر دعائیں لیں اور حضرت نے ان بچوں کے سر پر بھی دست مبارک پھیر کر دین و دنیا کی ترقیات کی خوب دعائیں دیں۔

راقم سطور چونکہ لکھنے پڑھنے کا نہ صرف شوقین ہے، بلکہ مسلسل اس میدان میں سرگرم عمل و مصروف بھی رہتا ہے، خدائے رحمٰن و رحیم کی توفیق سے راقم سطور کے ناتواں قلم سے مختلف موضوعات پر ۷۰/ سے زائد مضامین و مقالات اور تا حال تین کتابیں طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں:

۱- طلاق کیا؟ کیوں؟ اور کیسے؟

۲- مسلم معاشرے کے مسائل اور ان کا حل

۳- رمضان کے انوار و برکات

آخر الذکر دونوں کتابوں پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بیش قیمت مقدمے بھی ہیں، جنہیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے باوجود اپنی بے پناہ مشغولیتوں اور جسمانی عوارض و امراض کے تحریر کر کے اس بندہ عاجز پر بے پناہ شفقت و مہربانی کا اظہار فرمایا، بلکہ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے لیے قلم کاری کو مہمیز دی، حوصلہ بخشا، ناتواں کاندھوں کو مضبوط کیا اور یہ حضرت اقدس کی عمومی صفت تھی کہ آپ چھوٹے سے چھوٹے شخص کے معمولی کام کو بھی بہت سراہتے تھے اور آگے بڑھنے میں حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔

ابھی حالیہ رمضان المبارک میں جب ''رمضان کے انوار و برکات'' طبع ہو کر آگئی تو دوسرے عشرے میں راقم اسے لے کر رائے بریلی تکیہ پر حاضر خدمت ہوا، تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے گھر کے اندر زیارت و ملاقات کا شرف عطا فرمایا، دعائیں دیں، نصیحتیں کیں اور پھر ابھی جب کہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ اپنی بیماری کی شدت میں مہمان خانے میں مکمل طور پر صاحب فراش ہو گئے تھے، بندہ عیادت کی غرض سے حاضر خدمت ہوا تو بس دور ہی دور سے حضرت نے کئی مرتبہ دیکھا، خاموش رہے، ارد گرد ڈاکٹروں کی ٹیم مصروف علاج تھی اور بندہ بھی غم و الم میں ڈوبے دل، آنسوؤں سے بھیگی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے واپس آ گیا اور بس حضرت اقدس کی زندگی کی یہ آخری زیارت و ملاقات تھی، کسے کیا خبر تھی کہ یہ زیارت و دیدار آخری دیدار ثابت ہوگا، اس کے بعد یہ آنکھیں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی دید سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائیں گی اور حضرت کی پدرانہ شفقتیں، مخلصانہ محبتیں، حکیمانہ نصیحتیں ہمیشہ یاد آتی رہیں گی، اب حضرت کی دید و ملاقات ممکن نہ ہو سکے گی، اب تو سب چیزیں دیدہ سے شنیدہ ہو جائیں گی۔

حقیقت یہ ہے کہ راقم سطور کو جو کچھ بھی دین و دنیا کا حصہ حاصل ہے، لکھنے پڑھنے کی صلاحیت ہے، اہل علم و ادب کے درمیان رسائی ہو سکی ہے، دار العلوم ندوۃ العلماء میں کام کرنے اور خرم نگر لکھنؤ کی مسجد میں امامت و خطابت کے مواقع ملے ہیں، رشتہ نکاح اور اس کی برکات حاصل ہیں، یہ سب بعد از فضل الٰہی حضرت رحمۃ اللہ علیہ ہی کی توجہات، عنایات اور دعاؤں کا فیض ہے، ورنہ راقم کبھی اس لائق نہیں تھا کہ حضرت کی سرپرستی ملتی، خانوادۂ رسول ﷺ سے نسبت رکھنے والے پاکیزہ نفوس کو پڑھنے، دیکھنے، برتنے اور ان کا زبانی و قلمی تذکرہ کرنے کا اعزاز حاصل ہوتا۔

خدا تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ بار الٰہا! ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے جنت الفردوس میں درجات بلند فرما، ان کے نیک کاموں، آل و اولاد، فیوض و برکات میں خوب برکت عطا فرما اور ہم سب کو بالخصوص ندوۃ العلماء سے وابستہ تمام اداروں کو خانوادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ کے نفوسِ قدسیہ کی سرپرستی میں خوب سے خوب علم و ادب، فکر و دعوت کی خدمت کرنے کی توفیق نصیب فرما اور ہمارے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین، مفکر اسلام علیہ الرحمہ کے پوتے، ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی دامت برکاتہم العالیہ کی تمام شرور و فتن سے حفاظت فرما، ان کی صحت و تندرستی میں بہتری عطا فرما اور ان کی حکیمانہ قیادت میں دین برحق اور ندوۃ العلماء کے پیغام کو پوری دنیا میں عام کرنے کی توفیق نصیب فرما۔ آمین یارب العالمین!

نبوت کے یہ وارث ہیں یہی ہیں ظل رحمانی

مفتی صابر حسین ندوی
(جامعہ ضیاء العلوم کنڈلور- کرناٹک)

ہاتھوں میں کپکپاہٹ ہے، بلکہ پورے وجود پر رعشہ طاری ہے، آنکھوں کے سامنے دھندلکا گویا سب کچھ فنا ہو چکا ہے، سالار نے ہمارا ہاتھ چھوڑ دیا، رہنما اور رہ رو چل بسا، اب کیسے قرار آئے، کیسے خود کو تسلی دی جائے، زبان تو خود لڑکھڑا رہی ہے، اس میں سکت کہاں کہ وہ کچھ کہے، کچھ بولے اور دل کو بہلائے، حزن کا ایسا عالم ہے جو گوشت و پوست میں سرایت کر گیا ہے، اب خون کی جگہ غم بہہ رہا ہے، اپنے مرشد وسید کو کھو دینے کا درد امنڈ رہا ہے، عقل وفکر پر بھی گویا پردہ پڑ گیا ہے، کچھ لکھنا چاہتا ہوں، کچھ بولنا چاہتا ہوں، مگر کیسے لکھوں؟ الفاظ ساتھ نہیں دے رہے، جملے بناتا ہوں تو وہ حرف حرف بکھر جاتے ہیں، ہر حرف کے پیچھے بھاگتا ہوں، کہتا ہوں کہ رکو مجھے مرثیہ لکھنا ہے، اپنے استاد و مربی اور شیخ کا ذکر حسنہ کر کے خود کو تسلی دینی ہے، اپنی تعزیت کرنی ہے، مگر الفاظ ہیں کہ ہاتھ نہیں لگتے، علم و فن سے نا آشنا لوگ کیا جانیں کہ وہ کس زمانے اور کس کی قیادت و سیادت اور محبت میں زندگی گزار رہے تھے، جواب نہیں ہے۔

میرے تو دل و دماغ پر بس ایک ہی تصویر ہے، سوشل میڈیا کا معائنہ کرتا ہوں، حضرت والا کی تصاویر دیکھتا ہوں تو پھر دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، بعضوں نے آپ کی وفات کے بعد کی تصویر شیئر کی ہے، آہ!! دل کٹ کر رہ گیا، مولانا کے تعلق سے اکثر بیماری اور ناسازی کی خبریں ملتی تھی، لیکن ہر بار یہی امید رہتی تھی کہ مولانا کی طبیعت ان شاء اللہ بحال ہو جائے گی، الحمد للہ مولانا کسی بڑی بیماری سے دوچار نہ تھے، نقاہت' کمزوری اور ضعف تھا، مگر اس دفعہ یہ بیماری آپ کو سفر آخرت پر لے گئی۔

جب ان کی یادوں کا پٹارا کھلنے لگتا ہے، تو تعلیمی زمانہ پھر مختلف مواقع پر آپ سے ملاقات' شفقت و محبت یاد آنے لگتی ہے، ان کی مسکراہٹ، ان کا بولنا، چلنا، دیکھنا، کہنا اور سادگی و بے تکلفی، تواضع وانکساری، خشوع وخضوع، عاجزی، تصنع سے دوری، مبالغہ آرائی سے پرہیز، شاف وصفاف وجود، جو دیکھے لگے کہ فرشتہ ہے، محسوس ہو کہ کوئی ایسی بزرگ شخصیت ہے جو اسلاف کے قافلے سے بچھڑ گئی ہے اور ہم خوش نصیبوں کو سعادت کی گھڑیاں عنایت کرنے، مادیت میں روحانیت کی حقیقت جاننے، امیری میں فقیری کی زندگی جینے کا سلیقہ سکھانے کے لیے روک دیا گیا ہے، ان کے پاس کیا نہیں تھا؟ وہ چاہتے تو یقیناً اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کی گاڑیاں، فلیٹ، مکان اور دوکان ہوتی، دنیا کی تمام آسائشوں سے لیس ہوتے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں اور دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ ندوۃ العلماء کے مہمان خانے سے لے کر تکیہ کلاں رائے بریلی تک ہر جگہ یوں رہے کہ گویا دنیا کو وہ بقدر ضرورت ہی استعمال کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنی منزل اور مقصد حقیقی کی طرف گامزن ہیں، انہیں صرف رفیق اعلیٰ کی یاد ستاتی ہے اور اس سے ملنے کو بے تاب ہیں۔، آج اس بے تابی کو قرار مل گیا اور اس بے چینی کو سکون نصیب ہو گیا۔

تجہیز و وتکفین کا منظر:

آپ کی تجہیز و تکفین کا وقت طے کر دیا گیا تھا، پہلی نماز جنازہ ندوہ میں عشاء بعد اور دوسری نماز جنازہ آپ کے مولد تکیہ کلاں رائے

بریلی میں فجر بعد تھی، پورا ندوہ کھچا کھچ بھرا ہوا، اسٹریٹ لائٹ کے درمیان ملال وحزن سے بھرپور چہرے دیکھے جاسکتے تھے، نڈھال اور غم زدہ نگاہیں اپنے مرشد کی طرف لگی ہوئی تھیں، نہ جانے کون لوگ تھے، اللہ انہیں سلامت رکھے کہ انہوں نے ہم عشاق کے لیے لائیو کوریج کی تھی، جنہیں دیکھ کر شوق کا پرندہ پھڑ پھڑا رہا تھا، بے تاب ہو رہا تھا کہ کیسے اور کسی بھی طرح پرواز کرے، دوری' مسافت کی تہیں لپیٹ دی جائیں اور ان کے در پر حاضری نصیب ہوجائے، کاش! کوئی سلطنت سلیمان (علیہ السلام) کا جن حاضر خدمت ہوتا اور وہ پلک جھپکتے ہی مجھے ان عاشقوں کے جھنڈ میں شامل کر دیتا، اللہ اللہ! کیا نظارہ تھا، ہر طرف انسان، ہر جانب چلتی پھرتی سانسیں، ندوۃ العلماء کی جامع مسجد سے لے کر ہر خالی جگہ پر آدم زاد ہیں، چیونٹی کے گزرنے کی بھی جگہ نہیں ہے، چشم فلک یہ کیسا منظر دیکھ رہا تھا، اسے بھی رشک ہو رہا ہوگا کہ یہ کیسا عاشق رسول ﷺ، خادم دین اور محبوب ملت ہے، جس کے لیے پوری امت بے قرار ہے، چہار جانب غم کی چادر تنی ہوئی ہے، خموشی سے سینہ پھٹ رہا ہے، ہونٹ ہلتے نہیں، بدن پر قابو نہیں، وہ سب بے ساختہ ایڑیوں کے بل اٹھ اٹھ کر دیکھ رہے ہیں کہ بس ادھر یا ادھر سے مرشد کا جنازہ لایا جائے گا، بس آخری دیدار مل جائے اور کسی طرح اس تڑپتے دل کو سکون میسر ہو۔

رمضان کا مبارک مہینہ ہے، آخری عشرہ ہے، بعضوں نے اعتکاف کیا ہوگا، بعضے اپنی لاغری اور کمزوری کی بنا پر چلنے پھرنے سے قاصر ہوں گے، سواریوں کی دشواریاں، طویل مسافت اور تقاضے بھی سروں پر ہوں گے، لیکن اس کے باوجود پورا اندرون ندوہ اور صدر دروازہ سے باہر لوگوں کا ہجوم ہے، بھیڑ سنبھل نہیں رہی، ایک صاحب لوگوں کو خطاب کر رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ اپنے آپ کو سنبھالیں، اللہ تعالیٰ کا ذکر کریں، خود کو جمائے رکھیں کہ تبھی جامع مسجد کے بغل سے آپ کا جنازہ نمودار ہوا، عاشقین اپنے مرشد کا جنازہ اٹھائے ہوئے ہیں، جن راہوں سے چل کر جایا کرتے تھے، جہاں انہوں نے آمد و رفت میں تقریباً ایک عہد گزارا تھا، آج انہی راستوں پر انہیں ایک جنازہ میں لایا جا رہا ہے، یہ کیسا منظر ہے کہ ہر کسی کے پاؤں اکھڑ رہے ہیں، آنکھیں نم ہیں، دل کچوکے لگا رہا ہے کہ صابر! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تم اپنے مرشد' ناظم کے سرہانے کیوں نہیں؟ میں اسے کیسے سمجھاؤں کہ زندگی نے ہم جیسوں کو تھکا رکھا ہے، اپنی پیچیدگیوں میں الجھا رکھا ہے، ہم سانس بھی ادھار لے کر چلتے پھرتے ہیں، اس کشمکش میں حضرت مولانا کا چہرہ دیکھ کر، ان کی تگ و دو اور ان کا سوز و گداز محسوس کر کے تسلی لیا کرتے تھے، مگر اب وہ بھی چلے گئے، آہ مولا! رات کے گیارہ بج یا بارہ بجنے کو ہیں، لیکن جنازے کے پیچھے چلنے والے، سواریاں، گاڑیاں دیکھ کر لگتا نہیں تھا کہ نصف شب گزر چکی ہے، لکھنؤ سے فارغ ہو کر رائے بریلی کی طرف لے جا رہے ہیں، غمگین آنکھیں لیے اور بھاری دل کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، ورچول نظارہ ہی ایسا تھا کہ دل بیٹھا جا رہا تھا، تو سوچیے! جنہوں نے اس منظر کا مشاہدہ کیا ہے وہ خوش نصیب بھی ہیں اور مضبوط دل والے بھی، حضرت مولانا کو معروف و مشہور بستی تکیہ کلاں لے جایا گیا، وہاں دور دراز سے لوگ پہنچے ہوئے تھے، وہ مسجد جس کی بنیاد شاہ علم اللہ رحمہ اللہ نے رکھی تھی، جس کو کعبہ کے طرز پر بنایا گیا تھا، وہاں سے لے کر تمام جگہوں پر انسان ہی انسان ہیں، حضرت مولانا بلال حسنی ندوی مدظلہ کا پرسوز بیان بھی سنا، وہ رندوں کو تسلی دے رہے تھے، اللہ تعالیٰ کی منشا و مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے اور دین کی حفاظت اور دین داری پیدا کرنے کا پیغام عام کر رہے تھے، یہ سارے مناظر دل چیر رہے تھے، ایک ایک لمحہ مشکل ہو رہا تھا، کبھی کبھی لگتا کہ اب ان نظاروں کو نہ دیکھوں گا، مگر پھر دل نہیں مانتا تھا، سوشل میڈیا کو پھر کھنگالنا شروع کرتا اور انہی مناظر سے خود کو تسلی دیتا، اللہ! کیا ایک ہی شخص تھا اس جہاں میں۔

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا
ہے نسیم بہار گرد آلود

خاک اڑتی ہے اس مکان میں کیا
یہ مجھے چین کیوں نہیں پڑتا
ایک ہی شخص تھا جہان میں کیا

زعفرانیت کے منجدھار میں:

اس دنیا میں جو ہونا ہے اسے کوئی ٹال نہیں سکتا، زندگی اور موت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، انسان جیتا ہے اور بھرپور جیتا ہے، لیکن موت اس کی تلاش میں لگی رہتی ہے کہ ایک دن یہ حادثہ واقع ہو ہی جاتا ہے، قرآن مجید کی یہ آیت اسی حقیقت کو بتلاتی ہے:

﴿أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ﴾ (النساء: ۷۸) (تم جہاں کہیں بھی رہو، موت تو تم کو آ پکڑ کر رہے گی، گو مضبوط قلعوں میں کیوں نہ ہو)

دوام صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ذات کو ہے، دنیا میں موجود بلکہ ہر مخلوق خواہ وہ اس دنیا میں ہو یا نہ ہو اسے موت آنی ہے اور صرف رب ذوالجلال کی بادشاہت قائم رہنی ہے، فرمایا گیا: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ، وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَ الْإِكْرَامِ﴾ (الرحمن: ۲۶-۲۷) (جو کچھ بھی زمین پر ہے سب فنا ہونے والا ہے اور آپ کے رب کی بزرگی وعظمت والی ذات ہی باقی رہ جائے گی)

چنانچہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ نے کتنے سال کی عمر پائی ہے، اگر کوئی عمر نوح بھی پالے تب بھی اپنی آخری آرام گاہ کی طرف لوٹ ہی جائے گا، وہی اس کا دائمی اور اصل ٹھکانہ ہے، استاذ محترم مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ نے بھرپور زندگی پائی، تقریباً ۹۴ رسال کی سرسبز وشاداب زندگی گزار کر داعی اجل کو لبیک کہا، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ اس وقت واقع ہوا جب ملت منجدھار میں پھنسی ہوئی ہے، ہندو احیائت اور زعفرانیت تلے کچلی جارہی ہے، ہر طرف ایک عجیب سناٹا ہے، بد حواسی اور ناامیدی کا دور دوراں ہے، ارتداد کی لہر زوروں پر ہے، آر ایس ایس ملک کو ہندو راشٹر بنانے اور اس سے پہلے مسلمانوں کو لقمہ تر سمجھ کر کچا چبانے کو بے قرار ہے، ہجومی دہشت گردی کی جارہی ہے، متحدہ طور پر مسلم سماج میں پائی جانے والی تمام اچھائیوں، مذہبی ثقافتوں اور اسلامی تعلیمات وغیرت کو نشانہ بنارہی ہے، ہم یہ نہیں کہتے کہ مولانا ہیڈگوار اور گرو گوالکر کی تحریک کی جڑ کاٹ دیتے، لیکن یہ بھی قبول کرنا پڑے گا کہ مولانا کا وجود ان فاشسٹ افکار کے مالکان کے لیے روڑہ تھی، وہ جانتے تھے کہ ایک عظیم ہستی ان کے سامنے ہے، جس نے جنگ آزادی سے قبل اور بعد کا دور دیکھا ہے، جو سید احمد شہید سے لے کر انفاس علی کی جاں نشینی رکھتا ہے، جس نے مشرق ومغرب کے میخانے دیکھے ہیں، وہ اگر چپ ہے تو سلامتی ہے، اگر وہ بولے تو زمانہ خموش ہوجائے، چنانچہ ایسے میں جو واقعات سالوں میں ہوتے مولانا کا سایہ اٹھ جانے کی وجہ سے وہ جلد از جلد ہوں گے، کیوں کہ سایہ نہ ہو تو دھوپ بہت تیز لگتی ہے۔

سب سے بڑا خطرہ مسلم پرسنل لا کی جانب ہے، ہندو احیائیت نے یکساں سول کوڈ کی تیاری کرلی ہے، امت شاہ متعدد دفعہ کہہ چکے ہیں، ایک ملک ایک قانون، یقیناً اس کا خمیازہ دیگر تمام مذاہب اور مختلف ثقافت رکھنے والی قوموں کو بھگتنا پڑے گا، لیکن اس کا سب سے بڑا نقصان مسلمانوں کو اٹھانا ہوگا، مولانا نے سنہ ۲۰۰۲ء میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ کی وفات کے بعد مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت سنبھالی، تب سے ہی آپ نے اپنی حیات میں اس موضوع پر بیانات دیے تھے اور ملک کے سربراہان کو آگاہ کیا تھا کہ اگر ملک میں یکساں سول کوڈ نافذ کیا گیا تو اس کی بنیاد ہل جائے گی، خصوصاً مولانا مسلم پرسنل لا کے تعلق سے حکومت اور فاشسٹ سوچ کے خلاف صاف صاف کہہ دیتے کہ لفظ مسلم سے واویلا کرنا صحیح نہیں ہے، یہ دستور اور جمہوری طرز پر ہے، پچھلے کچھ عرصے سے ملک میں بڑی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں، خصوصاً ۲۰۱۴ء کے بعد بی جے پی کی سیاست نے ملک کی باگ ڈور سنبھالی تو اس کے بعد سے ملکی ڈھانچہ اس تیز رفتاری سے بدلا جتنا پچھلے ستر سال سے بھی نہ بدلا

تھا، مولانا نے اپنی پیری اور ضعف کے ساتھ مشکل ترین اوقات میں مسلمانوں کو ڈھارس بندھائی، ان کی صفوں کو متحد رکھنے کی کوشش کی اور غیر سماجی افکار جو دراندازی کرنا چاہتے تھے انہیں روکے رکھا، مولانا ہی کی شخصیت تھی کہ ندوہ میں تمام سیاست دان جمع ہوجاتے تھے، زعفرانیت کا رنگ گہرا ہوجانے کے بعد بھی بی جے پی کے سینئر لیڈران راجناتھ سنگھ جیسے لوگ مولانا کے پاس آتے، ملک کے احوال پر چرچا ہوتی اور آپ مناسب نصیحتیں کرتے، مولانا کی وفات سے ایک بہت بڑا خلا پایا جارہا ہے جو پرسنل لا بورڈ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو ہمت وقوت دے، انہیں بتلائے کہ ہم ہر حال میں جی لیں گے، لیکن اسلامی اقدار سے سمجھوتہ نہیں کریں گے، مولانا نے بارہا بیانات دیے ہیں جن میں لوگوں کو متوجہ کیا کہ ہم دین کی کسی بات سے انحراف اور اس میں دخل اندازی برداشت نہ کریں گے، مولانا کا وجود ہی لوگوں کو ہمت دیتا تھا، مگر وہ ہمت زمین تلے دفن ہوچکی ہے، خصوصاً اس وقت جب کہ زعفرانیت ایک نئے رنگ وڈھنگ میں سر اٹھانے کو ہے، ۲۰۲۴ء کے عام انتخابات سر پر ہیں، مسلمانوں کو سیاست کی چکی میں پیسا جائے گا اور ان کے سروں کو رسوا کیا جائے گا، ممکن ہے کہ دنگے فساد بھی ہوں مگر اب کوئی چہرہ نہیں جس سے تسلی لیں اور امید لگائیں کہ نہیں وہ محبوب چہرہ ابھی سلامت رکھے اور امت کا ناخدا زندہ ہے۔

رہنے کو سدا دہر میں آتا نہیں کوئی
تم جیسے گئے ایسے بھی جاتا نہیں کوئی

حضرت مولانا رحمہ اللہ کی صورت میں علم وفضل کا سپاہی بھی رخصت ہوگیا، جنہیں دیکھ کر اسلاف کی یاد آئے، ان کے کارنامے، ان کی عبادات، ریاضتیں، ان کی جفاکشی اور بے لوثی یاد آئے وہ آخری اینٹ بھی گرگئی ہے، جس دیوار سے امت نے خود کو صدہا سال لگایے رکھا، اپنے آپ کو جس کی شفقت ومحبت اور خلوص میں چھپائے رکھا، وہ پردہ بھی چاک ہوگیا، علم وفن کا وہ منبع جو پچھلے کئی دہائیوں سے روشن تھا بجھ گیا، دنیا کے ہر خطے میں مولانا کے شاگرد ہیں، یونیورسٹیاں، جامعات، مدارس ومکاتب ہر کہیں آپ سے فیض اٹھانے والے، آپ کو دیکھ کر سیکھنے والے پائے جاتے ہیں، آپ استاذ العلماء والصلحاء تھے، راقم خود اگر اپنی علمی سند شمار کرے تو کئی سندیں مل جائیں گی، کئی واسطے بھی ہوجائیں گے، مگر یہ بندہ کے لیے سعادت کی بات ہے کہ اس نے آپ سے براہ راست استفادہ کیا ہے، راقم کی آخری ملاقات مجلس تحقیقات شرعیہ کی جانب سے ۲۳؍نومبر ۲۰۲۲ء کو منعقدہ سمینار کے موقع پر ہوئی، اس وقت بندہ نے اپنے تاثرات نقل کیے تھے، کچھ حذف واضافہ کے ساتھ پیش خدمت ہیں:

ندوۃ العلماء کی ضرورت پہلے سے بھی زیادہ ہے، توازن، اعتدال اور رواداری ومحبت، علماء کے درمیان اتفاق وباہمی تعاون اور تعلقات کی بحالی، عوام کی قیادت، مصالح واحوال کو سامنے رکھتے ہوئے قوم کی رہبری یہ سب کام وقت کی ضرورت ہے، مگر ندوہ اس سلسلہ میں کہاں تک کامیاب ہے یہ ایک تحقیق کا موضوع ہے، اس تحریک کی سربراہی مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے سر تھی، خیال تھا کہ مولانا کا تذکرہ بحیثیت ناظم ندوہ مستقل طور پر کیا جائے، لیکن اس سے زیادہ مولانا خود کو ایک معلم کہلانا پسند کرتے ہیں، انہیں خوشی ہوگی کہ انہیں مربی ومعلم کی فہرست میں یاد کیا جائے، مولانا کی زندگی ایک صدی پر محیط تھی، انہوں نے ہندوستان کو بنتے بگڑتے، فساد کی زد میں جلتے اور ٹکنالوجی میں ترقی کرتے، بھوک مری اور گرین ریولوشن تک سب کچھ دیکھا تھا، مسلمانوں کی بھی تاریخ ان کی نگاہوں کے سامنے تھی، ہندوانہ تحریک، مسلم پرسنل لا کی جدوجہد اور اسلامی تشخص کی جنگ کے وہ گواہ ہیں، خصوصاً برطانوی سامراج میں مسلمانوں کی کاوشیں، آزادی کے بعد ان کی لیت ولعل اور پھر خود کو کانگریس کے سامنے گھٹنے کے بل بٹھا دینے کی مکمل تاریخ وہ جانتے تھے، اسی طرح ان کے دینی وعلمی عروج وزوال سے بھی واقف تھے، مدارس کا قیام، ضرورت اور علماء کی ذمہ داریاں پوری کرنے یا نہ کرنے

کی صورت میں نتائج سے اچھی طرح آگاہ تھے، مولانا نے مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی صحبت پائی، ان کی تربیت ونگرانی سے فیض اٹھایا، مفکر اسلام ایک عالمی شخصیت تھے، فکر اسلامی کی نمائندگی ان سے بہتر کون کرسکتا تھا، آپ نے ان کے ساتھ سفر وحضر میں وقت گزارا تھا، علمی کاموں میں معاون بنے ہیں اور قیادت وسیادت کا فن انہی سے سیکھا تھا، مولانا آبروئے امت تھے، ہندوستان میں مسلمانوں کی آڑ اور ندوہ کے مضبوط ستون بھی تھے، مولانا ہمارے استاد تھے، آپ نے "مختار الشعر العربي" اور "فقه السيـرة" پڑھائی ہے، اول الذکر کتاب لے کر ہم مہمان خانہ جاتے تھے، دوسری کتاب کبھی مسجد میں تو کبھی مہمان خانے میں پڑھاتے تھے، مولانا دونوں ہی موضوع پر مہارت رکھتے تھے، سیرت النبی ﷺ پر آپ نے سراجاً منیراً کے نام سے ضخیم کتاب لکھی ہے، جو عربی اردو دونوں زبانوں میں ہے، اس کے علاوہ متعدد کتب ورسائل ہیں، آپ عالم عرب کی جغرافیائی، سماجی اور تاریخی وتہذیبی احوال پر سند کا درجہ رکھتے تھے، ان کی کتاب جزیرۃ العرب سبھی نے پڑھی ہوگی، مولانا درس کے دوران سیرت کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے تھے اور ان میں سے کوئی ایک نکتہ لے کر بات ہوتی تھی، عام طور پر مفکر اسلام کی کتاب "السيرة النبوية" سامنے رہتی تھی، دوسری کتاب کا درس بھی بڑا ہی دلچسپ ہوتا تھا، آپ ایک ایک شعر کی تشریح کرتے تھے، عربی میں ہی مختلف الفاظ سے سمجھاتے تھے، خصوصاً لفظ کی حقیقت اور اس کے استعمال کو موضوع بناتے تھے، زمانہ جاہلیت میں ان کا استعمال اور زمانہ اسلام میں اس کی نئی جہت کے بارے میں بتاتے تھے۔

الفاظ کے خاصے پر ایسا جامع کلام کرتے کہ پورا گھنٹہ نکل جاتا تھا، جب جنگوں کی بات ہوتی اور اشعار میں موجود تلوار، گھوڑے، میدان جنگ اور ان کی تصویر سازی کی بات آتی تو لفظ کو کھول کھول یوں رکھتے تھے کہ میدان جنگ سامنے ہو، مگر جب مولانا امرء القیس کی شاعری پر بحث کرتے تو ان کے چہرے سے حیا کے موتی چمکتے ہوئے دکھائی دیتے، دراصل امرء القیس عرب زبان کا بدنام زمانہ شاعر ہے، جس کے کلام کی کوئی نظیر نہیں، لیکن وہ پراگندہ خیال شخص تھا، عشق ومحبت اور رخسار ولب کا رَسیا تھا، مگر اس دوران مولانا کا طرز دیکھنے کے قابل ہوتا تھا، اس کے علاوہ مولانا کی مجلس عشاء کے بعد لگتی تھی تو گاہے بگاہے حاضر ہونے سعادت حاصل ہوتی، یہ مجلس بڑی گراں قدر ہوتی تھی، اس میں علماء بھی جمع ہوتے اور طلباء بھی، حضرت مولانا سعید الرحمٰن صاحب ندوی، مولانا فیصل صاحب ندوی، مولانا عبدالسلام صاحب ندوی وغیرہ اس مجلس کی رونق بڑھاتے تھے، مولانا نذر الحفیظ صاحب ندوی بھی اکثر دیکھے جاتے تھے، ان بزرگوں کے درمیان تعلقات دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی، وہ ایک دوسرے کی قدردانی میں رطب اللسان رہتے تھے، مہتمم صاحب کا یہ حال تھا کہ وہ مولانا کی مجلس میں گھٹنے کی مجبوری کے باوجود پورے احترام کے ساتھ بیٹھتے اور اگر انہیں دوران مجلس جانا پڑ جائے تو بڑی عاجزی وانکساری کے ساتھ اجازت لیتے اور دبے پاؤں باہر آتے، مولانا کا درس ہو یا مجلس جب بھی ان کے آس پاس رہیے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا تھا، ان کی ایک ایک ادا کچھ نہ کچھ سکھاتی تھی، ایک دفعہ ایک طالب علم تعلیم کے دوران سامنے دوزانو بیٹھا ہوا جھپکی لینے لگا، مولانا نے اپنی آواز بلند کی، وہ ہوشیار ہوا، مگر پھر غنودگی کا شکار ہوگیا، مولانا نے اس طرح دو یا تین مرتبہ کیا، جب یہ طے ہوگیا کہ یہ باز نہیں آنے والا تو مولانا نے اپنا پہلو بدل لیا، واقعی ظرف بلند ہونا چاہیے، نظر انداز کرنے اور اپنے آپ کو صرف عمر سے ہی نہیں بلکہ کام اور فکر سے بڑا بنانا چاہیے۔

خیر! حضرت مولاناؒ مجلس تحقیقات شرعیہ کے دوروزہ سمینار کی کسی بھی نشست میں شرکت نہ کر سکے، حالانکہ آپ نے افتتاحی کلمات لکھوائے تھے، مولانا نے املاء کروایا تھا، جو بہت جامع تھا۔

زہے نصیب! مولانا کو کچھ افاقہ ہوا تو ان سے ملاقات کی ایک سبیل نکلی، مگر نقاہت کے سبب تفصیلی ملاقات اور استفادہ کی گنجائش نہیں تھی، راقم الحروف کے لیے تو یہی کافی تھا کہ میر کارواں کا دیدار ہو،

جن آنکھوں نے ایک صدی دیکھی ہے، انہیں ہم بھی دیکھیں اور ان سے دعائیں حاصل کریں، مولانا موسم سرما کی خنکی میں دھوپ کی تپش سے محظوظ ہورہے تھے، مہمان خانے کی بغل والی عمارت میں تشریف رکھتے تھے، ان دنوں یہاں سابق ناظر عام اور نائب ناظم-موجودہ ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا بلال عبدالحی حسنی ندوی مدظلہ ٹھہرتے تھے- مولانا سے بھی یہیں سلام کلام کی نوبت آئی تھی، اندر داخل ہوا تو مولانا سورج کی روشنی میں ایک بستر پر نیم دراز آرام فرمارہے تھے، کئی تکیے لگائے، گرم کپڑوں میں ملبوس، بے تکلف اور چہرے پر مسکراہٹ لیے ایک بزرگ عالم دین سے محو گفتگو تھے، وہ مولانا کو عربی اشعار سنارہے تھے، ساتھ ہی ساتھ ان اشعار کی معنویت اور بعض ادبی و بلاغی نوک و پلک پر بات ہورہی تھی، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خلیج میں کہیں مقیم ہیں، ایک دو قدم بڑھا اور مولانا کے سامنے ہولیا، انہیں تپاک سے عقیدت مندانہ سلام کیا، مصافحہ کرتے ہوئے اپنی کتابیں ''فقہ اسلامی کی تدوین جدید- ضرورت و اہمیت اور بنیادی خد و خال'' ''فقہ مقارن: ایک مطالعہ'' ''مقاصد شریعت: ایک مطالعہ'' پیش کیں، مولانا نے خوشی کا اظہار فرمایا اور خوب دعاؤں سے نوازا، وقت ایسا نہیں تھا کہ وہاں مزید ٹھہرتا، ملاقات کرنے والوں کی بھیڑ تھی، چنانچہ جلد ہی وہاں سے رخصت ہوا، مگر ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ پھر مولانا نے راقم کی تازہ تالیف ''صدائے فلسطین'' پر مقدمہ درج فرمایا، جو مولانا کی طرف سے ایک بیش قیمتی تحفہ قرار پایا، مولانا سے ملاقات کرکے دلی خوشی ملی، مولانا اس عمر میں بھی بشاش تھے، انہیں جدید دور کی متعدد بیماریاں نہیں بلکہ ضعف تھا، دماغی اعتبار سے پوری طرح حاضر، فکری نمو میں کوئی کمی نہیں اور علمی کاموں سے شغف بھی جاری تھا، اخیر وقت تک مولانا کی کوئی نہ کوئی کتاب آتی رہتی، کسی نہ کسی موضوع پر خامہ فرسائی فرماتے رہتے۔

اب مولانا اللہ رب العالمین کی بارگاہ میں پہنچ چکے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ سے امید ہے کہ حضرت مولاناؒ کو اپنی جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے گا، ان کی خدمات کو قبول کرتے ہوئے اپنے نیک و صالح بندوں میں شامل کرے گا۔ آمین!

مسئلہ فلسطین اور مسلمانوں کی بے چینی

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''مسئلہ فلسطین ایسا موضوع ہے کہ جب یہ چھڑتا ہے تو آنکھیں اشک بار ہوجاتی ہیں، دل میں ایک کسک اٹھتی ہے، پھر یہ کسک ایک آہ بن کر زبان پر آجاتی ہے، غصہ غیروں پر تو آتا ہے' اپنوں پر بھی آتا ہے، ایک طرف پوری منصوبہ بندی تھی، تو دوسری طرف انتہائی سادہ لوحی، اس کا جو نتیجہ نکلنا تھا وہ نکلا، جس کا وطن تھا وہ بے وطن ہوا، جس کا گھر تھا وہ بے گھر ہوا، بڑی طاقتیں پوری طرح اس ظلم و ناانصافی میں شریک رہیں، بلکہ اس غیر قانونی اور غیر انسانی عمل کی کھل کر سرپرستی کرتی رہیں۔ اپنے اس چھینے ہوئے حق اور غصب کی گئی زمین کو لینے کے لیے جو کوششیں کی گئیں، عوام ان میں پوری طرح مخلص تھے، جذبات سے لبریز، غیرت وحمیت سے بھرپور اور دینی جذبہ سے سرشار تھے اور اپنے اس مقدس مقام کو غاصبانہ قبضہ سے آزاد کرانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردینے کے لیے تیار تھے، لیکن تنہا عوام یہ کام نہیں کرسکتے تھے، کیوں کہ دوسری طرف مقابلہ میں ایک نہیں کئی حکومتیں تھیں اور در پردہ کچھ اپنے بھی اس میں شامل تھے، یہ صورت حال جو اس وقت تھی' تقریباً آج بھی وہی ہے، عوام میں جو درد' بے چینی اور تڑپ اس مسئلہ کو لے کر ہے، حکومتیں اس سے خالی ہیں۔ دوسروں کی سازشوں' اپنوں کی خیانتوں اور ماضی میں کی جانے یا ہوجانے والی غلطیوں کو سمجھنے کے لیے اور ان غلطیوں کے نتیجہ میں آج پہنچنے والے نقصانات کو جاننے کے لیے اس موضوع پر تیار کیے جانے والے رسائل یا کتابوں کی افادیت پہلے بھی تھی اور آج بھی ہے اور آئندہ بھی رہے گی، ماضی کے یہ واقعات جب نظروں کے سامنے رہیں گے تو دوبارہ اس طرح کی غلطیوں کے امکانات ختم نہیں تو کم ضرور ہوجائیں گے۔'' (ماخوذ از مقدمہ؛ صدائے فلسطین: ۱۱-۱۲)

آبروئے بارغِ ہند

مولانا فتح محمد ندوی
(سہارنپور)

میں ان کے سوا کس پہ فدا ہوں یہ بتادے
لا مجھ کو دکھا ان کی طرح کوئی اگر ہے

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات سے تقریباً سات ماہ قبل سابق پروفیسر محسن عثمانی ندوی کے حکم پر نوجوان عالم دین مولانا محمد مکرم ندوی سلیم پوری کی معیت میں راقم سطور کی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ حاضری ہوئی تھی، میرے لیے اس سفر کی خوشگواری اور اہمیت غیر معمولی تھی، کیونکہ اس سفر کا مقصد حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے مولانا محمود حسنی ندوی مرحوم کے سانحہ ارتحال پر اظہار تعزیت کے ساتھ ان سے اپنا اصلاحی تعلق قائم کرنا بھی تھا۔ ویسے بھی ندوہ میرا مادر علمی ہے۔ میرے دلوں کی دھڑکن ہے۔ میرے فکر و خیال کا محور اور مرکز ہے۔ میری تعلیمی اور روحانی یادوں کا خوبصورت اعلان اور عنوان ہے۔ اس سے بڑھ کر دین و دانش کا مرکب خوشگوار گلدستہ اور انمول ہیرا ہے۔ دوسری طرف یہ وہ بزم جہان علم ہے جہاں کی ہر صبح عرفانی اور ہر شام شام شگفتہ ہے۔ اس لیے ندوہ کے بام و در سے محبت کسی خاص سفر کے ساتھ وابستہ نہیں وہ تو سانسوں کی طرح زندگی کے ہر لمحے کی روداد ہے، جس طرح سانس ہماری زندگی کی بقا کا ضامن ہے، اسی طرح ہمارے لیے ہمارے مادر علمی دار العلوم دیوبند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ ہیں۔

اس سفر کا حاصل عنوان دراصل یہی تھا کہ اپنے مشفق و مربی سابق پروفیسر محسن عثمانی ندوی کی معیت میں مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ سے اصلاحی اور روحانی تعلق قائم کر کے ان کے منتسبین کے حلقہ ارادت میں شامل ہو جاؤں۔ بالآخر ۲۷ر محرم ۱۴۴۴ھ مطابق ۲۶ر اگست ۲۰۲۲ء بروز جمعہ بعد نماز مغرب حضرت مولانا سید رابع حسنی ندویؒ سے بیعت ہو کر آپ کے ارادت مندوں میں شامل ہو گیا۔ بلا مبالغہ میری زندگی کے جو خوشگوار لمحات تھے۔ ان کی ثروت میں ان لمحات کا اضافہ انگوٹھی میں نگینہ کی طرح بلکہ مثل کوہِ نور میری زندگی میں آویزاں ہو گیا۔

بلاشبہ برصغیر پاک و ہند کی مسند علم و عرفان اور اصلاح و ارشاد پر جلوہ افروز حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ جہاں خانوادۂ حسنی کی روایتوں کے امین اور خوبصورت حوالہ تھے، وہیں آپ کا وجود خود ہمارے لیے، ہمارے تعلیمی اداروں، ملی تحریکوں اور خاص طور پر ملت اسلامیان ہند کے لیے خیر کثیر کا عنوان اور اعلان تھے۔ میں کسی کی تنقید اور تنقیص اور کسی کے قد کو کم یا زیادہ کیے بغیر پوری امانت کے ساتھ کہتا ہوں کہ آپ کے پاس جو نظر اور نظریہ، جو فہم و ادراک آپ کو مشیت ایزدی کی طرف سے ودیعت ہوا تھا، جو تحمل اور برداشت آپ کو حاصل تھا، جو بے نیازی اور دینی غیرت و حمیت اور خودداری آپ کی ذات میں شامل تھی، جس سادگی، وضع داری، طبعی شرافت اور حسن کردار و عمل کے آپ پیکر تھے، مزید جس طرح آپ کا ذہن منفیت کے مہلک اثرات اور پروپیگنڈوں سے پاک تھا، کسی کو اس سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے؟! تاہم یہ اعتراف اس حوالہ سے ناگزیر ہے کہ جس طرح ہمارے ملی اور سیاسی قائدین پر مادیت کا غلبہ ہے، عہدوں کے لیے باہم دست و گریباں ہیں، اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ عظمت اور عبقریت کے اس مقام پر فائز تھے جہاں ان کے معاصرین

میں بظاہر کوئی مثال نظر نہیں آتی۔

آپ ہمیشہ دوسروں کے تئیں تحقیر کے بجائے تکریم اور احترام کا رویہ رکھتے تھے۔ مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندوی نور اللہ مرقدہ کی طرح آپ نے انتقادی ذہن کے بجائے مثبت رویوں کو اپنایا، خلیج بڑھنے کے بجائے خلیج کو پاٹنے کا کام کیا، ہر مسئلہ میں اعتدال اور توازن پیدا کرنے کی کوشش کی، بلکہ ہر منفی عمل کو مثبت پیکر عطا کر دینا آپ کی خاندانی شرافت کی طرح آپ کی بھی امتیازی شان رہی۔ آپ کے سامنے میری معلومات کے مطابق دو مسئلے ایسے آئے کہ آپ کا دامن ان میں الجھ جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دونوں سے آپ کو باعزت بری اور سرخ رو کیا۔ پہلا وہ مسئلہ جس میں گذشتہ دنوں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے موضوع پر زبردست اختلافات ہوئے، جن میں بہت سی بے اعتدالیاں بلکہ حد سے تجاوز کرنے والے بیانات اور جارحانہ رویے بھی دیکھنے کو ملے، وہ نہ صرف مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی شان اور عظمت کے خلاف تھا، بلکہ اختلافی اصولوں کے بھی مناسب نہیں تھا۔ دوسرا تبلیغی مرکز نظام الدین دہلی میں ہونے والے نظریاتی اختلاف میں جب ہماری ملت دو گروہ میں تقسیم ہوگئی، تو اس نازک موقع پر بھی آپ کسی جماعت کے فریق اور حریف نہیں بنے۔ ان دونوں اہم اختلافی مسئلوں میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے کمال ضبط و تحمل اور حسن اخلاق کا عملی نمونہ پیش کیا، بلکہ حسن عمل اور ادائے دلنوازی سے اپنے دونوں خاندانوں کو باہمی جدال اور آپس میں دست و گریباں ہونے سے بچایا، اسی طرح مرکز نظام الدین کے حوالہ سے آپ کا غیر جانبدار رویہ آپ کی طبیعت کی نیکی اور شریفانہ زندگی کی حیثیت کو متعین کرنے کے لیے کافی ہے۔

آپ کی حرف و خیال سے شناسائی جس دینی ماحول اور جس خوشگوار فضا میں ہوئی، وہاں نور و سرور کی بارشیں تھیں، کیف و مستی اور جذب و فنائیت تھی، ہمدردی، طبعی شرافت، نیکی، ایثار، بے نیازی، اسلامی غیرت و حمیت اور خود داری تھی، شہرہ آفاق اور جہاں دیدہ شخصیات تھیں، بلند پایہ مفسر و محدث، سیرت و سوانح نگار، ممتاز مصنف، مؤرخ، محقق، ادیب، انشاء پرداز، داعی، مبلغ اور صبر و ضبط، استقامت اور عزیمت کے پیکر مفکرین اور مصلحین کی ایک بڑی جماعت تھی۔ ان سب کے ہم آغوش رہ کر آپ کو اپنی ظاہری اور باطنی صلاحیتوں کو صیقل کرنے کا مناسب ماحول میسر آیا۔

لاریب آپ کی شخصیت اپنے خاندان کی تمام علمی، فکری، روحانی، ادبی، تصنیفی درخشاں موتیوں کا عنوان اور نشان ہے۔ اگر کسی کو حسنی خاندان کا ذوق جمال، فکر و خیال، علم و عرفان، ادبی، تصنیفی اور دعوتی مزاج، امت کے تئیں فکر مندی اور دل سوزی، صبر و تحمل، احترام آدمیت اور مذہبی رواداری جیسے حسین نکہت ریز اور دلکش نظاروں کا مشاہدہ کرنا ہے تو آپ کی پیشانی پر یہ تمام عنوانات تاروں کے کہکشاں کی طرح جھلمل ہیں۔ بلاشبہ ان تمام محاسن اور صفات کی قوس و قزح نے آپ کے وجود کو فرد سے جماعت، شخص سے شخصیت بلکہ انجمن سے ادارہ کا پیکر عطا کر دیا۔

آپ نے دنیائے اسلام کی علمی، روحانی فکری، مذہبی، ادبی، تحقیقی شخصیات سے بھرپور کسب نور کرنے کے بعد عملی زندگی میں قدم رکھا۔ اپنی خاندانی وسعت، فکر و خیال اور نظر کے تنوع کے ساتھ اپنے دینی مشن کا آغاز کیا۔ یعنی جس طرح آپ کے خاندانی مشائخ نے اپنی ذات کو کسی ایک دائرہ عمل تک محدود نہیں رکھا، بلکہ آفاقی بصیرت کے ساتھ معمار جہاں کا کردار ادا کیا۔ انہوں نے ہر میدان میں اسلام کی حفاظت کا فریضہ بھرپور جرأت سے انجام دیا۔ بقول علامہ سید سلیمان ندوی نور اللہ مرقدہ ''تیموریوں کا دور ختم ہوا اور سکھوں نے سر اٹھایا تو پھر دہلی اور رائے بریلی کے خانوادوں سے وہ اکابر اٹھے جنہوں نے پورے ہندوستان کو جگا دیا اور ہر طرف اصلاح و دعوت اور تبلیغ دین کا ولولہ پیدا کر دیا۔'' (حیات شبلی)

مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی شخصیت کا مطالعہ کئی جہتوں اور حوالوں سے مفید ثابت ہوگا۔ کیوں کہ آپ کی خدمات کا دائرہ ہمہ گیر بھی ہے اور ہمہ جہتی بھی۔ ایک طرف آپ مولانا علی میاں ندوی نور اللہ مرقدہ کے علوم و افکار اور خیال کے وارث اور امین بلکہ مضبوط

جانشین تھے۔اسی طرح آپ کے وجود سے نا صرف حسنی خاندان کی مستحکم شناخت قائم تھی، بلکہ حسنی خاندان کے گلدستہ میں خوبصورت پھول کا اضافہ تھا،اس حوالہ سے ہم یہاں الگ الگ جہتوں سے آپ کی شخصیت اورفن کا جائزہ سرسری طور پر پیش کریں گے۔

۱۹۴۹ء میں آپ کا دارالعلوم ندوۃ العلماء میں تدریس سے عملی زندگی کا باضابطہ آغاز ہوا۔ یہ شروعات آپ کے لیے اس اعتبار سے اہمیت کی حامل ثابت ہوئی کہ آپ کو تدریس کے ابتدائی دور سے بڑے بڑے اصحاب فکراور اصحاب کمال شخصیات کی سرپرستی بلکہ ان کی چشم عنایت حاصل رہی۔ دوسری طرف آپ نے دنیا بھر کے اہل علم سے براہ راست استفادہ حاصل کر کے اپنی شخصیت اور فکر وخیال کو تنوع اور ذہنی وسعت سے آباد کرلیا تھا، یہی تنوع آپ کے انداز تدریس اور دیگر علوم وفنون کا شان امتیاز بھی ہے۔ہم لوگوں نے آپ سے ۲۰۰۷ء میں ''الادب العربی بین عرض ونقد'' پڑھی ہے۔ یہ آپ ہی کی تصنیف کردہ کتاب ہے،اس کتاب کی تدریس کے درانیہ میں آپ کے انداز درس سے براہ راست استفادہ کرنے کا موقع فراہم ہوا،اسباق کی مکمل منصوبہ بندی،جس میں متن کا خلاصہ، سلیس ترجمہ، گزشتہ اسباق کا اعادہ اور ربط،غرض عصری کے ساتھ تفہیم اور ترسیل آپ کی تدریس کی نمایاصفات تھیں۔

قلم وکتاب سے وابستگی بلکہ جنوں شعاری آپ کی جہان خدمات کے عنوان میں سب سے ممتاز حوالہ ہے۔ ویسے بھی علم وکتاب سے لگاؤ آپ کی موروثی عادت کا حصہ تھی۔خاص طور پر آپ کے ذوق جمال میں علمی اور تصنیفی شوق اور وارفتگی مولانا علی میاں ندوی نوراللہ مرقدہ کی صحبت اور تربیت کا حصہ ہے۔مولانا علی میاں ندوی کا پورا تصنیفی ڈکشن اور علمی سرمایہ مولانا سید محمد رابع حسنی صاحب کی نظروں کے سامنے تیار ہوا ہے۔ بلکہ کہیں نہ کہیں کتابوں کے مآخذ تلاش کرنے اور مسوادات کو دیکھنے میں مولانا رابع حسنی صاحب کا تعاون ضرور شامل رہا ہوگا۔جس طرح مولانا علی میاں ندوی نوراللہ مرقدہ کے نگارشات کے گلدستہ میں فکرانگیزی اور خیال آفرینی کے ساتھ تنوع اور ہمہ گیریت شامل ہے، اسی طرح کی وسعت اور فکر وخیال کی ندرت اور جدت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کے یہاں بھی پوری توانائی اور بانکپن کے ساتھ دکھائی دیتی ہے۔قرآن،سیرت،سوانح،خاکہ نگاری،تاریخی،سماجی،علمی،ادبی اور مذہب وتصوف کے ساتھ دیگر فکر اسلامی کے جواہر پارے آپ کے تصنیفی کینوس کا نشان امتیاز ہیں۔

اسی کے فیض سے میری نگاہ ہے روشن

آپ کا لفظی آرٹ ہر قسم کے تصنع سے پاک تھا، تاہم آپ کے موئے قلم سے لفظی موشگافیوں سے زیادہ فکر ونظر کے دریچے وا ہوتے تھے، حالات پر سوچنے اور سمجھنے کی بصیرت عطا ہوتی تھی۔آپ کی درجنوں عربی اور اردو شاہکار تصنیفات آپ کی فکر ونظر کی وسعت اور آفاقی بصیرت کے معیار کو پرکھنے کے لیے کافی ہیں، لاریب آپ کی تحریروں میں اس بات کا مشاہدہ بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ آپ کا قلم ہر موقع پر افکار واحساسات کی جلوہ طرازیاں کس خوبصورتی سے دکھاتا ہے۔

جس طرح مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صلح اور صالحیت کے ساتھ صحت منداور مثبت فکر کے پیکر تھے،اسی طرح آپ کا پورا تصنیفی سرمایہ ہر قسم کی جماعتی عصبیت سے پاک ہے، بلکہ دعوت دین کو مرکزی حیثیت حاصل ہونے کی وجہ سے آپ کے یہاں حکمت و موعظت کے ساتھ مخاطب کی نفسیات کا بھرپور خیال ملتا ہے، دراصل اس عہد کی سب سے زیادہ ضرورت کردارسازی،افرادسازی اور ایمان افروزی ہے۔آپ کا پورا تصنیفی سرمایہ اسی اہم خیال کا خوبصورت اعلان ہے۔

لاریب آپ کا تعلق جس خاندان سے تھا اور جس نور وسرور والے ماحول میں آپ کی علمی وفکری اور روحانی نشو ونما ہوئی، صدیوں سے اس خاندان میں بڑے بڑے ارباب فضل وکمال اور ائمہ تصوف پیدا ہوتے رہے ہیں۔اس اعتبار سے بچپن ہی سے آپ کو اپنے دل کی دنیا آباد کرنے کے خوب مواقع فراہم ہوئے، بلکہ

ان صاحب دل اور صاحب حال شخصیات کی چشم عنایت سے آپ کا سینہ عشق الٰہی کی آگ سے بھر چکا تھا، تاہم آپ علمی اور باطنی کمالات سے مالا مال ہونے کے باوجود آداب محبت اور مزید روحانی استفادہ کے لیے اہل دل کی خدمت میں نیاز مندانہ حاضری دیتے رہے۔

آپ کی عقیدتوں کے محور میں شامل وہ تمام علمی اور روحانی بارگاہیں اور شخصیتیں تھیں جہاں سے دوائے دل عطا ہو۔اس کے لیے آپ دارالعلوم دیوبند، مظاہر العلوم سہارن پور، خانقاہ رائپور، مرکز نظام الدین وغیرہ نیاز مندانہ حاضر ہوئے، یہاں کے مشائخ عظام سے علمی اور باطنی تربیت اور تعلیم حاصل کی، بلا مبالغہ یہ تمام ادارے اور شخصیات جن سے آپ نے کسب نور کیا ان کے علمی اور عرفانی لالہ وگل کی مہک اور کمالات سے ایک جہان محظوظ ہو رہا تھا۔ حضرت مولانا احمد علی لاہوری نوراللہ مرقدہ، حضرت شاہ عبد القادر صاحب رائپوری نوراللہ مرقدہ، حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب فتح پوری نوراللہ مرقدہ، حضرت اقدس مولانا شیخ محمد زکریا کاندھلوی نوراللہ مرقدہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ، مبلغ اسلام حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی نوراللہ مرقدہ اور ان کے علاوہ دنیا بھر کے اساطین فن سے آپ نے بھرپور علمی اور روحانی استفادہ کیا۔

آپ کا ذوق خالص علمی اور تصنیفی تھا، پھر بھی آپ نے باضابطہ درس معرفت کے لیے حضرت شاہ عبد القادر رائپوری نوراللہ مرقدہ کے ہاتھ پر باطنی اصلاح کے لیے بیعت کی۔ شیخ کی توجہ اور تاثیر قلب سے سلوک کے مرحلوں سے گزر کر جذب و انجذاب، کیف وسرمستی کی وہ کیفیت آپ کے اندر پیدا ہوگئی تھی جس کے نمونہ ہمارے سلف وصالحین کی روایتوں میں ملتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی یاد رہے کہ آپ بلکہ آپ کا پورا خاندان تصوف کے ذوق شناسوں میں ضرور شامل تھا، لیکن وہ ایسے صوفی صافی نہیں تھے جو قومی اور ملی مسائل سے بے نیاز ہو کر تسبیح ومناجات میں مصروف عمل تھے، بلکہ انہوں نے تصوف اور مجاہدانہ زندگی کو اپنی جہد مسلسل سے بھری زندگی کا عنوان بنایا۔ انہوں نے کبھی قومی تقاضوں اور ملی تعمیر سے انحراف نہیں کیا۔ حضرت اقدس سید شاہ علم اللہ حسنی نوراللہ مرقدہ، حضرت سید احمد شہید نوراللہ مرقدہ، حضرت مفکر اسلام مولانا علی میاں ندوی نوراللہ مرقدہ وغیرہ کی شخصیات میں قلندرانہ ادائیں بھی تھیں اور میدان عمل کی جاں سپاری بھی، بلکہ اصلاح وتربیت اور مجاہدانہ زندگی کے دھارے اس خاندان کے مشائخ میں ایک دوسرے کے ساتھ مدغم ہو کر اکائی کا پیکر بن جاتے ہیں۔

آپ فقیہ النفس قاضی مجاہد الاسلام صاحب قاسمی نوراللہ مرقدہ کے بعد ۲۰۰۲ء میں ملت اسلامیان ہند کی فعال اور متحرک بلکہ مسلمانوں کے دینی اور شرعی تحفظ اور بقا کا ضامن بورڈ مسلم پرسنل لا کے صدر بنائے گئے۔ ملت کے اس اہم پلیٹ فارم سے آپ کی سنجیدہ، گہری بصیرت اور حکمت پر مبنی ملی قیادت نے ہندوستان میں اٹھنے والے بہت سے فتنوں کا جرأت اور پامردی سے مقابلہ اور تصفیہ کیا۔ طلاق، حجاب، بابری مسجد، گیان واپی مسجد، یکساں سول کوڈ جیسے اہم ایشوز پر آپ کی مدبرانہ جدوجہد اور تعمیری قیادت کے نتیجہ میں ملت کو صحیح سمت اور رہنمائی عطا ہوئی۔

بلاشبہ اپنی کوہ پیکر اور ذی وقار شخصیت کے ہیولے میں جہاں آپ کا وجود اور سرپرستی ہندوستان کی دینی وملی، علمی وفکری اور اصلاحی تحریکوں کے لیے خدا کا بہت بڑا انعام تھیں، وہیں آپ کی شخصیت اپنے خاندانی صفات اور محاسن کی رونق اور بہار تھی۔ آپ کو چہ تصوف کے رند باصفا بھی ہیں اور روح دین کے شناسا بھی، قلم وکتاب سے بھی آپ کی پوری زندگی وابستگی رہی اور ملت کے زمینی حقائق سے بھی آپ پوری طرح باخبر رہے، ایمانی غیرت وحمیت بھی آپ کی افتاد طبع کا جوہر تھی، خودداری و بے نیازی اور صدق احساس کی جلوہ تابانی بھی پوری توانائی کے ساتھ آپ کی ذات میں موجود تھی۔ حاصل عنوان یہ ہے کہ عہد حاضر میں اپنی جامع صفات خصوصاً ذہنی اور فکری اعتدال پسندی اور توازن کی بنیاد پر باغ ہند کی آبرو اس عہد میں آپ ہی کے دم سے قائم تھی۔

مرشد الامت مجلسی افادات کے آئینہ میں

مولانا زین العابدین ہاشمی ندوی
(ریسرچ اسکالر جامعہ ملیہ اسلامیہ- دہلی)

سب کو ہم بھول گئے جوش جنوں میں لیکن
اک تری یاد تھی ایسی جو بھلائی نہ گئی

حضرت مولانا رابع حسنی ندویؒ اوروں کے لیے، میرے لیے اور میرے جیسوں کے لیے استاد محترم حضرت مولانا!

مناسب قد وقامت، کشادہ پیشانی، سرخ چہرہ، ستواں ناک، آنکھوں میں چمک، خوش اطوار، خوش گفتار، مرشد ملت حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کو میں نے سب سے پہلے ۲۰۰۵ء میں دیکھا، جب میں ثانویہ رابعہ معہد میں پڑھتا تھا، جلسہ تقسیم اسناد وانعامات میں حضرت مولاناؒ کی صدارت تھی، اسی جلسہ میں خاکسار کو نعت پڑھنے کا موقع ملا، میں غالباً ۱۵ر برس کا تھا اور قاری صدیق صاحب باندویؒ کی مشہور نعت ''تمنا ہے کہ گلزار مدینہ اب وطن ہوتا'' پڑھی، سامنے بیٹھے ایک ساتھی نے بتایا کہ حضرت مولانا جھوم رہے تھے، یہ خبر میرے لیے عید سے کم نہ تھی، میں جہاں جاتا جس سے ملتا، سب سے یہی کہتا کہ آج میں نے نعت پڑھی اور حضرت مولانا نعت سنتے ہوئے جھوم رہے تھے۔

حضرت مولانا کی شخصیت ایسی تھی کہ انہیں جب کوئی دیکھتا یا ملتا تو ان سے محبت کر بیٹھتا، ان کے اخلاق وکمالات اور ان کے علم کے بارے میں سوچتا، جب میں معہد سے ندوۃ العلماء کے کیمپس میں آ گیا تو کبھی کبھی حضرت مولانا کی مجلس میں جانا ہونے لگا۔

پہلی دفعہ ایک دوست کے ساتھ حضرت مولانا کی مجلس میں جانے کا اتفاق ہوا، عشائیہ کے بعد طلبہ حضرت مولانا کے اردگرد بیٹھ گئے، تھوڑی دیر میں مولانا کے لیے ایک کپ چائے لائی گئی، کپ تشتری میں رکھا ہوا تھا، مولانا چائے تشتری میں انڈیلتے اور پی جاتے، سب خاموش بیٹھے تھے، پھر مولانا نذر الحفیظ ندویؒ نے کچھ بات شروع کی اور حضرت مولانا ان کا جواب دیتے رہے، پھر کسی نے ایک مسئلہ معلوم کیا تو حضرت مولانا نے کہا: کسی مفتی صاحب سے پوچھیں، پھر دفعۃً کسی نے مولانا وحید الدین خان صاحب کے نظریات کے متعلق پوچھ لیا، حضرت مولانا نے کہا: ہم سے شخصی سوالات نہ کرو۔

اس دن میں سب سے آخری صف میں تھا اور صرف سن رہا تھا، بلکہ آواز بھی مشکل سے آ رہی تھی، تب ہی ارادہ کر لیا کہ کل سب سے پہلے آ کر سب سے آگے بیٹھنا ہے، جب مجلس برخاست ہوئی تو میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ کیا ہم سوال کر سکتے ہیں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! بالکل کر سکتے ہیں۔

اگلے دن میں سب سے پہلے وہاں موجود تھا، اکثر طلبہ وہاں چپ ہی رہا کرتے، سب مولانا کے کچھ کہنے کا انتظار کیا کرتے تھے، لیکن میری عادت چپ رہنے کی ہے ہی نہیں، جیسے ہی حضرت تشریف لائے اور محسوس ہوا کہ اب کچھ پوچھا جا سکتا ہے، میں نے کہا:

''حضرت! ادبی ذوق کیسے پیدا کیا جائے؟''

فرمایا: ''کثرتِ مطالعہ سے ادبی ذوق پیدا ہوتا ہے۔''

میں نے پوچھا: ''کثرتِ مطالعہ کیسے کیا جائے؟''

حضرت مولانا مسکراتے ہوئے کہنے لگے: ''مطالعہ کے لیے خود کو آمادہ کرو، پھر دھیرے دھیرے عادت بن جائے گی۔''

میرے سوال کے بعد جو طلبہ کل خاموش بیٹھے تھے وہ بھی پوچھنے لگے، ایک ساتھی نے پوچھا: ''حضرت! جب ہم تقریر کرنے کھڑے ہوتے ہیں تو ڈر لگتا ہے تو یہ خود اعتمادی کیسے پیدا کریں؟''

حضرت مولانا نے کہا:

''اس کے دو طریقے ہیں؛ پہلا یہ کہ جب کوئی تقریر کرنے جائے تو یہ سمجھے کہ مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کروانے والا ہے، بس اللہ پر بھروسہ کریں اور یہی بہتر ہے۔''

پھر کسی نے پوچھا کہ ''حضرت بعض لوگ بہت جلدی جلدی مطالعہ کر لیتے ہیں، ہم سے تو نہیں ہو پاتا، کیا جلدی جلدی مطالعہ کا کوئی خاص طریقہ ہے؟''

حضرت مولانا نے کہا:

''اللہ تعالیٰ نے ہر کسی کی ذہنی صلاحیت مختلف رکھی ہے، کوئی جلدی پڑھ جاتا ہے اور کسی کو دیر بھی لگتی ہے۔ اگر کوئی اپنے ذہن اور نظر کو ساتھ ساتھ لے کر چلے تو مطالعہ کی رفتار بڑھائی جاسکتی ہے۔''

مولانا نے مزید کہا کہ

''نظر کودتے ہوئے چلتی ہے، اب اس کی ایک جست میں چند الفاظ آجائیں یا چند جملے، یہ مطالعہ کرنے والے پر ڈپینڈ کرتا ہے۔''

پھر چند اور سوالات کے بعد یہ مجلس ختم ہوگئی۔

پھر بہت عرصے تک مجلس میں جانا نہیں ہوا، میرے دوست محمد سعد جو اکثر مجلس میں شامل ہوتے تھے، ایک دن انہوں نے کہا کہ

''زین! آج کی مجلس میں حضرت مولاناؒ اپنے طالب علمی کے دور کا تذکرہ کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے دیوان الحماسہ اپنے ماموں جان (حضرت مولانا علی میاں ندویؒ) سے پڑھی ہے، اس کتاب کو پڑھتے ہوئے اگر کہیں ہم غلطی کرتے تو ماموں جان اتنا ڈانٹا کرتے تھے کہ ہمارے آنسو نکل جاتے تھے، دیوان الحماسہ نے ہمیں بہت رلایا ہے اور اللہ نے وہ وقت بھی دکھایا کہ ہم نے دیوان الحماسہ پڑھائی بھی۔''

اس واقعہ کو سن کر میں نے اگلے روز جانے کا فیصلہ کیا اور دوسری لائن میں جگہ ملی، کسی نے آج سب سے پہلے مرزا غالب کی شاعری پر ہی سوال کر لیا، وہاں ایک مولانا صاحب موجود تھے، انہوں نے وہ سوال ٹالنا چاہا اور دوسرا سوال کرنے کو کہا، لیکن حضرت مولانا نے اس طالب علم کے سوال کو اہمیت دی اور غالب کی شاعری کے متعلق کافی معلوماتی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ''غالب کی شاعری ایک غیر معمولی شاعری ہے اور بے مثال ہے۔ ہم نے اپنی عربی کتاب ''الغزل الاردی'' میں غالب کی شاعری کا تنقیدی جائزہ بھی لیا ہے وہ کتاب دیکھ لیں۔ لیکن ہم ان کے خطوط کے زیادہ شوقین تھے، ان کے خطوط نے مکتوب نگاری کو مکالمہ نگاری میں بدل دیا، بچپن میں ہم ان کے خطوط بہت دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔''

پھر میں نے مضمون نویسی کے متعلق پوچھ لیا کہ

''حضرت! مضمون نویسی کو بہتر کیسے بنایا جائے؟''

حضرت مولاناؒ نے کہا:

''کوئی چیز اگر لکھی جائے تو وہ ایک بار میں مکمل نہیں ہوتی، اس کی تراش خراش کی جاتی ہے، کئی کئی الفاظ یہاں تک کے جملے بھی بدلنے پڑتے ہیں اور ایسا کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے، ایک بار ہم دار المصنفین گئے، وہاں علامہ شبلی کی کسی کتاب کا مسودہ دیکھنے کا اتفاق ہوا، شبلی نے ایک صفحہ میں کئی کئی جگہ پر اور جملوں کے نیچے جملے لکھے ہوئے تھے، جس کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ کئی جگہ تصحیح کی گئی ہے تو مضمون نویسی میں حذف و اضافہ کوئی عیب نہیں بلکہ خوبی ہے۔''

پھر چند سوالات کے بعد یہ مجلس ختم ہوگئی۔

ایک مرتبہ گرمیوں کی چھٹی پڑنے والی تھی اور اگلے دن کلاس کے بعد سب گھر جانے والے تھے، اس دن میں ایک دوست کے ساتھ مجلس میں شریک ہوا، اس دن مجھے کوئی سوال کرنے کا موقع نہیں ملا، آگے بیٹھے لوگ یا مہمان سوالات کر رہے تھے۔ کسی نے پوچھا کہ

''حضرت! ادب اسلامی کو فروغ دینا اتنا ضروری کیوں ہے؟''

مولانا نے کہا کہ

''ادب اسلامی کو فروغ دینا اس لیے ضروری ہے تا کہ موجودہ اور آنے والی نسل کو بگڑنے سے بچایا جائے، ادب اسلامی کا مقصد یہ ہے کہ اخلاقیات اور مشرقی تہذیب وثقافت کو اولیت دی جائے، فحش نگاری اور مغربی تہذیب وثقافت سے بچا جائے، بس! اور کچھ نہیں۔''

مولانا نے مزید یہ بھی کہا کہ

''اللہ نے اگر آپ کو قلم پکڑنا سکھایا ہے تو یہ قلم اللہ کی ایک امانت ہے اور اس امانت کا صحیح استعمال کرنا فرض ہے۔''

پھر کسی نے کہا کہ حضرت کل سے طلبہ کی ۱۵/ دنوں کی چھٹی ہو رہی ہے کوئی نصیحت فرمادیں، حضرت مولانا نے کہا:

''ان چھٹیوں کے ایام کو بھی کام میں لایا جاسکتا ہے، ہم نے احمد امین کی تینوں مشہور کتابوں (فجر الإسلام، ضحیٰ الإسلام، ظهر الإسلام) کا گرمیوں کی چھٹیوں میں ہی مطالعہ کیا تھا، لہٰذا آپ لوگ نمازوں کی پابندی اور تلاوت کے ساتھ مطالعہ کا خاص خیال رکھیں۔''

یہ مجلس میری زندگی کی آخری مجلس تھی، حالانکہ اس کے بعد بھی کئی بار مولانا سے ملاقات ہوئی، کبھی رائے بریلی میں اور کبھی ندوے میں، لیکن مجلس میں پھر شامل ہونا مقدر کا حصہ نہیں تھا۔

پھر کسی کی یاد نے تڑپا دیا
پھر کلیجہ تھام کر ہم رہ گئے

ابھی چند دنوں سے مولانا کی طبیعت ناسازگی کی خبر ملتی رہتی اور وہ لمحہ آ گیا جس لمحہ کا ڈر تھا اور وہ خبر سن کر دھڑکن تھم سی گئی تھی۔ آہ! رمضان المبارک کا آخری عشرہ کتنا ہی مبارک اور عظیم ہوتا ہے، اللہ اپنے بندوں پر رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے، لیکن اس عشرے میں ندوے پر کیا بیتی کہ اس کا وہ فرزند دنیا سے رخصت ہو چلا جس نے اس کا نام علمی افق پر روشن کیا۔

دیکھئے! مولانا کے انتقال پر جلسے ہو رہے ہیں، تقریریں ہو رہی ہیں، مرثیہ بھی لکھے جا رہے ہیں کہ ایک بڑا قومی لیڈر رخصت ہو گیا، ندوۃ العلماء کا ناظم، مسلم پرسنل لا بورڈ کا صدر رخصت ہو گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا بندہ اور اپنے رب کا پرستار چل بسا، محمد ﷺ اور اصحاب محمد کا عاشق رخصت ہو گیا، آج ماتم اس بات کا نہیں کہ ایک عظیم ادیب ومصنف اور بہترین انشاء پرداز رخصت ہو گیا، ماتم اس کا ہے کہ وہ گم ہو گیا جو سچائی کا پتلہ تھا، حق گوئی کا مجسمہ تھا، جس نے اپنی دنیا پر عاقبت کو فوقیت دی، جس کے دل میں سوتے جاگتے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ہر لمحہ وہر آن اگر دُھن تھی تو صرف اللہ کے دین اور قوم ملت کی خدمت کی اور اسی کام میں اس نے اپنی زندگی کھپا دی۔

خیر! یہ اللہ کا فیصلہ ہے اور اٹل فیصلہ کہ ایک دن جو آیا ہے اس کو جانا ہے۔

مولانا علی میاں ندویؒ کی وفات پر استاد محترم پروفیسر عمران احمد عندلیب صاحب نے ایک نظم کہی تھی۔ آج یہ نظم حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ کو تصور کرتے ہوئے آپ بھی پڑھ لیجیے اور تصور کیجیے کہ ہاں فرشتوں نے واقعی اسی طرح پیار اور محبت سے اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہا ہوگا، فرشتوں نے کہا ہوگا: دیکھئے! آپ مت گھبرائیے، ہمارے ساتھ چلیے، اب محبت کی آخری منزل آ گئی، جنت کے دروازے آپ کے لیے کھول دئے گئے ہیں اور اللہ کے ولیوں کے ساتھ ایسا ہی تو ہوتا ہے ؎

علی میاں سے فرشتوں نے با ادب یہ کہا
یہ آب وگل، یہ ستارے، یہ پھول کی وادی
یہ جسم و جان، یہ فہم و شعور، حرکت دل
یہ آسمان یہ سورج یہ رنگ و نور کا شہر
بہت دنوں سے تیرا ساتھ یہ نبھاتے رہے
اب آ گئی ہے محبت کی آخری منزل
ہمارا روز کا دنیا میں آنا جانا ہے
ہمارے ساتھ چلیں، آپ یوں نہ گھبرائیں
چلیں بہشت کا موسم بڑا سہانا ہے

یاد آتی ہیں تری باتیں ترے جانے کے بعد

مولانا محمد سعد خاں ندوی
(جنرل سکریٹری انیس ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی - کانپور)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت موجودہ دور میں آیۃ من آیات اللہ کی تھی، یوں تو آپ کی شہرت ایک مصلح کی حیثیت سے تھی لیکن علوم وفنون میں کوئی ایسا علم وفن نہیں تھا جس میں آپکو کمال، بلوغ نظر اور دقت نگاہ حاصل نہ ہو، اس حیثیت سے آپ ایک فرد واحد ہی نہیں بلکہ اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

آپ ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۹ء تکیہ کلاں رائے بریلی میں پیدا ہوئے آپ کے والد سید رشید احمد حسنی متوسط درجہ کے زمین دار تھے، آپ سادات کی اس شاخ سے تعلق رکھتے ہیں جیسے حسنی وحسینی کہا جاتا ہے۔ آپ کا سلسلہ نسب سید حسن مثنی فرزند حضرت حسن رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے، جن کی شادی حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی سیدہ فاطمہ صغریٰ سے ہوئی تھی، ان کے فرزند سید عبداللہ المحض تھے۔

ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور اپنے چھوٹے ماموں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کی نگرانی وسرپرستی میں زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کیا، آپ اپنے طالب علمی کا ذکر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں: ”میری طالب علمی کے عہد سے حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی وفات تک شاید مجھ کو سب سے زیادہ مولانا کے قریب رہنے کا موقع ملا، وہ میرے ماموں تھے لیکن انہوں نے میرے اور میرے بھائیوں کے سلسلے میں ہمارے والد سید رشید احمد حسنی کی پوری نیابت کی)۔“
(عہد ساز شخصیت)

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عالمیت وفضیلت کے بعد آپ نے اپنے زمانہ کے مشائخ سے استفادہ کیا جن میں سرفہرست شیخ عبد القادر رائے پوری، شیخ الحدیث حضرت مولانا زکریا اور شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی اور پھر ایک سال ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۱ء تک حجاز مقدس کے اہل علم حضرات سے استفادہ کیا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے حامل تھے، جن میں علم وعمل کا توازن، تقریر وتحریر کی خوبی، دین وادب کی لذت، اخلاق وآئین کی پاسداری، خلوت وجلوت کی ہم آہنگی خوبصورتی کے ساتھ جمع تھی۔

فراغت کے بعد آپ کا تقرر دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی ادب ودعوت اسلامی کے استاذ کی حیثیت سے ہوا، ۱۹۵۵ء میں شعبہ کے صدر مقرر ہوئے اور ۱۹۷۰ء میں کلیۃ اللغۃ کے سربراہ بنائے گئے، ۱۹۹۳ء میں دارالعلوم کے مہتمم اور حضرت مولانا علیہ الرحمہ کی وفات کے بعد ۲۰۰۰ء سے تا حال ناظم ندوہ العلماء کی ذمہ داری بحسن وخوبی انجام دے رہے تھے، آپ کی مؤقر اور اثر انداز تصنیفات منظر عام پر آتی رہیں، جن کی شہرت برصغیر ہی میں نہیں بلکہ عالم اسلام میں ہوتی رہی اور بعض کتابیں تو بہت سے مدارس ویونیورسٹیز کے نصاب میں بھی داخل ہیں، آپ کی جملہ عربی واردو مطبوعات کی تعداد سینکڑوں کے قریب ہے۔

آپ کی سب سے عظیم الشان خدمات میں آپ کی تدریسی خدمات ہیں جو کہ ستر سال سے زائد طویل عرصے پر محیط ہیں، چنانچہ آپ کے لاکھوں شاگرد دنیا کے کونے کونے میں پھیلے ہوئے ہیں اور عظیم الشان دینی وعلمی خدمات انجام دے رہے ہیں اور مجھے بھی آپ کی شہرہ آفاق کتاب ”الادب العربی بین عرض ونقد“ پڑھنے کا

شرف حاصل رہا ہے۔اس کے علاوہ چند خاص یادیں اور باتیں ہیں:

عباسیہ ہال میں رسم اجراء:

یوں تو جو کچھ بھی لکھنے پڑھنے اور بولنے کی صلاحیت ہے وہ سب بہ توفیق الٰہی دار العلوم ندوۃ العلماء کی ہی دین ہے ورنہ جس وقت ہم داخل ہوئے اردو بھی صحیح سے لکھنا نہیں جانتے تھے اور اسی لکھنے کی صلاحیت سے وہ موقع بھی ملا جو کہ شاید بہت ہی کم لوگوں کو ملتا ہے جس میں حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی دعائیں اور حوصلہ افزائی شامل تھی موقع تھا زمانہ طالب علمی کی ہماری پہلی مرتب کردہ کتاب ''تذکرہ الحاج حافظ محمد اقبالؒ'' کی تیاری اور رسم اجراء کا جس میں حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا مضمون بھی شامل تھا، رسم اجراء کا پروگرام حضرت مہتمم صاحب مدظلہ اور حضرت ناظم صاحب کے مشورہ سے عباسیہ ہال میں علیا ثانیہ والوں کے الوداعی پروگرام کے اختتام پر تھا، جب وہاں پہنچے چند اور لوگوں کو معلوم ہوا تو بہت سی باتیں ہونے لگیں اور بات یہاں تک پہنچی کہ رسم اجراء بعد میں ہوگی لیکن حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور بغل میں موجود حضرت مولانا سید واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ وہ بچہ کہاں ہے جس کی کتاب کا رسم اجراء ہونا تھا، بس پھر کیا تھا افسردگی اور مایوس کے عالم میں ایسی خوشی کی بیان نہیں کی جاسکتی اور پھر مجھے اپنے آگے کھڑا کرلیا تو حضرت واضح رشید صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ تم بھی ایک کتاب ہاتھ میں لے لو، اس واقعہ میں چھوٹے لوگوں کے لیے بڑوں کی جانب سے بہت سے سبق ہیں۔

اسی طرح ہمارے زمانہ قیام دار العلوم ندوۃ العلماء میں حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مہتمم صاحب مدظلہ العالی کی اجازت سے دو اور اہم کام ہوئے۔

اول پورے دار العلوم میں موجود بوسیدہ اور پھٹے ہوئے قرآن مجید کی جلد سازی کا کام' ایک ایک درسگاہ سے اٹھاتے اور بنواتے پھر دوبارہ وہیں پر رکھ دیتے اگر زیادہ ہوتی تو دوسری درسگاہوں میں پہنچا دیتے، حتی کہ جدید درسگاہوں کے علاوہ دار العلوم' مسجد اور دوسری جگہوں کی بھی جلد سازی کروائی گئی، ایک اندازے کے مطابق دو ہزار سے زائد قرآن کریم کی جلد سازی ہوئی اور تعاون کی شکل یہ اختیار کی گئی کہ ہر شخص شامل ہو جائے اور کم سے کم دس روپے کا تعاون کرے، درسگاہوں میں قرآن کریم اٹھاتے وقت تعاون بھی حاصل کر لیتے، اس کام میں ہمارے معاون اور درسی ساتھی جناب ناصر رامپوری تھے، حضرت مہتمم صاحب جلدی جلدی مطلع کرتے رہتے تھے اور حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو بھی جب بھی جاتے خوب خوش ہوتے اور پوچھتے دعاؤں سے بھی نوازتے، اس کام میں بہت سے اساتذۂ کرام نے بھی دل خول کر تمام طرح سے خوب تعاون کیا تھا۔

عالیہ رابعہ ۲۰۱۲ء کے ڈائری جو بچوں کے لیے بہت بڑا تحفہ ہوتی ہے اور اپنی جیب خاص سے باہم مل کر بنواتے ہیں، دو سال سے تعطل کا شکار تھی، چند دوستوں کے کہنے پر بیڑا اٹھایا گیا اور اجازت کے لیے چند ساتھی حضرت مہتمم صاحب کے پاس پہنچے، پرانی شکایات کو دیکھتے ہوئے اول تو حضرت مہتمم صاحب نے منع کر دیا لیکن اصرار اور یقین دہانی پر مان گئے، اجازت کے بعد سب سے پہلے حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دعاؤں کے لیے پہنچے تو آپ نے دعاؤں کے علاوہ بہت سے مفید مشورے دیئے، بیچ بیچ میں دونوں بزرگوں سے ملاقات کر اطلاع دیتے رہے، جب تیار ہوگئی اور سالانہ امتحانات کو ابھی پندرہ دن باقی تھے، سب سے پہلی ڈائری حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ہدیہ پیش کی گئی تو حضرت کے چہرے کی خوشی' بٹھا کر باتیں کرنا اور سر پر ہاتھ رکھ کر دعائیں دینا' ابھی تک وہ منظر بالکل یاد ہے۔

پیر طلحہ صاحب کا خط:

۲۰۱۰ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں ششماہی کی چھٹیوں کے موقع پر سہارنپور کا سفر ہوا جس میں دار العلوم دیوبند، وقف اور مظاہر علوم بھی جانا ہوا، حضرت پیر طلحہ صاحب نے حضرت ناظم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نام بہت ہی طویل ایک خط مجھ سے لکھوایا جس میں

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ذکر کی مجالس، حضرت مولانا رحمۃ اللہ کی باتیں اور اپنے والد ماجد حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ شامل تھا، واپسی پر ندوۃ العلماء پہنچے اور ناظم صاحب سے ملنے گئے تو کسی وجہ سے ملاقات نہیں ہوسکی، ہم موقع کی تلاش میں لگے رہے کہ جب موقع ملے حضرت ناظم صاحب سے مل لیں اور موقع دیکھ کر پہنچ بھی گئے، پھر دیگر سامان کے ساتھ خط بھی خدمت میں پیش کیا۔

زمانہ طالب علمی کے بعد آل انڈیا پیام انسانیت فورم کے پروگراموں اور رائے بریلی ولکھنؤ میں ملاقاتیں رہیں، ابھی ہولی والے دن ملاقات رہی اور جب بھی ملاقات ہوتی تو حضرت کی جانب سے کوئی نہ کوئی بہترین ہدیہ ضرور ملتا اور بہت سی باتیں ہیں جن کا یہاں تذکرہ ضروری ہے، لیکن طوالت کی وجہ سے چند یادوں اور باتوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں، یوں تو آپ پر بہت سے اہل قلم حضرات نے لکھا اور لکھتے رہیں گے۔

آپ کی اہم عربی تصنیفات کچھ اس طرح ہیں:

الأدب العربي، منثورات، معلم الإنشاء ثالث، تاريخ الأدب العربي، فی ظلال السيرة، العالم الإسلامي اليوم قضايا و حلول، أضواء على الأدب العربي، قمة الأمة الإسلامية، مقالات فی التربية و المجتمع، رسالة المناسبات، فی وطن الإمام البخاري، الغزل الأردی، مختار الشعر العربي، الأدب الإسلامي، واقعة الثقافة الإسلامية، رسائل الأعلام، بين التصوف والحياة، ندوة العلماء فكرتها و دورها، طبقة الأمة الإسلامية، أضواء على الفقه الإسلامي.

اردو تصنیفات میں یہ ہیں:

رہبر انسانیت، جزیرہ العرب، قرآن پاک انسانی زندگی کا رہبر کامل، سیرت محمدی انسانیت کے لیے اعلیٰ نمونہ، امت مسلمہ رہبر ومثالی امت، تحفہ رمضان، دو مہینے امریکہ میں، سمرقند و بخارا کی باز یافت، نقوش سیرت، حالاتِ حاضرہ اور مسلمان، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی عہد ساز شخصیت، عالم اسلام اور سامراجی نظام، حج ومقامات حج، اسلامی شریعت ایک محکم قانون، سماج میں تعلیم وتربیت، جغرافیہ ممالک اسلامیہ، غبار کارواں، فقہ اسلامی اور عصر حاضر، مسلمان اور تعلیم، مقامات مقدسہ وغیرہ وغیرہ۔

آپ کی فکری ونظری خصوصیات میں اصلاح باطن وتزکیہ نفس کا خصوصی امتزاج تھا، جس کی وجہ سے زہد فی الدنیا، استغناء اور قناعت، فکر آخرت کا غلبہ زیادہ رہتا تھا، الغرض حضرت کی مصروف ترین زندگی ہمارے لیے باعث عبرت اور نصیحت تھی۔

اللہ رب العزت کروٹ کروٹ جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے آپ کے مشن کو آگے بڑھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

معیاری انسان

”اس امت میں جو شخصیتیں مختلف زمانوں میں ابھریں اور بلند مقام کی مستحق ہوئیں، ان میں ذوق عبادت اور تقویٰ اپنے پورے معیار کے مطابق پایا گیا ہے، لیکن اس طرح تھا کہ زندگی کے جائز تقاضوں سے ان کا کوئی ٹکراؤ نہیں تھا اور عزیمت ومجاہدہ کی صفت کسی میں ظاہر ہوتی تو صرف ایک پہلو میں نہیں، بلکہ مختلف پہلوؤں میں ظاہر ہوتی، ایک طرف عبادت میں کمال ہے تو دوسری طرف لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں پوری محبت وہمدردی اور تیسری طرف حسب ضرورت عمل وجہاد میں بھی شرکت۔ ان معیاری انسانوں کے متعلق صحیح کہا گیا ہے کہ ”رهبانا بالليل وفرسانا بالنهار“ کہ رات میں دیکھو تو تارک الدنیا‘ انسانوں کی طرح عبادت کرتے ہوئے نظر آئیں گے اور دن میں دیکھو تو میدان زندگی کے شہ سوار اور فریضہ جہاد میں مشغول‘ معاصی سے سخت پرہیز کرنے والے اور اعتدال سے کام لینے والے ہوتے ہیں۔“ (امت مسلمہ- رہبر اور مثالی امت:۵۶)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

ایک تاریخ ساز شخصیت

شاہ عمران حسن
(ڈائریکٹر رہبر بک سروس-نئی دہلی)

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اُن خوش نصیب شخصیات میں سے ایک تھے، جنہیں اپنے ماموں مولانا علی میاں کی تربیت وسرپرستی میں رہنے کا موقع ملا۔ اگر یہ بات کہی جائے کہ انہوں نے اپنے بھائیوں میں اپنے ماموں سے سب سے زیادہ استفادہ کیا، تو یہ بات عین درست ہوگی، یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں مولانا عبداللہ عباس ندویؒ لکھتے ہیں:

''مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی' خود مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی تصویر ہیں اور تصویر مجسم ہیں، صورت شکل بھی مولانا سے مل گئی ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی بخشش کا نمونہ ہے کہ مولانا کو ایسا جانشین دیا جو بلانزاع ان کا آئینہ ہے۔''

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: عہد ساز شخصیت، از مولانا عبداللہ عباس ندوی، صفحہ:۲۲)

یہ حقیقت ہے کہ مولانا علی میاںؒ نے زیر تربیت افراد کی ایک پوری ٹیم چھوڑی ہے، جو ان کے بعد ان کے کاموں کو بحسن وخوبی انجام دے رہے ہیں، ان میں سے ایک اہم ترین نام 'مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی' کا تھا جن کی تحریر وتقریر سے عالم اسلام نہ صرف واقف ہے بلکہ استفادہ بھی کر رہا ہے۔ وہ اپنی اعتدال پسندی اور غیر متنازع شخصیت ہونے کے سبب ہر مسلک ومشرب میں نہایت ہی عزت واحترام سے دیکھے جاتے ہیں۔ فطری سی بات ہے کہ آدمی ان کے حالات وواقعات بھی جاننا چاہتا ہے، اس لیے ذیل میں ان کی زندگی کا مختصر سا منظر نامہ پیش کیا جا رہا ہے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی پیدائش ۲۵/اکتوبر ۱۹۲۹ء تکیہ کلاں (رائے بریلی) میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید رشید احمد حسنی تھا اور والدہ کا نام سیدہ امۃ العزیز تھا۔ ان کی والدہ مولانا علی میاں کی بڑی ہمشیرہ تھیں۔

بروز جمعرات بتاریخ ۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء کو مولانا سید محمد رابع حسنی کا انتقال لمبی علالت کے بعد لکھنؤ میں ۹۴/سال کی عمر میں ہوگیا۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنی ابتدائی تعلیم خاندانی روایت کے مطابق رائے بریلی کے اپنے خاندانی مکتب میں حاصل کی، اس کے بعد ان کا داخلہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ہوا، جہاں سے انھوں نے ۱۹۴۸ء میں فراغت حاصل کی، دریں اثنا انھوں نے دارالعلوم دیوبند میں بھی ایک سالہ کورس کیا۔ ۱۹۴۹ء میں وہ دارالعلوم ندوہ کے شعبہ ادب عربی میں بحیثیت معاون استاد مقرر ہوئے۔ دو سال (۱۹۵۰-۱۹۵۱ء) تک انھوں نے حجاز مقدس میں علمی استفادہ کے لیے اپنا وقت گزارا، جہاں کے علماء ادباء، علمی شخصیات اور وہاں کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔

سنہ ۱۹۵۲ء میں وہ ہندوستان واپس آئے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی ادب کا درس دینے لگے۔ ۱۹۵۵ء میں انھیں شعبہ ادب عربی کا صدر بنایا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں عمید کلیۃ اللغۃ العربیہ دار العلوم ندوۃ العلماء مقرر ہوئے۔ ۱۹۹۳ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا منصب اہتمام ان کے سپرد کیا گیا۔ ۱۹۹۸ء میں انہیں نائب ناظم بنایا گیا اور مولانا علی میاں کی وفات کے بعد متفقہ طور پر انھیں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا ناظم بنایا گیا۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی صلاحیتوں کو نکھارنے اور

بنانے سنوارنے میں نہ صرف ان کے بڑے ماموں ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی کا ہاتھ رہا، بلکہ چھوٹے ماموں یعنی مولانا علی میاں کا بھی انھیں بہت زیادہ تعاون ملا۔ انھوں نے بھی ان کی تعلیم وتربیت میں خاص دھیان دیا، جب مولانا علی میاں حج کے سفر پر گئے تھے اس وقت ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی نے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو یک سالہ تعلیم کے لیے دیوبند بھیجا اور اس کے تمام اخراجات خود برداشت کیے، ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی روزمرہ کی زندگی کے کام کرتے ہوئے اپنے بچوں اور اپنے رشتہ داروں کے بچوں کی تربیت کرتے رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان بچوں نے اعلیٰ صلاحیتوں کے ساتھ اپنا قدم علم کی دنیا میں رکھا اور دنیا والوں کے لیے علم کا ذریعہ بنے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے متعدد مرتبہ اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان کی تعلیم وتربیت میں ان کے دونوں ماموں کا حصہ رہا ہے۔ اگرچہ چھوٹے ماموں یعنی مولانا علی میاں کی نگاہ شفقت انھیں زیادہ ملی، یہی وجہ ہے کہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی لکھتے ہیں:

''مجھ کو اپنے چھوٹے ماموں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی اور سرپرستی کا زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہوا، بلکہ میری تعلیم کا خاصا حصہ براہِ راست ان کی استادی میں گزرا اور پھر شاید اسی مناسبت سے بعد میں مجھ کو ان کی علمی مشغولیات میں خدمت اور تعاون کی سعادت بھی زیادہ ملی اور عربی سے تعلق کے کاموں میں خدمت اور ذیلی طور پر تعاون دینے کا موقع ملا اور باہر کے سفروں میں جو زیادہ تر بلادِ عربیہ میں ہوئے اکثر ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ ان کے علمی مسودات کو صاف کرنے اور پروف دیکھنے اور طباعت واشاعت کے سلسلے میں جو خدمت درکار تھی، اس میں بھی خاصی حد تک لگنا ہوا۔ اس طریقہ سے ان کے ساتھ رہنے اور ان کو مختلف موقعوں پر کام کرنے اور کسی مسئلہ میں رائے رکھنے سے واقفیت کا موقع ملا اور ان کی خدمت سے بڑی حد تک ان کے اطمینان ورضا مندی کی سعادت حاصل ہوئی۔ ایک طرف مجھے ان کا بھانجہ ہونے کی وجہ سے شفقت حاصل رہی، دوسری طرف شاگردی کا تعلق ہونے کی وجہ سے عقیدت حاصل ہوئی اور تیسری طرف ان کے کاموں میں خدمت کا شرف حاصل ہونے سے ذیلی مناسبت بھی حاصل ہوئی۔''

(مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: عہد ساز شخصیت مشاہدات اور تجربات کی روشنی میں، از: مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، صفحہ: ۱۸-۱۹)

مولانا علی میاں کی تربیت میں رہ کر انھوں نے جو چیز سیکھی ان میں سے ایک چیز تھی کہ ہر انسان سے محبت کرنا اور ہر انسان کو برابر سمجھنا ہے۔ اپنے کو بڑا نہ سمجھنا اور جو کسی بھی ضرورت کے لیے ان سے مدد مانگے ان کی مدد ضرور کرنا، اس کی ایک واقعاتی مثال میں اپنی زندگی سے دینا چاہتا ہوں، میں نے مختلف مراحل کے سلسلے میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو کئی خطوط لکھے اور ہر خط کا جواب انھوں نے اپنے دستخط کے ساتھ دیا۔ فروری ۲۰۰۶ء کے پہلے ہفتہ میں نے مولانا وحید الدین خاں کے سلسلے میں ایک خط لکھا تھا اور ان سے مولانا موصوف کے متعلق رائے پوچھی تھی، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنے دستخط کے ساتھ جو جواب دیا، وہ یہاں نقل کر رہا ہوں تاکہ سند رہے:

''مکرمی جناب شاہ عمران حسن صاحب زید لطفہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط بصورت پوسٹ کارڈ مجھے موصول ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ میں جلد جواب نہ دے سکا۔

آپ نے مجھ سے مولانا وحید الدین خاں صاحب کے بارے میں رائے معلوم کی ہے۔ ماہنامہ ''الرسالہ'' میرے پاس نہیں آتا ہے، میرے پاس اس کے شمارے بھی نہیں ہیں، اس طرح وہ میرے مطالعہ میں نہیں آتا، لہٰذا اس میں شائع ہونے والی باتوں سے میں واقف نہیں ہوں، لہٰذا اس میں طبع ہونے والی باتوں کے بارے میں کوئی رائے بھی نہیں دے سکتا، مولانا وحید الدین خاں سے میری ملاقات بھی عرصہ سے نہیں ہوئی ہے، وہ بہت عرصہ قبل جب علم جدید کا چیلنج (مذہب اور جدید چیلنج) تصنیف کر رہے تھے اور دار العلوم ندوۃ

العلماء میں تھے، ان سے ملاقات ہوئی تھی، جس کو کئی دہائی کا عرصہ گزرا، لکھنؤ سے جانے کے بعد رابطہ نہیں رہا، اس لیے مجھ سے ان کے متعلق رائے معلوم کرنا زائد از ضرورت بات ہے۔

والسلام

محمد رابع حسنی ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۸ر شوال ۱۴۲۷ھ مطابق ۳۱ر مارچ ۲۰۰۶ء''

اسی طرح جب میں نے مولانا منت اللہ رحمانی پر لکھی جانے والی اپنی کتاب ''حیاتِ رحمانی'' (شائع شدہ: ۲۰۱۲ء) کے لیے ان سے پیغام لکھنے کی درخواست کی تو انھوں نے فوراً اپنے دستخط کے ساتھ ایک پیغام ارسال کیا جو کتاب مذکورہ میں شامل ہے۔ اس تاریخی پیغام کو یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''مکرمی جناب شاہ عمران حسن صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا خط (۳ر جنوری ۲۰۰۷ء) ملا۔ اس میں آپ نے اپنی تصنیف ''حیاتِ رحمانی'' کا ذکر کیا ہے، جو آپ نے مولانا منت اللہ رحمانی کی شخصیت پر تیار کی ہے۔ یہ کام آپ نے بہت اچھا کیا ہے۔ مولانا منت اللہ رحمانی بڑی شخصیت کے مالک تھے۔ امت مسلمہ کے لیے انھوں نے بڑی قابل قدر رہنمائی کا کام انجام دیا اور باطنی اصلاح وارشاد کا کام بھی مؤثر ڈھنگ سے انجام دیا، وہ مسلمانوں کے قائدین اور مفکرین میں سے تھے، اُن کی شخصیت سے واقفیت حاصل کر کے اُن کی خوبیوں کو اپنانے کی ضرورت ہے۔

والسلام

محمد رابع حسنی ندوی

دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ

۱۹/۱/۱۴۲۸ھ مطابق ۱۸ر فروری ۲۰۰۷ء''

(بحوالہ: حیاتِ رحمانی، شاہ عمران حسن، صفحہ: ۱۰، اشاعت اوّل: ۲۰۱۲ء، ناشر: رہبر بک سروس۔ نئی دہلی)

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی اِنہی گونا گوخوبیوں کی وجہ سے ہر طبقہ میں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، جہاں وہ بڑوں کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہیں، وہیں وہ چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنا بھی خوب جانتے ہیں، جس کی بین مثال میری پہلی کتاب ''حیاتِ رحمانی'' کے لیے لکھے گئے ان کے پیغام میں دیکھی جاسکتی ہے۔

درس وتدریس کے ساتھ ساتھ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کو تصنیف وتالیف سے بھی دلچسپی تھی، عربی اور اُردو میں ان کی ۳۰ر سے زائد کتابیں شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہو چکی ہیں۔ انھوں نے ۱۹۵۹ء میں ایک عربی مجلّہ ''الرائد'' جاری کیا، جس کی اشاعت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ عربی داں اہل علم کے علاوہ طلبہ بھی بڑی تعداد میں اس کا مطالعہ واستفادہ کرتے ہیں۔ عربی زبان وادب کے تئیں خدمات انجام دینے کے اعتراف میں اُنھیں ۱۹۸۲ء میں صدرِ جمہوریہ ایوارڈ مل چکا ہے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی دارالعلوم ندوۃ العلماء کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے ساتھ ہندوستان کے مختلف اداروں مثلاً آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، رابطہ ادب اسلامی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، مجلس صحافت ونشریات، دینی تعلیمی کونسل، دارِعرفات، رابطہ عالم اسلامی، دارالمصنفین، آکسفورڈ سنٹر فار اسلامک اسٹڈیز، مولانا محمد ثانی میموریل سوسائٹی، مولانا عبدالباری سوسائٹی، مولانا ابوالکلام آزاد اکیڈمی، تحریک پیامِ انسانیت، مولانا ابوالحسن اکیڈمی وغیرہ سے بھی وابستہ تھے اور اُن اداروں کو مسلسل اپنا تعاون دیتے رہے۔

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی جیسی نابغہ روزگار شخصیت پر نہ صرف جامع مضمون لکھنے کی ضرورت ہے، بلکہ ان پر مستقل کتاب لکھی جانی چاہیے، تاکہ آنے والی نسلیں ان کی خدمات کو جان سکیں اور اپنے لیے کوئی لائحہ عمل تیار کر سکیں، جب تک نئی نسلوں کو ان کے اسلاف کی کارکردگی کے بارے میں نہیں بتایا جائے گا، تب تک ان کے اندر کام کرنے جذبہ نہیں ابھر سکتا۔

چھپ گئے وہ ساز ہستی چھیڑ کر

مولانا محمد زاہد عباسی ندوی
(ناظم مدرسہ عابدہ روضۃ الاطفال۔لکھنؤ)

موت ایک ایسی سچائی اور وہ مسلم حقیقت ہے جس کو کوئی مات نہ دے سکا اور جب اس وقت مقرر آجاتا ہے تو کوئی مہلت نہیں ملتی:

﴿لَن يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْساً إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ﴾ (اللہ کسی بھی جان کو اس کا وقت آجانے کے بعد ہرگز مہلت نہیں دیا کرتا اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ کو سب کی خبر ہے)

اس حقیقت کا مشاہدہ ہم بچشم خود کرتے رہے ہیں اور اس مدت میں ہم نے نہ جانے کتنے جنازے دفنائے ہیں۔

ان مدفونوں میں اس صدی کی سب سے معروف ومشہور، زہد وتقویٰ کی پیکر، حلم تدبر کا سرچشمہ، مصلح قوم، مرشد الامت، صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، ناظم اعلیٰ عالمی ادارہ ندوۃ العلماء لکھنؤ اور درجنوں اداروں وتنظیموں کے سرپرست میرے مرشد ومربی استاذ الاساتذ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا سانحہ ارتحال پر ملال تھا۔

ستارے ٹوٹتے رہتے ہیں روز وشب لیکن
غضب تو یہ ہے کہ اب آفتاب ٹوٹا ہے

حضرت سے میرے تعلق ۲۰۰۷ء میں معہد دارالعلوم ندوۃ العلماء سکروری سے ہوا، جب ناچیز وہاں زیر تعلیم اور معتمد بزم ضیافت تھا، وہیں مجھے سب سے پہلے حضرت کی خدمت کی سعادت نصیب ہوئی، وہ لمحہ میری زندگی کا بہت حسین پل تھا، اس کے علاوہ بھی ناچیز کو بہت سے موقعوں پر سفر وحضر میں آپ کی خدمت کا موقع ملا اور اول دن سے حضرت کی مجلسوں میں شرکت کا شرف میسر رہا، جن کی برکت سے زندگی کا مقصد حاصل ہوا اور ہمارے اندر ایمانی حرارت پیدا ہوئی۔

۲۰۱۴ء میں جب ناچیز کا انتخاب بحیثیت ناظم جمعیۃ الاصلاح دارالعلوم ندوۃ العلماء ہوا تو حضرت نے تائید فرمائی اور دعاؤں سے نوازا اور ۲۰۱۴ء ہی میں حضرت کی سرپرستی میں جمعیۃ الاصلاح کی تاریخ میں سب سے پہلا خاص نمبر الاصلاح بعنوان ''ابنائے ندوہ کی قرآنی خدمات'' نکلا جس کے تعلق سے حضرت رقم طراز ہیں:

''ہمارے علماء اساتذہ، مصنفین اور دیگر اصحاب درس وافادہ شخصیتوں نے قرآن مجید کو اپنی شخصیت کی تشکیل اور دوسروں کی تعلیم اور تربیت میں بنیادی حصہ رکھا ہے، ان میں جس کا جتنا تعلق اور رسوخ بڑھتا گیا اس کی حیثیت بھی بلند ہوتی گئی، ہمارے ندوہ کی شخصیتوں میں علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالباری ندویؒ، مولانا اویس نگرامی ندویؒ اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ ان سب کا تعلق قرآن مجید سے بہت گہرا تھا، ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی خصوصیات کو نمایاں کیا جائے اور ان کی قرآنی خدمات کو موضوع بنایا جائے۔اس کا ایک اجمالی خاکہ عزیزی مولوی زاہد عباسی ندوی نے تیار کیا ہے، یہ بھی لائق مطالعہ ہے۔امید ہے ان کی یہ کوشش ان کی دینی وعلمی ترقی کی بنیاد ثابت ہوگی۔''

۲۰۱۴ء میں ہی اس ناچیز کو عالمی سیمینار اورنگ آباد میں حضرتؒ کی سرپرستی میں علامہ شبلی کی شاعری میں ملت اسلامیہ کی دردمندی کے عنوان سے مقالہ پیش کرنے کا شرف حاصل ہوا اور اس کے بعد ۲۰۱۶ء میں حضرت سے باقاعدہ بیعت کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

۲۰۱۸ء میں دائر شاہ علم اللہ تکیہ کلاں رائے بریلی میں حضرتؒ نے بندۂ عاجز کا نکاح پڑھا کر تکمیل ایمان کی مبارک کڑی کو پورا کیا۔

ربط وضبط کا یہ مبارک سلسلہ دراز ہوتا پھر یہ ہوا کہ آپ نے قضا کی صدا کو قبول کیا اور بے شمار محبین کو سوگوار کر کے چلے گئے کہ

چھپ گئے وہ ساز ہستی چھیڑ کر
اب تو بس آواز ہی آواز ہے

تاج دارِ علم وحکمت

محمد نجم الدین ندوی
(رفیق دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی)

اکیسویں صدی میں عالم اسلام کی عظیم ومثالی ہستی اور ہند میں سرمایہ ملت کے نگہباں، مخدوم ملت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت ایک عظیم سانحہ ہے، حضرت' صدی کی تاریخ اور ایک زریں عہد کی آخری کڑی تھے۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ علم وحکمت، فکر وعمل، اخفائے حال وخلوت پسندی اور صبر وقناعت پسندی سے متصف اس خانوادہ کے چشم وچراغ تھے، جسے برصغیر ہندوپاک میں اسلامیت کی احیاء کی سب سے مؤثر اور پرجوش تحریک چلانے کا اعزاز وافتخار حاصل ہے، وہ خاندان سید احمد کے رکن ذی وقار تھے اور امام ملت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی سے ان کا قریبی رشتہ ہے یعنی وہ صاحب تذکرہ کے چھوٹے ماموں تھے۔

مولانا کا آبائی گھر علم ومعرفت، ذکر وفکر اور دعوت دین و اصلاح ملت میں نمایاں اس تاریخی بستی میں تھا جس کے سرخیل عظیم روحانی شخصیت شاہ علم اللہ تھے جنھوں نے اپنی نوجوانی میں اس علاقہ کو ذکر الٰہی سے آباد کیا، ان کی نسبت سے یہ بستی دائرۂ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں کہلاتی ہے، یہ چند گھرانوں کا چھوٹا سا ایک گاؤں ہے جو رائے بریلی شہر کے نواح میں واقع ہے اور ''اب تک ہر دور میں کوئی نہ کوئی اللہ والا فرشتہ صفت مرشد یہاں سے اٹھا اور اس نے دین کا چراغ روشن کیا، ان لوگوں نے محض اللہ کے نام کو آباد کرنے کے لیے اس سرزمین پر اپنا پڑاؤ ڈالا، اس کے انعامات سے مستفید ہوتے رہے اور آزمائشوں سے بھی دوچار ہوئے، راحت وآرام کی کچھ ساعتیں بھی ملیں اور افلاس کی سختیاں بھی برداشت کیں۔'' (خانوادۂ علم اللٰہی:۱۱)

مولانا اس خانوادہ سے نسبت رکھنے والوں میں سے ایک عظیم ہستی تھے، اور اسی بستی میں اکتوبر ۱۹۲۹ء میں پیدا ہوئے، یہیں پلے بڑھے، ان کی والدہ ماجدہ حکیم سید عبدالحی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء کی دختر نیک اختر تھیں، ابتدائی تعلیم اپنے وطن ہی میں گھر کے ماحول میں رہ کر حاصل کی، اور اس کے بعد لکھنؤ میں اپنے دونوں ماموں ڈاکٹر سید عبدالعلی اور امام ملت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نگرانی وسرپرستی میں حصول علم میں ہمہ تن وجان منہمک رہے، برصغیر ہندوپاک کی عظیم تاریخی درس گاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا اور یہیں رہ کر انہوں نے ۱۹۴۸ء میں تعلیم کی تکمیل کی، انہوں نے جن یگانۂ عہد اساتذہ سے تعلیم پائی اور استفادہ کیا، ان میں اکثر علم وادب میں ملک گیر شہرت رکھتے تھے، شاہ حلیم عطا محدث، مولانا سعید احمد ندوی، مولانا سید حمید الدین شہید، مولانا محمد ناظم ندوی، مولانا محمد اسحاق سندیلوی، مولانا محمد عمران خان، مفتی محمد سعید اعظمی اور مولانا سید نورالحسن سے بھرپور فیض حاصل کیا، لیکن ان کے مثالی وآئیڈیل ان کے ماموں جی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تھے کہ انہوں نے پوری زندگی اسی عظیم وعبقری شخصیت کے نقش پا پر قدم بہ قدم چل کر گزاردی اور ان کی زندگی میں انہی کے ذاتی سکریٹری ورفیق اور مشیر کی حیثیت سے ان کے جملہ امور میں مشیر اور معاون رہے۔

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی (سابق معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ) نے بڑی اہمیت سے یہ بات ذکر کی ہے کہ

''حضرت مولانا کو ان پر جتنا اعتماد تھا' وہ دوسری کسی شخصیت کو حاصل نہیں تھا۔'' (عہد ساز شخصیت:۷)

دارالعلوم کی تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد شعبۂ ادب عربی میں معاون مدرس ومعلم مقرر ہوئے تھے، دارالعلوم میں اپنی تدریسی زندگی کے آغاز کے بعد انہوں نے اپنے ماموں جی مولانا سید ابو الحسن علی ندوی اور پیرومرشد حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری کی تجویز ومشورہ سے ان بزرگان گرامی کی ہمراہی ومعیت میں حجاز مقدس کا سفر کیا، حج وعمرہ اور زیارت کی سعادت حاصل ہوئی اور وہاں علمی ودعوتی مقصد سے ایک سال قیام کا فیصلہ کیا گیا، ان کے رفقاء میں مولانا عبداللہ عباس ندوی، ڈاکٹر سید رضوان علی، مولانا سید محمد طاہر، مولانا عبدالرشید، قاضی معین اللہ ندوی تھے، مولانا محمد رابع صاحب دوسرے حج کے بعد لکھنؤ (ہندوستان) واپس آئے۔

حجاز مقدس میں یک سالہ قیام سے واپسی کے بعد شعبہ ادب عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر (ادیب دوم) مقرر ہوئے، مطالعہ، تدریس وتعلیم، طلبہ کی تربیت اور نصابی کتابوں کی تصنیف وتدوین میں لگ گئے، اور یہ سنہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے، ترقی کرتے ہوئے صدر شعبہ عربی اور بعد میں عمادۃ الکلیہ کے عہدہ پر سنہ ۱۹۹۳ء تک فائز رہے، اس طویل المدتی عہد میں ناظم ندوۃ العلماء کی سرپرستی ونگرانی میں عربی شعبہ کے نصاب ونظام کو بہتر اور مفید بنانے میں ان کا بڑا حصہ رہا اور انہوں نے شعبہ عربی ادب کے لئے منشورات من أدب العرب (طبع اول ۱۹۵۷ء، نامی پریس لکھنؤ) معلم الانشاء (حصہ سوم) (طبع اول ۱۹۵۶/۵۵ء) الادب العربی بین عرض ونقد (طبع اول سنہ ۱۹۶۵ء) تاریخ الادب العربی (طبع اول ۱۹۹۰ء) مختار الشعر العربی حصہ اول (طبع اول ۱۹۷۳ء) مختار الشعر العربی حصہ دوم (طبع اول ۱۹۸۳ء) جیسی بنیادی نصابی کتب کی تدوین میں اہم کردار ادا کیا۔

مولانا نے دارالعلوم میں نصوص عربی ادب، بلاغت، نقد اور تاریخ ادب عربی، جدید وقدیم ادب پڑھایا، جغرافی کے اسباق بھی وابستہ رہے، حدیث شریف کی کتابوں میں ریاض الصالحین من أحادیث سید المرسلین مولفہ امام نووی اور صحیح البخاری کے کچھ حصے بھی زیر درس رہے، عربی زبان وادب میں پوری مہارت کا سبھی کو اعتراف ہے اور اس کا اظہار بھی ہوا ہے، جغرافیہ ایک خشک فن کے طور پر مشہور ہے، لیکن ان کی اس فن میں مہارت اور رسوخ اس قدر تھا کہ ماہر جغرافیہ داں بلکہ بعضوں جیسے پروفیسر وصی احمد صدیقی (اسلامیہ ڈگری کالج شاہجہاں پور) نے انہیں ''البیرونی'' سے تشبیہ دی ہے، ان کے سفرنامے اور جزیرۃ العرب نامی کتاب اس تشبیہ کی دلیل وبرہان ہے، جب ان کی یہ کتاب منظر عام پر آئی تو ماہر القادری جیسے ادیب ونقاد نے کھلے دل سے اظہار واعتراف کیا کہ

''جناب مولانا سید رابع حسنی اس کتاب کی تصنیف وتالیف پر علمی دنیا اور خاص طور سے اسلامی دنیا کی طرف سے قدر وستائش کے مستحق ہیں، جغرافیہ کے ساتھ تاریخ وادب کے امتزاج نے اس کتاب کی جامعیت اور افادیت میں اضافہ کردیا ہے۔''

(ماہر القادری کے تبصرے: ۱۲۷)

اور جہاں تک فن تفسیر کی بات ہے اس میں آپ کی دلچسپی کا مظہر آپ کی تصنیف ''قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل'' اور ''اسلامی زندگی سورۂ حجرات کی روشنی میں'' کے علاوہ سورۂ انبیاء کی موضوعی تفسیر ''احتساب زندگی'' سورۂ یوسف کی ''صبر وتقویٰ کی زندگی'' اور ''حق وباطل کی کشمکش'' کے زیر عنوان پیش کی جاچکی ہیں، ان کے علاوہ قرآنی دروس کا ایک بڑا ذخیرہ محفوظ ہے، انہوں نے تفسیر میں مفردات القرآن کی شرح وتفہیم بڑی خوبی سے فرمائی ہے، اگر اس کو ایک رسالہ کی شکل دی جائے تو بیش بہا رسالہ مفردات القرآن کے موضوع پر تیار ہوجائے گا۔ بہرکیف قرآنی موضوع سے دلچسپی شروع ہی سے رہی مگر بہت دنوں تک تفسیر پڑھانے کا موقع نہیں ملا، مگر ہم یہاں اس بات کے اعتراف میں اپنے کو حق بجانب پاتے ہیں کہ جس طرح عربی زبان وادب اور اس کی تاریخ دلچسپی کا موضوع تھا، حقیقت یہ ہے کہ علم تفسیر بھی آپ کا کم پسندیدہ موضوع نہیں تھا بلکہ ڈاکٹر یاسین مظہر صدیقی ندوی آپ کے ابتدائی دور کے شاگردوں میں تھے' کہتے تھے کہ تفسیر آپ کا موضوع تھا۔ فہم قرآن کی جو روایت ندوۃ العلماء اور ابناء ندوہ میں قائم ہے اس سلسلہ کی اہم اور

سنہری کڑی تھے جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اور ان کے واسطہ سے علامہ سید سلیمان ندوی تک ایک مضبوط زنجیر ہے اور جہاں تک سیرت کے موضوع سے دلچسپی بلکہ والہانہ تعلق کی بات ہے تو انسان کی فکر میں دین کے بارے توازن واعتدال اس وقت پایا جاتا ہے جب وہ سیرت نبوی کا مطالعہ برابر کرتا ہے اور اس میں غور وفکر کی عادت ڈالتا ہے، مولانا نے شروع سے سیرت کا مطالعہ جاری رکھا اور عربی ماحول میں رہے اور دارالعلوم میں بھی سیرت نبوی اور فقہ سیرت کے موضوعات کا برسوں درس دیا اور ساتھ ہی غیر مسلموں کے ذہنوں میں پائی جانے والی غلط فہمیوں سے آگاہ بھی رہے، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سیرت کے سدا بہار موضوع پر ایک وقیع اور علمی کتاب آسان اسلوب ولہجہ میں ''رہبر انسانیت'' تیار کی، جس سے ان غلط فہمیوں کے ازالہ کرنے میں جو دشمن عناصر کے اذہان میں پرورش پارہے تھے' موثر اور مفید ثابت ہوئی، اس کتاب کے علاوہ ''نقوش سیرت'' بھی بہترین کتاب ہے، مولانا محمد رضوان القاسمی نے اس کتاب کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے کہ

''اس کتاب میں عصر حاضر کی مریضانہ ذہنیت اور بیمار فکر ونظر کے لئے شفا کا سامان بھی ہے۔'' (نقوش سیرت:۱۰)

ندوۃ العلماء کے احاطہ میں مغربی فکر وفلسفہ اور یورپ وامریکہ سے آرہے الحاد وارتداد کے مقابلہ اور نئی نسل کے مذہب واخلاق پر اعتماد کو بحال کرنے کی فکر واحساس پر لکھنؤ میں ایک ادارۂ تحقیق وتصنیف وجود پذیر ہوا، جسے ''اکیڈمی فار اسلامک رسرچ اینڈ پبلی کیشنز'' کے نام سے قانونی شکل حاصل ہوئی، مولانا کو ان کی فکری وانتظامی خوبیوں کو دیکھتے ہوئے شروع ہی سے اس کا سیکریٹری مقرر کیا گیا، ان کی سکریٹری شپ میں اکیڈمی نے ترقی کی اور پورے عالم میں اس کی ایک شناخت ہے، چار سو سے زائد کتب ورسالے شائع کرنے کا شرف اسے حاصل ہے۔ اسی ادارہ سے خود ان کی متعدد کتب اور رسالے بھی شائع ہوئے اور اہل علم ونظر اور اصحاب دین ودانش نے تحسین کی نظر سے دیکھا جن میں ''امت مسلمہ- رہبر اور مثالی امت'' کے علاوہ ''مسلم سماج- ذمہ داریاں اور تقاضے'' اور ''عالم اسلام اور سامراجی نظام- امکانات اندیشے مشورے'' خاص کر اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کی کتاب ''امت مسلمہ'' کی نسبت بعض اہل فکر ونظر نے امام ملت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شہرۂ جہاں کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر'' کا امتداد کہا ہے کیوں کہ اس میں اہل اسلام کو ان کا مقام ومرتبہ اور امت کو اس کا کمال واعتدال یاد دلایا گیا ہے اور مغرب کے اثر سے مشرقی اسلامی ثقافت میں سرایت کر جانے والے مضرات ونقائص کی نشان دہی کی گئی اور ان تمام کے ازالہ کی فکر ورہنمائی کی گئی ہے، پوری کتاب وسیع وگہرے مطالعہ کے نتیجے اور گراں بہا معلومات سے پُر ہونے کے ساتھ عمل وکردار پر ابھارنے اور امت کی رہبری کا جذبہ بیدار بلکہ پیدا کرنے والی انمول تصنیف ہے۔

اچھے معاشرہ کی تشکیل اور اس کی تعمیر وقت کی آواز ہے، صالح معاشرہ کی تعمیر کے لئے افراد کی تیاری ناگزیر ہے، اور یہ کہ اصلاح کی ابتدا انسان اپنی ذات سے شروع کرے، اور معاشرہ میں پائے جانے والے امراض کے علاج کی فکر کی جائے، مولانا نے اصلاح معاشرہ کی صدا اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ لگائی، معاشرہ کے ہر ایک فرد کو اس کی دعوت دی، اس کے تقاضے اور ذمہ داریوں سے آگاہ کیا، اور اس کی اہمیت کو بڑی خوبصورتی سے بتایا کہ

''ہماری انسانی زندگی میں عبادات کا پہلو تو مذہبی اہمیت وخصوصیت کا سمجھا ہی جاتا ہے لیکن زندگی کے عام معاملات، اخلاق اور دیگر طور طریق کے سلسلہ میں عموماً اس بات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ان کے سلسلہ میں مذہبی ہدایات کیا ہیں؟ اور ان کی تابع داری ٹھیک طور پر کرنے پر ان طور طریق کو بھی عبادت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے، مذہبی ہدایات کی صحیح پابندی نہ ہو تو عبادات کے پہلو بھی عبادات کے فائدہ سے خالی ہو جاتے ہیں، اس لیے بہت ضروری ہے کہ زندگی کے سارے پہلوؤں میں رب العالمین کی طرف سے دی گئی ہدایات کی پابندی کی جائے۔'' (مسلم سماج- ذمہ داریاں اور تقاضے:۷)

مولانا جہاں ایک جہاں دیدہ مفکر، یگانۂ زمانہ عالم دین اور مایۂ ناز ادیب تھے وہیں ایک باکمال ومتوازن فکر ونظر کے مصنف بھی تھے، انہوں نے سو پچاس نہیں ہزاروں صفحہ وقرطاس دعوت دین اور اصلاح امت کی خاطر سیاہ کیے، درسی ونصابی کتب تیار کر کے نئی نسل کو علم وادب سے آراستہ کیا اور نظام تعلیم وتربیت کی اصلاح کی آواز بلند کی اور مضامین لکھے، عالم اسلام اور خاص طور پر عالم عربی کو اس کا مقام یاد دلایا اور امت مسلمہ کی عظمت رفتہ کی بحالی کی فکر ودعوت کو لے کر عالم عرب کے اسفار کیے، اعلیٰ سطحی مجالس میں شرکت فرمائی اور یورپ کے قلب میں اسلامک سینٹر کے قیام میں اہم کردار ادا کیا اور یورپ اور امریکہ کے تاریخی ودعوتی دورے کر کے وہاں کے باشندگان کو اسلام اور اس کی خوبیوں کو اختیار کرنے اور اپنی زندگیوں میں اپنانے کی دعوت دی، ادب اسلامی کے سفیر بن کر کیا عرب کیا عجم ہر جگہ گئے اور اصحاب علم وادب میں ادب اسلامی کا تعارف کیا اور دعوت فکر وعمل دی، ان تمام امور اور کاموں کے لئے انہوں نے قلم وزبان اور تحریر وتقریر کا استعمال کیا، ان کے قلم سے نکلنے والے مضامین ومقالات اور کتابوں کی تعداد تین درجن سے زائد ہے، مولانا کے مضمون یا کتاب کی زبان سلیس آسان اور عام فہم ہوتی ہے، اپنے اور غیر سب کے اذہان کو سامنے رکھ کر لکھنے کے عادی تھے، اور سب سے بڑھ کر دین کے متوازن تصور کا اعلیٰ مذاق حاصل تھا، یہی وجہ ہے کہ ان کی تصنیفات ورسائل اہل فکر ونظر، علماء، ادباء اور وجہاء، طلبہ علوم اسلامیہ، شائقین زبان وادب اور عام مسلمانوں اور غیر مسلم طبقہ ہر ایک گروہ کے لیے مفید ومؤثر ہیں۔ کیوں کہ بقول پروفیسر وصی احمد صدیقی: ''مولانا رابع صاحب کا جو مخصوص طرز انشاء ہے اس نے مضمون کو جاذب نظر بنا دیا ہے، دماغ اور دل دونوں کی راحت کا باعث ہوتا ہے۔'' (فتوحات ندویہ:۱۸۹)

مولانا کی تصنیفات ورسائل میں قارئین ہمیشہ دیکھیں گے کہ ان میں پورا اعتدال اور توازن پایا جاتا ہے اور یہ کہ ہر دور اور عہد میں اسلام پوری دنیا کی قیادت وسیادت کی صلاحیت رکھتا ہے، کیوں کہ اس دین کی خصوصیت اپنے جہاں اور کائنات کا احتساب ہے، مولانا کی تحریروں میں یہ بات اس لئے پائی جاتی ہے کہ اس کی اساس کتاب الٰہی، سیرت نبوی کے ساتھ تاریخ کا گہرا اور وسیع مطالعہ اور غور وفکر ہے۔

اختلاف فکر ونظر اور مذاہب ومسالک کے متضاد ہونے کے ساتھ مسلمانانِ ہند کے آپسی اتحاد وتعاون اور تحفظ دین وملت کی اتحادی کوشش کا مظہر، کل ہند مجلس شرعی عائلی قانون (آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) ہے، اس متحدہ مضبوط محاذ کی تشکیل اقلیتی طبقہ کے کاروان ایمان ویقین کے تحفظ شریعت کی تاریخ ہے، اس نے اپنی تشکیل کے وقت سے تحفظ شریعت کے اصل کام کی خاطر جدوجہد کی، اور برابر کر رہا ہے، امام ملت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے الفاظ میں:

''ایک آل انڈیا بورڈ کی تشکیل ہوئی... اور اس طرح اس مبارک مہم کا آغاز ہوا جو مسلمانوں کے لیے (دینی وشرعی نقطۂ نظر سے) موت وحیات کا مسئلہ ہے اور یہ جدوجہد ابھی تک جاری ہے۔''
(کاروان زندگی: ۲/ ۱۳۸، مکتبۂ اسلام لکھنؤ)

بورڈ کے صدر فقیہ ملت قاضی مجاہد الاسلام قاسمی کی وفات سے خالی مؤقر مگر حساس ترین اعلیٰ منصب پر متضاد مسالک کے نمائندگان اور مختلف اہل فکر ونظر نے بغیر کسی اختلاف کے فائز ومقرر کیا۔ یہ سنہ ۲۰۰۲ء ماہ اپریل کی بات ہے، اس وقت سے اب تک جس کی مدت بیس سال پر محیط ہے، صدارت عالیہ کے پروقار وپرخطر منصب پر رہ کر سرمایۂ ملت ہندیہ کی نگہبانی فرمائی اور فکری قیادت کی، جب کہ اس کے پہلے دوسرے اور تیسرے صدر کو انہوں نے تقویت فراہم کی اور ہر موقع پر ان کا ساتھ دیا وہ بورڈ کی تاریخ کا بھی ایک روشن حصہ ہے۔

مسلم عائلی وشرعی قانون کا آل انڈیا یہ بورڈ چونکہ ہندوستان میں مذہبی امور بالخصوص عائلی شرعی قانون مسلمانوں کا متحدہ اور نمائندہ ادارہ ہے، خود اس کی حفاظت اور اس میں توازن واتحاد ناگزیر ہے، مولانا کو اس کی ہمیشہ فکر دامن گیر رہی، انہوں نے سترہواں اجلاس بورڈ (منعقدہ مونگیر) کے موقع پر اپنے خطبہ میں فرمایا تھا کہ

''بورڈ کی یہ اولین ذمہ داری ہے کہ بورڈ انفرادی نیز جماعتی تفرقہ واختلاف سے بچتے ہوئے کوشش کرتا رہے، بورڈ کی قوت وطاقت اسی رویہ میں مضمر ہے،اس کے لئے بورڈ پر یہ بات بھی عائد ہوتی ہے کہ بورڈ جس مقصد کے لیے وجود میں آیا' وہ اپنے کو بنیادی طور پر اسی کے ساتھ مربوط رکھے،اس کے علاوہ دیگر ثانوی اور ذیلی سطح کے معاملات میں اپنے کو زیادہ مشغول نہ کرے۔''

(صدارتی خطبہ سترہواں اجلاس بورڈ،مونگیر)

ہندوستان کی اس دھرتی پر مسلمان اقلیت میں آباد ہیں اور جب کہ دوسری قومیں اکثریت میں رہتی ہیں،اس لیے اکثریت اور حکومت چاہتی ہے کہ یہاں اس ملک میں موقع موقع سے قومی سالمیت اور یک جہتی کی دہائی دے کر یکساں سول کوڈ کے نفاذ کی بات کی جاتی ہے، جب کہ ملک کا دستور وقانون ہر مذہب والے کو اس کے اپنے مذہب پر عمل کی پوری آزادی وحق دیتا ہے،لیکن اگر قانون شریعت کے کسی جزء کے خلاف چیلنج کیا جائے تو قانون اور جمہوری طریقہ کار سے فائدہ اٹھا کر اس چیلنج اور مشکل کا حل نکالنا شریعت اسلامیہ کی حفاظت وصیانت کے لئے لازمی اور ناگزیر ہے۔اس سلسلہ میں پرسنل لاء بورڈ کے صدر ذی احترام نے شریعت کی پاسبانی ونصرت کے بارے میں اہل وارکان بورڈ سے دو اہم پہلو ذکر کیے ہیں کہ

''بورڈ نے شریعت اسلامیہ کی نصرت کی دوطرفہ ذمہ داری لی ہے،ایک ذمہ داری اسلامی شریعت کو غیروں کی طرف سے خطرہ پیش آنے کی صورت میں بچانا ہے، اس کے لئے جو قابل عمل وسائل کورٹ سے تعلق رکھنے والے ہیں یا قانون ساز ادارہ سے تعلق رکھتے ہوں' ان کو اختیار کرنا ہے۔شریعت اسلامیہ کی نصرت کا دوسرا پہلو خود مسلمانوں میں شریعت اسلامی پر عمل کرنے میں جو کوتاہیاں ہیں' ان کو روکنا ہے۔'' (خصوصی اشاعت مجلّہ المومنات لکھنؤ:۴۴)

اور ان دو میں پہلی شئی کے تین پہلو قانون اور ہم وطنوں میں کام سے وابستہ ہیں اور دو مسلمانوں سے؛ جنہیں ہم بورڈ کے لئے پانچ اہم نکات وخطوط سے تعبیر کر سکتے ہیں،صدر بورڈ ان متعینہ خطوط کی شرح کرتے ہیں؛(۱) ایک تو شریعت کو حکومت یا اکثریت کی دخل اندازی سے محفوظ رکھنا ہے، اس کے لئے جہاں قانون کے سہارے کی ضرورت پڑتی ہے تو قانون کا سہارا لینا ہے۔(۲) اگر ذمہ دارانِ حکومت کے ساتھ افہام وتفہیم کی ضرورت ہو تو اس ذریعہ کو اختیار کرنا بھی بورڈ کی ذمہ داری ہے۔(۳) ہم وطن غیروں کے ذہنوں میں شریعت اسلامی کے بارے میں جو غلط فہمیاں ہیں' ان کو دور کیا جائے، اس کام کو دعوتی اور علمی انداز میں اور ذرائع ابلاغ کو مہارت وقابلیت کے ساتھ استعمال کرنے سے انجام دیا جاسکتا ہے، اور یہ کام ایسے ملک میں جہاں ہم غیروں کے بیچ میں رہتے ہیں' اہم اور بنیادی کام ہے،اگر اس کا بھرپور طریقہ سے اور اخلاق ومحبت کے انداز سے کیا جائے تو مسلمانوں کے بہت سے وہ مسائل جو وطنی بنیاد پر الجھتے چلے گئے ہیں' بڑی حد تک حل ہو سکتے ہیں۔'' اور دو اہم اور بنیادی کام جو اہل اسلام کے کرنے کے ہیں جن پر عمل سے تحفظ شریعت کی خاطر نعروں اور احتجاجوں کی چندہ ضرورت نہیں ہوگی،اس سلسلہ میں انہوں نے دو کاموں کی توجہ مبذول فرمائی، اگر ان پر عمل کیا جائے گا تو خود بخود مسائل کے حل میں بڑی مدد ملے گی اور معاشرتی سکون وعافیت بھی پائی جائے گی اور ساتھ ہی ستھرا اور نمونے کا ایک معاشرہ بنے گا؛(۱) تحفظ شریعت کا ایک اہم پہلو جو بڑا بنیادی اور اہم ہے، وہ یہ ہے کہ خود مسلمانوں کی زندگی میں تحفظ شریعت ہو، کیوں کہ یہ بات معقول اور مناسب نہیں کہ ہے کہ ہم حکومت سے اور عدالت سے کہیں کہ ہماری شریعت میں تبدیلی یا مداخلت نہیں ہو سکتی اور ہم خود اپنے معاشرہ میں شریعت محفوظ وقائم نہ رکھیں۔(۲) تحفظ شریعت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کی عائلی زندگی میں جو نزاعات ابھرتے ہیں' ان کے حل کے لیے ہم کو ان عدالتوں سے رجوع کم سے کم کرنا چاہیے جہاں اسلامی عائلی قوانین سے واقفیت یا ان کی پسندگی نہیں ہے، کیوں کہ ان سے ہمارے لیے مطلوبہ حل حاصل کرنا مشکل ہے اور عدالتوں میں مقدمات کی کثرت کی وجہ سے فیصلہ آنے میں بہت تاخیر بھی ہوتی ہے، اس طرح کے

امور کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ دارالقضاء قائم کیے جائیں اور مسلمانوں کو اپنے شرعی نزاعات ان میں لے جانے کو کہا جائے۔''

(مسلم پرسنل لا بورڈ مزاج اور طریقہ کار: ۴-۵، مطبوعہ لکھنؤ)

انہوں نے بورڈ کے ارکان وذمہ داران کو اجتماعیت واتحاد اور آپسی تعاون اور کسی مسئلہ میں سنجیدگی سے اس کو حل کرنے کی دعوت دی اور جلد بازی سے گریز کرنے کی بات کہی اور کسی مسئلہ کے بیان اور اس کے اعلان میں بورڈ کا لائحۂ عمل بھی بیان کردیا ہے، ذیل میں صدارتی خطبہ کے اس اقتباس کو ملاحظہ کیجیے جس میں انہوں نے میں فرمایا تھا کہ

''ہم کو بورڈ کی اہمیت اور اس کے آپسی تعاون وموافقت کی اہمیت کو بھی برابر اپنی توجہ وفکر میں رکھنا ہے تاکہ بورڈ کی اجتماعیت جو کہ اس کی بڑی طاقت ہے' برقرار رہے، کام کرنے والوں میں کسی کسی وقت کسی کسی معاملہ میں اگر کوئی کمی کمزوری محسوس ہو تو اس کو انفرادی سطح پر دور کرنا ہے تاکہ ملت کے اتحاد کی بنیاد کو نقصان نہ پہنچنے دیا جائے، اس طرح یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بنیادی معاملات کے سلسلہ میں اگر کوئی نئی نقصان رساں بات اچانک پیش آجاتی ہے تو جب تک اس کا مالہ وماعلیہ اچھی طرح واضح نہیں ہو' اس پر تبصرہ کرنے اور بیان دینے میں اگر بورڈ کے ذمہ داروں کی طرف سے تاخیر ہو تو اس کو نامناسب نہ سمجھا جائے کیونکہ بورڈ کے ذمہ داروں کی طرف سے بیان دینے سے پہلے معاملہ کی پوری طرح سمجھ لینے کی ضرورت ہوتی ہے، اور کچھ تاخیر ہونا عیب کی بات نہیں، اس کو کوتاہی نہیں قرار دینا چاہیے۔'' (مجلّہ المومنات ۲۰۱۰ء)

مولانا کا صدارتی عہد سنہ ۲۰۰۲ء کے اپریل میں بلانزاع انتخاب سے شروع ہوا اور تاعمر اس مؤقر منصب پر جلوہ افروز رہ کر ملت اسلامیہ ہند کا مرکز اتحاد رہے، ان کے عہد صدارت میں ملک گیر پیمانہ پر کئی اہم کام انجام پائے، اصلاح معاشرہ کمیٹی کو وسعت دی گئی، دارالقضاء کی تحریک بھی پہلے سے چل رہی تھی اس کو مزید متحرک وفعال بنانے کے ساتھ وسعت بھی دی گئی اور نشیب وفراز سے گزرنے کے ساتھ اس میں برابر کامیابی حاصل ہوتی رہی، ملک کے طول وعرض میں زائد از پچاس دارالقضاؤں کا قیام عمل میں آیا۔ اجلاس بھوپال کے موقع پر تفہیم شریعت کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس کے سکریٹری مولانا خالد سیف اللہ رحمانی مدظلہ کو بنایا گیا، انہوں نے صدر ذی احترام کی سرپرستی وہدایات کی روشنی میں اس کے متعدد کامیاب جلسے کرائے اور تفہیم شریعت کے اس کام سے اپنوں اور غیروں میں بہتوں کے اذہان صاف ہوئے اور قانون شریعت کو سمجھنے کے مواقع میسر آئے۔

ملت اسلامی ہند کو قانون شریعت کے تحفظ کی تاریخ میں بعض ایسے دل خراش واقعات پیش آئے کہ ملت کے سرفروشوں نے جوش کے ہوش سے کام لیا، یہاں کی سرزمین پر وقفہ وقفہ سے قانون شرع کی ترمیم وتنسیخ کا مطالبہ کیا جاتا ہے، حکومتی واکثریتی طبقہ بھی یہی چاہتا ہے اور ذرائع ابلاغ ومیڈیا بھی ہوا کے رخ پر لتے ہیں اور عدلیہ کے فیصلے بھی دستور ہند کی شرح کے بجائے بہت سے معاملات میں شریعت میں مداخلت کی کھلی دلیل ہے، ایسے موقع پر ایک طرف مسلمانوں میں غم وغصہ پایا جاتا ہے تو دوسری طرف غیروں خوشی کی لہر ہوتی ہے، ایسے میں ہم نے بارہا حضرت مولانا کو دیکھا کہ ان کا نہایت موزوں بیان نشر ہوتا ہے جس میں ایک طرف مسلمانوں کو تسلی اور صبر واستقامت کی تلقین کی جاتی ہے تو اس میں غیروں اور اہل حکومت وعدلیہ کے لیے پیام ہوتا ہے، اس سلسلہ میں ہند کی عدالت عظمیٰ کے فیصلہ بابری مسجد ہی کو لیجیے، عدالت نے جملہ براہین وشواہد کو تسلیم کرنے کے بعد فیصلہ مسلمانوں کے حق نہیں دیا، جس کی وجہ سے تمام مسلمان میں مایوسی کے ساتھ غم وغصہ بھی تھا اور دوسری طرف غیروں میں ان کے حق میں فیصلہ آنے کی خوشی کے ماحول، ایسے میں جو بیان جاری کیا گیا' وہ یقیناً وہی انسان کرسکتا ہے جس کو قرآن وحدیث اور سیرت وتاریخ کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہو اور اعلیٰ درجہ کی حمیت ایمانی اور غیرت ملی ودینی بھی حاصل ہو، صدر ذی وقار واحترام نے صدارتی بیان جاری کرتے ہوئے کہا جس کو ہزاروں نہیں لاکھوں

لاکھ کیا اپنے کیا غیر! سب نے سنا کہ وہ کہہ رہے ہیں کہ

''سپریم کورٹ نے اپنا فیصلہ سنایا ہے، مگر یاد رکھو کہ یہ عدالتی فیصلہ ہمارے جسموں پر تو نافذ ہوسکتا ہے لیکن ہمارے قلوب واذہان پر نہیں۔''

اس موقع پر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (سکریٹری جنرل آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) کی یہ بات یاد آتی ہے کہ

''مجھے مولانا کا جو وصف سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے وہ ان کے اندر کا پایا جانے والا سمندر کا سکوت اور زمین کا سا بچھاؤ اور جھکاؤ ہے اور اس وقت ملت اسلامیہ ہند جس نازک دور سے گزر رہی ہے اور جیسے مسائل سے دوچار ہے، ان کے حل کے لیے ایسی ہی قیادت مطلوب ہے جو حضرت عثمان غنیؓ کے الفاظ میں' قوال سے زیادہ فعال، جوش سے زیادہ ہوش سے کام لیتی ہو اور پتھر پھینکنے والے پر پھول برسانے کی صلاحیت رکھتا ہو۔'' (مسلم پرسنل لا بورڈ-کام اور پیام:۱۱)

بہرحال ان کے صدارتی دور میں کئی اجلاسہائے عام بھی ہوئے جن کی تعداد تقریباً گیارہ ہے، اور آخری بار صنعتی شہر کانپور میں اس کا اجلاس ۲۰۲۱ء کے نومبر میں ہوا تھا، اور جہاں تک عاملہ کے جلسوں کی بات ہے تو غالباً پینتالیس سے زیادہ مجلس عاملہ کے اجلاس ملک کے طول وعرض میں متعدد مناسبتوں اور فوری ضرورتوں کی بنا پر ہوئے، ان کی زندگی کا بورڈ کا اہم کارنامہ ''مجموعہ قوانین اسلامی متعلق مسلم پرسنل لا'' تدوین نو اور اشاعت ہے، اللہ تعالیٰ حضرت کی کاوشوں کا قبول فرمائے۔ ایسے اور بہت سے کام ہیں جن کی وجہ سے ڈاکٹر سید وقار احمد رضوی (پروفیسر کراچی یونیورسٹی، کراچی) نے آج سے چند سال پہلے اپنی تحریر میں بہترین خراج پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ

''اس وقت علمائے ہند میں مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا وجود بہت مغتنم ہے، وہ نہ صرف ندوۃ العلماء چلا رہے ہیں بلکہ پورے ہندوستان کی فکری رہنمائی فرما رہے ہیں۔''

(سید العلماء-احوال وآثار:۳۸۴، مکتبہ رشیدیہ کراچی)

مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ایک نامور وباکمال عالم دین، ممتاز مربی واستاد اور کامیاب مصنف ومرشد تھے اور اس کے ساتھ ہی ایک انتظامی امور کی صلاحیت سے بھرپور فائدہ اٹھانے کے لیے مولانا محبّ اللہ لاری ندوی کے بعد سنہ ۱۹۹۳ء کو دارالعلوم کے مؤقر عہدۂ اہتمام پر مقرر کیا گیا اور اہتمام کے آخری دو سال نائب ناظم کے مؤقر منصب پر بھی رہے، جنوری سنہ دو ہزار میں ناظم ندوۃ العلماء کا عہدۂ جلیلہ باتفاق رائے سپرد کیا گیا، نظامت کے اِن بائیس سالوں میں ندوۃ العلماء اور اس کے دارالعلوم کو حسن تدبیر اور خوش اسلوبی سے چلایا اور اس کی ہمہ جہت ترقی کے لئے کوشش کی، یہ تاریخ ندوہ کا ایک خوبصورت گوشہ ہے، متعدد دارالاقامے، درسگاہ کی نئی عمارت، ڈاکٹر عبدالعلی اسپتال کے علاوہ اسٹاف کوارٹرس کی تعمیری کام بہت اہمیت رکھتے ہیں، دارالعلوم میں نظام ونصاب کو بہتر سمت عطا کیا گیا، شعبۂ صحافت والسنہ، شعبہ انگریزی، فتاوی ندوۃ العلماء کی تدوین واشاعت، معہد الدرسات العلمیہ (انسٹی ٹیوٹ فار ریسرچ اینڈ ہائر اسٹڈیز) کی تاسیس، المعہد العالی للدراسات الشرعیۃ اور مجلس تحقیقات شرعیہ (شریعہ اکیڈمی فار ریسرچ اینڈ اسٹڈیز) کی تنظیم نو کے ساتھ ایک اور کلیۃ الدعوۃ والاعلام (کالج آف دعوہ اینڈ انفارمیشن) کی تشکیل واضافہ، مولانا ظہورالاسلام کمپیوٹر سینٹر، مسجد دارالعلوم کی آخری بار توسیع کا کام، احاطہ دارالعلوم میں محرک وبانی ندوۃ العلماء سے منسوب ہاسٹل کی تعمیر اور دیگر کاموں میں معہد ثانوی کا احاطہ دارالعلوم سے دس کلو میٹر کے فاصلہ پر سکروری میں قیام اور یہاں پر مسجد، درسگاہ اور دارالاقامہ کی تعمیر کا کام، معہد ابی بکر الصدیق مہپت مئو (لکھنؤ) کی سہ منزلہ عمارت کی تاسیس وتعمیر، مدرسہ مظہر الاسلام لکھنؤ میں ایک منزلہ مسجد تعمیر اور تعلیم ورہائش گاہ کی تعمیر، مدرسہ عثمانیہ رائے بریلی کا قیام وغیرہ بہت اہمیت رکھتے ہیں اور ندوۃ العلماء کی تاریخ جب رقم کی جائے گی تو کوئی مؤرخ ان خدمات اور کاوشوں کو نظر انداز ہرگز نہیں کرسکتا۔ کیوں کہ مولانا نے ندوہ کو ظاہری ومعنوی ترقی عطا کی اور اپنے پیشرو کی فکر ودعوت پر اپنے آپ کو قائم رکھا۔ ڈاکٹر مسعود الحسن عثمانی (جنرل

سکریٹری دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش) نے لکھا ہے کہ

''مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب دامت برکاتہم اس وقت اس کی فکری وراثت کے امین اور ایک جہاں دیدہ مخلص صاحب بصیرت محافظ کی حیثیت سے علمی اور دینی حلقوں میں محبوب ومقبول ہیں، مولانا علی میاں کی شخصیت کا ایک خوبصورت عکس جمیل، ان کے فکری توازن، تواضع اور انکسار ومحبت، رواداری اور مروت، طرز گفتگو کا دل نشیں انداز واظہار اس بات کی علامت ہے کہ وہ مولانا علی میاں اور ندوۃ العلماء کی تحریک ودعوت دونوں کے بہترین ترجمان اور اس پورے اثاثے کے ذمہ دار ونگہبان ہیں۔''

(مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی شخصیت اور خدمات: ۱۴-۱۵)

مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی مدظلہ (مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) رقم طراز ہیں کہ

''حضرت مولانا کے سچے جانشین اور ان کی فکر دین ودنیا کے حامل اور علمائے ندوۃ العلماء کی جامعیت کے مکمل نمائندے ہیں۔''

(مطالعۂ تصنیفات رابع: ۸، مطبوعہ لکھنؤ)

محترم سید علی اکبر رضوی (کراچی) اپنے سفرنامہ ہند میں رقم کرتے ہیں کہ

''محترم مولانا محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوہ اس وقت مولانا علی میاں مرحوم کے جانشین ہیں، خود اپنی علمی خدمات اور شگفتہ نگارشات کے سبب پورے عالم اسلام میں جانے جاتے ہیں، مولانا سے مختلف عنوانات پر گفتگو ہوتی رہی، مولانا کے انداز تکلم سے ان کا تقویٰ، تواضع، تبحر علمی اور انکساری پوری طرح نمایاں تھی، مولانا علی میاں مرحوم کے بعد نہایت سلیقے سے ندوہ کے نظم ونسق کو دیکھ رہے ہیں، پورا ندوہ اپنی جلوہ سامانیوں سے لبریز ہے، اس کے ایک ایک ذرہ سے علم وتحقیق کی بوئے حیات بخش آرہی ہے۔''

(بھارت یاترا: ۴۷، جاوداں کراچی)

ہمارے حضرت کی تعلیم وتربیت اور انتظامی امور کی دیکھ ریکھ اور بورڈ کے کاموں کا جائزہ، دینی وایمانی حفاظت کی کونسل کی جدو جہد کی برابر خبر گیری اور وعظ وارشاد کے ذریعہ عوام الناس اور خواص کی فکری ونظری قیادت کا سلسلہ اخیر روزِ حیات تک جاری وساری رہی اور گزشتہ ماہ رمضان المبارک کے عشرۂ اخیرہ میں ۲۱ر کو حادثۂ وفات پیش آیا، حضرت کی وفات اگرچہ اچھی عمر میں بمصداق "من طال عمره وحسن عمله" ہوئی، یہ خبر آئی ہی تھی کہ پورا عالم حزن والم میں ڈوب گیا، اور سب کو ایسا محسوس ہوا کہ وقت سے پہلے وفات ہوگئی اور سب نے ایک بڑا خسارہ اور ملت کا بڑا نقصان جانا، ان کے جانے سے جو خلا ہوا' اس کو آج بھی محسوس کیا جارہا ہے کیوں کہ ان کا سانحۂ ارتحال ایک عہد کا خاتمہ اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔

اللهم اغفرله وارحمه وأدخله الفردوس الأعلىٰ.

تعلیم اور نصاب تعلیم کی اہمیت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''تعلیم کا عمل انسان کے فکر ورجحان اور اس کی معلومات کو پروان چڑھانے نیز اس کو مخصوص انداز پر تشکیل دینے کا کام انجام دیتا ہے، اس سلسلہ میں استاد اور نصاب تعلیم کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے، استاد سے اس کا طالب علم صرف علم ہی نہیں حاصل کرتا بلکہ اس کے ذہن ورجحان سے بھی اثر لیتا ہے، اسی طرح نصاب تعلیم کا معاملہ ہے کہ نصاب تعلیم کی کتابوں کی صرف مندرجہ ذیل معلومات ہی سے وہ علمی وفکری فائدہ حاصل نہیں کرتا، بلکہ جس طرز پر اور جس ذہن سے اور جس اسلوب وانداز سے بات کہی گئی ہوتی ہے، اس اسلوب وانداز سے بھی متاثر ہوتا ہے، یہ وہ طریقہ ہے جو تعلیم حاصل کرنے والی نسل کو معینہ خیالات اور رجحانات کا حامل بناتا ہے اور اس طرح کوئی بھی نسل کسی بھی قوم یا کسی بھی مذہب کی ہو' اپنی پسند کے سانچہ کے بجائے استاد اور نصاب تعلیم کے اختیار کردہ سانچہ میں ڈھلنے لگتی ہے۔''

(ماخوذ از مقدمہ؛ سرکاری نصابی کتابوں کا قومی یکجہتی کے نقطہ نظر سے جائزہ: ۵)

جانشین مفکر اسلام "کاروان زندگی" کے آئینہ میں

محمد ارمغان بدایونی ندوی
(رفیق دار عرفات تکیہ کلاں- رائے بریلی)

اسلامیان ہند کی بساط پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا نام گرامی کئی حیثیتوں سے ممتاز ومنفرد مقام کا حامل ہے۔ خاندانی نسبتوں، اکابر ومشاہیر امت کی صحبتوں اور مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی قربتوں نے ان کی شخصیت کو ایسا حسن بخشا تھا کہ وہ کہکشاں کی انجمن میں ماہِ تمام اور آسمان علم وادب کے بدر کامل ہوگئے تھے، اللہ تعالیٰ نے انہیں بلند وبالغ نظر کے ساتھ اصابت رائے اور حکمت عملی کا انتہائی درجہ عطا فرمایا تھا۔

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی خود نوشت سوانح حیات ''کاروان زندگی'' کے صفحات اس بات کے گواہ ہیں کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ اپنے ماموں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کے حقیقی جانشین تھے، ان کے ہم مزاج اور ان ہی کے ہم رنگ تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ ان کی ذات بابرکت عہد بوالحسنی کا امتداد تھی، یا یوں کہہ لیں کہ عہد بوالحسنی کے بیشتر کارناموں میں ان کی شخصیت ایک بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔

ذیل میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی زبانی جانشین مفکر اسلامؒ کا ایک جامع تعارف نذر قارئین ہے جو ان کے اشہب قلم سے اس وقت حیطہ تحریر میں آیا جب ندوۃ العلماء کی مجلس نظامت نے حضرت مولانا رابع صاحب علیہ الرحمہ کو بالاتفاق مہتمم بنایا تھا:

''عزیز موصوف کامیاب استاذ، عربی زبان کے ایک ممتاز ادیب، باحث ونقاد، صاحب قلم اور مصنف ہیں، جن کی کئی تصنیف شدہ کتابیں دارالعلوم کے نصاب میں داخل ہیں، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نائب صدر اور عجمی ممالک کے لیے ذمہ دار اور سکریٹری (ناظم) اور اس کے اہم وفعال رکن اور مشیر ومعتمد ہیں، اس کے ساتھ وہ اسلامک اسٹڈیز آکسفورڈ یونیورسٹی کی عاملہ کے ممتاز رکن بھی ہیں، جو ہر سال اس کے سالانہ انتظامی جلسہ میں راقم کی رفاقت میں شرکت کے لیے انگلستان جاتے ہیں۔ چاٹگام، استنبول اور سعودی عرب کے ادب اسلامی کے جلسوں میں انہوں نے ذمہ دارانہ اور منتظمانہ کردار ادا کیا ہے، رابطہ کے ہندوستان میں ترجمان، سہ ماہی رسالہ ''کاروان ادب'' کے وہی مدیر مسئول اور روح رواں ہیں، ندوۃ العلماء کے عربی رسالہ ''الرائد'' اور ماہانہ مؤقر رسالہ ''البعث الاسلامی'' کے بھی اہم مضمون نگاروں میں ہیں، ندوۃ العلماء کی فکر، خصوصیات وامتیازات اور اس کے علمی، ذہنی اور دینی مزاج کے نہ صرف حامل بلکہ اس کے داعی، ترجمان اور عملی پیکر بھی ہیں۔'' (۶/۱۲-۱۳)

''کاروان زندگی'' میں متعدد مقامات پر حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے حضرت مولانا رابع صاحبؒ کا ایسے بلند الفاظ میں ذکر کیا ہے جس سے ان کے تعلق اور مزاج شناسی کا علم ہوتا ہے مثلاً:

''میرے بھانجے مولوی سید محمد رابع ندوی میرے مشیر ومعاون ہیں اور سفروں کے انتظامات بھی دیکھتے ہیں۔'' (۲/۲۱۲)

ایک جگہ لکھا ہے کہ ''عزیز القدر مولوی سید محمد رابع ندوی کو بھی ساتھ جانا مفید ومعاون تھا، اس لیے ان کو بھی ساتھ لیا۔'' (۶/۲۱۳)

کہیں یہ مشفقانہ انداز بھی نظر آتا ہے کہ ''عزیزی مولوی محمد رابع ندوی نے ہماری پرانی بات نقل کی۔'' (۷/۲۴۴)

کہیں لکھا ہے کہ ''عزیز القدر مولوی محمد رابع ندوی نے بڑے کام کی بات کہی.....'' (۶/۱۲۶)

کہیں لکھا ہے کہ ''عزیزی محمد رابع سلمہ کو یہ خیال خوب آیا...'' (۵/۲۴۳)

کہیں لکھا ہے کہ ’’عزیز رفیق کے اس کہنے کی بنا پر....‘‘
(۲۳۸/۵)

کہیں اپنے متعلق موصول ہونے والے دعوتی خطوط کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ’’عزیزی محمد رابع سلمہ ان پیغامات کو وصول کرتے رہے اور سفر کی دشواریوں کا عذر کرتے رہے۔‘‘(۷۲/۶)

کہیں لکھا ہے کہ ’’عزیز القدر مولوی سید محمد رابع ندوی (مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء) کو بھی اس کا احساس ہوا کہ خواہ تھوڑا وقت صرف کیا جائے مگر یہ سفر ضروری ہے، انہوں نے ——— تین ٹکٹ حاصل کرنے کی کوشش کی۔‘‘(۱۱۷/۷)

ایک جگہ لکھا ہے کہ مجھے عالمی کانفرنس میں شرکت کے لیے مدعو کیا گیا، جس میں ہندوستان کی بہت سی اہم دینی شخصیتوں، علماء اور زعماء اور مختلف جماعتوں واداروں کے سربراہوں کو دعوت دی گئی تھی، اس کے لیے میں نے بھی اپنی جانب سے چند اہم نام پیش کیے، پھر اخیر میں لکھا ہے کہ ’’عزیزی محمد رابع ندوی کا اضافہ کیا جو راقم کے مستقل رفیق سفر اور معاون ہوتے ہیں۔‘‘(۲۹۳/۴)

ایک جگہ رابطہ عالم اسلامی کی سالانہ مجلس تاسیسی کے اجلاس میں شرکت کا ذکر کرتے ہوئے یہ بلند الفاظ بھی تحریر کیے ہیں:

’’اس سفر میں عزیز القدر مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی کی رفاقت رہی، جن کی معیت کو اس طرح کے اسفار میں عموماً ترجیح دیتا ہوں، اس لیے کہ ان سے بڑی مدد اور مناسب مشورہ ملتا ہے۔‘‘(۳۵/۴)

ایسے ہی رابطہ ادب اسلامی کی ایک عالمی کانفرنس میں شرکت کے موقع پر بھی حضرت مولاناؒ نے ان کے متعلق لکھا ہے:

’’عزیزی محمد رابع ندوی ان سفروں میں عام طور پر رفیق سفر ومعاون ہوتے ہیں اور بحیثیت رابطہ کے جنرل سکریٹری اور نائب صدر ہونے کی حیثیت سے ان کی شرکت ضروری اور قدرتی تھی۔‘‘
(۹۱/۴)

ایک جگہ تین براعظموں (افریقہ-یورپ اور ایشیا) کے اسفار اور ان کے التوا کی کہانی نقل کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

’’ہندوستان میں واقع مراکشی سفارت خانہ نے اس سلسلہ میں بار بار راقم سے اور عزیزی مولوی محمد رابع حسنی سے ٹیلیفون کے ذریعہ رابطہ قائم کیا اور اس کا اطمینان دلایا کہ سفر کے سلسلہ کے سارے انتظامات موجود اور مکمل ہیں اور اس کا بھی اشارہ کیا کہ شاہ مراکش بھی اس کے خواہش مند ہیں کہ یہ سفر کیا جائے۔‘‘
(۲۸۸/۴)

ایک جگہ کسی سفر کی روداد قلم بند کرنے میں اپنے میزبانوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ’’اس سلسلہ میں وہ عزیز القدر مولوی محمد رابع ندوی سے خط وکتابت کر رہے تھے کہ وہ ہمیں اس مجلس میں شرکت پر آمادہ کریں۔‘‘(۳۴۲/۶)

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے اپنے حقیقی جانشین حضرت مولانا رابع صاحب علیہ الرحمہ کو محض علمی وادبی اسفار ہی میں اپنا رفیق سفر اور معاون نہیں بنایا، بلکہ سیاسی لوگوں سے اہم ملاقاتوں میں بھی وہ ان کے رفیق ومعاون رہے جس کی نظیریں موجود ہیں۔

۱۹۷۶ء میں جب وزیر اعظم اندرا گاندھی جی سے ایک اہم مسئلہ کے پیش نظر ملاقات کرنی پڑی تو فرماتے ہیں:

’’میری نظر کمزور تھی، اچانک عزیزی رابع نے مجھے یہ کہہ کر متوجہ کیا کہ ماموں جی! پرائم منسٹر آپ کے سامنے کھڑی ہیں۔‘‘
(۲۱۴/۲)

۱۹۹۳ء میں جب وزیر اعظم نرسمہا راؤ جی سے ملاقات ہوئی تو لکھا ہے کہ اس موقع پر ’’عزیز القدر مولوی محمد رابع حسنی ندوی (صدر شعبہ ادبیات عربی دار العلوم ندوۃ العلماء جو اس سفر میں ساتھ آئے تھے) اس ملاقات کے موقع پر موجود تھے۔‘‘
(أیضا: ۱۴۶/۵)

۱۹۹۶ء میں جب نئے وزیر اعظم مسٹر دیوگوڑا صاحب حضرت مولانا سے ملاقات کے لیے تشریف لائے اور اس وقت لکھنؤ کے ’’قومی آواز‘‘ نامی اخبار میں رپورٹ نشر ہوئی، اس میں بھی ذکر ہے کہ ’’ملاقات کے دوران مولانا محمد رابع حسنی ندوی بھی موجود تھے۔‘‘
(۲۵۲/۶)

۱۹۹۷ء میں رابطہ کی طرف سے لاہور کا تاریخی بین الاقوامی

سیمینار ہوا، جس کی صدارت صدر پاکستان سردار فاروق احمد خاں لغاری نے کی، پنجاب کے گورنر جناب شاہد حامد صاحب، چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت پاکستان محبوب احمد صاحب بھی اجلاس میں شریک رہے، اس موقع پر بھی مولانا رابع صاحبؒ نہ صرف یہ کہ موجود تھے بلکہ ایک فعال عنصر کی طرح سرگرم تھے، لکھا ہے کہ

''مولوی سید محمد رابع حسنی نے تعارفی کلمات ادا کیے۔'' (۵۴/۷)

اس کے بعد تحریر فرماتے ہیں کہ ''رابطہ کی چوتھی نشست کی صدارت مولوی سید محمد رابع ندوی نے کی۔'' (۵۶/۷)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی قیادت میں جو بھی سیمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوتیں، ان کے لیے زمین کو ہموار کرنا اور ان کی کامیابی کے لیے منصوبہ بند حکمت عملی اختیار کرنا' حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے ذریعہ ہی ممکن تھا، درج ذیل سطور میں اسی سلسلہ کی چند جھلکیاں قارئین کرام کی نذر ہیں:

۱۹۸۱ء میں جب ندوۃ العلماء میں رابطہ ادب اسلامی کا ایک بین الاقوامی سیمینار منعقد ہوا، تو اس میں مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاںؒ نے حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی شبانہ روز محنتوں کا یوں ذکر خیر کیا ہے کہ ''عزیزی محمد رابع ندوی اس پورے مذاکرہ کے روح رواں تھے، وہی اس مجلس کے ذمہ دار قرار دیے گئے۔'' (۳۳۳/۲)

۱۹۸۲ء میں جب دار المصنفین کی جانب سے ''اسلام اور مستشرقین'' جیسے اہم عنوان پر ایک بین الاقوامی سیمینار کا انعقاد ہوا اور صف اول کے لوگوں نے اس میں شرکت کی، اس کا بنیادی خاکہ بنانے' ضروری مشورے دینے اور رہنمائی کرنے میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے پوری دلچسپی لی لیکن ان تمام مواقع پر ان کے عزیز بھانجے بھی موجود رہے، حضرت مولانا فرماتے ہیں: ''میں اور عزیزی محمد رابع اس کے مشوروں میں شریک تھے۔'' (۳۴۸/۲)

اسی سیمینار کے موقع پر ایک ایسا دل دوز حادثہ بھی پیش آ گیا جس سے نبرد آزمائی کے لیے ایمان کی انتہائی بلندی چاہیے، مفکر اسلام کے سگے بھانجے اور حضرت مولانا رابع صاحبؒ کے بڑے بھائی مولانا سید محمد ثانی حسنیؒ کا سانحہ وفات ۱۶/فروری ۱۹۸۲ء کو ہوا، جس کے بعد اس سیمینار میں شرکت کا فیصلہ یقیناً بڑا دشوار تھا، مگر اس موقع پر بھی آپ حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی ہمت وعزیمت اور ان کی مستعدی کا بچشم خود مشاہدہ کیجیے، حضرت مولاناؒ لکھتے ہیں:

''عزیز القدر سید محمد رابع ندوی سلمہ کی ہمت کو دیکھ کر جو عزیز مرحوم کے حقیقی چھوٹے بھائی ہیں (بارک اللہ فی حیاتہ) اور جن کے سامنے محبوب بھائی کی بیماری اور جدائی کے سارے مراحل گذرے تھے' ہمت بندھی۔'' (أیضا: ۳۴۹)

۱۹۸۴ء میں جب عربی ادب کے ممتاز علماء کا ایک وفد حضرت مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے درخواست کی کہ رابطہ کو بین الاقوامی تنظیم کی حیثیت سے قائم کیا جائے اور عرب دانشوروں کی ایک ایسی کمیٹی تشکیل دی جائے جس میں مراکش اور الجزائر سے لے کر خلیج کی ریاستوں کے ادباء اور اہل قلم بھی نہ صرف یہ کہ شریک ہوں بلکہ اس کی رکنیت میں شامل ہوں۔ اس اہم اور تاریخ ساز موقع پر من جملہ تمام ذمہ دارانہ امور کے بقول حضرت مفکر اسلامؒ ایک اہم بات یہ بھی طے ہوئی کہ ''عزیزی مولوی محمد رابع ندوی (عمید کلیة اللغة العربیة) اس کے جنرل سکریٹری ہوں گے۔'' (۲۸/۳)

کسی بھی تنظیم کے جنرل سکریٹری کی ذمہ داریوں اور آرام وراحت کو قربان کر دینے والی مصروفیتوں سے ہم سب واقف ہیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت مولانا نے ان کی خدمات کا کھل کر اعتراف کیا:

''عزیزی مولوی محمد رابع ندوی رابطہ کے اکثر جلسوں اور سعودی عرب وحجاز کے مجالس وتقریبات میں زیادہ تر میرے ہم سفر اور معاون رہے ہیں اور وہاں کی شخصیتوں اور حالات سے سب سے زیادہ واقف ہیں۔'' (۲۸۱/۳)

۱۹۸۷ء میں رابطہ ادب اسلامی کی جانب سے منعقدہ سیمینار بعنوان ''اردو ادب پر حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کا اثر'' کا ذکر کرتے ہوئے مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی خدمات کو یوں سراہا ہے:

''یہ (سیمینار) رابطہ ادب اسلامی کے سکریٹری مولوی سید محمد

رابع ندوی ـــــــ کا انتخاب کیا ہوا موضوع اور منصوبہ تھا۔‘‘
(۳/۳۱۱)

۱۹۹۰ء میں جب رائے بریلی میں ’’حمد ومناجات‘‘ کے عنوان پر تاریخی سیمینار ہوا اور حضرت مولاناؒ کی نسبت پر حجاز مقدس کی اہم شخصیات تشریف لائیں، اس کی کارگزاری کے ذیل میں حضرت مولاناؒ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اس میں مرکزی کردار کس کا تھا؟ فرمایا:

’’راقم اور اس کے رفیق عزیزی مولوی محمد رابع ندوی نے حجاز کے چند ممتاز ادباء اور اہل قلم کو بھی اس کی دعوت دی۔‘‘ (۴/۳۱۸)

اسی سال لکھنؤ میں رابطہ ادب اسلامی کی جانب سے ایک اہم کانفرنس بعنوان ’’مقامات مقدسہ-خطرات اور اندیشے‘‘ منعقد ہوئی جس میں ہندوستان کے مقتدر علمائے کرام کے ساتھ قدرآور سیاسی شخصیات بھی موجود تھیں، اس کانفرنس کا سب سے اہم جز بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ رقم طراز ہیں:

’’سیمینار کا سب سے اہم اور پراز معلومات مضمون مولوی محمد رابع ندوی کا مقالہ ’’صدام حسین کی جارحیت‘‘ کے عنوان سے تھا، جس میں مشہور قوم پرست اور لادینی پارٹی ’’البعث العربی‘‘ پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی، جس کے صدام حسین خاص طور پر داعی وحامی اور عراق میں اس کے سرپرست ومحافظ ہیں۔‘‘ (۴/۳۱۶)

۱۹۹۴ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عظیم الشان ’’اصلاح معاشرہ کانفرنس‘‘ کا انعقاد ہوا، اس کے تذکرہ میں فرماتے ہیں:

’’دارالعلوم کے ذمہ داروں بالخصوص مہتمم دارالعلوم مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی کی تحریک ودعوت پر ۳۰؍جولائی ۱۹۹۴ء کو دارالعلوم کے اندر بھی اصلاح معاشرہ کانفرنس کا انتظام کیا گیا۔‘‘ (۶/۲۷)

جس زمانہ میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ تحریک ندوۃ العلماء میں نئی روح پھونک رہے تھے اور اس کو بدلے ہوئے زمانہ وحالات کے جائز وفطری تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کی سعی محمود میں سرگرم عمل تھے، اسی لیے وہ ”مختارات“ ”القراءۃ الراشدۃ“ اور ”قصص النبیین“ جیسی وقیع عربی ریڈرز کی ترتیب وتدوین میں مشغول تھے اور اصحاب علم وذوق کی جانب سے دادِ تحسین وصول کر رہے تھے، ٹھیک اسی زمانہ میں ان کے حقیقی جانشین حضرت مولانا رابع حسنی ندویؒ بھی انہی کے نقش قدم پر چل رہے تھے اور انہی کے شانہ بشانہ تحریک ندوۃ العلماء کو علمی، ادبی وفکری سطح پر فروغ دے رہے تھے، ”منثورات من أدب العرب“ ”الأدب العربي بين عرض ونقد“ ”معلم الإنشاء الجزء الثالث“ اور جغرافیہ ’’جزیرۃ العرب‘‘ جیسی بیش قیمت نصابی کتابیں اسی زمانہ کی تصنیفات ہیں۔

حضرت مولانا علی میاںؒ نے ندوۃ العلماء کی طرف سے ترتیب نصاب کی کوششوں کے ضمن میں آپ کی کاوشوں کا یوں ذکر کیا ہے:

’’مختارات اور القراءۃ الراشدۃ کے درمیان کی کڑی کے طور پر خواہرزادۂ عزیز مولوی سید محمد رابع حسنی ندوی (حال صدر شعبہ عربی دارالعلوم) نے ’’منثورات‘‘ تالیف کی، جس میں بہت سے ان قابل انتخاب ادبی نمونوں کو شامل کیا، جو مختارات کے نمونوں کے مقابلہ میں نسبتاً آسان لیکن طلباء کے سامنے آنے کے قابل تھے، ان کے انتخاب میں ان کا صحیح ادبی ذوق اور مطالعہ کار فرما نظر آتا ہے اور یہ کتاب بھی مدارس میں جگہ پانے کی مستحق ہے۔‘‘

’’الادب العربی بین عرض ونقد‘‘ کے تذکرہ میں رقم طراز ہیں:

’’اس میں عربی نثر کے منتخب قطعات کو لے کر ان کے محاسن اور خصوصیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور طلباء میں ادب سے ذائقہ لینے اور اس کے محل ومقام کے تعین کی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔‘‘

’’معلم الانشاء‘‘ جس کے دو حصے مولانا عبدالماجد ندویؒ کے قلم سے ہیں اور اس کا تیسرا اہم حصہ حضرت مولانا رابع صاحبؒ نے لکھا ہے، اس کے متعلق بھی یہ الفاظ ملاحظہ فرمائیں:

’’اس کا خلا شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا اور مدارس کے نصاب میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو تحریر وانشاء کی مشق وتمرین کی خدمت انجام دے ـــــ اس کا تیسرا حصہ مولوی محمد رابع ندوی کے قلم سے تیار ہوا، یہ کتاب بھی بہت سے مدارس میں داخل نصاب ہے۔‘‘

مذکورہ کتابوں کی ترتیب وتدوین کے علاوہ حضرت مولانا رابع صاحبؒ کا ایک اہم کارنامہ ’’جغرافیہ جزیرۃ العرب‘‘ ہے جس کی

اہمیت وافادیت مفکر اسلام ہی کے قلم سے نذر قارئین ہے:

''جدید نصاب کی ترتیب کے سلسلہ میں ایک ضروری اور مفید کام یہ ہوا کہ عزیزی مولوی محمد رابع ندوی سلمہ نے ''جغرافیہ ممالک اسلامیہ'' کے نام سے کتاب تیار کی، حدیث وسیرت ہی نہیں، تاریخ ادب کا طالب علم بھی جب اپنے مضمون کا مطالعہ کرتا تو اس کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک سرنگ میں داخل ہوگیا ہے، جس کے آگے پیچھے، دائیں بائیں کچھ نظر نہیں آتا، صدہا مقامات کے نام حدیث وسیرت میں اور اشعار جاہلیت میں ملتے ہیں، جن کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا اور اس لاعلمی کی وجہ سے وہ ان بہت سے تاریخی حقائق' سیرت وحدیث کے واقعات کی اہمیت اور ان کا ماحول اور پس منظر سمجھنے سے قاصر رہتا ہے جو ایک باشعور طالب علم کے لیے ضروری ہے، چہ جائیکہ ایک اچھے معلم واستاد کے لیے، یہ کام انہوں نے بڑی محنت وسلیقہ سے انجام دیا، نقشے تیار کیے، حدیث وسیرت کے واقعات کی طرف ضروری اشارہ اور اشعار عرب کا اندراج کیا جو ان مقامات کے متعلق تھے، اس کام کی سب سے زیادہ داد مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے دی اور اس کو سراہا، افسوس ہے کہ انہی حجابات کی وجہ سے (جن کی طرف اوپر اشارہ کیا جاچکا ہے) مدارس عربیہ نے اس محنت سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔'' (۱/۲۲۱-۲۲۳)

ذیل کی سطور میں حضرت مولانا علی میاں ندویؒ ہی کے قلم گہر بار سے تاریخ ندوہ کے دو ایسے اہم واقعات بھی منقول ہیں، جن سے حضرت مولانا رابع صاحبؒ کی حکمت عملی' سیاسی بصیرت اور تدبیر وتدبر کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۱۹۶۹ء میں جب دار العلوم ندوۃ العلماء میں طلباء کی جانب سے ایک ناشدنی واقعہ پیش آیا اور طلباء نے گرمی کے سبب امتحان کے التواء اور دار العلوم میں چھٹی کا مطالبہ کیا، اس واقعہ نے حضرت مولاناؒ کے دل ودماغ اور اعصاب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا، لیکن ایسے سنگین موقع پر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ہی کی ذہانت وذکاوت اور فراست مندی معاون ثابت ہوئی، مفکر اسلام کی یہ شہادت ملاحظہ ہو:

''عزیزی مولوی محمد رابع ندوی نے بڑی مستعدی اور بیدار مغزی سے ان طلباء کے ساتھ معاملہ کرنے میں انتظامیہ کی مدد کی جو (اختلاف درجات کے ساتھ) اس ہنگامہ میں شریک تھے۔''

(۵۲/۲)

۱۹۹۴ء میں جب سیکولر ملک ہندوستان میں یہ شرم ناک واقعہ پیش آیا کہ ندوہ جیسی عالمی درس گاہ میں پولیس کے بعض اہلکاروں نے درمیانی شب میں چھاپہ ماری کی اور طلباء کو گرفتار بھی کرلیا، اس موقع پر مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ جیسی عالمی شخصیت نے ایسی گستاخانہ حرکت پر سخت ردعمل کا اظہار کیا اور منصوبہ بند حکمت عملی سے کام لیا، لیکن اس نازک موڑ پر انہی کے جانشین مولانا رابع صاحبؒ کا کارنامہ بھی مفکر اسلام ہی کے قلم سے ملاحظہ ہو:

''اس موقع پر اخلاقی طور پر کسی قدر تشکر واعتراف کی ضرورت بھی محسوس ہوتی ہے، اس میں پہلا اعتراف عزیز القدر مولوی محمد رابع ندوی مہتمم دار العلوم کی مستعدی' فرض شناسی اور ذہنی توازن اور حقیقت پسندی کا ہے کہ انہوں نے عین واقعہ کے بعد وزیر اعلیٰ ملائم سنگھ یادو جی سے ملاقات کی اور ان کو واقعہ سے مطلع کیا اور اس سلسلہ میں آئینی اور مثبت طریقہ پر جو کاروائیاں کرنی چاہیے تھیں ان میں تاخیر اور تساہل سے کام نہیں لیا، ان کے اس آئینی اور متوازن اقدامات سے مسئلہ فرقہ وارانہ اور جذباتی نہیں بن سکا اور بالآخر سارے ملک' دینی اور غیر دینی اداروں' تعلیم گاہوں اور حقیقت پسند شخصیتوں کی ہمدردی اور تائید اس مسئلہ میں حاصل ہوئی۔''

(۴۹/۶)

۱۹۹۹ء میں لکھنؤ کے ایک تبلیغی اجتماع میں حضرت مولاناؒ کا خطاب ہوا، جس کو دہلی کے ایک ہندی روزنامہ ''جن ستا'' نے فرقہ پرستی کی نگاہ سے دیکھا اور معاندانہ رویہ برتا، اس کا اثر یہ ہوا کہ ندوہ کے احاطہ سے متصل لکھنؤ یونیورسٹی کے نریندر دیو ہاسٹل میں طلبہ نے ندوۃ العلماء اور حضرت مفکر اسلامؒ کی شخصیت کو سخت مذمت کا نشانہ بنایا' گالیاں دیں اور پتھر پھینکے، اس سلسلہ میں ندوہ کی انتظامیہ نے پر امن طریقہ سے ٹھوس اقدامات کیے، جن میں بالخصوص حضرت مولانا رابع حسنی ندویؒ کے متعلق یہ کارگذاری ملاحظہ ہو:

''مہتمم دار العلوم ندوۃ العلماء عزیزی مولوی محمد رابع ندوی نے اپنے ایک فیکس کے ذریعہ وزیر اعظم کو لکھنؤ یونیورسٹی یونین کے صدر جو بی جے پی سے تعلق رکھتے ہیں' کے بیان کی کٹنگ بھیج کر توجہ دلائی، جس میں انہوں نے تمام مسلم دینی اداروں کو دہشت گردی کا اڈہ قرار دیتے ہوئے ان میں آگ لگا دینے کی دھمکی دی ہے اور اس طرح سے کھلے طریقہ سے اعتراف کرلیا ہے کہ یونیورسٹی کے نریندر دیو ہاسٹل کے طلباء کی طرف سے سنگ باری ہوئی تھی۔'' (۷/۲۶۹)

سطور بالا سے جانشین مفکر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی تدبیر' تدبر' فراست' بصیرت' حکمت' ذہانت' ذکاوت' محبت' فنائیت اور انتہائی محنت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے، جنہوں نے تقریباً مکمل ۷۰ رسال حضرت مولانا علی میاںؒ کی صحبت میں ایک خادم کی حیثیت سے گذارے اور اس طویل عرصہ میں اپنی شخصیت کو ایسا متوازن اور ستودہ صفات بنالیا جس نے حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد پیدا ہونے والے خلا کو بڑی حد تک پر کردیا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ایک باشعور' سنجیدہ' دور اندیش اور انتہائی حلیم و بردبار قائد تھے، ایک طرف انہیں اپنے مقام ومنصب اور اس کے معیار ووقار کا مکمل خیال تھا، جس پر امت مسلمہ اور بالخصوص ہندوستانی مسلمان انہیں دیکھنا چاہتے تھے، دوسری طرف انہیں اپنی سوجھ بوجھ اور مؤمنانہ فراست کے نتیجہ میں ہندوستان کے سیاسی منظر نامہ اور یہاں کی منصوبہ بند سازشوں کا بھی بخوبی علم تھا، اسی لیے آپ ہمیشہ پروپیگنڈہ کی پالیسی سے گریزاں رہتے تھے اور اخفاء کے ساتھ مثبت وٹھوس کوششوں کے قائل تھے، یہی وجہ ہے کہ جب بھی عالم اسلام یا ہندوستانی مسلمان کسی نازک مسئلہ سے دوچار ہوتے تو آپ اخبارات یا میڈیا کے نمائندوں کے ذریعہ اپنا بیان دینا ضروری نہ سمجھتے، البتہ اس مسئلہ کو لے کر بے چین ہوجاتے اور اس کے حل کی ممکنہ تدابیر اختیار فرماتے، بادشاہوں' وزراء اور اہم عہدیداروں کو مؤثر خطوط لکھتے اور اگر ان سے ملاقات ممکن ہوتی تو کوشش کرتے کہ بالمشافہ انہیں مسئلہ کی سنگینی سے متوجہ کریں اور اگر بسا اوقات اپنے اعذار کے سبب بذات خود ان میں سے کوئی کام بھی مشکل معلوم ہوتا تو اپنے نائبین کو اس کا مکلّف کرتے اور جب تک آخری حجت پوری نہ ہوجاتی تب تک بے چین و بے کل رہتے لیکن سنگین سے سنگین حالات میں بھی وہ ایسا کوئی جذباتی اقدام نہ کرتے جس سے ان کی شخصیت یا ان کے باوقار عہدوں کو نقصان پہنچے، اس حقیقت کا اندازہ انہی کے ایک مدبرانہ جملہ سے ہوتا ہے:

''ملک کی اکثریت غیر مسلم ہے، اکثریت کے سیاسی وزن اور حکومت میں اس کی مضبوط نمائندگی کو دیکھتے ہوئے مسلم اقلیت کے رہنماؤں کو اس بات پر بھی نظر رکھنی ہوتی ہے کہ ملک میں کوئی ایسا اقدام یا عمل سامنے نہ آئے جس سے ان کی مذہبی حیثیت کو نقصان پہنچے۔''

(خطبات رابع: ۴۴۷)

حضرت مولاناؒ انہی حکمتوں اور مصلحتوں کے پیش نظر ہمیشہ ظاہر داری سے دور رہے، تاہم اگر کبھی مسئلہ ناگزیر ہوتا اور انہیں یہ محسوس ہوتا کہ ان کے ایک بیان سے حالات کی سنگینی میں تخفیف ممکن ہے تو ان کے الفاظ ایسے باوزن' مؤثر اور جامع ہوتے کہ ماہر قانون دانوں کے لیے بھی اس میں ایک نقطہ رکھنے کی گنجائش نہ ہوتی۔

سپریم کورٹ میں جب دار القضا کے نظام پر رِٹ دائر کی گئی تو ہیجانی ونفرت انگیز بیانات کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا تاکہ مسلم پرسنل لا بورڈ کی شبیہ داغ دار ہو، ایسے موقع پر حضرت مولاناؒ نے انتہائی مختصر الفاظ میں اس پورے شور وہنگامہ کو یہ کہہ کر ختم کردیا کہ

''مسلم پرسنل لا بورڈ کی جانب سے دار القضا کا نظام ملکی عدالتوں کے ہرگز مخالف نہیں بلکہ یہ تو ان کے حق میں معاون ہے۔''

۲۰۱۹ء میں جب پلوامہ حملہ ہوا اور سیاسی بساط کی چالوں نے بے گناہ فوجیوں کے گھر ویران کردیے، ایسے سوہانِ روح واقعہ پر حضرت مولاناؒ کا دردِ انسانیت یوں نظر آیا کہ فرمایا: ''پلوامہ حملہ میں بے گناہوں کا خون کردینا انسانیت سے گری ہوئی بات ہے۔''

بابری مسجد کے متعلق جب سپریم کورٹ کا فیصلہ صادر ہوا اور ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے تو یہ کہہ کر ہندوستانی مسلمانوں کی دل بستگی فرمائی کہ ''سپریم کورٹ کا فیصلہ گرچہ ہم نے قبول کرلیا، لیکن یہ فیصلہ ہمارے جسموں پر نافذ ہوا ہے نہ کہ دلوں پر۔''

ابا حضرت ہم سے رخصت ہو گئے

سعید احمد حسنی ندوی
(ڈائریکٹر مکتبۂ اسلام-لکھنؤ)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع الحسنی ندوی جن کو رحمۃ اللہ علیہ اس دنیا سے اس وقت رخصت ہوئے جب ہم دونوں بھائی رشید احمد حسنی اور میں پیدا نہیں ہوئے تھے، تو ابا کو ہم لوگ بھی نانا سے زیادہ دادا ہی سمجھتے تھے، اسی لیے ابا ہم لوگوں کو بھی اسی درجے میں مطلب پوتا ہی سمجھتے تھے اور بے پناہ فکر میں رہتے اور ہر موقع پر تربیت کرتے، جب بھی کوئی غلطی ہوتی تو تنبیہ کرتے بلکہ ڈانٹتے بھی، یہ چیز ایسی تھی جو کسی کے ساتھ نہیں تھی، کیوں کہ ابا کا مزاج ایسا تھا کہ کسی کو ڈانٹنا تو دور کی بات بلکہ کبھی سخت لہجے میں بات تک نہیں کی، اگر ہم کو ڈانٹا تو رشتہ ہونے کی وجہ سے، کتنی ہی بار ہم نے ان سے رمضان میں دعاؤں کے لیے کہا تو فرماتے کہ تم کو تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، تم لوگوں کے لیے دعا نہیں کروں گا تو کس کے لیے کروں گا، تم لوگ ہمیشہ یاد رہتے ہو۔ ذرا غور کریں بھلے ہی وہ نانا ہوں دادا ہوں، لیکن تھے تو امت کا سرمایہ جن پر امت کی ذمہ داری تھی، جس میں آدمی کو سوچنے کی فرصت نہ ہو، اس میں بھی خاندان کی تربیت کی فکر رہتی اور سب کے حالات سے واقفیت رکھتے اور خاندانی رشتوں کا احترام دل میں ہوتا پھر امت کی بھی فکر ہوتی، یہ امت سے محبت خاندانی رشتوں سے تعلق کی ہی بات تھی کہ ان کی شفقت سب کے لیے نمایاں تھی، اسی لیے عوام وخواص میں مقبول تھے، ہر طبقے کا شخص اور ہر عمر کا شخص ان پر فدا تھا اور حضرت بھی ان کو محبت وشفقت سے نوازتے رہے اور ان کے کام آتے رہے، ان کی رہنمائی کرتے رہے، کوئی شخص چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، جب اس کو موقع ملتا تو حضرت سے مشورہ لیتا، حضرت بھی اس کو اس کی عمر کے مطابق ہی اپنی رائے پیش کرتے اور ویسے ہی پیش آتے جیسے کوئی اہم شخصیت مشورہ طلب کر رہی ہو لیکن کبھی یہ نہیں دیکھا

اب رحمۃ اللہ علیہ کہنا پڑ رہا ہے ایسی عظیم وعبقری بشری شخصیت جن پر امت محمدیہ کا اجماع تھا جو دین کے روشن ستارہ کی مانند تھے جن سے علم وعمل کی کرنیں لوگوں کے دلوں کو منور کر رہی تھیں آج وہ عظیم شخصیت نہ رہی ان کو رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہوئے دل مغموم ہوتا ہے اور یقین کرنا مشکل ہوتا ہے کہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں اب صرف ان کی یادیں ہیں، ان کے تذکرے ہیں ان کی محبتیں والفتیں ہی باقی رہ گئیں ہیں، وہ چلے گئے لیکن ہم کو علم وعمل محبت واخلاق سمندر دے گئے، وہ ایک ایسی خاندانی شخصیت تھے جو خاندانی روایات کے امین تھے، ان کا رخصت ہونا صرف خاندان ہی نہیں بلکہ پوری ملت کا نقصان عظیم ہے جن کا بدل شاید خاندان میں ملنا ممکن نہ ہو، کیوں کہ ان کی ہر بات میں ایک سبق ہوتا تھا، تربیت ہوتی تھی، چاہے چھوٹا چاہے بڑا سب کو اسی کے مطابق سمجھاتے تھے، میں نے بعض جگہ یہاں تک دیکھا کہ اور محسوس کیا کہ وہ دین کے خلاف کوئی بھی قول وعمل برداشت نہیں کرتے، چاہے وہ بچہ ہی کیوں نہ ہو، اس کو سمجھاتے، اس کو برا محسوس کراتے، تاکہ وہ کل بڑا ہو کر ایسی عمل نہ کرے جس سے پشیمانی ہو اور تربیت میں کمی رہے۔

جہاں تک بات ہے میری تو میں ان کو ابا کہتا تھا کیوں کہ وہ میرے دادا اور نانا دونوں کے مقام تھے، انہوں کئی بار ہم سے کہا کہ تم کبھی دادا اور نانا میں فرق نہ کرنا، ہم تمہارے دادا بھی ہیں نانا بھی ہیں، وہ اس لیے بھی کہتے تھے کیوں کہ میرے دادا مولانا محمد ثانی حسنی

کہ مشورہ دینے کے بعد یہ خواہش ظاہر کی ہو کہ مشورہ طلب کرنے والا حضرت کی رائے پر عمل بھی کرے، یہ بہت بڑی بات ہوتی ہے کہ کسی اہم شخصیت سے مشورہ مانگا جائے اور مشورہ ملنے کے بعد اس کو نہ مانا جائے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مشورہ دینے والے کو برا محسوس ہوتا ہے، جب کہ حضرت برا ماننا تو چھوڑیے برا محسوس بھی نہیں کرتے اور نہ کبھی اس پر گفتگو کرتے کہ دیکھو آتے ہیں مشورہ مانگتے ہیں، مشورہ دو تو مانتے نہیں اپنی کرتے ہیں۔

وہ جیسے گھر والوں کی تربیت کی ذمہ داری محسوس کرتے تھے، ویسے ہی پوری قوم کی تربیت کی بھی فکر میں رہتے، کوئی بھی ملنے آجاتا تو اس سے ایسے تعلق سے اور مسکراتے ہوئے ملتے کہ وہ فدا ہو جاتا اور اس کو اپنا گھر جیسا محسوس ہوتا، اس کو یہ محسوس ہوتا کہ وہ اپنے گھر میں یا گھر والوں کے بیچ میں ہی ہے، اس کے بعد وہ شخص دعا حضرت سے دعا کے لیے کہتا تو حضرت کہتے ان شاء اللہ ہم ضرور دعا کریں گے، آپ بھی ہمارے لیے دعا کریں، دعاؤں کی ضرورت تو ہم سب کو ہے۔ اتنی عظیم شخصیت ہمیں پیغام دے رہی ہے کہ انسانی اخلاق کا تقاضہ کیا ہے؟ لوگوں سے کیسا برتاؤ کرا جائے؟ کیسے ان دلوں کو مسخر کیا جائے؟ لوگوں سے ملنا، ان کے غموں کی دلجوئی کرنا، ان کے مسائل کو حل کرنا، ان کو اچھی تجاویز دینا، تاکہ ان کی پریشانی دور ہو، یہ ان کے تعلق و محبت کی ہی بات تھی، اسی لیے لوگوں کو بالخصوص نوجوانوں کو ان سے بہت تعلق و محبت تھی، بعض نوجوان ملنے آتے اگر حضرت آرام کر رہے ہوتے یا طبیعت ناساز ہوتی تو دور سے دیکھ کر چلے جاتے، ہم نے ایک دو بار ان کی محبت و تعلق کو دیکھ کر کہا بھی کہ مل لیں تو انہوں نے کہا کہ دیکھنا مقصود تھا، ملنے سے آرام میں خلل واقع ہوگا اور ہم حضرت کے آرام میں مخل ہوں یہ گستاخی نہیں کر سکتے، ہم نے دیکھ لیا ہے ہم مطمئن ہیں تو ایسا تعلق صرف اولیاء اللہ سے ہی ہوسکتا ہے اور یہ محبت و تعلق صرف اللہ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے، کیوں کہ جو لوگ اللہ کے لیے جیتے ہیں، اللہ کے لیے مرتے ہیں انہی کے لیے قول باری تعالیٰ ہے:

﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ☆ الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ لَهُمُ الْبُشْرَى فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

(سورۃ یونس: ۶۲-۶۳)

اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے ان بندوں کی محبت لوگوں کے دلوں میں پیوست کر دیتا ہے اور ان کو اپنا دوست بنا لیتا ہے، صرف اس لیے کہ انہوں نے اللہ کے راستے میں مجاہدے کیے ہیں، اللہ کے دین کو عام کرنے اور اس کے احکام کو نافذ کرانے میں دن و رات ایک کر دیے، وہ مسلسل کوششوں میں کرتے رہتے ہیں کہ اللہ کا دین کو کیسے عام کیا جائے؟ اس کی باتوں کو کیسے پھیلایا جائے؟ چاہے وہ تعلیم کے راستے سے ہو یا تبلیغ کے راستے سے، ان کا واحد مقصد اللہ کے احکام کا نفاذ ہے، وہ اس میں اپنی ذات کو مٹا دیتے ہیں، اپنے نفس کو دباتے ہیں، تب جا کر اللہ تبارک وتعالیٰ کے مقرب اور خلیل بنتے ہیں۔ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے جس طرح زندگی گزاری وہ ایک مثالی زندگی تھی، اس زندگی میں اخلاق حسنہ اور اسوۂ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی متعدد مثالیں آپ کو دیکھنے میں ملیں گی، لکھنے والوں نے اس پر خوب لکھا ہوگا اور آئندہ بھی خوب لکھا جائے گا، لیکن گھر کی زندگی کا حال تو صرف گھر والے ہی بتا سکتے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں اس بات کا شاہد ہوں کہ میں نے اپنی زندگی میں حضرت کو کبھی کسی کے اوپر تبصرہ کرتے نہیں دیکھا، نہ ہی تنقید کرتے دیکھا، جب کہ متعدد مواقع پر مختلف لوگوں اشکالات اٹھائے، حضرت کی علمی کاوشوں کو نکارنے کی جسارت کی، مختلف طریقوں سے حوصلہ شکنی کی، یہاں تک کہ نجی مجلسوں میں غیبتیں کیں اور کھلے عام تہمتیں لگائیں، ان کے علم و اخلاق پر تیر و نشتر چلائے، لیکن باوجود اس کے حضرت نے نہ کبھی ان باتوں پر یا ان لوگوں پر تبصرہ کیا نہ کوئی جواب، بلکہ ان کو شفقت و محبت اور اپنائیت کے ساتھ سمجھاتے رہے، بلکہ اہل خانہ کو بھی تاکید کی کہ کبھی کسی بات کا جواب نہ دیا جائے کہ ہماری پکڑ آخرت میں ہو، میں نے ابا حضرت سے کہا

بھی جواب تو دینا چاہیے، کچھ تو کہنا چاہیے، لیکن حضرت نے ایک جملہ فرمایا کہ ان کے اعمال ان کے ساتھ ہیں، تمہارے اعمال تمہارے ساتھ ہیں، تم اپنی باتوں کا اپنے اعمال کا حساب دوگے، وہ اپنے اعمال کا، لہٰذا خاموشی بہترین چیز ہے سب اللہ پر چھوڑ دو۔

﴿اِنَّ اللّٰہَ عَالِمُ غَیۡبِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ☆ اِنَّہٗ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ﴾

خیر یہ تو بات ہوگئی ظاہری چیزوں کی، جہاں تک بات گھر کی ہے تو ابا حضرت کی وہ خوش گوار یادیں کبھی نہ بھول پانے والی' وہ مسکراہٹ اور بات کرنے کا وہ لذت آمیز انداز کیسے بھولا جاسکتا ہے؟ خاص طور پر تربیت کرنے کے انداز کی بات تو کچھ اور ہی تھی، مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ایک مسلمان منسٹر صاحب آئے ابا سے ملنے تو اور میں بہت چھوٹا تھا، غالباً سات یا آٹھ سال کا تھا، تو منسٹر صاحب کے ساتھ بہت سے لوگ اور گاڑیاں آئیں جیسے عموماً منسٹرس کے ساتھ ہوتا ہے، تو میں بھی ان کو دیکھنے چلا گیا اور ساتھ ساتھ چلنے لگا تو کسی صاحب نے ان منسٹر سے میرا تعارف کرادیا کہ یہ حضرت کے نواسے ہیں، تو یہ سن کر منسٹر صاحب آگے آئے اور مجھ سے ملنے کے بعد مجھے ۵۰۰/ کا نوٹ دینے لگے کہ یہ عیدی ہے، میں نے وہ لینے سے انکار کردیا، لیکن منسٹر مستقل ضد کرتے رہے، یہاں تک وہ مجھے لینا پڑا، کیوں کہ میں اتنا چھوٹا تھا کہ ان چیزوں سے واقف نہیں تھا کہ اس کے کیا نقصانات ہیں؟ خیر وہ دے کر چلے گئے، میں گھر آیا پھر یہ بات والد صاحب کو معلوم ہوئی تو ان کو برا محسوس ہوا اور وہ ۵۰۰/ کا نوٹ انہوں نے مجھ سے لے کر کسی مسجد میں دے دیا، لیکن پھر ابا حضرت کو یہ بات معلوم ہوئی کہ سعید نے کسی منسٹر سے پیسے لیے ہیں، جیسے لوگ اپنے طریقے سے بتاتے ہیں، تو ابا حضرت کو میرا پیسے لینا بہت ناگوار گزرا اور مجھے بلا کر پہلے تو خوب ڈانٹا پھر بیٹھا کر اس کے نقصانات بتائے اور دیر تک سمجھایا کہ اس کے کیا نقصانات ہیں اور خاندان کے لیے بھی مناسب نہیں کہ تم جس خاندان سے وہاں احتیاط برتی جاتی ہے، لہٰذا اپنے خاندان کی خصوصیت کو برقرار رکھو اور ان چیزوں سے بچو جن سے آگے چل کر نقصانات ہوں اور اس کے بعد اس ۵۰۰/ روپیے کو میرے والد نے مجھ سے لے کر خیر کے راستہ میں خرچ کردیا۔ ابا حضرت ہمیشہ میری تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں فکرمند رہتے، ہر موقع پر جب کوئی اہم شخصیت آتی اگر سیاسی ہوتی تو کبھی پسند نہیں کیا کہ خاندان کے لوگ وہاں ہوں بالخصوص بچے تو ہونا ہی نہیں چاہیے لیکن اگر کوئی بزرگ ہستی تشریف لاتی تو سب نواسوں کو بلا کر تعارف کراتے اور دعا کے لیے کہتے۔

اسی طرح متعدد مواقع پر تربیت کرتے رہتے، ایک واقعہ اور بیان کرتا ہوں، میں چھوٹے ابا حضرت مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو کبھی کبھی قرآن کریم سناتا تھا تو ابا اور چھوٹے ابا دونوں ہوتے تھے تو جب بھی سناتا تھا اور سنا کر اٹھتا تھا تو چھوٹے ابا خوش ہوتے اور ابا سے کہتے کہ دیکھئے کتنا اچھا پڑھا ہے تو ابا حضرت بھی خوش ہوتے اور انعام سے نوازتے اور حوصلہ افزائی کرتے، اسی طرح ایک دن میں ندوہ میں ابا حضرت کو قرآن کریم سنا رہا تھا، چھوٹے ابا کے انتقال کے بعد کی بات ہے تو عصر کی نماز کے بعد سنانے بیٹھا تو سناتے سناتے آواز تھوڑی اونچی ہوگئی تو کہا کہ آہستہ پڑھو، تاکہ دوسرے لوگوں کو پریشانی نہ ہو، کوئی ذکر میں ہوگا، کوئی تلاوت میں ہوگا اور اس کو دقت ہوگی تیز آواز سے، کسی کو پریشانی ہو تو یہ مناسب نہیں ہے۔ آپ سوچیں ابا حضرت کی یہ خوبیاں کہ دوسروں کا خیال کرنا، اللہ کے بندوں کے ساتھ شفقت و محبت اور حسن اخلاق کے ساتھ پیش آنا، کیا اللہ کو پسند نہیں ہوگا جب کہ اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن کریم میں ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلۡیَعۡفُوۡا وَلۡیَصۡفَحُوۡا ؕ اَلَا تُحِبُّوۡنَ اَنۡ یَّغۡفِرَ اللّٰہُ لَکُمۡ﴾ (النور: ۱۲) (اور چاہیے کہ لوگ معاف کریں اور درگزر سے کام لیں، کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہاری مغفرت فرمائے)

دوسری جگہ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰہُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ﴾ (آل عمران: ۱۳۴) (اور غصہ کو پی جانے والے اور

کرتا ہے)

ان سب آیتوں سے ہم کو سبق ملتا ہے اور ہم کو کوشش کرنی چاہیے کہ اس سے سبق لیں اور جو اس پر عمل کرے اس کی زندگی سے بھی سبق حاصل کریں اور ان کو نمونہ بنائیں، ہم نے اپنی پوری زندگی میں تو کبھی یہ محسوس نہیں کیا کہ حضرت نے کبھی کسی پر غصہ کیا یا تبصرہ کیا، تو حضرت کی زندگی بھی ہمارے لیے نمونہ ہے، اب وہ نہیں ہیں تو ان کی کتابیں ہم سب کے لیے مشعل راہ ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ حضرت جب ہر ہفتہ جمعرات کو رائے بریلی تشریف لاتے تو ہم سب بھاگ کر گاڑی آنے سے پہلے ہی باہر آجاتے، تاکہ ان سے سب سے پہلے مل سکیں، ان کے ہر نواسے کی خواہش ہوتی کہ پہلے وہ ملے، جو پہلے نکلتا وہ گاڑی کے دروازے پر کھڑا ہو جاتا اور جو دروازہ کھولتا وہی پہلے مل پاتا، مجھے یہ بھی یاد ہے جب ملاقات ہوتی تو چھوٹے ابا اور ابا ہم لوگوں کو دیکھتے ہی مسکراتے اور وہی مسکراہٹ ہم سب کی روح کو تازگی بخشتی، ہم لوگ اصرار کرتے کہ گھر چلئے، چھوٹے ابا تو گاڑی سے اتر کر گھر روانہ ہوتے لیکن ابا مہمان خانہ جاتے، کیوں کہ مہمان بھی ہوتے، پھر تھوڑا آرام اور کھانے کے بعد مغرب کے بعد گھر آتے تو سارے لوگ جمع ہو جاتے، جیسے ہم نے اپنے بچپن میں ابا جان کو دیکھا تھا، اسی طرح جب وہ گھر آتے تو تمام رشتہ دار آکر ملتے اور ان کی مجلس میں بیٹھتے، اسی طرح ابا آتے تو سب آجاتے اور مجلس لگتی، خاندان کے بزرگوں کے تعلق سے مختلف معلومات بتاتے، لیکن چھوٹے ابا کے بعد ابا جب بھی لکھنؤ سے آتے تو گاڑی سے اترتے ہی گھر چلے جاتے اور ہم سب خدمت میں لگ جاتے، کیوں کہ وہ بزرگ ہستی تو تھے لیکن ہم لوگوں کے لیے نانا بھی تھے، اسی نسبت سے ابا ہم لوگوں سے بہت محبت کرتے اور ہر وقت فکر میں رہتے کہ کیسے ان بچوں کی تربیت ہو کہ کوئی کمی نہ رہ جائے، اکثر ابا جان جن کو ابا ماموں جی کہتے تھے تذکرہ کرتے اور ان کی باتیں سنا کر نصیحت کرتے، ان سے اپنے تعلق کے بارے میں بتاتے اور دین سے جڑنے کی اہمیت سمجھاتے، نیت میں اخلاص کا ہونا کتنا ضروری ہے تاکہ دین کے کام میں آسانی ہو اور دین کے کام سے محبت ہو۔

اسی طرح ابا ہر چیز پر غور کرتے، گھر میں کوئی بھی کام ہو تو بتاتے ایسے کرو کہ سادگی لگے، زیادہ فضول کام نہ کرو تاکہ اسراف نہ ہو، تاکہ وہی رقم اللہ کے راستے میں لگا کر آخرت میں اجر ملے، یہاں جو تعمیر کرو گے یہیں چھوڑ دو گے، جو یہاں اللہ کے راستہ میں خرچ کر کے آخرت بھیج دو گے وہی وہاں ملے گا، باقی سب یہیں چھوڑ دو گے، جو بھیج دیا مل جائے گا، اس لیے کوشش کرو کہ آخرت کی تیاری کی فکر کرو، جو ہمیشہ کی زندگی ہے، تو ابا کو ہم سب سے اتنی محبت تھی کہ چاہتے تھے سب وہاں اہل خاندان اکھٹا ہوں، کوئی کسی سے جدا نہ ہو، اسی لیے کہتے تھے کہ ہر کام اللہ کے لیے کرو اور اللہ کے حکم کے مطابق کرو۔

ایک بار میں امتحان کے زمانہ میں رزلٹ آنے کے بعد ابا کو رزلٹ بتانے گیا، کیونکہ ابا کو فکر رہتی تو جب ہم نے رزلٹ بتایا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں تمہاری کامیابی کی دعائیں کر رہا تھا، اللہ کا شکر کہ تم کامیاب ہو، تو اتنی محبتیں باپ ہی دیتا ہے اور میں نے دادا کو دیکھا نہیں جس کی وجہ ابا اکثر کہتے تھے کہ میں تمہارا نانا بھی ہوں دادا بھی ہوں جو چاہو مانگو جو لینا ہے لو، میری ہر چیز تم لوگوں کی ہے، جو دل کرے لے لیا کرو۔

ابھی حال ہی میں انتقال سے ایک ہفتہ پہلے گھر کے لوگ (ان کی بیٹیاں اور نواسے نواسی) تھے، میں نے ابا سے کہا: ابا ہم سب کو بہت چاہتے ہیں تو یہ سن ابا مسکرائے اور فرمایا: یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے، تم سب میرے گھر کے میرے نواسے ہو، تم سے زیادہ میں تم لوگوں کو چاہتا ہوں، کتنی محبت سے کہا، یہ جس کے لیے کہا وہ سمجھ سکتا ہے، ایسی محبت کہاں ملے گی؟ محبت دینے والے رخصت ہو گئے، اب صرف ان کی یادیں ہیں، احساسات ہیں جو باقی ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گے ان شاء اللہ۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابا کو بلا لیا اپنے پاس کہ اے میرے بندے! اے میرے دوست! آجاؤ اب تمہارے سکون و آرام

کا وقت ہے، اب سکون سے اپنے گھر والوں کے ساتھ رہو، اپنے خاندان کے ساتھ رہو، انشاء اللہ وہ اپنی والدہ اور والد کے ساتھ ہوں گے اور ان کے ساتھ ان کے بھائی ہوں گے اور سب اپنے آباء واجداد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور اپنی والدہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس ہوں گے، نور کی محفلیں منعقد ہوں گی، سب وہاں جلوہ افروز ہوں گے، میرے والد، میرے نانا اور دادا، چھوٹے ابا اور تمام لوگ اور بھائی صاحب سب ہوں گے، ان شاء اللہ ابا جان ہوں گے، سید صاحب اور شاہ علم اللہ صاحب تمام ہوں گے، ایک ہی خاندان ہے تو ان شاء اللہ ایک ہی جگہ ہوں گے سب، کیا منظر ہوگا اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

ہم لوگ یہاں غمزدہ ہیں اور ہوں گے بھی، کیوں کہ محبت کرنے والے چلے جاتے ہیں لیکن ان کا احساس باقی رہتا ہے، انسان چلا جاتا ہے سب کو چھوڑ جاتا ہے، جانا سب کو ہے کوئی پہلے تو کوئی بعد میں۔ دعا ہے کہ ہم سب بھی اللہ پر ایمان ویقین کے ساتھ دنیا سے جائیں۔ آمین!

اسی طرح ابا بھی رخصت ہو گئے لیکن کیا ہی عمدہ زندگی، بہترین اخلاق کے ساتھ گئے کہ ہر کوئی اشکبار ہے، ہر کوئی اپنے کو یتیم محسوس کر رہا ہے، اللہ نے ایسی محبت بندوں کے دلوں میں ڈال دی کہ ہر بندہ اللہ کے ولی کے جانے سے غمزدہ ہے، یہ اللہ کے نزدیک مقبولیت کی دلیل ہے۔

ابا کے رخصت ہونے کا وقت بھی ایسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ چند ہی لوگوں کو ایسا وقت میسر فرماتے ہیں جن کو میسر ہوتا ہے تو وہ خوش نصیب ہیں، رمضان کا مبارک مہینہ آخری مبارک عشرہ، طاق راتوں کی مبارک ساعتیں اور ایمان کے ساتھ جانا کیسا ہی مبارک ہے:

﴿فَمَن يُؤْمِن بِرَبِّهِ فَلَا يَخَافُ بَخْسًا وَلَا رَهَقًا﴾ (الجن: ۱۳) (جو اپنے رب پر ایمان رکھتا ہے اسے نہ کمی کا اندیشہ ہوگا نہ کسی دباؤ کی فکر ستائے گی)

﴿وَمَن يَعْمَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا﴾ (طه: ۱۱۲) (جو پورا مؤمن رہ کر اچھے کام کرتا ہے اسے نہ ظلم کا خطرہ ہوگا نہ حق تلفی کا خدشہ ہوگا)

﴿لَا يَحْزُنُهُمُ الْفَزَعُ الْأَكْبَرُ وَتَتَلَقَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ هَذَا يَوْمُكُمُ الَّذِي كُنتُمْ تُوعَدُونَ﴾ (الأنبياء: ۱۰۳) (اچھے لوگوں کو بہت بڑی گھبراہٹ غمزدہ نہیں کرے گی، فرشتے ان سے ملاقات کریں گے اور کہیں گے کہ یہ تو تمہارا ہی دن ہے جس کا تم سے وعدہ کیا جا رہا تھا)

اللہ تبارک وتعالیٰ ابا کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے اور ان کو اپنے اہل خاندان کے ساتھ جگہ نصیب فرمائے اور ہم سب کو بھی ایمان ویقین کے ساتھ زندہ رکھے اور ایمان ویقین کے ساتھ موت نصیب فرمائے۔ آمین ثم آمین!

﴿يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي﴾

دین کے بنیادی اصول

”دین کسی ایک جز کا نام نہیں، اسلام کی تمام تعلیمات، اس کے بتائے ہوئے طریقہ اور اسلام کے پورے ڈھانچہ کا نام ”دین“ ہے، تلاوت، عبادات، معاملات، حلال وحرام کی تمیز، رسالت وقیامت پر یقین، یہ سب دین کے بنیادی اصول ہیں، اس کی تمام باریکیوں پر عمل کرنے اور اس کو سیکھنے کی ضرورت ہے، اچھے اعمال کرنا، برے اعمال سے اپنے کو بچانا، اس سلسلہ میں علماء اور جاننے والوں سے معلوم کرنا پڑے گا، پہلے دین کو اس کے جاننے والوں سے سیکھو پھر اس پر عمل کرو۔“ (ملفوظات مرشد الامت: ۴۰-۴۱)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

ایک باکردار مثالی استاذ

مولانا محمد ارشد ندوی
(امام وخطیب مسجد مجیدیہ-نئی دہلی)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی کی وفات ملک وملت کے لیے ایک نا قابل تلافی نقصان سمجھی جارہی ہے، کیونکہ آپ کی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع تھا اور اس طرح کی وسعت کی حامل شخصیتوں کا ملنا ناممکن ہے، مگر رب کریم کی ذات عالی سے ہمیں ناامید بھی نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ جو ذات گرامی جامع الکمالات شخصیتوں کو اٹھاتی ہے تو پھر اس جامعیت کی تکمیل کی خاطر اس عالم آب وگل میں چند ایسے افراد کو کھڑا کردیتی ہے جن میں انفرادی طور پر وہ سبھی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو تنہا اُس جانے والی شخصیت میں پائی جاتی تھیں۔

حضرت مولانا رابع حسنی ندوی جو براہ راست میرے استاذ تھے، میرے لیے باعث سعادت ہے کہ میں نے استاذ محترم کے سامنے متعدد بار ان سے متعلق کتاب کی عبارت پڑھی، تقریر کی، مقالات سنائے اور داد تحسین حاصل کی، عشاء کے بعد آراستہ ہونے والی مجلسوں سے استفادہ کیا، جس کے فائدے ابھی تک محسوس ہورہے ہیں اور آئندہ بھی محسوس ہوتے رہیں گے۔

استاذ محترم کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ایک کامیاب استاذ تھے اور استاذی کے منصب کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے تھے، مجھے اچھی طرح یاد ہے ایک دفعہ جب آپ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے مہتمم تھے، دارالعلوم کی مسجد میں طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

''میں اصلاً استاذ ہوں اور استاذ کہلانا ہی پسند کرتا ہوں اور استاذ کی حیثیت سے طلباء کی ذہنیت سے واقف ہوں، اس لیے طلباء جب غلطی کرتے ہیں تو کیوں کرتے ہیں یہ بھی جانتا ہوں اور اچھا کرتے ہیں تو کیوں کرتے ہیں یہ بھی جانتا ہوں۔''

ایک بار طلباء سے خطاب کرتے ہوئے علم کی خودداری اور غیرت مندی پر یوں گویا تھے:

''علم بڑا غیرت مند اور خود دار ہے، بے توجہی سے علم بھاگتا ہے، علم اسی کو حاصل ہوتا ہے جو اس پر محنت کرے گا، آپ یہاں دور دراز سے اپنا گھر بار، ماں باپ، بھائی بہن اور گھر کے آرام وآرائش سب چھوڑ کر آئے ہیں، یہ محل صحیح ہے، آپ کا انتخاب صحیح ہے، آپ بہت صحیح جگہ پر آئے ہیں اور بہت ترقی کرسکتے ہیں، آپ اس کی قدر کریں، اپنا وقت لہو ولعب اور فضول مصروفیات میں نہ گزاریں، بلکہ علم میں پوری یکسوئی، محنت اور لگن کے ساتھ لگے رہیں، انشاء اللہ اللہ کی مدد آپ کے ساتھ ہوگی اور آپ کو علم میں ترقی اور کامیابی حاصل ہوگی۔''

ایک طرف طلباء سے اپنائیت کا اظہار ہے تو دوسری طرف علم کے تعلق سے طلباء کو بیدار کرنے کا انوکھا انداز ہے، جس میں ایک طالب علم کو اس کی بلند مقامی کا احساس دلایا جارہا ہے، ساتھ ہی اسے اپنی ذمہ داری کے تئیں متنبہ کیا جارہا ہے۔

استاذ محترم کا کمال یہ تھا کہ انتظامی ذمہ داریاں کبھی ان کے علمی کاموں میں رکاوٹ نہیں بنیں، یہی وجہ ہے کہ زمانہ طالب علمی سے لے کر تادم واپسیں کتابوں سے آپ کا گہرا تعلق رہا، کتاب پڑھنا، پڑھانا، مضامین لکھنا، رسائل تصنیف کرنا، دیگر مصنفین کی کتابوں پر مقدمہ لکھنا، تبصرہ کرنا یہ آپ کا محبوب مشغلہ تھا، کیونکہ آپ میں علم کی طلب تھی، دوسری طرف حصول علم کی خاطر محنت ومشقت، دماغ سوزی کا جذبہ ہمیشہ اپنا اثر دکھاتا رہتا اور انہی دونوں چیزوں یعنی علم کی سچی طلب اور حصول علم کی خاطر محنت ومشقت کی طلباء کو

تلقین کرتے رہتے، ایک موقع سے امام غزالیؒ کا یہ مقولہ

"العلم لا يعطيك بعضه حتى تعطيه كلك، فإذا أعطيته كلك، فأنت من إعطائه إياك بعضه على خطر."

(علم تمہیں اپنا تھوڑا حصہ بھی نہیں دے سکتا، جب تک کہ تم اسے اپنا پورے کا پورا نہ دے دو اور پورا دینے پر بھی اس کا تھوڑا حصہ حاصل ہوجانا بھی محل خطر ہے)

یہ جملہ طلباء کو سنایا اور آگے فرمایا:

''علم بڑی محنت' مشغولیت اور توجہ چاہتا ہے، رات دن اس میں اپنے کو ڈبو دینا چاہتا ہے، علم میں کمال واختصاص پیدا کرنے کے لیے اپنے کو اس میں لگانا ہوگا، علم آرام وراحت اور تفریحات کے ساتھ حاصل نہیں ہوسکتا۔''

آپ کے نزدیک علم کی نزاکت بھی بالکل کھلی ہوئی تھی، طالب علم اگر اساتذہ کی رہنمائی کے بغیر مطالعہ جاری رکھتا ہے تو اس کے گمراہ ہونے کا خطرہ رہتا ہے، کیونکہ علم بہت ہی نزاکت بھرا ہے، اس لیے طلباء سے جہاں دل جمعی اور محنت وکاوش کی بات کرتے ہیں' وہیں اساتذہ کی خصوصی رہنمائی کی طرف بھی توجہ دلاتے ہوئے فرماتے:

''آپ کو اپنے اساتذۂ کرام کی رہنمائی میں کام کرنا ہوگا، ورنہ آپ بھٹک جائیں گے، محنت اور رہنمائی دونوں ہوں تب علم حاصل ہوگا، علم کے بارے میں امت مسلمہ کا نظریہ جامع اور مفید علم کا ہے، جو کسی کی رہنمائی میں رہ کر ہی حاصل ہوسکتا ہے، لہٰذا خوب محنت کریں، علم میں انہماک ہو۔''

ایک استاذ کے لیے علمی قابلیت کے ساتھ سنجیدہ ہونا بھی ضروری ہوتا ہے، اگر استاذ سنجیدہ نہ ہو تو طلباء پر استاذ کی زندگی کے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں، طالب علم مانوس ہونے کے بجائے بدک جاتا ہے، قریب ہونے کے بجائے دور ہوجاتا ہے، استاذ محترم کی سنجیدگی ہم سب کے لیے قابل تقلید تھی، جب کبھی طلباء کی غلط حرکتوں کی شکایت پہنچتی اور مجبور ہوکر طلباء کی فہمائش کرتے تو فہمائش کا اسلوب بھی مہذب ہوتا، اس میں ذرہ بدتہذیبی یا طلباء کی بے جا حرکتوں پر انتقامی کارروائی کا اظہار نہ ہوتا، اگر طلباء کبھی زیادہ غصہ کردیتے تو صرف اتنا فرماتے:

''اگر اس ادارہ کے نظام سے آپ فائدہ اٹھانے کے بجائے اپنا وقت ضائع کررہے ہیں اور ادارہ اور ادارہ کے ذمہ داروں کی بدنامی کا سبب بن رہے ہیں تو پھر ہم آپ میں جو طلباء ایسے ہیں ان کا انتظام کریں گے۔''

عام طور سے یہ مشاہدہ ہے کہ جب کسی کو بڑا عہدہ حاصل ہوجاتا ہے تو وہ عہدہ ومنصب کی ذمہ داریوں میں ایسا مصروف ہوجاتا ہے کہ تدریسی ذمہ داری کو اپنے لیے بوجھ سمجھنے لگتا ہے اور ایک مرحلہ میں اس سے کنارہ کشی اختیار کرلیتا ہے، مگر استاذ محترم کا یہ حال تھا کہ پڑھانے کو سب سے اہم سمجھتے اور پوری توجہ سے روزانہ متعلقہ کتابیں پڑھاتے، جب طلباء کے سامنے بیٹھتے تو طبیعت کھل جاتی، پوری دل جمعی سے سبق کے مضامین کی وضاحت کرتے، اگر مسئلہ کچھ گنجلک ہوتا تو متعدد مثالوں سے سمجھاتے، سال کی ابتداء میں وضاحت زیادہ ہوتی، درمیان میں وضاحت اوسط درجہ کی ہوتی اور اخیر میں وضاحت کم ہوتی، مگر طلباء تینوں طریقہائے تدریس سے مطمئن ہوجاتے، جو استاذ محترم کی تدریس اور تفہیم کی امتیازی لیاقت کی دلیل ہوا کرتے، عالمیت کے آخری سال میں ''الادب العربی بین عرض ونقد'' نامی کتاب جو آپ کی تصنیف کردہ ہے کا پہلا سبق جو لفظ ادب کی حقیقت وماہیت سے متعلق تھا کی وضاحت کرنے لگے تو لفظ ''ادب'' سے متعلق بہت سے قیمتی افادات کے بعد فرمانے لگے:

''ادب دراصل انسان کے وجدان سے بنتا ہے اور انسان کے وجدان کو متاثر کرتا ہے، وجدان کی طاقت وصلاحیت اللہ تعالیٰ نے تقریباً ہر انسان کو دی ہے، خواہ محقق ومفکر ہو اور خواہ جاہل وعامی، اس کی وجہ سے ادب کا دائرہ کار بھی بہت وسیع ہے، اس لیے ادب کے ذریعہ کبھی مخاطب کے وجدان کو صرف لطف ولذت دینے کا کام کیا گیا، کبھی محض اپنی مرضی کے خیال کو جاگزیں کرنے کا مقصد

حاصل کیا گیا اور کبھی مخاطب کے کسی انسانی تقاضے کی رعایت میں تسکین کا سامان کیا گیا، کبھی اس سے اصلاح عوام کا کام لیا گیا اور پوری پوری قوم میں تبدیلی لے آئی گئی، یا اس کو ایک بالکل نئے یا متضاد رخ پر ڈال دیا گیا اور اس سے غیر ملکی طاقتوں کو مبغوض بنا کر مطرود کرنے کا کام لیا گیا، اس طرح ادب ایک طاقت ہے ایک اثر انگیز ذریعہ ہے، ایک انسانی تقاضے کا فطری جواب ہے۔''

تواضع ایک ایسا وصف ہے جس کے بغیر انسان کی تمام تر قابلیتوں پر پانی پھر جاتا ہے، ایک انسان ذاتی قابلیت کا حامل ہے مگر اس میں تواضع نہیں بلکہ اکڑفوں تکبر اور گھمنڈ یا پھر وہ احساس برتری جو دراصل احساس کمتری کا نتیجہ ہوتا ہے کا شکار ہے تو وہ اپنی قابلیت سے فائدہ پہنچانے کے بجائے نقصان پہنچاتا ہے، اس کے برخلاف اگر صلاحیت ولیاقت کے ساتھ تواضع سے آراستہ ہے تو اس کا فیض عام وتام ہوجاتا ہے، یہی حال استاذ محترم کا تھا وہ ایک باشعور قابل انسان ہونے کے ساتھ تواضع کا پیکر تھے، ہر کسی سے خندہ پیشانی سے ملتے، چھوٹے بڑے ہر ایک کا خیال رکھتے، اگر کوئی ملنے آتا اور نجی مصروفیتوں کی وجہ سے دیر ہوجاتی تو اس سے معافی مانگتے، اگر کوئی بڑا مہمان آجاتا تو ان سے کہتے کہ آپ نے زحمت کیوں کی' مجھے حکم دیتے میں خود ہی آجاتا، مہمان سے پوری توجہ سے گفتگو کرتے، بیٹھنے کا انداز ایسا ہوتا کہ ہر ملنے والا اپنے کو استاذ محترم کے برابر سمجھتا، ایک مرتبہ ''دارالامور'' سری رنگا پٹنم کے سفر پر تھے، طلباء کے درمیان بیٹھے تعارف ہوا' جب طلباء اپنا تعارف کرا چکے تو استاذ محترم نے فرمایا: ''میں بھی آپ ہی کا ایک فرد ہوں، فرق یہ ہے کہ میں نے طالب علمی کے مرحلے کو پہلے طے کرلیا ہے اور آپ ابھی طے کررہے ہیں، ہم اور آپ ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، ہم میں آپ میں کوئی فرق نہیں ہے۔''

استاذ محترم کو طلباء کی عملی زندگی کی بھی فکر دامن گیر ہوتی، اس لیے طلباء کو عملی زندگی جینے کا گر بھی سکھاتے رہتے تھے، ایک بار فرمایا:

''یہاں سے فارغ ہونے کے بعد سب سے بڑا مسئلہ آپ کے معاش کا ہوگا، روزی روٹی کا معاملہ مقدر ہوتا ہے، جتنی روزی آپ کے مقدر میں ہے، وہ آپ کو مل کر رہے گی اور اس کے لیے باعزت ڈھنگ سے کوشش اور طلب مطلوب بھی ہے، مگر ادھر ادھر منہ مارنا آپ کو زیب نہیں دیتا۔''

پھر اپنا واقعہ سنایا کہ میں حجاز میں تھا، وہاں سے واپسی پر میں اپنے گھر تکیہ پر ہی رہتا تھا، کیونکہ اس وقت مجھے پڑھانے کی کوئی جگہ نہیں ملی تھی، تو ان خالی ایام سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے اپنے کو مطالعہ میں مصروف رکھا، مطالعہ کرتا رہا، پھر ندوہ میں جگہ مل گئی اور پڑھانے لگا تو پڑھاتا ہی رہا۔''

ایک طالب علم جب کسی مدرسہ سے تعلیم مکمل کرلیتا ہے اور عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اس کے لیے باوقار زندگی یعنی عالمانہ وقار کی حامل زندگی گزارنا بھی چیلنج بن جاتا ہے، جو اس کے لیے سوہان روح ثابت ہوتا ہے، اگر وہ ڈٹ کر مقابلہ کرتا ہے تو اپنی عزت بچالیتا ہے اور اگر مقابلہ کرنے میں ناکام ہوجاتا ہے تو پھر ذلت اس کا مقدر بن جاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ سماج میں اپنا اعتماد کھودیتا، استاذ محترم طلباء کو ایسے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی تلقین کرتے اور اپنے وقار سے ذرہ برابر سمجھوتہ نہ کرنے کی تاکید فرماتے، ایک مرتبہ ''النادی العربی'' کے پروگرام میں ملک کی مشہور یونیورسٹیوں کے اساتذہ بھی شریک تھے، جو استاذ محترم ہی کے شاگرد تھے، طلباء کو نصیحت کرتے ہوئے ان اساتذہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

''ان حضرات کو دیکھئے، اپنے وضع قطع کے اعتبار سے بالکل ویسے ہی ہیں جیسے یہاں تھے، اگر یہ حضرات ذرہ سمجھوتہ کرلیتے تو حکومت کے بڑے عہدوں تک پہنچ جاتے۔''

آج کے حالات میں جہاں استاذی کو خدمت نہیں ایک پیشہ بنا لیا گیا ہے، تدریس کو عبادت نہیں بلکہ بندھی ٹکی ملازمت' امانت نہیں بلکہ آزادانہ کام جس میں کسی طرح کی باز پرس نہ ہو سمجھ لیا گیا ہے، مخلص کو بیوقوف اور امانت دار کو حالات سے بے بہرہ، فریب کاری کو عقلمندی، شاطرانہ حرکتوں کو دیدہ دری اور دوراندیشی سے تعبیر کیا جاتا ہے، استاذ محترم کا مثالی کردار ہم سب کے لیے درس عبرت ہے۔

ستودہ صفات شخصیت

عبدالعلی حسنی ندوی
(دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں- رائے بریلی)

ایک شخصیت جو عہد ساز ہو، ملک وملت کے لیے نباض ہو، احوال وکوائف کی نکتہ شناس ہو، سراپا پیکر لطف وعنایت اور صداقت واخلاص ہو، علم وفضل، ورع وتقوی، منصب ومقام جس کے فلک کے درخشاں ستارے ہوں، مروت وشرافت، حلم وبردباری جس کا قرینہ ہو، شائستگی گفتار اور بلندی کردار میں جو یگانہ ہو، زبان وادب، فصاحت وبلاغت کا جو رمز شناس ہو، اصحاب عقل ودانش، اہلیان قلب ونظر کا جو رہنما ہو، ملت کے لیے جس کا وجود مانند قطب نما ہو، وہ لعل بدخشاں جب گم ہوتا ہے تو بلاشبہ ہر خاص وعام پر رنج وکلفت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا ہے، اہل فکر ونظر اس برق ستم سے ریزہ ریزہ ہو جاتے ہیں، محسوس ہوتا ہے کہ لامتناہی صحرا یا سمندر ہے اور ایک سمت نما جو اب معدوم ہے۔

آپ کی ذات ستودہ صفات کا ہر پہلو مہر تاباں کی مانند روشن وپرنور ہے، آپ کی کم گوئی اور نصیحت کی اثر انگیزی، رفق وملاطفت سے لبریز لہجہ، سہل وسنجیدہ اور معیاری اسلوب تحریر وتقریر، نہ نو بہ نو الفاظ کا زیر وبم، نہ نت نئی تعبیرات کا پیچ وخم، نہ منطقانہ انداز سخن، لیکن طرز تخاطب ایسا کہ جو بات زبان سے نکلتی دل کے نہاں خانوں میں اتر جاتی، مخاطب کو اسیر محبت بنا لیتی، بقول اقبال ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

آپ کی شخصیت ایسی مقناطیسی کشش کی حامل کہ ملک ہندوستان کے طول وعرض میں اگر کوئی فرد اعیان ملت کے نزدیک نقطہ اتفاق اور مرجع تقلید تھا جہاں پیچیدہ معاملات پیش ہوتے، مشکلات ومسائل امت کے تحلیل وتجزیہ کی جستجو ہوتی اور جس کے فیصلہ کو بہر صورت معتبر سمجھا جاتا، وہ آپ ہی کی ذات بابرکت تھی اور یہ امر بھی بدیہی ہے کہ جو احترام واعتبار ملک وبیرون میں آپ کو حاصل ہوا وہ برصغیر ہندوپاک میں مفکر اسلام علیہ الرحمہ کی وصال کے بعد چنندہ لوگوں کو مل سکا اور یہ آپ کی قد آور اور مستحکم شخصیت کی واضح دلیل ہے، لیکن اس قدر مقبولیت، جاہ واکرام، منصب ومقام، جلالت شان اور مرجع خاص وعام ہونے کے باوجود زمانہ شاہد ہے کہ فخر ومباہات یا ناز وخودستائی کا شائبہ تک پیدا ہوا ہو، یا عجب ورعونت کا کبھی اظہار کیا ہو، عالم یہ تھا کہ بیشتر اوقات خاموش ہوتے بقدر ضرورت کلام فرماتے اور جب بھی لب کشائی ہوتی لایعنی باتوں سے احتراز برتتے، مادیت کے دھاروں میں غلطاں وپیچاں نوجوانان ملت کے لیے متفکر رہتے، نت نئے چیلنجز کے تیز وتند تھپیڑوں سے نبرد آزما طالبان علوم نبوت کو نشان منزل دکھاتے اور تابندہ ودرخشندہ نقوش نبوت پر جمے رہنے کی تلقین فرماتے، فرد وجماعت، قلب ودماغ کے مابین برپا کشمکش سے حیراں وپریشاں گم گشتگان راہ کو سیدھی روش تجویز کرتے، مدھم سروں میں دلوں کے تار چھیڑتے اور سوز دروں جگاتے، آپ کی دل آویز نستعلیقی تحریریں ہمیں ہمارے متاع گم گشتہ کی یاد دلاتیں، آپ کی عطر بیز مجالس اساتذہ وطلبہ کو سامان اکسیر فراہم کرتیں، آپ کے علمی وقلمی کرناموں کا احاطہ اس مختصر سے مضمون میں کرنا ممکن نہیں، مختصر یہ کہ عربی اور اردو زبان میں بیسیوں کتابیں آپ کے نوک قلم سے نکل کر مقبول خاص وعام ہوئیں، قرآنیات، سیرت وسوانح، زبان وادب، تاریخ وجغرافیہ، فکر اسلامی اور اصلاحیات جیسے

مختلف موضوعات پر آپ کی کتب، مقالات ورسائل مختلف ملکوں اور عالمی اکیڈمیوں سے شائع ہوچکے ہیں، عرب وعجم آپکے نستعلیقی ادب اورٹھوس علم کا لوہا مانتے ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ ایسی مجمع الکمالات شخصیت کا اس دور قحط الرجال میں باوجود تلاش بسیار کے ملنا محال ہے، خلاصہ یہ کہ آپ ہند میں سرمایہ ملت کے نگہبان تھے اور عالم میں فکر ندوہ کے حقیقی ترجمان تھے، اخیر دور کے بے ربط وبے ہنگم شور شرابوں میں، حالات کی ناہمواریوں میں آپ کا وجود مثل کہسار تھا، سفر زیست کے آخری پڑاؤ پر سلسلہ وار آزمائشوں کے طومار کے مقابلہ صبر وسکون اور عزم واستقلال کی تمثیل، آپ کی شخصیت اس اشعار کی حقیقی مصداق تھی کہ

حالات کے قدموں میں قلندر نہیں گرتا
ٹوٹے بھی جو تارا زمیں پر نہیں گرتا
گرتے ہیں سمندر میں بڑے شوق سے دریا
لیکن کبھی دریا میں سمندر نہیں گرتا

اللہ رب العزت نے آپ کو طویل عمر عطا فرمائی جو آپ نے بے نفسی، انکساری، استغنا اور للّٰہیت میں گذاری، پڑھنے لکھنے کو اوڑھنا بچھونا بنایا، علمی، دعوتی اور تربیتی امور سے ہمیشہ اپنی ذات کو منسلک رکھا، زمانہ طالب علمی کی انتھک جدوجہد سے آپ کو ذوق علم وادب حاصل ہوا، جس کی نشر واشاعت میں لمحات زندگی بسر فرمائے اور رمضان کے آخری عشرے میں داعی اجل کو لبیک کہتے ہوئے عالم فنا سے راہی بقا ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

یہ چند نقوش ہیں، بکھرے موتی ہیں جنہیں میں سمیٹ سکا، لکھنے والے لکھیں گے، کہنے والے کہیں گے کہ

موت اس کی ہے کرے جسکا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

تخلیق آدم کا مقصد

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

''اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا یہ نظام ہے کہ انسان کی جو کچھ ضرورت ہوسکتی ہے، اس کی صحت، اس کی بقاء کے لیے اور اس کی طاقت کو قائم رکھنے کے لیے اور اس کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے، اللہ تعالیٰ نے ان تمام چیزوں کو پہلے ہی اس زمین کے اندر رکھ دیا ہے، کیونکہ ایک انسان کی ضرورت کو اس کے رب سے زیادہ کون جان سکتا ہے؟ اسی نے سب کو بنایا ہے اور انسان کو بھی بنایا ہے، تو انسان کی ہر چیز اللہ کے علم میں ہے، اس لیے اس نے انسان کی ضرورت کی ہر چیز زمین کے اندر محفوظ کردی ہے، انسان ان اشیاء سے وقتاً فوقتاً فائدہ اٹھاتا رہتا ہے، لیکن غور کی بات یہ ہے کہ یہ سب صرف یوں ہی تفریحاً نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کو ایک ایسی مخلوق پیدا کرنی تھی جس سے وہ اس دنیا میں کام لے، اس سے وہ فریضہ انجام دلوائے جو صحیح معیاری زندگی کا فریضہ ہے، جس میں بنیادی بات انسان کا اپنے مالک کو پہچاننا اور اس کا شکر گزار ہونا ہے، اس کی شکر گزاری کا طریقہ اختیار کرنا ہے اور ایک اچھا صالح انسان بننا ہے، انسان ہونے کی حیثیت سے بہتر سے بہتر انسان بننا ہے، یہ بھی قدرت کا کمال ہے کہ اس نے انسان کے مزاج میں وہ ساری خصوصیات رکھ دی ہیں جو اس کو بہتر بنانے کے لیے کارآمد ہوسکتی ہیں اور ان کے ذریعہ سے انسان بہتر سے بہتر انسان بن سکتا ہے، فرشتوں پر بھی فائق ہوسکتا ہے، اس لیے کہ وہ وہ خدمت انجام دیتا ہے جو دوسری مخلوقات نہیں دے سکتیں، کیونکہ زمینی مخلوقات صرف انسان کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ہیں، ان کا اپنا کوئی مقصد نہیں، ان میں سے بعض سواری کے لیے ہیں، بعض گوشت کے لیے ہیں، بعض اون کے لیے ہیں اور جو بھی ان سے فائدے حاصل ہوتے ہیں ان کے لیے ہیں، اس کا بھی زیادہ علم اللہ ہی کے پاس ہے۔''

(اسلامی معاشرہ-سورۂ حجرات کی روشنی میں: ۹۶-۹۷)

ہمارے ابا

عبدالحی حسنی ندوی
(مدرسہ سیدنا عثمان بن عفانؓ- رائے بریلی)

انسان دنیا میں مسافر کی حیثیت سے آیا ہے اور اسی حیثیت سے رہنے کا مطالبہ بھی ہے، ارشاد نبوی ہے:

"کن فی الدنیا کأنك غریب أو عابر سبیل" (دنیا میں اس طرح رہو جس طرح ایک اجنبی رہتا ہے یا ایک مسافر رہتا ہے)

ابا کی پوری زندگی اس حدیث کا عکس تھی، آپ نے دنیا کو ایک مسافر خانہ اور آخرت کی کھیتی سمجھا اور اسی اعتبار سے زندگی بھی گزاری، مقصد حیات فوت ہونے نہیں دیا، عارضی ٹھکانے کو دائمی ٹھکانہ سمجھنے کی بھول نہیں کی، اعمال سے اپنا رشتہ مضبوط رکھا، پوری زندگی استفادہ اور افادہ میں گزار کر ماہِ رمضان کے آخری عشرہ میں بروز جمعرات اپنے رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ ارشاد باری ہے:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ﴾

ہر جان کو موت کا جام پینا ہے، چاہے وہ بادشاہ ہو یا فقیر، امیر ہو یا غریب، بیمار ہو یا صحت مند، مفلس ہو یا مالدار، مرشد ہو یا مسترشد، ہر ایک کو خدا کے حضور حاضر ہونا اور خدا کے سامنے جواب دہ ہونا ہے۔

ابا ہمارے صرف نانا ہی نہیں تھے، بلکہ ہمارے استاذ، شیخ اور مربی بھی تھے، آپ کی تربیت کا انداز بڑا ہی نرالا تھا، کسی غلطی پر اس طرح غصہ نہیں ہوتے تھے کہ سننے والے کے اندر ری ایکشن پیدا ہو جائے بلکہ اس کے منفی اثرات اور اس کی شناعت سے آگاہ فرماتے تھے، انداز انتہائی خیر خواہانہ اور مخلصانہ ہوتا تھا، لہجہ مشفقانہ ہوتا تھا اور غلطی کرنے والا اپنی اصلاح کر لیتا تھا، یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ ابا ہمارے لیے مشعل راہ تھے، ہمارے لیے نمونہ تھے، زندگی کے ہر گوشہ میں ہم نے آپ کو منفرد پایا اور آپ سے بہت کچھ سیکھا۔

ابا کی ایک بہت بڑی خوبی جو موجودہ دور میں عنقا ہے، ہر ایک سے مسکرا کر ملنا، ان کے مسائل سننا، ان کو حل کرنے کی فکر کرنا ہے، ہر طرح کے لوگ آپ کے پاس آتے، موقع بے موقع آتے، وہ بھی ہوتے جن کے بارے میں آپ کو بتایا جاتا کہ یہ آپ سے مطمئن نہیں ہیں، ان سب کے ساتھ یکساں حسن سلوک کرنا، ان کو پورا وقت دینا، اپنے آرام اور راحت کو پس پشت ڈال دینا، یہ غیر معمولی اخلاق کی بات ہے۔

دوسری انفرادی خوبی جو میں نے ابا میں دیکھی وہ قرآن کریم سے شغف ہے، قرآن کریم محض تلاوت کی جانے والی کتاب نہیں بلکہ وہ دستور حیات ہے، جس میں تدبر کرنا، اس کی آیات پر غور وفکر کرنا' یہ مطلوب عمل ہے، ابا کو میں نے دیکھا کہ آپ جب قرآن کریم کی تلاوت کرتے تو اس چیز کا اظہار آپ کی تلاوت سے ہوتا تھا، تلاوت کے بعد آپ ان آیات میں تذکیر کے پہلو کو اجاگر کرتے تھے، ہم لوگوں کو قرآن کریم سے رشتہ مضبوط رکھنے اور مسلسل تلاوت کرنے کی تاکید فرماتے تھے۔

حبِّ نبی ﷺ سے آپ سرشار تھے، ہمارے ایک جاننے والے تھے، ان کا نام محمد تھا، ہمیشہ ان کے نام کے آگے بھائی لگایا اور فرمایا: صرف محمد کہنا بے ادبی ہے، باوجود ضعف اور کمزوری کے اور دیگر مشاغل کے طلبائے حدیث کو بخاری شریف کا درس دیتے تھے اور دیگر اہم مصروفیات کو اس کے لیے ترک فرما دیتے تھے، باقاعدہ مطالعہ کرتے، ہر خیر وبرکت کا ذریعہ اس کو قرار دیتے تھے، رائے بریلی میں ہوتے تو حدیث شریف کا درس دینے کے لیے متعینہ دن

سے ایک دن قبل ہی ندوہ تشریف لے جاتے، آپ کی مجلس بھی علم وعرفان کا سنگم تھی، جہاں پہلے حدیث شریف پڑھی جاتی، پھر آپ اس پر کچھ گفتگو فرماتے، اس میں نصیحت کا جو پہلو ہوتا وہ بیان کرتے اور پھر مجلس برخواست ہوجاتی تھی۔

تیسری انفرادی خصوصیت جو آپ کو آپ کے معاصرین سے ممتاز کرتی ہے، آپ کے اخلاق حسنہ ہیں، حضور ﷺ کے نزدیک اخلاق حسنہ کی بڑی اہمیت تھی، آپ ﷺ اپنے لیے حسن اخلاق کی دعائیں کیا کرتے تھے، یہی اخلاق ہیں جو میزان عمل میں سب سے بھاری ہوں گے، یہی اخلاق ہیں جو جنت کی بلندی میں محل کے حصول کا ذریعہ بنیں گے، یہی اخلاق ہیں جو جنت میں آپ ﷺ کی قربت عطا کریں گے، اخلاق حسنہ میں ہم نے ابا کو غیر معمولی ممتاز پایا، آپ کے ہونٹوں پر ہر ایک کے لیے مسکراہٹ تھی، زبان پر ہر ایک کے لیے کلمہ خیر تھا اور دل میں ہر ایک کے لیے احترام تھا، تکلیف میں ہوں، دن بھر کی تھکاوٹ ہو، ملاقات کرنے والوں کی آمد ورفت مسلسل جاری ہو، پھر بھی ہر ایک آنے والے سے اسی مسکراہٹ اور خندہ پیشانی سے ملاقات کرتے اور اس کو پورا وقت دیتے، ارشاد نبوی ہے:

"أنا زعيم ببيت فی ربض الجنة لمن ترك المراء وإن كان محقا، وببيت فی وسط الجنة لمن ترك الكذب وإن كان مازحا وببيت فی أعلی الجنة لمن حسن خلقه."

مولانا واضح رشید حسنی ندویؒ کے انتقال کے بعد آپ نے ناشتہ اور کھانا گھر میں کھانا شروع کردیا تھا، لیکن جو لوگ آپ کے ساتھ رہتے تھے ان کو بلانا نہیں بھولتے تھے، اگر کبھی ہم لوگوں میں سے کسی نے کہہ دیا کہ وہ باہر کرلیں گے لیکن آپ اس کو پسند نہیں فرماتے تھے، فرماتے تھے؛ ان کو محسوس ہوگا اور اگر مہمانوں کی تعداد زیادہ ہوتی جو نہ آسکتے ہوں تو ان کی بہت فکر کرتے، کھانا جلدی لے جانے کی تاکید کرتے اور تاکید کرتے کہ وہیں رہنا تاکہ کھانے میں کمی ہو تو اس کمی کو دور کیا جاسکے۔

آپ کی ایک نمایاں صفت اخفاء ہے، ارشاد نبوی ہے: اس طرح خرچ کرو کہ بائیں ہاتھ کو پتہ نہ چلے کہ داہنے ہاتھ نے کیا دیا، آپ بہت خاموشی سے تعاون کرتے تھے، اس کے کئی واقعات ہیں جن کا ذکر کرنا مناسب نہیں ہے۔

ہم کو امید ہے کہ آپ کی یہ نیکیاں آپ کو وہاں فائدہ پہنچا رہی ہوں گی، اگرچہ ہم لوگوں کی زندگیوں میں ایک خلا ہوگیا ہے، ہمارے مشفق نانا جن کی دعائیں ہمارے ساتھ تھیں، توجہات ہمارے ساتھ تھیں، جن کی صحبت سے ہم کو بہت کچھ سیکھنے کا موقع مل رہا تھا، وہ شخصیت ہماری نگاہوں سے پردہ کرچکی ہے، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو اچھے اعمال کے ساتھ اور کامیاب زندگی گزار کر دنیا سے رخصت ہوا وہ حقیقی معنوں میں سرخ رو اور کامیاب ہے۔

امید ہے اللہ کی شان رحیمی سے کہ ابا کو ان کے اپنوں سے ملادیا ہوگا۔ وما عند اللہ خیر وأبقی!

اعمال کی تاثیر

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

"دین کے جو اعمال اس کے آداب کی رعایت کے مطابق کیے جاتے ہیں، ان کے نتائج عمدہ ہوتے ہیں، جو عمل انسان کرتا ہے، اچھے برے کے اعتبار سے اس کی چھاپ پڑتی ہے، اسی اعتبار سے وہ اپنے اعمال کی چھاپ آخرت میں دیکھ لے گا، انسان کے افعال واعمال اور حرکات وسکنات سب ریکارڈ ہوتے ہیں، کراماً کاتبین سب کچھ لکھتے ہیں، جیسے جس کے اعمال ہوں گے، اسی اعتبار سے اس کا ریکارڈ اس کے سامنے رکھا جائے گا، حلال وحرام کا نتیجہ تو مقرر ہے، اس سے کوئی اپنے کو بچا نہیں سکتا۔" (ملفوظات مرشد الامت: ۴۲)

ملے خاک میں اہل شاں کیسے کیسے

حافظ محمود ضیاء خیر آبادی
(متعلم مدرسہ منبع العلوم خیر آباد-مئو)

لاک ڈاؤن پوری دنیا کے لیے بڑا ہلاکت خیز اور نقصان دہ ثابت ہوا، لاک ڈاؤن کی وجہ سے پوری دنیا نے جس معاشی بحران کا سامنا کیا اور جو نقصانات اٹھائے، اسے تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ مگر امت مسلمہ بالخصوص ملت اسلامیہ ہند کے لیے اس عرصہ میں جو سب سے بڑا سانحہ پیش آیا، وہ اکابر و مشاہیر علماء کرام کی پے در پے اموات ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ''قیامت اسی وقت آئے گی جب علم اٹھالیا جائے گا۔'' (بخاری شریف:۱۰۳۶)

جس کا مشاہدہ حضرت مولانا مفتی سعید احمد پالن پوری (وفات: ۱۹؍مئی ۲۰۲۰ء مطابق ۲۵؍رمضان ۱۴۴۱ھ) کی رحلت سے لے کر حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی (وفات:۱۳؍اپریل ۲۰۲۳ء مطابق ۲۱؍رمضان ۱۴۴۴ھ) کی وفات تک پوری امت نے کیا۔ دو ڈھائی سال کے اس مختصر عرصہ میں علم و عمل کے کیسے کیسے آفتاب و ماہتاب غروب ہوئے، کیسے کیسے اکابرین و مشاہیر نے رخت سفر باندھا، کیسے کیسے قائدین و مصلحین ہم سے جدا ہوئے، کیسے کیسے مدرسین و محدثین نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ کوئی بھی صاحب دل انسان اگر غور کرے کہ ہم نے اس مختصر سے عرصہ میں کتنی اہم اہم شخصیات کو کھویا ہے تو اس کا دل ضرور غمگین ہوگا، اس کی آنکھ سے غم و الم کے دو تین قطرے ضرور نکلیں گے، اس کے چہرے پر اداسی و مایوسی کی کیفیت ضرور چھائے گی۔ بقول شاعر ؎

ملے خاک میں اہل شاں کیسے کیسے
مکیں ہوگئے بے مکاں کیسے کیسے
ہوئے نامور بے نشاں کیسے کیسے
زمیں کھاگئی آسماں کیسے کیسے

لاک ڈاؤن کے بعد جب حالات اپنی سابقہ حالت پر آگئے، تجارت و معیشت کا حسب سابق آغاز ہوگیا، مدارس و مکاتب اور عصری درسگاہیں کھل گئیں، تو کاروانِ علم و فن کا ایک قافلہ ہم سے جدا ہو چکا تھا، مگر جو شخصیات بقید حیات تھیں اور جن پر ہم سب کی نگاہیں مرجع کی حیثیت سے ٹھہرتی تھیں، ان میں ایک ممتاز نام مرشد امت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا تھا، البتہ حضرت مولاناؒ کی عمر عزیز نو دہائیوں کو پار کر چکی تھی، مگر آپ کی صحت مندی و تندرستی، آئے دن آپ کے بیانات و پیغامات اور تحریرات و تقریظات کو دیکھ کر امید نہیں تھی کہ حضرتؒ اس قدر جلدی ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ ابھی اسی رمضان میں آپ کے بیانات ہوتے رہے، مگر فرمان خداوندی: ﴿إِنَّ اَجَلَ اللّٰهِ إِذَا جَآءَ لَا يُؤَخَّر﴾ (بیشک جب اللہ کا مقرر کیا ہوا وقت آجاتا ہے تو پھر وہ مؤخر نہیں ہوتا) پورا ہوا اور داعی اجل نے آواز دی: ﴿يَا اَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِىْ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِىْ فِىْ عِبَادِىْ وَادْخُلِىْ جَنَّتِىْ﴾ (الفجر: ۲۷-۳۰) (اے نفس مطمئنہ! اپنے پروردگار کی طرف اس طرح لوٹ کر آجا کہ تو اس سے راضی ہو اور وہ تجھ سے راضی اور شامل ہو جا میرے نیک بندوں میں اور داخل ہو جا میری جنت میں)

یہ ندا سن کر یہ پاکیزہ روح اپنے ہزاروں تلامذہ و مسترشدین، متعلقین و مقربین اور لاکھوں عقیدت مندوں کو نم ناک چھوڑ کر اپنے رب سے جا ملی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

۱۷؍شعبان المعظم ۱۴۴۴ھ مطابق ۲۳؍اپریل ۲۰۱۹ء کو والد محترم مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی اور برادر مکرم حافظ احمد ضیاء کے ہمراہ لکھنؤ کا سفر ہوا، جس میں ندوۃ العلماء حاضری اور اکابرین ندوہ سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی، والد محترم کے دوست اور معروف عالم و محقق مولانا فیصل احمد صاحب ندوی بھٹکلی (استاذ حدیث ندوۃ العلماء لکھنؤ) کے ساتھ ہم لوگ حضرت مولاناؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، حضرتؒ مہمان خانہ کے ایک سادہ سے کمرہ میں تشریف فرما تھے، جو تمام تر زیب و زینت اور عیش و عشرت سے عاری تھا، میں نے جب مصافحہ کیا تو دست مبارک روئی کی طرح بالکل نرم تھا، آج بھی اس نرمی کو محسوس کرتا ہوں، حضرت کی مجلس میں بڑی نورانیت محسوس ہوئی، والد محترم نے حضرتؒ کی خدمت میں تذکرۂ سید الملت (مجموعہ مقالات سید الملت مولانا سید محمد میاں دیوبند سیمینار) پیش کی، حضرتؒ بہت خوش ہوئے، ہم سب کو خوب دعائیں دیں، یہی حضرتؒ سے پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

جب حضرتؒ سے میری ملاقات ہوئی تو اس وقت میں کم عمر اور حضرتؒ کے کمالات سے ناواقف تھا، پھر بعد میں رفتہ رفتہ آپؒ کے عزیز شاگرد مولانا ضیاء الدین صاحب قاسمی ندوی اور والد محترم کی زبانی آپؒ کی شرافت و نجابت، تواضع و انکساری، علمی و علمی امتیازات و کمالات کے بارے میں سنتا رہا اور انتقال کے بعد جب آپ کے کمالات و خصوصیات کو پڑھا تو دل دنگ رہ گیا، بالخصوص ۱۹۴۹ء سے ۲۰۲۳ء (چوہتر سال) تک ندوۃ العلماء کی حسبۃً للہ خدمت اور کھانا تک گھر سے منگا کر کھانے کے بارے میں پڑھا تو حیران رہ گیا کہ اس مادیت پرستی اور دنیا پرستی کے دور میں بھی ایسی ہستیاں زندہ ہیں، جن کی بے نفسی اور منکسر المزاجی کا یہ عالم ہے۔

حضرت مولاناؒ کی خودنوشت ''اوراق زندگی'' کا بھی میں نے گہرائی سے مطالعہ کیا اور بہت استفادہ کیا اور اس سے مجھے بہت سی معلومات حاصل ہوئیں۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ حضرتؒ کی عمر نوے سال ہے، تبھی سے مجھے آپ کے حالات کی تلاش تھی، خصوصاً یہ کہ آپؒ نے کن کن اکابر کو دیکھا ہے؟ آپؒ کے زمانہ طالب علمی کے رفقاء درس کون کون تھے؟ آپؒ کے زمانہ طالب علمی کے حالات وواقعات وغیرہ۔ یہ تمام معلومات مجھے اس خودنوشت میں مختصراً ہی سہی مل گئیں، مثلاً آپؒ نے مولانا حیدر حسن خان ٹونکیؒ (سابق شیخ الحدیث ندوۃ العلماء و خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ) بانی تبلیغ مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ، حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ (آپ کا نکاح حضرت مدنیؒ نے پڑھایا تھا) امام الہند مولانا ابو الکلام آزادؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا شاہ عبد القادر رائے پوریؒ (اولاً آپ حضرت رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے تھے) اور مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ، شاہ فیصل شہیدؒ اور جنرل ضیاء الحقؒ وغیرہم کی دید و زیارت سے مشرف تھے۔ آپؒ کے دار العلوم دیوبند کے رفقاء درس میں فدائے ملت مولانا سید اسعد مدنیؒ، خطیب الاسلام مولانا محمد سالم قاسمیؒ، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلیؒ وغیرہم تھے۔ مولانا سلیم اللہ خان صاحب لوہاروی ثم کراچوی آپ سے آگے تھے مگر بہت خیال کرتے تھے۔

غرض اس کتاب نے میری معلومات میں بیش بہا اضافہ کیا، مجھے اس سے ہندوستان اور پوری دنیا میں پیش آنے والے بہت سے اہم واقعات و سانحات کا علم ہوا، بہت سے اکابرین و مشائخ اور قائدین کی وفیات معلوم ہوئیں اور ان کی خصوصیات و امتیازات کا اندازہ ہوا، بہت سی کانفرنسوں، اجلاسوں اور سیمیناروں کے نام اکابرین کی زبان سے سن رکھے تھے، جن کی نوعیت و روداد پہلی مرتبہ اس کتاب میں ملی، اس کتاب کو پڑھ کر مغربی دنیا کی عیاریوں مکاریوں، مکر و فریب اور عالم اسلام کے خلاف کی جانے والی ان کی سازشوں کا علم ہوا۔ رابطہ ادب اسلامی کا قیام، رابطہ کا مقصد، اس کے اجلاسات وغیرہ کی تفصیل اس کتاب میں ملی۔

یہ کتاب میرے لیے اہم اور محسن کتابوں میں سے ہے، جس میں ایک صاحب دل بزرگ اور ایک بابصیرت قائد کی زندگی کے تجربات و مشاہدات پنہاں ہیں، اس لیے اسے ہر شخص، ہر فرد اور ہر

معلم و متعلم کو پڑھنا چاہیے۔

اوراقِ زندگی کے مطالعہ اور پھر کچھ دیر ان کی بابرکت خدمت میں گزارے نیز اپنے اساتذہ اور بڑے بزرگوں کی زبان حق سے حضرتؒ کی خصوصیات و امتیازات اور خصائل و محاسن کے سننے کے بعد حضرت مرشد امتؒ کی شخصیت جن کمالات کا مجموعہ نظر آئی، وہ یہ ہیں:

اخلاص و للّٰہیت، حکمت و موعظت، صلاح و تقویٰ، زہد و ورع، کسر نفسی، تواضع و انکساری، فکر کی بلندی، حلم و بردباری، صبر واستقامت، فکر و نظر میں اعتدال، بزرگان دین سے دلی تعلق، غیبت وعیب جوئی سے حد درجہ اجتناب، حسبی و نسبی شرافت، زبان و بیان میں حلاوت و نظافت، علوم و فنون میں رسوخ و توسع، فن تدریس میں مہارت و کمال، اندازِ تربیت میں پدرانہ شفقت، انتظامی امور میں دیانتداری، رشتوں کی پاس داری، کثرت تلاوت، تہجد گزاری، اشراق و چاشت کی پابندی، نرم گفتاری، شیریں کلامی اگر ان سب کو ملا کر ایک صورت تشکیل دی جائے تو جو شخصیت ابھر کر ہمارے سامنے آئے گی، ہم اس کو حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کہیں گے۔

اخیر میں اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ حضرت مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے، ان کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، ندوۃ العلماء، مسلم پرسنل لا بورڈ اور پوری امت مسلمہ کو آپؒ کا نعم البدل عطا فرمائے اور ہم سب کو آپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

انسانی مخلوق کا امتیاز

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

”اللہ تعالیٰ نے جو مخلوقات پیدا فرمائی ہیں، ان تمام مخلوقات کی نوعیتیں الگ الگ ہیں، ان سب کے اندر اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیت رکھی ہے ان میں وہی صلاحیت موجود ہے، وہ اپنی اس صلاحیت سے نہیں ہٹ پاتے، دوسری بات یہ ہے کہ ان کو موہوب صلاحیت کے سوا مزید معلومات حاصل کرنے کی کوئی فکر نہیں ہے، اسی لیے ان سب کا دائرہ محدود ہے اور ہر مخلوق کو من جانب اللہ جو ذمہ داری تفویض کی گئی ہے، وہ اپنی اسی ذمہ داری کی ادائیگی میں مصروف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں انسانی مخلوق کو ایسا بنایا ہے کہ ان کو زندگی گذارنے کے لیے معلومات سے واقفیت بہت ضروری ہے اور اگر ان کے پاس معلومات نہ ہوں تو ان کی زندگی بالکل بے کار ہے، مثلاً: اگر آپ کو نہ معلوم ہو کہ کپڑا کیسے بنتا ہے؟ کپڑا کہاں سے لایا جاتا ہے؟ غذا کہاں اور کیسے ملے گی؟ پانی کیسے حاصل ہوگا؟ یا آپ کسی ایسی جگہ پر ہوں جہاں پانی نہ ہو، غذا کا بھی کوئی انتظام نہ ہو یا وہاں کی زمین ہی ایسی ہو کہ وہاں کچھ نہ ملتا ہو اور آپ کو وہاں کے متعلق کچھ معلوم بھی نہ ہو تو ایسی صورت حال میں آپ کہاں سے کھانا لائیں گے؟ کہاں سے پانی لائیں گے؟ کہاں سے کپڑے لائیں گے؟ ظاہر ہے ایسے موقع پر آپ کچھ نہیں کر سکتے۔ معلوم ہوا انسان کی زندگی کا پورا نظام معلومات پر چل رہا ہے، معلومات کے ذریعہ سے ہی آدمی اپنی ضروریات اور اپنے تقاضے اور اپنا مقصد سمجھتا ہے، گویا معلومات بنیادی چیز ہے جس سے انسان اس دنیا میں زندہ ہے اور تمام مخلوقات پر اس کا تفوق ثابت ہے، ورنہ انسان اور جانور میں کوئی فرق نہ ہوتا۔

انسان اور جانور کی زندگی کا فرق اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ انسان کو ایک وقت کے کھانے کے لیے بہت سی معلومات سے واقفیت ضروری ہوتی ہے، اس کو یہ معلوم کرنا ہوتا ہے کہ ایک وقت کے کھانے کے لیے کیا ذرائع اختیار کیے جائیں گے جن سے اس کے ہاتھ میں پیسہ آسکے، پھر وہ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ اس کے ذوق کے مطابق کھانے پینے کی اشیاء کہاں ملیں گی؟ پھر انہیں بنانے کا طریقہ معلوم کرتا ہے اور اس کے بعد عمدگی کے ساتھ پکا کر اطمینان سے کھاتا ہے۔ لیکن ایک جانور ہے جس کو کھانے کے لیے کسی قسم کی معلومات یا کوئی ذریعہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس کو جب بھوک لگے گی تو وہ جہاں کھانے کی کوئی چیز دیکھے گا کھالے گا اور اپنی ضرورت پوری کر لے گا۔“

(شعائر اللہ کی عظمت: ۳۱-۳۳)

اچھے ابا کی چند خصوصیات

سید محمد میاں حسنی
(دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں-رائے بریلی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ مسلمانوں میں سے افضل کون ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"خیرکم من طال عمره وحسن عمله."

(تم میں بہتر وہ ہے جس کی عمر لمبی ہو اور اعمال اچھے ہوں۔)

ابا نے ماشاء اللہ ۹۴ رسال کی عمر پائی، پوری عمر خدمت دین میں گزاری، ابا کی پوری زندگی اس شعر کا آئینہ تھی

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی
میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی

آپ کی انفرادی زندگی کو دیکھا جائے تو تقویٰ، خوفِ خدا اور خشیت الٰہی میں آپ بہت بلندی پر جلوہ افروز نظر آتے ہیں، جن سات لوگوں کو اللہ کے عرش کا سایہ نصیب ہوگا، ان میں سے ایک وہ ہے جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرے اور آنکھیں اس کی بہہ پڑیں، میں نے ابا کو خلوت میں اللہ کو یاد کر کے دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے اور گڑ گڑاتے ہوئے دیکھا ہے۔ سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"لا يستقيم عبد حتى يستقيم قلبه ولا يستقيم قلبه حتى يستقيم لسانه." (آدمی کا ایمان اس وقت تک درست نہیں ہوسکتا جب تک اس کا دل سیدھا نہ ہو جائے اور دل اس وقت تک سیدھا نہیں ہوسکتا جب تک زبان سیدھی نہ ہو جائے۔)

ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے اچھے ابا کو کبھی کسی کی غیبت کرتے ہوئے دیکھا ہو، کسی کا مذاق اڑاتے ہوئے دیکھا ہو، زبان کی حفاظت آپ کی اتنی تھی کہ کھانے میں بھی کبھی آپ کی زبان سے شکوہ نہیں سنا، جیسا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آتا ہے کہ

"ما عاب النبي صلى الله عليه وسلم طعاما قط، ان اشتهاه أكله والا تركه." (آپ نے کبھی کھانے میں عیب نہیں نکالا، پسند آیا تو نوش فرمایا، پسند نہیں آیا تو چھوڑ دیا۔)

ہم نے اچھے ابا کے ساتھ بہت بار کھانا کھایا، لیکن ہمیں یاد نہیں کہ اچھے ابا نے کھانے پر کبھی نکتہ چینی کی ہو، بلکہ آپ "من حسن اسلام المرء تركه ما لا يعنيه" پر عمل پیرا تھے، بہت سوچ سمجھ کر الفاظ کا انتخاب کرتے تھے، خدا کے ہاں جواب دہی کا احساس آپ کو ہر وقت رہتا تھا، اچھے ابا اخلاق نبوی کے عکس جمیل تھے، جیسا کہ ارشاد نبوی ہے کہ اللہ کے میزان میں حسن اخلاق سے بڑھ کر کوئی چیز وزنی نہیں، آپ کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ کوئی شخص بھی اگر ملنے آتا تو اس سے مسکرا کر ملتے، گرچہ اس کو جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں، کبھی بھی ناگواری چہرہ سے ظاہر نہ ہوتی، اگر خاندان کا کوئی شخص ملنے آتا تو بہت زیادہ محبت سے ملتے اور خوشی کا اظہار کرتے، آپ کی تربیت کا طریقہ جداگانہ تھا، جب بھی گھر آتے اور کوئی چھوٹا بچہ ملنے آتا تو آپ تربیت کی خاطر پیسے نہ دیتے اور دوسروں کو بھی پیسے دینے سے روکتے، بلکہ اس کو ٹافی یا چوکلیٹ دیتے اور محبت وشفقت سے پیش آتے اور اگر کوئی چیز کسی نواسے کو دیتے تو سب کو دینے کی کوشش کرتے، جیسا کہ نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں:

"أعطاني أبي عطية فقالت عمرة بنت رواحة: لا أرضى حتى تشهد رسول الله صلى الله عليه وسلم، فأتى رسول الله صلى الله عليه وسلم، فقال: إني أعطيت ابني من

عمرة بنت رواحة عطية، فأمرتنى أن أشهدك يا رسول الله! قال: أعطيت سائر ولدك مثل هذا؟ قال: لا، قال: فاتقوا الله واعدلوا بين أولادكم، ثم قال: فرجع فرد عطيته."

(میرے والد نے مجھ پر اپنا کچھ مال صدقہ کیا تو میری والدہ عمرہ بنت رواحہ کہنے لگی کہ میں اس پر اس وقت تک راضی نہیں ہوں گی جب تک آپ اس پر نبی مکرم ﷺ کو گواہ نہ بنادیں، تو میرے والد نبی مکرم ﷺ کے پاس گئے تا کہ انہیں میرے صدقہ پر گواہ بنا سکیں تو نبی ﷺ نے انہیں فرمایا: ''کیا تو نے اپنے ساری اولاد کے ساتھ ایسے ہی کیا ہے؟'' انہوں نے جواب نفی میں دیا، نبی ﷺ فرمانے لگے: ''اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور اپنی اولاد کے مابین عدل وانصاف سے کام لو۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر انہوں نے واپس جا کر اپنا ہدیہ واپس کر دیا۔)

اگر کوئی مسلم سیاست داں کوئی ہدیہ پیش کرتا تو مسلم سیاست داں کو ہی دیتے، اگر غیر مسلم دیتا تو اس ہدیہ کو کسی غیر مسلم کو ہی دیتے، لیکن اگر دینے والا اللہ کا نیک بندہ ہوتا' ولی صفت انسان ہوتا تو آپ اس کو خود استعمال کرتے جیسا کہ علی گڑھ سے کسی متعلق نے حکیم کلیم اللہ صاحب کا کوئی تحفہ لا کر پیش کیا تو ابا اس کو خود استعمال کرتے یا دینے والا کوئی غریب ہوتا' بڑے خلوص سے کوئی ہدیہ پیش کرتا' دل میں اس کے اللہ والوں کی محبت ہوتی، جذبہ اس کا نیک ہوتا تو اس تحفہ کو بھی ابا کوشش کرتے کہ کسی حد تک استعمال کریں اور اس کا اظہار اس کے سامنے کر دیتے جس سے اس کو خوشی ہوتی تھی، اس طرح ایک مسلمان کو خوش کرنے کا عمل بھی ہو جاتا تھا۔

قرآن مجید سے خاص شغف اور تعلق تھا، فجر بعد اور عصر بعد قرآن شریف پڑھنے اور سننے کا معمول تھا، جب کبھی سفر پر جاتے تو دو رکعات نماز پڑھتے، رات میں تہجد پڑھنا نہ بھولتے، چند سال قبل ڈاکٹروں نے چند طبی وجوہات کی بنیاد پر روزہ نہ رکھنے کی تجویز دی تھی، کیونکہ کچھ خاص دوائیں لینا ہوتی تھیں، اس بات کا اچھے ابا کو بہت زیادہ افسوس ہوتا اور اس کا آئے دن ذکر کرتے اور چاہتے کہ روزہ رکھیں لیکن روزہ نہ رکھنے کے باوجود سحر وافطار کا خوب اہتمام فرماتے، اگر کوئی باہر کا شخص خدمت کرنا چاہتا اور ہاتھ یا پیر دبانے لگتا تو اس کو روکنے کی کوشش کرتے اور منع کرتے، ندوہ میں ہوتے تو باوجود کثیر مشاغل کے وقت نکال کر گھر آتے اور سب سے ملتے اور کھانا ساتھ کھاتے، اچھے ابا کا کھانا گھر سے ہی جاتا، اگر دیر ہو جاتی کھانا ندوہ پہنچنے میں تو کبھی غصہ نہیں ہوتے اور نہ ہی شکایت کرتے، بقول ملازمین کے حضرت ہم پر پر غصہ نہیں ہوتے۔

اچھے ابا کو چند لوگوں نے گاڑی دینے کی کوشش لیکن اچھے ابا نے گاڑی لینے سے انکار کر دیا اور خود لینے کے بجائے ندوہ کو دینے کے لیے کہہ دیا، جب کبھی اچھے ابا کسی کو کچھ دیتے تو ایسے دیتے کہ لینے والے کے علاوہ اس کا علم کسی کو نہ ہوتا۔

ہم نے اچھے ابا سے زیادہ صابر کسی کو نہیں پایا، بڑے سے بڑا سانحہ یا واقعہ ہو جاتا لیکن اچھے ابا خاموش رہتے اور صبر کرتے، ابھی کچھ سالوں کی بات ہے کہ اچھے ابا کے سامنے خاندان کے بہت سے لوگوں کی وفات ہوئی جن میں ابی' چھوٹے ابا' ماموں صاحب ودیگر یہ وہ لوگ تھے جن سے اچھے ابا کو قلبی لگاؤ تھا، ان سب حادثوں کے باوجود اچھے ابا صبر کرتے رہے اور اف تک نہ کہا۔

نرم مزاج' خوب سیرت اور خوبصورت قرآن وحدیث کے پڑھنے والے تھے، عربی ادب میں بھی ماہر تھے، اکثر قرأت وکتابت کی تلقین کیا کرتے، خاص کر عربی تعبیر کی طرف رغبت دلاتے اور بزرگوں کی صحبت اختیار کرنے کو کہتے، علیا اولیٰ تکمیل کے نتیجہ کے بارے میں جب بتایا تو بہت زیادہ خوش ہوئے اور کہا کہ اپنے ابی اور دادا کی طرح بننا، جب کبھی اچھے ابا کے پاس بیٹھتے تو اچھے ابا گھر کے بارے میں پوچھنا نہ بھولتے اور پوچھتے کہ کون کون سی کتابیں پڑھ رہے ہو اور کن کن اساتذہ سے پڑھ رہے ہو اور علیا اولیٰ اور علیا ثانیہ کے طلبہ کے بارے میں بھی دریافت کرتے اور پوچھتے کہ کتنے طلبہ درجہ میں ہیں اور بدھ کے دن بخاری شریف کا مسجد میں معمول کے ساتھ درس دیتے۔

اللہ اور اس کے رسول سے سے بہت زیادہ محبت کرنے والے

تھے اور صحابہ کرام سے رضی اللہ عنہم سے گویا عشق تھا اور ان کے خلاف ایک لفظ برداشت نہیں کرتے۔

ارشادِ نبوی ہے: "من لم یشکر الناس لم یشکر اللّٰہ" جو لوگوں کا شکریہ نہیں ادا کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرتا، آپ کی زندگی میں اس کا بہت اہتمام تھا، یہاں تک کہ آپ جب گھر سے بنگلہ وہیل چیر سے تشریف لے جاتے اور ہم میں سے کسی کو یہ سعادت حاصل ہوتی کہ وہیل چیر وہ چلا رہا ہوتا تو آپ بنگلہ میں وہیل چیر سے اترتے ہوئے جزاک اللہ کہنا کبھی نہیں بھولتے تھے، جزاک اللہ کہنے اور شکریہ ادا کرنے کا اتنا اہتمام کم لوگوں کی زندگی میں ہوگا، آپ کی حیاتِ مستعار میں حقوق مسلم کا شعبہ بہت مضبوط دکھتا ہے، پھر چاہے بیمار کی عیادت اور مزاج پرسی ہو تعاون علی البر والتقویٰ کی کوئی بھی شکل ہو، دوسروں کے لیے قلب کی صفائی اور دل کی پاکیزگی ہو، دین کے ہر فیلڈ میں آپ بہت نمایاں اور ممتاز نظر آتے ہیں، آپ کی زندگی میں اس کا بہت اہتمام تھا۔

خاص کر ہم سے بہت زیادہ محبت کرتے اور جب کبھی ہم اچھے ابا کے پاس جاتے تو بہت زیادہ محبت کا اظہار کرتے اور بہت زیادہ خوش ہوتے، ایک دن ایک صاحب اچھے ابا سے ملنے کے لیے آئے تو ہم وہیں پر تھے تو اچھے ابا میرا تعارف کرانے لگے ان سے اور کہا کہ یہ میرا بیٹا ہے پھر احساس ہوا تو کہا کہ میرا نواسہ ہے، جب ابی کا انتقال ہوا تھا تو اچھے ابا نے ہم سے کہا: کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو ہم سے کہہ سکتے ہو، ہم تمہارے والد کی طرح ہیں، جب کبھی ضرورت ہو تو ہم سے مانگ سکتے ہو، اکثر پوچھتے بھی رہتے تھے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے اور کچھ نہ کچھ دیتے رہتے۔

اور کتنی ہی ایسی خصوصیات جن کا ذکر نہیں ہوسکا، اچھے ابا کی وفات کے وقت ہم سب وہیں پر تھے، جس نے ہم کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور یتیم کر کے رکھ دیا۔ اللہ اچھے ابا کے درجات بلند فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

محاسبہ کی ضرورت

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

"آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر مسلمان اپنا جائزہ لے کہ اس کو اللہ کے رسول سے کتنی محبت ہے، اس محبت کا اندازہ صرف کہنے سے نہیں بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کے مقابلہ میں کوئی چیز آجائے، عموماً آدمی کو دنیا کے منافع، مال ومتاع اور اولاد سے ایسی محبت ہوجاتی ہے کہ اس سے دین کے معاملہ میں خلل پڑنے لگتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس سے روکا اور یہ فرمادیا کہ تمہاری اولاد، تمہارا مال ودولت تمہارے لیے فتنہ ہے، فتنہ کے معنی عربی میں لبھا کر آدمی کو اصل راستہ سے ہٹانے کے ہیں، یعنی آدمی شوق میں غلط کام کرنے لگے، کسی چیز کو اتنا پسند کرے اور اس سے اتنا لگاؤ ہو کہ اس کی وجہ سے وہ غلط کام کردے، لیکن اللہ کے رسول سے آدمی کو اگر صحیح محبت ہو، جیسی محبت کا مطالبہ ہے کہ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوگا، تو پھر وہ شخص ہزار چیزوں کے باوجود بھی اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی نہیں کرسکتا، کیونکہ انسان کو جس سے محبت وعقیدت ہوگی وہ اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا، لہٰذا ایمان کے مکمل ہونے اور شریعت پر صحیح عمل کے لیے ضرورت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ سے ایسی محبت ہو۔"

(اسلامی معاشرہ-سورۂ حجرات کی روشنی میں: ۲۸-۲۹)

وہ جو رخصت ہو گئے ویران ہے اب یہ چمن

سید ابوالحسن علی حسنی
(دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں-رائے بریلی)

۲۲؍رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ بروز جمعرات' یہ وہ دن تھا جس دن علم ومعرفت کا ایک دریائے رواں تھم گیا، یہ وہ دن تھا جس دن دنیا کو ایک عظیم حادثہ سے دوچار ہونا پڑا، یہ وہ دن تھا جس دن عالم اسلام کی ایک عظیم شخصیت' ہم سب کے محبوب مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا سانحہ ارتحال پیش آیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون!

حضرت والا کی شخصیت وہ تھی کہ جس کا وجود ہی ہمارے لیے باعث برکت ورحمت تھا، آپ کی ہر ہر نصیحت ہمارے لیے صلاح وفلاح کا ذریعہ تھی، آپ کے ہر عمل کی بنیاد رضائے الٰہی اور آپ کی ہر بات احادیث نبویہ کی ترجمان معلوم ہوتی تھی، ایک طرف آپ کی نرم طبیعت کا یہ عالم تھا کہ ہر لحہ آپ کو یہ بات پیش نظر رہتی تھی کہ آپ کی ذات سے کسی کو اذیت نہ پہنچے تو دوسری طرف دینی امور میں آپ کے پختہ اقدامات کی مثال ملنا بھی مشکل ہے، ایک طرف چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور رعایت کا معاملہ-جس کا تجربہ خود راقم سطور نے بارہا کیا-تو دوسری طرف ان کی تربیت کا بھی پورا خیال، آپ کے اخلاق سنت نبوی ﷺ سے مستعار تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو وہ وجاہت اور جاذبیت دی تھی کہ جو آپ سے مل لیتا آپ ہی کا ہو جاتا، ہر ایک سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملنا، نرم لہجہ میں گفتگو کرنا آپ کا شیوہ رہا، متعدد مرتبہ ایسا ہوا کہ کوئی شخص آپ سے ملاقات کے لیے آیا تو آپ نے خوب گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا، خوب خاطر مدارات کی اور بعد میں معلوم ہوا کہ آپ نے اس کو پہچانا بھی نہیں، بایں خاطر ہر ایک کے نزدیک آپ محبوب تھے اور ہر شخص اپنے آپ کو حضرت کا خاص ومحبوب سمجھتا تھا، امت کی فکر میں بے چین وبے قرار، گویا آپ اس آیت قرآنی کے مصداق تھے:﴿فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَفْسَكَ عَلىٰ آثارِهِمْ إِنْ لَمْ يُؤْمِنُوا بِهذَا الْحَدِيثِ أَسَفاً﴾

متعدد لوگوں سے سنا کہ حضرت والا کو دیکھا کہ رات کی تاریکی میں جہاں لوگ اپنے نرم بستروں پر محو خواب ہیں، آپ اپنی اشک بار آنکھوں کے ساتھ بارگاہِ خداوندی میں دعا گو ہیں:﴿الَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّداً وَ قِياماً﴾

جہاں ایک طرف آپ کے زہد وتقویٰ کی مثالیں دی جاتی ہیں، وہیں دوسری طرف آپ کی علمی لیاقت کا بھی لوہا مانا جاتا ہے، ایک طرف عربی ادب کا آپ خاص ذوق رکھتے تھے، وہیں علوم دینیہ میں بھی آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ کے جانشین ہوئے اور آپ کی فکر کے ساتھ ندوہ کے مشن کو لے کر آگے بڑھے اور دین کی تعمیر وترقی اور دعوت توحید کی خاطر اپنی زندگی کھپا دی:﴿وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا☆ وَإِنَّ اللَّهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِينَ﴾

اس وقت مسلمانوں کے درمیان آپ کی حیثیت ایک مشفق باپ کی سی تھی اور امت کے لیے آپ بڑا قیمتی سرمایہ تھے، بہر حال اس خالق کائنات کے لیے کچھ مشکل نہیں! اس رب سے دعا ہے کہ آپ کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کو پر فرمائے اور آپ کی مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔آمین!

عرش والا عرش کے سائے تلے رکھے انہیں
باغ جنت ہو سجا اور آپ ہوں جلوہ فگن

آہ مرشد الامت

محمد معاذ بن حافظ مصباح
(متعلم دار العلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

فاضل جفاکشانے محبت کی موت کیا
جب تھک گئے تو سو گئے آرام کے لیے

۱۳/اپریل ۲۰۲۳ء مطابق ۲۲/رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ بروز جمعرات کوملت اسلامیہ ہندیہ کا ایک عظیم سرمایہ محسن ومشفق مربی بین الاقوامی شہرت یافتہ شخصیت جانشین ابوالحسن ناظم ندوۃ العلماء وصدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ۹۴/ سال کی عمر میں اپنی گوناگوں صفات کا دفتر سمیٹ کر اس جہان فانی سے جہان بقا کی طرف رخصت ہوگئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون!

ہوگیا روپوش خورشید فلک پیا کہیں
غم میں ڈوبے ہیں ستارے چاند بھی ڈوبا کہیں
پیکر صدق وصفا تھا مرکز مہر وفا
اب بھلا پائیں ایسا پیر میخانہ کہیں؟
یاد رکھیں گے تجھے رابع بام ودر صدا
بھول سکتے ہیں تجھے ناہید زہرہ کہیں؟

دنیا میں کسی کو بقاودام حاصل نہیں ہے، ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ☆ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾ لیکن آپ کا سانحہ ارتحال عالم اسلام کے لیے ایک عظیم خسارہ ہے۔کسی نے سچ ہی کہا ہے ''موت العالم موت العالم'' اور یہ سچ ہے کہ حضرت مولاناؒ کی رحلت صرف ایک ادارے یا ایک تنظیم کی نہیں بلکہ ایک پورے عہد کا خاتمہ ہے۔آپ کی شخصیت جن اوصاف کی حامل تھی اس کی نظیر آج کے اس پرآشوب دور میں شاذ ونادر دیکھنے کو ملتی ہے۔آپ بے شمار اور بے پناہ صلاحیتوں کے حامل تھے۔ آپ تقویٰ، علم وللّٰہیت، صبر وتحمل اور بلند اخلاق کے پیکر تھے۔آپ خاموش مزاج وحساس اور نرم طبیعت کے مالک تھے، آپ نہایت نازک مسائل کو خاموش مزاجی اور حکمت پسندی سے حل کرتے تھے۔آپ ایک جہاندیدہ شخصیت کے مالک تھے۔آپ کے اس دنیا سے رخصت ہوجانے سے پورے ایک دور بلکہ ایک عہد کا خاتمہ ہے۔

جو بادہ کش تھے پرانے وہ اٹھے جاتے ہیں
کہیں سے اب بقائے دوام لا ساقی

آپ کی شخصیت کا آغاز ۱۹۲۹ء سے ہوتا ہے، آپ نے خاندانی مکتب میں تعلیم حاصل کی، پھر آپ دار العلوم ندوۃ العلماء تشریف لائے، پھر آپ عالمی شہرت یافتہ ام المدارس دار العلوم دیوبند تشریف لے گئے اور وہاں حضرت مولانا حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہ کی صحبت میں رہے، پھر ندوۃ العلماء آکر تعلیم مکمل کی اور ۱۹۴۸ء میں آپ نے سند فراغت حاصل کی۔

فراغت کے بعد آپ کا ۱۹۴۹ء میں دار العلوم ندوۃ العلماء میں معاون مدرس کے طور پر تقرر ہوا، پھر آپ درمیان میں ایک سال لیے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۱ء تک حجاز تشریف لے گئے۔اس سفر سے واپسی کے بعد آپ دار العلوم ندوۃ العلماء میں مستقل طور پر استاد مقرر ہوئے اور تصنیف وتدریس وتالیف میں مشغول ہوگئے۔آپ نے ۱۹۵۹ء میں ''الرائد'' کے نام سے ایک پندرہ روزہ عربی رسالہ جاری کیا، ۱۹۷۰ء میں آپ شعبہ عربی کے صدر منتخب ہوئے اور ۱۹۹۳ء میں آپ ندوۃ العلماء کے مہتمم منتخب ہوئے اور ۲۰۰۰ء میں مفکر اسلام کی رحلت کے بعد آپ ندوۃ العلماء کے ناظم منتخب ہوئے

اور ۲۰۰۳ء میں قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ کی وفات کے بعد آپ پرسنل لا بورڈ کے صدر منتخب ہوئے اور تادم آخر مسلسل اس عہدے پر فائز رہے، بلاشبہ آپ بقیۃ السلف تھے، اخلاق وکردار، شرافت نفس اور نرم روی اور کم گوئی میں آپ ممتاز مقام رکھتے تھے، آپ ہر کام کو دور اندیشی، دانش مندی اور نام ونمود سے دوری کے ساتھ سرانجام دیتے تھے۔ آپ کی انہی صفات حمیدہ کی بنا پر آپ کو ملت اسلامیہ کے ہر طبقہ میں انتہائی احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس بات کا اندازہ آپ کی نماز جنازہ میں لوگوں کے ازدحام سے لگایا جاسکتا ہے۔ آپ دل میں ملت اسلامیہ کا درد رکھتے تھے۔ آپ نے جزیرۃ العرب میں جب شریعت کا مذاق اڑاتے دیکھا تو آپ بے چین ہوگئے اور آپ نے محمد بن سلمان کو خط لکھ کر مولانا علی میاں ندویؒ کے نہج میں سمجھانے کی کوشش کی، آپ ہر وقت امت کی حالت زار پر متفکر رہتے تھے، راقم نے بارہا حضرت کو تنہائی میں ایک الگ کیفیت میں دیکھا، اس وقت آپ پر ایک وجدانی کیفیت طاری ہوتی تھی۔

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا
آنکھ حیران ہے کیا شخص زمانے سے اٹھا

بلا شبہ حضرت مولانا رابع حسنی ندویؒ اللہ کے ولی تھے اور حدیث پاک میں ولایت کی صفات بیان کی گئی ہیں کہ

"من ذکرکم باللّٰہ رؤیتہ وزادکم فی العلم منطقہ وذکرکم بالآخرۃ عملہ" (جس کو دیکھ کر تمہیں اللہ کی یاد آئے، جس کی گفتگو سے تمہارے علم میں اضافہ ہو اور جس کے عمل سے تمہیں آخرت کی توجہ ہو)

حضرت مولاناؒ اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ محی السنہ حضرت مولانا شاہ ابرار الحق صاحبؒ کی خدمت میں ڈرتے ڈرتے حاضر ہوا کہ کہیں ان کی بے ادبی نہ ہوجائے، وہ حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں سے ہیں، میں ان کے سامنے انتہائی ادب کے ساتھ بیٹھ گیا، ان کی جو نظر مجھ پر پڑی میں سوچ بھی نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت کے درجات بلند فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

خیر امت کی شانِ امتیازی

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

"دین کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے میں اس امت نے اپنا ایک وقار قائم کر رکھا ہے، دین کے معاملہ میں ہر طرح کی قربانی دینا خواہ وہ جان کی ہو یا مال کی یا وقت کی، اس امت کا شعار رہا ہے اور اس میں یہ امت ممتاز ہے، دنیا کی کسی اور قوم میں یہ بات نہیں ہے کہ وہ اپنے مذہب کے لیے اتنی قربانی دے، یہ اس امت کے خیر امت ہونے کی دلیل ہے اور اس سے کامیابی کی طرف اشارہ ملتا ہے، اگرچہ مسلمانوں میں انفرادی طور پر بعض خرابیاں پائی جاتی ہیں، لیکن "من حیث القوم" یہ امت دین سے جڑی ہوئی اور اس سے وابستہ ہے، بعض خرابیوں کو دیکھ کر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ مسلمانوں میں دین کا جذبہ موجود ہے اور جب جذبہ ہو اور دین کے لیے کوشش ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ﴿وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے (قرب وثواب) یعنی جنت کے راستے ضرور دکھائیں گے۔"

(ملفوظات مرشد الامت: ۸۱-۸۲)

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

سید علی زین العابدین اشرف
(متعلم جامعۃ العلوم گڑھا- گجرات)

رمضان المبارک کا مہینہ شروع تھا، بندے کا قیام ان دنوں میسور میں تھا، اچانک ایک دن والدہ کے توسط سے یہ خبر موصول ہوئی کہ حضرت مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ العالی کی طبیعت کافی ناساز ہے اور انہیں فوری طور پر رائے بریلی سے لکھنؤ منتقل کیا گیا ہے۔ بہر حال میسور سے ۲۰ رمضان المبارک کو واپس ہوا، ایک دن قیام کے بعد یہ الم ناک خبر بجلی بن کر گری کہ حضرت مولانا وصال فرما گئے ہیں، یہ خبر سنتے ہی ایسا محسوس ہونے لگا کہ کوئی قیامت سی ٹوٹ پڑی ہو، زمین میں اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود تنگ دامن معلوم ہونے لگی، ایک ویرانی سی چاروں طرف فضاؤں میں بکھرتی نظر آنے لگی، فوراً نانیہال سے رائے بریلی کے لیے روانہ ہوگیا، دورانِ سفر حضرت مولانا کے ساتھ گزارے ہوئے وہ مبارک لمحات نیز آپؒ کی دینی وعلمی مجالس دل ودماغ میں برابر گردش کرتی رہیں، اور دل ودماغ اب تک اس بات کو قبول کرنے کو تیار نہ تھا کہ حضرت اب ہمارے درمیان نہ رہے۔

مجھے بھی حضرت مولانا کو بچپن سے ہی بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، آپ کا معمول تھا کہ آپ پورے ہفتے ندوے میں رہتے لیکن جمعرات کو آپ تکیہ تشریف لے آتے، اسی بہانے نمازوں میں آپؒ کے قریب کھڑے ہونے کا موقع ملتا، بعض مرتبہ صف میں آپؒ سے بالکل متصل کھڑے ہونے میں تکلف محسوس ہوتا تو حضرت خود اپنے سے قریب فرمالیا کرتے تھے، بندے کا جب حفظ قرآن مجید مکمل ہوا تو حضرت نے ہی دعا فرمائی، نیز جلسہ دستار بندی کا بھی انعقاد حضرت کی ہی سرپرستی میں ہوا۔

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی پوری زندگی اخلاق نبوی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، انکی مجالس علم ودین اور شرم وحیا کی مجلس ہوا کرتی تھی، اس مجلس میں تھوڑی دیر کے لیے کوئی بیٹھ جاتا تو نیک جذبہ لے کر اٹھتا، اچھے اور خیر کے کاموں کو انجام دینے اور انسانوں کے ساتھ ہمدردی وخیر خواہی اور دوسروں کے کام آنے کا جذبہ لے کر جاتا، آپ حدیث شریف میں موجود ربانی و ایمانی اوصاف کے مکمل نمونہ تھے، آپؒ تصوف وسلوک، تقویٰ وللّٰہیت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے، قرب الٰہی کی دولت سے مالا مال تھے، اخلاص، تقویٰ، شکر، صبر، قناعت، توکل علی اللہ جیسی صفات سے بھی آپؒ متصف تھے، یہی وجہ ہے کہ آپؒ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی در کے سوالی نہیں رہے، اسی سے لو لگانا، اسی سے مانگنا، مسائل ومشکلات میں اسی کی طرف رجوع کرنا آپؒ کی طبیعت ثانیہ بن چکی تھی، مزید یہ کہ آپؒ سنت نبوی ﷺ پر پوری طرح عامل تھے، آپؒ کا کردار قرآنی و حدیثی کردار تھا، آپؒ کے ذریعہ ہزاروں بندگانِ خدا نے کسب فیض کیا اور تا وفات آپؒ اپنے علم ومعرفت کے جوہر بکھرتے رہے۔

آپؒ حضرت مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے حقیقی بھانجے اور صحیح معنوں میں جانشین تھے، آپؒ کو بلاد عربیہ وممالک اسلامیہ کی ممتاز شخصیات اور سربرآوردہ لوگوں سے ملاقات وتبادلہ خیال کے اچھے مواقع فراہم ہوئے۔ حضرت مولانا علی میاں ندویؒ نے آپ کو اپنی پوری زندگی خود سے بہت قریب رکھا، نیز آپؒ سے حضرت مفکر اسلامؒ اہم معاملات میں مشورہ بھی طلب فرمایا کرتے تھے اور بعض مرتبہ تو حضرت مولانا علی میاں ندویؒ آپ کی رائے

معلوم کرنے کے بعد اپنی رائے تبدیل کر دیا کرتے تھے۔ آپؒ نے حضرت مفکر اسلامؒ کے ساتھ دنیا کے مختلف ممالک کے اسفار بھی کیے نیز آپؒ حضرت مفکر اسلامؒ کی وفات کے بعد متفقہ طور پر ناظم ندوۃ العلماء منتخب کئے گئے اور اس منصب جلیلہ کی خدمات آپؒ تاحین وفات انجام دیتے رہے۔

پھر حضرت مولانا قاضی مجاہد اسلامؒ کی وفات کے بعد جب پرسنل لا بورڈ اپنے ایک عظیم قائد سے محروم ہو گیا تو یکا یک تمام علماء ہند کی نظریں آپؒ کی طرف اٹھیں اور آپؒ کو اپنے نام کی مناسبت سے بورڈ کا چوتھا صدر منتخب کیا گیا، مختصراً یہ کہ ہمارے حضرت ایک عالم گیر شخصیت اور اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔

حضرت کو ہمارے جامعہ سے بھی کافی لگاؤ تھا اور آپؒ نے ہی جامعہ کا نام ''جامعۃ العلوم'' تجویز فرمایا تھا، نیز ہمارے جامعہ کے بانی و مہتمم (جو کہ حضرتؒ کے مجاز بھی ہیں) حضرت مولانا سیف الدین صاحب کا بھی حضرتؒ مولانا سے انتہائی گہرا تعلق تھا، حضرتؒ کی ہمارے جامعہ میں کئی مرتبہ آمد بھی ہوئی، حضرت کی روحانی مجالس اور علمی وفکری بیانات سے طلبہ جامعہ نے خوب خوب استفادہ کیا، آپؒ کے جامعہ میں کیے ہوئے چند بیانات آگے چل کر آپ کا سفرنامہ تحفہ گجرات کا حصہ بنے، اسی موقع سے آپؒ نے جامعہ کی ایک عمارت (معہد القرآن) کی سنگ بنیاد بھی اپنے دست مبارک سے رکھی اور الحمد للہ حضرتؒ کی دعا شامل حال رہی کہ حضرتؒ کی حیات ہی میں عمارت پائے تکمیل کو پہنچ گئی۔

بہر حال حضرتؒ کی زندگی کے مختلف شعبہ جات کا ان چند صفحات میں احاطہ کر لینا ممکن نہ ہوگا، لکھنے والے نے لکھا ہے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا انتقال بیک وقت علمی، ادبی، فکری اور روحانی قیادت کا خاتمہ ہے۔

آپ نے ۲۲؍رمضان المبارک بروز جمعرات دار العلوم ندوۃ العلماء میں مختصر علالت کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا، حضرت کے وصال کی خبر پورے ہندوستان بلکہ پورے عالم اسلام میں بجلی کی طرح پھیل گئی اور لوگوں کا جم غفیر ایک سیلاب کے مانند دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف بڑھنے لگا۔

آپ کی نماز جنازہ رات ۱۰؍بجے احاطہ دار العلوم ندوۃ العلماء میں حال مہتمم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سعید الرحمن اعظمی ندوی نے پڑھائی اور لاکھوں لوگوں نے آپؒ کی نماز جنازہ ادا کی، دوسری نماز جنازہ حال ناظم ندوۃ العلماء حضرت مولانا سید بلال عبد الحی حسنی ندوی نے تکیہ کلاں رائے بریلی میں پڑھائی اور یہاں بھی آپؒ کے جنازے میں ہزاروں کی تعداد میں لوگوں نے شرکت فرمائی اور خاندانی قبرستان میں آپؒ کی تدفین عمل میں آئی۔

حضرت تو اب ہمارے درمیان نہ رہے، البتہ حضرتؒ کی تحریریں رہتی دنیا تک باقی رہیں گی، لوگ آپؒ کی تحریروں سے استفادہ کرتے رہیں گے، حضرتؒ کی وفات سے اب ایسا خلا پیدا ہو چکا ہے جس کا پر کیا جانا بظاہر نہایت مشکل معلوم ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے حضرتؒ کی خدمات کو قبول فرما کر حضرتؒ کے لیے صدقہ جاریہ بنائے نیز آپؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین

تعلیم وتربیت کی جامعیت وقت کا تقاضا

''ہمارے مذہب میں تعلیم وتربیت دونوں ضروری ہے، تعلیم وتربیت سے مراد انسان کو اچھا بنانا' اس کو صالح بنانا' اس کو اللہ کا مطیع بنانا' آخرت کی فکر والا بنانا ہے، بعض اوقات اگر تربیت پر توجہ کم ہو جاتی ہے، تو اس کے نقصانات بھی ہوتے ہیں، ایسے لوگ آپ کو ملیں گے جو مدرسہ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایسے کام میں لگ گئے اور علم حاصل کرنے کا ایسا ذریعہ اختیار کر لیا، جہاں سارے برے کام کرنے ہوتے ہیں اور وہ کر رہے ہیں۔'' (تحفۂ گجرات: ۱۰۹-۱۱۰) مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

حیات مستعار کے چند گوشے

محمد حنظلہ کمال
(متعلم دارالعلوم ندوۃ العلماء-لکھنؤ)

ہمارے وطن عزیز کی تاریخ علمائے راسخین فی العلم، مخلص دعاۃ اور میراثِ نبوی کے محافظین ووارثین کے ذکر سے مزین ہے، یہ تمام حضرات علم وہدایت کی روشنی اور حلم وتقویٰ کا منبع ہیں، انہی اصحابِ کمال علماء میں سے حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک سنہری کڑی تھے۔

ولادت ونسب:

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی بن رشید احمد بن خلیل الدین حسنی تکیہ کلاں رائے بریلی کے ایک مشہور علمی، دینی اور دعوتی خانوادہ میں پیدا ہوئے اور آپ کا نسبی سلسلہ کئی واسطوں سے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے ملتا ہے۔

پرورش و تعلیم:

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی علم و اخلاص، صلاح وتقویٰ کے ماحول میں پروان چڑھے۔ حضرت مولانا کی والدہ محترمہ سیدہ امۃ العزیز حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی سگی بہن تھیں۔ حضرت مولانا کا بچپن اپنی والدہ اور دادی کی سرپرستی میں گزرا اور آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے خاندانی مکتب ہی سے حاصل کی، پھر آپ ابتدائی تعلیم کے بعد لکھنؤ تشریف لائے اور اپنے ماموں جی مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی اور بڑے ماموں ڈاکٹر عبدالعلی حسنی کی تربیت ونگرانی میں رہے اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے پاس رہ کر ان سے عربی زبان وادب اور شرعی علوم حاصل کیے، پھر آپ اعلیٰ تعلیم کے لیے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخل ہوئے اور آپ نے اپنے زمانہ کے بڑے اساتذہ سے استفادہ کیا اور بڑے مشائخ سے فائدہ اٹھایا، ان میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری اور حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اور آپ نے ۱۹۴۸ء میں ندوۃ العلماء سے سند فضیلت حاصل کی۔

تعلیم کے بعد عملی زندگی شروع کی اور حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی کے بیشتر اسفار میں ساتھ رہے اور حضرت مولانا نے ۱۹۵۰ء میں حجاز کا سفر کیا اور وہاں ۱۹۵۱ء کے اواخر تک دعوت وتبلیغ اور حصول علم میں وقت گزرا پھر وطن واپسی ہوئی۔

تدریسی زندگی:

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ ۱۹۵۲ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں بحیثیت استاد عربی ادب کے مقرر ہوئے، مولانا عبداللہ عباس ندوی کی حجاز منتقلی کے بعد صدر شعبہ عربی کے منصب پر فائز ہوئے اور ۱۹۹۳ء میں مولانا محمد محبّ اللہ لاری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد آپ کو ندوۃ العلماء کا اہتمامی عہدہ سونپا گیا، پھر حضرت مولانا معین اللہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ناسازی طبیعت کی وجہ سے ۱۹۹۸ء میں آپ کو نائب ناظم ندوۃ العلماء منتخب کیا گیا، دو سال کے بعد نظامت ندوۃ العلماء کی ذمہ داری سپرد کی گئی، مگر ان تمام ذمہ داریوں کے ساتھ وفات تک تدریس وتعلیم سے وابستہ رہے۔

عہدے اور ذمہ داریاں:

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بہت سی تنظیموں، تحریکوں اور اداروں کے صدر اور ممبر رہے۔ آپ جنوری ۲۰۰۰ء سے اپنی وفات تک ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ کے باوقار عہدہ

پر فائز رہے، ۲۰۰۳ء میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر بنائے گئے اور یہ سلسلہ وفات تک قائم رہا، آپ رابطہ ادب اسلامی شعبہ برصغیر و ممالک شرقیہ کے صدر الصدور کے منصب پر بھی فائز رہ کر ادب اسلامی کی آبیاری کرتے رہے اور رابطہ عالم اسلام مکہ مکرمہ، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور آکسفورڈ سینٹر فار اسلامک اسٹڈیز لندن کے رکن کی حیثیت سے بھی اپنی خدمات پیش کرتے رہے۔

علمی اور صحافتی سرگرمیاں:

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے دینی، علمی اور دعوتی اور صحافتی میدانوں میں اپنی اعلیٰ خدمات پیش کیں، آپ نے قرآنی علوم، فقہ، ادب، تعبیر، سیرت نبوی، جغرافیہ اور تاریخ و دیگر فنون سے متعلق کتابیں لکھیں اور کئی کتابوں کے ترجمے بھی کیے۔

مولانا سید محمد واضح رشید حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جو آپ کے سگے چھوٹے بھائی اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کے معتمد تعلیم تھے، لکھتے ہیں:

''مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے ۱۹۵۹ء میں الرائد کے نام سے ایک پندرہ روزہ عربی صحیفہ صادر فرمایا جو آج بھی ندوۃ العلماء سے شائع ہوتا ہے، حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی نے اپنے قیمتی و بیش بہا ادبی اور اصلاحی مضامین و مقالات سے اس رسالہ کو مالا مال فرمایا ہے۔''

جہاں تک حضرت مولانا کی تصانیف کا تعلق ہے، انہوں نے کئی کتابیں لکھیں اور بعض کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا، ان میں "بین التصوف والحیاۃ" اور "فضائل الدعوۃ إلی اللّٰہ" بہت مشہور ہیں۔ قرآنیات سے متعلق متعدد کتابیں لکھیں ہیں جن میں ''قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل'' اور ''اسلامی معاشرہ- سورۂ حجرات کی روشنی'' کے علاوہ ''ایمان و مادیت کی کشمکش سورہ کہف کی روشنی میں'' بھی شامل ہیں اور سیرت نبوی کے موضوع پر ''سراجاً منیراً'' کے نام سے ایک کتاب لکھی جس کے اب تک کئی ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ آپ کی مشہور کتابوں میں سے ''جزیرۃ العرب'' بھی ہے، جو جغرافیہ، ادب اور تاریخ کی ایک جامع اور منفرد کتاب ہے، مولانا ماہر القادری جیسے ماہر ادیب و نقاد نے بھی اس کتاب کی خوب تعریف و تحسین فرمائی ہے۔ تاریخ شعر و نثر اور نقد میں "الأدب العربي بين عرض و نقد" آپ کی ایک ایسی کتاب ہے جس میں ادب و تنقید کی تاریخ کے ساتھ منتخب ادبی نصوص کو بھی شامل کیا گیا ہے، یہ کتاب اور "منثورات من أدب العرب" نصاب میں داخل ہیں۔

یقیناً حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ ایک ایسے صاحب کمال اور مثالی عالم تھے جن کے علم و حکمت اور نایاب بصیرت کی دنیا آج بھی محتاج ہے۔

وفات:

حضرت مولانا کی ۱۳/ اپریل ۲۰۲۳ء مطابق ۲۱/ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ کو لکھنؤ میں وفات ہوئی اور اپنے آبائی وطن تکیہ کلاں رائے بریلی میں دفن ہوئے۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولانا کی خدمات کو قبول فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!

طلباء سے خطاب

''یاد رکھئے! صاحبِ صلاحیت کی دنیا قدر کرتی ہے، وہ شخص ضائع نہیں ہوتا جس میں صلاحیت پیدا ہو جائے، جس میں کمال پیدا ہو جائے، دنیا مجبور ہے اسے ماننے پر اور اس کی قدر کرنے پر، لیکن اگر آدمی اپنے اندر امتیاز پیدا نہ کرے اور صلاحیت پیدا نہ کرے، تو وہ ایک ایسا عام انسان ہوتا ہے کہ سڑک پر چلا جا رہا ہے مگر کوئی دیکھتا بھی نہیں اور کوئی پوچھتا بھی نہیں کہ کون جا رہا ہے۔'' (ملفوظات مرشد الامت: ۷۰)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

اچھے ابا- کچھ یادیں

امامہ حسنی بنت مولانا مسعود حسن حسنی ندوی
(دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں- رائے بریلی)

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ جنہیں ہم سب اچھے ابا کہتے تھے، وہ میری دادی کے حقیقی چچا تھے، ان کو بہت چاہتے تھے، وہ ہمارے خاندان کے سب سے بڑے بزرگ تھے اور سب لوگ ان کی بہت عزت اور احترام کرتے تھے۔ ان کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے خصوصی اخلاص وذہانت سے نوازا تھا، جب ان سے کوئی ملنے آتا تو وہ محبت اور خوشی سے ملتے، چاہے وہ بیمار ہوں یا ان کا دل نہ چاہ رہا ہو۔ وہ جب کبھی ہمارے گھر آتے تو جو لوگ ان کو سلام کرتے ان کے سلام کا جواب مسکراتے ہوئے دیتے تھے۔ وہ جب آتے تو بچوں کو ٹافیاں دیتے تھے، یا پیسے دیتے تھے، وہ جب ہمارے گھر آتے تو ہم لوگ ان کے سامنے ادب سے بیٹھتے تھے۔ میرے ابا وغیرہ جب ان کے سامنے بیٹھتے تو وہ ان کو نصیحت کرتے تھے، ہمارے خاندان کے بچوں کے نام اچھے ابا ہی رکھتے تھے، بسم اللہ بھی اچھے ابا ہی کراتے تھے، ختم قرآن بھی اچھے ابا ہی کراتے تھے اور پھر پیسے دیتے تھے۔ میر پھوپھی زاد بھائی ثانی کا ختم قرآن تھا، اچھے ابا ختم کرا رہے تھے، اس کے بعد میرے بھائی عبداللہ کی بسم اللہ ہونی تھی، ثانی کے ختم قرآن کے بعد جب عبداللہ کے بسم اللہ کی باری آئی تو وہ اچھے ابا کے پاس ہی سو چکا تھا، جب اس کو اٹھانے کا ارادہ کیا تو اچھے ابا نے منع کر دیا اور فرمایا: بعد میں بسم اللہ ہو جائے گی، ابھی اس کو سونے دو، یہ بچوں پر آپ کی شفقت تھی،، پھر دوبارہ اس کی بسم اللہ رائے بریلی میں ہوئی۔

اچھے ابا نے پوری زندگی ندوہ میں گزاری، اچھے ابا چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ دیتے تھے، بچوں کے بال اگر آنکھ پر آرہے ہوتے تھے تو کٹوانے کو کہتے تھے، بچوں کے لیے بھی صحیح لباس کی تاکید کرتے تھے، جو پورے جسم کو چھپائے، باہر کا دروازہ اگر کھلا رہ جاتا تو فوراً بند کرنے کی تاکید کرتے، بچوں کو بدتمیزی کرنے سے روکتے، ہم لوگوں کے گھر آتے تو وہیل چیئر گیٹ کے اسٹاپر پر مشکل سے چڑھتی تھی تو وہاں ڈھلان بنوانے کو کہتے تھے، تاکہ وہیل چیئر چلانے والے کو پریشانی نہ ہو۔ فرماتے تھے: یہاں ڈھلان بنوالو تاکہ تم لوگوں کو چڑھانے میں پریشانی نہ ہو، جب اچھے ابا کی نواسی جو میری چچی ہیں ان کے پیر دبانے کو کہتیں تو منع کر دیتے تھے کیوں کہ ان کو اچھا نہیں لگتا تھا۔

ہمارے چچا ابو (مولانا محمود حسنی) کو دیکھنے کے لیے آتے اور ان کے علاج کی فکر کرتے، کوئی بیمار ہوتا اس کے علاج کی فکر کرتے اور اپنی طرف سے پیسے بھی دیتے تھے، وہ ہر ایک کا اچھا چاہتے تھے، کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے

ہماری امی بتاتی ہیں کہ اچھے ابا جب ہمارے نانا کے زمانے میں دہلی آتے تھے، تو ہمارے نانا بہت خوش ہوتے تھے، جو مہمان اچھے ابا سے ملنے آتے سب کی خاطر تواضع کرتے تھے، اچھے ابا کو وضو کراتے اور ان کے آرام کی فکر کرتے تھے، ہماری پرنانی کے اچھے ابا ماموں زاد بھائی تھے، اس لیے نانی کا خیال کرتے تھے، اچھے ابا کی ایک بیٹی جن کو ہم اکا جان کہتے ہیں، وہ لکھنؤ میں خاتون منزل میں رہتی تھیں، وہی اچھے ابا کا کھانا ندوہ بھیجتی تھیں، ان سے ملنے اچھے ابا گھر آتے تھے، ان کا بہت خیال کرتے تھے، اچھے ابا رشتوں کا بہت خیال کرتے تھے۔

میرے اچھے ابا

سید عادل حسنی
(متعلم مدرسہ ضیاء العلوم-رائے بریلی)

یہ ہمارا پہلا مضمون ہے، خواہش ہوئی کہ ہم بھی اچھے ابا کے بارے میں لکھیں، جن چیزوں کو سنا ہے ان ہی کو لکھنے کی کوشش کی ہے۔ بڑے ہوتے تو اور بہت کچھ لکھتے۔

اچھے ابا ہمارے خاندان کے سب سے بڑے تھے، گھر میں جب بھی اچھے ابا کا ذکر ہوتا تو ان کی نرم دلی کا ذکر بھی ضرور ہوتا، اس طرح ہمارے کانوں میں اکثر یہ آوازیں پڑتی رہتیں اور ہمیں بھی سن کر اچھا محسوس ہوتا، پھر جب ملاقات ہوتی تو ان کو ویسا ہی پاتے جیسا ہماری اماں ذکر کرتی تھیں، وہ مسکراتا چہرہ اور وہی دھیمی آواز میں خیریت پوچھنا اور دعائیں دینا، ہم لوگ دعا کے لیے ضرور کہتے۔

ہم دہلی میں رہتے ہیں، اماں بتاتی ہیں جب اچھے ابا دہلی آتے تو ہمارے گھر قیام کرتے اور ہمارے نانا مرحوم بہت خوش ہوتے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے نانا مرحوم بھی بہت نیک تھے۔ اللہ ان کی بھی مغفرت فرمائے۔ آمین!

ایک دفعہ جب اچھے ابا دہلی آئے تو اماں ابا نے ہماری بسم اللہ ان ہی سے کرائی، اس وقت ہم بہت خوش ہوئے تھے، پھر ہمارا تکیہ آنا جانا رہتا اور ہم اچھے ابا سے کبھی مسجد اور کبھی گھر پر ملتے، اکثر اماں ہمیں بنگلہ پر ملاقات کے لیے بھی بھیجتیں۔

پھر دہلی میں ہمارا حفظ قرآن مکمل ہوا تو اچھے ابا نے آن لائن تکمیل قرآن اور دعا کرائی۔ ہمارے حفظ ہونے پر پورا خاندان جمع ہوا، سب بہت خوش تھے۔ اچھے ابا کا ہمارے بابا جان یعنی دادا سے بہت گہرا تعلق تھا، دادا کی بیماری میں اکثر اچھے ابا ملنے آتے یا جب خود بیمار ہوتے تو کسی اور کو ہسپتال دیکھنے بھیجتے۔

آخری بار جب ہم ان سے ملنے گئے تو وہ لکھنؤ جا رہے تھے، کافی طبیعت خراب تھی، ہم سب دعائیں کر رہے تھے، مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

اللہ تعالیٰ اچھے ابا کو جنت الفردوس عطا فرمائے اور ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور جو لوگ اللہ کے پاس چلے گئے ہیں ان سب کی مغفرت فرمائے۔ آمین ثم آمین!

نرم لہجہ دھیمی سی مسکراہٹ نگاہوں سے جاتی نہیں
ایسی نیک شخصیت روز روز دنیا میں آتی نہیں

بچوں کا ادب

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

''بچوں کا ادب نوخیز نسل کی تربیت اور ذہن سازی کا ایک بڑا ذریعہ ثابت ہوگا اور خاص طور پر آج سے پچاس سال قبل کا زمانہ سامنے رکھا جائے جب کہ ذرائع ابلاغ کے نئے وسائل عام نہیں ہوئے تھے، تو بچوں کا ادب بچوں کو معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ان کی ذہن سازی بھی کرتا تھا اور کرسکتا تھا، بچوں کا یہ ادب تحریر و گفتگو دونوں ذریعہ سے وجود میں آتا اور کام کرتا رہا ہے، گفتگو والا حصہ عموماً محفوظ نہیں کیا جاسکا، لیکن تحریری ادب مختلف نمونوں کی صورت میں خاصہ محفوظ ہے۔'' (دین وادب: ۱۸۴)

جتنا بھی فخر تم کو محسوس ہو وہ کم ہے

حضرت مولانا سید محمد ثانی حسنی رحمۃ اللہ علیہ

''اپنے برادر عزیز حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے نام حضرت مولانا محمد ثانی حسنیؒ کے قلم سے لکھی گئی ایک یادگار نظم!
یہ اشعار تحریری شکل میں مکہ مکرمہ اس وقت ارسال کیے گئے جب حضرت مولاناؒ سنہ ۱۹۶۳ء میں سفرِ حج پر تھے۔''

میرے عزیز بھائی تم کو سلام پہنچے
بعد از سلام میرا تم کو پیام پہنچے
تم کو مبارک کعبہ کی ہو زیارت
قابل ہے رشک کے جو تم کو ملی سعادت
جتنا بھی فخر تم کو محسوس ہو وہ کم ہے
بس میں نہیں کسی کے، اللہ کا کرم ہے
اس وقت تم جہاں ہو وہ ہے مقام رحمت
مینہ کی طرح برستی ہے صبح وشام رحمت
ہے ایک کام تم سے میرا اگر کرو تم
بھولوں نہ عمر بھر میں احساں گر کرو تم
مجھ کو بھی یاد رکھنا شام وسحر دعا میں
کعبہ کے پاس در پر عرفات میں منی میں
کوہِ صفا پہ چڑھ کر کعبہ ہو جب کہ رخ پر
مروَہ کی سیڑھیوں پر مسعیٰ میں رہ گزر پر
منبر کے سایہ میں بھی اندر حطیم کے بھی
رکن یمانی چھو کر در پر کریم کے بھی
دیوار سے لگا کر سینہ کو ملتزم پر
چل کر مطاف میں پھر رک کر ہر اک قدم پر
پردہ سے لپٹ کر آنسو بہا کے کہنا
کعبہ کے پاک در پر سر کو جھکا کے کہنا
بیت عتیق کے رب اپنے کرم کا صدقہ
اور رحمت ومحبت بے کیف وکم کا صدقہ
تو نے مجھے بلایا تیرا بہت کرم ہے
ایک اور مضطرب ہے جو مبتلائے غم ہے
بے تاب ہو رہا ہے اس کو بھی تو بلا لے
دنیا سے دل ہٹا کر اپنا ہی تو بنا لے
دن رات جا کے زمزم تم بار بار پینا
میری طرف سے بھی تم دو چار بار پینا
للہ میری جانب سے بھی طواف کرنا
آنسو جو چند نکلیں نذر غلاف کرنا
ہوگا نویں کو عرفہ رحمت کا روز ہوگا
قلب وزباں میں پیدا جب درد وسوز ہوگا
تم بے قرار ہوکر سجدہ میں جب پڑے ہو
پہلو بدل رہے ہو مبہوت سے کھڑے ہو
اشکوں سے بھیگ جائیں جب حاجیوں کے دامن
ایسی جھڑی لگی ہو بھادوں ہو یا کہ ساوَن
چیخوں سے اپنی حاجی تھرا دیں جب فضا کو
جب رحم آئے سب پر بے ساختہ خدا کو
ہوگا وہ ایسا عالم ہر سمت نور ہوگا
قلب ونظر پہ طاری کیف وسرور ہوگا
ایسے ہی پیارے عالم میں مجھ کو بھی یاد رکھنا
ذکر ودعا سے للہ مجھ کو بھی شاد رکھنا
اللہ تم کو ہر دَم اپنی اماں میں رکھے
اپنا بنا کے تم کو دونوں جہاں میں رکھے
حج کا سفر تمہارا صد بار ہو مبارک
جانا بھی ہو مبارک آنا بھی ہو مبارک

ہیں شریعت اور طریقت کے چمکتے ماہتاب

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی شان میں
انہی کی حیات میں کہے گئے چند اشعار نذر قارئین ہیں

آپ کے اخلاق وسیرت آپ کا علم وعمل
دست بستہ ہیں گواہی میں کھڑے دشت وجبل

اے ہمارے پیر ومرشد حضرت رابع میاں
دیجیے ایسی دعا یہ بندہ اب جائے سنبھل

بو الحسن ندوی کے سچے جانشیں رابع میاں
ہم سبھی کے معتمد ہیں بالیقیں رابع میاں

ہیں شریعت اور طریقت کے چمکتے ماہتاب
اللہ اللہ سر اٹھائے ہے زمیں رابع میاں

نتیجہ فکر: -الحاج انیس احمد انیس پرخاصویؒ

عظمت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ

''حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت اور آپ کا کرم اتنا بڑھا ہوا تھا کہ اگر کوئی آپ کی توہین کردے تو آپ اس کا بدلہ نہیں لیتے تھے، کوئی سختی سے پیش آتا تھا آپ کچھ نہ کہتے تھے، حتی کہ اگر کبھی آپ نے لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا تو لوگ پہلے سے آکے بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے، جس سے آپ کو اور آپ کے گھر والوں کو دشواری ہوتی، اس پر بھی آپ کچھ نہیں فرماتے بلکہ آپ برداشت کرتے، اسی لیے اللہ نے اپنے نبی کے احترام کی جگہ جگہ تاکید فرمائی ہے، کیونکہ نبی عام انسان نہیں ہے، اللہ نے ان کو اپنے لیے مخصوص کرلیا ہے، ان کو اللہ کی طرف سے ایک حصار حاصل ہوگیا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندے ہوگئے ہیں، اب اگر ان کے ساتھ کوئی ناروا معاملہ کرے گا تو اللہ تعالیٰ کو برا لگے گا۔'' (اسلامی معاشرہ: ۳۳-۳۴)

بشارت گوش کن رابع کہ تو محبوبِ آقائی

جناب فیض الرحمٰن صاحب
(سابق ڈائریکٹر محکمہ اقلیتی فلاح و بہبود- اتر پردیش)

الٰہ العالمین خواہم کہ آرم تابِ گویائی
ولے ممکن کجا، تا تو نہ بخشی اَش پذیرائی

خداوندا! بفضل خود عطا کن جنت ماویٰ
محمد رابع حسنی شریف النفس وشیدائی

بہ گردوں تیرہ یک نور ہدایت، برشد از ندوہ
منور کرد، دلہا را، بہ ایمان وشناسائی

درود تارِ نفس لرزاں، جگر در عشق تو بریاں
نگہ دل دوز، رخ تاباں، سبق آموز گویائی

محبت از رسولؐ وعشق کل، حب خداوندی
درون قلب پیوستے، زِحسن خلق ودانائی

الٰہی کس نہ یابد خلد بے فضل خداوندی
عطا کن شیخ را خلد بریں از فضل دارائی

خوشا! ہاتف چوں گفتہ باشد اے نفس طمانینہ
بشارت گوش کن رابع، کہ تو محبوبِ آقائی

خدا راضی ومرضی ہست، تو مرضی وراضی اِی
خدا گفتے: بیا نزدم، کہ ایں جا محفل آرائی

خدا خود میزباں، در جنتش تو میہماں باشی
بیا رابع! بہ خلد من کہ مثل محرماں آئی

بصد جذبہ، روانہ شد، سوئے منزل بہ جان ودل
بگفتا حاضرم لبیک یا معبود، مولائی

پس آں سید محمد رابع حسنی، دوید آں دم
کشیدہ خود بہ رفتے، نہ دانم ایں چہ یارائی

بسے گریہ کند الحاح وزاری پیش تو مولا
گنہگارے کہ نامش فیض خواہد عفو مولائی

قطعہ تاریخ ارتحال مولانا محمد رابع حسنی ندویؒ

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی
(گوشہ مطالعات نعت-علی گڑھ)

رابع حسنی کہ بود استاد ما
رفت ازین دنیای پُر رنج وعنا

جانب خلد بریں کرد او سفر
کہ از آنجا نیست بہتر ہیچ جا

حوریانِ خواندند نغماتِ طرب
گفت رضوان مرحبا صد مرحبا

ای امامِ اہلِ ایمان وعمل
ای نگہدارِ نوامیس ہدیٰ

اوستادِ اہلِ ہند وہم عرب
جادہ دین وادب را پیشوا

ای امیر اہل گفتار وقلم
ای جہانِ فکر وفن را رہ نما

پاک باطن، مالک خلق حسن
تیز رو اندر طریق مصطفیٰ

ای و جودتِ شمع ایمان ویقین
ای و جودتِ بزم ہستی راضیا

بودی اندر ھند از اَعلام دہر
جانشین بوالحسن مردِ خدا

بر وفاتت غم زدہ اہل زمین
لیک شادان آمدی در خلد ما

این ہمہ رضوان بگفت وباز گفت
ای رئیس ای واعی حرف و نوا

سال فوتش زود تر آری بہ نظم
تا بدارند یاد مردم عصر ھا

سی ویک افزودہ آمد بر لبم
۳۱

"رفت رابع ہم سویٰ دار البقا"

۱۴۱۳

۱۴۱۳
۳۱
۱۴۴۴ھ
(۲۰۲۳ء)

آہ حضرت مولانا رابع حسنی ندویؒ

ڈاکٹر ماجدؔ دیوبندی
(سکریٹری جنرل، انٹرنیشنل صوفی مشن، نئی دہلی)

وہ جو بزمِ ناز کا فخر تھا جو تھا نیک نام چلا گیا
میں بھلاؤں کیسے اُسے بھلا جو ذی احترام چلا گیا

وہ تھا وقت اکیسویں روزے کا کہ خدا نے اُس کو بلا لیا
وہ تھا جمعرات کا روز جب وہ بوقتِ شام چلا گیا

کسے اب میں نعتیں سناؤں گا وہ دعائیں کیسے میں پاؤں گا
مرے سر پہ رکھتا تھا ہاتھ جو وہی ذی مقام چلا گیا

جو علی میاںؒ کا تھا جانشیں جسے لوگ کہتے تھے رشکِ دیں
وہ طہارتوں کی شراب کا ہمیں دے کے جام چلا گیا

جو گناہگار رہیں گے دس وہ بنائے گا اُنہیں جنتی
کہ تھا حفظ جس کو کلامِ حق وہ مرا امام چلا گیا

کہ جو ندوۃ العلماء کا ایک ذہین ناظمِ اعلیٰ تھا
جو سنبھالتا تھا خلوص سے اسی کا نظام چلا گیا

جو مفکرِ رہِ راست تھا جو محدّثوں میں بھی خاص تھا
وہ رسولِ پاکؐ کا نامور حسنی غلام چلا گیا

وہی صبح و شام کی رونقیں ہیں حکایتیں بھی وہی مگر
تھا ہمیشہ ماجدؔ خستہ جاں پہ جو لطفِ عام چلا گیا

اک پاسبانِ ملتِ بیضا چلا گیا

مولانا محمد مرتضیٰ سلفی راغب
(استاد معہد دار العلوم ندوۃ العلماء۔لکھنؤ)

علم وادب ہنر کا ستارہ چلا گیا
ملت کا غمگسار، سہارا چلا گیا

صحن چمن اداس ہے تاریک ہے فضا
رہبر وہ جس پہ ناز تھا تارا چلا گیا

رابع کی یاد یار ستائے نہ کیوں ہمیں
اک پاسبان ملت بیضا چلا گیا

عفو کرم کا بحر نا پیدا کنار تھا
واحسرتا وہ محسن اعلیٰ چلا گیا

حسنی تبار رنج والم میں ہے اس گھڑی
ہر دل عزیز تھا جو وہ پیارا چلا گیا

گل پھول مضمحل ہوئے جاتے ہیں دیکھئے
گل چین وباغبان ومہ پارہ چلا گیا

بحر غمِ فراق میں ڈوبی ہے کائنات
دردِ جگر کا جو تھا مداوا چلا گیا

عالم کی موت بالیقیں عالم کی موت ہے
منظر جو خوشنما تھا نظارہ چلا گیا

شمع بغیر یہ دلِ پروانہ جل گیا
راغبؔ جو اک حسین مسیحا چلا گیا

فلاح ونجات کا راستہ

”کسی فرد مسلم کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے استثناء نہیں، بلکہ اسی میں اس کی فلاح اور نجات ہے، لیکن اگر وہ یورپ کی تقلید کو اختیار کرتا ہے، تو اسے راستہ میں ایسی گھاٹیاں اور سراب پیش آئیں گے جو آسمانی نظام زندگی کی اتباع سے روک دیں گے۔“ (امت مسلمہ۔رہبر اور مثالی امت: ۱۲۰)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمہ اللہ

رحلت حضرتِ رابع کا ہے ہر دل کو ملال

مولانا محمد نعمان اکرمی ندوی
(امام وخطیب مسجد اوقاف - دبئ)

رحلت حضرتِ رابع کا ہے ہر دل کو ملال
دورِ الحاد میں کی جرأت حق جس نے بحال
تھا جو اس دور میں اسلاف کی تابندہ مثال
آشکارا تھا خد و خال سے شاہوں کا جلال

چہرے بشرے سے عیاں حسن عمل کا تھا جمال
ہے زیاں امت اسلام کا حضرت کا وصال

نازشِ عالم اسلام، نشانِ عظمت
نازِ ہندوستاں اور باعث فخر امت
مصلح قوم و وطن، مرشد ملک وملت
صاحب فہم وذکا، صاحب علم وحکمت

قوتِ حسن تخیل سے تھا مبہوتِ خیال
ہے زیاں امت اسلام کا حضرت کا وصال

جنبش لب سے تھا الفاظ و معانی میں اثر
دل نشیں لہجہ تھا، اندازِ تخاطب تھا دگر
تھا حکیمانہ سخن اور تھی مومن کی نظر
فکر وفن کے لیے تھا وقف ہر اک حرفِ ہنر

نطق کے سحر سے ہو جاتا مخالف بھی نڈھال
ہے زیاں امت اسلام کا حضرت کا وصال

ذہن میں نقش ہیں ندوے کی نظامت کے نقوش
پرسنل لا کی صدارت کے قیادت کے نقوش
وعظ و ارشاد میں وہ شانِ خطابت کے نقوش
فکر امت میں دعاؤں کے محبت کے نقوش

آپ کے کارِ نمایاں پہ نہ آئے گا زوال
ہے زیاں امت اسلام کا حضرت کا وصال

اے خدا اجر دے، ہر حسن عمل کا ان کو
ہر خطا بخش دے اور اچھا صلہ دے ان کو
اور فردوس بریں میں بھی جگہ دے ان کو
تیری رحمت کے ہو شایاں وہ جزا دے ان کو

لطف واحساں سے تیرے ان کو نہ ہو کوئی سوال
ہے زیاں امت اسلام کا حضرت کا وصال

منبع صدق وصفا حضرتِ رابع ندوی

مولانا سید ہاشم نظام ندوی
(چیف ایڈیٹر ''فکر وخبر'' بھٹکل)

منبع صدق و صفا حضرتِ رابع ندوی
مظہر فیض و عطا حضرتِ رابع ندوی
صاحب فہم رسا، حضرتِ رابع ندوی
مجمع خلق و وفا، حضرتِ رابع ندوی

اہل دل اہل نظر، اہل صفا اور نسبت
اہل فن اہل ہنر اہل زباں تھے حضرت
فخر ہند فخر وطن اور تھے فخر ملت
صاحب فضل تھے اور صاحب خیر و برکت

اپنی ہی ذات میں خود ایک ادارہ تھے جو
شب دیجور میں ضو بار ستارہ تھے جو
پرسنل لا کے تھے صدر، ناظم ندوہ تھے جو
علم کے نور کا گو ایک منارہ تھے جو

وہ مدرس تھے مربی تھے وہ داعی بھی تھے
گلشن علم کے گل چیں تھے وہ مالی بھی تھے
وہ ہر اک خیر میں سبّاق تھے حامی بھی تھے
اور وہ وقت کے رومی بھی غزالی بھی تھے

زندگی وقف تھی ساری ہی عبادت کے لیے
دین اسلام ہی کی نشر واشاعت کے لیے
ہمہ تن وقف تھے وہ رب کی اطاعت کے لیے
پوری ملت کی صحیح سمت قیادت کے لیے

جس کو دیکھو تھا وہ رنجیدہ خبر یہ سن کر
ہو گیا حضرتِ رابع کا ہے دنیا سے گزر
اور جاری یہ دعا بھی ہے لبوں پر ہاشم
ملے امت کو بدل آپ ہی جیسا بہتر

حضرت رابع تھے جو ملت کے نگہبان

مولانا محمد عمران فراہی ندوی ازہری
(ابوہامور-قطر)

یہ تیر خبر میرے جگر جائے رہا ہے
حضرت کی ملاقات کا در جائے رہا ہے
حضرت رابع تھے جو ملت کے نگہبان
حکمت وتدبر کا جہاں جائے رہا ہے
اب کس سے دعاؤں کا طلب گار رہوں گا
خوابوں کا شہر، میر سفر جائے رہا ہے
نایاب تھے، کمیاب تھے وہ حضرت رابع
بھارت کا امیر العلماء جائے رہا ہے
ندوے میں طوافوں کا تسلسل ہی تمہی تھے
کعبہ میرے ندوے کا تو اب جائے رہا ہے
ہر پل کی ملاقات کا نقشہ میرے دل میں
تصویر میرے خوابوں کی اب جائے رہا ہے
اہرام تھا ندوہ کا جگر چور ہوا ہے
ندوے کا میرے تاج محل جائے رہا ہے
اترا نہ ملک روح کو لے جاتے ہوئے تم
اپنا تو جگر سینے سے اب جائے رہا ہے
اٹھا نہ تو رندانہ ندوہ کا ترانہ
ندوہ کا ترانہ تو میرا جائے رہا ہے
شبلی و علی حیی کے خوابوں کا ترانہ
وہ بزم سلیماں کا نشاں جائے رہاہے
او مسند صفہ کی جگہ ڈھونڈنے والو!
خوبی صحابہ کا ہنر جائے رہا ہے

مؤرخ ومفسر ومفکر تھا صدی کا
عمید عربی پیر جہاں جائے رہا ہے
سادہ سا وہ توفیق شدہ شیخ تھا اپنا
عہد عتیق، سرنہاں جائے رہا ہے
تھا مرد خلیق اس میں محمد کا طریقہ
کیا پیکر عظمت کا نشاں جائے رہا ہے
اقبال کا شاہین، تحمل کا سفینہ
وہ خضر عجم، راہ نما جائے رہا ہے
قلندر تھا نواسائے حسن ابن علی کا
صابر و نجابت کا جبل جائے رہا ہے
ندوہ تیرے بن اب مجھے ویراں سا لگے گا
نشتر سا میرے دل کو یہ غم کھائے رہا ہے
ملنے کا مزا جذب دروں، کھولتا جائے
تبسم میرے حضرت کا ستم ڈھائے رہا ہے
وہ چشمہ صافی تھا میرے میر عرب کا
وہ مرجع خلائق کا شجر جائے رہا ہے
جہاں دیدہ، پسندیدہ دل لائیں گے کہاں سے
وہ خلق حسن، رند ظفر جائے رہا ہے
وہ جس سے ملاقات کو دل کہتا تھا ساقی
ساقی میرے میخانے کا در جائے رہا ہے
بعد از علی تو، تو ہی مداوائے حرم تھا
عمرآں ہی نہیں سب کا کنول جائے رہا ہے

تھے نازشِ قرطاس وقلم حضرتِ رابع

مولانا سمعان خلیفہ ندوی بھٹکلی
(استاد جامعہ اسلامیہ-بھٹکل)

وہ علم کا مینار وہ اخلاق کی تنویر
وہ ضربتِ شمشیر وہ اک نعرہ تکبیر
وہ زہد کی تصویر وہ ایمان کی تفسیر
کردار کے ماتھے پہ لکھی حسن کی تحریر

تھے نازشِ قرطاس وقلم حضرتِ رابع

وہ نورِ شبستانِ علی منبعِ احساں
وہ آبروئے ندوہ شبلی وسلیماں
وہ گلشنِ اسلام کی خوشبوئے پریشاں
''وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہباں''

وہ رشکِ عرب فخرِ عجم حضرتِ رابع

وہ پاک نظر پاک ادا پاک طبیعت
وہ پیکرِ شفقت وہ سراپائے مروت
گویا کہ برستا ہوا بارانِ محبت
اک ابرِ گہر بار تھا سرگرمِ عنایت

تھے دستِ سخا بحرِ کرم حضرتِ رابع

وہ ہاتھ میں جن کے رہا ملت کا پھریرا
وہ جن سے سروں پر رہا سایہ سا گھنیرا
وہ جن کے عزائم سے گریزاں تھا اندھیرا
وہ جن کی نظر میں رہا ہر شب کا سویرا

تھے وحدتِ امت کا عَلَم حضرتِ رابع

دانش کدہ علم کی وہ شمعِ فروزاں
بے چین نگاہوں کی وہ تسکین کا ساماں
ندوے میں رہے صورتِ خورشیدِ درخشاں
اور محفلِ ایمان وعزیمت کی رہے جاں

لو آج چلے سوئے عدم حضرتِ رابع

مانندِ سحر جن کی تھی بے داغ جوانی
وہ عظمتِ اسلاف کی رخشندہ نشانی
گفتار میں جاری رہی دریا کی روانی
اخلاص ووفا، حسنِ عمل، دردِ نہانی

ہیں راہیِ گلزارِ ارم حضرتِ رابع

افسردہ در وبام ہیں، بے رنگ ہے محفل
دل فرقتِ رابع پہ ہوا صورتِ بسمل
کھوئی گئی جذبات میں الفاظ کی منزل
سمعانؔ کے آنسو ہیں اسی درد کا حاصل

کیسے ہو بیاں دل کا یہ غم، حضرتِ رابع

علم وعمل کی شمع، ہدایت کا اک چراغ

مولانا محمد زاہد حسین ندوی جمشید پوری

تیرے بغیر قلب تو ویراں مکاں ہے آج
اے میرے شیخ رابعؒ بتا تو کہاں ہے آج

تیری تو ذات ایک امام زماں کی تھی
لیکن ہماری آنکھوں سے تو بھی نہاں ہے آج

تھا کس قدر قریب تو پروردگار سے
تیری حیات وموت سے اب وہ عیاں ہے آج

علم وعمل کی شمع، ہدایت کا اک چراغ
اسرار زندگی تو بڑی ضوفشاں ہے آج

مانا کہ اب ملیں گی نہ تری شفقتیں ہمیں
تیرا مگر مقام خلد تو باغ جناں ہے آج

نقش قدم پہ شیخ کے تو زیست بھر رہا
اب موت میں بھی شیخ کے تو ہم عناں ہے آج

زاہدؔ کو بھی نیاز تھا کچھ تیری ذات سے
وہ بھی تری صفات میں رطب اللساں ہے آج

امت کے پاس بان دلارے چلے گئے

مولانا پرویز ندوی (بہرائچ)

علم وہنر کے چاند ستارے چلے گئے
سچے جو راہبر تھے ہمارے چلے گئے

رخصت جو ہم سے ہوگئے استاذ محترم
لگتا ہے جیسے سہارے چلے گئے

کشتی ہماری پھر سے تلاطم میں آگئی
آنکھوں سے اپنی دور کنارے چلے گئے

مالک سے اپنے مل گئے ہم سب کو چھوڑ کر
امت کے پاس بان دلارے چلے گئے

روتا بلکتا دیکھئے پرویزؔ رہ گیا
استاد درمیاں سے ہمارے چلے گئے

رابع الحسنی کے جیسا کوئی دوجا اب کہاں

مولانا محمد تسنیم عابد ندوی
(ریسرچ اسکالر شعبہ اردو- دہلی یونیورسٹی)

نرم خو پاکیزہ سیرت نیک دل روشن خیال
مخلص و محسن مربی واعظ شیریں مقال

راست گوئی پاک بازی اور متانت کی مثال
سرپرست قوم وملت ذی وقار وباکمال

جامع الاوصاف ایسی شخصیت کا کیا بیاں
رابع الحسنی کے جیسا کوئی دوجا اب کہاں

چہرۂ انور پر ایماں کی حرارت کا ظہور
یاد ہر دم ان کو رہتے تھے شریعت کے امور

صاف آتا تھا نظر حضرت کی پیشانی پہ نور
جوہر علم وادب پر ان کو حاصل تھا عبور

سربراہِ اہل دل ندوہ کے میر کارواں
ہند میں مسلم پرسنل لا کے تھے روح رواں

ان کی مجلس میں قرینہ تھا شہ کونین کا
ان کی محفل میں تھا اک عالم سکون وچین کا

ان کی صحبت میں مزا تھا صحبت حسنین کا
انجمن ان کی نشان راہ تھی دارین کا

دین و حکمت کے مبلغ اہل ایماں کے رفیق
ان کے جیسا اب کہاں پائیں گے ہم مرد خلیق

خاکساری ان کا شیوہ سادگی ان کی ادا
سربراہی میں تھی ان کی قوم مسلم ایک جا

اپنی ہستی دین کی ترویج میں کردی فنا
تفرقوں کو ختم کرنا ان کا نصب العین تھا

دردمندانہ طبیعت اور فقیرانہ مزاج
یاد ان کی کروٹیں لیتی ہے ہر سینے میں آج

یوں تو دنیا کی نہیں ہستی کا کچھ بھی اعتبار
زندگی ان کی تھی لیکن لائق صد افتخار

یعنی پابند اجل ہے یہ حیاتِ مستعار
عرش پر آمد کا ان کی ہو رہا تھا انتظار

روح کی پاکیزگی کا تھا یہ میّت پر اثر
رخ پہ آتا تھا سراپا نورِ ایمانی نظر

حق تعالیٰ نے عطا کی ہے انہیں عمر دوام
ان پہ یا رب کیجیے گا نعمتیں اپنی تمام

تا ابد زندہ رہے گا دہر میں ان کا پیام
جنت الفردوس میں ان کو ملے اعلیٰ مقام

تا بہ محشر باغ جنت کا کھلا روزن رہے
قبر میں نور الٰہی کی شمع روشن رہے

بوالحسن کے خانوادے کی شمع اک بجھ گئی

پرویز حاصل ندوی
(ارریہ- بہار)

کھودیا ہے آج ہم نے اک مشیر و راہ بر
موت کے آگے نہیں ہے کوئی حیلہ کارگر

آپ تھے مسلم پرسنل لا کے صدرِ ذی وقار
تھی نظامت سے سدا ندوے کا موسم پر بہار

بردبار و منکسر اور نیک سیرت مہہ جبیں
لے کے شمع ڈھونڈنے سے نہ ملے گا پھر کہیں

علم و حکمت دوربینی زیرکی دانشوروی
آپ کے آگے تھی بیشک ہیچ شانِ کشوری

ہے ہر اک رنجور سن کر آپ کی نعیِ وفات
کھوگئی ہے ہم سے اک ذات کمالات وصفات

آپ کی رحلت سے ہرسو چھائی ہے غم کی گھٹا
ہرطرف انا الیہ راجعوں کی ہے صدا

بوالحسن کے خانوادے کی شمع اک بجھ گئی
کون ہے جو اب سنبھالے گا قیادت کی کڑی

بعد رحلت ہوگئی فصل بہاراں اب خزاں
آج ندوے کا بہت غمگین ہے بیشک سماں

ہے پرسنل لا کے سارے ممبراں میں خامشی
اور ندوے کے سبھی ارکاں پہ ہے طاری غشی

ہوگئی ویراں عشاء کے بعد کی وہ مجلسیں
اور سنساں ہوگئی ہیں دن کی ساری محفلیں

ہم نہ پائیں گے کبھی بھی آپ سا محسن امام
کون ہے جو اب سنبھالے گا نظامت کی زمام

عالم اسلام پر تھی آپ کی گہری نظر
شخصیت تھی آپ کی دنیامیں بیشک پر اثر

کر دیا ہے دفن ہم نے آہ کیوں زیر زمیں
قیمتی ہیرہ تھے وہ اور قیمتی تھے وہ نگیں

صبر دے سارے بہی خواہان کو تو اے خدا
ہے خدا سے بس یہی ہر شخص کے دل کی دعا

یا خدا! فردوس میں اعلیٰ جگہ دینا انہیں
بعد رحلت بھی نہ بھولے گا کوئی ہرگز جنہیں

مغفرت کے واسطے ہے تیری رحمت منتظر
بشری لغزش معاف کرنا تو ہے غفار و قدیر

آپ کے جانے سے خالی ہوگیا میدان علم
یا الٰہی! بھیج دے پھر حامل افکار و حلم

بھول پائے گا نہیں حاصلؔ سراپا آپ کا
گفتگو تھی نرم، لہجہ تھا شفیقانہ سدا

اللہ کے خاص بندے

”نیکی کا حکم دینے والوں اور برائی سے روکنے والوں کی تعداد جب دنیا میں بڑھ جاتی ہے تو ان کی وجہ سے عذاب رک جاتا ہے، جس طرح سیلاب سے بچاؤ کے لیے پشتہ اور بند بنایا جاتا ہے، اسی طرح ایسے نیک لوگ پشتہ اور آڑ بن جاتے ہیں۔“ (افضل انسان:۸)

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

شان ندوہ جان ندوہ جانشین بوالحسن

سید ابوالحسن علی حسنی
(دائرہ شاہ علم اللہ تکیہ کلاں - رائے بریلی)

وہ گل گلزار علم وفضل وہ درِّ عدن
وہ جو رخصت ہوگئے ویران ہے اب یہ چمن

حب محبوب خدا سے قلب روشن آپ کا
تھے سراپا اتباع سنت شاہِ زمن

آپ کے اخلاق اعلیٰ ہر کس وناکس کے ساتھ
واسطے ہر ایک کے خندہ جبیں شیریں سخن

حسن بھی بخشا خدا نے غیر معمولی انہیں
گر لبوں پر ہو تبسم ہو وہ مثل نسترن

آپ کے دل میں غم امت کا اک سیلاب تھا
اور ملت کے دلوں میں عشق ان کا موجزن

تھا ملا ذوق زبان ہادی عالم انہیں
صاحب قلم وزباں تھے صاحب فکر اور فن

فخر اہل علم وعرفاں مرشد امت بھی تھے
شان ندوہ جان ندوہ جانشین بو الحسن

ہے دعا ہر ایک کی اس رب اکبر سے یہی
ہو عطا نعم البدل کہ دور ہے یہ پرفتن

عرش والا عرش کے سایہ تلے رکھے انہیں
باغ جنت ہو سجا اور آپ ہوں جلوہ فگن

کتنی ہی نسلوں کے معمار تھے رابع حسنی

شفقت علی کاوش شوکتی (لکھنؤ)

چشم بینا دل بیدار تھے رابع حسنی
پیکر شفقت وایثار تھے رابع حسنی

جس کی نکہت سے معطر ہے فضائے عالم
وہ مہکتا گل وگلزار تھے رابع حسنی

غم کسی کا ہو، سمجھتے تھے اُسے غم اپنا
ہر پریشان کے غم خوار تھے رابع حسنی

گفتگو نرم، دل گرم، یقیں مستحکم
صاحب شوخی کردار تھے رابع حسنی

فکر ملت میں گذرتے تھے شب وروز اس کے
قوم کے قافلہ سالار تھے رابع حسنی

فیض سے ان کے ہوا ایک زمانہ سیراب
کتنی ہی نسلوں کے معمار تھے رابع حسنی

دامن فیض سے کاوشؔ نے بھی پایا ہے فیض
سب پہ ہی ابر گہر بار تھے رابع حسنی

دین اسلام کے بقا کا غیبی نظام

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

’’اس دین کے بقا کا نظام انسانوں ہی کی کوشش کے ذریعہ رکھا گیا، جس کے لیے آخری نبی محمد ﷺ نے اپنی زندگی میں اور پھر آپ کی تربیت یافتہ جماعت صحابہؓ نے کارنامہ انجام دیا کہ صرف نصف صدی میں اس زمین کے بڑے اور اہم علاقہ میں اسلام کا نمونہ کا نظام قائم ہوگیا اور امت اسلامیہ کو غیر معمولی طاقت اور اخلاص عمل کے ساتھ دین کی حفاظت کی خدمت انجام دینے کا کامیاب موقع ملا اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دین کے بقا کا فیصلہ ہے، اس لیے اس کے بقا کے لیے نسلاً بعد نسل لوگوں کو توفیق ملتی رہی۔ اس دین کے بقا کی عظیم خدمت انجام دینے والے لوگ اس دین پر پورے اخلاص سے یقین رکھنے والے اور اس کی خاطر اپنے پورے تن من دھن کی قربانی دینے والے لوگ رہے اور اس کے بغیر دین اپنی اصلی حالت پر باقی بھی نہیں رہ سکتا۔‘‘ (اصحاب رسول اللہ ﷺ: ۱۳)

تعزیت نامے

’’مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے سانحہ ارتحال پر ہندو بیرون ہند کی مؤقر علمی، دینی، اصلاحی سماجی وسیاسی شخصیات نے برقی وورقی ذرائع سے اظہار تعزیت کیا، ذیل میں چند تعزیتی پیغامات نذر قارئین ہیں۔‘‘

علماء ودانشوران بیرون ھند:

’’علامہ محمد رابع حسنی ندویؒ ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ تھے اور امت کی نابغہ روزگار شخصیات میں سرفہرست تھے، وہ علم ودعوت اور فکر اسلامی کے بہترین شہ سوار تھے اور ان کی تربیت اپنے ماموں مفکر اسلام علامہ سید ابوالحسن علی ندویؒ کی زیر نگرانی ہوئی تھی، آپ نے ان کی صحبت کو سفر وحضر میں لازم پکڑا اور تقریباً ساٹھ برس تک ساتھ رہے، پھر حضرت مولاناؒ کی وفات کے بعد آپ ہی ان کے حقیقی جانشین قرار پائے، آپ نے حضرت مولانا کی شخصیت کا ایسا اثر قبول کیا تھا کہ گویا انہی کے مثنی بن گئے تھے، حتی کہ صورت وشکل بھی انہی کے مشابہ ہوگئی تھی۔ بلاشبہ آپ نے اپنی پوری زندگی دعوت اور علم واصلاح کے میدان میں بسر کی اور امت کے لیے ہزاروں شاگردوں کے علاوہ اپنی بیش قیمت تالیفات ورسائل اور دروس کی شکل میں ایک بیش قیمت سرمایہ چھوڑ کر رخصت ہوئے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی مغفرت کرے اور غم کے اس موقع پر امت مسلمہ بالخصوص ندوی برادری کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ آمین!‘‘

(شیخ) عبدالحمید اسماعیل زھی

(امام وخطیب اہل سنت زاہدان-ایران)

’’۲۱ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ بروز جمعرات بعد نماز ظہر حضرۃ الشیخ محمد رابع حسنی ندویؒ کے حادثہ وفات کی خبر موصول ہوئی۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

حضرت شیخ سید محمد رابع حسنی ندویؒ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے صدر اور ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ تھے، وہ ایک ربانی عالم دین اور تواضع وانکسار کا عملی نمونہ تھے، علمی وادبی حلقوں میں آپ کی باوقار شخصیت ایک عالم وادیب اور متواضع انسان کی حیثیت سے معروف ہے۔ آپ اپنے ماموں حضرت شیخ ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے سفر وحضر میں رفیق رہتے تھے، پھر ان کی وفات کے بعد ندوۃ العلماء کے انتظامی امور بھی آپ ہی کے سپرد ہوئے۔ آپ نے اپنی حیات میں متعدد گراں قدر علمی وادبی کارہائے نمایاں انجام دیے، جن میں سب سے ممتاز ترین کام ’’سراجا منیرا‘‘ کے نام سے سیرت رسول ﷺ کے موضوع پر آپ کی تصنیف ہے۔ کئی سال قبل ایک انٹرنیشنل اسلامک کانفرنس میں آپ سے میری پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی، پھر اس کے بعد عالمی سیرت کانفرنس میں بھی آپ کے ساتھ شرکت کا موقع ملا، جس میں آپ نے اپنی طبیعت کی کمزوری اور معذوری کے باوجود بڑا زبردست خطاب پیش کیا تھا۔

بلاشبہ حضرت شیخ کی وفات سے فکری، ادبی اور دعوتی دنیا میں ایک زبردست خلا واقع ہوا ہے، اللہ تعالیٰ اس خلا کو پر فرمائے اور ان کا نعم البدل عطا کرے۔ اس موقع پر ہم ان کے اہل خاندان اور تمام اہل تعلق کی تعزیت کرتے ہیں۔‘‘

ڈاکٹر حسن امرانی حسنی

(صدر رابطہ عالمی ادب اسلامی)

''بڑے ہی غم واندوہ کے ساتھ حضرت شیخ علامہ محمد رابع حسنی ندویؒ (ناظم ندوۃ العلماء) کے وفات کی خبر موصول ہوئی، ان کی مکمل زندگی علم دین کی خدمت اور دعوت الیٰ اللہ میں گذری، انہوں نے لوگوں کو عبادت رب کی حقیقت سے آگاہ کیا اور انہیں ان کا مقام ومرتبہ یاد دلایا۔ لیکن موت ایک اٹل حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ ہے، اس دنیا پر ہر ایک کو فنا ہے سوائے رب ذوالجلال والاکرام کے۔

اللہ تعالیٰ حضرت شیخ کی مغفرت فرمائے اور ان کی وفات سے پیدا ہونے والے خلا کو پر فرمائے۔ آمین!''

(مفتی) احمد بن حمد خلیلی

(مفتی عام سلطنت عمان)

''حضرت شیخ علامہ محمد رابع حسنی ندویؒ ایک جلیل القدر عالم دین اور بابرکت ہستی تھے، انہوں نے حضرت شیخ علامہ ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات کے بعد ایک طویل عرصہ تک حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ علماء کی قیادت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا، بلاشبہ ان کا قائدانہ کردار مثالی اور بامقصد تھا، حضرت شیخ محمد رابع حسنی ندویؒ اس مبارک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس نے عالمگیر سطح پر اور بالخصوص ملک ہندوستان میں اسلام کی زبردست خدمات انجام دی ہیں، انہوں نے تعلیمی، دعوتی، تصنیفی وتالیفی میدان میں اسلام کی خدمت کی اور ان سب سے بڑھ افرادسازی کا غیر معمولی کام بھی انجام دیا، جو اس دین کے لیے سب سے اہم اور بنیادی چیز ہے، اس طرح انہوں نے ہر میدان کے لائق بہترین افرادِ کار مہیا کیے اور ایسے علماء ودعاۃ پیدا کردیے جنہوں نے ملک گیر اور عالمی سطح پر اپنے فرائض انجام دیے۔

الحمدللہ مجھے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل ہے اور مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب حضرت شیخ علامہ ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی وفات ہوئی تو اس موقع پر آکسفورڈ کے اسلامک سینٹر میں ایک تعزیتی نشست کا انعقاد ہوا، جس کے اندر مجھے بھی شیخ ندویؒ سے متعلق چند کلمات کہنے کی سعادت حاصل ہوئی، حسن اتفاق کہ میرے وہ کلمات حضرت شیخ محمد رابع ندویؒ نے سماعت فرمائے اور انہیں بہت پسند کیا، پھر مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں انہیں قلم بند کرکے لائق اشاعت بناؤں۔

آج ہم ان کی وفات کے موقع پر جامعہ سیدہ عائشہ دوحہ میں موجود ہیں، جہاں ہم نے ایک جم غفیر کے ساتھ ان کی غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حضرت شیخ علامہ محمد رابع حسنی ندویؒ کی تصنیفی وتالیفی، علمی وادبی، دعوتی اور قائدانہ کوششوں کو قبول فرمائے۔ اللہ آپ کو غریق رحمت کرے، آپ کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔''

ڈاکٹر علی قرہ داغی

(جنرل سکریٹری رابطہ اتحاد عالمی)

''عظیم داعی، جلیل القدر عالم دین حضرت شیخ سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے حادثہ وفات کی خبر بعد نماز عشاء حرم شریف مکہ مکرمہ میں موصول ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمام اہل خاندان، ندوی فضلاء اور پورے عالم اسلامی کے مسلمانوں کو صبر وتسلی عطا فرمائے۔ آمین!

۲۱ رمضان المبارک ۱۴۴۴ھ کو حضرت شیخ کا انتقال ہوا، اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے امید ہے کہ یہی رات شب قدر کی ہوگی۔

تعزیت مسنونہ کے ساتھ تمام اہل خاندان اور اہل تعلق کی خدمت میں سلام عرض ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین!''

ڈاکٹر عائض قرنی

(حرم شریف، مکہ مکرمہ)

''مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے جانشین سیدی ومرشدی وشیخی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے حادثہ جانکاہ کی اطلاع ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

اس حادثہ کے موقع پر ایک مرتبہ پھر وہی غم تازہ ہوگیا ہے جو حضرت مفکر اسلام کی وفات کے موقع پر ہوا تھا، مگر اللہ کی ذات قادر

مطلق ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ موقع صرف آپ ہی کے لیے قابل رنج وغم نہیں ہے بلکہ ہم سب اور پورا عالم اسلامی اور مسلمانوں کے تمام دینی وعلمی حلقے اس وقت غم کے عالم میں ہیں۔

بلاشبہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے مفکر اسلام حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کی صحبت سے خوب فائدہ اٹھایا اور ان کے بعد دعوت وارشاد امت کی قیادت میں ان کی بہترین نیابت کی، اللہ انہیں اس کا بہترین بدلہ عطا فرمائے اور ان کے درجات بلند کرے۔

اس بندۂ ناتواں پر ان کی بے شمار عنایات رہیں اور بہت سی دعائیں حاصل رہیں، سچی بات یہ ہے کہ میرے پاس اپنے شیخ ومرشد کا شکریہ بجالانے اور ان کے احسانات کا تذکرہ کرنے کے لیے الفاظ ہی نہیں ہیں، چند ماہ قبل میری والدہ کی وفات کے موقع پر ان کے تعزیتی کلمات میرے لوح دل پر آج بھی نقش ہیں، مجھے بڑی آرزو تھی کہ عنقریب ہی میں آپ کی خدمت اقدس میں حاضری کا شرف حاصل کروں گا۔ مگر تقدیری فیصلوں کو ٹالا نہیں جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمارے شیخ ومرشد کو اپنی رحمت میں ڈھانپ لے اور ان پر اپنی نعمتوں کی بارش فرما، ان کے بعد ان کے گھر والوں کو صبر وتسلی دے اور امت کو ان کا بہترین بدل عطا فرما۔ آمین!

دارالعلوم زاہدان کے اساتذہ وطلباء نے حضرت کی وفات پر دعاؤں اور ایصال ثواب کا بطور خاص اہتمام کیا ہے اور انشاء اللہ یہ سلسلہ آگے بھی جاری رہے گا۔

(مولانا مفتی) محمد قاسم قاسمی

(جامعہ دارالعلوم زاہدان-ایران)

''اردو کے صاحب اسلوب ادیب، مفکر، عربی واسلامی اور سماجی علوم میں ممتاز مقام کے حامل، جزیرۃ العرب کے مصنف، امت کے انتہائی خیرخواہ اور اس کی حالت زار کے شاکی استاذ العلماء محمد رابع حسنی ندوی (امین عام ندوۃ العلماء-لکھنؤ وصدر عالمی رابطہ ادب اسلامی) کی وفات کی خبر سن کر انتہائی افسوس ہوا۔ یقیناً ایک عالم ربانی کی وفات ایک جہان کی موت ہے اور یہ ایک خسارہ ہے جس کا بدل شاید ہی ممکن ہو۔

میں اپنی ذاتی حیثیت میں اور جماعت اسلامی پاکستان کے جملہ ارکان ومتعلقین کی جانب سے بھی علامہ کی وفات حسرت آیات پر اظہار تعزیت کرتا ہوں، دعا گو ہوں کہ انہوں نے دین اسلام کی خدمت کرتے ہوئے جو خدمات جلیلہ پیش کی ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی بارگاہ میں قبول ومنظور فرمائیں، ان کی مغفرت فرمائیں اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں۔''

(مولانا) سراج الحق

(امیر جماعت اسلامی پاکستان)

''بڑے ہی افسوس اور غم کے ساتھ حضرت شیخ محمد رابع حسنی ندویؒ کے حادثہ وفات کی خبر ملی، جنہوں نے اپنی پوری عمر دین وعلم اور شریعت کی خدمت میں وقف کردی تھی۔ اس موقع پر میں سبھی اہل تعلق کی تعزیت کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو صبر عطا فرمائے اور ان کے نقوش قدم کی پیروی کرنے کی توفیق دے اور ان کا بہترین وارث بنائے۔ آمین!''

(مفتی) کہلان بن نبہان خروصی

(معاون مفتی عام سلطنت عمان)

''شیخ علامہ محمد رابع حسنی ندوی، عالمی رابطہ ادب اسلامی کے صدر اور ندوۃ العلماء کے ناظم تھے، آپؒ حضرت شیخ علامہ ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کے دست راست تھے اور رابطہ ادب اسلامی سے آپ کا پہلے دن سے انتظامی تعلق تھا، آپ نے پابندی کے ساتھ اس کی کانفرنسوں میں شرکت فرمائی اور ممبران کی میٹنگوں میں بھی حصہ لیا۔

ادب اسلامی اور دعوت اسلامی کے موضوع پر آپ نے متعدد بیش قیمت تصنیفات لکھیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں مرحوم کی حسنات میں اضافہ کا ذریعہ بنائے اور لوگوں کے لیے نفع بخش بنائے۔

اس موقع پر یقیناً غم بہت سخت ہے، رابطہ ادب اسلامی کے

لیے خاص طور پر اور عالم اسلامی کے لیے عام طور پر یہ حادثہ بڑا افسوس ناک ہے، اس لیے کہ یکے بعد دیگرے امت مسلمہ کی با اثر شخصیات دنیا سے رخصت ہورہی ہیں۔

حضرت شیخ کی وفات پر ہم تمام متعلقین و منتسبین کی تعزیت کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ہم سب کو صبر و تسلی عطا کرے۔ آمین"

ڈاکٹر ناصر بن عبدالرحمٰن خنین
(نائب صدر مقامی دفتر عالمی رابطہ ادب اسلامی)

"جلیل القدر عالم دین حضرت شیخ علامہ محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات کے موقع پر دار القلم بیروت کی جانب سے ان کے اہل خاندان اور ندوۃ العلماء سے نسبت رکھنے والے فضلاء کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش ہے، اللہ آپ کو تسلی و ہمت دے۔ آمین!"

(شیخ) عماد الدین دولہ
(ڈائریکٹر دار القلم- بیروت)

"استاذ العلماء، ممتاز مفکر و ادیب، مفکر محمد رابع حسنی ندوی (امین عام ندوۃ العلماء-لکھنؤ وصدر عالمی رابطہ ادب اسلامی) کی وفات کی خبر سن کر انتہائی صدمہ اور افسوس ہوا، یقیناً ایک عالم ربانی کی وفات ایک جہان کی موت ہے اور یہ ایک ایسا خسارہ ہے جس کا بدل شاید ہی ممکن ہو۔

میں علامہ کی وفات پر اظہار تعزیت پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات جلیلہ کو شرف قبولیت بخشے، ان کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔"

(مولانا) محمد آصف لقمان قاضی
(جماعت اسلامی پاکستان)

"اللہ تعالیٰ کی مدد آپ کے شامل حال ہو، انتہائی رنج و افسوس کے ساتھ ہمیں حضرت شیخ علامہ محمد رابع حسنی ندویؒ کی خبر وفات موصول ہوئی، آپ ندوۃ العلماء کے ناظم اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو غریق رحمت کرے اور جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام نصیب فرمائے۔

اس موقع پر میری طرف سے اور ڈاکٹر شیخ عبداللطیف بن عبد العزیز آل شیخ حفظہ اللہ نیز ڈاکٹر عواد بن سبتی عنزی کی جانب سے آپ سب کو تعزیت مسنونہ پیش ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!"

(شیخ) بدر بن ناصر غانم عنزی
(سعودی ایم بی سی- نئی دہلی)

"حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ان شخصیات میں سے تھے جنہوں نے ملت کی رہنمائی میں مؤثر کردار ادا کیا، مرحوم ایک متواضع اور بلند اخلاق کے حامل تھے۔ مولانا منکسر المزاج، وسیع القلب اور وسیع الخیال نیز فکر و نظر، علم و عمل، دیانت، تفقہ، تدبیر و تدبر، ایثار، خلوص و ولی اللّٰہی شخصیت کے ساتھ ساتھ سبھی مذاہب اور مسالک کے لوگوں سے رابطہ رکھتے اور قومی و ملی مسائل پر ہم آہنگی و یگانگت قائم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ آپ کی عظیم قابل قدر دینی، ملی، علمی، سماجی و اصلاحی تعلیمی خدمات کو کبھی بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ایسے جلیل القدر عالم دین کی رحلت پر ایران کلچر ہاؤس دہلی بہت رنجیدہ اور غمگین ہے اور مرحوم کے وابستگان بالخصوص خانوادۂ مرحوم کی خدمت میں تسلیت و تعزیت پیش کرتا ہے۔ خداوند عالم مرحوم کو ان کے حسنات کے لیے اجر جزیل اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!"

ڈاکٹر محمد علی ربانی
(اسلامی جمہوریہ ایران- نئی دہلی)

"فلسطینی علماء یونین کو انتہائی رنج و غم سے لبریز فضیلۃ الشیخ محمد رابع حسنی ندویؒ کے حادثہ وفات کی خبر موصول ہوئی، حضرت شیخ رحمہ اللہ ندوۃ العلماء کے ناظم اور عالم اسلامی کے ممتاز علماء میں سے تھے،

ان کی پوری زندگی علم ودعوت اور خدمت دین سے عبارت ہے۔

اس موقع پر ہم خصوصاً تمام ہندوستانی مسلمانوں اور عموماً پوری امت مسلمہ کی تعزیت کرتے ہیں اور خاص طور پر حضرت شیخ رحمہ اللہ کے اہل خاندان، ان کے متعلقین اور شاگردوں کی تعزیت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور تمام پس ماندگان کو صبر جمیل دے۔ آمین!''

فلسطینی علماء یونین

(فلسطین)

''ہم سب کے مربی ومشفق ومحسن استاد اور مرشد ملت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات یوں تو پوری ملت اسلامیہ کے لیے ایک بڑا سانحہ ہے، مگر ہم شاگردان اور وابستگان کے لیے خاص طور پر اندوہ ناک اور الم ناک حادثہ ہے۔ ساری ندوی برادری صدمہ سے دوچار ہے اور ایک دوسرے کی غم گساری کر رہے ہیں۔

امارات میں مقیم تمام فرزندان ندوہ اور حضرت رحمہ اللہ کے خوان علم وادب سے خوشہ چینی کرنے والے تلامذہ بھی اپنے رنج والم کا اظہار کرتے ہیں۔

ہم رب کریم کے حضور دست بدعا ہیں کہ ہمارے استاذ الاساتذہ کو اپنی رحمت ومغفرت سے نواز کر اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے، ان کی قبر کو نور سے بھر دے، ان کے پس ماندگان اور ملت اسلامیہ بطور خاص ملت اسلامیہ ہندیہ کو صبر جمیل کی توفیق مرحمت فرمائے۔ آمین!''

ابنائے ندوہ

(متحدہ عرب امارات)

علماء ودانشورانِ ھند:

''حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ایک باکمال ملی رہنما، ادیب کامل اور عربی زبان پر کامل عبور رکھتے تھے، آپ کی کئی تصنیف کردہ کتابیں ہیں، عربی ادب وثقافت میں اختصاص کے ساتھ آپ کی اردو تصانیف بھی کم نہیں ہیں، آپ کی ذات فکر ونظر علم وعمل، دیانت، تفقہ، تدبیر وتدبر، خلوص وللّٰہیت کی مجموعہ تھی، آپ ایک بہترین استاذ، مخلص داعی اور مفکر تھے، جن سے علمی، دینی، ادبی وسیاسی دنیا میں رہنمائی حاصل کی جاتی تھی۔ آپ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے تربیت یافتہ اور آپ کے علمی مشرب سے فیض یافتہ تھے، ان ہی کی طرح جامعیت وبلندی فکر وخیال کی سچی تصویر تھے، قحط الرجال کے اس دور میں ایسی عظیم شخصیت کا رخصت ہوجانا بے شک عالم اسلام کے لیے بڑا خسارہ ہے اور دار العلوم بھی اپنے ایک اہم رکن سے محروم ہوگیا۔

اس صدمہ کی گھڑی میں ہم خدام دار العلوم آپ حضرات کی خدمت میں اور حضرت نور اللہ مرقدہ کے اہل خانہ وپس ماندگان کی خدمت میں تعزیت مسنونہ پیش کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ حضرت کی مساعی جمیلہ وخدمات دینیہ کو قبولیت سے نوازے، حسنات کو قبول فرمائے، سیئات سے درگذر فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں قرب خاص نصیب فرمائے۔ آمین!''

(مولانا مفتی) محمد راشد اعظمی

(قائم مقام مہتمم دار العلوم دیوبند)

''حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ جیسے عالم ربانی کا دنیا سے اٹھ جانا جس کو ملت اسلامیہ میں ایک مربی، ایک بزرگ اور سرپرست کی حیثیت حاصل ہو، ان کا سانحہ وفات کسی ایک خاندان یا کسی ایک ادارہ اور انحائے عالم میں منتشر اس کے منتسبین کے لیے ہی عظیم حادثہ نہیں بلکہ ملت کا ہر وہ فرد جو شعور کی سطح پر ان کے بلند تر مقام علم وعمل بزرگ سالہ مرتبہ عظمت اور ہندوستان کے مسلم معاشرہ میں ان کی موجودگی سے پائی جانے والی ذہنی وفکری تقویت جیسے حقائق سے واجبی سی بھی آگہی رکھتا ہے، ایسا قلب ودماغ خواہ وہ دنیا کے کسی بھی مقام پر اس صدمہ کی شدت اور اس کے اثرات کو اہل خانہ اور مقربین کی طرح محسوس کرتے ہوئے مرحوم ومغفور کے لیے ترقی

درجات اور اعلیٰ علیین میں صدیقین وصالحین کی صفوف میں مقام کریم عطا کیے جانے کے لیے بچشم نم دست دعا دراز کیے ہوئے ہے۔

بارگاہ رب ذوالجلال والاکرام میں دعا گو ہوں کہ حق تعالیٰ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور دار العلوم ندوۃ العلماء کو مرحوم ومغفور کا بہترین بدل عطا فرمائیں۔آمین یارب العالمین!''

(مولانا) محمد سفیان قاسمی

(مہتمم دار العلوم وقف- دیوبند)

''حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا وجود باجود دینی اور علمی امور میں ایک حوصلہ بخشتا تھا، ان کے انتقال سے ملت اسلامیہ ماتم کناں ہے، وہ تمام حلقوں میں محترم ومعظم تھے، نامساعد اور پیچیدہ حالات میں حضرت نے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے پلیٹ فارم سے ہندوستان کے مسلمانوں کی شرعی رہنمائی فرمائی، قحط الرجال کے دور میں جب ملت کے تمام مسلکی طبقات کو ایک لڑی میں پرونا ناممکن سا لگتا ہے، تمام ملی تنظیمیں ومسلکی طبقات ان کے اردگرد جمع ہوجاتے تھے، ان کی جدائی کا خلا دنیائے دنی مدتوں محسوس کرے گی۔

اللہ تعالیٰ حضرت کے درجات بلند فرمائے اور تمام متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق ارزانی کرے۔آمین!''

(مولانا) محمد سعیدی

(ناظم مدرسہ مظاہر علوم- سہارنپور)

''حضرت مرشد ملت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی علیہ الرحمہ کے سانحہ رحلت کی خبر سن کر دل دھک سے ہوکر رہ گیا، کل تک ان کی درازی عمر کی دعائیں ہورہی تھیں اور آج ان کا سایہ سر سے اٹھ جانے پر پورا عالم اسلام خون کے آنسو رو رہا ہے، اللہ تعالیٰ حضرت والا کے درجات کو بلند سے بلند تر فرمائے اور ہمیں ان کے دکھلائے ہوئے راستہ پر چلنے کی توفیق دے۔

مدیر روزنامہ ''انقلاب'' سے ۱۸؍دسمبر ۲۰۲۲ء کی ملاقات کے وقت حضرت والا نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''مسلمانوں کے پاس یہ موقع ہے کہ وہ اپنی اصلاح کریں اور باری تعالیٰ کی ذات میں اپنے یقین کو اور مضبوط کریں۔حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے، ایک دن روشن صبح نمودار ہوگی۔'' بس حضرت کے اس پیغام کو دل سے قبول کرلینے اور گرہ باندھ لینے کی ضرورت ہے۔

خادم سبھی اہل خاندان ومتعلقین کی خدمت میں تعزیت مسنون پیش کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ صبر جمیل عطا فرمائے اور ہم سب کو حضرت کے نقوش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔آمین!''

(مولانا) عزیز الحسن صدیقی

(مدرسہ دینیہ- غازی پور)

''حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ایک صاحب دل ربانی عالم دین، بلند پایہ مصنف اور بالغ نظر منتظم تھے اور اس سے بڑھ کر اخلاق ومروت کا پیکر ایک عظیم اور بے ضرر انسان تھے۔آپ نے تقریباً پوری زندگی اسلام اور ملت اسلامیہ کی خدمت میں گذاری، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے لیے آپ کی شخصیت انتہائی اہمیت کی حامل تھی اور ان دونوں اداروں کی سرپرستی کا فریضہ نہایت کامیابی کے ساتھ ایک ایسے دور میں انجام دیا جب کہ انہیں سنبھالنا آسان نہیں تھا، ان کے علاوہ دیگر بہت سے دینی وتعلیمی وادبی اداروں کو بھی آپ کی سرپرستی حاصل رہی۔آپ کی وفات کسی ایک ادارے اور تنظیم کا نقصان نہیں، بلکہ پوری امت کا ناقابل تلافی نقصان ہے۔

اللہ تعالیٰ مولانا ے محترم کی بال بال مغفرت فرما کر اعلیٰ علیین میں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی رفاقت نصیب فرمائے اور ملت اسلامیہ کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے۔آمین!''

(مولانا) کاکا سعید عمری

(نائب صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ)

''حضرت مولانا شاہ محمد رابع حسنی ندوی نور اللہ مرقدہ ہر مسئلہ کو دانشمندی اور دور بینی بلکہ حکمت وفراست کے ساتھ مثبت انداز سے

حل فرماتے تھے۔ آپ خلیق، نرم خو، شیرین زبان، بردبار، متحمل مزاج تھے۔ انتظامی امور میں باریک بین اور سلیقہ مند تھے۔ ہمیشہ آپ سکوت میں رہتے مگر ملک وملت کے لیے متفکر رہتے۔ آپ کے مشورہ یا فیصلہ سے کسی کی دل آزاری نہ ہو اور کسی کی انا کو ٹھیس نہ پہنچے، اس کا آپ بہت لحاظ فرماتے۔ 1965 سے وفات 2023 تک میرا آپ سے ربط رہا، شفقت و خورد نوازی میں کبھی تغیر محسوس نہیں ہوا۔ دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کی نظامت، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی صدارت اور دیگر ملکی و عالمی اعلیٰ مناصب پر فائز ہونے کے باوجود آپ کی سادگی وتواضع اور مسکینی طبیعت میں قطعاً فرق نہیں آیا۔ ایک خوبی جو آپ کی پوری فعال زندگی کی خوبیوں میں سر فہرست تھی، وہ ہے اتحاد ملت اور وحدت امت۔"

شاہ قادری سید مصطفیٰ رفاعی جیلانی
(کارگزار جنرل سکریٹری آل انڈیا ملی کونسل)

"حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات کی اطلاع موصول ہوئی تھی، اسی روز خانقاہ محمودیہ جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین ڈابھیل میں دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مسلمانان ہند کے لیے عموماً اور ندوی برادری کے لیے خصوصاً بڑا حادثہ ہے۔

دل سے دعا کرتا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ مرحوم کی بال بال مغفرت فرمائے، موصوف کی تقریری، تحریری اور دینی وملی خدمات جلیلہ کو شرف قبولیت سے نوازے، ان کی موجودگی میں جن رحمتوں، نعمتوں، نوازشوں اور عنایتوں کا سلسلہ جاری تھا، ان کی وفات کے بعد بھی ان کے متعلقین پر اسے جاری رکھے۔

موت ہر ایک کو آنی ہے اور مرحوم کی موت قابل رشک ہے کہ رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں واقع ہوئی، کاش کہ ہم اس حادثہ سے اپنی زندگی کے لیے کوئی سبق لے سکیں اور دنیا کی اس فانی زندگی کی حقیقت پہچان لیں جس کا کوئی لمحہ یقینی نہیں۔"

(مولانا) احمد بزرگ عفی عنہ
(جامعہ اسلامیہ تعلیم الدین-ڈابھیل)

"حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے وصال الی اللہ کی خبر باعث حزن وملال ہوئی، حضرت مولانا مرحوم اگر آپ کے محسن ومربی اور سرپرست تھے، تو میرے پیر بھائی تھے اور گہری انس ومحبت رکھتے تھے، جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ کے سرپرست اعلیٰ اور آل انڈیا ملی کونسل کے بھی سرپرست تھے، اس اعتبار سے حضرت والا کا اٹھ جانا جہاں آپ کے لیے غم واندوہ اور محرومی کا سبب ہے وہیں میرے لیے ذاتی طور پر بھی حزن وملال کا باعث ہے۔"

(مولانا حکیم) محمد عبداللہ مغیثی
(مہتمم جامعہ اسلامیہ عربیہ گلزار حسینیہ-اجراڑہ)

"شیخ العرب والعجم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا سانحہ ارتحال یقیناً پوری امت مسلمہ کا ناقابل تلافی نقصان ہے، ان کی رحلت پر پورا عالم اسلام زبان حال سے گویا ہے: "إن العين تدمع والقلب يحزن ولا نقول إلا ما يرضى ربنا، وإنا بفراقك يا رابع لمحزونون."

اللہ تعالیٰ مرشد ملت کو غریق رحمت کرے اور خانوادۂ علی میاں ندویؒ کے ہر فرد کو اس مشکل گھڑی میں ہمت وحوصلہ دے۔ آمین!"

(جناب) محمد عتیق
(چیئرپرسن مولانا آزاد یونیورسٹی-جودھ پور)

"حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ملت اسلامیہ ہندیہ کے عظیم رہنما اور اتحاد وہمہتی کے علم بردار تھے، موجودہ حالات میں عالم اسلام کو ان کی اشد ضرورت تھی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور دیگر اداروں کا وقار اور اتحاد برقرار رکھنے میں ان کا کردار ناقابل فراموش ہے۔ مولانا کی علمی، ملی اور دینی خدمات نصف صدی سے زائد عرصہ پر محیط ہیں، جس کو ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا، ان کے انتقال سے ایک بڑا خلا واقع ہوا ہے۔ انہوں نے تا حیات علمی وفکری اور ملی اعتبار سے قوم کی ترجمانی کی، وہ عالم اسلام کے لیے عموماً اور ایشیائی مسلمانوں کے لیے خصوصاً نعمت عظمیٰ تھے۔ ان

کے علم، ان کے تقویٰ، ان کے بلند افکار سے ملت اسلامیہ کو کافی فائدہ پہنچا۔ آپ کی وفات یقیناً ایک بڑا خلا ہے، جسے پر ہونے میں عرصہ لگ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ حضرت مولاناؒ کی مغفرت فرمائے اور اہل خانہ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!''

ڈاکٹر محمد منظور عالم
(چیئرمین انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز)

''حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ملت اسلامیہ ہند کے سرپرست تھے اور مسلمانان ہند کے سب سے موقر پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر تھے، آپ کی زیر صدارت بورڈ نے قابل قدر خدمات انجام دیں اور اس کے دائرہ کار میں اضافہ بھی ہوا۔ مولانا مرحوم ایک بلند پایہ محقق، بہترین مصنف، متبحر عالم، دور اندیش قائد، بہترین مربی اور کامیاب مدرس تھے۔ انتہائی شریف النفس، با اخلاق، منکسر المزاج، متواضع اور دردمند انسان تھے، ان سے مل کر ایمان تازہ ہوتا تھا، چہرہ پر نور بکھرا ہوا ہوتا تھا اور مجلس بڑی روحانی ہوتی تھی۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی خدمات جلیلہ کو شرف قبولیت بخشے، جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!''

(مولانا) محمد طاہر مدنی
(ناظم جامعۃ الفلاح-اعظم گڑھ)

''حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا سانحہ ارتحال یقیناً پوری علمی دنیا، وابستگان وفیض یافتگان ندوۃ العلماء کے لیے بڑا حادثہ ہے۔ مجھے اس عظیم حادثہ فاجعہ پر بے حد صدمہ ہے، میں اپنے دکھ کو الفاظ کے پیرایہ میں بیان نہیں کرسکتا، ان کی شخصیت ہمہ گیر شخصیت تھی، مختلف مذہبی، سماجی، علمی تنظیموں (رابطہ ادب اسلامی عالمی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ) کے ذمہ دار وصدر تھے، ہر چھوٹے بڑے سے خندہ پیشانی اور محبت سے پیش آتے، علمی حلقوں میں ان کی ایک بہترین شناخت تھی۔ مرحوم کے زمانہ نظامت میں ندوۃ العلماء خوب پروان چڑھا، یہ حضرت مولانا علی میاںؒ کی حس نظر اور حسن انتخاب کا کمال تھا، موصوف علم وعمل کے سنگم، انتہائی وضع دار، نظیف الطبع، جامہ زیب، خلیق وملنسار تھے اور اکابر سے والہانہ عقیدت رکھتے تھے۔

حضرت موصوف سے جب بھی ملاقات ہوتی تو بندہ کے دادا جان علیہ الرحمہ کا ضرور تذکرہ فرماتے اور کہتے کہ آپ کے دادا حضرت مولانا سید حمید الدین صاحبؒ ہمارے استاذ ہیں، ہم نے ندوہ میں ان سے حدیث پڑھی ہے۔ حضرت مولانا کے اس سانحہ ارتحال پر ہم مرحوم کے جملہ متعلقین ومنتسبین اور جملہ اساتذہ دار العلوم ندوۃ العلماء کو کلمات تعزیت پیش کرتے ہیں۔''

(مولانا) سید اشہید رشیدی
(صدر جمعیۃ علماء اتر پردیش)

''نمونہ سلف وجانشین مفکر اسلام حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے سانحہ ارتحال کی خبر صاعقہ بن کر گری، حضرت والا ہم سبھی کے مرشد ومربی اور ملت اسلامیہ کے عظیم قائد ورہنما تھے، آج کے پر آشوب اور نازک وقت میں آپ کی رحلت نہ صرف ہمارا، اہل خاندان واہل ندوہ کا بلکہ پوری ملت اسلامیہ خاص طور سے ملت اسلامیہ ہندیہ کا ناقابل تلافی نقصان وخسارہ ہے، جس کا تدارک وتلافی بظاہر مشکل ترین بلکہ ناممکن نظر آتا ہے، آج کے منافرت بھرے ماحول، نفاق وشقاق اور شدت پسندی کے اس دور میں حضرت والا اتحاد ملت کے سلسلہ میں اور ''تحریک پیام انسانیت'' کے عنوان سے اتحاد انسانیت کے میدان میں جو کام اور خدمات انجام دے رہے تھے وہ یقیناً آب زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں، آج قحط الرجال کے اس دور میں ملت کو آپ کی شدید ضرورت تھی لیکن موت سے کس کو رست گاری ہے۔ ربِّ کریم آپ کے زیر سایہ چلنے والی تمام تحریکات، تنظیموں اور اداروں کے بقا وتحفظ وترقی کے اسباب غیب سے مہیا فرمائے۔ حضرت والا کی بال بال مغفرت فرمائے۔ آمین!''

(مولانا) آس محمد گلزار قاسمی
(صدر آل انڈیا ملی کونسل (اتر پردیش)

''بلاشبہ حضرت اس امت مسلمہ کا قیمتی سرمایہ اور متاع گراں مایہ تھے۔آپ کے مزاج میں حد درجہ توازن، تحمل، عفوودرگذر اور کمال فنائیت تھی، ساتھ ہی آپ کی نصف صدی سے زیادہ علمی، دینی وملی خدمات بے لوث، ہر طرح کی فرقہ واریت اور تشدد سے پاک رہی، یقیناً آپ کی تمام تر خدمات ایک مدت تک یاد کی جاتی رہے گی۔ آپ نہایت بااخلاق، بڑے مہمان نواز اور کریم النفس تھے۔اب اخلاص ووفا، سخاوت ومہمان نوازی کے ایسے حسین پیکر کہاں ملیں گے۔اللہ تعالیٰ ان کی روح کو سرسبز وشاداب فرمائے اور درجات عالیہ سے نوازے۔ بزرگوں کے چلے جانے کے بعد جو ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے وہ محسوس ہورہا ہے۔''

(مولانا) احمد نصر بنارسی

(خانقاہ امدادیہ-وارانسی)

''بین الاقوامی شہرت یافتہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر، عربی زبان وادب کے مایہ ناز محقق ودانشور مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مرحوم کا اس دار فانی سے کوچ کر جانا ملت اسلامیہ خصوصاً ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے مولانا کا قلبی لگاؤ ہمیشہ سے رہا۔ یونیورسٹی کورٹ کے ممبر بھی رہے، یہاں کے مختلف علمی پروگراموں خصوصاً شعبہ عربی اور شعبہ علوم اسلامیہ کے متعدد سیمیناروں میں شرکت اور صدارت کی۔تقریباً سات دہائیوں تک تعلیمی، دینی، روحانی، ملی وسماجی خدمات انجام دینے والی ایک قاموسی شخصیت دنیا سے رخصت ہوگئی۔مولانا کے انتقال سے جو خلا پیدا ہوا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پر کرنے کی کوئی سبیل پیدا کرے۔شعبہ عربی اور شعبہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جملہ اساتذہ، طلبہ، علمی برادری ان کے انتقال پر اظہار تعزیت کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی بال بال مغفرت فرمائے، جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔لواحقین اور وابستگان کو صبر جمیل دے۔آمین!''

پروفیسر محمد ثناء اللہ ندوی

(صدر شعبہ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

''مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر، ندوۃ العلماء کے ناظم اور اپنی گراں قدر تعلیمی وسماجی خدمات کے لیے مشہور حضرت مولانا رابع حسنی ندوی صاحبؒ کی وفات بلاشبہ ایک بڑا حادثہ ہے۔مولانا مرحوم عصر حاضر میں امت مسلمہ کے مسائل کو لے کر فکر مند شخصیات میں شامل اور اس سلسلے میں مختلف فورم پر سرگرم تھے۔ جہاں آپ نے مسلمانان ہند کے باوقار مشترکہ پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کی حیثیت سے اپنا فریضہ انجام دیا، وہیں نہ جانے کتنے اداروں کے سرپرست، علمی اداروں کے سربراہ اور علمی مجلسوں کے صدر نشین رہے۔ساتھ ہی ساتھ آپ کی اردو وعربی میں عالی قدر تصانیف اپنی جگہ بڑی اہم اور قیمتی ہیں۔

علم وادب، تعلیم وتعلم، دعوت وتبلیغ اور ملی قیادت ورہبری میں مولانا کی گراں قدر خدمات ہمیشہ یاد رہیں گی۔اللہ تعالیٰ آپ کی بال بال مغفرت فرمائے، آپ کے خدمات کو قبول فرمائے اور امت مسلمہ کو آپ کا نعم البدل عطا فرمائے۔

(جناب) افضال محمد فاروقی صفوی

(خانقاہ صفویہ صفی پور-اناؤ)

''عالم اسلام کے متبحر عالم دین استاذی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کا سانحہ ارتحال نہ صرف مسلمانان ہند کا بلکہ عالم اسلام کا ایک بڑا خسارہ ہے، آپ کی وفات کی خبر سن کر دل پر عجیب اضطراب وبے چینی کی کیفیت طاری ہوگئی، کیونکہ اس قحط الرجال کے عہد میں حضرت الاستاذ جیسی شخصیات عنقا ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم مسلمانان ہند پر رحم فرمائے اور آپ کا نعم البدل عطا فرمائے۔

حضرت کی شخصیت مسلمانان ہند کے لیے بالعموم اور ندوی برادری کے لیے بالخصوص ایک سرپرست اور مربی کے مانند تھی، اللہ

تعالیٰ نے آپ کو بے پناہ علمی و تنظیمی صلاحیتوں سے نوازا تھا، آپ ایک بلند پایہ مصنف، صاحب طرز ادیب، مفکر اور ایک خدا ترس عالم دین تھے۔ آپ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے پروردہ اور ان کے علوم کے امین اور ان کے سچے جانشین تھے اور آپ نے ان کی جانشینی کا حق ادا کیا۔

حضرت کا انتقال کسی ایک خانوادہ یا ادارے کا نقصان نہیں، بلکہ پوری امت کا نقصان ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ استاذ گرامی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے اور انہیں اعلیٰ علیین میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

(مولانا) انیس الرحمٰن ندوی
(جنرل سکریٹری فرقانیہ اکیڈمی وقف- بنگلور)

''حضرت کی وفات ملک وملت اور علمی دنیا کے لیے عظیم خسارہ ہے اور ایک عہد کا خاتمہ ہے، آپ کی زندگی کا ہر پہلو تابناک وقابل رشک تھا، حضرت والا وہ مایہ ناز شخصیت تھے جن کی بزرگی، اخلاص وللّٰہیت، نام ونمود سے دوری اور دین وملت کی بے لوث خدمات کا اعتراف عرب وعجم دونوں کرتے تھے، علم وادب میں مولانا کی شاندار خدمات نے عرب وعجم میں مولانا کو ایک نمایاں مقام عطا کیا تھا، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی رحلت کے بعد آپ عالم اسلام میں ان کے نمائندہ اور نائب کی حیثیت سے جانے جاتے تھے، آپ نے امریکہ، جاپان، ملیشیا، مصر، الجزائر، ازبکستان، ترکی، جنوبی افریقہ کے علاوہ برطانیہ وغیرہ کا بھی سفر کیا اور وہاں علمی ودعوتی نقطہ نظر سے امت کو بیدار کیا۔ مولانا کی عظیم الشان تدریسی خدمات تقریباً نصف صدی پر محیط ہیں۔ مولانا کی عظیم شخصیت اس دور قحط الرجال میں سلف صالحین کی جیتی جاگتی تصویر تھی، ماہ مبارک میں آپ کی وفات یقیناً ایک ولی کامل ہونے کی علامت ہے۔ مولانا کی وفات سے علمی دنیا میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے جس کا پر ہونا بظاہر مشکل معلوم ہورہا ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرت کی خدمات کو شرف قبولیت عطا فرمائے اور اعلیٰ علیین میں جگہ عنایت فرمائے۔ آمین!''

(مولانا) عبدالقادر ڈانگی
(ناظم مدرسہ عربیہ تعلیم القرآن- بھٹکل)

''حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ ایک طویل عرصہ تک تدریس وتصنیف اور نظم وانصرام کی خدمات انجام دیتے رہے۔ مسلمانوں کے مشترکہ پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر رہے۔ عالمی رابطہ ادب اسلامی کے نائب صدر اور لکھنؤ میں قائم مجلس تحقیقات ونشریات اسلام اور ندوۃ العلماء کی مجلس صحافت ونشریات کے صدر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ آپ نے مسلمانوں کو میڈیا پر مہارت وعبور حاصل کرتے ہوئے ابلاغ دین کی بارہا اپیل کی ہے۔ بین المذاہب رابطوں اور مباحث کی وکالت کرتے تھے، دی ہندو کے بیان کے مطابق ''وہ ہمیشہ مسلمانوں کو غصہ اور تشدد سے باز رہنے اور صبر واستقامت کے راستہ پر چلنے کی نصیحت کرتے رہے۔'' آپ کا شمار دنیا کے ۵۰۰/ بااثر مسلم شخصیات میں کیا جاتا تھا، اگر کینوس پر فکر وفہم، تعلیم وتدریس، تصنیف وتحریر، تبلیغ وتفسیر، نظم وانصرام، قوت فیصلہ، حکمت ودانائی، حلم وبردباری، مصلحت ودوراندیشی کے رنگ بکھیرے جائیں تو یقیناً مولانا محمد رابع حسنی ندوی علیہ الرحمہ کی شخصیت ابھر کر سامنے آئے گی۔ آپ کی شخصیت کا ابھرتا پہلو یہ تھا کہ آپ تمام مکاتب فکر اور علمی حلقوں میں یکساں مقبول تھے اور عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔

آپ کا اس دنیا سے رحلت فرمانا ملت اسلامیہ سے قیمتی سرمایہ کے اٹھ جانے کے مترادف ہے۔ بارگاہ الٰہی میں دعا ہے کہ آپ کے لواحقین اور عقیدت مندوں کو صبر جمیل کی توفیق دے اور ملت کو آپ کا بہترین نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین!''

(مفتی) سہیل احمد فلاحی
(ناظم جامعۃ البرکہ- اعظم گڑھ)

’’حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد دار العلوم ندوۃ العلماء کے ناظم اعلیٰ کی حیثیت سے اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کی حیثیت سے سالہا سال خدمات انجام دیں، اللہ پاک قبول فرمائے اور اجر وافر نصیب فرمائے۔ آمین!

حضرت مولانا مرحوم نیک دل، سادہ مزاج، متواضع، ملنسار، ہنس مکھ، نمونہ اسلاف وغیرہ اوصاف کے حامل تھے۔ اللہ پاک مرحوم کی جمیع خدمات کو شرف قبول بخشے، ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور جملہ پس ماندگان کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین!‘‘

(مولانا) محمد نذیر خانپوری
(مہتمم دار العلوم فلاح دارین- گجرات)

’’حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کے انتقال کی خبر سے ہم سب کو شدید صدمہ پہنچا، حضرت تو چلے گے لیکن عرب وعجم، مدارس ومکاتب کے ذمہ دار، دینی فکر رکھنے والے، نئی نسل کو دینی راہ پر لانے والے، ہر مسلک ومشرب کے لوگ اور اہل مسلم پرسنل لا بورڈ کو رنجور، مغموم اور اداس چھوڑ گئے، صرف اہل ندوہ ہی نہیں غم گین ہیں، دانشوران قوم فکر مند ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور حضرت کی علمی وروحانی اولاد کو ان کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین!‘‘

حافظ محمد یوسف رشید
(مہتمم دار العلوم مدرسہ عربیہ تعلیم المسلمین- گجرات)

’’حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی وفات علمی، فکری، دعوتی دنیا کا عظیم سانحہ ہے، تاریخ کا ایک زرّیں باب بند ہوگیا، حضرت والاؒ بلا شبہ ایک ایسی شخصیت کے مالک تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہے، اس پر آشوب دور میں حضرت مولانا کی ذات گرامی ملت اسلامیہ ہندیہ کی عزت وناموس کے لیے آخری ڈھال تھی، آپ کی وفات صرف ندوۃ العلماء اور آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا نہیں بلکہ پوری امت کا ناقابل تلافی نقصان وخسارہ ہے، اخلاص وللّٰہیت، نام ونمود سے دور اور دین وملت کی بے لوث خدمت آپ کا طرۂ امتیاز تھا، آپ تواضع وانکساری، کریمانہ اخلاق، وسعت ظرفی میں اپنے اسلاف کا بہترین نمونہ تھے۔ وہ پوری ملت کے لیے نقطہ اتحاد تھے، ہر حلقہ میں محبوب اور ہر دل عزیز تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کے اندر انتظامی صلاحیت بھرپور رکھی تھی، انہوں نے دار العلوم ندوۃ العلماء کو بام عروج پر پہنچایا۔

اللہ تعالیٰ حضرت مولاناؒ کی بے لوث خدمات کو قبول فرما کر سرمایہ آخرت بنائے اور ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور اعلیٰ علیین میں مقام عطا فرمائے۔ آمین!‘‘

(مولانا) ظہیر انوار قاسمی
(مہتمم دار العلوم الاسلامیہ- بستی)

’’پیکر علم وعمل، قائد ملت، استاذ الاساتذہ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ کی رحلت پوری ملت اسلامیہ کے لیے بہت بڑا حادثہ ہے، آپ کی وفات ’’موت العالم موت العالم‘‘ کا حقیقی مصداق ہے، حضرت مولانا پیرانہ سالی سے گذر رہے تھے، یہ خیال نہیں تھا کہ علم وعمل کا یہ متاع گراں مایہ اس طرح داغ مفارقت دے کر چلا جائے گا، اللہ رب العزت مولاناؒ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کی خدمات عالیہ کو قبول فرما کر اپنی شایان شان بدلہ عطا فرمائے۔ آمین!‘‘

(مولانا) کمال احمد ندوی
(استاذ جامعہ عربیہ تعلیم الدین- مئو)

’’حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ نہ صرف ہمارے بلکہ پورے خاندان کے محسن ومرشد اور مربی تھے۔ ایسے مشفق ومربی عظیم المرتبت عالم ربانی کا دنیا سے اٹھ جانا ایک خاندان یا کسی ایک ادارہ ہی کا نقصان نہیں ہے بلکہ یہ پوری ملت اسلامیہ اور اس سے بھی آگے بڑھ کر پوری دنیائے انسانیت کا بظاہر ناقابل تلافی خسارہ ہے۔ اللہ تعالیٰ محض اپنی رحمت وقدرت سے حضرت والاؒ کا بدل عطا فرمائے۔‘‘

قاضی ابو ریحان فاروقی
(جامعہ ریاض العلوم- اندور)

اہل سیاست:

''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ادھیکچھ' مہان عالم مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی جی کا ندھن ہوگیا، شکچھا کی لائن میں ان کی سیوائیں اور اسلام کے لیے ان کے سراہنی کاریے سدیو یاد رکھے جائیں گے۔ سبھی پرجنوں اور پریے جنوں کو میری سنویدنائیں۔''

(جناب) این چندرابابو نائیڈو
(سابق وزیر اعلیٰ آندھرا پردیش)

''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ادھیکچھ حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صاحب کا ندھن دُکھد ہے، وہ ایک اسلامک وِدّوان تھے، تتھا دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے پرمکھ چانسلر رہے تھے، ایشور سے پرارتھنا ہے کہ وہ انہیں جنت میں اہم مقام عطا کرے۔''

جناب شیش کمار
(وزیر اعلیٰ بہار)

''بہت ہی دکھد سماچار پراپت ہوا کہ مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی جی جو آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ادھیکچھ تھے' ان کا دیہانت ہوگیا، وہ بڑے ہی مہان اسلامک اسکالر تھے، شکچھا کی لائن میں ان کے سراہنی کاریے سدیو یاد کیے جائیں گے۔ شوک کی اس گھڑی میں تمام پرجنوں اور پریے جنوں کے لیے میری سنویدنائیں۔''

ملک ارجن کھڑگے
(صدر کانگریس پارٹی)

''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ادھیکچھ حضرت مولانا رابع حسنی ندوی جی کے ندھن کا دُکھد سماچار ملا، ایشور دِوَنگت آتما کو شانتی دے۔ شوک سنتپت پرجنوں ایوم پریے جنوں کے پرتِ میری گہری سنویدنائیں، ونمر شردّھانجلی۔''

(محترمہ) پرینکا گاندھی واڈرا
(کانگریس پارٹی)

''مولانا رابع حسنی ندوی جی ایک مہان وِدّوان ہی نہیں اَپِتُ سماج کے ایک ایسے رہنما تھے جنہوں نے اپنی اُدارتا اور میتری بھاو سے سب کا دل جیت لیا، سب دھرموں کے لوگوں کے ساتھ ان کا اِسنیہ پورَوک ویوہار انکرڑیہ ہے، ایشور ان کے پریوار و پریے جنوں کو دھیریے اور شکتی دے۔''

گرودیو شری شری روی شنکر
(بنگلور)

''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ادھیکچھ حضرت مولانا رابع حسنی ندوی کے ندھن کا دُکھد سماچار پراپت ہوا، ایشور دِونگت کی آتما کو شانتی پردان کریں وشوک ستپنت پرجنوں کو اس اَسیم دکھ کو سہن کرنے کی شکتی پردان کریں۔''

جناب شیو پال سنگھ یادو
(راشٹریہ مہا سچو سماج وادی پارٹی)

''لکھنؤ کے وشو وکھیات دارالعلوم ندوۃ العلماء کے پرمکھ' آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ادھیکچھ' و مولانا علی میاں کے قریبی مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے آج انتقال کی خبر اَتِ دُکھد ہے، ان کے پریوار تتھا دنیا بھر میں رہنے والے ان کے تمام چاہنے والوں کے پرتِ میری گہری سنویدنا۔''

(محترمہ) مایاوتی
(صدر بہوجن سماج پارٹی)

''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ادھیکچھ حضرت مولانا رابع حسنی ندوی جی کے انتقال کی خبر انتہائی افسوس ناک ہے، خدا آپ کے چاہنے والوں کو صبر عطا کرے، آپ کی خدمات کو زمانہ یاد رکھے گا۔''

یوپی کانگریس
(اتر پردیش)

''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ادھیکچھ حضرت مولانا رابع حسنی ندوی اب نہیں رہے، اوپر والے سے دعا ہے کہ مرحوم کو جنت میں اعلیٰ مقام دے۔ بھاوبینی شردّھانجلی۔''

راشٹریہ لوک دَل

افادات

مرشد الامت حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

عقیدۂ توحید:

''توحید صرف ایک علمی حقیقت ہی نہیں بلکہ ایک عملی حقیقت ہے، انسانی زندگی خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، توحید کے تصور اختیار کرنے پر منظّم اور صحیح طریقہ کی بن جاتی ہے کہ وہ ایک کا بندہ ہے، کئی کو راضی کرنے کی پریشانی سے محفوظ ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی پر توحید کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اس سے انسان بے خوف، نڈر، بہادر اور جری بنتا ہے، توحید کے مقابلہ میں شرک اور کفر کی لازمی خصوصیت یہ ہے کہ اس سے انسان بزدل، کمزور اور ناتواں ہوتا ہے کہ کس کس کو راضی کرنے کی کوشش کرے، کس کس کے سامنے جھکے اور تابعداری کرے، عقیدۂ توحید انسان میں عزتِ نفس کا جذبہ پیدا کرتا ہے، توحید کا ماننے والا انسان مغرور اور متکبر نہیں ہوتا بلکہ اس میں تواضع اور انکساری آجاتی ہے، توحید کا ماننے والا کبھی تنگ نظر نہیں ہوتا، وہ اپنے ماتحتوں کا حق نہیں مارتا اور نہ ان کو بے جا دباتا ہے، کیونکہ وہ ایک خدائے برتر واعلیٰ کا ماننے والا اور اس کے وجود کا قائل ہوتا ہے، اس کو سب سے زیادہ طاقتور جانتا ہے اور مالک کل سمجھتا ہے، صرف اسی سے مانگتا ہے، صرف اسی سے لیتا ہے، توحید کے ماننے والے جھوٹے متعدد منتشر خداؤں کے سامنے سر جھکانے کے محتاج نہیں، وہ صرف ایک ہی سے لو لگاتے ہیں اور وہ سب سے بڑا اور قادر مطلق ہے، اس لیے سب کچھ اسی سے مل سکتا ہے۔ عقیدۂ توحید کا اجتماعی زندگی پر یہ اثر ہوتا ہے کہ انسانی معاشرت کی بنیاد کامل عدل اور صحیح مساوات پر استوار ہوتی ہے، دنیا کی موجودہ ابتری وتباہی کا بنیادی سبب یہی ہے کہ انسان توحید خداوندی پر دل سے پوری طرح یقین نہیں رکھتا۔''

(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل: ۲۵۷)

نماز:

''اللہ تعالیٰ کو نماز کا عمل بہت محبوب ہے اور اس کی فرضیت بھی آسمان کے اوپر معراج میں ہوئی، اس کے ذریعہ بڑا روحانی عروج حاصل ہوتا ہے اور بندہ اللہ کے قریب ہوتا ہے، اس عبادت کی ادائیگی کے لیے جو انداز عمل اور جو قلبی احساس کی تعلیم دی گئی ہے، اس کو اختیار کرنے کی ضرورت ہے، اس کے ہونے پر زمینی خوبی سے انسان آسمانی خوبی میں پہنچ جاتا ہے۔ نماز کی عبادت کا عمل بھی ہمہ وقت نہیں رکھا گیا، تاکہ بندہ کے لیے یہ عمل آسان رہے، ۲۴ر گھنٹے میں صرف پانچ بار، نصف یا ربع (چوتھائی) گھنٹے میں نماز کا عمل پورا ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے، لیکن اخلاص کے ساتھ عند اللہ قبولیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نماز کو غیر معمولی اوصاف والا بنایا ہے، نماز انسان کو روحانی قوت بخشتی ہے، اللہ تعالیٰ سے قریب کرتی ہے، مصیبت کے وقت انسان کو ہمت دیتی ہے اور مصائب سے نبرد آزما ہونے کے لیے اہل ایمان کا آہنی ہتھیار ثابت ہوتی ہے۔''

(شعائر اللہ کی عظمت: ۶۶-۶۸)

زکوٰۃ:

''ادائے عبدیت کا دوسرا رکن زکوٰۃ وصدقات کی ادائیگی ہے، زکوٰۃ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی مالی نعمتوں کا شکر ہے، جس کو ادا کر کے انسان اپنے رب کے مالی احسانات کا شکر ادا کرتا ہے، وہ مال کی مختلف قسموں پر ایک مقررہ حد تک پہنچ جانے پر فرض ہوتی ہے، مال جب کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ ہو جاتا ہے تو اس پر زکوٰۃ فرض ہو جاتی ہے، ضرورت سے زیادہ ہونے کی ایک حد مقرر کی گئی ہے اور

زکوٰۃ کی مقدار بھی ایک معمولی حد رکھی گئی ہے مثلاً: یہ کہ ضرورت سے زیادہ مال پر زکوٰۃ فرض ہے، لائق حد تک سال بھر آدمی کے پاس موجود رہے، تو ڈھائی فیصد رقم زکوٰۃ کی رہے گی اور مال کی قسموں کے علاوہ علیحدہ علیحدہ حدیں بھی رکھی گئی ہیں، زکوٰۃ فرض ہے، زکوٰۃ کے علاوہ صرف اپنے رب کو راضی اور خوش کرنے کے لیے صدقات کی بھی تلقین کی گئی ہے، اس کی کوئی حد نہیں رکھی گئی ہے اور اس کو فرض بھی نہیں کیا گیا ہے، اس طرح زکوٰۃ وصدقات میں اظہار عبدیت کے ساتھ اپنے ہم جنس انسانوں کی مصیبت و پریشانی میں ان کی ہمدردی وغم خواری کی علامت بنتی ہے اور یہ صورت اللہ رب العالمین کو بہت پسند ہے، اسی لیے اپنی عبادت اختیار کرنے کی تلقین میں نماز کے ادا کرنے کے فوراً بعد زکوٰۃ کا ذکر آیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس سے ایک طرف ہمدردی وغم خواری کی فضا قائم ہوتی ہے اور دوسری طرف معاشرہ کے افراد میں خوش حالی کی صورت حال قائم ہوتی ہے، مالوں میں برکت ہوتی ہے، دلوں میں الفت پیدا ہوتی ہے، ایک دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ کی فضا قائم ہوتی ہے۔"

(قرآن مجید انسانی زندگی کا رہبر کامل: ۲۷۰)

روزہ:

"انسان کی پسند اور خواہش عام طور پر تین چیزوں میں منقسم ہوتی ہے، ایک تو کھانے پینے کی لذت، دوسرے خواہش نفس اور تیسرے آپس کے معاملات میں دلچسپی کا آزادانہ رویہ، ان تینوں چیزوں میں عام طور پر آدمی اپنی طبیعت کو لگاتا ہے، اپنی پسند کے مطابق کھاتا پیتا ہے اور خواہش نفس کا موقع ملنے پر اس کو پورا کرتا ہے اور آپس میں بات چیت میں زیادتی پر اتر آتا ہے، کسی کو برا بھلا کہتا ہے، کسی کی غیبت کرتا ہے اور کسی کی حق تلفی کرتا ہے اور زیادتی کرتا ہے۔ روزے میں ان تینوں چیزوں سے پورا پرہیز کرایا گیا ہے اور چونکہ غیر محدود مدت کے لیے کم سے کم کھانے پینے کو نہیں روکا جاسکتا، اس لیے اس کو ٹکڑوں میں پورے مہینہ میں پھیلا دیا گیا ہے اور یہ ٹکڑے شب وروز میں وہ حصے ہوتے ہیں جن میں ان آزادیوں کا موقع زیادہ ملتا ہے مثلاً: فجر کے وقت سے لے کر شام تک، لہٰذا روزانہ ان حصوں میں پابندی لگادی گئی اور تسلسل کے ساتھ بار بار یہ پابندی کرنے سے عبادت واطاعت کے مواقع بھی مسلسل بن جاتے ہیں اور بار بار کرنے سے اس نیکی کی مشق وتربیت بھی ایک مہینہ تک ہوتی ہے جو سال بھر کے لیے انسان کے لیے معیار عمل بن جاتی ہے۔"

(تحفہ رمضان: ۸-۹)

حج:

"حج ہر اس شخص پر جو آزاد، عاقل، بالغ، تندرست ہو اور اس کے پاس اپنی اور اپنے بیوی بچوں کی بنیادی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد اتنا زائد ہو کہ اس سے مکہ مکرمہ جانے آنے اور دوران سفر کے اخراجات پورے ہوسکیں، عمر میں ایک بار فرض ہوتا ہے، جس کی ادائیگی زندگی بھر میں ضروری ہوتی ہے، حج کی استطاعت کے ہونے کی صورت میں بھی حج نہ کرنا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محمد ﷺ کی طرف سے بہت برا قرار دیا گیا ہے اور اس پر بڑی وعید آئی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ﴾ (اور اللہ کا حق ہے لوگوں پر حج کرنا اس گھر کا جو کوئی پاوے اس تک راہ اور جس نے کفر وانکار کیا تو اللہ غنی ومستغنی ہے تمام جہاں کے لوگوں سے)

اور حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص حج کا ارادہ رکھتا ہو اس کو جلدی کرنا چاہیے اور فرمایا: جس شخص کو ضروری حاجت یا مرض شدید یا ظالم بادشاہ نے نہیں روکا اور وہ بلا حج مرگیا تو اس کی مرضی جو چاہے کرے، یہودی ہوکر مرے یا نصرانی ہوکر۔

حج کا نہ کرنا گویا اسلام سے رشتہ ناطہ توڑ دینا یا اسلام سے بے تعلقی کے مرادف ہے، اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے ان فرمودات کے بعد کسی مسلمان کے لیے حج ترک کرنے یا اس کی ادائیگی میں سستی وکوتاہی کرنے کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے، بہت ڈرنے کی بات ہے، حج کی استطاعت ہوتے ہی کسی بھی مسلمان کے لیے زیبا نہیں کہ اس کی ادائیگی میں تاخیر کرے، کیونکہ خدانخواستہ اگر حج نہ کرسکا تو

قیامت میں اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کتنا افسوس ناک مقام ہوگا۔‘‘

(حج ومقامات حج:۱۸-۱۹)

محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم:

’’حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کا شمار شعائر اسلام میں ہوتا ہے، اس لیے آپ کے ساتھ احترام کا معاملہ کرنا، آپ کی باتوں پر عمل کرنا، آپ کے حکموں کی تعمیل کرنا، آپ سے محبت کرنا تمام اہل ایمان پر لازم ہے، محبت کرنے کی بات تو یہاں تک کہی گئی ہے کہ آدمی کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوگا جب تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اپنے ماں باپ اپنی اولاد سے بھی زیادہ نہ ہو، یعنی ماں باپ سے زیادہ محبت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہونی چاہیے۔

آج ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر مسلمان اپنا جائزہ لے کہ اس کو اللہ کے رسول سے کتنی محبت ہے اور اس محبت کا اندازہ صرف کہنے سے نہیں بلکہ اس وقت ہوتا ہے جب اس کے مقابلہ میں کوئی چیز آجائے، عموماً آدمی کو دنیا کے منافع، مال ومتاع اور اولاد سے ایسی محبت ہوجاتی ہے کہ اس سے دین کے معاملہ میں خلل پڑنے لگتا ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس سے روکا اور یہ فرمادیا کہ تمہاری اولاد، تمہارا مال ودولت تمہارے لیے فتنہ ہے، فتنہ کے معنی عربی میں لبھا کر آدمی کو اصل راستہ سے ہٹانے کے ہیں، یعنی آدمی شوق میں غلط کام کرنے لگے، کسی چیز کو اتنا پسند کرے اور اس سے اتنا لگاؤ ہو کہ اس کی وجہ سے وہ غلط کام کردے، لیکن اللہ کے رسول سے آدمی کو اگر صحیح محبت ہو، جیسی محبت کا مطالبہ ہے کہ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوگا تو پھر وہ شخص ہزار چیزوں کے باوجود بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی نہیں کرسکتا، آپ کے جو حقوق ہر انسان پر عائد ہوتے ہیں، ان کے ادا کرنے میں کوئی بھی کوتاہی نہیں کرسکتا، کیونکہ انسان کو جس سے محبت وعقیدت ہوگی وہ اس کے خلاف کر ہی نہیں سکتا، لہٰذا ایمان کے مکمل ہونے اور شریعت پر صحیح عمل کے لیے ضرورت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حقیقی محبت ہو۔‘‘

(مقدمہ حقوق رسول صلی اللہ علیہ وسلم:۷-۸)

علم:

’’علم معلومات کو کہتے ہیں اور معمولی چیزیں بھی علم میں داخل ہوتی ہیں اور اہم چیزیں بھی علم میں داخل ہوتی ہیں اور معلومات اتنی ہے ہم لوگوں کے لیے دنیا میں کہ اگر ہم ایک علم پر بھی اپنی پوری زندگی صرف کردیں تو زندگی پوری ختم ہوجائے گی، وہ علم پورا حاصل نہیں ہوگا۔

علم کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ علم ہے جو انسان خود اپنی محنت سے حاصل کرتا ہے، اپنے استاد سے حاصل کرتا ہے، استاد کی محنت سے حاصل کرتا ہے، دوسرا وہ علم ہے جس سے ساری دنیا چل رہی ہے، ساری ترقیات چل رہی ہیں، یہ سب جو تہذیب وتمدن دیکھ رہے ہیں اور ترقیات دیکھ رہے ہیں، یہ وہ ہیں جو انسان اپنی کوشش سے اور اپنے تجربہ اور مجاہدہ سے اور اپنے استاد سے حاصل کرتا ہے۔

ایک وہ علم ہے جو انسان کے بس کا نہیں ہے، جس کو علم غیب کہتے ہیں، علم غیب ہمارے لیے اصلاً ہماری نجات کے لیے، ہماری کامیابی کے لیے علم غیب کی ضرورت ہے، یہ علم جس سے ہم دنیاوی فائدہ اٹھالیتے ہیں، اپنے جسم کا فائدہ اٹھالیتے ہیں، لیکن اس کے بعد ہمیں جو دوسری زندگی موت کے بعد کی ملے گی، خود اس زندگی کے اندر صحیح طور پر ہم زندہ رہیں یہ علم ہم کو علم غیب سے حاصل ہوتا ہے اور علم غیب اللہ نے ہم کو قرآن مجید کے ذریعہ اور حدیث شریف کے ذریعہ سے دیا ہے۔ آپ خود حاصل نہیں کرسکتے تھے، اپنی کوشش سے نہیں حاصل کرسکتے تھے، وہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیا گیا ہے، تاکہ ہمیں نجات حاصل ہو، تاکہ ہم کامیاب ہوں، تاکہ ہم ناقص نہ رہیں، تاکہ ہم دنیوی مصیبت میں مبتلا نہ ہوں۔ یہ علم والے علم رکھتے ہیں، صرف اتفاق رکھتے ہیں، انسانی علم پر اتفاق رکھتے ہیں اور وہ علم حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے جو اللہ نے غیب سے عطا فرمایا ہے۔‘‘

(علم کی اہمیت اور علماء ومدارس کا کردار:۹-۱۰)

بیعت:

’’بیعت حقیقت میں توبہ ہے کہ کسی شخص کے مشورہ اور دین سے واقف کے سامنے جو اس کا مجاز ہو توبہ کرنا، جس کے سامنے یہ

عمل کیا جاتا ہے وہ اس کا گواہ بن جاتا ہے، تو یہ اللہ کا بڑا انعام اور تحفہ ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا بسائی ہے انسانوں کا امتحان لینے کے لیے کہ اللہ کو مانتے ہیں، یا کسی دوسرے کو مانتے ہیں، مسئلہ یہ آجاتا ہے کہ جی کچھ چاہ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مرضی اور چاہت کچھ اور ہے، اب آدمی کیا فیصلہ کرتا ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ دیکھنا چاہتا ہے کہ تمہارے سامنے ایسا مسئلہ آجاتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ اپنے دلوں کی مانو گے یا اللہ کی مانو گے؟ مگر مزا اور لطف دل چاہنے میں ہوتا ہے، اس لیے انسان وہاں پھسل جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ دنیا میں جو کچھ دیا، زندگی دی، طاقت دی، دولت دی، عزت دی اور سب کچھ دیا، وہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اللہ کا احسان وانعام مانتے ہو کہ نہیں؟ اللہ تعالیٰ کو اس کی ضرورت نہیں کہ ہم اللہ کی عبادت کریں، اس کے لیے بڑی مخلوق ہے، فرشتے ہیں اور دوسری سب مخلوقات ہیں، مگر انسان اور جنات کو اختیار دیا گیا، جن وانس کے لیے یہ مواقع بہت آتے ہیں کہ دل کچھ جاہ چاہ رہا ہے اور اللہ کی مرضی کچھ اور ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے دونوں کا مقصد حیات صاف صاف بتادیا: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ اور اللہ کی مرضی اور چاہت کے خلاف کرنے کی صورت میں مؤاخذہ اور سزا کی بات بھی صاف فرمادی: ﴿مَن يَعْمَلْ سُوءاً يُجْزَ بِهِ﴾ کہ برائی کی سزا دی جائے گی، مگر اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے توبہ رکھی ہے کہ بندہ معافی مانگ لے اور اعتراف قصور کرلے کہ غلطی ہوگئی، اس پر اللہ معاف کردیتا ہے۔ توبہ کے اس عمل کو تھوڑا اہتمام کرکے کیے جانے کی ضرورت ہے کہ دوسرے کو گواہ بنا کر کی جائے، اس کا اثر پڑتا ہے، جس کے ہاتھ پر یا جس کے کہلاتے ہوئے الفاظ پر اس کے سامنے یہ عمل کیا جاتا ہے اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر اس عمل کو انجام دے، اس کو اطلاع کی جاتی ہے، اس میں وہ صورت پیدا ہوجاتی ہے کہ اس کو گواہ بنایا اور اپنی نئی ایمانی زندگی گذارنے کے لیے جو عہد کیا اس میں اس کو اپنا امیر بنایا، اس سے لحاظ اور حیثیت کی ایک کیفیت پیدا ہوجاتی ہے اور دل میں اہمیت پیدا ہوتی ہے۔'' (تحفہ گجرات: ۲۵۸-۲۵۹)

نیک صحبت:

''اس وقت بزرگوں کی تعداد کم ہے اور جب تعداد کم ہوتی ہے تو اس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے، دین جس طرح دین والوں کی صحبت وتعلیم سے آتا ہے کسی اور طریقہ سے نہیں آتا، یہ بات کسی حد تک تبلیغی جماعت، دینی مدارس اور دین وملت کے اجتماعی کاموں میں لگنے سے پیدا ہوتی ہے اور اسلام میں جماعت اور اجتماعیت کی بڑی اہمیت ہے، البتہ کسی اللہ والے اور نیک شخص سے رابطہ قائم کرکے اور اگر وہ عالم دین ہیں تو اور زیادہ بہتر بات ہے کچھ وقت ساتھ گزارنا اور اپنی رائے کو دبانا اور مان کر زندگی گذارنا اور اس کے ساتھ تقرب الی اللہ والے اعمال کی انجام دہی بڑی ترقی کا باعث ہوتی ہے اور یہ بات وہ صلاحیت پیدا کراتی ہے کہ آگے بڑھ کر بڑے کام کو انجام دیا جاسکے اور اس کی اہلیت پیدا ہوسکے۔''

(تحفہ گجرات: ۶۵-۶۶)

دعوتِ دین:

''امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو اپنے سے پہلے کی مسلمان امتوں پر یہ امتیاز حاصل ہے کہ سابقہ امتوں میں انبیاء علیہم السلام کے بھیجے جانے کا سلسلہ قائم تھا، اللہ تعالیٰ ایک نبی کے بعد دوسرا نبی بھیجتا تھا جو دین کی صحیح دعوت کا کام کرتا تھا، ہر نبی کے امتی اپنے نبی کے کام میں ہاتھ بٹاتے تھے اور دعوت دین کے کام میں شرکت کرتے تھے لیکن حضور مقبول حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے بعد نبیوں کا بھیجا جانا موقوف کیا گیا اور وہ کام جو پے در پے نبی بھیج کر کرایا جاتا تھا، اس کی ذمہ داری امت محمدیہ کے سپرد کی گئی، چونکہ آخری نبی کے آجانے سے دین مکمل ہوگیا، اس کی رو سے آخری نبی کے لائے ہوئے آخری پیغام خداوندی کو قیامت تک جاری رہنا ہے، اس لیے اب جو کام ہونا تھا وہ اسی دین کے اندر ہونا تھا، لہٰذا اس کے لیے اب آپ کے بعد قیامت تک کی نیابت آپ کی امت کے سپرد کی گئی۔''

(مسلم سماج - ذمہ داریاں اور تقاضے: ۱۳۸)

طریقۂ دعوت:

''اگر مسلمان دعوت کے فریضہ کو اپنی زندگیوں کو اسلامی سیرت کا نمونہ بناتے ہوئے انجام دیں تو اس کے بڑے اچھے نتائج نکل سکتے ہیں اور ان کے مصائب اور پریشانیوں میں بہت کمی آسکتی ہے اور وہ اس سے عنداللہ سرخ رو اور کامیاب بھی ہوں گے اور یہ جو سیاسی سطح پر مسلمانوں کے ساتھ مختلف ملکوں میں واقعات پیش آرہے ہیں، اس کے نقصانات بھی کم ہوں گے، کیونکہ سامنے سے اسلام اور مسلمان دشمنی کی کیفیت ہٹ جائے گی اور مسئلہ خالص سیاسی یا معاشی رہ جائے گا، جس کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے مناسب حکمت عملی سے ان کو روکنے کی کوشش کی جاسکتی ہے، مسلمانوں میں اگر اپنے پروردگار کی اطاعت اور دین کی نصرت کا صحیح جذبہ ہو اور اس کی صحیح فکر ہو اور اس پر ہم دردی اور انسانی خیر خواہی کے بتائے ہوئے جذبہ سے عمل ہو تو مسلمانوں کے مخالفوں میں بھی مسلمانوں سے نفرت کا جذبہ نہیں رہے گا، پھر مسئلہ صرف کاروباری اور دنیاوی فائدہ کے حصول کا رہ جائے گا اور اس کا مداوا زیادہ مشکل نہیں۔''

(حالات حاضرہ اور مسلمان:۶۳)

خود رائی:

''خودرائی میں ہمارا موجودہ معاشرہ بری طرح مبتلا ہے وہ ''اعجاب کل ذی رأی برأیہ'' کا پوری طرح شکار ہے، اس کے نتیجہ میں ہماری ملی اجتماعیت پراگندگی کا شکار ہے، ہم میں سے چار آدمی بھی مل جل کر زیادہ دنوں تک کام نہیں کر پاتے، ذرا اختلاف رائے یا مصلحتوں کا ٹکراؤ پیدا ہو تو کشمکش اور افتراق کا شکار ہو جاتے ہیں، پھر مسئلہ صرف افتراق وانشقاق پر ہی ختم نہیں ہوتا، بلکہ ایک دوسرے سے ناگواری اور عداوت کی منزل تک بات پہنچ جاتی ہے اور انتقام کا جذبہ کام کرنے لگتا ہے کہ فلاں نے میری رائے نہیں مانی یا میری رائے پر نہیں چلا، یا وہ میری رائے سے اتفاق نہیں رکھتا، لہٰذا اب اس کا ساتھ نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ قابل تعزیر بھی ہے اور تعزیر کے لیے موجودہ جمہوری دور میں غیبت اور مخالفانہ پروپیگنڈہ سے لے کر عدالتی کارروائی تک کی جاتی ہے، ہمارے ملی ادارے اور کام اسی ٹکراؤ اور ہنگامہ آرائی کے شکار رہیں، حالانکہ دوسرے کی رائے کے لحاظ واحترام کی شاندار مثالیں ہم کو عہد اول میں خوب ملتی ہیں۔''

(مسلم سماج - ذمہ داریاں اور تقاضے:۹۸)

نیت:

''یاد رکھئے! اصل چیز نیت ہے، عمل بظاہر خواہ کتنا ہی مہتم بالشان اور نیک معلوم ہو رہا ہو مگر دل کے اندر اس کے خلاف ہے اور نیت خدا کی رضا جوئی کی نہیں ہے تو وہ عمل اکارت ہے، وہ سارے اعمال جو بڑے اجر وثواب کے حامل ہیں، اگر ان کی ادائیگی خالص خدا ورسول کے احکام کو سامنے رکھ کر ہو رہی ہے تو باعث ثواب ہے۔''

(ملفوظات مرشد الامت:۱۲۷)

دعا:

''دعا کی دو خصوصیات ہیں: ایک تو یہ کہ اس سے اپنے پروردگار سے اپنی حاجت کو پورا کرنے کی طلب کو قوت ملتی ہے، دوسرے دعا کا عمل عبادت کا بھی فائدہ دیتا ہے، دعا کو ''مخ العبادۃ'' (عبادت کا مغز) کہا گیا ہے، لہٰذا دعا سے دونوں باتیں ہوتی ہیں، اپنی ضرورت کی تکمیل بھی اور عبادت بھی۔ مومن کے لیے دعا کارگر ذریعہ ہے، اللہ رب العالمین کی طاقت اصل طاقت ہے اور اس کی مشیت کسی بھی چیز کے انجام پانے میں اصل سبب ہے، اس سبب کو جب بھی اختیار کیا جاتا ہے تو اس سے مقصد کے حصول میں بڑی مدد ملتی ہے، اللہ تعالیٰ دعا کو سنتا اور پسند کرتا ہے تو دیتا بھی ہے، یہ دینا تو کبھی اسی چیز کا دینا ہوتا ہے جس کی دعا کی گئی ہے، لیکن اگر وہ چیز مانگنے والے کے لیے مفید نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ انسان کے فائدہ کی خاطر وہ چیز دینے کے بجائے اسی طرح کی کوئی دوسری مفید چیز دے دیتا ہے، اس کے مانگنے کو رد نہیں کرتا، خاص طور پر جب دعا دل سے مانگی جائے تو بڑی کارگر ہوتی ہے۔ اسی طرح دعا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے بڑے فیصلے ہوتے ہیں۔''

(مقدمہ دعا اور تقدیر:۵-۶)

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 15 ⚜ June-August 2023 ⚜ Issue: 06-08

مرشد الامت — اکابر امت کی نظر میں

''عزیزی مولوی محمد رابع حسنی ندوی ندوۃ العلماء کی فکر، خصوصیات وامتیازات اور اس کے علمی، ذہنی اور دینی مزاج کے نہ صرف حامل بلکہ اس کے داعی، ترجمان اور عملی پیکر بھی ہیں۔''

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

''مولانا رابع میاں، حضرت مولانا (علی میاںؒ) کی تصویر ہیں اور تصویر مجسم ہیں، صورت شکل بھی حضرت سے مل گئی ہے، خیر یہ بات اس لیے بھی ہے کہ وہ ان کے حقیقی بھانجے ہیں اور ایک خون کے دو پیکر ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولاناؒ کو ایسا جانشین دیا جو بلانزاع ان کا آئینہ ہے۔''

حضرت مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ

''حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ صرف اپنے خاندان کے ہی نہیں بلکہ ملت اسلامیہ کے بھی بزرگ اور قابل احترام شخصیت تھے، وہ علم وفضل اور صلاح وتقویٰ اور شرافت نفسی میں اپنی مثال آپ تھے، انہوں نے نہ صرف ندوۃ العلماء بلکہ پوری امت مسلمہ ہندیہ کی بے مثال خدمات انجام دیں، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر کی حیثیت سے ان کی بے لوث قیادت انہی کا حصہ تھا۔''

حضرت مولانا ارشد مدنی مدظلہ

''اللہ رب العزت نے مخدوم ومکرم حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کے ذریعہ ندوۃ العلماء کو حضرت مولانا علی میاں ندوی قدس اللہ سرہ کے خطوط پر پورے اعتدال، ہر طرح کی میانہ روی اور حکمت وفقاہت کے ساتھ جاری رکھا، بلاشبہ یہ پوری امت کے لیے باعث مسرت ہے۔''

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی مدظلہ

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9792646858
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)